معالم القرآن

جلد نہم

محمد علی الصدیقی کاندھلوی

علم و کتاب واٹس ایپ گروپ

ملکیت ——— ادارہ تعلیماتِ قرآن، سیالکوٹ

عناوین ——— ۳۵۰

آیات ——— ۱۱۹+۴۰ = ۱۵۹

طابع ——— شبیر احمد عثمانی

تزئین و آرائش ——— سید انور حسین، نفیس رقم

کتابت ——— محمود احمد، گوجرانوالہ

ناشر ——— قاری عبدالرحمٰن ایم اے

صفحات ——— ۸۹۶

تاریخ اشاعت ——— جنوری ۱۹۸۵ء

مطبع ———

ملنے کا پتہ

ادارہ تعلیماتِ قرآن

دارالعلوم الشہابیہ رنگ پورہ روڈ

سیالکوٹ

قیمت :- ——— ۱۰۰ روپے

انتساب

میں تفسیر معالم العرفان کی نویں جلد کو جس میں انسانیت کو
حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثتِ عمومی کی خوشخبری سنا کر رہتی دنیا
تک آپ کی ذاتِ گرامی کو مدارِ ہدایت بنایا گیا ہے۔ اور پوری
انسانی دنیا کو ایمان کی دعوت دی گئی ہے، قابلِ صد احترام فضیلت مآب
جناب الحاج عبد الغنی صاحب سلمہٗ کے نام سے منسوب کرتا ہوں جن
کی قرآن و سنت سے مخلصانہ وابستگی اور دریا دلی سے یہ جلد زیورِ طباعت
سے آراستہ ہو رہی ہے۔

دعا ہے کہ اللہ سبحانہٗ اس جذبۂ خیر کو تا دیر سلامت رکھے اور اس
کے لیے، ان کی اولاد کے لیے اور ان کے والدین کے لیے دنیا و
آخرت میں کامیابی کا ذریعہ بنائے، آمین!۔

قاری عبد الرحمٰن ایم۔ اے
ناظم ادارہ تعلیمات قرآن
دار العلوم الشہابیہ، سیالکوٹ

دریا بحباب اندر

مقدمہ

اس پارے میں ایک سے زیادہ مقام پر لعلھم آیا ہے کہیں لعلھم یفرعون، کسی جگہ لعلھم یذکرون، کسی مقام پر لعلکم تھتدون، کہیں لعلھم یتقون، دو جگہ لعلھم یرجعون، ایک جگہ لعلکم ترحمون اور ایک مقام پر لعلکم تشکرون آیا ہے۔

علامہ راغب اصفہانی نے لکھا ہے کہ قرآن کے بیشتر مقامات پر لعل تعلیل کے لیے آیا ہے۔ تعلیل کا مطلب ہے کہ پہلی بات کی علت بتائی جا رہی ہے لعلھم یفرعون کا منطوق یہ ہے کہ ہم نے نبیوں کی مخاطب قوموں کو سختیوں اور تنگیوں میں مبتلا کیا تاکہ ان میں سرکشی وغیرہ ختم ہو کر عاجزی اور نیازمندی نمایاں ہو یعنی ایسا کرنے میں ہماری حکمت اور مصلحت یہ تھی کہ لوگ انبیاء کی دعوت کی طرف متوجہ ہوں۔ فرعون اور فرعونیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے فرعون کی قوم کو خشک سالی اور پیداوار کے نقصان میں مبتلا کیا تاکہ ان کو اپنی برائیوں پر تنبیہہ ہو اور وہ نصیحت یاب ہوں لعلھم یذکرون۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت عمومی کا تذکرہ کیا اور فرمایا کہ اس پیغمبر پر ایمان لاؤ لعلکم تھتدون تاکہ تم بے راہ روی اور گمراہی سے ہٹ کر ہدایت سے ہمدوش ہو جاؤ۔ بنی اسرائیل کی بے راہ روی پر علماء نے ان کو برائیوں سے باز رہنے کی تلقین کی لیکن کچھ لوگوں نے ان وعظ کرنے والوں سے کہا کہ تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جن کو اللہ ہلاک کرنے والا ہے تو وعظ کہنے والے علماء نے ان کو جواب دیا کہ اس لیے کہ ہم اللہ کے حضور معذرت کر سکیں اور لعلھم یتقون تاکہ یہ لوگ خدا کی نافرمانی سے بچ جائیں۔

بنی اسرائیل ہی کو کتاب الٰہی کے بارے میں بتایا گیا کہ جو کتاب ہم نے تمہیں دی ہے اسے مضبوطی سے تھامے رہو اور جو کچھ اس میں ہے اسے یاد رکھو لعلکم تتقون تاکہ تم برائیوں سے بچ جاؤ ۔ عام قانون بنایا گیا ہے کہ ضوابط اور احکام کو کھول کر بیان کرتے ہیں اور لعلھم یرجعون میں اس کی علت یہ بتائی گئی ہے تاکہ لوگ حق کی طرف لوٹ آئیں ۔

قرآن کے بارے میں بتایا کہ یہ تمہارے رب کی جانب سے دلائل کا سرمایہ ہے ۔ زندگی میں اللہ کی بندگی کے لیے راہنما اور پرستش کے لیے پیغام رحمت ہے ۔ اس کا ادب یہ ہے کہ جب یہ پڑھا جائے تو خوب متوجہ ہو جاؤ اور خاموش رہو لعلکم ترحمون یہ اس لیے کہا جا رہا ہے تاکہ تم پر اللہ کی جانب سے رحمت ہو ۔

مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اللہ نے تمہیں مدینے میں ٹھکانا دیا ۔ اپنی مدد سے قوت بخشی اور اچھی اچھی چیزوں کے رزق کا سامان کیا یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ تم اللہ کے شکر گزار بندے ہو ۔

صرف لعل ہی تعلیل کے لیے نہیں آتا ہے لام بھی آتا ہے ، کے بھی آتا ہے ، مفعول لہ بھی آتا ہے ۔ شفاء العلیل میں حافظ ابن القیم نے پوری تفصیل دی ہے ۔ یہ تعبیرات اس بات کی واضح اور صاف دلیل ہیں بلکہ اس کے لیے واضح رہنما اصول ہیں کہ اسلامی قانون کے پس منظر میں مصالح حکم اور عواقب ہیں ۔

عام خیال یہی ہے کہ اللہ سبحانہ نے اپنے منشور میں جو احکام بندوں کو دیے ہیں ان کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ جیسے آقا اپنے غلام کو کہے پتھر اٹھا کر لاؤ اور اس کے پس منظر میں غلام کی اطاعت کے امتحان کے سوا کوئی تصور کارفرما نہ ہو ۔ اسلامی قانون کے بارے میں یہ بلاشبہ بقول حکیم الامت

ایسا غلط اور ناروا تصور ہے جس کی سنت اور خیر القرون کا اجماع تکذیب کرتے ہیں ۔

شاہ صاحب کے اپنے الفاظ یہ ہیں :

ہذا ظن فاسد تکذبہ السنۃ واجماع القرون المشھود لہا بالخیر

یہ درست ہے کہ اللہ سبحانہ کے احکام معلل بالاغراض نہیں لیکن یہ کہنا غلط ہے اللہ سبحانہ کے احکام معلل بالمصالح اور حکم نہیں ۔ اغراض کا تعلق قانون ساز سے ہے

جب کہ مصالح اور حکم کا تعلق ان سے ہے جن کے لیے قوانین بنائے جا رہے ہیں۔ آج کی سیاسی زبان میں یوں کہہ دو کہ اغراض اقتدار سے تعلق رکھتی ہیں جب کہ مصالح کا عام شہریوں سے تعلق ہوتا ہے۔

قانون کے پس منظر میں مصالح اور حکمتیں ہوتی ہیں تو قانون عوامی اور ترقی پذیر ہوتا ہے۔ مصالح سے تہی دامن قانون استبدادی اور جامد ہے۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

اسلامی قوانین کی مصالح اور حکم سے اگر کوئی شخص بے خبر ہے تو اس کے بارے میں سمجھ لینا چاہیے کہ علم کی اس کو ہوا بھی نہیں لگی۔ اس کے علم کی مقدار صرف اتنی ہے جتنا پانی میں ڈوبی سوئی پر پانی ہوتا ہے۔ اسے اپنے علم پر اعتماد کی بجائے رونا چاہیے۔

مصالح ہی قانون کا نظریاتی سرمایہ ہوتی ہیں، اور نظریاتی سرمایہ ہی مجتہد کے اجتہاد کی بنیاد ہوتا ہے۔ اسی لیے بتانے والوں نے بتایا ہے:

مجتہدین کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ان مصالح کا پتہ لگائیں جو قانون میں قانون ساز کا مقصد ہیں اور اس علت کی چھان بین کریں جس سے حکم وابستہ ہے کیونکہ اسی راہ سے مصالح کا پتہ لگتا ہے۔

قانون میں قانون ساز کا مقصد و منشا اور مناط حکم معلوم کرنا ہی تخریج مناط ہے۔ پھر اسی مناط حکم کی بنیاد پر کسی معاملہ کا فیصلہ کرنا تحقیق مناط ہے۔

تمام اسلامی علوم میں یہ علم ضروری ہونے کے ساتھ بے حد نازک بھی ہے۔ ضرورت تو ظاہر ہے کہ اس پر قانون کے ارتقاء کا مدار ہے اور نزاکت یہ ہے کہ یہ ہر کہ ومہ کا کام نہیں ہے اس کے لیے وسیع علم اور وسیع تجربہ کی ضرورت ہے۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ:

مجتہد کے لیے ضروری ہے کہ قرآن وسنت کے احکام سے متعلق جتنے علوم ہیں ان تمام علوم کی اسے پوری معرفت حاصل ہو۔ وہ خاص و عام، مجمل و مبین اور ناسخ و منسوخ کو جانتا ہو۔ اسی طرح وہ حدیث میں متواتر، غیر متواتر اور متصل و مرسل وغیرہ تمام اقسام حدیث کو پہچانتا ہو، نیز راویان حدیث کی قوت وضعف سے واقف ہو، عربی زبان پر اسے پورا عبور ہو، صحابہ و تابعین کے اقوال اور ان کے اجماع و اختلاف سے باخبر ہو، مزید براں قیاس کی تمام قسموں سے واقف ہو۔

پارہ نہم ایک نظر میں

شرک

سیاسی قوانین

اجتماعی قوانین

دفاعی قوانین

اخلاقی قوانین

توحید عبادت

دلوں کو تھامنا اور قدموں کو جمانا اللہ کا کام ہے۔

دستوری قواعد

معاشرتی قوانین

رسالت و نبوت

صحابہ کرام کا چہرہ

ایمان واسلام

آخرت کی زندگی

قرآن کی دعائیں

قرآن کی تمثیلات

واقعاتِ قرآنی

حرفِ آغاز

باسمہٖ سبحانہٗ

معالم القرآن کی آٹھویں جلد رجب ۱۴۰۱ھ مئی ۸۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ آج پورے تین سال چھ ماہ کے بعد اس کی نویں جلد آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔

بلاشبہ آپ کو ایک طویل عرصہ انتظار کرنا پڑا۔ اس طویل عرصہ میں میرے سامنے دو کام تھے ان کی بجا آوری بے حد ضروری تھی۔ اس وقت میری زندگی کے تین مقصد ہیں۔

۱۔ دارالعلوم میں جامع مسجد کی تعمیر

۲۔ دارالعلوم میں جدید نصاب کے تحت تعلیمی نظام

۳۔ معالم القرآن کی تکمیل

اللہ سبحانہٗ کا لاکھ لاکھ شکر و احسان ہے کہ اس سیاہ کار کو جامع مسجد کی توفیق ارزانی فرمائی اور اس کے لیے غیر متوقع اسباب مہیا فرمائے۔ دارالعلوم میں پہلے مسجد ۴۰ + ۲۵ کے رقبہ میں تھی اب ۱۵۰ + ۱۰۰ کے طویل رقبہ میں ہے۔ مسجد کا ہال ۴۰ + ۵۰ کا ہے۔ ہال کے تین طرف برآمدہ ۱۵۸ فٹ لمبا ہے۔ آگے صحن ۳۰ + ۹۷ ہے۔ اس کے آگے وضوگاہ وغیرہ ۴۰ + ۵۰ میں ہے۔ وضوگاہ کے اوپر مسجد کے امام کی رہائش گاہ ہے اور وضوگاہ کے سامنے ۴۰ + ۴۰ میں دو منزلہ لائبریری کا ہال ہے۔ وضوگاہ اور لائبریری کے درمیان چمن ہے۔ اس سارے منصوبہ پر اب تک چودہ لاکھ روپے صرف ہوئے۔ آپ پوچھیں گے کہ یہ خطیر رقم کہاں سے آئی۔ ایک روز بھی میں اس کی خاطر دارالعلوم سے باہر نہیں گیا۔ ایک بار جمعہ کے روز صلوٰۃ الحاجہ پڑھ کر

دُعا کی اور خطبۂ جمعہ میں لوگوں سے اپیل کی۔ اللہ سبحانہ نے لوگوں کے قلوب کو اس انداز سے اس طرف متوجہ فرمایا کہ میں کہہ نہیں سکتا کہ پردۂ غیب سے کیسے ہُوا۔ حق سبحانہٗ کی اس بے پایاں عنایت پر شکر کرنا میری بساط سے باہر ہے۔ میرے بدن کے رونگٹیں رونگٹیں میں اگر ایک ایک زبان ہو اور یہ زبان شکر کے ترانے کے لیے زمزمہ سنج ہو پھر بھی مجھ سے اس کا شکر ادا نہیں ہو سکتا الحمد للہ مسجد کی تکمیل ہو گئی ہے اس پر پورے تین سال لگ گئے۔

دارالعلوم میں جدید نصاب کے تحت ۸۰ء سے کام شروع کیا تھا۔ ۸۰ء میں پرائمری پاس دس طلبہ کو داخل کیا۔ اس وقت اسی نصاب کے مطابق میں پانچ جماعتیں موجود ہیں، پورا نصاب تعلیم نو سالہ ہے عملی تکمیل میں ۴ سال باقی ہیں۔ یہ نصاب دینی مدرسوں اور سرکاری اسکولوں، دونوں سے ممتاز ہے۔ اس میں بقدر ضرورت سرکاری نصاب کا آمیزہ ہے لیکن اہم اور بنیادی چیز اسلامی علوم کی تعلیم ہے۔ ہفتہ بھر ۵۰ گھنٹیوں میں سے صرف ۱۵ گھنٹیاں سرکاری نصاب کو دی جاتی ہیں باقی ۳۵ گھنٹیاں اسلامی علوم کو دی جاتی ہیں۔ اس راہ میں اب تک جس قدر قدم اُٹھے ہیں الحمد للہ نتیجہ خیز اور کامیاب ہیں۔ ابھی منزل تک پہنچنے میں چار سال ہیں۔ تعلیم کے سلسلے میں ان پانچ سالوں میں میں خود ہمہ تن مصروف رہا۔ ایک طرف تعمیر مسجد، دوسری دارالعلوم میں تعلیمی اور انتظامی مصروفیتیں معالم القرآن کی چلتی گاڑی میں رکاوٹ بن گئیں۔ ب الحمد للہ کچھ سکون ہُوا ہے۔ مسجد کا کام پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا ہے اور دارالعلوم میں تعلیم ے لیے اساتذہ کی ایک ٹیم دستیاب ہو گئی۔ اب انشاء اللہ اپنی زندگی کے تیسرے مقصد ی تکمیل کی طرف متوجہ ہو جاؤں گا۔ اس داستان کے سنانے کا منشا یہ ہے کہ میں معالم القرآن ا دیری کے لیے آپ کی جناب میں معذرت پیش کر دوں۔

گر قبول اُفتد زہے عزّ و شرف

اس جلد کی تالیف و ترتیب میں مجھے جن علمی چشموں سے اپنی تشنگی دور کرنے کا وقعہ ملا ہے وہ یہ ہیں:

ازالۃ الخفاء	حضرت حکیم الامت شاہ ولی اللہ
لوارق الغیب	حضرت مولانا محمد منظور نعمانی
حاشیہ بر کشاف	حضرت علامہ میر سید شریف
اظہار الحق	حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی

ہدایۃ الحیاری	حضرت حافظ ابن القیم الجوزی
سیرۃ النبی	مولانا شبلی نعمانی
بشائر النبیین	حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی
الجواب الکافی	حافظ ابن القیم الجوزی
الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح	حافظ ابن تیمیہ
الفرقان بین اولیاء الرحمٰن والشیطان	〃 〃 〃
بدائع الفوائد	حافظ ابن القیم
دلائل النبوۃ	مولانا نعیم الاصفہانی
جواب اہل الایمان	حافظ امام ابن تیمیہ
الکشاف	علامہ زمخشری

یہ اللہ سبحانہ کا بے پایاں انعام ہے کہ تفسیر کے لیے لوگوں میں طلب زیادہ ہے۔ اس کا اندازہ تفسیر پر کام کے خلا سے ہوا۔ اس عرصہ میں مختلف قسم کے خطوط آتے۔ ہر خط میں تفسیر کے لیے اپنے جذبات تھے۔ میں اللہ کی جناب میں دست بدعا ہوں کہ وہ باقی پاروں کی تشریح و تفسیر میں مجھے جادہ حق پر چلنے کی توفیق ارزانی فرمائے اور میری قدم قدم پہ مدد فرمائے کہ میرا قلم راہِ حق پہ استوار رہے۔

میری دلی خواہش ہے کہ جن بزرگوں کے فیضان سے دین سمجھا ہے ان کے علوم کو نہاں خانوں سے نکال کر شاہراہ عام پہ لاؤں۔ اللہ سے دعا فرمائیے کہ وہ مجھے اس کوشش میں کامیابی عطا فرمائے۔ آمین

محمد علی الصدیقی
دار العلوم الشہابیہ
سیالکوٹ

اصطلاحاتِ قرآنی

احیاء : مصدر ہے اس کے معنے زندہ کرنے اور جلانے کے ہیں۔ مجرد حیّ ہے جس کا مصدر حیاۃ ہے۔ حیاۃ کا استعمال مختلف معانی میں ہوتا ہے۔

۱۔ قوتِ نامیہ جو حیوانات اور نباتات میں ہوتی ہے

۲۔ قوتِ احساس جس کی وجہ سے حیوان کو حیوان کہا جاتا ہے ان الذی احیاھا لمحی الموتیٰ میں زمین کی زندگی سے اس کی شادابی مراد ہے اور مردوں کو زندہ کرنے سے قوتِ احساس کا عطا کرنا مراد ہے۔

۳۔ عقل کی قوتِ کارکردگی او من کان میتا فاحییناہ میں زندگی سے مراد عقل کی قوتِ کار کا عطا کرنا ہے۔

۴۔ بقائے فہم کے ساتھ ساتھ لذت اندوزی ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا بل احیاء میں زندگی سے مراد یہ ہے کہ ان میں فہم باقی ہے اور وہ اللہ کی نعمتوں سے لذت اندوز ہو رہے ہیں۔

۵۔ آخرت کی دائمی زندگی جیسے یالیتنی قدمت لحیاتی میں حیات سے حیاتِ اُخروی مراد ہے۔

۶۔ حیات جب اللہ سبحانہ کی صفت بن کر آتی ہے تو حی سے مراد وہ ذاتِ اقدس ہے جس کے متعلق کبھی موت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

۷۔ ہلاکت سے نجات دینا و من احیاھا فکانما احیا الناس جمیعاً میں حیات سے ہلاکت سے بچانا مراد ہے۔

استجابت :۔ جوب سے بابِ استفعال بنا ہے جواب کا طلب کرنا یا اس کے

لیے تیار ہونا۔ مراد حکم کو ماننا اور قبول کرنا۔ بالعموم اس کے ساتھ لام آتا ہے کبھی جواب دینے کے معنے میں بھی آتا ہے۔

استغاثہ: یہ غوث سے استفعال ہے۔ اس کے معنے مدد مانگنے اور فریاد کرنے کے ہیں۔ اسی سے اغاثہ مدد کرنے کے معنے میں ہے۔ توحید عبادت میں اس کی بے حد اہمیت ہے۔ استغاثہ اللہ سے کرنا چاہیے، اللہ کے سوا کسی بھی مخلوق کو غوث، مغیث اور غیاث نہ کہنا چاہیے اور نہ سمجھنا چاہیے۔

استدراج: درج سے مصدر بنا ہے۔ درجہ مرتبہ اور بلندی کے اعتبار سے مقام کو کہتے ہیں۔ درجہ عام سے مکان کی منزلوں کو بھی کہتے ہیں۔ زینے کی سیڑھیوں کو بھی کہتے ہیں سیڑھی کے ڈنڈوں کو بھی کہتے ہیں۔ اونچے مرتبہ کو بھی درجہ بولا جاتا ہے۔ استدراج کے معنے درجہ بدرجہ لے جانا ہیں۔ مراد یہ ہے کہ وہ آہستہ آہستہ بتدریج اس نتیجہ سے دوچار ہو کر رہیں گے جو تکذیب و سرکشی کا لازمی نتیجہ ہے۔ قرآن کی زبان میں امہال کے قانون کو استدراج کہتے ہیں۔ افراد میں اور جماعتوں میں اللہ کا قانون استدراج کام کرتا ہے۔ استدراج کے معنے کپڑے یا خط کو طے کر دینا بھی ہیں۔ یہاں مراد غافل بنا دینا ہیں۔

امی: عربی میں اُمی ایسے شخص کو کہتے ہیں جو اپنی پیدائشی حالت پر لکھنے پڑھنے اور علم و فن کی باتوں سے آشنا نہ ہو۔ اسی لیے عرب کے باشندے بھی اُمی کہلاتے کیونکہ تعلیم و تربیت سے وہ آشنا نہ تھے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو الاُمی فرمایا کیونکہ ظاہری تعلیم و تربیت کا آپ پر سایہ نہیں پڑا تھا۔ جو کچھ تھا سرچشمہ وحی کا فیضان تھا۔ قرآن نے یہاں آپ کو الاُمی فرما کر ایک طرف تو اپنے اعجاز کو ثابت کیا ہے اور دوسری طرف حضور کے اس معجزے کی طرف پوری انسانی دنیا کی توجہ دلائی ہے کہ باوجود اُمی ہونے کے کمالِ علوم سے سرفراز ہیں اور تیسری طرف چونکہ تورات کی بشارات حضور کے اس وصف کی طرف اشارہ ہے، اس لیے خصوصیت کے ساتھ اس وصف کے ساتھ آپ کا چہرہ پیش کیا۔ اس لحاظ سے لفظ اُمی حضور کے حق میں صفت مدح ہے دوسروں کے حق میں نہیں جیسے تکبر صرف ذات باری کے لیے صفت مدح ہے اور دوسروں کے لیے مذموم۔

اِلٰہ: بروزن فِعال ہے اِل سے بنا ہے جیسے اُم سے امام بنا ہے بمعنی اسم مفعول مألوہ۔ ہر قوم کے نزدیک جس کی پرستش و بندگی کی جائے وہ الٰہ ہے چاہے معبود برحق ہو یا معبود باطل۔

الٰہ کے معنے میں علمائے لغت کے مختلف اقوال ہیں مگر سب سے زیادہ قوی بات یہ ہے کہ اس کی اصل الہ ہے اور الہ کے معنے تحیّر اور درماندگی کے ہیں۔ اللہ سبحانہٗ کے لیے یہ لفظ اس لیے بولا گیا ہے کہ انسان جو کچھ جانتا ہے یا جان سکتا ہے وہ عقل کے تحیّر اور درماندگی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

امت :- ملت طریقہ، دین، ہر وہ جماعت جس میں کسی قسم کا کوئی رابطہ اشتراک موجود ہو اُسے اُمت کہا جاتا ہے۔ اسلام نے رابطہ اشتراک کو ایمان قرار دیا ہے۔ اصل میں یہ ام سے مشتق ہے۔ اسی سے امام بنا ہے ام کے معنے میں ایک قسم کی اکثریت پائی جاتی ہے، ام القریٰ دارالخلافہ کو کہتے ہیں۔ ام القرآن سورۃ فاتحہ کو کہتے ہیں کیونکہ قرآن کی تمام سورتوں کے لیے اس معنے کے لحاظ سے مرکزیت ہے کہ نماز میں قرآن کی ساری سورتیں اس کے پیچھے لگتی ہیں اور یہ خود کسی کے پیچھے نہیں لگتی ہے۔ ام الکتاب لوح محفوظ کو کہتے ہیں کیونکہ وہ تمام علوم کا سرچشمہ ہے۔ قرآن میں آیات محکمات چونکہ قرآن کی ساری تعلیمات کی خبر اور مرکز ہیں اس لیے اُمت وہ جماعت ہے جو ایمان وعمل میں مرکزی حیثیت رکھتی ہو۔ قرآن میں جہاں اہل ایمان کو اُمت کہا گیا ہے وہاں اُمت کے کسی وصف کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً اُمۃ وسط کہہ کر لتکونوا شھداء علی الناس فرمایا ہے۔ ایک جگہ اُمت کہہ کر یدعون الی الخیر کہا ہے۔ ایک مقام پر خیر امۃ کہہ کر اخرجت للناس تامرون بالمعروف الخ کہا ہے۔

باساء : بوس سے مشتق ہے۔ بوس کے معنے لڑائی، دبدبہ، سختی، آفت، جنگ کی شدت۔ اصل میں تو اس کے معنے سختی اور آفت کے ہیں مگر لڑائی اور غلبہ کے معنے میں اس کا استعمال بکثرت ہوتا ہے۔ اسی سے باساء اسم مونث ہے سختی اور فقر کے معنے ہیں۔ امام راغب نے دونوں میں تھوڑا سا فرق بتایا ہے۔ بوس تنگدستی اور جنگ میں زیادہ استعمال ہوتا ہے اور باساً سزاؤں کی سنگینی میں بولا جاتا ہے۔

ضراء :- یہ ضر سے مشتق ہے اور نفع کے مقابلہ میں اس کے معنے بدحالی، تکلیف، سختی، تنگی، بیماری، مصیبت کے آتے ہیں۔ باساء اور ضراء دونوں مونث ہیں۔ ان کا مذکر نہیں آتا۔ ضر کے معنے بدحالی کے آتے ہیں چاہے اپنے اندر ہو، علم وفضل اور عفت کی کمی کی وجہ سے یا بدن میں کسی عضو نہ ہونے کی وجہ سے ہو۔

طبع : کسی چیز کسی صورت کے اتارنے کو طبع کہتے ہیں جیسے میں تصویر

یہ لفظ ختم سے عام ہے اور نقش سے خاص ہے اور اسی اعتبار سے نفس پر کسی صورت کے نقش کا نام طبیعت ہے اور طبع السیف کے معنی تلوار کے زنگ آلود ہونے کے ہیں محاورہ سے رجل طبع وہ شخص جس کے اخلاق پست ہوں کہ کسی بے حیائی سے نہ شرماتا ہو۔ چنانچہ بعض علماء نے یطبع اللہ علی قلوب الکافرین میں طبع کو اس معنے میں لیا ہے اور معنے یہ بتاتے ہیں۔ اللہ نے ان کے دلوں کو زنگ آلود اور میلا کر دیا ہے۔ علامہ طاہر فتنی صاحب مجمع البحار میں فرماتے ہیں کہ طبع سکون کے ساتھ بمعنی ختم آتا ہے اور حرکت کے ساتھ زنگ آلود ہونے کے معنی میں ہے اور اصل میں یہ وہ میل ہے جو تلوار کو لگ جاتا ہے طبع السیف سے ماخوذ ہے۔ بعد ازیں گناہ اور برائیوں کے لیے استعمال ہونے لگا ہے۔ اصل میں یہ اللہ کے قانون اجتماعی کی طرف اشارہ ہے کہ انسان جب اعتقاد باطل اور ارتکاب حرام میں اس قدر جھوٹ اور بے لگام ہو جاتا ہے کہ کوئی تنبیہ اسے کارگر نہیں ہوتی اور کسی طرح اسے حق کی طرف توجہ نہیں ہوتی تو اس سے اس کی کچھ ایسی حالت ہو جاتی ہے کہ گناہوں کو اچھا سمجھنا اس کی طبیعت بن جاتی ہے اور گویا اس طرح اس دل پر مہر لگ جاتی ہے۔

طائف : وسوسہ خطرہ، پھر جانے والا۔ پھیرے والا پہلے معنے مجازی ہیں اور دوسرے حقیقی۔ طوف سے اسم فاعل ہے۔ طوف کے معنی کسی چیز کے گرد چکر کاٹنے کے ہیں۔ اسی لیے جو شخص گھروں کے ارد گرد چکر کاٹتا رہتا ہے، طائف کہلاتا ہے اور اسی سے جن، خیال، حادثہ وغیرہ کو بطور استعارہ طائف بولتے ہیں اذا مسھم طائف من الشیطان یعنی شیطان انسان پر چکر کاٹتا رہتا ہے اور اس کو شکار کرنا چاہتا ہے اس کا وسوسہ اثر کر گیا۔

رشد : ہدایت، صلاحیت، راہ یابی بھلا، راستی ہوشیاری، حسن تدبیر، رَشَد یرشُد کا مصدر ہے۔ اسی کے ہم معنے رَشَد بالفتح بھی آتا ہے لیکن دونوں میں فرق ہے امام راغب لکھتے ہیں۔ کچھ علماء کا خیال ہے کہ رَشَد رُشد سے خاص ہے۔ کیونکہ رُشد دنیوی اور اخروی دونوں کے لیے آتا ہے۔ اور رشد صرف امور اخروی کے لیے بولا جاتا ہے اور راشد و رشید دنیا و آخرت دونوں کے لیے آتے ہیں۔ سیدھی راہ، بھلائی کے راستہ کو سبیل الرشد اور سبیل الرشاد کہتے ہیں۔ اللہ سبحانہٗ کا قانون یہ ہے کہ جو لوگ سمجھ بوجھ سے کام لینے کی اپنے بڑوں کو اندھی تقلید کرتے رہتے ہیں اور اسی پر اڑے رہتے ہیں۔ آہستہ آہستہ ان کی

عقلیں ماری جاتی ہیں۔ کتنی بھی صاف بات کہی جائے ان کی سمجھ میں نہیں آئے گی، کتنی ہی ان کی بھلائی چاہو وہ اور زیادہ مخالفت کریں گے۔ قرآن نے اس حالت کو یوں تعبیر کیا وان یروا سبیل الرشد لا یتخذوہ سبیلاً اگر وہ ہدایت کی سیدھی راہ دیکھتے ہیں تو اسے نہیں اپناتے ہیں وان یروا سبیل الغی یتخذوہ سبیلاً اور اگر گمراہی کی ٹیڑھی راہ ان کے سامنے ہو تو خود اس سے استقبال کر لیں۔

غی : یہ غوی یغوی کا اسم معنے ہے اس کا مصدر غوایۃ ہے۔ غوایۃ اور ضلالت میں باریک سا فرق ہے۔ ضلالت ہوتی ہے اعمال میں اور غوایت ہوتی ہے افکار میں۔ قرآن میں حضور اقدس سے دونوں کی نفی کی گئی ما ضل صاحبکم وما غوی ضلالت کی ضد ہدایت ہے اور غوایت کی ضد رشاد ہے۔

سحر : جادو۔ ابوبکر الجصاص احکام القرآن میں رقمطراز ہیں کہ اہل لغت کا بیان ہے کہ سحر اصل میں اس چیز کو کہتے ہیں جس میں لطافت ہو اور جس کا سبب پوشیدہ ہو۔ اور سحر بالفتح بمعنے غذا ہے کیونکہ وہ مخفی ہوتی ہے اور اس کے مجاری لطیف ہوتے ہیں سحر پھیپھڑے کو بھی کہتے ہیں۔ امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں کہ سحر طرف حلقوم اور پھیپھڑے کو کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسی سے سحر بھی مشتق ہے۔ سحر مختلف معنے میں آتا ہے۔ ۱۔ دھوکہ دینا اور بے حقیقت خیالات کی تخلیق جیسے شعبدہ باز کرتا ہے۔ ارشادِ الٰہی سحروا اعین الناس اسی کے متعلق ہے۔ ۲۔ جنات و شیاطین سے کسی طرح کے تقرب کے ذریعے مدد لینا، ولکن الشیاطین کفروا یعلمون الناس السحر میں بھی اسی کا ذکر ہے۔ ۳۔ تیسرے معنے وہ ہیں جو عقل سے بیگانہ لوگ بناتے ہیں کہ وہ ایسے فعل کا نام ہے جس کے متعلق ان کا کہنا ہے کہ اس کے ذریعے صورتوں اور طبیعتوں کو بدلا جا سکتا ہے اور انسان کو گدھا بنایا جا سکتا ہے لیکن اہلِ علم کے نزدیک اس کی کچھ حقیقت نہیں ہے اور کبھی سحر کی تعبیر حسن و خوبی کو ظاہر کرنے کے لیے ہوتی ہے جیسے ان من البیان لسحرا اور کام کی باریکی اور لطافت بتانے کے لیے سحر بولتے ہیں جیسے حکما طبیعت کو ساحرہ اور غذا کو سحر کہتے ہیں کیونکہ بدنِ انسانی میں اس کا فعل دقیق اور اس کی تاثیر لطیف ہوتی ہے۔ سحر کی حقیقت کیا ہے یا اس موضوع پر حافظ ابوحیان اندلسی نے البحر المحیط میں، ابوبکر الجصاص نے احکام القرآن میں، اور امام فخر الدین رازی نے مفاتیح الغیب، علامہ ابن خلدون نے مقدمہ میں اور شاہ عبدالعزیز نے

تفسیر فتح العزیز میں بڑی سیر حاصل بحثیں کی ہیں۔

روحانی اصطلاحات

توکل علی اللہ
ایمان باللہ
توحید عبادت
تجلی پروردگار
اسماء حسنیٰ
اللہ کی ولایت
استعاذہ باللہ
قرآتِ قرآن
اللہ کی تسبیح
ذکر اللہ
اہلِ ایمان سے محبتِ خداوندی
اتقا اور اس کی طاقت
اللہ کی رفاقت اور کارسازی

علمی اصطلاحات

وراثتِ ارضی
خدا کی ہستی کا اعتقاد فطرتِ انسانی میں ہے
معرفت، کی دو راہیں فکر اور نظر
قانونِ امہال

سیاسی اصطلاحات

فتح

مالی اصطلاحات

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ
يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ
مِلَّتِنَا ؕ قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ ﴿٨٨﴾ قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ
كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰنَا اللّٰهُ مِنْهَا ؕ وَمَا
يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ؕ وَسِعَ رَبُّنَا
كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ؕ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ؕ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ
قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ ﴿٨٩﴾ وَقَالَ الْمَلَاُ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا اِنَّكُمْ اِذًا
لَّخٰسِرُوْنَ ﴿٩٠﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ
جٰثِمِيْنَ ﴿٩١﴾ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۛ مع
اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٩٢﴾ فَتَوَلّٰى
عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ
لَكُمْ ۚ فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴿٩٣﴾

قوم کے سرداروں نے جنہیں اپنی طاقت کا گھمنڈ تھا حضرت شعیبؑ سے کہا اے شعیب تجھے اور تیرے ساتھیوں کو جو تیرے ساتھ ایمان لاتے ہیں ہم اپنے شہر سے ضرور نکالیں گے یا پھر تمہیں ضرور ہماری ملت میں واپس آنا ہوگا[۱۱۶]۔ حضرت شعیب نے فرمایا اگر ہمیں تمہارے دین میں واپسی ناپسند و ناگوار ہو تو کیا پھر بھی ہم واپس ہو جائیں[۱۱۷]۔ اگر ہم تمہارے دین میں لوٹ جائیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اب تک خدا کے نام پر ہم نے جو کام کیا یہ جھوٹ بول کر ہم نے خدا پر بہتان اٹھایا حالانکہ اللہ نے ہمیں تمہاری ملت سے بچایا ہے[۱۱۸]۔ تمہارے دین میں واپس ہونا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے ہاں یہ کہ اللہ ہی چاہے جو ہمارا پروردگار ہے تو وہ جو چاہتا ہے ہو کر رہتا ہے ایسی کوئی چیز نہیں جو ہمارے رب کی علمی وسعتوں میں سمائی ہوئی نہ ہو، ہمارا تمام تر بھروسہ اللہ پر ہے اے ہمارے مولیٰ و آقا تو

ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کا فیصلہ فرما دے اور تو بہترین فیصلہ فرمانے والا ہے[119]۔ حضرت شعیب کی نبوت کے منکر قوم کے سرداروں نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا لوگو اگر تم نے شعیب کی پیروی کر لی تو بس سمجھ لو کہ تمہارا مستقبل گھاٹے والا ہے[120] بس آدبوچا اُن کو ایک لرزانے والی ہلاکت نے اور اس کے نتیجے میں وہ صبح کو اوندھے منہ پڑے تھے[121]۔ جن لوگوں نے شعیب کو جھٹلایا اُن کا حال یہ تھا کہ گویا وہ ان بستیوں کے کبھی آباد کار نہ تھے، شعیب کی تکذیب کرنے والے ہی تباہ ہونے والے تھے[122]۔

حضرت شعیب اُن سے الگ ہو گئے اور فرمایا میں نے اپنے رب کے پیغامات تمہیں پہنچا دیے اور میں نے تمہاری خیر خواہی کی تھی اس لیے اب میں نہ ماننے والوں پر کیسے افسوس کروں[123]۔

معانی مفردات

قریۃ واحد قریٰ جمع بستی اور بستی کے رہنے والے قُریٰ جمع قانونی نہیں۔ سماعی ہے کیونکہ فعلۃ کی قیاسی جمع فعال آتی ہے جیسے ظبیۃ کی جمع ظباء کچھ علمائے لغت کی رائے ہے کہ یمن والے اس لفظ کو قریہ بولتے ہیں۔ اس کی جمع قری قیاسی ہے جیسے ذِروۃ کی جمع ذری ہے۔ بہرحال قرآن میں قریہ آیا ہے اور یہی فصیح ہے۔ اس کے مقابلے میں یمنی استعمال فصیح نہیں ہے۔ لغت میں قریٰ کے معنے جمع کرنا ہیں۔ قریت الماء فی الحوض میں نے حوض میں پانی جمع کر دیا۔ بستی میں چونکہ آدمی جمع ہوتے ہیں اس لیے اس کو قریہ کہتے ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ دونوں معانی کے لیے مستعمل ہے۔ بستی اور بستی کے باشندے جہاں اہل یا اس کا ہم معنے موجود نہیں ہے وہاں قریہ یا قری سے مراد بستی ہے اور جہاں اہل کا لفظ موجود ہے وہاں قریہ یا قریٰ سے مراد بستی کے باشندے ہیں۔

ملۃ، امام راغب نے المفردات میں لکھا ہے کہ دین کی طرح ملت بھی اس دستورِ الٰہی کا نام ہے جو اللہ اپنے بندوں پر جاری فرماتا ہے تاکہ وہ اس پر چل کر قربِ خداوندی حاصل کر سکیں۔ اور یہ دستور انبیاؑ کی وساطت سے بندوں تک پہنچتا ہے لیکن قرآن مجید میں لفظ ملت کا اطلاق کئی جگہ مذہب پر بھی ہوا ہے جو خود انسانوں کا تراشیدہ تھا دستورِ الٰہی پر مبنی نہ تھا۔ حضرت یوسفؑ نے جیل کے دونوں قیدیوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا انی ترکت ملۃ قوم لایومنون باللہ، شاید امام راغب کی مراد یہ ہو کہ ملت تو اس دستورِ الٰہی کا ہی نام ہے جو انبیاؑ کی معرفت بھیجا جاتا ہے لیکن اگر انسانی دماغ اس میں خورد بُرد کر لیں اور بگاڑ دیں تب بھی بطورِ مجاز اس پر لفظ ملت کا اطلاق ہوتا ہے۔ امام راغب نے دین و ملت کا فرق ظاہر کرتے ہوتے لکھا ہے کہ لفظ ملت کی اضافت صرف انبیاء کی طرف ہوتی ہے کسی غیر نبی کی طرف نہیں ہوتی اور نہ اللہ کی طرف ہوتی ہے اسی لیے ملۃ اللہ یا ملۃ زید یا ملتی نہیں بولتے ہاں دین کا استعمال عام دین اللہ، دین الانبیاء بولا جاتا ہے۔

اربابِ اقتدار کا حضرت شعیب کو چیلنج

پہلی آیت میں حضرت شعیب نے یہ کہہ کر حتی یحکم اللہ بیننا ایک سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ

کیا ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک شکل تو یہ ہوتی ہے کہ قوم کی غالب اکثریت رسُول کی دعوت کا انکار کردیتی ہے اور اس انکار پر اڑ جاتی ہے۔ ایسی صورت میں یہ بات جلد واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ یہ قوم ایمان کی صلاحیت سے بالکل خالی ہے پھر اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر عذاب بھی جلد آجاتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ قوم کے اندر سے ایک گروہ ایمان لاتا ہے۔ دوسرا گروہ اس کی مخالفت کرتا ہے۔ یہ صورت اس بات کی قرینہ ہوتی ہے کہ اس قوم کے اندر کچھ صلاحیت ہوتی ہے ہو سکتا ہے کہ اس پر کچھ زیادہ محنت کی جاتے تو اس میں سے کچھ افراد دعوتِ حق کو قبول کرلیں۔ اللہ سبحانہٗ کی ذات اپنے بندوں پر غایت درجہ پر مہربان ہے اس لیے وہ ایسی صورت میں قوم کو مہلت دیتا ہے تاکہ نبوت کو ان میں جی کھول کر کام کا موقعہ ملتا ہے نبوّت کا کام پورا ہو جانے کے بعد اللہ سبحانہٗ اس قوم کا فیصلہ فرما دیتا ہے اس سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ قوم کو یہ مہلت ان صالحین کی برکت سے ملتی ہے جو اللہ کے رسُول کی دعوت کو قبول کر لیتے ہیں۔ حضرت شعیب نے اس قانون کو پیش کر کے اشارۃً بتا دیا کہ عذاب کی گھڑی آرہی ہے دیر ہے اندھیر نہیں ہے اس لیے انتظار کرو یہ سُن کر ان کے اقتداری حلقہ میں جوش آیا اور حضرت شعیب کو دھمکیاں دینے لگے۔ یہاں حضرت شعیب نے جب اس قانونِ الہٰی کا ذکر کر کے فرمایا فاصبروا انتظار کرو تو معاً ذہن میں یہ سوال ابھرا کہ پھر قوم نے کیا کہا۔ ان آیات میں اسی سوال کا جواب ہے۔

۱۱۶۔ قوم کے سرداروں نے جنہیں اپنی طاقت کا گھمنڈ تھا حضرت شعیب سے کہا اے شعیب تجھے اور تیرے ساتھیوں کو جو تیرے ساتھ ایمان لاتے ہیں ہم اپنے شہر سے ضرور نکال دیں گے یا پھر تمہیں ضرور ہماری ملت میں واپس آنا ہوگا۔ عود کے معنے کسی چیز سے نکل کر دوبارہ اس کی طرف چلنے کے ہیں۔ حضرت شعیب کے ساتھیوں کی نسبت تو یہ لفظ حقیقۃً صادق ہو سکتا ہے کیونکہ وہ لوگ کفر سے نکل کر اسلام میں داخل ہوتے تھے۔ باقی خود حضرت شعیب علیہ السلام کی نسبت یہ تصور نہیں ہو سکتا کہ وہ معاذ اللہ پہلے ملت کفار میں داخل تھے پھر مسلمان ہوتے۔ لامحالہ یا تو ان کے اعتبار سے یہ خطاب تغلیباً ہوگا یعنی عام مومنین کے حق میں جو الفاظ استعمال ہوتے اکثریت غالبہ کو مرجح سمجھ کر حضرت شعیب کے لیے علیحدہ الفاظ اختیار نہیں کیے اور یا یہ لفظ ان کے حق میں کفار کے زعم کے موافق کہا گیا کیونکہ بعثت سے پہلے جب تک حضرت شعیب نے دعوت و تبلیغ شروع نہ کی تھی اہل مدین کے متعلق ان کی خاموشی دیکھ کر شاید وہ یہی گمان کرتے ہیں کہ یہ بھی ہمارے شامل حال اور ہمارے طور طریقے پر راضی ہیں اور یا عود کو مجازاً صیرورۃ مطلق کے معنے میں

لیا جاتے جیسا کہ بعض مفسرین کی رائے ہے لہ

شارحین قرآن کی رائے عامہ نے یہاں اس سوال کی اہمیت کو بے حد محسوس کیا ہے جس کی طرف شیخ الاسلام نے اختصار کے ساتھ اشارہ کیا ہے۔ یعنی دوبارہ ان کی ملت میں لوٹنے والی بات مومنین کی حد تک تو صحیح ہے مگر شعیب علیہ السلام کے حق میں یہ صحیح نہیں کیونکہ شعیب نبی تھے اور انبیاء سے کبھی کفر صادر نہیں ہوتا اس لیے حضرت شعیب کے متعلق او لتعودن فی ملتنا کہنا درست نہیں ہے۔ اس سوال کی گرفت سے بچنے کے لیے شارحین قرآن نے مختلف راہیں بتائی ہیں۔ قاضی بیضاوی، علامہ آلوسی، شہاب خفاجی اور ابوحیان الاندلسی نے اسے تغلیب قرار دیا ہے۔ یعنی اصل بات حضرت شعیب کے ساتھیوں کے بارے میں کہی گئی ہے لیکن سب کے ساتھ حضرت شعیب کو بھی تغلیباً داخل کر لیا گیا ہے۔ آلوسی لکھتے ہیں فاسنادہ الیہ علیہ السلام من باب التغلیب اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ آغاز کلام میں لنخرجنك یا شعیب میں صرف حضرت شعیب کو مخاطب کیا لیکن تغلیباً ان کے پیروکار بھی مخاطب ہیں۔ الخفاجی نے اسی لیے لکھا ہے فی الایۃ تغلیبان اور کچھ یہ کہتے ہیں کہ آیت میں لتعودن اپنے معنے میں نہیں ہے بلکہ لتصیرن کے معنے میں ہے اور مطلب یہ ہے کہ تم ہمارے مذہب ہو جاؤ۔ اور کچھ کہتے ہیں کہ یہ بات قوم شعیب نے اپنے خیال کے مطابق کہی ہے۔ ظاہر ہے کہ پیغمبر بعثت سے پہلے اپنے یہاں کے موروثی مذہب کی مخالفت نہیں کرتا ہے اور اس لیے لوگ قدرتاً اسے اپنا ہم مذہب سمجھتے ہیں اس لیے لوگوں نے اپنے اسی خیال کے مطابق حضرت شعیب سے یہ بات کہی ہے لیکن اصل یہ ہے کہ یہاں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ یہ تو خواہ مخواہ اپیچ ہے۔ کہنے والے حضرت شعیب کی نبوت کو مانتے ہی نہیں اور نہ شعیب علیہ السلام نے نبی ہونے سے پہلے ان سے ایسی بات کہی ہے جس سے ان کا ان سے علیحدہ ہونا معلوم ہوتا بے شک ان کی برائیوں سے الگ تھلگ خاموش زندگی گزارتے تھے۔ منصب نبوت پر فائز ہونے کے بعد آپ نے موروثی افکار و اعمال کے خلاف آواز اٹھائی۔ اس سے پہلے عام شہریوں کی طرح لوگ ان کو بھی ایک شہری سمجھتے تھے اور ان کی خاموش زندگی کو اپنا حریف نہیں بلکہ حلیف تصور کرتے تھے اس لیے بات واضح ہے، اس میں تغلیب وغیرہ کی تاویل کی حاجت نہیں اور خود حضرت شعیب کا جواب بھی اس تاویل کو

لہ افادات شیخ الاسلام

بے مزہ کر رہا ہے۔
آیت کا مطلب یہ ہے کہ قوم شعیب کے طاقتور طبقہ نے حضرت شعیب اور ان کے ساتھیوں کو آخری دھمکی دی کہ قسم کھا کر پورے زور سے کہتے ہیں کہ یا تو تم ہماری ملت میں واپس آجاؤ ورنہ ہم تم کو اور تمہارے ساتھیوں کو اپنے ملک سے نکال دیں گے۔ اور استبداد کا دامن جب دلائل سے خالی ہو جاتا ہے وہ اسی قسم کی دھمکیوں پر اتر آتا ہے۔ یہاں تو صرف ملک بدر کرنے کی دھمکی دی ہے سورہ ہود میں قرآن نے ان کی یہ دھمکی بھی نقل کی ہے ولولا رھطک لرجمناک وما انت علینا بعزیز۔ اگر تمہارے ساتھ تمہاری برادری کے آدمی نہ ہوتے تو ہم تمہیں سنگسار کر دیتے تمہاری ہمارے سامنے کوئی ہستی نہیں ہے۔ یہ دونوں دھمکیاں حضرت شعیب کو قوم نے مختلف اوقات میں دی ہیں۔ اور آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ بعینہٖ یہی صورتِ حال سورہ اعراف کے نزول کے وقت مکہ میں درپیش تھی۔ اس وقت قریش کے لوگ بھی اسی طرح حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے خون کے پیاسے تھے اور چاہتے تھے کہ آپ کی زندگی کا خاتمہ کر دیں لیکن اس وجہ سے آپ پر ہاتھ ڈالتے ہوئے ڈرتے تھے کہ بنی ہاشم آپ کی پشت پر تھے۔ اسی پارے کے آخر میں پڑھو گے۔

واذ یمکر بک الذین کفروا لیثبتوک او یقتلوک او یخرجوک،

وہ وقت یاد کرو جب منکرین سازشیں کر رہے تھے آپ کو قید کر دیں یا قتل کر ڈالیں یا جلاوطن کر دیں۔

بہرحال قوم نے حضرتِ شعیب کے سامنے دلیل کی قوت سے عاجز ہو کر طاقت کا سہارا لیا، اور ان سے کہا کہ اگر تمہیں یہاں رہنا ہے تو ہماری ملت اپنا کر رہو اور اگر ملت کو نہیں اپنانا ہے تو پھر یہاں سے بستر گول کرو۔ یعنی دونوں باتوں میں سے ایک کو قبول کرو۔ یہاں قاری کے ذہن میں پھر سوال ابھرتا ہے کہ اس کے جواب میں حضرت شعیب نے کیا کہا۔ قرآن نے آگے اسی کو نقل کیا ہے۔

وطنیت اور قومیت کا بت

۱۱۔ حضرت شعیب نے فرمایا اگر ہمیں تمہارے دین میں واپسی ناپسند و ناگوار ہو تو کیا پھر بھی ہم واپس ہو جائیں۔ یعنی دلائل و براہین کی روشنی میں تمہاری ان مہلک کفریات سے خواہ ہم کتنے ہی بیزار اور کارہ ہوں کیا تم پھر بھی یہ زہر کا پیالہ ہمیں زبردستی پلانا چاہتے ہو۔ مطلب یہ ہے کہ

کیا تم اپنی ملت میں لوٹنے پر ہماری خواہش اور ارادے کے خلاف ہمیں مجبور کرو گے ۔ آیت میں استفہام انکاری اور لو وصلیہ ہے ۔ یعنی کیا تم ہمیں اپنے دین میں لوٹ آنے کا حکم دے رہے ہو ۔ اور شہر بدر کرنے کی دھمکی دے رہے ہو خواہ یہ دونوں باتیں ہمیں کیسی ناگوار ہوں ۔ تم عجیب نادان ہو اور دین و ایمان کی حقیقت سے بے خبر ہو کر وطنیت اور قومیت سے اس کا مقابلہ کر رہے ہو اور اس نادانی میں تم ہم سے کہہ رہے ہو کہ وطن اور مذہب کے نام پر بنتے ہوئے قوم کے گھروندے کو دین و ایمان کے مقابلے میں اپنائیں اور دینِ حق کے مقابلے میں وطن اور قوم کو ترجیح دیں ۔ قومِ شعیب میں دین ایک موروثی رابطہ اور قومی عصبیت کا نام تھا ۔ خواہ افرادِ قوم کا کردار کچھ ہو ۔ نبوت جو دین لے کر آتی ہے اس کی حیثیت اس سے بالکل جدا ہوتی ہے ۔ نبوت کے لاتے ہوئے دین کا جب بھی قومیت اور وطنیت سے مقابلہ ہوتا ہے تو نبوت رابطہ ایمان کو ترجیح دیتی ہے اور اس کے مقابلہ میں وطنیت اور قومیت کو قربان کر دیتی ہے ۔ ایمان کے مقابلہ میں وطن و قوم کی قربانی انبیاء کا دستور رہا ہے ۔ حضرت ابراہیم ، حضرت لوط اور خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اس کی مثالیں موجود ہیں ۔

کچھ شارحینِ قرآن نے اس فقرے کا یہ مطلب بتایا ہے کہ کیا تم شہر اور ہمارے وطن سے کسی ایسے جرم کے بغیر نکال دو گے جو وطن کا اخراج چاہتا ہے خواہ ہمیں اپنے وطن کی جدائی کیسی ناپسند ہو اور ہم وطن میں رہنے کو خواہ پسند کریں ۔ اس مطلب میں نہ کوئی معنویت اور نہ یہ حضرت شعیب کے باقی جواب سے کوئی مناسبت رکھتا ہے ۔ آیت واضح طور پر بتا رہی ہے کہ حضرت شعیب نے وطن سے نکالے جانے کو قطعاً نظر انداز کر دیا لیکن ان کی دوسری دھمکی کا نوٹس لیا اور اس کا جواب بڑے واضح اور قطعی لفظوں میں دیا ہے ۔

ملتِ کفر سے انتہائی بیزاری

۱۱۸ ۔ اگر ہم تمہارے دین میں لوٹ جائیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اب تک خدا کے نام پر ہم نے جو کام کیا یہ جھوٹ بولا کہ ہم نے خدا پر بہتان اٹھایا باوجودیکہ اللہ نے ہمیں تمہاری ملت سے بچایا ہے ۔ باطل اور جھوٹے مذہب کو سچا کہنا ہی خدا پر افتراء کرنا اور بہتان باندھنا ہے ۔ پھر بھلا ایک جلیل القدر نبی اور اس کے مخلص متبعین سے یہ کب ممکن ہے کہ وہ معاذاللہ سچائی سے نکل کر جھوٹ کی طرف واپس جائیں اور جو سچے دعوے اپنی حقانیت یا مامور من اللہ ہونے کے کر رہے تھے ۔ ان

سب کا بھی جھوٹ اور افتراء ہونا تسلیم کریں اور بعد اذ نجانا اللہ کا مطلب یہ ہے کہ باوجودیکہ ہم کو اللہ نے اس سے بچالیا کسی کو تو ابتدائً نجات دے چکا کہ اس میں داخل ہی نہ ہونے دیا جیسے حضرت شعیب اور بعضوں کو داخل ہونے کے بعد اس سے نکالا جیسے عام مومنین لے

دراصل یہ جملہ انشائیہ ہے خبریہ نہیں۔ اگرچہ بصورت خبر ہے قسم کے ذریعے اس کو موکد کیا گیا ہے اس میں جن دو باتوں کی انہوں نے پیش کش کی تھی ان میں سے دوسری بات کو کہ ہمارے ملت میں لوٹ آؤ اس کا رد کیا ہے اور ملت کفر سے انتہائی بیزاری کا اعلان ہے جیسے بولتے ہیں اگر میں یہ کام کر دوں تو میں خدا کی رحمت سے دور رہوں یا ذمہ سے بری ہوں۔ یہ بھی قسم ہی کی ایک صورت ہے۔ قوم شعیب نے بھی حضرت شعیب کو قسم کھا کر لتنخ جنگ کی دھمکی دی تھی۔ حضرت نے بھی قسم کے جواب میں قسم کھا کر فرمایا قد افترینا علی اللہ کذباً اور قسم کو قد اور فعل ماضی لا کر زوردار بنایا۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے باوجود کہ اللہ نے ہمیں تمہارے دین کے اس گھر دندے سے بچالیا ہے اور ہمیں اپنی خاص رحمت سے صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق ارزانی فرمادی ہے پھر بھی ہم اگر تمہاری ملت میں داخل ہوجائیں تو ہم سے زیادہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان طراز اور کون ہوگا۔ اول تو ہر کافر اللہ کے بارے میں بے پر کی اڑا کر مفتری علی اللہ کذباً ہے اور پھر ہم صراط مستقیم کو جان کر اگر راہ ارتداد اختیار کریں تو ہمارے جرم کی سنگینی تو اصل کافر سے بھی زیادہ ہوگی۔ یہ تو علم کے بعد انکار حق اور کفر جحود ہوگا۔ اور کفر کی تمام قسموں میں یہ بدترین قسم ہے۔ اسی بنا پر شریعت میں ارتداد کی سزا بر نسبت کفر کے سنگین ہے۔ حضرت شعیب نے اول تو اس ملت کو افتراء علی اللہ کذباً قرار دیا گویا جھوٹ کا پلندہ جس کو بالکل بے سند خدا کی طرف منسوب کر دیا دوسرے فرمایا کہ جب اللہ نے اپنے فضل وکرم سے اس لعنت سے ہمیں بچالیا تو پھر اس لعنت میں اگر ہم پڑ جائیں تو پھر ہم سے بڑا مفتری علی اللہ کون ہوگا۔

اس کا ایک دوسرا مطلب یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اگر ہم تمہاری ملت میں اس سے بچنے کے بعد واپس آجائیں تو اس کا مطلب صاف یہ ہے کہ اب تک ہم نے اللہ کا نام لے کر جو کام کیا ہے وہ سب افتراء علی اللہ کذباً ہے اور فی الواقع ہم خدا کی جانب سے جو بات بتاتے ہیں وہ خدا کی نہیں بلکہ ہماری گھڑی ہوئی ہے معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔ شیخ الاسلام نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ امام ثوری اور ابن جریر نے بھی یہی مطلب اختیار کیا ہے مگر ابو حیان اندلسی اور مشہور مفسر ابن عطیہ نے پہلے مطلب

لے افادات شیخ الاسلام

کو راجح قرار دیا ہے اور دونوں صحیح ہیں۔

ایمان پر عزم کا اظہار اور تفویض الی اللہ

۱۱۹۔ تمہارے دین میں واپس ہونا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے ہاں یہ کہ اللہ ہی چاہے جو ہمارا پروردگار ہے تو وہ جو چاہے ہو کر رہتا ہے۔ ایسی کوئی چیز نہیں جو ہمارے رب کی علمی وسعتوں میں سمائی ہوئی نہ ہو۔ ہمارا تمام تر بھروسہ اللہ پر ہے۔ اے ہمارے مولیٰ و آقا تو ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کا فیصلہ فرما دے تو بہترین فیصلہ فرمانے والا ہے۔ یعنی اپنے اختیار یا تمہارے احیا و اکراہ سے ممکن نہیں کہ ہم معاذ اللہ کفر کی طرف جائیں۔ ہاں اگر فرض کرو خدا ہی کی مشیت ہم میں سے کسی کی نسبت ایسی ہو جاتے تو اس کے ارادے کو کون روک سکتا ہے۔ اگر اس کی حکمت اسی کو مقتضی ہو تو وہاں کوئی نہیں بول سکتا کیونکہ اسی کا علم تمام مصالح اور حکمتوں پر محیط ہے۔ بہرحال تمہاری دھمکیوں سے ہمیں کوئی خوف نہیں۔ کیونکہ ہمارا بالکلیہ اعتماد اور بھروسہ اپنے خدائے واحد پر ہے۔ کسی کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا جو ہوگا اسی کی مشیت اور علم محیط کے تحت ہوگا۔ اسی لیے ہم اپنے اور تمہارے فیصلہ کے لیے بھی اسی سے دعا کرتے ہیں کیونکہ ایسے قادر اور علیم و حکیم سے بہتر کسی کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ حضرت شعیب کے ان الفاظ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انبیاؑ کے قلوب حق تعالیٰ کی عظمت و جبروت اور اپنی عبودیت و افتقار کے کس قدر عظیم و عمیق احساس سے معمور ہوتے ہیں اور کس طرح ہر آن ہر لمحہ اور ہر حال میں ان کا توکل و اعتماد تمام وسائط سے منقطع ہو کر اسی وحدہٗ لاشریک پر پہاڑ سے زیادہ مضبوط اور غیر متزلزل ہوتا ہے۔ [1]

اس فقرے کے ذریعے بھی حضرت شعیب علیہ السلام نے قوم کے مطالبہ پر ان کے مذہب میں واپسی کو بلیغ ترین انداز میں رد کیا ہے۔ اور رد بھی نفی فعل کے ذریعے نہیں بلکہ نفی شان کے ذریعے کیا ہے۔ اُردو میں اگر ہم یوں کہیں کہ میں یہ نہ کروں گا یہ نفی فعل ہے اور اگر یوں کہیں کہ ایسا کرنا میرے بس سے باہر ہے تو یہ پہلے فقرے سے انکار و نفی میں زیادہ بلیغ ہے۔ پہلے میں سادہ انکار ہے لیکن دوسرے میں انکار مدلل ہے، بس میں نہ ہو اس کی دلیل ہے۔ عربی میں اگر لا نعود کہیں گے تو یہ سادہ انکار ہوگا اور اگر ما یکون لنا ان نعود فیھا کہیں گے تو یہ انکار بلیغ اور مؤثر

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہو گا۔ مطلب یہ ہے کہ جہاں تک ہمارا تعلق ہے یہ صاف سن لو کہ تمہاری ملت میں واپس آنے کا کوئی امکان نہیں یہ ہمارے بس سے باہر اور ہماری شان کے خلاف ہے اس لیے کسی حال میں بھی ایسا نہیں ہو سکتا۔ چونکہ اس میں اپنے لیے ایک قسم کا ادعا تھا اس لیے فوراً فرمایا الا ان یشاء اللہ ربنا لیکن ہاں اللہ کی مشیت سب پر غالب ہے اس کی آزمائشوں پر کامیاب اترنا اسی کی بخشی ہوئی توفیق پر منحصر ہے۔ یہ صرف اسی کو علم ہے کہ کس کا کیا مقدر ہے۔ اس کو ہر قسم کی قدرت ہے اس کے علاوہ کوئی قادر نہیں نہ تم قادر ہو نہ ہم قادر ہیں۔ ہمیں یقین کامل ہے کہ تمہاری ملت سر تا سر باطل ہے اور ہماری ملت سر تا سر حق ہے اور کوئی شخص اپنے یقین کو نہ بدل سکتا ہے اور نہ اسے ہٹا سکتا ہے۔ یہ کام تو صرف اللہ سبحانہ کا ہے وہ ہی مقلب القلوب ہے اور کائنات میں سب کچھ اسی کی مشیت کے تابع ہے۔ کیونکہ سب کا علم ناقص ہے اس کا علم ہر چیز کو اپنے احاطہ میں لیے ہوئے ہے یہ وہ ہی جانتا ہے کہ ایمان و کفر، ہدایت و ضلالت، صلاح و فساد کے اسباب کیا ہیں اور اس کی مشیت اس کے علم و حکمت کے مطابق ہوتی ہے۔ یہ استثناء انکار میں زور پیدا کرنے کے لیے لایا گیا ہے۔ بعینہٖ یہی بات سیدنا ابراہیم نے بھی فرمائی تھی۔ سورہ انعام میں گزر چکا ہے۔

لا اخاف ما تشرکون بہ الا ان یشاء ربی شیئاً،

میں ان چیزوں سے نہیں ڈرتا جن کو تم خدا کا شریک کرتے ہو مگر یہ کہ میرا رب ہی کوئی بات چاہے۔

آئیے اس موضوع پر دوسرے علماء کے افکار بھی پڑھ لیجئے:

مولانا ادریس فرماتے ہیں:

مطلب یہ ہے کہ جب ہم کفر کی قباحت اور شناعت اور اس کے انجام بد سے بخوبی واقف ہیں تو پھر کفر کیونکہ اختیار کر سکتے ہیں ہاں اگر اللہ ہی کو ہماری ہدایت منظور نہ ہو اور اس نے ہماری قسمت میں کفر لکھ دیا ہو تو ہم مجبور ہیں۔ اشارہ اس طرف ہے کہ ہدایت اور گمراہی سب اللہ ہی کی طرف سے ہے اور اس کی مشیت انسان کے ارادے پر غالب ہے۔ انسان کی سعادت و شقاوت اس کے اختیار میں نہیں۔ دل جو تمام افعالِ انسانی کا محرک ہے وہ خدا ہی کے قبضہ میں ہے ۔

معارف القرآن ۔

مفتی محمد شفیع صاحب فرماتے ہیں :

حضرت شعیب علیہ السلام کے اس قول میں ایک قسم کا دعویٰ تھا کہ ہم اب تمہارے مذہب میں پھر واپس نہیں آ سکتے اور ایسا دعویٰ بظاہر عبدیت کے خلاف ہے جو مقربان بارگاہِ الٰہی اور اہلِ معرفت کی شایانِ شان نہیں اس لیے فرمایا الا ان یشاء اللہ ربنا اس میں اپنے عجز وضعف کا اظہار اور اللہ تعالیٰ پر توکل وتفویض ہے جو کمالاتِ نبوت میں سے ہے[1]

مولانا دریا بادی فرماتے ہیں :

عارف ہمیشہ تقدیر الٰہی کے سامنے لرزاں وترساں رہتا ہے پہلے تو اپنا ارادہ مضبوطی کے ساتھ ظاہر کر دیا کہ ہم ہرگز کفر اختیار نہ کریں گے لیکن یہ ایک صورت دعویٰ اور اثبات خودی کی تھی اس لیے معاً یہ جزء بھی اضافہ کر دیا۔ عام مومنین کے لیے تو اس کا دھڑکا اور احتمال ہر وقت ہی لگا رہتا ہے باقی خود پیغمبر کا اپنے لیے یہ کہنا اظہارِ عبدیت کے لیے ہے جو کمالاتِ نبوت کے لوازم میں سے ہے اور اکابر انبیاء سے ایسے ہی کلمات برابر منقول ہیں۔[2]

مولانا مودودی فرماتے ہیں :

یہ فقرہ اسی معنے میں ہے جس میں ان شاء اللہ بولا جاتا ہے اور جس کے بارے میں سورہ کہف میں ہے کہ کسی چیز کے متعلق دعوے کے ساتھ یہ نہ کہہ دیا کرو کہ میں ایسا کر دوں گا بلکہ اس طرح کہا کرو کہ اگر اللہ چاہے گا تو ایسا کر دوں گا اس لیے کہ مومن جو اللہ تعالیٰ کی سلطانی و بادشاہی اور اپنی بندگی وتابعیت کا ٹھیک ٹھیک ادراک رکھتا ہے کبھی اپنے بل بوتے پر یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں فلاں بات کر کے رہوں گا یا فلاں حرکت ہرگز نہ کروں گا بلکہ وہ جب کہے گا تو یوں کہے گا کہ میرا ارادہ ایسا کرنے یا نہ کرنے کا ہے لیکن میرے اس ارادے کا پورا ہونا میرے مالک کی مشیت پر موقوف ہے وہ توفیق بخشے گا۔ تو میں اس میں کامیاب ہوں گا ورنہ ناکام رہ جاؤں گا۔[3]

مولانا اصلاحی فرماتے ہیں :

اس فقرے کے پہلے ٹکڑے میں اپنے عزم کا اظہار اور دوسرے میں تفویض الی اللہ ہے۔ اور یہی عزم اور تفویض توحید کی حقیقت ہے۔ ارشاد کا مدعا یہ ہے کہ جہاں تک ہمارا تعلق ہے یہ سن لو کہ اب تمہاری ملت میں واپس آنے کا کوئی امکان نہیں ہے لیکن اللہ کی مشیت ہر چیز پر غالب ہے۔

---

[1] معارف [2] ماجدی [3] تفہیم

اس کی آزمائشوں میں پورا اترنا اسی کی بخشی ہوئی توفیق پر منحصر ہے یہ صرف اسی کو علم ہے کہ کس کے لیے کیا مقدر ہے اور کس کا انجام کیا ہونا ہے۔ [۱]

پیر محمد کرم شاہ صاحب ایم اے سجادہ نشین بھیرہ فرماتے ہیں:

پہلے اپنا پختہ ارادہ اور عزم بتایا کہ ہم راہِ راست کو کسی قیمت پر چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور اس کے لیے بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنے کو تیار ہیں لیکن اس میں خودی کی بُو آ رہی تھی اس لیے فوراً اپنے عزم وارادے کی بے بسی کا اعتراف کیا اور ہر چیز اپنے مولائے حقیقی کے حوالہ کر دی۔ یعنی ہمارا راہ حق پر ثابت قدم رہنا اسی وقت تک ہے جب تک اس کی نظرِ کرم اور توفیق شاملِ حال رہے ورنہ ہماری سمجھ، نیکی اور تقوی کسی کام نہیں آ سکتے۔ سبحان اللہ کیا مقام ہے پیغمبر کا بارگاہِ ربانی میں اتنی عزت اور توقیر کے باوجود دل ہر لمحے اپنے مالک کی بے نیازی سے لرزاں و ترساں ہے۔ مومن کی کیفیت بھی ایسی ہونی چاہیے کہ اپنی ہر نیکی کو اپنے رب کا فضل تصور کرے اور اپنے علم، عمل اور تقوی پر غرور گھمنڈ نہ کرے اور ہر لغزش سے اس کی پناہ مانگتا رہے۔ [۲]

آئیے ذرا ان سے پیشتر شارحین قرآن کے تفسیری علوم سے استفادہ فرمائیے۔ مشہور مفسر قرآن واحدی فرماتے ہیں:

اس آیت میں اہل علم وسنت کا موقف یہ ہے کہ حضرت شعیب اور ان کے صحابہ کرام نے فرمایا کہ یہ جاننے کے بعد کہ تمہاری ملت سر تا سر ضلالت اور گمراہی ہے ہم تمہاری ملت میں واپس نہیں آ سکتے الا یہ کہ اللہ ہی ہمارے ہلاک کرنے کا ارادہ فرمائے کیونکہ سارے امور کا مرجع اللہ کی ذات ہے۔ اس کی دسترس سے کوئی چیز باہر نہیں ہے وہ جسے چاہتا ہے طاعت کی توفیق دے کر صالح وسعید بنا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے معصیت کے ذریعہ ہلاک کر دیتا ہے اور یہ شعیب علیہ السلام کی جانب سے اپنے لیے مشیت الہی کے لیے سپردگی ہے۔ سارے انبیاء اور اکابر ہمیشہ انجام سے لرزاں رہے ہیں۔ حضرت ابراہیم کی اس دعا کو دیکھو واجنبنی وبنی ان نعبد الاصنام حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیشتر یہ دعا ہوتی تھی اللھم مقلب القلوب ثبت قلبی علی دینک۔ [۳]

علامہ ناصر الدین الانتصاف میں فرماتے ہیں:

اس میں انجام کے بارے میں اپنے علم کی کوتاہی کا اقرار اور امورِ غائبہ کے متعلق بے خبری کا اعتراف

---

[۱] تدبر قرآن [۲] ضیاء القرآن [۳] تفسیر کبیر۔

ہے۔ کیونکہ قدرتِ الٰہی میں یہ بات داخل ہے کہ کوئی کفر کی طرف پلٹ جاتے۔ اگر ایسا ہو تو یہ اللہ کی قدرت اور مشیت سے ہو سکتا ہے اس لیے بندے کو ہر وقت چوکنا رہنا اور ڈرتے رہنا چاہیے۔ اسی کی مثال حضرت ابراہیم کا یہ ارشاد ہے لا اخاف ماتشرکون بہ الآان یشاء ربی شیئاً وسع ربی کل شیئ علماً، چونکہ اللہ کی مشیت کا کسی کو پتہ نہیں اس لیے وسع ربی الخ فرما کر جتا دیا کہ مغیبات کے علم میں اس کی ذات منفرد ہے[1]

آخر میں فرمایا علی اللہ توکلنا یعنی ہمارا بھروسہ صرف اللہ ہی پر ہے۔ اسی نے ہماری اس راہ کی طرف رہنمائی کی ہے اور اسی سے ہمیں امید ہے کہ وہ ہمیں کامیابی سے ہمدوش کرے۔ اس کی ہدایت کے مطابق ہم اس میدان میں آتے ہیں۔ تمہاری دھمکیوں میں ہمیں وہ ہی کافی ہے۔ ہمیں اللہ کے سوا تمہاری ملت میں واپسی کے لیے کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔ توکل نام ہے اسباب کی پابجائی کے بعد نتائج کے لیے اسباب پر نہیں اللہ پر بھروسہ کرنے کا۔ اگر اسباب کی پابجائی کے بغیر اللہ پر بھروسہ کرتا ہے تو اس کا نام توکل نہیں عجز ہے۔ ایسا کرنے والا متوکل منصوص یا جو نہیں بلکہ جاہل معزور ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو جس نے آپ سے دریافت کیا تھا کیا میں اپنی اونٹنی کو کھلا چھوڑ کر اونٹنی کی حفاظت کے لیے اللہ پر بھروسہ کر دوں فرمایا تھا کہ اعقلھا و توکل علی اللہ اونٹنی کو باندھ لے اور حفاظت کے لیے اللہ پر بھروسہ کر۔ قرآن میں کاروبار حکومت کے سلسلے میں حضور کو پہلے یہ ہدایت ہوئی کہ شاورھم فی الامر صحابہ کرام سے مشورہ کرو۔ مشورے کے بعد جب بات پختہ ہو جاتے پھر فرمایا فاذا عزمت فتوکل علی اللہ یہ بات خالص جنگ کے موضوع پر آئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت شعیب نے استطاعت بھر تمام اسباب پر عمل کر لیا تھا اب نتائج کے ظہور کے لیے اللہ پر توکل کا اعلان کیا۔ اور اسباب ہی میں سے ایک قوی تر سبب اللہ کی جناب میں دعا ہے۔ یعنی سارے مادی اسباب کی پابجائی کے بعد حضرت شعیب نے کامیابی کے لیے اس روحانی اور معنوی سبب سے بھی استفادہ کیا اور فرمایا:

ربنا افتح بیننا و بین قومنا بالحق وانت خیر الفاتحین۔

یعنی ہماری اسی سے یہ دعا ہے کہ اے ہمارے رب ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ فرما دے اور تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ یہاں یہ بات بہت زیادہ قابل غور ہے کہ

---

[1] حاشیہ کشاف

ایک طرف اسباب میں اتنا انہماک کہ اس عالم مادی میں ایمان پر غیر متزلزل عزم کا اظہار اور ملت کفر سے نئے نئے انداز میں انتہائی بیزاری کا اعلان ہو رہا ہے یعنی جن راہوں سے حق تعالیٰ دعوت میں کامیاب ہونے والوں کو کامیابی عطا فرماتے ہیں دعوت کے ان ضوابط و آئین کے اختیار کرنے میں حضرت شعیب نے کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ ملت کفر سے ناگواری و بیزاری۔ ملت کفر کو افترا علی اللہ۔ اس کی لعنت سے نجات کو خدا کا انعام۔ اس میں واپسی کو ناممکن اور امر محال سب کچھ کرنے کے بعد حضرت شعیب کامیابی کی اس کلی اور کلیدی تدبیر میں مشغول ہو گئے جس کا نام دعا ہے یعنی کامیابی کا حقیقی اختیار جس کے قبضے میں ہے اس سے مانگنے میں مشغول ہو گئے۔ یہ عقلی تدبیر اور دعائی تدبیر کی جامعیت کی کیسی شاندار مثال ہے۔ اعتدال کے نقطہ نظر سے جن طبیعتوں میں انحراف پیدا ہو گیا ہے اس موضوع پر ان کا مذاق کچھ ہو لیکن نبوت جو حق لے کر آتی ہے اس کا مزاج خالص فطری ہوتا ہے۔ نبوت حصول مقاصد کے لیے تدبیر کی اسی جامعیت کو لے کر آتی ہے یعنی جو پیدا کر رہا ہے اس سے ہی مانگا جائے اور جن راہوں سے چیزیں پیدا ہو رہی ہیں ان میں بھی تلاش کیا جائے تعلیم کی یہی جامعیت اسلام کی خصوصیت ہے۔

دعائی تدبیر اور عقلی تدبیر میں فرق

یہ بات بھی دھیان میں رہے کہ کامیابی عطا کرنے والا ایک ہے اور جن راہوں سے کامیابی آ رہی ہے وہ بے شمار ہیں اس لیے دعائی تدبیر کا شعبہ عقلی تدبیر سے زیادہ آسان ہے۔ ایک سے تعلق رکھنا اور وہ بھی بھیک مانگنے، سوال کرنے کا تعلق رکھنا ایسا کام ہے کہ جس سے کچھ نہیں ہو سکتا وہ بھی بالآخر اس کام کو کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تدبیر کے اس عقلی شعبہ کا مکلف ہر شخص اپنی اپنی عقلی اور قوت عمل کے حساب سے ہے برخلاف دعائی تدبیر کے کہ وہ ایک کلی تدبیر ہے کامیابی کی راہوں سے نہیں بلکہ خود کامیاب کرنے والے سے اس کی پیدا کی ہوئی چیزوں کو مانگتا ہے۔ مانگنا ایک ایسا کام ہے کہ دنیا میں جو کچھ نہیں کر سکتا مانگنے پر وہ بھی قادر ہے اور مانگ ہی اس کی آخری پناہ ہے۔ الحاصل تدبیر کے ان دونوں شعبوں کے بھی نمایاں امتیازات ہیں جس کی بنیاد پر مذہب میں تدبیر کے دعائی شعبہ کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے ارشاد ہے:

وللہ غیب السماوات والارض والیہ یرجع الامر کلہ فاعبدہ وتوکل علیہ

اللہ ہی کے ہیں آسمان کی اور زمین کی پوشیدہ باتیں بٹنی سے بات سب کی سب

اسی کی طرف تو اسی کو پوجو اور اسی پر ٹیک لگالو۔

اس کا مطلب یہی ہے کہ عقل سے تم زیادہ سے زیادہ ان ہی آئین و قوانین کو دریافت کر سکتے ہو جو حواس و عقل کی گرفت میں ہوں لیکن آسمان و زمین کے قوانین کا وہ حصہ جو حواس و عقل سے غیب میں ہے۔ ان کے بارے میں چارہ کار یہی ہے کہ اللہ کو اپنا وکیل بناؤ۔ اسی سے مانگو۔ گویا عقل و حواس کی کی راہ سے جو معلومات حاصل ہو سکیں ان کا جو تقاضا ہو اس کو پورا کرنے کے بعد آخری پناہ اللہ کے سوا کوئی نہیں۔ من یتوکل علی اللہ فھو حسبہ' کا یہی مطلب ہے کہ ایسا آدمی بے سہارا نہیں ہو سکتا۔

بہرحال حضرت شعیب نے عقلی تدبیر کے ساتھ اس دعائی تدبیر کو اختیار کیا اور فرمایا ربنا افتح بیننا و بین قومنا بالحق۔ عربی زبان میں فتح کے معنے کھولنے کے ہیں۔ کھولنا دو طرح کا ہوتا ہے ایک مادی جیسے آنکھ کھولنا، تالا کھولنا اور معنوی جیسے رزق کی راہیں کھولنا، مشکل مسائل کھولنا۔ مقابلہ میں کامیابی کھولنا۔ قاضی کا مقدمہ میں حکم کھولنا۔ فیصلہ کو فتاحت کہتے ہیں۔ ایک عربی شاعر کہتا ہے۔

الا ابلغ بنی وھب رسولاً   بانی عن فتاحتھم غنی

اولاد وھب کو میرا یہ پیغام پہنچا دو کہ مجھے ان کے فیصلے کی کوئی پروا نہیں۔

اسی سے قضا کو فتاحت کہتے ہیں دن الفتاحۃ کے معنے ہیں اسے قضا کا عہدہ مل گیا۔ خاص اس دعائی پیمانہ کے بارے میں قتادہ ابن دعامہ نے حضرت عبداللہ بن عباس کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ،

عبداللہ فرماتے ہیں میں ربنا افتح بیننا کا مطلب نہ سمجھتا تھا ایک روز میں نے قبیلہ ذی یزن کی لڑکی سے سنا کہ وہ اپنے شوہر سے کہہ رہی ہے افاتحک یعنی تیرے سے فیصلہ کروں گی۔

اس سے معلوم ہوا کہ آیت میں افتح کے معنے فیصلہ کرنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اے اللہ رسولوں اور ان کی امتوں کے جھگڑے میں اپنی سنت کے مطابق ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان فیصلہ فرما دے۔ آپ بہترین فیصلہ فرمانے والے ہیں، آپ کو جھگڑے کا بھرپور علم ہے۔ آپ کے فیصلے میں نہ ظلم کا شائبہ ہے اور نہ اتباع ہوئی کا خطرہ۔ آپ کا فیصلہ ہر پہلو سے بہتر اور اچھا ہی ہو گا۔ یعنی اب آپ عملی اور مشاہدہ کے طور پر حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ظاہر فرما دیجئے تاکہ ہمارے مخاطبوں کا باطل ہونا اور ہمارا برحق ہونا کھل کر سامنے آجاتے۔

قوم شعیب کی اہل ایمان کو دھمکی

۱۲۰- حضرت شعیب کی نبوت کے منکر قوم کے سرداروں نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا لوگو اگر

تم نے حضرت شعیب کی پیروی کر لی تو بس سمجھ لو کہ تمہارا مستقبل گھاٹے والا ہے۔ یعنی باپ دادا کا مذہب چھوٹا، یہ تو دین کی خرابی ہوئی اور تجارت میں ناپ تول ٹھیک رکھی یہ دُنیا کا نقصان ہوا۔[1] حضرت شعیب کا سخت جواب سن کر سرداران قوم نے روئے سخن حضرت شعیب سے ہٹا کر حضرت شعیب کے ساتھیوں کی طرف کر لیا۔ کیونکہ ان کا فیصلہ کن جواب سننے کے بعد اب ان سے تو ان متمردین کے لیے کچھ سننے کی گنجائش ہی نہیں رہی۔ ان غریب اہل ایمان سے انہوں نے وہی کچھ کہا جو ہمیشہ طاقتور دلائل سے تہی دامن ہو کر ناداروں اور کمزوروں سے کہا کرتا ہے یعنی تم اگر حضرت شعیب کی ہمنوائی سے دست کش نہ ہوئے تو تمہیں بہت بڑے خسارے سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اس خسارے کی ان لوگوں نے کوئی وضاحت نہیں کی ہے۔ اس اجمال میں سب کچھ موجود ہے۔ سیاسی خسارہ، معاشی خسارہ، تجارتی خسارہ وغیرہ وغیرہ۔ اس چھوٹے سے فقرے میں وہ یہ بتا رہے تھے کہ حضرت شعیب جو نظامِ زندگی پیش کر رہے ہیں اور کاروباری زندگی میں جس ایمانداری اور راست بازی کی دعوت دے رہے ہیں اور اخلاق و دیانت کے جن مستقل اصولوں کی پابندی کرانا چاہتے ہیں۔ اگر ان کو مان لیا جائے تو ہم تباہ ہو جائیں گے۔ ہماری تجارت کیسے چل سکتی ہے۔ اگر ہم بالکل سچائی کے پابند ہو جائیں اور کھرے سودے کرنے لگیں۔ اور ہم جو دُنیا کی سب سے بڑی تجارتی شاہراہوں کے چوراہے پر بستے ہیں۔ اور مصر و عراق کی عظیم الشان متمدن حکومتوں کی سرحد پر آباد ہیں۔ اگر ہم قافلوں کو چھیڑنا چھوڑ دیں اور بے ضرر پُرامن لوگ ہی بن کر رہ جائیں تو جو معاشی اور سیاسی فوائد ہمیں اپنی موجودہ جغرافی پوزیشن سے حاصل ہو رہے ہیں وہ سب ختم ہو کر رہ جائیں گے اور اس پاس کی قوموں پر ہماری جو دھونس قائم ہے وہ باقی نہ رہے گی۔

یہ بات صرف قومِ شعیب کے سرداروں تک ہی محدود نہیں ہے۔ ہر زمانے میں بگڑے ہوئے لوگوں نے حق اور راستی کی روش میں ایسے ہی خطرات محسوس کیے ہیں۔ ہر دور کے مفسدین کا یہی خیال رہا ہے کہ تجارت اور سیاست اور دوسرے دنیوی معاملات جھوٹ اور بے ایمانی اور بد اخلاقی کے بغیر چل نہیں سکتے۔ ہر جگہ دعوتِ حق کے مقابلے میں جو زبردست عذرات پیش کیے گئے ان میں سے ایک یہ بھی رہا ہے کہ اگر دُنیا کی چلتی ہوئی راہوں سے ہٹ کر اس دعوت کی پیروی کی جائے گی تو قوم تباہ ہو جائے گی۔[2]

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

قوم مدین عذاب کی گرفت میں

۱۲۱ - پس آ دبوچا ان کو ایک لرزنے والی ہلاکت نے اور اس کے نتیجے میں وہ صبح کو اوندھے منہ پڑے تھے - متعدد آیات کے جمع کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان پر ظلہ، صیحہ اور رجفہ تین طرح کے عذاب آئے - یعنی اول بادل نے سایہ کر لیا جس میں آگ کے شعلے اور چنگاریاں تھیں - پھر آسمان سے سخت ہولناک اور جگر پاش آواز ہوئی اور نیچے سے زلزلہ آیا[1] شیخ الاسلام کی تشریح ان شارحین قرآن کی ترجمانی کرتی ہے جو کہتے ہیں کہ اصحاب مدین اور اصحاب الایکہ دونوں ایک ہی ہیں - ان کا قیاس ہے کہ ملک مدین کے پاس ایک جنگل تھا جہاں مدین کی قوم کبھی کبھی قیام کرتی تھی - اس لیے ان کو اصحاب الایکہ کہتے تھے - لیکن چونکہ اصحاب الایکہ کی تاریخ ہمارے مفسرین کے پیش نظر نہ تھی اس لیے انہوں نے یہ بات خود فرض کر لی کہ اصحاب الایکہ اور اصحاب مدین ایک ہیں - حالانکہ صورت حال یہ نہیں ہے -

مسلمان جغرافیہ نویس ان اطراف میں کسی جنگل کے ذکر سے خاموش ہیں - ان کی رائے ہے کہ شہر تبوک جو مدین کے مقابل مدین سے ۶۰ مرحلہ پر واقع ہے اس کا قدیم نام ایکہ تھا - اور خود اہل تبوک کو بھی اعتراف ہے کہ اس کا پہلا نام ایکہ ہے - قرآن کے انداز بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مدین اور ایکہ دو چیزیں ہیں کیونکہ ان دونوں قوموں کا حضرت شعیب سے سوال و جواب، طرز خطاب اور پھر آخر بربادی اور طریقہ بربادی مختلف ہے - اس بنا پر یہ کہنا درست نہیں کہ اصحاب مدین اور اصحاب ایکہ ایک ہیں - انشاء اللہ ہم اس پر سیر حاصل بحث جلد ۱۴ اور جلد ۱۹ میں کریں گے -

اس لیے دونوں کے عذاب میں بھی فرق ہے - قوم مدین پر جو عذاب آیا اسے قرآن نے یہاں رجفہ اور سورۂ ہود میں صیحہ کہا ہے اور اصحاب الایکہ پر جو عذاب آیا اسے ظلہ کہا ہے - رجفہ رجف سے اسم مرہ ہے ہلنے اور کپکپی کو کہتے ہیں - رجفان الارض زمین کا ہلنا بھی ہوتا ہے اسی سے رجفہ بمعنے زلزلہ ہے اور رجفان قلب کے معنے خوف اور ہول کے ہیں - یہاں زلزلہ کے معنے ہیں اور سورہ ہود میں اسی کو صیحہ فرمایا ہے اس کے معنے چیخ اور کڑک کے ہیں - پہلے ایک آواز بلند ہوئی اور پھر زلزلہ آیا - اس کے نتیجہ میں جو تباہی آئی ہے یہاں قرآن نے اسی کا نقشہ پیش کیا ہے اور سورۃ الشعراء میں اصحاب الایکہ کا جو عذاب بیان کیا ہے اسے عذاب یوم الظلہ کہا ہے یعنی سائبان والے دن کا عذاب جوہری نے ابوزید سے نقل

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کیا ہے کہ پہلی بدلی جو سایہ فگن ہو وہ ظلہ ہے اور عذاب یوم الظلہ کے بارے میں جوہری نے لکھا ہے کہ ایک ابر تھا جس کے نیچے بادِ سموم چل رہی تھی۔ اور تہذیب اللغہ میں ہے کہ ایک بدلی ان کے سر پر سایہ فگن ہو گئی تھی جب لوگ نیچے تپش سے پناہ کے لیے جمع ہو گئے تو وہ یکایک ان پر آ گری اور سب وہیں ڈھیر ہو گئے۔ تفصیل ان شاء اللہ معالم القرآن کی جلد ۱۹ میں ملے گی۔

قومِ مدین پر عذاب کا نتیجہ

۱۲۲۔ جنہوں نے حضرت شعیب کی تکذیب کی ان کا حال یہ تھا کہ گویا وہ ان بستیوں میں کبھی آباد ہی نہیں ہوتے تھے۔ حضرت شعیب کی تکذیب کرنے والے ہی تباہ ہونے والے تھے۔ انہوں نے شعیب اور ان کے ہمراہیوں کو بستی سے نکالنے کی دھمکی دی تھی سو وہ ہی نہ رہے اور نہ ان کی بستیاں رہیں اور وہ جو کہتے تھے کہ شعیب یہ استیناف بیانی ہے جس نے پہلے یہ دو باتیں قومِ مدین کی زبانی سُنی ہیں اے شعیب ہم تم کو اور تمہارے ساتھیوں کو اپنی بستی سے نکال دیں گے اور یہ بات کہ لوگو اگر تم نے شعیب کی ہمنوائی کی تو تم خسارے میں رہو گے تو سامع کے ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ معاملہ کیسے ختم ہوا اور نتائج کا اونٹ کس کروٹ بیٹھا۔ قاری و سامع کے ذہن میں اسی اٹھتے ہوئے سوال کا جواب اس آیت میں دیا جا رہا ہے۔ پہلے سوال کا یہ جواب دیا ہے کہ جو لوگ حضرت شعیب اور ان کے ساتھیوں کو بستی سے نکالنے کی دھمکیاں دے رہے تھے اور ان کی اپوزیشن بن کر کھڑے ہو گئے ان پر ایسی تباہی آئی اور وہ اس طرح ہو گئے گویا اس بستی میں وہ کبھی آباد ہی نہ ہوتے تھے وہ بھی مٹ گئے اور ان کی بستی بھی صفحۂ ہستی سے مٹ گئی۔ دوسرے سوال کا جواب یہ دیا کہ جو شعیب کی پیروی سے روکتے تھے اور حضرت شعیب کی تکذیب کرتے تھے وہ ہی اہلِ ایمان کے مقابلے میں گھاٹے میں رہے ان کی قومی ہستی مٹ گئی ان کا سرمایہ تباہ ہو گیا اُن کا وطن وطن نہیں رہا اس کے برعکس جنہوں نے حضرت شعیب کی اتباع کی وہ بامراد اور کامیاب رہے۔

علامہ طیبی نے اس میں یہ بھی نکتہ آفرینی فرمائی ہے کہ اللہ سبحانہ نے زلزلہ کے ذریعے جب ان پر عذاب کی گرفت کو بیان فرمایا اور بتایا کہ ان کو تکذیب و عناد کے نتیجہ میں بے دست و پا بنا کر رکھ دیا تو سننے والے کے ذہن میں یکبارگی یہ سوال ابھرا کہ گھروں میں اوندھے ہو جانے کا انجام کیا ہوا؟ جواب میں ارشاد ہوا کہ کان لم یغنوا فیھا۔ ان کی اس طرح بیخ کنی کر رکھ دی گئی اور ان کے مکانوں کو اس طرح تباہ کر دیا کہ دیکھنے والا محسوس کرتا ہے کہ یہاں کوئی آباد کبھی ہوا ہی نہیں ہے۔ یہاں پہنچ کر مخاطب کے ذہن میں

پھر اس سوال نے چٹکیاں لیں کہ کیا یہ معاملہ صرف ان ہی کے ساتھ ہوا یا کوئی اور بھی ان کا شریک تھا۔ فرمایا صرف ان کے ساتھ ہی ہوا ہے جنہوں نے حضرت شعیب کی تکذیب کی تھی۔ لیکن پہلی تشریح میں زیادہ معنویت ہے۔ اہل علم نے اس سے یہ بات بھی معلوم کی ہے کہ نبوت کی دعوت کے مقابلے میں وطنیت اور قومیت سے محبت کا نتیجہ دائمی محرومی ہے۔

حضرت شعیب کی ہجرت

۱۲۳۔ حضرت شعیب ان سے علیحدہ ہو گئے اور فرمایا کہ میں نے اپنے رب کے پیغامات تمہیں پہنچا دیے اور میں نے تمہاری خیر خواہی کی تھی اس لیے میں آپ کے نہ ماننے پر کیسے افسوس کروں۔ یعنی اب ہلاک ہوئے پیچھے ایسی قوم پر افسوس کرنے سے کیا حاصل جس کو ہر طرح سمجھایا جا چکا ہے، مؤثر نصیحتیں کی گئیں آنے والے عواقب و نتائج سے ڈرایا گیا۔ مگر انہوں نے کسی کی ایک نہ سنی بلکہ مخلص خیر خواہ ہوں سے اُلجھتے ہی رہے[1] یہ قوم سے حضرت شعیب کا آخری خطاب ہے کہ یہ انہوں نے عذاب آنے سے پہلے اس وقت فرمایا ہے جب ان کو اللہ کی طرف ہجرت کا حکم ملا ہے۔ اعلان برأت کر کے ہجرت فرمائی ہے۔ یہی رخصتی تقریر کر کے آپ نے ہجرت فرمائی۔ کیونکہ رسولوں کے بارے میں سنتِ الٰہی یہ ہے کہ عذاب آنے سے پہلے اللہ کے حکم سے وہ علاقہ عذاب سے ہجرت کر جاتے ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ترتیبِ بیان میں اس بات کو عذاب کے بعد کیوں ذکر کیا اس کا جواب یہ ہے کہ ترتیب میں یہ تقدیم و تاخیر تقاضائے بلاغت ہے۔ ارتکابِ جرم اور اس کے نتیجے کے فوری ظہور کو نمایاں کرنے کے لیے یہاں رجفہ کو قوم مدین کے چیلنج کے ساتھ بیان کر دیا اور حضرت شعیب کی ہجرت کو مؤخر کر دیا گویا جوں ہی اہل مدین نے لئن اتبعتم شعیبا انکم اذا لخاسرون کہا خدا کا عذاب آ گیا۔ اگر درمیان میں حضرت شعیب کی ہجرت اور ان کے آخری خطاب کو ذکر کیا جاتا تو عذاب کی یہ سبقت و مبادرت ظاہر نہ ہوتی۔ قرآن میں اس قسم کی مثالیں بہت ہیں اور اگر اسے عذاب کے بعد کا خطاب قرار دیا جائے تو فتولی عنھم میں کوئی معنویت نہیں رہے گی۔ مطلب یہ ہے کہ میں نے تمہیں خدا کا پیغام پہنچا دیا ہے اور تمہاری خیر خواہی میں اپنے آپ کو تج کر دیا۔ اس کے باوجود اگر تم اپنی تباہی پر تلے بیٹھے ہو تو اب میرے لیے تمہارے اس انجام پر ترس کھانے اور افسوس کرنے کا کیا موقع ہے۔

[1] افادات شیخ الاسلام

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّبِیٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ
وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ ﴿٩٤﴾ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ
الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا وَّقَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ
فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٩٥﴾ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى
اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَ
لٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿٩٦﴾ اَفَاَمِنَ اَهْلُ
الْقُرٰٓى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا وَّهُمْ نَآئِمُوْنَ ﴿٩٧﴾ اَوَاَمِنَ
اَهْلُ الْقُرٰٓى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّهُمْ يَلْعَبُوْنَ ﴿٩٨﴾ اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ
اللّٰهِ ۚ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿٩٩﴾ اَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِيْنَ
يَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ اَهْلِهَآ اَنْ لَّوْ نَشَآءُ اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ ۚ
وَنَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿١٠٠﴾ تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ
عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآئِهَا ۚ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا

كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ ۚ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ
الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۱﴾ وَ مَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ ۚ وَاِنْ وَّجَدْنَآ
اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ ﴿۱۰۲﴾

اور ہم نے جب کسی بستی میں کوئی نبی بھیجا تو ہمیشہ ایسا ہوا کہ اس کے باشندوں کو تنگ حالی اور بدحالی میں مبتلا کر دیا تاکہ نیازمندی اختیار کریں، پھر ہم نے بدحالی کو خوش حالی میں تبدیل کر دیا تا آنکہ وہ خوش حالی میں خوب ترقی کر گئے اور کہنے لگے ہمارے بزرگوں پر سختی کا دور بھی آیا اور راحت کا بھی تو اچانک ہمارے عذاب کی پکڑ میں آ گئے اور وہ بالکل بے خبر تھے[۱۲۶]۔ اور اگر ان بستیوں کے رہنے والے ایمان لاتے اور برائیوں سے بچتے تو ہم آسمان اور زمین کی برکتوں کے دروازے ضرور اُن پر کھول دیتے لیکن انہوں نے جھٹلایا لہٰذا ہم نے ان کو اس کمائی کی وجہ سے جو انہوں نے حاصل

کی پکڑ لیا۔[۱۲۵] کیا شہروں کے بسنے والوں کو اس بات سے امان کا پروانہ
مل گیا ہے کہ ہمارا عذاب راتوں رات آنازل ہو اور وہ سوتے ہوں
یا انہیں اس بات سے امان مل گئی ہے کہ دن کی روشنی میں اُن
پر عذاب آجاتے اور وہ کھیل کود میں مشغول ہوں۔[۱۲۶] کیا ان کو خدا
کی مخفی تدبیروں سے امان مل گئی ہے یاد رکھو خُدا کی مخفی تدبیروں سے
بے خوف وہی ہوتے ہیں جو تباہ ہونے والے ہوتے ہیں۔[۱۲۷] کیا
جو لوگ ملک والوں کے ہلاک ہونے کے بعد ملک کے وارث ہوتے
ہیں یہ بات نہیں جانتے کہ اگر ہم چاہیں تو انہیں بھی گناہوں کی
پاداش میں مصیبتوں میں ڈال دیں اور اُن کے دلوں پر مُہر لگا دیں
کہ کوئی بات ہی نہ سُنیں۔[۱۲۸] اے پیغمبر یہ آبادیاں جن کی داستانیں
ہم تمہیں بتاتے ہیں ان سب میں ان کے پیغمبر واضح اور روشن
دلیلوں کے ساتھ آئے مگر اُن کے بسنے والے اس بات پر ایمان نہ

لا سکے جن کو اُن کے پیشتر وہ جھٹلا چکے تھے، اسی طرح اللہ ہٹ دھرمی سے انکار کرنے والوں کے دلوں پر مُہر لگا دیتا ہے[۱۲۹]۔ اور ان میں سے اکثر کو ہم نے ایسا پایا کہ اپنے عہد پر قائم نہ تھے اور اُن کے اکثر کو ہم نے بالکل نافرمان پایا ہے[۱۳۰]۔

معانی مفردات

البأساء، سختی، فقر اسم مونث ہے۔ بؤس سے مشتق ہے صفت نہیں ہے اور بعض کے خیال میں صفت ہے جو موصوف کے قائمقام ہے۔ الضرّاء، تکلیف، سختی، تنگی، مرض، بیماری، مصیبت اسم ہے۔ سراء اور نعماء کی ضد ہے۔ واضح رہے باساء اور ضراء دونوں مونث ہیں اور ان کا مذکر نہیں آتا۔ فراء کا خیال ہے کہ اگر ان دونوں کی جمع ابؤس اور اضر استعمال کی جاتے جس طرح کہ نعماء کی جمع انعم استعمال کی جاتی ہے تو جائز ہے۔ الصراح من الصحاح۔ السیئۃ، برائی، گناہ، فعل بد، حسنہ کی ضد ہے۔ سیئۃ اصل میں سیوأۃ ہے۔ واو کو ی سے بدل کر یا میں ادغام کر دیا۔ راغب لکھتے ہیں حسنہ اور سیئۃ دو قسم کے ہیں۔ ایک باعتبار عقل و شرع جیسے وہ کام جن کا ذکر من جاء بالحسنۃ فلہ عشر الخ میں ہے۔ دوسرے حسنہ اور سیئۃ باعتبار طبع کہ طبیعت پسند کرے یا ناپسند کرے جیسے فاذا جاءتھم الحسنۃ قالوا لنا ھذہ اور جیسے اس آیت میں عفوا وہ بڑھ گئے وہ زیادہ ہو گئے۔ عفو سے جس کے معنے زیادہ ہونے کے ہیں۔ علامہ عزیزی نزہۃ القلوب میں لکھتے ہیں۔ عفوا بمعنی کثروا ہے۔ جب کوئی چیز زیادہ اور گھنی ہو جاتی ہے تو بولتے ہیں عفا الشیئ نیز عفا الشیئ کے معنے بوسیدہ اور ختم ہونے کے آتے ہیں اور یہ اضداد میں سے ہے۔ علامہ قرطبی نے شرح صحیح مسلم میں بھی یہی لکھا ہے۔ عفا اضداد میں سے ہے۔ زیادہ ہونے کے معنے میں بھی آتا ہے اور کم ہونے کے معنے میں بھی۔ ظاہر ہونے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور پوشیدہ ہونے کے لیے۔ سراء نعمت فراخی خوشی اصل میں حالت شادمانی کا نام سراء ہے برکات، برکت کی جمع جس کے

معنے کسی چیز میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے خوبی اور بھلائی کے ثابت ہونے کے ہیں اور چونکہ خدا کی طرف سے خیر و خوبی غیر محسوس طریقے پر صادر ہوتی ہے۔ اور بے حد و بے شمار طریقے پر پائی جاتی ہے۔ اسی لیے ہر چیز کو جس میں غیر محسوس طور پر زیادتی مشاہدہ میں آئے مبارک اور بابرکت کہتے ہیں۔ اصل میں برک اونٹ کے سینے کو کہتے ہیں۔ اونٹ چونکہ سینہ ٹیک کر بیٹھتا ہے اسی لیے اس کے معنے ٹیکنے، ٹھہرنے، ثابت رہنے اور ایک جگہ جمے رہنے کے استعمال ہونے لگے۔ چنانچہ حوض کو برکہ اسی لیے کہتے ہیں کہ پانی رکا ہوا ہوتا ہے اور جس طرح حوض میں پانی جمع رہتا ہے اسی طرح کسی چیز میں بھی خیر و خوبی کے اکٹھا ہونے کا نام برکت ہے۔

وقائع و قصص اور قوانین اجتماعی

قرآن نے تذکیر و موعظت کے لیے جو باتیں بطور دلائل کے اختیار کی ہیں اور جنہیں وہ جا بجا، حجج، براہین، بیّنات اور بصائر سے تعبیر کرتا ہے۔ ان میں ایک نمایاں استدلال، واقعات تاریخی کا ہے۔ اس نے جہاں کہیں گزشتہ قوموں کے حالات بیان کیے ہیں وہاں یہ بات بھی واضح کر دی ہے کہ اس بیان سے اس کا مقصود کیا ہے۔ قرآن کا مقصد تورات کی طرح دنیا کی تاریخ بیان نہیں کرنا بلکہ کچھ باتیں ہیں جن کا وہ دلوں میں اذعان پیدا کرنا چاہتا ہے اور یہ واقعات اس کے لیے دلیلیں ہیں۔ ان آیات میں اسی طرف اشارات کیے گئے ہیں کہ یہ سرگزشتیں کیونکر دلیل، حجت اور برہان ہیں۔ غور فرمائیے جتنے رسول پیدا ہوئے وہ کیسے وقتوں میں پیدا ہوئے اور کن لوگوں میں پیدا ہوئے ان کی دعوت کیا تھی اور دعوت کی نوعیت کیا تھی۔ ان کی دلیلیں کیا تھیں جن پر انہوں نے زور دیا۔ ان کا طریق کار کیا تھا جس پر وہ برابر کاربند رہے انہوں نے اپنے قدم جہاں ٹکائے تھے وہ جگہ کون سی تھی اور سہارے کے لیے جس کی طرف ہاتھ بڑھایا وہ کون تھا۔ پھر ان میں اور ان کی قوموں میں جو معاملات پیش آئے وہ کس قسم کے تھے اور ان معاملات میں ان کا جو قول و فعل رہا وہ کس قسم کا تھا۔ آپ غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ان ساری باتوں میں ہر رسول دوسرے رسول کی تصویر تھا اور ہر دعوت دوسری دعوت کا عکس تھی۔ کسی بات میں بھی آپ ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کر سکتے۔ سب اسی حال میں پیدا ہوئے کہ دنیوی طاقتوں اور حکمرانیوں میں سے کچھ نہیں رکھتے تھے۔ سب کا ظہور ایسے ہی وقتوں میں جب خدا پرستی اور نیک عملی کی روشنی بجھ چکی تھی۔ سب انہی قوموں میں پیدا ہوئے جن قوموں

کو انہوں نے مخاطب کیا تھا۔ سب کی زبانوں سے ایک ہی پکار نکلی، سب نے ایک ہی طرح لوگوں کو بلایا سب نے کہا کہ اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا کوئی معبود نہیں، سب نے کہا کہ ظلم و بدعملی سے باز آجاؤ اس کا نتیجہ ہلاکت ہے۔ سب نے کہا۔ ہماری جدوجہد ادائے فرض ہے۔ مزدوری کی طلب ہے سب نے کہا کہ ہمارے پاس علم و یقین ہے۔ ہم تمہیں جہل و گمان سے بچانا چاہتے ہیں۔ سب نے کہا ہمارا دعویٰ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایمان و نیک عملی کے نتائج کی بشارت دینے والے ہیں۔ انکار و بدعملی کے نتائج سے آگاہ کرنے والے ہیں ماننا نہ ماننا تمہارا کام ہے سب نے کہا تمہارا بھروسہ اپنی طاقتوں پر ہے ہمارا پروردگار عالم پر تم جو کچھ کر سکتے ہو کر دیکھو ہم اپنے کام سے باز آنے والے نہیں۔ سب نے کہا کہ اگر مانتے نہیں تو کم از کم حق کے مقابلہ سرکشی کرنا چھوڑ دو۔ سرکشی کا نتیجہ عذاب ہے۔ پھر ان قوموں پر نظر ڈالو جن پر ان تمام دعوتوں کا ظہور ہوا تھا۔ یہاں بھی ہر قوم کو اپنے طرز عمل میں ٹھیک ٹھیک دوسری قوم کی شبیہ ہے اور کس طرح گمراہی کا چہرہ ہمیشہ ایک طرح رہا۔ کوئی بات بھی ایسی نہیں جس میں ظلم و فساد کی ایک نمود ظلم و فساد کی دوسری نمود سے ہم آہنگ نہ ہو۔ سب نے اپنی اپنی باری وہی سب کچھ کیا جو ان میں سے کسی ایک نے کیا تھا۔ سب نے دعوت سے انکار کیا۔ سب نے مذاق اڑایا۔ سب سرکشی اور گھمنڈ سے پیش آتے سب نے جبر و تشدد سے راستہ روکنا چاہا۔ سب نے موعظت و دلائل کا جواب ظلم و تعدی سے دیا۔ سب کی زبانوں سے ایک ہی طرح کی صدائیں نکلیں۔ سب کے اعراض و انکار کا مزاج ایک طرح کا رہا۔ نتیجہ بھی ہمیشہ ایک ہی رہا۔ ہمیشہ خدا کے فیصلہ کا انتظار کیا گیا اور ہمیشہ فیصلہ یہی ہوا کہ مومنوں کو نجات ملی سرکشوں کے لیے ہلاکت ہوئی۔ یہ گویا اس معاملہ کا قدرتی خاصہ تھا اور خاصہ کبھی بدل نہیں سکتا۔ یہ آگ کے لیے گرمی تھی۔ برف کے لیے ٹھنڈک تھی۔ سنکھیا کے لیے ہلاکت تھی۔ یعنی ہر جگہ ایک ہی قانون ایک ہی طرح کام کر رہا ہے۔ بلاشبہ لباس مختلف ہیں قوالب الگ الگ ہیں اور ناموں میں اختلاف ہے مگر حقیقت ایک ہی ہے۔ ان آیات میں قرآن نے خصوصیت کے ساتھ اسی کی طرف توجہ دلائی ہے۔ یہ دعوتِ حق کے ظہور و احوال کی یکسانیت ہے۔ چنانچہ پہلی آیت میں فرمایا کہ ہمیشہ سنتِ الٰہی ایسی ہی رہی ہے اور تلک القریٰ اور اس کے بعد والی آیت میں واضح کر دیا ہے کہ گزشتہ وقائع کے ذکر سے مقصود اسی حقیقت کی تلقین ہے۔

۱۲۴۔ اور ہم نے جب کسی بستی میں کوئی نبی بھیجا تو ہمیشہ ایسا ہوا کہ اس کے باشندوں کو تنگ حالی اور بدحالی میں مبتلا کر دیا تاکہ نیازمندی اختیار کریں۔ پھر ہم نے بدحالی کو خوش حالی میں تبدیل کر

یا تا آنکہ وہ خوش حالی میں خوب ترقی کر گئے اور کہنے لگے کہ ہمارے بزرگوں پر سختی کا دور بھی آیا اور راحت کا بھی، تو اچانک ہمارے عذاب کی پکڑ میں آگئے اور وہ بالکل بے خبر تھے۔ یعنی پیغمبروں کی بعثت کے وقت جب عموماً لوگ تکذیب و مقابلہ سے پیش آتے ہیں تو خدا کی طرف سے ابتدائی تنبیہ کے طور پر بیماری قحط اور مختلف قسم کی سختیاں اور تکلیفیں مسلط کر دی جاتی ہیں۔ تاکہ مکذبین تازیانے کھا کر شرارتوں سے باز آجائیں اور بارگاہ الٰہی کی طرف جھکیں۔ جب ان تنبیہات کا اثر قبول نہیں کرتے تو سختیوں اور مصیبتوں کو ہٹا کر ان پر فراخی اور عیش و خوشحالی وغیرہ بھیجی جاتی ہے کہ احسانات سے متاثر ہو کر کچھ شرمائیں اور حضرت ربوبیت کی طرف متوجہ ہوں یا عیش و ثروت کے نشے میں چور ہو کر بالکل ہی غافل و بدمست بن جائیں۔ گویا جہاں تک صحت و اولاد اور دولت و حکومت بڑھتی جائے اسی کے ساتھ ان کی نخوت و غفلت میں بھی ترقی ہو حتیٰ کہ پچھلی سختیوں کو یہ کہہ کر فراموش کر دیں کہ تکلیف و راحت کا سلسلہ تو پہلے ہی سے چلا آتا ہے۔ ہمارے کفر و تکذیب کو اس میں کچھ دخل نہیں۔ ورنہ اب خوشحالی کیوں حاصل ہوتی۔ یہ سب زمانے کے اتفاقات ہیں جو ہمارے اسلاف کو بھی اسی طرح پیش آتے رہے ہیں۔ اس حد پر پہنچ کر ناگہاں خدا کا عذاب آ دباتا ہے جس کی اپنے عیش و آرام میں انہیں خبر ہی نہیں ہوتی۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ

بندہ کو دنیا میں گناہ کی سزا پہنچتی رہے تو امید ہے کہ توبہ کرے اور جب گناہ راست آگیا تو یہ اللہ کا بھلاوا ہے پھر ڈر ہے ہلاکت کا جیسے کسی نے زہر کھایا اگل دے تو امید ہے اور اگر پچ گیا تو کام آخر ہوا۔ [1]

اس پر سب کا اتفاق ہے کہ انبیاء اور ان کی قوموں کی تاریخی داستان بیان فرمانے کے بعد وہ جامع ضابطہ اور قانون بیان ہو رہا ہے جو ان تاریخی واقعات کے موقع پر اللہ سبحانہ نے اختیار فرمایا ہے۔ ابن جریر لکھتے ہیں معرفۃ سنتہ فی الامم التی قد خلت من قبل امتہ، پہلی امتوں کے واقعات میں اللہ کے قوانین و ضوابط کی ان آیات میں نشاندہی کی گئی ہے۔ ابن کثیر نے حافظ ابن جریر کی ہمنوائی کی ہے۔ قاضی بیضاوی، علامہ آلوسی، ابو حیان اندلسی وغیرہ نے یہی سمجھا ہے آیت کے آغاز میں واو عاطفہ کے ذریعہ پچھلے تمام تاریخی واقعات کے ساتھ ان قوانین ذ سنن کو مربوط کیا گیا ہے۔ یعنی انبیاء کے ان کی تباہ شدہ قوموں کے ساتھ احوال یہ تھے اور اس موضوع

---

[1] افادات شیخ الاسلام

پر ہمارا قانون یہ ہے۔ آیت میں قریہ کے معنے اس مرکزی آبادی کے ہیں جس میں قومی لیڈر اور حکمرانوں کا ڈیرہ ہوتا ہے جسے عرف میں دارالخلافہ کہتے ہیں۔ انبیاؑ کی بعثت مرکزی مقام پر ہی ہوتی ہے۔ پہلی آیت میں گزشتہ قوموں میں انبیاؑ کی دعوت کے سلسلے میں یہ قانون بتایا گیا ہے کہ جب نبوت کسی قوم میں کام شروع کرتی ہے تو نبی کے روانہ کرنے کے بعد یا اس سے پہلے اس قوم کے خارجی ماحول کو قبول دعوت کے لیے نہایت سازگار بناتے ہیں۔ صورت یہ ہوتی ہے کہ ان کو مصائب و آفات میں مبتلا کیا گیا۔ قحط، وبا، تجارتی خسارہ، جنگی شکست یا اور اسی طرح کی تکلیفیں ان پر ڈالی گئیں تاکہ ان کا دل نرم پڑے۔ ان کی شیخی اور تکبر سے اکڑی ہوئی گردن ڈھیلی ہو۔ ان کا غرور، طاقت اور نشہ دولت ٹوٹ جائے اپنے ذرائع و وسائل اور اپنی قوتوں اور اپنی قابلیتوں پر ان کا اعتماد شکست ہو جائے۔ ان کو محسوس ہو کہ اوپر کوئی طاقت ہے جس کے قبضہ میں ان کی قسمت کی باگیں ہیں۔ اور اس طرح ان کے کان نصیحت کے لیے کھل جائیں اور دیکھ لیں کہ اللہ سبحانہ، جب چاہے اور جہاں سے چاہے ان کو پکڑ سکتا ہے۔ اصل ارشاد میں مآ ارسلنا فی قریہ من نبی الا اخذنا اھلھا اس میں اخذنا اھلھا کی تعبیر میں بہت گہری معنویت ہے۔ اخذنا حال ہے اور ارسلنا کی ضمیر سے حال ہے۔ حال کے لیے عام قاعدہ تو یہی ہے کہ جملہ حال ہو کر آئے تو واو یا قد کے ساتھ آتا ہے۔ لیکن ان دونوں صورتوں میں صرف یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ یہ حال مقارنہ ہے۔ اگر آیت میں حال مقارنہ قرار دیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ ان پر باسا اور ضرا کی حالت انبیاؑ آنے کے بعد طاری ہوئی۔ جن لوگوں نے ایسا سمجھا ہے انہوں نے کذبوا محذوف مانا ہے اور مطلب یہ بتایا ہے کہ انبیاؑ آئے، لوگوں نے انبیاؑ کی تکذیب کی۔ پھر باسا اور ضرا کی حالت اس لیے پیدا ہوئی کہ لوگوں میں انبیاؑ کے لیے جذبہ تصدیق رونما ہو۔ یہ مسئلہ اپنی جگہ درست ہے لیکن عبدالقاہر جرجانی نے یہاں ایک مفید بات لکھی ہے کہ حال مقررہ مقارنت کا فائدہ دیتا ہے مگر جملہ حالیہ یہ بھی بتاتا ہے کہ یہ کام پہلے سے ہو رہا تھا اور اب بھی ہو رہا ہے۔ آیت کا یہی مدلول ہے کہ نبی کی تشریف آوری کے بعد اور پہلے اللہ کی جانب سے لوگوں کی پکڑ شروع ہو جاتی ہے تاکہ نبوت کی دعوت کے قبول کرنے کے لیے زمین ہموار ہو جائے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک قانون تو اللہ کا یہ ہے تنگ حالی اور بدحالی کی بھٹی میں لوگوں کو ڈالا جاتا ہے تاکہ لوگوں کی تربیت ہو جائے۔ اور فساد سے ہٹ کر لوگوں میں صلاح کی طرف میلان نمایاں ہو۔ مومن تو مومن شدائد اور مصائب میں پاپی کافر کو بھی خدا یاد آجاتا ہے۔ باسا سے مالی آفتیں مثلاً قحط گرانی، کساد بازاری وغیرہ اور ضرا سے جسمانی آفتیں مثلاً بیماریاں وغیرہ مراد ہیں۔ یہ تجربہ ہے کہ زمانہ جنگ ہو، قحط سالی ہو یا ہیضہ اور طاعون پھیلا

جائے تو عام لوگوں کا میلان مساجد اور معابد کی طرف ہو جاتا ہے۔ نبی کی آمد سے پہلے اور نبی کی تشریف آوری کے بعد اس لیے کیا جاتا ہے کہ نبی کی دعوت کی بازگشت تمام عناصر کائنات سے سنائی دے ورنہ یہ قانون امہال سب کے لیے ہے اور عام ہے اور اس کا مقصد لوگوں کو جھنجوڑنا اور بیدار کرنا ہے یہ ایک عام قانون اجتماعی ہے۔ اور اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو جھنجوڑا جائے اور بیدار کیا جائے یہی قانون قرآن نے ساتویں پارے میں ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

ولقد ارسلنا الی امم من قبلک فاخذناهم بالباساء والضراء لعلهم یتضرعون۔

ہم نے تم سے پہلے بھی بہت سی اُمتوں کی طرف انبیاء روانہ کیے پھر ان قوموں کو تنگ حالی اور بدحالی میں گرفتار کیا تاکہ وہ اللہ کے حضور میں عجز و نیاز کریں۔

یہ خدائی قانون آزمائش ہے یگانوں بیگانوں دونوں کے لیے ہوتا ہے یگانوں میں اس لیے ہوتا ہے کہ پتہ لگ جائے کہ مومن ہونے کے لیے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ ایمان کا اقرار کر لیا جائے بلکہ ضروری ہے کہ ان تمام آزمائشوں میں استقامت کا مظاہرہ کیا جائے جو ایمان کی راہ میں مشکلات کی صورت میں پیش آتی ہیں۔ گویا یگانوں میں باساء اور ضراء کی حالت استقامت اور ثابت قدمی دیکھنے اور کھرے کھوٹے سے ممتاز کرنے کے لیے ہوتی ہے اور بیگانوں میں یہی حالت اس لیے ہوتی ہے کہ وہ اللہ کے حضور عجز و نیاز کریں اور بدعملیوں سے باز آجائیں۔ شدائد کے ذریعے تربیت اللہ کا قانون اور اس کی سنت ہے۔ باساء اور ضراء کے ذریعے پکڑنے کا مطلب یہ ہے کہ ان دونوں کا وہ لوگ شکار ہوتے لیکن اس کے باوجود ان کی آنکھیں نہ کھلیں اور ان میں عجز و نیاز ظاہر نہ ہوا۔ آیت کے آخر میں لعلهم یتضرعون فرما کر اشارہ کر دیا کہ ان کو باساء و ضراء میں مبتلا کرنے کا منشا عذاب نہیں تھا بلکہ یہ اور صرف یہ تھا کہ مصیبت میں مبتلا ہو کر ہر شخص کو خدا یاد آجاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ اللہ سبحانہ کا انداز تربیت ہے اور یہ بھی ارشاد کے انداز بیان سے معلوم ہو رہا ہے کہ اللہ سبحانہ کسی قوم پر دفعۃً اور یکبارگی عذاب نازل نہیں فرماتے بلکہ بطور تنبیہ تھوڑی تھوڑی سزائیں نازل فرماتے ہیں۔

خطرناک اور انتہائی خطرناک سزا

قانون آزمائش کے بعد قانون امہال کو بیان کیا ہے۔ ارشاد ہے ثم بدلنا مکان السیئة الحسنة حتی عفوا۔ یہ دوسرا قانون اجتماعی ہے۔ پہلے یہ بتایا ہے کہ قوموں اور اُمتوں کو چونکانے کے لیے ان کو

باساء اور ضراء میں مبتلا کیا جاتا ہے لیکن اگر وہ متنبہ نہیں ہوتے اور اس سازگار ماحول میں بھی اس کا دل قبولِ حق کی طرف مائل نہیں ہوتا تو بدحالی اور تنگ حالی کی جگہ خوش حالی آجاتی ہے۔ دنیوی اسباب و وسائل کے ہر گوشہ میں ترقی و فراخی کے آثار نمایاں ہوتے ہیں۔ آزمائشوں اور تکلیفوں کے دن ذہنوں سے نکل جاتے ہیں اور اس کے کج فہم رہنما اس کے ذہن میں تاریخ کا یہ احمقانہ تصور بٹھاتے ہیں کہ حالات کا بناؤ بگاڑ کسی حکیم کے انتظام میں اخلاقی بنیادوں پر نہیں ہو رہا ہے بلکہ ایک اندھی طبیعت بالکل غیر اخلاقی اسباب سے کبھی اچھے اور کبھی برے دن لاتی رہتی ہے۔ لہٰذا مصائب اور آفات کے نزول سے کوئی اخلاقی سبق لینا اور کسی ناصح کی نصیحت قبول کرکے خدا کے آگے تضرع و زاری کرنا بجز ایک طرح کی نفسی کمزوری کے اور کچھ نہیں ہے۔ خوش حالی میں سرکش لوگ چہکنا اور اہلِ حق کا مذاق اڑانا شروع کر دیتے ہیں کہ یہ عقل کے کوتاہ لوگ پچھلے قحط اور سیلاب کو ہمارے اعمال و افکار کی خرابی کا نتیجہ بتاتے تھے حالانکہ ان باتوں کا ایمان و اخلاق سے کیا تعلق اس قسم کی گردشیں تاریخ میں ہوتی رہتی ہیں۔ ان حالات سے ہم ہی دوچار نہیں ہوتے ہمارے باپ دادوں پر بھی یہ دن گزرے ہیں۔ یہ تو زمانے کے اتفاقات ہیں کبھی تنگی ہے کبھی فراخی ہے کبھی کاروبار میں ترقی ہوئی کبھی ناکامی، کبھی فصل اچھی ہوئی اور کبھی ماری گئی۔ کبھی سیلاب آگیا اور کبھی قحط پڑ گیا۔ یہ تو بین الاقوامی حالات کا طبعی تقاضا ہے۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ دنیوی زندگی کی یہی سہولتیں بھی آسانیاں جنہیں قرآن نے یہاں الحسنہ کہا ہے۔ زندگی کی یہی شکل قوموں اور افراد کے لیے عصیان و تمرد کا قدرتی انتقام بھی بن کر نمودار ہوتی ہے۔ دور سے نظارہ کرنے والے کے لیے یہی انتقام صلہ اور جزا معلوم ہوتا ہے لیکن خود اللہ سبحانہ، کا بیان ہے کہ درحقیقت وہ باطنی سزا کی خطرناک انتہائی خطرناک صورت ہوتی ہے۔ اقوام کے متعلق اس کا عجیب و غریب قانون کا ذکر کرتے ہوئے قرآن میں بتایا ہے کہ اس قسم کی تادیلی ذہنیتیں رکھنے والی قوموں کے ساتھ اللہ کا عام دستور یہ ہے کہ کچھ دن کے لیے ان کو ڈھیل دی جاتی ہے ڈھیل ہی نہیں بلکہ ان مواقع کی ایسی آیتیں مثلاً سورہ انعام میں پڑھ چکے ہو فلما نسوا ما ذکروا بہ فتحنا علیہم ابواب کل شیء جب وہ بھول گئے ان باتوں کو جن سے چونکائے گئے ہیں یا زیرِ تشریح والی آیت ثم بدلنا مکان السیئۃ الحسنۃ وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ حالات سے بھی زیادہ ان پر آسانیوں کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور کل شیء یعنی ہر قسم کی چیزوں کے اور زندگی کے تمام شعبوں کے دروازے ان پر کھل جاتے ہیں۔ السیئہ برائیوں کو الحسنہ سے بدل دیا جاتا ہے۔ گویا مٹی ان کے ہاتھوں میں پہنچ کر ایسی حالت میں سونا بنتی جاتی ہے۔ وہ بڑھتے ہیں بڑھائے جاتے ہیں اور بڑھاتے چلے جاتے ہیں حتی عفوا کے

یہی معنے ہیں کہ اس زمانہ میں ترقی و عروج، ارتقاء اعتلاء کی انتہائی بلندیوں پر ان کو پہنچا دیا جاتا ہے اور اس کے بعد یہ فرمایا:

قالوا قد مس اباءنا الضراء والسراء فاخذنا هم بغتة وهم لا يشعرون

اور بولے کہ ہماری گزشتہ نسلوں کو بھی دکھ اور سکھ نے چھوا تھا بس ہم نے اُن کو اچانک آلیا اس طرح کہ ان کو پتہ بھی نہ تھا۔

اس کا مطلب یہی ہے کہ ان ساری ترقیوں، اولوالعزمیوں کے بعد قدرت کا مخفی ہاتھ اچانک ان کو پکڑ لیتا ہے اور اس طرح پکڑتا ہے کہ ان کا سارا کیا کرایا برباد ہو کر رہ جاتا ہے۔ سرکش دماغی قوموں کے ساتھ اللہ سبحانہ کا یہ انتقامی برتاؤ جو بظاہر سرفرازیوں کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے ان لوگوں کے لیے بڑا صبر آزما اور انتہائی خطرات کا سبب بن جاتا ہے جن کو انجام سے پہلے انتقام کے اس عجیب و غریب عبوری دور میں زندگی گزارنی پڑتی ہے۔ سب کچھ دیا جاتا ہے ان کو انتقاماً اور مجرمانہ غفلتوں پر تازیانہ اور عبرت بنا کر تاکہ ان کی غفلتوں میں اضافہ ہو جائے۔ سیئہ کی جگہ اس حسنہ کی ٹوپی اڑھانے سے مقصد اور صرف یہ ہوتا ہے کہ ان کو اندھا بنایا جائے اور خوش حالیوں، مرفہ الحالیوں اور ترقیوں کی ڈاٹیں ان کے کانوں میں اس طرح ٹھونسی جاتی ہیں کہ نیکی کی راہوں سے بیگانہ ہو جائیں لیکن وہ اپنی جگہ اس خوش فہمی میں مگن رہتے ہیں کہ ہم ہی اللہ کے پیارے ہیں اور ان لوگوں میں ہیں جن کو خدائی نعمتوں کے لیے اللہ نے چن لیا ہے۔ اسی مغالطی قالب کے بارے میں قرآن نے یہ تنبیہہ کی ہے:

فلا تعجبك اموالهم ولا اولادهم انما يريد الله ليعذبهم في الحياة الدنيا وتزهق انفسهم وهم كافرون۔

تو دیکھو یہ بات کہ لوگوں کے پاس مال و دولت ہے اور صاحبِ اولاد ہیں۔ تمہیں حیران نہ کرے یہ تو اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ نے مال و اولاد ہی کی راہ سے ان کو دنیا میں عذاب دینا چاہا ہے اور ان کی جانیں اس حال میں نکلیں گی کہ ایمان سے محروم ہوں گے

اس میں بتایا گیا ہے کہ ان کا حال اہلِ ایمان کے ایمان کو نہ لرزا دے صاف لفظوں میں اعلان کر دیا گیا ہے کہ الاموال اور الاولاد کی یہ وہی قسم ہے جس کے ذریعے اللہ سبحانہ ان لوگوں کو سزا دیتا ہے اور منشا یہی ہے کہ اسی ناشکری اور ایمان سے محرومی کی حالت میں ان کو موت اس طرح آئے کہ چونکنے اور سنبھلنے کا ان کو موقعہ نہ ملے۔

قوموں کی حد تک تو شاید الحسنہ خوش حالی کا یہ سزائی قالب ایسا نہیں ہے جسے پہچاننے والے نہ

پہچان سکیں۔ دنیا میں ایسی قومیں جن کی زندگی کا ہر شعبہ ناخدا شناسی اور خدا کی کھلم کھلا بغاوت پر مبنی ہے اور اس کے ساتھ ان کا ہر باغیانہ اقدام ان کے لیے اچھے سے اچھے دنوں کو فراہم کر رہا ہے۔ اپنی طغیانیوں میں جس قدر آگے ہوتے جاتے ہیں اسی قدر ابواب کل شیئ اور الحسنہ کے کھلنے کا سلسلہ بھی زیادہ سے زیادہ ہوتا جاتا ہے۔

اگر آپ خدا اور رسول کو مانتے ہیں قرآن کو انسانی دماغ کا خود تراشیدہ نظام نہیں سمجھتے بلکہ نسل انسانی کے جینے اور رہنے کا قدرتی اور لاہوتی دستور تسلیم کرتے ہیں تو آپ کے لیے اس کے سوا اور راہ کون سی ہے جس کی اطلاع قرآن میں دی گئی ہے۔ ہر قرآن خوان اور قرآن دان قرآن سے یہی بات سمجھے گا اور اس کو اس کے سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے گی۔ قابل رحم تو وہ مسکین ہے جو ایک طرف تو خدا کو بھی مانتا ہے اس کے رسول کو بھی سراہتا ہے لیکن اللہ کے باغیوں اور رسول کے دشمنوں پر نعمتوں کی بارش دیکھ کر اور السیئہ کی جگہ الحسنہ دیکھ کر اس انتقام کو انعام اور اس سزا کو وہ عمل کی جزا اوروں کے کرتوتوں کا صلہ ماننے لگے۔ ایک لیڈر تو اسی راہ میں بھٹک کر اہل یورپ کے بارے میں یہاں تک کہہ گئے۔

الفرنگیون اولئک ھم المومنون حقاً

یورپ کے باشندے ہی سچے اور پکے مومن ہیں۔

اوروں کا پتہ نہیں کم از کم میں اپنے قرآنی مطالعہ کی روشنی میں اس قسم کے دماغوں کی ذہنی دستوں کو سمجھنے سے قاصر ہوں۔ اگر خدا کی ان باغی قوموں کے ساتھ یہ مردم شماری کے مسلمان بھی قرآن سے خدا سے رسول سے بغاوت کر دیتے اور اس وقت یہ بات کہتے تو اس کی کوئی گنجائش ہوتی لیکن جس تناقض اور تضاد کا شکار موجودہ حالات میں ان کا دماغ ہے اس کی کوئی توجیہ سمجھ میں نہیں آتی ہے۔

بہر حال ان دو آیتوں میں دو قانون بتاتے گئے ایک کی اساس مصائب ہے جب کہ دوسرے کی عمارت معاصی پر کھڑی ہے۔ ظاہر ہے کہ مصیبت کا وزن معصیت سے ہلکا ہے۔ پہلا اگر اس لیے ہے کہ لوگوں میں توبہ واستغفار کی طرف میلان ہو تو دوسرا اس لیے ہے کہ ان کے لیے ہلاکت اور تباہی ہو۔ قوم عاد، قوم ثمود اور اصحاب مدین کے واقعات میں اس کی تصویر پیش ہو چکی ہے۔ ان قوموں پر عذاب کے قوالب اگرچہ مختلف ہیں۔ عاد پر کسی طرح کا عذاب اترا، ثمود پر کسی اور طرح کا۔ اہل مدین پر کسی دوسری صورت میں مگر عذاب کی شکلیں اور صورتیں خواہ کتنی مختلف

ہوں وہ قانون جس کے تحت یہ عذاب نازل ہوا ہے ایک ہی ہے۔ قانون یہ اور صرف یہ ہے کہ جب کسی قوم کی خوشحالی بڑھ جاتی ہے تو وہ غلط کاری اور گمراہی کی طرف مائل ہو جاتی ہے اور خود بخود اس کی عملی قوتوں کا رُخ صلاح سے فساد کی طرف پھر جایا کرتا ہے۔

یہ عذابِ الٰہی کا قانون جس طرح پچھلی قوموں پر جاری ہوتا رہا ہے اسی طرح آج بھی اس کا عمل جاری ہے اور اگر بصیرت ہو تو آج آپ خود اپنی آنکھوں سے اس کے نفاذ کی کیفیت ملاحظہ کرسکتے ہیں۔ مغرب کی وہ عظیم الشان قومیں جن کی دولت مندی، خوشحالی، طاقت و جبروت، شان و شوکت، عقل و ہنر کو دیکھ کر نگاہیں خیرہ ہوتی جاتی ہیں اور جن پر ابواب کل شیئ کی پیہم بارشوں کے مشاہدے سے یہ دھوکا ہوتا ہے کہ شاید یہ خدا کے بڑے ہی مقبول اور چہیتے بندے اور خیر و صلاح کے مجسمے ہیں ۔ ان کی اندرونی حالت پر ایک غائر نگاہ ڈالیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ عذابِ الٰہی کے اسی قانون کی گرفت میں آچکے ہیں۔ وہی صنعت و حرفت کی فراوانی وہی تجارت کی گرم بازاری، وہی شعورِ سیاست کی کامیابی وہی علوم حکمیہ و عقلیہ کی ترقی، وہی نظامِ معاشرت کی سربفلک بلندی جس نے ان قوموں کو دُنیا پر غالب کیا اور روئے زمین پر ان کی دھاک بٹھائی۔ آج ایک ایسا خطرناک جال بن کر ان کو لپٹ گئی ہے جس کے ہزاروں پھندے ہیں اور ہر پھندے میں ہزاروں مصیبتیں ہیں۔ وہ اپنی عقلی تدبیروں سے جس پھندے کو کاٹنے کی کوشش کرتے ہیں اس کا ہر تار کٹ کر ایک نیا پھندا بن جاتا ہے اور رہائی کی ہر تدبیر مزید گرفتاری کا سبب بن جاتی ہے۔ ان کی حیثیت ان قوموں سے قطعاً مختلف نہیں ہے جن کو ماضی میں اللہ کی نعمتوں پر شکر کی توفیق نہیں ہوئی اور جن کو اللہ کی گرفت خدا کی نافرمانی سے نہ بچا سکی۔ یہ اپنے علوم و فنون کی نعمتوں کو کمزوروں پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ دن رات اقتداری جنگ میں مصروف ہیں اور فسق و فجور میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں اللھم اعذنا من شرور انفسھم و سیئات اعمالھم۔

ہمارے شارحین قرآن نے ان آیات میں بیان کردہ ضوابط کی افراد کی حد تک تو خوب وضاحت کی ہے لیکن اجتماع اور عمران کے موضوع پر وہ بالکل خاموش ہیں۔ حالانکہ یہاں قرآن کا روئے سخن اقوام ہیں افراد نہیں۔ افراد منطوق کے درجہ میں نہیں بلکہ مدلول کے درجہ میں ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام میں تصوف کی توجہات کا مرکز افراد کی اصلاح اور ذاتی تزکیہ ہے اور قرآن کی بیشتر تشریحات اسی دور کی تخلیقات ہیں۔

آسمان وزمین کی برکتیں اور ایمان وتقویٰ

۹۶ - اور اگر ان بستیوں والے ایمان لاتے اور برائیوں سے بچتے تو ہم آسمان اور زمین کی برکتوں کے دروازے ان پر کھول دیتے لیکن انھوں نے جھٹلایا لہٰذا ہم نے ان کو ان کی کمائی کی وجہ سے جو انھوں نے حاصل کی پکڑ لیا - یعنی ہم کو بندوں سے کوئی ضد نہیں جو لوگ عذاب الٰہی میں گرفتار ہوتے ہیں یہ انہی کی کرتوتوں کا نتیجہ ہے - اگر یہ لوگ ہمارے پیغمبروں کو مانتے اور حق کے سامنے گردن جھکا دیتے اور کفر وتکذیب سے بچ کر تقویٰ کی راہ اختیار کرتے تو ہم ان کو آسمانی وزمینی برکتوں سے مالا مال کر دیتے - امام رازی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ برکت کا لفظ دو معنے میں استعمال ہوتا ہے - کبھی تو خیر باقی ودائم کو برکت سے تعبیر کرتے ہیں اور کبھی کثرت آثار فاضلہ پر یہ لفظ اطلاق کیا جاتا ہے - لہٰذا آیت کی مراد یہ ہوگی کہ ایمان و تقویٰ کے اختیار کرنے پر ان آسمانی وزمینی نعمتوں کے دروازے کھول دیے جاتے جو دائمی اور غیر منقطع ہوں یا جن کے آثار فاضلہ بہت کثرت سے ہوں ایسی خوش حالی نہیں جو مکذبین کو چند روز کے لیے بطور امہال واستدراج حاصل ہوتی ہے اور انجام کار دنیا میں ورنہ آخرت میں تو ضروری وبال جان بنتی ہے [1]

آیت کا بغیر کسی توجیہ وتاویل کے صریح مطلب یہی ہے کہ آسمان وزمین کی برکتیں جو ہمارے معاشی فوائد ہی کی دوسری تعبیر ہے ہم ان کو ایمان و تقویٰ کی قوت سے بھی حاصل کر سکتے ہیں جیسے ایمان وتقویٰ کو فراموش کرکے دوسرے ناجائز ذرائع فسق وفجور وغیرہ سے دنیا کی مادی منفعتیں اہل دنیا حاصل کرتے ہیں - اور جس کی طرف قرآن نے بدلنا مکان السیئۃ الحسنۃ، میں اشارہ کیا ہے اور جس کی سورہ انعام کی اس صراحت سے

فلما نسوا ما ذکروا بہ فتحنا علیھم ابواب کل شیئ

جب ہماری تذکیر کو بھول جاتے ہیں تو ہم ہر چیز کے ان پر دروازے کھول دیتے ہیں۔

پہلی صورت یعنی ایمان وتقویٰ کے نتیجہ میں جو کچھ ملے انعام واکرام کی ہے دوسری صورت یعنی معاصی کی موجودگی، چیزوں کی فراوانی انتقام کی ہے - ایمان وتقویٰ کی بنیاد پر جو برکات حاصل ہوتی ہیں ان برکات سے انسانی زندگی کتنی شگفتہ، پاک اور صاف وستھری ہوتی ہے۔ قرآن کی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اصطلاح میں اسی کا نام حیاۃ طیبہ ہے ارشاد ہے :

من عمل صالحاً من ذکر او انثی وھو مومن فلنحیینہ حیاۃ طیبۃ ،

مرد ہو یا عورت اگر ایمان و عمل صالح رکھتا ہے تو ہم ضرور اسے زندہ رکھیں گے ستھری زندگی کے ساتھ۔

آیت میں اھل القریٰ سے مراد وہی قومیں ہیں جن کی تکذیب کی داستان قرآن بیان کر چکا ہے فرمایا کہ یہ لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی راہ اختیار کرتے تو اللہ تعالیٰ ان سے یہ معاملہ نہ کرتا کہ ایک مہلت دینے کے بعد ان کو عذاب میں پکڑ لیتا بلکہ ان کے لیے آسمان و زمین دونوں طرف سے اپنی بے پایاں برکتوں کے دروازے کھول دیتا۔

دوسرے یہ کہ ایمان و تقویٰ کی زندگی جس طرح آخرت میں خدا کی رحمتوں کی ضامن ہے اسی طرح دنیا میں بھی اگر کوئی قوم ایمان و تقویٰ کو اختیار کرے تو یہ زمین و آسمان کی برکتوں اور فیروز مندیوں کی کلید ہے بلکہ قرآن کی آیت

الذین امنوا وکانوا یتقون لھم البشریٰ فی الحیاۃ الدنیا و فی الاخرۃ ، لا تبدیل لکلمات اللہ ،

میں اسی ایمان و تقویٰ کو آخری نجات سے پہلے دنیوی کامیابیوں کی بشارت کا ذریعہ قرار دے کر اللہ سبحانہ نے اپنی ایسی بابت یا ایک ایسا قانون قرار دیا ہے جو کبھی بدل ہی نہیں سکتا یعنی ایسی اٹل بات ہے جو اپنے مقررہ نتیجے سے جدا نہیں ہو سکتی۔ مطلب یہی ہوا کہ ایمان و تقویٰ کسی میں پایا جاتے اور اس کی زندگی ان نتائج سے محروم ہو ایسا کبھی ہو نہیں سکتا۔

بہرحال آیت میں اس اجتماعی قانون کی نشاندہی کی گئی ہے کہ ایمان و تقویٰ کو اپنانا دنیا میں انعامات و برکات کا ذریعہ ہے اور ایمان و تقویٰ والی جماعت اور قوم ان انعامات کی حقدار ہے۔ یہ قرآن کی آیت صاف اور کھلے طور پر بتا رہی ہے کہ اللہ سبحانہ ایمان و تقویٰ کا سرمایہ رکھنے والوں کو آخرت کی فلاح کے ساتھ ساتھ اس دنیا کی بھی آسائش اور عزت و اقتدار بخشے گا۔ کوئی وجہ نہیں کہ اسلام اور اہل اسلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ ضابطہ بدل جاتے۔ چنانچہ وہ نہیں بدلا، اور دنیوی فلاح کے بارے میں ٹھیک اسی طرح کا وعدہ اس امت سے بھی کیا گیا ہے جیسے پہلوں سے کیا جاتا رہا ہے اور ہر مرحلے میں کیا گیا۔ مکہ کے تاریک ماحول میں بھی کیا گیا اور مدینے کے پرخطر دور میں بھی۔ انہیں بھی خطاب کیا گیا جو ابھی اسلام نہیں لاتے تھے اور انہیں بھی

جو اسلام لا چکے تھے۔ ایمان و تقویٰ کی شرطیں پوری کرنے کے نتیجے میں یہ قانون اہلِ اسلام کے حق میں کیسے پورا اترا اس سے دُنیا ناواقف نہیں ہے۔ وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ اسلام نے مسلمان کو ایمان و تقویٰ کی بنیاد پر وہ سب کچھ دیا جو دُنیا میں کسی قوم کو مطلوب ہو سکتا ہے۔ آج بھی قرآن کی چیختی ہوئی صدا یہی ہے کہ ایمان و تقویٰ یا ایمان و عمل صالح کی دولت فراہم کرو اور آسمانی و زمینی برکتوں کا آنکھوں سے مشاہدہ کرو۔

شاید آپ کے ذہنوں میں یہاں یہ سوال چٹکیاں لے کہ دین تو انسان کو آخرت کی طرف بھگاتا اور دُنیا سے بے پروا بناتا ہے پھر اسے ایمان و تقویٰ کی بنیاد کیسے مل سکتی ہے؛ اس سوال کا جواب معلوم کرنے اور اس مسئلے کو سمجھنے کے لیے یہ دو اصولی باتیں سمجھ لینی چاہئیں۔

ایک تو یہ کہ یہ دولت یہ عزت یہ اقتدار حکومت جنہیں دُنیا کی فلاح کہا جاتا ہے یا جو برکات من السماء والارض ہے دین کی نگاہ میں بجائے خود معیوب نہیں ہیں۔ بلکہ اللہ سبحانہ کی نعمت اور اس کا فضل ہیں چنانچہ قرآن عزیز کی متعدد آیات میں یہ بات کھول کر سمجھائی گئی ہے۔

دوسری بات یہ کہ انسان اس دُنیا میں اللہ کا خلیفہ اور نائب بنا کر پیدا کیا گیا ہے۔ اس کا منصب ہی یہ ہے کہ وہ اس زمین کا انتظام اپنے ہاتھ میں رکھے اور اسے اپنے مالک کے احکام و مرضیات کے مطابق چلائے۔

یہ دونوں حقیقتیں اگر سامنے ہوں تو زیر بحث سوال اس حد تک بالکل حل ہو جاتا ہے کہ دُنیا کی عزت، دولت اور اقتدار ہرگز ایسی چیزیں نہیں ہیں جن سے تعلق رکھنا اور فائدہ اٹھانا دین و ایمان کے منافی ہو کیونکہ جو چیزیں اللہ کا فضل و احسان ہوں وہ اس کے حق شناس بندوں کے لیے ممنوع نہیں ہو سکتیں۔ اس طرح کی چیزوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا تو ارشاد یہ ہے ھی للذین آمنوا فی الحیاۃ الدنیا خالصۃ یوم القیامہ، اس کے معنے یہ ہیں کہ ان چیزوں کے اصل حقدار اللہ کے فرمانبردار بندے ہی ہیں۔ اگر ان چیزوں کے حقدار اللہ تعالیٰ کے فرمان بردار بندے ہی ہیں تو وہ ان کے لیے ناپسندیدہ اور نامطلوب کسی طرح نہیں ہو سکتیں۔ خدا شناس بندے اس کی نعمتوں سے بھاگتے ہیں نعمتوں سے نہیں بھاگتے۔ یہ تو ہوا دنیوی عزت دولت کے نعمت و فضل ہونے کا تقاضا اب انسان کے پیدائشی منصب کو سامنے رکھ کر غور کیجیے کہ اس کا تقاضا کیا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے انسان کو خلیفہ بنایا ہے اور چاہتا ہے کہ اس زمین پر وہ اس کے احکام کے مطابق اپنے اختیارات کو استعمال کرے تاکہ یہاں بھی اس کی مرضی پوری ہوتی رہے جس طرح کہ باقی کائنات میں پوری ہو رہی ہے

تو جب تک یہاں ایسے لوگ موجود ہوں جو اپنے اس فرضِ منصبی کا پورا احساس رکھتے ہوں اس وقت تک رہا یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت، دانائی اور انصاف کے بالکل خلاف ہوگی کہ انہیں اس زمین کے اقتدار و اختیار سے محروم رکھے اور ان کے ہوتے ہوتے یہ اقتدار ان لوگوں کے سپرد کر دے جو اپنے اس فرضِ منصبی کے منکر ہوں اور اپنے بارے میں خلیفہ ہونے کی پوزیشن ہی کو نہ مانتے ہوں اور اس دُنیا میں اپنی آزاد حاکمیت کے یا کسی اور حاکمیت کے مدعی ہوں۔ ان تمام پہلوؤں پر غور کیجئے تو آپ خود محسوس کریں گے کہ مسلمان اخروی فلاح ہی کا نہیں بلکہ دنیوی فلاح کا بھی حقدار اور طلبگار ہوتا ہے اور اس کے لیے ایسا ہونا اس کی سچی دینداری ہی کا تقاضا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک سچے اور صحیح الفکر مسلمان کی دُعا اپنے خدا سے یہ ہوتی ہے ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنۃ و فی الاخرۃ حسنۃ و قنا عذاب النار اور واجعلنا للمتقین اماماً، آخر میں اس حقیقت کا یاد دلانا بھی مناسب ہوگا کہ جس طرح سچا ایمان و تقویٰ آخرت کی فلاح کے لیے ضروری ہے اسی طرح دُنیا کی فلاح کے لیے بھی ضروری ہے۔ یعنی دنیوی برکتوں کے دروازے مسلمانوں پر اس وقت کھولے جاتے ہیں جب وہ ایمان و تقویٰ کی شرط پوری کر دیتا ہے۔ غرض جہاں اللہ تعالیٰ کا یہ ایک عمومی وعدہ ہے کہ وہ اپنے دین کے ماننے والوں کو دنیوی فلاح سے بھی نوازتا ہے وہیں اس آیت کی رو سے اس کا یہ بھی ایک عمومی ضابطہ ہے کہ یہ ایمان و تقویٰ کی لازمی شرط کے ساتھ مشروط ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان و تقویٰ کے بغیر صرف آخرت ہی کی نہیں دُنیا کی فلاح بھی ہاتھ نہیں آسکتی۔ دین کے بغیر صحیح معنوں میں دُنیا بھی نہیں مل سکتی۔ یہ ضابطہ افراد ہوں یا جماعت سب کے لیے ہے۔ کوئی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ افراد کو بھی اپنی انفرادی زندگی کی دنیوی فلاح مثلاً امن و سکون، عزت و محبوبیت اور ضروریاتِ زندگی وغیرہ اسی وقت ملے گی جب وہ اپنی حد تک ایسے خدا شناس اور آخرت پسند ہوں جیسا کہ ایک مسلمان کو ہونا چاہیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حقیقت کی وضاحت کی تھی جب آپ نے یہ فرمایا تھا۔

> جس نے اپنے کل کی فکر ایک ہی فکر اپنی آخرت کی فکر کو بنا لیا اللہ تعالیٰ اس کی دُنیا کا انتظام کر دینے کے لیے کافی ہے اور جس کے ذہن کو بے شمار افکار نے منتشر کر رکھا ہو اللہ کو اس کی کوئی پروا نہیں کہ وہ اس دُنیا کی کس گھاٹی میں ہلاک ہوتا ہے۔

اسی طرح اُمت کو بھی اپنی اجتماعی زندگی کی فلاح، آزادی، دولت مندی، سربلندی، اقتدار اور بین الاقوامی احترام وغیرہ اسی وقت میسر آسکتی ہے جب وہ اپنی اجتماعی حیثیت میں فی الواقع اُمت ہو۔

بہرحال اس آیت میں بتایا ہے کہ دنیوی برکتوں کو ایمان و تقویٰ کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہے اور ایمان و تقویٰ کے ذریعے جو برکات حاصل ہوتی ہیں وہ اللہ کا انعام ہیں جیسا کہ پہلی آیت میں بتایا تھا کہ نافرمانیوں کے بحران میں جو چیزوں کی فراوانی ہوتی ہے وہ انعام نہیں بلکہ اللہ کی جانب سے سزا اور انتقام ہوتی ہے۔

خدا کی گرفت سے کوئی نہیں بچ سکتا

۱۲۶۔ کیا شہروں کے بسنے والوں کو اس بات سے امان کا پروانہ مل گیا ہے کہ ہمارا عذاب راتوں رات آنازل ہو اور وہ سوتے ہوں یا انہیں اس بات سے امان مل گئی ہے کہ دن کی روشنی میں ان پر عذاب آجاتے اور وہ کھیل کود میں مشغول ہوں۔ یعنی جب عیش و آرام میں غافل پڑے سو رہے ہوں یا دنیا کے کاروبار اور لہو و لعب میں مشغول ہوں اس وقت خدا کا عذاب ان کو دفعتہً آگھیرے۔ اس بات سے یہ لوگ کیوں نڈر اور بے فکر ہو رہے ہیں۔ حالانکہ جن اسباب کی بنا پر گزشتہ اقوام پر عذاب آتے وہ ان میں بھی موجود ہیں۔ یعنی کفر و تکذیب اور سید الانبیاء کے ساتھ مقابلہ و محاربہ[1]

اس آیت میں بھی اشارہ ان ہی قوموں کی طرف ہے جن کا ذکر پہلے سے ہو رہا ہے یعنی قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود اور قوم مدین، ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مرز دلبراں گفتہ آید در حدیث دیگراں کے انداز پر قریش مکہ کو توجہ دلائی ہے کہ تمہارا معاملہ بھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وہی کچھ ہے جو ان قوموں کا اپنے پیغمبروں کے ساتھ تھا۔ وہ خدا کے عذاب کے مقابلہ میں کچھ نہ کر سکے۔ ان پر خدا کا عذاب رات کی تاریکی میں اس وقت بھی آیا جب وہ سو رہے اور دن کی کھلی روشنی میں اس وقت بھی جب وہ اپنی دلچسپیوں اور سرگرمیوں میں مصروف تھے اور یہ نتائج تھے ان کی بدکاریوں اور نافرمانیوں کے، جس طرح دنیا میں ہر چیز کی ایک خاصیت ہے اور وہ جب یہاں وجود پذیر ہوتی ہے تو اس کے ساتھ اس کے آثار و خواص بھی پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح اس دنیا میں انسانی اعمال کے بھی کچھ آثار و لوازم ہیں جو ان سے الگ نہیں ہو سکتے۔ کفر و شرک، فسق و فجور، بے ایمانی، غرور و ظلم کا ایک نہ ایک اثر و نتیجہ ہے اور ہر ایک کے کچھ نہ کچھ خصائص و لوازم ہیں جو اس سے اسی طرح الگ نہیں ہو سکتے جس طرح سنکھیا سے سمیت اور آگ سے حرارت جدا نہیں ہو سکتی۔ اور ان معنوی، روحانی اور نفسیاتی چیزوں میں علت و معلول کا وہی لزوم ہے جو جسمانی، مادی اور طبیعاتی اشیا میں ہے

[1] افادات شیخ الاسلام

اشخاص کی نیکوکاری و بدکاری اور افراد کی سعادت و شقاوت کے جو قوانین ہیں وہی جماعتوں، قوموں کی صلاح و فساد اور سعادت و شقاوت پر بھی حاوی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہاں قوانین کی بے لاگ عدالت ہے۔ خدا کی تدبیر بے اماں ہے کسی کی طاقت نہیں کہ اس سے بچ سکے جس طرح ماضی میں قانون نے کسی کا لحاظ نہیں کیا حال اور مستقبل میں بھی وہ سب کے لیے یکساں ہے۔ ماضی کی داستان میں ایک فریق نبی ہے جس کی دعوت جس کی نصیحت و خیرخواہی اور جس کی ساری باتیں بعینہٖ وہی ہیں جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہیں اور دوسرا فریق حق سے روگرداں قوم ہے جس کی اعتقادی گمراہیاں جس کی اخلاقی خرابیاں جس کی جاہلانہ ہٹ دھرمیاں جس کے سرداروں کا استکبار جس کے منکروں کا اپنی ضلالت پر اصرار غرض سب کچھ وہی ہے جو قریش میں موجود ہے۔ اگر وہاں اعمال کے نتائج رات کی تاریکیوں اور دن کی روشنیوں میں اگر ان کو تباہ کر سکتے ہیں تو قریش کو کون بچا سکتا ہے۔ ان کو اگر خدا کے قوانین کا علم ہوتا تو وہ دن رات یوں اطمینان سے نہ گزارتے۔ کیونکہ نعمتوں کا ہونا۔ ان کے دوام کی دلیل نہیں ہے۔

خدائی قانون کی گرفت سے بے فکر قومیں

۱۲۷۔ کیا ان کو خدا کی مخفی تدبیروں سے اماں مل گئی ہے یاد رکھو خدا کی مخفی تدبیروں سے بے خوف وہی ہوتے ہیں جو تباہ ہونے والے ہوتے ہیں۔ دُنیوی خوشحالی اور عیش کے بعد جو خدا کی ناگہانی پکڑ ہے اسی کو مکراللہ (خدا کا داؤ) فرمایا ہے۔ عیش و تنعم میں پڑ کر وہ بھی لوگ خدا کی ناگہانی گرفت سے بے فکر ہوتے ہیں جن کی شامتِ اعمال نے انہیں دھوکا دیا ہو۔ مومن کی شان یہ ہے کہ وہ کسی حال خدا کو نہ بھولے۔

ظفر اس کو آدمی نہ جانیے گا گو ہو کیسا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا [1]

مکر کے معنے مخفی داؤ اور تدبیر کے ہیں۔ امام راغب نے لکھا ہے کہ اللہ کی خفیہ تدبیر کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ اپنے قوانین و ضوابط کے نفاذ میں ایسا طریقہ اختیار کرتا ہے جو لوگوں کی نگاہوں سے مخفی ہوتا ہے اور وہاں سے پکڑتا ہے جہاں سے پکڑے جانے کا گمان بھی نہیں ہوتا۔ اللہ کے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

قوانین وضوابط کے نفاذ کے طریقہ سے لوگوں کی بے خبری ہی لوگوں کو دھوکہ میں ڈال دیتی ہے۔ طاقتور اپنی قوت پر سرمایہ دار اپنے سرمایہ پر، عالم اپنے علم پر، عابد اپنی عبادت پر مغرور ہوتا ہے اور اسے دھوکہ ہوتا ہے کہ ملی ہوئی نعمت باقی رہے گی۔ اور نہیں جانتا کہ اللہ کے داؤ کیسے مخفی اور ناگہاں ہوتے ہیں زلزلے کے اسباب شب و روز نشوونما پاتے رہتے ہیں۔ سیلاب ایک لمحہ کی برف باری ہی کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ آتش فشاں پہاڑوں کا لاوا برسوں تک کھولتا رہتا ہے۔ اللہ سبحانہ، چپکے چپکے یہ سب کام کرتا رہتا ہے لیکن ہم دن رات گزارتے رہتے ہیں اور ایک لمحہ کے لیے گمان بھی نہیں ہوتا کہ کوئی غیر معمولی بات ہونے والی ہے یہاں تک کہ اچانک اس کا داؤ نمودار ہو جاتا ہے اور ہم یک قلم غفلت و سرمستی میں سرشار ہوتے ہیں فلا یامن مکر اللہ الا لقوم الخاسرون [1] مطلب یہ ہے کہ کیا انہوں نے اطمینان کر لیا ہے کہ ان کا سیاسی اقتدار ہمیشہ برقرار رہے گا اور کسی روز ان کی وجاہت و قوت پر کوئی دہا وا نہ ہوئے گا۔ کیا ان کو یقین ہے کہ ان کی تندرستیاں اور صحتیں باقی رہیں گی اور کسی روز بیماری کے جراثیم ان کی بستیاں نہ دیکھیں گے۔ کیا انہوں نے اس کی کوئی ضمانت لے لی ہے کہ افرادی قوت ہمیشہ قائم رہے گی اور کوئی طاعون اور کوئی ہیضہ اور ایسے ہی دوسرے وبائی امراض سے کوئی مرض پھیل کر ان کی افرادی طاقت کو ختم نہ کر دے گا کیا وہ اس سے بے خوف ہو چکے ہیں کہ ایک دن یکایک ان کے گھر کے تنوروں، ان کے کنوؤں اور ندی نالوں سے کوئی ایسا ہی سیلاب نہ آجائے گا جیسے قوم نوح پر آیا تھا۔ کیا ان کو اطمینان ہے کہ ان کے مکانوں، کارخانوں اور دکانوں پر قوم عاد کی طرح سات رات اور آٹھ دن تک مسلسل آندھی کا طوفان آکر تباہی و بربادی نہ مچا دے گا اور کیا ان کو یہ اندیشہ نہیں ہے کہ قوم ثمود کی طرح ان کی بلند بالا عمارات زلزلہ کی نذر نہ ہو جائیں گی۔ اور کیا ان کو اطمینان ہے کہ قوم لوط کی طرح ان پر پتھروں کی بارش نہ ہوگی اور کیا وہ حق کا مقابلہ کر کے اور نبوت کی تکذیب کر کے یہ خیال نہیں کرتے کہ قوم شعیب کی طرح ان پر آگ کے شعلے اور چنگاریاں برس کر ان کی ساری ترقیوں کو ختم کر دیں گے۔ یقیناً یہ سب کچھ ہو سکتا ہے اور اللہ کی خفیہ تدبیر اس داؤ پر ہے لیکن فلا یامن مکر اللہ الا القوم الخاسرون۔ یاد رکھو اللہ نے فطرت کے تمام مظاہر کے لیے ایک خاص بھیس مقرر کیا ہے وہ جب کبھی آئے گی تو اسی بھیس میں آئے گی اس کا بھیس بدل نہیں سکتا لیکن اس کے ظہور کے مقاصد ہمیشہ یکساں نہیں ہوتے اور حقیقت حال انسانی علم کی دسترس سے باہر ہے۔ اس لیے

---

[1] ترجمان القرآن

عذاب کا ظہور اگرچہ قدرت کی عادی و جاری صورتوں میں ہوتا ہے لیکن اس لیے ہوتا ہے کہ انکار و کفر کے نتائج لوگوں کے سامنے آجائیں اور پیغمبروں نے ان کے ظہور کی پہلے سے خبر دے دی تھی۔

انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی ہلاکت

۱۲۸۔ کیا جو لوگ ملک والوں کے ہلاک ہونے کے بعد ملک کے وارث ہوتے ہیں یہ بات نہیں جانتے کہ اگر ہم چاہیں تو ان کو بھی گناہوں کی پاداش میں مصیبتوں میں ڈال دیں اور ان کے دلوں پر مہر لگا دیں کہ کوئی بات ہی نہ سنیں۔ جیسے پہلوں کو پکڑ لیا تمہیں بھی پکڑ لیں گے

الذین یرثون الارض صیغہ حال ہے اور اس سے مراد قریش مکہ ہیں اور من بعد اھلھا سے ماضی کے حکمران مراد ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ قریش مکہ جو اب ملک میں حکمرانی کر رہے ہیں پچھلے حکمرانوں کے حکومت میں وارث ہیں اور یہ پچھلے حکمران وہی ہیں جن کا قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود، قوم لوط، قوم شعیب کے نام کا ذکر ہو چکا ہے۔ یہ سب عرب قومیں تھیں اور اسی ملک کے مختلف حصوں میں حکومت کرتی تھیں۔ اب ان کی ہی وراثت قریش مکہ کو ملی ہے۔ قریش کے لیے ان قوموں میں جن کے زوال کی داستانیں ابھی ابھی قرآن نے سنائیں کافی رہنمائی موجود ہے۔ قریش اگر دانائی سے کام لیں تو سمجھ سکتے ہیں کہ کچھ مدت پہلے جو لوگ یہاں دادِ عیش دے رہے تھے اور جن کی عظمت کا جھنڈا یہاں لہرا رہا تھا انہیں فکر و عمل کی غلطیوں نے برباد کیا اور یہ بھی محسوس کر سکتے ہیں کہ جس بالاتر اقتدار نے کل انہیں ان کی غلطیوں پر پکڑا تھا اور ان سے یہ جگہ خالی کرالی تھی وہ آج کہیں چلا نہیں گیا ہے۔ نہ اس سے کسی نے یہ طاقت و قوت سلب کر لی ہے قریش مکہ اگر وہی بدعنوانیاں کریں جو عاد و ثمود کرتے رہے ہیں تو وہ ان کو بھی اسی طرح اقتدار سے محروم نہ کر سکے جس طرح اس نے ان سے پہلوں کو محروم کیا تھا یعنی قریش کو اپنے مورثوں کی تاریخ سے عبرت حاصل کرنا چاہیے۔ اللہ سبحانہ نے جس قانون سے ان کو ہلاک کیا وہ اسی قانون سے قریش کو کیوں ہلاک نہ کرے فرمایا کہ قریش مکہ کیوں نہیں سوچتے کہ جس طرح ہم نے ان کو ان کے جرموں کی پاداش میں سزا دی۔ اسی طرح جب چاہیں قریش کو بھی ہلاک کر دیں گے۔

تاریخ کا فلسفہ قرآن میں

یہ اور اس قسم کی دوسری آیات میں اشارہ ہے کہ قرآن میں تاریخی واقعات کی حیثیت تاریخی داستان کی نہیں ہے بلکہ یہ کچھ باتیں ہیں جن کا وہ دلوں میں اذعان پیدا کرنا چاہتا ہے اور یہ تاریخی حقائق اس کے لیے دلیلیں ہیں حجتیں ہیں براہین ہیں۔ یہ بات کہ کیونکر یہ تاریخی حقائق بیّنات و دلائل ہیں۔ اس آیت میں اسی کی طرف اشارہ ہوا ہے اولم یھد للذین یرثون الارض من بعد اھلھا میں بتایا ہے کہ جس طرح ہر بات کے لیے خدائی قوانین موجود ہیں اسی طرح قوموں، جماعتوں کی سعادت و شقاوت اور حیات و ممات کا بھی ایک قانون ہے اور جس طرح اللہ سبحانہٗ کے سارے قوانین یکساں ہیں عالمگیر ہیں غیر مبدل ہیں۔ اسی طرح یہ قانون بھی ہمیشہ ایک طرح رہا ہے اور ہمیشہ ایک ہی طرح کے احکام و نتائج ظاہر ہوتے ہیں۔ زمانوں اور قوموں کے اختلاف سے اس کی تاثیر مختلف نہیں ہو سکتی۔ جس طرح سنکھیا کا خاصہ ہلاکت ہی ہے خواہ کسی ملک اور کسی عہد میں کھائی جائے اسی طرح اس قانون کے احکام و نتائج بھی یکساں ہی ہوں گے خواہ وہ کسی ملک اور کسی عہد میں پیش آئیں یہ نہیں ہو سکتا کہ قوم عاد کے زمانے جو اعمال موجب ہلاکت تھے وہ اب زندگی کا سامان ہو جائیں۔

ایک اور اجتماعی قانون

اس آیت میں من اھلھا کے بعد اصبنا ھم بذنوبھم سے یہ قاعدہ بھی نکلتا ہے کہ ہلاکت و بربادی کا سبب انفرادی شر و فساد نہیں بلکہ قرآن کی نظر میں اجتماعی اور قومی شر و فساد ہے یعنی اعتقاد اور عمل کی خرابیاں اگر متفرق طور پر افراد میں پائی جاتی ہوں لیکن مجموعی طور پر قوم کا دینی و اخلاقی معیار اتنا بلند ہو کہ افراد کی برائیاں اس کے اثر سے دبی رہیں تو خواہ افراد علیحدہ علیحدہ کتنے ہی خراب ہوں قوم بحیثیت مجموعی سنبھلی رہتی ہے اور کوئی فتنہ عام برپا نہیں ہوتا جو پوری قوم کی بربادی کا موجب ہو مگر جب اعتقاد اور عمل کی خرابیاں افراد سے گزر کر پوری قوم میں پھیل جاتی ہیں اور قوم کا دینی احساس اور اخلاقی شعور اس درجہ ماؤف ہو جاتا ہے کہ اس میں خیر و صلاح کے بجائے شر و فساد کو پھیلنے اور پھولنے کا موقعہ ملنے لگے تو اس وقت اللہ تعالیٰ کی نظرِ عنایت ایسی قوم سے ہٹ جاتی ہے اور وہ عزت کے مقام سے ذلت کی طرف گرنے لگتی ہے یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اللہ کا غضب اس پر بھڑک جاتا ہے اور اس کو بالکل تباہ و برباد کر دیا جاتا ہے۔ اس سورت میں جو واقعات

بیان ہوتے ہیں وہ اس کی ہی مثالیں ہیں۔

قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود، قوم لوط اور قوم شعیب اہل مدین کے حالات کا قرآن میں بغور مطالعہ کرو تو محسوس ہوگا کہ ان کا بربادی کا الارم کن حالات میں بجا؟ انشاء اللہ اس کی مزید توضیح اسی جلد کے آخر میں آرہی ہے۔

آخر میں ارشاد ہوا ہے ونطبع علی قلوبھم فھم لا یسمعون۔

دلوں پر قہر الٰہی کی تمہید ہے

یہ بھی اگرچہ قریش مکہ کو دھمکی ہے لیکن اصل میں قانون بتایا جارہا ہے کہ مغضوبیت اور خدا کے یہاں سے مردود ہونے کی نشانی یہ ہے کہ ان کے دلوں پر مہر لگ جاتی ہے اور اس کے نتیجے میں وہ حق سننے سے محروم ہوتے ہیں۔ قرآن میں جہاں بھی اس قسم کی تعبیر آئی ہے وہاں پہلے یا بعد میں لوگوں کے گناہوں کا ذکر ضرور ہوتا ہے یہاں بھی پہلے اصبناھم بذنوبھم ہے مطلب یہ ہے کہ جن کو ہم حکومت دیتے ہیں اور جو لوگ حکومت کو اپنے مورثوں سے وراثت میں حاصل کرتے ہیں ان کے لیے ضروری ہے کہ دنیا میں پھونک پھونک کر قدم اٹھائیں مفسد اور ظلم کار نہ بنیں اور نہ بدکار سرمایہ دار ہوں۔ اور یہ بات کان کھول کر سن لیں کہ سیئات کی پاداش میں امتوں پر عذاب آتا ہے۔ ماضی میں اس کی بہت مثالیں ہیں۔ اور یہ واقعات کوئی وقتی حادثہ نہیں بلکہ اللہ کے قانون کا ناگزیر تقاضا ہیں اس میں کسی کی کوئی رعایت نہیں۔ اس میں دو قسم کے لوگ ہیں ایک طبقہ وہ ہے جو گناہ کرتا ہے لیکن گناہ کے بعد ندامت محسوس کرکے توبہ کی طرف قدم اٹھا دیتا ہے۔ اس کے مقابلے میں دوسرا طبقہ ہے جو گناہ کرتا ہے اور گناہ کیے ہی جاتا ہے۔ تاآنکہ گناہ اس کے دل پر کندہ ہوجاتا ہے۔ یعنی جب وہ تاریخ سے اور عبرتناک آثار کے مشاہدے سے سبق نہیں لیتے اور اپنے آپ کو خود بھلاوے میں ڈالتے ہیں تو پھر خدا کی طرف سے بھی ان کو سوچنے اور سمجھنے اور کسی ناصح کی بات سننے کی توفیق نہیں ملتی۔ خدا کا قانون فطرت یہی ہے کہ جو اپنی آنکھیں بند کرلیتا ہے اس کی بینائی تک آفتاب روشن کی کوئی کرن نہیں پہنچ سکتی اور جو خود سننا نہیں چاہتا اسے پھر کوئی کچھ سنا نہیں سکتا۔ یہ نہ سننا اور نہ دیکھنا خود بخود نہیں بلکہ اس لیے ہوتا ہے کہ اللہ ان کے دلوں پر مُہر لگا دیتا ہے اور اللہ کا مہر لگانا ایک بلیغ استعارہ ہے اللہ کی جانب سے ضلالت کے فیضان کے لیے اس کو تشبیہاً یوں ادا کیا کہ ان کے دلوں پر مُہر لگا دیتے ہیں کہ سنتے نہیں جب کفر کا صدور ہوتا ہے تو خدا کی طرف سے مُہر لگ جاتی ہے۔ ارشاد ہے۔

بل طبع اللہ علیہا بکفرھم یہاں ان کا کفر خدا کی مہر پر مقدم ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جب کفر کا صدور ہوتا رہتا ہے تو دلوں سے صداقت شناسی اور اثر پذیری کا جوہر سلب ہو جاتا ہے اور یہی خدا کی مہر ہے۔ قرآن میں جہاں جہاں خدا کی اس مہر کا یا کسی کو ہدایت نہ دیے جانے کا ذکر ہے وہاں اس کے ساتھ کفر و فسق کی علت ہمیشہ ذکر کی گئی ہے۔ ان آیتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کی بداعمالی مقدم ہے اور اللہ تعالیٰ کا اس کے جوابی اثر کو اپنی طرف سے مہر لگنا فرمانا مؤخر ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دلوں پر مہر لگنا علت اور انسانوں کا کفر معلول نہیں ہے بلکہ حقیقت اس کے برعکس ہے کہ کفر علت ہے اور مہر لگنا معلول ہے یہی انسانوں کا کفر پہلے سے ہوتا ہے اور خدا کی طرف سے دل پر مہر بعد میں لگائی جاتی ہے اور یہی طبعی اصول بھی ہے کہ انسان جب گرتا ہے تو چوٹ لگتی ہے اور غمگین ہوتا ہے تب آنسو کے قطرے ٹپک آتے ہیں۔ اگر کوئی اسے الٹ کر بیان کرے تو یہ کیسی نادانی ہوگی۔

یہاں نطبع کی تعبیر سے قریش کو دھمکی دی ہے کہ ابھی تو ہم نے ان کے دلوں پر مہر نہیں لگائی ہے لیکن یہ لوگ کفر کی جس روش پر بڑھتے جا رہے ہیں وہ وقت دور نہیں ہے کہ ہم ان کے دلوں پر مہر کر دیں اور یہ سننے سے بالکل رہ جائیں۔

قرآن کے قصص کا حجت ہونا

۱۲۹۔ اے پیغمبر یہ آبادیاں جن کی داستانیں ہم تمہیں بتا رہے ہیں ان سب میں ان کے پیغمبر واضح اور روشن دلیلوں کے ساتھ آتے مگر ان کے بسنے والے اس بات پر ایمان نہ لا سکے جن کو ان کے پیشتر جھٹلا چکے تھے۔ اسی طرح اللہ ہٹ دھرمی سے انکار کرنے والوں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے۔ یعنی جس چیز کا ایک دفعہ انکار کر بیٹھے پھر کتنے ہی نشان دیکھیں دنیا ادھر سے اُدھر ہو جائے ممکن نہیں کہ اس کا اقرار کر لیں جب حق تعالیٰ کے مقابلہ میں کسی قوم کی ضد اور ہٹ دھرمی اس درجہ تک پہنچ جاتی ہے تب اصلاحِ حال و قبولِ حق کا امکان باقی نہیں رہتا۔ یہ ہی صورت دلوں پر مُہر لگا دینے کا کیا مطلب ہے۔ فائدہ، ولقد جاءتھم رسلھم بالبینات سے معلوم ہوگیا کہ جو انبیاء علیہم السلام قوم نوح، عاد، ثمود، قوم لوط، اہل مدین کی بستیوں کی طرف مبعوث ہوتے وہ سب بینات واضح نشانات دیے کر بھیجے گئے پس ہود علیہ السلام کی قوم کا یہ کہنا یاھود ماجئتنا ببینۃ، محض لغت اور عناد کی راہ سے تھا۔

یہ آیت بھی مہمات معارف میں سے ہے اس میں چار حقائق پیش کیے گئے ہیں اول یہ کہ تلک القریٰ نقص علیک من انبائہا عام شارحینِ قرآن اس فقرہ کو ناقابلِ تشریح سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں ترجمہ یہ ہے کہ اے پیغمبر یہ ہیں آبادیاں جن کے حالات ہم تمہیں سناتے ہیں۔ یہ بات بطور استیناف کے اس طرح پیش کی گئی ہے کہ محسوس ہوتا ہے کہ اپنی جگہ بڑی غیر معمولی اور بے حد اہمیت کی حامل ہے یہاں بیان وقائع میں یہ بات ملحوظ رکھی گئی ہے کہ سرزمینِ عرب اور اس کے اطراف و جوانب ہی کے وقائع ہوں۔ البتہ اس آیت کے انداز سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ قرآن کے مخاطب ان واقعات کی تفصیلات سے ناآشنا تھے اور بعض وقائع ایسے تھے جن کی صرف کانوں میں بھنک پڑی تھی لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ معاملہ کس طرح پیش آیا اور صحیح سرگزشت کیا ہے نہ صرف عرب میں بلکہ ان خطوں میں بھی جہاں وہ پیش آئے تھے جن وقائع کا ذکر تورات میں موجود تھا ان کی بھی بعض حقیقتیں عرف ہو گئی تھیں یا بھلا دی گئی تھیں۔ اور خود اہل کتاب کو بھی خبر نہ تھی کہ اصلیت کیا ہے؟ قرآن نے ان واقعات کی حقیقت ٹھیک ٹھیک بیان کر دی۔ ہر معاملہ اپنی صورت میں واضح ہو گیا۔ بعض وقائع کی نسبت تصریح کر دی کہ اس سے باشندگانِ عرب بالکل ناآشنا تھے یعنی نام تو سنا تھا مگر اس کی تفصیلات اور جزئیات کا کسی کو پتہ نہ تھا۔

پھر قرآن نے جغرافیائی لحاظ سے یہاں جن خطوں کی اقوام کا ذکر کیا ہے۔ دُنیا کو ان کی قدیم تاریخ بہت کم معلوم تھی۔ اور خود عرب اور عربی نسل کی ابتدائی سرگزشتیں بھی پردہ خفا میں مستور تھیں لیکن اٹھارویں صدی سے آثارِ قدیمہ کی تحقیقات کا نیا سلسلہ شروع ہوا، اور پھر انیسویں صدی میں نئے نئے پردے اٹھے اور اب بیسویں صدی کے انکشافات روز بروز ایک خاص رُخ پر جا رہے ہیں ان سب سے عراق، فلسطین، شام اور مصر کی قدیم قوموں اور تمدنوں کے جو حالات منکشف ہوئے ہیں انہوں نے ان خطوں کی قدیم تاریخ کو بالکل ایک نئی شکل دے دی ہے۔ سب سے زیادہ عجیب بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ عربی نسل اور عربی زبان کے صرف اتنے ہی معنے نہیں ہیں جتنے آج تک سمجھے گئے ہیں بلکہ یہ قوموں اور نسلوں کی ایک نہایت قدیم اور وسیع داستان ہے اور وہ دُنیا کی ابتدائی تمدن میں عظیم حصہ لے چکے ہیں۔ اس سلسلے میں تین باتیں نمایاں طور پر سامنے آتی ہیں۔

اولاً یہاں تلک القریٰ کہہ کر جن اقوام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ان کی خصوصیت اتنی ہی نہیں ہے کہ بعض سرزمینِ حجاز کے قرب و جوار میں گزر رہی تھیں اور بعض سے اہل کتاب واقف تھے بلکہ اس سے بھی زیادہ کوئی گہری بات ہے کیونکہ معلوم ہوتا ہے یہ تمام قومیں اصلاً ایک نسلی حلقہ

کی ہیں۔

ثانیاً، اس سے ایک اور مسئلہ بھی صاف ہو جاتا ہے۔ قرآن نے اس سورت میں ترتیبِ ظہور کے ساتھ دعوتوں کا ذکر کیا ہے۔ قومِ نوح کے بعد قومِ عاد اور عاد کے بعد ثمود نمایاں ہوئی ہے اور ان تینوں کو ایک دوسرے کا جانشین بتایا ہے۔ چونکہ ان تینوں کا جغرافیائی محل ایک دوسرے سے الگ تھا اس لیے یہ بات واضح نہیں تھی کہ اس کا صحیح مطلب کیا ہے لیکن اب بات بالکل واضح ہو گئی کہ یہ تمام قومیں ایک ہی نسلی حلقہ سے تعلق رکھتی ہیں۔

بہرحال تلك القرىٰ نقص عليك من انبائها میں اس کی توضیح کی گئی ہے کہ قومِ عاد، قومِ نوح، قومِ ثمود، قومِ لوط، اور قومِ شعیب کے واقعات ہم آپ کے گوش گزار اس لیے کر رہے ہیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ تاریخ میں اور واقعات کی روشنی میں اللہ کا معاملہ منکر قوموں کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔

دوسری بات ان قوموں کے بارے میں یہ فرمائی ہے لقد جاءتهم رسلهم بالبينات اس میں بتایا ہے کہ ان قوموں کے پاس ان کے انبیاء روشن اور واضح دلائل اور براہین لے کر آئے یہ نبیوں کی صداقت کی دلیلیں تھیں اور وہ معجزات تھے جن کا ان کی قوموں نے انبیاء سے مطالبہ کیا تھا۔ بینات اصل میں صفت ہے اس کا موصوف محذوف ہے ۔ الآيات البينات، یہاں جتنے انبیاء کا ذکر آیا ہے ان میں سب کو اللہ سبحانہ کی جانب سے اعجازی آیات عطا کی گئیں۔ حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط، اور حضرت شعیب سب کو ان کی نبوت کے دعویٰ کے لیے بطور دلیل معجزہ عطا ہوا ہے۔ انبیاء کرام میں غیر معمولی آیات و دلائل انہی انبیاء کو مرحمت ہوتے جن کو سخت و شدید معاندین اور منکرین کا سامنا کرنا پڑا ہے اور ضرورت بھی ان کو ہی تھی کہ ان کے عقائد و افکار کا وہ ان کے ذریعے سے جواب دے سکتے تھے اور ظاہر ہے کہ جن انبیاء کا یہاں ذکر ہوا ہے ان کا سابقہ ایسے ہی معاندین سے ہوا ہے۔ اس بحث کا یہاں موقعہ نہیں ہے کہ معجزہ دلیل ہے یا نہیں اور اگر ہے تو کیونکر۔ اس مسئلہ پر سب سے زیادہ سیر حاصل بحث ابنِ رُشد نے کشف الادلہ میں کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ معجزہ دلیلِ نبوت نہیں ہو سکتا کیونکہ منطقیانہ حیثیت سے دعویٰ اور دلیل میں مناسبت کا ہونا ضروری ہے۔ اور معجزہ اور نبوت میں کسی قسم کی مناسبت نہیں پائی جاتی لیکن ہمیں اس سے اتفاق نہیں ہے۔ دراصل نبوت علم و عمل کے مجموعہ کا نام ہے اور جو شخص نبوت کا دعویٰ کرتا ہے وہ فی الواقع دونوں میں کمال کا دعویٰ کرتا ہے اور اسی کمال کے اظہار

کے لیے اس سے معجزہ طلب کیا جاتا ہے اور انبیاء کے معجزات اگرچہ مختلف قسم کے ہوتے ہیں تاہم ان کو صرف دو نوع میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اخبار بالغیب اور تصرف فی الکائنات اور ان دونوں کا نبوت کے ساتھ ربط و اتحاد ہے۔ اخبار بالغیب سے نبوت کے علمی کمال کا اور تصرف فی الکائنات سے اس کی عملی قوت ظاہر ہوتی ہے یہ کہنا کہ منطقیانہ حیثیت سے دعویٰ اور دلیل میں کوئی مناسبت نہیں بالکل درست ہے کیونکہ معجزے کے دلیل نبوت ہونے کے یہ معنے نہیں ہیں کہ وہ نبوت کی منطقی دلیل ہے دلیل کا لفظ یہاں منطقی محاورہ میں نہیں بلکہ عام اور لغوی معنے میں استعمال ہوا ہے اس لیے جب معجزہ سرے سے دلیل منطقی ہی نہیں تو دعویٰ اور دلیل میں مناسبت تلاش کرنا بے محل ہے اور یہ تلاش بھی بے سود ہے کہ وہ انواع دلیل کی کس قسم میں داخل ہے بلکہ معجزہ کی دلالت نبوت پر عقلی نہیں بلکہ عادی ہے مطلب یہ ہے کہ معجزہ منطقی نہیں بلکہ نفسیاتی دلیل ہے۔ عادتِ انسانی یہ ہے کہ جب کسی شخص سے کوئی غیر معمولی کارنامہ ظاہر ہوتا ہے تو لوگ اس کی عظمت و کبریائی کے سامنے سرنگوں ہو جاتے ہیں جب ایک شخص عام انسانی حالات سے بلند تر سطح میں آ کر منجانب اللہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور خوارق عادات اس سے ظاہر ہوتے ہیں تو عام متاثرین خود اس دعویٰ کو تسلیم کر لیتے ہیں۔

بہرحال اس فقرے کے ذریعے قرآن نے یہ بتایا ہے کہ ان قوموں کے سامنے پیغمبر ان قوموں کے پاس دعویٰ کی پشت پر دلیل کی طاقت لے کر آئے تھے۔

تیسری بات یہاں یہ ارشاد ہوئی فما کانوا لیومنوا بما کذبوا بہ من قبل وہاں کے بسنے والے ایسے نہ تھے کہ جو بات پہلے جھٹلا چکے تھے اسے مان لیں۔ یعنی ان لوگوں کی طبیعتیں انبیاء کے معجزے سے اثر پذیر نہیں ہوتی تھیں بلکہ انہوں نے عناد کور باطنی اور تعصب کا مظاہرہ کیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے لیے یہ خوارق و معجزات قطعاً بے سود رہے کیونکہ ان کا عناد تعصب اور کور باطنی حسن ظن کے بجائے ان میں سوئے ظن کے جراثیم کی تخلیق کر رہا تھا وہ بڑے بڑے معجزے کو دیکھ کر بھی یہی کہہ دیتے تھے کہ یہ سحر و جادو اور طلسم و نیرنگ ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں شارحین قرآن نے دو مختلف زاویوں سے دادِ سخن دی ہے اوّل یہ کہ بما کذبوا ایمان کا صلہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ وہ ایسے نہ تھے کہ جس چیز کو پہلے جھٹلا چکے تھے اسے مان لیں۔ بیشتر شارحین قرآن نے یہی بات سمجھی ہے لیکن کچھ کے خیال میں بما کذبوا کی با ایمان کا صلہ نہیں بلکہ با سببیہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ ان کے ایمان نہ لانے کا سبب یہ ہے کہ وہ پہلے سے خدا کی آیتوں کو جھٹلاتے رہتے تھے یعنی تکذیب حق کے چونکہ وہ عادی مجرم تھے اس لیے وہ ایمان نہیں لاتے۔ لیکن مرحوم السید رشید رضا نے اسے ذوق عربیت کے خلاف قرار

دیتے ہوتے لکھا تا دیل واہ جدا یہ بہت ہی واہی تباہی توجیہ و تفسیر ہے کیونکہ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ رسولوں کی تشریف آوری سے پہلے ہی زمانہ جاہلیت میں نبوت کی تکذیب کرتے تھے اس لیے انہوں نے بینات کی تکذیب کردی اس میں کوئی معنویت نہیں ہے اور پہلی صورت میں مطلب یہ ہے کہ نبیوں کے آنے کے بعد وہ نبیوں کی تکذیب کر چکے تھے اس لیے جب انبیاء نے معجزات پیش کیے ان کی بھی انہوں نے تکذیب کردی ۔ بتانا یہ ہے کہ انبیاء کی تشریف آوری کے بعد سے لے کر پوری عمر وہ تکذیب ہی کرتے رہے ۔

جو نہی بات یہ فرمائی ہے کذالک یطبع اللہ علی قلوب الکافرین ۔ یعنی اس قسم کے لوگ جن کے اوصاف یہ ہوں کہ حق سے ان کو عناد ہو، ضلالت پر اصرار ہو، دلائل و بینات سے متاثر نہ ہوں اور کفران کی طبیعت بن جاتے ان کے دلوں پر اللہ مُہر لگاتا ہے ۔ یہ مُہر لگانا تعبیر ہے خدا کی طرف سے ضلالت آنے کی ۔ گویا پچھلی آیت میں جو ارشاد ہوا و نطبع علی قلوبھم اس کی تشریح اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فرمادی ۔ اس تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دلوں پر مُہر لگنے سے مراد ذہن انسانی کا اس کے نفسیاتی قانون کی زد میں آجانا ہے جس کی رو سے ایک دفعہ جاہلی تعصبات یا نفسانی اغراض کی بنا پر حق سے منہ موڑ لینے کے بعد پھر انسان اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کے اُلجھاؤ میں اُلجھتا ہی چلا جاتا ہے اور کسی مشاہدے اور کسی تجربے سے اس کے دل کے دروازے قبول حق کے لیے نہیں کھلتے ۔

فطری شعور فطرتِ انسانی کا عہد ہے

۱۳۰ ۔ اور ان میں سے اکثر کو ہم نے ایسا پایا کہ اپنے عہد پر قائم نہ تھے اور ان کے اکثر کو ہم نے بالکل نافرمان پایا ہے ۔ عہد سے ممکن ہے عام عہود مراد ہوں یا خاص الست مراد ہو یا وہ عہد جو مصائب اور سختیوں کے وقت کرتے تھے کہ فلاں سختی اٹھالی جاتے تو ہم ضرور ایمان لے آئیں گے جیسے فرعون نے کہا تھا،

لئن کشفت عنا الرجز لنومنن لک ولنرسلن معک بنی اسرائیل

فلما کشفنا عنھم الرجز الی اجل ھم بالغوہ اذا ھم ینکثون ۔

اگر تیری دعا سے عذاب ٹل گیا تو ضرور ہم تیرے معتقد ہو جائیں گے اور بنی اسرائیل کو ہم چھوڑ دیں گے کہ تیرے ساتھ چلے جائیں لیکن پھر جب ایسا ہوا کہ ہم نے ایک خاص وقت تک کے لیے کہ انہیں اس تک پہنچنا عذاب ٹال دیا تو دیکھو وہ اچانک اپنی بات سے پھر گئے [1]

اصل ارشاد میں لفظ عہد آیا ہے۔ عہد تین طرح کا ہوتا ہے۔ فطری، شرعی اور عرفی۔ ارشاد میں تینوں کی نفی ہے۔ عہد فطری سے وہ عہد مراد ہے کہ اللہ سبحانہ نے تمام اولادِ آدم سے اپنی ربوبیت کا اقرار لیا ہے اور وہ اس طرح کہ اللہ نے ان سے سوال کیا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں سب نے اقرار کیا ہے کہ ہاں بے شک تو ہمارا رب ہے اور ہم اس کے گواہ ہیں۔ اس عہد کا ذکر قرآن نے ایک اہم واقعہ کی حیثیت سے کیا ہے اور روزِ اول کا وہ عہد و پیمان ہے جو خالص و مخلوق کے درمیان ہوا تھا اور یہ اسی عہد و پیمان کا احساس ہے جو انسان کے رگ و ریشے میں سرایت کیے ہوئے ہے کہ ہزار انکار کے بعد بھی کسی نہ کسی رنگ میں وہ اعتراف نمایاں ہو جاتا ہے۔ اس کی تفصیل اسی جلد میں آرہی ہے

عہد شرعی وہ عہد و پیمان ہے جو ہر مومن نبوت سے ایمان کی صورت میں کرتا ہے۔ انقیادِ باطن، التزام طاعت، عہدِ وفاداری یہ وہ اوصاف ہیں جن کے بغیر تصدیق صرف علم ہی کا ایک مرتبہ رہتی ہے۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ایمان صرف تصدیق نہیں ہے بلکہ انقیادِ قلبی اور التزامِ طاعت اس کا اہم جزء ہے اگر ایک شخص صرف تصدیق رکھتا ہے مگر عہدِ وفاداری نہیں کرتا تو وہ مومن نہیں کہلا سکتا۔

عہدِ عرفی یہ کہ باہم لین دین میں انسان ایک دوسرے سے عہد کرتے ہیں جس سے انسانی قدریں اخلاقی قدریں پروان چڑھتی ہیں۔

قرآن نے ما وجدنا لاکثرھم من عھد کہہ کر اگرچہ ہر قسم کے عہد کی ان سے نفی کر دی ہے یعنی کسی قسم کے عہد کا بھی ان میں پاس نہیں ہے نہ اس فطری عہد کا پاس ہے جس میں پیدائشی طور پر ہر انسان خدا کا بندہ اور پروردہ ہونے کی حیثیت سے بندھا ہوا ہے نہ اس اجتماعی عہد کا پاس ہے جس میں ہر فرد بشر انسانی برادری کا ایک رکن ہونے کی حیثیت سے باندھتا ہے اور نہ اس ذاتی عہد کا پاس جو آدمی اپنی مصیبت اور پریشانی کے لمحوں میں یا کسی جذبۂ خیر کے موقعہ پر خدا سے بطور خود باندھا کرتا ہے ان ہی عہدوں کے توڑنے کو یہاں فسق کہا ہے۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ مُّوسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَظَلَمُوْا بِهَا ۚ

فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَقَالَ مُوسٰى يٰفِرْعَوْنُ

اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ اَقُوْلَ

عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ

مَعِيَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۰۵﴾ قَالَ اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَآ

اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۰۷﴾ ۚ

ع ۹ ۱۳ ۳

وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ

قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۹﴾ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ

مِّنْ اَرْضِكُمْ ۚ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَاَرْسِلْ

فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ﴿۱۱۲﴾

پھر ان قوموں کے بعد ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ

فرعون اور اُس کے درباریوں کے پاس روانہ کیا لیکن اُنھوں نے

ہماری واضح نشانیوں کے ساتھ ظالمانہ رویہ اختیار کیا تو دیکھو اُن
مُفسدوں کا انجام کیا ہوا[۱۳۱]۔ اور حضرت موسیٰ نے کہا اے فرعون
میں رب العالمین کا فرستادہ ہوں، میرا فرضِ منصبی یہی ہے
کہ اللہ کے بارے میں حق گوئی کو اپناؤں میں تمہارے پاس
تمہارے مالک و آقا کی جانب سے اپنی رسالت کی واضح دلیل
لے کر آیا ہوں[۱۳۲]۔ لہٰذا تو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ روانہ کر دے[۱۳۳]
فرعون نے کہا کہ اگر تو اپنی رسالت پر کوئی نشانی لے کر آیا ہے،
تو اگر تو سچوں میں سے ہے نشانی پیش کر، موسیٰ علیہ السلام
نے اپنی لاٹھی ڈال دی تو اچانک وہ واضح طور پر ایک اژدہا
بن کر سامنے آگیا، اور اپنے جیب سے ہاتھ نکالا تو وہ بھی
یکایک سب دیکھنے والوں کے سامنے چمک رہا تھا[۱۳۴]۔ قوم
فرعون کے سرداروں نے کہا کہ یہ تو فن کار جادوگر ہے[۱۳۵]۔

تمہیں تمہاری زمین سے بے دخل کرنا چاہتا ہے بتاؤ تمہاری کیا
صلاح ہے۔[۱۳۶] پھر اُن سب نے (باہم مشورے کے بعد) فرعون
سے کہا کہ موسیٰ اور اس کے بھائی کو ڈھیل دے دو اور سارے
شہروں میں ہرکارے بھیج دو کہ تمام شہروں سے فن کار جادوگر
اکٹھے کرکے تیرے حضور لے آئیں۔[۱۳۷]

معانی مفردات

فرعون، اس کے معنے ہیں سورج دیوتا کی اولاد، قدیم اہلِ مصر سورج دیوتا کو جوان کا مہا دیو یا رب اعلیٰ تھا رَع کہتے تھے اور فرعون اسی کی طرف منسوب تھا۔ اہلِ مصر کے اعتقاد کی رُو سے کسی فرمانروا کی حاکمیت کے لیے اس کے سوا کوئی بنیاد نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ رَع کا جسمانی مظہر اور اس کا ارضی نمائندہ ہو۔ اسی لیے ہر شاہی خاندان جو مصر میں برسرِاقتدار آتا تھا اپنے آپ کو سورج بنسی بنا کر پیش کرتا اور ہر فرمانروا جو تخت نشین ہوتا فرعون کا لقب اختیار کرکے باشندگانِ ملک کو یقین دلاتا کہ وہ تمہارا رب اعلیٰ یا مہا دیو ہے۔
حقیق، سزاوار، لائق ثابت حق سے بروزن فعیل صفت مشبہ ہے۔ اور کچھ نے اس کے معنے حریص کے بتائے ہیں۔ یعنی حقیق میں حریص کی تضمین قرار دی ہے۔ اگر سزاوار اور لائق کے معنے میں ہو تو علیٰ معنے میں باکے ہے اور اگر حریص کے معنے ہوں تو علیٰ اپنے ہی معنے میں ہے۔ اور کچھ نے حقیق کے معنے فرض و واجب کے کیے ہیں۔ ثعبان، اسم ہے اژدہا کے معنے میں ہے۔ مذکر اور مونث دونوں کے لیے آتا ہے۔ قرآن میں کہیں جنہ بمعنے سانپ کہیں جان بمعنے سنک اور یہاں ثعبان بمعنے اژدہا آیا ہے۔ یا تو واقعات کے اختلاف سے لاٹھی کئی شکلوں میں تبدیل ہوتی ہے اور یا اس کے جثہ کو بتانے کے لیے ثعبان اس کی پھرتیلے پن کو ظاہر کرنے کے لیے جان اور اس کی سمیت کو نمایاں کرنے کی خاطر حیہ کہہ دیا ہے۔ نزع، اس کے معنے

کھینچنے اور نکالنے کے ہیں ہاتھ گریبان کی راہ سے بغل میں دبا کر نکالا گیا تھا اس لیے یہاں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ حاشرین۔ نقیب، اکٹھے کرنے والے، حشر سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ تامرون، امر سے ہے اس کے معنی مشورہ دینا، رائے دینا اور صلاح دینا ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ ان معنے میں کئی جگہ آیا ہے عبداللہ بن عباس سے یہی تشریح منقول ہے۔

ایک اور تاریخی شہادت

فرعون شاہان مصر کا لقب ہے کسی خاص بادشاہ کا نام نہیں ہے۔ تین ہزار قبل مسیح سے شروع ہو کر زمانہ اسکندر تک فراعنہ کے اکتیس خاندان مصر پر حکمران رہے ہیں۔ سب سے آخری خاندان فارس کی شہنشاہی کا تھا جو ۳۳۲ قبل مسیح سکندر کے ہاتھوں مفتوح ہوا۔ ان میں سے حضرت یوسف کا فرعون ہیکسس عمالقہ کے خاندان سے تھا جو دراصل عرب خاندانوں ہی کی ایک شاخ تھی۔

سوال یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کے عہد کا فرعون کون ہے اور کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ عام مورخین عرب اور مفسرین اس کو بھی عمالقہ ہی کے خاندان کا فرد بتاتے ہیں۔ مشہور مورخ ابن قتیبہ المعارف میں فرزندان سام بن نوح کی تقسیم و تفریق کے بعد لکھتا ہے " انہیں میں سے عمالیق ہیں۔ یہ متعدد قوموں کا مجموعہ تھے جو متفرق ہو کر ممالک میں پھیلے من جملہ ان کے مصر اور بابل کے بادشاہ ہیں" اور ابن خلدون کا بیان ہے " ان اقوام میں سے بہت بادشاہ گزرے ہیں اور ان کی عرب میں حکومتیں ہوتی ہیں جن کے چند قبائل کا سلسلہ حکومت مصر و شام تک وسیع ہو گیا تھا" اسی قسم کی تصریحات دوسرے مورخین عرب نے کی ہے۔ اس فرعون کا نام کوئی ولید بن مصعب بن ریان بتاتا ہے اور کوئی مصعب بن ریان بتاتا ہے۔ ان میں سے ارباب تحقیق کی رائے یہ ہے کہ اس کا نام ریان یا ربان تھا۔ حافظ ابن کثیر کہتے ہیں کہ اس کی کنیت ابو مرہ تھی۔ یہ سب آراء قدیم مورخین کی قائم کردہ ہیں مگر اب جدید مصری اثری تحقیقات اور حجری کتبات کے پیش نظر اس سلسلے میں دوسری رائے سامنے آتی ہے وہ یہ کہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کا فرعون رعمیس ثانی کا بیٹا منفتاح ہے جس کا دور حکومت ۱۲۹۲ ق م سے شروع ہو کر ۱۲۲۵ ق م پر ختم ہو جاتا ہے۔

اس تحقیقی روایت کے متعلق احمد یوسف آفندی نے ایک مستقل مضمون لکھا ہے۔ یہ مصری دار الآثار کے مصور ہیں اور اثری و حجری تحقیق کے بہت بڑے عالم ہیں۔ ان کے اس مضمون کا خلاصہ قصص الانبیاء میں علامہ نجار نے نقل کیا ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے؛

یہ بات پایہ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ یوسف علیہ السلام جب مصر میں داخل ہوئے تو یہ فراعنہ کے سولہویں خاندان کا زمانہ تھا اور اس فرعون کا نام " اپالی الاوّل "، تھا۔ میں نے اس کی شہادت اس حجری کتبہ سے حاصل کی جو عزیزِ مصر " فوتی فارع "، کے مقبرے میں پایا گیا۔ اور سترھویں خاندان کے بعض آثار سے یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ اس خاندان سے قبل کم قریب ہی زمانے میں مصر میں ہولناک قحط پڑا۔ لہٰذا ان تعیینات کے بعد آسانی سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ حضرت یوسف کا داخلہ مصر اپابی الاول کے زمانے میں تقریباً ۱۶۰۰ ق م ہوا ہے اور حضرت یوسف کا عزیزِ مصر کے یہاں رہنا اور پھر قید خانہ کی زندگی بسر کرنا ان دونوں کی مدت کا اندازہ کر کے کہا جا سکتا ہے کہ بنی اسرائیل حضرت یوسف سے تقریباً ستائیس سال بعد مصر اس نشان سے داخل ہوئے جس کا ذکر قرآن حکیم اور تورات میں کیا گیا ہے۔ ہم اگرچہ فراعنہ مصر کی حکومت اور شاہی خاندان کے متعلق اچھی طرح آگاہی پا چکے ہیں اور مصری آثار نے اس میں کافی مدد دی ہے مگر ابھی تک ان اثریات میں وہ تفصیلی تصریحات دستیاب نہیں ہوئیں جو فرعون اور بنی اسرائیل کی عداوت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت اور غرقِ فرعون و نجاتِ بنی اسرائیل سے متعلق ہیں۔ تورات میں مذکور ہے کہ جس فرعون نے بنی اسرائیل کے ساتھ عداوت کا معاملہ کیا اور ان کو سخت مصائب میں مبتلا رکھا اس نے بنی اسرائیل سے دو شہروں رعمیس اور فیتوم کی تعمیر کی خدمت بھی لی اور ان کو مزدور بنایا تو اثری حضریات (پرانے آثار کی کھدائی) میں ان دو شہروں کا پتہ تو لگ چکا ہے۔ ایک کتبہ سے معلوم ہوا ہے کہ اس کا نام " پر۔ توم " یا " فیتوم " ہے اس کا ترجمہ ہے " خدائے توم کا گھر "، اور دوسرے کا نام " پررعمسیس " ہے جس کا ترجمہ " قصرِ رعمیس "، ہوتا ہے۔ اور شرقی جانب میں جو مقام اب " تل مسخوطہ " کے نام سے مشہور ہے یہیں " فیتوم کی آبادی تھی۔ اور جس جگہ اب " قنیتر "، یا قدیم مصری زبان کے اعتبار سے " خنت نفر "، واقع ہے اس مقام پر " رعمسیس "، آباد تھا۔ اس کو " رعمسیس ثانی "، نے اس لیے آباد کیا تھا کہ یہ مصر کی بحری جانب کے سینٹر میں بہترین قلعہ کا کام دے اور فیتوم کی آبادی کا بھی یہی مقصد تھا۔ اس شہر کی چار دیواری کے جو کھنڈر معلوم ہوئے ہیں وہ بلاشبہ اس کی شہادت دیتے ہیں کہ یہ دونوں شہر مصر کے بہترین حفاظتی قلعے تھے نہ کہ تورات کے بیان کے مطابق غلوں کے گودام اس

تمام قیل وقال کا مطلب یہ ہے کہ جس فرعون نے بنی اسرائیل کو مصائب میں مبتلا کیا وہ یہی "رعمسیس دوم" ہو سکتا ہے۔ یہ مصر کے حکمرانوں کا انیسواں خاندان تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کے زمانہ میں پیدا ہوتے اور اسی کی آغوش میں پرورش پاتی، تاریخ اثریات سے پتہ چلتا ہے کہ "اسیویہ" قبائل جو مصر کے قریب آباد تھے ان کے اور فراعنہ کے اس خاندان کے درمیان پیہم نو سال تک سخت جنگ دیکار رہی بدیں وجہ یہ قرین قیاس ہے کہ رعمسیس دوم نے اس خوف سے کہ کہیں بنی اسرائیل کا یہ عظیم الشان قبیلہ جو لاکھوں نفوس پر مشتمل تھا اندرونی بغاوت پر آمادہ نہ ہو جائے بنی اسرائیل کو ان مصائب میں مبتلا کرنا ضروری سمجھا جن کا ذکر تورات اور قرآن حکیم میں کیا گیا ہے۔

رعمسیس دوم اس زمانہ میں بہت مسن اور معمر ہو چکا تھا، اس لیے اس نے اپنی زندگی ہی میں اپنے بڑے بیٹے "منفتاح" کو شریک حکومت کر لیا تھا۔ رعمسیس کی ڈیڑھ سو اولاد میں سے یہ تیرہواں [۱۳] لڑکا تھا لہٰذا منفتاح ہی وہ "فرعون" ہے جس کو موسیٰ و ہارون علیہما السلام نے اسلام کی دعوت دی اور بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ کیا، اور اسی کے زمانے میں بنی اسرائیل مصر سے نکلے اور یہی غرقِ دریا ہوا۔ چونکہ اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے گھر میں پرورش پاتے دیکھا تھا اس لیے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو اسلام کا پیغام سنایا تو قرآن عزیز کے ارشاد کے مطابق اس نے یہ طعنہ دیا۔

الم نربك فينا وليدا ولبثت فينا من عمرك سنين۔ (شعراء)

کیا ہم نے اپنے یہاں تیرے بچپن میں تیری پرورش نہیں کی؟ اور تو اپنی عمر کے چند سال ہم میں بسر کر چکا ہے۔

تورات میں ہے کہ خروج سے پہلے مصر کے بادشاہ کا انتقال ہو گیا، اس سے مراد وہ ہی رعمسیس دوم ہے جو منفتاح کا باپ تھا۔

علامہ فلانڈرس نے ایک حجری کتبہ دریافت کیا ہے جس پر سیاہ حروف کندہ ہیں اور وہ ۵۹۹ مصری میں لکھا گیا ہے۔ یہ دراصل ایک بہت بڑی چٹان ہے جس کی بلندی ۳ میٹر اور ۱ء۴۳ ہے۔ یہ کتبہ دو وجہ سے معرضِ تحریر میں آیا تھا، ایک یہ کہ ان تمام تفصیلات کو بیان کیا جائے جو اٹھارہویں خاندان کے بادشاہ "امنتحب" نے "معبد امون" کی خدمات کے متعلق انجام دی تھیں اور دوسرے یہ کہ انیسویں خاندان کے بادشاہ "منفتاح" بن رعمسیس دوم کی تعریف میں کچھ لکھا جائے۔

اس لیے اس کتبہ کی عبارت شاعرانہ اسلوب پر لکھی گئی ہے اور منفتاح نے یوسین پر جو فتح حاصل کی تھی اس کا بڑے فخر و مباہات کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے اور عسقلان، جیزر، بانو عیم جو فلسطین کے علاقہ کے مشہور شہر تھے ان کے سقوط کی جانب اشارات کیے گئے ہیں۔

اسی کے ضمن میں بنی اسرائیل کے متعلق بھی مختصر عبارت میں اظہارِ خیال کیا گیا اور یہ سب سے پہلا اثری نقش اور حضریات مصری کا پہلا کتبہ ہے جس میں بنی اسرائیل کا صراحت کے ساتھ ذکر موجود ہے، اس کا ترجمہ یہ ہے:

لقد سحق بنو اسرائیل ولم یبق لھم بذر،

بنی اسرائیل تمام ہلاک ہو گئے اور اب ان کی نسل کا خاتمہ ہو گیا۔

ایک باریک بین اس عبارت کو دیکھ کر بآسانی یہ علم حاصل کر سکتا ہے کہ یہ تحریر منفتاح کے زمانے میں نہیں لکھی گئی ورنہ تو مصری دستور کے مطابق بنی اسرائیل جیسے عظیم الشان قبیلہ کی ہلاکت کے واقعہ کو اس معمولی اور مختصر الفاظ میں درج نہ کیا جاتا بلکہ منفتاح کی شان میں بڑے زبردست قصیدہ کے ساتھ اس دشمن پر کامیابی کا اظہار کیا جاتا اور جن واقعات پر اس کتبہ میں اشارہ کیا گیا ہے ان کی اہمیت اور عظمت کا تقاضا یہی تھا کہ وہ یونہی ضمنی طور پر اور وہ بھی سابق بادشاہ کے حالات سے متعلق کتبہ پر درج نہ کر دیے جاتے بلکہ ان اہم واقعات کے لیے منفتاح کے زمانے میں مستقل الگ ایک کتبہ اسی غرض سے تحریر کیا جاتا۔

مگر ایسا کیوں نہ ہوا؟ سو بات بہت واضح ہے وہ یہ کہ مصری کاہنوں کو اس واقعۂ ہائلہ کی ہرگز توقع نہ تھی جو موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں "غرقِ فرعون" کی شکل میں ظاہر ہوا اور وہ "منفتاح" کی موت کے لیے اس عجلت کے متوقع نہ تھے، اس زمانہ کی عمر طبعی کے لحاظ سے ابھی کافی زمانہ تھا کہ منفتاح کے کاہن، مصری دستور کے مطابق اس انیسویں خاندان کے بادشاہ کے ان حالات کو مرتب کر کے لوح پر محفوظ کر دیں تاکہ وہ بادشاہ کے مقبرہ پر کندہ ہو سکے۔ اب جب کہ یہ واقعۂ ہائلہ پیش آ گیا تو اصل حقیقت کو چھپانے کی سعی کی گئی تاکہ آئندہ قبطی نسلیں اس ذلت و رسوائی کو معلوم نہ کر سکیں جو ان کے واجب الاحترام دینی عقائد پر خدا کی طرف سے سخت ضرب کا باعث بن چکی تھی۔

پس انہوں نے بیجا جسارت اور تاریخی بددیانتی کے ساتھ حالات کو منقلب کر کے معاملہ کو بالکل مخالف شکل میں تحریر کر دیا اور بنی اسرائیل کی کامیاب واپسیٔ وطن کو ان مسطورۂ بالا الفاظ میں ظاہر کیا تاکہ "غرقِ فرعون" کا قصہ آئندہ مصریوں کے سامنے باقی ہی نہ رہے۔

اس نتیجہ کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ مصری دستور کے مطابق ہر ایک بادشاہ کا مقبرہ جُدا ہوتا تھا اور اس کے تمام حالات اور خصوصی نمایاں امتیازات کی تاریخ اور اس کے زمانہ کی بعض شاہی اشیاء اور جواہرات اس کی قبر کے ساتھ ہی محفوظ کر کے رکھے جاتے تھے۔

لیکن منفتاح کی اس شان کے باوجود جس کا مذکورہ بالا کتبہ میں اشارہ کیا گیا ہے نہ اس کا علیحدہ مقبرہ بنایا گیا اور نہ وہ تمام رسوم انجام پا سکیں جو ہمیشہ بادشاہوں کے لیے ضروری سمجھی جاتی تھیں بلکہ اس کو عجلت کے ساتھ "امنحب" کے مقبرہ ہی میں دفن کر دیا گیا اور اٹھارہویں خاندان کے بادشاہ، اور اُنیسویں خاندان کے بادشاہ کی نعشیں ایک ہی جگہ جمع کر دی گئیں[1]

اولاً، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کے دور میں دو فرعون گزرے ہیں ایک وہ جس کے زمانہ میں حضرت موسیٰ کی ولادت ہوئی اور جس کے گھر میں آپ نے پرورش پائی۔ دوسرا وہ جس کے پاس آپ اسلام کی دعوت لے کر تشریف لے گئے اور جس نے تکذیب کی اور بالآخر دریا بُرد ہوا۔ موجودہ زمانہ کے محققین کا عام میلان اس طرف ہے کہ پہلا فرعون رعمیس دوم تھا اور دوسرا فرعون جس کا یہاں ذکر ہے۔ منفتاح تھا جو اپنے باپ رعمیس دوم کی زندگی ہی میں شریکِ حکومت ہو چکا تھا اور اس کے مرنے کے بعد سلطنت کا مالک ہوا۔

ثانیاً، اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مصر کے تاریخی آثار میں حضرت موسیٰ کی سرگزشت کا کوئی سراغ کیوں نہیں ملتا حتیٰ کہ بنی اسرائیل کا توطن مصر اور خروج کا پورے واقعہ سے اثریات مصر کی تاریخ بالکل خاموش ہے۔

۱۰۳ — پھر ان قوموں کے بعد ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں دے کر فرعون اور اس کے درباریوں کے پاس روانہ کیا لیکن انہوں نے ہماری واضح نشانیوں کے ساتھ ظالمانہ رویہ اختیار کیا تو دیکھو ان مفسدوں کا انجام کیا ہوا۔ یعنی جن انبیاء کا پہلے ذکر ہوا، نوح، ہود، صالح، لوط، شعیب علیہم السلام۔ موسیٰ علیہ السلام ان سب کے بعد تشریف لاتے۔ ان پیغمبروں کا ذکر فرمانے کے بعد درمیان میں "سنت اللہ" بیان فرمائی تھی جو مکذبین کے متعلق جاری رہی ہے جس کے ضمن میں موجودہ جماعتِ کفار کو متنبہ کر دیا گیا۔ اس درمیانی مضمون سے فارغ ہو کر پھر سلسلہ بعثت رسل کی ایک عظیم الشان کڑی کا ذکر شروع کر دیتے ہیں[2]

---

[1] قصص القرآن جلد اول [2] افاداتِ شیخ الاسلام

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نسب چند واسطوں سے حضرت یعقوب علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ ان کے والد کا نام عمران ہے۔ اہل کتاب اسے عمرام کہتے ہیں۔ لفظ موسیٰ کے معنے ہیں وہ جو پانی سے بچا لیا گیا ہو حضرت عبداللہ بن عباس نے بھی موسیٰ کی وجہ تسمیہ یہی بتائی ہے۔ دراصل موقبطی زبان میں پانی اور اسی درخت کو کہتے ہیں۔ حضرت موسیٰ کی والدہ نے ولادت کے بعد حضرت موسیٰ کو الہام خداوندی کے مطابق صندوق میں رکھا اور دریائے نیل کی نذر کر دیا اور ساتھ ہی اپنی بڑی لڑکی حضرت موسیٰ کی ہمشیرہ کو کہا کہ وہ اس صندوق کے ساتھ کنارے کنارے چل کر صندوق کو نگاہ میں رکھے اور دیکھے کہ خدا اس کی حفاظت کا وعدہ کس طرح پورا کرتا ہے تا آنکہ آلِ فرعون نے اسے اٹھا لیا۔

قرآن عزیز میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر بے شمار مقامات میں آیا ہے۔ چونکہ ان کے بیشتر حالات حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات سے بہت زیادہ مطابقت رکھتے ہیں اور ان واقعات میں غلامی اور آزادی کے باہم معرکہ آرائی اور حق و باطل کے مقابلہ کی بے نظیر داستان ودیعت ہے۔ نیز ان کے اندر بصائر و مواعظ کا نادر ذخیرہ جمع ہے اس لیے اللہ سبحانہٗ نے حسبِ ضرورت اور حسبِ موقع جگہ جگہ اس قصہ کے اجزاء کو مجمل اور مفصل طریقہ پر بیان کیا ہے۔

اس سے پہلے انبیاء کے جو تاریخی واقعات بیان ہوئے ہیں ان میں اور حضرت موسیٰ کی تاریخی داستان میں بہت بڑا فرق ہے۔ انبیاء کی تاریخی شہادتوں سے مقصود یہ ذہن نشین کرانا تھا کہ جو قوم خدا کا پیغام پانے کے بعد اسے رد کر دیتی ہے اسے ضرور ہلاکت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ان واقعات کی تاریخی شہادت کے بعد اب حضرت موسیٰ کی تاریخ کے دو مختلف پہلو پیش کیے جاتے ہیں۔ ایک حضرت موسیٰ اور فرعون کی داستان، دوسرے حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کے وقائع گویا ایک وہ تاریخی شہادت ہے جس میں نبی اپنی اُمت دعوت سے مخاطب ہے۔ دوسرے وہ احوال و ظروف پیش کیے ہیں جن میں نبی کا روئے سخن اُمتِ اجابت کی طرف ہے۔

اُمتِ دعوت کے وقائع میں کفارِ مکہ کو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ دعوتِ حق کے ابتدائی مرحلوں میں حق و باطل کی قوتوں کا جو تناسب بظاہر نظر آتا ہے اس سے دھوکا نہ کھانا چاہیے۔ حق کی پوری تاریخ اس پر گواہ ہے کہ نبوت ایک فی قوم بلکہ فی الدنیا کی اقلیت سے شروع ہوتی ہے اور بغیر کسی سر و سامان کے اس باطل کے خلاف لڑائی چھیڑ دیتا ہے جس کی پشت پر بڑی بڑی قوموں اور سلطنتوں کی طاقت ہوتی ہے۔ پھر بھی آخر کار وہی غالب آ کر رہتا ہے۔ نیز اس قصے میں ان کو یہ بتایا گیا ہے کہ داعی حق کے مقابلہ میں جو چالیں چلی جاتی ہیں اور جن تدبیروں سے اُن کا

دعوت کو دبانے کی کوشش کی جاتی ہے وہ کس طرح الٹی پڑتی ہیں اور یہ کہ اللہ تعالیٰ منکرین حق کی ہلاکت کا آخری فیصلہ کرنے سے پہلے ان کو کتنی کتنی طویل مدت تک سنبھلنے اور درست ہونے کے مواقع دیتا چلا جاتا ہے۔ اور جب کسی تنبیہہ کسی سبق آموز واقع اور کسی روشن نشانی سے بھی وہ اثر نہیں لیتے تو پھر وہ انھیں کیسی عبرتناک سزا دیتا ہے۔

اُمتِ اجابت کو اس قصے میں دوہرا سبق دیا گیا ہے۔ پہلا سبق اس بات کا کہ اپنی قلت و کمزوری کو اور مخالفینِ حق کی کثرت و شوکت کو دیکھ کر ان کی ہمت نہ ٹوٹے۔ اور اللہ کی مدد آنے میں دیر ہوتے دیکھ کر وہ دل شکستہ نہ ہوں۔ دوسرا سبق اس بات کا کہ ایمان لانے کے بعد جو گروہ یہودیوں کی سی روش اختیار کرتا ہے وہ پھر یہودیوں ہی کی طرح خدا کی لعنت میں گرفتار بھی ہوتا ہے۔

ثم بعثنا من بعدھم کو حرف عطف کے ذریعے پہلے واقعات سے مربوط کیا ہے۔ آغاز لقد ارسلنا نوحاً سے کیا تھا اور اس پر والی عاد والی ثمود اور الی مدین کا بغیر فعل ارسلنا کے عطف سے کیا کیونکہ ان میں ہم آہنگی تھی، رسولوں کی تکذیب، ان سے عناد، ان کی ایذا رسانی اور بالآخر اس کی پاداش میں ہلاکت ان سب میں اشتراک تھا گویا یہ بتانا تھا کہ یہ سب ایک نوع تھے۔ یہاں عطف فعل کے ذریعے کیا اور فعل بھی ارسلنا کی جگہ بعثنا لاتے۔ یہ لفظ ارسال سے زیادہ بلیغ ہے۔ اور پھر تراخی کو بتانے کے لیے ثم لے کر آئے لیکن یہ ظاہر کرنے کے لیے یہ تراخی زمانی نہیں بلکہ نوعی ہے من بعدھم لے کر آئے۔ بعد اور من بعد میں جوہری فرق ہے قرأت القرآن بعد صلوٰۃ الفجر، وہاں بولا جائے گا جب نماز فجر کے بعد اذکار وغیرہ سے فراغت کے بعد قرآن کی تلاوت کی ہو اور قرات القرآن من بعد صلاۃ الفجر اس وقت بولا جائے گا جب نماز کے فوراً بلا فصل تلاوت قرآن کی ہو۔ یہاں حضرت موسیٰ اور شعیب میں کسی دوسرے پیغمبر کا فصل نہیں ہے اس لیے من بعد آیا ہے لیکن چونکہ دونوں کی دعوتوں کی نوعیت میں فرق ہے۔ حضرت شعیب کی دعوت دعوت عبادت ہے جبکہ حضرت موسیٰ کی دعوت فرعون کے سامنے بنی اسرائیل کی آزادی کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے ان انبیاء کے بعد حضرت موسیٰ کو اپنی آیات دے کر فرعون اور اس کی جماعت کی طرف روانہ کیا۔ جماعت سے مراد امراء اور حکومت کے کرتے دھرتے ہیں۔ کیونکہ بادشاہ اور امراء مملکت ہی بنی اسرائیل کو غلام بنائے ہوئے تھے اس لیے فرعون اور اس کی جماعت کی تعبیر اختیار کی۔ فرعون اور اس کی قوم نہیں فرمایا۔ آیات سے مراد معجزات بھی ہیں اور دلائل و براہین بھی ہیں۔ یعنی ایسی آیات جن سے حضرت موسیٰ کے دعویٰ کی صداقت معلوم ہو۔ آیات ہی نبوت شناسی کا پیمانہ ہیں۔

آیاتِ نبوت کی دو قسمیں

آیاتِ نبوت کی دو قسمیں ہیں ایک ظاہری اور مادی اور دوسری باطنی اور روحانی۔ ظاہری اور مادی آیات و دلائل تو وہ خوارق ہیں جن کو لوگ عام طور پر معجزات کہتے ہیں مثلاً مردہ زندہ کرنا، عصا کا سانپ بن جانا، انگلیوں سے چشمہ کا اُبلنا، بیمار کا اچھا کرنا وغیرہ، باطنی اور روحانی آیات و دلائل مدعیٔ نبوت کی صداقت، معصومیت، تزکیہ، تاثیر، تعلیم، ہدایت ارشاد فلاح اور تائید ہے۔ اہلِ نظر اور حقیقت شناسوں کے لیے یہی نبوت کی حقیقی نشانیاں ہیں۔ باقی ظاہری نشانیاں صرف سطحی اور ظاہر بین نگاہوں کے لیے ہیں جو ہر چیز کو ان ظاہری آنکھوں ہی سے دیکھ کر پہچانتے ہیں۔ انشاء اللہ ہم اس موضوع پر تفصیلی بحث اسی جلد میں کسی دوسرے موقعہ پر کریں گے۔

اس کے بعد ارشاد ہوا ہے فظلموا بہا یعنی انہوں نے آیات کے ساتھ ظالمانہ اور بے انصافی کا رویہ اختیار کیا کہ کبر و جحود کی وجہ سے ان کا انکار کر دیا اور اس کے نتیجہ میں وہ اور اس کی قوم نعمتِ ایمان سے محروم ہو کر رہ گئی۔ موسیٰ علیہ السلام کی اصل بعثت بنی اسرائیل کی طرف اور فرعون کی طرف تبعاً تھی۔ یا یوں کہہ دیجیے کہ حضرت موسیٰ کی تشریف آوری کا بنیادی مقصد بنی اسرائیل تھے اور فرعون اور اس کی جماعت کی طرف تشریف آوری اس مقصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ تھا۔ اور قاعدہ عقلی یہ ہے کہ مقاصد کی پاسبانی کے لیے وسائل سے آغاز کیا جاتا ہے۔ ظلموا کے مفعول پر با کفر کے معنے کی تضمین پیدا کرنے کے لیے لائی گئی ہے اس لیے فقرہ ظلموا بہا ایک وقت میں دوہرے معنے دے رہا ہے۔ یعنی انہوں نے آیات کا کفر کر کے اور ان کی تکذیب کر کے ظلم کیا۔ اور کچھ لوگوں نے با کو سببیہ قرار دیا ہے یعنی انہوں نے لوگوں کو آیاتِ نبوت پر ایمان لانے سے روک کر اپنے آپ پر اور لوگوں پر ظلم کیا ہے۔ پہلی بات میں زیادہ معنویت ہے یعنی آیات پر ظلم کیا یعنی ان کو نہ مانا اور ان کو سحر قرار دیا۔ مولانا مودودی نے ان معنے کو اچھے انداز میں سمجھایا ہے کہ جس طرح ایسے شعر کو جو شعریت کا مکمل نمونہ ہو تک بندی سے تعبیر کرنا اور اس کا مذاق اڑانا نہ صرف اس شعر کے ساتھ بلکہ نفسِ شاعری اور ذوقِ شعری کے ساتھ بھی ظلم ہے۔ اسی طرح وہ نشانیاں جو خود اپنے من جانب اللہ ہونے پر صریح گواہی دے رہی ہوں۔ اور جن کے متعلق کوئی صاحبِ عقل آدمی یہ گمان تک نہ کر سکتا ہو کہ سحر کے زور سے بھی ایسی نشانیاں ظاہر ہو سکتی ہیں بلکہ جن کے متعلق خود فنِ سحر کے ماہرین نے شہادت دے دی ہو کہ وہ ان کے فن کی دسترس سے باہر ہے ان کو سحر

قرار دینا نہ صرف ان نشانیوں کے بلکہ عقل سلیم اور صداقت کے ساتھ بھی ظلم عظیم ہے۔
بہرحال بتانا یہ چاہتا ہوں کہ فظلموا بہا کی ضمیر مجرور کا مرجع آیات میں معنے یہ ہیں کہ ان لوگوں نے ہماری آیات پر ظلم کیا اور ظلم سے مراد یہ ہے کہ ان لوگوں نے آیات الٰہیہ کی قدر نہ کی۔ اقرار کی جگہ ان کا انکار کیا۔ ایمان کے بجائے کفر اختیار کیا۔ اس کے بعد ارشاد ہوا ہے فانظر کیف کان عاقبۃ المفسدین یعنی اس سے زیادہ مفسد کون ہوگا جو خدا کے سفراء کو جھٹلاتے۔ آیات اللہ کی تکذیب اور حق تلفی کرے مخلوقِ خدا سے اپنی پرستش کراتے آگے ضروری تفصیل بیان فرماکر اس انجام کی تفصیل کی گئی ہے لے
اندازِ بیان میں خاص طور پر اسم ضمیر کی جگہ لفظ مفسدین لاکر اس طرف اشارہ کیا ہے کہ ظلم اور فساد لازم و ملزوم ہیں۔ جہاں ظلم ہوگا وہاں فساد ناگزیر ہے او۔ فانظر میں حرف فا اس بات کی غمازی کر رہا ہے کہ جیسے ان کے ظلم کا نتیجہ یہ ہولناک انجام ہے ٹھیک اس واقعہ کو بیان کرنے کا یہ ناگزیر تقاضا ہے کہ اس پر غور و فکر اور تدبر کیا جاتے گویا یہ فقرہ اس لیے آیا ہے کہ قرآن کے قاری کی توجہ اصل مقصد سے نہ ہٹنے پاتے۔ اس میں قریش کو تاریخ کی روشنی میں بتایا گیا ہے کہ تمہارے اندر ایک رسول کی بعثت ہوئی ہے اگر تم نے اس رسول کی تکذیب کر دی تو تم خدا کی زمین میں فساد برپا کرنے والے ٹھہروگے اور تمہارا حشر بھی وہی ہوگا جو تم سے پہلے دوسرے مفسدین کا ہوا ہے۔ یاد رہے کہ صلاح و فلاح کا تمام سرچشمہ نبوت کی تعلیم و ہدایت ہوتی ہے۔ رسول جو نظامِ زندگی لے کر آتا ہے وہی نظام سب کی اصلاح کا ضامن ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اس کی تکذیب اور مخالفت ہی خدا کی زمین میں فساد پیدا کرنے کے ہم معنے ہے۔ اور خاص طور پر فانظر فرماکر قرآن اپنے مخاطبوں کے جملہ دماغ میں علی سبیل التبادل یہ بات اتارنا چاہتا ہے کہ اس واقعہ کا انجام بہت فکر انگیز ہے۔ سوچنا چاہیے کہ موسیٰ علیہ السلام تن تنہا نہیں اور اس جماعت کے ایک فرد ہیں جس کے افراد کمزور ہیں اور فرعون کے جبر و استبداد کا تختہ مشق ہیں فرعون اور اس کی حکمران جماعت ملک کی بہت بڑی طاغوتی قوت ہے لیکن اللہ کی مدد سے مظلوم کامیاب ہو رہی ہے اور وقت کا حاکمانہ جبر و استبداد، اس کے فن کار اور دانشور ناکام ہو رہے ہیں۔ یہ اس بات کی کھلی اور واضح دلیل ہے کہ کامیابی مادی طاقت کو نہیں بلکہ معنوی اور روحانی

لے افادات شیخ الاسلام

طاقت کو ہوتی ہے جیسا کہ آج بھی ظالم قوتوں کے دبدبے کو دیکھ کر لوگ کہتے ہیں۔ انا للہ فالی اللہ المشتکی۔

موسیٰ علیہ السلام کی فرعون کو دعوت

۱۰۴ ۔ اور حضرت موسیٰ نے کہا اے فرعون میں رب العالمین کا فرستادہ ہوں میرا فرض منصبی ہے کہ اللہ کے بارے میں حق گوئی کو اپناؤں، میں تمہارے پاس تمہارے مالک و آقا کی جانب سے اپنی رسالت کی واضح دلیل لے کر آیا ہوں۔ اکثر مفسرین قرآن نے حقیق کے معنے جدیر (لائق) کے لیے ہیں اس لیے علیٰ کو بمعنی با لینا پڑا ہے یعنی میری شان کے یہی لائق ہے کہ خدا کی طرف سے کوئی ناحق اور غلط بات نہ کہوں۔ بعض نے حقیق کو بمعنی حریص لیا ہے لیکن حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز نے حقیق کو قائم اور ثابت کے معنے میں لیا جس کا مطلب یہ ہے کہ میں بغیر ادنیٰ تزلزل اور تذبذب کے پوری مضبوطی اور استقلال کے ساتھ اس پر قائم ہوں کہ سچ کے سوا کوئی چیز زبان سے نہ نکالوں۔ خدا کا پیام بلا کم و کاست تم کو پہنچا دوں اور تمہاری تکذیب اور تخویف کی وجہ سے ذرا بھی نہ ڈگمگاؤں لے دو معنے کی تصریح تو حضرت شیخ الاسلام نے فرمادی ہے ایک یہ کہ حقیق جدیر لائق سزاوار کے معنے ہیں دوسرے لفظ حقیق حریص کے معنے میں ہے۔ حافظ ابن کثیر نے بھی یہی دو معنے بتاتے ہیں۔ لیکن حریص کے معنے میں ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ یہ حقیق کا لغوی مدلول ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ حقیق میں حریص کے معنے کی تضمین ہے اور تضمین کا مطلب یہ ہے کہ لفظ میں اصلی معنے اور وہ معنے جو تعدیہ کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں دونوں میں ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ اس لحاظ سے فقرہ کا مطلب یہ ہوگا میں رب العالمین کا فرستادہ ہوں اور میرے شایانِ شان یہی ہے کہ میں اللہ کے بارے میں حق کے سوا کچھ نہ کہوں اور میں اسی کا حریص ہوں اس کو کبھی نظرانداز نہ ہونے دوں گا۔ ابو عبید نے حقیق کے معنے فرض واجب بھی بتاتے ہیں۔ یعنی رسول ہونے کی حیثیت میں میرا فرض یہ ہے کہ اللہ کے بارے میں حقیقت اور واقعیت سے ہٹ کر کچھ نہ کہوں۔ ان معنے کی تائید حضرت نافع کی اس قرأت سے بھی ہوتی ہے جس میں حقیق علیّٰ ہے یعنی یہ میرا فرض ہے کہ میں اللہ کے نام سے صرف وہی کچھ پیش کروں جس میں حق صداقت ہو۔
حضرت موسیٰ نے فرعون کو مخاطب کر کے یہ پیغام پہنچایا کہ میں اللہ رب العالمین کا رسول ہوں۔ اس میں حضرت موسیٰ نے دو باتیں فرعون کے گوش گزار کی ہیں۔ ایک اللہ کی توحید، دوسرے رسالت

رب العالمین کہہ کر جتا دیا کہ اس کائنات کا مالک و آقا اللہ ہے نہ تو ہے اور نہ کوئی اور۔ بندگی صرف اللہ کی ہونی چاہیے نہ کہ تیری۔ اور میں اللہ کا رسول ہوں۔ رسول ہونے کی وجہ سے تبلیغ و ہدایت میں قطعاً ہر قسم کے گناہ سے پاک ہوں۔ فرعون نے حضرت موسیٰ سے اللہ سبحانہٗ کی ربوبیت پر مناقشہ کیا جیسا کہ آپ سورہ الشعراء میں پڑھیں گے اور سورہ طٰہٰ میں ایمان بالیوم الآخر کا بھی ذکر ہے۔ منشا یہ ہے کہ حضرت موسیٰ نے سب سے پہلے فرعون کو ایمان کے تینوں اصول توحید، رسالت اور بعثت و جزاء کی دعوت پیش کی۔

بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ

۱۳۳- لہٰذا تو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ روانہ کر دے۔ یوں تو حضرت موسیٰ نے کئی کئی طرح کی نصیحتیں کیں جیسا کہ دوسری آیات میں مذکور ہیں فقل ھل لک الی ان تزکی و اھدیک الی ربک فتخشی۔ مگر ایک بڑی اہم چیز یہ تھی کہ بنی اسرائیل کو جو انبیائے کرام کی اولاد میں سے تھے اور جنہیں فرعونیوں نے ذلیل جانوروں کی طرح غلام بنا رکھا تھا۔ مظالم و شدائد سے نجات دلائیں اس موقعہ پر فرعون کو مخاطب کرتے ہوئے اسی چیز کی طرف متوجہ کرتے ہوئے فرمایا کہ بنی اسرائیل کو اپنی قید و بیگار سے نجات دے تاکہ وہ آزادی کے ساتھ اپنے پروردگار کی عبادت میں مشغول ہوں اور میرے ساتھ اپنے وطن مالوف شام چلے جائیں کیونکہ ان کے جد اعلیٰ حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے عراق سے ہجرت کر کے شام ہی میں قیام فرمایا تھا۔ بعدہٗ حضرت یوسف علیہ السلام کی وجہ سے بنی اسرائیل مصر میں آباد ہوئے اب چونکہ یہاں قبطیوں نے ان پر طرح طرح کے مظالم کر رکھے ہیں ضرورت ہے کہ ان قبطیوں کی ذلیل غلامی سے آزادی دلا کر آبائی وطن کی طرف واپس کیا جائے[1]۔

پہلے شیخ الاسلام نے ایک ذہن میں اُٹھتے ہوئے سوال کا جواب دیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا حضرت موسیٰ نے فرعون اور اس کے درباریوں کے سامنے کوئی دعوت پیش نہیں کی بس بلا تمہید یہ مطالبہ ہی ان کے سامنے رکھ دیا کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ روانہ کر دو۔ اس کا جو جواب شیخ الاسلام نے اجمالاً دیا ہے اس کی توضیح یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کی جو سرگزشت بیان ہوئی ہے وہ قرآن کی مختلف سورتوں میں سورتوں کے مضمون کے لحاظ سے الگ الگ کر کے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

بیان ہوتی ہیں۔ ہر سورت میں سرگزشت کا اتنا ہی حصہ بیان ہوا ہے جس قدر حصہ کے لیے سورۃ کے موضوع کا تقاضا تھا۔ یہ سورت چونکہ انبیاء کے مکذبین کے انجام کو ظاہر کر رہی ہے اس لیے اس میں سرگزشت کا صرف وہی حصہ بیان ہوا ہے جس کا سورت کے موضوع سے تعلق ہے باقی اجزاء دوسری سورتوں میں اپنے اپنے موقع پر آئے ہیں۔ سورہ الشعراء میں بات کا آغاز ہی تقویٰ سے کیا ہے۔

اذ نادی ربک موسیٰ ان ائت القوم الظالمین قوم فرعون الا یتقون۔

اور سورہ طٰہٰ میں تذکیر اور خشیت کی دعوت کا ذکر ہے اور سورہ نازعات میں تزکیہ کی خاص دعوت کا ذکر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ نے فرعون کو اولاً عام انبیاء کی سنت کے مطابق ایمان باللہ، ایمان بالرسالۃ، ایمان بالیوم الآخر کی دعوت دی۔ بعدازیں بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ کیا درا صل قرآن نے جستہ جستہ حضرت موسیٰ کی زندگی کے جو حصے بیان کیے ہیں ان میں قرآن نے واقعاتی ترتیب کو پیش نظر نہیں رکھا کیونکہ قرآن کی موعظت کا ایک دائرہ ہے وہ جو کچھ کہتا ہے اسی کے اندر رہ کر کہتا ہے۔ بس ضروری ہے کہ حضرت موسیٰ کی زندگی کے واقعات کو بھی اسی کے اندر رہ کر دیکھیں اس سے باہر جانے کی کوشش نہ کریں۔ قرآن کے اس انداز بیان نے اہم حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ تاریخ کا استعمال کیا ہونا چاہیے۔ قرآن کے اس انداز سے معلوم ہو گیا کہ گزشتہ کا مطالعہ اس لیے کرنا چاہیے کہ آئندہ کے لیے عبرت حاصل ہو۔ ہم اگر چاہیں تو قرآن کی مدد سے حضرت موسیٰ کی زندگی تاریخی ترتیب کے ساتھ مرتب کر سکتے ہیں کیونکہ قرآن نے حضرت موسیٰ کی پیدائش سے لے کر ان کی وفات تک کے واقعات کو جستہ جستہ بیان کیا ہے۔ یہ بہت بڑی بے انصافی ہو گی اگر ہم یہ کہیں کہ حضرت موسیٰ نے پہلے ہی روز ارسل معی بنی اسرائیل کا مطالبہ فرعون کے سامنے پیش کر دیا تھا۔ حالانکہ یہ مطالبہ بالکل آخری مطالبہ ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے دشمنوں کے درمیان زندگی بسر کی۔ آپ نے فرعون اور اس کے درباریوں کو ہر طرح سمجھایا مگر وہ ایمان نہ لاتے اور بالآخر موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے ہجرت کرنی پڑی۔ آپ کو جس قدر معجزے عطا ہوتے تھے اس لیے عطا ہوئے تھے کہ ان کو دکھا کر فرعون کو حق کی دعوت دی جائے۔ جب ایک مدت کے بعد اہل مصر میں سے جس قدر لوگ ایمان لا سکتے تھے لے آتے تو حضرت موسیٰ کو شق بحر کا معجزہ ملا اور رود احمر کی لہریں فرعون کو اس کے ساز و سامان کو ہمیشہ کے لیے نگل گئیں اور اس کے بعد فرعون کی شامی مملکت پر بنی اسرائیل قابض ہو گئے۔ یاد رہے کہ فرعون کی حکومت شام سے لے کر لیبیا تک

اور بحر روم کے سواحل سے حبش تک پھیلی ہوئی تھی۔ اور اس عظیم الشان ملک کا مطلق العنان بادشاہ ہی نہیں بلکہ معبود بنا ہوا تھا۔

رسالت پر فرعون کا مطالبہ

۱۳۴۔ فرعون نے کہا کہ اگر تو اپنی رسالت پر کوئی نشانی لے کر آیا ہے تو اگر تیرے دعویٰ میں صداقت ہے تو نشانی پیش کر۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی لاٹھی ڈال دی تو اچانک وہ واضح طور پر ایک اژدہا بن کر سامنے آ گیا اور آپ نے گریبان سے ہاتھ نکالا تو وہ بھی یکایک سب دیکھنے والوں کے سامنے چمک رہا تھا۔ اژدھا ہونے میں کسی طرح کا کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی۔ کہتے ہیں کہ وہ اژدہا منہ کھول کر فرعون کی طرف لپکا۔ آخر فرعون نے بدحواس ہو کر موسیٰ علیہ السلام سے اس کے پکڑنے کی درخواست کی۔ موسیٰ علیہ السلام کا ہاتھ لگانا تھا کہ پھر عصا بن گیا۔ اور ہاتھ کے چمکنے کے لیے موسیٰ علیہ السلام نے ہاتھ گریبان میں ڈال کر اور بغل میں دبا کر نکالا تو لوگوں نے کھلی آنکھوں دیکھ لیا کہ غیر معمولی طور پر سفید اور چمکدار تھا۔ یہ روشنی اور چمک کسی مرض برص وغیرہ کی وجہ سے نہ تھی بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قلب منور کی روشنی بطورِ اعجاز ہاتھ میں سرایت کر جاتی تھی[1]

یہ فرعون کا حضرت موسیٰ سے رسالت کے موضوع پر سب سے پہلا مناظرہ ہے۔ اندازِ بیان بتا رہا ہے کہ یہ حضرت موسیٰ کی فرعون سے پہلی گفتگو نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے فرعون سے گفتگو ہو چکی ہے۔ اس گفتگو میں فرعون نے حضرت موسیٰ سے ان کے اس دعویٰ پر دلیل کا مطالبہ کیا کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ اس نے کہا کہ تمہارے اس دعوے میں صداقت ہے کہ تم خدا کے رسول ہو تو اپنے رسول ہونے کی کوئی نشانی پیش کرو۔ حضرت موسیٰ نے دو نشانیاں پیش کیں۔ ایک لاٹھی کے اژدہا بن جانے، دوسرا ہاتھ کے چمکیلا ہونے کا۔ یہ دو نشانیاں حضرت موسیٰ کو اس امر کے ثبوت میں مرحمت ہوئیں کہ وہ اس خدا کے نمائندے ہیں جو کائنات کا خالق اور فرمانروا ہے ان نشانیوں کو قرآن کی اصطلاح میں آیات اور براہین کہا جاتا ہے۔ یہاں ان دو نشانیوں کو آیت کہا گیا ہے اور سورہ قصص میں ان کو برہان کہا گیا ہے۔ اور ان ہی کو متکلمین کی زبان میں معجزات اور خوارق کہا جاتا ہے۔ امام بخاری نے صحیح میں ان کو علاماتِ نبوت کہا ہے۔ اور جن مؤلفین نے

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

اس موضوع پر مستقل تصانیف فرمائی ہیں۔ انہوں نے اپنی تصانیف کا نام دلائل نبوت رکھا ہے۔ حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ معجزات کا صحیح عنوان آیات و براہین ہے اور یہی عنوان قرآن کریم اور سلف صالحین نے اختیار کیا ہے اور معجزہ کی صحیح حقیقت سمجھنے کے لیے یہی تعبیر بہت آسان ہے۔ معجزہ کے عنوان سے بہت سی الجھنیں پیدا ہو گئی ہیں جو بہت بڑی تفصیل کے بعد بھی قابو میں نہیں آتی ہیں۔ لمبی چوڑی بحثوں کے بعد ارباب تصانیف کا شاہوارِ قلم کسی ایک راستے پر قائم نہیں ہے۔ بہرحال معجزہ کی اصطلاح غلط ہے کیونکہ قرآن و سنت میں یہ لفظ استعمال نہیں ہوا ہے بلکہ اس کی جگہ آیت اور برہان کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جو اپنے مفہوم کو نہایت خوبی سے ادا کرتے ہیں۔ قدیم محدثین نے دلائل اور علامات کے الفاظ استعمال کیے ہیں جو الفاظِ قرآنی کے ہم معنے ہیں۔

معجزات اور عقلیت

آیات و براہین یا علامات و دلائل کے الفاظ کو سننے کے ساتھ ہی سب سے پہلے دلوں میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ ممکن بھی ہیں کیا عقل و خرد ان کے وقوع کو جائز بھی رکھتی ہے۔ دُنیا میں عقل و نقل اور فلسفہ و مذہب کا جب سے وجود ہے ان مباحث پر معرکہ آرا بحثیں ہوتی چلی آئی ہیں۔ لیکن فلسفہ قدیمہ ہو یا جدیدہ فلسفہ یونان ہو یا فلسفہ اسلام، مشرق کا فلسفہ ہو یا مغرب کا ان سب کا حاصل بحث یہ نکلتا ہے کہ اگر کچھ فرقے ان کو ممکن بلکہ واقع سمجھتے ہیں تو دوسرے ان کو محال قطعی تصوّر کرتے ہیں۔ عقل و فہم کا یہ اختلاف دُنیا میں ہمیشہ سے قائم تھا قائم ہے اور قائم رہے گا۔ لیکن جو لوگ ان کے امکان اور وقوع کے قائل ہیں وہ خود اپنے کج بحث دماغ اور بدگمان قلب کی تسکین اور رفع شک کے لیے اپنے فہم و ادراک کے موافق مختلف نظریے قائم کرتے ہیں تاکہ وہ اپنی راز جو طبیعت کی تشنہ لبی کو تسکین دے سکیں۔ ان تمام نظریات کا ماحصل یہ ہے کہ عقل و حواس سے مافوق ان حقائق کو اپنے دریافت کردہ معلوم و محسوس قواعد کے مطابق بنا سکیں لیکن کیا یہ ممکن ہے؟ کیا غیر محسوس و محسوس یا جسمانی و روحانی دنیا دونوں ایک ہی نظام پر چل رہی ہے کہ ایک عالم کے قیاس تمثیلی و استقرائی سے ہم دوسرے عالم کے ثبوت پر شہادتوں کا انبار لگانا چاہتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جو جانا نہیں جا سکتا اس کو ہم جاننا چاہتے ہیں اور جو سمجھا نہیں جا سکتا اسے ہم سمجھنا چاہتے ہیں۔ جب ہماری عقل و فہم کی تنگ پائی محسوسات کے دائرے میں صاف نظر آتی ہے تو ماوراء محسوسات اس کی دوڑ دھوپ کہاں تک منزلِ مقصود

تک پہنچا سکتی ہے۔

معجزہ کی حقیقت

دوسری باتوں سے پہلے ہمیں اس پر غور کرنا چاہیے کہ خود معجزہ کیا ہے۔ اگرچہ اس پر علماء نے بہت کچھ لکھا ہے اور جدید و قدیم نے سیر حاصل دادِ تحقیق دی ہے لیکن ہم ادہر اُدہر سے ہٹ کر اپنے لفظوں میں معجزے کی حقیقت یہ سمجھتے ہیں۔ جس طرح زمین و آسمان، چاند و سورج، پھل اور پھول کے خاص خاص قوانین فطرت ہیں جن میں عموماً تغیر نہیں ہوتا۔ اسی طرح دُنیا کی رشد و ہدایت، عذاب و رحمت اور نبوّت و رسالت کے خاص خاص اُصول و قواعد ہیں جن میں تغیر راہ نہیں پاتا۔ انبیاء اپنے اپنے وقت پر مبعوث ہو کر قوموں کو دعوت دیتے ہیں۔ قومیں ان کی تصدیق یا تکذیب کرتی ہیں۔ منکرین ہلاک اور مومنین کامیاب ہوتے ہیں۔ اس روحانی جہاد میں انبیاء و رسل سے ہمارے علم و دانش سے بالاتر اعمال صادر ہوتے ہیں اور ان سے عجیب و غریب خوارق ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ جس طرح ہمارا نفس اور ہماری رُوح یا ہمارے جسم کی پُر اسرار مخفی ہمارے کالبد خاکی پر حکمران ہے اور ہمارے تمام اعضاء و جوارح اس کے ایک ایک اشارے پر حرکت کرتے ہیں۔ اسی طرح نبوّت کی روح اعظم اذانِ الٰہی سے سارے عالم جسمانی پر حکمران ہو جاتی ہے اور روحانی دُنیا کے سنن و اصول عالمِ جسمانی کے قوانین پر غالب آجاتے ہیں اس لیے چشم زدن میں فرشِ زمین سے عرشِ بریں تک عروج کر جاتی ہے۔ سمندر اس کی ضرب سے تھم جاتا ہے۔ چاند اس کے اشارے سے دو ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ اس کے ہاتھوں کی دی ہوئی چند خشک روٹیاں ایک عالم کو سیر کر دیتی ہیں۔ اس کی انگلیوں سے پانی کی نہریں نکلتی ہیں۔ اس کے پھینکنے سے لاٹھی اژدہا بن جاتی ہے۔ وہ ہاتھ گریبان سے نکالتا ہے آفتاب کی طرح روشن ہو جاتا ہے۔ اس کے نفسِ پاک سے بیمار تندرست ہو جاتے ہیں اور مُردے جی اُٹھتے ہیں۔ وہ تنہا مٹھی بھر خاک سے پوری فوج کو تہ و بالا کر دیتا ہے۔ کوہ و صحرا، بحر و بر، جاندار و بے جان بحکمِ الٰہی اس کے آگے سرنگوں ہو جاتے ہیں مگر بایں ہمہ وہ بندہ اور بشر ہوتا ہے اور اس سے یہ جو کچھ عجائباتِ قدرت ظاہر ہوتے ہیں وہ اس کا نہیں بلکہ اس کے رب کا فعل ہوتا ہے اور اسی کی مشیت اور قدرت سے پیغمبر کے ہاتھ سے ظاہر ہوتا ہے یا اللہ سبحانہٗ کی طرف سے اس کے لیے ظاہر کیے جاتے ہیں۔

لیکن جس طرح ہم کبھی یہ نہیں بتا سکتے کہ خاص خاص پھول خاص خاص درخت، خاص خاص ستارے، فلاں فلاں معین اوقات ہی پر کیوں جلوہ نما ہوتے ہیں۔ ستارے چمکتے کیوں ہیں، شہد میٹھا کیوں ہوتا ہے۔ چاند اور سورج چلتے کیوں ہیں؟ تخم، درخت، غذا، خون، گوشت کیوں کر بن جاتا ہے۔ اسی طرح اس کا جواب بھی نہیں دے سکتے کہ پیغمبروں کا ظہور اپنے اپنے وقت پر کیوں ہوتا ہے اور ان سے یہ مافوق العادۃ افعال واعمال بحکم الٰہی کیوں کر صادر ہوتے ہیں۔ ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ وہ ہوتے ہیں چنانچہ دُنیا کا ہر پیغمبر بلکہ روحانیت کا ہر حامل اپنی پر اسرار زندگی کے اندر اس قسم کے حالات وکیفیات کی ایک دُنیا رکھتا ہے۔ عالم کی تاریخ آپ کے سامنے ہے جس میں اگر قوموں کے روحانی معلموں کے حالات غور سے پڑھیں تو آپ کو ہر جگہ نظر آئے گا کہ وہ وہ کچھ دیکھتے ہیں جو ہم نہیں دیکھتے وہ وہ کچھ سنتے ہیں جو ہم نہیں سنتے۔ وہ وہ کچھ جانتے تھے جو ہم نہیں جانتے اور ان سے وہ اعمال صادر ہوتے ہیں جو کسی اور سے نہیں ہو سکتے۔ یہ تاریخی واقعات ہیں جن کا انکار کسی طرح ممکن نہیں ہے۔

آئیے اب اسی موضوع پر عُلماء نے جو معجزہ کی تعریف بتاتے ہوتے اپنی تحقیقات زیبِ قرطاس فرمائی ہیں وہ بھی سن لیجئے:

حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری جلد ششم میں فرماتے ہیں:

معجزہ کو معجزہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ جن کے روبرو وہ ظاہر کیا جاتا ہے وہ اس کا سامنا کرنے سے عاجز آجاتے ہیں اور معجزہ میں تا تانیث کی نہیں، بلکہ علامّہ کی طرح مبالغہ کے لیے ہے یا معجزہ صفت ہے اور اس کا موصوف محذوف ہے۔ اصل میں آیۃ معجزہ ہے اس وقت تا تانیث کے لیے ہے۔

اور مشہور عالم حضرت ملا علی قاری مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں لکھتے ہیں:-

معجزہ عجز سے مشتق ہے جو قدرت کی ضد ہے اور تحقیقی بات صرف یہ ہے کہ معجزہ وہ ہے جو غیر میں عجز کا فعل پیدا کرے۔

علاّمہ قاضی عیاض مالکی شفا میں رقمطراز ہیں:

جاننا چاہیے کہ جو خرق عادت چیز انبیاء کرام کے ہاتھ پر صادر ہوتی ہے اس کو اس لیے معجزہ کہتے ہیں کہ مخلوق اس کے کرنے سے عاجز ہوتی ہے۔

امام عبدالوہاب شعرانی سراج العقول کے حوالہ سے لکھتے ہیں،

معجزہ وہ فعل ہے جس کو اللہ تعالیٰ خرق عادت کے طور پر مدعیٔ نبوت کے ہاتھ پر
اس کے دعویٰ نبوت کی تائید میں صادر فرمائے ۔

مولانا عبدالحی لکھنوی فتاوی میں لکھتے ہیں ،

معجزہ اس خرقِ عادت کو کہا جاتا ہے جو منکرینِ نبوت کے مقابلہ میں مدعیٔ نبوت
کے ہاتھ پر صادر ہو اور اس کی مثل لانے کی کسی کو قدرت نہ ہو ۔

مشہور مفسرِ قرآن علامہ السید رشید رضا تفسیر المنار میں لکھتے ہیں ،

معجزہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنے عادی نظام کے خلاف صرف اپنی قدرت
سے ظاہر فرماتا ہے تاکہ یہ بات ثابت کر دے کہ نوامیس طبعیہ خود اس کے محکوم ہیں
وہ ان کا محکوم نہیں ہے ۔

حضرت مولانا اشرف علیؒ نے بوادر النوادر میں معجزہ کی حقیقت پر بڑا بصیرت افروز اور جامع
تبصرہ فرمایا ہے ۔ فرماتے ہیں :

معجزہ یہ ہے کہ اس کے صدور میں اسباب طبعیہ کو اصلاً دخل نہیں ہوتا نہ
جلیہ کو نہ خفیہ کو ۔ نہ صاحبِ معجزہ کی کسی قوت کو نہ خارجی قوت کو ۔ وہ براہ راست حق
تعالیٰ کی مشیت سے بلا توسط اسباب عادیہ واقع ہوتا ہے جیسا کہ صادر اول بلا کسی
واسطہ کے صادر ہوا ہے یعنی فلاسفہ کے نزدیک ۔ پھر قیامت تک بھی کوئی شخص
اس میں سبب طبعی نہیں بتلا سکتا کیونکہ معدوم کو موجود کون ثابت کر سکتا ہے ورنہ
اگر معجزہ سے کسی زمانہ خاص میں صاحبِ معجزہ کی تائید ہو جاتی تو دوسرے زمانہ میں
اس کے سبب خفی بتلانے سے اس کی تکذیب ہو جاتی تو کسی نبی کی نبوت پر یقین
نہیں ہو سکتا ۔ یہی وجہ ہے کہ معجزہ اس کے جنس کے ماہرین نے کوئی سبب خفی
بتلا کر باقاعدہ شبہ نہیں کیا نہ اس کے مثل کو ظاہر کر کے مقاومت کر سکے ۔ بالخصوص
اگر نبی کی قوت اس کا سبب ہوتی تو موسیٰ علیہ السلام اپنے معجزے سے خود نہ ڈرتے
اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض فرمائشی معجزوں کی تمنا پر یہ نہ فرمایا جاتا فان
استطعت ان تبتغی نفقا فی الارض او سلما فی السماء فتاتیھم بآیۃ اور
استناد الی الاسباب الخفیہ کے احتمال پر معجزہ و دیگر عجائب طبعیہ میں کوئی فرق
واقعی نہ ہوتا ۔ ۔ ۔ اور انضمام اخلاق و کمالات کے ساتھ جو اس کی دلیل کہا گیا ہے

تو ان اخلاق کی مخصوص نوعیت کو پہچاننے میں جتنی غلطی ہو سکتی ہے وہ معجزات کے متعلق غلطی ہونے سے کہیں زیادہ ہے۔

حضرت اقدس نے ان مختصر کلمات میں وہ سب کچھ فرما دیا ہے جو حال کے مؤلفین اوراق میں بھی نہیں کہہ سکتے۔ اس فقرے میں کہ انضمام اخلاق و کمالات ہیں اس کی پوری وضاحت کر دی ہے کہ کسی نبی کے اخلاق و کمالات میں اگرچہ اعجاز کی کتنی روح موجود ہو لیکن ان کا یہ اعجاز نظری ہوتا ہے لہٰذا ان کو معجزہ بنا کر پیش نہیں کیا جا سکتا۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اپنی مشہور کتاب حجۃ الاسلام میں فرماتے ہیں :

مدارِ نبوت تین باتوں پر ہے اوّل یہ کہ محبت و اخلاص خداوندی اس قدر ہو کہ ارادہ معصیت کی بھی گنجائش نہ ہو لہٰذا نبوت کے لیے عصمت ناگزیر ہے۔ دوسرے یہ کہ اخلاق حمیدہ و پسندیدہ ہوں اور اخلاق کا اچھا یا بُرا ہونا اس پر موقوف ہے کہ خدا تعالیٰ کے اخلاق کے موافق یا مخالف ہوں جو خدا تعالیٰ کے اخلاق کے موافق ہوگا وہ اچھا ہے اور جو مخالف ہوگا وہ بُرا ہے۔

تیسری بات عقل و فہم ہے۔۔

الغرض اصل نبوت اس کو مقتضی ہے کہ فہم سلیم اور اخلاق حمیدہ اس قدر ہوں رہے معجزات تو وہ نبوت کے بعد عطا کیے جاتے ہیں یہ نہیں ہوتا کہ جس نے اظہارِ معجزات کے امتحان میں نمبر اوّل حاصل کیا اس کو نبوت عطا ہو گئی ورنہ ناکام رہا۔

معجزات کی دو قسمیں علمی اور عملی

مولانا محمد قاسم نانوتوی نے معجزات کی دو قسمیں بتائی ہیں علمی اور عملی۔ معجزات عملی سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص دعویٰ نبوت کر کے ایسا کام کر دکھائے کہ اور سب اس کام کے کرنے سے عاجز آجائیں اور معجزہ علمی یہ کہ کوئی شخص دعویٰ نبوت کر کے ایسے علوم ظاہر کرے کہ دوسرے افراد اس کے مقابلہ میں عاجز آجائیں۔ اور حافظ ابن کثیر نے بھی البدایہ والنہایہ میں معجزہ کی دو قسمیں بتائی ہیں حسی اور معنوی معنوی معجزے سے مراد مدعیٔ نبوت کے وہ اوصاف و ملکات ہیں جو اللہ سبحانہٗ کسی کسب کے بغیر آغاز ہی سے ان میں ودیعت فرماتے ہیں۔ اس لیے ان کے من جانب اللہ ہونے کی نشانی خود ان کے سرتاپا وجود ہوتا ہے دیکھنے والوں کے لیے ان کی چشم و ابرو میں اور سننے والوں کے لیے ان کے

لہجہ وآواز ہیں اور سمجھنے والوں کے لیے ان کا پیام و دعوت میں اعجاز ہوتا ہے لیکن جو لوگ احساسِ حقیقت میں فروتر ہوتے ہیں ان کو اس سے تسکین نہیں ہوتی اور وہ مادی اور حسی نشانیوں کے طلبگار ہوتے ہیں جو بالآخر ان کو دی جاتی ہیں لیکن انبیائے کے متبعین میں سے سابقین، اوّلین اور صدیقین وصالحین نے اپنے اپنے پیغمبروں سے معجزہ طلب نہیں کیا۔ حضرت ہارون و یوشع نے حضرت موسیٰ کا معجزہ دیکھ کر ان کو پیغمبر تسلیم نہیں کیا تھا۔ حضرت عیسیٰ کے حواریوں نے ان کا معجزہ دیکھ کر آسمانی دولت کا حصہ نہیں پایا۔ حضرت خدیجہ سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں مگر چاند کے دو ٹکڑے ہوتے ہوتے دیکھ کر نہیں بلکہ یہ جان کر کہ آپ غریبوں کے دست و بازو ہیں، قرضداروں کی تسکین اور سہارا ہیں، مسافروں کے ملجا و ماویٰ ہیں۔ حضرت ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم اور دیگر اصحاب کبار میں سے کسی ایک نے بھی آپ کی صداقت اور راستی کی حقیقت کو ظاہری آیات و معجزات کی روشنی میں تلاش نہیں کیا۔ ان کے لیے آپ کا سرتا پا وجود نفس دعوتِ حق اور پیام اخلاص ہی معجزہ تھا۔ انہوں نے اسی کو دیکھا اور اسی سے ایمان کی دولت پائی مگر فرعون، نمرود، ابوجہل اور ابولہب جو آتشِ خلیل، طوفانِ نیل، قحطِ مکہ اور انشقاقِ قمر کے معجزوں کے طالب تھے پھر بھی ایمان کی دولتِ عظمیٰ سے محروم رہے۔ لیکن بایں ہمہ ایک درمیانی طبقہ بھی دنیا میں موجود رہا ہے جس کے بصیرت کے آئینے پر غفلت کے زنگ کی کچھ کچھ چھائیاں پڑی ہوتی ہیں۔ جب حقیقت کا آفتاب طلوع ہوتا ہے اور اس کی معجزانہ کرنیں ان آئینوں پر پڑتی ہیں تو وہ چمک اٹھتے ہیں اور آمنا برب ھارون وموسیٰ، فرعون کے ساحروں نے حضرت موسیٰ کے معجزوں کو دیکھا تو موسیٰ و ہارون کے خدا کے آگے سجدہ میں گر پڑے۔ یہی طبقہ ہے جس کو حسی معجزات سے بقدرِ استعداد حصہ ملتا ہے اس کے علاوہ حسی معجزات کا بڑا حصہ مویدات یعنی تائیدِ حق کے لیے غیر منتظر اور غیر متوقع حالات کا رونما ہونا ہے۔ مومنین و صادقین کو مشکلات کے عالم اور اضطراب کی گھڑیوں میں ان کے ذریعے سے تسکین دی جاتی ہے اور رسوخِ ایمان اور ثباتِ قدم رحمت ہوتا ہے۔ ان بے سر و سامانیوں اور بے نوائیوں کی مکافات ہوتی ہے اور اس سے ان کی دولتِ ایمان کا سرمایہ ترقی کرتا ہے۔

معجزہ کا سبب صرف ارادۂ الٰہی ہے۔

معجزہ کا سبب براہ راست اللہ کی مشیت اور اس کا ارادہ ہے۔ کبھی یہ مشیت وارادہ عادات جاریہ اور ظاہری علل و اسباب کے پردے میں ظاہر ہوتا ہے مثلاً قوم نوح کے لیے طوفان آنا،

قوم ہود کے کوہ آتش فشاں کا پھوٹنا اور زلزلہ آنا۔ حضرت ایوب کا چشمہ کے پانی سے صحیح و تندرست ہو جانا، قوم صالح کے لیے آندھی آنا، مکہ میں قحط عظیم کا رونما ہونا۔ غزوہ خندق میں آندھی چلنا۔ یہ تمام نشانیاں ظاہری اسباب اور عادات جاریہ کے خلاف نہیں لیکن ان اسباب کے ظاہر ہونے کا سبب جس میں حق کی فتح اور باطل کی شکست، نیکوکاروں کی نجات اور گنہ گاروں کی ہلاکت ہوئی نہ بخت و اتفاق ہے بلکہ ارادہ مشیت الٰہی نے خاص ان موقعوں کے لیے بطور نشان کے ان کو پیدا کیا اور کبھی یہ مشیت الٰہی عادات جاریہ اور اسباب ظاہری کا نقاب اوڑھ کر نہیں بلکہ بے پردہ نشان بن کر سامنے آتی ہے۔ مثلاً عصا کا سانپ بن جانا اور ہاتھ کا چمکیلا ہو جانا کہ ان کی تشریح موجودہ علم و اسباب و علل کی بنا پر نہیں کی جا سکتی۔ اور نہ ان کو عادات جاریہ کے مطابق کہا جا سکتا ہے اس لیے ان کی علت خدا کی مشیت اور ارادے کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے انبیاء نے یہ تصریح کی ہے کہ جو کچھ ان سے ظاہر ہوتا ہے وہ صرف خدا کی قدرت اور مشیت اور اذن سے ہوتا ہے کیونکہ اگر وہ ظاہری سبب و علت کے مطابق ہوں تو وہ پیغمبر اور خدا کے باہمی ربط و علاقہ کی دلیل کیوں کر بن سکتے ہیں۔ مخاطب ان کو دیکھ کر فوراً کہہ سکتے ہیں کہ یہ تو فلاں سبب سے ہوا ہے اس لیے خدائی نشان کیوں کر ہو سکتا ہے۔

معجزہ کا فاعل نبی نہیں اللہ ہے

عام لوگوں میں نبوت کے بارے میں یہ غلط عقیدہ پیدا ہو گیا تھا کہ جو نبوت کا خلعت لے کر آتا ہے وہ براہ راست عالم کائنات کے تصرف پر قادر ہے چنانچہ موجودہ انجیلوں کے مصنفوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کو جس انداز سے پیش کیا ہے اس نے عیسائیوں کے دلوں میں یہ یقین پیدا کر دیا ہے کہ یہ تمام کائنات حضرت عیسیٰ کے قبضہ و قدرت میں تھی اور وہ اس میں جیسے چاہتے تھے تصرف کرتے تھے یہی وہ بنیادی پتھر ہے جس پر انجیل کے مصنفوں نے اپنے دین کی دیوار کج کھڑی کی تھی۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ توحید کی عمارت اس پر قائم نہ رہ سکی۔ قرآن نے نہایت شدت اور نہایت اصرار سے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ معجزات اور نشانات پیغمبر کی قوت اور ارادہ سے نہیں بلکہ خدا کی قدرت اور مشیت سے ظاہر ہوتے ہیں۔

یہ بڑے دکھ کی بات ہے کہ عیسائیوں کی دیکھا دیکھی کچھ نام نہاد مسلمانوں نے بھی ایسا ہی کہنا شروع کر دیا اور اسلام کے صاف چہرے کو گرد آلود بنانے کی کوشش کی انا اللہ فالی اللہ المشتکی۔

قرآن نے یہ بات کھول کر سمجھائی ہے۔

قل انما الایات عند اللہ - (انعام ۱۳-)

قل انما الایات عند اللہ - (عنکبوت ۵-)

قل ان اللہ قادر علی ان ینزل ایۃ (انعام ۴)

وما کان لرسول ان یاتی بایۃ الا باذن اللہ -

اور سینہ قرآن سے ابلی ہوئی ان ہی صداؤں سے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے معلوم کر کے علمائے اہل السنہ نے اس موضوع پر اسلام کا یہ چہرہ پیش کیا ہے۔ اللہ سبحانہ جزائے خیر دے حضرت مولانا ابو الزاہد محمد سرفراز خاں صفدر صدر مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کو کہ انہوں نے اس موضوع پر کتاب ہدایۃ المرتاب الی طریق الصواب، لکھ کر اسلام کا صحیح چہرہ علمائے عامہ کے سامنے کھول کر پیش کر دیا۔ وہ فرماتے ہیں :

رئیس الاحناف قاضی ابوبکر ابن الطیب الباقلانی لکھتے ہیں :

یہ ثابت ہو چکا ہے کہ معجزہ جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی دلیل ہے اس کے بارے میں یہ کہنا درست نہیں ہے کہ وہ بندوں کی قدرت کے تحت داخل ہے بلکہ معجزہ کی قدرت پر اللہ تعالیٰ ہی منفرد ہے۔ (اعجاز القرآن)

اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ معجزہ خواہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ہو یا کسی اور نبی کا بہرحال اس پر صرف اللہ سبحانہ قادر ہے اور یہ صرف اسی کا فعل ہے بندوں کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔

علامہ قاضی عیاض مالکی لکھتے ہیں :

معجزات کا اللہ کے بغیر کسی اور سے ہونا ممکن نہیں ہے بلکہ یہ اللہ کا فعل ہے جو نبی کے ہاتھ پر صادر ہوتا ہے اور نبوت اسے بطور چیلنج مکذبین کے روبرو پیش کرتی ہے۔ (شفا)

اسی کی شرح میں ہے :

متکلمین کہتے ہیں کہ اعجاز کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے اور انسان کی قدرت سے بالا ہے۔ (فتح الصفا-)

یہ یہاں بھی اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہے کہ معجزہ محض اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے۔ امام محمد بن محمد الغزالی فرماتے ہیں :

معجزہ انبیائے کرام کی صداقت پر بایں طور دلالت کرتا ہے جب کہ اس کے ظاہر کرنے سے تمام انسان عاجز ہیں تو وہ صرف اللہ تعالیٰ کا فعل ہوگا - اور بس - اور جب یہ نبی کی تحدی سے مقرون ہوگا تو اس کا مطلب یہ ہوگا گویا کہ اللہ تعالیٰ نے تصدیق کر دی کہ تو دعوائے رسالت میں سچا ہے - (احیاء العلوم)

مشہور صوفی شیخ اکبرؒ کے ترجمان شیخ عبدالوہاب الشعرانی، شیخ ابوطاہر القزوینی کی کتاب سراج العقول کے حوالہ سے لکھتے ہیں :

جاننا چاہیے کہ انبیاء کرام کی نبوت کے ثبوت پر واضح ترین دلیل صرف معجزات ہیں - اور معجزہ وہ فعل ہے جس کو خرقِ عادت کے طور پر اللہ تعالیٰ مدعیٔ نبوت کے ہاتھ پر اس کے دعوائے نبوت کا اعتراف کرتے ہوئے صادر فرماتے اور یہ فعل اللہ تعالیٰ کے اس قول کے قائمقام ہے کہ تو اپنے دعویٰ رسالت میں بالکل صادق ہے -

نیز شیخ ابوطاہر ہی کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ

بہ تحقیق یہ بات مخفی نہیں ہے کہ عاجز کرنے والا درحقیقت صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے کیونکہ وہ عجز و قدرت کا خالق ہے باقی رہا خرقِ عادت فعل کو معجزہ کہنا تو یہ بطورِ مجاز کے ہے فی الواقع یہ فعل معجز نہیں ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص آسمان سے بجلی گرتے ہوئے دیکھے اور یہ کہے کہ خدا کی قدرت کو دیکھو حالانکہ وہ بجلی خدا کی قدرت نہیں بلکہ اس کی قدرت کا ایک اثر ہے اور یہ اس لیے کہ درحقیقت عجز اس چیز سے ہوتا ہے جو قدرت کے تحت ہو اور مثلاً مردے کا زندہ کرنا تو بشر کی قدرت میں داخل نہیں ہے حتیٰ کہ یہ کہا جائے کہ فلاں احیائے موتیٰ سے عاجز ہوگیا ہے -

اس سے بھی صراحت کے ساتھ یہ معلوم ہوگیا کہ امر خارق للعادۃ کو معجزہ کہنا محض بطورِ مجاز ہے درحقیقت معجزہ عاجز کرنے والا وہ فعل نہیں جو نبی کے ہاتھ پر صادر ہوتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی پاک ہستی اور ذات اس فعل کے ذریعے مکذبین کو عاجز کرنے والی ہے جو حقیقی طور پر خالق عجز و قدرت ہے اور یہ فعل مخلوق کی طاقت سے بالکل خارج ہے اور ان کا اس پر کوئی دسترس نہیں ہے -

الشیخ ابن الہمام لکھتے ہیں

معجزہ جب ایسی چیز ہے کہ اس کے صادر کرنے سے مخلوق عاجز ہے تو معجزہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کا فعل ہوگا - (المسائرہ)

یہ تصریحات واشگاف بتا رہی ہیں کہ معجزہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہے اور بس۔

معجزہ اور سحر میں فرق

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ معجزہ سے جس طرح عجیب و غریب امور صادر ہوتے ہیں سحر، طلسم، نیرنگ شعبدہ سے بھی اس قسم کی باتیں دکھائی جا سکتی ہیں۔ سحر و طلسم کے الفاظ اگر اس بیسویں صدی میں مکروہ معلوم ہوں تو ان کے معنے مسمریزم اور ہپناٹزم کے سمجھ لیے جائیں۔ ایسی صورت میں ایک پیغمبر اور ساحر شعبدہ باز اور مسمرائزر میں کیا فرق ہوگا۔ اس سوال پر علم کلام میں طویل بحثیں ہیں۔ معتزلہ اور ارباب ظواہر میں حافظ ابن حزم ظاہری کا یہ دعویٰ ہے کہ معجزہ کے علاوہ سحر و طلسم اور شعبدہ وغیرہ جو چیزیں ہیں وہ صرف فریب نظر ہیں لیکن معجزہ سے قلب حقیقت اور تبدیل ماہیت ہو جاتی ہے۔ اشاعرہ سحر و طلسم کی حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں لیکن یہ کہتے ہیں کہ معجزہ سے جو عظیم الشان عجائبات سرزد ہوتے ہیں سحر و طلسم کے زور سے نہیں ہو سکتے۔ حکمائے اسلام کا مسلک یہ ہے کہ معجزہ اور سحر میں فرق یہ ہے کہ صاحب معجزہ اپنی قوت کو خیر میں صرف کرتا ہے اور ساحر شر میں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جوابات سے اشکال کی گرہ نہیں کھلتی۔ ایک شخص اپنے دعویٰ کے ثبوت میں بظاہر ایک خارق عادت کرشمہ پیش کرتا ہے اب اس پر یہ بحث کہ یہ دھوکا یا نظر بندی ہے یا امر الٰہی ہے یا معمولی کام ہے یا عظیم الشان کارنامہ ہے نہایت مشکل ہے کیوں کہ ان اشیائے کے وقوع میں کوئی ظاہری امتیاز نہیں ہو سکتا۔ نیز اس کا فیصلہ کہ یہ قوت خیر میں صرف ہوتی یا شر میں یا یہ ضروری ہے کہ یہ خوارق عادات محل خیر میں صرف ہوں یا محل شر میں، اس کے علاوہ کوئی تیسری شکل نہیں ہو سکتی۔ بہت کچھ قابل بحث ہے۔ ایک مسمریزر اپنی قوت سے بعض بیماریوں کو دور کر دیتا ہے اور اس سے غریبوں کا علاج یہ تو خیر اور نیکی کی چیز ہے تو کیا آپ اسے معجزہ کہہ دیں گے؟۔

اصل یہ ہے کہ معجزہ اور دیگر عجائبات میں دو عظیم الشان فرق ہیں ایک یہ کہ معجزہ براہ راست خدا کا فعل ہوتا ہے اور دوسرے عجائبات اسباب طبعی و نفسی کے نتائج ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ معجزہ سے مقصود اعدائے دعوت حق کی ہلاکت یا صاحب رسالت کی تائید اور مومنین، صادقین کی حمایت و برکت ہوتی ہے۔ محض کھیل تماشہ، شعبدہ بازی اور بازی گری اس کا مقصد نہیں ہوتی۔ اور سب سے آخری شئے جو ان دونوں کے درمیان حد فاصل بن جاتی ہے یہ ہے کہ ساحر اور بازی گر اور شعبدہ باز صرف تماشا کرتب اور عجائبات دکھاتے ہیں۔ اس کے ساتھ وہ اپنی زندگی کی پاکیزگی،

ارادوں کی یکسانی، دلوں کی طہارت اور صفائی، شریعتِ الٰہی کی تبلیغ، قلوب کے تزکیہ اور سیہ کاریوں کے قلع وقمع کے نہ وہ مدعی ہوتے ہیں اور نہ یہ کارنامے ان سے ظاہر ہوتے ہیں۔ لیکن نبوت کی معصوم زندگی پاک اخلاق، مقدس اعمال اور دیگر پیغمبرانہ خصائص وکیفیات خود ان کی نبوت کی منادی کرتے رہتے ہیں۔ قدم قدم پر اللہ سبحانہ ان کی دعوت کی تائید کرتا ہے۔ ان کی صدائے حق جماعتوں، قوموں اور ملکوں میں روحانی انقلاب پیدا کرتی ہے۔ ان کی سچائی، راستی اور صداقت پر ان کے سوانح حیات کا حرف حرف گواہ ہوتا ہے۔ وہ سونے چاندی پر نہیں بلکہ دلوں پر اخلاص و ایثار اور صدق و صفا کی مہر لگاتے ہیں۔ ایک ساحر اور مسمریزر خواص اشیاء میں انقلاب پیدا کر سکتا ہے مگر کافر کو مومن بدکار کو عفیف بے باک کو متقی بخیل کو فیاض، سخت کو نرم اور جاہل کو عالم نہیں بنا سکتا۔ وہ لوہے کو زرِ خالص کی صورت میں تبدیل کر سکتا ہے لیکن کسی زنگ آلود دل کو جلا نہیں دے سکتا۔

باقی رہا ظاہری اشتباہ اور التباس تو یہ صرف معجزہ اور سحر ہی میں نہیں ہے بلکہ دنیا کی ہر حقیقت اسی طرح اپنے مقابل سے مشتبہ اور ملی جلی ہوتی ہے۔ صبر اور بے یقینی، توکل اور کاہلی، بخل اور کفایت شعاری، سخاوت اور اسراف، حق گوئی اور گستاخی، شجاعت اور تہور ان کے ڈانڈے باہم اس قدر ملے ہوتے ہیں کہ انسان کی قوتِ عقل کبھی کبھی دھوکا کھا جاتی ہے لیکن اہلِ عقل ان دونوں حقیقتوں کے ظاہری تشابہ سے فریب نہیں کھاتے۔ ان دونوں کی ظاہری شکل وصورت اگرچہ ایک ہو مگر ان دونوں کے خصائص و آثار اس درجہ متفاوت اور متمائز ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے حدود اور فرق و امتیاز کو فوراً پہچان لیتے ہیں۔ جب پیغمبر اپنا معجزہ اور جادوگر اپنا کرتب دکھاتے ہیں تو ظاہری حیرت زائی کے لحاظ سے عوام کے نزدیک ایک لمحہ کے لیے گو دونوں ایک ہوں مگر جب حقیقت کا پردہ چاک ہو جاتا ہے تو ایک اخلاق کا مجسمہ پاکیزگی کا فرشتہ شریعت کا حامل، گنہ گاریوں کا طبیب اور قلوب کا معالج ہوتا ہے اور دوسرا محض تماشا گر یا شعبدہ باز اور بناوٹی حیلہ گر اور نقال ہوتا ہے۔ ایک عطائی اور ایک طبیب حاذق، ایک معمولی سپاہی اور ایک بہادر جنرل، ایک حرف شناس اور ماہر علوم، ایک مکار اور زاہد، ایک مصنوعی اور حقیقی صوفی کے درمیان شاید کبھی عوام فرق نہ کر سکیں، مگر جب ان دونوں کے آثار و خصائص اور علامات و قرائن باہم ملائے جائیں تو ظلمت و نور کی طرح ان دونوں میں علانیہ فرق محسوس ہو جاتا ہے۔

اس پر مزید بحث انشاء اللہ سولہویں جلد میں آرہی ہے۔ وہاں ہم اس موضوع پر حافظ ابنِ تیمیہ، حافظ ابن القیم، مولانا محمد قاسم نانوتوی اور علامہ سید سلیمان ندوی کے شہ پارے ہدیۂ ناظرین

کریں گے۔

معجزہ دلیلِ نبوت ہے یا نہیں

اس تقریر سے یہ بات اگرچہ کھل کر سامنے آگئی ہے کہ صرف معجزہ ہی نبی شناسی کا پیمانہ نہیں بلکہ یہاں اور بھی پیمانے ہیں۔ اس موضوع پر تو ہم ان شاء اللہ اسی جلد میں حافظ ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ کے حوالہ سے علیحدہ بحث کریں گے۔ یہاں ہم صرف اس مسئلہ کی طرف ناظرین کی توجہ مبذول کرنا چاہتے ہیں جس کی طرف ایک سرسری اشارہ پہلے ہی ہو چکا ہے۔ یعنی یہ کہ معجزہ دلیلِ نبوت ہے یا نہیں۔ اشاعرہ کا جواب اثبات میں اور معتزلہ کا جواب نفی میں ہے۔ مذہب اعتزال کی ترجمانی ابن رشد اندلسی کشف الادلہ میں بھرپور انداز میں کی ہے۔ اور ثابت کیا ہے کہ معجزہ دلیلِ نبوت نہیں ہو سکتا کیونکہ منطقی حیثیت سے دعویٰ اور دلیل میں مطابقت کا ہونا ضروری ہے اور معجزہ و نبوت میں کسی قسم کی مناسبت نہیں پائی جاتی ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰ نے دعویٰ کیا ہے کہ میں خدا کا رسول ہوں اور دلیل کے مطالبہ پر انہوں نے لاٹھی کو سانپ بنا دیا تو یہ بات کہ لاٹھی سانپ بن گئی اگرچہ اپنی جگہ عجیب سے عجیب تر ہے لیکن اس دلیل کو دعوے سے کیا مناسبت ہے؟

فرض کیجئے کہ ایک شخص دعویٰ کرتا ہے کہ وہ فلسفہ و ریاضی کا بہت بڑا ماہر ہے اور اس کے ثبوت میں انسان کو جانور اور جانور کو انسان بنا دیتا ہے تو واقعہ سے اس کے فلسفہ و ریاضی کا کمال کیوں کر ظاہر ہو سکتا ہے۔ اشاعرہ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ نبوت علم و عمل کے مجموعہ کا نام ہے اور جو شخص دعویٰ نبوت کرتا ہے اس کی نسبت یہ تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ وہ ان دونوں چیزوں میں کمال رکھتا ہے اور اس کمال کے اظہار کے لیے معجزہ طلب کیا جاتا ہے اور انبیاؑ کے معجزات اگرچہ مختلف قسم کے ہوتے ہیں تاہم ان کو صرف دو نوع میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اخبار بالغیب اور تصرف فی الکائنات اور ان دونوں کو اجزائے نبوت کے ساتھ ربط و اتحاد ہے۔ اخبار بالغیب سے اس کے علمی کمال کا اظہار ہوتا ہے اور تصرف فی الکائنات سے اس کی عملی قوت ظاہر ہوتی ہے۔ ایک اور مناسبت یہ ہے کہ معجزہ خرق عادت کا نام ہے اس میں کوئی نزاع نہیں کہ اشیا اور حقائق کے خصائص اور علل خدا کے امر و حکم سے ہیں اب جو شخص ان خصائص و علل کو اپنے معجزے سے توڑتا ہے وہ گویا اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ جس برتر ذات نے ان اسباب و علل کو بنایا ہے وہی اس کو توڑ سکتی ہے اور یہ شکست و ریخت چونکہ اس کے واسطہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اس کا رسول ہے۔ رسول کی مثال یہ

ہے کہ ایک بادشاہ اپنی رعایا کے پاس قاصد بھیجتا ہے۔ رعایا پوچھتی ہے کہ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تم بادشاہ کے قاصد ہو۔ وہ اس کے جواب میں بادشاہ کی مہر اور انگوٹھی پیش کرتا ہے۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ قاصد کے دعویٰ پیامبری کو مہر اور انگوٹھی سے براہ راست کوئی مناسبت نہیں ہے لیکن یہ مناسبت یوں ظاہر ہوتی ہے کہ یہ مہر اور انگوٹھی بادشاہی کی نشانی ہے جو ایک معمولی قاصد کے ہاتھ میں نہیں ہو سکتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ بادشاہ کی طرف سے نشانی دے کر بھیجا گیا ہے۔

علم کلام کی کتابوں میں ایک مثال یہ دی جاتی ہے کہ ہر شخص کو معلوم ہے کہ شاہی دربار اور جلوس کے رسوم و آداب خاص ہوتے ہیں۔ بادشاہ دربار میں معمولی فرش پر نہیں بلکہ طلائی و نقرئی تخت پر بیٹھتا ہے۔ جلوس میں وہ پیادہ نہیں بلکہ سوار ہو کر نکلتا ہے۔ ایک شخص بادشاہ کی طرف سے قاصد بن کر مجمع عام میں آتا ہے۔ یہ مجمع اس کو شاہی پیامبر تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے۔ قاصد بادشاہ سے کہتا ہے کہ اے بادشاہ اگر میں حقیقۃً تیرا فرستادہ ہوں تو رسم و عادت کے خلاف فرش پر جلوس فرما اور پیادہ پا نکل۔ بادشاہ اس کے مطابق دربار میں فرش پر جلوس کرتا ہے اور پیادہ پا چلتا ہے۔ بادشاہ کا یہ عمل یقیناً اس بات کی تصدیق ہو گی کہ وہ شاہی قاصد ہے۔ اسی طرح دنیا کے اسباب و علل اس دنیا میں خدا کی بادشاہی کے رسوم و عادات ہیں۔ پیغمبر اس بات کا مدعی ہوتا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے آیا ہے۔ کفار اس کے قاصد الٰہی ہونے سے انکار کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اے خدا اگر میں حقیقۃً تیرا فرستادہ ہوں تو اپنے رسوم و عادات کے خلاف معجزہ اور خرق عادت دکھا وہ دکھا دیتا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خدا کی طرف سے آیا ہے۔

لیکن معجزہ اگر دلیل نبوت ہے تو منطقی حیثیت سے یہ کس قسم کا استدلال ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کو برہان یقینی نہیں کہا جا سکتا تاہم دلیل کا انحصار صرف برہانیات میں نہیں ہے بلکہ اس کی بھی اور متعدد قسمیں ہیں اور معجزہ ان مقدمات میں داخل ہو سکتا ہے۔

ابن رشد نے کشف الادلہ میں معجزہ کو خطابیات میں داخل کیا ہے۔ یعنی معجزہ اگرچہ نبوت پر بالذات یقینی طور پر دلالت نہیں کرتا۔ تاہم جب کوئی پیغمبر سلسلۂ کائنات میں عجیب و غریب تصرف کرتا ہے تو اس کو دیکھ کر ہر شخص اس کے کمال روحانی کا اعتراف کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ جو شخص ان عظیم الشان تصرفات کی قدرت رکھتا ہے وہ ضرور اپنے دعوے میں صادق ہو گا۔ ان دونوں نتائج یعنی تصرف فی الکائنات اور اصلاح روحانی میں اگرچہ باہم کوئی تلازم نہیں ہے تاہم عوام کی دلفریبی کے لیے یہ کافی ہے اور اس سے زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہ جدل ہے جس میں مسلمات خصم سے استدلال کیا

جاتا ہے۔ اور تاریخی حیثیت سے معجزات کو قیاس جدل کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ زمانہ قدیم سے یہ خیال چلا آتا ہے کہ جو لوگ پیغمبر ہوتے ہیں ان میں کوئی نہ کوئی مافوق الفطرت قوت ضرور ہوتی ہے اور وہی پیغمبر کو عام لوگوں سے ممتاز کرتی ہے۔ اس بنا پر تمام لوگ اس سے معجزہ طلب کرتے ہیں۔ اور پیغمبر کو مجبوراً دکھانا پڑتا ہے۔ یہ معجزہ اگرچہ ایک فلسفی کے لیے دلیل و حجت نہیں ہو سکتا تاہم جو لوگ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ معجزہ دلیل نبوت ہے اور انہی کے طلب و اصرار سے اس معجزہ کا ظہور ہوا ہے ان کو اس کے ذریعہ سے ساکت کیا جا سکتا ہے اور وہ ان کے لیے دلیل ہو سکتا ہے۔

اگر ذرا غور و فکر سے کام لیا جائے تو آپ محسوس کریں گے کہ اشاعرہ اور معتزلہ کے مابین اس موضوع پر غلط مبحث ہو گیا ہے۔ اشاعرہ کا یہ کہنا کہ معجزہ دلیل نبوت ہے اس کے معنے یہ نہیں ہیں کہ وہ منطقی دلیل ہے اور معتزلہ کا اعتراض اسی وقت درست ہو سکتا ہے جب اشاعرہ اس کو منطقی دلیل کہیں۔ دلیل کا لفظ یہاں منطقی محاورے میں نہیں بلکہ عام اور لغوی معنے میں استعمال ہوا ہے۔ اس بنا پر جب معجزہ سرے سے دلیل منطقی ہی نہیں تو یہ تلاش کہ وہ انواع دلیل کی کس قسم میں داخل ہے بے سود ہے۔ چنانچہ اشاعرہ خود کہتے ہیں کہ معجزہ کی دلالت نبوت پر عقلی نہیں بلکہ عادی ہے۔ شرح مواقف بحث معجزات میں ہے:۔

> معجزہ نبوت کی دلیل عقلی نہیں جیسے فعل فاعل کے وجود کی دلیل ہوتی ہے یا جیسے فعل کے استحکام و نظم کی دلالت فاعل کے علم پر عقلی ہے۔ کیونکہ دلائل عقلی اپنے مدلولات کے ساتھ مربوط ہوتے ہیں اور یہ فرض ناممکن ہے کہ وہ اپنے مدلول پر دلیل نہ ہو اور معجزہ کی دلالت کی صورت ایسی نہیں ہے بلکہ معجزہ کی دلالت دلالت عادیہ ہے جیسا کہ مولف نے یہ کہہ کر کہ یہ دلالت ہمارے نزدیک اس بنا پر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عادت یہ ہے۔ اشارہ کیا ہے۔

آج کل کے محاورۂ علمی میں اشاعرہ کے اس قول کی تشریح کہ معجزہ دلیل عقلی نہیں بلکہ عادی ہے یہ ہے کہ معجزہ دلیل منطقی نہیں بلکہ نفسیاتی ہے۔ عادت انسانی یہ ہے کہ جب کسی شخص سے کوئی غیر معمولی کارنامہ ظہور پذیر ہوتا ہے تو نفوس اس کی عظمت و کبریائی کے سامنے سرنگوں ہو جاتے ہیں۔ جب ایک شخص عام انسانی حالت سے بلند تر سطح میں آکر من جانب اللہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور خوارق عادات اس سے ظاہر ہوتے ہیں تو عام متاثر طبع فوراً اس کے دعوے کو تسلیم کر لیتے ہیں۔

کیا صرف معجزہ ہی نبی شناسی کا پیمانہ ہے

یہاں سے یہ بات بھی خود بخود سمجھ میں آرہی ہے کہ نبی شناسی کا صرف معجزہ ہی پیمانہ نہیں ہے جیسا کہ متکلمین بتاتے ہیں بلکہ نبی شناسی کے کچھ اور بھی پیمانے ہیں۔ جو کہتے ہیں کہ نبوت کا علم صرف معجزات ہی کے ذریعے ہوتا ہے۔

کیا معجزہ مافوق الاسباب کام ہے؟

اب تک گفتگو اس میں تھی کہ معجزہ اللہ کا فعل ہے اور معجزہ دلیل نبوت ہے کہ نہیں لیکن بات تشنۂ تکمیل رہ جائے گی اگر ہم یہ نہ بتائیں کہ کیا معجزات مافوق امور ہوتے ہیں یا ان کے لیے بھی غیر مادی، غیر ظاہری اور مخفی اسباب ہوتے ہیں۔

اشاعرہ یہ کہتے ہیں کہ خود اشیأ کی طبیعت کے اندر کوئی ایسی چیز نہیں جس کی بنا پر ایک علت و سبب اور دوسرا معلول و مسبب ہو۔ نفس آگ میں کوئی ایسی چیز نہیں جس کو ہم گرمی کا سبب قرار دے سکیں اور نہ نفس برف کے اندر ٹھنڈک طبیعت کے طور پر موجود ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اشاعرہ کے خیال میں کوئی شے کسی چیز کی علت نہیں اور نہ اشیأ میں کوئی خاصیت اور تاثیر ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ نے کتاب الرد علی المنطقیین میں جہاں اشاعرہ کے وہ مسائل گنانے ہیں جن میں وہ متفرد ہیں۔ ان میں اس مسئلہ کو بھی شمار کیا ہے بلکہ لکھا ہے کہ اس مسئلہ کا اصل بانی جہم ہے جس کے انتساب سے فرقہ جہمیہ قائم ہوا تھا اس کے بعد ابوالحسن اشعری نے اس کی پیروی کی۔ علامہ ابن تیمیہ نے اس مسئلہ کی تشریح اپنے الفاظ میں اس طرح کی ہے۔

> لیکن متکلمین میں جو لوگ اسباب و علل کے منکر ہیں جیسے جہم اور اس مسئلہ میں جہم کے جو موافق ہیں جیسے ابوالحسن اشعری اور ان کے پیرو۔ وہ یہ مانتے ہیں کہ ہم کو صرف یہ معلوم ہے کہ ایک چیز کا دوسری چیز کے ساتھ ایک لگاؤ اور علاقہ ہے اور یہ لگاؤ اور علاقہ صرف اسی قادر ذی ارادہ کی مشیت سے ہے۔ جہمیہ اور اشاعرہ کے سوا تمام عقلاً مسلم اور غیر مسلم اور مسلمانوں میں اہل السنہ خواہ متکلمین ہوں یا فقہاء

محدثین ہوں یا صوفیا۔ اور غیر اہل السنہ یعنی معتزلہ وغیرہ یہ سب کہتے ہیں کہ یہاں سلسلہ اسباب ہے اور بتاتے ہیں کہ جس طرح ہم کو یہ معلوم ہے کہ ایک کا دوسرے سے لگاؤ ہے، اسی طرح یہ بھی معلوم ہے کہ آگ میں ایک قوت ہے جو گرمی کو چاہتی ہے اور پانی میں ایک قوت ہے جو ٹھنڈک کو مقتضی ہے اور اسی طرح آنکھ میں ایک قوت ہے جو مزہ پیدا کرتی ہے۔ یہ لوگ طبیعت کو ثابت کرتے ہیں جس کا دوسرا نام فطرت، خلقت عادت وغیرہ ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اشاعرہ کے علاوہ باقی تمام اسلامی فرقے اس کے قائل ہیں کہ عالم میں جو کچھ ہوتا ہے وہ علت و معلول، سبب ومسبب، شرط ومشروط، مُؤثر و موثر کے بغیر نہیں ہوتا۔ یہ بات ملحوظِ خاطر رہے کہ یہ اسلامی فرقے فلاسفہ وحکماء کی طرح اللہ تعالیٰ کو علت موجبہ اور عالم کو معلول نہیں کہتے بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کو فاعل بالاختیار کہتے ہیں۔ ہاں اسباب ومسببات میں آپس میں ایک دوسرے کو علت و معلول اور سبب ومسبب وغیرہ مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسی سلسلہ اور نظام کا نام فطرۃ سنت اللہ اور خلق اللہ ہے۔ اور وہ یہ کہتے ہیں کہ جب بھی کوئی واقعہ اللہ سبحانہ کی عادت جاریہ کے خلاف وقوع میں آتا ہے جس کو لوگ خرقِ عادت کہتے ہیں تو واقعہ اسباب ہی کی وجہ سے وقوع میں آتا ہے گویا وہ اسباب مخفی اور غیر معمولی ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضرت امام غزالی فرماتے ہیں "کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے عجیب وغریب واقعات صادر ہوتے ہیں جن کا ہم مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ ان کے امکان کا کسی طرح انکار مناسب نہیں ہے اور نہ ان کے محال ہونے کا فیصلہ درست ہے۔ اسی طرح حضرت موسیٰ کی لاٹھی کا سانپ بنا دینا اسی طریقہ پر ممکن ہے کہ چونکہ مادہ ہر چیز کو قبول کر لیتا ہے۔ مثلاً مٹی اور جملہ دیگر عناصر نباتات کی صورت میں نمودار ہو جاتے ہیں اور ان ہی سبزیوں اور ترکاریوں کو جب جاندار کھاتے ہیں تو ان میں خون پیدا ہوتا ہے اور یہ نباتات خون کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ پھر بھی خون مٹی کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور یہ مٹی جب رحم میں پہنچتی ہے تو اس سے جاندار کی شکل تیار ہوتی ہے اور یہ تبدیلیاں عادۃً کافی زمانہ میں پایہ تکمیل کو پہنچتی ہیں یہ لکھ کر امام غزالی نے خوارق کا انکار کرنے والوں سے دریافت کیا ہے۔

آخر اس کو محال کیوں کہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں یہ بات داخل ہو کہ وہ مادے کو ان مختلف حالات میں بہت ہی مختصر سے وقت میں اس قابل بنا دے کہ وہ اپنے مقررہ وقت سے کم ہیں۔ یہ تبدیلیاں قبول کرے اور جب اس سے کم

وقت میں ایسا ہونا ممکن ہے تو اقل کے لیے کوئی حد ہی نہیں ہے۔ لہٰذا جب یہ قوتیں بڑی عجلت سے اپنی کارروائی پایۂ تکمیل کو پہنچا دیں گی تو اس سے معجزہ حاصل ہو جاتے گا۔

(تہافۃ الفلاسفہ)

امام رازی نے المطالب العالیہ میں اسی کو دوسرے انداز میں پیش کیا ہے کہ فلاسفہ اگرچہ معجزات کو نہیں مانتے ہیں مگر وہ متعدد ایسے اصول مانتے ہیں جن کی بنا پر خرق عادت کا تسلیم کرنا ان کے لیے لازمی ہو جاتا ہے مثلاً وہ تولد ذاتی کے قائل ہیں یعنی یہ کہ جن جانداروں کی پیدائش ایک نظام خاص کے ساتھ ہوتی ہے۔ ایک قطرۂ آب سے خون، خون سے گوشت، پھر بتدریج مدت حمل کے اندر وہ شکم مادر میں پرورش پاتے رہتے ہیں۔ ایک متعین زمانہ کے بعد وضع حمل ہوتا ہے۔ پھر شیر خوارگی اور بچپن کے دور سے آہستہ آہستہ بڑھتے ہوتے ایک تنومند قوی ہیکل ذی روح صورت میں ظاہر ہوتے ہیں وہ دفعتاً ان بیچ کے منازل کو طے کیے بغیر اس ہیکل اور صورت میں نمودار ہو جائیں۔ یہ فلاسفہ کہتے ہیں کہ قطرۂ آب کے زمانہ سے لے کر عہد شباب تک اس مجموعہ عناصر کو جو سالہا سال صرف کرنے پڑے اس کی وجہ یہ تھی کہ ان عناصر میں حیات کی قابلیت پیدا ہونے کے لیے ایک خاص قسم کی اعتدال ترکیب کی ضرورت تھی۔ جب ترکیب میں یہ اعتدال پیدا ہوا حیات نمودار ہو گئی۔ اس بنا پر اگر کسی مجموعہ عناصر میں اس قسم کا اعتدال پیدا ہو جاتے جس میں حیات انسانی کے قبول کی صلاحیت ہو تو بغیر نطفہ، حمل، خون، گوشت، وضع حمل، شیر خوارگی، بچپن وغیرہ درمیانی وسائط طبعی کے اچھا خاصہ ایک نوجوان مٹی کے پتلے سے بن کر کھڑا ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ برسات میں اکثر کیڑے مکوڑے سڑی گلی مٹی میں ایک خاص اعتدالی کیفیت پیدا ہو جانے سے جاندار اور ذی روح بن جاتے ہیں اسی کا نام تولد ذاتی ہے۔

اس تفصیل کی بنا پر ان کے نزدیک یہ ثابت ہو گیا کہ جاندار کی پیدائش کے لیے دنیا میں جو سلسلہ اسباب عادتاً جاری ہے۔ اس کے خلاف ہو سکتا ہے تو پھر عصائے موسیٰ بھی سانپ ہو سکتا ہے لاٹھی کے سانپ بن جانے کی صورت یہ ہے کہ پہلے وہ سڑ گل کر مٹی ہو جاتا ہے وہ مٹی غذا کی شکل میں ایک سانپ کے اندر جاتی ہے اور پھر وہ غذا دوسری شکل میں بن کر سانپ کا بچہ بن جاتی ہے۔ تولد ذاتی کے اصول پر یہ ممکن ہے کہ بیچ کے وسائط کے بغیر عصا میں سانپ بننے کی صلاحیت پیدا ہو جاتے۔

انداز اگرچہ امام غزالی اور امام رازی کے مختلف ہیں مگر مآل دونوں کا ایک ہے کہ معجزہ دراصل

مادہ اور علت و سبب سے وابستہ ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ عام طور پر جتنا وقت عادی امور کے لیے درکار ہوتا ہے وہ وقت خرق عادت اور معجزے کے لیے ضروری نہیں ہے اور وقت کی کمی کی کوئی حد بندی نہیں ہو سکتی۔ امام غزالی نے اپنی دوسری کتابوں، احیاء العلوم، معارج القدس، المضنون بہ علی غیر اہلہ، اور المنقذ من الضلال میں بھی اس موضوع پر اچھی تفصیلی بحث کی ہے۔ علامہ ابن رشد اندلسی نے تہافت الفلاسفہ اور کشف الادلہ میں اس پر تفصیلی تبصرہ کیا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

جس نے اسباب کو اڑا دیا تو اس نے عقل سے ہاتھ دھو لیے۔ فن منطق کی رو سے یہ بات ثابت شدہ ہے کہ یہاں سلسلہ اسباب و مسببات موجود ہے۔

ہم اس بحث کو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی ایک جامع و مانع عبارت پر ختم کرتے ہیں شاہ صاحب فرماتے ہیں:

معجزات اور کرامات امور اسبابی ہیں لیکن چونکہ ان پر کمال غالب ہو گیا ہے اس لیے یہ دیگر امور اسبابی سے ممتاز ہو گئے ہیں[1]

حضرت شاہ صاحب کی عبارت سے واضح ہو گیا کہ تمام اشاعرہ معجزات کو علی الاطلاق مافوق الاسباب امور قرار نہیں دیتے۔ کیونکہ حضرت شاہ صاحب بھی اشاعرہ کا مسلک رکھتے ہیں مگر اس کے باوجود وہ معجزات کو امورِ اسبابی قرار دیتے ہیں۔

یہاں یہ بات یاد رہے کہ اشاعرہ اور معتزلہ میں جو اختلاف ہے وہ نظریاتی فرق ہے۔ اس سے نفس خرق عادت اور معجزہ کے ثبوت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہ بات کہ اشیاء کے طبائع میں فی نفسہٖ خواص و آثار ودیعت ہیں یا اللہ تعالیٰ ان کو ہر وقت پیدا کر دیتا ہے ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے کسی پہلو کے اثبات اور دوسرے کی نفی پر کوئی دلیل قائم نہیں کی جا سکتی اور معجزہ کے سلسلہ میں ہم کو اس کے چھیڑنے کی ضرورت نہیں اس کا کوئی پہلو بھی صحیح ہو بہر حال دونوں تسلیم کرتے ہیں کہ کبھی کبھی اشیاء کی عادت جاریہ کو اللہ تعالیٰ توڑ دیتا ہے اور بدل دیتا ہے۔

دراصل معجزات کے باب میں اصل فیصلہ کن سوال صرف یہ ہے کہ آیا اللہ نظام کائنات کو ایک قانون پر چلا دینے کے بعد معطل ہو چکا ہے اور اب اس چلتے ہوئے نظام میں کبھی کبھی موقع پر مداخلت نہیں کر سکتا یا وہ بالفعل اپنی سلطنت کی زمامِ تدبیر و انتظام اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے اور ہر آن اس کے

---

[1] تفہیمات الٰہیہ۔

احکام اس سلطنت میں نافذ ہوتے ہیں اور اس کو ہر وقت اختیار ہے کہ اشیا کی تشکلوں اور واقعات کی عادی رفتار میں جزئی طور پر یا کلی طور پر جیسا چاہے اور جب چاہے تغیر کر دے۔ جو لوگ اس سوال کے جواب میں پہلی بات کے قائل ہیں ان کے لیے معجزات کو تسلیم کرنا غیر ممکن ہے۔ کیونکہ معجزہ نہ تو ان کے تصورِ خدا میل کھاتا ہے اور نہ تصورِ کائنات سے بخلاف اس شخص کے جو قرآن کے دلائل سے مطمئن ہو کر دوسرے تصور کو قبول کرے اس کے لیے معجزے کو سمجھنا اور تسلیم کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر آپ کا عقیدہ یہ ہو کہ بے جان مادے میں خدا کے حکم سے زندگی پیدا ہوتی ہے اور خدا جس مادے کو جیسے چاہے زندگی عطا کر سکتا ہے اس کے لیے خدا کے حکم سے لاٹھی کا اژدہا بننا اتنا ہی غیر عجیب واقعہ ہے جتنا اسی خدا کے حکم سے ڈنڈے کے اندر چند بے جان مادوں کا اژدہا بننا غیر عجیب ہے۔ صرف یہ بات کہ ایک واقعہ ہمیشہ پیش آتا رہتا ہے اور دوسرا واقعہ صرف تین مرتبہ پیش آیا۔ ایک کو غیر عجیب اور دوسرے کو عجیب بنا دینے کے لیے کافی نہیں ہے۔

حضرت موسیٰ کے ان دونوں معجزوں پر انشاء اللہ معالم القرآن کی جلد ۱۶ میں تفصیلی تبصرہ کریں گے۔

فرعون کے لیے یہ بات نہایت عجیب تھی کہ اس کی مملکت کا ایک عام شہری اس کے پاس خدا کا رسول بن کر آئے وہ آپ کو رب اعلیٰ کہتا تھا۔ اس لیے اس نے حضرت موسیٰ سے سنتے ہی کہا کہ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو کہ تم خدا کے رسول ہو تو اپنے رسول ہونے کی کوئی نشانی پیش کرو۔ حضرت موسیٰ نے اس کے مطالبہ پر عصا اور ید بیضا کے معجزے دکھائے۔ معجزات کے موضوع پر اللہ کا دستور یہ رہا ہے کہ وہ قوموں کے مذاق اور میلانات کے مطابق دیے جاتے ہیں تاکہ ان پر حجت ہو سکیں مصر کی تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس دور میں سحر و شعبدہ کا بہت زور تھا اور شہری زندگی میں جادوگروں کو بہت اونچا مقام حاصل تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو ایسے معجزے دیے جن سے ساحروں کی جادوگری کو باطل کیا جا سکے۔

یہاں ثعبان کے ساتھ مبین کی صفت آئی ہے جس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ لاٹھی واقعی اور سچ مچ اژدہا بن گئی تھی۔ ایسا کھلا اژدہا کہ کسی کے لیے ذرا شبہ کی گنجائش نہ تھی اور یہ حقیقت تھی جادو کی طرح صرف تخییل یا نظر کا فریب نہ تھا۔ اسی طرح بیضاء للناظرین فرما کر اشارہ کیا ہے کہ ہاتھ میں جو چمک ظاہر ہوتی تھی وہ محض فریبِ نظر قسم کی چمک نہ تھی بلکہ دیکھنے والوں کو اس کی چمک اور تابانی بالکل اصلی اور حقیقی معلوم ہوتی تھی۔

فرعون کو ارباب حکومت کا مشورہ

۱۳۵۔ قوم فرعون کے سرداروں نے کہا کہ یہ تو فن کار جادوگر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کے معجزات سے ہیبت زدہ ہو کر پبلک کو جمع کیا اور پہلے اس نے بذات خود کمال الشرار پھر اس کی طرف سے بڑے بڑے لیڈروں نے اس رائے کا اظہار کیا کہ موسیٰ علیہ السلام معاذاللہ کوئی بڑے ماہر جادوگر معلوم ہوتے ہیں کیونکہ جو خوارق موسیٰ علیہ السلام سے ظاہر ہوتے ان کی حیثیت کے موافق جادو سے بہتر ان کی کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی تھی[۱] یہاں جو بات قوم فرعون کے سرداروں کی طرف منسوب کی ہے۔ سورہ شعراء میں اسی بات کو فرعون کی طرف منسوب کیا ہے۔ ارشاد ہے:

قال للملاء حوله ان هذا لساحر عليم

فرعون نے اپنے ارد گرد سرداروں سے کہا کہ یہ فن کار جادوگر ہے۔

دراصل یہ مشاورت کی کہانی ہے۔ اصل بات فرعون نے کہی اور ان سے مشورہ کیا اور مشورے میں ان کی رائے پوچھی تو انہوں نے فرعون کے خیال سے اتفاق کرتے ہوئے اسی رائے کا اظہار کیا کہ ان ھذا لساحر علیم یعنی یہ شخص سحر کے تمام علوم کا بہت بڑا علامہ معلوم ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ مصری تمدن کی جو تاریخ پیش کرتا ہے اس میں یہ بات بہت نمایاں نظر آتی ہے کہ مصری علوم وفنون میں سحر کو ایک مستقل علم و فن کی حیثیت حاصل تھی۔ اسی بنا پر ساحرین کا مصر میں بہت اونچا علمی مقام تھا حتیٰ کہ ان کو شاہی دربار میں بھی بہت رسوخ حاصل تھا اور جنگ وصلح، پیدائش و وفات کے نتائج اور اہم سرکاری معاملات میں ان کی جانب رجوع کیا جاتا تھا اور ان کے فنی نتائج کو بڑی وقعت دی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ مذہبی معاملات میں بھی ان کو اہم جگہ دی جاتی تھی۔ قدیم شاہی مقبروں میں ممی (حنوط شدہ نعشوں) کے ساتھ جو کاغذات و دستاویزیں برآمد ہوتی ہیں۔ اور ان حجروں میں جو تصاویر و نقوش پائے جاتے ہیں ان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

قدیم قوموں میں عام گمراہیوں میں سے ایک گمراہی یہ بھی رہی ہے کہ وہ جادو پر ایک مذہبی حیثیت سے اعتقاد رکھتے تھے اور زندگی کے مسائل کو اس سے وابستہ رکھتے تھے اور اسی نظریہ کے تحت اس کے تعلیم و تعلم کو اپناتے تھے اور اس پر ہی ان کے ترقیاتی پروگرام کا دارومدار تھا۔

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

چنانچہ عراق، بابل، مصر، چین اور ہندوستان کی تاریخ اس کی گواہ ہے۔

یہی وجہ ہے کہ فرعون اور اس کے اعیال و ارکانِ حکومت نے حضرت موسیٰ کو جادوگر کہا اور صرف جادوگر نہیں بلکہ کہا کہ اپنے فن میں بہت بڑا علامہ ہے اور یہ فرعون اور اس کے ارکانِ حکومت کا متفقہ فیصلہ تھا۔

حکومت کی نظر میں حضرت موسیٰ کا مقصد

۱۳۶- تمہیں تمہاری زمین سے بے دخل کرنا چاہتا ہے بتاؤ کہ تمہاری کیا رائے ہے۔ یعنی عجیب و غریب ساحرانہ کرشمے دکھلا کر لوگوں کو اپنی طرف مائل کرے اور انجام کار ملک میں اقتدار پیدا کرکے اور بنی اسرائیل کی حمایت و آزادی کا نام لے کر قبطیوں کو جو یہاں کے اصل باشندے ہیں۔ ان کے ملک و وطن سے بے دخل کر دے۔ ان حالات کو پیشِ نظر رکھ کر مشورہ دو کہ کیا کرنا چاہیے[1] ارکانِ حکومت نے حضرت کے بارے میں یہ بات کہی تھی کہ یہ علامہ قسم کا بہت بڑا جادوگر ہے۔ یہاں ذہن میں یہ سوال خود بخود پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ علامہ قسم کا جادوگر ہے تو اس کا مقصد کیا ہے؟ بتایا کہ یہ چاہتا ہے کہ تمہیں ہٹا کر زمینِ مصر کے اقتدار پر قبضہ کر لے۔ دونوں معجزوں کی عظمت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ابھی ابھی ایک لمحہ پہلے فرعون اپنی رعیت ایک فرد کو یا تو کہہ رہا تھا فات بایۃ[2] ان کنت من الصادقین اور یا اب نشانیوں کو دیکھ کر فرعون اور اس کے اعیانِ حکومت پر ایسی بدحواسی طاری ہوئی ہے کہ اسے اپنے ملک اور اقتدار چھننے کا خطرہ لاحق ہو گیا۔ بنی اسرائیل جیسی دبی ہوئی قوم کا ایک فرد وقت کے سب سے بڑے طاقتور بادشاہ کے سامنے کھڑا تھا۔ کوئی لاؤ لشکر اس کے ساتھ نہ تھا۔ قوم میں کوئی طاقت نہ تھی کسی بغاوت کا ملک میں نام و نشان تک نہ تھا۔ ملک سے باہر کسی دوسری حکومت کی طاقت بھی ان کی پشت پر نہ تھی۔ ان حالات میں صرف ایک لاٹھی کا اژدہا بنتے دیکھ کر اور ایک ہاتھ کو چمکتا دیکھ کر یکایک سارے اعیانِ حکومت کا فرعون سمیت یہ واویلا کہ یہ بے سروسامان آدمی میری سلطنت کا تختہ آلٹ دے گا اور پورے حکمران طبقہ کو اقتدار سے محروم کر دے گا۔ آخر کیا معنے رکھتا ہے۔ فرعون اور اس کے اربابِ اقتدار کا یہ کہنا کہ یہ شخص جادو کے زور سے ایسا کر ڈالے گا، مزید بدحواسی کی دلیل ہے۔ جادو کے زور سے دنیا میں کبھی کوئی سیاسی انقلاب

---

[1] افادات شیخ الاسلام

نہیں ہوا، کوئی ملک فتح نہیں ہوا، کوئی جنگ نہیں جیتی گئی۔ جادوگر تو اس کے اپنے ملک میں موجود تھے اور بڑے بڑے کرشمے دکھا سکتے تھے مگر وہ خود جانتا تھا کہ تماشا کرکے انعام پانے سے بڑھ کر ان کی اوقات کوئی نہیں ہے۔ حکومت تو کجا، وہ بے چارے تو حکومت کے کسی سپاہی کو بھی چیلنج کرنے کی ہمت نہ کر سکتے تھے۔ اس لیے یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ فرعون اور اس کے اعیان حکومت کو یہ خطرہ کیوں پیدا ہوا کہ ان یخرجکم من ارضکم تمہیں ملک بدر کرکے اقتدار پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ حضرت موسیٰ نے صرف یہی دعویٰ کیا تھا کہ یا فرعون انی رسول من رب العالمین۔ اور بنی اسرائیل کا مطالبہ پیش کیا تھا۔ اس کے علاوہ کسی قسم کی سیاسی گفتگو یہاں بتائی نہیں گئی اور ہوئی بھی نہ ہوگی۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ موسیٰ علیہ السلام نے صراحتہً ایسی کوئی بات نہیں فرمائی لیکن آپ کا دعویٰ رسالت اپنے اندر ہی یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ دراصل پورے نظام زندگی کو بحیثیت مجموعی تبدیل کرنا چاہتے ہیں جس میں لامحالہ ملک کا سیاسی نظام بھی داخل ہے۔ پیغمبر کا اپنے آپ کو رب العالمین کے نمائندے کی حیثیت سے پیش کرنا لازمی طور پر اس کو متضمن ہے کہ وہ انسانوں سے اپنی کلی اطاعت کا مطالبہ کرتا ہے کیونکہ رب العالمین کا نمائندہ کبھی کسی دوسرے نظام حیات کا مطیع اور کسی اور کی رعیت بن کر رہنے کے لیے نہیں آتا بلکہ دنیا میں مطاع اور راعی بننے کے لیے آتا ہے اور کسی کافر کے حق حکمرانی کو تسلیم کرنا اس کی حیثیت رسالت کے قطعاً منافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ کی زبان سے انی رسول من رب العالمین کا دعویٰ سنتے ہی فرعون اور اس کے اعیان حکومت کے سامنے سیاسی، معاشی اور تمدنی انقلاب کا خطرہ نمودار ہو گیا۔ جو کچھ بحیثیت رسول حضرت موسیٰ کا پیش نہاد تھا وہی کچھ فرعون اور اس کے اعیان حکومت نے سمجھا سورہ یونس میں اسی چیز کی وضاحت دوسرے عنوان سے آئی ہے۔

اجئتنا لتلفتنا عما وجدنا علیہ آباءنا وتکون لکما الکبریاء فی الارض وما نحن لکما بمومنین۔

کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ جس راہ پر ہم نے اپنے باپ دادا کو چلتے دیکھا ہے اس سے ہمیں ہٹا دے اور ملک میں تم دونوں کے لیے سرداری ہو جائے۔ ہم تو تمہیں ماننے والے نہیں ہیں۔

یہاں فرعون اور اعیان حکومت کے اس قول یخرجکم من ارضکم کی یہ تاویل کرنا کہ: یہ ضروری نہیں ہے کہ فی الواقع ان کے دل میں بھی وہی بات ہو جو زبان پر آئی۔

وہ حضرت موسیٰ وہارون سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان کے ماضی وحاضر اور ان کے اخلاق اور کردار کو سامنے رکھ کر وہ آسانی سے فیصلہ کر سکتے تھے کہ حضرت موسیٰ نہ تو جادوگر ہو سکتے ہیں اور نہ اصلاح کے سوا ان کے سامنے کوئی اور مقصد ہو سکتا ہے لیکن ارباب اقتدار کا ہمیشہ یہ شیوہ رہا ہے کہ جب ان کے مقابل میں کوئی اصلاحی دعوت آئی ہے تو انہوں نے اپنی عوام کو اس سے برگشتہ کرنے کے لیے اس کے اندر کوئی نہ کوئی خطرناک سیاسی معنے ومفہوم پیدا کرنے کی مذموم کوشش کی ہے۔ یہی حرکت فرعون کے درباریوں نے کی۔

بالکل بے معنے ہے۔ گویا ان کے خیال مبارک میں نبوت کی اصلاحی دعوت کا دائرہ صرف رسوم اور رواجوں کی اصلاح تک محدود رہتا ہے اور وقت کی سیاسی، معاشی الجھنوں سے اسے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

ایک قرآن کے شارح فرماتے ہیں کہ

دُنیا پرستوں کی یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی اہلِ حق اغراضِ دنیوی سے پاک ہو کر خالصۃً اللہ بھی کام کر سکتا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کے طریقِ حق کو فرعون نے ایک باطل کی صورت میں ظاہر کیا۔

ان سب بزرگوں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ حکومت پر قبضہ کرنا خالص دنیا داری اور دُنیا پرستی ہے اور نبوت کا دامن اس سے پاک ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا موسیٰ علیہ السلام صرف یہ چاہتے تھے کہ فرعون کی حکومت جس نوع کی ناخدا شناسی اور خدا کی کھلم کھلا بغاوت پر چل رہی ہے چلتی رہے اور بس۔ اگر حضرت موسیٰ اللہ کے پیغمبر ہیں تو بلا شبہ ہر پیغمبر کی اصلاحی دعوت کی اساس یہ ہے کہ ناخدا شناسی پر مبنی سب نشانیوں کو مٹاتے اور انسانوں کو مسرفین کی طاعت سے ہٹا کر اپنی طاعت کی دعوت دے۔ یہ دُنیا داری نہیں بلکہ عین دینداری ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو قرآن حضرت موسیٰ کی محنتوں اور مساعی کے نتائج یہ نہ بتاتا۔

فاخرجنا ھم من جنات و عیون و کنوز و مقام کریم کذالک و اورثنا بنی اسرائیل۔

اور اگر حضرت موسیٰ کی دعوت اصلاحی کا یہی مفہوم ہوتا تو حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو یہ تسلی نہ دیتے۔

عسیٰ ربکم ان یھلک عدوکم و یستخلفکم فی الارض۔

سارے اعیانِ حکومت کا فیصلہ

۱۳۷ - پھر ان سب نے باہم مشورہ کے بعد فرعون سے کہا کہ موسیٰ اور اس کے بھائی کو ڈھیل دے دو اور سارے شہروں میں ہرکارے بھیج دو کہ تمام شہروں سے فن کار جادوگر اکٹھے کرکے تیرے حضور لے آئیں۔ مشاورت باہمی کے بعد یہ پاس ہوا کہ فرعون سے درخواست کی جائے کہ وہ ان دونوں موسیٰ اور ہارون کے معاملہ میں جلدی نہ کرے۔ ان کا بہترین توڑ اور مؤثر جواب یوں ہوسکتا ہے کہ چپراسی بھیج کر تمام قلمرو میں سے فنِ سحر کے جاننے والے جو ان سے بھی بڑھ کر اس فن کے ماہر (سحار) ہوں جمع کرلیے جائیں۔ ان سے ان کا مقابلہ کیا جائے۔ چنانچہ یوں ہوا[1] یہ مشورے کے بعد وہ فیصلہ ہے جو پورے اتفاق رائے کے ساتھ اعیانِ حکومت کی طرف سے فرعون کو پیش کیا گیا وہ یہ کہ موسیٰ اور ہارون کے بارے میں جلد بازی میں کوئی قدم اٹھانا خلاف مصلحت ہے۔ تقاضائے سیاست یہ ہے کہ ابھی ان کو نظرانداز کر دیجئے اور پوری مملکت میں ہرکارے بھیج کر ملک کے تمام ماہر جادوگروں کو جمع کیجئے تاکہ وہ کسی عوامی مجمع میں ان دونوں کو ایسی شکست دیں کہ ان کی شاہراہ عام پر سرکرکری ہو جائے۔

اعیانِ حکومت کے اس فیصلہ سے یہ بات صاف طور پر معلوم ہورہی ہے کہ ان کو اعجاز اور سحر میں امتیازی فرق واضح طور پر معلوم تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اعجاز ایک حقیقت ہے اور جادو محض نظر اور نفس کو متاثر کرکے اشیاء میں ایک خاص قسم کی تبدیلی محسوس کراتا ہے۔ اسی لیے انہوں نے حضرت موسیٰ کے دعویٰ رسالت کو رد کرنے کے لیے کہا کہ یہ شخص جادوگر ہے۔ یعنی عصا فی الواقع سانپ نہیں تھا کہ اسے خدائی نشان مانا جائے۔ بلکہ صرف ہمیں ایسا نظر آیا کہ وہ گویا سانپ تھا جیسا کہ ہر جادوگر کرلیتا ہے۔ پھر انہوں نے مشورہ دیا کہ تمام ملک کے ماہر جادوگروں کو بلایا جائے اور ان کے ذریعے سے لاٹھیوں اور رسیوں کو سانپوں میں تبدیل کرکے لوگوں کو دکھایا جائے تاکہ عامۃ الناس کے دلوں میں اس پیغمبرانہ معجزے سے جو ہیبت بیٹھ گئی ہے وہ اگر بالکلیہ دُور نہ ہو تو کم از کم شک ہی میں تبدیل ہو جائے[2]

اصل ارشاد میں ڈھیل دینے کے لیے اَرجہ آیا ہے۔ یہ اصل میں ارجئہ ہے۔ ہمزہ کو

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

تخفیف کی خاطر گرادیا ہے۔ اس کا مصدر ارجاء ہے۔ اس کے معنے موخر کرنے، دیر کرنے، ڈھیل دینے، کسی معاملہ کو دوسرے وقت پر ڈالنے کے ہیں۔ تاخیر اور ڈھیل دینے کا اعیانِ حکومت کی جانب سے فرعون کو مشورہ دینا بتا رہا ہے کہ اس سے پہلے حضرت موسیٰ اور فرعون کے پاس کچھ معاملات ہو چکے ہیں۔ ممکن ہے قید کی سزا اور قتل کی دھمکی فرعون نے حضرت موسیٰ کو دی ہو۔ اس پر اعیانِ حکومت نے فرعون کو حضرت موسیٰ کے معاملہ میں تاخیر کا مشورہ دیا تاکہ رائے عامہ میں حکومت کی رسوائی نہ ہو۔ اسی بنا پر پہلے رائے عامہ کو ہموار کرنے کا مشورہ دیا اور کہا کہ جادوگروں کو بلایا جائے اور وہ بھی ماہر قسم کے ہوں۔ علامہ حبشی کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ یہ آیت جیسے بتا رہی ہے کہ حضرت موسیٰ کے اعجاز کی عظمت کو ظاہر کر رہی ہے ایسے ہی اس بات کی طرف بھی اشارہ کر رہی ہے کہ فرعون اور اس کے اعیان کی نادانی کو بھی ظاہر کر رہی ہے کہ انہوں نے حضرت موسیٰ کو ساحر سمجھا۔ یہ اعجاز کی عظمت اور اس کا دبدبہ ہے کہ فرعون اس کے جواب کے لیے تیاریوں میں مصروف ہے۔ جادو کا جواب جادو سے دینا معارضہ بالمثل کہلاتا ہے۔ چونکہ فرعون نے اعجاز کو سحر کہا تھا اس لیے سحر کو توڑنے کے لیے ساحروں کو جمع کرنے کا حکم دیا۔ آگے آرہا ہے کہ اس مقابلہ میں فرعون اور اس کے اعیانِ حکومت کو شکست فاش ہوئی اور منہ کی کھانی پڑی ہے۔ نبوتِ موسیٰ کے لیے عصا اور یدِ بیضا اعجاز تھے اور نبوتِ محمدیہ کے لیے قرآن عزیز اعجاز ہے۔ اگر اہلِ عرب میں قرآن کے معارضہ کی طاقت ہوتی تو وہ بھی ضرور معارضہ کرتے۔ اسی لیے قرآن نے ان کو چیلنج دیا تھا فاتوا بسورۃ من مثلہ فرعون اور اعیانِ حکومت کو اس معارضہ میں ناکامی ہوئی لیکن اقتدار، جاہ، مال اور دولت کی محبت دعوتِ موسیٰ کی راہ میں آڑ بن گئی۔

وَجَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ
الْغٰلِبِيْنَ ﴿۱۱۳﴾ قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ قَالُوْا
يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾
قَالَ اَلْقُوْا ۚ فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ
وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۱۶﴾

اور جادوگر فرعون کے حضور میں آئے انہوں نے کہا کہ اگر ہم موسٰی پر غالب آئے تو ہمیں اس خدمت کے صلہ میں انعام ملنا چاہیے۔[۱۳۸] فرعون نے کہا ضرور ملے گا اور تم سب میری بارگاہ میں مقرب ہو گے۔[۱۳۹] جادوگروں نے کہا اے موسٰی یا تو تم پہلے ڈالو یا پھر ہمیں ہی پھینکنا ہے، موسٰی نے کہا تم ہی پھینکو۔[۱۴۰] پھر جادوگروں نے پھینکیں تو انہوں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور لوگوں میں دہشت ڈال دی اور بہت بڑے جادو کی نمائش کی۔[۱۴۱]

معانی مفردات

بسحرٍ عظیم، جادو، اور جادو کرنا۔ سحر یسحر کا مصدر اور اسم مصدر کے معنے میں بھی آتا ہے۔ علامہ آلوسی رقمطراز ہیں کہ یہ مصادر شاذہ میں ہے۔ علامہ ابن خالو یہ لغوی نے کتاب لیس میں تصریح کی ہے کہ عربی زبان میں فعَلَ یفعَلُ فعلا کے وزن پر سوائے سحر یسحر سحرا" اور کوئی مصدر نہیں ہے لیکن علامہ ابوحیان اندلسی نے البحر المحیط میں اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ بجز سحر اور فعل کے اور کوئی مصدر بروزن فِعل باب فتح کا نہیں آتا۔ شیخ سمیں نے بھی یہی کہا ہے۔ ابوبکر الجصاص رازی احکام القرآن میں رقمطراز ہیں۔ اہلِ لغت ذکر کرتے ہیں کہ سحر کی اصل لغت میں اس چیز کے لیے ہے جو لطیف ہو اور جس کا سبب نہایت مخفی ہو اور سَحَر ان کے خیال میں بالفتح بمعنے غذا ہے کیونکہ وہ مخفی ہوتی ہے اور اس کے مجاری لطیف ہوتے ہیں۔ لبید کہتے ہیں۔

ارانا موضعین لامر غیب

ونسحر بالطعام وبالشراب

اس شعر میں نسحر کے دو معنے ہیں ایک یہ کہ ہم سحر زدہ کی طرح مشغول و فریفتہ تھے۔ دوسرے یہ کہ ہم غذا حاصل کر رہے تھے بہر حال جو مطلب بھی ہو سحر کے معنے خفا کے ہوتے ہیں۔ ایک اور شاعر کہتا ہے،

فان تسئلینا فیم نحن فاننا

عصافیر من هذا الانام المسحر

اس شعر کے معنے میں وہ ہی دو احتمال ہیں جو پہلے شعر میں ہیں اور یہ بھی احتمال ہے کہ مسحر سے ذو سحر مراد ہو یعنی پھیپھڑے والا۔ سحر پھیپھڑے کو اور جو حلق لگا ہو اسے کہتے ہیں۔ اسی سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ قول ہے توفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما بین سحری ونحری حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے پھیپھڑے اور سینے کے درمیان وفات پائی۔ یہ ہیں وہ معنے جو لغت میں سحر کے آتے ہیں۔ پھر یہ اسم منقول ہو کر ہر اس امر کے لیے استعمال ہونے لگا جس کا سبب مخفی ہو اور اپنی حقیقت کے خلاف اس کا تخیل ہونے لگے۔ نیز ملمع اور دھوکہ بازی کے قائمقام ہو۔ اور جب بھی یہ لفظ مطلق بلا کسی قید کے استعمال ہو گا اپنے فاعل کی مذمت کو سناتے گا ہاں قید کے ساتھ قابل مدح وستائش کے بارے میں بھی استعمال ہوا ہے۔ ارشاد

ہے ان من البیان لسحراً، کچھ بیان تو جادو ہوتے ہیں۔

جادوگروں کا اجتماع اور حضرت موسیٰ سے مقابلہ

چونکہ اعیان حکومت اور فرعون نے حضرت موسیٰ پر جادوگر ہونے کا الزام لگایا تھا اس لیے ضروری ہوا کہ اعجاز و سحر کا باہم مقابلہ ہوتا کہ عوام کے سامنے اعجاز اور سحر کا فرق ممتاز ہو جائے۔ یہ حُسنِ اتفاق ہے کہ موسیٰ پر جادوگر کا الزام لگانے والوں نے خود ہی فیصلہ کر لیا کہ ماہر جادوگروں کو اکٹھا کیا جائے اور ان سے حضرت موسیٰ کا مقابلہ کرایا جائے۔ موسیٰ علیہ السلام نے بھی اس بات کا یہ سوچ کر خیر مقدم کیا کہ وہ اب تک جس قدر معجزات فرعون اور اس کی قوم کو دکھا چکے تھے ان کو وہ یہ کہہ کر رد کر چکے تھے کہ یہ جادو ہے۔ اب موقعہ ہے کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو کر سامنے آجائے۔ اور ان کو صداقت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑے۔ جادو اور شعبدہ بازی میں صرف دل لگی کے آنی اور وقتی تماشے ہوتے ہیں جبکہ معجزات قوموں اور جماعتوں کے صلاح و فساد، تعمیر اور تخریب، ترقی اور تنزل کے اسباب ہوتے ہیں۔ جادوگر کا مقصد کسی غیر معمولی واقعہ کا صرف حیرت انگیز طریقہ سے اظہار ہوتا ہے۔ تاکہ وہ دیکھنے والوں کو تھوڑی دیر کے لیے متحیر کر دے لیکن نبوت کا مقصد اپنے ان حیرت انگیز اعمال سے دُنیا کی اصلاح قوموں کی دعوت، جماعتوں کی تہذیب اور دینِ الٰہی کی تقویت کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا، پیغمبر بشیر نذیر ہادی ہوتا ہے۔ جادوگر ان تمام اوصاف سے خالی ہوتا ہے اور حیرت انگیز تماشا گری کے سوا کوئی اور ممتاز بات اس کے اندر نہیں ہوتی۔ بس اسی حقیقت کو نمایاں کرنے کے لیے معجزہ کا سحر سے مقابلہ ہوا۔ اور یہ مقابلہ بھی جیسا کہ قرآن ہی نے دوسری جگہ بتایا ہے کہ یوم الزینۃ جشن کے روز ہوا، منشا یہ تھا کہ عوام و خواص کے مجمع میں سلحر و جادوگر نبوت کی صداقت کا اقرار کر لیں تو پھر کسی کو یارائے انکار نہ رہے گا اور خدا کی حجت پوری ہو جائے گی۔

۱۲۸- اور جادوگر فرعون کے پاس آئے، انھوں نے کہا کہ اگر ہم موسیٰ پر غالب آئے تو ہمیں اس خدمت کے صلے میں انعام ضرور ملنا چاہیے۔ ساحرینِ فرعون نے ان لنا لاجرا کہہ کر پہلے ہی قدم پر جتلا دیا کہ انبیاء علیہم السلام جن کا پہلا لفظ ما اسالکم علیہ من اجر ان اجری الا علی اللّٰہ ہوتا ہے کوئی پیشہ ور لوگ نہیں ہوتے[1] قرآن نے یہاں، سرگزشت کا غیر ضروری حصہ نظر انداز کر

---

[1] افادات شیخ الاسلام

دیا ہے۔ یعنی اعیانِ حکومت کے مشورے کے مطابق فرعون نے مملکت کے تمام شہروں میں پیادے دوڑا دیے وہ حکم کے مطابق گئے اور ہر جگہ سے ماہر اور فن کار جادوگروں کو جمع کر کے لاتے اور ان کو فرعون کے دربار میں حاضر کیا چونکہ یہ ساری بات سیاقِ کلام سے خود ٹپک رہی تھی اس لیے اسے چھوڑ کر اصل بات بیان کر دی کہ ساحروں نے آتے ہی پیشہ ورانہ انداز میں سودے بازی شروع کر دی کہ اگر ہم نے بازی جیت لی تو ہمیں انعام بھی ملے گا۔ قرآن نے یہاں خاص طور پر ساحروں کی سودے بازی کا ذکر کر کے اشارہ کر دیا کہ پیشہ وری اور دینداری میں کیا فرق ہے اور یہ بھی ظاہر کر دیا کہ شعبدہ بازی کی پیشہ ورانہ زندگی میں اخلاقی پستی اور دناءت کا کیا حال ہوتا ہے۔ اسی پر نقالوں، مسخروں، بھانڈوں، شاعروں، افسانہ نویسوں، جھاڑ پھونک کرنے والوں، تعویذ گنڈہ کرنے والوں کو قیاس کر لو۔

یہ فقرہ اس خیال کی تائید کرتا ہے کہ جن حاضرینِ دربار نے حضرت موسیٰ کا معجزہ دیکھا تھا اور باہر جن لوگوں تک اس کی خبر پہنچی تھی، ان کے عقیدے اپنے دینِ آبائی سے متزلزل ہو رہے اور اب ان کے دین کا دار و مدار اس پر رہ گیا تھا کہ کسی طرح جادوگر بھی وہ کام کر دکھائیں جو موسیٰ علیہ السلام نے کر دکھایا ہے۔ فرعون اور اس کے اعیانِ سلطنت اسے خود ایک فیصلہ کن مقابلہ سمجھ رہے، ان کے اپنے بھیجے ہوئے آدمی عوام الناس کے ذہن میں یہ بات بٹھاتے پھر رہے تھے کہ اگر جادوگر کامیاب ہو گئے تو موسیٰ کے دین میں جانے سے بچ جائیں گے ورنہ ہمارے دین و ایمان کی خیر نہیں ہے فرعون اور اعیانِ حکومت کا یقین بتایا ہے کہ ہمارے ہی جادوگروں کی پارٹی کامیاب ہو گی اور اسی کو صداقت و حقانیت کا معیار قرار دے کر اس نے پکار کرا دی تھی کہ سب لوگ اپنے ملکی اور سرکاری ماہرینِ فن کے کمالات کا مشاہدہ کرو اور مشاہدہ کے بعد اپنے اسی دینِ فرعونی کی صداقت پر اور زیادہ جم جاؤ، دوسری جگہ ارشاد ہے لعلنا نتبع السحرة ان کانوا ھم الغالبین۔

خبر نہیں ہمارے شارحینِ قرآن بلا وجہ جادوگروں کی تعداد معلوم کرنے کے کیوں درپے ہیں۔ آلوسی، قرطبی، اندلسی، اور دوسرے شارحینِ قرآن نے کوشش کی ہے کہ جادوگروں کی تعداد معلوم کریں اور ۱۲ کی تعداد سے شروع ہو کر ۹ لاکھ تک بتائی ہے کچھ نے جادوگروں کے امکنہ کو بھی متعین کیا ہے اور کچھ نے ان کا فنی نسب نامہ بھی بتایا ہے لیکن ان میں سے کوئی بات قرآن نے نہیں بتائی ہے اور نہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موضوع پر امت کی کوئی رہنمائی فرمائی ہے اور مزہ یہ ہے کہ تورات کے اوراق اس سے خالی ہیں۔ اس سے زیادہ مزہ دار بات یہ ہے کہ کچھ بزرگوں نے ان رسیوں اور لاٹھیوں کا وزن بھی معلوم کر لیا جو جادوگر لے کر آئے تھے لکھا ہے کہ ان کا وزن تین سو اونٹوں کے

باربرداری کے ہم وزن تھا، مگر افسوس یہ ہے کہ ان سب باتوں سے قرآن خاموش ہے۔

جادوگروں کو فرعون کا جواب

۱۲۹۔ فرعون نے کہا ضرور ملے گا اور تم سب میری بارگاہ میں مقرب ہوگے۔ یعنی مزدوری کیا چیز ہے وہ تو ملے گی اس سے بڑھ کر کہ تم ہمارے مقربین بارگاہ اور مصاحبین خاص میں داخل کر لیے جاؤ گے۔[1] فرعون نے ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا، انعام تو جو ملنا ہے ملے گا تم پر مزید نوازش یہ ہوگی کہ تم خاص مقربین میں شامل کیے جاؤ گے۔ مطلب یہ ہے کہ روپیہ پیسہ ہی نہیں ملے گا دربار میں کرسی بھی ملے گی۔ اس طرح فرعون اور جادوگروں نے خود ہی نبی اور جادوگر کا عظیم اخلاقی فرق ظاہر کر دیا ہے۔ دونوں کا تقابلی مطالعہ فرمائیے۔ ایک طرف بنی اسرائیل جیسی پسی ہوئی قوم کا ایک فرد دس سال تک قتل کے الزام میں روپوش رہنے کے بعد فرعون کے دربار میں تشریف لایا، اور بڑے طنطنے کے ساتھ ڈنکے کی چوٹ کہا کہ انی رسول من رب العالمین فرعون سے بات کرنے میں وہ ادنیٰ سے جھجک محسوس نہیں کرتا۔ اس کی دھمکیوں کی وہ پرکاہ برابر پرواہ نہیں کرتا۔ یہ روحانیت ہے اس کے مقابلے میں جادوگروں کی صورت میں خالص مادیت ہے۔ فرعون کے سرکاری دین اور اس کے جعلی نظامِ حیات کو بچانے کے لیے بلائے گئے ہیں۔ پھر بھی ہاتھ جوڑ کر کہتے ہیں کہ سرکار انعام ملنا چاہیے اور جواب میں یہ سن کر پھولے نہیں سماتے کہ پیسہ بھی ملے گا اور قربِ شاہی سے بھی سرفراز کیے جائیں گے۔ یہ دو مقابل کے کردار آپ سے آپ ظاہر کر رہے تھے کہ نبی کس شان کا انسان ہوتا ہے اور اس کے مقابلہ میں آنے والوں کی کیا ہستی ہے۔ نبی خدا کا فرستادہ ہوتا ہے اور اس کا نعرہ لا اسالکم علیہ اجرا ہوتا ہے اور اس کے مدِمقابل مادے کے فرستادے ہوتے ہیں اور ان کا نعرہ ان لنا لاجرًا ان کنا نحن الغالبین ہوتا ہے۔ نبی نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد نبی کی ذات مجسم ہدایت و رہنمائی اور امامت و پیشوائی کے لیے خاص ہوتی ہے۔

سوچنے کی بات ہے کہ جیسے جادوگروں کی زبان سے ان کنا نحن الغالبین سن کر فرعون کو کس قدر حوصلہ ہوا ہوگا ایسے ہی فرعون کی زبان سے نغمہ سن کر جادوگروں کو بھی تسلی ہوئی ہوگی کہ محنت رائیگاں نہ جائے گی، کیونکہ طالبانِ دنیا کی نظر مہارت اور کمالِ فن کے باوجود فوری نفع پر ہوتی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہے۔ یوں سمجھو کہ جشن کے میدان میں فرعون تمام شاہانہ کر و فر کے ساتھ تخت نشین ہے۔ درباری بھی حسب مراتب قرینے سے بیٹھے ہیں اور لاکھوں انسان حق و باطل کے معرکہ کا مظاہرہ کرنے کو جمع ہیں ایک جانب مصر کے مشہور جادوگروں کا گروہ اپنے ساز و سامان سے لیس کھڑا ہے اور دوسری جانب خدا کے رسول سچائی اور راستی کے پیکر حضرت موسیٰ کھڑے ہیں۔ فرعون خوش ہے اور اس یقین پر ہے کہ جادوگر حضرت موسیٰ کو ضرور شکست دے دیں گے۔ جادوگروں کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے اگر تم نے اسی کو شکست دے دی تو نہ صرف انعام و اکرام سے مالا مال کیے جاؤ گے بلکہ میرے دربار میں خاص مقام پاؤ گے۔ جادوگر بھی اپنی کامیابی کے یقین پر فرعون سے اپنے اعزاز و اکرام کا وعدہ لے رہے ہیں اور اس کے تصور سے بہت شاداں و فرحاں ہیں۔ مولانا روم نے کیا خوب فرمایا ہے :

سحر را با معجزہ کردہ قیاس   ہر دو را بر مکر پندارد اساس
زر قلب و زر نیکو در عیار   بے محک ہرگز نہ دانی ز اعتبار
ہر کرا در جان خدا بنہد محک   ہر یقین را باز داند او ز شک

مقابلہ میں پہل کون کرے ؟

۱۴۰۔ جادوگروں نے کہا کہ اے موسیٰ یا تو تم پہلے ڈالو یا پھر ہمیں ہی پھینکنا ہے، موسیٰ نے کہا کہ تم ہی پھینکو۔ جادوگروں نے یہ بات شاید اس لیے کہی کہ اس سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے روبرو عصا ڈال کر باذن اللہ اژدہا بنا چکے تھے۔ حضرت موسیٰ نے فرمایا کہ تم ہی ڈالو۔ یعنی جب تم کو یہ مقابلہ ہی منظور ہے اور اسی پر آخری فیصلہ کا انحصار کرتے ہو تو پہلے تم ہی ڈال کر پوری قوت آزمائی کر لو۔ کیونکہ باطل کی پوری نمائش اور زور آزمائی کے بعد جو حق کا غلبہ شاہد ہوگا وہ اُمید ہے کہ زیادہ مؤثر اور واقع فی النفوس ہو تو فی الحقیقت یہ موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے سحر کے ساتھ معجزہ کا مقابلہ کرنے کی اجازت نہ تھی بلکہ دو صورتوں میں سے ایک ایسی صورت کا انتخاب تھا جو باطل کے خمود اور حق کے غلبہ و وضوح کی مؤثر ترین صورت ہو سکتی تھی۔[1]

جادوگروں نے پیشہ ورانہ طور پر جب یہ اطمینان کر لیا کہ غلبہ کی صورت میں انعام سے نوازے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

جائیں گے اور سرکار کے یہاں کرسی نشینی ملے گی تو اب حضرت موسیٰ کی طرف متوجہ ہوئے مگر پہلے اس سے کہ باہم سحر و اعجاز کا مقابلہ ہو قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے آخری طور پر حق تبلیغ ادا کرتے ہو فرمایا ۔

ویلکم لا تفتروا علی اللہ کذبا فیسحتکم بعذاب وقد خاب من افتری

افسوس تم پر تم کیا کر رہے ہو دیکھو اللہ پر جھوٹی تہمت نہ لگاؤ ایسا نہ ہو کہ وہ کوئی عذاب بھیج کر تمہاری بیخ مٹا دے ۔

لوگوں نے حضرت موسیٰ سے یہ بات سنی تو آپس میں رد و کد شروع کر دی اور سرگوشیاں کرنے لگے ۔ اعیانِ حکومت نے یہ صورت دیکھی تو جادوگروں سے کہا ان ھذان لساحران یریدان ان یخرجکم من ارضکم بسحرھما یہ دونوں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون جادوگر ہیں ۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ اپنے جادو کے زور سے ملک پر قبضہ کر لیں اور تمہیں نکال دیں ۔ تم اپنا کام شروع کرو اور موسیٰ کے مقابلہ میں ڈٹ جاؤ ۔ اس کے بعد جادوگروں نے آگے بڑھ کر موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ موسیٰ بتاؤ ابتدا تمہاری جانب سے ہو گی یا ہماری جانب سے ۔ حضرت موسیٰ نے جب دیکھا کہ ان پر اس تنبیہہ کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا تو فرمایا کہ ابتدا تم ہی کرو اور اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کرو ۔

نظمِ قرآن بتا رہا ہے کہ حضرت موسیٰ کے مقابلہ میں جادوگروں کی خواہش یہی تھی کہ پہل ہم کریں ساحر اس وقت تک موسیٰ علیہ السلام کو اپنے ہی طرح کا ایک ماہر فن ساحر سمجھ کر گویا کہہ رہے ہیں کہ مقابلہ ہمارے تمہارے فن کا ہی ہو رہا ہے ۔ اب یہ بتلاؤ شروع کون کرے گا ہم یا تم اور نحن پر زور دے کر اپنی رغبت ظاہر کر دی ۔ حضرت موسیٰ نے پہلے ان ہی کو موقع دیا کہ وہ اپنا ہنر دکھائیں جو اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت موسیٰ کو پورا اعتماد تھا کہ انہیں خدا کی تائید حاصل ہے اس وجہ سے یہ ساحر کتنا ہی بڑا جادو دکھائیں لیکن اللہ تعالیٰ ان کے سحر کو باطل کر کے رہے گا ۔ حضرت تھانوی نے یہاں یہ خوب نکتہ آفرینی فرمائی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا مقصود اس سے خود اذن نہیں بلکہ اذن کو ان کے کفر کے ابطال اور اپنے معجزے کے اظہار کا ذریعہ بنایا تھا ۔

جادو محض نگاہوں کا دھوکا ہے

۱۴۱ ۔ پھر جادوگروں نے پھینکیں تو انہوں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور لوگوں میں

دہشت ڈال دی اور بہت بڑے جادو کی نمائش کی۔ یعنی جادو کے زور سے نظر بندی کر کے مجمع پر چھا گئے اور لوگوں کو مرعوب کر لیا۔ دوسری آیت میں ہے کہ انہوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں زمین پر پھینک دیں جس سے زمین پر سانپ ہی سانپ دوڑتے معلوم ہونے لگے۔ یخیل الیہ من سحرھم انھا تسعی۔ ان آیات سے معلوم ہوا کہ ساحرین فرعون نے جو شعبدہ دکھلایا تھا۔ اس میں فی الواقع قلب ماہیت نہیں ہوا بلکہ وہ محض تخییل و نظر بندی تھی۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ تمام اقسام سحر اسی میں منحصر ہوں۔ شاید انہوں نے یہ گمان کیا ہو کہ ہم اتنی ہی کارروائی سے موسیٰ علیہ السلام کو دبا لیں گے اور کچھ گنجائش ملی تو ممکن تھا کہ اس سحر عظیم سے بھی بڑا کوئی سحر اعظم دکھلاتے مگر اعجاز موسوی نے سحر کو پہلے ہی مورچہ پر مایوس کن شکست دے دی آگے موقع ہی نہ رہا کہ مزید مقابلہ جاری رکھا جاتا۔[1]

انداز بیان سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جوں ہی حضرت موسیٰ کی زبان سے القوا کا لفظ نکلا۔ جادوگروں نے یکبارگی اپنی رسیاں اور لاٹھیاں ان کی طرف پھینک دیں۔ اور اچانک ان کو یہ نظر آیا کہ سینکڑوں سانپ دوڑتے ہوتے آرہے ہیں۔ یہاں صرف یہ بتایا ہے کہ جادوگروں نے لوگوں کی نگاہوں کو مسحور کر دیا اور ان کو دہشت زدہ کر دیا اور پارہ ۱۶ سورہ طٰہٰ میں یہ بتایا کہ یخیل الیہ من سحرھم انھا تسعی یہ اثر صرف لوگوں پر ہی نہیں ہوا تھا بلکہ حضرت موسیٰ بھی خود سحر کے اثر سے متاثر ہوگئے تھے۔ حضرت موسیٰ کی صرف آنکھوں نے یہ اثر محسوس نہیں کیا بلکہ ان کے خیال پر بھی یہ اثر پڑا کہ لاٹھیاں اور رسیاں سانپ بن کر دوڑ رہی ہیں۔ یہ اس بات کی تصدیق خود قرآن کر رہا ہے کہ عام انسانوں کی طرح پیغمبر بھی جادو سے متاثر ہو سکتا ہے۔ اگرچہ جادوگر کے جادو کا پیغمبر کی نبوت پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا جیسے یہاں حضرت موسیٰ کے بارے میں قرآن بتا رہا ہے کہ یخیل الیہ من سحرھم انھا تسعی حضرت موسیٰ کو ان کے جادو کی وجہ سے ایسا دکھائی دیا کہ ان کی لاٹھیاں دوڑ رہی ہیں ٹھیک اسی طرح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں احادیث میں آیا ہے کہ حضور فرماتے ہیں تخیل لی انی اقول الشیئ ولا فعلہ ولم اقلہ ولم افعلہ مجھے دکھا دیتا ہے کہ میں ایک بات کہتا ہوں یا ایک کام کرتا ہوں حالانکہ میں نے نہ کہی ہوتی ہے نہ کام کیا ہوتا ہے جیسے یہاں کہا گیا ہے کہ جادوگروں کی لاٹھیاں اور رسیاں سانپ نہیں بنی تھیں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

بلکہ ان شعبدہ گری کی وجہ دیکھنے والا خیال کرنے لگا تھا سانپ کی طرح حرکت کر رہی ہیں اسی طرح حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بھی خیال کرتے تھے کہ میں نے یہ کام کر لیا ہے حالانکہ وہ کام کیا ہوا نہ ہوتا۔ اگرچہ ہم اس موضوع پر تفصیلی بحث پارہ ۱۶ میں کریں گے لیکن یہاں اشارات ہدیہ ناظرین ہیں۔

سحر کی حقیقت اور اسلام میں اس کا حکم

سحر کی حقیقت کچھ ہے یا محض نظر کا دھوکہ اور بے حقیقت شے ہے اس کے متعلق جمہور علمائے اہل السنہ کی یہ رائے ہے کہ سحر واقعی ایک حقیقت ہے اور مضرت رساں اثر رکھتا ہے اسی بنا پر شیخ الاسلام کو یہاں اس تاویل کی ضرورت پیش آئی۔ "اس میں فی الواقع قلب ماہیت نہیں ہوا بلکہ وہ محض تخییل اور نظر بندی تھی۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ تمام اقسام سحر اسی میں منحصر ہوں" قرآن حکیم میں سحر کے متعلق جس قدر بیانات آئے ہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ وہ سحر کو تخییل اور نظر بندی سے زیادہ کوئی وقعت نہیں دیتا۔ اسی بنا پر امام ابو حنیفہ، ابو بکر الجصاص، ابو اسحاق اسفرائنی شافعی اور ظاہریہ میں سے حافظ ابن حزم اور معتزلہ کہتے ہیں کہ سحر کی حقیقت شعبدہ بازی، نظر بندی اور فریب خیال کے سوا کچھ نہیں ہے۔ بلا شبہ وہ ایک باطل اور بے حقیقت چیز ہے۔ ابو بکر الجصاص کہتے ہیں:

اور جب سحر کو مطلق استعمال کیا جائے گا تو وہ ایک ایسے امر کا نام ہے جو محض دھوکا اور باطل ہو کہ جس کی اس سے زیادہ کوئی حقیقت نہ ہوا ور نہ اس کو ثبات حاصل رہو۔ (احکام القرآن)

اور حافظ عماد الدین ابن کثیر لکھتے ہیں:

اور وزیر ابو المظفر یحییٰ ابن محمد بن ہبیرہ نے اپنی کتاب الاشراف فی مذہب الاشراف میں ایک باب سحر کے متعلق بھی قائم کیا ہے۔ اس میں انھوں نے بتایا ہے کہ علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ سحر کی بھی ایک حقیقت ہے مگر امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ (تفسیر ابن کثیر)

ابو عبد اللہ القرطبی کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک سحر حقیقت ہے اور ایک واقعی شے ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے سے جو چاہتا ہے پیدا کر دیتا ہے مگر معتزلہ اور شوافع میں سے ابو اسحاق اسفرائنی اس کے مخالف ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ سحر

محض فریبِ نظر اور خیال بندی کا نام ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)
اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں لکھا ہے:

سحر کے متعلق اختلاف ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ وہ فقط تخییل ہے اور اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے یہ ابوجعفر شافعی، ابوبکر رازی حنفی اور ابن حزم الظاہری اور ایک چھوٹی جماعت کا خیال ہے اور نووی فرماتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ سحر ایک حقیقت اور واقعہ ہے۔ جمہور کا یہی خیال ہے اور عام علماء کا یہی مسلک ہے۔

لیکن جو علماء سحر کو تخییل سے زیادہ واقعیت اور حقیقت کے معنے دیتے ہیں ان میں پھر اختلاف ہے کہ کیا سحر میں یہ تاثیر ہے کہ وہ حقائق و ماہیات میں انقلاب پیدا کر دے مثلاً آدمی کو کتا بنا دے یا لاٹھی کو فی الواقع سانپ بنا دے۔ یا صرف نقصان رساں ہے۔ ایک چھوٹے سے گروہ کا خیال یہ ہے کہ سحر میں انقلابِ ماہیت کی تاثیر بھی ہے مگر جمہور کو اس سے اتفاق نہیں وہ کہتے ہیں کہ سحر میں انقلابِ ماہیت کی تاثیر بالکل نہیں ہوتی اور سحر کے ذریعے قلبِ ماہیت نہیں ہوتا بلکہ دھوکہ نظر بندی اور قوتِ متخیلہ کی شعبدہ بازی کا نام ہے۔ حافظ ابنِ حجر عسقلانی نے فتح الباری میں یہ فیصلہ کن بات لکھی ہے۔

محل نزاع یہ امر ہے کہ سحر سے ذات کا انقلاب ہوتا ہے یا نہیں۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ سحر فریبِ نظر کا نام ہے۔ وہ انقلابِ نظر کو نہیں مانتے اور جو لوگ سحر کو ایک حقیقت مانتے ہیں وہ اس بارے میں پھر باہم مختلف ہیں کہ کیا سحر کا اثر صرف اس حد تک ہے کہ وہ مزاج میں ایک قسم کا تغیر پیدا کر دے جیسے دوسری بیماریوں میں ہوتا ہے یا اس کی تاثیر اس سے زیادہ ہے کہ ایک شے کی حقیقت کو بدل ڈالے مثلاً پتھر کو جانور بنا دے یا جانور کو پتھر بنا دے۔ جمہور پہلی بات کے قائل ہیں اور کچھ لوگ دوسری بات کے۔

سحر کے موضوع پر امام ابوبکر الجصاص نے احکام القرآن میں امام فخر الدین رازی نے مفاتیح الغیب میں ابنِ خلدون نے مقدمہ میں اور شاہ عبدالعزیز نے تفسیر فتح العزیز میں بڑی سیر حاصل بحث کی ہے انشاء اللہ ہم معالم القرآن کی جلد ۱۶ میں ہدیہ ناظرین کریں گے۔

قرآن نے جادوگروں کے اس عمل کو اس جگہ سحر عظیم کہا ہے لیکن ہمارے شارحینِ قرآن کو اصرار ہے کہ یہ سحر نہیں بلکہ صنعت کاری تھی۔ لاٹھیوں اور رسیوں میں پارہ بھر دیا گیا تھا اور جس زمین پر یہ

مظاہرہ ہوا تھا اس کو کھوکھلا کرکے اس کے اندر آگ بھر دی گئی تھی۔ وقت مقررہ پر نیچے کی گرمی سے پارے میں حرکت پیدا ہو گئی اور وہ لاٹھیاں اور رسیاں سانپ کی طرح دوڑتی نظر آنے لگیں۔ یہ راہ محض اس لیے اختیار کی گئی ہے کہ پہلے اپنی جگہ یہ فیصلہ کر لیا گیا ہے کہ سحر ایک حقیقت ہے اور قرآن اس فیصلہ کا ساتھ نہیں دیتا ہے۔ وہ سحر کو محض تمویہ اور تخییل کے درجہ کی چیز قرار دیتا ہے۔

دراصل جادو کا اعتقاد دُنیا کی قدیم اور عالمگیر گمراہیوں میں سے ہے اور نوع انسانی کے لیے بڑی مصیبتوں کا باعث ہو چکا ہے۔ قرآن نے اس کے بے اصل ہونے کا اعلان کیا ہے لیکن افسوس کہ دُنیا متنبہ نہیں ہوئی اور ازمنہ وسطی کے مسیحی جہل و قساوت نے ہزاروں بے گناہ انسانوں کو زندہ جلا دیا۔[1]

---

[1] ترجمان القرآن

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَاِذَا هِىَ تَلْقَفُ
مَا يَاْفِكُوْنَ ﴿١١٧﴾ فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١١٨﴾
فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ ﴿١١٩﴾ وَاُلْقِىَ السَّحَرَةُ
سٰجِدِيْنَ ﴿١٢٠﴾ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٢١﴾ رَبِّ مُوْسٰى
وَهٰرُوْنَ ﴿١٢٢﴾ قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ
اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِى الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا ۚ
فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿١٢٣﴾ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ
خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿١٢٤﴾ قَالُوْٓا اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا
مُنْقَلِبُوْنَ ﴿١٢٥﴾ وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا ۭ
رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ﴿١٢٦﴾

اور ہم نے موسیٰ پر وحی کی کہ تم اپنی لاٹھی میدان میں ڈال دو جونہی
موسیٰ نے لاٹھی پھینکی تو اچانک جو کچھ جھوٹی نمائش جادوگروں نے

کر رکھی تھی اس کو لاٹھی ہڑپ کر رہی تھی[142]۔ بس سچائی ثابت ہو گئی اور
جو کچھ جادوگر کرتب کر رہے تھے سب ملیامیٹ ہو گئے[143]۔ نتیجہ یہ ہوا
کہ موسیٰ کے مدِمقابل سارے مغلوب ہو گئے اور فتح کی جگہ اُلٹے ذلیل
ہو گئے، سارے جادوگر بے اختیار سجدے میں گر پڑے[144]۔ انہوں نے
کہا ہم اس ذات پر ایمان لے آئے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے
جو موسیٰ اور ہارون کا پروردگار ہے[145]۔ فرعون نے کہا مجھ سے
اجازت لیے بغیر تم موسیٰ پر ایمان لے آئے بلاشبہ یہ ایک سازش ہے
جو تم نے شہر میں مل کر کی ہے تاکہ شہر سے اس کے باشندوں کو
نکالو تمہیں عنقریب اس کے نتیجہ کا پتہ لگ جائے گا[146]۔ میں ضرور
تمہارے ہاتھ اور پاؤں اُلٹے سیدھے کٹواؤں گا، پھر تمہیں سُولی
پر چڑھاؤں گا[147]۔ انہوں نے جواب دیا ہمیں اپنے مالک کے حضور
میں پیش ہونا ہی ہے[148]۔ ہمارا قصور اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ

جب ہمارے پروردگار کی نشانیاں ہمارے سامنے آگئیں تو ہم ان پر
ایمان لے آئے اے ہمارے آقا تو ہمیں صبر کی نعمت سے سرفراز
کر اور ہمیں اس حالت میں موت دے کہ ہم تیرے فرمانبردار ہوں۔ ۱۴۹

معانی مفردات

تلقف ، وہ نگل جاتی ہے لقف یلقف باب سمع سے آتا ہے اس کے معنی کسی چیز کو تیزی اور پھرتی سے لے لینے کے ہیں چاہے منہ سے نگل کر ہو یا ہاتھ سے لے کر ہو یہ مضارع کا واحد مونث غائب ہے اسی سے لقف لقف اور لقیف آتا ہے۔ لینے میں تیزی دکھانے والا، بات کو جلدی تاڑ جانے والا۔ یافکون ، افک سے مضارع کا جمع مذکر غائب۔ افک اَفک افوک جھوٹ بولنا باب ضرب و سمع سے ارض مافوکہ، وہ زمین جس پر بارش نہ ہو۔ افاک جھوٹا لپاٹی۔ اصل معنے ہٹ جانے کے ہیں۔ افکار میں حق سے ہٹ جاتے، گفتار سے راستی سے ہٹ جاتے۔ کردار میں اچھے کام سے ہٹ جاتے۔ غلبوا ، ماضی کا جمع مذکر غائب، مغلوب ہو گئے۔ غلبہ اور غلب مصدر ہیں۔ اصلی لغت میں موٹی گردن والے آدمی اور شہر کو کہتے ہیں۔ اس لیے لغوی لحاظ سے غلبہ کے معنی کسی موٹی گردن کو اپنی گرفت میں لینا۔ عمرو بن معدی کرب کا شعر ہے۔

یمشی بھا غلب الرقاب کانھم
بزل کسین من الکحیل جلا لا

ایسی موٹی گردنوں والے وہاں پھرتے ہیں جیسے تارکول کی جھولیں پہنے ہوئے موٹی گردنوں والے طاقتور اونٹ، غالب اور قابو پانے کے معنی بھی اسی مناسبت سے لیے ہیں۔ صاغرین، ذلیل و خوار، صغار سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر، صاغر کی جمع بحالت نصبی۔ صغر یصغر باب کرم سے آتا ہے۔

حق کا بول بالا اور باطل کا منہ کالا

جب جادوگر اپنی فن کاری میں مہارت کو منظر عام پر لے آئے اور ان کی لاٹھیاں اور رسیاں سانپ بن کر دوڑنے لگیں، عام نگاہیں مسحور ہو گئیں اور لوگوں میں انہوں نے دہشت پیدا کر دی۔ حضرت موسیٰ کی قوت خیال بھی اس درجہ متاثر ہو گئی کہ ان کو بھی لاٹھیاں اور رسیاں اپنی طرف دوڑتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ بلکہ دوسرے موقعہ پر قرآن نے بتایا ہے کہ حضرت موسیٰ نے اپنے اندر ہراس محسوس کیا کہ اس منظر سے لوگ متاثر نہ ہو جائیں فاوجس فی نفسہ خیفۃ موسیٰ قرآن نے یہاں اختصار سے کام لیا ہے دوسرے موقعہ پر تفصیل ہے کہ ہم نے کہا لا تخف انک انت الاعلیٰ۔ ڈرو مت بول بالا تمہارا ہوگا۔ قرآن تاریخ کی داستان نہیں قدم قدم پر ایک ایک فقرہ میں مخاطبوں کی فکری اصلاح کرتا ہے یہاں اوحینا الیٰ موسیٰ، کی تصریح کر کے اشارہ فرمادیا کہ اعجاز نبی کا نہیں بلکہ اللہ کا کردار ہوتا ہے۔ معجزات اور نشانات پیغمبر کی قوت سے نہیں بلکہ خدا کی قدرت اور مشیت سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اور یہی قرآن کی خصوصیت ہے کہ وہ اپنے مشن میں تطہیر افکار کو اساسی حیثیت دیتا ہے وہ سب سے پہلے لوگوں کے دل و دماغ کا جائزہ لیتا ہے اور دیکھتا ہے کہ ان کے اندر باطل افکار کے کون سے جھاڑ جھنکاڑ موجود ہیں۔ انجیل میں حضرت عیسیٰ کے معجزات جس عبارت اور لب و لہجہ میں بیان ہوتے ہیں ان کا صاف منشا یہ ہے کہ گویا حضرت عیسیٰ کو تمام کائنات کی بادشاہی سپرد کر دی گئی ہے اس لیے وہ خاص اپنی طاقت اور قدرت سے جو چاہتے تھے کر دیتے تھے۔ قرآن عزیز یہ ایسا انداز اختیار نہیں کرتا۔ وہ انبیاء کے معجزات بیان کرتا ہے مگر اس کے ساتھ اس عقیدہ باطلہ کی بھی اصلاح کرتا جاتا ہے اور نہایت تصریح کے ساتھ یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ جو کچھ تھا خدا کی قدرت سے تھا۔ نبی کے ارادے اور اختیار سے نہیں۔ اسی بیان میں اس منظر کا آغاز اوحینا الیٰ موسیٰ سے کیا ہے۔

۱۱۷۔ اور ہم نے موسیٰ کو وحی کی کہ تم اپنی لاٹھی میدان میں ڈال دو جونہی موسیٰ نے لاٹھی پھینکی تو اچانک جھوٹی نمائش جو انہوں نے کر رکھی تھی سب کو لاٹھی ہڑپ کر رہی تھی۔ یعنی عصائے موسیٰ سانپ بن کر ان کی تمام لاٹھیوں اور رسیوں کو نگل گیا اور سارا بنا بنایا کھیل ختم ہو گیا۔[۱]

یہاں مایافکون آیا ہے اور دوسرے موقعہ پر ماصنعوا آیا ہے۔ ہمارے شارحین قرآن لکھ

[۱] افادات شیخ الاسلام

رہے ہیں کہ جادوگروں کے بناتے سانپوں کو حضرت موسیٰ کا اژدہا ہڑپ کر گیا۔ لیکن قرآن کے الفاظ مایا فکون اور ما صنعوا میں بہت گہری اور بلیغ معنویت ہے۔ ایک معنے تو یہی ہیں جو عام شارحین قرآن بتا رہے ہیں اور جو عبداللہ بن عباس، قتادہ، الحسن وغیرہ سے منقول ہیں کہ حضرت موسیٰ کا اژدہا جادوگروں کی لاٹھیوں اور رسیوں کو نگل گیا۔ اس صورت میں مایا فکون میں ما موصولہ ہوگا لیکن دوسری صورت یہ ہے کہ ما کو مصدریہ قرار دیا جاتے اور معنے یہ کیے ہیں کہ حضرت موسیٰ کا اژدہا جادوگروں کی فریب کاری اور بناوٹ کو ہڑپ کر گیا۔ یعنی عصائے موسیٰ نے فی الفور جادوگروں کی نظربندی، تخیل اور فریب کو ختم کر دیا اور لاٹھیاں لاٹھیاں ہی نظر آنے لگیں۔ مطلب یہ ہے کہ عصائے موسیٰ نے لاٹھیوں اور رسیوں کو نہیں نگلا بلکہ اس جادو کے اثر کو زائل کر دیا جس کی بدولت وہ سانپ نظر آ رہی تھیں۔ السید رشید رضا نے الشیخ اکبرؒ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ کی لاٹھی نے جادوگروں کے جادو کو ملیامیٹ کیا ہے اور اس کی صورت یہی ہے کہ لاٹھی کے اژدہا بنتے ہی فوراً اس نے جدھر کا رُخ کیا سحر مٹ گیا اور وہ لاٹھیاں جو فریبِ نظر کی وجہ سے پہلے سانپ نظر آ رہی تھیں۔ لاٹھیاں ہی نظر آنے لگیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ عصائے موسیٰ ان لاٹھیوں اور رسیوں کو ہڑپ کر گیا تو دیکھنے والوں کے لیے معاملہ میں التباس ہوتا اور وہ یہ فیصلہ نہ کر سکتے کہ سحر کیا ہے اور اعجاز کیا ہے۔ دونوں میں غرابت دیکھ کر چھوٹے اور بڑے ہونے کا فیصلہ کرتے۔ لیکن جب ان کو جادو کا فریب منظرِ عام پر آوارہ نظر آیا اور لاٹھیاں اور رسیاں سانپ نہ رہیں اور موسیٰ کی لاٹھی سانپ بن کر میدان میں دندناتی رہی تو حق باطل سے ممتاز ہو گیا اور انہوں نے سمجھ لیا کہ یہ آیتِ الٰہی اور اعجاز ہے اور وہ فریب کاری اور نظربندی ہے۔

احقاقِ حق اور ابطالِ باطل

۱۴۳۔ پس سچائی ثابت ہو گئی اور جادوگر جو کچھ کرتب کر رہے تھے سب ملیامیٹ ہو گئے۔ یہ فقرہ بھی ان معنے کی مزید تائید کرتا ہے کہ عصائے موسیٰ نے سانپ بن کر ان کے اس طلسمِ فریب کو ہڑپ کرنا شروع کر دیا جو انہوں نے تیار کیا تھا۔ اس کا صاف مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ عصائے موسیٰ نے جدھر رُخ کیا وہاں سے جادو کا اثر مٹ گیا جس کی وجہ سے لاٹھیاں اور رسیاں سانپ نظر آ رہی تھیں۔ سورہ یونس میں جادوگروں کے اسی عمل کے بارے میں فرمایا ہے ما جئتم به السحر جو کچھ تم نے کیا ہے وہ جادو ہے اور اللہ اسی کو مٹا دے گا ان اللہ سیبطله الحق "حقق"

سے ہے اور عربی میں حق کا خاصہ ثبوت اور قیام ہے یعنی جو بات ثابت ہو، اٹل ہو، اَن مٹ ہو، اسے حق کہتے ہیں اور باطل ٹھیک ٹھیک اس کی ضد ہے۔ یعنی ایسی بات جو مٹ جانے والی ہو اور باقی نہ رہنے والی ہو۔ قرآن سچائی کو حق سے اور انکار کو باطل سے تعبیر کرکے یہ بات واضح کر رہا ہے کہ سچائی کا خاصہ ثبوت و قیام ہے اور انکار و سرکشی کے لیے نہ ٹک سکنا اور مٹ جانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس موقعہ پر سورہ یونس میں یحق اللہ الحق کی تعبیر آئی ہے۔ خدا حق کو حق کر دے گا اور باطل کو باطل یعنی حق ثابت و قائم رہ کر اپنی حقانیت آشکارا کرے گا اور باطل مٹ کر اپنے باطل ہونے کا ثبوت دے گا۔ قرآن نے قاعدہ بتایا ہے کہ حق و باطل کی نزاع میں کامیاب حق ہوتا ہے۔ یہاں اعجازِ موسیٰ اور سحرِ ساحران میں نزاع کے موقعہ پر اسی قانون کے تحت اعجازِ موسیٰ کو کامیابی عطا فرمائی۔ کیونکہ اعجاز حق ہے اور جادو اس کے مقابلہ میں باطل ہے۔ باطل کے لیے مٹنا ہے۔ امرِ الٰہی اعجازِ موسیٰ کی صورت میں ظاہر ہوا اور حق کا بول بالا ہو گیا۔ قرآن کی اصطلاح میں اسی کا نام قضا بالحق ہے ارشاد ہے۔ فاذا جاء امر اللہ قضی بالحق۔

جادوگروں کا ضمیر بیدار ہو گیا

۱۲۴۔ نتیجہ یہ ہوا کہ موسیٰ کے مدِمقابل سارے مغلوب ہو گئے اور فتح کی جگہ اُلٹے ذلیل و رُسوا ہو گئے اور سارے جادوگر بے اختیار سجدے میں گر گئے۔ ساحرین کو شبہ ہوا کہ یہ سحر سے بالاتر کوئی اور حقیقت ہے۔ آخر فرعون کے لوگ بھرے مجمع میں شکست کھا کر اور ذلیل ہو کر میدانِ مقابلہ سے لوٹے اور ساحرین خدائی نشان دیکھ کر بے اختیار سجدہ میں گر پڑے۔ کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ و ہارون نے ظہورِ حق پر سجدہ شکر ادا کیا۔ اسی وقت ساحرین بھی سربسجود ہو گئے۔ القی السحرہ کا انداز بتا رہا ہے کہ کوئی ایسا قوی حال ان پر طاری ہوا جس کے بعد بجز خضوع و استسلام کوئی چارہ نہیں رہا۔ رحمتِ الٰہیہ کا کیا کہنا کہ جو لوگ ابھی ابھی پیغمبرِ خدا سے نبرد آزمائی کر رہے تھے سجدے سے سر اٹھاتے ہی اولیاء اللہ اور عارف کامل بن گئے۔[1] جادوگر حضرت موسیٰ کے اعجاز کی قہرمانیت سے اتنے متاثر اور مرعوب ہوتے کہ بے تحاشا سجدے میں گر پڑے۔ القی مجہول کا صیغہ ہے دو باتوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے ایک جادوگروں کے جذبہ تعظیم و اکرام کی طرف دوسرے قبولیتِ حق کے لیے ان

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

سے قلب کی کیفیت کی طرف، اُن کا کفر ساری زندگی کا کفر تھا اور ایمان چند لمحوں کا ایمان لیکن ایمانی لمحات کے ایک سجدے نے عمر بھر کا کفر محو کر دیا۔ اب اُن کا دل صدیقوں کا دل اور ان کی صدا شہدائے حق کی صدا ہو گئی۔ مصری شہنشاہی کا سارا قہر و جلال ایک پل کے لیے ان کی استقامت ایمانی پر غالب نہ آسکا۔ روحانیت اور مادیت میں جب مقابلہ ہوتا ہے تو روحانی طاقت کا یہی حال ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اُن کے سحر کو سرِ عام رُسوا ہونے اور اعجازِ موسیٰ کے ادراک نے ان کی عقلوں میں یقین اور اُن کے دلوں میں ایمان کی طاقت بھر دی۔ ایمان و یقین کی اسی استدلالی اور وجدانی طاقت سے بے قابو ہو کر وہ سجدہ ریز ہو گئے اور ان کے دلوں میں فرعون، اس کی حکومت کا کوئی مقام نہ رہا۔ جادوگر فن کار تھے جادو اُن کی فن کاری۔ حضرت موسیٰ کا اعجاز ان کی فن کاری کا مظاہرہ نہ تھا۔ جادوگروں نے موسیٰ کے چہرے پر خوف کے آثار دیکھ کر تاڑ لیا کہ یہ اس کا اپنا فن نہیں ہے۔ اس کے پیچھے یقیناً غیبی طاقت ہے اور یہ یقیناً اللہ کا رسول ہے۔

جادوگروں کا علی رؤس الاشہاد ایمان

۱۴۵۔ انہوں نے کہا کہ ہم اس ذات پر ایمان لے آئے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے جو موسیٰ اور ہارون کا رب ہے۔ چونکہ فرعون بھی اپنی نسبت انا ربکم الاعلیٰ۔ کہتا تھا اس لیے رب العلمین کے رب موسیٰ و ہارون کہنے کی ضرورت ہوئی۔ اس میں یہ بھی اشارہ ہو گیا کہ بے شک جہان کا پروردگار وہی ہو سکتا ہے جس نے موسیٰ و ہارون کو اپنی خاص ربوبیت سے بدون توسط اسباب ظاہرہ دُنیا کے متکبروں پر علی رؤس الاشہاد اس طرح غالب کر کے دکھلا دیا۔[1]

اس کے معنے یہ ہیں کہ وہاں سب کو معلوم تھا کہ یہ مقابلہ کس بنیاد پر ہو رہا ہے۔ پورے مجمع میں کوئی بھی اس غلط فہمی میں نہ تھا کہ مقابلہ موسیٰ اور جادوگروں کے کرتب کا ہو رہا ہے اور فیصلہ اس بات کا ہونا ہے کہ کس کا کرتب زبردست ہے۔ سب یہ جانتے تھے کہ ایک طرف موسیٰ علیہ السلام اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ خالق زمین و آسمان کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں اور اپنی پیغمبری کے ثبوت میں یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ ان کا عصا معجزے کے طور پر فی الواقع اژدہا بن جاتا ہے اور دوسری طرف جادوگروں کو برسرِ عام بلا کر فرعون یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ عصا سے اژدہا بن جانا معجزہ نہیں ہے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

بلکہ محض جادو کا کرتب ہے بالفاظِ دیگر وہاں فرعون اور جادوگر اور سارے تماشائی عوام و خواص معجزے اور جادو کے فرق سے واقف تھے۔ اور امتحان اس بات کا ہو رہا تھا کہ موسیٰ جو کچھ دکھا رہے ہیں یہ جادو کی قسم سے ہے یا اس معجزے کی قسم سے ہے جو اللہ سبحانہٗ کی قدرت کے کرشمے کے سوا اور کسی طاقت سے نہیں دکھا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جادوگروں نے اپنے جادو کو مغلوب ہوتے دیکھ کر یہ نہیں کہا کہ ہم نے مان لیا کہ موسیٰ ہم سے زیادہ باکمال ہے بلکہ انہیں فوراً یقین آگیا کہ موسیٰ واقعی اللہ سبحانہٗ کے سچے پیغمبر ہیں اور وہ پکار اُٹھے کہ ہم اس کو خدا مان گئے جس کے پیغمبر کی حیثیت سے موسیٰ اور ہارون آئے ہیں۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مجمع میں اس شکست کے کیا اثرات پڑے ہوں گے اور پورے ملک پر اس کا کتنا زبردست اثر ہوا ہو گا۔ فرعون نے ملک کے سب سے بڑے مرکزی مقام پر اور بہت بڑے جشن کے موقعہ پر یہ مقابلہ اس اُمید پر کرایا تھا کہ جب مصر کے ہر گوشہ سے آئے ہوتے لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ جائیں گے کہ لاٹھی سے سانپ بنا دینا موسیٰ کا کوئی کمال نہیں ہے ہر جادوگر یہ کرتب دکھا سکتا ہے تو موسیٰ کی ہوا اکھڑ جائے گی۔ لیکن اس کی یہ تدبیر اسی پر اُلٹ پڑی اور قریہ قریہ سے آئے ہوئے لوگوں کے سامنے خود جادوگروں ہی نے بالاتفاق اس بات کی تصدیق کر دی کہ موسیٰ جو کچھ دکھا رہے ہیں یہ ان کے فن کی چیز نہیں ہے۔ یہ فی الواقع معجزہ ہے جو صرف خدا کا پیغمبر ہی دکھا سکتا ہے۔

حضرت موسیٰ کی کامیابی پر فرعون کی بدحواسی

۱۴۶۔ فرعون نے کہا مجھ سے اجازت لیے بغیر تم موسیٰ پر ایمان لے آئے بلاشبہ یہ ایک سازش ہے جو تم نے شہر میں مل کر کی ہے تاکہ شہر سے اس کے باشندوں کو نکالو تمہیں عنقریب اس کے نتیجہ کا پتہ لگ جائے گا۔ یعنی یہ تم سب جادوگروں کی ملی بھگت ہے، غالباً موسیٰ تمہارا بڑا اُستاد ہو گا۔ اس کو آگے بھیج دیا پھر سب نے اپنی مغلوبیت کا اظہار کر دیا تاکہ عام لوگ متاثر ہو جائیں اس گہری سازش سے تمہارا مقصود یہ ہے کہ اس ملک کے اصلی باشندوں کو نکال باہر کرو اور خود مصر کی سلطنت پر قبضہ کر دو یہ بات فرعون نے اپنی کھلی شکست پر پردہ ڈالنے اور لوگوں کو اُلو بنانے کے لیے کی تھی فاستخف قومہ فاطاعوہ مگر جس چیز سے فرعون اور اعیانِ حکومت ڈر رہے تھے آخر تقدیرِ الٰہی سے وہی پیش آئی۔ ونری فرعون وھامان وجنودھما

منہم ما کانوا یحذرون[1]

فرعون نے حضرت موسیٰ کی دعوت کو ختم کرنے کے لیے جو سیاسی کھیل کھیلا تھا اللہ نے اس میں اسے بُری طرح ناکام کیا۔ کھیل یہ تھا کہ تمام ملک کے ماہر جادوگروں کو بلا کر منظرِ عام پر جادوگری کا مظاہرہ کرایا جاتے تاکہ عوام الناس کو حضرت موسیٰ کے جادوگر ہونے کا یقین ہو جاتے لیکن اس مقابلہ میں اسے کھلی شکست ہوئی کہ خود اپنے بلاتے ہوتے ماہرینِ فن نے بالاتفاق فیصلہ کر دیا کہ حضرت موسیٰ جو چیز پیش کر رہے ہیں وہ ہرگز جادو نہیں ہے بلکہ اللہ سبحانہ کی شانِ قدیری کا مظاہرہ ہے۔ ظاہر ہے جادو کو جادوگروں سے زیادہ کون جان سکتا ہے جب انہوں نے ہی عملی تجربے اور آزمائش کے بعد شہادت دے دی کہ یہ جادو نہیں تو پھر فرعون اور اس کے اعیانِ حکومت کا عصائے موسیٰ اژدہا اور یدِ بیضا کو دیکھ کر یہ دعویٰ کرنا ان ھذا لساحر علیم بالکل ایک کھوکھلا نعرہ ہے۔ اب فرعون اور اس کے اعیانِ حکومت کا یہ سیاسی اسٹنٹ ملک کے عوام کی نظروں میں بالکل بے معنے ہو کر رہ گیا۔ اب حالات کو آخری سنبھالا دینے کیلئے یہ سیاسی مہرہ چلا کہ اس سارے معاملہ کو حضرت موسیٰ اور جادوگروں کی سازش قرار دے دے۔ اس نے عوام کو سمجھایا کہ یہ سازش کے ذریعے اقتدار پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں اور بتایا کہ انہوں نے پہلے سے مشورہ کر کے یہ طے کر رکھا تھا کہ ہم عین موقعہ پر اپنی شکست مان کر اپنے ایمان کا اعلان کر دیں گے اور اس طرح موجودہ برسرِ اقتدار گروہ کا اقتدار ختم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ چنانچہ فرعون نے ان پر سازش اور بغاوت کا الزام لگا کر پہلے ان کو دھمکی دی کہ فسوف تعلمون۔ تمہیں اپنی کرتوت کا پتہ لگ جاتے گا بلاشبہ یہ فرعون کا الزام ہے ورنہ جو کچھ ہوا وہ حق کی قوت اور جادوگروں کی حق پسندی سے ہوا ہے۔

یہاں تو صرف فرعون کی یہ بات نقل کی ان ھذا لمکر مکرتموہ فی المدینۃ لتخرجوا منھا اھلھا۔ یہ ایک سازش ہے جو تم نے مل کر شہر میں تیار کی ہے تاکہ اس کے مالکوں کو اقتدار سے محروم کر دو اور قرآن ہی میں دوسرے موقعہ پر یہ بتایا ہے کہ فرعون نے انہ لکبیرکم الذی علمکم السحر، یعنی صرف ملی بھگت نہیں بلکہ معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ موسیٰ تمہارا سرگروہ ہے۔ تم نے معجزے سے شکست نہیں کھائی ہے بلکہ اپنے استاد سے جادو میں شکست کھائی ہے اور تم آپس میں یہ طے کر کے آتے ہو کہ اپنے استاد کا غلبہ ثابت اور اسے اس کی پیغمبری کا ثبوت بنا کر یہاں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

سیاسی انقلاب بپا کرد۔ فرعون نے جادوگروں پر اپنی شکست کو چھپانے کے لیے یہ الزام عائد کیا۔ حافظ ابن کثیر نے صحیح لکھا ہے۔

وہ خود بھی جانتا تھا اور ہر عقل والا جانتا ہے کہ فرعون جو کچھ کہہ رہا ہے سب سے بڑا جھوٹ ہے موسیٰ علیہ السلام نے مدین سے آتے ہی فرعون کو اللہ کی طرف بلایا اور معجزات دکھاتے۔ اسی وقت فرعون نے مقابلہ کا اعلان کرا دیا اور ملک میں جادوگروں کو بلانے کے لیے ہرکارے روانہ کر دیے۔

(تفسیر ابن کثیر)

پھر پتہ نہیں کہ ہمارے شارحین قرآن کو یہ کیسے پتہ لگ گیا ہے کہ

موسیٰ علیہ السلام اور جادوگروں کے امیر کی باہم ملاقات ہوئی۔ حضرت موسیٰ نے اس سے کہا تیری کیا رائے ہے کہ اگر بازی میں جیت گیا تو کیا تو مجھ پر ایمان لے آئے گا اور میری دعوت کی حقانیت کی گواہی دے گا۔ جادوگر نے کہا میں کل ایسے جادو کی نمائش کروں گا کہ اس پر کوئی جادو غالب نہیں ہو سکتا۔ بخدا اگر تم غالب آ گئے تو میں ضرور تم پر ایمان لے آؤں گا اور آپ کے برحق ہونے کی گواہی دوں گا اور فرعون ان کی طرف گفتگو کے وقت دیکھ رہا تھا اسی لیے فرعون نے یہ بات کہی ان هذا لمکر مکرتموہ۔

روایت ابن جریر اور ابن کثیر دونوں نے لکھی اور عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن مسعود کے نام سے لکھی۔ لیکن یہ روایت جس راہ سے سفر کر کے ہم تک پہنچی ہے وہ سدی کبیر ہے اور ہمیں افسوس ہے کہ ہم تفسیر قرآن کے بارے میں ان سے حسن ظن نہیں رکھتے۔ قرآن اپنی تفسیر و تشریح میں اس افسانہ سے بے نیاز ہے۔

جادوگروں کی سزا کا اعلان

۱۲۴۔ میں ضرور تمہارے ہاتھ پاؤں اُلٹے سیدھے کٹوا دوں گا۔ پھر تمہیں سولی پر چڑھا دوں گا۔ فرعون نے پہلے جادوگروں پر سازش اور بغاوت کا الزام عاید کیا۔ اب اس نے اس سزا کا بھی اعلان کر دیا جو اس کے ملک میں حکومت کے باغیوں کے لیے ملکی قانون میں موجود تھی یعنی پہلے ان کے ہاتھ پاؤں بے ترتیب کاٹے جائیں پھر سرِ عام ان کو سولی دی جاتے۔

یہ خوفناک دھمکی فرعون نے اس نظریہ کو کامیاب بنانے کے لیے دی تھی کہ جادوگر دراصل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ سازش کر کے آئے ہیں۔ اس کے پیش نظر یہ تھا کہ اس طرح یہ لوگ جان بچانے کی خاطر سازش کا اعتراف کر لیں گے اور وہ ڈرامائی اثر ختم ہو جائے گا جو شکست کھاتے ہی ان کے سجدے میں گر ایمان لے آنے سے ان لوگوں پر ہوا تھا جو خود اس کی دعوت پر جمع ہوئے تھے اور جنہیں خود اس کے روانہ کردہ لوگوں نے یہ خیال دلایا تھا کہ مصری قوم کا دین و ایمان بس ان جادوگروں کے ذریعے قائم ہے یہ کامیاب ہوں تو قوم اپنے دین آبائی پر قائم رہ سکے گی ورنہ موسیٰ کی دعوت کا سیلاب اسے اور اس کے فرعون کے اقتدار کو بھی بہا کرلے جائے گا۔ ظلم و استبداد ہمیشہ بے بس اور بے کس انسانوں میں اپنے جھوٹے وقار کو قائم رکھنے کے لیے اسی قسم کے ہتھکنڈے اختیار کیا کرتا ہے کہ ان کو باغی اور سازشی قرار دیتا ہے اور بغاوت کے جرم میں ان کو سنگین سزائیں دیتا ہے۔ خود ہمارا اپنا تجربہ ہے جب ہم نے ظلم کے خلاف آواز اٹھائی ہمیں سازشی اور غدار کہا گیا ہے اس طریقے سے ظلم و استبداد اپنی درازیٔ عمر کی تدبیر کرتا ہے لیکن ہوتا وہی ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔

بے کس اور بے بس جادوگروں نے فرعون کا یہ ظالمانہ اور جابرانہ اعلان سنا اور دو باتوں کا ایمان کی روشنی میں تقابلی مطالعہ کیا۔ ایک طرف دنیا اور اس کی وقتی تکلیفیں ہیں، دوسری طرف آخرت اور اس کی دائمی راحتیں ہیں۔ دنیا حاصل ہوتی ہے فرعون کی ربوبیت مان کر اور آخرت ملے گی اللہ کی ربوبیت مان کر۔ انہوں نے پوری سوچ بچار کے بعد دنیا کے مقابلے میں آخرت کو ترجیح دی۔ یہاں کی وقتی لذتوں کے مقابلے میں آخرت کی دائمی راحتوں کو قبول کیا اور سب کے سامنے فرعون کی اس دھمکی کا یہ جواب دیا۔

جادوگروں کا ایمان افروز جواب

۱۴۸۔ انہوں نے جواب دیا ہمیں اپنے مالک کے حضور میں پیش ہونا ہی ہے۔ جادوگر توحید اور تمنائے لقائے اللہ کے نشہ سے مخمور ہو چکے تھے۔ جنت و دوزخ گویا آنکھوں کے سامنے تھیں۔ وہ ان دھمکیوں کی کیا پرواہ کر سکتے تھے۔ انہوں نے صاف کہہ دیا کچھ مضائقہ نہیں جو کرنا ہو کر گزر۔ پھر ہم کو اپنے خدا کے پاس جانا تیرے سر ہو کر سہی۔ وہاں کے عذاب سے یہاں کی تکلیف آسان ہے اور اس کی رحمت و خوشنودی کی خاطر دنیا کی بڑی سے بڑی تکلیف و مصیبت کا برداشت کر لینا عاشقوں کے لیے سہل ہے۔

ھنیئاً لارباب النعیم نعیمھم
وللعاشق المسکین ما یتجرع

جادوگروں کی طبیعت کا یہ زبردست انقلاب انسانی تاریخ کا ایک انوکھا واقعہ ہے۔ یہ انقلاب عصائے موسیٰ سے زیادہ طاقتور اعجاز ہے۔ ایک وہ اعجاز ہے کہ حضرت موسیٰ کی لاٹھی سانپ بن گئی اور ایک اعجاز یہ ہے کہ جن کی دنائت اور پست ہمتی کا ابھی چند منٹ پہلے یہ حال تھا کہ اپنے کرتب دکھانے کے لیے فرعون کے سامنے حاضر ہوتے ہیں تو بھانڈوں، نقالوں اور بھڑووں کے انداز پر اپنے فن کے مظاہرہ پر بھرپور انعام کی التجا کرتے ہیں اور ایک یہ حال ہے کہ ایمان کی روشنی دل میں داخل ہوتے ہی ان کے باطن کا ہر گوشہ اس طرح منور ہو گیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ تاریکی کی کوئی پرچھائیں ان کے دلوں پر کبھی نہیں پڑی ہے اور یہ گوشت پوست کے انسان نہیں بلکہ عزیمت و استقامت کے پہاڑ ہیں۔ ان کی زندگی میں عظیم الشان انقلاب رونما ہو گیا۔ ابھی ابھی وہ دُنیا کی حقیر مایہ کے لیے فرعون سے ان لنا لاجرا کی التجا کر رہے تھے اور اب وہی اسی فرعون سے سنگین دھمکی سن کر انا الیٰ ربنا منقلبون کہہ رہے ہیں۔ ایمان ان میں پیوست ہو گیا۔ یقین ان کے رگ و ریشہ میں سرایت کر گیا اور ان کے جسم میں خون اور روح کی طرح دوڑ گیا۔ فرعونی ربوبیت کے جراثیم ختم ہو گئے۔ اب وہ پہلے جادوگر نہ رہے۔ ان کا دل و دماغ ایمان کے فیضان سے معمور ہو گیا ہے۔ اب وہ ایمان کا تقاضا پورا کرنے کے لیے کہہ رہے ہیں کہ جو کچھ کرنا ہے کرے فاقض ما انت قاض ان کی اس حیرت انگیز تبدیلی پر عقل دنگ ہے اور فلسفہ و تاریخ اخلاق انگشت بدنداں ہے کہ اس کی کیا توجیہ کی جائے قوت ایمان کے سوا اس کی کوئی توجیہ نہیں۔ یہاں اجمال ہے لیکن سورہ طٰہٰ میں اس کی تفصیل ہے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ قوتِ ایمان نے ان کے دلوں میں زندگی کو ایسا حقیر بنا دیا تھا اور ان میں ایسی دلیری بھر دی تھی جو بالکل ایک معجزانہ شان رکھتی تھی۔ فرعون کی اسی بات لا قطعن ایدیکم الخ کے جواب میں انہوں نے علی رؤس الاشہاد فرعون سے کہا۔

لن نؤثرک علی ما جاءنا من البینات والذی فطرنا

قسم ہے اس ذات کی جس نے ہمیں پیدا کیا ہے یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ہم واضح نشانیاں آجانے کے باوجود تجھے ترجیح دیں۔

یہ قوتِ ایمان کا مظاہرہ، محبت و جاں نثاری کی یہ نمائش اپنی مثال آپ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے ہمارے ہاتھ پاؤں کاٹ کر ہمیں سُولی پر لٹکایا تو ہم کہیں اور نہیں جائیں گے اپنے رب ہی

کے پاس جائیں گے۔ ہمیں اس کی پروا نہیں ہے۔ تو جو کچھ کرنا چاہتا ہے کر گزر۔ تو زیادہ سے زیادہ یہی کرے گا کہ بس ہماری یہ دنیوی زندگی ختم کر دے گا اس سے زیادہ تو کر ہی کیا سکتا ہے۔ فی الواقع سچا ایمان اگرچہ ایک ہی لمحہ کا ہو ایسی روحانی طاقت پیدا کر دیتا ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اسے مرعوب نہیں کر سکتی۔

آئندہ حالات میں صبر کی دعا۔

۱۴۹۔ ہمارا قصور اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ جب ہمارے پروردگار کی نشانیاں ہمارے سامنے آگئیں تو ہم ان پر ایمان لے آئے۔ اے ہمارے آقا ہمیں صبر کی نعمت سے سرفراز کر اور ہمیں اس حالت میں موت دے کہ ہم تیرے فرمانبردار ہوں۔ یعنی جس رب کی نشانیوں کو مان کر ہم تیری نگاہ میں مجرم ٹھہرے ہیں۔ اسی رب سے ہماری دعا ہے کہ وہ تیری زیادتیوں اور سختیوں پر ہم کو صبر جمیل بخشے اور مرتے دم تک اسلام پر مستقیم رکھے۔ ایسا نہ ہو کہ گھبرا کر کوئی بات تسلیم و رضا کے خلاف کر گزریں[1]

مطلب یہ ہے کہ ہم نے کوئی سازش نہیں کی اور نہ ہماری باہم کوئی ملی بھگت ہے۔ ہمارا جرم اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ہم نے اپنے رب کی نشانیوں کو مان لیا ہے اور ہم نے اپنے عملی تجربے اور آزمائش سے جان لیا کہ موسیٰ جو کچھ پیش کر رہا ہے یہ جادو نہیں بلکہ آیات رب ہیں۔ اور تیری نگاہ میں ہمارا یہی جرم ہے اور اسی کا تو ہم سے انتقام لینا چاہتا ہے۔ ہم تیری ہر قسم کی سزاؤں کا استقبال کریں گے۔ اور اس راہ میں ہماری اپنے مولیٰ سے دعا یہ ہے کہ وہ ہمیں تیری ایجرہ دستیوں اور ستم رانیوں کو برداشت کرنے کی قوت عطا فرمائے اور ہم کو دنیا سے اس حال میں اٹھائے کہ ہم اس کے فرمانبردار اور تابعدار ہوں۔ پہلے ایمان کا دعویٰ کیا تھا اب ایمان کے تقاضے پورے کرنے کی اللہ سے دعا کر رہے ہیں۔ ایمان کا اولین تقاضا یہ ہے کہ اپنی پوری زندگی ایمان کے سانچے میں ڈھال لے اور ایمان کی خاطر سرفروشی کے لیے تیار ہو جائے۔

جادوگروں کا کردار اس بات کی واضح اور کھلی دلیل ہے کہ سازش کا الزام سراسر جھوٹ ہے۔ جادوگر اپنے فن میں ماہر ہونے کی وجہ سے مان گئے تھے کہ یہ اعجاز ہے جادو نہیں ہے۔ ان کا ضمیر بیدار ہو گیا اور نعمت ایمان سے مالا مال ہو گئے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ أَتَذَرُ مُوسَىٰ وَقَوْمَهُ لِيُفْسِدُوا
فِي الْأَرْضِ وَيَذَرَكَ وَآلِهَتَكَ ۚ قَالَ سَنُقَتِّلُ أَبْنَاءَهُمْ وَ
نَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ وَإِنَّا فَوْقَهُمْ قَاهِرُونَ ﴿١٢٧﴾ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ
اسْتَعِينُوا بِاللَّهِ وَاصْبِرُوا ۖ إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَنْ
يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ ﴿١٢٨﴾ قَالُوا أُوذِينَا مِنْ
قَبْلِ أَنْ تَأْتِيَنَا وَمِنْ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ۚ قَالَ عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَنْ
يُهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ
تَعْمَلُونَ ﴿١٢٩﴾

اور قوم فرعون کے اعیانِ حکومت نے فرعون سے کہا، کیا تو موسیٰ اور اس کی قوم کو اسی حال میں چھوڑ دے گا کہ وہ ملک میں فساد برپا رکھیں اور تیرا، اور تیرے معبودوں کا بائیکاٹ رکھیں[150]۔ فرعون نے کہا ہم ان کے لڑکوں کو قتل کر دیں گے اور ان کی عورتوں کو زندہ

رہنے دیں گے اور وہ تو ہماری طاقت سے دبے ہوتے ہیں ۱۵۱
حضرت موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اللہ سے مدد مانگو اور ڈٹے رہو
بلاشبہ زمین کا مالک اللہ ہے وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا
ہے وارث بنا دیتا ہے اور انجام ان ہی کے لیے ہے جو متقی ہیں ۱۵۲
انہوں نے کہا تمہارے آنے سے پہلے بھی ہمیں ستایا گیا ہے اور
اب تمہارے آنے کے بعد ہمیں ستایا جا رہا ہے ۱۵۳۔ زمین اللہ کی ہے
اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے وارث بناتا ہے اور آخری
کامیابی ان کے لیے ہے جو متقی ہوتے ہیں ۱۵۴۔ موسیٰ نے کہا قریب
ہے کہ تمہارا پروردگار تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور ملک میں
تمہیں اس کا جانشین بنا دے پھر وہ دیکھے کہ تمہارے کام کیسے
ہیں ۱۵۵۔

معانی مفردات

عسیٰ، عنقریب ہے، شتاب ہے، ممکن ہے، توقع ہے، اندیشہ ہے۔ صاحب قاموس نے

لکھا ہے کہ عسیٰ مطلقاً فعل ہے اور یا مطلقاً حرف ہے۔ اس پر علامہ زبیدی نے اپنے شیخ ابوالطیب قاسمی سے نقل کیا ہے کہ یہ دونوں باتیں تشنہ ہیں بلکہ عسیٰ میں تفصیل ہے جب یہ ضمیر متصل پر داخل ہوتا ہے جیسے عساہ تو حرف ہے اور جب اسم ظاہر پر داخل ہوتا ہے تو افعال مقاربہ میں سے ایک فعل ہے یہی مبرد اور اخفش کی رائے ہے اور دونوں طرح سے استعمال ہونے کے شرائط تسہیل اور اس کی شروح میں مذکور ہیں اور امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں رقمطراز ہیں کہ عسیٰ کے معنے طمع اور ترجی کے ہیں یعنی توقع ہے اور امید ہے۔ اور بہت سے مفسرین نے اس کی تفسیر لازم یعنی ضروری اور یقینی سے کی ہے وہ کہتے ہیں کہ اللہ سبحانہٗ کے متعلق طمع اور رجا صحیح نہیں ہے لیکن یہ ان کی کوتاہ نظری ہے کیونکہ قرآن میں عسیٰ اس لیے آیا ہے کہ انسان اللہ سے توقع رکھے نہ اس لیے کہ خود اللہ سبحانہٗ توقع رکھے لہٰذا عسی ربکم ان یھلک عدوکم کے معنے یہ ہیں کہ تم اللہ سے اپنے دشمن کو ہلاک کرنے کی توقع رکھو۔ اور علامہ ابوحیان اندلسی نے البحر المحیط میں یہ بھی تصریح کی ہے کہ عسیٰ کا استعمال رجا میں زیادہ اور خوف میں کم ہے۔ حافظ سیوطی الاتقان فی علوم القرآن میں اس کی معنویت پر تفصیلی تبصرہ کیا ہے۔

اعیانِ حکومت کی بوکھلاہٹ

فرعون حضرت موسیٰ کی روحانی طاقت سے مغلوب ہو کر یہ فیصلہ کرنا چاہتا تھا کہ حضرت موسیٰ کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ فرعون نے اس سے پہلے حضرت موسیٰ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن فرعون ہی کے ایک شخص نے جو اندر سے ایمان رکھتا تھا فرعون کو اس ارادہ سے باز رکھا۔ چنانچہ اس کی پوری داستان آپ پارہ ۲۴ میں پڑھیں گے۔ یہاں اس موقعہ پر قرآن نے فرعون اور اعیانِ حکومت کا یہ مکالمہ صرف یہ بتانے کے لیے پیش کیا ہے کہ فرعون اس مقابلہ کے بعد ایک تو حضرت موسیٰ کی روحانی طاقت سے مغلوب ہو چکا تھا اور دوسرے رائے عامہ کے خلاف ہونے کا اسے اندیشہ ستا رہا تھا کیونکہ جادوگروں سے مقابلہ ہونے اور جادوگروں کے سرِعام دعوتِ موسیٰ کو اپنانے کا واضح مطلب یہ ہے کہ ملک کی رائے عامہ حضرت موسیٰ کا احترام کر رہی تھی۔ حالات کی نزاکت کا واضح تقاضا تھا کہ فرعون حضرت موسیٰ کو کچھ نہ کہے لیکن حکومت کے اربابِ بست وکشاد کو اب یہ اندیشہ ستا رہا تھا کہ اگر حضرت موسیٰ کو کھلا چھوڑ دیا گیا تو حضرت موسیٰ ملک میں بغاوت کرا دیں گے اور فرعون سے اور فرعون کے نظامِ حکومت سے تعلقاتِ بندگی منقطع کر لیں گے

یہی خدشہ اور خطرہ اس سے پہلے خود فرعون نے حضرت موسیٰ کے بارے میں ظاہر کیا تھا۔

انی اخاف ان یبدل دینکم او ان یظھر فی الارض الفساد

مجھے اندیشہ ہے کہ یہ تمہارا دین بدل دے گا یا ملک میں شورش برپا کر دے گا۔

یعنی مجھے حضرت موسیٰ سے دو باتوں کا اندیشہ ہے ایک مجھے اس سے انقلاب کا خطرہ ہے اگر انقلاب بپا نہ کر سکے تو کم از کم یہ خطرہ تو ضرور ہے کہ ملک میں فساد برپا کر دے۔ دونوں کی باتوں میں ہم آہنگی ہے۔ اب فرعون نے حالات کے تحت رائے بدل لی تھی اور حضرت موسیٰ کی روحانی طاقت سے مغلوب ہو کر اور رائے عامہ کے دھارے کو دیکھ کر وہ حضرت موسیٰ کو کھلا چھوڑ دینا چاہتا تھا کیونکہ جادوگروں سے سرِعام حضرت موسیٰ کا مقابلہ ہونے کے بعد ملک کی رائے عامہ کے سامنے یہ بات واضح ہو کر سامنے آگئی تھی کہ فرعون کا بنایا ہوا سارا گھروندا پاش پاش ہو چکا تھا جو مقابلہ اس نے خود فیصلے کے لیے کرایا تھا اس میں موسیٰ علیہ السلام کی کھلی کھلی فتح کو سیدھی طرح مان لینے کے بجائے اس نے اب فوراً ایک جھوٹی سازش کا افسانہ گھڑا اور جادوگروں کو قتل و تعذیب کی دھمکی دے کر زبردستی اقرار کرانے کی کوشش کی۔ اس افسانے میں ذرہ برابر کوئی صداقت نہ تھی۔ اگر کوئی صداقت بھی ہوتی تو جادوگر ہر قسم کی سزا کا استقبال کرنے کے لیے یوں تیار نہ ہوتے اور سرِعام یہ نہ کہتے فاقض ما انت قاض۔ حالات کے اسی دباؤ نے فرعون کو مجبور کیا کہ وہ براہِ راست حضرت موسیٰ پر ہاتھ نہ ڈالے۔ لیکن اعیانِ حکومت مطالبہ کر رہے ہیں کہ حضرت موسیٰ سے خطرہ ہے۔ فرعون اس کے جواب میں اُن کو تسلی دے رہا ہے کہ ڈرنے کی کیا بات ہے ہماری کرسی مضبوط ہے اور بنی اسرائیل ہماری مضبوط طاقت کے تلے دبے ہوئے ہیں۔

۱۵۰۔ اور قومِ فرعون کے اعیانِ حکومت نے فرعون سے کہا تو موسیٰ اور اس کی قوم کو اسی حال میں چھوڑ دے گا کہ وہ ملک میں فساد برپا رکھیں اور تیرا، تیرے معبودوں کا بائیکاٹ رکھیں۔ جب حق کے نشان دیکھ کر جادوگر سجدے میں گر پڑے اور بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام کا ساتھ دینا شروع کر دیا بلکہ قبطیوں کا میلان بھی ان کی طرف ہونے لگا تو فرعونی لیڈر گھبرائے اور فرعون کو یہ کہہ کر تشدد پر آمادہ کرنے لگے کہ موسیٰ اور اس کی قوم بنی اسرائیل کو یہ موقعہ نہ دیا جائے کہ وہ آزاد رہ کر ادھم مچاتے پھریں اور عام لوگوں کو اپنی طرف مائل کر کے حکومت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیں اور آئندہ تیری، اور تیرے تجویز کیے ہوئے معبودوں کی پرستش ملک سے موقوف کرا دیں فرعون اپنے آپ کو ربِ اعلیٰ کہتا تھا غالباً اسی اعلیٰ کو نباہنے کے لیے کچھ ادنیٰ پروردگار بھی تجویز

کیسے ہوں گے ان کو یہاں الھتک کہا۔ بعض نے کہا کہ وہ گائے وغیرہ کی مجسم تصویریں تھیں۔ بعض نے سورج اور ستارے مراد لیے ہیں۔ بعض کے نزدیک خود فرعون نے اپنی تصویر کے مجسمے پرستش کے لیے تقسیم کر دیے تھے۔ کچھ بھی بڑا معبود اپنے ہی کو کہلاتا تھا اور ما علمت لکم من الٰہ غیری کہہ کر خدا کے وجود کی نفی کرتا تھا۔[1] مصری مختلف دیوتاؤں کی پوجا کرتے تھے۔ بڑا دیوتا سورج تھا جسے "رع" کہتے تھے اور چونکہ بادشاہ کو اس کا اوتار سمجھتے تھے اس لیے اس کا لقب فارع تھا۔ یہی فارع عبرانی میں فاراعو اور عربی میں فرعون ہو گیا۔[2]

شارحینِ قرآن نے الھتک کو دو طرح سے پیش کیا ہے ایک یہ کہ الٰہ کی جمع الھۃ ہے۔ دوسرے یہ کہ الاہت ہے۔ پہلی صورت میں معنے معبودوں کے ہیں اور دوسری صورت میں معنے عبادت کے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ لفظ الھۃ ہی ہے اور الٰہ کی جمع ہے اور معبودوں ہی کے معنے میں ہے۔ اعیانِ حکومت فرعون سے یہ کہہ رہے ہیں کہ اب موسیٰ اور ان کی قوم کو زیادہ مہلت دینے کے ملکی حالات سازگار نہیں ہیں اگر ان کو مزید موقعہ دیا گیا تو ایک طرف ملک میں شورش برپا کریں گے اور دوسری طرف آپ کو اور آپ کے معبودوں کو چھوڑ دیں گے۔ کچھ لوگوں نے یہاں الٰھہ کو الٰہ کی جمع مان کر حاکم کے معنے میں لیا ہے اور مطلب یہ بتایا ہے کہ وہ آپ کو اور آپ کے حاکموں کو چھوڑ دیں گے اور متوازی حکومت قائم کر لیں گے۔

فرعون کی سفاکانہ تجویز

۱۵۱- فرعون نے کہا کہ ہم ان کے لڑکوں کو قتل کر دیں گے اور ان کی عورتوں کو زندہ رہنے دیں گے اور وہ تو ہماری طاقت سے دبے ہوئے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے بھی فرعون نے بنی اسرائیل پر ظلم کر رکھا تھا کہ لڑکوں کو قتل کر دیتا۔ اس خوف سے کہ کہیں یہ وہی اسرائیلی نہ ہو جس کے ہاتھ پر اس کی سلطنت کے زوال کی خبر منجمین نے دی تھی اور لڑکیوں کو خدمت وغیرہ کے لیے رکھ لیتا۔ اب موسیٰ علیہ السلام کا اثر دیکھ کر اندیشہ ہوا کہ کہیں اس کی تربیت و اعانت سے بنی اسرائیل زور نہ پکڑ جائیں اس لیے انہیں خوفزدہ اور عاجز کرنے کے لیے اپنی زور و قوت کے نشہ میں پھر اسی پرانی اسکیم پر عمل کرانے کی ٹھہرائی۔ بنی اسرائیل اس سفاکانہ تجویز کو سن کر طبعی طور پر پریشان ہوئے اور

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] ترجمان القرآن

متقین کے لیے ہے[1]

فرعون کی یہ بات سنتے ہی بلاشبہ بنی اسرائیل کے ہوش اُڑ گئے ہوں گے اس کے کہنے کا انداز بھی بڑا ہی مکروہ تھا۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ فرعون نے جب اعیانِ حکومت سے کہا سنقتل ابناءھم و نستحی نساءھم و انا فوقھم قاھرون ۔ تو بنی اسرائیل نے اس سے مستقبل میں حالات کی سنگینی کی بُو سونگھ لی۔ اور حالات کے آئینے میں وہ مستقبل کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ ماضی میں فرعون کے جبر و استبداد نے بنی اسرائیل کی ہمتیں سلب کر دی تھیں۔ اب اس نئے ظالمانہ قانون نے ان کو مستقبل کے بارے میں بالکل مایوس کر دیا۔ ان ہی پیش پا افتادہ حالات کے تحت حضرت موسیٰ نے ان سے کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں مستقبل کو مشکوک نگاہوں سے نہ دیکھو۔ اللہ نے جو منصب تم کو عطا کیا ہے وہ بہت عظیم ہے۔ یہ منصبِ امامت ہے۔ حضرت موسیٰ نے اس منصب کے مناسب تمام دوسری باتوں سے بنی اسرائیل کو جس بات پر متنبہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ یہ کوئی پھولوں کا بستر نہیں ہے جس پر آپ حضرات کو لٹایا جا رہا ہے۔ یہ تو ایک عظیم الشان اور پُر خطر خدمت ہے جس کا بار اُٹھانے کے ساتھ ہی تم پر ہر قسم کے مصائب کی بارش ہوگی۔ سخت آزمائشوں میں ڈالے جاؤ گے۔ طرح طرح کے نقصانات اٹھانے پڑیں گے اور جب صبر و ثبات اور عزم و استقلال کے ساتھ ان تمام مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے خدا کی راہ میں آگے بڑھتے جاؤ گے تب تم پر عنایات کی بارش ہوگی۔ اس بھاری خدمت کا بوجھ اٹھانے کے لیے جس طاقت کی ضرورت ہے وہ تمہیں دو چیزوں سے حاصل ہوگی ایک یہ استعانت باللہ سے اپنے آپ کو مضبوط کرو۔ یعنی اللہ سے عابدانہ تعلقات پیدا کرو۔ اس سے مراد نماز ہے کیونکہ نماز ہی نبوت کے مشن میں اللہ سے استعانت کا اوّلین نشانِ کار ہے۔ دوسرے یہ کہ صبر کی صفت اپنے اندر پیدا کرو۔ یہ دونوں وہ کلیدِ کامیابی ہیں جس کے بغیر کوئی شخص کسی مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ نبوت کی زندگی میں ایمان باللہ ایمان بالیوم اور ایمان بالرسالۃ کے بعد سب سے اہم چیز استعانت باللہ اور استعانت بالصبر ہے۔

استعانت باللہ

استعانت باللہ کا مقصود اللہ سبحانہ سے پرستش کے تعلقات کو استوار کرنا ہے۔ اس سے مراد

---

[1] افادات شیخ الاسلام

دہشت زدہ ہوتے ہوں گے اس کا علاج موسیٰ علیہ السلام نے آئندہ آیت میں بتایا[1] گویا فرعون نے ان کو اطمینان دلایا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے وہ ہمارے پنجہ اقتدار میں پوری طرح کسے ہوئے ہیں۔ ہماری گرفت سے باہر نہیں ہیں۔ ہم ان کی اجتماعی اور دفاعی قوت کو ختم کرنے کی تدبیر جانتے ہیں ہم ان کے لڑکوں کو قتل کر دیں گے ان کی لڑکیوں کو زندہ رکھیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارا ان پر پورا قابو ہے۔

سورہ بقرہ میں لڑکوں کے قتل اور لڑکیوں کے زندہ رکھنے کی فرعون کی سفاکانہ تجویز کا ذکر ہو چکا ہے۔ اب یہاں پھر اسی تجویز کا ذکر ہو رہا ہے۔ دراصل حضرت موسیٰ کے دو دوروں کا ذکر ہے ایک دور فرعونی استبداد کا حضرت موسیٰ کی تشریف آوری سے پہلے ہے اور دوسرا دور حضرت موسیٰ کی تشریف آوری کے بعد ہے۔ پہلا دور رعمسیس ثانی کا ہے اور دوسرا دور اس کے بیٹے منفتاح کا ہے۔ دونوں میں یہ بات مشترک ہے کہ لڑکوں کو قتل کرو اور لڑکیوں کو زندہ رکھو۔ یہ اسکیم اس لیے اختیار کی گئی کہ بنی اسرائیل کی تعداد ملک میں اتنی زیادہ نہ ہو جائے کہ وہ فرعونی اقتدار کے لیے خطرہ بن جائے اور تاکہ بتدریج ان کی نسل کا خاتمہ ہو جائے اور یہ قوم دوسری قوموں میں گم ہو کر رہ جائے۔ فرعون یہاں بتانا چاہتا ہے کہ اطمینان رکھو کہ ہم ان کو کسی صورت میں اپنے لیے خطرہ نہیں بننے دیں گے ضرورت محسوس ہوئی تو ہم اس سکیم کو پوری شدت سے چلائیں گے۔ سید رشید رضا نے اس کتبہ کا حوالہ دیا ہے جس میں بھی حضرت موسیٰ کے زمانہ کا فرعون جس کا نام منفتاح ہے اپنے کارناموں کا ذکر کرنے کے بعد لکھتا ہے و انفك الاسرائیلیون فلا بذر لهم، اور بنی اسرائیل مٹ گئے ان کا بیج تک نہیں رہا۔

اہلِ ایمان کے لیے فلاحِ دُنیا کی لازمی شرط

۱۵۲۔ حضرت موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ سے مدد مانگو اور ڈٹے رہو بلاشبہ زمین کا مالک اللہ ہے اور اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے اور انجام ان ہی کے لیے ہے جو متقی ہیں۔ یعنی گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے اللہ کے سامنے کسی کا ذرہ نہیں چلتا ملک اسی کا ہے جس کو مناسب جانے عطا فرمائے لہٰذا ظالم کے مقابلے میں اسی سے مدد مانگو اسی پر نظر رکھو اسی سے ڈرو صبر و تقویٰ کی راہ اختیار کرو اور یقین رکھو کہ آخری کامیابی صرف

[1] افادات شیخ الاسلام

دُعا و نماز ہے۔ گیارہویں پارے میں اقیموا الصلوٰۃ کی تصریح آئی ہے۔ صلاۃ کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے حضور اپنی غلامانہ اور خادمانہ حیثیت کو ظاہر کیا جاتے بالفاظِ دیگر صلوٰۃ نام ہے اللہ کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو جانے کا۔ خود حضرت موسیٰ کو کوہ طور پر بتایا گیا تھا کہ اقیم الصلاۃ لذکری۔ اور یہی بات بنی اسرائیل سے کہی گئی تھی۔

والذین یمسکون بالکتاب واقاموا الصلوٰۃ انا لانضیع اجر المصلحین۔

اور بنی اسرائیل میں سے جو لوگ کتاب اللہ کو مضبوط پکڑے ہوتے ہیں اور نماز میں سرگرم ہیں تو ان کے لیے کوئی کھٹکا نہیں ہم کبھی مصلحین کا اجر ضائع نہیں کرتے۔

اور نماز ہی کے بارے میں یہ بات بھی بنی اسرائیل سے کہی گئی تھی۔

لئن اقمتم الصلاۃ و اتیتم الزکوٰۃ و امنتم برسلی وعزرتموھم واقرضتم اللہ قرضا حسنا لاکفرن عنکم سیاتکم ولادخلنکم جنات تجری من تحتھا الانھار۔

اگر تم نے نماز قائم رکھی اور زکوٰۃ دی اور میرے رسولوں کو مانا اور ان کی مدد کی اور اپنے خدا کو اچھا قرض دیتے رہے تو یقین رکھو میں تمہاری برائیاں تمہارے سے دُور کر دوں گا۔

قرآن میں اس آیت استعینوا باللہ واصبروا کو اس آیت کے ساتھ پڑھیے۔ واستعینوا بالصبر والصلاۃ، دونوں ہی حکم بنی اسرائیل کو دیے گئے ہیں۔ دونوں کو ملا کر پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں ایک ہی بات کہی گئی ہے۔ صرف الفاظ کا فرق ہے اور فرق یہ ہے کہ پہلی آیت میں جس جگہ اللہ کا لفظ ہے دوسری آیت میں صلوٰۃ کا لفظ ہے۔ جو لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ قرآن محض الفاظ اور اسالیب کے ہلکے سے تغیر کے ذریعے بڑے بڑے اہم نکات حکمت بیان کر جاتا ہے وہ لفظوں کے اس اختلاف کو بلا وجہ قرار نہیں دے سکتے۔ وہ محسوس کریں گے کہ اس اختلاف میں حکمت صرف یہ ہے کہ نماز اللہ کی قربت اور معیت کا نام ہے اور یہی اللہ سے استعانت کا ذریعہ ہے۔ یہ آیت بتلاتی ہے کہ ان آلام و مصائب کا مقابلہ جن سے خدا پرستی اور طاعت و اشاعتِ حق کے دلدادوں کا دوچار ہونا سنتِ الٰہی کے مطابق بہرحال ضروری ہے۔ صرف صبر اور نماز سے کیا جا سکتا ہے۔ صبر دراصل کوئی مستقل بالذات چیز نہیں بلکہ دراصل وہ نماز ہی کا فیضان ہے اس لیے عملاً استقامت علی الحق کا دارومدار صرف نماز پر آن ٹھہرتا ہے۔

یہ طاقت نماز میں کہاں سے اور کیوں کر آتی ہے؟ اس کا جواب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ جب نماز اللہ کی معیت کا نام ہے تو ظاہر ہے کہ جس کے ساتھ اللہ ہو اسے زیر کرنے کی راہ افکار و مصائب کیسے پا سکتے ہیں۔ اللہ کی معیت کے تو معنے ہی یہ ہیں کہ دل سکون و طمانیت سے مالامال ہو اور خوف و حزن کا دور تک نام و نشان نہ ہو۔ اس لیے استعانت باللہ دراصل استعانت بالصلوٰۃ ہی ہے۔ حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کو استعانت باللہ کے پیچھے دوسری بات جس کی تلقین کی وہ صبر ہے۔ صبر کے معنے لغت میں تین آتے ہیں۔ رکنا، ڈٹنا اور سہنا۔ رکنا یہ کہ نبوت جو نظام لے کر آئی ہے اپنی پوری زندگی میں اس کی خلاف ورزی سے رک کر رہے، محرمات سے رکے اور ان تمام احوال، اقوال اور افعال سے رکے جو نبوت کے مشن سے دور لے جاتے ہوں۔ اور ڈٹنا یہ کہ نبوت نے جو فرائض، واجبات، عبادات اور شعائر کا نقشہ پیش کیا ہے ان پر پوری زندگی کاربند رہے۔ اور سہنا یہ کہ نبوت کے نظام کو اپنانے، اسے پیش کرنے اور قائم کرنے کی راہ میں جو تکالیف اور مصائب آئیں ان کو خندہ پیشانی سے برداشت کرے۔ جیسے یہاں جب حضرت موسیٰ کے ساتھی حضرت موسیٰ پر ایمان لاتے اور فرعونی اقتدار نے ان پر عرصہ حیات تنگ کیا تو حضرت موسیٰ نے ان سے فرمایا استعینوا باللہ واصبروا۔ حتیٰ کہ جب فرعونی مظالم کے آہنی پنجہ سے انہیں نجات ملتی ہے تو وہ بھی اسی صبر کے طفیل ملتی ہے ارشاد ہے:

وتمت کلمۃ ربک الحسنی علی بنی اسرائیل بما صبروا

صبر و استقامت کی ان سعادت بخشیوں کو صرف اسی دنیا کی زندگی تک محدود نہیں رکھا گیا۔ بلکہ آخرت کی حقیقی زندگی اور ابدی زندگی میں بھی خوش بخت وہی ہوں گے جو اپنے سابقہ صبر کا توشہ لے کر حاضر ہوتے ہوں۔ چنانچہ حق تعالیٰ نیکوکاروں کو اپنی مغفرت اور رحمت کا انعام عطا کرتے ہوتے فرماتے گا۔

انی جزیتہم الیوم بما صبروا

اور اس بخشش اور بنائے بخشش کا اعلان کچھ اسی دن یکایک نہیں ہوگا بلکہ اس کی اطلاع ہمیں یہاں دی جا چکی ہے اولئک یجزون الغرفۃ بما صبروا۔

نبوت کے لائے ہوتے نظام حیات میں صبر کو یہ غیر معمولی اہمیت کیوں حاصل ہے۔ آئیے اسے سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ استعانت باللہ تو ایک مثبت حقیقت ہے۔ اس کی ایمانی نوعیت اس کی غیر معمولی عظمت کی دلیل ہے۔ لیکن صبر کچھ کرنے یا ہونے کا نام نہیں بلکہ کچھ نہ ہونے

یا نہ کرنے کا نام ہے اس کے باوجود اس کی بھی منفی حقیقت اپنے اندر ایک شان امتیاز بھی رکھتی ہے جو کسی اور میں نہیں پائی جاتی۔ استعانت باللہ ایسی چیز ہے جس میں غلط بیانی اور فریب کاری سے کام لیا جا سکتا ہے مگر صبر کے اندر اس کا کوئی امکان نہیں ہے۔ استعانت اور اس کے مظاہر نماز، دعا وغیرہ بناتے حق تو ضرور ہیں مگر ان کا اظہار نمائشی اور ریاکارانہ بھی ہو سکتا ہے مگر صبر کا مظاہرہ نمائشی نہیں ہو سکتا۔ پھر صرف اتنی بات نہیں کہ صبر کا کھوٹا سکہ چلایا نہیں جا سکتا بلکہ استعانت باللہ کا کھرا پن بھی اس سے معلوم ہوتا ہے۔

صبر کے مقامات

یوں تو دنیا کا کوئی کام اور مقصد نہیں جو بغیر کسی جدوجہد کے محض زبانی دعووں سے پورا ہو جاتے مگر وہ مقصد جو اپنی عظمت میں آپ اپنی نظیر ہو اس کے لیے سعی و جہد کی کوئی معمولی مقدار کافی نہیں ہے۔ اللہ پر ایمان، اس کی بندگی، اس کے دین کی پیروی اور پھر اسے دنیا میں بپا کرنے کا مقصد وہ مقصد ہے جس کے لیے بڑی ہی پختہ عزیمت کی ضرورت ہے۔ حضرت موسیٰ فرعون کے مقابلہ میں یہی مقصد لے کر آئے ہیں۔ اس کی راہ میں مشکلات، مصائب اور رکاوٹوں کا ہونا یقینی ہے حضرت موسیٰ نے اسی کی طرف یہاں استعینوا باللہ واصبروا فرما کر اجمالی اشارہ کیا ہے اور دوسرے موقعہ پر حضرت موسیٰ نے یہی بات کھول کر سمجھائی ہے۔

ان کنتم امنتم باللہ فعلیہ توکلوا ان کنتم مسلمین

اگر تم فی الواقع فرعون کے مقابلہ میں اللہ پر ایمان لے آتے اور اس کی فرمانبرداری کرنا چاہتے ہو تو فرعون کی طاقت سے نہ ڈرو اللہ پر بھروسہ کرو۔

اس راہ میں عوام فریب، پروپیگنڈا، طنز و افترا، جان و مال کا نقصان اور محبوب رجحانات کی قربانی سے سب کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔ تمھیں بھی اس میدان سے گزرنا ہوگا۔ جو مقصد حضرت موسیٰ لے کر آئے ہیں وہ اتنا عظیم ہے جس کی راہ میں دور دور تک بھاری چٹانوں، گہرے غاروں، سنگلاخ وادیوں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ کسی اور چیز کا نام لیجیے ایک طرف سے مخالفت کی ہمت شکن صدا بلند ہوگی تو تین طرف سے حوصلہ افزائی کی آوازیں بھی آئیں گی۔ مگر استبداد کے مقابلہ میں نبوت کے علم و عمل اور اس کے نظام حیات کا نام لیجیے تو دیکھ لیجیے ہر طرف سے مشکلوں اور مخالفتوں کا طوفان آپ کا استقبال کرے گا۔ کہیں نفس کی لذت کہیں

شہرت کی ہوس، کہیں خاندان کی حمایت، کہیں قوم کی عقیدت اور کہیں وطن کی محبت آپ کے راستہ میں سنگ گراں بن کر آجاتے گی۔ وطن کی زمین آپ کے لیے تنگ ہو جاتے گی۔ قوم غداری کے القاب سے آپ کو نوازے گی۔ ملت طعنوں اور افترا پردازیوں سے آپ کا استقبال کرے گی خاندان آپ کو برداشت کرنے سے انکار کردے گا۔ یہی حالات فرعون کے استبداد میں بنی اسرائیل کو یہ تلقین کر رہے ہیں استعینوا باللہ واصبروا۔ مطلب یہ ہے فرعون کی اس دھمکی سنقتل ابناء ھم سے پریشان نہ ہو۔ اللہ سے عابدانہ تعلقات کو استوار کرو اور صبر کا دامن ہاتھ سے نہ دو۔ فتنوں اور آزمائشوں کی منزل صبر واستقامت ہی سے سر ہوتی ہے۔ یہ کام اللہ کی مدد کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

بنی اسرائیل کی شکایت

۱۵۳۔ انہوں نے کہا تمہارے آنے سے پہلے بھی ہمیں ستایا گیا ہے اور اب تمہارے آنے کے بعد ہمیں ستایا جا رہا ہے۔ یعنی ہم تو ہمیشہ مصیبت میں رہے۔ تمہاری تشریف آوری سے قبل ہم سے ذلیل بیگار لی جاتی تھی اور ہمارے لڑکے قتل کیے جاتے تھے۔ تمہارے آنے کے بعد طرح طرح کی سختیاں کی جا رہی ہیں اور قتل ابناء کے مشورے ہو رہے ہیں۔ دیکھئے ہماری مصیبتوں کا کب خاتمہ ہو۔[1]

محکومانہ زندگی کا پہلا اثر یہ ہوتا ہے کہ عزم وہمت کی روح پژمردہ ہو جاتی ہے۔ لوگ غلامی کی ذلت آمیز امن پر قانع ہو جاتے ہیں اور طلب وسعی کی مشکلوں سے جی چرانے لگتے ہیں۔ یہی حال بنی اسرائیل کا ہوا تھا۔ عرصہ تک مصریوں کی غلامی میں رہتے رہتے اس درجہ مسخ ہو گئے تھے کہ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا، آزادی وکامرانی کی طلب میں ان حقیر راحتوں سے کیوں ہاتھ دھو بیٹھیں جو غلامی کی حالت میں میسر آ رہی ہیں۔ حضرت موسیٰ نے جب صبر واستقامت کی تلقین کی تو شکر گزار ہونے کی جگہ الٹی شکایت کرنے لگے وہ ان کی نجات اور کامرانی کے لیے فرعون کا مقابلہ کر رہے تھے۔ انہیں شکایت تھی کہ تمہاری اس جدّ وجہد نے فرعون کو اور زیادہ ہمارا مخالف بنا دیا۔ تم فائدہ پہنچانے کی جگہ الٹے وبال جان ہو گئے۔[2] مطلب یہ ہے کہ جب حالات و واقعات

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] ترجمان القرآن

یہ ہیں جو پیش پیش کر رہے ہیں تو تمہارے ان وعدوں اور تمہاری ان طفل تسلیوں پر وقت کون گزار سکتا ہے تم تو ہمارے لیے رحمت کے بجائے زحمت ہی زحمت بنتے جا رہے ہو۔ تورات میں اس دور بنی اسرائیل کے مصائب کا جو نقشہ پیش کیا گیا ہے وہ بھی گوش گزار فرما لیجئے۔

اسی دن فرعون نے بیگار لینے والوں اور سرداروں کو جو لوگوں پر تھے حکم دیا کہ اب آئندہ ان لوگوں کو اینٹیں بنانے کے لیے بھس نہ دینا جیسے اب تک دیتے رہے ہو وہ خود ہی اپنے لیے بھس مہیا کریں۔ اور ان سے اتنی ہی اینٹیں بنوانا جتنی وہ اب تک بناتے آتے ہیں۔ تم اس میں سے کچھ نہ گھٹانا کیونکہ وہ کاہل ہو گئے ہیں۔ اس لیے چلا چلا کر کہتے ہیں کہ ہم کو جانے دو کہ ہم اپنے خدا کے لیے قربانی کریں۔ لہٰذا ان سے زیادہ سخت محنت لی جائے تاکہ کام میں مشغول رہیں اور جھوٹی باتوں سے دل نہ لگائیں۔ تب بیگار لینے والوں اور سرداروں نے جو لوگوں پر تھے جا کر ان سے کہا کہ فرعون کہتا ہے میں تم کو بھس نہیں دوں گا۔ تم خود ہی جا کر اور جہاں کہیں بھس ملے وہاں سے لاؤ کیونکہ تمہارا کام کچھ بھی گھٹایا نہیں جائے گا۔ چنانچہ وہ تمام لوگ ملک مصر میں مارے مارے پھرنے لگے کہ بھس کے عوض کھونٹی جمع کریں۔ اور بیگار لینے والے یہ کہہ کر جلدی کراتے تھے کہ تم اپنا روز کا کام جیسے بھس لے کر کرتے تھے اب بھی کرو۔

(خروج فصل پنجم)

اس طرح عذاب کی وہ سنگینی جو پہلے ہی زیادہ تھی حضرت موسیٰ کی تشریف آوری کے بعد اس میں اور اضافہ ہو گیا۔

حکومت کے حصول کا طریق

۱۵۴- زمین اللہ کی ہے اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے وارث بناتا ہے اور آخری کامیابی ان کے لیے جو متقی ہیں۔ حضرت موسیٰ نے فرمایا خدا جسے چاہتا ہے زمین کا وارث بنا دیتا ہے۔ بس اس سے مدد مانگو اور اسی راہ میں جمے رہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو جماعت دنیوی بے سروسامانی سے ہراساں ہو کر بے ہمت نہیں ہوتی بلکہ خدا کی مدد پر بھروسہ کرتی اور مشکلات و موانع کے مقابلے میں جمی رہتی ہے وہی ملک کی وارثت کی مستحق ہوتی ہے یعنی استعانت باللہ اور صبر اس راہ میں اصل اصول ہے۔

یہ فرعون کے اس غرور کا جواب ہے جو اس نے انا فوقھم قاھرون کے الفاظ سے ظاہر کر رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے منہ سے اپنے متعلق جو چاہے کرسی کے مضبوط ہونے کا دعویٰ کرے لیکن اقتدار کا اصل مالک تو اللہ ہے وہی اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے۔ آخر میں فرمایا والعاقبۃ للمتقین یعنی جو جماعت برائیوں سے بچنے والی اور عمل میں پکی ہوگی بالآخر کامیابی اسی کے لیے ہے۔ جو برائیوں سے بچتا ہے یعنی خدا کا مقررہ قانون یہ ہے کہ زمین کے وارث متقی ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جماعتوں اور قوموں کے لیے یہ قانون الٰہی ہے کہ ان ہی لوگوں کے حصہ میں ملک کی فرماں روائی آتی ہے جو متقی ہوتے ہیں۔ متقی وقایہ سے بنا ہے وقایہ کے معنے بچنے کے ہیں متقی وہ لوگ ہیں جو برائیوں سے بچتے ہوں۔ ان کے دامن پر فساد کے داغ نہ ہوں خود سنورے ہوئے ہوں اور دوسروں کو سنوارنے کا جذبہ رکھتے ہوں لہٰذا قانون یہ ہوا کہ زمین کی وراثت برائیوں سے بچنے والوں کی وراثت میں آتی ہے ان کی وراثت میں نہیں آتی جو فکر و عمل کی برائیوں میں مبتلا ہوں اور سنوارنے کی جگہ بگاڑنے والے ہوں۔

قرآن نے زمین کی وراثت کی ترکیب جا بجا استعمال کی ہے۔ یہ ترکیب صورت حال کی کتنی سچی اور قطعی تعبیر ہے۔ حکومتوں میں ایک طرح کی بدلتی ہوئی میراث کا سلسلہ برابر جاری ہے یعنی ایک فرد ایک گروہ طاقت و اقتدار حاصل کرتا ہے پھر وہ چلا جاتا ہے اور دوسرا گروہ اس کی ساری چیزوں، اس کی حکومت کا وارث ہو جاتا ہے۔ حکومتیں کیا ہیں؟ محض ایک ورثہ ہیں جو ایک گروہ سے نکلتا ہے اور دوسرے کے حصہ میں آجاتا ہے۔ اگر کوئی ملک سامنے رکھو اور جس وقت سے اس کی تاریخ روشنی میں آئی ہے اس کے حالات کی جستجو کرو اس کی پوری تاریخ اس حقیقت کے سوا کچھ نہیں کہ وارث و میراث کی ایک مسلسل داستان ہے۔ ایک قوم قابض ہوئی پھر مٹ گئی۔ دوسری اس کی وارث ہوگئی پھر وہ بھی مٹی، تیسری وارث ہو گئی، سلسلہ جاری رہتا ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ زمین کی وراثت تمہیں ملے گی بشرطیکہ تم متقی ہو۔ اس کے قانون کو نافذ کرو۔ صورت حال وہ نہیں ہے جو تمہارے اور فرعون کے خیال میں ہے کہ طاقتور طاقتور ہی رہے گا اور کمزور کمزور۔

حضرت موسیٰ کی بنی اسرائیل کو تسلی

۱۵۵- موسیٰ نے کہا قریب ہے کہ تمہارا پروردگار تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور ملک

تمہیں اس کا جانشین بنا دے پھر وہ دیکھے کہ تمہارے کام کیسے ہیں۔ حضرت موسیٰ نے تسلی دی کہ زیادہ مت گھبراؤ خدا کی مدد قریب آگئی ہے تم دیکھ لو گے کہ تمہارا دشمن ہلاک کر دیا جاتے گا اور تمہیں ان کے اموال و املاک کا مالک بنا دیا جاتے گا تاکہ جس طرح آج سختی و غلامی میں تمہارا امتحان ہو رہا ہے اس وقت خوشحالی اور آزادی دے کر آزمایا جاتے کہ کہاں تک اس کی نعمتوں کی قدر اور احسانات کی شکر گزاری کرتے ہو۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ یہ کلام مسلمانوں کے سنانے کو فرمایا ہے یہ سورت مکی ہے اس وقت مسلمان بھی ایسے ہی مظلوم تھے۔ گفتہ آید در حدیث دیگراں کے رنگ میں یہ بشارت ان کو سنائی گئی ہے[1]

اس آیت میں حضرت موسیٰ کی تین باتیں اللہ سبحانہٗ نے نقل فرمائی ہیں۔ اول یہ کہ عسیٰ ربکم ان یہلک عدوکم اللہ سبحانہٗ تمہارے دشمن کو ہلاک کرے گا۔ بنی اسرائیل نے پیش پا افتادہ حالات کے تحت جس مایوسی اور بے دلی کو ظاہر کیا تھا اسے دور کرنے کے لیے حضرت موسیٰ نے ان کو پھر تسلی دی کہ مایوسی اور دل برداشتہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اللہ تمہارے دشمنوں کو ضرور ہلاک کرے گا۔ آیت میں دشمن کی ہلاکت کو توقع سے پیش کیا ہے یعنی یہ فرمایا ہے کہ توقع اور امید ہے کہ تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے۔ یہ نہیں فرمایا کہ یقیناً تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے گا۔ یعنی عربی میں انداز تعبیر عسیٰ ربکم الخ اختیار فرمایا یہ نہیں فرمایا ان ربکم یہلک عدوکم اس کی دو وجہ ہیں۔ ایک یہ کہ یہ انداز اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ بے عملی کا شکار نہ ہو جائیں اور اس راہ میں جس قدر محنت و ریاضت کی ضرورت ہے وعدہ پر اترا کر کے اس سے غافل نہ ہو جائیں۔ دوسرے اس لیے کہ مدتوں کی غلامی میں رہ کر مستقبل کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ اور فرعون کی قوت و عظمت سے حد درجہ مرعوب ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ حتمی وعدے کو سن کر حالات کے تحت تکذیب کر دیں۔ تورات سے بھی اس وعدے کی تائید ہوتی ہے۔

تب موسیٰ خداوند کے پاس گیا اور کہا اے خداوند تو نے ان لوگوں کو کیوں دکھ میں ڈالا اور مجھے کیوں بھیجا۔ کیونکہ جب سے فرعون کے پاس میں تیرے نام کی باتیں کرنے گیا اس نے ان لوگوں سے برائی ہی برائی کی اور تو نے اپنے لوگوں کو ذرا بھی رہائی نہ بخشی۔

[1] افادات شیخ الاسلام

تورات خروج کے باب ششم کے آغاز میں ہے:
تب خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ اب تو دیکھے گا کہ میں فرعون کے ساتھ کیا کرتا ہوں۔ تب وہ زور آور ہاتھ کے سبب سے ان کو جانے دے گا اور زور آور ہاتھ کے سبب ہی سے وہ ان کو اپنے ملک سے نکال دے گا۔ پھر خدا نے موسیٰ سے کہا میں خداوند ہوں۔ اور میں ابراہام و اسحاق و یعقوب کو خدائے قادرِ مطلق کے طور پر دکھائی دیا لیکن اپنے یہوواہ نام سے ان پر ظاہر نہ ہوا۔ اور میں نے ان کے ساتھ اپنا عہد بھی باندھا ہے کہ ملک کنعان جو ان کی مسافرت کا ملک تھا اور جس میں وہ پردیسی تھے ان کو دوں گا اور میں نے بنی اسرائیل کے کراہنے کو بھی سن کر جن کو مصریوں نے غلامی میں رکھ چھوڑا ہے اپنے اس عہد کو یاد کیا ہے سو تو بنی اسرائیل کو کہہ کہ میں خداوند ہوں اور میں تم کو مصریوں کے بوجھ کے نیچے سے نکال لوں گا اور میں تم کو ان کی غلامی سے آزاد کروں گا اور میں ہاتھ بڑھا کر اور ان کو بڑی بڑی سزائیں دے کر تم کو رہائی دوں گا اور میں تم کو لے لوں گا۔ میری قوم بن جاؤ اور میں تمہارا خدا ہوں گا اور تم جان لوگے کہ میں تمہارا خداوند خدا ہوں۔ جو تم کو مصریوں کے بوجھوں کے تلے سے نکالتا ہوں اور جس ملک کو ابراہام اسحاق اور یعقوب کو دینے کی قسم کھائی تھی۔ اس میں تم کو پہنچا کر اسے تمہاری میراث دوں گا۔ خداوند میں ہوں۔ (خروج باب ششم)

دوسری بات حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل سے یہ فرمائی ویستخلفکم فی الارض ملک میں اللہ تم کو حکومت عطا فرمائے گا۔ یہاں ملک سے سرزمینِ مصر نہیں بلکہ سرزمینِ کنعان (فلسطین) مراد ہے۔ فرعون کی سلطنت کی جغرافیائی حدود شام سے لے کر لیبیا تک اور بحرِ روم کے سواحل سے لے کر حبشہ تک پھیلی ہوتی تھیں۔ حضرت موسیٰ کی مہم یہ تھی کہ شام و فلسطین کو فرعون کے جبر و استبداد سے آزاد کرایا جائے۔ یہاں اس آیت میں فلسطین و کنعان ہی کی حکومت مراد ہے جیسا کہ اس پر انشاء اللہ تبصرہ آنے والے رکوع میں کریں گے۔ قرآن کی اس آیت سے ایک عظیم حقیقت کا انکشاف ہو رہا ہے اور وہ یہ کہ انبیاء علیہم السلام جس مشن پر مامور ہوتے تھے وہ اپنی آخری عملی صورت کے لحاظ سے ایک دینی اور اسلامی ریاست کا قیام ہی ہوتا تھا کیونکہ اقتدار کے بغیر اسلام اسلام نہیں رہ جاتا اور اللہ کے دین پر پورا عمل نہیں ہو سکتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ انبیاء میں سے بہتوں کے ساتھ حالات نے سازگاری نہ کی ہو۔ اور اس لیے ان کی دعوتی جدوجہد کے نتائج اس حدِ کمال کو نہ پہنچ سکے ہوں۔ لیکن ظاہر ہے کہ

کسی دعوت کا اس کے حدِ کمال تک نہ پہنچنا اور بات ہے اور اس چیز کا حدِ کمال نہ ہونا بالکل دوسری بات ہے۔ انبیائی دعوتوں کی جو تاریخ ہمارے سامنے موجود ہے اس میں اس بات کا تذکرہ تو ضرور ملتا ہے کہ ان میں سے اکثر اپنا سیاسی نظام قائم نہ کر سکے مگر اس بات کا ثبوت نہیں ملتا کہ وہ ایسا چاہتے بھی نہ تھے۔ بلاشبہ ہر نبی کی دعوت کا اساسی کلمہ لا الٰہ الا اللہ ہی تھا لا حاکم الا اللہ نہیں تھا مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ لا الٰہ الا اللہ کے مفہوم میں لاحاکم الا اللہ بھی شامل ہے۔ اور الوہیت کا ایک جزو حاکمیت بھی ہے یعنی یہ بات کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں، یہ معنے بھی رکھتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی حاکم نہیں۔ الٰہ کو صرف حاکم سمجھنا ضرور غلط ہے مگر اس سے زیادہ غلط بات یہ ہے کہ الٰہ کے اصل مفہوم میں حاکمیت کا تصور بھی نہ مانا جاتے۔

مشہور مترجم قرآن شاہ عبدالقادر نے الٰہ کے معنے میں دونوں کی رعایت کی ہے انہوں نے مالکم من الٰہ غیرہ کا ترجمہ سورہ اعراف میں صاحب سے اور سورہ ہود میں اگر حاکم سے کیا تو قصہ ابراہیم میں ءانت فعلت ھذا بالھتنا یا ابراھیم میں الٰہ کے معنے ٹھاکر کے کیے ہیں۔ بہرحال اس آیت سے معلوم ہو رہا ہے کہ حضرت موسیٰ جس مشن پہ مامور ہو کر آئے تھے اس کی آخری عملی شکل ایک اسلامی ریاست کا قیام تھا۔

تیسری بات یہ فرمائی ینظر کیف تعملون اس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو عروج و ترقی عطا فرماتا ہے تو صرف یہ دیکھنے کے لیے دیتا ہے کہ اقتدار کی وراثت پاکر یہ قوم کیا رویہ اختیار کرتی ہے۔ فساد برپا کرتی ہے یا ملک میں صلاح کی راہ اختیار کرتی ہے یہ حکومت پرچہ امتحان ہوتا ہے اس کے ذریعے اعمال کی جانچ کی جاتی ہے۔

وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ
لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿١٣٠﴾ فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ
تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ ۗ اَلَآ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ
عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٣١﴾ وَقَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا
بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا ۙ فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٣٢﴾ فَاَرْسَلْنَا
عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ
مُّفَصَّلٰتٍ ۫ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿١٣٣﴾ وَلَمَّا وَقَعَ
عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ لَئِنْ
كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيْٓ
اِسْرَآءِيْلَ ۚ ﴿١٣٤﴾ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰٓى اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ
اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ ﴿١٣٥﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِى الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ
كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿١٣٦﴾

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے فرعونیوں کو خشک سالی کے برسوں اور پیداوار کے نقصان میں مبتلا کیا تھا تاکہ وہ متنبہ ہوں[۱۵۶]۔ بس جب کبھی ایسا ہوتا کہ اُن پر خوشحالی آتی تو کہتے یہ ہماری وجہ سے ہے اور اگر ایسا ہوتا کہ سختی پیش آتی تو کہتے یہ موسیٰ اور اس کے ساتھیوں کی نحوست ہے سُن لو! کہ ان کی نحوست اللہ کے یہاں تھی لیکن بہتوں کو یہ بات معلوم نہیں ہے[۱۵۷]۔ اور فرعونیوں نے کہا اے موسیٰ تو ہم پر جادو چلانے کے لیے کتنی ہی نشانیاں پیش کرے ہم تجھے ماننے والے نہیں ہیں[۱۵۸]۔ لہٰذا ہم نے اُن پر طوفان بھیجا، ٹڈی دل، اور جوئیں اور مینڈک اور لہو یہ سب جُدا جُدا نشانیاں تھیں ۔ اس پر بھی انہوں نے سرکشی کی اور اُن کا گروہ مجرموں کا گروہ تھا[۱۵۹]۔ اور جب بھی ان پر عذاب کی سختی آتی تو کہنے لگتے اے موسیٰ تیرے پروردگار نے تجھ سے جو عہد کیا ہے تو اُس کے

مطابق ہمارے لیے دُعا کر، اگر تو نے اپنی دُعا سے ہم سے عذاب ہٹا دیا تو ہم ضرور تیری بات مان لیں گے اور تیرے ساتھ بنی اسرائیل کو روانہ کر دیں گے۔[۱۶۰] لیکن پھر جب ایسا ہوا کہ ہم نے ایک خاص وقت تک کے لیے کہ انہیں اس تک پہنچنا تھا عذاب ٹال دیا تو اچانک وہ اپنی بات سے پھر گئے۔[۱۶۱] بالآخر ہم نے انہیں سزا دی بس ان کو سمندر میں غرق کر دیا' اس جرم کی پاداش میں کہ انہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی اور وہ ان سے غافل تھے۔[۱۶۲]

معانی مفردات

الحسنۃ، خوبی، بھلائی، نیکی، نعمت، ہر وہ نعمت جو انسان کو اس کی جان بدن یا حالات میں حاصل ہو کر اس کے لیے مسرت کا سبب بنے حسنہ کہلاتی ہے سیئۃ اس کی ضد ہے۔ یہ دونوں اسم جنس ہیں جن کے تحت مختلف انواع داخل ہیں جیسا کہ وان تصبہم حسنۃ یقولوا ھذا من عنداللہ یہاں حسنہ سے مراد فضل کی عمدگی اور فراخی و کامیابی ہے اور وان تصبہم سیئۃ میں سیئۃ سے مراد تنگی اور ناکامی ہے۔ حسن، حسنۃ اور حسنی میں فرق یہ ہے کہ حسن اعیان اور احداث دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح حسنہ جب کہ صفت

ہو کر آئے تو دونوں کے لیے بولی جاتی ہے اور اسم ہو کر آئے تو صرف احداث میں استعمال ہوتی ہے۔ اور حسنی کا استعمال صرف احداث ، میں ہوتا ہے اعیان میں نہیں ہوتا۔ طائرھم ان کی فال بد، ان کا شگون بد، ان کی بری قسمت، ان کی نحوست، ان کی نامبارکی۔ اصل میں تو طائر کے معنے اڑنے والے ہی کے ہیں چنانچہ طار یطیر طیرانا" کا استعمال اسی معنے میں ہوتا ہے مگر عرب جاہلیت کا معمول تھا کہ جب وہ کسی اہم کام کا ارادہ کرتے تو پرندوں کو للکارتے اور ان سے فال لیتے اگر وہ داہنے سے بائیں کو نکل جاتے تو برا سمجھتے اور منحوس جانتے۔ اور پھر اس کام کو نہ کرتے چنانچہ اس طرح اس کا استعمال پرندوں سے برے شگون لینے کے بارے میں ہونے لگا۔ اور پھر ہر اس شے کے لیے کہ جس سے بد فالی لی جاتے یا اسے منحوس سمجھا جاتے استعمال کرنے لگے۔ غرض عرب چونکہ پرندہ کو شوم و نحوست کی دلیل و علامت سمجھتے تھے اس لیے مدلول کو دلیل کا نام دے کر خود طائر اور طیر کو شوم سے موسوم کر دیا گیا۔ نیز طائر کے معنے حصہ کے بھی ہیں۔ چنانچہ امام رازی ابو عبید سے تفسیر کبیر میں نقل کیا ہے۔ کبھی طائر کا استعمال حصہ اور نصیب کے معنے میں بھی کرتے ہیں۔ خواہ بھلا ہو یا برا۔ حتی کہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ تطیر اصل ہی لوگوں میں مال کو متفرق کر دینا اور اڑا دینا ہے تاکہ ہر ایک کے لیے اس کا حصہ بھلا ہو یا برا اڑ جائے پھر شر میں اس کا استعمال غالب ہو گیا۔

آیتِ ہدایت اور آیتِ ہلاکت

کفار پر نتائج کی حیثیت سے آیاتِ نبوت کی دو قسمیں ہیں آیاتِ ہدایت اور آیاتِ ہلاکت: نبوت پہلے کفار کو ہدایت کی نشانیاں دکھاتی ہے اور ان کو حق کی دعوت دیتی ہے۔ کفار کی کثیر تعداد میں جس قدر صالح اجزاء ہوتے ہیں وہ اس دعوت کو قبول کرتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ بالآخر وہ وقت آتا ہے جب مادہ فاسد کے علاوہ کفار کی جماعت میں کوئی صلاحیت پذیر عنصر باقی نہیں رہتا یعنی اس کثیف ملبے سے چھٹ کر تمام اجزائے لطیفہ الگ ہو جاتے ہیں۔ اور ڈھیر میں پھونس کے سوا کچھ نہیں رہتا تو اس وقت آیتِ ہلاکت آسمان کی بجلی، فضا کی آندھی، زمین کا سیلاب، سمندر کی موجیں بن کر رونما ہوتی ہے اور سطح خاکی کو ان کے وجود کی نجاست سے پاک کر دیتی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو متعدد معجزے عطا ہوتے تھے مگر وہ اس لیے تھے کہ ان کو دکھا

کو فرعون کو حق کی طرف دعوت دی جاتے۔ جب ایک مدت کے بعد اہل مصر میں سے جو لوگ ایمان لا سکتے ہیں سے آتے تو حضرت موسیٰ کو شق بحر کی آیت ہلاکت عنایت ہوئی۔ یہاں آیت ہلاکت سے پہلے متعدد آیات ہدایت کا ذکر ہوا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اللہ نے فرعونیوں کی ہدایت کے لیے کس قدر اہتمام فرمایا ہے۔ یہاں اسی بات کو ظاہر کرنے کے لیے لعلھم یذکرون، فرمایا ہے یعنی یہ آیات ہدایت ہیں۔ آخر میں فانتقمنا منھم میں آیت ہلاکت کو بیان کیا ہے آیت ہلاکت اس وقت تک ظاہر نہیں ہوتی جب تک آیات ہدایت کے ذریعے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی نہیں ہو جاتا۔ حضرت نوح نے ایک طویل زمانے تک اپنی قوم کو دعوت دی اور اس کے بعد ناامید ہو کر انہوں نے آخری معجزہ ہلاکت کی رب لا تذر کہہ کر دعا مانگی۔ حضرت موسیٰ کو جب فرعون سے پوری مایوسی ہو گئی تو انہوں نے دعا کی ربنا اطمس علی اموالھم و اشدد علی قلوبھم فلا یومنوا حتی یروا العذاب الالیم۔

۱۵۶۔ اور بلاشبہ یقیناً ہم نے فرعونیوں کو خشک سالی کے برسوں اور پیداوار کے نقصان میں مبتلا کیا تھا تاکہ وہ متنبہ ہوں۔ گزشتہ آیت میں فرمایا تھا کہ قریب ہے کہ خدا تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے۔ یہاں سے اسی اہلاک موعود کے بعض مبادی اور مقدمات کی تفصیل شروع کی گئی ہے یعنی اس سنت اللہ کے موافق جو اسی پارے کے شروع میں آیت وما ارسلنا فی قریۃ من نبی الا اخذنا بالباساء والضراء الخ کے تحت میں گزر چکا۔ خدا تعالیٰ نے فرعونیوں کو ابتدائی تنبیہ کے طور پر قحط و خشک سالی وغیرہ معمولی تکالیف اور سختیوں میں مبتلا کیا تاکہ وہ خواب غفلت سے چونکیں اور موسیٰ علیہ السلام کی پیغمبرانہ نصیحتوں کو قبول کریں مگر وہ اسے کا ہے کو تھے انہوں نے ان تنبیہات کی کچھ پروا نہ کی بلکہ پہلے سے زیادہ ڈھیٹ اور سخت ہو گئے۔[1]

اصل ارشاد میں لفظ سنین آیا ہے۔ سنۃ کی جمع ہے۔ اس کے معنے سالوں کے ہیں۔ لیکن امام راغب فرماتے ہیں کہ اس کا بسا اوقات استعمال قحط والے سال کے لیے ہوتا، یہاں سال سے سالہائے قحط مراد ہیں۔ علامہ تقی نے تاج العروس میں تصریح کی ہے کہ یہ اس کے مجازی معنے ہیں۔ اور نقص من الثمرات سے پیداوار کی کمی مراد ہے۔

آخر میں فرمایا ہے لعلھم یذکرون، اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو نصیحت ہو اور ان کو

[1] افادات شیخ الاسلام

عبرت ہو اور اپنے حالات کو تبدیل کریں ۔

فرعونیوں کا ردِ عمل

۱۵۷- بس جب کبھی ایسا ہوتا کہ ان پر خوشحالی آتی تو کہتے یہ ہماری وجہ سے ہے اور اگر ایسا ہوتا کہ سختی پیش آتی تو کہتے یہ موسیٰ اور اس کے ساتھیوں کی نحوست ہے ۔ سن لو کہ ان کی نحوست اللہ کے یہاں تھی لیکن بہتوں کو یہ بات معلوم نہیں ہے ۔ جب ثم بدلنا مکان السیئۃ الحسنۃ کے قاعدہ کے مطابق قحط وغیرہ دور ہو کر ارزانی اور خوشحالی حاصل ہوتی تو کہنے لگتے کہ دیکھو خوش طالعی اور اقبال مندی کے لائق تو یہ حالات ہیں ۔ پھر اگر درمیان میں کبھی کسی ناخوشگواری سے دوچار ہونا پڑ جاتا تو کہتے کہ یہ سب معاذ اللہ موسیٰ اور اس کے رفقاء کی شومی تقدیر اور نحوست ہے ۔ حق تعالیٰ نے اسی کا جواب دیا ہے الا انما طائرھم عند اللہ یعنی بدبختی اور نحوست کو مقبول بندوں کی طرف کیوں نسبت کرتے ہو ۔ تمہاری اس نحوست کا واقعی سبب تو خدا کے علم میں ہے اور وہ تمہارا ظلم و عدوان اور بغاوت و شرارت ہے ۔ اسی سبب کی بنا پر خدا کے یہاں سے کچھ حصہ نحوست کا وقتی سزا اور تنبیہہ کے طور پر تم کو پہنچ رہا ہے ۔ باقی تمہارے ظلم و کفر کی اصلی شومی و نحوست یعنی پوری پوری سزا تو وہ ابھی اللہ کے پاس محفوظ ہے جو دنیا میں یا آخرت میں اپنے وقت پر تم کو پہنچ کر رہے گی جس کی ابھی اکثر لوگوں کو خبر نہیں ہے[1]

یہ بتایا جا رہا ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنی جو آزمائشیں فرعونیوں کو جھنجھوڑنے اور بیدار کرنے کے لیے روانہ کیں کہ وہ حضرت موسیٰ کی دعوت کی طرف متوجہ ہوں انہوں نے ان آیات میں حضرت موسیٰ کی نحوست کا نتیجہ قرار دیا ۔ ان کا خیال تھا کہ ملک میں جو خوشحالی رفاہیت رزق میں فراوانی معاشی برتری ہوتی ہے وہ تو اس لیے ہے کہ ہماری حکومت کے تدبر، فکر و غور اور منصوبہ بندی کا نتیجہ ہے ۔ اور ملک میں جو قحط سالی، معاشی خرابی، بازار کی گرانی، پیداوار کی کمی اور باقی امراض پھیل رہے ہیں یہ حضرت موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کی روز کی شورشوں اور شہری زندگی کے امن، سکون اور حکومت کو پریشان کرنے کی وجہ سے ہے ۔ فرعون ہی نہیں بلکہ ہر مستبد اپنے عوام کے ساتھ یہی معاملہ کرتا ہے وہ ملک کی خوشحالی کو اپنے سیاسی تدبر اور منصوبہ بندی کا نتیجہ اور بدحالی کو زعماء کے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

سرھو پاتا ہے۔ قرآن نے یہاں اس کا جواب یہ دیا ہے کہ ملک کی خوشحالی تمہارے حسن تدبر کا نتیجہ نہیں ہے اور نہ بدحالی حضرت موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کی نحوست کا نتیجہ ہے بلکہ یہ اللہ کے اس قانون کا نتیجہ ہے جس نے اچھے بُرے اعمال کے لیے ایک قانون مقرر کیا ہے اور اسی کے مطابق نتائج پیش آتے ہیں۔ یہ تمہارے اعمال کی نحوست ہے جو اللہ کے پاس ہے کسی اور کے پاس نہیں اور اسی کے مطابق یہ نتائج ہیں۔

فرعونیوں کا حضرت موسیٰ کو آخری جواب

۱۵۸- اور فرعونیوں نے کہا کہ اے موسیٰ تو ہم پر جادو چلانے کے لیے کتنی ہی نشانیاں پیش کر دے ہم تجھے ماننے والے نہیں ہیں۔ یہ موسیٰ علیہ السلام کے معجزات دیکھ کر کہتے تھے کہ خواہ کیسا ہی جادو آپ ہم پر چلائیں اور اپنے خیال کے موافق کتنے ہی نشان دکھلائیں ہم کسی طرح تمہاری بات ماننے والے نہیں جب انہوں نے یہ آخری فیصلہ سنا دیا اور قبول حق کے سارے دروازے اپنے اوپر بند کر لیے تب خدا نے ان پر چند قسم کی عظیم الشان بلائیں یکے بعد دیگرے مسلط کر دیں جن کی تفصیل آئندہ آیت میں آتی ہے[1]

یہاں فرعونیوں کی ہٹ دھرمی انتہا کو پہنچ گئی اس چیز کو بھی جادو قرار دے رہے ہیں یعنی قحط سالی اور پیداوار کی کمی کو جس کے متعلق ان کو خود بھی پتہ تھا کہ یہ جادو کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ اسی بنا پر قرآن میں دوسرے موقعہ پر بتایا ہے کہ جب ان کے پاس ہماری کھلی نشانیاں آئیں تو انہوں نے کہا کہ ھذا سحر مبین کہ یہ کھلا جادو ہے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ آیات کے بارے میں یہ انکاری رویہ سراسر ظلم اور غرور کی وجہ سے تھا ورنہ ان کے دل یقین کر چکے تھے۔ کیونکہ یہ بات کسی طرح تصور میں نہیں آ سکتی ہے کہ ایک پورا قحط اور چیزوں کی نایابی کی لپیٹ میں اگر آجاتے تو جادو کا کرشمہ ہو۔ یہ دونوں کھلی آیات ہدایت تھیں جن کو دیکھ کر ایک بیوقوف آدمی بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ پیغمبر کی دعا کے نتیجے میں ملک گیر بلاؤں کا آنا اور پھر اس کی دعا سے ہٹ جانا صرف اللہ رب العالمین ہی کے تصرف کا نتیجہ ہے۔ اسی بنا پر حضرت موسیٰ کو مخاطب کر کے صاف صاف کہہ دیا تھا ما انزل ھولاء الا رب السماوات والارض بصائر یہ بصیرت افروز نشانیاں اللہ کے سوا کسی

[1] افادات شیخ الاسلام

نے نازل نہیں فرمائی ہیں لیکن جس وجہ سے فرعونیوں نے ان آیات کے بارے میں کفر جحود کا رویہ اختیار کیا وہ صرف یہ تھی انؤمن لبشرین مثلنا وقومھما لنا عابدون کیا ہم اپنے ہی جیسے دو انسانوں کی بات مان لیں حالانکہ ان کی قوم ہماری بندگی کر رہی ہے۔ اس مرحلہ پر اگر آیات ہدایت ختم ہوتی ہیں کیونکہ انہوں نے حضرت موسیٰ سے کہہ دیا ہے وما نحن لک بمومنین ان کے اس فیصلے کے بعد آیت ہلاکت کے مقدمات اور مبادی شروع ہوتے اسی لیے اس کے بعد والی آیت فارسلنا کے شروع میں فاء نتیجہ کے لائے یعنی ان کے اس کہنے کا نتیجہ یہ ہوا۔

فرعونیوں کی ہلاکت کے مقدمات

۱۵۹- لہٰذا ہم نے ان فرعونیوں پر طوفان بھیجا، ٹڈی دل اور جوئیں، مینڈک اور لہو۔ یہ سب نشانیاں کھول دی گئی تھیں پھر بھی انہوں نے سرکشی کی اور ان کا گروہ مجرموں کا گروہ تھا۔ بارش اور سیلاب کا طوفان یا طوفان کی وجہ سے موت کا طوفان علی اختلاف الاقوال۔ قمل سے مراد چیچڑیاں ہیں جیسا کہ حضرت شیخ الہند نے اختیار کیا یا جوئیں یا گیہوں وغیرہ غلہ میں جو کیڑا لگ جاتا ہے جس سے غلہ خراب ہو جاتا ہے۔ یعنی بدن اور کپڑوں میں چیچڑیاں اور جوئیں پڑ گئیں، غلہ میں گھن لگ گیا۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد یہ سب آیات دکھلائی گئیں مگر وہ کچھ ایسے متکبر، جرائم پیشہ اور گنہ گار تھے کہ کسی طرح مان کر نہ دیئے۔ سعید بن جبیر سے منقول ہے کہ جب فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کے مطالبہ بنی اسرائیل کی آزادی کو تسلیم نہ کیا تو حق تعالیٰ نے بارش کا طوفان بھیجا۔ جس سے کھیتوں وغیرہ کی تباہی کا اندیشہ پیدا ہو گیا۔ آخر گھبرا کر حضرت موسیٰ سے درخواست کی کہ تم اپنے خدا سے کہہ کر یہ بلاء طوفان دور کرا دو تو ہم بنی اسرائیل کو آزادی دے کر تمہارے ساتھ روانہ کر دیں گے۔ موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے بارش بند ہو گئی اور بجائے نقصان کے پیداوار بہت کثرت سے ہوئی۔ فرعونی عذاب سے بے فکر ہو کر اپنے عہد پر قائم نہ رہے تب اللہ تعالیٰ نے تیار کھیتوں پر ٹڈی دل بھیج دیا جسے دیکھ کر پھر گھبرائے کہ یہ نئی آفت کہاں سے آگئی پھر موسیٰ علیہ السلام سے دعا کی درخواست کی اور پختہ وعدے کیے کہ اگر یہ عذاب ٹل گیا تو ہم ضرور بنی اسرائیل کو آزاد کر دیں گے۔ جب یہ عذاب بھی اٹھالیا گیا تو پھر مطمئن ہو گئے اور سب وعدے فراموش کر دیئے۔ آخر جس وقت غلہ اٹھا کر مکانوں میں بھر لیا تو خدا کے حکم سے غلہ میں گھن لگ گیا۔ پھر موسیٰ سے دعا کرائی اور بڑے پکے عہد و پیمان کیے لیکن جہاں وہ حالت ختم ہوتی بدستور

سابق سرکشی اور بدعہدی کرنے لگے تو خدا نے ان کا کھانا اور پینا بے لطف کر دیا۔ مینڈک اس کثرت سے پیدا کر دیے گئے کہ ہر کھانے اور برتن میں مینڈک نظر آتا تھا جب لوٹنے اور کھانے کے لیے منہ کھولتے مینڈک جست کر کے منہ میں پہنچتا تھا اور ویسے بھی اس جانور کی کثرت نے رہنا سہنا مشکل کر دیا۔ ادھر پینے کے لیے جو پانی لینا چاہتے تھے وہی خدا کے حکم سے برتنوں میں یا منہ میں پہنچ کر خون بن جاتا۔ غرض کھانے پینے تک سے عاجز ہو گئے۔ اس پر بھی شیخی اور اکڑفوں وہی رہی۔[1]

اس سے پہلے آیاتِ ہدایت آتی رہیں اور فرعونی ان کو سحر بتاتے رہے اور بالآخر انہوں نے اپنا دوٹوک فیصلہ کر دیا ما نحن لك بمومنين اے موسیٰ ہم تیری بات نہیں مانیں گے۔ اس کے بعد آیتِ ہلاکت آجانی چاہیے تھی لیکن حق تعالیٰ کے یہاں رحمت کا غلبہ ہے اس لیے اصل آیتِ ہلاکت سے پہلے بطورِ مقدمات آیات یکے بعد دیگرے ظاہر ہوئیں۔ قرآن کے اندازِ بیان سے ظاہر ہو رہا ہے کہ یہ مقدمات ان کے سابقہ کردار کا نتیجہ بن کر ظاہر ہوتے۔ یہاں قرآن نے پانچ نشانیاں بتائی ہیں ایک طوفان، دوسرے جراد، تیسرے قمل، چوتھے ضفادع اور پانچویں دم۔ اور ان پانچوں کا اجمالی چہرہ آیات مفصلات سے پیش کیا ہے۔ عام شارحینِ قرآن نے تو مفصلات کے معنے یہی بتاتے ہیں کہ یہ آیات ایسی واضح اور کھلی تھیں جن کے معجزہ ہونے میں کوئی ہوش مند شبہ نہیں کر سکتا۔ اور ایک مطلب یہ بھی لکھا ہے کہ یہ سب نشانیاں الگ الگ اور جدا جدا آئیں یکبارگی نہیں آئیں۔ اور امام مجاہد نے مفصلات کو معلومات کے معنے میں لیا ہے۔ یعنی سب کی جانی بوجھی ہیں۔ جانی بوجھی کا مطلب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ اہلِ کتاب کے علم میں ہے چنانچہ موجودہ توراۃ میں اس کی تفصیل موجود ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ کچھ اور معجزات بھی بیان ہوتے ہیں۔ قرآن میں صرف اشارہ ہے۔ موجودہ توراۃ کی روشنی میں ان پانچوں معجزات کی تفصیل یہ ہے:

طوفان کی تفصیل توراۃ میں اس طرح بتائی گئی ہے کہ

خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ اپنا ہاتھ آسمان کی طرف بڑھا تا کہ سب ملک مصر میں انسان اور حیوان اور کھیت کی سبزی پر جو ملک مصر میں ہے اولے گریں۔ اور موسیٰ

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

نے اپنی لاٹھی آسمان کی طرف اٹھائی اور خداوند نے رعد اور اولے بھیجے اور آگ زمین تک آنے لگی اور خداوند نے ملک مصر پر اولے برسائے پس اولے گرے اور اولوں کے ساتھ آگ ملی ہوئی تھی اور وہ اولے ایسے بھاری تھے کہ جب سے مصری قوم آباد ہوئی ایسے اولے ملک میں کبھی نہیں پڑے تھے اور اولوں نے سارے ملک مصر میں ان کو جو میدان میں تھے کیا انسان کیا حیوان سب کو مارا اور کھیتوں کی ساری سبزی کو بھی اولے مار گئے۔ اور میدانوں کے درختوں کو توڑ ڈالا مگر جشن کے علاقہ میں جہاں بنی اسرائیل رہتے تھے اولے نہیں پڑے۔ (خروج باب ۹)

اس سے معلوم ہوا کہ یہ طوفان بارش، ہواؤں کڑک، گرج اور ژالہ باری کا طوفان تھا۔ اس میں آگ کا جو ذکر ہے وہ بجلی والی آگ ہے جو اس طوفان میں ہوتی ہے۔

جراد عربی زبان میں ٹڈی کو کہتے ہیں اس کی تفصیل تورات میں اس طرح آتی ہے:

تب خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ ملک مصر پر اپنا ہاتھ بڑھا تاکہ ٹڈیاں ملک مصر میں آئیں اور ہر قسم کی سبزی کو جو اس ملک میں اولوں سے بچ رہی ہے چٹ کر جائیں۔ پس موسیٰ نے ملک مصر پر اپنی لاٹھی بڑھائی اور خداوند نے اس سارے دن اور ساری رات پر آندھی چلائی اور صبح ہوتے ہوتے پروا آندھی ٹڈیاں لے آئی اور ٹڈیاں سارے ملک پر چھا گئیں اور وہیں مصر کی حدود میں بسیرا کیا اور ان کا دل ایسا بھاری تھا کہ نہ تو ان سے پہلے ایسی ٹڈیاں کبھی آئیں اور نہ ان کے بعد پھر آئیں گی کیونکہ انہوں نے تمام روئے زمین کو ڈھانک لیا۔ ایسا کہ ملک میں اندھیرا ہو گیا اور انہوں نے اس ملک کی ایک ایک سبزی کو اور درختوں کے میووں کو جو اولوں سے بچ گئے تھے چٹ کر لیا اور ملک مصر میں نہ تو کسی درخت کی نہ کھیت کی کسی سبزی کی ہریالی باقی رہی۔ (خروج باب ۱۰- ۱۱- ۱۵)

قمل کے معنے عربی میں ایک سے زیادہ آتے ہیں۔ چیچڑی، سرسری، جوں چھوٹی مکھی، مچھر وغیرہ ہمارے خیال میں جانوروں میں چیچڑیاں، آدمیوں میں جوئیں اور غلہ میں سرسری پیدا ہو گئی مگر تورات میں جوں کا ذکر ہے اس لیے ہم نے بھی ترجمہ میں جوں کو رکھا ہے۔ اس عذاب سے ایک طرف آدمی اور جانور سخت پریشان ہوئے اور دوسری طرف غلوں کے گودام تباہ ہو گئے۔ تورات میں اسے اس طرح بیان کیا ہے:

تب خداوند نے موسیٰ سے کہا ہارون سے کہہ کہ اپنی لاٹھی بڑھا کر زمین کی گرد کو مار۔
تا کہ تمام ملک مصر میں جوئیں بن جائیں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا اور ہارون نے اپنی لاٹھی
لے کر اپنا ہاتھ بڑھایا اور زمین کے گرد مار اور انسان و حیوان پر جوئیں ہو گئیں۔ اور
تمام ملک مصر میں زمین کی ساری گرد جوئیں بن گئی۔ (خروج باب ۸)

الضفادع ضفدع کی جمع ہے۔ اس کے معنے مینڈک کے ہیں۔ مینڈکوں کے عذاب کی تفصیل بائبل کے آٹھویں باب میں اس طرح بیان کی ہے۔

پھر خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ فرعون کے پاس جا اور اس سے کہہ کہ خداوند یوں فرماتا ہے کہ میرے لوگوں کو جانے دو کہ میری عبادت کریں اور اگر تو ان کو جانے نہ دے گا تو دیکھ میں تیرے ملک کو مینڈکوں سے ماروں گا اور دریا بے شمار مینڈکوں سے بھر جائے گا اور وہ آکر تیرے گھر میں تیری آرام گاہ میں اور تیرے پلنگ پر اور تیرے ملازموں کے گھروں میں اور تیری رعیت پر اور تیرے تنوروں اور تیرے آٹا گوندھنے کے لگنوں میں بھی گھستے پھریں گے۔ اور تجھ پر اور تیری رعیت اور تیرے نوکروں پر چڑھ جائیں گے۔ اور خداوند نے موسیٰ کو فرمایا کہ ہارون سے کہہ اپنی لاٹھی لے کر اپنا ہاتھ دریاؤں اور نہروں اور جھیلوں پر چڑھا اور مینڈکوں کو ملک مصر پر چڑھا لا۔ چنانچہ جتنا پانی مصر میں تھا اس پر ہارون نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور مینڈک چڑھ آئے اور ملک مصر کو ڈھانک لیا۔

(خروج باب ہشتم)

دم کے معنے خون کے ہیں۔ یہ عذاب اس طرح آیا کہ تمام نہروں، کنوؤں، چشموں اور تالابوں کا پانی خون میں تبدیل ہو گیا۔ مچھلیاں مر گئیں، ہر جگہ پانی میں عفونت پیدا ہو گئی اور پورے ایک ہفتہ تک مصر کے لوگ صاف پانی سے ترس گئے۔ بائیبل کے باب ہفتم میں اس عذاب کا نقشہ اس طرح بتایا گیا ہے۔

اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ ہارون سے کہہ کہ اپنی لاٹھی لے اور مصر میں جتنا پانی ہے یعنی دریاؤں اور نہروں، جھیلوں اور تالابوں پر اپنا ہاتھ بڑھا تاکہ وہ خون بن جائیں۔ اور سارے ملک مصر میں پتھر لکڑی کے برتنوں میں بھی خون ہوگا اور موسیٰ و ہارون نے حکم کے مطابق کیا اس نے لاٹھی اٹھا کر اسے فرعون اور اس

کے فاعون کے سامنے دریا کے پانی پر مارا دیا اور دریا کا پانی سب خون ہوگیا۔ اور دریا کی مچھلیاں سب مرگئیں اور دریا سے تعفن اُٹھنے لگا اور مصری دریا کا پانی نہ پی سکے اور تمام ملک مصر میں خون ہی خون ہوگیا۔ (خروج ۷)

ایک اہم اور ضروری توضیح

بائیبل کی کتاب خروج میں ان عذابوں کی مفصل رُوداد درج ہے لیکن اس میں حقیقت اور ملاوٹ دونوں ہیں۔ اس میں کہا گیا ہے کہ جب خون کا عذاب آیا تو جادوگروں نے بھی ایسا ہی لا کر دکھایا مگر جب جوؤں کا عذاب آیا تو جادوگر جواب میں جوئیں پیدا نہ کر سکے اور انہوں نے کہا کہ یہ خدا کا کام ہے۔ پھر اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب مینڈکوں کا سیلاب اٹھا تو جادوگر بھی جواب میں مینڈک چڑھا لائے لیکن اس کے باوجود فرعون نے حضرت موسیٰ ہی سے یہ درخواست کی کہ اللہ سے دعا کر کے اس عذاب کو دفع کراتے۔ سوال یہ ہے کہ جب جادوگر مینڈک چڑھا لانے پر قادر ہے تو فرعون نے انہی کے ذریعہ سے یہ عذاب دُور کیوں نہ کرالیا اور آخر یہ کیسے معلوم ہوا کہ مینڈکوں کی اس فوج میں اللہ کے مینڈک کون سے اور جادوگروں کے کون سے تھے؟ یہی سوال خون کے بارے میں بھی پیدا ہوتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ کی تنبیہہ کے مطابق ہر طرف پانی کے ذخیرے خون میں تبدیل ہو چکے تھے تو جادوگروں نے کس پانی کو خون بنایا اور کیسے معلوم ہوا کہ فلاں جگہ کا پانی جادوگروں کے کرتب سے خون بنا ہے۔ ایسی باتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ بائیبل خالص کلام الٰہی پر مشتمل نہیں ہے بلکہ یوں کہنا بجا ہے کہ موجودہ بائیبل جن لوگوں نے اپنی طرف سے بہت کچھ ملایا ہے وہ واجبی سی عقل کے لوگ بھی نہ تھے جنہیں بات گھڑنے کا بھی سلیقہ نہ تھا لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔

آخر میں فرمایا ہے فاستکبروا وکانوا قوماً مجرمین۔ پھر بھی انہوں نے سرکشی کی اور اُن کا گروہ مجرموں کا گروہ تھا۔ فرعونیوں کی سرکشی کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ان واقعات و حقائق کے باوجود حضرت موسیٰ کی نبوت کو نہیں مانتے تھے اور اسے جادو ہی سمجھتے تھے۔ حالانکہ وہ جادو کی حقیقت سے واقف تھے اور ان سے یہ بات چھپی ہوئی نہ تھی کہ یہ کرشمے کسی جادو سے رونما نہیں ہو سکتے۔ ایک جادوگر زیادہ سے زیادہ جو کچھ کر سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک محدود رقبہ میں جو لوگ اس کے سامنے موجود ہوں۔ ان کے ذہن پر ایسا اثر ڈالے جس سے وہ یہ محسوس کرنے لگیں

کہ پانی خون بن گیا ہے یا مینڈک نکل رہے ہیں یا ٹڈی دل چڑھ رہا ہے اور اس محدود دائرے کے اندر بھی کوئی پانی حقیقت میں خون نہ بن جائے گا بلکہ اس دائرے سے نکلتے ہی پانی کا پانی رہ جائے گا۔ کوئی مینڈک فی الواقع پیدا نہ ہوگا بلکہ اسے پکڑ کر آپ اس دائرے سے باہر لے جائیں گے تو آپ کے ہاتھ میں مینڈک کے بجائے صرف ہوا ہوگی۔ ٹڈی دل بھی محض خیالی دل ہوگا کسی کھیت کو وہ چاٹ نہ سکے گا۔ رہی یہ بات کہ ایک پورے ملک میں قحط برپا ہو جائے یا تمام ملک کی نہریں، چشمے اور کنویں خون سے بھر جائیں یا ہزارہا میل کے رقبے پر ٹڈی دل ٹوٹ پڑے اور وہ لاکھوں ایکڑ کے کھیت صاف کر جائے۔ یہ کام آج تک نہ جادوگر سکا ہے اور نہ جادو کے زور سے ہو سکتا ہے اس کے باوجود بھی اگر کوئی نہیں مانتا ہے تو اس کا منشا استکبار نہیں تو اور کیا ہے۔ یعنی راج ہٹ اور شاہی طنطنہ کے سوا اور کیا ہے۔

فرعونیوں کی حضرت موسیٰ سے درخواست دعا

۱۶۰۔ اور جب بھی ان پر عذاب کی سختی آتی تو کہنے لگتے اے موسیٰ تیرے پروردگار نے تجھ سے جو عہد کیا ہے تو اس کے مطابق ہمارے لیے دعا کر، اگر تو نے اپنی دعا سے ہم پر عذاب ہٹا دیا تو ہم ضرور تیری بات مانیں گے اور تیری ساتھ بنی اسرائیل کو روانہ کر دیں گے۔ یعنی اس نے دعا کا جو موثر طریقہ سجھ کو بتلا رکھا ہے۔ اسی طرح دعا کر دے۔ بما عھد عندک کا یہ مطلب ہے کہ نبی اللہ ہونے کی حیثیت سے دعا فرما دیجئے گویا عہد کا اطلاق نبوت پر ہوا کیونکہ خدا اور نبی کے درمیان ایک طرح کا معاہدہ ہوتا ہے کہ خدا نبی کو خلعت اکرام و اعانت سے سرفراز فرمائے گا اور نبی اس کی پیغام رسانی میں کوئی کوتاہی نہیں کرے گا اور ممکن ہے بما عہد عندک سے وہ عہد مراد ہو جو بتوسط انبیاء علیہم السلام اقوام سے کیا جاتا ہے کہ اگر تم کفر و تکذیب سے باز آگئے تو عذاب الٰہی اٹھا لیا جائے گا[1]

یہاں تو قرآن نے فرعونیوں کی حضرت موسیٰ سے درخواست کا ذکر یا موسیٰ سے کیا ہے لیکن ۲۵ پارہ میں الفاظ یہ لکھے ہیں یا ایھا الساحر ادع لنا ربک بما عھد عندک اے ساحر تجھے اپنے رب کی طرف جو منصب حاصل ہے اس کی بنا پر ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کر۔ یہاں عام شارحین

---

[1] افادات شیخ الاسلام

قرآن کو یہ الجھن درپیش آتی ہے کہ جب عذاب سے نجات پانے کے لیے فرعونیوں نے حضرت موسیٰ سے درخواست کی تو ان کو اُسے ساحر کہہ کر کیوں پکارا۔ مبتلا تو خوشامد کیا کرتا ہے نہ کہ مذمت۔ اس وجہ سے انہوں نے یہ تاویل کی ساحر اس دور میں بڑا وقیع اور علمی مقام رکھتا تھا وہ گویا حضرت موسیٰ کو اپنے زمانہ کے عرف کے مطابق اسے عالم کہہ رہے تھے لیکن یہ تاویل اس بنا پر غلط ہے کہ قرآن حکیم میں دوسرے مقامات پر جہاں جہاں بھی فرعون کے وہ اقوال نقل کیے گئے جن میں اس نے حضرت موسیٰ کو جادوگر اور ان کے پیش کردہ معجزات کو جادو کہا ہے۔ وہاں مذمت اور تحقیر کا انداز صاف ظاہر ہوتا ہے اور صریحاً یہ نظر آتا ہے کہ اس کے نزدیک جادو ایک چھوٹی چیز تھی جس کا الزام وہ حضرت موسیٰ پر رکھ کر آپ کی دعویٰ نبوت میں تکذیب کرتا تھا۔

رہا یہ سوال کہ جب دُعا کی درخواست کرتے وقت بھی فرعون علانیہ حضرت موسیٰ کی تکذیب کرتا تھا تو آپ اس کی درخواست ہی کیوں قبول کرتے تھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کے پیش نظر اللہ کے حکم سے ان لوگوں پر حجت تمام کرنا تھا۔ عذاب ٹالنے کے لیے اُن کا آپ سے دُعا کی درخواست کرنا خود یہ ثابت کر رہا تھا کہ اپنے دلوں میں وہ جان چکے تھے کہ یہ عذاب کیوں آ رہے ہیں اور کون انہیں ٹال سکتا ہے اس کے باوجود جب وہ ہٹ دھرمی اور دیدہ دلیری سے آپ کو ساحر کہتے تھے اور عذاب کے ٹل جانے کے بعد راہِ راست قبول کرنے کے وعدے سے پھر جاتے تھے تو درحقیقت وہ اللہ کے نبی کا کچھ نہ بگاڑتے تھے بلکہ اپنے خلاف اس مقدمہ کو اور زیادہ مضبوط کرتے جاتے تھے جس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ نے ان کے کلی استیصال کی شکل میں آخر کر دیا۔

بہرحال آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب بھی وہ عذاب کی گرفت میں آتے حضرت موسیٰ کی منت سماجت کرنے لگتے کہ خدا سے جو تمہیں قرب و تعلق ہے اس کی بنا پر ہمارے لیے دُعا کرو اور سفارش کرو کہ یہ عذاب ٹل جائے اگر تم نے ٹال دیا تو ہم ضرور تمہاری بات مان لیں گے تورات میں بھی اس کا ذکر آیتوں میں ملتا ہے۔ مثلاً،

> تب فرعون نے موسیٰ و ہارون کو بلایا اور کہا کہ خداوند سے شفاعت کرو کہ مینڈکوں کو مجھ سے اور میری رعیت سے دفع کرے اور میں ان لوگوں کو جانے دوں گا تاکہ وہ خداوند کے لیے قربانی کریں۔ (خروج ۸-۸)
>
> تب فرعون نے موسیٰ و ہارون کو بلوایا اور ان سے کہا کہ اس دفعہ میں نے گناہ کیا ہے۔ خداوند عادل ہے۔ میں اور میری قوم گنہ گار ہیں۔ خداوند

سے شفاعت کرو کہ بس کر آئے کو اس طرح سے نہ گرجے اور اولے نہ گریں۔ تب میں
تمہیں جانے دوں گا اور تم اس سے آگے نہیں رہنے کے
(خروج باب نہم ۲۷-۲۸)
تب فرعون نے موسیٰ و ہارون کو جلد بلایا اور کہا کہ میں خداوند تمہارے
خدا کا اور تمہارا گنہ گار ہوں سو میں اب تمہاری منت کرتا ہوں فقط اس مرتبہ میرا گناہ
بخشو اور خداوند اپنے خدا سے شفاعت کرو کہ فقط اسی موت کو مجھ سے دور کرے
(خروج ۱۰)

بار بار اُن کی عہد شکنی

۱۶۱۔ لیکن پھر جب ایسا ہوا کہ ہم نے ایک خاص وقت کے لیے کہ انہیں اس تک پہنچنا تھا عذاب ٹال دیا تو اچانک وہ اپنی بات سے پھر گئے۔ اس مدت سے یا تو موت اور غرق ہونے تک کی مدت مراد ہے یا ممکن ہے ایک بلا کے بعد دوسری بلا کے آنے تک کا وقت مراد ہو[1] اصل ارشاد میں الرجز آیا ہے۔ امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں کہ رجز کی اصل اضطراب خوب ہلنا ہے اسی سے رجز البعیر ہے۔ اور علامہ زمخشری اساس میں لکھتے ہیں ا/ تجذ الرعد اس وقت کڑک کے لیے بولتے ہیں جب کپکپی جیسی آواز ہو یعنی ایسی جنبش جس میں ہلنا ہو۔ اشعار میں رجز بھی آواز کے اضطراب سے ہوتا ہے۔ یہاں رجز سے عذاب مراد ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس اور سعید بن جبیر نے یہاں رجز سے طاعون مراد لیا ہے۔ قرآن کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ رجز سے ایسا عذاب مراد ہے جس سے پوری زندگی ہل کر رہ جاتے اس لیے رجز کی آغوش میں وہ تمام نوازل اور حوادث جو اللہ سبحانہ نے قوم فرعون پر نازل کیے ان ہی میں سے یہ پانچ بھی ہیں جن کا یہاں ذکر ہوا ہے۔ اور اگر تورات میں بیان کردہ عذاب کی ساری صورتوں کو صحیح مان لیا جاتے تو پھر رجز کا مدلول وہ سب ہوں گے۔ قرآن میں لما کا استعمال کچھ اس طرف اشارہ بھی کر رہا ہے کہ اس قسم کے واقعات بہت ہوتے ہیں اور فرعون ہر حادثہ کے موقع پر حضرت موسیٰ سے دعا کی درخواست کرتا اور وعدہ کرتا کہ بنی اسرائیل کے جانے میں مزاحمت ختم کر

---

[1] افادات شیخ الاسلام

دے گا لیکن ہر بار مکر جاتا اذا ھم ینکثون عمل کے اسی تکرار کو ظاہر کر رہا ہے۔

درمیان میں ارشاد ہوا ہے کہ الی اجل ھم بالغوہ ایک خاص وقت تک کے لیے کہ انہیں اس تک پہنچنا تھا۔ یعنی ایک آنے والا وقت تھا جس کی طرف وہ اپنے اعمال کے ذریعے بڑھ رہے تھے اور بالآخر پہنچنے والے تھے۔ یہ آنے والا وقت کون سا تھا؟ ان کے ظلم و فساد کا آخری نتیجہ کہ اللہ سبحانہ کے قانونِ جزا نے اس طرح کے نتیجے کے لیے جتنی مقدار فساد عمل کی ٹھہرا دی ہے جب وہ مہیا ہو گئی تو نتیجہ رونما ہو گیا۔ یہی ظہورِ نتائج کا وقت ہے جسے قرآن نے اُمتوں کی اجل سے تعبیر کیا ہے جیسا کہ اسی سورت کی ابتدا میں لکل امۃ اجل فرما کر ذکر کیا ہے۔ یہاں اسی قانون تاجیل کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہر جماعت اپنے اعمال کے ذریعے ایک خاص نتیجے تک پہنچتی رہتی ہے جو اس کی مقررہ اجل ہے۔ اگر اعمال نیک ہوتے ہیں تو یہ اجل فلاح کی ہوتی ہے بُرے ہوتے ہیں تو ہلاکت کی ہوتی ہے [1]

فرعون کی ہلاکت

۱۶۲- اور بالآخر ہم نے انہیں سزا دی بس ان کو سمندر میں غرق کر دیا۔ اس جرم کی پاداش میں کہ انہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی اور وہ ان سے غافل رہے۔ رجز سے بعض مفسرین کے نزدیک طاعون مراد ہے جیسا کہ بعض احادیث میں یہ لفظ طاعون پر اطلاق کیا گیا ہے۔ لیکن اکثر مفسرین ان آیات کو پچھلی آیات ہی کا بیان قرار دیتے ہیں۔ موضح القرآن میں ہے کہ یہ سب بلائیں ان پر آئیں ایک ایک ہفتہ کے فرق سے۔ اول حضرت موسیٰ فرعون کو کہہ آتے کہ اللہ تم پر یہ بلا بھیجے گا وہ ہی بلا آتی۔ پھر مضطر ہوتے۔ حضرت موسیٰ کی خوشامد کرتے، ان کی دعا سے دفع ہوتی پھر منکر ہو جاتے۔ آخر کو وبا پڑی۔ نصف شب کو سارے شہر میں ہر شخص کا پہلا بیٹا مر گیا۔ وہ لگے مُردوں کے غم میں حضرت موسیٰ اپنی قوم کو لے کر شہر سے نکل گئے۔ پھر کئی روز کے بعد فرعون نے پیچھا کیا۔ دریائے قلزم پر جا پکڑا وہاں یہ قوم بسلامت گزر گئی اور فرعون ساری فوج سمیت غرق ہوا [2]

---

[1] ترجمان القرآن [2] افادات شیخ الاسلام

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آخر کار ایک رات مقرر فرما دی جس میں تمام بنی اسرائیل اور غیر اسرائیل مسلمانوں کو مصر کے ہر حصے سے ہجرت کے لیے نکلنا تھا۔ یہ سب لوگ ایک طے شدہ پروگرام کے تحت مقررہ مقام پر جمع ہو کر ایک قافلے کی صورت میں روانہ ہو گئے۔

دراصل مصر سے فلسطین یا سرزمین کنعان جانے کے دو راستے ہیں۔ ایک خشکی کا راستہ ہے اور وہ قریب ہے اور دوسرا بحر احمر (قلزم) کا راستہ یعنی اس کو عبور کر کے بیابان سور اور سینا کی راہ ہے اور یہ دور کی راہ ہے مگر خدا تعالیٰ کی مصلحت کا تقاضا یہی ہوا کہ وہ خشکی کی راہ چھوڑ کر دور کی راہ اختیار کریں اور قلزم کو پار کر کے جائیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس راستہ کو اللہ تعالیٰ نے اس لیے ترجیح دی کہ خشکی کے راستہ سے گزرنے میں فرعون اور اس کی فوج سے ضرور جنگ ہو جاتی کیونکہ انہوں نے بنی اسرائیل کو قریب ہی سے آلیا تھا اور اگر دریا کا معجزہ پیش نہ آتا تو فرعون بنی اسرائیل کو واپس مصر لے جانے میں کامیاب ہو جاتا اور چونکہ صدیوں کی غلامی نے بنی اسرائیل کو بزدل اور پست ہمت بنا دیا تھا اس لیے وہ خوف اور رعب کی وجہ سے کسی طرح فرعون کے ساتھ جنگ پر آمادہ نہ ہوتے۔ تورات سے بھی اس توجیہ کی تائید ہوتی ہے۔

اور جب فرعون نے ان لوگوں کو جانے کی اجازت دے دی تو خدا ان کو فلسطینیوں کے ملک کے راستہ سے نہیں لے گیا۔ اگرچہ ادھر سے نزدیک پڑتا کیونکہ خدا نے کہا کہ ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ لڑائی بھڑائی دیکھ کر پچھتانے لگیں اور مصر کو لوٹ جائیں بلکہ خداوند ان کو چکر کھلا کر بحر قلزم کے بیابان کے راستہ لے گیا۔

(خروج ۱۳)

نیز فرعون اور آل فرعون کو ان کی نافرمانی اور سرکشی کی پاداش اور عظیم الشان اعجاز کے ذریعے ظالم و قاہر اقتدار سے مظلوم قوم کی نجات کا عدیم النظیر مظاہرہ کرنا بھی مقصود تھا اسی لیے یہ راستہ تجویز ہوا۔ بہرحال حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر راتوں رات بحر احمر کی راہ پر ہو لئے اور روانہ ہونے سے پہلے مصری عورتوں کے زیورات اور قیمتی پارچات جو ایک تقریب کی خاطر مستعار لیے تھے وہ بھی واپس نہ کر سکے کہ کہیں مصریوں کو ہماری روانگی کا علم نہ ہو جائے۔ ادھر پرچہ نویسوں نے فرعون کو اطلاع کی کہ بنی اسرائیل مصر سے فرار ہونے کے لیے شہروں سے نکل گئے ہیں۔ فرعون نے اسی وقت فوج کو ساتھ لیا اور ان کا تعاقب کیا۔ بنی اسرائیل کی تعداد تورات کی تصریح کے مطابق علاوہ بچوں اور جانوروں کے

چھ لاکھ تھی۔ فرعون کے تعاقب میں آتے دیکھ کر بنی اسرائیل گھبرا گئے اور کہنے لگے۔

کیا مصر میں قبریں نہ تھیں جو تو ہم کو مرنے کے لیے بیاباں میں لے آیا ہے تو نے ہم سے یہ کیا کیا؟ کہ ہم کو مصر سے نکال لایا، کیا ہم تجھ سے مصر میں نہ کہتے تھے کہ ہم کو رہنے دے کہ ہم مصریوں کی خدمت کریں کیوں ہمارے لیے مصریوں کی خدمت کرنا بیابان میں مرنے سے بہتر۔ (خروج ۱۴)

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو تسلی دی اور فرمایا خوف نہ کرو خدا کا وعدہ سچا ہے وہ تم کو نجات دے گا اور تم ہی کامیاب ہوگے اور پھر درگاہ الٰہی میں دست بدعا ہوئے۔ وحی الٰہی نے حضرت موسیٰ کو حکم دیا کہ اپنی لاٹھی کو پانی پر مارو چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے ایسا ہی کیا جب انہوں نے قلزم پر اپنا عصا مارا تو پانی پھٹ کر دونوں جانب دو پہاڑوں کی طرح کھڑا ہوگیا اور درمیان میں راستہ بن گیا۔ اور حضرت موسیٰ کے حکم سے تمام بنی اسرائیل اس میں سے اتر کر پار ہوگئے۔ فرعون نے یہ دیکھا تو اپنا تمام لشکر لے کر اسی راستہ پر چل دیا۔ جب بنی اسرائیل کا ہر فرد دوسرے کنارے پر سلامتی کے ساتھ پہنچ گیا تو پانی بحکم الٰہی پھر اپنی اصلی حالت پر آگیا اور فرعون اور اس کا تمام لشکر غرق ہوگیا۔

قرآن عزیز نے بنی اسرائیل کی روانگی اور فرعون کے غرق اور بنی اسرائیل کی نجات کے واقعہ کو بہت اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے اور اس کے صرف ضروری اجزاء ہی کا ذکر کیا ہے لیکن واقعہ سے متعلق عبرت و بصیرت اور موعظت کے معاملہ کو ذرا کھول کر مختلف مقامات پر پیش کیا۔ مگر تورات میں بیان کردہ واقعات کے علاوہ اور بھی بہت کچھ تفصیلات بتائی ہیں۔ اور بنی اسرائیل کے کوچ اور پڑاؤ کے اکثر مقامات کے نام بھی بتائے ہیں جو دُنیا کے لیے نامعلوم ہیں۔

بدقسمتی سے مسلمانوں میں کچھ ایسی نامور شخصیتیں بھی ہیں جو علم کے نام سے اسلام کے ہر مسئلہ کو ادبیات ہی تک محدود رکھتے ہیں۔ اس لیے وہ معجزات کو نہیں مانتے ہیں۔ انہوں نے غرق فرعون کے معاملہ کو بھی روحانی اعجاز سے نکال کر ایک مادی اور عادی واقعہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ وہ لوگوں کو باور کرانا چاہتے ہیں کہ غرقِ فرعون مادی علل و اسباب کے تحت ظہور پذیر ہوا ہے۔

صاحب تفسیر احمدی نے اس کی یہ تشریح فرمائی ہے کہ غرق فرعون اور بنی اسرائیل کی نجات کا یہ واقعہ معجزہ نہ تھا بلکہ عام دنیوی اسباب و علل کے ماتحت سمندر کے مد و جزر جوار بھاٹا سے تعلق رکھتا ہے یعنی صورت حال یہ پیش آئی کہ جس وقت بنی اسرائیل نے قلزم کو عبور کیا تھا اس وقت اس کا پانی سمٹا ہوا تھا اور پیچھے کو ہٹ کر اس نے جزر اختیار کر لیا تھا۔ فرعون نے

جب بنی اسرائیل کو اس آسانی سے پار ہوتے دیکھا تو اس نے بھی اپنے لشکر کو داخل ہونے کا حکم دے دیا مگر بنی اسرائیل پار ہو چکے تھے اور فرعونی لشکر ابھی دریا کی خشکی پر چل رہا تھا کہ سمندر کے مد اور آگے بڑھنے کا وقت پہنچ گیا اور فرعون اور اس کے لشکر کو اتنی مہلت بھی نہیں ملی کہ وہ آگے بڑھ سکے یا پیچھے ہٹ سکے اور سب غرق ہو گئے۔

ان صاحب نے اپنے اس مزعومہ خیال کے مطابق بنی اسرائیل کے عبور کے متعلق ایک نقشہ بھی دیا ہے جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بنی اسرائیل نے قلزم کے شمالی دہانہ پر جاکر اس کو عبور کیا ہے، مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ قرآن عزیز کی تصریحات اس کا قطعی انکار کرتی ہیں۔

قرآن اور تورات دونوں کی تصریحات سے یہ قطعی طور پر متعین کیا جا سکتا ہے کہ بنی اسرائیل نے بحرِ قلزم کے کسی کنارے اور دہانہ سے عبور کیا یا درمیان سے اس پر ہم ان شاء اللہ تفصیلی تبصرہ جلد ۱۶ میں کریں گے۔

بعض مغرب زدہ حضرات نے یہاں ایک نئی اپچ کا مظاہرہ کیا ہے، جب ان کو اس کا زمانہ اعجاز سے کسی طرح فرار کی کوئی صورت نظر نہیں آئی تو تورات کے اس فقرے کا سہارا لیا۔

> اور خداوند نے رات بھر پوربی آندھی چلا کر اور سمندر کو پیچھے ہٹا کر اسے خشک زمین بنایا اور پانی دو حصے ہو گیا اور بنی اسرائیل سمندر میں سے خشک زمین پر چل کر نکل گئے۔

وہ کہتے ہیں کہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہ خشک زمین دریا کے بیچ میں نکل آئی تھی پھر بھی یہ معجزہ نہ تھا بلکہ رات بھر خشک ہوا کے چلنے سے دونوں جانب پانی بستہ برف کی طرح ہو گیا تھا اور بیچ میں خشک راستہ بن گیا تھا مگر جب فرعون کی باری آئی تو آفتاب کی تمازت نے بستہ برف کو پگھلا دیا اور پانی اصل حالت پر آ گیا اور مصری غرق ہو گئے۔

یہاں عبدالوہاب نجار مصری نے یہ خوب لکھا ہے کہ اگر بالفرض ان کی اس باطل تاویل کو تسلیم بھی کر لیا جائے پھر بھی یہ اعجاز ہی ہے کیونکہ سمندروں کی تاریخ بتاتی ہے کہ کبھی ہوا چل کر ان کے درمیان خشک راستہ نہیں بناتی علمِ تاریخ و جغرافیہ اس قسم کے واقعہ سے خالی ہیں۔ لہٰذا اگر عام مادی علل و اسباب سے جدا ہو کر ہوا کا یہ عمل صرف حضرت موسیٰ کی خاطر ہوا تو پھر بھی یہ حضرت موسیٰ کا معجزہ ہے۔

آخر میں اس انتقام کی جزا ان سے غرق کی صورت میں لیا گیا وجہ یہ بتائی ہے کہ بانھم کذبوا بآیاتنا وکانوا عنھا غٰفلین یعنی اوّل تو وہ اللہ کی آیات سے غافل رہے اور جب کھلے ہوئے چیلنج کے ساتھ ان کی رونمائی ہوئی تو انہوں نے اس کی تکذیب کر دی کہ یہ خدا کی طرف سے نہیں بلکہ سحر و شعبدہ ہے یہ انتہائی ہٹ دھرمی اور سخن پروری تھی کہ فرعونی اس چیز کو بھی جادو قرار دے رہے تھے جس کے متعلق وہ خود بھی جانتے تھے کہ یہ جادو نہیں ہو سکتا۔ اسی بنا پر قرآن حکیم کہتا ہے وجحدوا بہا واستیقنتھا انفسھم ظلماً وعلواً اُن کے دل اندر سے مان چکے تھے مگر انہوں نے ظلم و سرکشی کی راہ سے انکار کیا۔

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۗ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ بِمَا صَبَرُوْا ۗ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ﴿۱۳۷﴾

اور ہم نے وارث بنا دیا اُن لوگوں کو جن کو حقیر اور کمزور سمجھا جاتا تھا اس ملک کے مشرقی اور مغربی حصوں کا جو ہماری بخشی ہوئی برکت سے مالا مال ہے۔[۱۶۳] اور اس طرح تیرے رب کا پسندیدہ فرمان بنی اسرائیل کے حق میں پورا ہوا کیونکہ وہ ہمت و ثبات کے ساتھ جمے رہے۔[۱۶۴] اور فرعون اور اُس کی قوم جو کچھ بناتے رہے تھے اور جو بلندیاں اٹھاتے رہے تھے سب درہم برہم کر دیں۔[۱۶۵]

معانی مفردات

تمّت، پوری ہوگئی تمام سے ہے پورا کرنا، پورا ہونا، کسی چیز کے پورا ہونے یا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ اب کسی خارجی شے کی اس کو احتیاج نہیں رہی اور ناقص وہ ہے جو کسی خارجی چیز کا محتاج ہو۔ یعنی جو چیز اجزاء کے اعتبار سے آہستہ آہستہ انتہا کو پہنچے۔ حضرت ابراہیم سے اللہ کا وعدہ تھا کہ تمہیں ارض مقدس کا وارث بنایا جائے گا۔ یہ وعدہ بنی اسرائیل کے لیے آہستہ آہستہ پورا ہوا۔ دمّرنا، تدمیر سے ماضی کا جمع متکلم ہے ہم نے ہلاک کر دیا، تباہ کر دیا، اکھیڑ دیا۔ یعرشون، جمع مذکر غائب مضارع ضرب و نصر اونچا کرنا، چھتریاں بنانا، اونچے اونچے مکان بنانا۔ مصدر عرش ہے۔ لازم و متعدی دونوں آتا ہے۔ لازم کے معنے حیران و سرگرداں ہونا، عرش بالمکان قیام کرنا، تعریش البیت مکان کی چھت بنانا۔ تعریش الامر کام میں دیر کرنا، تعرش بالبلد شہر میں قیام کیا، اعتراش چھتری بنا، عریش جھونپڑی کو کہتے ہیں۔ ابو عبیدہ نے یہاں اس کے معنے بیننون سے کیے ہیں۔ یعنی اونچی اور بلند عمارات بناتے تھے۔

بنی اسرائیل کی وراثت ارض

نبوت نے یہ کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ چونکہ اس کا پیش کردہ نظام زندگی سب سے بہتر اور اس کے اصول اور طریقہائے کار حقیقت پر مبنی ہیں لہٰذا وہ تاریخی واقعات کی ناگزیر رفتار سے خود بخود دنیا کے دیگر ادیان پر غالب آجائے گا گویا کہ اس کی کامیابی تاریخ انسانی کے ارتقائی عمل کا ناگزیر نتیجہ یا ایک تاریخی وجوب ہے۔ نبوت کے نقطہ نظر سے انسان کے افعال انفرادی اور اعمال اجتماعی میں جبر کا کوئی پہلو نہیں وہ کائنات کو سعی و عمل کا ایک وسیع میدان قرار دیتی ہے اور یہاں کی کامیابی کو سعی و تدبیر کی شرط سے مشروط کرتی ہے۔

دنیا میں ہر گروہ کے لیے، ہر فرد کے لیے اور ہر عقیدے کے لیے خواہ وہ حق ہو یا باطل کامیابی کی راہیں کھلی ہوئی ہیں یہاں تک کہ جو شخص گمراہی اور فساد کی راہ اختیار کرتا ہے وہ بھی اپنی سعی و عمل کے مطابق کامیابی حاصل کر سکتا ہے اور کائنات کی کوئی قوت اس کی راہ میں مزاحم نہیں ہوتی کیونکہ اس کی تخلیق کچھ ایسی ہوئی ہے کہ اس کی وسیع گود میں ہر سعی کے لیے راہ ہموار ہو جاتی ہے اور

ہر عمل کا راستہ آسان ہو جاتا ہے خواہ وہ سعی بجائے خود سعی غلط اور وہ عمل عمل غیر صالح ہو غرضیکہ کائنات میں کسی حرکت اور کسی عمل کے لیے مزاحمت نہیں پائی جاتی ہے۔ عدم مزاحمت اس کا بنیادی قانون ہے۔ کسی فرد یا گروہ کو جو خود قدم اٹھاتے کائنات آپ ہی کامیابی عطا نہیں کرتی ہے۔ محض خلوص نیت دعائیں اور آرزوئیں خواہ وہ مومن کی ہوں یا کافر کی اسے کامیاب نہیں کر سکتی ہیں جب تک عمل کی طاقت اس کی پشت پناہ نہ ہو لیکن اہلِ ایمان اور صالحین کے لیے خالق کائنات نے یہ گنجائش رکھی ہے کہ اگر وہ سعی و عمل کے قانون کے مطابق کام کریں اور اپنے مقصد کے لیے ابتدائی قدم اٹھائیں تو کائنات کی تمام قوتیں ان کی مساعدت کرنے لگتی ہیں۔ مگر یہ مساعدت حرکت و اقدام اور سعی و عمل کے ساتھ مشروط ہے یعنی ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی صالح گروہ زمین پر حق کے لیے جد وجہد نہ کر رہا ہو پھر بھی کائنات کی قوتیں محض اس لیے اس کا ساتھ دیں کہ وہ صالح ہے بلکہ جدوجہد کی ابتدا اہلِ ایمان کی جانب سے ہونی چاہیے۔ پھر قوائے فطرت اس کے لیے سامان امداد بہم پہنچاتی ہیں۔ فطرت کائنات اس کی مقتضی ہے کہ کوئی گروہ قیام حق کے لیے کھڑا ہو اور جب ایسا کوئی گروہ نمودار ہوتا ہے تو قدرت اس کے لیے سرو سامان کامیابی بہم پہنچاتی ہے۔ یہی صورت حال فرعون کے مقابلہ میں بنی اسرائیل اور حضرت موسیٰ کے لیے رونما ہوئی بما صبروا اسی کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

۱۶۳- اور وارث بنا دیا ہم نے ان لوگوں کو جن کو کمزور سمجھا جاتا تھا اس ملک کے مشرقی اور مغربی حصوں کا جو ہماری بخشی ہوئی برکتوں سے مالا مال ہے۔ یعنی بنی اسرائیل کو اکثر مفسرین کے نزدیک اس زمین سے مراد ملک شام ہے جس میں حق تعالیٰ نے بہت سی ظاہری و باطنی برکات ودیعت کی ہیں۔ ظاہری تو یہی ہے کہ نہایت سرسبز و شاداب سیر حاصل خوشنما منظر اور زرخیز ملک ہے۔ اور باطنی اس لیے کہ بہت سے انبیاء علیہم السلام کا مدفن ہے۔ بنی اسرائیل مصر سے نکل کر ایک عرصہ تک صحرائے تیہ میں سرگرداں پھرتے رہے جیسا کہ پہلے گزر چکا بعدہ حضرت یوشع کے ساتھ ہو کر عمالقہ سے جہاد کیا اور اپنے آبائی وطن یک شام کے وارث بنے۔ بعض مفسرین نے اس زمین سے مصر مراد لیا ہے یعنی فرعونیوں کو غرق کر کے ہم نے بنی اسرائیل کو مصر کی دولت کا وارث بنا دیا کہ آزادی کے ساتھ اس سے متمتع ہوں۔

کم ترکوا من جنات وعیون وزروع ومقام کریم ونعمۃ کانوا فیھا فاکھین کذالک واورثناھا قوما آخرین۔

کتنے ہی باغ اور چشمے اور کھیت اور شاندار محل جو وہ چھوڑ گئے اور کتنے عیش کے

سروسامان جن میں وہ مزے کر رہے تھے ان کے پیچھے رہ گئے یہ ہوا ان کا انجام اور ہم نے دوسروں کو ان کا وارث بنا دیا۔ (سورہ الدخان رکوع ۱)

و نرید ان نمن علی الذین استضعفوا فی الارض و نجعلھم ائمۃ و نجعلھم الوارثین و نمکن لھم فی الارض و نری فرعون و ھامان و جنودھما منھم ما کانوا یحذرون۔

اور ہم یہ ارادہ رکھتے تھے کہ مہربانی کریں ان لوگوں پر جو زمین میں ذلیل کر کے رکھے گئے تھے اور انہیں پیشوا بنا دیں اور ان ہی کو وارث بنا دیں اور زمین میں ان کو اقتدار بخشیں اور ان فرعون اور ہامان کے لشکر کو وہ کچھ دکھائیں جس کا انہیں اندیشہ تھا۔

اس صورت میں مصر کی ظاہری برکات تو ظاہر ہیں۔ باطنی اس حیثیت سے ہوں گی کہ حضرت یوسف علیہ السلام وہیں مدفون ہوتے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام وہاں تشریف لے گئے اور آخر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بچپن سے لے کر بڑی عمر تک طویل مدت اسی ملک میں گزاری۔ امام بغوی نے مفسرین کے دونوں قول جمع کر کے اس جگہ مصر و شام دونوں مراد لیے ہیں [1]

اس آیت میں تین اہم باتیں کہی گئی ہیں

ایک یہ کہ بنی اسرائیل کو حقیر و کمزور سمجھا جاتا تھا

دوسرے یہ کہ ہم نے بنی اسرائیل کو ملک کے مشرقی اور مغربی حصوں کا وارث بنا دیا۔

تیسرے یہ کہ جس سرزمین کی بنی اسرائیل کو وراثت ملی تھی اس کو سرزمین کو ہم نے برکتوں سے مالا مال کیا تھا۔

پہلی بات تو بے غبار ہے کہ فرعونیوں کی نظر میں بنی اسرائیل حقیر و کمزور تھے اور غلامی نے ان میں عزم و ہمت کو بالکل نہ چھوڑا تھا۔ وہ اس قدر بے بس تھے کہ کسی حکومت کا مقابلہ کرنے کی ان میں تاب نہ تھی۔ ان حالات میں ان کے بارے میں وہم بھی نہ ہو سکتا تھا کہ منصب حکمرانی پر فائز ہوں گے۔

دوسری بات کہ ہم نے بنی اسرائیل کو ملک کے مشرقی اور مغربی حصوں کا وارث بنا دیا۔ اس

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ملک سے جس کا بنی اسرائیل کو وارث بنایا کون سا مراد ہے۔ اس موضوع پر شارحین قرآن کے صرف دا ہی نہیں بلکہ تین خیال ہیں۔

ایک یہ کہ شام و فلسطین مراد ہے یہ حضرت قتادہ، الحسن البصری، زید بن اسلم کی رائے ہے۔

دوسرا خیال یہ ہے کہ اس سے مراد سرزمین مصر ہے اور تیسری رائے یہ ہے کہ دونوں مراد ہیں۔

پہلی رائے کو عام شارحین کے یہاں شرف پذیرائی حاصل ہے کیونکہ تاریخ اور قرآن دونوں اسی کے مؤید ہیں۔ تاریخ سے یہ ثابت نہیں ہے کہ بنی اسرائیل ہجرت کے بعد پھر مصر واپس گئے ہوں اور خود قرآن کی دوسری تصریحات سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔ سورہ بقرہ، مائدہ، اعراف اور سورہ طٰہٰ میں جو حالات بیان کیے گئے ہیں۔ ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ فرعون کی غرق آبی کے بعد بنی اسرائیل مصر کی طرف پلٹنے کے بجائے اپنی منزل مقصود فلسطین کی طرف روانہ ہوگئے۔ اور پھر حضرت داؤد کے زمانے تک ان کی تاریخ میں جو واقعات بھی پیش آئے وہیں پیش آئے جو آج جزیرہ نما سینا، شمالی عرب، شرق اُردن اور فلسطین کے ناموں سے موسوم ہے اس لیے یہاں مشارق الارض و مغاربہا کا صحیح مفہوم یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ملک مصر بنی اسرائیل کو بخش دیا بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ فلسطین اور شام کا ملک جو مصر کے مشرق میں واقع ہے اور اس کے مغربی حصوں کا ملک یعنی جزیرہ نما سینا جو فلسطین کے مغرب میں ہے ہم نے اُن کو دے دیا۔ یہ تمام علاقہ اس وقت مصری شاہنشاہی کا حصہ تھا کیونکہ اس وقت فرعون کی حکومت شام سے لیبیا اور بحرِ روم کے سواحل سے حبش تک تھی۔

اور یہاں بارکنا فیہا کی قید بھی بتا رہی ہے کہ اس ملک سے شام، فلسطین کا علاقہ مراد ہے کیونکہ یہ استعارہ عموماً قرآن میں فلسطین ہی کے لیے استعمال ہوا ہے اور کسی علاقہ کا نام لیے بغیر جب اس کی یہ صفت بیان کی جاتی ہے تو اس سے یہی علاقہ مراد ہوتا ہے۔ مثلاً سورہ بنی اسرائیل میں ہے۔ الی المسجد الاقصی الذی بارکنا حولہ اور سورہ انبیاء میں ارشاد ہوا ہے و نجینٰہ و لوطاً الی الارض التی بارکنا فیہا للعالمین اور عاصفۃ تجری بامرہ الی الارض التی بارکنا فیہا اسی طرح سورہ سبا میں ہے القری التی بارکنا فیہا، کے الفاظ سرزمین شام و فلسطین ہی کی بستیوں کے متعلق استعمال ہوتے ہیں۔ اس بنا پر راجح یہی ہے کہ آیت میں الارض سے مراد سرزمین فلسطین و شام ہے اور اس سرزمین میں چونکہ پہلے فرعون کی ہی حکومت تھی اس لیے یہاں اورثنا کی تعبیر اختیار فرمائی اور سورہ الشعراء میں جہاں فرعونیوں کے باغوں، چشموں، خزانوں اور

بہترین قیام گاہوں سے محرومی کا ذکر ہے وہاں بھی مصر کے نہیں بلکہ فلسطین و شام کے باغات، چشمے اور خزانے مراد ہیں۔

حضرت لیث بن سعد کی رائے ہیں اس سرزمین سے سرزمین مصر ہی مراد ہے۔ ان کے خیال میں فرعون کے اموال و املاک کا بنی اسرائیل کو اللہ نے وارث بنایا تھا لیکن تاریخ سے اس کی تائید نہیں ہوتی ہے۔

بنی اسرائیل کی ہمت و استقامت

۱۶۴- اس طرح تیرے رب کا پسندیدہ فرمان بنی اسرائیل کے حق میں پورا ہوا کیونکہ وہ ہمت و ثبات کے ساتھ جمے رہے۔ یعنی بنی اسرائیل نے جب فرعونیوں کے سخت تباہ کن شدائد پر صبر کیا۔ موسیٰ علیہ السلام کی ہدایت کے موافق خدا سے استعانت اور خدا کے رسول کا ساتھ دیا تو اللہ سبحانہ نے جو نیک وعدہ ان سے کیا تھا عسیٰ ربکم ان یہلک عدوکم اور نرید ان نمن علی الذین استضعفوا وہ پورا کر دکھایا۔[1]

اس میں قرآن نے پہلے اس وعدے کی طرف اشارہ کیا ہے جس کا ذکر پہلے عسیٰ ربکم ان یہلک میں ہو چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو وعدہ اللہ سبحانہ نے بنی اسرائیل کے آباؤ اجداد سے کیا تھا اور جس کی تجدید بالآخر حضرت موسیٰ نے فرمائی وہ وعدہ بالآخر ہلاکت فرعون سے پورا ہوا۔ پورا ہونے کا مطلب بالکل واضح اور صاف یہ ہے کہ اب اس کا حصہ باقی نہیں رہا۔ اور دوسری بات اس میں جو ارشاد فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ یہ وعدہ اس طرح پورا ہوا کہ اس کے حصول کے لیے بنی اسرائیل نے صبر کا مثالی کردار پیش کیا۔ یہ بات نہیں کہ مجرد خاندان و نسب کسی کو خدا کا چہیتا بنا دیتا ہے۔ لفظ صبر میں بہت بڑی اور گہری معنویت ہے۔ صبر کے تین معنے یہاں بھی ملحوظ ہیں۔ رکنا، سہنا، اور ڈٹنا۔ رکنا یہ کہ وہ اللہ کی نافرمانیوں سے زندگی کے ہر شعبے میں رک گئے۔ اور سہنا یہ کہ اس راہ میں فرعون کی جانب سے جو شدائد اور تکلیفیں آئیں ان کو برداشت کیا۔ اور ڈٹنا یہ کہ اللہ کی جانب سے ان پر جو فرائض عاید ہوتے ان پر پوری طرح کاربند رہے۔ یہی جہاد ہے اور یہی وہ کسوٹی ہے جس پر کھرے کھوٹے کی تمیز ہو جاتی ہے۔ اپنے ایمان کا امتحان

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کرنا چاہتے ہو تو دیکھو خدا کی راہ میں تکالیف و مصائب برداشت کرنے کی خواہش تم میں کتنی ہے۔ کیونکہ یہی خواہش ایمان کی حقیقی کسوٹی ہے۔ قرآن کی یہ آیت ہمارے لیے درسِ عبرت ہے۔ غور کیجیے آج کتنے مسلمان ہیں جن کے قلوب جہاد فی سبیل اللہ کی خواہش سے معمور ہیں۔ جو لوگ ہم میں سب سے اچھے ہیں انہیں کے دلوں کا جائزہ لیجیے کیا ان میں سرفروشی اور جاں نثاری کی آرزو کہیں جھلکتی نظر آتی ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ کی خواہش تو اسی صورت میں پیدا ہو سکتی جب ہم بنی اسرائیل کی طرح غیر اسلامی ماحول اور کافرانہ نظامِ تمدن سے غیر مطمئن ہوں اور اسے بدلنے کی آرزو رکھتے ہوں اور کہتے ہوں ربنا لا تجعلنا فتنۃ للقوم الظالمین و نجنا برحمتک من القوم الکافرین۔ وہ لوگ جہاد کی تمنا کیوں کرنے لگے جو موجودہ ماحول کی آسائشوں اور نعمتوں اور کافرانہ نظامات کے منافع سے استفادہ کر رہے ہوں اور نہ اس استفادہ کو برا سمجھتے ہوں اور نہ ان نظامات سے باہر نکلنا چاہتے ہوں، جو لوگ غیر اسلامی نظامات اور باطل افکار و اقدار کی خدمت کرنے اور ان سے نفع حاصل کرنے کے بعد محض رسوم و شعائرِ عبادت کی ادائیگی کی بنا پر اپنے تئیں نجات کا مستحق سمجھتے ہوں انہیں کیا پڑی ہے کہ حق کے قیام کی خاطر جان و مال کی قربانی دیں اور صداقت کی تبلیغ اور اشاعت کے لیے تکلیفیں اور مصیبتیں برداشت کریں۔ خدا کا کلمہ بلند کرنے کی خواہش اور اس کے لیے ایثار و قربانی کا جذبہ تو اس جماعت میں پیدا ہو سکتا ہے جو بنی اسرائیل کی طرح فرعونی تہذیب سے بیزار اور اس کی جگہ اسلامی تہذیب کے قیام کی آرزومند ہو۔ اس کے برعکس غیر اسلامی نظاموں سے ہماری وابستگی اس قدر پختہ ہو گئی ہے کہ نہ صرف ان نظاموں سے باہر نکلنے کی خواہش ہم میں باقی نہیں رہی ہے بلکہ جب کبھی ان نظاموں کو خطرہ لاحق ہوتا ہے ہماری تمام کوششیں ان نظاموں کی حفاظت و بقا میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ ہم میں سے جو لوگ فی الجملہ دیندار ہیں انہوں نے بھی عبادات و ریاضیات اور معاشرتی فرائض کی ادائیگی کو پورا اسلام سمجھ رکھا ہے حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کی داستان میں ان کے لیے سرمۂ چشم بصیرت ہے۔ اُن کا حال یہ ہے کہ چند عبادات کو ادا کر لینے کے بعد وہ غیر اسلامی تہذیب و تمدن کی جگہ اسلامی تہذیب و تمدن کے قیام کی نہ ان میں آرزو باقی رہ گئی ہے اور نہ اس کے لیے وہ کسی قسم کی جد و جہد کرنے پر آمادہ ہیں۔ اگر اس آیتِ قرآنی کی روشنی میں ہم اپنے آپ کا جائزہ لیں تو معلوم ہو گا کہ ہم میں سے ننانوے فی صد بلکہ اس سے زیادہ اشخاص نظامِ کفر کے مقابلہ میں اصبروا کی عملی تفسیر سے تہی دامن ہیں۔ جب تک مسلمان عملاً اس کا نمونہ نہ بنیں گے یہ ساری سیاست بازی اور نمائشی تنظیم

کچھ کام نہ آسکے گی اور ذلت و رسوائی کا داغ ہماری قومی پیشانی پر اسی طرح لگا رہے گا۔ خواہ ہم میں سے ہر شخص سال کی ساری راتوں اور دنوں میں دوازدہ تسبیحات کا ورد کرتا رہے اور ہمارا ہر نوجوان علوم دینی میں کامل اور ماہر بن کر آسمانِ شہرت پر چمکنے لگے۔ یہ آیت ہم سے مطالبہ کرتی ہے کہ ہم بنی اسرائیل کی طرح فرعون کے کافرانہ نظام کو ہٹانے اور اسلامی نظامِ تمدن کے قیام اور دینِ حق کے غلبہ کی خاطر خدا کی راہ میں صعوبتیں برداشت کی جائیں اور اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے ایثار و جاں فروشی کی جاتے چونکہ ہم اسلام کے معمولی فرائض و واجبات پر قانع ہو گئے ہیں اور فضیلت کے اعلیٰ مقام تک پہنچنے کی آرزو سے ہمارے دل خالی ہو چکے ہیں اسی لیے ہم پر پستی اور دوں ہمتی طاری ہے۔ نیکی یہ ہے کہ وہ خدا کی راہ میں قربانیاں اور نبوت کا لایا ہوا نظامِ علم و عمل قائم کرنے کے لیے محنت کرے لیکن ان دونوں نیکیوں میں عظیم الشان فرق ہے۔ جو لوگ صرف ادنیٰ نیکیوں پر قناعت کر لیتے ہیں انہیں دُنیا میں ترقی اور سربلندی کی خواہش سے بھی دستبردار ہونا پڑتا ہے۔ رفعت و سربلندی صرف ان قوموں کے لیے ہے جو اعلیٰ ترین نیکیوں اور بلند ترین درجات کے لیے کوشاں رہتی ہیں۔ انسان کی کامیابیاں اور مسرتیں اس کے تخیل کی رفعت کے اعتبار سے کم یا زیادہ ہوتی ہیں۔ اگر تخیل بلند ہے تو کامیابیاں اور مسرتیں بھی بلند ہوں گی۔ ہم نے اسلام کا پست تصور قائم کر رکھا ہے اس لیے ہماری کامیابیوں کا دائرہ محدود اور مسرتوں کی سطح پست ہے۔

حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کو جو اسلام کا تصور دیا تھا وہ صرف بنی اسرائیل کی نجات کا تصور تھا۔ قرآن نے مسلمانوں کو جو اسلام کا تصور دیا ہے وہ صرف شخصی نجات کا نہیں بلکہ پورے عالم کی نجات کا تصور ہے۔ ظاہر ہے کہ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے اور اس کے نتیجہ میں ان کوششوں اور محنتوں میں بھی فرق ہوگا جو اسلام کی خاطر بنی اسرائیل نے کیں اور جو مسلمانوں کو کرنی چاہئیں۔ ان کا مقابلہ اگر فرعونِ مصر سے ہوا تو مسلمانوں کا مقابلہ پورے عالم کے فراعنہ سے ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن نے مسلمانوں سے کہا ہے کہ اپنی نجات چاہتے ہو تو دنیا بھر کی نجات کی فکر لے کر اٹھ کھڑے ہو۔ اسی وجہ سے مسلمانوں کو صرف اپنے اعمال کی اصلاح کا حکم نہیں دیا گیا ہے بلکہ ایک قدم بڑھ کر تمام انسانوں کی بھلائی اور برائی کا ذمہ دار قرار دیا ہے کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنہون عن المنکر اس حکم کی مصلحت یہ ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو دوسرے کی بھلائی اور برائی کا ذمہ دار سمجھے گا وہ لازماً اپنے اعمال کی اصلاح کے لیے بھی کوشاں رہے گا ورنہ سوسائٹی خود اسے ملامت کرے گی کہ دوسروں کو نصیحت کرنے سے

پہلے اسے اپنے اعمال درست کرنے چاہئیں۔ نیز اس فرض کی انجام دہی میں اس کا اس سے اجتناب کرتا رہے گا لیکن دوسروں کو نیکی کی طرف دعوت دینا اور برائی سے روکنا اس وقت ممکن ہے جب دوسرے لوگ اس کی بتائی ہوئی نیکی کو نیکی خیال کریں اور جس بات کو وہ برا خیال کرے اسے برا سمجھیں بالفاظ دیگر اصلاح اعمال کی کوشش اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب خیر و شر کا وہ تصور اور حق و باطل کا وہ معیار عملاً کارفرما ہو جس کی طرف ہمیں دنیا کو دعوت دینی ہے۔ جہاں فرعونی نظام نے غلبہ پا کر انسان کے معیار ترک و اختیار اور اقدار حیات کو الٹ کر رکھ دیا ہو وہاں نیکی کی طرف دعوت دینا اور برائی سے روکنا ایک فعل عبث ہے کیونکہ جب تک نیکی اور بدی کا معیار پھر سے قائم نہ ہو جائے لوگ آپ کی دعوت کو جنون یا دقیانوسیت پر محمول کر کے حق سے اعراض کریں گے الناس علی دین ملوکھم ایک تلخ حقیقت ہے جس سے آپ منہ نہیں موڑ سکتے۔ جو نظام تمدن دنیا پر غالب ہو گا اور جس قوم کی تہذیبی برتری عملاً قائم ہو گی اس کے اقدار و غایات دوسرے تمام انسانوں کے اقدار و غایات کا ماخذ ہوں گے اور اسی کا معیار خیر و شر دنیا میں رائج ہو گا۔ صرف غیر مسلم ہی نہیں بلکہ مسلمان بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر انہی خیالات و نظریات کا دم بھریں گے جو حکمران تہذیب اپنے ساتھ لائی ہے پوری تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے۔ یہی راز ہے حضرت موسیٰ کے اس مطالبہ کا کہ ان ارسل معنا بنی اسرائیل کیونکہ اگر اپنے آپ کو نیک بنانا ہے تو پہلے باطل نظامات کے پیدا کیے ہوئے نظریات و افکار کو توڑنا ہو گا اور اسلامی معیار خیر و شر کو قائم کرنا ہو گا۔

فرعونی تہذیب و تمدن کی تباہی

۱۶۵- اور فرعون اور اس کی قوم جو بناتے رہے تھے اور جو بلندیاں اٹھاتے رہے تھے ہم نے سب درہم برہم کر دیے۔ یعنی فرعون اور اس کی قوم نے اپنے کبر و نخوت کے اظہار کے لیے جو ڈھونگ بنا رکھا تھا وہ سب تباہ و برباد ہو گیا اور ان کی اونچی اونچی عمارتیں تہ و بالا کر دی گئیں[۱] مطلب یہ ہے کہ نظام باطل جس نظام تمدن و تہذیب کی تخلیق کی تھی اس کو تباہ برباد کر دیا گیا۔ لیکن یہ تباہی کیوں کر ہوئی، اس وقت ہوئی جب اسلامی نظام عدل و حق کو قائم کرنے کا مقصد

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

بنی اسرائیل حضرت موسیٰ کی قیادت میں لے کر کھڑے ہو گئے۔ جماعت ہو یا فرد مقاصد کی کشش، اس کی جدوجہد کا اصلی محرک ہے۔ اسلام ایک نظامِ حیات ہے۔ یہ پورا نظام اعلاءِ کلمۃ اللہ اور دینِ حق کے قیام کی سعی و طلب پر استوار ہے۔ روزہ، نماز، عبادات و فرائض اور اوامر و نواہی سب کے سب بالآخر اس غایت اصلی کے تابع ہیں کہ خدا کی زمین پر بس اس کی بندگی کی جائے اور معبودانِ باطل کو ہر جگہ سے نکال دیا جائے۔ خواہ یہ معبود ہوائے نفس کی شکل میں ہو یا دیوتاؤں اور بتوں کی، طبقاتی اور قومی مفاد کی صورت میں ظاہر ہوں یا آمروں لیڈروں اور فرعون جیسے بادشاہوں کا بھیس بدل کر آئیں۔ فرعونی نظام تہذیب و تمدن کی تباہی کا راز اور اس حیرت انگیز انقلاب کی وجہ یہ اور صرف یہ تھی کہ بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰ کی تعلیم کی برکت سے اعلاءِ کلمۃ اللہ کی خدمت انجام دے کر اللہ کا تقرب حاصل کرنے کی طلب و آرزو پیدا ہو گئی تھی۔ ان میں اسلام کے اخلاقی اقدار اور نبوت کے معیارِ خیر و شر کو فرعون کے معیارِ خیر و شر پر حکمران بنا کر اپنے اللہ کو راضی کرنے کی خواہش تھی اور بس ہمیں بھی بنی اسرائیل کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنا چاہیے۔ قرآن نے اس کو ہمارے لیے یہ کہہ کر آئینہ بنایا۔

انا ارسلنا الیکم رسولا شاھدا علیکم کما ارسلنا الی فرعون رسولا

بلاشبہ ہم نے تمہاری طرف ایسا ہی عظیم المرتبت پیغامبر روانہ کیا شاہد بنا کر جیسا کہ ہم نے فرعون کی طرف رسول بھیجا۔

عہدِ رسالت کے مسلمانوں کو آج کل کے مسلمانوں سے یہی چیز ممیز کرتی ہے کہ ان میں اس مقصد کی لگن اور اس کا صحیح شعور تھا۔ ان کو احساس تھا کہ اللہ نے اس لیے ان کو مبعوث کیا ہے کہ وہ لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لائیں۔ انسانوں کی بندگی چھڑا کر اللہ کی بندگی پر آمادہ کریں۔ اور انہیں دنیا کی تنگی سے نکال کر کشادگی کی طرف لائیں اور مذاہب کی کجروی اور بے اعتدالی سے نکال کر اسلام کی صراطِ مستقیم پر لگائیں۔ وہ اس تخیل کے داعی تھے اور اس سے ان کو اتنی شدید محبت تھی کہ اس کے لیے کوئی قربانی نہ تھی جسے انہوں نے گوارا نہ کیا ہو اور کوئی مشقت نہ تھی جو انہوں نے سہی نہ ہو۔

بہر حال حضرت موسیٰ، بنی اسرائیل کی داستان میں ہمارے لیے بہت بڑی عبرت کی باتیں ہیں یہی وجہ ہے کہ قرآن میں حضرت موسیٰ کے واقعات کو تفصیل اور تکرار سے پیش کیا گیا ہے۔

یہ آیت واشگاف طور پر بتا رہی ہے کہ اللہ کا وعدۂ نصرت ان ہی کے حق میں پورا ہوتا ہے جو اس کی شرط کو پورا کریں۔ یعنی راہِ عمل میں جمے رہیں اگر بنی اسرائیل یہ شرط پوری نہ کرتے تو کامیابی سے محروم رہتے ❊

وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰى قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓى
اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوْا يٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ۭ قَالَ
اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ اِنَّ هٰٓؤُلَاۗءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ وَبٰطِلٌ مَّا
كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ قَالَ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَّهُوَ فَضَّلَكُمْ
عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۴۰﴾ وَاِذْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ
سُوْۗءَ الْعَذَابِ ۚ يُقَتِّلُوْنَ اَبْنَاۗءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَاۗءَكُمْ ۭ وَفِيْ
ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿۱۴۱﴾

اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر سے پار کر دیا، اُن کا گزر ایسے لوگوں پر ہوا جو اپنے کچھ بتوں پر مجاور بنے بیٹھے تھے[166]۔ بنی اسرائیل نے کہا اے موسیٰ ہمارے لیے بھی کوئی ایسا ہی معبود بنا دے جیسے ان لوگوں کے معبود ہیں، موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تم بلاشبہ بڑی نادانی کی باتیں کرتے ہو۔ یہ لوگ جس طریقہ پر چل رہے ہیں

وہ تو تباہی کا راستہ ہے اور انہوں نے جو عمل اختیار کیا ہے وہ بالکل غلط ہے[۱۶۸]۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہارے لیے اللہ کے سوا کوئی اور معبود تلاش کر دوں، حالانکہ یہ اللہ ہی کی ذات ہے جس نے تمہیں دُنیا کی قوموں پر بزرگی عطا فرمائی ہے[۱۶۹]۔ اور اللہ فرماتا ہے کہ اے بنی اسرائیل وہ وقت یاد کرو کہ ہم نے تمہیں فرعون کی قوم سے نجات دی وہ تمہیں سنگین سزا دیتا تھا تمہارے لڑکوں کو قتل کرتا اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھتا تھا اور اس میں تمہارے رب کی جانب سے بڑی ہی آزمائش تھی[۱۷۰]۔

معانی مفردات

یعکفون، عکوف سے مضارع کا جمع مذکر غائب ہے۔ راغب اصفہانی لکھتے ہیں۔ عکوف کے معنے ہیں تعظیم کے طور پر کسی چیز کی طرف متوجہ ہونا اور اس کو لازم پکڑ لینا۔ تاج المصادر میں اس کے حسب ذیل معانی لکھے ہیں۔ روکا جانا، کسی چیز کی طرف متوجہ ہونا، کسی چیز کے گرد جمع ہونا۔ کسی جگہ میں مقیم ہونا ارشاد باری العاکف فیہ والباد کے متعلق ابو بکر الجصاص فرماتے ہیں کہ سلف کی ایک جماعت سے مروی ہے کہ عاکف سے مراد اہل حرم اور الباد سے مراد غیر اہل حرم ہیں اور ظلت علیہ عاکفاً میں عاکف بمعنی مجاور ہے کیونکہ جب عکوف کا صلہ علیٰ آتا ہے جیسے

یہاں یعکفون علی اصنام لھم تو اس کے معنے ہوتے ہیں کسی چیز کی طرف اس طرح لگنا کہ منہ نہ موڑے۔ تاج العروس میں ہے عکف علیہ اقبل علیہ مواظبا لا یصرف وجھہ عنہ یعنی اس کی طرف اس اہتمام سے متوجہ ہوا کہ ادھر سے کہ منہ ہی نہیں ہٹاتا سوء العذاب علامہ سید مرتضیٰ زبیدی نے لکھا ہے کہ یہ آفات و امراض کا ایک جامع نام ہے۔ امام راغب فرماتے ہیں کہ سوء ہر وہ چیز ہے جو انسان کو غم میں ڈال دے خواہ دنیوی امور میں سے یا اخروی امور سے احوال نفسیہ سے ہو یا احوال بدنیہ سے یا ان حالات میں سے ہو جو جاہ، مال کے چھوٹ جانے سے اور دوست کے بچھڑ جانے سے پیدا ہوتے ہیں۔ قرآن میں اس کا استعمال جن معانی میں ہوا ہے۔ علامہ جلال الدین السیوطی نے ان کو الاتقان فی علوم القرآن میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ سوء کئی طرح پر استعمال ہوتا ہے۔ شدت کے لیے جیسے یسومونکم سوء العذاب کونچیں کاٹنے کے لیے جیسے لا تمسوھا بسوء، زنا کے لیے من اراد باھلک سوء برص کے لیے بیضاء من غیر سوء عذاب کے لیے السوء علی الکافرین شرک کے لیے ماکنا نعمل من سوء، گالی گلوچ اور یاوہ گوئی کے لیے لا یحب اللہ الجھر بالسوء گناہ کے لیے و یعملون السوء بجھالۃ ضرر کے لیے و یکشف السوء قتل و ہزیمت کے لیے لم یمسسھم سوء، بلاء، آزمائش مصدر ہے جب اس کی ماضی باب سمع سے آتی ہے تو اس کے معنے بوسیدہ ہونے کے آتے ہیں اور جب باب نصر سے آتی ہے تو امتحان و آزمائش کے معنے ہوتے ہیں۔ غم کو بھی بلاء اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ جسم کو گھلا دیتا ہے۔ تکلیف کو بھی بلا اسی لیے کہتے ہیں کہ جتنی تکلیفیں ہیں سب بدن پر گراں ہیں۔ قرآن کی آیت و لنبلونکم حتیٰ نعلم المجاھدین منکم والصابرین سے ظاہر ہے کہ تکالیف آزمائش کے لیے ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کبھی تو بندوں کو فراخی دے کر آزماتا ہے اور کبھی تنگی کے ذریعے آزماتا ہے ارشاد ہے و نبلوکم بالشر والخیر فتنۃ بہ نسبت شکر کے صبر کے حقوق کی بجاآوری زیادہ آسان ہے اسی لیے نعمت سے بہ نسبت محنت و مشقت کے زیادہ آزمائش ہے۔ حضرت عمر فرماتے ہیں بلینا بالضراء فصبرنا و بلینا بالسراء فلم نصبر اس آیت فی ذالکم بلاء من ربکم عظیم میں نعمت و مشقت دونوں طرح کی آزمائش مذکور ہے۔ فرعون سے نجات دینا نعمت ہے اور بچوں کا قتل اور عورتوں کا زندہ رکھنا مشقت ہے۔

وادیٔ سینا کے مندر اور بنی اسرائیل

دُنیا کی تاریخ میں یہ بڑی حیرت زا اور عجیب بات ہے کہ بنی اسرائیل تقریباً ساڑھے چار سو سال سے مصر کے قاہر و جابر بادشاہوں اور مصری قوم کے ہاتھوں میں غلام اور مظلوم اور غالب قوم کے سخت سے سخت مصائب و مظالم کا شکار بن رہی ہے کہ اچانک اسی مردہ قوم میں سے بجلی کی کڑک اور آفتاب کی چمک کی طرح ایک برگزیدہ ہستی سامنے آتی ہے اور اس کی صدائے حق اور اعلانِ ہدایت سے تمام باطل کی قوتیں لرزہ براندام ہو جاتی ہیں۔ اور ایوانِ ظلم و کفر میں زلزلہ آجاتا ہے۔ رسول ہونے کی حیثیت میں حضرت موسیٰ دُنیا کی ایک زبردست متمدن طاقت کے مقابلہ میں خدا کے رسول ہونے کا اعلان کرتا ہے اور فرعون کو مخاطب کر کے کہتا ہے میں تجھ کو ہدایت کی پیروی اور مظلوموں کی آزادی کا پیغام سنانے آیا ہوں۔ فرعونی طاقت اپنے تمام مادی اسباب کے ساتھ ان کا مقابلہ کرتی ہے مگر ہر بار شکست کھاتی ہے۔ اور آخری بازی میں حق کی کامیابی اور باطل کی ہلاکت کا ایسا حیرت زا نقشہ سامنے آتا ہے کہ مادی طاقت قلزم میں غرق ہو جاتی ہے اور غلام و مظلوم قوم اور دُنیوی اسباب سے محروم قوم آزادی کی فضا میں سانس لیتی ہے۔ صورتِ حال کیسی عجیب ہے کہ فرعون ختم ہو چکا ہے بنی اسرائیل جشنِ مسرت منا رہے ہیں۔ اور اس شادمانی میں حضرت موسیٰ سے سینا کے بُت کدوں میں بُتوں کی پوجا پاٹ کو دیکھ کر یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ ہمیں بھی ایسے ہی معبود بنا دو۔ اِنَّا للہ فالی اللہ المشتکی۔

۱۶۶۔ اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر سے پار کر دیا، ان کا گزر کچھ ایسے لوگوں پر ہوا جو اپنے کچھ بتوں پر مجاور بنے بیٹھے تھے۔ بعض نے کہا کہ یہ قبیلہ لخم کے لوگ تھے اور بعض نے کنعانی عمالقہ کو اس کا مصداق قرار دیا ہے کہتے ہیں کہ ان کے بُت گائے کی شکل پر تھے۔ واللہ اعلم[1]

یہاں جس قوم کا ذکر ہے اس سے کون مراد ہیں۔ ظاہر یہی ہے کہ بنی اسرائیل مصر سے نکل کر سرزمینِ عرب میں داخل ہو رہے ہیں تو اس سے مراد کوئی عرب قوم ہی ہے۔ حضرت قتادہ کا انکشاف یہ ہے کہ اس سے مراد قبیلہ لخم ہے۔ اور دوسرے کہتے ہیں کہ لخم و جذام ہیں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اور علامہ آلوسی نے مجہول کے صیغہ کی تعبیر میں ان کو کنعانی عمالقہ کہا ہے - اور ہماری رائے میں یہی زیادہ قرین قیاس ہے - ابن قتیبہ نے لکھا ہے کہ اہل عرب میں سے عمالقہ میں یہ متعدد قومیں جو ملکوں میں منتشر ہو گئی تھیں اور ان ہی میں مصر کے فراعنہ اور جبابرہ ہیں - مورخ یعقوبی نے بھی اسی قسم کی تصریح کی ہے بلکہ یاقوت نے تو معجم البلدان میں صاف لکھا ہے کہ مصر کے فرعون عمالقہ میں سے تھے - ان ہی میں حضرت ابراہیم کا فرعون اور حضرت یوسف کا فرعون اور حضرت موسیٰ کا فرعون ہے - مورخ ابن خلدون کی تحقیق ہے کہ قدیم باشندگان مصر کے بعض بادشاہوں نے اپنے زمانہ کے عمالقہ سے مدد مانگی وہ آیا اور مصر پر قبضہ کر لیا - ان ہی کے بقایا سینا میں آباد تھے - جب اہل مصر نے ان عمالقہ کو مصر سے نکال دیا اور ان کی حکومت کا مصر میں خاتمہ ہو گیا تو بنی اسرائیل جو سام بن نوح کی اولاد کی شاخ تھے اور عمالقہ کے دور میں طاقتور ہو گئے تھے اب مصریوں نے اپنی حکومت قائم کر لی تھی - انہوں نے چاہا کہ بنی اسرائیل کو کمزور کیا جائے - تورات میں ہے :

> اسرائیل کی اولاد برومند ہوئی اور بہت بڑھی اور فراواں ہوئی اور بہت زور پیدا کیا اور وہ زمین ان سے معمور ہوئی تب مصر میں ایک نیا بادشاہ جو یوسف کو نہ جانتا تھا پیدا ہوا اور اس نے اپنے لوگوں سے کہا دیکھو کہ بنی اسرائیل کے لوگ ہم سے زیادہ اور قوی تر ہیں - ہم ان کے ساتھ دانشمندانہ تدبیر کریں تا نہ ہو وے کہ جب وہ اور زیادہ ہو جاویں اور جنگ پڑے تو ہمارے سے مل جائیں اور ہم سے لڑیں اور ہم کو نکال دیں -

ان الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل کا مصر میں معاملہ بالکل سیاسی نوعیت کا تھا - قرآن عزیز سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے - جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں یرید ان یخرجکم لبحمل (یا ان هذان لساحران یریدان ان یخرجاکم من ارضکم تورات کے اس فقرہ کا کہ تب مصر میں ایک نیا بادشاہ ہوا جو یوسف کو نہ جانتا تھا واضح اور صاف مطلب یہ ہے کہ اب نئی حکومت آگئی جو بنی اسرائیل سے نفرت کرتی تھی - جن عمالقہ کی حضرت موسیٰ سے پہلے حکومت ختم ہوئی تھی ان ہی کا بقایا وادیٔ سینا میں موجود تھا اور بت پرستی کر رہا تھا - یہاں مشہور مفسر قرآن ابن جریر کا یہ انکشاف بے حد وزنی ہے کہ یہ بت بچھڑے کے تھے - گائے بیل اور بچھڑے کی تقدیس کا خیال سمریوں میں بھی تھا اور مصریوں میں بھی - مصری اپنے دیوتا جو اس کا بت گائے

کی شکل کا بناتے تھے۔

بنی اسرائیل کا حضرت موسیٰ سے مطالبہ

۱۶۷۔ بنی اسرائیل نے کہا اے موسیٰ ہمارے لیے بھی کوئی ایسا معبود بنا دے جیسا کہ ان لوگوں کے لیے معبود ہیں موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تم بلاشبہ بڑی نادانی کی باتیں کرتے ہو۔ یعنی حق تعالیٰ کی عظمت، شان اور تنزیہہ و تقدیس سے تم بالکل جاہل معلوم ہوتے ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ مدت دراز تک مصری بت پرستوں کے زیر سایہ رہنے کی وجہ سے بنی اسرائیل کا میلان بار بار اس طرح کے افعال اور رسوم شرکیہ کی طرف ہوتا تھا۔ یہ بیہودہ جاہلانہ درخواست بھی مصر کی آب و ہوا اور وہاں کے بت پرستوں کی صحبت کے تاثرات کو ظاہر کرتی ہے۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ جاہل آدمی نرے بے صورت معبود کی عبادت سے تسکین نہیں پاتا جب تک سامنے ایک صورت نہ ہو وہ قوم دیکھی کہ ایک گائے کی صورت پوجتی تھی ان کو بھی یہ ہوس آئی آخر سونے کا بچھڑا بنایا اور پوجا[۱]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصر کی طویل غلامی نے بنی اسرائیل کی ذہنی و اخلاقی سطح اس حد تک پست کر دی تھی کہ حضرت موسیٰ کی صحبت میں خدا کے جمال و جلال کی اتنی شانیں دیکھنے کے بعد بھی وہ گویا ابھی مصر کی مشرکانہ تاریکیوں میں تھے اور توحید کے بارے میں ان کا مبلغ علم بے حد کمزور اور سطحی تھا۔ اسی بنا پر حضرت موسیٰ نے اُن کو تجھلون کہہ کر مخاطب کیا ہے یعنی تم آیات عظیمہ دیکھنے کے باوجود اللہ سبحانہ کی عظمت سے قطعاً نابلد اور بے خبر ہو اور صرف بے خبر اور ناواقف نہیں بلکہ بیوقوف بھی ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اُمتوں میں اللہ سے عابدانہ تعلقات ٹوٹنے کا ایک اہم سبب بے خبری اور ناواقفیت ہے۔ جس قدر مبلغ علمی ترقی کرے گا اسی قدر خدا کی معرفت زیادہ ہو گی اور جس قدر خدا شناسی بڑھتی جائے گی اسی نسبت سے اللہ سے تعلقات عبادت قائم ہوتے جائیں گے۔ یہ سوال بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ سے اسلام کی حقیقت سے ناآشنا ہونے کی وجہ سے کیا ہے۔ اگر اُن کو پتہ ہوتا کہ اسلام یہ ہے تو وہ کبھی یہ سوال نہ کرتے۔ بت پرستوں میں رہ کر شرک بنی اسرائیل کی عادت میں داخل ہو گیا تھا۔ خود ہم پر بھی ہندوؤں کا اثر ہوا ہے یہاں تک کہ قبر پرستی کی صورت میں طرح طرح کے مشرکانہ عمل ہم کر رہے ہیں۔ اس کا بنیادی سبب دین

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

ناآشنائی کے سوا کچھ نہیں ۔ اس آیت میں علماء کے لیے بہت بڑی عبرت ہے کہ حضرت موسیٰ خالص اس مشرکانہ ذہن رکھنے والوں پر کوئی فتویٰ نہیں لگاتے ہیں بلکہ سمجھائے ہیں کہ تم نادان اور بے خبر ہو عوامی زندگی جو اعمال نادانی اور بے خبری میں کرتی ہے اس کا بہترین علاج بے خبری کو دور کرنا ہے۔

نبی کے مخاطب دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو نبوت کو نہیں مانتے اور دوسرے وہ جو مانتے ہیں۔ پہلے لوگوں کو اُمتِ دعوت کہتے ہیں اور دوسروں کو اُمتِ اجابت کہتے ہیں۔ فرعون اور مصر کے شہری حضرت موسیٰ کے لیے اُمتِ دعوت ہیں جبکہ بنی اسرائیل اُمت اجابت ہیں۔ اب تک جو سرگزشت بیان ہوئی ہے اس کا تعلق حضرت موسیٰ اور ان کی اُمتِ دعوت سے ہے۔ اور یہاں سے سرگزشت کا وہ حصہ شروع ہوا ہے جس کا تعلق حضرت موسیٰ اور اُمتِ اجابت سے ہے۔ پہلے حصہ میں یہ حقیقت واضح کی تھی کہ دعوتِ حق کی مخالفت ہمیشہ طاقتور جماعتوں نے کی ہے اور ہمیشہ ناکام رہی ہیں۔ اس حصہ میں یہ حقیقت واضح کی جارہی ہے کہ نبی کی اُمت کو راہ عمل میں کیسی کیسی لغزشیں پیش آسکتی ہیں تاکہ اہلِ ایمان اس سے آگاہ رہیں۔ غور فرمائیے کہ شرک سے بڑا کون گناہ اور کون سا ہو سکتا ہے خود علمبرداران توحید بھی اس راہ میں ٹھوکر کھا جاتے ہیں لیکن اس کا سبب خدا کی بغاوت نہیں بلکہ خدا ناآشنائی ہوتی ہے۔ اُمت میں یہ بیماری اصلاح طلب ضرور ہوتی ہے مگر مایوس کن نہیں ہوتی ہے۔ اس کا علاج مدعیانہ انداز میں یہ ہرگز نہیں کہ کفر کا میگزین کھول دیا جائے۔ یہ ان کی جہالت اور بے خبری سے ناجائز فائدہ اٹھانا ہے بلکہ اس کا علاج داعیانہ طریق پر یہ ہے کہ ان سے دین ناآشنائی کو دور کیا جائے۔ افسوس کہ ہم یہ سبق بھول چکے ہیں اور اس کے نتیجہ میں اُمت المناک حالات سے دوچار ہے۔ یہاں پہلے حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کو اسلام ناآشنائی کا الزام کیا ہے اور بتایا ہے کہ تمہارا یہ مطالبہ علمی زمین، علمی اصولوں اور علمی حقائق پر مبنی نہیں ہے بلکہ سراسر جہل و نادانی پر مبنی ہے۔

شرک باطل کا گھروندا ہے

۱۶۸- یہ لوگ جس طریقہ پر چل رہے ہیں وہ تو تباہی کا راستہ ہے اور انہوں نے جو عمل اختیار کیا ہے وہ بالکل غلط ہے۔ یعنی ان کا بت پرستی کا مذہب میرے اور اہلِ حق کے ہاتھوں سے تباہ ہونے والا ہے اور جو کچھ سوانگ یہ اب تک بناتے رہے ہیں وہ محض باطل اور بالکل غلط بیکار اور بے حقیقت ہے [1]

[1] افادات شیخ الاسلام

اصل ارشاد میں متبرٌ آیا ہے یہ تبار سے بنا ہے اس کے معنی تباہ ہونے کے ہیں اور تتبیر کے معنے تباہ کرنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ یعنی اصنام پرست ان کی تباہی اور بربادی کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اب ان کا دور ختم ہو رہا ہے یہاں شرک کو سرنگوں ہونا ہے اور توحید کا جھنڈا بلند ہونا ہے اور یہ لوگ جو اعمال کر رہے ہیں خس و خاشاک کی طرح اڑ جائیں گے۔ ان کی زندگی کا کوئی سامان نہیں ہے کیونکہ باطل کی زندگی اسی وقت تک ہوتی ہے جب تک اس کے مقابلہ میں حق نہیں آتا۔ اب چونکہ نبوت حق کی علمبردار بن کر بصورت موسیٰ و ہارون آ چکی ہے اس لیے اب ان کی زندگی کا سوال ہی نہیں ہے۔ یہ گویا حضرت موسیٰ مستقبل کے متعلق پیشین گوئی فرماتے ہیں کہ ان ملکوں میں وثنیت اور بت پرستی کا مستقبل تاریک ہے اور تاریخ کہتی ہے کہ ہوا بھی ایسا ہی ہے۔

علامہ محی الدین بغوی یہاں یہودیوں کے اس مطالبہ پر کہ اجعل لنا الٰہا کما لھم آلھۃ پر یہ خوب نکتہ آفرینی فرمائی ہے کہ بنی اسرائیل کی حضرت موسیٰ سے یہ درخواست اس بنا پر نہ تھی کہ بنی اسرائیل اللہ کی وحدانیت کے قائل نہ تھے یا ان کو خدا کی وحدانیت میں شک تھا بلکہ اس درخواست سے ان کا منشا صرف یہ تھا کہ ہمیں ایسا کوئی الٰہ مہیا کر دیجئے جس کی ہم تعظیم کریں اور اس تعظیم کے ذریعے اللہ کا قرب حاصل کریں۔ ان کے خیال میں اس طرز عمل سے ان کی دینداری میں کوئی خطرہ نہ تھا۔ یہی ان کی جہالت تھی۔

امام رازی نے یہاں ایک قدم اور آگے بڑھا کر یہ بات فرمائی ہے۔ یہ بات قطعاً محال ہے کہ ایک عقل مند آدمی حضرت موسیٰ سے یہ کہے اجعل لنا الٰہا ہمارے لیے خالق و مدبر بنا دیجئے کیونکہ حضرت موسیٰ کے بنانے اور ان کی تدبیر سے کوئی چیز کائنات کی خالق و مدبر نہیں ہو سکتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ سے یہ مطالبہ کیا کہ ان کے لیے کچھ بت یا تصاویر ایسی مقرر کر دیجئے جن سے عابدانہ تعلق قائم کر کے اللہ کا قرب حاصل کریں۔

حیرت ہے امام رازی نے لفظ الٰہ کے لغوی مدلول کو چھوڑ کر آیت میں اس کے کلامی مفہوم پر محمول کیا ہے۔ عربی لغت میں الٰہ کے معنے مطلق معبود کے ہیں۔ خالق و مدبر کے نہیں ہیں اور سب جانتے اور مانتے ہیں کہ دنیا کے شرک نے اللہ کی عبادت میں دوسروں کو شریک کیا ہے قرآن کی بے شمار آیتیں اس کی تائید میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ خود اہل عرب بھی اپنے بتوں کو الٰہ کہتے تھے اور کوئی بھی اس کا معتقد نہ تھا کہ لات و عزیٰ اور منات وغیرہ کائنات کے خالق ہیں۔ وہ مانتے تھے کہ کائنات کا خالق اللہ ہے۔ ان کا شرک عبادت میں تھا۔ اللہ کے ساتھ ان کی عبادت

کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل بھی حضرت موسیٰ سے عبادت ہی میں شریک کی اجازت مانگ رہے تھے اور حضرت موسیٰ ان کے اسی فکر کو جاہلانہ فکر قرار دے رہے تھے۔ اس بات میں حضرت موسیٰ ان کو سمجھا رہے ہیں کہ جن کو تم بتوں کی عبادت کرتے دیکھ رہے ہو وہ دعوتِ توحید عبادت کے سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہ جائیں گے۔ ان کا نام و نشان نہ رہے گا اور ان کے یہ بت بھی تباہ برباد ہو جائیں گے اور یہاں توحید عبادت کا پرچم لہرائے گا۔ امتوں میں علم کی کمی سے اس قسم کی اجتماعی کمزوریاں پیدا ہو جاتی ہیں اور جس قدر نبوت کا لایا ہوا علم و عمل عام ہو تا جاتا ہے یہ کمزوریاں اس کی روشنی میں ختم ہو جاتی ہیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اتنے تر نہیں گرے لیکن ایک موقعہ پر جب انہوں نے دیکھا کہ مشرکین نے ایک درخت مقرر کر رکھا ہے جس پر وہ اپنے ہتھیار لٹکا دیتے ہیں اور اسی مناسبت سے اس کو ذات انواط کہتے ہیں تو وہ بھی بے ساختہ یہ درخواست کرنے پر مجبور ہو گئے کہ یا رسول اللہ ہمارے لیے ذات انواط جیسا ایک درخت مقرر فرما دیجئے ہم بھی اس پر اپنے ہتھیار لٹکایا کریں گے۔ ذرا سوچئے اس میں شرک کی کیا بات تھی لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنی بات کو بھی نہایت اہمیت دی اور بہت تشدید آمیز لہجے میں اس طرح تنبیہہ فرمائی کہ تمہاری یہ فرمائش ٹھیک ایسی ہی ہے جیسے حضرت موسیٰ سے بنی اسرائیل نے کی تھی۔ اجعل لنا الٰها كما لهم اٰلهة حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ سے شرک فی العبادۃ کی اجازت مانگی تھی۔ خدا کے علاوہ کسی اور کے خالق ہونے کا وہاں تصور بھی نہ تھا۔ امام رازی کے اندازِ بیان سے معلوم ہو رہا ہے کہ وہ الٰہ سے شرک فی الذات مراد لے رہے ہیں۔ علم کلام کی حد تک تو شاید یہ بات درست ہو لیکن قرآن و سنت جس چیز کی بھر پور تردید کر رہا ہے وہ شرک فی الذات نہیں بلکہ شرک فی العبادت ہے بلکہ بقول حضرت حکیم الامت شاہ ولی اللہ انبیاء کے مخاطب شرک فی الذات کے قائل ہی نہ تھے وہ صرف شرک فی العبادت کرتے تھے۔

بنی اسرائیل کی مخصوص ذمہ داری

۱۶۹ - کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہارے لیے اللہ کے سوا کوئی اور معبود تلاش کر دوں حالانکہ یہ اللہ ہی کی ذات ہے جس نے تمہیں دُنیا کی قوموں پر فضیلت و بزرگی عطا فرمائی ہے۔ یعنی خدا کے انعامات عظیمہ کی شکر گزاری اور حق شناسی کیا یہ ہی ہو سکتی ہے کہ غیر اللہ کی پرستش کر کے اللہ سے

بغاوت کی جاتے - پھر بڑی شرم کا مقام ہے کہ جس مخلوق کو خدا نے سارے جہان پر فضیلت دی ہے، وہ اپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی مورتیوں کے سامنے سربسجود ہو جاتے کیا مفضول افضل کا معبود بن سکتا ہے۔[1] حضرت شاہ صاحب نے اس کا ترجمہ اس طرح کیا ہے کہا کیا اللہ کے سوا لادوں تم کو کوئی معبود اور اس نے تم کو بزرگی دی سب جہانوں پر۔ مطلب یہ ہے کہ کیا میں اللہ رب العالمین خالق السماوات والارض کے علاوہ کوئی اور معبود تمہارے لیے تلاش کر دوں۔ یعنی معبود والی تو صرف اللہ کی ذات ہی ہو سکتی ہے۔ اللہ کے علاوہ، اللہ کے ساتھ اور اللہ سے ورے کوئی تمہارا معبود نہیں ہو سکتا جس سے تم عابدانہ تعلقات قائم کرو۔ الٰہ کے معنی عربی زبان میں معبود کے ہیں۔ یعنی جس سے عابدانہ تعلقات وابستہ کیے جاتیں وہ الٰہ ہے خواہ کوئی ہو۔ فرمایا کہ تمہارے عابدانہ تعلقات اللہ کے علاوہ کسی اور سے کیوں کر ہو سکتے ہیں یہ تو تمہارے اس منصب کے خلاف ہے جو اللہ نے تم کو عطا فرمایا ہے۔ اللہ نے ملت ابراہیم اور سنتِ انبیاؑ کے مطابق تمہیں دُنیا میں توحید اور ہدایت کا علمبردار بنایا ہے۔ یہ تمہاری مخصوص ذمہ داری ہے کہ اللہ کی توحید عبادت کو اللہ کے بندوں تک پہنچانے کا کام کرو۔ ۔ توحید کو دوسروں تک پہنچانے کا مطلب محض تبلیغ نہیں بلکہ ایسی تبلیغ ہے جس کی شہادت خود تمہاری زندگی میں ہو۔ شہادت دینا یہ ہے کہ توحید کو پہنچانے کا کام اسی طرح کیا جاتے جس طرح حضرت موسٰی و ہارون کر رہے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ عام امتیں اگر صرف ایک ذمہ داری رکھتی تھیں اور وہ یہ کہ اپنے دین کی مخلصانہ پیروی کرتی رہیں تو بنی اسرائیل اس عام ذمہ داری کے ساتھ ساتھ ایک ذمہ داری اور بھی رکھتی ہیں اور وہ یہ کہ بیرونی دنیا کے سامنے توحید فی العبادت کو اس طرح پیش کریں جس طرح پیش کرنے کا حق ہے اور جس کا عملی نمونہ حضرت موسٰی نے ان کے سامنے رکھا ہے۔

اس دور میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ دُنیا کی قوموں میں فرعون اور اس کی قوم تھی۔ علم و قوت تمدن و تہذیب، اقتدار اور بالادستی میں سب سے پیش پیش تھے۔ اللہ تعالیٰ نے موسٰی و ہارون کو نبی بنا کر اس وقت کی ساری متمدن اور مہذب دُنیا پر بنی اسرائیل کو فضیلت دی۔ منشا یہ ہے کہ اس مقام رفیع پر گامزن ہو کر تم عابدانہ تعلقات غیر اللہ سے قائم کرنا چاہتے ہو **اغیر اللّٰہ ابغیکم الٰھًا** میں لفظ غیر اللہ بے حد عام ہے کمزور سے کمزور تر مخلوق سے لے کر طاقتور سے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

طاقتور ترین مخلوق اس کا مصداق ہے۔ بتایا یہ جارہا ہے کہ مخلوق کی کوئی نوع کوئی جنس، ذی نوع کی کوئی فرد بھی یہ حق نہیں رکھتی کہ اس کی عبادت کی جائے۔ بنی اسرائیل کی درخواست پر حضرت موسیٰ نے ان کو جاہل صرف اس لیے نہیں کہا کہ اصنام ایک کمترین چیز ہیں اور ان کی عبادت کمتری کی وجہ سے قابلِ مذمت ہے بلکہ ان کو جاہل اس لیے کہا ہے کہ عبادت غیر اللہ کا حق ہی نہیں خواہ یہ غیر اللہ عابد کے خیال میں کتنا ہی معزز و مکرم ہو، اس میں کوئی تفریق نہیں ہے خواہ عبادت ملائکہ کی جائے، عبادت انبیاءؑ اور اولیاءؒ کی کی جائے۔ جو بھی اللہ کے سوا جس کی بھی عبادت کرتا ہے وہ قطعاً جہالت کا شکار ہے۔ اور ایک مومن کا نعرہ صرف ایاک نعبد ہونا چاہیے۔ یہ واضح کرنے کے بعد حضرت موسیٰ نے بتایا کہ جس بناوٹ کی بنیاد تمہارا جہل ہے اس کے لیے مجھے واسطہ بنانا چاہتے ہو یعنی تمہارا میرے سے یہ مطالبہ کرنا ایک طرف اگر تمہارے مقامِ الوہیت سے ناواقف ہونے کی علامت ہے تو دوسری طرف مقامِ نبوت سے ناآشنا ہونے کی نشانی ہے۔ میں الٰہ بنانے نہیں بلکہ بتانے آیا ہوں نبوت بناتی کچھ نہیں صرف راہ بتاتی ہے۔ بتانے کی حد تک میں اللہ کی الوہیت تمہیں بتا چکا ہوں تمہارا فرض ہے کہ اللہ سے اپنے عابدانہ تعلقات قائم کرو اور بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ تمہاری فضیلت تمہاری بزرگی اور شرف و مجد کا معیار ہی پوری دنیا میں یہ ہے کہ تم اللہ کی توحید کے علمبردار بنائے گئے۔ فضیلت سے مراد قوموں کی ہدایت و رہنمائی کا وہ منصب ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ایک خاص منتخب فرمایا تھا۔ جو فضیلت کسی منصب کی ذمہ داریوں کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے وہ ایک مشروط فضیلت ہوتی ہے۔ اگر صاحبِ منصب قوم اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوتی ہے تو یہ فضیلت اس کو حاصل رہتی ہے اور اگر اس کو چھوڑ بیٹھتی ہے تو صرف اس فضیلت ہی سے محروم نہیں ہوتی بلکہ کفرانِ نعمت کی پاداش میں اس کو مزید براں ذلت نصیب ہوتی ہے۔ یہاں حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کو یہ بات یاد دلائی ہے کہ جو فضیلت تمہیں اللہ کی جانب سے ملی ہے یہ مطالبہ اس کے سرتاسر خلاف ہے۔ اگر اس کو باقی رکھنا چاہتے ہو تو اس کا حق ادا کرو۔ خدا سے عابدانہ تعلق توڑ کر تم اس فضیلت کو قائم نہیں رکھ سکتے۔ قوموں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے بنی اسرائیل کے منتخب کیے جانے کا ذکر قرآن میں دوسرے انداز میں بھی آیا ہے مثلاً،

ولقد اخترنٰھم علی علم علی العالمین

ہم نے ان کو دنیا والوں کی رہنمائی کے لیے منتخب کیا ہے دیکھ بھال کر

بنی اسرائیل کی فضیلت کیوں ؟

۱۷۰۔ اور اللہ فرماتا ہے اے بنی اسرائیل وہ وقت یاد کرو کہ ہم نے تمہیں فرعونیوں سے نجات دی وہ تمہیں سنگین سزا دیتے تھے، تمہارے بیٹوں کو قتل کرتے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھتے تھے اور اس میں تمہارے رب کی جانب سے بڑی آزمائش تھی۔ یعنی جس خدا نے ابھی ابھی تم پر ایسا عظیم الشان احسان فرمایا ہے کیا تم اسے چھوڑ کر لکڑیوں اور پتھروں کے سامنے جھکتے ہو۔[1]

آلِ فرعون یعنی قومِ فرعون۔ آل سے مراد کسی شخص کی اولاد ہی نہیں ہوتی بلکہ یہ لفظ اولاد اتباع قوم قبیلہ اور انصار و اعوان سب پر حاوی ہوتا ہے۔ یہیں سے علماء نے یہ نکتہ آفرینی کی کہ آل النبی سے مراد آپ کے پیروکار اور متبعین ہیں۔ آل کا مضاف نہ نکرہ ہوتا ہے اور نہ زمان و مکان ہوتا ہے اور نہ آلِ خیاط بولا جاتا ہے بلکہ اس کا مضاف الیہ افضل اور اشرف ہوتا ہے جیسے آلِ سلطان۔ آل النبی کے بارے میں علماء نے تحقیق کی ہے کہ اُمت کا وہ طبقہ جو علم و عمل کی دولت سے مالا مال ہے وہ آل النبی ہے اور وہ لوگ جو علم و عمل سے تہی دامن ہیں ان کو امۃ النبی کہا جاتا ہے۔ لہٰذا نبی کی آل تو اُمت ہے لیکن ہر اُمتی آل نہیں ہے۔ بہرحال آل صرف اولاد کے لیے نہیں بلکہ اعوان و انصار کے لیے آتا ہے۔ نابغہ کا شعر ہے

من ال میہ رائح او مغتدی
عجلن ذا زاد وغیر مزود

آل میہ میں سے کچھ لوگ صبح روانہ ہوتے اور کچھ شام کو کچھ زادِ راہ کے ساتھ اور کچھ بغیر زادِ راہ کے۔

سورہ مومن میں وحاق بآل فرعون سوء العذاب۔ اور ابھی ابھی پڑھ آتے ہو ولقد اخذنا آل فرعون بالسنین ان آیات میں جس عذاب کا ذکر ہے ظاہر ہے کہ وہ فرعون اور اس کی ساری قوم ہی پر آیا نہ کہ صرف اس کی اولاد پر۔ اس کی اولاد کا تو کہیں ذکر ہی نہیں ہے بلکہ جہاں تک دلائل کا تعلق ہے وہ فرعون کا بے اولاد ہونا ثابت کرتے ہیں۔ تورات میں یہ ذکر مذکور ہے کہ حضرت موسیٰ کو بچپن میں دریا سے جس نے نکلوایا تھا وہ فرعون کی صاحبزادی تھی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

لیکن قرآن نے اس غلطی کی تصحیح کر دی کہ یہ اس کی لڑکی نہیں بلکہ اس کی بیوی تھی۔

وقالت امرأت فرعون قرت عين لي ولك

فرعون کی بیوی نے کہا کہ یہ میری اور تیری آنکھوں کی ٹھنڈک ہوگا۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ کے اس فضل کو دھیان میں لاؤ کہ تم کو فرعونی استبداد سے اپنا رسول روانہ کر کے نجات دلائی۔ وہ فرعونی استبداد جو تمہیں بدترین اور سنگین سزاؤں میں پیس رہا تھا اصل ارشاد میں یسومونکم آیا ہے۔ سوم کے معنے کسی پر کوئی بوجھ بار بار ڈالنے کے ہیں رکھتے ہیں سامہ ظلماً اس کو ظلم کا مزہ چکھایا یعنی ڈھوروں کی طرح وہ تم سے اپنے کام لیتا تھا۔ یقتلون ابناءکم ویستحیون نساءکم وہ تمہارے بیٹوں کو قتل کرتے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھتے تھے یہ اس عذاب عظیم و ذلت کی تفصیل ہے جس میں فرعونیوں کے ہاتھوں بنی اسرائیل مبتلا ہوئے اگرچہ مصر میں بنی اسرائیل پر طرح طرح کے ظلم توڑے جاتے تھے اور بے شمار قسم کی ذلتوں سے آپ کو سابقہ پڑا تھا جن کی تفصیل ان کی تاریخ میں موجود ہے لیکن یہاں ذکر صرف دو ہی باتوں کا بطور نمونہ فرمایا ہے۔ ان نمونوں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ بنی اسرائیل وہاں کس شکنجہ میں تھے۔ بیٹوں کے قتل کی تفصیل تو کسی موزوں مقام پر آئے گی۔ یہاں البتہ بلاغت کا ایک نکتہ یاد رکھنا چاہیے وہ یہ کہ لڑکوں کے ذبح کا ذکر جو کیا ہے تو ابناء کے لفظ سے کیا ہے تاکہ شفقت پدری کا جذبہ ابھرے اور لڑکیوں کے ذکر میں بنات نہیں فرمایا بلکہ نساءکم فرمایا ہے یعنی تمہاری عورتوں کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس لیے کہ غیرت کو حرکت میں لانے کے لیے یہ تعبیر زیادہ موثر تھی۔

آخر میں ارشاد ہوا ہے وفي ذالكم بلاء من ربكم عظيم آزمائش اس بات کی کہ اس بھٹی سے تم خالص سونا بن کر نکلتے ہو یا نری کھوٹ بن کر رہ جاتے ہو اور آزمائش اس امر کی کہ اتنی بڑی مصیبت سے اس معجزانہ طریقہ پر نجات پانے کے بعد بھی تم اللہ کے شکر گزار بندے بنتے ہو یا نہیں۔ اس آزمائش کے کٹھن ہونے کی طرف یہاں اشارہ اس لیے فرمایا کہ اس نجات کی اہمیت کا ان کو کچھ اندازہ ہو سکے جو انہیں حاصل ہوئی کہ کیسا عظیم ابتلا تھا جس سے ان کے رب نے ان کو چھڑایا تھا اگر وہ نہ چھڑاتا تو کوئی دوسری طاقت ان کو نہیں چھڑا سکتی تھی۔

یہ گویا دلیل ہوئی بنی اسرائیل کی فضیلت اور بزرگی کی کہ اللہ کے یہاں ان کی کتنی اہمیت ہے اور یہ اہمیت بلا وجہ نہیں ہے۔ وجہ صرف یہی ہے کہ ان سے دنیا کی قوموں میں ہدایت کا کام لینا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ اس فضل و انعام کے باوجود بھی میرے علاوہ یا میرے ساتھ یا میرے سے ورے کسی الٰہ

اور معبود کی تلاش میں ہو۔ حضرت موسیٰ نے فرمایا تھا کہ یہ کام تم مجھ سے لینا چاہتے ہو کہ میں تمہارے لیے الٰہ بناؤں یہ نہیں فرمایا کہ اس کے باوجود تم اللہ کے علاوہ الٰہ تلاش کرتے ہو سبحان اللہ کیا بلاغت ہے۔

حیرت ہے کہ علامہ خفاجی نے اسے دلیل خطابی قرار دیا ہے یعنی یہ بُرہان عقلی نہیں ہے اور موسیٰ علیہ السلام کی جانب سے دلیل عقلی پیش نہ کرنے کی وجہ یہ بتاتی ہے کہ بنی اسرائیل کی عوامی ذہنیت اسے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتی ہے۔ دلیل عقلی سے مراد علامہ موصوف کی وہ دلیل ہے جس کو علمائے کلام کی زبان میں برہان تمانع کہا جاتا ہے لیکن علامہ موصوف کو یہاں ذہول ہو گیا برہان تمانع وہاں استعمال ہوتا ہے جہاں مشرکین خدا کی ربوبیت میں شرک کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایک نہیں کائنات کا کاروبار دو چلا رہے ہیں لیکن یہاں مخاطب شرک فی الربوبیت کا نہیں بلکہ شرک فی العبادت کی درخواست کر رہے ہیں۔ یہ موقع برہان تمانع کا نہیں بلکہ برہان خطابی کا ہے یعنی ان خطابیات کے ذریعہ سے یقین پیدا کیا جائے جن کو لوگ عام بول چال اور عمل کاروبار میں استعمال کرتے ہیں اور عادۃً ان کو صحیح سمجھتے ہیں۔ اگر طبع انسانی میں خاص طور سے اس مسئلہ کی طرف غیر معمولی انکار یا شدید تعصب نہ ہو اور سامع میں تشکیک مناظرہ اور خواہ مخواہ کریداد نہ حجت کی عادت نہ ہو اور اس کی طرف فطرت صالحہ سادہ اور صاف ہو تو اس طریقہ سے اکثر انسانی افراد کو یقین کی دولت ہاتھ آتی ہے اور اسی لیے قرآن نے اسی طرزِ استدلال سے اکثر کام لیا ہے علامہ آلوسی نے بھی علامہ خفاجی کے اس موقف کو مخدوش قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

> ان بت پرستوں کے مقابلہ میں برہان تمانع کو لانا جو ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ کہتے اور جو کائنات کا اللہ کو خالق و مالک مانتے ہیں مشکل ہے بلکہ یہ ان کے مقابلے میں پیش کی جاتی ہے جو عالم کے چلانے میں دوئی کے قائل ہیں۔

حضرت موسیٰ یہاں وثنیت کی تردید فرما رہے ہیں اور علامہ خفاجی اس میں ثنویت کی بُو سونگھ رہے ہیں۔

وَوٰعَدْنَا مُوسٰى ثَلٰثِينَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيقَاتُ
رَبِّهٖٓ اَرْبَعِينَ لَيْلَةً ۚ وَقَالَ مُوسٰى لِاَخِيهِ هٰرُونَ اخْلُفْنِي
فِي قَوْمِي وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيلَ الْمُفْسِدِينَ (١٤٢) وَلَمَّا جَآءَ
مُوسٰى لِمِيقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِيٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ؕ
قَالَ لَنْ تَرٰىنِي وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ
فَسَوْفَ تَرٰىنِي ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوسٰى
صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِينَ (١٤٣)
قَالَ يٰمُوسٰٓى اِنِّي اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِي وَبِكَلَامِي ۖ
فَخُذْ مَآ اٰتَيْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِينَ (١٤٤) وَكَتَبْنَا لَهٗ فِي
الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ۚ
فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوا بِاَحْسَنِهَا ؕ سَاُورِيكُمْ
دَارَ الْفٰسِقِينَ (١٤٥)

اور ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا تھا پھر دس راتوں کے
اضافہ سے ہم نے اسے پورا چلہ کر دیا اس طرح پروردگار کے حضور
میں آنے کی مقررہ میعاد چالیس راتوں کی مقدار ہو گئی[۱۴۱]۔ موسیٰ نے
اپنے بھائی ہارون سے کہا تم میرے بعد قوم میں میرے جانشین بن کر
رہو اور دیکھو سارے کام ٹھیک کرنا خرابی ڈالنے والوں کی راہ نہ
چلنا[۱۴۲]۔ اور جب موسیٰ آیا کہ ہمارے مقررہ وقت میں حاضری
دے اور اُس کے پروردگار نے اس سے کلام کیا[۱۴۳]۔ تو بول پڑا
اے رب دکھا تو مجھے میں تیری طرف دیکھوں حکم ہوا مجھے تو ہرگز
نہ دیکھے گا[۱۴۴]۔ ہاں اس پہاڑ کی طرف دیکھ اگر یہ اپنی جگہ ٹکا رہا تو
تُو مجھے دیکھ پائے گا[۱۴۵]۔ پھر جب اُس کے پروردگار کی پہاڑ پر
تجلی ہوئی تو پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گیا اور موسی بے ہوش ہو گئے[۱۴۶]۔
جب موسیٰ ہوش میں آئے تو بول پڑے خدایا تیرے لیے ہر

طرح کی تقدیس ہو، میں اپنی جسارت سے تیرے حضور توبہ کرتا ہوں
میں ان میں پہلا شخص ہوں گا جو اس پر یقین رکھتے ہیں[۱۷۷]۔ خدا نے
فرمایا اے موسیٰ میں نے تجھے اپنی پیغمبری اور ہم کلامی سے لوگوں
پر برتری دی ہے لہٰذا جو کچھ میں نے تجھے عطا کیا ہے اسے لے
اور شکر بجا لا[۱۷۸]۔ اور ہم نے موسیٰ کے لیے ان تختیوں میں ہر قسم
کی باتیں لکھ دی تھیں تاکہ زندگی کے ہر معاملہ کے لیے اس میں
نصیحت ہو اور ہر بات الگ الگ واضح ہو جاتے[۱۷۹]۔ اسے
مضبوطی سے پکڑ لے اور اپنی قوم کو حکم دے کہ اس کے
پسندیدہ حکموں پر کاربند ہوں میں ضرور بدکاروں کی جگہ
تمہیں دکھاؤں گا[۱۸۰]۔

معانی مفردات

میقات، وہ وقت جس میں مقررہ کام کیا جائے۔ اسی کی جمع مواقیت آتی ہے۔ وقت سے اسم آلہ ہے۔ وقت سے اسم آلہ یہی آتا ہے مگر دونوں کے املا میں اور معنی میں فرق ہے۔ وقت سے

میعات بھی تاء سے لکھا جاتا ہے کیونکہ یہ تاء اصلی ہے اور اس کا وزن مفعال ہے اور وقابیتہ میقاۃ گول تاء سے لکھا جاتا ہے یہ تاء تانیث ہے اور مفعلۃ کے وزن پر ہے۔ اُخْلُفْنِیْ، اخلف امر ہے جانشین ہو تو مرا اس معنے کے اعتبار سے اس کا مصدر خلافت ہے اور اگر معنے پیچھے آنے کے ہوں تو اس اعتبار سے اس کا مصدر خلف ہے جس کے معنے پیچھے آنے کے ہیں۔ اسی سے خلف ہے امام بغوی لکھتے ہیں خلف اس قرن کو کہتے ہیں جو دوسرے قرن کے بعد آتا ہے۔ ابوحاتم کا بیان ہے کہ خلف لام کے سکون کے ساتھ یعنے اولاد ہے۔ واحد اور جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور خلف لام کے زبر کے ساتھ یعنے بدل آتا ہے خواہ اولاد یا کوئی اجنبی، ابن الاعرابی کا کہنا ہے کہ خلف زبر کے ساتھ نیک کے لیے آتا ہے اور جزم کے ساتھ بد کے لیے۔ نضر بن شمیل کہتے ہیں کہ خلف لام کی حرکت کے ساتھ اچھی نسل کے لیے اور لام کے سکون کے ساتھ بُری نسل کے لیے آتا ہے۔ محمد بن جریر نے تصریح کی ہے کہ اکثر مدح میں تو لام کا زبر آتا ہے اور مذمت میں لام کا سکون اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس کا عکس ہوتا ہے۔ تجلّی، جلو سے بنا ہے اسی سے اُردو میں جلوہ بولتے ہیں۔ پوشیدگی کے بعد ظہور کو کہتے ہیں۔ جلا الامر بات کھل گئی بولا جاتا ہے۔ اسی طرح انجلی، تجلی آتے ہیں۔ اسی سے متعدی جلّاہ آتا ہے اس نے اسے واضح کر دیا۔ دکاً، ریزہ ریزہ کرنا، ڈھا کر برابر کرنا، کوٹ کر ہموار کرنا۔ دک یدک کا مصدر ہے اصل میں دک نرم اور ہموار زمین کو کہتے ہیں اور چونکہ نرم اور ہموار زمین ریزہ ریزہ ہوتی ہے اسی مناسبت سے اس کے مصدر کے معنے مقرر ہوئے۔ خرّ، باب ضرب سے خر مصدر ہے اس کے معنے کسی چیز کے اوپر سے گرنے کے ہیں یخرون للاذقان۔ صعقاً، صفت مشبہ کا صیغہ ہے جس کے معنے بے ہوش ہو جانے کے ہیں۔ اسی سے صاعقہ بجلی کی کڑک کے معنے میں ہے۔ صاعقہ اور صاقعہ دونوں قریب ہیں دونوں کے معنے سخت گڑگڑاہٹ کے ہیں مگر صقع اجسام ارضیہ کے لیے بولا جاتا ہے اور صعق اجسام علویہ کے لیے۔ بعض اہل لغت کا خیال ہے کہ صعق تین طرح پر آتا ہے۔ موت کے معنے میں ہے جیسے فصعق من فی السماوات اور فاخذتھم الصاعقۃ دوسرے عذاب کے معنے میں انذرتکم صاعقۃ مثل صاعقۃ عاد و ثمود، تیسرے آگ کے معنے میں جیسے یرسل الصواعق، یہاں صعق صفت کا صیغہ ہے۔

کوہِ طور پر اعتکاف

مصر سے نکلنے کے بعد جب بنی اسرائیل کی غلامانہ پابندیاں ختم ہوگئیں اور انہیں ایک خود مختار قوم کی حیثیت حاصل ہوگئی تو حکمِ خداوندی کے تحت حضرت موسیٰ کوہِ طور پر طلب کیے گئے تاکہ انہیں بنی اسرائیل کے لیے قانون عطا فرمایا جائے چنانچہ یہ طلبی جس کا یہاں ذکر ہو رہا ہے اس سلسلے کی پہلی طلبی تھی اور اس کے لیے چالیس دن کی میعاد اس لیے مقرر کی گئی تھی کہ حضرت موسیٰ ایک پورا چلہ یہاں گزاریں اور روزے رکھ کر شب و روز عبادت اور تفکر و تدبر کرکے اور دل و دماغ کو یکسو کرکے اس قولِ ثقیل کے اخذ کرنے کی استعداد اپنے اندر پیدا کریں جو ان پر نازل کیا جانے والا تھا۔

حضرت موسیٰ نے اس ارشاد کی تعمیل میں کوہِ سینا جاتے وقت بنی اسرائیل کو اس مقام پر چھوڑا تھا جو وادی الشیخ کے نام سے آجکل مشہور ہے۔ اس وادی کا وہ حصہ جہاں بنی اسرائیل نے پڑاؤ کیا تھا آج کل میدان الراحۃ کہلاتا ہے وادی کے ایک سرے پر وہ پہاڑی واقع ہے جہاں مقامی روایت کے بموجب حضرت صالح علیہ السلام ثمود کے علاقہ سے ہجرت کرکے تشریف لے آئے تھے آج وہاں ان کی یادگار میں ایک مسجد بنی ہوئی ہے۔ دوسری طرف ایک اور پہاڑی جبل ہارون نامی ہے جہاں کہا جاتا ہے کہ حضرت ہارون بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی سے ناراض ہوکر جا بیٹھے۔ تیسری طرف سینا کا بلند پہاڑ ہے جس کا بالائی حصہ اکثر برف باریوں سے ڈھکا رہتا ہے اور جس کی بلندی ۷۳۵۹ فٹ ہے۔ اس پہاڑ کی چوٹی پر وہ کھوہ زیارت گاہ عام بنی ہوئی ہے جہاں حضرت موسیٰ نے چلہ کیا تھا۔ اس کے قریب مسلمانوں کی ایک مسجد اور عیسائیوں کا گرجا موجود ہے اور پہاڑ کے دامن میں رومی قیصر جسٹنین کے زمانہ کی ایک خانقاہ آج تک موجود ہے۔

۱۷۱۔ اور ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا تھا پھر دس راتوں کے اضافہ سے ہم نے اسے پورا چلہ کر دیا اس طرح پروردگار کے حضور میں آنے کی مقررہ میعاد چالیس راتوں کی مقدار ہوگئی۔ جب بنی اسرائیل کو طرح طرح کی پریشانیوں سے اطمینان نصیب ہوا تو انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ اب ہمارے لیے کوئی آسمانی شریعت جس پر ہم دلجمعی کے ساتھ عمل کرکے دکھلائیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے ان کا معروضہ بارگاہِ الٰہی میں پیش کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے کم از کم تیس دن اور زیادہ از زیادہ چالیس دن کا وعدہ فرمایا کہ جب اتنی مدت تم پے در پے روزے رکھو گے اور کوہِ طور پر معتکف رہو گے تو تم کو تورات شریعت عنایت کی جائے گی۔ دو مدتیں کم اور زیادہ ٹھہرانے کا

شاید یہ مطلب تھا اگر اثنائے ریاضت میں وظائف عبودیت اور آداب تقرب ادا کرنے کے اعتبار سے کسی قسم کی کوتاہی اور تقصیر ظاہر نہ کی تو اقل مدت تیس دن کافی ہوں گے ورنہ اکثر الاجلین چالیس روز پورے کرنے پڑیں گے یا شروع سے تیس دن ضروری و لازمی میعاد کے طور پر ہوں اور چالیس دن پورے کرنا اختیاری و استحبابی حیثیت سے اصل میعاد کی تکمیل و تتمیم کے طور پر رکھے گئے ہوں جیسے شعیب علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی بیٹی دیتے وقت فرمایا تھا علی ان تاجرنی ثمانی حجج فان اتممت عشراً فمن عندک وما ارید ان اشق علیک (القصص رکوع ۳) اور ہمارے زمانہ کے بعض مصنفین نے یہ کہا ہے کہ اصلی میعاد چالیس ہی دن کی تھی جیسا کہ سورہ بقرہ میں مذکور ہے اور یہاں بھی فتم میقات ربہ، اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ اس چالیس دن کے بیان کا ایک پیرایہ ہے کہ ہم نے تیس دن کا وعدہ کیا تھا جن کا تتمہ دس دن اور تھے تاکہ اشارہ ہو جائے کہ ایک مہینہ سالم ذی قعدہ پورا کر کے دوسرے مہینہ ذی الحجہ سے دس دن اور بڑھائے گئے۔ اس طرح یکم ذی قعدہ سے شروع ہو کر ۱۰ ذی الحجہ کو چلہ پورا ہوا جیسا کہ اکثر سلف سے منقول ہے واللہ اعلم، موضح القرآن میں ہے کہ حق تعالیٰ نے وعدہ دیا حضرت موسیٰ کو کہ پہاڑ پر تیس رات خلوت کرو کہ تمہاری قوم کو تورات دوں۔ اس مدت میں انہوں نے ایک دن مسواک کی۔ فرشتوں کو ان کے منہ کی بو سے خوشی تھی وہ جاتی رہی اس کے بدلے اور بڑھا مدت پوری کر دی[1] حضرت موسیٰ جب اپنی قوم کو فرعونی حکومت کے پنجہ استبداد سے نکال لائے اور اللہ سبحانہ نے ان کو آزادی دے دی تو اب اللہ کا فیصلہ یہ ہوا کہ اس قوم کو ایک پورا نظام، قانون اور دستور زندگی عطا ہو تاکہ بنی اسرائیل جو اب تک فرعون کے نظام بندگی میں زندگی گزار رہے تھے اللہ کے نظام بندگی میں اپنی زندگی گزار دیں۔ یاد رہے کہ بنی اسرائیل پرستش تو پہلے بھی اللہ کی کرتے رہے تھے جیسا کہ قرآن نے بتایا ہے کہ ان کو اپنے گھروں میں قبلہ رو ہو کر نماز پڑھنے کا حکم تھا۔

اوحینا الیٰ موسیٰ واخیہ ان تبوا لقومکما بمصر بیوتا واجعلوا بیوتکم قبلۃ واقیموا الصلوٰۃ وبشر المومنین۔

ہم نے موسیٰ اور ان کے بھائی ہارون کو وحی کی کہ اپنی قوم کے لیے مصر میں مکان

---

[1] افادات شیخ الاسلام

بناؤ اور اپنے مکانوں کو قبلہ رُخ بناؤ اور ان میں نماز قائم کرو اور اہل ایمان کو خوشخبری دو۔ حضرت موسیٰ کو نظامِ زندگی کے قائم کرنے کی خاطر شریعت اور قانون دینے کے لیے اللہ سبحانہ نے کوہِ طور پر چالیس روز کے اعتکاف کا حکم دیا۔ گویا وحی نبوت کا آغاز تو اس وقت ہوا تھا جب حضرت موسیٰ مدین سے آرہے تھے اور اب حضرت موسیٰ کے لیے وحی شریعت و قانون کے آغاز کی داستان سنائی جارہی ہے۔

تورات میں بھی یہ واقعہ مذکور ہے:

اور خداوند نے کہا کہ پہاڑ پر میرے پاس آ اور وہیں ٹھہرا رہ اور میں تجھے پتھر کی لوحیں اور شریعت اور احکام جو میں نے لکھے ہیں دوں گا تاکہ تو ان کو سکھائے۔ (خروج باب ۲۴-۱۲-۱۳)

اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ تو یہ باتیں لکھ کیونکہ ان ہی باتوں کے مفہوم کے مطابق میں تجھ سے اور اسرائیل سے عہد باندھتا ہوں سو وہ چالیس دن اور چالیس رات وہیں خداوند کے پاس رہا اور نہ روٹی کھائی نہ پانی پیا اور اس نے ان لوحوں پر اس عہد کی باتوں کو لکھا۔

آیت کی واضح تشریح تو ختم ہو چکی ہے لیکن چند امور تشریح طلب ہیں۔

اولاً سورہ بقرہ "وَاعَدْنَا مُوسَىٰ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً" ہے یہاں اس اربعین کی تفصیل ہے۔ سورہ اعراف مکی ہے اور البقرہ مدنی ہے۔ یہ چالیس دن کی مدت اس قلبی اور روحانی تیاری کے لیے تھی جو کتاب الٰہی کے بارِ عظیم کے متحمل ہونے کے لیے ضروری تھی۔

ابتداءً تیس دنوں کا اور پھر دس روز کا اضافہ اس کی علماء نے مختلف توجیہات کی ہیں ایک خیال تو وہ ہے جو آپ حضرت شاہ عبدالقادر کی زبانی سُن آئے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تیس روزے رکھنے کے بعد آخری روزے میں مسواک کر لی تو حضرت موسیٰ کو حکم ہوا کہ دس روزے اور رکھو۔ شارحینِ قرآن نے مسند فردوس دیلمی کے حوالہ سے یہاں عبداللہ ابن عباس کی ایک مرفوع روایت بھی نقل کی ہے لیکن یہ روایت تاریخی حیثیت سے مستند نہیں ہے۔ دوسرا خیال یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام وقت مقررہ سے پہلے پہنچ گئے تھے ان کی اس جلدی کے سبب سے حکمتِ الٰہی اس کو مقتضی ہوئی کہ یہ مدت تیس دنوں سے بڑھا کر چالیس روز کر دی جائے۔ سورہ بقرہ میں پوری مدت ذکر کر دی گئی اور یہاں سورہ اعراف میں اس کی

تفصیل بتا دی گئی۔ اور عبداللہ بن عباس کے حوالے سے تیسری روایت یہ بتائی گئی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے کہا کہ اللہ نے میرے سے تیس راتوں کا وعدہ کیا ہے میں جا رہا ہوں اور ہارون کو جانشین بنا رہا ہوں جب حضرت موسیٰ کوہ طور پر پہنچے تو اللہ نے دس روز اور اضافہ کر دیے ان ہی دس دنوں میں گوسالہ پرستی کے فتنے نے سر اٹھایا۔

ثانیاً، آیت میں بجائے ثلاثین یوماً کے ثلاثین لیلۃ آیا ہے۔ اس سے علماء نے دو وجہیں بتائی ہیں۔ رات کی تخصیص اس لیے فرمائی کہ رات کی عبادت میں مجاہدہ زیادہ ہے۔

ان ناشئۃ اللیل ھی اشد وطاً واقوم قیلاً،

نیز اللہ سبحانہٗ کا نزول اجلال آسمان دنیا پر رات ہی کو ہوتا ہے جیسا کہ صحیحین میں ہے اور برکتیں بھی اکثر رات ہی میں نازل ہوتی ہیں۔ قرآن میں لیلۃ مبارکہ کی تصریح ہے۔ قرب الٰہی حاصل کرنے کے لیے رات سے بہتر کوئی وقت نہیں ہے۔ جیسا کہ ترمذی نے سنن میں یہ ارشاد نقل کیا ہے۔

> عمرو بن عبینہ رضی اللہ عنہ، فرماتے ہیں کہ انہوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوتے سنا ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ بندے کے سب سے قریب وسط شب میں ہوتے لہٰذا اگر تجھ سے یہ ہو سکے کہ اس وقت میں اللہ کو یاد کرنے والوں میں سے ہو سکے تو ہو جا۔　　　　(سنن ترمذی)

یہی وجہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن میں قیام لیل کا حکم آیا یا ایھا المزمل قم اللیل اور رات ہی میں تہجد کا حکم ہوا۔ اور رات ہی میں آپ کو آسمانوں کی سیر کرائی گئی سبحان الذی اسریٰ بعبدہ لیلاً۔ اہل عرب جب سفر کرتے تو رات کو چلتے اور دن کو ٹھہرتے اس لیے رات میں مسافت جلدی طے ہوتی ہے۔ اسی طرح سیر الی اللہ کے لیے رات کو خاص کیا گیا تاکہ رہ روسلوک جلد منزل مقصود کو پہنچ جائے۔

نیز لیلہ کی تعبیر سے علماء نے یہ بات بھی معلوم کی ہے کہ قمری مہینوں میں تاریخ کا حساب رات سے ہوتا ہے۔ تیس راتوں کے ذکر سے اشارہ ہے کہ حضرت موسیٰ کا یہ اعتکاف قمری ماہ میں تھا۔ کیونکہ قمری ماہ کا آغاز رات ہی سے اور اس کی تاریخ غروب سے شروع ہوتی ہے۔ عبادات میں قمری ماہ و سال معتبر ہیں۔ قرطبی نے ابن عربی کے حوالے سے لکھا ہے کہ شمسی ماہ و سال کا حساب کاروباری زندگی کے لیے ہے اور قمری ماہ و سال عابدانہ زندگی کی خاطر ہیں۔ یہ تیس

راتیں حضرت عبداللہ بن عباس کی تصریح کے مطابق پورا ماہ ذی قعدہ اور پھر ان پر ذی الحجہ کے دس دِنوں کا اور اضافہ ہوا۔ اس کا خلاصہ یہ ہوا کہ حضرت موسیٰ کو تورات اللہ کی جانب سے ذی الحجہ کی ۹ر تاریخ کو ملی۔ یہ حسن اتفاق ہے جیسا کہ مستند روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی دین کی تکمیل کا اعلان اسی تاریخ میں ہوا۔

ثالثاً چالیس راتوں کی تخصیص کی وجہ شارحین قرآن نے یہ بتائی ہے کہ اعداد کے مختلف درجات میں ایک درجہ اعداد میں اکائیوں کا ہے دوسرا درجہ دہائیوں کا ہے تیسرا درجہ سینکڑوں کا ہے اور چوتھا درجہ ہزاروں کا ہے۔ عربی زبان میں ہزار سے آگے اعداد کی کوئی درجہ بندی نہیں ہے دس کا عدد اکائیوں کا خاتمہ ہونے کی وجہ سے ایک تکمیلی عدد ہے۔ جب کسی چیز کی خاص طور پر تکمیل مقصود ہوتی ہے تو اسی عدد کو چار گونہ کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت آدم کی مٹی کا خمیر چالیس روز تک کیا گیا اور حدیث میں ہے کہ شکم مادر میں چالیس روز تک نطفہ رہتا ہے پھر چالیس روز تک علقہ پھر چالیس روز تک مضغہ اس کے بعد رُوح پھونکی جاتی ہے۔ معلوم ہوا کہ اس عدد کو عروج اور ترقی سے کوئی خاص مناسبت ہے۔ بس جس طرح جسمانی عروج اور ترقی کے لیے چالیس کا عدد منتخب ہوا اسی طرح اللہ سبحانہ نے اپنی اس قدیم سنت کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام کے باطنی اور روحانی عروج و ترقی کے لیے چالیس کا عدد مقرر فرمایا۔ علامہ منذری نے الترغیب والترہیب میں بحوالہ عبداللہ بن عباس حضور انور کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ،

> جو چالیس روز تک عمل خالص اللہ کے لیے کرے تو علم و حکمت کے چشمے اس کے قلب سے نکل کر اس کی زبان پر جاری ہو جائیں گے۔

نبوت کے لیے بھی چالیس سال کی عمر کو خاص کیا گیا ہے کیونکہ اصل عمر انسان کی چالیس سال ہے اس میں انسانی قوتوں کا کمال ہوتا ہے۔ اس کے بعد زوال و انحطاط شروع ہو جاتا ہے۔

یہیں سے صوفیائے کرام نے مجاہدہ و ریاضت کے لیے چلہ استنباط کیا ہے حافظ شیرازی کہتے ہیں:

شنیدم رہروے در سرزمینے
ہمی گفت ایں معما با قرینے
کہ اے صوفی شراب آنگہ شود صاف
کہ در شیشہ بماند اربعینے!

اگرچہ ہمیں اس قسم کے استنباط سے اصولی اختلاف ہے۔ فقہی اجتہاد و استنباط پر اسے قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ فقہی مسائل میں اجتہاد کی ضرورت عقل سے اور اس کی اجازت بلکہ حکم نقل سے بالکل واضح طور پر ثابت ہے لیکن کیا تزکیہ نفس اور مسئلہ باطن کا بھی معاملہ ایسا ہی ہے کیا اس کے لیے اجتہاد کی واقعی ضرورت ہے اور اس ضرورت پر عقلی اور نقلی دلائل موجود ہیں۔ اس کا جواب اثبات میں دینا سخت دشوار ہے۔

عقلی پہلو سے دیکھتے تو قلوب انسانی کے بنیادی حقائق رفتارِ زمانہ کے ساتھ بدلنے والے نہیں وہ جیسے کل تھے ویسے ہی آج کل ہیں اور ہزار برس کے بعد بھی ویسے ہی رہیں گے۔ انسان کی باطنی بیماریوں میں ماضی، حال اور مستقبل کا فرق کوئی جوہری فرق نہیں۔ جو بیماریاں زمانہ رسالت میں دلوں کو بیمار بنایا کرتی تھیں وہی آج بھی انہیں لاحق ہوا کرتی ہیں۔ اگر تزکیہ نفس کا مدعا یہی ہے کہ نفس انسانی کو کفر و شرک، نفاق، دُنیا پرستی، غفلت، آخرت فراموشی اور اتباع خواہش کے روگوں سے پاک کر کے اللہ کا سچا پرستار بنایا جاتے تو یقین کرنا چاہیے کہ عہدِ رسالت میں بھی یہی روگ اسی طرح دلوں کو لاگو ہوتے تھے جس طرح آج۔ اگر ایسا ہے تو یقین کرنا کہ ان بیماریوں کے علاج کے لیے کسی نئے نسخے کی ہرگز ضرورت نہیں۔ اللہ اور اس کے رسول نے جو نسخہ تجویز فرمایا ہے وہ بالکل کافی ہے۔ اسی میں شفا ہے۔ ایسی شفا جو قلب و روح کو ان کی فطری تندرستی اور توانائی بخشنے والی ہے۔

حضرت ہارون کی خلافت

۱۴۲۔ موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا تم میرے بعد قوم میں میرے جانشین بن کر رہو اور سب کام درستگی سے کرنا اور خرابی ڈالنے والوں کی راہ نہ چلنا۔ یعنی میری غیبت میں میرے حصہ کا کام بھی تم ہی کرو۔ گویا حکومت و ریاست کے جو اختیارات موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مخصوص تھے وہ ہارون علیہ السلام کو تفویض کر دیے گئے اور چونکہ بنی اسرائیل کی تلون مزاجی اور سست اعتقادی کا پورا تجربہ رکھتے تھے اس لیے بڑی تصریح و تاکید سے ہارون علیہ السلام کو متنبہ کر دیا کہ اگر میرے پیچھے یہ لوگ کچھ گڑبڑ کریں تو تم اصلاح کرنا اور میرے طریق کار پر کاربند رہنا۔ مفسدہ پردازوں کی راہ پر نہ چلنا۔ خدا کی مشیت کہ موسیٰ علیہ السلام یہ وصیت کر کے اُدھر گئے اِدھر بنی اسرائیل نے گوسالہ پرستی شروع کر دی مگر ہارون علیہ السلام نے موجود

بائیبل نویسوں کے علی الرغم یا قوم انما فتنتم بہ وان ربکم الرحمان فاتبعونی واطیعوا امری،
کہہ کر ان کی گمراہی اور اپنی بیزاری کا صاف اعلان کر دیا اور وصیت موسوی کے مطابق اصلاحِ حال کی
امکانی کوشش کی۔ ؎

نبوت کی حد تک تو حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون دونوں نبی تھے اس لیے نبوت میں نیابت کا یہاں سوال ہی نہیں ہے۔ لیکن بنی اسرائیل میں حکومت اور قیادت کا منصب حضرت موسیٰ کو حاصل تھا اس لیے اخلفنی کا منشا یہ ہے کہ فرمانروائی اور حکمرانی کا جو کام حضرت موسیٰ کے سپرد تھا وہ ان ایام میں حضرت ہارون کریں۔ یعنی حضرت موسیٰ نے حضرت ہارون کو اپنی غیر حاضری کے زمانے کے لیے اپنا خلیفہ بنایا۔ یہ وقتی خلافت تھی کیونکہ حضرت ہارون کی وفات حضرت موسیٰ سے پہلے ہوئی وہ حضرت موسیٰ سے تین سال بڑے تھے۔ اسی قسم کی خلافت مختلف سفروں میں مختلف صحابہ کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی قائم فرمائی۔ غزوۂ تبوک میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں اسی نوع کی خلافت سے سرفراز فرمایا تھا۔ چنانچہ صحیحین میں ہے:

> حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو مخاطب کر کے فرمایا، کیا تو اس بات سے خوش نہیں کہ میرے لیے ایسا ہی ہو جیسے حضرت ہارون حضرت موسیٰ کے لیے تھے۔

کچھ لوگوں نے اسی کو دستاویزِ خلافت بنا کر یہ نعرہ لگا دیا کہ خلافت اصل میں حضرت علی کا حق ہے اور حضور کی آپ کے بارے میں وصیت ہے۔ ایسا سمجھنا تاریخ سے بہت بڑی بے انصافی ہے حضور انور ہمیشہ ہی غزوات میں جاتے وقت مدینہ میں اپنا خلیفہ بناتے تھے اور یہ بات حضور انور نے حضرت علی کو مخاطب کر کے اس وقت فرمائی تھی جب حضرت علی نے حضور کی زبانِ مبارک سے اپنے بارے میں مدینہ میں رہنے کا حکم سن کر کہا کہ کیا آپ مجھے بچوں اور عورتوں میں اپنا جانشین بنا کر جا رہے ہیں حضور نے حضرت علی کو یہ کہہ کر کہ کیا تو راضی نہیں ہے کہ تو میرے لیے ویسا ہی ہو جیسے ہارون موسیٰ کے لیے، مسندِ احمد میں ہے کہ حضرت علی نے یہ بات سن کر فرمایا رضیت رضیت میں راضی ہوں میں راضی ہوں۔

بہرحال اس آیت میں حضرت موسیٰ حضرت ہارون کو اپنے سفرِ طور کے موقعہ پر اپنی غیر حاضری

؎ افاداتِ شیخ الاسلام

کے وقت اپنا خلیفہ بنا رہے ہیں اور ان کو یہ ہدایت دے رہے ہیں کہ تم قوم کے اندر کوئی خرابی کوئی بگاڑ اور کوئی بدعت وضلالت نہ پیدا ہونے دینا۔ اگر اس طرح کی کوئی چیز رونما ہو تو اس کی اصلاح کرنا اور ہرگز ہرگز بگاڑ پیدا کرنے والوں کی راہ نہ چلنا۔ قرآن میں المفسدین کی تعبیری انداز بتا رہا ہے کہ حضرت موسیٰ فسادی عناصر سے پہلے سے واقف تھے اور ان کی طرف سے ان کو اندیشہ بھی تھا اس لیے انہوں نے حضرت ہارون کو خاص طور پر تاکید کی کہ اگر یہ عناصر کوئی فتنہ اٹھانے کی کوشش کریں تو اس کو چلنے نہ دینا۔

اصل ارشاد میں اخلفنی آیا ہے اسی کا مصدر خلافت ہے اس کا مادہ خلف اور اسی سے خلیفہ بنا ہے۔ خلافت کے معنے نیابت اور جانشینی کے ہیں۔ ابن فارس کہتے ہیں کہ یہ خلف فلان فلانا فی ہذا الامر سے بنا ہے یعنی اگر ایک شخص کسی دوسرے شخص کا قائمقام ہوا تو یہ خلافت ہوئی اور لغت میں اس کو خلیفہ کہیں گے خواہ یہ نیابت سابق کی موت وعزل کی وجہ سے ہو یا غیبت کی وجہ سے ہو یا اپنا اختیار ومنصب سپرد کرنے کی وجہ سے ہو۔ امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

> خلافت دوسرے کی نیابت کا نام ہے چاہے منوب عنہ کی غیر حاضری کی وجہ سے ہو یا موت کی وجہ سے یا کام سے رہ جانے کی وجہ سے۔

یہ لفظ بھی قرآن حکیم کے اختیارات لغویہ میں سے ہے یعنی عربی زبان کے ان الفاظ میں سے ہے جن کو لغت میں عام معانی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے مگر قرآن نے اپنے خاص قانونی اصطلاحی معنے کے لیے اختیار کیا ہے۔ قرآن کی زبان میں خلافت اور استخلاف فی الارض اور وراثت اور تمکن فی الارض سے مقصود حکومت وریاست ہے۔ قرآن حکیم اس کو سب سے بڑی نعمت قرار دیتا ہے جو یقین اور اچھے کاموں کے بدلے دنیا میں مل سکتی ہے۔ قرآن کے نزدیک اس خلافت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دنیا میں نوع انسان کی ہدایت وسعادت کے لیے ایک خاص ذمہ دار حکومت قائم ہو وہ عدل ربانی کو دنیا میں نافذ کرے۔ ظلم وجور اور ضلالت وطغیان سے اس کی زمین پاک ہو جائے۔ اور اللہ کا وہ ہمہ گیر قانون عدل جو تمام کائنات میں سورج سے لے کر زمین کے ذرات تک تکوینا نافذ وقائم ہے۔ زمین کے گوشہ گوشہ اور چپے چپے میں تشریعاً جاری ہو کر کرۂ ارضی کو ہدایت وسعادت کی بہشت زار بنا دے۔ یہی خدا کا قانون عدل تشریعی نبوت لے کر آتی ہے۔ اسی کا دنیا میں قائم کرنا اس کا اولین مقصد ہوتا ہے۔ یہاں حضرت ہارون حضرت موسیٰ کے اسی لحاظ سے خلیفہ ہیں۔ اور اسی لحاظ سے حضرت آدم اللہ سبحانہٗ کے خلیفہ ہیں۔ لغت کے اعتبار سے یہ اطلاق اس

یہ ہوا کہ سب سے پہلے جو شخص خلیفہ ہوا وہ اللہ کی عدالت قائم رکھنے میں زمین پر اللہ کی نیابت رکھتا تھا اور ہر خلیفہ سابق کا قائمقام ہوتا تھا۔ ظہورِ اسلام کے بعد جب ارضی خلافت کے وارث مسلمان ہوئے تو اس سلسلے کا پہلا خلیفۃ اللہ خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور پھر آپ کے بعد جن لوگوں کے ہاتھ اسلام کی مرکزی حکومت آتی وہ آپ کے نائب اور قائمقام ہوتے اس لیے ان پر خلیفہ کا اطلاق ہوا اور اب تک ہو رہا ہے۔ اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ معالم العرفان کی جلد ۱۰ میں آئے گی۔

حضرت موسیٰ کو شرف ہم کلامی

۱۴۳۔ اور موسیٰ آیا کہ ہمارے مقررہ وقت میں حاضری دے اور اس کے پروردگار نے اس سے کلام کیا۔ چالیس دن کی میعاد پوری ہو چکنے پر حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو کسی مخصوص و ممتاز رنگ میں مکالمہ کا شرف بخشا۔ انبیاء کی خصوصیتوں میں سب سے بڑی خصوصیت مکالمہ الٰہی ہے۔ قرآن عزیز میں بار بار پیغمبروں کے مخاطبہ ربانی اور مکالمہ الٰہی کی تصریح ہے اور مجموعہ تورات میں ہر پیغمبر کے متعلق اس کی شہادتیں موجود ہیں۔

اللہ انبیاء سے کلام کیونکر کرتا ہے۔ قرآن کی ایک آیت میں اس کی حسب ذیل صورتیں بتائیں۔

وماکان لبشر ان یکلمہ اللہ الا وحیا او من ورای حجاب او یرسل رسولا فیوحی باذنہ مایشاء انہ علی حکیم۔

اور کسی بشر کی یہ تاب نہیں کہ خدا اس سے دوبدو کلام کرے لیکن وحی کے ذریعے سے یا پردہ کی آڑ سے یا یہ کہ وہ قاصد کو بھیجے جو اس کے حکم سے جو کچھ وہ چاہتا ہے پہنچا دیتا ہے۔

اس آیت میں مکالمہ الٰہی کی تین صورتیں بیان ہوئی ہیں۔ کلام بالوحی، کلام پس پردہ اور کلام بذریعہ قاصد۔ ان تینوں قسموں میں سے ہر پیغمبر کو کسی نہ کسی طریق کلام سے مشرف کیا گیا ہے۔ بعض پیغمبروں کو خصوصیت کے ساتھ کلام پس پردہ کے شرف سے ممتاز کیا گیا ہے۔ اسی لیے ان کے فضائل میں تکلم الٰہی کی فضیلت کو مستقل حیثیت دی گئی ہے۔ مثلاً یہاں حضرت موسیٰ کی شان میں فرمایا ہے کلمہ ربہ کی تصریح ہے سورہ بقرہ میں اس خاص طریقہ کلام کے دائرہ کو اور بھی وسعت دی گئی ہے چنانچہ انبیاء کے تذکرے میں فرمایا منھم من کلم اللہ اس آیت میں

نام کی تصریح نہیں ہے اس لیے اس شرف خاص میں حضرت موسیٰ کے ساتھ دوسرے انبیاء بھی شریک ہو سکتے ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو مکالمہ الٰہی کے تینوں مذکورہ بالا طریقوں سے خدا کی ہمکلامی کا شرف حاصل ہوا ہے بلکہ واقعہ معراج میں وہ مرتبہ بھی پیش آیا ہے جہاں حبیب و محبوب کے درمیان قاصد و پیغمبر سے بیگانہ تھے۔ جہاں زمان و مکان اور جلوہ ذو نگاہ کی شرکت بھی مخل تنہائی تھی۔ جہاں نہ کوہِ سینا تھا نہ برقِ طور، دشت ایمن تھا نہ نخل وادی، صوت سرمدی سامعہ نواز تھی اور حقیقت محمدی گوش سا ع ۔

قرآن نے تو صرف اتنی بات فرمائی ہے کہ کلمہ ربہٗ یہاں کلام کے قرآن کے مخاطبوں نے وہی معنے سمجھے جو عربی زبان میں اس کے معنے ہیں لیکن متکلمین آفرین طبائع نے اس پر قناعت نہیں کی۔ انہوں نے اس کے لیے تاویل کا جامہ تراش لیا اور بنایا کہ کلام جو خدا کی صفت ہے وہ حروف اور آواز سے مرکب نہیں بلکہ وہ ایک صفت ہے جو اس کی ذات پاک سے قائم ہے اس کو کلام نفسی کہتے ہیں۔ نفسی خدا کی صفت ہے لفظی صفت نہیں ہے۔ نفسی مخلوق نہیں ہے لفظی مخلوق ہے قرآن کی صورت میں جو کچھ موجود ہے کلام نفسی نہیں بلکہ کلام لفظی ہے مگر قرآن مخلوق نہیں ہے کیونکہ یہ اللہ کا کلام ہے بایں معنے کہ یہ خدا کی صفت کلام کے لیے نشان راہ ہے۔ یہ بات لوگوں نے مختلف انداز میں سمجھائی ہے مثلاً مولانا حقانی فرماتے ہیں۔

کلام خدا کے دو معنے ہیں ایک کلام نفسی جو قدیم ہے پس یہ صفت ازل سے ابد تک اس کو حاصل ہے اس کے سبب سے جس سے چاہتا ہے کلام کرتا ہے جیسے کہ ہم کو صفت کلام حاصل ہے اور ہر وقت ہمارے ساتھ ہے گو کہ ہم کسی سے کلام نہ کریں یہ صفت کلام بالاتفاق ازلی ہے اور اس کے ساتھ قائم ہے سو یہ کلام الٰہی اس سبب سے ہے کہ اس کی صفت ہے دوسرے یہ الفاظ اور عبارت قرآن کی اس کو کلام الٰہی اس وجہ سے کہتے ہیں کہ یہ سوائے خدا کے اور کسی کی تالیف نہیں ہے بلکہ ان کو خاص اللہ تعالیٰ نے نازل کیا اس معنے سے الفاظ اور عبارت قرآن مجید بھی کلام الٰہی ہے۔

مولانا محمد ادریس نے اسی بات کو دوسرے انداز میں پیش کیا ہے۔

"کلام الٰہی کا اطلاق دو معنی پر ہوتا ہے اوّل یہ کہ کلام اللہ سبحانہٗ کی صفت قدیمہ ہے جو اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے اور بسیط ہے۔ دوٗ کلمات جن کا حق سبحانہٗ نے تکلم فرمایا۔ قرآن کو اسی معنے میں کلام اللہ کہا جاتا ہے۔ یہ کلمات بھی قدیم اور مجرد عن المادہ ہیں کیونکہ اللہ سبحانہٗ

سے ان کا ظہور اور صدور ہوا ہے اور جو شی قدیم سے ظاہر اور صادر ہوگی وہ بھی قدیم ہوگی ہمارے الفاظ اور حروف اور ہماری آواز ان کلمات الٰہیہ کے لیے بمنزلہ آئینہ کے ایک مظہر اور تجلی گاہ ہیں۔ اگر کسی شے کا عکس آئینے میں پڑے تو اصل شے کو عکس کے عوارض سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اسی طرح ہماری قرأت اور تلاوت میں جو حدوث کے لوازم پائے جاتے ہیں کلمات الٰہیہ کو ان سے کوئی تعلق نہ ہوگا قدیم اپنے قدیم پر رہے گا حادث اپنے حدوث پر رہے گا حدوث اور امکان کے سارے عوارض بندے کی طرف متوجہ ہوں گے اور خدا اور اس کا کلام ان سب سے منزّہ ہوگا ادھر تنزیہہ و تقدیس ہوگی ادھر تشبیہہ و تمثیل ہوگی۔ ادھر وجوب و قدم ہوگا ادھر حدوث اور امکان ہوگا۔

دوسرے عنوان سے اس کو یوں سمجھو کہ الفاظ اور عبارات معانی کے لیے بمنزلہ آئینہ کے ہیں۔ معانی الفاظ میں حلول نہیں ہوتے اور نہ الفاظ معانی کے لیے محل اور ظرف ہوتے ہیں بلکہ الفاظ معانی کے لیے مظہر اور تجلی گاہ اور ایک آئینہ ہوتے ہیں۔ الفاظ و معانی میں ظاہر اور مظہر کا علاقہ ہوتا ہے حال اور محل ظرف اور مظروف کا علاقہ نہیں ہوتا۔ کوئی شخص یہ نہیں سمجھا سکتا کہ معانی الفاظ کے آئینے میں کس طرح عکس فگن اور جلوہ گر ہیں۔ فقط اجمالاً اتنا جانتا ہے کہ الفاظ اور عبارات کی صفات اور کیفیات سے معانی کو کوئی تعلق نہیں۔ اسی طرح ہماری زبانیں اور ہمارے کتابی نقوش کلمات قدسیہ کے لیے ایک آئینہ ہیں۔ حدوث و امکان کے تمام عوارض ہماری زبان اور کتاب کی طرف متوجہ ہوں گے اور اس کا کلام پاک ان تمام عوارض سے پاک ہوگا۔ [1]

دوسرے علماء نے بھی اللہ سبحانہٗ کی صفت کلام کی تفہیم اسی کے قریب قریب کی ہے۔ دراصل یہ تفہیم کے لیے تقریر نہیں بلکہ تاویل ہے مگر اس تاویلی دلدل میں کلام نفسی ایک ایسی بجھارت ہے جس کے سمجھنے سے بڑے بڑے قاصر رہے ہیں۔ اردو کا حال تو کتابوں میں ہے لیکن شاہ ولی اللہ محدث دہلوی جن کی اس قسم کے مسائل میں ژرف نگاہی مشہور ہے ان کا اقرار ہے لا ادری ما الذی یسمونہ کلاماً نفسیاً، مجھے پتہ نہیں کہ متکلمین نے کلام نفسی کس چیز کا نام رکھا ہے۔ اس تاویل کے مقابلہ میں وہ تفویض کو ترجیح دیتے ہیں۔ یعنی یہ کہ اللہ سبحانہٗ کلام فرماتا

---

[1] علم الکلام

ہے جیسے اس کے شایان شان ہے اور جو اس کی عظمت اور کبریائی کے لائق ہے۔ اللہ کی ذات قادر ہے اور قادر کلام کے لیے ذرائع کا محتاج نہیں ہوتا۔ اسی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ خدا کے کلام کی قرأت اپنی تلاوت کے اعتبار سے حادث ہے کیونکہ قرأت قاری کا وصف ہے نہ کہ خدائے تعالیٰ کا۔ ابن قتیبہ کہتے ہیں کہ:

جو شخص یہ کہتا ہے کہ قرأت غیر مخلوق ہے وہ گویا یہ کہتا ہے کہ انسان کے اعمال غیر مخلوق ہیں۔ (اختلاف اللفظ)

حافظ ابن تیمیہ نے مسلک تفویض کی جو عقلی توضیح فرمائی ہے اس سے ارباب تاویل کا سارا گھروندا پاش پاش ہو گیا۔ انہوں نے اس بنیاد کو منہدم کر دیا جس پر معتزلہ کا اعتراض قائم ہے اور جس کے لیے متکلمین نے کلام نفسی کا کمزور سہارا تلاش کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ قرآن اگر غیر مخلوق ہے تو اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ وہ قدیم بھی ہے۔ ابن تیمیہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ امام احمد نے یہ دعویٰ کبھی نہیں کیا کہ قرآن قدیم ہے اسے غیر مخلوق کہنے کی حد سے انہوں نے کبھی تجاوز نہیں کیا اور قدیم اور غیر مخلوق ہونے میں کوئی تلازم نہیں۔ یہ لازم نہیں کہ جو چیز غیر مخلوق ہو وہ قدیم بھی ہو، کیونکہ ہر وہ چیز جو ذات خداوندی کے ساتھ قائم ہو، ضروری نہیں کہ وہ اس کی طرح قدیم بھی ہو۔ سب افعال و احداث ذات الٰہی سے وابستہ ہیں اور اس سے صادر ہوتے ہیں۔ اپنے وقت حدوث میں وہ اللہ کے ساتھ قائم ہوتے ہیں اور سب احداث اپنے حدوث موضوع کے اعتبار سے حادث ہیں لہٰذا اللہ تعالیٰ خالق ہے اور مخلوق حادث اور نفس خلق و ایجاد اپنے مصدری معنوں میں اپنے حدوث سے موضوع کے لحاظ سے حادث ضرور ہیں لیکن خلق و ایجاد کے لیے یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ مخلوق ہیں کیونکہ صفت موصوف کا معلول نہیں ہوتی نہ انہیں قدیم کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ وہ موجود بعد العدم ہیں۔ یہ تو فلاسفہ کی خواہ مخواہ کی دھینگا مشتی ہے کہ قدیم و غیر مخلوق میں بتاتے ہیں اور اس کی عمارت ایسے عقلی مفروضوں پر اٹھاتی ہے جنہیں سلف نے کبھی درخور التفات نہیں سمجھا۔ چونکہ یہ ظنیات ہیں اس لیے ان کے نتائج بھی ظنی ہیں۔ ابن تیمیہ الرسائل والمسائل میں رقمطراز ہیں:

سلف کا اس امر پر اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام غیر مخلوق ہے۔ اس سے بعض لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ وہ اس کو قدیم العین سمجھتے ہیں۔ اسی طرح ایک فرقہ نے یہ بات بنائی کہ قرآن درحقیقت معنی واحد کلام نفسی ہے جو مختلف شکلیں

اختیار کرلیتا ہے۔ دہی کبھی امر ہوجاتا ہے کبھی نہی کبھی خبر کبھی مخبر عنہ، وغیرہ اللہ نے اگر اسے عربی میں بولا تو وہ قرآن ہوگیا۔ عبرانی میں بولا تو وہ تورات کہلایا۔ سریانی میں بولا ہے تو وہ انجیل ہے۔ لیکن یہ بات بھی عقل اور شریعت دونوں کے بالکل خلاف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قدم ذات کے اعتبار سے صفت کلام قدیم ہے لیکن خود تکلم قدیم نہیں ہے لہٰذا قرآن نہ قدیم ہے اور نہ مخلوق ہے۔ متکلمین یہ بات سمجھانا چاہتے ہیں کہ قرآن کو کلام نفسی کے اعتبار سے غیر مخلوق کہنا چاہیے اور کلام نفسی کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے معانی اللہ تعالیٰ کے ہیں لیکن الفاظ وحروف کی خدائی نہیں ہے لیکن حافظ ابن تیمیہ نے تقریباً سوا اعتراضات متکلمین کے اس نظریہ پر کیے ہیں۔

اس موضوع پر یہ یقیناً غلو ہے کہ کلام کے ساتھ تلاوتِ کلام کو بھی غیر مخلوق کہا جاتے۔ ظاہر ہے کہ کلام اللہ کی صفت ہے جب کلام اللہ کی تلاوت بندہ کا فعل ہے اور افعال بندگان کے مخلوق ہونے کو سب مانتے ہیں۔ کچھ لوگوں نے تو اسے بدعت ہونے کی وجہ سے ناپسند کیا اور کچھ نے کلام اللہ کو مخلوق کہنے کے اندیشہ سے اس پر قدغن قائم کیا۔ ائمہ حدیث میں مشہور امام حدیث علی ابن المدینی کو اس مسئلہ میں اس درجہ غلو تھا کہ تلفظ بالقرآن کے مسئلہ پر ان کو امام بخاری سے سخت اختلاف ہوگیا تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ جیسے امام بخاری کو الایمان قول وعمل کے مسئلہ میں اس درجہ غلو تھا کہ جو شخص اس مسئلہ کا قائل نہ ہوتا اس سے حدیث نہ لیتے تھے چنانچہ خود ان کا بیان ہے۔ میں نے کسی ایسے شخص سے حدیث نہیں لکھی جس کا قول یہ نہ تھا کہ الایمان قول وعمل۔ اسی طرح امام ذہلی کو قرآن کے غیر مخلوق ہونے کے باب میں اس درجہ شدت تھی کہ جو شخص تلفظ بالقرآن کو بھی مخلوق کہتا وہ اسے بھی بدعتی سمجھتے تھے۔ یہ واقعہ ہے کہ جب امام بخاری نیشاپور تشریف لائے تو امام ذہلی نے بنظرِ احتیاط پہلے ہی لوگوں سے کہہ دیا کہ امام بخاری کی قیام گاہ پر بہت بڑا ہجوم تھا اس پر ہجوم نشست میں ایک شخص نے امام بخاری سے سوال کیا کہ تلفظ بالقرآن کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں۔ امام موصوف نے جواب دیا افعالنا مخلوقۃ و الفاظنا من افعالنا، ہمارے افعال مخلوق ہیں اور ہمارے الفاظ بھی ہمارے افعال میں داخل ہیں۔ یہ کہنے کے ساتھ حاضرین میں اختلاف ہوگیا اور اختلاف نے تھوڑی دیر میں ہنگامہ کی صورت اختیار کرلی۔ امام ذہلی کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو سخت برہم ہوتے۔ ان ہی دنوں بغداد کے محدثین نے بھی امام ذہلی کو لکھ بھیجا کہ امام بخاری نے یہاں بھی تلفظ بالقرآن کے مسئلہ پر کلام کیا۔ اب امام ذہلی سے دہانہ

گیا اور انہوں نے اعلان کر دیا۔

قرآن اللہ کا کلام ہے اور غیر مخلوق ہے اور جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ جو الفاظ قرآنی میرے منہ سے نکلتے ہیں وہ مخلوق ہیں وہ بدعتی ہے نہ اس کے پاس بیٹھنا چاہیئے نہ اس سے بات کرنی چاہیئے اور اس اعلان کے بعد جو امام بخاری کے پاس جاتے وہ مشکوک ہے۔

امام ذہلی کا یہ اعلان کرنا کہ سوائے امام مسلم اور احمد بن مسلمہ کے سب لوگوں نے امام بخاری سے قطع تعلق کر لیا۔ خیر یہ داستان طویل ہے۔ اصل بات یہ تھی کہ امام بخاری اس مسئلہ میں تلاوت اور متلو میں فرق کرتے تھے کہ متلو جو اللہ کا کلام ہے غیر مخلوق ہے اور تلاوت جو بندہ کا فعل ہے مخلوق ہے اور یہی سب کا مسلک ہے لیکن امام ذہلی اس تفصیل میں پڑنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ وہ خلق قرآن کے مسئلہ میں اس قدر ڈرے ہوتے تھے کہ سرے سے ان مسائل کلامیہ میں گفتگو کرنا ہی پسند نہ کرتے تھے کہ مبادا کسی نئے فتنہ کا دروازہ نہ کھل جائے اور محدثین کی اپوزیشن معتزلہ کی تقویت کا سامان ہو۔ بالکل اسی طرح جیسے کہ امام بخاری اس بات کو سننے کے روا دار نہ تھے کہ ایمان و عمل جدا جدا ہیں اور ہر ایک کا حکم مختلف ہے وہ اس مسئلہ کی تفصیل میں نہ جاتے تھے۔ صرف یہ دیکھ کر کہ ایمان و عمل کو جدا جدا سمجھنا مرجئہ کا مذہب ہے اس کی سختی سے تردید کرتے تھے حالانکہ اس موضوع پر امام بخاری کا مذہب یہ ہے کہ ایک عصیان شعار اور گنہ گار مسلمان کا معاملہ اللہ کے اختیار میں ہے وہ چاہے تو اپنے قانون عدل کے مطابق اس پر عذاب کرے اور چاہے تو اپنے فضل سے اس کو معاف کر دے مگر اس مسئلہ کی تفصیل میں نہ جانے سے امام بخاری کو اس مسئلہ میں اسی قدر شدت ہو گئی تھی جس قدر امام ذہلی کو تلفظ بالقرآن کے مسئلہ میں تھی۔

بہر حال کلام متکلم کا ایک وصف ہوتا ہے جو کسی ذات کا کمال سمجھا جاتا ہے لہٰذا کلمہ ربہ میں اگر اللہ سبحانہٗ کو متکلم کہا گیا ہے تو یہ وصف اس کی ذات مقدسہ کے ساتھ قائم ہے۔ کلام اس سے صادر ہوتا ہے۔ پھر یہ ایک اعلیٰ وصف ہے جو مخلوق میں اس نے پیدا کیا ہے کوئی وجہ نہیں کہ اس اعلیٰ وصف سے اللہ تعالیٰ کو موصوف نہ مانا جائے لیکن جس طرح صفت موصوف کی مفعول نہیں ہوتی اسی طرح خالق کا وصف اس کی مخلوق نہیں بلکہ اس سے متصل ہے۔

یہاں علامہ آلوسی نے امام ابوالحسن اشعری کی طرف منسوب یہ بات کی کہ موسیٰ علیہ السلام نے

کلام نفسی سنا لکھ کر بتایا ہے کہ اگر امام ابوالحسن کی طرف اس کی نسبت درست بھی ہو پھر بھی یہی درست ہے کہ امام ابوالحسن نے اس سے رجوع کر لیا ہے اور اُن کا مذہب سلف کے مطابق ہے۔ علامہ آلوسی نے اپنی کتاب روح المعانی کے مقدمہ میں کھلے لفظوں میں بتایا ہے کہ،

اب حضرت موسیٰ اللہ کی بات سننے کے بارے میں بات سنو۔ میرا کہنا یہ ہے کہ ائمہ دین جس آخری نتیجہ پر پوری ردوکد کے بعد پہنچے ہیں جیسے امام ماتریدی اور امام ابوالحسن اشعری اور دوسرے محققین وہ یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کا کلام حروف و آواز کے ساتھ سنا جیسا ان تصریحات کا تقاضا جو بہتات میں آئی ہیں کہ ان کی کوئی تاویل مناسب نہیں ہے۔

حضرت موسیٰ کا اشتیاقِ دید

۱۴۳۔ تو بول پڑا اے میرے رب دکھا تو مجھے میں تیری طرف دیکھوں حکم ہوا مجھے تو ہرگز نہ دیکھے گا۔ اس وقت حضرت موسیٰ کو بلا واسطہ کلام الٰہی سننے کی لذت بے پایاں حاصل ہوئی تو کمالِ اشتیاق سے متکلم کے دیدار کی آرزو کرنے لگے اور بے ساختہ درخواست کر دی رب ارنی انظر الیك اے پروردگار میرے اور اپنے درمیان سے حجاب اور موانع اٹھا دیجئے اور وجہ انور بے حجاب سامنے کر دیجئے کہ ایک نظر دیکھ سکوں۔ فرمایا لن ترانی یعنی دُنیا میں کسی مخلوق کا یہ فانی وجود اور فانی قوی اُس ذوالجلال والاکرام لم یزل ولا یزال کے دیدار کا تحمل نہیں کر سکتے۔ اس سے ثابت ہوا کہ دُنیا میں کسی کو موت سے پہلے دیدارِ خداوندی کا شرف حاصل ہونا شرعاً ممتنع ہے۔ گو عقلاً ممکن ہو کیونکہ اگر امکان عقلی بھی نہ مانا جائے تو موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کی نسبت یہ خیال نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ایک محال عقلی کی درخواست کرے۔ اہل السنۃ والجماعۃ کا یہی مذہب ہے کہ رویت باری دُنیا میں عقلاً ممکن شرعاً ممتنع الوقوع ہے۔ اور آخرت میں اس کا وقوع نصوص قطعیہ سے ثابت ہے۔ رہی رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رویت شب معراج میں وہ اختلافی مسئلہ ہے جس کا ذکر ان شاء اللہ سورہ نجم میں آئے گا۔[1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

مطلب یہ ہے کہ کلام سے مشرف ہونے کے بعد حضرت موسیٰ کو شوق ہوا۔ یعنی جب جنب سے ندائے حق سنی تو جوش طلب میں بے خود ہوگئے اور لذت سماع کی محویت میں لذتِ مشاہدہ کے حصول کا ولولہ پیدا ہوگیا۔ چنانچہ انہوں نے نہایت ادب سے درخواست کی رب ارنی انظر الیک میرے سامنے آجا کہ ایک نگاہ دیکھ لوں۔ یہ شوق ایک فطری شوق ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو اس پر ملامت نہیں کی بلکہ یہ فرمایا کہ لن ترانی انسان ان ناسوتی آنکھوں سے خدا کی ذات کو نہیں دیکھ سکتا۔ صرف اس کی صفات کے مظاہر کو دیکھ سکتا ہے آفتاب انسان کی زندگی کی ایک ناگزیر ضرورت ہے مگر اس کی روشنی اور حرارت اسی وقت تک اس کے لیے حیات بخش ہے جب تک وہ نہایت طویل فاصلہ سے نہ معلوم کتنے فضائی پردوں کی اوٹ سے اور کتنی چھلنیوں سے گزر کر اپنی روشنی اور حرارت انسان تک پہنچاتا ہے تو جب اس کائنات کی مخلوق کے مقابلہ میں انسان کی قوت برداشت اتنی ناتواں ہے تو وہ خدا کی ذات اقدس کی تاب کس طرح لا سکتا ہے۔

مسند احمد میں حضرت ابوموسیٰ اشعری کے حوالہ سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

> اللہ سبحانہٗ نہ سوتا ہے اور نہ سونا اس کی شان ہے، میزان عدل کو پست کرتا ہے اور بلند کرتا ہے۔ اس کے اور اس کی مخلوق کے درمیان خود اس کا نور اس کا حجاب ہے اگر وہ یہ حجاب اٹھا دے تو اس کی ذات کے انوار جہاں تک نظر ہو سب کو پھونک ڈالیں۔

اصل روایت میں حجابہ النار ہے اور صحیح مسلم میں اس کی جگہ حجابہ النور آیا ہے چونکہ حقیقت کے لحاظ سے نور اور نار میں کوئی فرق نہیں ہے اس لیے ہم نے اس کا عام فہم ترجمہ نور ہی کر دیا ہے۔ ابوعبیدہ نے لفظ نار کی مناسبت سے یہاں قرآن کی آیت فلما جاءھا نودی ان بورک من فی النار تلاوت کی ہے یعنی جب حضرت موسیٰ کو صورت نار میں تجلی ہوئی تو معلوم ہوا کہ ذات پاک کا حجاب نار تھا جس کے پس پردہ اس کی تجلی ہو رہی تھی۔ اس بابرکت نار اور بابرکت ماحول سے کسی نافہم کو یہ دھوکا نہ لگے کہ معاذاللہ خدا کی ذات آگ میں حلول کر آئی تھی۔ اس لیے فرمایا سبحان اللہ رب العالمین یعنی وہ اس آگ اور سارے جہان کا پالنے والا ہے۔ وہ جسم و جہت، حدوث و حلول کے آثار سے پاک و برتر ہے۔ ارشادِ نبوت کا خلاصہ یہ ہے کہ خالق کا حجاب مخلوق کی طرح باہر سے نہیں یہاں خود اس کے عظمت و جلال

کے انوار ہی اس کا حجاب ہیں جس طرح کہ خود آفتاب کی کرنیں اور حسین کا حسن کبھی کبھی اس کے دیدار کے لیے حجاب بن جاتا ہے۔ اسی طرح یہاں خود اس کی عظمت و جلال کے انوار ہی اس کا حجاب بن رہے ہیں۔ عقولِ انسانی نے بارہا شوخی کی اور چاہا کہ بے حجاب نظارہ کریں مگر ہمیشہ حیران اور سرگرداں ہو کر ناکام واپس آئیں۔ اب اس عالم میں بے حجاب دیدار کی صورت صرف یہ ہے کہ وہ خود اس حجاب کو اٹھا دے تو اس پر اس کو تو قدرت ہے مگر مخلوق میں اتنی طاقت نہیں کہ اس کی تاب لا سکے۔ اربابِ عقول کا حصہ یہاں صرف اعتقادِ عظمت ہے اور اربابِ کشف کا ذوق و وجدان۔

اس آیت سے معتزلہ نے استدلال کیا ہے کہ اللہ کی رویت اور اس کا دیدار اس دارِ دُنیا میں اور دارِ آخرت میں عقلاً ناممکن اور محال ہے اس لیے کہ رویت کا تقاضا جسمیت ہے یعنی دیکھی وہ ہی چیز جاتی ہے جو مجسم ہو۔ لیکن اہل السنۃ کے دونوں طبقے اربابِ تاویل اور اصحابِ تفویض نے معتزلہ سے اختلاف کیا ہے۔ وہ اس کے تو قائل ہیں کہ اس ناسوتی زندگی میں انسان اللہ کا دیدار نہیں کر سکتا لیکن آخرت میں وہ اللہ کے دیدار کے قائل ہیں۔ اور دُنیا کی زندگی میں وہ اپنی مادی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا مگر یہ نہ دیکھ سکنا امتناعِ عقلی کی بنا پر نہیں بلکہ امتناعِ شرعی کی بنا پر ہے اور یہ آیت اسی امتناعِ شرعی کی دلیل ہے۔ اگر دیدارِ خداوندی امرِ محال ہوتا تو خود حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ سبحانہٗ سے اس کی رب ارنی فرما کر اس کی درخواست نہ فرماتے۔ یہ ناممکن ہے کہ اللہ کے پیغمبر کو یہ علم نہ ہو کہ کون سی چیز بارگاہِ خداوندی میں ممکن ہے اور کون سی محال۔ نیز یہاں خود اس درخواست کا جواب لن ترانی بھی اس امکانِ عقلی کا مؤید ہے کیونکہ جواب میں یہ فرمایا لن ترانی تم ہرگز نہ دیکھو گے۔ یہ نہیں فرمایا لن اُریٰ میں ہرگز نہ دیکھا جاؤں گا یعنی میرا دیدار ممکن نہیں ہے۔ لن ترانی کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ میں اس قابل ہوں کہ دیکھا جاؤں۔ میری طرف سے کوئی حجاب نہیں ہے مگر تم میں دیدار کے تحمل کی قوت نہیں اس لیے تم مجھے دُنیا میں نہ دیکھ سکو گے۔ ہاں آخرت میں قوتِ تحمل عطا کر دی جائے گی اس لیے وہاں دیکھ سکیں گے۔ دنیا دارِ فنا ہے اور آخرت دارِ بقاء ہے۔ آخرت میں پہنچ جانے کے بعد نہ کسی کو موت آئے گی اور نہ کوئی بیمار ہوگا اور نہ کسی کو ضعف لاحق ہوگا۔

قرآن وسنت اور اجماعِ صحابہ اور تابعین سے یہ بات ثابت ہے کہ اہلِ ایمان جنت میں دیدارِ خداوندی سے مشرف اور سرفراز ہوں گے۔ جس طرح خداوندِ ذوالجلال بندوں کو دیکھتا ہے

اور خود مکان و جہت سے پاک اور منزّہ ہے اور بندے مکان اور جہت میں ہیں۔ اسی طرح عقلاً یہ بھی ممکن ہے کہ بندے اس خداوند ذوالجلال کو اس طرح دیکھیں کہ بندے تو کسی خاص سمت میں ہوں اور اللہ مکان و جہت اور سمت سے پاک ہو۔ دیکھنے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ جس شے کو دیکھا جائے وہ جسم ہی ہو اور کسی خاص سمت اور مکان میں ہو۔ یہ تمام باتیں رویت کی شرائط عادیہ میں عقلاً جائز ہیں کہ رویت کی تمام شرطیں موجود رہوں۔ آج بھی اللہ سبحانہٗ کو دل کی آنکھوں سے بے کیف دیکھتے ہیں۔ قیامت کے دن سر کی آنکھوں سے بے کیف دیکھیں گے یہ ہے اہلِ تاویل کا موقف۔ اہلِ تفویض قیامت کے دن دیدارِ الٰہی کے عقیدے پر کامل ایمان رکھتے ہیں اس لیے کہ یہ بات نصوص سے ثابت ہے لیکن وہ اس ادھیڑ بن میں نہیں پڑتے کہ یہ رویت کس طرح ہوگی۔ نہ معتزلہ کی طرح یہ سوچتے ہیں کہ رویت کے لیے جسم کا ہونا ضروری ہے وہ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ خدا کی رویت ہوگی اور اس طرح ہوگی کہ وہ فانی چیزوں سے متشابہ نہ ہوگی لیکن رویت کی حقیقت اور کیفیت یہ وہ مباحث ہیں کہ جن پر غور و فکر غیر ضروری ہے۔ ان کے خیال میں آخرت میں دیدارِ الٰہی کا عقیدہ تنزیہہ کے قطعاً منافی نہیں۔ جہت اور مکان وغیرہ کے لزوم کی حیثیت خود ساختہ اصطلاحات کا گورکھ دھندا ہے۔ تنزیہہ کے مفہوم میں جہت و مکان کے عموم کے داخل ہونے پر نہ کوئی عقلی دلیل ہے نہ نقلی، سینکڑوں براہین سے اللہ سبحانہٗ کا علو ثابت ہے اور آخرت میں اس کا دیدار بھی۔ اب جو لازم آتا ہے آجائے۔ اس سے رویت کے ثبوت پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ بلکہ یہ ایک مضحکہ خیز بات ہے کہ رویت کو تسلیم کر کے جہت سے فرار کیا جائے چنانچہ ایک متکلم امام ابن فورک سلطان محمود غزنوی کے سامنے لاجواب ہو گئے۔ جب انہوں نے دریافت کیا کہ رویت بلا جہت کیا ہوتی ہے۔ علامہ ابن رشد نے بھی اس کو اشعریوں کا تناقض قرار دیا ہے دیکھو الکشف عن مناہج الادلہ۔ حافظ ابن تیمیہ نے منہاج السنہ میں اس موضوع پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے اور اہلِ تاویل کے سارے استحالوں کا مدلل رد فرمایا ہے۔ حافظ ابن تیمیہ الرد علی المنطق میں لکھتے ہیں :

> خدا کا ممکن الرویۃ ہونا دلائل عقلیہ سے ثابت ہے لیکن وہ دلیل نہیں جو ابوالحسن اشعری وغیرہ نے قائم کی ہے۔

ابن قتیبہ نے اختلاف اللفظ میں پوری بات کو کھول کر سمجھایا ہے کہ :

لا تدرکہ الابصار کا مطلب یہ ہے کہ دُنیا میں خدا کو دیکھا نہیں جاسکتا۔ اسی طرح لن ترانی میں جو فرمایا کہ تم مجھے ہرگز نہ دیکھو گے ۔ یہ بھی دنیا کے لیے ہے۔ لیکن یوم حساب و جزا، قصاص کے دن وہ اپنی تجلی سے لوگوں کو شادکام کرے گا اور وہ اسے دیکھیں گے جس طرح چاندنی رات میں چاند کو دیکھتے ہیں۔ حدیث رسول کتاب اللہ کی مفسر اور شارح ہے ۔ رویت کی حدیث کی صحت سے کوئی جاہل ہی انکار کر سکتا ہے ۔ کیونکہ ثقہ راویوں کی یہ حدیثیں جہات کثیرہ سے ثابت ہیں پس اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں کہ لا تدرکہ الابصار اور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تصریح میں کہ تم قیامت کے روز اللہ کو دیکھو گے ایک صاحبِ نظر کے لیے صرف وقت کا فرق ہے ۔

انشاء اللہ رویت باری پر پوری تفصیلی بحث معالم القرآن کی ستائیسویں جلد میں آئے گی بشرطیکہ قفس عنصری میں انفاس حیات رواں رہے یہاں صرف اتنی بات یاد رکھ لیجئے کہ جنت کی سب سے آخری اور سب سے بڑی نعمت اللہ سبحانہ کی تجلی کا نظارہ ہے ۔ کون ہے جو اس مطلع انوار کے دیدار کی تاب لا سکے ۔ تاہم یا تو یہ آنکھیں کچھ اور ہوں گی یا وہ نور مطلق وہاں کسی شان میں نمایاں ہوگا۔ اس وقت یہ عالم ہوگا کہ وہ نور کا مرکز بن کر نمودار ہوگا اور جنت کی مشتاق نگاہیں اس کی طرف اٹھی ہوں گی۔

وجوہ یومئذ ناضرۃ الی ربہا ناظرۃ

حافظ ابن حجر عسقلانی نے صحیح بخاری کی شرح فتح الباری میں لکھا ہے :

مثبتین رویت کا رویت کے مفہوم میں اختلاف ہے ۔ کچھ کی رائے ہے کہ دیکھنے والے کے لیے اللہ سبحانہ کا علم عینی ہوگا جیسا کہ دوسری مرئیات میں ہوتا ہے یہ بات کما تردن القمر کے مطابق ہے لیکن اللہ کی ذات جہت اور کیفیات سے منزہ ہے اور کچھ کے خیال میں رویت سے علم ہی مراد ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان میں اللہ کی نسبت ایسی حالت پیدا ہو جائے گی جیسے آنکھ کی مرئیات سے حاصل ہوتی ہے اور کچھ کہتے ہیں انسان کا اللہ کو دیکھنا دراصل ایک قسم کا کشف و علم ہے لیکن یہ علم سے زیادہ واضح اور تام ہوگا اور یہ پہلی رائے کی نسبت زیادہ اقرب الی الصواب ہے ۔

۱۷۵۔ ہاں اس پہاڑ کی طرف دیکھو اگر یہ اپنی جگہ ٹکا رہا تو مجھے دیکھ پاؤ گے۔ یعنی تم پہاڑ کی طرف دیکھتے رہو ہم اپنے جمال مبارک کی ایک ذرا سی جھلک اس پر ڈالتے ہیں۔ اگر پہاڑ جیسی سخت اور مضبوط چیز اس کو برداشت کر سکی تو ممکن ہے تم کو بھی اس کا تحمل کرا دیا جائے ورنہ سمجھ لیجئے کہ جس چیز کا تحمل پہاڑ سے نہ ہو سکے کسی انسان کی مادی ترکیب اور جسمانی آنکھیں اسے کیسے برداشت کر سکتی ہیں۔ اگرچہ قلبی و روحانی طاقت کے اعتبار سے زمین آسمان پہاڑ سب چیزوں سے انسان فائق ہو اور اسی لیے موسیٰ علیہ السلام جس وحی الٰہی کے حامل تھے بلکہ دوسرے انبیاء بھی جس امانتِ عظیمہ کے حامل ہیں پہاڑ وغیرہ اس کے اٹھانے پر قادر نہیں۔ فابین ان یحملنها و اشفقن منها و حملها الانسان اور لو انزلنا هذا القرآن علی جبل لرایته خاشعا متصدعا من خشیة الله تاہم جس چیز کا تعلق ظاہری آنکھوں یا بدن کی مادی قوت سے ہو اس میں انسان دوسری عظیم الخلقت چیزوں سے بہت کمزور واقع ہوا ہے لخلق السماوات والارض اکبر من خلق الناس و لکن اکثر الناس لا یعلمون اور و خلق الانسان ضعیفا" اس جگہ موسیٰ علیہ السلام کو انسانی وجود کی اسی کمزوری کی طرف توجہ دلاتی ہے[1]

یہ مشاہدہ حضرت موسیٰ کی تسلی اور اطمینان خاطر کے لیے کرایا گیا کہ اللہ سبحانہ کی تجلی ذات کی تاب تو کوہ و جبل بھی نہیں لا سکتے جو جمود اور سختی میں انسان سے کہیں زیادہ ہیں تو انسان ضعیف البنیان ہو کر تم کس طرح لا سکو گے۔ انسان کی قوت برداشت محدود ہے۔ اس کی نگاہیں روشنی کو دیکھتی ہیں لیکن یہ روشنی ایک خاص حد سے بڑھ جائے تو آنکھیں جواب دے جاتی ہیں تو جب اس کائنات کی مخلوق کے مقابلے میں انسان کی قوت اتنی ناتواں ہے تو خدا کے جمال مطلق کی تاب کس طرح لا سکتی ہے۔ جو نور مطلق اور تمام چون و چگون سے ماورا اور بالاتر ہے فرمایا کہ تم مجھے نہیں دیکھ سکتے البتہ تم سامنے کے پہاڑ کی طرف دیکھو میں اس پر اپنی تجلی ڈالتا ہوں اور وہ تجلی بھی کتنی۔ مسند احمد اور سنن ترمذی میں حضرت انس بن مالک کے حوالہ سے بتایا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو انگلیوں کے اشارے سے بتایا کہ بس اتنی سی تجلی پہاڑ پر ہوئی۔ اگر اس پر پہاڑ اپنی جگہ رہ جاتے تو تم سمجھ لینا کہ تم مجھے دیکھ سکتے ہو۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

یہاں بھی متکلمین اور معتزلہ نے اپنی اپنی جولانی طبع کا مظاہرہ کیا ہے اور کھینچا تانی کی ہے حالانکہ دنیا میں رویت باری کی حد تک دونوں تھوڑے سے فرق کی حد تک محال بتاتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ معتزلہ دنیا میں اللہ کے دیدار کو محال عقلی کہتے ہیں اور متکلمین اسے محال شرعی کہتے ہیں باقی آخرت میں اللہ کی رویت تو اس کا آیت سے دُور کا واسطہ نہیں ہے۔

پہاڑ پر اللہ کی تجلی

۱۷۶۔ پھر جب اس کے پروردگار کی پہاڑ پر تجلی ہوئی تو پہاڑ ریزہ ریزہ ہوگیا اور موسیٰ بیہوش ہوگئے۔ حق تعالیٰ کی تجلیات بہت طرح کی ہیں اور یہ خدا کا ارادی فعل ہے کہ جس چیز پر جس طرح چاہے تجلی فرماتے۔ پہاڑ پر جو تجلی ہوئی اس نے معاً پہاڑ کے خاص حصے کو ریزہ ریزہ کر ڈالا۔ اور موسیٰ علیہ السلام چونکہ محل تجلی سے بھے ان پر اس قرب محل اور پہاڑ کے ہیبتناک منظر دیکھنے کا یہ اثر ہوا کہ بیہوش ہو کر گر پڑے۔ بلاتشبیہ یوں سمجھ لیجئے کہ بجلی جس چیز پر گرتی ہے اسے جلا کر ایک آن میں کس طرح خاک سیاہ کر دیتی ہے اور جو لوگ اس مقام کے قریب ہوتے ہیں بسا اوقات انہیں بھی کم و بیش صدمہ پہنچ جاتا ہے[۱]

تجلی کیا ہے اور اس کی نوعیت و کیفیت کیا ہوتی ہے۔ اس پر شارحین قرآن نے کوئی خاص تبصرہ نہیں کیا ہے لیکن حضرت مولانا اسماعیل شہید نے اپنی مشہور کتاب عبقات میں اس موضوع پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔

تجلیاتِ الٰہی کی تاویل کرنے والے دو گروہ

انبیاء علیہم السلام اور وہ سارا طبقہ جس نے تجلیات کی بنی آدم کو دعوت دی ہے ان کے کلام میں جو یہ بات پائی جاتی ہے یعنی تجلیات میں منشاؤں کے قیام کی وجہ سے بالفاظ دیگر معنے مصدری کے منشا کا حق تعالیٰ میں بلکہ تجلیاتِ الٰہی میں قیام کی وجہ سے خود حق تعالیٰ پر ان سے مشتق شدہ الفاظ کا جو اطلاق کیا گیا ہے اسی طرح ان مصادر سے جو افعال بنتے ہیں ان افعال کو بھی حق تعالیٰ کی طرف بھی منسوب کیا گیا ہے اس کی جن لوگوں نے تاویلیں کی ہیں وہ دو گروہوں میں

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

منقسم ہیں۔ ایک گروہ تو ان لوگوں کا ہے جو قائل ہے کہ ان مصدری معانی کے مناشی واقع میں پائے تو جاتے ہیں لیکن ان کی وجہ سے حق تعالیٰ پر ان سے مشتق شدہ الفاظ کا اطلاق مجازی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ چونکہ تجلی کی حقیقت متجلی کے سامنے بے حقیقت ہوتی ہے اس لیے اس واقعہ کی تہ تک ان بیچاروں کی رسائی حاصل نہیں ہوئی۔ ان کی اسی نارسائی نے سچ پوچھو تو ان لوگوں کو تاویل پر مجبور کیا ہے۔ انہوں نے یہ نہیں سمجھا کہ ثبوت احکام کے لیے اور مشتق الفاظ کے اطلاق کے لیے تجلی صرف ایک شرط ہے۔ نہ یہ کہ ان احکام کو تجلی ثابت کرتی ہے یا ان مشتق الفاظ کی وہ مصداق ہے۔

دوسرا گروہ جو پیغمبروں اور ہادیوں کے کلام کے اس حصہ کی تاویل کرتا ہے یہ وہ لوگ ہیں جو تجلی کے معنے کا انکار کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ان مشتق اسماء اور افعال جن کو خدا کی طرف منسوب کیا گیا ہے واقع میں ان کا منشا پایا ہی نہیں جاتا بلکہ یہ ایک مجازی تعبیر ہے اور اور معانی غیر محسوسہ یا معقولہ کو محسوس کا قالب عطا کیا گیا ہے۔ لیکن یہ ایک واضح اور صاف بات ہے کہ جو کچھ یہ حضرات کہتے ہیں اور جن تاویلوں کا یہ سہارا تلاش کرتے ہیں ان کی بنیاد ایسے کمزور علاقوں پر قائم ہے جو مجاز کی بنیاد نہیں ہو سکتے اور اہل زبان اس قسم کی بے بنیاد مجازی تعبیروں کو کبھی جائز قرار نہیں دے سکتے۔

کیسی عجیب بات ہے کہ انبیاء علیہم السلام نے ایک قرینہ بھی اپنے کلام میں ایسا نہیں چھوڑا ہے جسے بنیاد بنا کر ظاہر مطلب سے ان کے کلام کو ہٹا کر ان خود ساختہ مطالب پر چسپاں کیا جا سکے۔ ان بزرگوں میں سے کسی نے اپنی ساری زندگی میں اپنے مخلص ترین رفقاء سے خلوت یا جلوت میں کبھی ایسی بات نہیں کی جس سے اندازہ ہو سکے کہ ان کے کلام سے جو بات بظاہر سمجھ میں آرہی ہے وہ مقصود نہیں ہے اور انہوں نے یہ کبھی نہیں بتایا کہ جن باتوں کو وہ خدا کی طرف منسوب کر رہے ہیں ان سے اللہ سبحانہ کی ذات گرامی پاک اور منزہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی صحیح یا ضعیف حدیث سے ایسی کوئی بات ثابت نہیں ہوتی جس سے ان لوگوں کے تاویلی خیالات کی تائید کسی طرح بھی ہوتی ہو۔ یعنی جن احکام و امور کی ذات حق سبحانہ سے وہ نفی کرتے ہیں اپنی اس نفی کی تائید میں ان بزرگوں کی کوئی تصریح پیش نہیں کرتے بلکہ ان کا جو طریق کار ہے اس سے تو گویا نعوذ باللہ یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انبیاء کے بارے میں اپنے مخاطبوں کو یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ دنیا کو ان بزرگوں نے گمراہی میں مبتلا کیا ہے اور اس سے

آگے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ خود اللہ سبحانہٗ نے اپنے بندوں کی رہنمائی کے لیے اس قسم کے افراد منتخب کیے جن پر الہیات کے اسرار ہی نہ کھلے تھے اسی لیے ان بزرگوں نے لوگوں کو ایسی باتیں سکھائی ہیں جن کا واقعات سے کوئی ربط نہ تھا۔ اللہ کی ذات اس قسم کی بدگمانیوں سے پاک ہے۔ یہ بہت بڑا بہتان اور عظیم افترا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے شریعت کے طوق کو اپنے گلوں سے نکال پھینکا ہے اسی لیے ان کا شمار کسی حیثیت سے بھی اہل السنہ میں نہیں ہو سکتا۔

فی الواقع صحیح معنوں میں اہل السنہ کہلانے کے مستحق صحابہ کرام اور بزرگان دین کا وہ طبقہ ہے جنہوں نے صحابہ کی پیروی کی۔ بہر حال ہمارے لیے یہ کس طرح جائز نہیں کہ پہلوں کی راہ سے ہٹ جائیں۔ جب ہم سن چکے ہیں الرحمان علی العرش استوی اور تجلی للجبل جعلہ دکا۔ ہمیں کہنا چاہیے

ربنا امنا بما انزلت واتبعنا الرسول فاکتبنا مع الشاھدین۔

یہاں یہ بات بھی سمجھنے کی ہے کہ معنی مصدری کے منشاؤں کے قیام اور تحقق کی جو نوعیت تجلی اور متجلی کے سلسلے میں ہے وہ مناشی کے اس تحقق اور قیام سے مختلف ہے جو عام طور پر مناشی کے قیام سے سمجھا جاتا ہے اور یہی مطلب ان حضرات کا ہے جنہوں نے اس قسم کی صفات کے متعلق یہ فیصلہ کیا ہے کہ کیفیت کو مجہول قرار دے کر ان پر ایمان لانا چاہیے۔ درحقیقت ان کے خیال کی بنیاد اسی پر قائم ہے کہ منشا کے قیام کی نوعیت جو ہوتی ہے وہ منشا کے اس قیام سے مختلف ہے۔ جو تجلی اور متجلی کے سلسلے میں ہے۔ یہی حال ان دونوں سلسلوں میں احکام کے اختلاف کا بھی ہے۔ بہر حال ان دونوں سلسلوں میں اختلاف کی جو شکلیں ہیں ان میں بعض یہ ہیں۔ مثلاً یہ کہ تجلی کی راہ سے جو احکام متجلی کے لیے ثابت کیے جاتے ہیں ان احکام سے متجلی کی ذات پاک اور منزہ بھی ہوتی ہے اور پھر ان احکام سے متجلی کی ذات موصوف بھی ہوتی ہے اور یہ دونوں باتیں ایک ہی وقت میں ثابت ہوتی ہیں یعنی ٹھیک تجلی کرنے کا جو زمانہ ہوتا ہے اس وقت یہ دونوں باتیں صادق ہوتی ہیں اور یہ جو میں نے کہا کہ ان احکام سے متجلی کی ذات منزہ ہونے کے باوجود ان ہی سے موصوف بھی ہوتی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ معروض اپنی ذات کے مرتبہ میں عوارض سے پاک ہوتا ہے اور عوارض کے مرتبہ میں ان سے موصوف ہوتا ہے۔ بہر حال عوارض و معروضات کے سلسلے میں جو یہ بات کہی جاتی ہے اور معروضات کی تنزیہہ مرتبہ ذات میں عوارض سے جو کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ یہ کوئی واقعہ نہیں ہے بلکہ آدمی کے ذہن کا ایک تخلیقی کارنامہ ہے اور صرف ذہنی فن کاری کا نتیجہ ہے

برخلاف اس پاکی و تقدس کے جو متجلی کی ذات کے لیے ثابت کی جاتی ہے کہ یہ ایک واقعہ ہے۔
من جملہ اختلاف اور مغایرت کے وجوہ کے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ متجلی کی اپنے مرتبہ ذات میں اس کی گنجائش ہی نہیں رکھتی کہ نوپیدا حوادث کی محل بن کر تغیر و انقلاب کی آماجگاہ بن جائے لیکن باوجود اس کے نو بہ نو احکام جو تدریجی طور پر پیدا ہوتے رہتے ہیں یعنی احکام متجددہ کا ثبوت اور نت نئے پیدا ہونے والے امور حادثہ کا صدور تجلی کی راہ سے متجلی کی ذات کی طرف منسوب ہوتا ہے اور اس کی مثال گویا ایسی ہے کہ آدمی جب گفتگو کرتا ہے تو اس وقت ظاہر ہے کہ اس نفس ناطقہ کے لیے گفتگو کرنے کی صفت ثابت ہوتی ہے۔ یعنی اس کے متعلق کہا جائے گا کہ اس وقت وہی بول رہا ہے اسی طرح بولنے کے نتائج و احکام بھی اسی کی ذات کو ثابت ہوں گے۔ یعنی یہ بات کہ ایسے گہرے مطالب اور دقیق مضامین جو پوشیدہ تھے ان کا اظہار نفس نے کیا۔ نیز موسیقی کا کمال اور فصاحت و بلاغت کا ظہور اس سے ہوا اور یہ کہ جاہل کے علم میں اس کی گفتگو کی وجہ سے اضافہ ہوا، ناقص کی تکمیل ہوئی۔ الغرض کلام کرنے کے یہ سارے آثار و نتائج نفس ناطقہ ہی کی طرف منسوب ہوں گے لیکن ظاہر ہے کہ بولنے اور تکلم کا سرچشمہ اس آواز کے سوا اور کیا ہے جس کے قیام کا تعلق زبان سے ہے یا حلق سے مگر با ایں ہمہ نفس ناطقہ کے متعلق یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ نو بہ نو پیدا ہونے والے صفات کا اس میں اضافہ ہوا زیادہ سے زیادہ اسی کو نفس کی طرف منسوب کرنے کی گنجائش یہاں پیدا ہوتی ہے۔ گویا اس کی مثال ایسی ہوتی کہ سرخ رنگ کا شیشہ فرض کیجیے کہ آفتاب اور زمین کے درمیان حائل ہو جائے اور اس کی وجہ سے آفتاب جس کی شعاعیں پہلے سرخ نہ تھیں وہ سرخ ہو گئیں۔ اب کھلی ہوئی بات ہے کہ لال رنگ کی یہ کرنیں شیشہ کی نہیں بلکہ آفتاب ہی کی کرنیں سمجھی جائیں گی مگر اس کو سب جانتے ہیں کہ آفتاب اپنی چمک دمک میں اور اس باب میں کہ اس کی شعاعیں سفید رنگ رکھتی ہیں اپنے حال پر قائم رہتا ہے، جیسے اس سرخ شیشہ کے حائل ہونے سے پہلے بھی اس کا حال تھا یعنی اس شیشے کے حائل ہونے کی وجہ سے آفتاب میں کسی جدید صفت کا یا نئے حکم کا اضافہ قطعاً نہیں ہوا۔ یا یوں سمجھو کہ آفتاب اور کسی سیاہ جسم کے درمیان کسی آتشیں شیشہ کو رکھ دیا جائے اور اس عمل کی وجہ سے سیاہ جسم میں آگ لگ گئی اور وہ جل اٹھا تو ظاہر ہے کہ اس سیاہ جسم کو جلانے والا شیشہ نہیں بلکہ آفتاب ہی ہے مگر کیا آفتاب کی ذات میں اس کی وجہ سے کسی ایسی جدید صفت کا اضافہ ہوا جسے جلانے کے اس عمل کا منشا قرار دیا جائے۔

افضل المحققین نے اپنی کتاب لمعات کے مبادی میں جو یہ لکھا ہے کہ اول یعنی واجب تعالیٰ کے لیے تجلی کے جو احکام ثابت ہوتے ہیں تو وہ تجلی کی شرط کے ساتھ مشروط ہیں۔

اس کا یہی مطلب ہے وہ یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ تجلی کے احکام سے متجلی کی ذات باوجودیکہ منزہ اور پاک ہوتی ہے لیکن ٹھیک اسی وقت اس کی طرف پھر یہ احکام بھی منسوب ہوتے ہیں۔ اس کا راز کیا ہے؟ یہ دونوں باتیں ایک ساتھ واقعیت کا رنگ کیسے اختیار کر سکتی ہیں۔ کیونکہ ابھی جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ یہ وہ صورت نہیں جو عوارض اور معروضات کے درمیان ہوتی ہے یعنی معروضات کے متعلق بھی کہا جاتا ہے کہ اپنے مرتبہ ذات میں وہ عوارض سے پاک اور منزّہ ہوتے ہیں۔ بتا چکا ہوں کہ یہ تو صرف ایک ذہنی کارستانی کا نتیجہ ہے۔

بہرحال تجلی کی حقیقت کا صحیح علم اور یہ کہ متجلی کی ذات ایک ہی وقت میں تجلی کے احکام سے منزّہ و پاک بھی ہے اور اسی وقت ان احکام سے موصوف بھی ہے جو اس راز کی اصل حقیقت کو پانا چاہتا ہے۔ اس کو چاہیے کہ تشبیہہ اور تنزیہہ کے دونوں نظریوں میں مطابقت پیدا کرے اور سمجھے کہ واقعہ یہ بھی ہے اور وہ بھی ہے یعنی تشبیہہ و تنزیہہ کے مابین مسلک کو اختیار کرے جس کی طرف حضرات انبیاء علیہم السلام نے دعوت دی ہے۔

باقی بعض اکابر صوفیہ کے کلام سے بظاہر جو یہ سمجھا جاتا ہے کہ تنزیہہ و تشبیہہ کے اجتماع کا مطلب یہ ہے کہ لاہوت کی ایسی معرفت حاصل کی جائے جس کی وجہ سے لاہوت کے متعلق یہ کہنا عالم کا وہ عین ہے یا غیر یہ دونوں باتیں درست ہو جائیں تو ظاہر ہے کہ ہمارے مقابلے میں اس قسم کے مسائل کے زیادہ تر جاننے والے یہی حضرات ہیں مگر اگر مجھ سے دریافت کیا جائے تو میں یہی کہوں گا کہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کیونکہ حضرات انبیاء علیہم السلام نے لوگوں کو تجلی ہی کی طرف دعوت دی ہے۔ تجلیات سے اوپر جو مراتب ہیں ان سے ان کی دعوت کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ جن لوگوں نے حضرات انبیاء کے پیغام کا مطالعہ کیا ہے وہ اس سے بخوبی واقف ہیں۔

تنزیہہ و تشبیہہ دونوں میں ہم آہنگی پیدا کر کے اس کو اپنا مسلک بنانا ہر آدمی کے بس کی بات نہ تھی اس لیے تنزیہہ کے موضوع پر تو نبوت نے اشارات اور اجمال سے کام لیا ہے۔ فرمایا لیس کمثلہ شیء۔ اور تشبیہہ کے موضوع کی انہوں نے اہمیت محسوس کی۔ حق تک رسائی حاصل

کرنے کی طبعی راہ بھی ہو سکتی ہے۔[1]

تنزیہہ کی تکمیل

غور فرمائیے تجلی ربہ للجبل میں قرآن نے تنزیہہ کی ایسی تکمیل کی ہے جس کی کوئی نمود نزول قرآن کے زمانہ میں دنیا میں موجود نہ تھی۔ قرآن سے پہلے تنزیہہ کا بڑے سے بڑا مرتبہ جس کا ذہن انسانی متحمل ہو سکتا تھا یہ تھا کہ اصنام پرستی کی جگہ ایک ان دیکھے خدا کی پرستش کی جاتے لیکن جہاں تک صفاتِ الٰہی کا تعلق ہے انسانی اوصاف و جذبات کی مشابہت سے کوئی تصور بھی خالی نہ تھا۔

یہ مقام قرآن و تورات کا مشترک ہے۔ دقتِ نظر کے ساتھ دونوں کا مطالعہ کرو۔ تورات میں جہاں کہیں براہِ راست خدا کی نمود کا ذکر کیا گیا ہے قرآن نے وہاں خدا کی تجلی کا ذکر کیا ہے۔ تورات میں جہاں یہ پاؤ گے کہ خدا متشکل ہو کر اترا۔ قرآن اس موقع کی یوں تعبیر کرے گا کہ خدا کا فرشتہ متشکل ہو کر اترا۔ قرآن اس موقع کی یوں تعبیر کرے گا کہ خدا کا فرشتہ متشکل ہو کر نمودار ہوا۔ بطورِ مثال صرف اسی مقام کو دیکھئے تورات میں ہے۔

> خداوند نے کہا اے موسیٰ دیکھ یہ جگہ میرے پاس ہے تو اس چٹان پر کھڑا رہ، اور یوں ہوگا کہ جب میرے جلال کا گزر ہوگا تو میں تجھے اس چٹان کی دراز میں رکھوں گا اور جب تک نہ گزر دل گا تجھے اپنی ہتھیلی سے ڈھانپے رہوں گا پھر ایسا ہوگا کہ میں اپنی ہتھیلی اٹھالوں گا اور تو میرا پیچھا دیکھے گا لیکن تو میرا چہرہ نہیں دیکھ سکتا۔ (خروج)
>
> تب خداوند بدلی کے ستون میں ہو کر اترا اور خیمہ کے دروازے پر کھڑا رہا....
> اس نے کہا کہ میرا بندہ موسیٰ اپنے خداوند کی شبیہہ دیکھے گا۔ (گنتی)

اسی بات کو قرآن نے یہاں اس بلیغ انداز میں پیش کیا ہے۔ تجلی ربہ للجبل۔ یہاں حضرت مولانا اشرف علی قدس اللہ سرہ العزیز نے لطیف انداز میں جو بات ارشاد فرمائی ہے وہ بھی گوش گزار فرمالیجئے فرماتے ہیں۔

---

[1] عبقات

پہاڑ پر تجلی ہونے کے معنے یہ ہیں کہ حق تعالیٰ کا نور خاص بارادہ خداوندی خلائق سے محجوب ہے اور اس محجوب ہونے کے جو وسائط ہیں وہ حجب اور موانع ہیں۔ ان کی تعیین کا اللہ ہی کو علم ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان حجابات میں سے بعض حجاب ہٹا دیے گئے ہوں اور چونکہ ہٹائے ہوئے حجابات تھوڑے تھے اس لیے ترمذی کی حدیث میں تمثیلاً ان کی قلت کو انما خنصر سے تشبیہہ دی گئی ہے ورنہ صفاتِ الٰہی تجزیہ اور مقدار سے منزہ ہیں۔ اور چونکہ افعال اللہ تعالیٰ کے اختیاری ہیں اس لیے ممکن ہے کہ وہ حجابات پہاڑ کے اعتبار سے اٹھائے گئے ہوں اور موسیٰ علیہ السلام اور دیگر مخلوقات کے لحاظ سے نہ اٹھائے گئے ہوں اور چونکہ حجابات کے اٹھا دینے کی خصوصیت احراق ہے جیسا کہ ارشاد ہے لاحرقت سبحات النور ما انتهى اليه بصره۔ اس لیے پہاڑ کی یہ حالت ہوئی اور یہ بھی ضروری نہیں کہ سارے پہاڑ کی یہ حالت ہوئی ہو کیونکہ تجلی فرمانا باختیار خود کسی خاص قطعہ پر ممکن ہے۔ موسیٰ علیہ السلام پر بے ہوشی موسیٰ پر تجلی کی وجہ سے نہ تھی یہ تجلیل کے خلاف ہے بلکہ ایسا ہوا کہ پہاڑ کی یہ حالت دیکھ کر اور ایک گونہ محل تجلی سے تلبس و تعلق کی وجہ سے آپ بے ہوش ہو گئے۔ آیتِ قرآنی فان استقر مكانه فسوف ترانی سے استقرار کی صورت میں دیدار کا ہونا اور استقرار نہ ہونے کی صورت میں دیدار نہ ہونا معلوم ہوتا ہے لیکن اس موضوع پر یہ بات پہلے قابلِ تحقیق ہے کہ ان دونوں میں علاقہ کیا ہے۔ عدمِ استقرار اور دیدار نہ ہونے میں تو علاقہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کی نگاہ ترکیب عنصری میں پہاڑ سے زیادہ ضعیف اور زیادہ لطیف ہے۔ جب زیادہ قوی اور اشد متحمل نہیں ہوا تو اضعف کیسے متحمل ہو گا۔ لیکن اس صورت میں استقرار مستلزم تحمل بصر موسوی عقلاً نہ ہو گا مگر اس کو وعدہ پر محمول کرنے سے اشکال رفع ہو جائے گا۔ یعنی باوجود دونوں میں برابری نہ ہونے کے ہم تبرعاً وعدہ کرتے ہیں کہ پہاڑ متحمل ہو گیا تو تمہارے حاسہ بصریہ کو بھی متحمل کر دیا جائے گا۔ یہ بھی خیال رہے کہ وقوع تجلی سے وقوع رویت نہیں ہوتی کیونکہ دونوں میں نہ تو ترادف ہے اور نہ تلازم۔ تجلی کے معنے کسی چیز کا ظاہر ہونا ہے۔ اگرچہ دوسرے کو اس کا ادراک نہ ہو۔ بس تجلی کا رویت سے انفکاک ممکن ہے جیسے آفتاب کو متجلی کہہ سکتے ہیں لیکن خفاش کو رائی اور مدرک کہنا لازم نہیں ہے ممکن ہے کہ تجلی کے مبادی کی وجہ سے چشمِ خفاش بے نور ہو کر رہ جاتے۔ آیت لن ترانی میں رائی کی انفعالیت کی نفی ہے مرئی کی فاعلیت کی نفی نہیں ہے۔

خدائی عظمت و جلال کا یقین

۱۷۷۔ جب موسیٰ ہوش میں آئے تو بول پڑے خدایا تیرے لیے ہر طرح کی تقدیس ہے۔ میں

اپنی جسارت پر تیرے حضور توبہ کرتا ہوں، میں ان میں پہلا شخص ہوں گا جو اس پر یقین رکھتے ہیں۔ یعنی پاک ہے اس سے کہ کسی مخلوق کے مشابہ ہو اور یہ فانی آنکھیں اس کے دیدار کا تحمل کر سکیں۔ تیری پاکی اور برتری کا اقتضا یہ ہے کہ کسی چیز کی طلب تیری اجازت کے بغیر نہ کی جاتے۔ میں توبہ کرتا ہوں کہ فرطِ اشتیاق میں بدون اجازت کے ایک نازیبا درخواست کر گزرا۔ میں زمانہ کے سب لوگوں سے پہلے تیری عظمت و جلال کا یقین رکھتا ہوں اور پہلا وہ شخص ہوں جسے ذوقی وعیانی طریق پر منکشف ہوا کہ خداوند قدوس کی رویت دُنیا میں ان ظاہری آنکھوں سے واقع نہیں ہو سکتی۔ [1]

اصل ارشاد میں افاق آیا ہے۔ افاق افاقہ سے ماضی ہے۔ اس تعبیر میں حضرت عبداللہ بن عباس کے اس موقف کی تائید ہوتی ہے کہ صعق کے معنے بے ہوش ہونے کے ہیں۔ بے ہوشی سے ہوش میں آنے کو افاقہ کہتے ہیں۔ مرنے کے بعد زندہ ہونے کو افاقہ نہیں کہتے جیسا کہ حضرت قتادہ نے صعق کے معنے مرنے کے بتاتے ہیں۔ اگر قتادہ والی بات ہوتی کہ موسیٰ علیہ السلام تجلی سے گر کر مر جاتے ہیں تو تعبیر افاق نہیں بلکہ بعث ہوتی جیسا کہ خود بنی اسرائیل کے بارے میں ہے۔ ثم بعثناکم من بعد موتکم۔

آیت میں موسیٰ علیہ السلام کی تسبیح کے معنے علماء نے یہ بتاتے ہیں کہ آپ کی ذات گرامی اس چیز سے بالا اور برتر ہے جس کی درخواست میں نے آپ سے کی۔ یا یہ مطلب ہے کہ آپ کی ذات اس سے پاک ہے کہ آپ کو دُنیا میں کوئی دیکھ سکے یا یہ کہ تو اس سے ارفع اور منزہ ہے کہ تجھے ان ناسوتی آنکھوں سے دیکھا جاتے۔ میں نے یہ جسارت کی کہ تجھے دیکھنے کی خواہش کی۔ میں اس سے توبہ کرتا ہوں اور معافی کا خواستگار ہوں اور میں سب سے پہلے اس بات پر ایمان لانے والا ہوں۔ کہ تیری ذات ہماری آنکھوں کے مشاہدے سے بالاتر ہے۔ یہ خیال رہے کہ توبہ ہمیشہ معصیت ہی سے نہیں ہوتی۔ نامناسب درخواست سے بھی ہو سکتی ہے اور وہی یہاں مراد ہے۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ کو حق تعالیٰ نے بزرگی دی کہ فرشتہ کے بغیر خود کلام کیا۔ ان کو شوق ہوا کہ دیدار بھی کروں اس کی برداشت نہ ہوتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کو دیکھنا ممکن ہے کیونکہ پہاڑ پر تجلی ہوتی لیکن دُنیا میں اس کی قابلیت نہ تھی آخرت میں اس کی قابلیت ہوگی وہاں دیکھنا یقینی ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

بہرحال یہ موضوع اہل السنہ اور اہل اعتزال کے مابین معرکۃ الآراء ہے۔ اس پر اگرچہ دونوں متفق ہیں کہ دنیا میں خدا کا دیدار نہیں ہو سکتا لیکن اسے عقلاً ناممکن بتاتے ہیں اور اہل السنہ اسے عقلاً نہیں بلکہ شرعاً ممتنع کہتے ہیں۔ ہاں آخرت میں دیدارِ خداوندی کے بارے میں دونوں ایک دوسرے کی اپوزیشن ہیں۔ اہل السنۃ کہتے ہیں کہ آخرت میں اہلِ ایمان کو دیدارِ الٰہی ہوگا اور معتزلہ کہتے ہیں کہ نہیں ہوگا۔ معتزلہ کی قیادت علامہ زمخشری کرتے ہیں اور اس موضوع پر اہل السنہ کو توہین آمیز انداز میں مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں :

لجماعۃ سموا ھواھم سنۃ
وجماعۃ حمرٌ لعمری مُوکَفَہ

ایک جماعت نے اپنی خواہشوں اور ولولوں کا نام سنت و جماعت رکھ لیا۔ یہ حقیقت میں بخدا بوجھ سے لدے ہوتے گدھے ہیں۔

قد شبھوہ بخلقہٖ وَ تخوَفوا
شنع الوریٰ وتستَّروا بالبلکفہ

انہوں نے خدا کو مخلوق سے جا ملایا اور پھر مخلوق کی برائی کے اندیشہ سے بلاکیف کے پردے کا سہارا لیا۔

زمخشری کی یہ بات اہل السنہ کے لیے نشتر کا کام کر گئی۔ انہوں نے اس کی چبھن کو بُری طرح محسوس کیا۔ سب سے پہلے الانتصاف میں ابن المنیر نے اہل السنہ کی مدافعت کرتے ہوئے جواباً کہا۔

وجماعۃ کفروا بردیتہ ربھم حقا و وعد اللہ مالن یخلفہ

اور ایک جماعت نے اللہ کی رویت کا صاف انکار کر دیا ہے حالانکہ اللہ کا وعدہ ہی وہ وعدہ ہے جس کی وہ ہرگز خلاف ورزی نہ کرے گا۔

وتلقبوا عدلیۃ، قلنا اجل عدلوا بربھم فحسبھم سفہ

اور انہوں نے اپنے کو لوگوں میں عدلیہ کہہ کر روشناس کرایا۔ ہم نے کہا ٹھیک ہے مگر یہ عدلیہ عدل (انصاف اعتدال) سے نہیں، بلکہ عدول (ہٹنا) سے ہے یہ اپنے رب سے ہٹ گئے ہیں۔ ان کو یہ حماقت ہی سمجھتی ہے یعنی رب سے روگردانی کی حماقت

وتلقبوا الناجین، کلا انھم ان لم یکونوا انی لظی فعلی شفہ

اور اپنے کو انہوں نے نجات یافتہ بتایا ہرگز نہیں امرِ واقعہ یہ ہے کہ یہ لوگ دوزخ کی اگر دہکتی آگ

بھی نہ ہوں گے تو دوزخ کے کنارے پر ضرور ہوں گے۔

علامہ ابوحیان اندلسی نے بھی اہل السنہ کی مدافعت کی اور کہا

شبہت جہلا صدر امۃ احمد

وذوی البصائر بالحمیر الموکفہ

تو نے حماقت سے حضور انور کی اُمت کے اس صدر اول کو جو ارباب بصیرت ہیں بوجھ والے گدھوں سے تشبیہ دی ہے۔

وجب الخسار علیک فانظر منصفاً

فی آیۃ الاعراف فھی المنصفہ

تُو تو سر تا سر خسارے کی آماجگاہ بن چکا ہے۔ آیت اعراف بنظر انصاف مطالعہ کر۔ یہ آیت ہی پورے کیس میں فیصلہ کن ہے۔ شاعر کا مقصود یہ آیت ہے یعنی رب ارنی انظر الیک

اتری الکلیم اتی بجھل ما اتی

واتی شیوخہ ما اتوا عن معرفہ

کیا تیرے خیال میں حضرت موسیٰ نے جو درخواست کی تھی اس کا مبنی نادانی تھا اور تیری اساتذہ کی رائے علم و معرفت کی اساس پر قائم ہے۔

ان الوجوہ الیہ ناظرۃ، بذا

جاء الکتاب فقلتم ھذا سفہ

قرآن کا ناطق فیصلہ تو یہی ہے کہ روز قیامت اللہ کا دیدار ہوگا آپ کہہ دیجئے کہ یہ سفاہت ہے اور سوچئے کہ آپ کی چوٹ کہاں پہنچ رہی ہے۔

نطق الکتاب وانت منطق بالھوی

فھوی الھوی بک فی المھاوی المتلفہ

اللہ کی کتاب نے تو فیصلہ دے دیا ہے۔ آپ کی بات ہوائے نفس اور ہوا جس کے سوا کیا ہے اسی ہوائے نفس نے آپ کو ہلاکت خیز گڑھوں میں گرا دیا ہے۔

خیر یہ تو معالم القرآن کے ناظرین کی خدمت میں محض منہ کا مزہ درست کرنے کے لیے چند اشعار کے نمونے پیش کیے ہیں ارباب ذوق اگر مزید مزہ لینا چاہیں تو علامہ السبکی کا طبقات الشافعیہ الکبریٰ جلد نہم کا مطالعہ کریں۔

حضرت موسیٰ کا خصوصی شرف و امتیاز

۱۴۸۔ خدا نے فرمایا اے موسیٰ میں نے تجھے اپنی پیغمبری اور ہمکلامی سے لوگوں پر برتری دی ہے لہٰذا جو کچھ میں نے تجھے عطا کیا ہے اسے لے اور شکر بجا لا۔ یعنی دیدار نہ ہو سکا نہ سہی، یہ شرف و امتیاز کیا تھوڑا ہے کہ ہم نے تجھ کو پیغمبر بنایا اور تورات عطا کی اور بلا واسطہ کلام فرمایا لہٰذا جس قدر بخشش ہماری طرف سے ہوئی اسے پلے باندھو اور ان بندوں میں سے ہو جاؤ جنہیں خدا نے شاکرین کے امتیازی لقب سے ملقب فرمایا ہے[1] مطلب یہ ہے کہ میں نے اپنے پیغام اور کلام سے تم کو لوگوں پر جو برگزیدگی بخشی ہے۔ تمہارے شرف کے لیے یہی بس ہے۔ میں نے جو تعلیم و ہدایت کی ذمہ داری تم پر ڈالی ہے اس کو مضبوطی سے اپناؤ اور برابر میرے شکر گزار رہو یعنی اس کا حق ادا کرو خود بھی دل و جان سے اس کی قدر کرو اور دوسروں کو بھی یہ بتاؤ۔ اندازِ کلام سے یہ بات ٹپک رہی ہے کہ جو عطا ہوا ہے تمہارے لیے یہی بہت ہے اسی پر قناعت کرو میرے دیدار کی تگ و دو نہ کرو۔ اتنی بات تو قرآن سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے بلاواسطہ کلام فرمایا۔ پھر اس کلام میں بھی ایک تو وہ ہے جو اول عطائے نبوت کے وقت ہوا تھا۔ دوسرا کلام یہ ہے جو عطائے تورات کے وقت ہوا اور جس کا یہاں ذکر ہو رہا ہے۔ آیت سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ اس دوسرے کلام کو بہ نسبت پہلے کے کچھ مزید خصوصیت حاصل تھی لیکن یہ بات کہ اس کلام کی حقیقت و نوعیت کیا تھی؟ اس کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں اس میں انسانی عقل جس قدر بھی غور کر سکتی ہے اور اس غور کے نتیجے میں جتنے عقلی احتمالات پیدا کر سکتی ہے سب کی گنجائش ہے بشرطیکہ وہ کسی شرعی حکم سے متصادم نہ ہو مگر ان میں کسی بھی احتمال کی بلا دلیل تعیین درست نہیں ہے اور سلف صالحین ہی کا مسلک تفویض یہاں اسلم ہے۔

اصل یہ ہے کہ ہمیں اس معاملہ میں دو بنیادوں پر اعتماد کرنا چاہیے۔

ایک یہ کہ قرآن و سنت میں جو وارد ہوا ہے بغیر کسی تاویل کے اور ظاہری معنی سے ہٹائے بغیر ماننا چاہیے۔ اسے بالکل اہمیت نہ دینی چاہیے کہ ظاہری معنے میں عقلی استحالہ ہے۔ دوسرے یہ کہ قرآن سے جو کچھ خدا کے لیے ثابت ہوتا ہے وہ اس جنس سے نہیں ہے جو

---

[1] افادات شیخ الاسلام

مخلوق میں ہے بلکہ یہ اوصاف و احوال ذات باری کے شایان شان ہیں اور اس کی تنزیہہ کے مطابق ہیں کیونکہ رسمی مشابہت حقیقی مشابہت کی مقتضی نہیں ہوتی ہے۔ یہاں حافظ ابن تیمیہ الکلیل میں یہ بات بڑے پتے کی فرما گئے ہیں:

راہ صواب وہ ہے جس پر ائمہ ہدایت گامزن تھے اور وہ یہ ہے کہ خدا کو ان صفات سے موصوف مانا جاتے جو خود خدا نے اپنے لیے بیان فرماتے ہیں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن اوصاف الٰہی کا تذکرہ فرمایا ہے اس سلسلے میں قرآن و حدیث سے سرمو انحراف نہ کرنا چاہیے۔ اور سلف کے راستہ کی پیروی کرنی چاہیے۔ جو اہل علم و ایمان ہے۔ اور قرآن و سنت سے جو معانی سمجھے جاتے ہیں وہ شبہات و اوہام کی بنا پر رد نہیں کیے جا سکتے کیونکہ یہ قرآن میں ایک طرح کی تحریف ہے۔

کوہ طور پر حضرت موسیٰ کو تورات ملی

۱۷۹۔ اور ہم نے موسیٰ کے لیے ان تختیوں میں ہر قسم کی باتیں لکھ دی تھیں تاکہ زندگی کے ہر معاملہ کے لیے اس میں نصیحت ہو اور ہر بات الگ الگ واضح ہو جائے۔ بعض کہتے ہیں کہ تورات شریف ان تختیوں پر لکھی ہوئی تھی اور بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ تختیاں تورات کے علاوہ تھیں جو نزول تورات سے پہلے مرحمت ہوئیں۔ بہرحال دیدار نہ ہو سکنے سے جو شکستگی موسیٰ علیہ السلام کو ہوئی اس کی تلافی اور جبر مافات کے طور پر الواح عطا کی گئیں جن میں ہر قسم کی نصیحتیں اور تمام ضروری احکام کی تفصیل تھی۔ ابن کثیر[۱]

یہاں یہ بات تشریح طلب ہے کہ طور کے اس واقعہ میں موسیٰ علیہ السلام کو جو لکھی ہوئی تختیاں ملی تھیں ان میں کیا لکھا ہوا تھا تورات یا کچھ اور؟

ایک رائے یہ ہے کہ طور کے واقعہ میں جن احکام کا نزول ہوا وہ تورات ہے۔ یہ زیادہ تر شارحین قرآن کی رائے ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ اس سے مراد وہ دس احکام ہیں جو مذہب موسوی میں شریعت یا احکام عہد کے نام سے موسوم ہیں۔ یہ بیشتر شارحین عہد جدید کا خیال ہے اور ہمارے بعض شارحین قرآن کا ہمارے زمانے میں بھی کچھ ایسا ہی خیال ہے لیکن

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

یہ دوسری رائے خود قرآن اور تورات دونوں کی شہادت کے خلاف ہے۔ پہلی رائے کو قرآن عزیز کی تائید حاصل ہے کیونکہ قرآن عزیز نے سورہ بقرہ میں حضرت موسیٰ کے چلہ کا ذکر کرتے ہوئے جب نزولِ احکام کا تذکرہ کیا تو اس کا چہرہ کتاب اور فرقان کے عنوان سے پیش کیا اور یہ دونوں صفات قرآن نے تورات کے لیے بولی ہیں نہ کہ احکامِ عہد کے لیے۔ اور اگرچہ تورات کے سفر خروج استثنا اور کتاب یسوع میں موسیٰ علیہ السلام کے چلہ کے بعد احکامِ عہد یا شریعت کا لفظ پایا جاتا ہے لیکن مولانا رحمت اللہ کیرانوی نور اللہ مرقدہ نے اپنی شہرہ آفاق کتاب اظہار الحق میں فارسی، عربی اور اُردو کے قدیم تراجم کے حوالہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ تورات کے ان نسخوں میں ان ہر دو الفاظ کی جگہ تورات لکھا ہے۔ چنانچہ مولانا عبدالحق حقانی نے بھی اپنی تفسیر حقانی میں اُردو فارسی بائیبل مطبوعہ ۱۸۴۵ء ۱۸۳۹ء سے حسبِ ذیل حوالے نقل کیے ہیں:

بر آں سنگہا تمامی کلمات ایں تورات را بخط روشن بنویس
(استثنا باب ۲۷ آیت ۲۸)

بنی اسرائیل نے بموجب حکم موسیٰ کے ایک مذبح بنایا اور اس کے پتھروں سے تورات کو لکھ دیا۔ (یسوع باب ۸ آیت ۱۵)

ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو جو الواح کوہِ طور پر چلہ کے بعد دی گئی تھیں وہ تورات کی الواح تھیں۔ اور انگریزی نسخہ میں LAW اور عربی اُردو نسخوں میں شریعت کو بھی صحیح مان لیا جائے تو یہ لفظ بھی اپنی معنوی وسعت کے لحاظ سے تورات پر صادق آتا ہے اور تورات، شریعت قانون سب کا مصداق ایک ہی ہے اور قدیم عیسائی دُنیا بھی یہی سمجھتی رہی ہے اور احکامِ عہد اسی کا جزو ہیں اور احکامِ عہد کو مستقل قرار دینا بعد کی تخلیق ہے خیر یہ ایک ضمنی بات تھی آئیے آیت پر غور کریں۔ ارشاد ہوا ہے وکتبنا لہ فی الالواح تختیوں پر اللہ تعالیٰ نے خود لکھا یا اللہ کی ہدایت کے مطابق حضرت موسیٰ نے لکھا۔ تورات سے دونوں باتیں نکلتی ہیں۔ چنانچہ خروج باب ۲۴ آیت ۳، ۴ میں ہے۔

اور موسیٰ نے لوگوں کے پاس جا کر خداوند کی سب باتیں اور احکام ان کو بتا دیئے اور سب لوگوں نے ہم آواز ہو کر جواب دیا کہ جتنی باتیں خداوند نے فرمائی ہیں ہم ان سب کو مانیں گے اور موسیٰ نے خداوند کی سب باتیں لکھ لی ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تختیاں حضرت موسیٰ کی لکھی ہوئی تھیں لیکن خروج ہی میں

دوسرے مقام پر یہ بھی لکھا ہوا ہے ۔ باب ۳۲ آیت ۱۵، ۱۶ میں ہے ۔

اور موسیٰ شہادت کی دونوں لوحیں لیے ہوئے الٹا پھرا اور پہاڑ سے نیچے اترا اور وہ لوحیں ادھر سے اور ادھر سے دونوں طرف سے لکھی ہوئی تھیں اور وہ لوحیں خدا ہی کی بنائی ہوئی تھیں اور جو لکھا ہوا وہ بھی خدا ہی کا لکھا اور ان پر کندہ کیا ہوا تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ تختیاں قدرت الٰہی سے لکھی ہوئی حضرت موسیٰ کو ملی تھیں۔ قرآن کے الفاظ دونوں معنوں کا احتمال رکھتے ہیں۔ یہ بھی احتمال ہے کہ قدرت الٰہی سے لکھی ہوئی ہوں اور وکتبنا فی الالواح میں کتابت کی اسناد حقیقی ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ حضرت موسیٰ نے لکھی ہوں اور اسناد مجازی ہو۔ دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ جب حضرت موسیٰ نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تحت لکھا تو یہ اللہ تعالیٰ نے لکھا۔ قرآن کی تمام حفاظت کا اہتمام حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلّم اور آپ کے صحابہ کرام کے ہاتھوں عمل میں آیا لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے تحت عمل میں آیا اس وجہ سے ارشاد ہوا ہے انا لہ لحافظون۔

یہاں کتبنا لہ کے الفاظ یہ نشاندہی کر رہے ہیں کہ اللہ سبحانہٗ نے بھی بنی اسرائیل کو قانون دینے میں خاص اہتمام فرمایا ہے کیونکہ حضرت موسیٰ سے پہلے جو انبیاء آئے انہوں نے اپنی اپنی اُمتوں کو زبانی تعلیم دی لیکن بنی اسرائیل کے لیے اللہ سبحانہٗ نے لکھی ہوئی دستاویز دینے کا اہتمام فرمایا۔ حضرت موسیٰ نے صرف کردار و گفتار ہی کے ذریعے ان کو تعلیم نہیں دی بلکہ ان کے لیے سب کچھ قلم بند کر دیا کہ اللہ کا قانون ان کو سب سے زیادہ محفوظ و مامون شکل میں ملے۔ اور تورات ہی کا چہرہ پیش کرتے ہوئے جو یہ ارشاد ہوا ہے من کل شیئٍ موعظۃً و تفصیلاً لکل شیئٍ، یعنی ان الواح میں ہر قسم کی ضروری ہدایات بھی تھیں اور تمام ضروری تفصیلات بھی من کل شیئٍ اور لکل شیئٍ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دنیا جہان کی ہر بات تشریح و تطویل کے ساتھ لکھ دی گئی تھی بلکہ مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے جن جن حکموں کی ضرورت تھی وہ سب ان تختیوں کے احکام میں موجود تھے۔

یہاں شارحین قرآن نے ان تختیوں کے مشتملات کی وسعت کو بتاتے ہوئے کچھ روایات درج کی ہیں۔ حافظ سیوطی نے درمنثور میں ان روایات کی تلخیص پیش کی ہے لیکن ابن جریر اور ابن کثیر نے اس کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا ہے۔ ان کا سرچشمہ وہ اسرائیلی جراثیم ہیں جو کعب احبار اور وہب بن منبہ کی وساطت سے ہمارے تفسیری علم کی زینت بن گئے ہیں۔

بنی اسرائیل سے تورات پر عمل کا مطالبہ

۱۸۰۔ اسے مضبوطی سے پکڑے اور اپنی قوم کو حکم دے کہ اس کے پسندیدہ حکموں پر کاربند ہوں۔ میں ضرور بدکاروں کی جگہ تمہیں دکھاؤں گا۔ یعنی خود بھی ان الواح کو مضبوطی اور احتیاط سے پکڑے رہو کہیں ہاتھ سے نہ چھوٹ جائیں اور اپنی قوم کو سمجھائیں کہ وہ الواح کی بہترین ہدایات پر پختگی سے عمل کرتے رہیں اور ایسی اچھی چیز کو ہاتھ سے نہ دیں۔ لفظ احسنها سے یا تو اس پر متنبہ فرمایا ہے کہ ان میں احسن کے سوا کچھ نہیں ہے یا یہ مطلب ہے کہ جو احکام دیے گئے ہیں یوں تو سب فی حد ذاتہ حسن ہیں مگر بعض بعض سے احسن ہوتے ہیں مثلاً ظالم سے بدلہ لینا حسن ہے لیکن صبر کر دینا اور معاف کر دینا عزیمت اور احسن ہے۔ گویا بنی اسرائیل کو اس پر آمادہ کرنا تھا کہ عزائم و مندوبات کے اکتساب میں سعی کریں اور خدا کے کامل فرمانبردار بنیں۔ اگر نافرمانی کریں گے تو انہیں نافرمانوں کا گھر دکھلا دیا جائے گا یعنی آخرت میں دوزخ اور دنیا میں تباہی و رسوائی اعاذنا اللہ منہما ابن کثیرؒ و بغوی اور بعض نے نافرمانوں کے گھر سے شام و مصر مراد لیا ہے جو نافرمان عمالقہ یا فرعونیوں کا ملک تھا۔ اس صورت میں یہ آیت بنی اسرائیل کے لیے بشارت ہوگی کہ اگر پوری طرح فرمانبرداری کرو گے تو نافرمانوں کے ملک تم کو دے دیے جائیں گے والراجح ہو الاول کما رجحہ ابن کثیرؒ [1]

اس فقرے میں تین باتیں بتائی گئی ہیں۔

ایک یہ کہ ہم نے حضرت موسیٰ سے کہا کہ یہ زندگی کا دستور ہے تم اسے عزم و ہمت سے لو۔ یعنی اس کے ذریعے اُمت کی تکوین تمہارا کام ہے۔ قانون یہ ہے لیکن اس کے ذریعے بنی اسرائیل کی تربیت کرنا تمہاری ہمت پر موقوف ہے۔ ایک طرف اگر ان کی نشو و نما ذلت و صغار میں ہوئی ہے تو دوسری طرف چار سو سالہ فرعون کی غلامی میں یہ پھلے اور پھولے ہیں۔ اس کے نتیجے میں رسوم شرک ان کے رگ و ریشے میں سماتے ہوتے ہیں۔ اس دستور حیات کے ذریعے آپ کو دوہری مشقت کرنی ہوگی ایک طرف ان میں سے مفاسد اور رذائل کو ختم کرنا ہوگا دوسری طرف فضائل کو ان میں پیدا کرنا ہوگا اس لیے فرمایا خذها بقوة یعنی عزم و جزم کے ساتھ اس کو اختیار کرو اور ہر طرح کے حالات میں خواہ نرم ہوں یا گرم اس کی ہدایات پر جمے رہو۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

دوسری بات یہ فرمائی وامر قومك یاخذوا باحسنھا اپنی قوم کو ہدایت کرو کہ دوسرے نظاموں کے مقابلہ میں اس نظام کو اپنائیں جو اس تورات میں پیش کیا گیا ہے یہ ان سب میں بہتر زیادہ اچھا ہے یہاں احسن سے مراد وہ تقابل نہیں جو تورات کی مختلف ہدایات میں ہے کیونکہ وہ تو ساری کی ساری احسن ہیں اور سب بلا استثنا اپنانے کے لیے ہیں بلکہ یہ حسن ان نظاموں کے مقابلے میں ہے جن سے بنی اسرائیل کو سابقہ پیش آ رہا تھا اور جن سے وہ ایک درجہ میں متاثر بھی تھے۔ قرآن میں لفظ احسن ایسے ہی تقابلی موقعہ پر خود قرآن کے بارے میں استعمال ہوا ہے اتبعوا احسن ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونه اولیاء اور یا مطلب یہ ہے کہ تورات کے احکام پر حسین طریقہ پر عمل پیرا ہوں یعنی احکام الہٰی کا وہ صاف اور سیدھا مفہوم لیں جو واقعیت پر مبنی ہو اور جسے ہر وہ شخص سمجھ لے جس کی نیت میں فساد یا جس کے دل میں کجی نہ ہو۔ یہ قید اس لیے لگائی کہ جو لوگ احکام کے سیدھے سادے الفاظ میں سے فانی اینچ پینچ اور حیلوں کے راستہ اور فتنوں کی گنجائشیں نکالتے ہیں کہیں ان کی موشگافیوں کو کتاب اللہ کی پیروی نہ سمجھ لیا جائے مطلب یہ ہے کہ اس اسلامی نظام کے مقابلے میں جو دوسرے نظام موجود ہیں ان کو نہ دیکھیں بلکہ اس پاکیزہ، اعلیٰ اور احسن نظام کو اپنائیں جو حضرت موسیٰ کوہ طور سے لے کر آتے ہیں۔ یہی تفضیل کا صیغہ قرآن میں دوسرے موقعہ پر بھی ان معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

تیسری بات یہ فرمائی گئی ہے کہ ساُریکم دار الفاسقین اس کا ایک مطلب تو وہی ہے جو شیخ الاسلام نے بتایا ہے لیکن شارحین قرآن نے اس کا دوسرے انداز سے بھی مطالعہ فرمایا ہے مثلاً کچھ کی رائے میں دار فاسقین سے مراد عاد و ثمود کے کھنڈر ہیں، کچھ کہتے ہیں کہ مصر مراد ہے کہ بنی اسرائیل دوبارہ اس میں داخل ہوں گے۔ حضرت قتادہ کہتے ہیں کہ اس سے شام کی مقدس سرزمین مراد ہے جہاں اس زمانہ میں عمالقہ کے جابر بادشاہوں کی حکومت تھی اور جہاں بنی اسرائیل کو داخل ہونا تھا۔ عبدالوہاب النجار نے قصص القرآن میں اس کو ترجیح دی ہے۔ مولانا حفظ الرحمان، سیوہاری بھی اس کو صحیح کہا ہے۔ باقی اس پر یہ شبہ کہ حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کے بوڑھے ان بستیوں میں داخل نہیں ہو سکتے۔ اس لیے کہ حضرت موسیٰ کا انتقال ارض مقدس میں داخل ہونے سے پہلے ہی ہو گیا تھا اور اسی طرح بنی اسرائیل کے بوڑھوں پر بھی آنے والی تفصیل کے مطابق اس کا داخلہ حرام کر دیا گیا تھا۔ لہٰذا اس آیت کا مطلب یا تو یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے نوجوانوں کا داخلہ جن کی اکثریت تھی سب کا داخلہ ہے اور اس طرح کا استعمال شائع ہے اور یا یہ امر مراد کہ حضرت موسیٰ نے یوشع بن نون اور کالب

بن یوفنہ اور چند بنی اسرائیل کے بہادروں کو ارض مقدس میں اس لیے بھیجا تھا کہ وہ وہاں کے مفصل حالات معلوم کر کے آئیں کہ ہم کس طرح ان کو شکست دے کر پاک سرزمین میں داخل ہو سکتے ہیں اور انہوں نے آ کر تمام حالات بنی اسرائیل اور موسیٰ علیہ السلام کے سامنے بیان کیے تھے تو گویا ان معدودے چند افراد کا ارض مقدس میں داخل ہو کر اس کو دیکھ آنا اور پھر سب کو وہاں کے حالات سے آگاہ کرنا آیت میں اسی معاملہ کی جانب اشارہ ہے۔ قتادہ کے قول کے مقابلہ میں پہلا قول اس لیے مرجوح ہے کہ اس واقعہ کے بعد بنی اسرائیل کبھی قومی اور جماعتی حیثیت سے مصر میں داخل نہیں ہوئے اور دوسرا قول اس لیے قابلِ اعتنا نہیں ہے کہ اگرچہ ثمود کے آثار وادی سینا کے قریب تھے مگر عاد کے آثار تو عرب کے مغربی حصہ میں واقع تھے جو وادی سینا سے مہینوں کی راہ تھی تو ایسی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ بنی اسرائیل کو صرف ان محو شدہ آثار و کھنڈرات کو دکھانے کے لیے بھیجا جاتا اور اس کے لیے خدا کا وعدہ اس شان کے ساتھ بیان ہوتا۔

پھر یہ آگے کے مراحل کی طرف اشارہ ہے کہ ان تعلیمات و ہدایات کو مضبوطی سے پکڑنا تمہارے اور تمہاری قوم کے لیے اس واسطے بھی ضروری ہے کہ آگے تمہیں کفار و فساق کے علاقوں سے گزرنا اور ان سے سابقہ پیش آتا ہے۔ کفر و فساد کے ان علاقوں میں یہی چیزیں تمہارے لیے بدرقہ اور زادِ راہ کا کام دیں گے اور انہی کے ذریعے سے تم غالب اور فتح مند ہو گے۔ ان سے مسلح رہے بغیر تمہاری قوم کے ہر قدم پر فتنہ میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔[1]

---

[1] تدبرِ قرآن۔

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ
وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ
الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ
يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا
غٰفِلِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ
اَعْمَالُهُمْ ؕ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۷﴾ ع ۱۷ ۶ ۷

میں ضرور ایسے لوگوں کو اپنے احکام سے برگشتہ رکھوں گا جو دُنیا میں تکبّر کرتے ہیں جس کا ان کو کوئی حق حاصل نہیں[۱۸۱]۔ اور اگر تمام دُنیا بھر کی نشانیاں بھی وہ دیکھ لیں ان پر ایمان نہ لائیں اور اگر وہ دیکھیں کہ حق کی راہ سیدھی سامنے ہے تو اس پر کبھی نہ چلیں اور اگر دیکھیں کہ گمراہی کی راہ سامنے ہے تو فوراً چل پڑیں ان کی یہ حالت اس لیے ہو جاتی ہے کہ ہماری نشانیاں جھٹلاتے

رہے اور ان کی طرف سے غافل رہے[۱۸۲]۔ اور جن لوگوں نے ہماری
آیات کی اور آخرت کی زندگی کی تکذیب کی تو ان کے سارے کام
اکارت ہو گئے، ان کو ان کے ان کرتوتوں کی ضرور سزا ملے گی،
جو وہ کرتے رہے۔

معانی مفردات

الرشد، ہدایت، صلاحیت، راہ یابی، بھلائی، راستی ہوشیاری، حسن تدبیر، رشد یرشد کا مصدر ہے ہدایت کی جگہ استعمال ہوتا ہے۔ یہ دو طرح قرآن میں آیا ہے رُشد اور رَشد دونوں مصدر ہیں۔ دونوں میں فرق ہے۔ امام راغب لکھتے ہیں کہ بعض علماء کا بیان ہے کہ رشد بالفتح رشد بالضم سے اخص ہے کیونکہ رشد دنیوی اور اخروی دونوں امور میں استعمال ہوتا ہے اور رشد بالفتح صرف اخروی امور پر بولا جاتا ہے اور رُشد اور رشید دونوں کے لیے آتا ہے۔ الغی، اسم فعل گمراہی، بدراہی، مصدری معنے ناکام ہونا، بہک جانا اور بے راہ ہونا ہیں۔ پہلے معنے کی تائید میں امام راغب نے کسی شاعر کا یہ مصرع لکھا ہے،

ومن یغو لا یعدم علی الغیّ لائما

ناکام ہونے والے کو ناکامی پر ملامت کرنے والا بھی ضرور ملتا ہے یعنی ایک تو ناکامی دوسرے ناکامی پر ملامت دوہری تکلیف ہوتی ہے۔ مطلب یہ گمراہی کا راستہ، ناکامی کا راستہ، بدراہی کا راستہ۔

اللہ کی بندگی سے محرومی کا قانون

قرآن کا عام اسلوب بیان یہ ہے کہ خدا کے ٹھہرائے ہوئے قوانین و اسباب سے جو نتائج پیدا ہوتے ہیں ان کو براہ راست خدا کی طرف منسوب کرتا ہے مثلاً [illegible] جو لوگ سمجھ بوجھ

سے کام لینے کی جگہ اپنے بڑے بوڑھوں کی اندھی تقلید کرتے ہیں اور اسی پر اڑے رہتے ہیں۔ رفتہ رفتہ ان کی عقلیں ماری جاتی ہیں اور سمجھ بالکل الٹی ہو جاتی ہے کتنی ہی صاف بات کہی جاتے ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ کتنی ہی ان کی بھلائی چاہو وہ اور زیادہ مخالفت کریں گے۔ قرآن اس حالت کو یوں تعبیر کرے گا کہ خدا نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی پس وہ سمجھتے نہیں یعنی یہ صورتِ حال خدا کے ٹھہراتے ہوتے قانون کا قدرتی نتیجہ ہے۔ جب کبھی کوئی یہ چال چلتا ہے۔ خدا کا مقررہ قانون مؤثر ہو کر اسے اس حالت میں پہنچا دیتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح یہاں فرمایا جو لوگ ناحق ملک میں بڑے بنتے ہیں۔ بڑا بننا یہ کہ خدا کے حکم کے مقابلہ میں اپنا حکم منواتے ہیں، ناحق اس لیے کہا کہ ان کو اس کا کوئی حق نہیں ہے فرمایا میں ان کو اپنے احکام سے ہٹا دوں گا۔ یعنی جان بوجھ کر جو کوئی تکبر کرے تو خدا کا قانون یہی ہے کہ وہ دلیلوں، روشنیوں سے متاثر ہونے کی استعداد کھو دیتا ہے۔ پھر واضح کیا ہے کہ یہ حالت اس لیے پیش آتی ہے کہ وہ خدا کی آیات کی تکذیب کرتے ہیں اور ان سے غافل رہتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ جو کوئی تکذیب کو اپناتا ہے اور غفلت سے باز نہیں آتا وہ طاعت اور قبولِ حق سے محروم رہتا ہے۔ یہی مطلب ان کو احکام سے ہٹا دینے کا ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ خدا کسی آدمی کو بے عقلی اور گمراہی پر مجبور کر دیتا ہے۔

یتکبرون فی الارض بغیر الحق میں گہری معنویت ہے یعنی وہ لوگ جو اپنے اپنے زمانہ میں ملکی تہذیب و ثقافت، قومی ذہانت اور علمی ایجادات میں بلند ترین معیار پر پہنچے ہوتے ہیں۔ وہ انبیاء کی تعلیمات کے مقابلے اپنے کو بڑا بناتے ہیں اور علمی کامیابیوں اور تمدنی ترقیوں کے نشہ میں نبوت کے لائے ہوتے علم کو رد کرتے ہیں، ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ میرا قانون یہ ہے کہ میں ایسے لوگوں کو اپنے دستور و قانون سے برگشتہ ہی رکھتا ہوں۔ متعدد ترقی یافتہ قومیں جو علم و ادب کے بیش بہا خزانوں سے اس دنیا میں مالا مال تھیں اور ذکاوت و عبقریت میں جن کی مثال دی جاتی تھی اس تکبر، غرور، خود پرستی اور اپنے علوم و فنون پر فخر کا شکار ہو چکی ہیں اپنے زمانہ کے نبی کی تعلیمات کو انھوں نے حقارت و نفرت کی نظر سے دیکھا۔ اس سے بے نیازی برتی۔ اپنے قوانین کے مقابلے میں اس کو بے کار اور بے قیمت سمجھا تو وہ اسی غرور کی نذر ہو گئیں۔

۱۸۱۔ میں ضرور ان لوگوں کو اپنے احکام سے برگشتہ رکھوں گا جو ملک میں تکبر کرتے ہیں جس کا ان کو کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ جو لوگ خدا اور پیغمبروں کے مقابلے میں ناحق تکبر کرتے اور نخوت و غرور اجازت نہیں دیتا کہ احکام الٰہی کو قبول کریں ہم بھی ان کے دل اپنی آیات کی

طرف سے پھیر دیں گے کہ آئندہ ان سے منتفع ہونے کی توفیق نہ ہوگی[1]

قرآن کی یہ آیت مہمات معارف میں سے ہے۔

سب سے پہلے یہ بات سمجھنے کی ہے کہ آیت میں بغیر الحق کی حیثیت کیا ہے اگر یہ یتکبرون کے متعلق ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ملک میں ناحق بڑے بنے ہوتے ہیں۔ یعنی ان کو بڑے بننے کا کوئی حق نہیں ہے کیونکہ اپنے کو بڑا سمجھنا اس کا حق ہے جو واقع میں بڑا ہو وہ صرف اللہ کی ذات ہے اور یا بغیر حق یتکبرون کی ضمیر فاعل سے حال ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ خلاف حق اور باطل پرست ہو کر بڑے بن رہے ہیں۔ بڑے بننے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے مقابلہ میں اپنے آپ کو بندگی سے بالاتر سمجھے اور خدا کے احکام کی کوئی پروا نہ کرے اور ایسا طرز عمل اختیار کرے گویا کہ وہ نہ خدا کا بندہ ہے اور نہ خدا اس کا رب ہے۔

اس آیت کا تعلق یا دار الفاسقین سے یا خود بنی اسرائیل سے ہے۔ اگر فاسقین سے ہے تو مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں سے آگے چل کر تم کو سابقہ پڑنا ہے ان کے اس نظام حق سے جو نبوت سے کر آئی ہے محروم ہونے کی وجہ یہ اور صرف یہ ہے کہ وہ ملک میں ناحق بڑے بنے ہوتے ہیں اور اس بڑائی میں انہوں نے خدا کی بندگی اور نبوت کے نظام سے منہ موڑا ہوا ہے۔ اور میرا قانون یہ ہے کہ میں متکبرین کو حق کی پذیرائی سے محروم کرتا ہوں۔ یعنی کبر کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ حق کی پذیرائی اور اس کے اتباع سے محروم ہوتا ہے۔ وہ حق کے نمایاں ہونے کے باوجود حق سے روگرداں رہتا ہے۔ یہ بات چونکہ اللہ کے قانون کے تحت ہوتی ہے اس لیے ساصرف میں پھیرنے کی نسبت براہ راست اللہ کی طرف ہوتی ہے۔ اور اگر آیت کا روئے سخن بنی اسرائیل کی طرف ہے جیسا کہ سیاق و سباق کا تقاضا ہے تو بنی اسرائیل کو خبردار کیا جا رہا ہے کہ اگر دستور زندگی آنے کے باوجود تم نے قانون سازی میں اللہ کا مقابلہ کیا اور اپنے کو بڑا سمجھا جیسا کہ زعماء قوم، بادشاہان مملکت اور گمراہ لیڈروں کا شیوہ ہے تو پھر تمہیں یہ بات کان کھول کر سن لینی چاہیے کہ ایسے لوگوں کو جو خدا کے مقابلے میں بڑے بنیں، انسانوں سے بجائے خدا کے اپنی بندگی کرائیں۔ قبول حق کے بعد بھی اتباع حق سے محروم کر دیتا ہوں۔ اسلام زمان و مکان کی قید سے بالا ہے۔ اس کی ہر دور اور ہر جگہ دعوت یہ رہی کہ اللہ کے بندوں کو

---

[1] افادات شیخ الاسلام

انسانوں کی بندگی سے نکال کر خدا کی بندگی میں داخل کیا جائے خدا کی بندگی سرتاسر نور ہے جب کہ انسانوں کی بندگی ظلمتوں اور تاریکیوں کا انبار ہے۔

آیت میں اگر روئے سخن فاسقین کی طرف ہے تو آیات سے مراد معجزات، دلائل اور براہین ہیں اور اگر روئے سخن بنی اسرائیل کی طرف ہے تو آیات سے مراد احکام و قوانین خداوندی ہیں۔ بہرحال حضرت موسیٰ کو تورات دی گئی اور ساتھ ہی یہ بتا دیا گیا کہ ہمارا قانون یہ ہے کہ جب کوئی امت ہدایت پا لینے اور اس کی صداقت پر دلائل آجانے کے باوجود بھی ہمارے قوانین کے مقابلے میں اپنے بنائے ہوئے قوانین پر یا باپ دادا کی رسوم یا دنیا کے دانشوروں کے احکام پر قائم رہتی ہے اور اس پر اصرار کرتی ہے تو پھر ہم اس سے اتباع حق کی توفیق سلب کر لیتے ہیں اور توفیق سلب ہونے کے بعد ان کا حال کیا ہوتا ہے؟ یہ آگے ارشاد ہو رہا ہے۔

اللہ کی بندگی سے اعراض کے نتائج

۱۴۶- اور اگر تمام دنیا بھر کی نشانیاں بھی وہ دیکھ لیں تو ان پر ایمان نہ لائیں اور اگر وہ دیکھیں کہ حق کی راہ سیدھی سامنے ہے تو اس پر کبھی نہ چلیں اور اگر دیکھیں کہ گمراہی کی راہ سامنے ہے تو فوراً چل پڑیں، ان کی یہ حالت اس لیے ہے کہ کہ ہماری نشانیاں جھٹلاتے رہے اور ان کی طرف سے غافل رہے۔ ایسے لوگوں کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ خواہ کتنے ہی نشان دیکھیں اور کتنی ہی آیتیں سنیں ٹس سے مس نہ ہوں۔ ہدایت کی سڑک کیسی ہی صاف اور کشادہ ہو، پر نہ چلیں۔ ہاں گمراہی کے راستہ پر نفسانی خواہشات کی پیروی میں دوڑتے چلے جائیں۔ تکذیب کی عادت اور غفلت کی بیماری سے جب دل مسخ ہو جاتا ہے اس وقت آدمی اس حالت کو پہنچتا ہے[1] اس میں اس سرکشی کے آثار و نتائج بتاتے گئے ہیں اور فرمایا ہے کہ اللہ سے اس مقابلہ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے سامنے اللہ کے کتنے ہی احکام واضح اور صاف پیش کیے جائیں وہ اپنے غرور کی سرشاریوں میں نہ سننے کو تیار ہوتے ہیں اور نہ دیکھنے کو۔ یہاں آیت سے مراد احکام منزلہ ہیں اور ان کو نہ ماننے کا مطلب یہ ہے کہ ان کو اپنی عملی زندگی میں شرف پذیرائی نہیں دیتے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ اگر رشد و ہدایت اور کامیابی کی راہ کو دیکھتے ہیں تو اس پر ایک قدم بھی چلنے کو

---

[1] افادات شیخ الاسلام

تیار نہیں ہوتے بلکہ اس کی طرف دھیان بھی نہیں دیتے۔ سبیل الرشد سے مراد انبیاء کی بتائی ہوئی راہ ہے اسی لیے راہِ نبوت کو زندگی میں اپنانے والوں کو راشدین کہا ہے ۔

اولٰئک ھم الراشدون فضلا من اللہ و نعمۃ

یہی لوگ جن کے دلوں میں ایمان کا جال گھر کیے ہوتے ہے اور جو کفر و فسق اور عصیان کے ہر شائبہ سے بیزار و نفور ہیں ۔ درحقیقت رشد و ہدایت پر ہیں۔ ان کا ہی راستہ سبیل الرشد ہے اس میں ضلالت کی جگہ ہدایت ہے، فساد کی جگہ صلاح ہے۔ فسق و فجور کی جگہ تقویٰ و عبادت ہے ۔ اس پر وہ ہی چلتا ہے جو خدا کو مطاع مطلق مان کر اپنے ارادے اور اپنی مرضی سے اس کے احکام پر چلتا ہے ۔ وہ شیطان، بت حکمران، سردار، قومی لیڈر اور مذہبی پیشوا جو خوف خدا سے بے بہرہ اور ہدایتِ الٰہی سے بے نیاز ہوں اور اپنی رائے اور مرضی ہی کو وقت کا قانون سمجھتے ہوں ان خدا بیزار قوتوں سے وہ زندگی کے کسی موڑ پر بھی مصالحت نہیں کرتا ہے ۔ بہرحال سبیل الرشد سے مراد راشدین کی راہ ہے ۔ وہ اس کی جگہ ان لوگوں کی راہ پر چلتے ہیں جو ضلالت و غوایت، فسق و فجور اور فساد کے داعی ہیں ۔

یہ بات کہ وہ رشد و ہدایت سے گریزاں اور غوایت و ضلالت کے بے دام غلام ہیں ان میں کہاں سے آئی ہے یہ بات نہیں کہ اللہ نے ان کی تخلیق ہی ایسی فرمائی ہے بلکہ اصلی وجہ یہ ہے بانھم کذبوا بآیتنا وکانوا عنھا غافلین انہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی اور ان پر غور کرنے سے غافل رہے ۔ یہ سب کچھ انہوں نے اپنے ارادہ و اختیار سے کیا ہے جیسے امتوں کا تعلق نبوت کے علم و عمل سے ٹوٹ جاتا ہے تو بالکل یہی صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے ۔ ایسے لوگوں میں خیر اور ہدایت کی رغبت مردہ ہو جاتی ہے ۔ اس وجہ سے اگر ان کو ہدایت کی راہ دکھائی جاتے تو وہ اس سے بھاگتے ہیں اور اگر گمراہی کی دعوت دی جاتے تو وہ اس پر چل پڑتے ہیں ۔

اللہ کی بندگی سے اعراض کی اُخروی سزا

۱۴۷۔ اور جن لوگوں نے ہماری آیات کی اور آخرت کی زندگی کی تکذیب کی تو اُن کے سارے کام اکارت ہو گئے ان کو ان کے ان کرتوتوں کی ضرور سزا ملے گی جو وہ کرتے رہے ہیں۔ یعنی احکامِ الٰہیہ پر چلنے کی توفیق نہ ہوگی اور جو کچھ کام اپنی عقل سے کریں گے وہ خدا کے یہاں قبول نہ ہوگا۔ جیسا کریں گے ویسا بھگتیں گے۔ باقی ان کی بے جان اور مردہ نیکیوں کا جو بدلہ ملنا ہوگا دُنیا میں

مل رہے گا۔[1] مطلب یہ ہے کہ آیاتِ الٰہی کی تکذیب اور آخرت کی زندگی میں حساب وجوابدہی سے روگردانی کرنے والے لوگ جو اعمال بھی کرتے ہیں خواہ وہ کتنے بڑے کارنامے ہوں۔ بہرحال وہ دُنیا کے خاتمہ کے ساتھ ہی ختم ہو جائیں گے۔ ان کے قصر و محلات ان کی یونیورسٹیاں اور لائبریریاں ان کے کارخانے اور فیکٹریاں ان کی سڑکیں اور راہیں، ان کی ایجادیں اور صنعتیں۔ ان کے علوم و فنون اور ان کی آرٹ گیلریاں اور دوسری وہ چیزیں جن پر وہ فخر کرتے تھے ان میں سے کوئی چیز بھی اپنے ساتھ لیے ہوتے خدا کے ہاں نہ پہنچیں گے کہ خدا کی ترازو میں اس کو رکھ سکیں وہاں جو چیز باقی رہنے والی ہے وہ صرف ایمان بآیات اللہ اور ایمان بالیوم الآخر اور ان کی بنیاد پر اُٹھے ہوتے اعمال و اخلاق۔ اب اگر ایمان سے ہٹ کر زندگی کے سارے مقاصد کو دُنیا ہی میں محدود رکھتا ہے اور نتائج بھی اس کو دنیا ہی میں مطلوب ہیں اور دُنیا کی زندگی میں وہ نتائج عمل دیکھ بھی چکا ہے تو اس کا سب کیا کرایا دُنیائے فانی کے ساتھ فنا ہو گیا۔ اور سب کچھ ضائع ہو گیا کیونکہ خدا کے ہاں انسانی سعی وعمل کے بارآور ہونے کا انحصار دو باتوں پر ہے ایک یہ کہ وہ سعی و عمل خدا کے قانون شرعی کی پابندی میں ہو دوسرے یہ کہ اس تگ و دو میں دُنیا کے بجائے آخرت میں کامیابی پیشِ نظر ہو۔ یہ دو شرطیں جہاں نہ ہوں گی وہاں لازماً حبطِ عمل ہو گا۔ جس نے خدا سے ہدایت لیے بغیر بلکہ اس سے منہ موڑ کر باغیانہ انداز پر دُنیا میں کام کیا ظاہر ہے کہ وہ خدا سے اجر کی توقع رکھنے کا کسی طرح حقدار نہیں ہو سکتا اور جس نے سب کچھ دُنیا ہی کے لیے کیا اور آخرت کے لیے کچھ نہ کیا کھلی بات ہے کہ آخرت میں اسے کوئی ثمرہ پانے کی اُمید نہ رکھنی چاہیے اور کوئی وجہ نہیں کہ وہ وہاں کسی قسم کا ثمرہ پائے۔ اگر میری مملوکہ زمین میں کوئی شخص میرے منشا کے خلاف تصرف کرتا رہا ہے تو وہ مجھ سے سزا پانے کے سوا آخر اور کیا پانے کا حقدار ہو سکتا ہے؟[2]

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ
خُوَارٌ ؕ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا ۘ
اِتَّخَذُوْهُ وَكَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ۝ وَلَمَّا سُقِطَ فِيْٓ اَيْدِيْهِمْ وَرَاَوْا
اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا ۙ قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَيَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ
الْخٰسِرِيْنَ ۝ وَلَمَّا رَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۙ قَالَ
بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِيْ مِنْ بَعْدِيْ ۚ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ ۚ وَ
اَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗٓ اِلَيْهِ ؕ قَالَ ابْنَ اُمَّ
اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِيْ وَكَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِيْ ۖ فَلَا تُشْمِتْ بِيَ
الْاَعْدَآءَ وَلَا تَجْعَلْنِيْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ قَالَ رَبِّ
اغْفِرْ لِيْ وَلِاَخِيْ وَاَدْخِلْنَا فِيْ رَحْمَتِكَ ۖ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝

اور موسیٰ کی قوم نے موسیٰ کے بعد اپنے زیورات سے ایک بچھڑا
کو یعنی ایک قالب جس میں گاتے جیسی آواز تھی اپنا معبود بنا لیا[۱۸۴]

کیا اُن کی عقل میں یہ بات نہیں آئی کہ وہ ان سے بات تک
نہیں کرتا ہے اور نہ ان کی رہنمائی کرتا ہے انہوں نے اس کو معبود
بنالیا وہ اپنے کردار میں بڑے سب ڈھنگے تھے۔[۱۸۵] اور جب ندامت
سے ہاتھ ملنے لگے اور ان کی یہ بات سمجھ میں آگئی کہ وہ راہِ حق
سے بھٹک گئے تو پکار اُٹھے اگر ہمارے رب نے ہم پر رحم
نہ کیا اور ہمیں معاف نہ کیا تو ہم ضرور تباہی کا شکار ہو جائیں گے[۱۸۶]
اور جب موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور سے خشمناک اور افسوس کی حالت
میں واپس آئے تو موسیٰ نے کہا افسوس تم نے کس بُرے طریقہ
پر میری جانشینی کی کیا تم نے اپنے رب کے حکم آنے سے پہلے
ہی ایسی جلد بازی کی ہے۔[۱۸۷] اور موسیٰ نے تختیاں پھینک
دیں اور ہارون کو بالوں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگے۔[۱۸۸]
ہارون نے کہا کہ اے میرے ماں جائے بھائی لوگوں نے

مجھے بے حقیقت سمجھا اور قریب تھا کہ قتل کر ڈالیں میرے
ساتھ ایسا سلوک نہ کرو کہ جس سے دشمن ہنسیں اور نہ مجھے ان ظالموں
کے ساتھ شمار کر[۱۸۹]، موسیٰ نے کہا پروردگار میرا قصور بخش دے
اور میرے بھائی کا بھی اور ہمیں اپنی رحمت کے سایہ میں داخل
کر لے تیرے سے بڑھ کر کون ہے جو رحم کرنے والا ہو۔

معانی مفردات

حلیّ حلی کی جمع ہے جیسے ثُدیّ ثدی کی جمع ہے حلی کے معنے زیور اور گہنے کے ہیں۔ عجل، بچھڑا، گوسالہ، گائے کا بچہ، علامہ مطرزی نے المغرب میں تصریح کی ہے کہ گائے کا بچہ وقت ولادت سے لے کر ایک ماہ تک عجل کہلاتا ہے۔ راغب اصفہانی لکھتے ہیں عجل بچہ گاؤ کو کہتے ہیں کیونکہ اس کے متعلق عجلت کا وہ تصور پایا جاتا ہے کہ جو ثور بیل ہو جانے کی حالت میں معدوم ہو جاتا ہے اس کی مونث عجلہ اور جمع عجول ہے۔ امام ابو منصور ثعالبی نے فقہ اللغہ میں گائے بیل کی عمر کے لحاظ سے حسب ذیل تین الفاظ مقرر فرماتے ہیں۔ بچہ کے لیے عجل جوان کے لیے شبوب اور عمر رسیدہ کے لیے فارض۔ جسد، دھڑ بدن، جسد کے معنے جسم ہی کے ہیں مگر یہ اس سے خاص ہے کیونکہ جسد وہ ہے جس میں رنگ ہو اور جسم کا استعمال اس کے لیے بھی ہوتا ہے جس کا رنگ ظاہر نہ ہو جیسے پانی ہوا جمع اجساد آتی ہے۔ خوار، گائے کی آواز اصل میں تو یہ لفظ گائے کی آواز ہی کے لیے خاص ہے مگر کبھی کبھی بطور استعارہ اونٹ بکری ہرن یا تیروں کی آوازوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے سقط فی ایدیھم وہ گرا دیا گیا سقوط جس کے معنے گر پڑنے کے ہیں۔ امام ابو جعفر احمد بن علی مقری بیہقی اپنی کتاب تاج المصادر میں لکھتے ہیں لما سقط فی ایدیھم یعنی وہ نادم

ہوتے اس کے معنے ہوتے ہیں سقط الندم فی ایدیھم ندامت ان کے ہاتھوں میں گر پڑی ندامت کو حذف کر دیا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ سقط مجہول ہے اور نائب فاعل پر آیا ہے جیسے مرغب فی فلان بولا جاتا ہے لیکن سقطت نہیں بولا جاتا جس طرح رغبت نہیں بولا جاتا بلکہ کہا جاتا ہے رُغِبَ فلان اور سقط فی یدہ بمعنے ندم، سقط فی ایدیھم کی طرح اسقط فی ایدیھم بھی بولا جاتا ہے مگر سقط کا استعمال زیادہ بھی اور فصیح بھی اور کچھ نے اسقط کا انکار کیا ہے اور یہ طرزِ استعمال عربی زبان میں قرآن سے پہلے نہ تھا اور اہلِ عرب اس سے واقف نہ تھے اور یہ ترکیب کسی چیز کے اوپر سے نیچے کی طرف آنے اور اس کے زمین پر گرنے کو بتاتی ہے۔ پھر اس کے معنے میں وسعت کی گئی چنانچہ غلط بات کو سقط (گری پڑی چیز) کہا جانے لگا کیونکہ یہ بے ضرورت چیز کے مشابہ ہے اور ہاتھ کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ ندامت دل میں پیدا ہوتی ہے اور اس کا اثر ہاتھوں میں ظاہر ہوتا ہے جیسے اللہ سبحانہٗ کا ارشاد ہے فاصبح یقلب کفیہ بساوقات ہاتھوں کی طرف اس فعل کی بھی نسبت کر دی جاتی ہے جو اس سے سرزد نہیں ہوتا جیسے ذالکَ بما قدمت یداکَ۔

بنی اسرائیل کی باغیانہ سرکشی کی داستان

اب تک تصویر کا ایک رُخ بیان ہوا ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے بنی اسرائیل پر کس قدر انعامات کی بارشیں کی ہیں۔ اب یہاں سے تصویر کا دوسرا رُخ بیان ہو رہا ہے کہ بنی اسرائیل نے ان انعامات کا مقابلہ کس طرح کیا۔ شکر سے یا کفر سے۔ یہاں اس داستان میں ان کی اس مشرکانہ ذہنیت اور مشرکانہ طرزِ عمل کو کھولا جا رہا ہے جو انہوں نے اختیار کیا تھا۔ بنی اسرائیل مصر کی بت پرستی سے اس درجہ مالوف ہو چکے تھے کہ رہ رہ کر انہیں اس کا شوق ہوتا۔ جونہی حضرت موسیٰ چالیس دن کے لیے الگ ہوتے انہوں نے گائے کے بچھڑے کی طلائی مورتی بنا کر اس کی پوجا شروع کر دی۔ عجائب پرستوں کا قاعدہ ہے کہ جہاں کوئی ذرا سی عجیب بات نظر آئی فوراً معتقد ہو گئے اور سمجھ بوجھ کو خیر باد کہہ دیا۔ سامری مصر کے مندروں کے بھیدوں سے واقف تھا وہاں اس ترکیب سے مورتیاں بنائی جاتی تھیں کہ جونہی ہوا ان کے اندر جاتی طرح طرح کی آوازیں نکالنے لگتیں۔ آج کل یہ صنعت باجوں اور کھلونوں میں استعمال کی جاتی ہے۔ اس زمانہ میں معبودوں

کا معجزہ تھا۔ چنانچہ اس نے بچھڑے کی مورتی میں بھی یہی کاریگری رکھی۔ بنی اسرائیل اتنی سی بات دیکھ کر معتقد ہو گئے۔ ہندوستان کی طرح مصر میں بھی بیل اور گائے کی عظمت کا تصور پیدا ہو گیا۔ اگر کالڈیا کے تمدن کی قدامت تسلیم کر لی جائے تو وہیں سے یہ خیال دوسرے ملکوں میں پھیلا ہوگا۔ یہ دراصل اس مصریت زدگی کا دور ظہور تھا جسے لیے ہوئے بنی اسرائیل مصر سے نکلے تھے۔ مصر میں گائے کی پرستش اور تقدیس کا جو رواج تھا اس سے بنی اسرائیل اتنی شدت سے متاثر تھے کہ قرآن نے ان کا اس موضوع پر چہرہ پیش کرتے ہوئے بتایا ہے واشربوا فی قلوبھم العجل یعنی ان کے دلوں میں بچھڑا رچ بس گیا تھا۔

سب سے زیادہ حیرت کا مقام یہ ہے کہ ابھی مصر سے نکلے ہوئے ان کو صرف تین مہینے ہی گزرے تھے، سمندر کا پھٹنا، فرعون کی غرقابی، ان لوگوں کا بخیریت اس بندِ غلامی سے نکل آنا، جس کے ٹوٹنے کی کوئی امید نہ تھی اور اس سلسلے کے دوسرے واقعات ابھی بالکل تازہ تھے۔ اور انہیں خوب معلوم تھا کہ یہ جو کچھ ہوا محض اللہ کی قدرت سے ہوا ہے کسی دوسرے کی طاقت و تصرف کا اس میں کوئی دخل نہ تھا لیکن اس پر بھی پہلے تو انہوں نے حضرت موسیٰ سے ایک مصنوعی معبود کا مطالبہ کیا اور پھر پیغمبر کی غیر حاضری میں خود ہی ایک مصنوعی معبود بنا لیا۔ یہی وہ حرکت ہے جس پر انبیاء میں سے کچھ نے بنی اسرائیل کو اس بدکار عورت سے تشبیہ دی ہے جو اپنے شوہر کے سوا دوسرے مرد سے جی لگاتی ہو اور جو شب اول میں بھی بیوفائی سے نہ چوکی ہو۔ [لہ]

۱۴۸۔ اور موسیٰ کی قوم نے موسیٰ کے بعد اپنے زیورات سے ایک بچھڑے کو یعنی ایک قالب جس میں گائے جیسی آواز تھی اپنا معبود بنا لیا۔ یہ زیور جسے گلا کر اور ڈھال کر بچھڑا بنایا اصل میں فرعون کی قوم قبطیوں کا تھا۔ ان کے پاس سے بنی اسرائیل کے قبضہ میں آیا جیسا کہ سورہ طٰہٰ میں ہے حملنا اوزارا من زینۃ القوم [لہ] قرآن نے تو ان زیورات کے بارے میں جن سے بنی اسرائیل نے پوجنے کے لیے بچھڑا بنایا تھا صرف یہی بتایا ہے کہ ہم لوگوں کے زیورات کے بوجھ سے لدے ہوئے تھے۔ اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ ہمارے مردوں اور عورتوں نے مصری رسم کے مطابق جو بھاری بھاری زیورات پہن رکھے تھے وہ اس صحرا نوردی میں ہم پر بار ہو گئے تھے۔ اور ہم پریشان تھے کہ اس بوجھ کو کہاں تک لادے پھریں۔ یہاں من حلیھم اور سورہ طٰہٰ میں من زینۃ القوم کی

لہ ترجمان و تفہیم۔ لہ افادات شیخ الاسلام

تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ سفر کی آبادھاپی میں ضائع ہونے کے خطرے سے محفوظ رکھنے کے لیے اپنے قیمتی زیورات بہت سے لوگوں نے سرداروں کے پاس امانت جمع کرا دیے تھے اور انہوں نے ایک خدمت سمجھ کر مجبوراً یہ ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی۔

یہ زیورات بنی اسرائیل کے تھے یا قبطیوں کے ؟ قرآن یہاں تو من حلیہم سے یہی اشارہ کر رہا ہے کہ یہ زیورات بنی اسرائیل کے تھے۔ اور سورہ طہٰ میں بھی من زینۃ القوم سے بنی اسرائیل مراد ہیں کیونکہ یہ سرداران قوم کا مقولہ ہے اور ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ سرداروں ہی سے مخاطب ہیں لیکن تورات کی روایات اس موضوع پر مختلف ہیں۔ کتاب خروج کے باب ۳۵ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ زیورات بنی اسرائیل کے تھے۔ لیکن اسی کتاب کی دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل نے ملک چھوڑتے وقت سونے اور چاندی کے بہت سے زیورات اور برتن مصریوں سے مستعار لیے تھے اور ہمارے شارحین قرآن کے یہاں اسی روایت کو شرف پذیرائی حاصل ہے لیکن یہ بات بالکل خلافِ قیاس معلوم ہوتی ہے ان شاء اللہ اس پر تفصیلی بحث معالم القرآن کی جلد شانزدہم میں آپ پڑھیں گے۔ بہرحال ان زیورات سے بچھڑے کی ایک مورت بنائی گئی اور معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھ کی صفائی یہ دکھائی گئی ہے کہ اس میں سے جب ہوا گزرتی تو جیسے بچھڑا ڈکراتا ہے ایسی آواز اس سے نکلتی۔ خوار عربی میں بیل کی آواز کو کہتے ہیں۔ قرآن یہ داستان بنی اسرائیل کی بلادت عقلی بے مائیگی اور ان کی ناسپاسی اور ناقدری ظاہر کرنے کے لیے سنا رہا ہے۔ اللہ اکبر جس ذات اکبر نے ان کو اپنے جلال و جمال کی وہ نشانیاں دکھائیں جن کی تفصیل پہلے بیان ہو چکی ہے اس کی شکرگزاری انہوں نے اس طرح کی کہ اسے چھوڑ کر عابدانہ تعلقات ایک ایسی مورتی سے قائم کر لیے جو اپنے ہی زیور سے بنائی اور اس کے متعلق یہ باور کریں کہ یہ ہماری عابدانہ نیازمندیوں کا مستحق ہے۔ اس طرح بنی اسرائیل نے اپنا وہ شوق پورا کر لیا جس کا اظہار انہوں نے حضرت موسیٰ کے کوہ طور پر جانے سے پہلے کیا تھا اور جس پر حضرت موسیٰ نے ان کو ڈانٹ پلائی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کی امت اگر نبوت کے علم و عمل سے ناداں بے خبر اور بیگانہ ہو تو شرک جیسی سنگین برائی میں بھی مبتلا ہو جاتی ہے۔

بنی اسرائیل کی حماقت پر تنبیہہ

۱۸۵۔ کیا ان کی عقل میں یہ بات نہیں آتی کہ وہ ان سے بات تک نہیں کرتا اور نہ ان کی

رہنمائی کرتا ہے انہوں نے اس کو معبود بنا لیا وہ اپنے کردار میں بڑے بے ڈھنگے تھے۔ سورہ طٰہٰ میں اس بچھڑے کا مفصل تذکرہ آئے گا۔ یہاں ان کی حماقت و سفاہت پر متنبہ فرمایا ہے کہ ایک خود ساختہ ڈھانچے میں سے گائے کی آواز سن لینے پر مفتون ہو گئے اور بچھڑے کو خدا سمجھ بیٹھے۔ حالانکہ اس کی بے معنے آواز میں نہ کوئی کلام و خطاب تھا نہ دینی و دنیوی رہنمائی اس سے ہوتی تھی۔ اس طرح کی صوت محض تو کسی چیز کو انسانیت کے درجہ تک ہی نہیں پہنچا سکتی، چہ جائے کہ خالق جل و علا پر پہنچا دے۔ یہ کتنا بڑا ظلم اور بے موقع کام ہے کہ ایک معمولی جانور کی صورت کو خدا کہہ دیا جائے بات یہ ہے کہ اس قوم کو پہلے ہی سے ایسی بے موقع باتیں کرنے کی عادت تھی چنانچہ پیشتر اجعل لنا الٰھا کما لھم الٰھۃ کی درخواست کر چکے تھے۔ [1]

معبود بنا لینے کی تفصیل تورات میں اس طرح بیان ہوئی ہے کہ

انہوں نے کہا کہ اے اسرائیل یہ تمہارا معبود ہے جو تمہیں ملک مصر سے نکال لایا۔ (خروج ۲۲-۴۱)

انہوں نے اپنے لیے ڈھالا ہوا بچھڑا بنایا اور اسے پوجا اور اس کے لیے قربانی ذبح کر کے کہا کہ اے اسرائیل یہ تمہارا معبود ہے جو تمہیں ملک مصر سے چھڑا لایا۔ (خروج ۳۲-۸)

اصل بات اتخذوہ وکانوا ظالمین ہے یعنی وہ بچھڑے کو معبود بنا بیٹھے اور اس طرح اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ ظلم کی اصل حقیقت حق تلفی کرنا ہے۔ شرک فی العبادۃ کا ارتکاب کر کے انسان اپنی تحقیر کرتا ہے کیونکہ وہ کائنات میں خدا کا خلیفہ اور تمام مخلوقات میں اشرف ہونے کے باوجود اپنی ہی جیسی یا اپنے سے بھی کسی گھٹیا چیز کو اپنا معبود بنا بیٹھتا ہے۔ اپنے نفس کی اس سے بڑی حق تلفی کیا ہو سکتی ہے وکانوا ظالمین اگرچہ معنے کے اعتبار سے وکانوا مشرکین کے معنے میں ہے۔ قرآن میں شرک کو متعدد مقامات میں ظلم کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن یہ قرآن کی غایت درجہ احتیاط ہے کہ وہ نبی کی امت اور نبی کی قوم میں فرق کرتا ہے۔ ایک نبی کی نبوت کو نہ مانتے ہوئے یہ عمل کیا جائے تو قرآن اس پر کھلے طور پر مشرک ہونے کا فتویٰ لگاتا ہے لیکن اگر نبی کو مانتے ہوئے بے علمی کی بنا پر اس قسم کا طرز عمل اختیار کیا جائے تو قرآن اسے

[1] افادات شیخ الاسلام

ظلم کہتا ہے ۔ قرآن میں جہاں بھی یہ واقعہ آیا ہے قرآن نے ظلم ہی کی تعبیر اختیار کی ہے مثلاً ثم اتخذتم العجل من بعدہ وانتم ظالمون اور انکم ظلمتم انفسکم باتخاذکم العجل اسی بنا پر الم یروا انہ لا یکلمھم ولا یھدیھم سبیلا ، جملہ معترضہ لا کر ان کی حماقت پر تنبیہ کی ہے کہ انہوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ جو چیز بات بھی نہیں کرتی خالی ٹیں ٹیں کر رہی ہے اور کسی قسم کی کوئی رہنمائی بھی جس میں موجود نہیں اس کی عبادت کرنے لگے ۔ اس سے اشارہ معلوم ہو رہا ہے کہ بنی اسرائیل الوہیت کے موضوع پر بالکل ان پڑھ تھے اور ان کا مبلغ علم عجائبات کے سوا کچھ نہ تھا اس فقرہ کا یہ منشا نہیں ہے کہ معبود وہ ہوتا ہے جو بات کرے اور راہ بتائے بلکہ مقصد یہ سمجھانا ہے کہ کچھ تو عقل کے ناخن لینے چاہئیں ۔ آخر معبود ہونے کا کوئی معیار ہونا چاہیے ۔ ایک مورت کو صرف بھاں بھاں کرتے دیکھ کر عبادت کرنا کہاں کی دانشمندی ہے ۔ یہاں حضرت مولانا تھانوی کا یہ استنباط بہت لطیف ہے کہ خوارق سے دھوکا نہ کھانا چاہیے ۔ خوارق خواہ کیسے ہوں لیکن دلیل شرعی کے سامنے اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے ۔ اگر کہیں بطور خرق عادت ایسا ہو بھی جائے کہ کسی بنی ہوئی مورتی سے آواز آجائے یا بات کرنے لگے یا کسی قبر سے کوئی آواز آئے یا کوئی روشنی محسوس ہو یا مردہ باتیں کرنے لگے پھر بھی اس کی عبادت حرام ہوگی کیونکہ دلیل شرعی سے غیر اللہ کی عبادت حرام ہو چکی ہے ۔

بنی اسرائیل کی اپنے کردار پر ندامت

۱۴۹ ۔ اور جب ندامت سے ہاتھ ملنے لگے اور ان کی یہ بات سمجھ میں آگئی کہ وہ راہ حق سے بھٹک گئے تو پکار اٹھے کہ اگر ہمارے رب نے ہم پر رحم نہ کیا اور ہمیں معاف نہ کیا تو ہم ضرور تباہی کا شکار ہو جائیں گے ۔ اپنی بد عقلی اور کج روی سے انہوں نے ایسا بے ڈھنگا اور بھونڈا کام کیا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کی تنبیہ کے بعد جب باطل کا جوش ٹھنڈا ہوا اور عقل و ہوش کچھ ٹھکانے آئے تو خود بھی اپنی حرکت پر بہت شرمائے گویا مارے ندامت کے ہاتھ کاٹنے لگے اور خوف و ہراس کی وجہ سے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے ، گھبرا کر کہنے لگے اب کیسے بنے گی اگر خدا نے ہم پر رحم فرما کر توبہ اور مغفرت کی کوئی صورت نہ نکالی تو یقیناً ہم ابدی خسران اور دائمی ہلاکت میں جا پڑیں گے[1] یہ ان کی اپنے کردار پر ندامت کی تصویر ہے ۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان کی رائے عامہ نے جو کچھ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کیا بے خبری اور لاعلمی میں کیا لیکن جرم بہرحال جرم ہے خواہ بے خبری میں کیا جاتے۔ بے خبری جُرم کے جواز کے لیے عذر نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سامری اور اس کے ساتھیوں کے پروپیگنڈے سے مسحور ہو کر بنی اسرائیل یہ حماقت کرنے کو کر بیٹھے لیکن سامنے جب بھاں بھاں کرتا ہوا بچھڑا نظر آیا اور معلوم ہوا کہ یہ بنی اسرائیل کا معبود ہے تو ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ ان کو اپنی حماقت اپنی آنکھوں کے سامنے نظر آئی اور اپنی گمراہی کا احساس ہوا اور بولے کہ اگر ہمارے رب نے ہم پر رحم نہ فرمایا اور ہمارے اس جرم کو معاف نہ کیا تو ہم نامراد ہوتے۔

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ ان میں یہ احساس کب بیدار ہوا ہے۔ جب کہ اس کردار پر حضرت ہارون کی توبیخ پر ان کا جواب یہ تھا کہ لن نبرح علیہ عاکفین حتی یرجع الینا موسیٰ جب تک موسیٰ ہمارے پاس نہ آتے ہم اس کی پرستش پر جمے رہیں گے۔ قرینہ دلیل ہے کہ یہ احساس ان کو اس وقت ہوا جب موسیٰ علیہ السلام کوہ طور سے واپس ہوتے اور ان کو اس جہالت و حماقت پر ملامت کی تو ان کے ہوش ٹھکانے آتے اور گھبرا کر کہنے لگے اور یہ احساس بھی صرف ان لوگوں کو جن کے اندر کچھ سوجھ بوجھ تھی۔ عوامی جوش کے بحران میں تو وہ صحیح حال کا اندازہ نہ کر سکے لیکن جب نتیجہ سامنے آگیا تو ان کی آنکھیں کھلیں اور انہوں نے دیکھا کہ ہم تو راہِ حق سے ہٹ گئے ہیں۔

اجتماعی زندگی میں اس قسم کے مواقع بڑی ہی آزمائش کے اور بڑے ہی خطرناک ہوتے ہیں کوئی ایک گمراہی لے کر اٹھتا ہے اور جذباتی عوام کی بھیڑ اپنے اردگرد جمع کر کے کوئی ایسا فتنہ اٹھا دیتا ہے جس سے پوری جماعت کا شیرازہ منتشر ہو جاتا ہے اور بسا اوقات سمجھدار اور ذمہ دار لوگ بھی اس وقت بیدار ہوتے ہیں جب پانی سر سے گزر جاتا ہے۔

ظاہر یہی ہے کہ ندامت اور افسوس کے لیے ان کے ضمیر کی بیداری خود اپنے علم و یقین کی بنا پر نہیں بلکہ حضرت موسیٰ کی تہدید و توبیخ کی وجہ سے پیدا ہوئی اس کی اہمیت کے پیش نظر اسے پہلے بیان کر دیا گیا ہے۔ قرآن نے ان کے کردار کے ساتھ ان کی گفتار بھی بتا دی تاکہ پتہ لگ جاتے کہ وہ بنی اسرائیل کا اگر کردار ہے تو یہ ان کی گفتار ہے۔

حضرت موسیٰ کی ناراضگی

۱۸۷-۱ ۔ جب موسیٰ علیہ السلام کوہ طور سے واپس ہوتے خشمناک اور افسوس کی حالت میں

تو موسیٰ نے کہا افسوس تم نے کس بُرے طریقے پر میری جانشینی کی کیا تم نے اپنے رب کے حکم آنے سے پہلے ہی ایسی جلد بازی کی ہے؟ - اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو طور پر ہی اطلاع دے دی تھی کہ سامری نے تیری قوم کو گمراہ کر دیا ہے یہ سن کر موسیٰ علیہ السلام سخت متاسف اور غضبناک تھے آتے اور آکر گوسالہ پرستوں کو مخاطب کر کے کہا میرے پیچھے تم نے میری خوب قائمقامی کی۔ جس بات پر میں سب سے زیادہ زور دیتا تھا خدا کی توحید اس کی جگہ تم نے بچھڑے کی پوجا، یہ کہہ کر کھڑی کر دی کہ ھذا الٰھکم والٰہ موسیٰ اور ممکن ہے کہ خطاب حضرت ہارون سے بھی ہو کہ تم نے میری نیابت کا حق جو اخلفنی فی قومی کہہ کر سپرد کر گئے تھے اچھی طرح ادا نہ کیا کہ ان کو روکتے اور مضبوطی سے اس فتنہ کا مقابلہ کرتے جیسا کہ سورہ طٰہٰ میں مفصل آئے گا۔ اور فرمایا کہ اعجلتم امر ربکم یعنی میں پروردگار سے تمہارے لیے احکام ہی لینے تو گیا تھا اور چالیس روز کی معیاد بھی خدا نے مقرر کر دی تھی۔ تم نے خدا کی مقرر کی ہوئی مدت پوری ہونے اور اس کے احکام لے آنے کا بھی انتظار نہ کیا۔ کچھ بہت زیادہ زمانہ تو نہیں گزر گیا جو تم نے گھبرا کر اس قدر جلد خدا کے قہر و غضب کو اپنی طرف آنے کی دعوت افطال علیکم العھد ام اردتم ان یحل علیکم غضب من ربکم فاخلفتم موعدی۔[1]

تورات اور قرآن دونوں ہی سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حضرت موسیٰ کو اس حادثہ کی اللہ سبحانہ نے کوہ طور پر اطلاع دے دی تھی۔ سورہ طٰہٰ میں ہے ۔

فانا قد فتنا قومك من بعدك واضلھم السامری

ہم نے تیری قوم کی تیرے پیچھے آزمائش کی اور ان کو سامری نے بہلا دیا۔

تورات کی کتاب خروج باب ۳۲ میں ہے ،

تب خداوند نے موسیٰ کو کہا نیچے جا، کیونکہ تیرے لوگ جن کو تو مصر سے نکال لایا بگڑ گئے تھے ۔ وہ اس راہ سے جس کا میں نے ان کو حکم دیا تھا بہت جلد پھر گئے ہیں۔ انہوں نے اپنے لیے ڈھالا ہوا بچھڑا بنایا اور اسے پوجا اور اس کے لیے قربانی چڑھا کر یہ بھی کہا کہ اے اسرائیل یہ تیرا وہ دیوتا ہے جو تجھ کو ملک مصر سے نکال کر لایا اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ میں اس قوم کو دیکھتا ہوں کہ یہ گردن کش قوم ہے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

چنانچہ حضرت موسیٰ جب کوہ طور سے واپس آئے تو نہایت غم و غصہ کی حالت میں تھے۔ غصہ ان کو ان مفسدین کی شرارت پر تھا اور غم اپنی قوم کی نادانی و جہالت پر، آتے ہی انہوں نے سب سے پہلے ان لوگوں کی خبر لی جن پر ان کی غیر موجودگی میں قوم کی دیکھ بھال کی ذمہ داری عائد ہوتی تھی فرمایا کہ تم لوگوں نے میرے بعد میری بہت بری جانشینی کی کہ قوم کو اس برے راستے پر ڈال دیا۔ سورہ طہٰ میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ یہ تم کیا کر بیٹھے ہو۔ کیا تم سے اللہ سبحانہٗ نے نہایت مبارک وعدہ کتاب و شریعت دینے کا نہیں فرمایا تھا۔ کیا اس وعدہ کے پورا ہونے میں اتنی دیر ہو گئی کہ تم صبر نہ کر سکے کیا تم صبر نہ کر سکے کیا تم نے یہ چاہا کہ تم پر خدا کا غضب نازل ہو تم اس عہد کو توڑ بیٹھے ہو جو میں تم سے لے کر گیا تھا۔

اعجلتم امر ربکم یعنی قبل اس کے خدا یہ بتانے کہ اس کی عبادت کا طریقہ کیا ہے اور یہی بتانے کے لیے اس نے مجھے کوہِ طور پر بلایا۔ تم نے آگے بڑھ کر خود ہی عبادت کا طریقہ ایجاد کر لیا حالانکہ یہ چیز تمہارے ایجاد کرنے کی نہیں بلکہ خدا ہی کے بتانے کی ہے۔ گویا توبیخ دو باتوں پر کی جا رہی ہے ایک یہ کہ غیر اللہ سے عابدانہ تعلقات استوار کیے جا رہے ہیں اور دوسرے یہ کہ عبادت کے پیمانے بطورِ خود بنا رہے ہیں۔ دونوں باتیں ممنوع ہیں اور دونوں افترا علی اللہ کذبا ہیں۔ بہر حال مطلب یہ ہے کہ میں پرستش اور بندگی کا ضابطہ ہی لینے گیا تھا کم از کم میرا انتظار ہی کر لیتے۔ اتنی جلد بازی کی کیا ضرورت تھی۔ اس عجلت کا پسِ منظر شرارت اور جہالت تھا۔ اسی لیے حضرت موسیٰ پر دو ملی جلی کیفیات ظاہر ہوئیں ایک غصہ، دوسرے غم، غصہ و غم کے ملے جلے جذبات کا اظہار ان دو جملوں میں فرمایا بئسما خلفتمونی من بعدی میں غم کا اظہار ہے اور اعجلتم امر ربکم میں غضب کا اور غم و غصہ کی اسی حالت میں۔

حضرت ہارون پر حضرت موسیٰ کا غصہ

۱۸۸۔ اور موسیٰ نے تختیاں پھینک دیں اور ہارون کو بالوں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگے

حضرت موسیٰ علیہ السلام اس مشرکانہ ڈھونگ کو دیکھ کر اور ہارون علیہ السلام کی نرمی و تساہل کا گمان کر کے اس قدر برافروختہ اور دینی حمیت کے جوش سے اس قدر بے قابو ہو رہے تھے کہ ہارون علیہ السلام کی طرف لپکے اور حرارتِ ایمانی کے بے اندازہ جوش میں ان کی داڑھی اور سر کے بال پکڑ لیے۔ معاذ اللہ ہارون کی اہانت کی نیت سے نہیں کیونکہ ہارون خود مستقل نبی اور عمر میں موسیٰ علیہ السلام

سے تین سال بڑے تھے۔ پھر ذی علم پیغمبر سے یہ کیسے ممکن تھا کہ دوسرے نبی کی جو اس کا بڑا بھائی ہو ذرہ برابر توہین کا ارادہ کرے، نہیں بلکہ موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے یہ معاملہ اس وقت ہوا جب کہ وہ قوم کی سخت بدعنوانی کی بنا پر بغض فی اللہ اور غصہ سے بے اختیار ہوئے تھے۔ حضرت ہارون کی نسبت یہ خیال گزر رہا تھا کہ شاید انہوں نے اصلاح حال کی پوری کوشش نہیں کی۔ حالانکہ ان کو اصلاح کی بھی تاکید کر گئے تھے۔ بے شک ہارون نبی اور عمر میں بڑے تھے۔ اور سیاسی و انتظامی حیثیت سے ہارون کو ان کا وزیر اور تابع بنایا گیا تھا۔ اس موقع پر موسیٰ علیہ السلام کی شان سیادت و حکومت کا ظہور ہوا۔ گویا ان کی طرف سے یہ دارو گیر اور سخت بازپرس حضرت ہارون کی تقصیر مظنون پر ایک قسم کی فعلی ملامت تھی جس سے قوم کو بھی پوری طرح متنبہ کر دیا گیا کہ پیغمبر کا قلب نشہ توحید سے اس قدر سرشار اور دسیسہ شرک و کفر سے کس قدر نفور و بیزار ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں ادنیٰ ترین تساہل یا خاموشی کو بھی برداشت نہیں کر سکتے حتیٰ کہ ایک نبی کی نسبت اگر ایسا وہم ہو جائے کہ اس نے شرک کے مقابلہ میں آواز بلند کرنے میں ذرا سی کوتاہی کی ہے تو اس کی بزرگی اور وجاہت عنداللہ بھی ایسی سخت بازپرس سے ان کو نہیں روک سکتی۔ بہرحال موسیٰ علیہ السلام اس حالت میں شرعاً معذور تھے۔ اسی فرط غضب میں اور ہنگامہ دارو گیر میں الواح وہ تختیاں جو خدا کی طرف سے مرحمت ہوئی تھیں ان کے ہاتھ سے چھوٹ گئیں جسے عدم تحفظ کی وجہ سے تغلیظاً القا سے تعبیر فرمایا کیونکہ بظاہر خذھا بقوۃ کا امتثال نہ کر سکے یا جیسا کہ بعض مفسرین کا خیال ہے ہارون کی طرف بڑھتے وقت ہاتھ خالی کرنے کے لیے بہت تیزی اور عجلت کے ساتھ تختیاں ایک طرف رکھ دیں۔ مگر چونکہ ان دونوں معاملات کی سطح جو ہارون یا الواح کے متعلق ظہور میں آئے صورۃً پسندیدہ نہ تھے۔ گو موسیٰ علیہ السلام نیز معذور تھے اس لیے آئندہ رب اغفر لی الخ کہہ کر حق تعالیٰ سے عفو کی درخواست کی واللہ سبحانہ اعلم۔[1]

والقی الالواح میں جو کچھ بتایا گیا ہے اس کی سیر حاصل تشریح تو حضرت مولانا عثمانی قدس اللہ سرہ العزیز کی زبان سے آپ سن چکے ہیں اور یہ بھی معلوم کر چکے ہیں کہ اس کا پس منظر غلبہ حال اور جوش حمیت ہے۔ اللہ کے معاملہ میں جوش و جذبہ، غیرت اور حضرت ہارون کے ساتھ قلبی محبت کے تقاضے سے دب کر حضرت موسیٰ نے حضرت ہارون سے دریافت کیا کہ تم نے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اس فتنہ کو سر کیوں اٹھانے دیا۔ سورہ طٰہٰ میں ہے ما منعك اذ رایتهم ضلوا الا تتبعن افعصیت امری، تم نے جب دیکھا کہ یہ گمراہ ہو رہے ہیں تو کس چیز نے تجھے روکا کہ تو میری پیروی نہ کرے کیا تو نے میرے حکم کی خلاف ورزی کی۔ حکم سے مراد وہ حکم ہے جو پہاڑ پر جاتے وقت حضرت ہارون کو بنی اسرائیل کی قیادت سونپتے ہوئے حضرت موسیٰ نے دیا تھا۔ یعنی اصلح و لا تتبع سبیل المفسدین چونکہ اس حکم کی رو سے اصل ذمہ داری حضرت ہارون پر ہی تھی۔ اور ان پر پورا پورا اعتماد بھی تھا اس وجہ سے حضرت موسیٰ نے ان پر عتاب فرمایا۔ بہر حال حضرت موسیٰ کا یہ سارا کردار غیرت توحید کے جوش اور بے خودی میں رونما ہوا اس لیے اس کردار پر نہ کوئی گرفت کی جا سکتی ہے اور نہ یہ کردار دوسروں کے لیے سند کا کام دے سکتا ہے۔ بعض نادان صوفیا نے موسوی کردار کو اپنے لیے حالت وجد میں کپڑے پھاڑنے کے لیے سند بنایا ہے۔ قرطبی نے صاف لکھ دیا ہے کہ یہ قیاس مع الفارق سرتا سر لغو ہے۔ یہاں حضرت مولانا اشرف علی قدس اللہ سرہ العزیز کا یہ استنباط بڑا ہی لطیف ہے کہ:

> حضرت موسیٰ نے یہ معاملہ حضرت ہارون سے اپنے اس اجتہاد کی بنا پر کیا کہ حضرت ہارون سے کوتاہی واقع ہوئی۔ حالانکہ کوتاہی نہ ہوئی تھی تو جب پیغمبر برحق کے اجتہاد کا مطابق واقع ہونا ضروری نہیں ہے تو مشائخ غیر معصومین سے غلطی کا صدور کیوں ممکن نہیں۔

پس منظر تو تختیاں پھینکنے کا بھی ہے جو آپ سن چکے ہیں کہ مشہور مفسر قرآن امام محمد بن جریر طبری نے اس القاء الواح کا پس منظر بتاتے ہوئے حضرت قتادہ کے حوالہ سے یہ عجیب و غریب انکشاف فرمایا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے غصہ اور تختیوں کے پھینکنے کا پس منظر یہ تھا کہ ان تختیوں میں ان کی امت کی مدح و ستائش نہ تھی بلکہ امت محمدی کی تعریف و توصیف تھی۔ اس قسم کی بات ایک معمولی صالح متقی انسان کے منہ پر بھی نہیں پھبتی چہ جائیکہ حضرت موسیٰ جیسا عظیم پیغمبر یہ بات کہے۔ خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے حافظ ابن کثیر کو، انہوں نے اس روایت کے بارے میں ہمیں یہ بتا دیا کہ:

> ابن جریر نے اس موضوع پر قتادہ سے جو روایت نقل کی ہے اس کی سند بھی صحیح نہیں ہے۔ ابن عطیہ اور دوسرے علماء نے اسے مردود قرار دیا ہے اور وہ اسی قابل ہے کہ اسے مردود کہا جائے عجب نہیں قتادہ کو یہ روایت اہل کتاب سے

پہنچی ہو جن میں بڑے کذاب روایت سازی کے فن کار اور چھوٹے لپاٹی ہیں۔

حضرت ہارون کی معذرت

۱۸۹- ہارون نے کہا کہ اے میری ماں جائے بھائی لوگوں نے مجھے بے حقیقت سمجھا اور قریب تھا کہ قتل کر ڈالیں، میرے ساتھ ایسا سلوک نہ کر کہ جس سے دشمن ہنسیں اور نہ مجھے ان ظالموں کے ساتھ شمار کر۔ اگرچہ ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ کے عینی بھائی ہیں مگر ماں کا حوالہ دینے سے ان کے جذبۂ شفقت کو ابھارنا ہے اس لیے ابن ام فرمایا۔ اس آیت میں حضرت ہارون کی معذرت کا بیان ہے۔ حاصل یہ ہے کہ میں اپنے مقدور کے موافق ان کو سمجھا چکا ہوں لیکن انہوں نے میری کچھ حقیقت نہ سمجھی اُلٹے مجھے قتل کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ اب آپ ایسا معاملہ کر کے ان کو مجھ پر ہنسنے کا موقع نہ دیجئے اور عتاب و غصہ کا اظہار کرتے وقت مجھ کو ظالموں میں شامل نہ کیجئے[1]

یہ حضرت ہارون نے اپنی صفائی پیش فرمائی ہے اور بیان کا طریق بے حد دل بہلانے والا ہے۔ آپ نے اپنی صفائی میں کہا ابن اُم اے میری ماں جاتے بھائی، اس سے پیار اور رہا تو دونوں چیزیں نمایاں ہو رہی ہیں۔ آپ نے بتایا کہ قوم نے مجھے بے بس کر دیا تھا اور قریب تھا کہ میری جان سے کھیل جائیں۔ جتا دیا کہ میں نے نہ صرف یہ کہ لوگوں کو اس مشرکانہ عمل سے روکا بلکہ اس کے لیے میں نے آپ کو بھی خطرہ میں ڈال دیا لیکن لاتے عامہ کی اکثریت سامری کے پیچھے لگ گئی تھی اور میرے ساتھ اتنی تھوڑی تعداد رہ گئی کہ طاقت کے زور سے اس کو روکنا میرے بس سے باہر ہو گیا اس لیے میں نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ آپ کی واپسی کا انتظار کروں مبادا میرا کوئی اقدام کسی مزید فتنہ کا سامان نہ ہو جاتے اور یہ بنی اسرائیل میں تفریق کا فتنہ ہے۔ سورہ طہٰ میں تصریح ہے :

خشیت ان تقول فرقت بین بنی اسرائیل

مجھے اندیشہ ہوا کہ تم کہو گے کہ تو نے بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی۔

یہ سارا ان شیاطین کا بپا کردہ ہے میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آپ مجھ پر ناراضگی کا اظہار فرما کر ان شیاطین کو خوشی منانے کا موقعہ نہ دیں۔ ڈرامہ کی ساری ذمہ داری ان پر ہے۔ میں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اس سے بالکل بری ہوں۔

یہاں قرآن عزیز نے ایک بڑے الزام سے حضرت ہارون کی برأت ثابت کی ہے۔ جو یہودیوں نے زبردستی ان پر چسپاں کر رکھا تھا۔ بائیبل بچھڑے کی پرستش کا واقعہ اس طرح بیان کرتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ کو پہاڑ سے اترنے میں دیر لگی تو بنی اسرائیل نے بے صبر ہو کر حضرت ہارون سے کہا کہ ہمارے لیے ایک معبود بنا دو۔ اور حضرت ہارون نے ان کی فرمائش کے مطابق سونے کا ایک بچھڑا بنا دیا جسے دیکھتے ہی بنی اسرائیل پکار اٹھے کہ اے اسرائیل یہی تیرا دیوتا ہے جو تجھے ملک مصر سے نکال لایا۔ پھر حضرت ہارون نے اس کے لیے ایک قربان گاہ بنائی اور اعلان کر کے دوسرے روز تمام بنی اسرائیل کو جمع کیا اور اس کے لیے قربانیاں چڑھائیں۔

(خروج باب ۳۲ آیت ۱-۶)

قرآن عزیز کے متعدد مقامات پر بصراحت اس غلط بیانی کی تردید کی گئی ہے اور حقیقت واقعہ یہ بتائی گئی ہے کہ اس جرم عظیم کا مرتکب اللہ کے نبی حضرت ہارون نہیں بلکہ اس کا بانی سامری تھا۔

یہ مقام قرآن کے ان مقامات میں سے ایک ہے جس میں قرآن نے اپنے مہیمن ہونے کا فرض انجام دیا ہے اور تورات کی اغلاط کی تصحیح کی ہے اور یہ ان لوگوں کے لیے سرمہ چشم ہے جو یہ کہتے رہتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا خود ساختہ ہے اور آپ نے تورات و انجیل کی معلومات سے اس میں استفادہ کیا ہے۔ اگر آپ کی معلومات تورات کا فیضان ہوتیں تو آپ کی معلومات بلا شبہ تورات کے موافق ہوتیں۔ حیرت کی بات ہے کہ ایک شخص جو امی ہے جس نے کبھی کسی کے سامنے زانوئے ادب طے نہیں کیا اس کے بارے میں یہ سوچا جاتا ہے؟ انا للہ وانی اللہ المشتکی۔

ہارون کی بے گناہی کا اعتراف

۱۹۰۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا پروردگار میرا قصور بخش دے اور میرے بھائی کا بھی اور ہمیں اپنی رحمت کے سائے میں داخل کر لے تیرے سے بڑھ کر کون ہے جو رحم کرنے والا ہو۔ یعنی شدت غضب میں جو بے اعتدالی یا اجتہادی غلطی مجھ سے ہوئی خواہ میں اس میں کتنا ہی نیک نیت ہوں آپ معاف فرما دیجئے اور میرے بھائی ہارون سے اگر ان کے درجہ اور شان کو ملحوظ رکھتے ہوئے کسی طرح کی کوتاہی قوم کی اصلاح میں ہوئی اس سے بھی درگزر فرمائیے۔[1]

[1] افادات شیخ الاسلام

حضرت موسیٰ کو حضرت ہارون پر یہ شبہ ہوا تو کسی طرح ہو سکتا ہی نہیں تھا کہ خدانخواستہ وہ اس فتنہ کے بانی ہوں گے۔ البتہ جیسا کہ قرآن سے ہی معلوم ہو رہا ہے۔ یہ شبہ حضرت موسیٰ کو ہوا ہو گا کہ انہوں نے اس کے روکنے کے لیے اپنی ذمہ داری کما حقہ پوری نہیں کی۔ حضرت ہارون کے مذکورہ بالا جواب سے یہ شبہ دور ہو گیا۔ صورت حال واضح ہو جانے کے بعد حضرت موسیٰ نے اپنے اور اپنے بھائی کے لیے مغفرت مانگی۔

قرآن کے بیان کا مرتبین تورات کے اس بیان کے ساتھ تقابلی مطالعہ کیجئے جو حضرت ہارون کے بارے میں انہوں نے پیش کیا ہے۔ بظاہر یہ بات بڑی حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے کہ مرتبین تورات جن لوگوں کو خدا کا پیغمبر مانتے ہیں ان میں سے کسی کی سیرت کو انہوں نے داغدار بنائے بغیر نہیں چھوڑا ہے اور داغ بھی ایسے لگائے ہیں جو اخلاق و شریعت کی نگاہ میں بدترین جرائم شمار ہوتے ہیں مثلاً شرک جادوگری زنا، جھوٹ، دغا بازی اور ایسے ہی دوسرے شدید معاصی جن سے آلودہ ہونا پیغمبر تو درکنار ایک معمولی مومن اور شریف انسان کے لیے بھی سخت شرمناک ہے۔ یہ بات بجائے خود عجیب ہے لیکن بنی اسرائیل کی اخلاقی تاریخ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فی الحقیقت اس قوم کے معاملہ میں یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ یہ قوم جب اخلاقی و مذہبی انحطاط میں مبتلا ہوئی اور عوام سے گزر کر ان کے خواص تک کو حتیٰ کہ علماء و مشائخ اور دینی منصب رکھنے والوں کو بھی گمراہیوں اور بداخلاقیوں کا سیلاب بہا کر لے گیا تو ان کے مجرم ضمیر نے اپنی اس حالت کے لیے عذرات تراشنے شروع کیے اور اسی سلسلے میں انہوں نے وہ تمام جرائم جو یہ خود کرتے تھے۔ انبیاء علیہم السلام کی طرف منسوب کر ڈالے تاکہ یہ کہا جا سکے کہ جب نبی تک ان چیزوں سے نہ بچ سکے تو بھلا اور کون بچ سکتا ہے۔ اس معاملہ میں یہودیوں کا حال ہندوؤں سے ملتا جلتا ہے۔ ہندوؤں میں بھی جب بداخلاقی انتہا کو پہنچ گئی تو وہ لٹریچر تیار ہوا جس میں دیوتاؤں کی رشیوں، منیوں اور اوتاروں کی غرض جو بلند ترین آئیڈیل قوم کے سامنے ہو سکتے تھے ان سب کی زندگیاں بداخلاقی کے تارکول سے سیاہ کر ڈالی گئیں تاکہ یہ کہا جا سکے کہ جب ایسی عظیم الشان ہستیاں ان قبائح میں مبتلا ہو سکتی ہیں تو بھلا ہم کیا ہیں ؟۔

إِنَّ الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ
فِي الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِينَ ﴿۱۵۲﴾ وَالَّذِينَ
عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ ثُمَّ تَابُوا مِن بَعْدِهَا وَآمَنُوا إِنَّ رَبَّكَ مِن بَعْدِهَا
لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۵۳﴾ وَلَمَّا سَكَتَ عَن مُّوسَى الْغَضَبُ أَخَذَ
الْأَلْوَاحَ ۖ وَفِي نُسْخَتِهَا هُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِينَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُونَ ﴿۱۵۴﴾

بلاشبہ جن لوگوں نے بچھڑے کو معبود بنایا اُن کے حصہ میں اُن کے پروردگار کا غضب ضرور آتے گا اور دُنیا کی زندگی میں بھی ذلّت اور رُسوائی ہوگی، ہم افترا پردازوں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں۔[۱۹۱] ہاں جن لوگوں نے برائیوں کے ارتکاب کے بعد توبہ کرلی اور ایمان لے آتے تو بلاشبہ تمہارا پروردگار توبہ کے بعد بخش دینے والا رحمت والا ہے۔[۱۹۲] اور جب موسیٰ کا غصہ فرو ہوا تو اُس نے تختیاں اُٹھالیں اُن کی لکھائی میں اُن لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت

ہے جو اللہ سے ڈرتے ہیں۔[۱۹۳]

معانی مفردات

المفترین، مفتری کی جمع ہے افترا سے اسم فاعل ہے فری سے باب افتعال ہے۔ فری کے معنے درست کرنے کے لیے چمڑے کو تراشنا ہیں، افترا افتعال کے وزن پر ہو تو اس کے معنے چمڑے کو تراشنا خواہ درست کرنے کے لیے یا بگاڑنے کے لیے، مؤخر الذکر زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ قرآن کی زبان میں دین کا اپنی جانب سے دین کے نام پر بگاڑ ہو افترا کہلاتا ہے اس لیے شرک اور بدعت دونوں پر بولا جاتا ہے۔ سکت، وہ تھم گیا اس نے خاموشی اختیار کی۔ سکوت سے جس کے معنے خاموش ہو جانے کے ہیں۔ امام راغب لکھتے ہیں سکوت ترک کلام کے ساتھ مخصوص ہے اور چونکہ سکوت بھی سکون کی ہی ایک قسم ہے اس لیے ارشادِ الٰہی سکت موسی الغضب میں سکوت بطورِ استعارہ سکون ہی کے معنے میں استعمال ہوا یعنی جب موسیٰ کا غصہ فرو ہو گیا۔ نسختھا، کتاب لکھی ہوئی تحریر مراد وہ مضامین جن پر تحریر دلالت کرتی ہے اصل میں نسخہ وہ کتاب ہے جس سے نقل کیا جاتے نسخ مصدر ہے اس کے معنے مٹا دینا، بدل دینا، بے کار کر دینا، ایک چیز کو دوسری چیز کی جگہ قائم کرنا، لکھنا۔ استنساخ ایک تحریر سے دوسری تحریر نقل کرنا، تناسخ زمانہ کا قرن در قرن اور نوبت بہ نوبت گزرنا۔

عملِ شرک کی سنگینی

نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل میں شرک سنگین جرم ہے۔ توحید کی طرح شرک کے بھی چار درجے ہیں۔ ایک شرک یہ ہے کہ دو خدا مانے جائیں اور دو کا وجود اصلی اور حقیقی تسلیم کیا جاتے دوسرا یہ ہے کہ اس کائنات کو بنانے والے دو مانے جائیں اور دونوں مستقل ہوں۔ تیسرے یہ کہ اس کائنات کو چلانے والے دو مانے جائیں۔ چوتھے یہ کہ اللہ کے ساتھ اوروں کو اس کی عبادت میں شریک کیا جاتے اللہ کے ساتھ عبادت میں جسے شریک کیا جاتا ہے اور جس کی عبادت کی جاتی

ہے۔ اس کو معبود، الہٰ اور دیوتا کہتے ہیں۔ نبوت کے مخاطب اسی شرک کی بیماری میں مبتلا تھے۔ بنی اسرائیل نے بھی بچھڑے کو عبادت کے لیے دیوتا بنایا ہے اور نبوت کی اصلی ضرب اسی پر ہے اور یہی نبی کی قوم اور نبی کی اُمت کی بیماری ہے۔ یہ تمام گناہوں میں اتنا بڑا ہے کہ اس کا ارتکاب اگر توبہ کیے بغیر مر جاتے آدمی کو ہمیشہ کے لیے مغفرت سے محروم کر دیتا ہے۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں ایک عنوان میں شرک کی اسی سنگینی کی طرف یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے المعاصی من امر الجاھلیۃ لا یکفر صاحبھا بارتکابھا الا بالشرک یعنی گناہوں میں صرف شرک ایک ایسا گناہ ہے جس کے ارتکاب سے ایک مسلمان ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے گناہ تو اور بھی ہیں مگر کسی گناہ کے ارتکاب سے کوئی مسلمان کافر نہیں ہوتا جب تک اس کو حلال نہ سمجھے اگر آپ زانی ہیں تو زنا کے ارتکاب سے آپ ایمان سے محروم نہ ہوں گے لیکن اگر آپ نے زنا کو حلال ہی سمجھ لیا تو اب آپ ایمان سے محروم ہو گئے۔ اس کے برعکس شرک ایسا گناہ ہے کہ جس کے صرف ارتکاب سے مسلمان ایمان کھو بیٹھتا ہے۔ آپ ذرا اسی واقعہ میں شرک کی سنگینی کو دیکھیے کہ صرف اس خیال پر کہ حضرت ہارون کے سامنے یہ مشرکانہ عمل ہوا اور انہوں نے روکا نہیں حضرت موسیٰ نے حضرت ہارون کی ساری جلالتِ شان کے اعتراف کے باوجود حضرت ہارون کے ساتھ اس ناگوار طرزِ عمل کا مظاہرہ کیا کہ اخذ براس اخیہ یجرہ الیہ اللہ سے جاہلانہ تعلقات یعنی توحید عبادت نبوت کے مشن کی جان ہے۔

۱۹۱۔ بلاشبہ جن لوگوں نے بچھڑے کو معبود بنایا ان کے حصہ میں ان کے پروردگار کا غضب ضرور آئے گا اور دُنیا کی زندگی میں بھی ذلت و رُسوائی ہو گی۔ ہم افتراء پردازوں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں یہ غضب وہی ہے جس کا ذکر سورہ بقرہ میں گزر چکا۔ یعنی گوسالہ پرستوں کو وہ لوگ قتل کریں جنہوں نے یہ حرکت نہیں کی اور دوسروں کو روکنے میں حصہ بھی نہیں لیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مرتد کی سزا دُنیا میں قتل ہے[1]

دراصل بنی اسرائیل کے تین گروہ تھے ایک وہ جنہوں نے گوسالہ پرستی نہ کی اور دوسروں کو بھی روکا۔ دوسرے وہ جنہوں نے گوسالہ پرستی کی، تیسرے وہ جنہوں نے خود گوسالہ پرستی نہیں کی لیکن دوسروں کو بھی نہ روکا۔ دوسرے فریق کو حکم ہوا کہ مقتول ہو جاؤ، تیسرے فریق کو حکم ہوا کہ ان کو قتل کرو تاکہ ان کے سکوت کرنے کی توبہ ہو جاتے۔ پہلا فریق اس توبہ میں شریک

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہوا کیونکہ ان کو توبہ کی ضرورت تھی۔

اس سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ شرک کی یہ قسم قانون اسرائیلی میں ایک فوجداری سنگین جرم تھا۔ اسلام میں جرم کی سنگینی تو موجود ہے مگر اس سنگینی کا تعلق آخرت سے ہے۔ دُنیا میں اس کو فوجداری جرم قرار نہیں دیا گیا۔ اور اگر مولانا عثمانی کا تجزیہ صحیح ہے کہ اس قتل کا سبب ارتداد ہے تو اسلام میں یہ سنگینی موجود ہے۔ اسلام میں بھی ارتداد کی سزا قتل ہے۔ دونوں میں جوہری فرق ہے ایک یہ کہ شرک کی سزا دنیا میں قتل ہے اور دوسرے یہ کہ ارتداد کی سزا قتل ہے۔ یہاں ظاہر یہی ہے کہ یہ ارتکاب شرک کی سزا ہے کیونکہ البقرہ میں تصریح ہے کہ بنی اسرائیل کی توبہ کے قبول ہونے کی یہی شرط ہے۔ فتوبوا الی بارئکم فاقتلوا انفسکم مرتد کا حکم تو یہ ہے کہ اس کے سامنے حق کو پیش کیا جاتا اگر وہ توبہ کرے تو پھر کوئی سزا نہیں ہے اگر توبہ نہ کرے تو سزا قتل ہے۔ یہاں نوعیت بالکل الگ ہے۔ حکم یہ دیا جارہا ہے کہ ہر قبیلہ میں سے جو لوگ اس فتنہ گوسالہ پرستی سے الگ رہے ہیں اپنے اپنے قبیلہ کے ان لوگوں کی گردنیں اپنے ہاتھوں سے ماریں جنہوں نے قوم کے لیے اس فتنہ شرک کی راہ کھولی ہے یہ حکم دینے میں چند عظیم مصلحتیں ہیں۔

ایک یہ کہ اس طرح اس توبہ نے ایک اجتماعی توبہ کی شکل اختیار کرلی۔ گویا بنی اسرائیل کے اجتماعی ضمیر نے ان لوگوں کو اپنے اندر سے کاٹ دیا جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے عہد توحید عبادت کی توہین کی ہے۔

دوسرے یہ کہ اس سے توحید کی حقیقی عظمت اور شرک کی حقیقی کراہیت پورے طور پر واضح ہوگئی گویا شرک ایسی برائی ہے کہ آدمی کا بایاں ہاتھ اس کا ارتکاب کرے تو اس کے دائیں ہاتھ کا فرض ہے اپنے بائیں ہاتھ کو کاٹ کر پھینک دے۔ اس معاملہ میں نہ کسی مداہنت اور رواداری کو دخیل ہونے دے اور نہ کسی قرابت اور رشتہ داری کا لحاظ کرے۔

تیسری یہ کہ ہر قبیلہ کے اخیار اگر اپنے اپنے قبیلہ کے اشرار پر تلوار اٹھائیں گے تو اس سے خاندانی عصبیت نہیں ابھرے گی بلکہ کسی نئے فتنہ کے اندیشہ سے بنی اسرائیل کی تطہیر ہوجائے گی۔

تورات کے مطالعہ سے بھی قریب قریب یہی بات نکلتی ہے۔ چنانچہ تورات کی کتاب خروج میں ہے،

جب موسیٰ نے دیکھا کہ لوگ بے قابو ہو گئے۔ کیونکہ ہارون[لہ] نے ان کو بے لگام چھوڑ کر ان کو ان کے دشمنوں کے درمیان ذلیل کر دیا تو موسیٰ نے لشکر گاہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر کہا کہ جو خداوند کی طرف ہے وہ میرے پاس آ جاتے۔ تب سب بنی لاوی اس کے پاس جمع ہو گئے اور اس نے ان سے کہا کہ خداوند اسرائیل کا خدا یوں فرماتا ہے کہ تم اپنی اپنی ران سے تلوار لگا کر پھاٹک پھاٹک گھوم کر سارے لشکرگاہ میں اپنے اپنے بھائیوں اور اپنے اپنے ساتھیوں اور اپنے اپنے پڑوسیوں کو قتل کرتے پھرو اور بنی لاوی نے موسیٰ کے کہنے کے موافق عمل کیا۔ چنانچہ اس دن لوگوں میں سے تین ہزار مرد کھیت آتے اور موسیٰ نے کہا کہ آج خداوند کے لیے اپنے آپ کو مخصوص کرو بلکہ ہر شخص اپنے ہی بیٹے اور اپنے ہی بھائی کے خلاف ہو تاکہ وہ تم کو آج ہی برکت دے۔ (باب ۲۲ آیات ۲۵ تا ۳۰)

یہ تو سینالھم غضب من ربھم کی عملی تفسیر ہوئی باقی ذلۃ فی الحیاۃ الدنیا کی عملی تفسیر شارحین قرآن نے یہ بتائی ہے کہ ان کے معبود اُن کی آنکھوں کے سامنے نذرِ آتش کیا گیا۔ اس کے بعد فرمایا کہ یہ ان ہی کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ ہر مفتری کی سزا یہی ہے۔ اللہ کے ساتھ جو بھی کسی کو خدا کی عبادت میں شریک کرتا ہے وہ اس حیثیت سے یقیناً مفتری ہے کہ بغیر کسی خدائی حکم کے بطورِ خود یہ کام کر رہا ہے۔ یہی قول علی اللہ بغیر علم ہے۔ اور اسی معنی کے لحاظ سے علماء نے مبتدع کو بھی مفتری قرار دیا ہے۔ چنانچہ حضرت امام مالک فرماتے ہیں کہ ہر مبتدع اپنی جگہ ذلت محسوس کرتا ہے اور آپ نے یہ تلاوت فرمائی۔ یہی بات امام سفیان بن عینیہ نے بھی فرمائی ہے کہ روئے زمین میں ہر مبتدع رُسوا و ذلیل ہوتا ہے فرمایا کہ یہ کتاب الٰہی کا فیصلہ ہے۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ قرآن میں کہا ہے فرمایا ان الذین اتخذوا العجل سینالھم الخ لوگوں نے کہا کہ یہ تو گوسالہ پرستوں کے بارے میں ہے فرمایا آگے پڑھو وکذالک نجزی المفترین یہ قیامت تک کے لیے ہر مبتدع کے بارے میں ہے۔ مبتدع بھی اس حیثیت سے مفتری ہوتا ہے کہ دین میں ایک بات دین کے نام سے پیش کرتا ہے

[لہ] حضرت ہارون کی نسبت اس قسم کی جو باتیں مرتبین تورات نے اضافہ کی ہیں۔ ان کی تردید ہم اس سے پہلے کر چکے ہیں اور بتا چکے ہیں کہ یہودی اخلاق کا انتہائی انحطاط کا نمونہ ہے۔

حالانکہ نبوت کی جانب سے اس کی کوئی علمی اور عملی رہنمائی نہیں ہوتی ہے۔

گناہوں سے توبہ کا قانون

۱۹۲- ہاں جن لوگوں نے برائیوں کے ارتکاب کے بعد توبہ کرلی اور ایمان لے آئے تو بلاشبہ تمہارا پروردگار توبہ کے بعد بخشش دینے والا اور رحمت والا ہے۔ یعنی برا کام حتیٰ کہ شرک و کفر کرکے پھر توبہ کرلے اور ایمان لے آئے تو غفور رحیم کے یہاں رحمت اور معافی کی کچھ کمی نہیں۔ یہ معافی وغیرہ آخرت سے متعلق ہے۔ گویا اشارہ فرمادیا کہ گوسالہ پرستوں کو جو سزائے قتل دی گئی وہ ان کے حق میں توبہ سمجھ لی گئی فتوبوا الی بارئکم فاقتلوا انفسکم اب ان پر اخروی مواخذہ باقی نہیں رہا۔ دنیوی سزا کے بعد اخروی حالت کا بیان اس جگہ ایسا ہی ہے جیسے دوسری جگہ السارق والسارقۃ فاقطعوا ایدیھما کے بعد فمن تاب من ظلمہ واصلح الخ فرمادیا گیا ہے[1]

عام شارحین قرآن نے اس آیت کی پہلی آیت سے پیوندکاری کی ہے اور مطلب یہی بتایا ہے کہ جن لوگوں نے بچھڑے کی پرستش کا ارتکاب کرکے شرک کا سنگین جرم کیا ہے انہوں نے اس کے بعد اگر توبہ کرلی اور ایمان لے آئے تو اللہ بخشنہار ہے لیکن اس پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے یہ جرم کیا ہے ان کو تو قتل کی سزا مل چکی ہے۔ ان کی توبہ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

حضرت مولانا عثمانی اس کا جواب یہ دے رہے ہیں کہ گوسالہ پرستوں کو جو سزائے قتل دی گئی وہ ان کے حق میں شرط قبول توبہ سمجھی گئی اب ان پر آخرت میں کوئی مواخذہ نہیں ہے لیکن ہمیں حافظ ابن کثیر کی رائے سے اتفاق ہے کہ اس میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم مخاطب ہیں۔ پہلی آیت کے آخر میں چونکہ قیامت تک کے لیے یہ ضابطہ بنایا گیا تھا وکذالک نجزی المفترین اس لیے اس آیت میں اسی قانون عام کی وضاحت کی گئی ہے کہ ضابطہ تو یہی ہے کہ افترا کرنے والوں کو ہم سزا دیں گے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی قانون ہے کہ جو لوگ سیئات کا ارتکاب کریں خواہ ان کی نوعیت کچھ بھی ہو اور پھر اس کے بعد توبہ کرلیں

[1] افادات شیخ الاسلام

اور اپنی زندگی میں ایمان کے تقاضے پورے کریں تو اللہ کی مغفرت و رحمت ان کا استقبال کرنے کو تیار ہے
دراصل انسان کے تمام کاروبار میں اصل چیز اس کا دل ہے۔ انسان اسی سے پاک ہوتا ہے۔ اور اسی سے ناپاک۔ انسان کا دل اگر خلوص کے ساتھ کسی وقت خدا کی طرف رجوع کرے اور اپنی تقصیروں اور فروگزاشتوں پر اس کی بارگاہ میں نادم و شرمسار ہو کر اپنی پچھلی زندگی سے بیزار ہو کر آئندہ کے لیے نیکوکاری کا خدا سے مستحکم عہد کرے اسی کا نام توبہ ہے۔ یہ تو گنہگار سے گنہگار تر انسان کو بھی خدا کی آغوشِ محبت میں لا کر ڈال دیتے ہیں۔

یہاں افتراء علی اللہ کرنے والوں کے لیے قانونِ عام کا ذکر کرنے کے بعد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی الرحمۃ اور نبی التوبہ ہونے کی حیثیت میں یہ دوسرا قانون بتایا جا رہا ہے کہ کرنے والا خواہ کتنی سنگین برائی کا ارتکاب کرے لیکن اس کے بعد اگر توبہ کرے اور توبہ کے ساتھ آئندہ زندگی ایمان کے تقاضوں کے تحت گزارے تو اللہ سبحانہ اس کے گناہ کو معاف کر دے گا۔ اس طرح یہ گویا درمیان میں عفوِ عام کے قانون کو بیان کرنے کے بعد جملہ معترضہ لایا گیا ہے۔ جن لوگوں نے اس کو پہلے جملہ کے ساتھ مربوط کیا ہے ان کو بڑی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا ہے۔

تورات ہدایت و رحمت ہے

۱۹۳ ۔ اور جب موسیٰ کا غصہ فرو ہوا تو اس نے تختیاں اٹھالیں ان کی لکھائی میں ان لوگوں کے لیے ہدایت و رحمت ہے جو اللہ سے ڈرتے ہیں۔ یعنی جب موسیٰ خاموش ہوئے اور ان کا غصہ دور ہوا تو انہوں نے وہ تختیاں جو ایک طرف رکھ دی تھیں پھر اٹھالیں۔ یہاں اخذ الالواح کی تعبیر ہے۔ اس افسانہ کی تردید ہو رہی ہے جو مرتبینِ تورات نے لکھا ہے کہ:

> تب موسیٰ کا غضب بھڑکا اور اس نے ان لوحوں کو اپنے ہاتھوں سے پٹک دیا اور ان کو پہاڑ کے نیچے توڑ ڈالا۔ (خروج باب ۳۲، آیت ۱۹)

اور ان شارحینِ قرآن کی بھی یہ الفاظ بھرپور تردید کر رہے ہیں جو کہتے ہیں۔ سات تختیاں تھیں جب آپ نے انہیں غصہ سے رکھا تو وہ ٹوٹ گئیں۔ چھ تختیاں جن میں احکام کی تفصیل تھی اٹھالی گئیں اور ایک تختی جس میں موعظت و ہدایت تھی باقی رہ گئی۔

قرآن عزیز کی یہ تصریح دونوں کے علی الرغم کہہ رہی ہے کہ حضرت موسیٰ نے جو چیز پھینکی تھی جیسے وہ پھینکنے کے وقت الواح تھیں ایسے ہی اٹھانے کے وقت بھی وہ الواح ہی تھیں۔

ان میں کوئی بھی نہ ٹوٹی تھی اور نہ ان میں سے کوئی آسمان پر اٹھائی گئی تھی۔ اصل تورات چونکہ ان الواح ہی کی نقل تھی اس لیے تورات کو ان کے نسخہ سے تعبیر فرمایا ہے۔ ارشاد ہوا کہ اس میں ہدایت اور رحمت ہے۔ یہ بعینہٖ وہ بات ہے جو قرآن کے بارے میں فرمائی گئی ہے یعنی دُنیا کی زندگی میں یہ ہدایت ہے اور آخرت میں یہ رحمت ہے یا یوں کہہ دیجئے کہ آغاز میں ہدایت اور انجام میں رحمت ہے۔

وَاخْتَارَ مُوسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا ۚ فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ
الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ ۭ اَتُهْلِكُنَا
بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ۭ تُضِلُّ بِهَا مَنْ
تَشَآءُ وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ ۭ اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ
خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ ۞ وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي
الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ ۭ قَالَ عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَ
رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۭ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ
الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۞

اور موسیٰ نے ہمارے ٹھہرائے ہوئے وقت پر حاضری کے لیے
اپنی قوم میں سے ستر آدمی چنے۔[194] پھر جب لرزا دینے والی ہولناکی
نے انہیں آلیا،[195] تو موسیٰ نے عرض کیا پروردگار اگر تو چاہتا تو ان
سب کو پہلے ہی ہلاک کر ڈالتا اور خود میری زندگی بھی ختم کر دیتا

پھر کیا ایک ایسی بات کے لیے جو ہم میں چند بے وقوف کر بیٹھے ہیں تو ہم سب کو ہلاک کر ڈالے گا یہ اس کے سوا کیا ہے کہ تیری طرف سے ایک آزمائش ہے تو جسے چاہیے اس میں بھٹکا دے جسے چاہے راہ دکھا دے خدایا تو ہی ہمارا کارساز ہے ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم کر تجھ سے بہتر بخشنے والا کوئی نہیں[۱۹۶]۔ اور خدایا اس دُنیا کی زندگی میں بھی ہمارے لیے اچھائی لکھ دے اور آخرت کی زندگی میں ہمارے لیے اچھائی کر ہم تیری طرف لوٹ آتے[۱۹۷]۔ خدا نے فرمایا میرے عذاب کا حال یہ ہے کہ جسے چاہتا ہوں دیتا ہوں اور رحمت کا حال یہ ہے کہ ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے پس میں ان لوگوں کے لیے ضرور رحمت لکھوں گا جو بُرائیوں سے بچیں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور ان کے لیے جو میری نشانیوں پر ایمان لائیں گے[۱۹۸]۔

معانی مفردات

اختار، منتخب کیا اختیار کیا ماضی ہے اور اختیار خیر سے افتعال ہے۔ اصل میں اختار موسیٰ من قومہ سبعین رجلاً تھا۔ حرف من کو یہاں یہ بتانے کیلئے حذف کیا کہ ساری قوم میں خیار یہی تھے یہ بات نہیں کہ اچھے اور بہتر اور بھی تھے اور یہ ستر اچھوں میں سے منتخب ہوتے تھے۔ رجفۃ کپکپی، زلزلہ رجف یرجف سے اسم ہے یوم ترجف الراجفہ۔ فتنتک، فعلہ کے وزن پر ہے۔ فتن یفتن سے ہے اس کے اصلی معنے ہونے کو کٹھالی میں ڈال کر تپا کر کھوٹ نکالنے کے ہیں۔ اسی سے اس کے معنے آزمائش اور امتحان کے ہو گئے ہیں۔ عذابی، عذاب، سخت، سزا، دکھ کی مار۔ علامہ فیومی المصباح المنیر میں لکھتے ہیں کہ " عذاب تعذب سے سے اسم ہے۔ اصل میں عربی زبان میں اس کے معنے مارنے کے ہیں۔ بعد میں ہر دردناک سزا کے لیے استعمال کیا جانے لگا اور استعارہ کے طور پر امور شاقہ کو بھی عذاب کہنے لگے چنانچہ محاورہ ہے السفر قطعۃ من العذاب " اور امام راغب رقمطراز ہیں۔ عذاب کے معنے سخت دکھ کے ہیں اور اس میں اختلاف ہے کہ اس کی اصل کیا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ عذب الرجل فہو عاذب و عذوب سے بنا ہے جس کا استعمال کھانا اور سونا چھوڑ دینے کے لیے ہوتا ہے لہٰذا تعذب کے معنے اصل میں یہ ہوتے کہ انسان کو بھوکا رہنے اور جاگنے پر مجبور کیا جائے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس کی اصل عذب شیرینی اور گوارائی ہے لہٰذا عذبتہ کے معنے یہیں ہیں نے اس کی زندگی کی شیرینی اور گوارائی کو زائل کر دیا۔ اس میں سلب ماخذ ہے اور بعض کہتے ہیں کہ تعذب کے اصل معنے کثرت سے عذبۃ لسوط یعنی کوڑے کے پھندے سے مارنے کے ہیں اور کچھ اہل لغت کا بیان ہے کہ تعذب کے معنے خود مارنے کے ہیں اور کچھ کہتے ہیں کہ ماء عذب سے بنا ہے ماء عذب اس پانی کو کہتے ہیں کہ جس میں کوڑا کرکٹ ہو۔ اس صورت میں عذبتہ کے معنے ہوں گے میں نے اس کی زندگی مکدر کر دی۔ اور علامہ سید مرتضیٰ زبیدی تاج العروس میں فرماتے ہیں۔ ہمارے شیخ ابوالطیب فاسی اہل اشتقاق سے ناقل ہیں کہ عذاب کلام عرب میں عذاب سے ماخوذ ہے جس کے معنے روکنے کے ہیں عذبتہ عنہ، کے معنے ہیں میں نے اس کو اس سے روک دیا اور عذب عذوباً کے معنے ہیں وہ رک گیا اور آب شیریں کو عذب اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ پیاس کو روک دیتا ہے اور عذاب کو بھی عذاب اس لیے کہا جاتا ہے کہ سزا یافتہ کو دوبارہ اس قسم کے جرم کا ارتکاب کرنے سے روک دیتا ہے اور نہ صرف یہ بلکہ اور دوں

کو بھی اس کے کرنے سے باز رکھتا ہے۔ علامہ زبیدی نے یہ نقل کر کے لکھا ہے وھو کلام حسن یہ عمدہ بات ہے۔

توبہ کے لیے کوہ طور پر حاضری

جب بنی اسرائیل کا گوسالہ پرستی کا جرم معاف ہو گیا اب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا کہ میرے پاس جو یہ تورات کی تختیاں ہیں۔ ایک کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمہاری ہدایت اور دینی دنیوی زندگی کی فلاح کے لیے مجھ کو عطا فرمائی ہے۔ تمہارا فرض ہے کہ اس پر ایمان لاؤ اور اس کے احکام پر عمل کرو۔ بنی اسرائیل شک کے ایسے مریض تھے کہ انہیں کسی طرح یہ یقین ہی نہیں آتا تھا کہ فی الواقع اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام سے کلام بھی کرتا ہے۔ اس وجہ سے جب موسیٰ علیہ السلام ان سے کہتے کہ خداوند تمہیں یہ حکم دیتا ہے تو وہ کہتے کہ خدا جب آپ سے کلام کرتا ہے تو وہ ہم سے بھی کلام کرے اور ہم اس کو آنکھوں سے دیکھیں۔ اس کے بغیر ہم تمہاری بات کو درست کیسے تسلیم کریں۔

جہاں تک اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی خواہش کا تعلق ہے۔ یہ خواہش کوئی قابل ملامت خواہش نہیں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی یہ خواہش کی تھی لیکن بڑا فرق ہے اس بات میں کہ یہ خواہش شرح صدر اور اطمینان قلب حاصل کرنے کے لیے ہو۔ اور اس بات میں کہ اس کو انکار اور تکذیب کا بہانہ بنایا جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ خواہش اسی طرح کی تھی جس طرح حضرت ابراہیم نے یہ دیکھنا چاہا تھا کہ اللہ تعالیٰ مردوں کو کس طرح زندہ کرتا ہے تاکہ آخرت کے باب میں انہیں پورا پورا شرح صدر حاصل ہو جاتے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو ملامت نہیں فرمائی بلکہ صرف یہ فرمایا کہ تم ان ناسوتی آنکھوں سے میری ذات کو نہیں دیکھ سکتے صرف میری صفات کو ہی دیکھ سکتے ہو۔ اس کے برعکس بنی اسرائیل کا مطالبہ محض ان کی بے یقینی اور شک پرستانہ ذہنیت کا ایک مظاہرہ تھا اور یہ مظاہرہ وہ اللہ تعالیٰ کی کھلی کھلی نشانیاں دیکھنے کے باوجود قدم قدم پر کرتے رہتے تھے۔ راجح یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ میقات اس میقات کے علاوہ ہے جو یہ حضرت موسیٰ کے دوبارہ کوہ طور پر جانے کا ذکر ہے جب وہ گوسالہ پرستی کے بعد کوہ طور پر گئے ہیں۔ تورات کے راویوں نے اس واقعہ کو پہلے واقعہ میں خلط ملط کر دیا ہے اس وجہ سے معاملہ کچھ الجھ سا گیا ہے۔

قرآن نے ان دونوں واقعات کو الگ الگ بیان کر دیا ہے کیونکہ یہ واقعہ بجائے خود بنی اسرائیل کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھنے والا ہے اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے خاص وقت مقرر فرمایا۔

۱۹۴۔ اور موسیٰ نے ہمارے ٹھہراتے ہوتے وقت پر حاضری کے لیے اپنی قوم میں ستر آدمی چنے۔ راجح یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ میقات اس میقات کے علاوہ ہے جو موسیٰ علیہ السلام کو تورات عطا فرمانے کے لیے مقرر کیا تھا۔ نیز آیاتِ حاضرہ کی ترتیب سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ گوسالہ پرستی اور سزایابی کے بعد پیش آیا لیکن سورہ نساء کی آیت فقالوا ارنا اللہ جھرۃ فاخذتھم الصاعقۃ ثم اتخذوا العجل زیادہ صفائی سے بتلاتی ہے کہ گوسالہ پرستی اس واقعہ کے بعد ہوتی واللہ اعلم بالصواب [1]

یہ مولانا عثمانی کی رائے ہے بیشتر شارحینِ قرآن یہی کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل کی جانب سے خدا کو دیکھنے کا مطالبہ گوسالہ پرستی کے حادثہ کے بعد ہوا ہے۔ سورہ نساء میں واقعات کی ترتیب نہیں صرف تعدید ہے اور سورہ بقرہ میں ترتیب اور تعدید دونوں ہیں۔ سورہ نساء کی آیت ثم اتخذوا العجل میں ثم ترتیبِ زمانی کے لیے نہیں بلکہ مرتبہ و مقام کو ظاہر کرنے کے لیے ہے یعنی ادنیٰ سے اعلیٰ کو بتانا مقصود ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بے محابا اللہ کے دیکھنے کی درخواست اگرچہ جرم عظیم ہے مگر اس سے بڑھ کر جرم یہ ہے کہ انھوں نے گوسالہ پرستی کی۔ یہ اس درجہ شنیع ہے کہ جس کی کوئی حد نہیں ہے کیونکہ اپنے ہاتھوں سے بنا کر معبود بنا لینا عقل کا انتہائی بودا پن اور بیوقوفی ہے۔

دراصل گوسالہ پرستی کے حادثہ سے توبہ کرانے کے لیے حضرت موسیٰ نے ستر آدمی منتخب فرمائے تاکہ جس نوعیت کا اجتماعی جرم ہوا اسی نوعیت کی اجتماعی توبہ بھی ہو۔ نیز جو کچھ پیش آئے وہ قوم کے تمام ممتاز آدمیوں کے سامنے پیش آئے کہ وہ قوم کے سامنے اس کی گواہی دیں اس حیثیت سے یہ میقات توبہ و معذرت ہے جب یہ لوگ کوہِ طور پر پہنچے تو ایک ابر نمودار ہوا جس نے سارے پہاڑ کو ڈھانک دیا۔ سب سے پہلے اس ابر میں موسیٰ علیہ السلام داخل ہوئے اور قوم سے کہا کہ قریب آ جاؤ۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے کلام اور پیغام سے ان کو خبردار کیا تو کہنے لگے اے موسیٰ ہم کو تو یقین نہیں آتا کہ واقع میں اللہ سبحانہٗ تم سے باتیں کر رہا ہے۔ ہم اس وقت تک تیرا یقین نہ کریں

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

گے جب تک اللہ کو کھلم کھلا نہ دیکھ لیں کہ اللہ ہی تم سے باتیں کر رہا ہے۔ اس کہنے پر ان پر ایک بجلی گری جس سے سب مر گئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ دیکھا کہ یہ عذابِ الٰہی میں پکڑے گئے تو نہایت عاجزی سے ان کی رہائی کی دُعا کی اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو دوبارہ زندگی دی۔ خلاصہ کلام یہ کہ یہ میقات اس میقات کے علاوہ ہے جو من جانب اللہ عطاء تورات کے لیے مقرر ہوئی تھی۔ اور یہاں آیاتِ قرآنی ترتیب سے بھی پتہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ گوسالہ پرستی کے بعد پیش آیا۔ اور یہ میقات گوسالہ پرستی سے معذرت کے لیے مقرر ہوا اس لیے اللہ تعالیٰ نے اولاً میقات کلام کا ذکر فرمایا بعدازیں واقعہ اتخاذ عجل کا تذکرہ۔ اس کے بعد یہ واقعہ میقات پیش کیا۔ اسی ترتیب کے ساتھ یہ واقعہ قرآن کی دوسری سُورتوں میں بھی موجود ہے چونکہ یہ میقات عبادت عجل سے معذرت کے لیے مقرر ہوا اس لیے مناسب یہی ہے کہ اس میقات کو میقات التوبہ والمعذرت کہا جاتے اور پہلی میقات کو میقاتِ کلام و مناجات کہا جاتے۔ اس طرح دونوں میں فرق واضح ہو کر سامنے آجاتا ہے۔

رجفہ اور صاعقہ کی تعبیر

۱۹۵۔ پھر جب لرزا دینے والی ہولناکی نے انہیں آلیا۔ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ تمہاری باتیں اس وقت تسلیم کر سکتے ہیں جب خدا تعالیٰ سے خود سُن لیں۔ حضرت موسیٰ ان میں ستر آدمیوں کو جو سردار تھے منتخب کر کے طور پر لے گئے۔ آخر انہوں نے حق تعالیٰ کا کلام سُن لیا کہنے لگے کہ جب تک خدا کو ہم اپنی آنکھوں سے بے حجاب نہ دیکھ لیں ہم کو یقین نہیں ہو سکتا۔ اس گستاخی پر سخت بھونچال آیا، اوپر سے بجلی کڑکی آخر کانپ کر مر گئے یا مردوں کی سی حالت کو پہنچ گئے[1] یہاں قرآن نے جسے رجفہ کہا ہے اسی کو دوسرے مواقع پر قرآن نے صاعقہ کہا ہے۔ رجفہ کے معنے کپکپی، زلزلہ کے ہیں اور صاعقہ بجلی کی کڑک کو کہتے ہیں زلزلہ بھی آیا اور بجلی بھی کڑکی۔ اس صاعقہ اور رجفہ سے ان ستر آدمیوں پر جو اس موقع پر حضرت موسیٰ کے ساتھ طور پر گئے تھے جو حالت طاری ہوئی قرآن نے البقرہ میں اسے موت سے تعبیر کیا ہے۔ اس موت سے موت بھی مراد ہو سکتی ہے اور بطور استعارہ بے ہوشی بھی

[1] افادات شیخ الاسلام

عربی زبان میں موت کا لفظ استعارہ کے طور پر نیند اور بے ہوشی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ سو کر اٹھنے کے بعد جو دعا احادیث میں آئی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں :

الحمد للہ الذی احیانا بعد ما اماتنا والیہ النشور

اگرچہ بنی اسرائیل اپنی سرکشی کی وجہ سے اسی کے لائق ہے کہ ان کو دوبارہ اٹھنا نصیب نہ ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ اپنے خاص فضل سے ان کو مزید مہلت بخشی اور حضرت موسیٰ نے بھی ان کے لیے بڑی دلسوزی سے دعا کی جو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی ۔

حضرت موسیٰ کی دعا

۱۹۶۔ تو موسیٰ نے عرض کیا پروردگار اگر تو چاہتا تو ان سب کو پہلے ہی ہلاک کر دیتا اور خود میری زندگی بھی ختم کر دیتا۔ پھر کیا ایک ایسی بات کے لیے جو ہم میں چند بے وقوف کر بیٹھے ہیں تو ہم سب کو ہلاک کر ڈالے گا یہ اس کے سوا کیا ہے کہ تیری طرف سے ایک آزمائش ہے تو جسے چاہے اس میں بھٹکا دے جسے چاہے راہ دکھا دے خدایا تو ہی ہمارا کارساز ہے تو ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم کر تجھ سے بہتر بخشنے والا کوئی نہیں۔ حضرت موسیٰ نے اپنے رب کو ان سے نہایت مؤثر انداز میں دعا کی جس کا حاصل یہ تھا کہ خداوندا اگر تو ہلاک ہی کرنا چاہتا تو ان سب کو بلکہ ان کے ساتھ مجھ کو بھی کہ میں ہی ان کو لے کر آیا ہوں یہاں بلانے اور کلام سنانے سے پہلے ہی ہلاک کر دیتا۔ کس کی مجال تھی کہ آپ کی مشیت کو روک سکتا۔ جب آپ نے ایسا نہیں چاہا بلکہ مجھے لانے کی اور ان کو کلام سننے کے لیے یہاں آنے کی اجازت دی تو یہ کیسے گمان کیا جا سکتا ہے کہ آپ نے یہاں بلا کر محض بعض بے وقوفوں کی حماقت کی سزا میں ہم سب کو ہلاک کر دینا چاہا ہیں۔ یقیناً یہ رجفہ اور صاعقہ کا منظر سب آپ کی طرف سے ہماری آزمائش و امتحان ہے۔ اس قسم کے خطرناک اور لرزا دینے والے اقدام مواقع میں آپ ہی ہمارے تھامنے والے اور دستگیری کرنے والے ہیں۔ اور صرف آپ کی ذات منبع الخیرات سے یہ امید ہو سکتی ہے کہ ہم سب کی گزشتہ تقصیرات اور بے اعتدالیوں سے درگزر فرمائیں۔ اور آئندہ اپنی رحمت سے ایسی خطاؤں اور غلطیوں کا شکار نہ ہونے دیں۔ حضرت موسیٰ کی دعا پر وہ لوگ بخشے گئے اور خدا نے ان کو از سر نو زندگی مرحمت فرمائی کما قال ثم بعثناکم من بعد موتکم [1]

[1] افادات شیخ الاسلام

یہ حضرت موسیٰ کی گریہ وزاری اور ان کی دُعا و فریاد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ جلال تیرے غضب کا مظہر ہے اور تو نے ان کو اور مجھے ہلاک کرنے کا فیصلہ فرمالیا ہے تو یہ کام اگر تو چاہتا تو اس سے پہلے ہی کر لیتا لیکن اب جبکہ تو نے ہمیں باریابی کا موقع عنایت فرمایا اور ہم یہاں حاضر ہو بھی گئے تو یہ تیری رحمت سے بعید ہے کہ تو ہمیں ہلاک کر دے۔ حافظ ابن القیم نے اغاثۃ اللهفان میں لکھا ہے کہ یہ حضرت موسیٰ کی جانب سے اللہ کی جناب میں درخواست ہے اور ماضی کے عفو عام کو وسیلہ بنا کر اللہ سے دُعا فرماتے ہیں کہ ان کا ماضی ایسے سنگین گناہوں کا پشتارہ رکھتا ہے جو ان کی ہلاکت کا مقتضی ہے۔ اس کے باوجود آپ کے عفو و مغفرت نے اب تک ان کو اپنے آغوش میں رکھا ہے اور اپنے گناہوں کی سنگینی کے باوجود ان کو ہلاک نہیں فرمایا۔ آج بھی آپ سے اسی عفو و مغفرت کی اُمید ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی آقا اپنے نوکر پر کسی جُرم کی بنا پر مواخذہ کرے اور نوکر آقا سے کہے قبلہ مجھ سے اس سے پہلے سنگین جرائم ہو چکے ہیں اگر آپ چاہتے تو پہلے بھی مواخذہ فرمالیتے لیکن جیسے پہلے آپ معاف کر چکے ہیں آج بھی معاف فرما دیجئے۔ اس کے بعد فرمایا اتھلکنا بما فعل السفھاء منا، سفہا سے کون مراد ہیں۔ حضرت موسیٰ سے خدا کی دید کا مطالبہ کرنے والے، یا گوسالہ پرستی کرنے والے۔ اگر آخرالذکر مراد ہیں تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے عقلاء نے گوسالہ پرستی نہیں کی بلکہ ان کے بیوقوف طبقہ نے کی اور ان کی اکثریت تھی۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کو دیکھنے کا مطالبہ یا گوسالہ پرستی کا جُرم بیوقوفوں نے کیا ہے۔ کہیں یہ تھوڑا ہو سکتا کہ اس کی پاداش میں ہم سب کو ہلاک کر دیا جائے۔ یہ آپ کی رحمت سے بعید ہے کہ نادانوں کے جُرم کی پاداش میں سب کو ہلاک کر دیں۔ یہ استفہام استعظام ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ آپ اب ایسا تو ہرگز نہ کریں گے۔ مبرد اور ابن الانباری نے یہاں بھی نکتہ آفرینی فرمائی ہے۔ اس کے بعد فرمایا ان ھی الا فتنتك مطلب یہ ہے کہ ہر آزمائش کا موقعہ انسانوں کے درمیان فیصلہ کن ہوتا ہے۔ وہ چھاج کی طرح ایک مخلوط گروہ میں سے کارآمد آدمیوں اور ناکارہ آدمیوں کو پٹک کر الگ کر دیتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی عین حکمت کا تقاضا ہے کہ ایسے مواقع وقتاً فوقتاً آتے ہیں۔ ان مواقع پر جو کامیابی کی راہ پاتا ہے وہ اللہ کی توفیق اور رہنمائی سے پاتا ہے اور جو ناکام ہوتا ہے وہ اس کی توفیق و رہنمائی سے محروم ہونے کے باعث ہی ناکام ہوتا ہے۔ اگرچہ اللہ کی جانب سے توفیق و رہنمائی ملنے اور نہ ملنے کے لیے بھی ایک ضابطہ ہے جو سراسر حکمت اور عدل پر مبنی ہے۔ لیکن بہر حال یہ حقیقت اپنی جگہ ثابت ہے کہ آدمی کا آزمائش کے مواقع پر کامیابی کی راہ پانا نہ پانا اللہ کی توفیق و ہدایت پر منحصر ہے۔

اس فقرے کا مطلب یہ ہے کہ یہ تو تیری ایک آزمائش تھی اور تیری آزمائش سے عہدہ برآ تو وہ ہوتا ہے جس کو تیری توفیق معین و مددگار ہو۔ جن کو توفیق عطا کرتا ہے امتحان میں کامیابی ان کا ہی حصہ ہے اور جن کو تو توفیق سے محروم کر دیتا ہے ناکامی ان کا ہی مقدر ہے۔ گویا حضرت موسیٰ نے نہایت ادب کے ساتھ اور نہایت لطیف انداز میں معاملے کی نزاکت کی طرف اشارہ کر دیا کہ تیرے امتحان میں پورا اترنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ تیرے ہی فضل پر موقوف ہے۔

حضرت موسیٰ کی دعا کا تتمہ

۱۹۷۔ اور فرمایا اس دنیا کی زندگی میں بھی ہمارے لیے اچھائی لکھ دے اور آخرت کی زندگی میں ہمارے لیے اچھائی کر، ہم تیری طرف لوٹ آتے۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں شاید حضرت موسیٰ نے اپنی امت کے حق میں دنیا و آخرت کی جو بھلائی مانگی مراد یہ تھی کہ سب امتوں پر مقدم اور فائق رہیں دنیا و آخرت میں۔ [1]

یہ موسیٰ علیہ السلام کی دعا کا تتمہ ہے اصل دعا دفع مضرت اور دفع مصیبت کے لیے تھی اور یہ تتمہ تحصیل منفعت کے لیے ہے جس میں دنیا و آخرت کی بھلائی کا ذکر ہے اکتب لنا کے معنے یہ نہیں کہ قید کتابت میں لے آیا ہمارے لیے تحریر کر دے بلکہ یہ ہیں کہ ہمارے حق میں لازم و مقرر کر دے۔ محاورہ عرب میں کتابتہ کے یہ معنے عام ہیں۔ امام راغب لکھتے ہیں کہ کتابت بول کر اثبات، تقدیر، ایجاب اور فرض مراد لیا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں بھی ہمارے لیے بھلائی لازم کر دے اور آخرت میں بھی۔ آخرت کے ساتھ لفظ حسنہ حذف کر دیا کیونکہ پہلا حسنہ خود دلیل ہے آخر میں فرمایا انا ھدنا الیک ہم تیری طرف لوٹ آتے اور ہم نے توبہ کر لی ہے ھادیھود ھودا کے معنے رجوع کرنے اور توبہ کرنے کے ہیں۔ پھر ھاد اور تھود یہودی ہونے کے معنے میں استعمال ہوتے اور یہ استعمال عربی زبان کے عام قاعدے کے مطابق ہے جس طرح تنصر نصرانی ہونے کے معنے میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے بیوقوفوں سے جو بچھڑے کی عبادت کی اور ہمارے اچھے لوگوں کی جانب سے ان کے اس کردار پر گرفت نہ کرنے کی یا دیدار الٰہی کا مطالبہ کرنے کی جو کوتاہی ہوئی ہے اس سے ہم باز آگئے اور آپ کی جانب طلب مغفرت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کے لیے لوٹ آتے ہیں لہٰذا اب ہمیں معاف فرما دیجئے اور ہمارے لیے دُنیا و آخرت کی سعادتوں کے دروازے کھول دیجئے۔ حضرت موسیٰ کی اس دُعا کا اللہ سبحانہٗ نے کیا جواب دیا؟

حضرت موسیٰ کی دُعا کا جواب

۱۹۸- خدا نے فرمایا میرے عذاب کا حال یہ ہے کہ جسے چاہتا ہوں دیتا ہوں اور رحمت کا حال یہ ہے کہ ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے لہٰذا میں ان لوگوں کے لیے رحمت ضرور لکھوں گا جو برائیوں سے بچیں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور جو میری آیات پر ایمان لائیں گے۔ جواباً خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ میرا عذاب اور رحمت کسی فرقہ کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ عذاب تو اسی پر ہے جس کو اللہ چاہے اور رحمت عامہ سب مخلوق کو شامل ہے لیکن وہ رحمت جو تم طلب کر رہے ہو ان کے حصہ میں آئے گی جو اللہ کا ڈر رکھتے ہیں اور اموال میں زکوٰۃ ادا کرتے ہیں یا نفس کا تزکیہ کرتے ہیں اور خدا کی ساری باتوں پر یقین کامل رکھتے ہیں یعنی آخری اُمت کہ سب کتابوں پر ایمان لاتے گی لہٰذا حضرت موسیٰ کی اُمت میں سے جو کوئی آخری کتاب پر یقین لائے وہ اس نعمت کا مستحق ہو اور حضرت موسیٰ کی دُعا کا مصداق ہو[1]

حضرت موسیٰ کی دُعا مطلق تھی اور قوم کے ساتھ ان کو جو محبت تھی اس کا تقاضا بھی تھا کہ وہ اسی تعمیم کے ساتھ قوم کے لیے دُنیا و آخرت دونوں کی بھلائی کی دُعائیں مانگیں۔ تورات میں بھی اس موقع کی دُعا اسی تعمیم کے ساتھ مذکور ہے۔ اس دُعا کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے اپنے عذاب و رحمت کا ضابطہ بیان فرما دیا۔ فرمایا کہ جہاں تک میرے عذاب کا تعلق ہے وہ تو میں انہی پر نازل کرتا ہوں جن پر چاہتا ہوں۔ خدا کا ہر چاہنا اس کی حکمت اور اس کے عدل کے تحت ہے اس لیے اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں اپنا عذاب صرف ان پر نازل کرتا ہوں جو میرے قانونِ عدل کے تحت اس کے سزاوار ٹھہرتے ہیں۔ رہی میری رحمت تو وہ اس دُنیا میں تو ہر چیز کو عام ہے جس کو بھی وجود کی نعمت ملی ہے میرے ہی فضل سے ملی ہے جس کو بھی رزق پہنچ رہا ہے میرے ہی خوانِ کرم سے پہنچ رہا ہے۔ امیر و غریب، شاہ و گدا اور کافر و مومن جس کے پاس جو کچھ بھی ہے سب میرا ہی عطا کردہ ہے لیکن وہ رحمت جو آخرت سے متعلق ہے اس کو میں ان لوگوں کے لیے خاص

---

[1] افادات شیخ الاسلام

رکھوں گا جو اس دنیا کی زندگی میں مجھ سے ڈرتے رہیں گے زکوٰۃ ادا کرتے رہیں گے اور خاص کر ان لوگوں کے لیے جو ہماری آیات پر ایمان لائیں گے۔

اُمتِ محمدیہ کے ظہور کی طرف اشارہ

دُعا کے جواب کے آخر میں والذین ھم بایٰتنا یومنون کہہ کر اُمتِ محمدیہ کے ظہور کی طرف لطیف اشارہ فرمایا ہے۔ خاص طور پر اسم موصول کے تکرار کے ساتھ ارشاد ہوا ہے والذین ھم بایٰتنا یومنون یعنی وہ لوگ جو ہماری آیات پر ایمان رکھتے ہیں یعنی ساری آیات پر ایمان رکھتے ہیں یہ نہیں کہ کچھ کو مانتے ہیں اور کچھ کو نہیں مانتے۔ عیسائی اور یہودی خدا کی تمام آیات کو نہیں مانتے، اُمتِ محمدیہ اللہ کی تمام آیات کو مانتی ہے بایٰتنا کی تقدیم قصر کا فائدہ دے رہی ہے۔ یہود تورات کے سوا کچھ نہیں مانتے۔ عیسائی تورات کے احکام نہیں مانتے۔ لیکن اس کی اخلاقی نصیحتوں کو قبول کرتے ہیں۔ لیکن قرآن پر ایمان لانے والا مجبور ہے کہ صحیفہ ابراہیم، تورات، زبور اور انجیل کو خدا کی کتابیں تعلیم کرے اور دوسری اگلی آسمانی کتابوں کی جن میں آسمانی تعلیمات کی خصوصیتیں پائی جاتی ہوں تکذیب نہ کرے۔

یہ بات سب آسمانی کتابوں کو مانا جانتے۔ اُمتِ محمدیہ کی ان خصوصیات میں سے ہے جس کا وجود کسی دوسری اُمت میں نہیں ہے۔ یہ رواداری بے تعصبی اور عام انسانی اخوت کی سب سے بڑی تعلیم ہے۔ یہودی اپنی کتاب کے سوا دوسری تمام آسمانی کتابوں کا انکار کر کے بھی نجات کا منتظر رہ سکتا ہے عیسائی تورات اور تمام دوسرے صحیفوں کا انکار کر کے بھی آسمانی بادشاہوں کا متوقع ہو سکتا ہے۔ پارسی اوستا کے سوا دوسری ربانی کتابوں کو باطل مان کر بھی جنت کا استحقاق پیدا کر سکتا ہے ہندو اپنے ویدوں کے سوا دُنیا کی ہر آسمانی کتاب کو دجل و فریب مان کر بھی اواگون سے نجات حاصل کر سکتا ہے مگر مسلمان جب تک قرآن کے ساتھ تمام آسمانی کتابوں کو من جانب اللہ تسلیم نہ کرے جنت کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ اسی بنا پر عبدالقادر نے یہاں یہ نکتہ آفرینی فرمائی ہے -

لیکن وہ رحمت خاص لکھی ہے ان کے نصیب میں ہے جو اللہ کی ساری باتیں یقین کریں گے یعنی آخری اُمت کہ سب کتابوں پر ایمان لاویں گے۔ سو حضرت موسیٰ کی اُمت میں سے جو کوئی آخری کتاب پر یقین لاتے وہ پہنچے اس نعمت کو اور حضرت موسیٰ دُعا ان کو لگی۔ (موضح القرآن)

الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ
مَكْتُوبًا عِندَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ
وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ
الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۚ
فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنزِلَ
مَعَهُ ۙ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿۱۵۷﴾ قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ
اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ لَا إِلَٰهَ إِلَّا
هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ ۖ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِي
يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿۱۵۸﴾

جو الرسول کی پیروی کریں گے کہ نبی اُمی ہوگا[۱۹۹] - اور اس کے
ظہور کی خبر اپنے یہاں تورات و انجیل میں لکھی پائیں گے[۲۰۰] -
وہ انہیں نیکی کا حکم دے گا برائی سے روکے گا[۲۰۱]، پسندیدہ چیزیں

حلال کرے گا گندی چیزیں حرام ٹھہرائے گا اس بوجھ سے نجات
دلائے گا جس کے تلے دبے ہوئے ہیں ان پھندوں سے نکالے
گا جن میں گرفتار ہو گئے۔[۲۰۲] تو جو لوگ اس پر ایمان لائے، اس
کی حمایت کی اور اس کی مدد کی اور اس روشنی کے پیرو کار
ہو گئے جو اس کے ساتھ بھیجی گئی ہے بس یہی لوگ کامیاب
ہونے والے ہیں۔[۲۰۳] اے پیغمبر تم لوگوں سے کہہ دو اے افرادِ نسلِ
انسانی میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا آیا ہوں وہ خدا کہ
آسمانوں کی اور زمین کی ساری بادشاہت اسی کے لیے ہے کسی
کی بندگی نہیں مگر اسی کی ذات کی وہی جلاتا ہے وہی مارتا ہے
بس اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول نبی اُمّی پر کہ اللہ اور
اس پر کلمات پر ایمان رکھتا ہے اس کی پیروی کرو تا کہ کامیابی
کی راہ تم پر کھل جائے۔[۲۰۴]

معانی مفردات

الامی ، ام کی طرف اسم نسبت ہے ۔ مدرسی و کتابی تعلیم و تعلم سے ناآشنا کو اُمی کہتے ہیں ۔ اُمیین کا لفظ اسماعیلی عربوں کے لیے بطور لقب استعمال ہوا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ مدرسی اور رسمی تعلیم و کتابت سے ناآشنا اپنی بدویانہ سادگی پر قائم تھے اور اس طرح بنی اسرائیل کے مقابلے میں ان کو امیین کہا جاتا ہے ۔ اور کچھ کی رائے میں یہ اُم القریٰ کی طرف نسبت ہے ۔ یعنی مکہ مکرمہ کے رہنے والے ۔ پہلی رائے زیادہ وزنی ہے ۔ لفظ اُمی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہاں بطور مدح آیا ہے کیونکہ اُمی ہونے کے باوجود کمال علم آپ کا معجزہ ہے ۔ صاحب قصیدہ بردہ نے کیا اچھی بات فرمائی ہے کفاک بالعلم فی الامی معجزۃ ۔ الطیبات ، طیبہ کی جمع ہے ۔ ستھری چیزیں ، نفیس اشیاء ، پاک چیزیں ، پاکیزہ چیزیں ، عمدہ چیزیں ۔ علامہ خفاجی نے بیضاوی کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ طیب کے دو معنے ہیں ایک یہ کہ طبیعت کو اچھے لگے دوسرے یہ کہ قانون میں اچھی اور بھلی ہو ۔ اگر پہلے معنے ہوں تو اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ تمام چیزیں جو طبیعت سلیمہ کو اچھی لگیں وہ حلال ہیں اور اگر دوسرے معنے ہوں تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ اصل میں ہر چیز میں حرمت ہے ہاں جن کی قانون نے اجازت دی ہو وہ حلال ہے لیکن یہ ایک فضول سی بحث ہے کیونکہ حل و حرمت کا تعلق قانون و شریعت سے ہے نہ کہ طبیعت کے میلان اور عقل کی پسندیدگی

الخبائث ، خبیثہ کی جمع ہے گندے کام اور ناپاک چیزیں ، ہر وہ چیز جو گندی اور ردی ہونے کی وجہ سے بُری معلوم ہو خبیث کہلاتی ہے خواہ وہ محسوس ہو یا امر معقول ہو ۔ اس اعتبار سے اعتقاد باطل ، گفتگو تے دروغ ، افعال قبیحہ کو بھی خبیث کہتے ہیں ۔ یہاں خبیث شرعی مراد ہے ۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ

پہلی آیت میں والذین ھم بآیاتنا یومنون فرما کر ضمناً اس عہد و پیمان کی طرف اشارہ کیا تھا جو بنی اسرائیل سے آئندہ آنے والے پیغمبروں پر ایمان لانے کے بارے میں لیا گیا تھا ۔ میری مراد سورہ مائدہ کی یہ آیت ہے لئن اقمتم الصلوٰۃ و اٰتیتم الزکوٰۃ و اٰمنتم برسلی ۔ یہ عہد یوں تو ان تمام نبیوں پر مشتمل تھا جو حضرت موسیٰ کے بعد آتے لیکن اس میں خاص اشارہ اس نبی اُمی

کی طرف تھا جن کی تشریف آوری کی بشارت خود حضرت موسٰی نے ہی عہد و میثاق سے جس کی طرف والذین ھم بآیاتنا یومنون کے الفاظ میں اشارہ ہے یعنی اللہ سبحانہ، حضرت موسٰی کی دعا کے جواب میں یہ تصریح فرمادی تھی کہ میری رحمت کے سزاوار صرف وہ لوگ ٹھہریں گے جو میرے عہد پر قائم رہیں گے جن کو میرے آخری رسول کی بعثت نصیب ہوگی وہ اس پر ایمان لائیں گے اور اس کے رفیق و مددگار بنیں گے۔ جب بات یہاں تک پہنچی تو جو بات اب تک اشاروں میں سمجھائی جا رہی تھی اسی کی یہاں تفصیل بیان ہو رہی ہے۔

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ حضرت موسٰی کی دعا کا جواب والذین ھم بآیاتنا یومنون پر ختم ہو گیا ہے اس کے بعد اب موقع کی مناسبت سے فوراً بنی اسرائیل کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی دعوت دی گئی ہے۔ تقریر کا مدعا یہ ہے کہ تم پر خدا کی رحمت نازل ہونے کے جو شرائط موسٰی علیہ السلام کے زمانے میں عائد کی گئی تھیں کہ نماز قائم کرنا، زکوٰۃ دینا، رسولوں پر ایمان لانا اور ان کی حمایت کرنا وہی آج تک قائم ہیں اور در اصل یہ انہی شرائط کا تقاضا ہے جو خدا کی نافرمانی سے بچ کر رہیں تو آج سب سے بڑی بنیادی نافرمانی یہ ہے کہ جس پیغمبر کو خدا نے مامور کیا ہے اس کی رہنمائی تسلیم کرنے سے انکار کیا جاتے لہٰذا جب تک اس نافرمانی سے پرہیز نہ کرو گے تقویٰ کی جڑ ہی سرے سے قائم نہ ہو گی خواہ جزئیات و فروعات میں تم کتنے متقی بنو۔ تم سے کہا گیا تھا کہ رحمت الٰہی سے حصہ پانے کے لیے زکوٰۃ بھی ایک شرط ہے تو آج کسی انفاق مال پر اس وقت تک زکوٰۃ کی تعریف صادق نہیں آسکتی جب تک اقامت دینِ حق کی اس جدّ و جہد کا ساتھ نہ دیا جائے جو اس پیغمبر کی قیادت میں ہو رہی ہے لہٰذا جب تک اس راہ میں مال صرف نہ کیا جائے زکوٰۃ کی بنیاد ہی استوار نہ ہو گی۔ تم سے کہا گیا تھا کہ اللہ نے اپنی رحمت صرف ان لوگوں کے لیے لکھی ہے جو اللہ کی آیات پر ایمان لے آئیں تو آج جو آیات قرآن کی صورت میں اس پیغمبر پر نازل ہو رہی ہیں ان کا انکار کر کے تم کسی طرح بھی آیات الٰہی کے ماننے والے قرار پا نہیں سکتے لہٰذا جب تک ان پر ایمان نہ لاؤ گے یہ آخری شرط بھی پوری نہ ہو گی خواہ تورات پر ایمان رکھنے کا تم کتنا ہی دعویٰ کرو۔

۱۹۹ - جو الرسول کی پیروی کریں گے کہ نبی اُمی ہو گا۔ اُمی یا تو ام کی طرف منسوب ہے جس طرح بچہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے اور کسی کا شاگرد نہیں ہوتا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری عمر کسی مخلوق کے سامنے زانوئے تلمذ نہیں کیا۔ اس پر کمال یہ ہے کہ جن علوم و معارف اور حقائق و اسرار کا آپ نے افاضہ فرمایا کسی مخلوق کا حوصلہ نہیں کہ اس کا عشر عشیر بھی پیش کر سکے

بس نبی اُمی کا لقب اس حیثیت سے آپ کے لیے مایۂ صد افتخار ہے یا اُمی میں نسبت ام القریٰ کی طرف ہے جو مکہ معظمہ کا لقب ہے جو آپ کا مولد شریف تھا۔[1]

قرآن نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ پیش کرتے ہوئے حضور کے یہ اوصاف بتائے ہیں۔

۱۔ النبی ، ۲۔ الامی ، ۳۔ الذی یجدونہ مکتوبا عندھم فی التوراۃ والانجیل ۴۔ یامرھم بالمعروف ۔ ۵۔ وینھاھم عن المنکر ، ۶۔ ویحل لھم الطیبات ، ۷۔ ویحرم علیھم الخبائث ۔ ۸۔ ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم ۔ ۹۔ النور الذی انزل معہ ۔ ۱۰۔ انی رسول اللہ علیکم جمیعا ۔ تلک عشرۃ کاملۃ ۔

حضور اقدس کا وصف النبی " وہ نبی "

یہاں قرآن نے خاص طور پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ پیش کرتے ہوئے الرسول بعد النبی کیوں کہا ۔ یہ بات عام شارحین قرآن کی نظروں سے اوجھل ہو کر رہ گئی اور وہ دور دراز وادیوں میں نکل گئے ۔ قاضی بیضاوی فرماتے ہیں ۔

> آپ کو رسول اس لیے کہا کہ آپ اللہ کے احکام لے کر آتے اور نبی اس لیے کہا کہ آپ یہ پیغام بندوں تک پہنچاتے ہیں ۔

اسی طرح دوسرے شارحین رسول اور نبی کے بارے میں لغوی اور کلامی بحثوں میں چلے گئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہاں الرسول کے تعارف میں النبی صرف اس لیے کہا گیا ہے کہ اہل کتاب النبی کے عنوان سے آنے والے پیغمبر سے حضرت موسیٰ کے ذریعے متعارف تھے اور اس کے منتظر تھے ۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام جب ظاہر ہوتے ہیں تو لوگ ان سے پوچھتے ہیں کہ تم ان آنے والے پیغمبروں میں سے تم کون ہو ۔

> یہودیوں نے یروشلم سے کاہنوں اور لاویوں کو بھیجا کہ اس سے پوچھیں کہ تو کون ہے اور اس نے اقرار کیا اور انکار کیا بلکہ اقرار کیا کہ میں مسیح نہیں ہوں ۔ تب انہوں نے اس سے پوچھا تو اور کون ہے ؟ کیا تو الیاس ہے ۔ اس

---

[1] افادات شیخ الاسلام

نے کہا میں نہیں ہوں پس آیا تو "وہ نبی" ہے؟ اس نے جواب دیا نہیں ۔ ۔ ۔ ۔
اور انہوں نے اس سے سوال کیا اور کہا اگر تو نہ مسیح ہے نہ ایلیاس اور نہ "وہ نبی" تو کیوں بپتسمہ دیتا ہے ۔ (یوحنا-۱-۱۹)

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ تورات کی پیشین گوئی کے مطابق یہود کو تین پیغمبروں کا انتظار تھا جن میں سے دو کے نام الیاس اور مسیح تھے لیکن تیسرے کا نام صرف "وہ نبی" لیا گیا تھا ۔ قرآن نے آپ کا تعارف اس آیت میں آپ کا چہرہ اسی لفظ کے ذریعے پیش کیا ہے ۔ النبی یعنی وہ نبی، اس کا مصداق آپ کے سوا کوئی نہیں ۔

"وہ نبی جس کا یہود و نصاریٰ انتظار کر رہے تھے اس کی پیش گوئی حضرت موسیٰ نے فرمائی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کتاب استثنا باب ۱۸ آیت ۱۷ میں ہے ۔
اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں سو ٹھیک کہتے ہیں ۔ میں ان کے لیے انہی کے بھائیوں میں سے تیرے مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی ان سے کہے گا ۔ الخ

کاہن اور لاوی جو علمائے یہود میں سے تھے اور اپنی کتابوں سے خوب واقف بھی تھے ۔ اور ان کو یحییٰ علیہ السلام کی نسبت یقینی طور پر معلوم تھا کہ وہ نبی ہیں مگر پھر بھی انہوں نے شک کیا کہ وہ مسیح ہیں یا ایلیاہ ہیں اور یا وہ مخصوص نبی جس کی اطلاع موسیٰ علیہ السلام نے دی عیسائی علماء تسلیم کرتے ہیں کہ یوحنا ۱-۲۱ میں لفظ "وہ نبی" استعمال کیا گیا ہے ۔ اس سے مراد وہی نبی ہیں جن کا ذکر حضرت موسیٰ نے کیا تھا ۔ بہرحال جو علمائے یہود مسیح کے معاصر تھے انہوں نے یحییٰ علیہ السلام سے سوال کیا کہ آپ مسیح ہیں ۔ جب انہوں نے انکار کیا تو پھر پوچھا کہ کیا آپ ایلیاہ ہیں ۔ جب انہوں نے اس کا بھی انکار کیا تو پوچھا کہ کیا آپ وہ ہی مخصوص نبی ہیں جن کی خبر موسیٰ علیہ السلام دے گئے ہیں ۔

اس سے معلوم ہوا کہ وہ لوگ مسیح اور ایلیا کی اس نبی کا بھی کر رہے تھے بلکہ وہ ان کے درمیان اس قدر مشہور تھا کہ اس کا نام لینے کی بھی ضرورت نہ ہوتی تھی بلکہ اس کی طرف اشارہ ہی کافی تھا ۔ انجیل یوحنا کے باب ۷ آیت ۴۰ میں عیسیٰ علیہ السلام کا قول نقل کرنے کے بعد یوں کہا گیا ہے کہ :

بس بھیڑ میں سے بعض نے یہ باتیں سن کر کہا بے شک یہی وہ نبی ہے،
اوروں نے کہا کہ یہ مسیح ہے۔
اس سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ جو نبی ان کے ذہنوں میں معہود اور معین تھا وہ مسیح کے علاوہ کوئی دوسرا ہے۔ اس لیے اس کو مسیح کے مقابلہ میں ذکر کیا۔ بہرحال قرآن میں النبی کہہ کر اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ یہی "وہ نبی" ہے جس کا یہود و نصاریٰ دونوں کو انتظار تھا۔ یہی بلاغت قرآنی کے زیادہ مطابق ہے اور اس میں زیادہ معنویت ہے۔ بہ مقابلہ اس کے کہ یہ کہا جائے کہ ان دونوں میں لغوی معنے ملحوظ ہیں۔ اسی لیے مسلمان حضور انور کو آنحضرت کہتے ہیں۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمیت

دوسرا وصف یہاں قرآن نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا الامی بتایا ہے۔ اُمی کے لغوی معنے آپ سن چکے ہیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ظاہری تعلیم اور نوشت و خواند کے داغ سے پاک تھے قرآن عزیز نے متعدد مواقع پر اس واقعہ کا اظہار کیا ہے۔ ارشاد ہے:

وما کنت تتلوا من قبلہ من الکتاب ولا تخطہ بیمینک اذا لارتاب المبطلون

اے نبی تم اس سے پہلے کوئی نہ پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو غلط کار لوگ شک میں پڑ سکتے تھے۔

اس آیت سے استدلال کی بنیاد یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ظاہری تعلیم کے داغ سے پاک تھے۔ آپ کے اہل وطن اور رشتہ و برادری کے لوگ جن کے درمیان روز پیدائش سے سن کہولت کو پہنچنے تک آپ کی ساری زندگی بسر ہوئی تھی اس بات سے خوب واقف تھے کہ آپ نے عمر بھر نہ کبھی کوئی کتاب پڑھی نہ کبھی قلم ہاتھ میں لیا۔ یہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ کتب آسمانی کی تعلیمات انبیاء سابقین کے حالات، مذاہب و ادیان کے عقائد، قدیم قوموں کی تاریخ اور تمدن و معیشت کے اہم مسائل پر جس وسیع اور گہرے علم کا اظہار اس اُمی کی زبان سے ہو رہا ہے یہ اس کو وحی کے سوا کسی ذریعے سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر اس کو نوشت و خواند کا علم ہوتا اور لوگوں نے اسے کبھی کتابیں پڑھتے اور مطالعہ و تحقیق کرتے دیکھا ہوتا تو باطل پرستوں کے لیے یہ شک کرنے کی کچھ بنیاد بھی ہو سکتی تھی کہ یہ علم وحی نہیں بلکہ اخذ و اکتساب سے حاصل کیا گیا ہے لیکن اس کی اُمیت نے تو ایسے کسی شک کے لیے برائے نام بھی کوئی بنیاد باقی نہیں چھوڑی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ آپ کا انسانی تعلیم سے پاک ہونا بھی مصلحتِ الٰہی کا ایک خاص منشا تھا، اسی لیے اس کے بعد ارشاد ہوا ہے۔

بل هو ايات بينات فى صدور الذين اوتوا العلم

دراصل یہ روشن نشانیاں ہیں ان لوگوں کے دلوں میں جنہیں علم بخشا گیا ہے۔

یعنی ایک اُمی کا قرآن جیسی کتاب پیش کرنا اور یکایک ان غیر معمولی کمالات کا مظاہرہ کرنا جن کے لیے کسی سابقہ تیاری کے آثار کبھی کسی کے مشاہدے میں نہیں آئے۔ یہی دانش و بینش رکھنے والے حضرات کی نگاہ میں اس کی پیغمبری پر دلالت کرنے والی روشن ترین نشانیاں ہیں۔ دُنیا کی تاریخی ہستیوں میں سے جس کے حالات کا بھی جائزہ لیا جائے آدمی اس کے اپنے ماحول میں ان اسباب کا پتہ دے سکتا ہے جو اس کی شخصیت بنانے اور اس سے ظاہر ہونے والے کمالات کے لیے اس کو تیار کرنے میں کارفرما تھے۔ اس کے ماحول اور اس کی شخصیت کے اجزائے ترکیبی میں ایک ملکی مناسبت پائی جاتی ہے لیکن حضور انور کی شخصیت جن حیرت انگیز کمالات کی مظہر تھی ان کا کوئی ماخذ آپ کے ماحول میں تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں نہ وقت کے عربی معاشرے میں اور نہ گرد و پیش کے جن ممالک عرب کے تعلقات تھے ان کے معاشرے میں کہیں دور دراز سے بھی وہ عناصر ڈھونڈ کر نہیں نکالے جا سکتے جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کے اجزائے ترکیبی سے کوئی مناسبت رکھتے ہوں۔ یہی حقیقت ہے جس کی بنا پر بیان فرمایا گیا ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ایک نشانی نہیں بلکہ بہت سی نشانیوں کا مجموعہ ہے۔ جاہل آدمی کو اس میں کوئی نشانی نظر نہ آتی ہو تو نہ آئے مگر جو لوگ علم رکھنے والے ہیں وہ ان نشانیوں کو دیکھ کر اپنے دلوں میں قائل ہو گئے ہیں کہ یہ شان ایک پیغمبر ہی کی ہو سکتی ہے۔

قرآن نے آپ کو بار بار اُمی کہا ہے لیکن آپ اُمی ہو کر اُمیوں میں رہ کر کتبِ سابقہ کی ظاہری تعلیم سے ناآشنا ہو کر بھی سب کچھ جانتے تھے اور یہ آپ کا شاہکار اعجاز تھا۔ مشرکین مکہ کو مخاطب کر کے قرآن کہتا ہے کہ حضور کی صداقت کی کیا دلیل کافی نہیں ہے کہ وہ ناآشنائے تعلیم ہو کر بھی وہ کچھ جانتا ہے جس کی علمائے بنی اسرائیل کے سوا اور کسی کو خبر نہیں۔

اولم يكن لهم آية ان يعلمه علماء بنى اسرائيل

کیا ان کے لیے یہ نشانی نہیں کہ ان باتوں کو جو ایک اُمی کی زبان سے ادا ہو رہی ہے بنی اسرائیل کے عالم جانتے ہیں۔

تورات وانجیل میں حضور کی بشارتیں

۲۰۰۔ اور اس کے ظہور کی خبر اپنے یہاں تورات و انجیل میں لکھی پاتیں گے۔ یعنی آپ کی تشریف آوری کی بشارات اور نعوت و صفات کتب سابقہ سماویہ میں مذکور ہیں۔ حتیٰ کہ اس وقت سے لے کر آج تک ساڑھے تیرہ سو برس کی کانٹ چھانٹ کے بعد بھی موجودہ بائیبل میں بہت سی بشارات اشارات پائے جاتے ہیں جن کو ہر زمانہ کے علماء بحوالہ کتب دکھلاتے چلے آتے ہیں۔ وللہ الحمد علیٰ ذالک۔[1]

اس موضوع پر سب سے سیر حاصل بحث حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس اللہ سرہ العزیز نے اظہارالحق میں کی ہے۔ سید رشید رضا نے بھی اپنی مشہور تفسیر المنار میں ان کے ہی علمی فیضان کی خوشہ چینی کی ہے۔ حضرت مولانا محمد ادریس شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ قدس اللہ سرہ العزیز نے اس موضوع پر اظہارالحق، ازالۃ الاوہام اور الجواب الفسیح کی مدد سے جو کتابچہ بشائرالنبیین کے نام سے مرتب کیا ہے وہ بھی بڑا قیمتی علمی سرمایہ ہے۔ ہم یہاں انہی کی علوم سے استفادہ کرتے ہیں:

بشارت اوّل

از تورات سفر استثناء باب ۱۸، آیت ۱۸۔

۱۸۔ اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ انہوں نے جو کچھ کہا اچھا کہا، میں ان کے لیے ان کے بھائیوں میں تجھ سا نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا۔ ۱۹۔ اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی میری باتوں کو جنہیں وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے گا تو میں اس کا حساب اس سے لوں گا۔ ۲۰۔ لیکن وہ نبی جو ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے اسے حکم نہیں دیا اور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے ۲۱۔ اور اگر تو اپنے دل میں کہے کہ میں کیونکر جانوں کہ یہ بات خداوند کی کہی ہوئی نہیں تو جان رکھ کہ جب نبی خداوند کے نام سے کچھ کہے اور وہ جو اس نے کہا ہے واقع نہ ہو

---

[1] افادات شیخ الاسلام

تو وہ بات خداوند نے نہیں کہی" انتہی۔

اہل اسلام یہ کہتے ہیں کہ یہ بشارت خاص سرورِ عالم سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے اور یہود کا یہ خیال ہے کہ یہ بشارت یوشع علیہ السلام کے لیے ہے اور نصاریٰ یہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے لیکن حق یہ ہے کہ اس بشارت کا مصداق بجز خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی نہیں ہو سکتا اس لیے کہ یہ بشارت اُس نبی کے ظہور کی ہے کہ جو موسیٰ علیہ السلام کے مماثل یعنی مانند ہو اور بنی اسرائیل میں سے نہ ہو بلکہ بنی اسرائیل کے بھائیوں یعنی بنی اسماعیل میں سے ہو اور پھر اُس بشارت میں اُس آنے والے نبی کی صفات کا ذکر ہے اس لیے اہل اسلام کہتے ہیں کہ یہ خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت ہے بچند وجوہ

اوّل: یہ کہ اس بشارت میں یہ مذکور ہے کہ میں اُن کے یعنی بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ نبی، بنی اسرائیل میں سے نہ ہوگا اس لیے کہ یہ خطابات ایک دو شخص کے ساتھ مخصوص نہ تھے بلکہ بنی اسرائیل کے تمام اسباط اور گروہوں کو تھے لہٰذا اس خطاب کی مخاطب مجموع قوم بنی اسرائیل ہوگی اور مطلب یہ ہوگا کہ اس پوری قوم بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے تیرے مانند ایک نبی برپا کروں گا جو اس امر کی صاف دلیل ہے کہ یہ نبی بنی اسرائیل میں نہ ہوگا اس لیے کہ اگر یہ نبی بنی اسرائیل میں سے ہوتا تو یہ فرماتے کہ خود تم میں سے ایک نبی پیدا ہوگا کما قال تعالیٰ لقد منّ اللہ علی المومنین اذ بعث فیھم رسولاً من انفسھم اور یہ فرماتے کہ تمہارے بھائیوں میں سے وہ نبی ظاہر ہوگا کما قال تعالیٰ خطاباً لبنی اسرائیل وجعل فیکم انبیاء۔

غرض یہ کہ موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا تمام بنی اسرائیل کو بلا کسی تخصیص کے یہ خطاب فرمانا کہ وہ نبی موعود تمہارے بھائیوں میں سے ہوگا اس امر کی صاف دلیل ہے کہ وہ نبی موعود بنی اسرائیل کے بھائیوں یعنی بنی اسماعیل میں سے ہوگا کیونکہ بنی اسماعیل بنی اسرائیل کے بھائی ہیں۔ نصاریٰ کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے بھائیوں سے خود بنی اسرائیل ہی مراد ہیں مگر یہ بالکل غلط ہے اور سراسر خلاف عقل ہے اور ساری دنیا کے لغت کے خلاف ہے جب یہ کہا جاتا ہے کہ زید کے بھائی تو زید ان بھائیوں میں داخل نہ ہوگا بلکہ بھائیوں کے علاوہ ہوگا کیونکہ مضاف الیہ باتفاق عقلاً مضاف سے خارج ہوتا ہے نیز کسی شخص اور اس کی اولاد کو دنیا کے کسی محاورہ میں بطریق حقیقت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اُس کے بھائی ہیں پس بنی اسرائیل کے بھائیوں سے بنی اسرائیل کی اولاد مراد لینا ہے

سراسر نادانی اور جہالت ہے محاورہ میں یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ زید بنی تمیم کا بھائی ہے اور ہود قوم عاد کے بھائی ہیں اور صالح قوم ثمود کے بھائی ہیں یعنی اس قوم کے ایک فرد ہیں لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قوم عاد قوم عاد کے بھائی ہیں اور ثمود ثمود کے بھائی ہیں اور بنو تمیم بنو تمیم کے بھائی ہیں اور بنو ہاشم بنو ہاشم کے بھائی ہیں۔

اسی طرح یہ کہنا کہ بنی اسرائیل بنی اسرائیل کے بھائی ہیں صریح نادانی اور جہالت ہے اور یہ کہنا بنی اسرائیل کے بھائیوں سے اُن کی نسل اور اولاد مراد ہے کھلی ہوئی حماقت ہے۔

نیز کتاب پیدائش کے سولھویں باب درس تیرہ میں۔ بنی اسرائیل کے مقابلہ میں حضرت اسماعیل اور اُن کی اولاد کا اس طرح ذکر ہے۔

۱۳۔ وہ اپنے سب بھائیوں کے سامنے بود و باش اختیار کرے گا۔ اھ

اور تورات سفر پیدائش کے پچیسویں باب درس ۱۸ میں ہے:۔

کہ اسماعیل اپنے سب بھائیوں کے سامنے مر گیا۔ الخ

پس ان دونوں جگہ بنی اسمٰعیل کے بھائیوں سے بالاتفاق بنی عیص اور بنی اسرائیل مراد ہیں اور یہ امر باتفاق یہود و نصاریٰ ثابت ہے کہ خالص بنی عیص میں سے کوئی صاحب نبوت نہیں ہوا اور یہ امر بھی فریقین میں مسلم ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جو اولاد قطورہ سے ہوئی اُن سے بھی اللہ تعالیٰ نے نبوت اور برکت کا کوئی وعدہ نہیں فرمایا البتہ حضرت اسمٰعیل کے حق میں برکت کا وعدہ فرمایا۔

اہلِ کتاب کی ایک تحریف کا ذکر

علماءِ اہل کتاب نے اس بشارت میں ایک لفظ یہ اضافہ کر دیا ہے خدا تیرے ہی درمیان سے تیرے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک پیغمبر قائم کرے گا (دیکھو اسی باب کا درس ۱۵) تاکہ یہ بشارت نبی کریم علیہ الصلاۃ والتسلیم پر صادق نہ آئے سوچنا چاہیے کہ یہ لفظ تیرے ہی درمیان سے بعد میں بڑھایا گیا ہے۔ دلیل اس تحریف کی یہ ہے کہ توریت سفر استثناء باب ۱۸ اور درس ۱۸ میں خدا تعالیٰ کی طرف سے موسیٰ علیہ السلام کو خطاب میں الفاظ یہ ہیں میں ان کے لیے اُن کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا۔ اھ

اس میں تیرے ہی درمیان سے، کا لفظ مذکور نہیں اور عجیب بات ہے کہ کتاب الاعمال باب ۳

آیت ۲۲ میں اس خبر کا ذکر آیا ہے مگر تیرے درمیان کا لفظ مذکور نہیں ۔
نیز حضرت مسیح کے حواریین نے جہاں کہیں بھی اس کلام کو نقل کیا ہے اس میں یہ جملہ یعنی کہ تیرے ہی درمیان سے کبھی ذکر نہیں کیا معلوم ہوا کہ یہ جملہ الحاقی ہے ۔
اور اگر بالفرض والتقدیر تھوڑی دیر کے لیے یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہ جملہ الحاقی نہیں تو ہو سکتا ہے کہ اس کی مراد یہ ہو کہ تیرے درمیان سے یعنی خدا پرستوں کی نسل سے مطلب یہ کہ وہ حضرت ابراہیم حنیف کی نسل سے ہو گا۔

خلاصہ کلام یہ کہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بنی اسرائیل کے بارہ اسباط کو مخاطب بنا کر یہ فرمانا کہ ان کے بھائیوں میں سے حق تعالیٰ ایک نبی برپا کرے گا اس امر کی صریح دلیل ہے کہ وہ بنی اسرائیل نہ ہو گا ورنہ اگر کسی اسرائیلی نبی کی خبر دینا منظور ہوتا تو یہ فرماتے کہ ان میں سے یا ان کی اولاد میں سے وہ نبی برپا ہو گا ایسی صورت میں بھائیوں کا لفظ بڑھانا محض لغو اور فضول ہو گا۔ بھائیوں کا لفظ باآواز بلند پکار رہا ہے کہ اُس نبی موعود کو ان لوگوں کے ساتھ علاقہ صلبی یا بطنی نہ ہو گا یعنی وہ نبی بنی اسرائیل کی نسل سے نہ ہو گا ۔

اور ظاہر ہے کہ حضرت یوشع علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام دونوں بنی اسرائیل میں سے ہیں ۔ بنی اسرائیل کے بھائیوں یعنی بنی اسمٰعیل میں سے نہیں لہٰذا یہ دونوں نبی اس بشارت کا مصداق نہیں بن سکتے ۔ اس بشارت کا مصداق صرف وہی نبی ہو سکتا ہے کہ جو بنی اسمٰعیل میں سے ہوا انبیاء بنی اسرائیل میں سے کوئی پیغمبر اس بشارت کا مصداق نہیں ہو سکتا ۔

دوم:۔ یہ کہ اس بشارت میں یہ مذکور ہے کہ تیرے مانند ایک نبی برپا کروں گا ۔ اور ظاہر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے مانند نہ یوشع علیہ السلام ہیں اور نہ عیسیٰ علیہ السلام اس لیے کہ یہ دونوں حضرات بنی اسرائیل میں سے ہیں اور توراۃ سفر استثنا باب ۳۴ ورس ۱۰ میں ہے کہ بنی اسرائیل میں موسیٰ کے مانند کوئی نبی نہیں اٹھا جس سے خدا وند آمنے سامنے آشنائی کرتا ۔ انتہی ۔
علاوہ ازیں حضرت یوشع علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تلمیذ (شاگرد) تھے اور تابع اور متبوع مماثل نہیں ہوتے ۔ نیز حضرت یوشع اُس وقت موجود تھے اور اس بشارت میں یہ مذکور ہے کہ ایک نبی برپا کروں گا جس سے صاف ظاہر ہے کہ اس نبی کا وجود زمانہ مستقبل میں ہو گا ۔

اور یوشع علیہ الصلوٰۃ والسلام حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی کے زمانہ میں نبی ہو چکے تھے پس وہ اس بشارت کا جس میں آئندہ نبی کی خبر دی گئی ہے کیسے مصداق ہو سکتے ہیں۔

علی ھذا حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مماثل نہیں اس لیے کہ نصاریٰ کے نزدیک تو وہ ابن اللہ یا خود خدا ہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نہ اللہ نہ ابن اللہ بلکہ خدا کے ایک بندے ہیں پس بندے اور خدا میں کیا مماثلت۔

نیز حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام باعتقاد نصاریٰ مقتول ومصلوب ہو کر اپنی امت کے لیے کفارہ ہوئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نہ مقتول ومصلوب ہوئے اور نہ کفارہ ہوئے۔

نیز حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شریعت حدود وقصاص، زواجر وتعزیرات غسل وطہارت کے احکام سے ساکت ہے۔ بخلاف شریعت موسویہ کے وہ ان تمام امور پر مشتمل ہے۔ ہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام میں مماثلت ہے جس طرح حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام صاحب شریعت مستقلہ تھے اسی طرح ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت غرّاء بھی مستقل اور کامل اور علی وجہ الاتم حدود وتعزیرات، جہاد وقصاص، حلال وحرام کے احکام کو جامع ہے اور ظاہری احکام کی طرح باطنی احکام یعنی اخلاق بھی جامع ہے۔

جس طرح موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بنی اسرائیل کو فرعون کے پنجہ سے نکال کر عزت دی اس سے بدرجہا زائد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کو روم اور فارس کی قید سے چھڑا کر اللہ کا کلمہ پڑھایا اور قیصر وکسریٰ کے خزائن کی کنجیاں اُن کے سپرد کیں۔ نیز جس طرح حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نکاح کیا اسی طرح ہمارے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی انبیاء سابقین کی سنت نکاح پر عمل فرمایا اور اسی مماثلت کی طرف قرآن کریم کی اس آیت میں اشارہ ہے۔

انا ارسلنا الیکم رسولاً شاهداً علیکم کما ارسلنا الی فرعون رسولاً

ہم نے تمہاری طرف ایک رسول بھیجا تم پر گواہی دینے والا جیسے ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا۔

نیز حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اور حضرت یوشع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کبھی اس مماثلت کا دعویٰ بھی نہیں فرمایا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ مماثلت سے یہ مراد ہے کہ وہ نبی موعود موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرح بنی اسرائیل میں سے ہوگا تو اس صورت میں حضرت عیسیٰ اور حضرت یوشع علیہما الصلوٰۃ والسلام کی کیا تخصیص ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل میں ہزاروں نبی پیدا ہوئے۔

اس لحاظ سے ہر نبی انبیاء بنی اسرائیل میں سے اس بشارت کا مصداق بن سکتا ہے اور اگر حضرت عیسیٰ اور حضرت یوشع علیہما الصلوٰۃ والسلام کے لیے کسی درجہ میں مماثلت تسلیم کر لی جائے تو اس مماثلت کو اُس مماثلت سے کہ جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے حاصل ہے کوئی نسبت نہیں۔

سوم یہ کہ اس بشارت میں یہ بھی مذکور ہے کہ میں اپنا کلام اُس کے منہ میں ڈالوں گا۔اھ۔ یعنی اُس نبی پر الواح تورات و زبور کی طرح لکھی ہوئی کتاب نازل نہ ہوگی بلکہ فرشتہ اللہ کی وحی لے کر نازل ہوگا اور وہ نبی اُمّی ہوگا۔ فرشتہ سے سُن کر اللہ کا کلام یاد کرے گا اور اپنے مُنہ سے پڑھ کر اُمت کو سنائے گا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ بات بجز نبی اُمّی فداہ نفسی وابی وامی کسی پر صادق نہیں آتی۔ کما قال تعالیٰ وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی آپ اپنی خواہش سے کوئی بات نہیں کہتے مگر وہ وحی ہوتی ہے جو اللہ کی طرف سے بھیجی جاتی ہے۔

چہارم یہ کہ اس بشارت میں اس امر کی بھی تصریح ہے کہ جو اُس نبی موعود کے حکم کو نہ ملنے گا میں اس کو سزا دوں گا اور ظاہر ہے کہ اس سزا سے اُخروی عذاب مراد نہیں اس لیے کہ اس میں اُس موعود کے نہ ماننے والے کی کیا خصوصیت۔ اُخروی عذاب ہر نبی کے نہ ماننے والے کے لیے ہے بلکہ اس سے دنیوی سزا یعنی جہاد و قتال اور حدود و قصاص کا جاری کرنا مراد ہے۔ اور یہ بات نہ عیسیٰ علیہ السلام کو حاصل ہوئی اور نہ یوشع علیہ الصلوٰۃ والسلام کو۔ البتہ خاتم الانبیاء سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو علی وجہ الاتم حاصل ہوئی لہٰذا وہی اس بشارت کا مصداق ہو سکتے ہیں۔

پنجم یہ کہ اس بشارت میں یہ بھی تصریح ہے کہ اگر وہ نبی عیاذ باللہ افترا کرے گا اور خدا کی طرف غلط بات منسوب کرے گا تو وہ نبی قتل کیا جائے گا۔ اور ظاہر ہے کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بعد دعوائے نبوت قتل نہیں کیے گئے۔ دشمنوں نے ہر طرح کی کوشش اور تدبیر کی مگر سب برباد گئی۔

کما قال اللہ تبارک وتعالیٰ واذ یمکر بک الذین کفروا لیثبتوک او یقتلوک او یخرجوک ویمکرون ویمکر اللہ واللہ خیر الماکرین۔

اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اُس نعمت کو یاد کیجئے کہ کافر جب آپ کے ساتھ مکر کرتے ہیں کہ آپ کو قید کر لیں یا مار ڈالیں یا نکال دیں وہ اپنی تدبیر کرتے ہیں اور اللہ اپنی تدبیر فرماتا ہے اور اللہ ہی بہترین تدبیر فرمانے والا ہے۔

اور حسب وعدۂ الٰہی واللہ یعصمک من الناس آپ بالکل محفوظ اور مامون رہے اور بجائے اس کے کہ کسی قسم کا حادثہ فاجعہ پیش آتا آپ کی شان وشوکت بلند ہوتی گئی۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اگر وہ نبی موعود نہ ہوتے تو ضرور قتل کیے جاتے۔ ہاں حسب زعم نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام مقتول ومصلوب ہوئے۔ پس اگر حضرت مسیح بن مریم علیہ السلام کو اس بشارت کا مصداق قرار دیا جائے تو علیٰ زعم النصاریٰ عیاذاً باللہ ان کا کاذب ہونا لازم آتا ہے اور قرآن عزیز میں بھی اس طرف اشارہ ہے کما قال اللہ تعالیٰ شانہ،

ولولا ان ثبتناک لقد کدت ترکن الیھم شیئاً قلیلا اذا لاذقناک ضعف الحیٰوۃ وضعف الممات ثم لا تجدلک علینا نصیراً، ولو تقول علینا بعض الاقاویل لاخذنا منہ بالیمین ثم لقطعنا منہ الوتین،

اگر ہم آپ کو ثابت قدم نہ رکھتے تو آپ قریب تھے کہ ان کی جانب اقل قلیل مائل ہو جاتے۔ اس وقت ہم آپ کو زندگی اور موت کا دو چند عذاب چکھاتے پھر آپ ہمارے مقابلے میں کسی کو مددگار نہ پاتے۔ اگر محمدؐ ہم پر کچھ افترا کرتے تو ہم اُن کا داہنا پکڑ لیتے اور ان کی شہ رگ کو کاٹ دیتے۔

ایک ضروری تنبیہ

بیسویں درس میں جو یہ مذکور ہے کہ وہ نبی اگر مجھ پر جھوٹ باندھے تو مار ڈالا جائے گا، سو جاننا چاہیے کہ نہ قتل ہونا علی الاطلاق صادق ہونے کی دلیل نہیں ورنہ اُن انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی صداقت کہ جو دشمنوں کے ہاتھ سے قتل کیے گئے زیر تامل ہوگی کما قال اللہ تعالیٰ ویقتلون النبیین بغیر الحق، خصوصاً نصاریٰ کو اپنے عقیدہ فاسدہ کی بنا پر حضرت عیسیٰ السلام کی صداقت ثابت کرنا بہت دشوار ہو جائے گی۔

بلکہ خاص اس نبی موعود کا قتل نہ ہونا اُس کے صادق ہونے کی علامت ہے جیسا کہ توارت کی اس عبارت سے ظاہر ہے " وہ نبی جو ایسی گستاخی کرے گا الخ " وہ قتل کیا جائے گا۔ ان دونوں جملوں میں وہ کی ضمیر خاص اُس نبیِ موعود کی طرف راجع ہے۔ اگر یہ حکم مطلق نبی کے حق میں ہو تو معاذ اللہ حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ جھوٹے نبی ٹھہرتے ہیں۔ اور نصاریٰ کے عقیدہ کی بنا پر چونکہ حضرت عیسیٰ مقتول اور مصلوب ہوئے تو وہ بھی معاذ اللہ جھوٹے ٹھہرتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ

یہ خبر خاص اس نبی موعود کے حق میں ہے کہ جس کی یہ بشارت دی گئی ہے اگر اس خبر کو مطلق نبی کے حق میں مانا جائے تو یہود بے بہبود جو حضرت عیسیٰ کو نبی نہیں مانتے ان کو اپنے کفر کے لیے ایک دلیل ہاتھ آجائے گی۔

ششم یہ کہ اس بشارت میں یہ بھی مصرح ہے کہ اُس نبی موعود کے صادق ہونے کی علامت یہ ہے کہ اُس کا کہا پورا ہوگا یعنی اس کی تمام پیشین گوئیاں صادق ہوں گی، سو الحمد للہ کہ اُس صادق مصدوق کی کوئی پیشین گوئی آج تک ذرہ برابر بھی غلط ثابت نہیں ہوئی۔ اور ہم پورے دعوے کے ساتھ بہ بانگ دُہل اعلان کرتے ہیں کہ قیامت تک بھی کوئی حاسد اُس صادق مصدوق کی کسی پیشین گوئی کو غلط ثابت نہیں کر سکتا۔

اور یہ وصف تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں ایسا نمایاں اور اجلیٰ تھا کہ آپ کے دشمنوں اور حاسدوں کو بھی بجز صادق امین کہنے کے کوئی چارہ نظر نہ آتا تھا۔

کوئی مانے یا نہ مانے

یہ گنہگار اُمت تو اُس نبی امی فداہ نفسی وابی وامی کے صادق مصدوق ہونے پر طلوع شمس اور وجودِ نہار سے بدرجہا زائد یقین رکھتا ہے اور اُس خدائے واحد لا شریک لہٗ کی قسم کھا کر اور اُس کو اور اُس کے تمام ملائکہ کو گواہ بنا کر صمیم قلب اور خلوصِ اعتقاد سے یہ تصدیق اور اقرار کرتا ہے کہ بے شک و شبہ آپ صادق مصدوق اصدق الاولین والآخرین ہیں۔ اللھم ثبتنا علیٰ ذالک آمین۔

ہفتم یہ کہ کتاب الاعمال باب سوم آیت ہفدہم کے پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ نبی منتظر حضرت عیسیٰ اور ایلیاء علیہما السلام بلکہ تمام انبیاء کرام کے علاوہ ہے۔ وہ عبارت یہ ہے:

> اب اے بھائیو میں جانتا ہوں کہ تم نے یہ نادانی سے کیا جیسے تمہارے سرداروں نے بھی۔ پر جن باتوں کی خدا نے اپنے سب نبیوں کی زبان سے آگے سے خبر دی تھی کہ مسیح دکھ اٹھائے گا سو پوری کیں۔ ۱۹۔ پس توبہ کرو اور متوجہ ہو کہ تمہارے گناہ مٹائے جائیں تاکہ خداوند حضور تازگی بخش ایام آویں۔ ۲۰۔ اور یسوع مسیح کو پھر بھیجے جس کی منادی تم لوگوں کے درمیان آگے سے ہوئی۔ ۲۱۔ ضرور ہے کہ آسمان

اُسی لیے رہے اس وقت تک کہ سب چیزیں جن کا ذکر خدا نے اپنے سب پاک نبیوں کی زبانی شروع سے کیا اپنی حالت پر آ دیں۔ ۲۲۔ کیونکہ موسیٰ نے باپ دادوں سے کہا کہ خداوند جو تمہارا خدا ہے تمہارے بھائیوں میں سے تمہارے لیے ایک نبی تیری مانند اُٹھا دے گا جو کچھ وہ تمہیں کہے اُس کی سب سنو۔ ۲۳۔ اور ایسا ہوگا کہ ہر نفس کہ جو اُس نبی کی نہ سنے وہ قوم سے نیست کیا جاوے گا۔ ۲۴۔ بلکہ سب نبیوں نے سموایل سے لے کر پچھلوں تک جتنوں نے کلام کیا ان دونوں کی خبر دی ہے ۲۵۔ تم نبیوں کی اولاد اور اس عہد کے ہو جو خدا نے باپ دادوں سے باندھا ہے۔ جب ابرہام سے کہا کہ تیری اولاد سے دُنیا کے سارے گھرانے برکت پادیں۔ آھ

اس عبارت میں اوّل حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بشارت اور ان کی اس تکلیف کا جو ان کو علی زعمھم یہود لعنہم اللہ سے پیش آئی ذکر ہے۔ اور آن کے نزول من السماء کا تذکرہ ہے۔ اس کے بعد اس نبی کی بشارت کا ذکر ہے کہ جس کے متعلق حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بنی اسرائیل سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا۔

خداوند عالم تمہارے بھائیوں یعنی بنی اسماعیل میں سے ایک نبی بھیجنے والا ہے۔ اور علاوہ موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے تمام نبیوں نے اس نبی موعود کے آنے کی خبر دی ہے۔ اور جب تک یہ وعدہ ظہور میں نہ آئے گا اس وقت تک یہ زمین وآسمان ضرور قائم رہیں گے اور اُسی زمانہ میں خدا کا وہ عہد بھی پورا ہوگا کہ جو اُس نے ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کیا تھا کہ تجھ سے دُنیا کے سارے گھرانے برکت پاویں گے۔

الحاصل حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بشارت کو ذکر کر کے یہ کہنا دسولپوری کیں) اور جس نبی کی موسیٰ اور ابراہیم علیہما السلام اور تمام انبیاء کرام علیہم الف الف صلوٰۃ والف الف سلام نے بشارت دی ہے اس کے انتظار کو ان الفاظ سے ظاہر کرنا کہ ”ضرور ہے کہ آسمان اس کے لیے رہے کہ اس وقت کہ سب چیزیں کہ جن کا ذکر خدا نے اپنے سب پاک نبیوں کی زبانی شروع سے کیا اپنی حالت پر آ دیں“ اھ

اس امر کی صاف دلیل ہے کہ یہ نبی مبشر اور رسول منتظر اُن تمام انبیاء ورسل کے علاوہ ہے کہ جو حضرت موسیٰ سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہما الصلوٰۃ والسلام تک گزرے۔ لہٰذا اس بشارت کا

مصداق حضرت موسیٰ سے حضرت عیسیٰ کے زمانہ تک کوئی نبی نہیں ہو سکتا" پس حضرت یوشع یا حضرت مسیح بن مریم علیہما السلام کو اس بشارت کا مصداق قرار دینا کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔

ہشتم یہ کہ انجیل یوحنا باب اوّل آیت انیسویں میں ہے:

جب یہودیوں نے یروشلم سے کاہنوں اور لاویوں کو بھیجا کہ اس کو پوچھیں کہ تو کون ہے اور اُس نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا بلکہ اقرار کیا کہ میں مسیح نہیں۔ تب انہوں نے اُس سے پوچھا تو اور کون ہے تو الیاس ہے اُس نے کہا میں نہیں ہوں، پس آیا تو وہ نبی ہے اُس نے جواب دیا نہیں"، اھ۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اُن کو حضرت مسیح اور ایلیا علیہما الصلوٰۃ والسلام کے سوا بھی ایک نبی کا انتظار تھا اور وہ نبی اُن کے نزدیک ایسا معروف و معہود تھا کہ اس کے نام کے ذکر کرنے کی بھی حضرت مسیح اور حضرت ایلیاء کے نام کی طرح حاجت نہ تھی۔ بلکہ فقط "وہ نبی" کا اشارہ ہی اُس کے لیے کافی تھا۔

پس اگر حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی اس بشارت کا مصداق تھے تو پھر اُن کو انتظار کس کا تھا۔

وہ نبی جس کا کہ اُن کو انتظار تھا وہ ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور اسی وجہ سے کہ اہل کتاب نبی اکرم سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے " وہ نبی" کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ اسی لیے ہمیشہ سے اہل اسلام نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو آنحضرت (جو بعینہٖ وہ نبی کا ترجمہ ہے) لکھتے ہیں۔

نہم یہ کہ انجیل یوحنا باب ہفتم کی آیت چہلم سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ نبیِ موعود حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے علاوہ ہے چنانچہ انجیل میں ہے:

۴۰۔ تب اُن لوگوں میں سے بہتیروں نے یہ سُن کر فی الحقیقت یہی وہ نبی ہے۔ اوروں نے کہا یہ مسیح ہے اھ۔

نبی معہود کو حضرت مسیح کے مقابلہ میں ذکر کرنا اس کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ وہ نبی معہود حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے علاوہ ہے۔ پس اگر "وہ نبی" سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مراد نہ ہوں تو پھر وہ کون نبی ہے کہ جس کا انتظار تھا۔

دہم، آپ کے عہدِ نبوت میں بہت سے علماءِ یہود و نصاریٰ نے اس امر کا اعتراف کیا کہ

آپ وہی نبی برحق ہیں جن کی موسیٰ علیہ السلام نے بشارت دی ہے اور آپ ہی اس بشارت کے مصداق ہیں بعدازاں ان میں سے بہت سے اسلام لاتے جیسے مخیریق یہودی اور ضغاطر رومی عیسائی اور بہت سو نے اقرار کیا مگر اسلام نہیں لاتے جیسے ہرقل شاہ روم اور عبداللہ بن صوریا یہودی و غیرہما نے اقرار کیا کہ آپ وہی نبی برحق ہیں جن کی حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ نے بشارت دی ہے مگر اسلام نہیں لائے۔

بشارت دوم

از توراۃ کتاب پیدائش باب ۱۷، آیت بستم[20]

اسمٰعیل کے حق میں میں نے تیری سُنی، دیکھ میں اُسے برکت دوں گا اور اُسے برومند کروں گا۔ اور اُسے بہت بڑھاؤں گا اور اُس سے بارہ سردار پیدا ہوں گے اور میں اُس سے بڑی قوم بناؤں گا اور اسی باب کی آٹھویں آیت میں ہے۔

اور میں تجھ کو اور تیرے بعد تیری نسل کو کنعان کا تمام ملک جس میں تو پردیسی ہے دیتا ہوں اھ۔

اور کتاب پیدائش کے باب ۱۶ آیت ۱۱ میں ہے۔

خداوند کے فرشتہ نے اُسے (ہاجرہ) کہا کہ تو حاملہ ہے اور ایک بیٹا جنے گی اس کا نام اسمٰعیل رکھنا خدا نے تیرا دکھ سن لیا وہ وحشی آدمی ہوگا اس کا ہاتھ سب سے (اوپر ہوگا) اور سب کے ہاتھ اس کے برخلاف ہوں گے اور وہ اپنے سب بھائیوں کے سامنے بود و باش کرے گا۔ انتہی

اور باب ۲۵ آیت ۱۱ میں ہے۔

آپ کے فرزند اسحاق کو اللہ نے برکت دی اھ

الحاصل حق تعالیٰ شانہٗ نے حضرت ابراہیم سے حضرت اسحاق اور حضرت اسمٰعیل علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بابت وعدہ فرمایا کہ ان کو برکت دوں گا چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ اوّل حضرت اسحاق کی اولاد نے برکت حاصل کی اور تقریباً کئی ہزار سال تک سلسلۂ نبوّت و رسالت آپ کی اولاد میں جاری رہا اور حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام تک برابر حضرت اسحاق کی اولاد میں انبیاء و رسل ہوتے رہے۔ بعدازاں جب دوسرے وعدہ کا وقت آگیا تو شرفِ نبوّت و رسالت یکسر بنی اسرائیل

سے بنی اسمٰعیل کی جانب منتقل ہو گیا اور دعائے حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ظہور فاران کی چوٹیوں سے اور سینا اور ساعیر کا نور فاران پر جگمگانے لگا۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم۔

تورات سفر پیدائش باب ۲۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل کو حجاز میں لے کر آئے اور وادیٔ فاران میں مکہ مکرمہ کے قریب چھوڑ کر واپس ہو گئے۔

حضرت سارہ کے وصال کے بعد حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم پر اُسی وادیٔ فاران میں واپس تشریف لائے۔ اس عرصہ میں حضرت اسمٰعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام جوان ہو چکے تھے۔ دونوں نے مل کر کعبۃ اللہ کی تعمیر شروع کی کما قال تعالیٰ تبارک وتعالیٰ۔

واذ یرفع ابراھیم القواعد من البیت واسمٰعیل۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم، ربنا واجعلنا مسلمین لک ومن ذریتنا اُمۃ مسلمۃ لک۔

اس وقت کو یاد کر جب حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام بیت اللہ کی بنیادیں اُٹھا رہے تھے اور یہ دُعا مانگتے تھے کہ اے پروردگار یہ خدمت تو ہم سے قبول فرما تو بے شک سننے والا اور جاننے والا ہے اور اے پروردگار ہم کو اور ہماری ذریت سے ایک جماعت کو اپنا فرمانبردار بنا۔

ناظرین غور فرمائیں کہ اس مقام پر کس کی ذریت مراد ہے۔ ظاہر ہے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذریت مراد ہے جو کہ وادیٔ فاران اور حرم الٰہی اور کعبۃ اللہ کے آس پاس مقیم ہے۔ اسی ذریت کے لیے حضرت ابراہیم نے اوّل یہ دُعا فرمائی ربنا واجعلنا الخ اور دوسری دُعا یہ فرمائی۔

ربنا وابعث فیھم فی ھذہ الذریۃ ذریۃ ھاجرہ واسمٰعیل علیہما الصلوٰۃ والسلام رسولا منھم یتلو علیھم اٰیٰتک ویعلمھم الکتٰب والحکمۃ ویزکیھم انک انت العزیز الحکیم۔

اے پروردگار ہاجرہ اور اسمٰعیل کی ذریت میں ایک ایسا رسول بھیج جو تیری کتاب کی تلاوت کرے اور لوگوں کو کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور ان کو کفر اور شرک سے پاک کرے بے شک تو ہی غالب اور حکیم ہے۔

حق تعالیٰ نے جس طرح قرآن کریم میں اس دعائے ابراہیمی کا ذکر فرمایا ہے اسی طرح اس کی اجابت کا بھی تذکرہ فرمایا ہے۔

هو الذی بعث فی الامیین رسولاً منهم یتلوا علیهم ایته ویزکیهم ویعلمهم الکتب والحکمة وان کانوا من قبل لفی ضلل مبین ۔

اللہ ہی نے بے پڑھوں میں ان ہی میں کا ایک رسول بھیجا جو ان پر خدا کی آیتوں کی تلاوت کرتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں مبتلا تھے۔

خلاصہ

یہ کہ قارئین کرام اس پر غور کریں کہ اسمٰعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اولاد میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے زائد کون بابرکت اور برومند ہوا اور کنعان کی زمین کس کی وراثت میں آئی اور حضور پرنور کے سوا کون ہے کہ جس کا ہاتھ سب کے اوپر ہوا ہو اور زمین کے خزانوں کی کنجیاں اس کے ہاتھ میں دی گئی ہوں۔

اور بارہ سرداروں سے بارہ خلفا مراد ہیں کما قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم:

یدور رحی الاسلام الی اثنی عشر خلیفة کلهم من قریش

اسلام کا رحیٰ (چکی) بارہ ۱۲ خلفاء پر گھومے گا جو سب کے سب قریش سے ہوں گے۔

فائدہ جلیلہ

اس علیم و حکیم نے اپنی حکمت بالغہ سے اسحٰق علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اولاد کو اسمٰعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اولاد پر برکت دینے میں اس وجہ سے مقدم رکھا کہ حضرت اسمٰعیل کی اولاد میں خاتم النبیین سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہونے والے تھے پس اگر حضرت اسمٰعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وعدہ کو مقدم کر دیا جاتا تو پھر اسحٰق علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اولاد سے سلسلۂ نبوت و رسالت منقطع ہو جاتا اس لیے خاتم الانبیاء والمرسلین کے بعد کوئی نبی و رسول نہیں بنایا جا سکتا۔

اور اسی وجہ سے کہ اسحاق علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اولاد میں بکثرت نبی ہوں گے تو بنی اسرائیل کو اس انعام کی تذکیر ان الفاظ سے کی گئی۔

اذ جعل فیکم انبیاء تم میں سے حق تعالیٰ نے بہت نبی پیدا کیے،
اور حضرت ابراہیم نے جو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے لیے دعا فرمائی تو یہ فرمایا
ربنا وابعث فیھم رسولاً یعنی اے پروردگار ان میں ایک عظیم الشان رسول بھیج"
اور یہ نہیں فرمایا ربنا وابعث فیھم رسلاً یعنی اے اللہ ان میں بہت سے رسول اور نبی بھیج۔"

جس سے صاف یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام بنی اسمٰعیل میں سے صرف ایک ایسے رسول کے مبعوث ہونے کی دعا فرماتے تھے کہ جس کے آنے کے بعد کسی نبی اور رسول کی حاجت نہ رہے۔ صیغہ مفرد کے ساتھ ذکر فرمایا رُسُلاً صیغہ جمع کے ساتھ نہیں ذکر فرمایا۔

وعن ابی العالیہ فی قولہ تعالیٰ ربنا وابعث فیھم رسولاً منھم یعنی امۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم فقیل لہ قد استجیب لک وھو کائن فی اٰخر الزمان وکذا قال السدی وقتادہ (تفسیر ابن کثیر ص ۱۳۳ ج ۱)

ابو العالیہ سے مروی ہے کہ جب حضرت ابراہیم نے یہ دعا فرمائی ربنا وابعث فیھم رسولاً منھم تو اللہ کی جانب سے یہ کہا گیا کہ تمہاری دعا قبول ہوئی۔ یہ پیغمبر اخیر زمانہ میں ہوگا ایسا ہی سدی اور قتادہ سے مروی ہے۔

ھو کائن فی اٰخر الزمان سے خاتم النبیین ہونا مراد ہے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد انا دعوۃ ابی ابراھیم یعنی میں اپنے باپ ابراہیم کی دعا ہوں" اسی طرف مشیر ہے۔

اور اسی وجہ سے کہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی یہ دعا امت محمدیہ پر عظیم الشان احسان ہے۔ اللھم صلی علیٰ محمد کے بعد کما صلیت علیٰ ابراھیم وعلیٰ اٰل ابراھیم کا پڑھنا اس احسان کے شکر میں امت پر لازم ہو گیا۔

یا یہ کہا جائے کہ تمام انبیاء ورسل میں سے حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو صلوٰۃ والسلام کے لیے مخصوص کرنا ان کی اس دعا کی اجابت ہے رب ھب لی حکماً والحقنی بالصالحین واجعل لی لسان صدق فی الاٰخرین۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو علم وحکمت بھی عطا فرمائی اور صالحین میں بھی داخل فرمایا اور آخر میں یعنی اس آخری امت میں کما صلیت علیٰ ابراھیم کے ذریعہ سے اُن کا ذکر خیر جاری فرمایا۔ اور انشاء اللہ العزیز الیٰ یوم القیامۃ اسی طرح جاری

رہے گا اللھم صلی علی محمد و علی آل محمد کما صلیت علی ابراھیم و علی آل ابراھیم انک حمید مجید۔
اور چونکہ حضرت ابراہیم سے برکت دینے کا وعدہ تھا اس لیے کما بارکت کا اور اضافہ کر دیا گیا۔
اور عجب نہیں کہ آن بارہ سرداروں سے کہ جن سے خلفاء مراد لیے گئے ختم نبوت کی طرف اشارہ ہو یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت و رسالت کا سلسلہ جاری نہ رہے گا بلکہ خلافت و نیابت کا سلسلہ جاری ہوگا اور اسی وجہ سے حق تعالیٰ نے اُمت سے صرف خلافت کے جاری رکھنے کا وعدہ فرمایا۔ نبوت و رسالت کا کسی درجہ میں بھی وعدہ نہیں فرمایا کما قال تعالیٰ،

وعد اللہ الذین اٰمنوا منکم و عملوا الصلحٰت لیستخلفنکم فی الارض
وقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم خلافۃ النبوۃ بعدی ثلاثون عاما
وقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم کانت بنو اسرائیل تسوسھم الانبیاء کلما ھلک نبی خلفہ نبی و انہ لا نبی بعدی سیکون خلفاء رواہ البخاری۔

جو لوگ ایمان لا چکے اور جنہوں نے عمل صالح کیے اُن سے اللہ تعالیٰ نے خلافت دینے کا وعدہ فرمایا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نبوت کی خلافت میرے بعد تیس ۳۰ سال رہے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بنی اسرائیل کا انتظام ان کے نبی کیا کرتے تھے جب کوئی نبی گزر جاتا تو دوسرا نبی اُس کے قائمقام ہو جاتا تھا لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں البتہ خلفاء ہوں گے۔ (بخاری)

بشارت سوم

از تورات سفر استثناء باب ۳۳ آیت ۲
جاء الرب من سیناء و اشرق لھم من ساعیر و تلالاء من جبال فاران و اتیٰ من ربوات القدس و عن یمینہ نار شریعۃ اھ
اور الجواب الفسیح میں بعض نسخ تورات سے اس طرح نقل کیا ہے۔
جاء الرب من سیناء و اشرق لنا من ساعیر و استعلن من جبال فاران اھ
اور اُردو نسخہ میں اس طرح ہے۔ اور اُس نے (یعنی موسیٰ علیہ السلام) نے کہا کہ خداوند سینا

سے آیا اور سعیر سے اُن پر طلوع ہوا۔ فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا اور اُس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشی شریعت اُن کے لیے تھی اھ

اس آیت میں

تین بشارتیں مذکور ہیں ۱۔ طور سینا پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات کا عطا ہوا مراد ہے۔ ۲۔ اور ساعیر ایک پہاڑی کا نام ہے کہ جو شہر ناصرہ مولد عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام میں واقع ہے اس سے حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت اور نزول انجیل کی طرف اشارہ ہے۔ ۳۔ اور فاران سے مکہ کے پہاڑ مراد ہیں۔ اس سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور نزول قرآن کی جانب اشارہ ہے۔

غار حرا اسی فاران پہاڑ میں واقع ہے جس میں سب سے پہلے اقرأ باسم ربک کی ابتدائی پانچ آیتیں آپ پر نازل ہوئیں توریت کتاب پیدائش کے اکیسویں باب درس ۲۰ میں حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل کے ذکر میں ہے۔

۲۰۔ اور خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا اور وہ بڑھا اور بیابان میں رہا کیا اور تیر انداز ہو گیا۔

۲۱۔ اور وہ فاران کے بیابان میں رہا۔ انتہی

اور حضرت اسمٰعیل کی سکونت کا مکہ مکرمہ میں ہونا سب کو مسلم ہے۔ معلوم ہوا کہ توریت کی اس آیت میں اُس نبوت کی بشارت ہے جو فاران کے پہاڑ سے جلوہ گر ہو گی اور کوہ و دشت کو اپنے نور سے بھر دے گی اب ناظرین خود دیکھ لیں کہ سوائے نبوت محمدیہ کے وہ کون سی نبوت ہے کہ جو فاران سے ظاہر ہوئی اور اس نے تمام عالم کو انوار ہدایت سے منور کر دیا۔ فاران کی نبوت بلاشبہ سینا اور ساعیر کی نبوت سے کہیں زیادہ روشن تھی۔ اور آتشی شریعت سے بھی قرآن کریم مراد ہے اس لیے کہ وہ احکام جہاد اور احکام حدود و قصاص پر مشتمل ہے اور دس ہزار قدوسیوں سے لشکر ملائک مراد ہے۔ یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فتح مکہ کے وقت دس ہزار صحابہ کے ساتھ مکہ پر حملہ کرنا مراد ہے۔ اور حضرت مسیح کے ساتھ بقول نصاریٰ صرف بارہ حواری تھے اور وہ بھی سب جان بچا کر بھاگ گئے اور ایک خاص حواری یہودا نے تیس درم رشوت لے کر اپنے خداوند کو گرفتار کرا دیا تھا۔

اور اس بشارت کی حسن ترتیب اور حسن بیان قابل غور ہے۔ اوّل یہ فرمایا جاء الرب

من سیناء خداوند سینا سے آیا اور اس کے بعد یہ فرمایا: ۱شرق من ساعیر، سعیر سے طلوع ہوا اور اخیر میں یہ فرمایا واستعلن من جبال فاران فاران کے پہاڑ سے جلوہ گر ہوا۔ جس سے مقصد یہ ہے کہ نزولِ توراتِ بمنزلہ طلوعِ فجر کے ہے اور نزولِ انجیل بمنزلہ طلوعِ شمس کے ہے اور نزولِ قرآن بمنزلہ استوارِ شمس فی نصف النہار ہے۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ کفر کی تاریک شب کا خاتمہ اور پہلی پھٹ کر ایمان وہدایت کی صبح صادق کا ظہور حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں ہوا اور فرعون اور قارون اور ہامان جیسے ائمۃ الکفر عذابِ الٰہی سے ہلاک ہوتے۔

اور جب حضرت مسیح بن مریم علیہما الصلوٰۃ والسلام کا ظہور ہوا تو آفتابِ ہدایت بھی افقِ مشرق پر ظاہر ہوا۔ اور جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا تو آفتابِ ہدایت ٹھیک نصف النہار پر آگیا اور کوئی چپہ زمین کا ایسا باقی نہ رہا کہ جہاں اس آفتاب کی روشنی نہ پہنچی ہو اور قرآن عزیز میں بھی اس بشارت کی طرف اشارہ ہے۔

والتین والزیتون وطور سینین وھذا البلد الامین

تین اور زیتون چونکہ ارض مقدس میں پیدا ہوتے ہیں جس جگہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام پیدا ہوتے اس لیے اس سے حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رسالت کی جانب اشارہ ہے اور بلد امین سے مراد مکہ مکرمہ مراد ہے کہ جس سے آفتابِ نبوت ورسالت کا طلوع ہوا۔

حق تعالیٰ شانہ نے مکہ کی صفت الامین ذکر فرمائی ہے جس سے اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ سرورِ عالم سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم خزانۂ الٰہی کے دُرِّ یتیم ہیں کہ بطورِ امانت اس بلد امین کے سپرد کیے گئے ہیں۔ بلد امین نے تریپن سال تک اس دُرِّ یتیم اور امانتِ الٰہی کی حفاظت کی مگر جب وقت بہت ہی نازک ہو گیا تو اس وقت بلد امین نے بادلِ خواستہ یہ امانت مدینہ طیبہ کے سپرد کر دی، کذا فی ھدایۃ الحیاریٰ۔

الحاصل

اس کلام میں تین ۳ پیغمبروں کی بشارتیں دی گئیں اور بشارت کا اختتام خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکرِ مبارک پر ہوا تاکہ ختمِ نبوت کی طرف اشارہ ہو جائے۔

مخالفین کہتے ہیں کہ فاران سیناء کے ایک علاقہ کا نام ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ

اس علاقہ میں ظاہر نہیں ہوتے اس لیے یہ بشارت اُن کے حق میں نہیں ہو سکتی۔ جواب یہ ہے کہ توراۃ کتاب پیدائش باب اکیسواں از ورس ۱۳ تا ورس ۲۱ میں لکھا ہے کہ بی بی ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل بی بی سارہ کے ناراض ہو جانے سے ارض مقدس کو چھوڑ کر دشت فاران میں سکونت پذیر ہوئے جس کی بنا پر فاران وہی مقام ہو گا جو حضرت اسمٰعیل اور ان کی اولاد کا سکونت گاہ ثابت ہوا۔ اور یہ امر روایات متواترہ سے ثابت ہے کہ بی بی ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل وادیٔ حجاز کے اس میدان میں مقیم ہوتے جہاں اس وقت مکہ آباد ہے اور یہیں آپ کی اولاد بھی قیام پذیر ہوئی معلوم ہوا کہ فاران علاقہ سینا کے کسی پہاڑ کا نام نہیں بلکہ مکہ مکرمہ کے پہاڑ کا نام ہے۔ جہاں حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل کی سکونت تھی۔

سامری توراۃ کے عربی ترجمہ میں جس کو علمائے جرمن نے ۱۸۵۱ء میں بمقام گاٹنگن چھپوایا ہے حضرت اسمٰعیل کی سکونت گاہ کے متعلق تحریر ہے وسکن فی بریة فاران واخذت له امه امرأة من ارض مصر (کون الدنیا ۲۱-۲۲)

حضرت داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام سموئیل نبی کی وفات کے بعد دشت فاران میں تشریف لے گئے اور وہاں آپ نے ایک زبور تصنیف کیا جس میں نہایت افسوس کے ساتھ فرماتے ہیں کہ میں قیدار کے قیام گاہ میں سکونت پذیر ہوں دیکھو سموئیل نبی کی پہلی کتاب باب ۲۵ ورس یکم اور دیکھو زبور ۱۲۰ ورس پنجم۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ قیدار فاران میں رہتا تھا۔ قیدار حضرت اسمٰعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دوسرے فرزند ہیں۔ اشعیا پیغمبر کے صحیفہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اور اس کی اولاد مغربی ملک میں رہتی تھی۔ بطلیموس نے حجاز کا وسطی علاقہ اس کی جائے سکونت بتلاتا ہے۔ اس بنا پر یہ امر ثابت ہے وادی حجاز اور فاران دونوں ایک ہی مقام ہیں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور مکہ میں ہوا جو حجاز کا مشہور شہر ہے کذا فی البشارات الاحمدیہ[1] اور آتشی شریعت سے مراد یہ ہے کہ وہ شریعت احکام جہاد و قصاص و حدود و تعزیرات پر مشتمل ہو گی اور اس کی نبوت دنیاوی بادشاہت ساتھ لیے ہو گی اور حضرت عیسیٰ کی نبوت دنیاوی بادشاہت کو ساتھ لیے ہوئے نہ تھی اور نہ وہ مجرمین سے انتقام پر قادر تھے۔

---

[1] یہ رسالہ جناب حکیم سید محمد شمس اللہ صاحب قادری حیدرآبادی کی تصنیف ہے رسالہ کل (۳۲) صفحہ کا ہے اور مفید اور مختصر ہے۔

بشارت چہارم

از توراۃ سفر استثناء باب ۳۲ آیت ۲۱
انہوں نے اس کے سبب سے جو خدا نہیں مجھے غیرت دلائی اور اپنی واہیات باتوں سے مجھے غصہ دلایا، سو میں بھی انہیں اس سے جو گروہ نہیں غیرت میں ڈالوں گا اور ایک بے عقل قوم سے انہیں خفا کروں گا۔ اھ

اس بشارت میں بے عقل قوم سے جہلائے عرب مراد ہیں کہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل جہالت اور گمراہی میں مبتلا تھے۔
علوم عقلیہ و شرعیہ سے واقفیت تو درکنار ان کو تو سوائے بت پرستی کے اور کسی شئی کا علم نہ تھا۔ یہود و نصاریٰ ان کو بہت حقیر جانتے تھے۔ ان کو جاہل اور اپنے کو عالم کہتے تھے۔
لیکن جب یہود و نصاریٰ نے توراۃ و انجیل کی اصلی تعلیم کو بھلا دیا اور بجائے توحید کے شرک میں مبتلا ہو گئے کما قال تعالیٰ شانہ وقالت الیہود عزیر ابن اللہ وقالت النصاریٰ المسیح ابن اللہ یہود نے عزیر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اور نصاریٰ نے عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خدا اور خدا کا بیٹا بنا لیا۔ اس وقت غیور مطلق حق جل جلالہ کی غیرت جوش میں آئی اور حسب وعدہ انہیں جہلاء اور امیین میں سے ایک نبی امی۔ فداہ نفسی ابی وامی کو مبعوث فرمایا۔ جس کے ہاتوں اپنے دین کو عزت دی اور یہود بے بہبود کو اُن کے ہاتوں قتل کرایا اور مصر و شام پر ان کا قبضہ کرایا کما قال تعالیٰ،

یُسَبِّحُ لِلّٰہِ ما فی السمٰوٰت وما فی الارض الملک القدوس العزیز الحکیم، ھو الذی بعث فی الامیین رسولاً منھم یتلوا علیھم اٰیتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتب والحکمۃ وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین۔

تمام آسمان اور زمین کی چیزیں خدائے بادشاہ پاک زبردست حکمت والے ہی کی تسبیح و تقدیس پڑھتی ہیں۔ اسی خداوند قدوس نے ناخواندوں میں سے ایک رسول کو مبعوث فرمایا جو اُن پر اللہ کی آیتوں کی تلاوت کرتا ہے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور بے شک وہ لوگ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔
امیین سے عربوں کی جاہل قوم مراد ہے اور عیسیٰ علیہ السلام اور یوشع علیہ السلام کی قوم جاہل اور حقیر نہ تھی اور نہ بنی اسرائیل کو ان سے غیرت دلائی گئی ہے۔ پس یہ بشارت سوائے قوم

عرب کے کسی قوم پر صادق نہیں آتی۔
باقی بے عقل قوم اور شعب جاہل سے یونانیین مراد لینا کہ پولوس کے رسالہ رومیہ سے مترشح ہوتا ہے صحیح نہیں اس لیے کہ یونانیین تو اُس زمانہ میں علوم و فنون کے اعتبار سے تمام عالم پر فائق تھے وہ شعب جاہل اور بے عقل قوم کا کیسے مصداق ہو سکتے ہیں۔ سقراط، بقراط، فیساغورس، افلاطون جالینوس، ارسطاطالیس، ارشمیدس، بیناس، اقلیدس یہ سب کے سب حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تشریف آوری اور بعثت سے کئی صدی قبل تمام علوم و فنون کے ماہر اور احکام توراۃ کے پورے عالم تھے۔

بشارت پنجم

از توراۃ سفر پیدائش باب ۴۹
۱۔ اور یعقوب نے اپنے بیٹوں کو بلایا اور کہا کہ اپنے کو جمع کرو تا کہ میں اس کی جو پچھلے دنوں تم پر بیتے گا تمہیں خبر دوں۔ ۲۔ اے یعقوب کے بیٹو! اپنے کو اکٹھا کرو اور سنو اور اپنے باپ اسرائیل کی سنو اور پھر آیت دہم میں ہے۔
یہوداہ سے ریاست کا عصا جدا نہ ہوگا اور نہ حاکم اُس کے پاؤں کے درمیان سے جاتا رہے گا جب تک کہ شیلا نہ آوے اور قومیں اُس کے پاس اکٹھی ہوں گی اھ
آیات مسطورہ میں اس امر کی خبر دی گئی ہے کہ جب تک کہ اخیر زمانہ میں شیلا کا ظہور نہ ہو اس وقت تک یہوداہ کی نسل سے حکومت و ریاست منقطع نہ ہوگی۔
اہل اسلام کے نزدیک شیلا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا لقب ہے۔ نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا لقب قرار دیتے ہیں مگر نصاریٰ کا یہ خیال صحیح نہیں اس لیے کہ اس عبارت کا سیاق اس کو مقتضی ہے کہ شیلا کو نسل یہوداہ سے خارج مانا جائے اس لیے کہ شیلا کے ظہور سے نسل یہوداہ کی حکومت و ریاست کا انقطاع جب ہی مقصود ہو سکتا ہے کہ جب شیلا نسل یہوداہ سے نہ ہو ورنہ اگر شیلا نسل یہوداہ سے ہو تو اس کا ظہور تو بقائے حکومتِ یہوداہ کا باعث ہوگا نہ کہ انقطاعِ حکومت یہوداہ کا۔

یہ لفظ عربی نسخوں میں ہے ۱۲ منہ

اور بائیبل کے ابواب بلکہ انجیل متی کے پہلے ہی صفحہ پر ذرا غور کرنے سے یہ بات بخوبی منکشف ہو سکتی ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ الصلوٰۃ والسلام نسل یہوداہ سے خارج نہیں اس لیے کہ آپ حضرت داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نسل سے ہیں اور حضرت داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام بالاجماع یہوداہ کی نسل سے ہیں۔

لہٰذا شیلا کا مصداق وہی نبی ہو سکتا ہے جو نسل یہوداہ سے خارج ہو اور اس کا ظہور آخیر زمانہ میں ہو جیسا کہ آیت اوّل کے اس جملے سے ظاہر ہے۔

"تاکہ میں اُس کی جو پچھلے دنوں میں تم پر بیتے گا تمہیں خبر دوں"

اور یہ دونوں امر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی پر صادق آسکتے ہیں کہ آپ یہوداہ کی نسل سے بھی نہ تھے بلکہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی نسل سے تھے اور آپ کا ظہور بھی خاتم النبیین ہونے کی وجہ سے اخیر زمانہ میں ہوا۔

اور آپ کی بعثت کے بعد سے یہودا کی نسل میں جو کچھ حکومت و ریاست تھی وہ سب جاتی رہی قرائتے، بنی نضیر اور خیبر سب آپ ہی کے زمانہ میں فتح ہوگئے اور اس جملہ میں کہ

"قومیں اس کے پاس اکٹھی ہوں گی"

عموم بعثت کی طرف اشارہ ہے کما قال اللہ تعالیٰ شانہ

قل یا ایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعاً،

اے نبی کہہ دیجئے کہ اے لوگو میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔"

بخلاف حضرت عیسٰی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کہ اُن کی بعثت صرف بنی اسرائیل کے لیے تھی۔ کما قال تعالیٰ شانہ ورسولاً الی بنی اسرائیل۔ نیز مختلف قومیں اور مختلف لوگ حضور پُرنور ہی کے پاس اکٹھے ہوتے اور آپ کے دین میں فوج فوج اور جوق جوق داخل ہوتے۔ یہ بات حضرت عیسٰی علیہ السلام کو حاصل نہیں ہوئی۔ اور گیارھویں آیت میں ہے:

"وہ اپنا گدھا انگور کے درخت سے باندھے گا۔"

سو مدارج النبوۃ میں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر فتح فرمایا تو وہاں ایک سیاہ حمار دیکھا۔ آپ نے اس سے کلام فرمایا اور اس کا نام دریافت فرمایا اس نے جواب دیا کہ میرا نام یزید بن شہاب ہے۔ حق تعالیٰ نے میری دادی کی نسل سے ساٹھ حمار پیدا کیے جس پر سوائے نبی کے کسی نے سواری نہیں کی اور مجھ کو اُمید ہے کہ آپ مجھ پر سواری فرمائیں گے میری دادی کی نسل سے میرے سوا اب کوئی باقی نہیں رہا اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام میں سے آپ کے، سوا کوئی باقی

نہیں رہا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر سواری فرمائی اور وہ حمار آپ کی وفات کے بعد صدمۂ رحلت سے ایک کنویں میں گر کر مر گیا۔

اور اسی گیارھویں آیت میں ہے:

"وہ اپنا لباس مئے میں اور اپنی پوشاک آبِ انگور میں دھووے گا۔"

اس آیت میں اصل عبرانی سے ترجمہ کرنے میں کچھ تصرف کیا گیا ہے۔

"وہ اپنا لباس مئے سے اور اپنی پوشاک آبِ انگور سے دھووے گا۔"

یعنی اُس نبی آخر الزماں کی شریعت میں شراب حرام کی جائے گی اور جس طرح دیگر نجاست سے کپڑوں کے دھونے کا حکم دیا جاتا ہے اسی طرح شراب سے بھی کپڑوں کے پاک رکھنے اور دھونے کا حکم دیا جائے گا۔

اور عجب نہیں کہ اس سے محبتِ الٰہی کی شراب میں استغراق مراد ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تو بہت ارفع ہے۔ آپ تو سید الاولین والآخرین بلا فخر ہیں۔ آپ کی اُمت میں ہزارہا بلکہ لاکھوں ایسے گزر گئے کہ عشقِ الٰہی اور محبتِ ربانی میں کوئی اُمت اُن کی ہمسری نہیں کر سکتی۔"

اور پھر بارہویں آیت میں ہے:

"اس کی آنکھیں مئے سے لال ہوں گی اور اس کے دانت دودھ سے سفید ہوں گے"

اس آیت میں اُسی نبی مبشر کے حلیہ مبارک کی طرف اشارہ ہے کہ اُس کی آنکھیں سُرخ اور دانت سفید ہوں گے۔ چنانچہ زرقانی شرح مواہب میں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تجارت کے لیے بُصریٰ تشریف لے گئے تو ایک سایہ دار درخت کے قریب قیام فرمایا جہاں نسطورا راہب کا تکیہ تھا۔ نسطورا راہب نے میسرہ غلام سے جو آپ کے ہمراہ تھا یہ دریافت کیا کہ آپ کی آنکھوں میں سُرخی ہے۔ میسرہ نے یہ جواب دیا کہ آپ کی آنکھوں میں ہمیشہ سُرخی رہتی ہے کبھی جُدا نہیں ہوتی۔ اس وقت نسطورا راہب نے یہ کہا کہ یہ آخری پیغمبر ہیں۔ کاش میں اُن کی بعثت کا زمانہ پاؤں۔

شیخ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ نے تاریخ مصر میں لکھا ہے کہ جب حضرت حاطب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا والا نامہ سلطان مقوقس شاہ مصر کے نام لے کر گئے تو شاہ مصر نے نبی آخر الزمان کی علامات بیان کرتے ہوئے یہ کہا کہ سُرخی اُن کی آنکھوں سے جُدا نہیں ہوتی۔ حضرت حاطب نے فرمایا کہ بے شک آپ کی چشمان مبارک سے سُرخی کبھی جُدا نہیں ہوتی۔ چنانچہ آپ کے شمائل میں

اشکل العینین کا لفظ آیا ہے۔ اَشکَل ایسی آنکھ والے کو کہتے ہیں کہ جس کی سفیدی میں سُرخ ڈورے ہوں۔ اور بعض روایات میں اَدعَج کا لفظ آیا ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ جس کی آنکھ میں سیاہی ہو۔ سو دونوں روایتوں میں کوئی تعارض نہیں حسن جمال کے لیے سُرخی اور سیاہی دونوں درکار ہیں۔ محض سُرخی اور محض سیاہی سے اتنا حسن پیدا نہیں ہوتا جتنا کہ سُرخی اور سیاہی سے مل کر پیدا ہوتا ہے۔

بشارت ششم

از زبور سیدنا داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام باب ۴۵

میرے دل میں اچھا مضمون جوش مارتا ہے میں اُن چیزوں کو جو میں نے بادشاہ کے حق میں بنائی ہیں بیان کرتا ہوں۔ میری زبان ماہر لکھنے والے کا قلم ہے ۔۲۔ تو حسن میں بنی آدم سے کہیں زیادہ ہے ۔ تیرے ہونٹوں میں لطف بٹایا گیا ہے اسی لیے خدا نے تجھ کو ابد تک مبارک کیا۔ ۳۔ اے پہلوان اپنی تلوار کو جو تیری حشمت اور بزرگواری ہے حمایل کر کے اپنی ران پر لٹکا۔ ۴۔ اور اپنی بزرگواری سے سوار ہو اور سچائی اور ملائمت اور صداقت کے واسطے اقبال مندی کے لیے آگے بڑھ۔ اور تیرا داہنا ہاتھ تجھ کو مہیب کام سکھلائے گا۔ ۵۔ تیرے تیر تیز ہیں، لوگ تیرے نیچے گرے پڑتے ہیں۔ وہ بادشاہ کے دُشمنوں کے دل میں لگ جاتے ہیں۔ ۶۔ تیرا تخت اے خدا ابدالآباد ہے۔ تیری سلطنت کا عصا۔ راستی کا عصا ہے ۔ ۷۔ تو صداقت کا دوست اور شرارت کا دشمن ہے۔ اس سبب سے تیرے خدا نے تجھ کو خوشی کے تیل سے تیرے مصاحبوں سے زیادہ مسح کیا۔ ۸۔ تیرے سارے لباس سے مُر اور عود اور تج کی خوشبو آتی ہے کہ جن سے ہاتھی دانت کے محلوں کے درمیان تجھ کو خوش کیا ہے ۹۔ بادشاہوں کی بیٹیاں تیری عزت والیوں میں ہیں، ملکہ اوفیر کے سونے سے آراستہ ہو کے تیرے داہنے ہاتھ کھڑی ہے ۔"

اور بارہویں آیت میں ہے ۔

"اور صور کی بیٹی ہدیے لائے گی۔ قوم کے دولت مند تیری خوشامد کریں گے"

اور سولہویں آیت میں ہے ۔

۱۶۔ تیرے بیٹے باپ دادوں کے قائمقام ہوں گے تو انہیں تمام زمین کا

سردار مقرر کرے گا۔ ۱۷۔ میں ساری پشتوں کو تیرا نام یاد دلاؤں گا اور سارے لوگ ابدالآباد تک تیری ستائش کریں گے انتہی، تمام اہل کتاب کے نزدیک یہ امر مسلّم ہے۔
کہ اس زبور میں حضرت سیدنا داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک عظیم الشان ذالشوکت رسُول کی بشارت دے رہے ہیں اور فرطِ محبت میں اُس کو مخاطب بنا کر اس کے اوصاف بیان فرما رہے ہیں اور یہ بتلا رہے ہیں کہ وہ نبی جب ظاہر ہو گا تو ان صفات کے ساتھ موصوف ہو گا۔ وہ اوصاف حسبِ ذیل ہیں :
۱۔ بادشاہ یعنی سب سے اعلیٰ اور افضل ہونا۔ ۲۔ حسین ہونا۔ ۳۔ ہونٹوں میں لُطف کا ہونا یعنی شیریں زبان اور فصیح اللسان ہونا۔ ۴۔ مبارک الی الدہر ہونا۔ ۵۔ پہلوان یعنی قوی ہونا۔ ۶۔ شمشیر بند ہونا۔ ۷۔ صاحب حق وصداقت ہونا۔ ۸۔ اقبال مند ہونا۔ ۹۔ اُس کے دائیں ہاتھ سے کسی عجیب و غریب کرشمہ کا ظاہر ہونا۔ ۱۰۔ تیرانداز ہونا۔ ۱۱۔ لوگوں کا اس کے نیچے گر پڑنا یعنی خلق اللہ کا اُس کے تابع ہونا۔ ۱۲۔ تخت کا ابدالآباد تک رہنا یعنی اس کی شریعت اور حکومتِ اسلام کا تا قیامِ قیامت باقی رہنا ۱۳۔ عصائے سلطنت کا عصائے راستی ہونا۔ ۱۴۔ صداقت کا دوست اور شرارت کا دشمن ہونا۔ ۱۵۔ اُس کے کپڑوں سے خوشبو کا آنا، ۱۶۔ اُس کے گھرانہ میں بادشاہوں کی بیٹیوں کا آنا۔ ۱۷۔ ہدایا اور تحائف کا آنا۔ ۱۸۔ اولاد کا بجائے باپ کے سردار اور حاکم ہونا۔ ۱۹۔ تمام پشتوں میں قرناً بعد قرن اور نسلاً بعد نسلٍ اس کا ذکر باقی رہنا۔ ۲۰۔ ابدالآباد تک لوگوں کا اُس کی ستائش کرنا۔
اہل اسلام کے نزدیک اس بشارت کا مصداق صادق محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہود کے نزدیک داؤد علیہ السلام کے بعد سے اب تک کوئی نبی ان صفات کے ساتھ موصوف ہو کر ظاہر نہیں ہوا اور نصاریٰ یہ کہتے ہیں کہ اس بشارت سے حضرت عیسٰی علیہ السلام مراد ہیں مگر اہلِ اسلام کا دعویٰ کہ اس بشارت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی مراد ہیں یہی حق ہے اس لیے کہ جو اوصاف اس بشارت میں مذکور ہیں وہ صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی پر صادق ہیں۔
۱۔ بادشاہت کا ثبوت آنحضرت کے لیے شمس فی نصف النہار سے زائد اجلیٰ اور روشن ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ نے آپ کو دین و دُنیا دونوں کی بادشاہی عطا فرمائی۔ احکام خداوندی کو بادشاہوں

کی طرح جاری فرمایا۔ جس طرح نصاریٰ کے زعم میں حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام یہود لعنہم اللہ تعالیٰ سے مقہور و مجبور تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مجبور نہ تھے۔ آپ نے تو یہود کو ان کے قلعوں سے نکال باہر کیا۔

الحاصل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دین و دنیا کے بادشاہ تھے۔ تمام انبیاء و رسل سے افضل اور برتر تھے نہ کسی رسول کو قرآن کریم جیسی معجز کتاب عطا کی گئی اور نہ کسی کو آپ جیسی کامل و مکمل شریعت عطا کی گئی کہ فلاح دارین اور نجات اور بہبودی کی پوری پوری کفیل ہو۔ جس نے عقائد و اعمال کی سنگین غلطیوں پر متنبہ کیا ہو۔ خدا تک پہنچنے کے لیے راستہ ایسا صاف کر دیا ہو کہ چلنے والوں کے لیے کوئی روڑا اٹکا نہ رکھا ہو۔ تہذیب، اخلاق اور تدبیر منزل سیاست ملکیہ و مدنیہ کے لحاظ سے بھی نہایت کامل و مکمل ہو۔ غرض یہ کہ اس میں جامعیت کبریٰ کا وصف نمایاں ہو۔ ان تمام محاسن اور خوبیوں کا جامع صرف دین اسلام ہے جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے پاس سے لائے۔

ان الدین عند اللہ الاسلام۔ بے شک دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔

یہی وہ کامل و مکمل دین ہے کہ اس کے طلوع ہوتے ہی سب ادیان و مذاہب کے چراغ گل ہو گئے ؎

رات محفل میں ہر اک مہ پارہ گرم لاف تھا صبح کو خورشید جو نکلا تو مطلع صاف تھا

پس جس نبی کی کتاب تمام کتب الٰہیہ اور صحف سماویہ سے افضل ہو اور اس کی شریعت تمام شرائع اور ادیان سے بدرجہا برتر اور کامل اور اکمل ہو اور اس کے معجزات بھی تمام انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے معجزات سے بڑھے ہوئے ہوں اور اس کی امت بھی تمام امتوں سے علم اور عمل، اعتقادات اخلاق، مکارم و شمائل، تہذیب و تمدن، سیاست ملکیہ اور مدنیہ کے لحاظ سے فائق اور برتر ہو تو اس نبی کے سید الاولین والآخرین اور بادشاہ دو جہاں ہونے میں کیا کلام اور شبہ ہو سکتا ہے۔

۲۔ حسن و جمال میں آپ کا یہ حال تھا کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زائد کسی کو حسین اور خوبصورت نہیں دیکھا۔ گویا کہ آفتاب آپ کے چہرہ مبارک میں گھومتا ہے اور جب تبسم فرماتے تو دندان مبارک کی چمک دیواروں پر پڑتی تھی۔

حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ؎

واحسن منک لم ترقط عینی واجمل منک لم تلد النساء

میری آنکھ نے آپ سے زائد حسین نہیں دیکھا اور آپ سے زائد جمیل اور خوبصورت عورتوں نے نہیں جنا

خلقت مبرءً من کل عیب　　　　کانک قد خلقت کما تشاء

آپ ہر عیب سے پاک پیدا کیے گئے ہیں　　　　گویا کہ آپ حسب منشا پیدا کیے گئے

۳- اور آپ کا خوش بیان اور شیریں زبان اور فصیح اللسان ہونا سب کو تسلیم ہے۔ آپ کے انفاس قدسیہ اور کلمات طیبات اس وقت تک باسانید صحیح و جیدہ محفوظ ہیں جن سے آپ کی فصاحت و بلاغت اور شیریں زبانی کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

۴- اور آپ مبارک الی الدہر بھی ہیں جیسا کہ بشارت دوم میں گزرا۔ مشرق و مغرب، شمال و جنوب میں کروڑ ہا مسلمان نمازمیں اور نماز کے بعد اور مختلف اوقات میں

اللّٰھم بارک علیٰ محمد و علیٰ اٰل محمد کما بارکت علیٰ ابراھیم و علیٰ اٰل ابراھیم انک حمید مجید،

اے اللہ برکت نازل فرما محمدؐ پر اور محمدؐ کی آل پر جیسے آپ نے ابراہیم اور اُن کی آل پر برکت نازل فرمائی بلاشبہ آپ ستائش اور بڑی بزرگی والے ہیں۔

پڑھتے ہیں۔ اس سے زائد اور کیا مبارک الی الدہر ہونے کی دلیل ہو سکتی ہے جس کے لیے دُنیا کے ہر گوشہ میں برکت کی دعا مانگی جاتی ہے۔

۵- قوت میں آپ کا یہ حال تھا کہ رکانہ پہلوان کو کہ جو قوت میں اپنی نظیر نہ رکھتا تھا ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگل میں مل گیا اور یہ کہا کہ اگر آپ مجھ کو پچھاڑ دیں تو میں آپ کو نبی برحق جانوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کو پچھاڑ دیا۔ اُس نے دوبارہ لڑنے کے لیے کہا۔ آپ نے اُس کو دوبارہ بھی پچھاڑ دیا۔ اُس کو بہت تعجب ہوا۔ آپ نے یہ ارشاد فرمایا اگر تو اللہ سے ڈرے اور میرا اتباع کرے تو اس سے زائد عجیب چیز دکھلاؤں۔ اُس نے پوچھا کہ اس سے زائد کیا عجیب ہے۔ آپ نے ایک درخت کو بلایا آپ کے بلاتے ہی آپ کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ بعد ازاں یہ فرمایا کہ لوٹ جا سو وہ درخت یہ سُن کر اپنی جگہ لوٹ گیا۔

۶- اور آپ کا شمشیر بند اور صاحب جہاد ہونا بھی مسلّم ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نہ شمشیر بند تھے اور نہ صاحب جہاد۔ اور بقول نصاریٰ اُن میں اتنی قوت بھی نہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو یہود سے بچا سکے۔

۷- اور آپ صاحب حق و صداقت بھی تھے۔ کما قال تعالیٰ شانہٗ

ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ

ولو کرہ المشرکون ط بل جاء بالحق وصدق المرسلین (صافات)

والذی جاء بالصدق وصدق به اولئک هم المتقون (سورہ زمر)

خدا ہی نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا ہے تاکہ اس کو تمام دینوں پر غالب کر دے اگرچہ مشرکین کو ناگوار گزرے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شاعر و مجنون نہیں بلکہ حق لے کر آئے ہیں اور پیغمبروں کی تصدیق کی ہے اور جو سچی بات لے کر آیا اور جس نے اس کی تصدیق کی یہی پرہیز گار ہیں۔

ایک مرتبہ نضر بن الحارث نے قریش کو مخاطب بنا کر یہ کہا:

قد کان محمد فیکم غلاما حدثا ارضاکم فیکم واصدقکم حدیثا و اعظمکم امانۃ، حتیٰ اذا رأیتم فی صدغیه الشیب وجاءکم بما جاءکم قلتم انه ساحر لا واللہ ماهو بساحر

محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم میں نوجوان تھے سب سے زائد پسندیدہ سب سے زائد سچے، سب سے زائد امین، لیکن جب تم نے ان کے جانبین راس میں بڑھاپا دیکھا اور وہ تمہارے پاس یہ دین حق لے کر آئے تو تم ان کو ساحر اور جادوگر کہنے لگے، ہرگز نہیں، خدا کی قسم وہ ساحر نہیں۔

اور ہرقل شاہ روم نے جب ابوسفیان سے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے متعلق یہ دریافت کیا کہ تم نے کبھی اس کو متہم بالکذب کیا ہے تو اس پر ابوسفیان نے یہ جواب دیا کہ ہم نے ان سے کبھی کوئی کذب نہیں دیکھا۔

۸- اور اقبال مند ہونا بھی ظاہر ہے اس لیے کہ حق تعالیٰ شانہ نے جیسا آپ کو اقبال عطا فرمایا ایسا اقبال آج تک کسی کو نصیب نہیں ہوا اور نہ ہوگا۔

۹- اور دائیں ہاتھ سے مہیب کام اور عجیب و غریب کرشمہ ظاہر ہونے سے معجزۂ شق قمر کی طرف اشارہ ہے ؎

چو دستش برآہیخت شمشیر بیم　　　بمعجز میان قمر زد دو نیم

اور علیٰ ہذا جنگ بدر اور جنگ حنین میں ایک مٹھی خاک سے تمام مشرکین کو خیرہ کر دینا یہ بھی آپ کے دائیں ہاتھ کا مہیب کام تھا۔

۱۰- تیرانداز ہونا بنی اسمٰعیل کا مشہور شعار ہے چنانچہ حدیث میں ہے۔

ارموا بنی اسمٰعیل فان اباکم کان رامیا۔
اے بنی اسمٰعیل تیراندازی کیا کرو اس لیے کہ تمہارا باپ تیرانداز تھا۔
اور دوسری حدیث میں ہے
من تعلم الرمی ثم ترک، فلیس منا
جو تیراندازی سیکھ کر چھوڑ دے وہ ہم میں سے نہیں۔
۱۱۔ اور لوگوں کا آپ کے نیچے گرنا، یعنی خلق اللہ کا آپ کے تابع ہونا، یہ بھی اظہر من الشمس ہے
چند ہی روز میں ہزاراں ہزار اسلام کے حلقہ بگوش بن گئے کما قال اللہ تعالیٰ شانہٗ
اذا جاء نصر اللّٰہ والفتح ورایت الناس یدخلون فی دین اللّٰہ افواجاً
فسبح بحمد ربک واستغفرہ، انہ کان توابا ہ
جب اللہ کی نصرت اور فتح آ چکی اور آپ نے لوگوں کو اللہ کے دین میں جوق درجوق
داخل ہوتے ہوتے دیکھ لیا تو اپنے رب کی تسبیح و تحمید کیجئے اور استغفار پڑھیے
بے شک خدا بہت توبہ قبول فرمانے والا ہے۔
۱۲، ۱۳۔ اور آپ کی شریعت ابد الآباد تک رہے گی چنانچہ قرآن کریم حسب وعدہ الٰہی
انا نحن نزلنا الذکر وانالہ لحافظون، بے شک ہم نے قرآن کو نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔
تیرہ صدی سے بالکل محفوظ چلا آتا ہے بحمد للہ اب تک اس کے ایک نقطہ اور ایک شوشہ میں بھی
سر مو تفاوت نہیں آیا اور ان شاء اللہ تعالیٰ تا قیام قیامت اسی طرح رہے گا اور یہود و نصاریٰ کو اپنی
تورات و انجیل کا حال خوب معلوم ہے لکھنے کی حاجت نہیں۔ اور آپ کی سلطنت کا عصا راستی اور
صداقت کا عصا ہے ہمیشہ اس سے احقاق حق اور ابطال باطل ہوتا رہتا ہے۔
۱۴۔ اور آپ صداقت کے دوست اور شرارت کے دشمن تھے کما قال اللہ جل جلالہٗ
لقد جاءکم رسول من انفسکم عزیز علیہ ما عنتم حریص علیکم
بالمومنین رؤف رحیم ہ یا ایھا النبی جاھد الکفار والمنافقین
واغلظ علیھم۔
بے شک تمہارے پاس تم میں سے ایسے رسول آ گئے ہیں کہ جن پر تمہاری تکلیف شاق
ہے تمہاری بھلائی کے لیے حریص ہیں مومنین پر نہایت شفیق اور مہربان ہیں۔
اے نبی کریم کفار و منافقین سے جنگ کیجیے اور ان پر سختی کیجئے۔

اور آپ کی اُمت کے یہ اوصاف ہیں ۔

اشداءُ علی الکفار رُحماءُ بینھم اذلۃ علی المومنین اعزۃ علی الکافرین یجاھدون فی سبیل اللہ ولا یخافون لومۃ لائم ۔

کافروں پر بہت سخت اور آپس میں مہربان مومنوں پر نرم اور کافروں پر سخت ۔ اللہ کے راستہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی بالکل پروا نہ کریں گے اور عجب نہیں کہ شرارت سے ابوجہل مراد ہو کہ جو سرتاپا شرارت تھا اور صداقت سے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مراد ہوں جو کہ سرتاپا صدق و صداقت تھے اور بے شک ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کے اہل تھے کہ ان کو خلیل و صدیق یعنی دوست بنایا جاتے ۔

۱۵- اور آپ کے کپڑوں سے خوشبو بھی آیا کرتی تھی حتیٰ کہ ایک عورت نے آپ کا پسینہ مبارک اس لیے جمع کیا تاکہ دُلہن کے کپڑوں کو اس سے معطر کرے ۔

۱۶- اور قرن اول میں بہت سی شہزادیاں مسلمانوں کی خادم بنی ہیں چنانچہ شہربانو یزدجرد شاہ کسریٰ کی بیٹی امام حسین رضی اللہ عنہ، کے گھر میں تھی ۔

۱۷- نجاشی شاہ حبشہ اور منذر بن ساوی شاہ بحرین اور شاہ عمان اور بہت سے امیر و کبیر آپ پر ایمان لائے اور آپ کے حلقہ بگوش بنے ۔ اور آپ کی خدمت میں سلاطین و امراء نے ہدایا بھیج کر فخر و سرفرازی حاصل کی ۔ چنانچہ مقوقس شاہ قبط نے آپ کی خدمت میں تین باندیاں اور ایک حبشی غلام اور ایک سفید خچر اور ایک سفید حمار اور ایک گھوڑا اور کچھ کپڑے بطور ہدیہ ارسال کیے ۔

۱۸- اور آپ کے بعد قریش میں خلافت رہی ۔ آپ کی اولاد میں امام حسن رضی اللہ عنہ، خلیفہ ہوتے اور امام حسن رضی اللہ عنہ، کی اولاد میں صدہا خلیفہ اور حکمران ہوتے ۔ حجاز و یمن، مصر و شام وغیرہ میں حکومت و سلطنت پر فائز رہے ۔ اور قیامت کے قریب امام مہدی کا ظہور ہو گا جو امام حسن کی اولاد سے ہوں گے اور تمام روئے زمین کے خلیفہ ہوں گے ۔

۱۹، ۲۰- اور آپ کی ستائش و ذکرِ خیر بھی ابدالآباد تک رہے گا ۔ ہر اذان میں اشھد ان لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ بلند آواز سے اشھد ان محمد رسول اللہ روزانہ پانچ مرتبہ کروڑہا مسلمان پکارتے ہیں ۔ کوئی وعظ اور خطبہ ایسا نہیں کہ جس میں آپ کا نام پاک محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہ لیا جاتا ہو ۔ محمد اور احمد کے معنے ستودہ کے ہیں ۔ اس بشارت کے شروع میں یا احمد کا لفظ صراحتاً مذکور تھا مگر حسد کی وجہ سے نکال دیا گیا مگر تاہم یہ اوصاف تو سوائے

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی پر صادق نہیں آتے۔
نصاریٰ کے زعم و اعتقاد پر تو حضرت مسیح بن مریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کسی طرح اس بشارت کا مصداق نہیں ہو سکتے اس لیے کہ نصاریٰ صحیفہ سعیاہ علیہ السلام کے ترپنویں[۵۳] باب کو حضرت مسیح علیہ السلام کی بشارت قرار دیتے ہیں اور وہ یہ ہے،

ہمارے پیغام پر کون اعتقاد لایا اور خداوند کا ہاتھ کس پر ظاہر ہوا۔ اس کے ڈیل ڈول کی کچھ خوبی نہ تھی اور نہ کچھ رونق کہ ہم اُس پر نگاہ کریں اور کوئی نمائش بھی نہیں کہ ہم اُس کے مشتاق ہوں وہ آدمیوں میں نہایت ذلیل و حقیر تھا۔ اھ۔

اور پھر آیت پنجم میں ہے:

"وہ ہمارے گناہوں کے سبب گھایل کیا گیا اور ہماری بدکاریوں کے باعث کچلا گیا۔" اھ

معاذ اللہ ثم معاذ اللہ جب نصاریٰ کے نزدیک حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایسے تھے تو وہ اوصاف زبور کا جو بالکل اس کی ضد ہیں کیسے مصداق ہو سکتے ہیں۔
ہمارے اعتقاد میں منجملہ دیگر تحریفات کے صحیفہ یسعیاہ علیہ السلام کا ترپنواں[۵۳] باب قطعاً و یقیناً الحاقی اور اختراعی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام حاشا ثم حاشا ہرگز ایسے نہ تھے۔ وہ تو دنیا و آخرت میں وجیہ (آبرو اور عزت والے) اور خدا کے مقربین میں سے تھے لیکن بایں ہمہ اس بشارت کا مصداق حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہیں اس لیے کہ نہ آپ شمشیر بند اور تیرانداز تھے اور نہ مجاہد تھے اور نہ آپ کی شریعت دائمی ہے۔ اور نہ آپ کی بعثت عام تھی اور نہ آپ کے گھرانے میں کوئی شہزادی آئی کہ جو آپ کی بیوی یا لونڈی ہوتی اس لیے کہ آپ نے کوئی نکاح ہی نہیں فرمایا۔ نیز آپ کے کوئی باپ دادا نہ تھا۔ آپ تو بغیر باپ کے پیدا ہوئے۔ واللہ سبحانہٗ و تعالیٰ اعلم۔

بشارت ہفتم

از زبور سیدنا داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام باب ۱۴۹۔
۱۔ خداوند کی ستائش کرو، خداوند کا ایک نیا گیت گاؤ۔ اور اس کی مدح پاک لوگوں کی جماعت میں، ۲۔ اسرائیل اپنے بنانے والے سے شادماں ہوتے۔ بنی صیہون اپنے بادشاہ کے سبب خوشی کریں۔ ۳۔ وہ اس کے نام کی ستائش کرتے ہوئے ناچیں۔ وہ طبلہ

اور بربط بجاتے ہوئے اس کی ثنا خوانی کریں۔ ۴۔ کیونکہ خداوند اپنے لوگوں سے خوش ہوتا ہے، وہ حلیموں کو نجات کی زینت بخشتا ہے۔ ۵۔ پاک لوگ اپنی بزرگواری پر فخر کریں اور اپنے بستروں پر پڑے ہوئے بلند آواز سے گایا کریں۔ ۶۔ خدا کی ستائش اُن کی زبانوں پر ہو دیں اور ایک دو دھاری تلوار اُن کے ہاتھوں میں ہو۔ ۷۔ تاکہ غیر اُمتوں سے انتقام لیویں اور لوگوں کو سزا دیویں۔ ۸۔ اُن کے بادشاہوں کو زنجیروں سے اور اُن کے امیروں کو لوہے کی بیڑیوں سے جکڑیں۔ ۹۔ تاکہ اُن پر وہ فتویٰ جو لکھا ہوا ہے جاری کریں کہ اس کے پاک لوگوں کی یہی شوکت ہے کہ خداوند کی ستائش کرو۔ اھ

اس بشارت میں نبی مُبشَّر کو بادشاہ کے لفظ سے اور اس کے مطیعین کو صالحین اور پاک لوگوں سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی وہ نبی موعود بادشاہ ہوگا اور اُس کی شمشیر زنی موافق خوشنودی حق اور بمقتضائے غضب الٰہی کافروں کے حق میں ہوگی اور اس کے اصحاب اور احباب اس کے ساتھ ہو کر کافروں سے جہاد و قتال کریں گے۔

بعد ازاں مطیعین کے کچھ اوصاف ذکر کیے گئے ہیں جو من اولہا الی آخرہا اُمت محمدیہ پر پورے منطبق ہیں یہی وہ اُمت ہے کہ جو اپنے بستروں پر بھی اللہ کو یاد کرتی ہے کما قال اللہ تعالیٰ

یذکرون اللہ قیاماً و قعوداً و علیٰ جنوبہم

وہ اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور کروٹ پر لیٹے ہوئے یاد کرتے ہیں۔

اور یہی وہ اُمت ہے کہ نماز میں اور جہاد میں اور ہر اذان میں اور عید الفطر اور عید النحر اور ایام تشریق اور ایام حج اور منیٰ اور مزدلفہ اور عرفات میں اللہ کو بلند آواز سے پکارتی ہے، بخلاف یہود و نصاریٰ کے کہ یہود تو بوق اور نصاریٰ ناقوس بجاتے ہیں بلند آواز ہی سے اللہ اکبر کہنا اور اللہ کو یاد کرنا صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کا شعار ہے۔

اور مہاجرین و انصار رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہی کی دو دھاری تلواروں نے روم و شام و دیگر ممالک کو فتح کیا اور بڑے بڑے بادشاہوں اور امیروں کو قید کیا ہے اور اہل کتاب کے نزدیک اس بشارت کا مصداق نہ سلیمان علیہ السلام ہو سکتے ہیں اخیر عمر میں مرتد اور بت پرست ہو گئے تھے۔

اور نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے اعتقاد کے مطابق اس بشارت کا مصداق ہو سکتے ہیں اس لیے کہ اُن کے نزدیک تو حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام خود ہی مقتول و مصلوب ہوتے۔

اور علیٰ ہذا آپ کے اکثر حواریین گرفتار کیے گئے وہ دوسرے بادشاہوں اور امیروں کو کہاں قید کرتے اور بشارت میں یہ مذکور ہے کہ وہ شخص موعود بادشاہ ہوگا اور ظاہر ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام بادشاہ نہ تھے اور معنوی بادشاہت ہر نبی کو حاصل رہی اس میں حضرت عیسیٰ کی کیا خصوصیت،

رہا کافروں سے قتال و جہاد کرنا اور ان کو گرفتار کرنا سو یہ عین عبادت ہے نہ کہ قابل اعتراض جیسا کہ موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اور موسیٰ علیہ السلام کے بعد یوشع بن نون علیہ السلام کا جہاد کرنا، اور علیٰ ہذا سلیمان علیہ السلام اور اُن کے صحابہ کا جہاد فرمانا تمام یہود و نصاریٰ کے نزدیک مسلّم ہے خلاصۂ کلام یہ کہ اس جزء کا مصداق حضرت مسیح نہیں ہو سکتے اس لیے کہ زبور مذکور کا مضمون بآواز بلند یہ کہہ رہا ہے کہ آنے والا نبی بادشاہ ہوگا اور اپنے اصحاب کے ساتھ سلاطین کفار سے جہاد و قتال کرے گا اور بڑے بڑے جبارین اور متکبرین مقتول اور اسیر اور گرفتار ہوں گے اور آپ کے اصحاب تکبیر کہتے ہوئے آپ کے ساتھ ہوں گے ؎

بتکبیر مرداں شمشیر زن کہ مرد دغا را شمارند زن

اور یہ تمام امور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر ظاہر ہوتے۔

بشارت ہشتم

از زبور باب ۷۲ درس اول

۱۔ اے خدا بادشاہ کو اپنی عدالتیں عطا کر اور بادشاہ کے بیٹے کو اپنی صداقت دے۔

۲۔ وہ تیرے لوگوں میں صداقت سے حکم کرے گا اور تیرے مسکینوں میں عدالت سے

۳۔ پہاڑ لوگوں کے لیے سلامتی ظاہر کریں گے اور ٹیلے بھی صداقت سے

۴۔ وہ قوم کے مسکینوں کا انصاف کرے گا اور محتاجوں کے فرزندوں کو بچاتے گا اور ظالم کے ٹکڑے ٹکڑے کرے گا۔

۵۔ جب تک کہ سورج اور چاند باقی رہیں گے ساری پشتوں کے لوگ تجھ سے ڈرا کریں گے۔

۶۔ وہ بارش کے مانند جو کاٹے ہوئے گھاس پر پڑے نازل ہوگا اور پھوہی کے مینہ کی طرح جو زمین کو سیراب کرتا ہے۔

۷۔ اس کے عصر میں جب تک کہ چاند باقی رہے گا صادق چلیں گے اور سلامتی فراواں ہوگی۔

۸۔ سمندر سے سمندر تک اور دریا سے انتہاء زمین تک اس کا حکم جاری ہوگا۔

۹- وہ جو بیابان کے باشندے ہیں اس کے سامنے جھکیں گے اور اس کے دشمن خاک چاٹیں گے۔
۱۰- ترسیس اور جزیروں کے سلاطین نذریں لائیں گے اور سبا اور سیبا کے بادشاہ ہدیے گزاریں گے۔
۱۱- سارے بادشاہ اس کے حضور سجدہ کریں گے ساری گروہیں اس کی بندگی کریں گی۔
۱۲- کیونکہ وہ دہائی دینے والے محتاج کو اور مسکین کو اور اُن کو جن کا کوئی مددگار نہ ہوگا چھڑائے گا۔
۱۳- وہ مسکین اور محتاج پر ترس کھائے گا اور محتاجوں کی جان بچائے گا۔
۱۴- وہ اُن کی جانوں کو ظلم اور غضب سے بچائے گا ان کا خون اس کی نظر میں بیش قیمت ہوگا۔
۱۵- وہ جیتا رہے گا اور سبا کا سونا اس کو دیا جائے گا اُس کے حق میں سدا دعا ہوگی ہر روز اُس کو مبارکباد کہی جائے گی۔
۱۶- اناج کی کثرت سرزمین میں پہاڑوں کی چوٹیوں پر ہوگی اُس کا پھل لبنان کے درخت کی طرح جھڑ جھڑائے گا اور شہر کے لوگ میدان کے گھاس کے مانند سرسبز ہوں گے۔
۱۷- اس کا نام ابد تک باقی رہے گا جب تک کہ آفتاب رہے گا اُس کے نام کا رواج ہوگا لوگ اس کے باعث اپنے تئیں مبارک کہیں گے ساری قومیں اُسے مبارکباد دیں گی۔
۱۸- خداوند خدا اسرائیل کا جو اکیلا ہی عجائب کام کرتا ہے مبارک ہے۔
۱۹- اس کا جلیل نام ابد تک مبارک ہے سارا جہان اس کے جلال سے معمور ہو آمین آمین۔
۲۰- داؤد بن یسی کی دعائیں تمام ہوئیں (بہترواں زبور ختم ہوا)

جاننا چاہیے کہ اس زبور میں ایسے پیغمبر کے ظہور کی خبر دی گئی ہے کہ جس کو نبوت و رسالت کے ساتھ من جانب اللہ بادشاہت اور حکومت بھی حاصل ہوگی اور (۱) اُس کا دائرہ سلطنت اتنا وسیع ہوگا کہ برّ و بحر کو شامل ہوگا۔ اور (۲) عدالت اور صداقت کے ساتھ اس کی عدالتیں جاری ہوں گی۔ مسکینوں (۴) اور محتاجوں کو ان کا حق دلائے گا۔ اور (۵) ظالموں کے ٹکڑے ٹکڑے کرے گا۔ اور اس کے دشمن لرزاں اور ترساں ہوں گے اور سلاطین عالم اس کے لیے ہدیے اور تحفے لائیں گے۔ اور (۷) تمام قبائل اُس کے مطیع اور فرمانبردار ہوں گے۔ ہر (۸) طرف سے ہر روز ساری قومیں اس کے حق میں دعا اور مبارکباد کہیں گے۔ اور (۹) ابد تک اس کا نام باقی رہے گا جب تک آفتاب رہے گا اس کے نام کا رواج رہے گا۔

اہل عقل ایک سرسری نظر سے سمجھ سکتے ہیں کہ یہ اوصاف مذکورہ حضرت مسیح علیہ السلام میں

نہ تھے بلکہ رسالتمآب خاتمیت جناب سرور عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی تھے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت کے ساتھ سلیمان اور ذوالقرنین جیسی حکومت عطا فرمائی کہ جس میں قوموں کے درمیان ایسی عدالت اور صداقت جاری ہوئی کہ دُنیا نے نہ ایسی صداقت اور عدالت دیکھی اور نہ سُنی ظالموں سے مظلوموں کا بدلہ لیا گیا اور زمین کو ظلم اور غضب سے پاک کر دیا۔ برّ اور بحر اور صحرا و بیابان میں آپ کی حکومت پھیلی اور دُشمن آپ سے تھرا اُٹھتے اور بڑے بڑے سلاطین آپ کے حضور سجدہ میں گرے اور ہدیے اور تحفے آپ کی بارگاہ میں بھیجے اور آپ نے صداقت اور عدالت کے جاری کرنے کے لیے جہادات اور غزوات کیے اور آپ کی جاری کردہ صداقت اور عدالت کو صدیق اکبر اور فاروق اعظم جیسے صداقت اور عدالت کے علمبرداروں نے حد کمال کو پہنچایا۔

اور ابد تک جب تک کہ چاند اور سورج قائم ہیں آپ کا نام مبارک ہر اذان اور نماز اور دُعا اور ہر منبر و محراب میں لیا جائے گا بلکہ خطبوں میں آپ کے نام مبارک کے ساتھ آپ کے خلفائے راشدین کا نام بھی لیا جائے گا جنہوں نے دُنیا میں صداقت و عدالت کا علم بلند کیا۔

اے علمائے یہود و نصاریٰ یہ ناچیز تم کو صداقت اور عدالت کا واسطہ دے کر پوچھتا ہے کہ جس صداقت اور عدالت کے جاری کرنے کا ذکر اس زبور میں ہے خدارا یہ بتلاؤ کہ سوائے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کہاں ظہور ہوا۔ اوصاف مذکورہ کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کے حواریین پر انطباق کسی صورت سے ممکن نظر نہیں آتا۔

بشارت نہم

از صحیفہ ملاکی علیہ الصلوٰۃ والسلام باب سوم آیت اوّل

دیکھو میں اپنے رسول کو بھیجوں گا اور وہ میرے آگے میری راہ کو درست کرے گا اور وہ خداوند جس کی تلاش میں تم ہو۔ ہاں ختنہ کا رسول جس سے تم خوش ہو وہ اپنی ہیکل میں ناگہاں آدے گا۔ دیکھو وہ یقیناً آدے گا۔ رب الافواج فرماتا ہے پر اس کے آنے دن کون ٹھہر سکے گا اور جب وہ نمود ہو گا کون ہے جو کھڑا رہے گا۔ اھ

اس بشارت میں ایسے رسول کی آمد و ظہور کا ذکر ہے کہ جو صاحب ختان ہو گا۔ اور اسی وجہ سے آپ کی بعثت سے قبل یہود و نصاریٰ کو رسول الختان کا انتظار تھا اور قیصر روم بھی اسی پیشین گوئی کے مطابق رسول ختان کے ظہور کا منتظر تھا جیسا کہ صحیح بخاری کی حدیث ہرقل میں

مذکور ہے مگر آج کل نسخوں میں بجائے ختنہ کے رسُول کے عہد کا رسُول مذکور ہے۔
لیکن اس صورت میں بھی عہد سے ختنہ ہی کا عہد مراد ہے جیسا کہ سفر پیدائش کے باب ہفدہم کی آیت دہم سے معلوم ہوتا ہے۔

اور میرا عہد جو میرے اور تمہارے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ہے جسے تم یاد رکھو سو یہ ہے کہ تم میں سے ہر ایک فرزند نرینہ کا ختنہ کیا جائے۔ اور تم اپنے بدن کی کھلڑی کا ختنہ کرو۔ اور یہ اُس عہد کا نشان ہوگا جو میرے اور تمہارے درمیان ہے اھ

بشارت دہم

از صحیفہ حبقوق علیہ الصّلوٰۃ والسّلام باب سوم آیت ۳

خدا تیمان سے۔ اور وہ جو قدوس ہے کوہِ فاران سے آیا۔ اس کی شوکت سے آسمان چھپ گیا اور زمین اُس کی حمد سے معمور ہوئی۔ اُس کی جگمگاہٹ نور کی مانند تھی اُس کے ہاتھ سے کرنیں نکلیں۔ انتہی

یہ بشارت سرورِ عالم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں نہایت ہی ظاہر ہے سوائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کون پیغمبر فاران سے مبعوث ہوا اور زمین اُس کی حمد سے معمور ہوئی ہو چنانچہ ہر دوست اور دشمن کی زبان پر آپ کا نام محمدؐ اور احمدؐ ہے اور ایک قدیم عربی نسخہ میں یہ لفظ ہیں:

وامتلأت الارض من تحمید احمد

یعنی تمام زمین احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمد سے بھر گئی

مگر حاسدین نے اس جملہ کا رہنا گوارا نہ کیا اور بعد کی اشاعت میں اس جملہ کو صحیفہ مذکورہ سے علیحدہ کر دیا اور علیٰ ہذا سارا عالم بھی آپ کے نورِ ہدایت سے جگمگا اٹھا۔

بشارت یازدہم

از صحیفہ یسعیاہ علیہ الصلوٰۃ والسّلام باب ۲۱ آیت ۶، ۷۔

خداوند نے مجھے یوں فرمایا جا نگہبان بٹھلا جو کچھ دیکھے سو بتلائے۔ اُس نے سوار دیکھے گھڑ چڑھوں کے جو دو دو آتے تھے اور گدھوں پر بھی سوار اور اونٹوں پر بھی سوار اھ

اس بشارت میں حضرت شعیاہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دو نبیوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔
اول حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف گدھے کی سواری سے ان ہی کی طرف اشارہ ہے
چنانچہ جناب مسیح علیہ السلام گدھے پر سوار ہو کر یروشلم (بیت المقدس) داخل ہوتے تھے۔
دوم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اونٹ کی سواری سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی طرف اشارہ ہے جو عرب کی خاص اور مشہور سواری ہے۔
چنانچہ آپ جب مدینہ طیبہ تشریف لے گئے تو اس وقت اونٹ پر سوار تھے اور پھر آیت نہم میں بابل کے سقوط یعنی اس کے گرنے کا ذکر ہے اور ظاہر ہے کہ بابل کا سقوط خلفاء راشدین کے زمانہ میں ہوا حضرت مسیح اور حواریین کے زمانہ میں بابل کا سقوط نہیں ہوا۔

بشارت دوازدہم

از صحیفہ یسعیاہ علیہ الصلوٰۃ والسلام باب ۲۱ آیت ۱۶، ۱۷

اس باب میں عرب کی بابت الہامی کلام کا ذکر ہے چنانچہ آیت ۱۶ میں ہے۔
خداوند نے مجھ کو یوں فرمایا ہنوز ایک برس ہاں مزدور کی سی ایک ٹھیک برس میں قیدار کی ساری حشمت جاتی رہے گی۔ ۱۷۔ اور تیر اندازوں کے جو باقی رہے قیدار کے بہادر لوگ گھٹ جائیں گے کہ خداوند اسرائیل کے خدا نے یوں فرمایا۔ اھ
چنانچہ ٹھیک ہجرت کے ایک سال بعد جنگ بدر میں بنی قیدار یعنی قریش کی ساری حشمت جاتی رہی ستر سردار مارے گئے اور ستر قید ہوئے اور بہت سے زخمی ہوئے۔ اور بنی قیدار کا بنی اسمٰعیل سے ہونا توریت وغیرہ اور تواریخ سے ثابت ہے اور علماء نصاریٰ کے نزدیک مسلم ہے۔

بشارت سیزدہم

از صحیفہ یسعیاہ علیہ الصلوٰۃ والسلام باب ۲۴ آیت ۲۳

اور چاند مضطرب ہوگا اور سورج شرمندہ کہ جس وقت رب الافواج کوہ صیہون پر اور یروشلم میں اپنے بزرگوں کے گروہ کے آگے حشمت کے ساتھ سلطنت کرے گا۔
چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت حشمت کے ساتھ سلطنت فرمائی اور چاند مضطرب یعنی اپنی اصلی حالت سے متغیر ہوا اور اس کے دو ٹکڑے ہو گئے کما قال تعالیٰ شانہٗ

اقتربت الساعۃ و انشق القمر قیامت قریب آگئی اور چاند دو ٹکڑے ہو گیا۔
اور سورج بھی شرمندہ ہوا چنانچہ غزوۂ خیبر میں اس کو حرکتِ معکوس کرنا پڑی۔

بشارت چہاردہم

از صحیفہ یسعیاہ علیہ الصلوٰۃ والسلام باب ۲۸ آیت ۱۳
سو خداوند کا کلام اُن سے یہ ہوگا حکم پر حکم، حکم پر حکم، قانون پر قانون، تھوڑا یہاں
تھوڑا وہاں۔
چنانچہ قرآن عزیز اسی طرح نجماً نجماً نازل ہوا۔ رہی انجیل سو وہ علمائے مسیحین کے نزدیک منزل
من اللہ ہی نہیں بلکہ وہ حواریین کی تصنیف ہے اور صحیفہ مذکورہ کی عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے
کہ کتاب موصوف کا منزل من اللہ ہونا ضروری ہے۔
اور ہمارے نزدیک جو انجیل حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دی گئی وہ تمام کتاب ایک
ہی مرتبہ نازل ہوئی۔ قرآن کریم کی طرح نجماً نجماً نازل نہیں ہوئی۔ قال تعالیٰ شانہٗ
وقرانا فرقناہ لتقرأہ علی الناس علی مکث و نزلناہ تنزیلا ط
قرآن کو ہم نے متفرق کر کے نازل کیا تاکہ آپ لوگوں کے سامنے ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں
و قال الذین کفروا لولا نزل علیہ القرآن جملۃ واحدۃ کذالک
لنثبت بہ فؤادک و رتلناہ ترتیلا ہ
اور ہم نے قرآن کو تھوڑا تھوڑا نازل کیا کافر کہتے ہیں کہ قرآن ایک ہی بار کیوں نہ
نازل کیا گیا۔ کہہ دو کہ ہم نے اسی طرح نازل کیا تاکہ آپ کے دل کو مضبوط رکھیں اس
لیے ہم نے ٹھہر ٹھہر پڑھ سنایا۔

بشارت پانزدہم

از صحیفہ یسعیاہ علیہ الصلوٰۃ والسلام باب ۴۲ آیت اوّل
دیکھو میرا بندہ جسے میں سنبھالتا میرا برگزیدہ جس سے میرا جی راضی ہے میں نے
اپنی روح اس پر رکھی وہ قوموں کے درمیان عدالت جاری کرائے گا۔
یہ بشارت بھی نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے لیے صریح ہے اس لیے کہ میرا بندہ یہ ترجمہ عبداللہ کا

ہے اور عبداللہ بھی آپ کے ناموں میں سے ایک نام ہے جیساکہ قرآن عزیز میں ہے
لما قام عبدُ اللہِ جب عبداللہ کھڑا ہوا۔
اور قرآن عزیز میں بکثرت عبداللہ کے لقب سے آپ کا ذکر کیا گیا ہے کما قال تعالیٰ
سبحٰن الذی اسریٰ بعبدہٖ و قال تعالیٰ مما نزلنا علیٰ عبدنا
پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندہ کو لے گیا اس چیز سے جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری
نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہ بشارت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں ہے
لیکن حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نصاریٰ کے اعتقاد میں خدا کے بندے نہیں بلکہ خدا اور معبود ہیں لہٰذا وہ اس کے مصداق نہیں ہو سکتے۔ اور برگزیدہ بعینہٖ ترجمہ مصطفیٰ کا ہے کہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مشہور و معروف نام ہے اور جس سے میرا جی راضی ہے یہ ترجمہ مرتضیٰ کا ہے کہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک نام پاک ہے۔
اور بزعم نصاریٰ اس جملہ کا مصداق یعنی جس سے میرا جی راضی ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہیں ہو سکتے اس لیے کہ وہ اُن کے زعم میں مصلوب و مقتول ہوتے۔ اور جو مقتول و مصلوب ہو جاتے وہ نصاریٰ کے نزدیک ملعون ہے جیساکہ گلیتوں کے تیسرے خط کے تیرہویں درس سے معلوم ہوتا ہے۔
مسیح جو ہمارے لیے لعنتی بنا اس نے ہمیں مول لے کر شریعت کی لعنت سے چھڑایا کیونکہ لکھا ہے کہ جو کوئی لکڑی پر لٹکایا گیا وہ لعنتی ہے۔ آہ
اس عبارت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے نصاریٰ کے اس زعم باطل کی بنا پر معاذاللہ خدا ان سے راضی نہیں۔

الحاصل

محمد مصطفیٰ احمد مرتضیٰ صلی اللہ علیہ وسلم بے شبہ خدا کے برگزیدہ بندہ اور رسول ہیں جن سے خدا راضی ہے۔
اور کتب سیر میں آپ کے اسماء مبارکہ میں آپ کا نام نامی مرتضیٰ اور رضی بھی لکھا ہے اور اسی وجہ سے رضی اللہ تعالیٰ تو آپ کے صحابہ کرام کا خاص شعار ہے کما قال تعالیٰ شانہٗ
لقد رضی اللہ عن المومنین اذ یبایعونک تحت الشجرۃ

البتہ تحقیق اللہ تعالیٰ مومنین سے راضی ہوا جبکہ وہ اس درخت کے نیچے آپ سے بیعت کر رہے تھے۔

محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم تراھم رکعاً سجداً یبتغون فضلا من اللہ و رضوانا ط سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود ط ذالک مثلھم فی التوراۃ۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور جو آپ کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت اور آپس میں مہربان ہیں۔ آپ اُن کو رکوع و سجود کرتے اللہ کا فضل اور اللہ کی رضا طلب کرتے دیکھیں گے۔ صلاح اور تقویٰ کی نشانی اُن کے چہروں پر سجدہ کے اثر سے نمایاں ہے یہ ہے اُن کی شان کہ جو تورات میں مذکور ہے۔

۴۔ اور روح سے مراد وحی الٰہی ہے کہ جس پر ارواح و قلوب کی حیات کا دارومدار ہے کما قال تعالیٰ شانہٗ

وکذالک اوحینا الیک روحاً من امرنا

اسی طرح ہم نے آپ کی طرف وحی بھیجی اپنے حکم سے

سو الحمدللہ کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے آپ پر مردہ قلوب کی حیات اور زندگی کے لیے ایک رُوح یعنی قرآن عظیم کو اتارا جس نے نازل ہوکر مردہ قلوب کو حیات اور بے شمار مریض دلوں کو شفا بخشی کما قال تعالیٰ شانہٗ

و ننزل من القرآن ما ھو شفاءٌ و رحمۃ للمومنین۔

اور اتارتے ہیں ہم ایسا قرآن کہ جو مومنین کے لیے سراسر شفاء اور رحمت ہے۔

۵۔ اور مبعوث ہوکر آپ نے باذن الٰہی عدالت کو بھی جاری فرمایا کما قال اللہ جل جلالہٗ وعم نوالہٗ

فلذالک فادع واستقم وکما امرت ولا تتبع اھواءھم وقل امنت بما انزل اللہ من کتاب وامرت لاعدل بینکم

پس اسی طرف بلائیے اور اسی پر قائم رہیے جیسا کہ آپ کو حکم کیا گیا ہے اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ فرمائیے اور یہ کہیے کہ میں ایمان لایا اللہ کی اتاری ہوئی کتاب پر اور حکم کیا گیا ہوں کہ تمہارے درمیان عدل و انصاف کروں۔

اور چونکہ عدالت کا جاری کرنا شوکت کو مقتضی ہے اس لیے یہ وصف بھی علی زعم نصاریٰ

حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام پر صادق نہیں اس لیے کہ نصاریٰ کے نزدیک تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں تو اتنی قوت بھی نہ تھی کہ جو اپنے کو قتل و صلب سے بچا سکتے شوکت تو درکنار

۶- پھر باب مذکور کی دوسری آیت میں ہے

کہ وہ نہ چلائے گا اور اپنی صدا بلند نہ کرے گا اور اپنی آواز بازاروں میں نہ سنائے گا۔

یہ جملہ بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر پوری طرح صادق آتا ہے چنانچہ صحیح بخاری کے باب کراہیۃ الصخب فی الاسواق میں عطاء بن یسار سے روایت ہے کہ میں نے عبد اللہ ابن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ، سے مل کر یہ دریافت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ اوصاف جو تورات میں مذکور ہیں بیان فرمایئے جواب میں عبد اللہ بن عمرو بن العاص نے بہت سے اوصاف ذکر فرماتے منجملہ ان کے یہ فرمایا:

لیس بفظ ولا غلیظ ولا سخاب بالاسواق

۷- اور باب مذکور کی تیسری آیت میں ہے:

وہ عدالت کو جاری کرائے گا کہ دائم رہے۔ یعنی وہ نبی صاحب حکومت اور صاحب عدالت ہوگا اور حضرت عیسیٰ کے یہاں حکومت کا نام بھی نہ تھا نہ کافروں سے جہاد کیا اور نہ مجرموں پر کوئی عدالت جاری کی۔ اس کا مصداق تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہو سکتے ہیں اور دائم رہنے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت غراء کا الی یوم القیامۃ باقی رہنا مراد ہے۔ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت اب تک برابر محفوظ ہے اور ان شاء اللہ ثم ان شاء اللہ ہمیشہ رہے گی کوئی امت اس بارہ میں امت محمدیہ کی ہمسری نہیں کر سکتی کسی امت نے بھی اپنے نبی کی شریعت اور اس نبی کے اقوال و افعال کی حفاظت امت محمدیہ کے مقابلہ میں عشر عشیر بھی نہیں کی۔ اور شریعت کے دائم ہونے سے خاتم الانبیاء ہونے کی طرف اشارہ ہے اس لیے شریعت کا دوام اور بقاء الی یوم القیامۃ جب ہی ہو سکتا ہے کہ اس نبی کے بعد اور کوئی نبی نہ بنایا جائے ورنہ اگر اس کے بعد کوئی اور نبی بنایا جائے تو شریعت سابقہ شریعت لاحقہ سے منسوخ ہو جانے کی وجہ سے دائمی نہ رہے گی۔

۸- اور باب مذکور کی چوتھی آیت میں ہے:

اس کا زوال نہ ہوگا اور نہ مسلا جائے گا جب تک راستی کو زمین پر قائم نہ کرے۔

چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال جب ہوا کہ جب راستی زمین پر قائم ہو گئی اور

اللہ تعالیٰ کی طرف سے

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا"

آج کے دن تمہارے لیے تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا اور میں نے تم پر اپنا انعام تمام کر دیا اور میں نے اسلام کو تمہارے دین بننے کے لیے پسند کر لیا۔

کی بشارت نازل ہو گئی اور

اِنّا فتحنا لک فتحاً مُبیناً بے شک ہم نے آپ کو ایک کھلم کھلا فتح دی۔

اور اذا جاء نصر اللّٰہ والفتح جب خدا کی مدد اور فتح آ پہنچی

کا وعدہ پورا ہو گیا اور عجب نہیں کہ راستی قائم کرنے سے خلافتِ صدیقیہ کی جانب اشارہ ہو جیسا کہ بعض علماء کی رائے ہے کہ راستی ترجمہ صدق کا ہے اور صدق کا اطلاق صدیق پر ایسا ہی ہے جیسا کہ عدل کا اطلاق زید پر۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض الوفات میں صدیق اکبر کو امام بنا کر اس طرف اشارہ فرما دیا کہ میرے بعد صدیق اکبر خلیفہ ہونے چاہئیں تاکہ صدق اور راستی قائم ہو۔

۹۔ اور چھٹی آیت میں ہے :

تیرا ہاتھ پکڑوں گا اور تیری حفاظت کروں گا۔

یہ جملہ بھی سوائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی اور پر صادق نہیں آتا اس لیے کہ اللہ نے آپ سے وعدہ فرمایا تھا۔

واللّٰہ یعصمک من الناس اللہ آپ کو لوگوں سے محفوظ رکھے گا۔

چنانچہ یہ وعدہ اللہ کا پورا ہوا، اللہ تعالیٰ نے آپ کی دستگیری کی اور حفاظت فرمائی ہاں بزعم نصاریٰ عیسیٰ علیہ السلام کی حفاظت نہیں ہوئی۔

۱۰۔ اور پھر چھٹی آیت میں جو نور کا ذکر ہے کہ لوگوں کے عہد اور قوموں کے نور کے لیے تجھے دوں گا اس سے نورِ ہدایت اور نورِ شریعت کا دینا مراد ہے جیسا کہ قرآن عزیز میں متعدد جگہ اس کا ذکر ہے۔

یا ایہا الناس قد جاءکم برھان من ربکم وانزلنا الیکم نوراً مبیناً

اے لوگو بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک برہان آ چکی ہے اور ہم نے

تمہاری طرف ایک نور (قرآن کریم) نازل کیا۔

فالذین آمنوا بہ وعزروہ ونصروہ واتبعوا النور الذی اُنزل معہ اولٰئک ھم المفلحون (سورہ اعراف)۔

پس جو لوگ آپ پر ایمان لاتے اور آپ کی مدد کی اور اسی نور کا اتباع کیا کہ جو آپ کے ساتھ نازل کیا گیا یہی لوگ فلاح والے ہیں۔

یا ایھا النبی انا ارسلنٰک شاھداً و مبشراً و نذیراً و داعیاً الی اللہ باذنہ و سراجاً منیراً۔ (سورہ احزاب)

اے نبی ہم نے تمہیں بشارت دینے والا اور ڈرانے والا اور خدا کی طرف خدا کے حکم سے بلانے والا اور ہدایت کا روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔

یریدون لیطفئوا نور اللہ بافواھھم واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون

کافر اپنی مونہوں کی پھونک سے اللہ کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں حالانکہ اللہ اپنے نور کو ضرور پورا فرمائیں گے اگرچہ کافروں کو ناگوار ہو۔

۱۱۔ اور آیت ہشتم میں ہے:

اور اپنی شوکت دوسرے کو نہ دوں گا

یہ جملہ بھی حرف بحرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق ہے۔

اعطیت مالم یعط احد من الانبیاء قبلی

مجھ کو من جانب اللہ وہ چیزیں عطا کی گئیں کہ جو انبیاء سابقین میں سے کسی کو نہیں دی گئیں۔

مثلاً ختم نبوت و رسالت، عموم بعثت و دعوت، مقام محمود، شفاعت کبریٰ، معراج سبع سمٰوٰت ان فضائل و مزایا سے سوائے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کسی نبی کو سرفراز نہیں کیا گیا۔ یہ حشمت و شوکت آپ کے سوا کسی کو نہیں دی گئی۔

اور اسی طرح حق تعالیٰ شانہ نے آپ کو وہ آیات بینات، محاسن اخلاق، فضائل و شمائل، علوم و معارف عطا فرمائے کہ جو کسی نبی اور رسول کو نہیں عطا فرماتے۔ خصوصاً قرآن حکیم کا معجزہ تو ایسا روشن معجزہ ہے کہ جس کے سامنے موافق و مخالف سب ہی کی گردنیں خم ہیں۔

ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم۔

یہ خدا کا فضل ہے وہ فضل جس کو چاہتا ہے دے دیتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

۱۲- اور گیارہویں آیت میں ہے :

بیابان عرب اور اُس کی بستیاں قیدار کے آباد دیہات اپنی آواز بلند کریں گے۔ سلع کے بسنے والے ایک گیت گائیں گے۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر سے للکاریں گے۔ وہ خداوند کا جلال ظاہر کریں گے۔ اھ

قیدار حضرت اسمٰعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ایک صاحبزادہ کا نام ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اجداد میں سے ہیں اور اس بیابان سے فاران کا بیابان مراد ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو چھوڑ آئے تھے جیسا کہ کتاب پیدائش باب کی اکیسویں آیت سے ظاہر ہے اور یہ وہی جگہ ہے کہ جہاں اس وقت مکہ معظمہ آباد ہے اور قیدار کے آباد دیہات سے یہی مکہ مراد ہے۔ اسی جگہ حضرت اسمٰعیل کی اولاد آباد ہوئی۔ الحاصل اس جملہ میں آپ کے مولد یعنی جائے ولادت کی طرف اشارہ ہے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ میں پیدا ہوں گے اور آپ کی اُمت اس بیابان میں لا الٰہ الا اللہ اور اللہ اکبر اور لبیک اللّٰھم لبیک کے نعروں سے اللہ کے جلال کو ظاہر کرے گی۔ سفر اور حضر میں اللہ کی تکبیر کہنا یہ خاص اُمت محمدیہ کا شعار ہے۔ اذان اور تکبیر کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں اور نصاریٰ میں گھنٹہ اور ناقوس بجا کر نماز پڑھی جاتی ہے اور بجائے تکبیر و توحید کے تثلیث اور تجسیم کا نعرہ لگاتے ہیں کہ خدا نے مریم کے پیٹ میں جسم پکڑا اور بندوں کی نجات کے لیے صلیب پر لٹکا۔

اور اس بشارت میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ وہ نبی مبشر قیدار بنی اسمٰعیل کی اولاد سے ہوگا لہٰذا اس بشارت کا مصداق انبیاء اسرائیل میں سے کوئی نبی نہیں ہو سکتا اس لیے کہ وہ سب حضرت اسرائیل کی اولاد سے ہیں نہ کہ قیدار بن اسمٰعیل کی اولاد سے۔ اور سلع مدینہ طیبہ کے ایک پہاڑ کا نام ہے۔ اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام ہجرت کی طرف اشارہ ہے واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

خلاصۂ کلام

یہ کہ یہ کلام معرفت التیام از اوّل تا آخر بآواز بلند یہ کہہ رہا ہے کہ وہ شخص موعود خداتعالیٰ کا

خاص برگزیدہ اور پسندیدہ بندہ ہوگا اور عامۂ خلائق کی پیشوائی اور سارے جہان کی بادشاہی اور رہنمائی کا منصب اس کو عنایت ہوگا اور شخص موعود بنی قیدار یعنی بنی اسمٰعیل میں سے ہوگا نہ کہ بنی اسرائیل میں سے کیونکہ قیدار بالاتفاق حضرت اسمٰعیل کے بیٹے کا نام ہے۔

پس اس خبر کا مصداق حضرت عیسٰی علیہ السلام نہیں ہو سکتے کیونکہ وہ بنی اسرائیل میں سے ہیں۔ بنی قیدار یعنی بنی اسمٰعیل میں سے نہیں

اور سارے جہان کی پیشوائی اور رہنمائی کا منصب بھی اُن کو حاصل نہیں ہوا اس لیے کہ انجیل میں ہے کہ حضرت عیسٰی صرف بنی اسرائیل کے گمراہ بھیڑوں کے طرف بھیجے گئے یعنی ان کی بعثت عام نہ تھی اور نہ حضرت عیسٰی نے کوئی حکومت کی اور نہ قوموں میں کوئی عدالت جاری کی پس اس خبر سے حضرت عیسٰی علیہ السلام کیسے مراد ہو سکتے ہیں۔ اس خبر میں جس قدر اوصاف مذکور ہیں وہ سب سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق اور منطبق ہیں لہذا وہی مراد ہو سکتے ہیں۔

بشارت شانزدہم

از صحیفہ یسعیاہ علیہ السلام باب ۵۲ درس ۱۳

۱۳۔ دیکھو میرا بندہ اقبال مند ہوگا وہ بالا اور ستودہ ہوگا اور نہایت بلند ہوگا۔ ۱۴۔ جس طرح بہتیرے تجھے دیکھ کے دنگ ہو گئے کہ اس کا چہرہ ہر ایک بشر سے زائد اور اس کی ہیکل بنی آدم سے زیادہ بگڑ گئی۔ ۱۵۔ اُسی طرح وہ بہت سی قوموں پر چھڑکے گا اور بادشاہ اس کے آگے اپنا منہ بند کریں گے کیونکہ وہ کچھ دیکھیں گے جو ان سے کہا نہ گیا تھا اور جو کچھ انہوں نے نہ سنا تھا وہ دریافت کریں گے (ختم ہوا)

اس بشارت میں میرے بندہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ستودہ صفات مراد ہے جس کے اقبال مند اور بالا اور ستودہ ہونے میں ذرہ برابر شک نہیں اور لفظ ستودہ ٹھیک لفظ محمد کا ترجمہ ہے۔

ع محمد ستودہ متین استوار

اور حق تعالیٰ نے حضور پُر نور کو وہ بلندی اور رفعت عطا کی کہ جو نہ کسی نے کبھی سُنی اور نہ دیکھی۔

حضرات نصاریٰ غور کریں کہ کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہ بلندی اور اقبال مندی بھی حاصل ہوئی نصاریٰ کے زعم فاسد کی بنا پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اقبال مندی اور نہایت بلندی تو کہاں سے حاصل ہوتی نصاریٰ کے عقیدہ صلیب کی بنا پر تو حضرت مسیح علیہ السلام کو وہ ذلت اور اہانت حاصل ہوئی کہ جو دنیا میں کبھی بھی کسی برگزیدہ حق کو نہیں ہوئی اہل اسلام تو اس توہین و تذلیل سے بری اور بیزار ہیں جو نصاریٰ اپنے مزعوم خدا کے لیے تجویز کرتے ہیں اسلام کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ حق تعالیٰ کے برگزیدہ بندے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو زندہ آسمان پر اٹھایا اور ان کے دشمنوں کو ناکام کیا۔

بشارت ہفدہم

از صحیفہ یسعیاہ علیہ السلام باب ۶۰ درس ۱

دربارۂ مکہ مکرمہ و مدینہ منورہ

۱۔ اٹھ روشن ہو (اے سرزمین مکہ) کہ تیری روشنی آئی اور خداوند کے جلال نے تجھ پر طلوع کیا ہے۔ ۲۔ کہ دیکھ تاریکی زمین پر چھا جائے گی اور تیرگی قوموں پر لیکن خداوند تجھ پر طالع ہوگا اور اس کا جلال تجھ پر نمودار ہوگا۔ ۳۔ اور قومیں تیری روشنی میں اور شاہان تیرے طلوع کی تجلی میں چلیں گے۔ اب یہاں سے زمین مدینہ کو خطاب ہے ۴۔ اپنی آنکھیں اٹھا کر چاروں طرف نگاہ کر وہ سب (لوگ) اکٹھے ہوتے ہیں وہ تجھ پاس ہوتے ہیں تیرے بیٹے دور سے آئیں گے اور تیری بیٹیاں گود میں اٹھائی جائیں گی۔ ۵۔ تب تو دیکھے گی اور روشن ہوگی ہاں تیرا دل اچھلے گا اور کشادہ ہوگا کیونکہ سمندر کی فراوانی تیری طرف پھرے گی اور قوموں کی دولت تیرے پاس فراہم ہوگی۔ ۶۔ اونٹوں کی قطاریں اور مدیان اور عیفہ کی سانڈنیاں آکے تیرے گرد بے شمار ہوں گی وہ سب جو سبا کے ہیں آئیں گے وہ سونا اور لبان لائیں گے اور خدا کی تعریفوں کی بشارتیں سنائیں گے۔ ۷۔ قیدار کی ساری بھیڑیں تیرے پاس جمع ہوں گی نبیط کے مینڈھے تیری خدمت میں حاضر ہوں گے وہ میری منظوری کے واسطے میرے مذبح پر چڑھائے جائیں گے اور میں اپنی شوکت کے گھر کو بزرگی دوں گا۔ ۸۔ یہ کون ہیں جو بدلی کی طرح اڑتے آتے ہیں اور کبوتروں کی مانند اپنی کابک کی طرف۔ ۹۔ یقیناً "بحری ممالک" میری راہ تکیں گے اور ترسیس (حلب) کے جہاز پہلے آئیں گے تیرے بیٹوں کو اُن

کے روپے اور سونے سمیت دور سے خداوند تیرا خدا اور اسرائیل کے قدوس کے نام کے لیے لائیں
کیونکہ اس نے تجھے بزرگی دی ہے ۔ ۱۰۔ اور اجنبیوں کے بیٹے تیری دیواریں اٹھائیں گے
اور اُن کے بادشاہ تیری خدمت گزاری کریں گے اگرچہ میں نے اپنے قہر سے تجھے مارا پر اپنی مہربانی
سے تجھ پر رحم کروں گا ۔ ۱۱۔ اور تیرے پھاٹک نت کھلے رہیں گی وہ دن رات کبھی بند نہ ہوویں گے
تاکہ قوموں کی دولت کو تیرے پاس لائیں اور اُن کے بادشاہوں کو دھوم دھام سے ساتھ ۔ ۱۲۔ کہ
وہ قوم اور وہ مملکت جو تیری خدمت گزاری نہ کرے گی برباد ہو جائے گی ہاں وہ قومیں بالکل
ہلاک ہو جائیں گی ۔ ۱۳۔ لبنان کا جلال تجھ پاس آئے گا سرو اور صنوبر اور دیوار ایک ساتھ تاکہ
میں اپنی مقدس مکان کو آراستہ کروں اور اپنے پاؤں کی کرسی کو رونق بخشوں ۔ ۱۴۔ اور تیرے
غارت گروں کے بیٹے بھی تیرے آگے جھکتے ہوئے آئیں گے یا وہ سب جنہوں نے تیری
تحقیر کی تیرے پاؤں پر پڑیں گے اور خداوند کا شہر اسرائیل کے قدوس کا صیہون تیرا نام رکھیں
گے ، ۱۵۔ اس کے بدلے کہ تو ترک کی گئی اور تجھ سے نفرت ہوتی ایسا کہ کسی آدمی نے تیری
طرف گزر بھی نہ کیا میں تجھے شرافت دائمی اور پشت در پشت لوگوں کا سرور بناؤں گی ۔ ۱۶۔ تو
قوموں کا دودھ بھی چوس لے گی ہاں بادشاہوں کی چھاتی چوسے گی اور تو جانے گی کہ میں خداوند تیرا
بچانے والا اور میں یعقوب کا قادر تیرا چھڑانے والا ہوں ۔ ۱۷۔ میں پیتل کے بدلے سونا لاؤں
گا اور لوہے کے بدلے روپا اور لکڑی کے بدلے پیتل اور پتھروں کے بدلے لوہا اور میں
تیرے حاکموں کو سلامتی اور تیرے عاملوں کو صداقت بناؤں گا ۔ ۱۸۔ آگے کو کبھی تیری سرزمین
میں ظلم کی آواز نہیں سنی جائے گی اور نہ کہ تیری سرحدوں میں خرابی یا بربادی کی تو اپنی دیواروں
کا نام نجات اور اپنے دروازوں کا نام ستودگی رکھے گی ۔ ۱۹۔ آگے تیری روشنی دن کو سورج سے
اور رات کو تیری چاندنی چاند سے نہ ہوگی بلکہ خداوند تیرا ابدی نور اور تیرا خدا تیرا جلال ہوگا ۔ ۲۰۔ تیرا
سورج پھر کبھی نہیں ڈھلے گا اور تیرے چاند کا زوال نہ ہوگا کیونکہ خداوند تیرا ابدی نور ہوگا اور
تیرے ماتم کے دن آخر ہو جائیں گے ۔ ۲۱۔ اور تیرے لوگ سب راستباز ہوں گے وہ ابد تک
سرزمین کے وارث اور میری لگائی ہوئی ٹہنی اور میرے ہاتھ کی کاریگری ٹھہریں گے تاکہ
میری بزرگی ظاہر ہو ۔ ۲۲۔ ایک چھوٹے سے ایک ہزار ہوں گے اور ایک حقیر سے ایک
قوی گروہ ہوگی میں خداوند اس کے وقت میں یہ سب کچھ جلد کروں گا ۔ باب ۶۰ ختم ہوا۔
اس باب کی پہلی آیت میں مکہ معظمہ کو خطاب ہے اور اس کو روشن اور منور ہونے کی

بشارت ہے اور نور اور روشنی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا نور یا قرآن کا نور مراد ہے قرآن کریم میں آپ کو اور قرآن کریم کو نور مبین کہا گیا ہے۔

۲۔ صدہا سال سے جو زمین پر کفر اور شرک اور گمراہی کی ظلمت اور تاریکی چھائی ہوئی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور نور قرآن سے زائل ہو گئی۔

۳۔ امیر و غریب اور بادشاہ اُس نور کے طلوع کی تجلی میں چلنے لگے۔

۴۔ اور رفتہ رفتہ وہ نور زمین کے چاروں طرف پھیلنے لگا اور مختلف قبائل اُس نور کے گرد اکٹھے ہونے لگے اور تیس برس کے اندر وہ نور دیار روم اور دیار مغرب اور دیار مشرق فارس اور کاشغر اور ختن اور ہند سندھ وغیرہ میں پہنچ گیا۔

۵۔ اور لاکھوں مسلمان پیادہ اور سوار امیر اور غریب حج بیت اللہ کے لیے مکہ مکرمہ میں جمع ہونے لگے اور بے شمار اونٹوں اور سانڈنیوں کی قطاریں مکہ معظمہ پہنچنے لگیں اور اونٹوں کی افراد جس قدر عرب اور مکہ معظمہ کے اطراف اور نواحی میں ہے وہ زمین کے کسی خطہ میں نہیں۔

۶۔ اور خداوند ذوالجلال کی حمد و ثنا اور تعریف کرنے والوں کے غول کے غول خانہ کعبہ کے گرد جمع ہونے لگے۔

۷۔ اور روئے زمین کے سلاطین اہل اسلام خانہ کعبہ اور اہل مکہ کے لیے لاکھوں درہم و دینار کے ہدایا بھیجنے لگے۔

۸۔ اور مدیان حضرت ابراہیم کے بیٹے کا نام ہے جو بطن قطورا سے ہے اور شہر مداین انہی کا آباد کیا ہوا ہے اور قیدار حضرت اسمٰعیل کے دوسرے بیٹے کا نام ہے جیسا کہ تورات کے کتاب پیدائش کے پچیسویں باب میں صراحۃً مذکور ہے اور اہل مداین اور نواحی سبا سب حضرت اسمٰعیل کی اولاد میں سے ہیں جو مشرف با اسلام ہوئے اور ہر سال اونٹوں اور سانڈنیوں پر سوار ہو کر حج بیت اللہ کے لیے حاضر ہوتے ہیں اور جن کی حمد و ثنا اور لبیک اللّٰھم لبیک لا شریک لبیک کی آوازوں سے دشت و بیابان گونجنے لگتے ہیں اور قیدار کی ساری بھیڑیں وہاں جمع ہو جاتی ہیں اور نبیط سے عرب مشرقی و شمالی کے قبائل مراد ہیں[1] اور مطلب یہ ہے کہ سبا یعنی یمن کے قبائل اور قیدار کی بھیڑیں یعنی قریش کے وحشی لوگ

---

[1] نبیط حضرت اسمٰعیل کے ایک فرزند کا نام ہے۔

اور نبیط کے مینڈھے یعنی موٹے اور فربہ آدمی۔ ہر طرف سے خدا کی تسبیح و تہلیل اور تحمید و تکبیر کے نعرے لگاتے ہوتے آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔

۹- اور کبوتروں کے مانند لوگ خانہ کعبہ کی طرف اڑ کر پہنچے گے اور اس کا طواف کریں گے۔

۱۰- اور اس وقت جو فخر اور جلال لبنان کو حاصل ہے وہ اُس وقت مکہ معظمہ کو حاصل ہوگا اور اس وقت ملک شام کو جو انبیاء بنی اسرائیل کے مسکن ہونے کا فخر اور شرف ہے وہ شرف اُس وقت مکہ مکرمہ کی طرف منتقل ہو جاتے گا جو خاتم الانبیاء اور سید الاصفیاء کا مولد اور مسکن ہوگا اور اس کے اصحاب انبیاء بنی اسرائیل کا نمونہ ہوں گے۔

۱۱- اور جو غارتگر خانہ کعبہ کا رُخ کرے گا وہ یک لخت ہلاک ہوگا جیسا کہ اصحاب فیل کا قصہ مشہور ہے۔

۱۲- اور خدا کا مقدس مکان یعنی خانہ کعبہ آراستہ اور پیراستہ ہوگا ہر سال اس پر زریں غلاف چڑھاتے جائیں گے۔

۱۳- اور اس بلدۃ مقدسہ کا نام صیہون ہوگا اس لیے کہ صیہون جس طرح یروشلم کے ایک پہاڑ کا نام ہے اسی طرح صیہون مکہ مکرمہ کا بھی نام ہے جیسے شیخ عبدالحق دہلوی نے مدارج النبوۃ باب چہارم قسم اول میں لکھا ہے۔ دیکھو ازالۃ الاوہام ص ۵۰۴۔

۱۴- اور آپ کے بعد جو خلیفہ اور حاکم ہوتے وہ عین سلامتی ہوتے اور آپ کی شریعت کے عالم عین صداقت بنے۔

۱۵- اور سرزمین عالم صداقت اور عدالت اور سلامتی سے ایسی معمور ہوئی کہ کسی جگہ بھی ظلم کی آواز نہ سنی گئی۔

۱۶- اور اُمت کو ایسی شریعت کا وارث بنا کر دُنیا سے رخصت ہوتے کہ جس کا نور اور روشنی ابد تک چمکتا رہے گا۔

۱۷- اور اس کا نور اور جلال ابدی ہوگا۔

۱۸- جو نہ کبھی ڈھلے گا اور نہ زوال پذیر ہوگا۔

۱۹- اور اُس نبی کے تمام صحابہ راستباز ہوں گے۔

۲۰- اور ایک چھوٹے سے ہزار اور ایک حقیر سے قوی گروہ ہو جائیں گے۔ و للہ الحمد و المنۃ،

گزارش

حضرات اہل علم سے گزارش ہے کہ وہ کتاب یسعیاہ کا باب ۵۴ اور باب ۶۵ بھی ضرور ملاحظہ فرمالیں اس میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام کے اوصاف کا تذکرہ ہے۔

اور اس کی تشریح اور تطبیق کے لیے ازالۃ الاوہام ص ۴۹۴ و ص ۵۰۵ بزبان فارسی و اظہار الحق ص ۱۴۵ ج ۲ بزبان عربی و ص ۱۴۷ ج ۲۔

ہر دو مصنفہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ کیرانوی ملاحظہ فرمالیں تطویل کے اندیشہ سے اس کو ترک کردیا ہے۔

بشارت ہشت دہم

از کتاب دانیال علیہ السلام باب دوم

کتاب دانیال کے باب دوم میں ایک طویل قصہ مذکور ہے جس کا خلاصہ ہم ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔

بخت نصر شاہ بابل نے ایک پریشان کن خواب دیکھا اور خواب دیکھ کر بھول گیا۔ اس سے اور بھی زیادہ پریشان ہوا۔ بادشاہ نے یہ ماجرا دانیال علیہ السلام سے ذکر کیا دانیال علیہ السلام نے وحی کے ذریعہ وہ خواب بھی بتلایا اور پھر اس کی تعبیر بھی بتلائی۔

۳۱۔ بادشاہ نے خواب میں دیکھا کہ ایک مورت ہے جو نہایت خوبصورت بھی ہے اور ہیبت ناک بھی ہے اور بادشاہ کے سامنے کھڑی ہے۔

۳۲۔ جس کا سر خالص سونے کا ہے اور اس کا سینہ اور بازو چاندی کے ہیں اور اس کا شکم اور رانیں تانبے کی ہیں اور اس کی پنڈلیاں لوہے کی ہیں اور اس کے پاؤں کچھ لوہے کے اور کچھ مٹی کے ہیں۔ بادشاہ اس عجیب و غریب مورت کو دیکھ رہا ہے۔

۳۴،۳۳۔ کہ یکایک ایک پتھر نکلا بغیر اس کے کہ کوئی ہاتھ سے کاٹ کر نکالے خود بخود نکلا اور اس مورت کے پاؤں پر لگا کر جو لوہے اور مٹی کے تھے اور اسے ٹکڑے ٹکڑے کردیا۔

۳۵۔ اور لوہا اور مٹی اور تانبا چاندی اور سونا (جس سے وہ مورت بنی ہوئی تھی) ٹکڑے ٹکڑے کیے گئے اور بستانی کھلیان کے بھوسے کے مانند ہوگئے اور ہوا انہیں اڑا کرلے گئی یہاں تک ان کا پتہ نہ ملا اور وہ پتھر جس نے اس مورت کو مارا ایک بڑا پہاڑ بن گیا اور

تمام زمین کو بھر دیا۔ (خواب ختم ہوا)

بادشاہ نے یہ خواب دیکھا تھا مگر بھول گیا تھا۔ دانیال علیہ السلام کو بذریعہ وحی بتلایا گیا کہ بادشاہ نے یہ خواب دیکھا ہے دانیال علیہ السلام نے حسب وحی خداوندی خواب بیان کر کے بادشاہ کو اس کی تعبیر بتلائی کہ اس خواب میں یکے بعد دیگرے پانچ سلطنتوں کی طرف اشارہ ہے۔ سونے کے سر سے بابل کا بادشاہ مراد ہے اور تیری سلطنت سونے کی مانند ہے اور تیرے بعد ایک اور سلطنت آئے گی جو چاندی کے مانند ہوگی اور تیری سلطنت سے کمتر ہوگی۔ اس کے بعد ایک تیسری سلطنت آئے گی جو تانبے کی مانند ہوگی پھر ایک چوتھی سلطنت آئے گی جو لوہے کی مانند مضبوط ہوگی پھر ایک پانچویں سلطنت آئے گی جس کے پاؤں کچھ لوہے کے اور کچھ مٹی کے ہوں گے۔ یعنی اس سلطنت میں کچھ ضعف اور اضطراب ہوگا۔ لوہا اور مٹی ملا جلا ہوگا یعنی وہ سلطنت قوت اور ضعف کا مجموعہ ہوگی۔ کبھی اس میں قوت ہوگی اور کبھی ضعف۔ اس پانچویں سلطنت کے زمانہ میں یکایک عالم غیب سے ایک پتھر نمودار ہوگا جو کسی کے ہاتھ سے کاٹ کر نکالا ہوا نہ ہوگا بلکہ من جانب اللہ خود بخود بلا سبب ظاہری کے آسمان سے اترے گا اور اس آخری سلطنت کے پاؤں پر گرے گا اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا تا آنکہ اس کو بستانی کھلیان کے بھوسہ کے مانند بنا دے گا اور ہوا اس کو اڑا کر لے جائے گی یہاں تک کہ اس کا نام ونشان نہ رہے گا اور رفتہ رفتہ وہ پتھر پہاڑ بن کر تمام زمین کو بھر دے گا۔ جاننا چاہیے کہ اس تعبیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور آپ کی نبوت ورسالت اور آپ کی آسمانی بادشاہت کو ایک پتھر سے تشبیہ دی گئی ہے اور یہ بتلایا گیا ہے کہ وہ پتھر بہت جلد پہاڑ کی شکل میں تبدیل ہو جائے گا یعنی اول اول وہ چھوٹی سی سلطنت ہوگی اور بعد میں تمام دنیا پر چھا جائے گی چنانچہ عہد فاروقی میں قیصر وکسریٰ کی شوکت کا خاتمہ ہو گیا اور اس طرح ھو الذی ارسل رسولہ بالھدی ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ کا وعدہ پورا ہوا اور ہلک کسریٰ فلا کسریٰ بعدہ وہلک قیصر فلا قیصر بعدہ کی تصدیق ہو گئی آسمانی بادشاہت کا پتھر زمین پر ایسا گرا کہ دنیا کی بڑی بڑی سلطنتوں کو پیس کر رکھ دیا اور جو شریعت آپ پر آسمان سے نازل ہوتی وہ قیامت تک باقی رہے گی۔ تفصیل کے لیے اظہار الحق ص ۱۴۸ ج ۲ بزبان عربی اور ازالۃ الاوہام ص ۵۰۷ بزبان فارسی ہر دو مصنفہ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس اللہ سرہ کو دیکھئے اور ہدایۃ الحیاری ص ۹۱ مصنفہ حافظ ابن القیم بھی دیکھیے۔

عاتکہ بنت عبد المطلب کا خواب

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عاتکہ بنت عبد المطلب کا ایک خواب ذکر کریں جو سیرت کی تمام صحیح اور معتبر کتابوں میں مذکور ہے تاکہ ناظرین کو اس بشارت دانیالیہ کے سمجھنے میں مدد دے۔ وہ خواب حسبِ ذیل ہے۔

ابو جہل کی سرکردگی میں قریش کا ایک ہزار کا قافلہ سات سو اونٹ اور سو سواروں اور دیگر سامان حرب کے ساتھ جنگ بدر کے لیے روانہ ہونے لگا تو قبل از روانگی عاتکہ بنت عبد المطلب نے یہ خواب دیکھا کہ ایک شتر سوار مکہ میں آیا اور مقام ابطح میں اونٹ بٹھلا کر باآواز بلند یہ کہہ رہا ہے:

الا انفروا یا آل غدر لمصارعکم فی ثلاث

لے اہل غدر یعنی غدارو تم بہت جلد اپنی مقتل اور پچھڑنے کی جگہ کی طرف تین دن میں نکل جاؤ۔

اور پھر وہ شتر سوار مسجد الحرام میں گیا اور خانہ کعبہ کی چھت پر چڑھ کر بھی اسی طرح اعلان کیا۔ اس کے بعد وہ سوار جبل ابو قبیس پر چڑھا اور وہی آواز دی اور پھر اوپر سے ایک پتھر اٹھا کر نیچے پھینکا وہ پتھر نیچے پہنچ کر چور چور ہو گیا اور مکہ کا کوئی گھر ایسا نہ رہا کہ جس میں اس کا کوئی ٹکڑا جا کر نہ گرا ہو۔ عاتکہ نے یہ خواب حضرت عباس سے بیان کیا جو اس وقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے انہوں نے یہ خواب سن کر اپنے مخصوص دوستوں سے بیان کر دیا اور سمجھ گئے کہ قوم پر کوئی مصیبت آنے والی ہے شدہ شدہ اس خواب کی اطلاع ابو جہل کو بھی ہو گئی۔ ابو جہل نے جب حضرت عباس کو مسجد حرام میں آتے دیکھا تو کہنے لگا اے ابو الفضل (حضرت عباس کی کنیت ہے) تمہارے مرد تو مدعی نبوت تھے ہی اب تمہاری عورتیں بھی نبوت کا دعویٰ کرنے لگیں۔ حضرت عباس نے کہا کیا بات ہے ابو جہل نے عاتکہ کے خواب کا ذکر کیا۔ خواب بیان ہی کیا جا رہا تھا کہ یکایک ضمضم غفاری ابو سفیان کا پیام لے کر اس شان سے مکہ میں پہنچا کہ پیرا ہن چاک ہے اور اونٹ کی ناک کٹی ہوئی ہے اور یہ آوازہ لگا رہا ہے اے گروہ قریش اپنے کاروان تجارت کی خبر لو اور جلد از جلد ابو سفیان کے قافلہ کی مدد کو پہنچو۔ یہ خبر سنتے ہی قریش پورے ساز و سامان کے ساتھ مکہ سے نکل کھڑے ہوئے اور بدر کے میدان میں پہنچ کر اس خواب کی تعبیر بحالت بیداری اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔

اور اس واقعہ پر بھی غور کرو کہ جو احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ غزوۂ خندق میں خندق کھودتے وقت جب ایک سخت پتھر نکل آیا تو اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ کدال ماری جس سے وہ پتھر ٹوٹ گیا اور اس سے روشنی نمودار ہوئی اور اس میں شام اور فارس اور یمن کے شہر نظر آتے اشارہ اس طرف تھا کہ یہ تمام ممالک اسلام کے مفتوح ہوں گے۔

بشارت نوزدہم

از انجیل متی باب سوم آیت اول

اُن دنوں میں یوحنا یہودیہ کے بیابان میں ظاہر ہو کے منادی کرنے اور یہ کہنے لگا کہ توبہ کرو آسمان کی بادشاہت نزدیک آگئی ہے۔ انتہی۔

اور اسی انجیل کے باب چہارم کے سترہویں آیت میں ہے "اسی وقت سے یسوع نے منادی کرنی اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ توبہ کرو کیونکہ آسمان کی بادشاہت نزدیک آگئی ہے" انتہی۔

آسمانی بادشاہت سے یہ مراد ہے کہ کوئی کتاب آسمان سے نازل ہو اور اس میں ہر طرح کے احکام مذکور ہوں گے اور نہایت شوکت اور حاکمانہ طور سے اس کی نشر و اشاعت کی جائے گی۔ خدا کے سرکشوں اور نافرمانوں پر تہدیدی احکام نافذ ہوں گے غرض یہ کہ نہ تو فقط دُنیوی بادشاہت ہو جیسا کہ سلاطین دُنیا کو حاصل ہوتی ہے اور نہ یہ ہو کہ فقط احکام خداوندی کی اشاعت نہایت مسکنت سے مقہور اور مغلوب ہو کر بلا کسی شوکت اور حکومت کے کی جاتے بلکہ احکام آسمانی بھی ہوں اور اس کے ساتھ شوکت اور حکومت زمینی بھی ہو۔ احکام خداوندی سے سرتابی کرنے والوں کو سزا بھی دی جاتی ہو۔ حکومت الٰہی کے باغیوں سے جہاد بھی کیا جاتا ہو اور یہ دونوں باتیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء کے عہد میں کما حقہ ظہور میں آئیں۔

احکام خداوندی اور شریعت آسمانی بھی نازل ہوئی اور نہایت شوکت اور قوت سے اس کو نافذ کیا گیا۔ قیصر و کسریٰ کے تخت کو اُلٹ کر رکھ دیا۔ خدا کے دشمنوں سے جہاد بھی کیا۔ چوروں، راہزنوں پر حد بھی قائم کی، زناکاروں کو رجم اور سنگسار کیا۔ شراب خواروں کے کوڑے لگوائے۔ آنکھ کھول کر دیکھئے کہ آسمانی بادشاہت اس کو کہتے ہیں اور خدارا یہ بھی آسمانی بادشاہت نہیں تو وہ بادشاہت تم بتلاؤ کہ جس کو آسمانی کہا جاسکے "ان فی ذالک لذکریٰ لمن کان له قلب او القی السمع و هو شهید"۔

بشارت بستم

از انجیل متی باب ۲۱ آیت ۴۲ -

یسوع نے انہیں کہا کیا تم نے نوشتوں میں کبھی نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو راج گیروں نے ناپسند کیا وہی کونے کا سرا ہوا۔

یہ خدا کی طرف سے ہوا اور ہماری نظروں میں عجیب۔ اس لیے میں تمہیں کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی اور ایک قوم کو جو اس کے میوہ لاوے دی جائے گی جو اس پتھر پر گرے گا چور ہو جائے گا۔ پر جس پر وہ گرے اُسے پیس ڈالے گا۔ انتہی۔ راج گیر اور معماروں سے بنی اسرائیل مراد ہیں اور کونے کے پتھر سے ہمارے نبی اکرم خاتم النبیین محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کیونکہ آپ بنی اسرائیل کی نظر میں ایک ناپسند پتھر کے مشابہ تھے۔ بنی اسرائیل نے ہر چند آپ کو رد کرنا چاہا مگر آپ تائید الٰہی سے کونے کا سرا یعنی خاتم النبیین ہو کر رہے۔ اور پتھر کے سرِ زاویہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ جو کونا عمارت کی بلندی کی طرف خالی تھا وہ اس سے بھر جائے گا۔ اسی طرح قصرِ نبوت میں جو زاویہ خالی تھا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پُر ہو گیا۔ اس طرح قصرِ نبوت کی عمارت پوری ہو گئی۔

کما روی ابو ھریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ان مثلی و مثل الانبیاء من قبلی کمثل رجل بنی بیتاً فاحسنہ واجملہ الا موضع لبنۃ من زاویۃ فجعل الناس یطوفون بہ و یعجبون لہ ویقولون ھلا وضعت اللبنۃ و انا خاتم النبیین۔ رواہ البخاری فی کتاب الانبیاء وفی روایتہ انا سددت موضع اللبنۃ و ختم بی البنیان وختم بی الرسل۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری اور انبیاء سابقین کی ایسی مثال ہے کہ کسی نے ایک محل نہایت عمدہ تیار کیا مگر ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی لوگ اس محل کا چکر لگاتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ یہ ایک اینٹ کیوں چھوڑ دی گئی۔ میں ہی خاتم النبیین ہوں۔ یعنی میں نے ہی اس اینٹ کی جگہ کو پُر کیا ہے اور میرے ہی سے یہ تعمیر ختم ہوئی اور مجھ ہی پر انبیاء و رسل کا سلسلہ ختم ہوا۔

پھر آپ پر جو گرا وہ بھی چُور چُور ہوا اور جس پر آپ گرے وہ چُورا چُورا ہوا۔ چنانچہ جنگ بدر میں قریش آپ پر گرے اور وہ خدا کے فضل سے چور چور ہوتے اور فتح مکہ کے وقت آپ ان پر گرے، تب بھی وہی چور چور ہوتے۔ اور آپ کے بعد صحابہ کرام ایران، شام و روم وغیرہ وغیرہ پر گرے اور سب کو چور کیا اور پھل اور میوہ لانے والی قوم بنی اسمٰعیل ہیں کہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت سے پھل لائی اور حکومت اور سلطنت کے مالک ہوئے اور یہ آسمانی بادشاہت اُن کے حصہ میں آئی۔

لہٰذا اس بشارت کا مصداق بجز خاتم النبیین سید الاوّلین والآخرین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ رہے حضرت عیسٰی علیہ الصلوٰۃ والسلام سو وہ حضرت داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نسل سے تھے، بنی اسرائیل میں بہت محترم تھے وہ ناپسند پتھر کے کیسے مشابہ ہو سکتے ہیں۔

دوم یہ کہ وہ خاتم النبیین نہیں جیسا کہ ماسبق میں معلوم ہو چکا ہے کہ اہل کتاب علاوہ عیسٰی علیہ السلام کے ایک اور نبی کے منتظر تھے۔ نیز ماسبق میں یہ بھی گزر چکا ہے کہ جب یحییٰ علیہ السلام مبعوث ہوئے تو یہودیوں نے اُن سے دریافت کیا۔ الخ

سوم یہ کہ حضرت مسیح خود تو کبھی کسی پر نہ گرے اور یہود جب اُن پر گرے تو بقول نصاریٰ حضرت مسیح چُور چُور ہوتے واللہ اعلم۔

اور حضرت عیسٰی علیہ السلام نے کبھی بھی یہ نہیں فرمایا کہ میں خاتم النبیین ہوں میرے آسمان پر چلے جانے کے بعد کوئی سچا نبی نہیں آئے گا۔

بشارت بست ویکم

از انجیل یوحنا باب چہاردھم آیت ۱۵۔

۱۵۔ اگر تم مجھ سے محبت رکھتے ہو تو میرے حکموں پر عمل کرو گے۔ ۱۶۔ اور میں باپ سے درخواست کروں گا کہ وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے۔ ۲۶۔ وہ تسلی دینے والا جو روح القدس ہے جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا وہی تمہیں سب چیزیں سکھائے گا اور سب باتیں جو کچھ کہ میں نے تمہیں کہی ہیں تمہیں یاد دلائے گا۔ ۲۹۔ اور اب میں تمہیں اس کے واقع ہونے سے پیشتر کہا تاکہ جب وہ وقوع میں آئے تو تم ایمان لاؤ۔ ۳۰۔ بعد اس کے میں تم سے بہت کلام نہ کروں گا اس لیے کہ اس جہان کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کی کوئی

چیز نہیں۔
اور باب ۱۵ آیت ۲۷ میں ہے۔
جب وہ مددگار آئے گا جس کو میں تمہارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا یعنی سچائی کی روح تو وہ میری گواہی دے گا۔ انتہیٰ۔
اور باب ۱۶ آیت ۷ میں ہے:
۷۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں تمہارے لیے میرا جانا ہی فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا۔ ۸۔ اور وہ آکر دُنیا کو گناہ اور راستبازی اور عدالت سے قصوروار ٹھہرائے گا۔ ۹۔ گناہ کے بارہ میں اس لیے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لاتے۔ ۱۰۔ راستبازی کے بارہ میں اس لیے کہ میں اپنے باپ کے پاس جاتا ہوں اور تم مجھے پھر نہ دیکھو گے۔ ۱۱۔ عدالت کے بارہ میں اس لیے کہ اس جہان کے سردار پر حکم کیا گیا ہے۔ ۱۲۔ میری اور بھی بہت سی باتیں ہیں کہ میں تمہیں اب کہوں پر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے۔ ۱۳۔ لیکن جب وہ روح حق آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سُنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا۔
۱۴۔ وہ میری بزرگی اور جلال کو ظاہر کرے گا۔ انتہیٰ۔
اور انجیل متی باب ۳ آیت ۱۱ میں ہے "میں تو توبہ کے لیے پانی سے بپتسمہ دیتا ہوں لیکن جو میرے بعد آتا ہے مجھ سے زور آور ہے اور میں اس کے جوتے اٹھانے کے لائق نہیں۔ انتہیٰ۔
یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کلام ہے کہ جو آپ نے رفع الی السماء سے پہلے حواریین کی تسلّی کے لیے فرمایا کہ تم یہود بے بہبود کی سازشوں اور قتل کے تدبیروں سے ہرگز نہ گھبراؤ اور میری تکلیف سے رنجیدہ اور غمگین نہ ہو میں عنقریب اس دُنیا سے نکل کر ایسی جگہ چلا جاؤں گا کہ جہاں کسی کی رسائی نہیں ہوگی یعنی آسمان پر چلا جاؤں گا۔ خدا کے یہاں بہت مکان ہیں اور قیامت کے قریب پھر آسمان سے نازل ہوں گا اور بعد ازاں ایک آنے والے فارقلیط کی بشارت دی کہ ایک زمانہ آئے گا کہ میرے علاوہ ایک دوسرا فارقلیط (رسول) ظاہر ہوگا اور وہ آکر میری بزرگی بیان کرے گا اور میرے نہ ماننے والوں یعنی یہود بے بہبود کو خوب سزا دے گا اور وہ دین دنیا کا سردار ہوگا اور وہ اس قدر بلند مرتبہ ہوگا کہ مجھ میں اس کی کوئی بات نہیں حق تعالیٰ شانہٗ نے قرآن میں اس بشارت کا ذکر فرمایا ہے کما قال تعالیٰ:

واذ قال عیسی ابن مریم یا بنی اسرائیل انی رسول اللہ الیکم مصدقا لما بین یدی من التوراۃ ومبشرا برسول یاتی من بعدی اسمہ احمد ط

اس وقت کو یاد کرو کہ جب عیسیٰ بن مریم نے کہا کہ اے بنی اسرائیل میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں اور توریت کی تصدیق کرنے والا ہوں اور بشارت دینے والا ہوں ایک عظیم الشان رسول کی جو میرے بعد آئے گا اور اس کا نام احمد ہو گا۔

اصل بشارت میں لفظ احمد موجود تھا اور جیسا کہ انجیل برنا باس میں اب بھی موجود ہے لیکن جب انجیل کا عبرانی زبان سے یونانی زبان میں ترجمہ ہوا تو یونانیوں نے اپنی عادت کی بنا پر کہ وہ ترجمہ کرتے ناموں کا بھی ترجمہ کر دیا کرتے تھے آنحضرت کے نام مبارک (احمد) کا ترجمہ بھی پیر کلوطوس سے کر دیا اور پھر جب یونانی نسخہ کا ترجمہ عربی زبان میں ہوا تو پیر کلوس کا معرب فارقلیط کر لیا گیا ایک عرصہ تک اردو اور فارسی اور عربی نسخوں میں فارقلیط کا لفظ رہا اس کے بعد اس کا ترجمہ روح القدس سے کیا گیا اور مسیحین روح القدس کے لفظ کو بطور تفسیر خطوط وحدانی میں لکھتے رہے رفتہ رفتہ فارقلیط کے لفظ کو بالکل حذف کر دیا پھ کسی نے فارقلیط کی جگہ روح القدس کا لفظ اور کسی نے روح حق کا لفظ اور کسی نے مددگار اور تسلی دینے والے کا لفظ رکھ دیا اور فارقلیط کے لفظ کو انجیل کے نسخوں سے بالکل حذف کر دیا۔

لفظ فارقلیط کی تحقیق

لفظ فارقلیط اصل میں یونانی زبان سے معرب کیا گیا ہے اور یہ لفظ یونانی زبان میں کئی معنی میں مشترک ہے اور وہ سب معنی احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق آتے ہیں۔ علماء نصاریٰ نے فارقلیط کے مختلف معنی بیان کیے ہیں۔

۱۔ کسی نے کہا کہ فارقلیط کے معنی تسلی دینے والے کے ہیں جس کا عربی ترجمہ معزی ہے ۲۔ کسی نے کہا کہ اس کے معنی معین اور مددگار کے ہیں، ۳۔ کسی نے کہا کہ اس کے معنی شافع یعنی شفاعت کرنے والے کے ہیں، ۴۔ کسی نے کہا کہ اس کے معنی وکیل یعنی وکالت کرنے والے کے ہیں۔ ۵۔ کسی نے کہا کہ اس کے معنی بڑا سراہنے والا جس کا فارسی ترجمہ ستائندہ اور عربی ترجمہ حماد اور احمد بصیغہ اسم تفضیل بمعنی فاعل ہے، ۶۔ اور کسی نے کہا کہ اس کے معنی بڑا سراہا گیا یعنی بڑا ستودہ کے ہیں جس کا عربی ترجمہ محمد ہے اور احمد اسم تفضیل بمعنی مفعول ہے

ایک مکان میں جمع تھے تو وہ روح ان پر نازل ہوئی اور اس کے روح کے نزول سے حواریین تھوڑی دیر کے لیے مختلف زبانیں بولنے لگے۔

نصاریٰ کا یہ خیال سراسر خیال خام ہے یہ بشارت کسی مقدس اور برگزیدہ انسان کے حق میں ہے جو خدا کی طرف سے الہام پاتے گا اور خدا کی طرف سے اس کو جو القاء ہوگا وہی کہے گا اپنی طرف سے کچھ نہ کہے گا۔ اس بشارت کو روح القدس یعنی جبرئیل امین کے نزول سے کوئی واسطہ نہیں اور کسی فرشتہ سے اس بشارت کا کوئی تعلق نہیں۔ فارقلیط کی آمد سے ایک رسول عظیم کی بعثت مراد ہے جو حق اور باطل کے درمیان فرق کرے گا۔

حضرت مولانا عبدالحق صاحب حقانی صاحب تفسیر حقانی عقائد الاسلام ص ۶۸ میں لکھتے ہیں:

ایک پادری صاحب اپنے ایک رسالہ میں جو لفظ فارقلیط کی تحقیق میں انہوں نے لکھا ہے اور ۱۲۶۸ ہجری میں کلکتہ میں چھپا تھا لکھتے ہیں کہ یہ لفظ فارقلیط یونانی زبان سے معرب کیا گیا ہے پس اگر اس کی یونانی میں پارا کلی طوس اصل قرار دی جاتے تو اس کے معنی معین اور وکیل کے ہیں اور اگر کہیں اصل پیر کلوطوس ہے تو اس کے معنی محمد یا احمد کے قریب ہیں پس جس عالم میں اہل اسلام نے اس بشارت سے استدلال کیا تو وہ اصل پیر کلوطوس سمجھا کیونکہ اس کے معنی محمد یا احمد کے قریب ہیں۔ پس اس نے دعویٰ کیا کہ عیسیٰ علیہ السلام نے محمد یا احمد کی خبر دی لیکن اصل پارا کلی طوس ہے فقط ہم کہتے ہیں کہ اصل پیر کلوطوس ہے یونانی خط میں بہت تشابہ ہے اس کو پارا کلی طوس غلطی سے پڑھ لیا۔ انتہیٰ کلامہ۔

اور دیکھو اظہار الحق ص ۱۵۵ ج ۲ مصنفہ فاضل محقق مولانا محمد رحمت اللہ کیرانوی قدس اللہ سرہ یہ مضمون اظہار الحق ہی کی عبارت کا ترجمہ ہے جو عربی میں ہے۔

اور یونانی زبان میں پیر کلوطوس ہونے کی ایک بڑی دلیل ہے کہ سینٹ جروم نے جب انجیل کا ترجمہ لاطینی زبان میں لکھنا شروع کیا تو پیر کلوطوس کی جگہ پارا کلوطوس لکھ دیا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جس کتاب سے نقل کیا تھا پیر کلوطوس تھا۔ (تفسیر حقانی ص ۱۰۹ تفسیر سورہ الصف)

اور اگر ہم اس تحقیق سے قطع نظر بھی کرلیں تو تب بھی ہمارا مدعا ثابت ہے کیونکہ اس بشارت میں آنے والے فارقلیط کے بہت سے اوصاف بیان کیے ہیں جو بہ تمام و کمال سیدنا و مولانا محمد مصطفیٰ واحمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق اور منطبق ہیں۔

اول یہ کہ جب تک میں نہ جاؤں گا وہ نہ آئے گا دوم یہ کہ وہ میری گواہی دے گا۔ سوم یہ کہ

وہ گناہ اور راستی اور عدالت سے تقصیر دار ٹھہرائے گا۔ چہارم یہ کہ مجھ پر نہ ایمان لانے والوں کو سزا دے گا۔ پنجم، وہ سچائی کی راہ بتلا دے گا۔ ششم، یہ کہ وہ آئندہ کی خبریں دے گا، ہفتم یہ کہ وہ اپنی طرف سے کچھ نہ کہے گا بلکہ جو اللہ سے سنے گا وہی کہے گا۔ ہشتم یہ کہ وہ جہان کا سردار ہوگا۔ نہم یہ کہ وہ میری تمام باتیں تم کو یاد دلائے گا۔ دہم یہ کہ جو امور تم اس وقت برداشت نہیں کر سکتے وہ نبی اس وقت آکر تم کو بتلائے گا اور جو باتیں غیر مکمل ہیں ان کی تکمیل کرے گا اور یہ تمام باتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق آتی ہیں۔ ۱۔ آپ کا تشریف لانا حضرت عیسٰی علیہ السلام کے جانے پر اس لیے موقوف تھا کہ آپ خاتم الانبیاء ہیں اس لیے کہ کسی نبی کا آنا پہلے نبی کے جانے پر جب ہی موقوف ہو سکتا ہے جب دوسرا نبی خاتم الانبیاء ہو ورنہ اگر وہ نبی خاتم الانبیاء نہیں تو اس کے آنے سے پہلے نبی کا جانا شرط ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا اس لیے کہ جب وہ نبی خاتم الانبیاء نہیں تو پہلے نبی کی موجودگی میں بھی وہ مبعوث ہو سکتا ہے۔

پہلے نبی کا جانا دوسرے کے آنے کے لیے جب ہی شرط ہو سکتا ہے کہ جب دوسرا نبی خاتم الانبیاء ہو۔ الحاصل حضرت مسیح نے اس جملہ سے یہ ظاہر فرما دیا کہ وہ فارقلیط اور روح حق خاتم الانبیاء ہوگا کما قال اللہ تعالٰی۔

ما کان محمدٌ ابا احدٍ من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں لیکن اللہ کے رسول اور آخر النبیین ہیں۔

اور حضرت مسیح خاتم النبیین نہ تھے ورنہ علماء نصاریٰ و یہود حضرت مسیح کے بعد ایک نبی کے کس لیے منتظر تھے اور روح کا آنا حضرت عیسٰی علیہ السلام کے جانے پر موقوف نہ تھا۔ روح کا نزول تو حضرت عیسٰی کی موجودگی میں بھی ہوتا تھا۔

۲۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کی گواہی بھی دی۔

وما قتلوہ وما صلبوہ ولکن شبہ لہم وان الذین اختلفوا فیہ لفی شک منہ۔ ما لہم بہ من علم الا اتباع الظن وما قتلوہ یقیناً بل رفعہ اللہ الیہ وکان اللہ عزیزاً حکیماً۔

اور انہوں نے نہ ان کو (عیسٰی علیہ السلام) کو قتل کیا اور نہ سولی دی لیکن اشتباہ میں

کیونکہ لفظ احمد صیغہ اسم تفضیل کا ہے جو کبھی بمعنی فاعل آتا ہے اور کبھی بمعنی مفعول پس اگر احمد اسم تفضیل بمعنی فاعل ہو تو اس کا ترجمہ یہ ہوگا بڑی حمد و ثنا کرنا یعنی خدا تعالیٰ کا بڑا سراہنے والا اور اگر احمد اسم تفضیل بمعنی مفعول ہو تو اس کا ترجمہ یہ ہوگا بڑا ستودہ یعنی جو خدا اور بندوں میں بڑا ہی ستودہ ہے کہ ہر جگہ اس کی تعریف کی جاتی ہے ۷۔ اور بعضوں نے فارقلیط کا ترجمہ امید گاہ عوام سے کیا ہے ۸۔ اور بعض نسخوں میں رسول کا لفظ ہے ۹۔ اور بعض نے کہا کہ اس کے معنی روح حق کے ہیں۔
۱۰۔ اور کسی نے کہا کہ اس کے معنی ثقہ اور معتبر کے ہیں۔

پس اگر فارقلیط کی اصل یونانی زبان میں پارا کلی طوس قرار دی جائے تو اس کے معنی معین اور مددگار اور وکیل کے ہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ اس کی اصل پیرکلوطوس ہے تو اس کے معنی محمد یا احمد یا حمّاد کے قریب قریب ہیں۔

انجیل کے تمام قدیم نسخوں میں عربی اور فارسی اور اردو تمام نسخوں میں فارقلیط کا لفظ موجود تھا مگر اب موجودہ نسخوں میں لفظ فارقلیط کے بجائے زیادہ تر مددگار اور روح حق کا لفظ پایا جاتا ہے مگر باوجود ان تحریفات اور تغیرات و تبدلات کے پھر بھی مدعا حاصل ہے اس لیے کہ اس بشارت فارقلیط کے جو اوصاف ذکر کیے گئے ہیں وہ تمام کے تمام محمد مصطفیٰ اور احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر علی وجہ الکمال والتمام صادق اور منطبق ہیں اور فارقلیط کے جو معنی بھی لیے جائیں وہ سب آپ پر صادق ہیں آپ خدا تعالیٰ کے وکیل اور سفیر بھی ہیں اور روح حق اور روح صدق اور روح راستی بھی ہیں یعنی روح خبیث نہیں جو جھوٹ بولے اور امت کے شافع بھی ہیں اور بشیر و نذیر بھی ہیں اور خدا کے ستودہ اور پسندیدہ بندہ بھی ہیں اور سب سے زیادہ خدا کی حمد و ثنا کرنے والے بھی ہیں بلکہ یہ تمام آپ کے اسماء ہیں یعنی آپ کے نام ہیں کوئی ان میں سے اسم صفت ہے جیسے وکیل اور شافع اور معین و مددگار اور روح الحق اور کوئی اسم علم ہے جیسے احمد اور محمد اور محمود اور حمّاد اور آپ کے ناموں سے ایک نام آپ کا حمد بھی ہے حمد اگرچہ مصدر ہے بمعنی ستودن مگر مبالغۃً آپ پر اطلاق کر دیا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حق تعالیٰ کی مجسم حمد و ثنا ہیں۔

فارقلیط کا سب سے زیادہ صحیح ترجمہ لفظ احمد ہے اور اسی وجہ سے قرآن کریم میں اس بشارت کا ذکر بلفظ احمد آیا ہے کما قال اللہ تعالیٰ، مبشرا برسول یاتی من بعدی اسمہ احمد۔

یہ آیت قرآن مجید کی ہے اور قرآن مجید جس ملک میں نازل ہوا اس وقت اس ملک میں بے شمار علماء یہود اور علماء نصاریٰ موجود تھے۔ اگر یہ بشارت اور خبر غلط ہوتی تو ہزار ہا علماء یہود و نصاریٰ اس غلطی کو فاش کرتے اور برملا اس خبر کی تردید کرتے اور جو علماء یہود اور نصاریٰ اسلام میں داخل ہو گئے تھے وہ اس غلط بیانی کو دیکھ کر فوراً اسلام سے برگشتہ ہو جاتے اور بغیر شور و غل مچاتے خاموش نہ بیٹھتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس پیشین گوئی کو علی الاعلان ظاہر فرمانا اور بیان کرنا اور علماء نصاریٰ کا خاموش رہنا یہ ان کے اعتراف اور تسلیم کی روشن دلیل ہے اور اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ اگر یہ بات سچی تھی تو اس وقت کے تمام علماء یہود و نصاریٰ کیوں مسلمان نہ ہو گئے۔

جواب

یہ ہے کہ علماء نصاریٰ کے نزدیک حضرت عیسٰی علیہ السلام کے ظہور کی پیشین گوئیاں توریت میں موجود ہیں مگر باوجود ان پیشین گوئیوں کے اور باوجود حضرت عیسٰی علیہ السلام کے معجزات کے مشاہدہ کر لینے کے پھر بھی علماء یہود حضرت مسیح پر ایمان نہیں لائے بلکہ اُن کے دشمن ہو گئے اور بوجہ سنگدلی اور بوجہ دنیاوی اغراض یا بوجہ حسد کے حضرت مسیح کی دعوت کو قبول نہیں کیا بلکہ صاف طور پر علماء یہود یہ کہتے ہیں کہ توریت میں حضرت مسیح کی کوئی بشارت نہیں اور نہ ان کا کوئی ذکر ہے اسی طرح بہت سے علماء نصاریٰ نے بوجہ سنگدلی اور بوجہ دنیاوی اغراض آپ کا پیرو ہونا قبول نہ کیا۔ حالانکہ ان کو یقین تھا کہ یہی وہ نبی ہیں جن کی مسیح بن مریم نے بشارت دی ہے جیسے ہرقل اور مقوقس نے صاف طور پر اس کا اقرار کیا کہ آپ وہی نبی ہیں جن کی انجیل میں بشارت دی گئی مگر اپنی سلطنت کی خاطر اسلام میں داخل نہیں ہوتے اور علماء نصاریٰ میں جو منصف اور حق پرست تھے جیسے نجاشی شاہ حبشہ اور ضغاطر رومی اور ابن الناطور وغیرہم یہ لوگ ایمان لائے اور بہت سے علماء نصاریٰ نے دیدہ و دانستہ علماء یہود کی طرح صاف طور پر یہ کہہ دیا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توریت و انجیل میں کوئی بشارت نہیں۔ علمائے نصاریٰ کی یہ تکذیب ایسی ہے جیسا کہ علماء یہود اور دیگر یہود حضرت مسیح کی بشارتوں کے منکر اور مکذب ہیں۔ علماء نصاریٰ یہ کہتے ہیں کہ اس بشارت میں فارقلیط کی آمد سے روح القدس کا حواریین پر نازل ہونا مراد ہے۔ چنانچہ حضرت عیسٰی کے رفع الی السماء کے بعد جب حواریین

شریعت کا کوئی علم نہیں کہ جس کی رُو سے وہ فتویٰ دے سکیں، ہاں نصاریٰ کے پاس صنعت و حرفت اور کاریگری کے علوم و فنون ہیں حکمرانی اور جہانبانی اور عدل عمرانی کے متعلق اُن کے پاس کوئی آسمانی قانون نہیں کہ جس کے رُو سے وہ دُنیا میں عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کر سکیں۔ مغربی اقوام کے پاس جو دستور ہے وہ چند اہلِ فکر کے افکار اور خیالات کا نتیجہ ہے۔ شریعتِ اسلامیہ کی طرح آسمان سے نازل شدہ کوئی قانون اُن کے پاس نہیں۔

علماء مسیحیین اس بشارت کو روح القدس کے حق میں قرار دیتے ہیں جس کا نزول حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کے رفع السماء کے ۴۷ یوم بعد حواریین پر ہوا۔ لیکن یہ قول چند وجوہ سے باطل ہے۔ ۱۔ اس لیے کہ روح کا نازل ہونا حضرت مسیح کے جانے پر موقوف نہ تھا بلکہ وہ تو ہر وقت حضرت مسیح کے ساتھ رہتی تھی۔

۲۔ اور نہ روح نے کسی کو راستی اور عدالت سے ملزم ٹھہرایا اور نہ کسی یہودی کو حضرت مسیح پر نہ ایمان لانے کی وجہ سے کبھی سزا دی البتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین اور کافرین سے جہاد بھی کیا اور یہودیوں کو کافی سزا بھی دی اور ان کو ملزم ٹھہرایا اس لیے کہ اہلِ دُنیا کو الزام دینا اور ان کی سرزنش کرنا بغیر حکومت کے ممکن نہیں معلوم ہوا کہ آنے والا فارقلیط اور دوسرا مددگار دُنیا کا حاکم اور بادشاہ ہوگا جو مجرموں کی سرزنش کرے گا اور چودہویں باب کے درس ۳۰ میں جو دُنیا کے سردار آنے کا ذکر ہے اس سے یہی دنیا کا حاکم مراد ہے کہ جس کی حکومت اور توبیخ اور سرزنش کا ذکر ہو چکا ہے۔

۳۔ نیز حضرت مسیح کا اس پر ایمان لانے کی تاکید فرمانا بالکل بے محل ہے اس لیے کہ حواریین پیشتر ہی سے روح القدس پر ایمان رکھتے تھے اس کے فرمانے کی کیا حاجت تھی کہ ''جب وہ آتے تب تم ایمان لاؤ''، حضرت مسیح کا اس قدر اہتمام فرمانا اور اس پر ایمان لانے کی وصیت کرنا خود اس کو بتلا رہا ہے کہ وہ آنے والی شئے کچھ ایسی ہوگی جس کا انکار تم سے بعید نہ ہوگا۔

پس اگر فارقلیط سے روح مراد ہوتی تو اس کے لیے چنداں اہتمام اور تاکید کی ضرورت نہ تھی اس لیے کہ جس کے قلب پر روح کا نزول ہوگا اس سے روح کا انکار ہونا بالکل ناممکن ہے۔

روح القدس کا نزول بالبداہت مفید یقین ہے جس طرح روح القدس کے نزول سے بالبداہت پیغمبر کو اپنی نبوت کا یقین آ جاتا ہے۔ پیش آنے والی چیز سے انسان کو ایسا یقین کامل ہو جاتا ہے کہ قوتِ خیالیہ بھی اس کو دفع نہیں کر سکتی انسان پر جب کوئی حالت طاری ہوتی تو

اس کا انکار ممکن نہیں ہوتا۔

۴- نیز اس بشارت کا سیاق اس بات کو بتلا رہا ہے کہ وہ آنے والا فارقلیط حضرت عیسیٰ سے مغایر ہے جیسا کہ سولھویں آیت کا یہ لفظ دوسرا مددگار بخشے گا۔ صاف مغایرت پر دلالت کرتا ہے کہ وہ علیحٰدہ صورت میں ظاہر اور نمودار ہوگا۔

پس اگر فارقلیط سے روح القدس مراد لی جاتے تو وہ حضرت عیسیٰ کے کسی طرح مغائر نہیں کیونکہ نصاریٰ کے نزدیک ابن اور روح القدس میں حقیقی اتحاد ہے اور روح القدس جو حواریین پر ظاہر ہوگی وہ کسی علیحٰدہ صورت میں ظاہر نہیں ہوئی جس طرح کسی شخص پر جن مسلط ہو جاتا ہے سو جن کی باتیں وہی ہوتی ہیں جو اس شخص کے منہ سے نکلتی ہیں علیحٰدہ صورت میں اس کا ظہور نہیں ہوتا۔

۵- نیز اس بشارت میں یہ بھی مذکور ہے کہ "جو کچھ میں نے تمہیں کہا، یاد دلاتے گا" حالانکہ کسی کتاب سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حواری حضرت عیسیٰ کے ارشادات فراموش کر چکے تھے۔ روح القدس نے ان کو علیحٰدہ صورت میں ظاہر ہو کر یاد دلاتے ہوں۔

۶- نیز اس بشارت میں یہ بھی مذکور ہے کہ "وہ میرے لیے گواہی دے گا" سو یہ وصف صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ہی صادق آ سکتا ہے کہ آپ ہی نے آکر مشرکین اور یہود کے سامنے حضرت مسیح کی گواہی دی اور اُن لوگوں کے سامنے کہ جو حضرت مسیح سے منکر یا بے خبر تھے آپ ہی نے حضرت مسیح کی رسالت کا اعلان کیا۔

بخلاف روح القدس کے وہ حضرت عیسیٰ کے حواریین پر نازل ہوتی اور حواریین پہلے ہی سے حضرت مسیح کو رسول جانتے تھے اُن کے سامنے گواہی دینے کی کوئی حاجت نہ تھی۔

گواہی کی ضرورت تو منکرین کے سامنے تھی نہ کہ مومنین کے سامنے بخلاف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے، آپ نے یہود کے سامنے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے منکر اور دشمن تھے۔ علی الاعلان حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت و رسالت کی گواہی دی۔ اور ان کے دعوائے قتل و صلب کی تردید کی اور رفع الی السماء کو ثابت کیا۔

۷- نیز حضرت مسیح اس فارقلیط کی نسبت یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ "مجھ میں اُس کی کوئی چیز نہیں" سو یہ جملہ آنحضرت ہی پر صادق آ سکتا ہے کہ مجھ میں اس کی کوئی چیز نہیں۔ روح القدس اور مسیح تو ایک ہی چیز ہیں۔

ڈال دیے گئے اور جن لوگوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اختلاف کیا وہ یقیناً شک میں ہیں خود ان کو اس کا یقین نہیں محض گمان کی پیروی ہے یقیناً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کو اپنی طرف اٹھا لیا وہی غالب و حکیم ہے۔

۳۔ اور راستی اور عدالت سے ملزم بھی کیا۔ ۴۔ اور حضرت مسیح کے نہ ماننے والوں کو پوری پوری سزا بھی دی کسی سے قتال اور جہاد کیا اور کسی کو جلاوطن کیا جیسا کہ یہود خیبر اور یہود بنو نضیر اور اور یہود بنو قینقاع کے واقعات سے ظاہر ہے اور روح نے نہ کسی کو ملزم ٹھہرایا اور نہ کسی کی سرزنش کی اور سرزنش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ فارقلیط ظاہر ہونے کے بعد حکومت کے ساتھ لوگوں کو توبیخ اور سرزنش کرے گا اور ظاہر ہے کہ روح القدس کا ظاہر ہوکر عام لوگوں پر حکومت کرنا کہیں ثابت نہیں اور نہ حواریین کا یہ منصب تھا۔ حواریین نے حکومت کے طور پر کسی کی توبیخ نہیں کی بلکہ واعظانہ طور پر لوگوں کو سمجھاتے تھے جس میں حکومت کا زور نہ تھا غرض یہ کہ کسی طرح بھی روح القدس کو فارقلیط کا مصداق نہیں قرار دیا جاسکتا۔

اور آیت دہم میں سرزنش کی یہ وجہ بیان فرمانا اس لیے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لاتے اس پر دلالت کرتا ہے کہ اس فارقلیط اور مددگار اور وکیل و شفیع کا ظہور منکرین عیسیٰ علیہ السلام کے سامنے ہوگا۔ بخلاف روح کے کہ اس کا ظہور تو آپ کے نزدیک حواریین پر ہوا کہ جو منکرین عیسیٰ علیہ السلام نہ تھے اور نہ حواریین نے کسی کو سزا دی وہ خود ہی مسکین اور عاجز تھے کسی منکر کو کیسے سزا دے سکتے تھے۔ ۵۔ اور آنحضرت نے صدق اور راستی کی وہ راہیں بتائیں کہ جو نہ کسی نے دیکھی اور نہ سنی، آپ کی شریعت غراء اور ملت بیضاء اس کی شاہد ہے۔ ۶۔ اور آئندہ واقعات کے متعلق آپ نے اتنی خبریں دیں کہ جن کا کوئی شمار نہیں اور ایسی صحیح خبریں دیں کہ جو ہو بہو ظاہر ہوئیں اور اُن کا ایک حرف بھی خلاف واقعہ نہ نکلا اور تاقیامت اسی طرح ظاہر ہوتی رہے گی۔ ۷۔ اس لیے کہ آپ نے اپنی طرف سے کچھ نہیں فرمایا کما قال تعالیٰ وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحی)۔ ۸۔ اور رہا ایں ہمہ جہان کے سردار اور بادشاہ بھی ہوتے اور جہان اور دُنیا کی سرداری سے اس طرف اشارہ ہے کہ آپ کی نبوت تمام عالم کے لیے ہوگی کسی قوم کے ساتھ مخصوص نہ ہوگی۔ ۹۔ اور نصاریٰ نے حضرت مسیح کی صحیح تعلیمات کو محو کر دیا تھا ان کو بھی یاد دلایا جن میں توحید و تثلیث کا مسئلہ بھی ہے اس کو خوب یاد دلایا اور حضرت مسیح کے قتل و صلب کی نفی اور رفع الی السماء کا اثبات فرمایا۔

قل یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم الا نعبد الا
اللہ ولا نشرک بہ شیئاً ولا یتخذ بعضنا بعضاً اربابا من دون اللہ
آپ فرما دیجئے کہ اے اہلِ کتاب ایک ایسے امر کی طرف آؤ کہ جو ہم میں اور تم میں مسلم ہے وہ یہ کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور ایک دوسرے کو اللہ کے سوا رب نہ بنائیں۔

و قال المسیح یٰبنی اسرائیل اعبدوا اللہ ربی و ربکم انہ من یشرک
باللہ فقد حرم اللہ علیہ الجنۃ و ماوٰہ النار و ما للظلمین من انصار۔
اور فرمایا حضرت مسیح بن مریم نے اے بنی اسرائیل بندگی کرو صرف ایک اللہ کی جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے۔ تحقیق جو اللہ کے ساتھ شریک کرے گا تو اللہ تعالیٰ نے اُس پر جنت کو حرام کیا ہے اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔

۱۰۔ آپؐ نے مبعوث ہونے کے بعد وہ باتیں بھی بتلائیں کہ جو حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں بنی اسرائیل کے تحمل سے باہر تھیں یعنی ذات و صفات، شریعت و طریقت، حشر و نشر، جنت و جہنم کے متعلق وہ علوم و معارف کے دریا بہائے کہ جن سے تمام عالم دنگ ہے اور کسی کتاب میں ان علوم کا نام و نشان نہیں اور جو اُمور غیر تکمیل شدہ تھے آپ کی شریعتِ کاملہ نے ان سب کی تکمیل بھی کر دی کما قال تعالیٰ،

الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت
لکم الاسلام دیناً۔
آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کو پورا کر دیا اور تمہارے لیے اسلام کو پسند کیا دین بنا کر۔

اور قیامت تک کے لیے دُنیا کو ایک ایسا کامل اور مکمل دستور (یعنی شریعت) دے گئے جو اُن کے دین اور دُنیا کی صلاح اور فلاح کا کفیل ہے اور اس کے حقائق اور دقائق اور اسرار و حکم کو دیکھ کر دُنیا حیران ہے قیامت تک پیش آنے والے واقعات کا حکم شریعت محمدیہ سے معلوم ہو سکتا ہے علماءِ یہود و نصاریٰ کے پاس کوئی شریعت ہی نہیں جس کو سامنے رکھ کر علماءِ اُمت اور فقہاءِ ملت کی طرح فتویٰ دے سکیں۔ اس وقت کے نصاریٰ کے پاس

۸- نیز یہ بھی قابلِ غور ہے کہ اس روح نے کون سی آئندہ کی خبریں بتلائیں کہ جس سے اس روح کو اس بشارت کا مصداق کہا جاتے۔

۹- نیز اس بشارت کا تمام سیاق و سباق دلالت کرتا ہے کہ آنے والا دوسرا فارقلیط اور دوسرا مددگار لباس بشری اور پیکرِ انسانی میں ظہور کرے گا اور حضرت عیسٰی علیہ السلام کی طرح لباس بشری میں دعوت حق اور لوگوں کو تسلّی کے لیے آوے گا پس فارقلیط کا مصداق اُس روح کو سمجھنا کہ جو آدمیوں پر جنّ کی طرح نازل ہو اور ان میں حلول کرے بالکل غلط ہے۔

۱۰- نیز حضرت عیسٰی کے رفع الی السماء کے بعد سے عامۃً نصارٰی فارقلیط کے منتظر رہے اور یہ سمجھتے تھے کہ کوئی عظیم الشان نبی مبعوث ہوگا۔ چنانچہ منتس عیسائی نے دوسری صدی عیسوی میں یہ دعویٰ کیا کہ میں وہی فارقلیط ہوں کہ جس کی حضرت مسیح نے خبر دی ہے۔ بہت سے لوگ اس پر ایمان لے آئے جس کا مفصل تذکرہ ولیم میور مسیحی نے اپنی تاریخ کے تیسرے باب میں لکھا ہے۔ اور یہ کتاب ۱۸۴۸ء میں طبع ہوئی۔ معلوم ہوا کہ علماء یہود اور نصارٰی یہی سمجھتے تھے کہ فارقلیط سے کوئی انسان مراد ہے نہ کہ روح القدس۔

اور لب التواریخ کا مصنف جو کہ ایک مسیحی عالم ہے لکھتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قبل یہود و نصارٰی ایک نبی کے منتظر تھے اور اسی وجہ سے نجاشی شاہ حبشہ جعفر طیار رضی اللہ عنہ، سے آپ کا حال سن کر ایمان لایا اور کہا کہ بلاشک یہی وہ نبی ہیں کہ جن کی حضرت مسیح نے انجیل میں خبر دی ہے حالانکہ نجاشی انجیل کا عالم ہونے کے علاوہ بادشاہ بھی تھا۔ کسی قسم کا اُس کو خوف و خطر بھی نہ تھا۔

اور مقوقس شاہ قبط نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والا نامہ کے جواب میں یہ لکھا:

سلام علیک اما بعد فقد قرأت کتابک و فهمت ماذکرت فیه وما تدعوالیه وقد علمت ان نبیا قد بقی وقد کنت اظن انه یخرج بالشام وقد اکرمت رسولک

سلام ہو آپ پر، اما بعد میں نے آپ کے والا نامہ کو پڑھا اور جو کچھ آپ نے اس میں ذکر فرمایا ہے اور جس کی طرف دعوت دی ہے اس کو سمجھا، مجھ کو خوب اچھی طرح معلوم ہے کہ اب صرف ایک نبی باقی رہ گیا ہے۔ میرا گمان یہ تھا کہ وہ نبی شام میں ظاہر ہوگا۔ اور میں نے آپ کے قاصد کا اکرام کیا۔

مقوقس اگرچہ اسلام نہ لایا مگر اتنا اقرار ضرور کیا کہ ایک نبی کا آنا باقی رہ گیا ہے۔

اور جارود بن علاء۔ جو اپنی قوم میں بہت بڑے عالم تھے جب اپنی قوم کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف با سلام ہوئے تو یہ کہا:

واللہ لقد جئت بالحق ونطقت بالصدق لقد وجدت وصفک فی الانجیل وبشر بک ابن البتول۔ فطول التحیۃ لک والشکر لمن اکرمک لا اثر بعد عین ولا شک بعد یقین مد یدک اشھد ان لا الہ الا اللہ وانک محمد رسول اللہ

خدا کی قسم آپ حق لے کر آتے ہیں اور آپ نے سچ فرمایا البتہ تحقیق میں نے آپ کی صفت انجیل میں پائی ہے اور مسیح بن مریم نے آپ کی بشارت دی ہے۔ آپ کے لیے طویل و عریض تحیۂ تکریم پیش کرتا ہوں۔ اور شکر ہے اس کے لیے جو آپ کا اکرام کرے ذات کے بعد نشان کی اور یقین کے بعد شک کی ضرورت نہیں۔ اپنا دست مبارک بڑھائیے میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یقیناً آپ محمد رسول اللہ ہیں۔

اور علی ہذا ہرقل شاہ روم اور دوسرے ذی شوکت علماء تورات و انجیل نے آپ کی نبوت و رسالت کا اقرار کیا پس ثابت ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت اور آپ کا نام انجیل میں لکھا ہوا تھا جس کو دیکھ کر لوگ آپ پر ایمان لاتے اور آپ کی آمد سے پہلے وہ آپ کے منتظر تھے جن کو خدا تعالیٰ نے توفیق دی اور کسی دُنیوی طمع نے ان کو نہ گھیرا وہ اس دولت سے متمتع ہوتے ؎

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم۔ والحمد للہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ۔

۱۱۔ اور سولھویں آیت کا یہ جملہ "کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے گا" اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ فارقلیط خود بذاتہٖ ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے گا اس لیے کہ فارقلیط بمعنی روح جس کے نصاریٰ قائل ہیں وہ بھی ہمیشہ اُن کے ساتھ نہ رہا۔

بلکہ مراد یہ ہے کہ اُس کی شریعت اور دین ابد تک رہے گا اور اس کے بعد کوئی دین نہ آئے گا جو اس کے لیے ناسخ ہو۔

۱۲- اور باب چہار دہم کی سترھویں آیت کا یہ جملہ یعنی سچائی کی روح جسے دُنیا حاصل نہیں کر سکتی کیونکہ نہ اسے دیکھتی ہے اور نہ جانتی ہے۔ آھ

اس کا یہ مطلب ہے کہ دُنیا اس کے مرتبہ کو نہیں جانتی وہ تمام کائنات میں سب سے بہتر اور برتر ہو گا۔

نصاریٰ کے چند شبہات واوہام اور اُن کا ازالہ

شبہ اوّل :- روح الحق اور روح القدس سے اقنوم ثالث مراد ہے لہٰذا روح القدس اور روح الحق سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مراد لینا کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟

جواب :- عہد قدیم اور عہد جدید میں روح کا لفظ اقنوم ثالث کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ صالح اور طالع، ہادی اور مضل کے معنی میں بھی مستعمل ہوتا ہے۔

چنانچہ یوحنا کے پہلے خط کے باب چہارم میں ہے:

۱- اے عزیزو! ہر ایک روح کا یقین نہ کرو بلکہ روح کو آزماؤ کہ وہ خدا کی طرف سے ہیں یا نہیں ۲- خدا کی روح کو تم اس طرح پہچان سکتے ہو کہ جو کوئی روح اقرار کرے کہ یسوع مسیح مجسم ہو کر آیا ہے وہ خدا کی طرف سے ہے۔ ۳- اور جو کوئی روح یسوع کا اقرار نہ کرے وہ خدا کی طرف سے نہیں اور آیت ششم میں ہے "اسی سے ہم حق کی روح اور گمراہی کی روح کو پہچان لیتے ہیں" آھ

اس مقام پر روح سے واعظِ صادق اور واعظِ مضل مراد ہے۔ اقنوم ثالث کسی کے نزدیک مراد نہیں۔

شبہ ثانیہ :- اس بشارت میں خطاب حواریین کو ہے لہٰذا روح کا نزول وظہور حواریین کی موجودگی اور حیات میں ہونا چاہیے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور حواریین کے صدہا سال کے بعد ہوا ہے۔

جواب :- حواریین کو خطاب اس لیے کیا گیا کہ اُس وقت وہی حاضر تھے باقی وہ مقصود بالخطاب نہیں، چنانچہ انجیل متی کے چھبیسویں باب ۲۶ آیت ۶۴ میں ہے۔ "میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ کہ اس کے بعد تم ابن آدم کو آسمان کے بادلوں پر آتے دیکھو گے" آھ

اب ان مخاطبین کو مرے ہوئے ۱۹ سو سال ہو گئے اور مخاطبین میں سے کسی نے بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان سے آتے نہیں دیکھا۔

پس جس طرح اس مقام پر مقصود بالخطاب وہ لوگ ہیں کہ جو نزول من السماء کے وقت موجود ہوں گے اسی طرح اس بشارت میں وہ لوگ مقصود بالخطاب ہیں کہ جو روح حق اور فارقلیط کے ظہور کے وقت موجود ہوں گے۔

شبہ ثالثہ:۔ انجیل یوحنا باب چہاردہم آیت تیسویں میں جو سردار کا لفظ آیا ہے اس پر بعض شدید التعصب نصاریٰ مضحکہ کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ سردار سے اس جگہ شیطان مراد ہے۔

جواب:۔ سردار سے شیطان مراد لینا سراسر جہالت ہے اور محض تعصب اور حسد پر مبنی ہے اس لیے کہ سردار عالم بول کر شیطان مراد لینا نہ کسی لغت سے ثابت ہے اور نہ کسی عرف سے اور سراسر سیاق و سباق کے بالکل خلاف ہے اس لیے کہ از اول تا آخر روح حق یعنی فارقلیط کا اور اس کے اوصاف کا تذکرہ ہے۔ جس وقت اس فارقلیط کا ظہور ہو اس وقت اس پر ایمان لانے کی تاکید کید ہے اور پھر اس کی علت بایں الفاظ ذکر فرمانا:

"کیوں کہ دُنیا کا سردار آتا ہے"

یہ جب ہی صحیح ہو سکتا ہے کہ سردارِ جہاں سے سید العالمین اور سردار انبیاء والمرسلین مراد ہوں۔ ورنہ معاذاللہ اگر اس مقام پر سردار سے شیطان مراد ہو تو شیطان کا آنا امور متذکرۂ بالا کی علت کیسے ہو سکتا ہے؟ معلوم ہوا کہ دُنیا کے سردار سے وہی فارقلیط اور روح حق مراد ہے کہ جس کے ہاتھوں سے گناہ اور جرم پر دُنیا میں شاہانہ اور حاکمانہ سزائیں دی جائیں گی اور انجیل یوحنا کے سولھویں باب ورس ۱۱ میں جو یہ آیا ہے کہ دُنیا کا سردار مجرم ٹھہرایا گیا یہ قطعاً غلط ہے اور بلاشبہ تحریف ہے جو سیاق و سباق کے بالکل خلاف ہے۔ ایک طرف تو فارقلیط کی صفات فاضلہ کا بیان ہو اور ایک طرف اس سے شیطان مراد ہو یہ کیسے ممکن ہے اور پھر اس سے بڑھ کر یہ کہ علماء نصاریٰ کے نزدیک کبھی اس سے روح القدس مراد ہو کیا یہ صریح نادانی اور وسوسۂ شیطانی نہیں۔ دوم یہ کہ حضرت مسیح کا یہ فرمانا کہ وہ سردارِ جہاں آنے والا ہے اس امر کی صریح دلیل ہے کہ وہ شخص ابھی تک دُنیا میں نہیں آیا اور شیطان باتفاق یہود و نصاریٰ اور اہل اسلام ابتداء آفرینش افراد بشری سے دُنیا میں موجود ہے اور لوگوں میں مختلط ہے۔ شیطان مردود لوگوں کے ساتھ ہے۔

وہ شیطان کہاں چلا گیا ہے کہ جس کی نسبت یہ کہا جا رہا ہے کہ وہ اب آتا ہے کیا وہ پہلے سے موجود نہ تھا؟

سوم یہ کہ سردار کا اطلاق انجیل متی کے باب دوم کی آیت ششم میں حضرت مسیح بن مریم علیہ الصلوٰۃ والسلام پر کیا گیا۔

عبارت انجیل حسب ذیل ہے:

"اے بیت لحم یہوداہ کے علاقے تو یہوداہ کے حاکموں میں ہرگز سب سے چھوٹا نہیں۔ کیونکہ تجھ میں سے ایک سردار نکلے گا جو میری اُمت اسرائیل کی گلہ بانی کرے گا" اھ

اس عبارت میں سردار سے حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام مراد ہیں جیسا کہ آیت ہفتم سے آیت دوازدہم تک پڑھنے سے بخوبی معلوم ہو سکتا ہے بلکہ کتب سماویہ میں سردار اور حاکم کا اطلاق حق تعالیٰ پر بھی آیا ہے معلوم ہوا کہ سردار سے شیطان مراد لینا بالکل غلط ہے۔

بشارت بست و دوم

از انجیل متی باب ۱۳، آیت ۳۱

"اُس نے ایک اور تمثیل اُن کے سامنے پیش کر کے کہا کہ آسمان کی بادشاہت اس رائی کے دانہ کے مانند ہے جسے کسی آدمی نے لے کر اپنے کھیت میں بو دیا۔ ۳۲۔ وہ سب بیجوں سے چھوٹا تو ہے مگر جب بڑھ جاتا ہے تو سب ترکاریوں سے بڑا ہوتا ہے اور ایسا درخت ہو جاتا ہے کہ ہوا کے پرندے آ کر اُس کی ڈالیوں پر بسیرا کرتے ہیں" انتہی

آسمانی بادشاہت سے شریعت اسلامیہ مراد ہے کہ جو ابتداء میں رائی کے دانے کے برابر تھی لیکن چند ہی روز میں اس قدر بڑھی کہ شرق سے غرب تک اور شمال سے جنوب تک پہنچ گئی۔

اور قرآن کریم کی اس آیت شریفہ میں اسی بشارت کی طرف اشارہ ہے:

ومثلهم في الانجيل كزرع اخرج شطأه فآزره فاستغلظ فاستوى على سوقه يعجب الزراع ليغيظ بهم الكفار ط

اور ان کی صفت انجیل میں ہے کہ جیسے کھیتی کہ اُس نے اپنا پٹھا زمین سے نکالا پس اس کو قوی کیا تو وہ موٹا ہو گیا اور اپنی نال پر سیدھا کھڑا ہو گیا اور اپنی روز افزوں ترقی سے کسانوں کو خوش کرنے لگا۔ اللہ نے مسلمانوں کو ایسی ترقی اس لیے دی کہ کافروں

کو اس وجہ سے غصہ میں لائے۔
اور عجب نہیں کہ اسی مناسبت سے کلمہ طیبہ کو شجرۃ طیبہ کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہو۔ کما قال
الم تر کیف ضرب اللہ مثلاً کلمۃ طیبۃ کشجرۃ طیبۃ اصلھا ثابت و
فرعھا فی السماء تؤتی اکلھا کل حین باذن ربھا و یضرب اللہ الامثال
للناس لعلھم یتذکرون۔
اے نبی کریم آپ نے کیا دیکھا نہیں کہ اللہ نے ایک مثال بیان فرمائی ہے کہ کلمہ طیبہ مثل
ایک پاکیزہ درخت کے ہے کہ جس کی جڑ مضبوط اور شاخیں آسمان میں ہیں۔ ہر وقت
اپنے میوے اللہ کے حکم سے دیتا رہتا ہے حق تعالیٰ شانہٗ لوگوں کے لیے مثالیں
بیان فرماتے رہتے ہیں کیا عجب ہے کہ نصیحت قبول کریں۔

بشارت بست وسوم

انجیل متی، باب بستم۔ آیت اوّل
آسمان کی بادشاہت اس گھر کے مالک کے مانند ہے جو سویرے نکلا کہ اپنے انگوری باغ
میں مزدور لگائے۔ ۲۔ اور اس نے مزدوروں سے ایک دینار روز ٹھہرا کر انہیں باغ میں بھیج
دیا۔ پھر وہ دن چڑھنے کے قریب نکل کر اس نے اوروں کو بازار میں بے کار کھڑے دیکھا اور
اُن سے کہا تم بھی باغ میں چلے جاؤ، جو واجب ہے تمہیں دوں گا۔ پس وہ چلے گئے۔ پھر اس نے
دوپہر اور تیسرے پہر کے قریب نکل کر ویسا ہی کیا اور کوئی ایک گھنٹہ دن رہے پھر نکل کر
اوروں کو کھڑا پایا اور اُن سے کہا تم کیوں یہاں تمام دن بے کار کھڑے رہے۔ انہوں نے اس سے
کہا اس لیے کہ کسی نے ہم کو مزدوری پر نہیں لگایا۔ اُس نے اُن سے کہا تم بھی باغ میں چلے جاؤ۔
جب شام ہوئی تو باغ کے مالک نے اپنے کارندے سے کہا کہ مزدوروں کو بلا اور پچھلوں
سے لے کر پہلوں تک انہیں مزدوری دے دے۔ جب وہ آئے جو گھنٹہ بھر دن رہے لگائے
گئے تھے تو انہیں ایک دینار ملا تو گھر کے مالک سے یہ کہہ کر شکایت کرنے لگے۔ ان پچھلوں
نے ایک ہی گھنٹہ کام کیا ہے اور تو نے انہیں ہمارے برابر کر دیا جنہوں نے دن بھر کا بوجھ اٹھایا اور سخت
دھوپ سہی۔ اس نے جواب دے کر ان میں سے ایک سے کہا میاں میں تیرے ساتھ بے انصافی نہیں
کرتا۔ کیا تیرا مجھ سے ایک دینار نہیں ٹھہرا تھا جو تیرا ہی اٹھا لے چلا جا۔ میری مرضی یہ ہے کہ

جتنا تجھے دیتا ہوں اُس پچھلے کو بھی اتنا ہی دوں۔ کیا مجھے روا نہیں کہ اپنے مال کو جو چاہوں سو کروں۔ یا تو اس لیے کہ میں نیک ہوں بُری نظر سے دیکھتا ہے۔ اسی طرح آخر اول ہو جائیں گے۔ اور اول آخر۔ انتہیٰ)

گھر کے مالک سے رب العزت مراد ہیں اور انگور کے باغ سے دین الٰہی مراد ہے اور مزدوروں سے اُمتیں مراد ہیں۔ اور مزدوروں کی وہ جماعت کہ جس نے سب سے آخر میں ایک گھنٹہ کام کیا ہے یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت ہے جو سب سے اخیر میں تھی اور سب سے اول ہو گئی۔ چنانچہ صحیح بخاری میں ہے:

عن ابن شہاب عن سالم بن عبداللہ عن ابیہ انہ اخبرہ انہ سمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول انما بقاؤکم فیما سلف قبلکم من الامم کما بین الصلوۃ العصر الی غروب الشمس اوتی اھل التوراۃ التوراۃ فعملوا حتیٰ اذا انتصف النہار عجزوا فاعطوا قیراطاً قیراطاً ثم اوتی اھل الانجیل الانجیل فعملوا الی صلوۃ العصر ثم عجزوا فاعطوا قیراطا قیراطاً۔ ثم اوتینا القرآن فعملنا الی غروب الشمس فاعطینا قیراطین قیراطین فقال اھل الکتابین ای ربنا اعطیت ھؤلاء قیراطین قیراطین واعطیتنا قیراطاً قیراطاً ونحن اکثر عملاً قال اللہ عزوجل ھل ظلمتکم من اجرکم من شیئ قالوا لا قال فھو فضلی اوتیہ من اشاء

(صحیح بخاری باب المواقیت ص ۷۹ ج ۱)

ابن شہاب نے سالم سے اور سالم نے عبداللہ بن عمر سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن عمر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ تمہارا دُنیا میں رہنا بمقابلہ اُمم گزشتہ ایسا ہے جیسا نماز عصر سے غروب شمس تک، تورات والوں کو تورات دی گئی کام کرنا شروع کیا، جب دوپہر ہوئی تو تھک گئے اور کام پورا نہ کر سکے ایک ایک قیراط اُن کو دیا گیا۔ پھر انجیل والوں کو انجیل دی گئی، نماز عصر تک کام کیا، پھر تھک گئے۔ ان کو بھی ایک ایک قیراط دے دیا گیا۔ پھر ہم کو قرآن کریم دیا گیا۔ ہم نے غروب آفتاب تک کام کیا۔ ہم کو

دو دو قیراط دیے گئے تو توریت اور انجیل والوں نے یہ کہا کہ اے پروردگار آپ نے ان کو دو دو قیراط دیے اور ہم کو ایک ایک حالانکہ ہمارا عمل زیادہ ہے۔ اللہ عزوجل نے یہ ارشاد فرمایا کہ میں نے تمہاری اُجرت میں کچھ کمی کی ہے؟ کہا نہیں، پس فرمایا۔ رب العزت نے یہ میرا فضل ہے جس کو چاہوں دوں۔

اور انجیل متی کی سولھویں آیت کا یہ جملہ کہ "اسی طرح آخر اول ہو جائیں اور اول آخر" بعینہٖ صحیح بخاری کی اس حدیث کے مطابق ہے:

حدثنا ابو ھریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال نحن الآخرون السابقون۔ (بخاری شریف ص ۱۰۴۲ ج ۲)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ نحن الآخرون السابقون۔

یعنی زمانہ کے لحاظ سے ہم سب سے اخیر میں ہیں مگر دخولِ جنت میں حق تعالیٰ شانہٗ کے فضل سے سب سے مقدم ہیں۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر

۲۰۱- وہ ان کو نیکی کا حکم دے گا اور ان کو بُرائی سے روکے گا۔ عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ معروف سے مراد مکارم اخلاق اور صلہ رحمی ہے اور منکر سے مراد بتوں کی عبادت اور قطع رحمی ہے۔ مقاتل کہتے ہیں کہ معروف ایمان و توحید ہے جب کہ منکر شرک ہے۔ اگر عبداللہ ابن عباس کی تشریح کو اپنایا جاتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن نے ان لفظوں میں نبی شناسی کا وہی اخلاقی پیمانہ پیش کیا ہے جس کی مدد سے آغازِ نبوت میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ نے آپ کو نبی مانا تھا۔ یہ نبی شناسی کا اخلاقی پیمانہ ہے۔ امام بخاری نے اس پیمانے کا ذکر حدیث عائشہ میں کیا ہے اور حضرت خدیجہ کی زبانی اس اخلاقی پیمانہ کی تصویر یہ ان الفاظ میں پیش کی ہے۔ آغازِ وحی میں جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ سے عالم مادی میں غارِ حرا کے روحانی مشاہدات کا تذکرہ کیا تو وہ ایمان لے آئیں۔ مگر کس پیمانہ سے اس کی توضیح اس سے ہوتی ہے کہ جب اپنے ان سے اپنے اس احساس کا تذکرہ کیا کہ خشیت علی نفسی تو حضرت خدیجہ

نے فرمایا :

خدا کی قسم خدا آپ کو رسوا نہ کرے گا۔ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں قرض داروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، غریبوں کی مدد کرتے ہیں۔ مہمانوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔ حق کی خاطر مصیبتوں میں لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ نیکی کا حکم دینا اور برائی کا روکنا دعوتِ نبوت کی خصوصیات میں ہے۔ تورات میں جو صفات مذکور ہیں اس کا بہت بڑا عنصر آپ کی اخلاقیات سے متعلق ہے۔ احادیث سے بھی یہی پتہ لگتا ہے کہ آپ کی تشریف آوری کا مقصد مکارمِ اخلاق کی تکمیل ہے۔ جو انسان انسانوں کے ساتھ اخلاق میں فیل ہو وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اسلام میں انسانی بلندی کا معیار اخلاق کی بلندی پر رکھا گیا ہے اس لیے خواص کو اخلاقیات میں عوام سے اونچا ہونا چاہیے۔ نبی کو اپنے اُمتی سے اونچا ہونا چاہیے اور اسی لیے انبیاء علیہم السلام میں سب سے بڑے نبی ہیں وہ اخلاقیات میں سب سے بڑھ کر اور آگے ہیں وہ اخلاقیات میں بھی سب سے آگے تھے حتیٰ کہ ان کی نبوت کا معیار ہی ان کی اخلاقی آزمائش تھی۔ یہاں حافظ ابن کثیرؒ نے یہ بات بڑے نکتہ کی لکھی ہے کہ

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی چہرہ پہلی کتابوں میں آیا ہے اور آپ کی پوری زندگی اسی کی عملی تفسیر تھی۔ آپ ہمیشہ خیر کے داعی اور برائی سے روکنے والے بن کر رہے۔ عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں قرآن میں جب بھی اللہ سبحانہٗ یاایھا الذین آمنوا کہہ کر مخاطب کریں تو پورے دھیان سے سنو۔ کسی خیر کا حکم ہوگا اور یا پھر کسی شر سے ممانعت ہوگی۔ سب سے بڑا معروف یگانہ خدا کی عبادت کا حکم ہے اور سب سے بڑا منکر خدا کے سوا اور کسی کی عبادت ہے۔ سارے نبیوں کی دعوت کا یہی خلاصہ ہے لقد بعثنا فی کل امۃ رسولاً ان اعبدوا اللہ واجتنبوا الطاغوت۔

سیدھا سادا دین نبوت کی دعوت ہے

۲۰۲۔ پسندیدہ چیزیں حلال کرے گا گندی چیزیں حرام ٹھہرائے گا، اس بوجھ سے نجات دلائے گا جس کے تلے لوگ دبے ہوتے ہیں، ان پھندوں سے نکالے گا جن میں لوگ گرفتار ہیں۔

یعنی یہود پر جو سخت احکام تھے اور کھانے کی چیزوں میں ان کی شرارتوں کی وجہ سے تنگی تھی فبظلم من الذین ھادوا حرمنا علیھم طیبات احلت لھم (نساء رکوع ۲۲) اس دین میں وہ سب چیزیں آسان ہو گئیں - اور جو ناپاک چیزیں مثلاً لحم خنزیر یا گندی باتیں مثلاً سود خوری وغیرہ انہوں نے حلال کر رکھی تھیں - ان کی حرمت اس پیغمبر نے ظاہر فرمائی - غرض ان سے بہت سے بوجھ ہلکے کر دیے اور بہت سی قیدیں اٹھا دی گئیں جیسا کہ حدیث میں فرمایا بعثت بالحنیفۃ السمحۃ[1]

اس میں دو باتیں بتائی گئی ہیں ایک یہ کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پسندیدہ چیزوں کو جائز ٹھہراتے ہیں ناپسندیدہ چیزوں کے استعمال سے روکتے ہیں - قرآن نے اس معنے میں طیبات اور خبائث کا لفظ اختیار کیا ہے - لفظ طیب اور خبیث میں اس قدر عموم ہے کہ اموال، احوال، اقوال اعمال اور اشیاء سب ہی اس کے دائرہ میں آجاتے ہیں - اشیاء میں یہ دونوں لفظ بولے جائیں تو صاف ستھری چیز طیب، گندی اور ناپاک چیز خبیث ہوتی ہے - اموال میں یہ لفظ استعمال ہو تو مال حلال طیب اور مال حرام خبیث کہلاتا ہے - احوال میں یہ فضائل کے لیے طیب اور رذائل کے لیے خبیث بولا جاتا ہے - اقوال میں اچھی باتوں کو طیب اور بری باتوں کو خبیث کہتے ہیں اس لیے آیتِ قرآنی کا صرف یہی منشا نہیں ہے کہ کھانے پینے کی چیزوں میں یہ پیغمبر اچھی اور ستھری چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ نبوت اشیاء، اموال، احوال، اقوال اور اعمال میں ہر اس چیز کی حوصلہ افزائی کرتی ہے جو اچھی ہو ستھری ہو اور ہر اس چیز پر قدغن قائم کرتی ہے جو پلید اور گندی ہو - ان دو لفظوں میں جامعیت پر غور کرو گے تو آپ کو اس میں پورا دین سمٹا ہوا نظر آئے گا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حلت و حرمت کا مدار طیب اور خبیث ہوتا ہے - خواہ اس کا تعلق اموال سے ہو یا اشیاء سے - قرآن میں اموال سے لے کر گفتار و کردار تک ہر چیز پر طیب اور خبیث بولا ہے - چونکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کسی خاص قوم یا زمانے تک محدود نہیں اس لیے آپ کو اخلاقی تعلیمات کا جو صحیفہ عنایت ہوا اس کو صرف اشیاء تک محدود نہیں رکھا گیا بلکہ اقوال، افعال اور احوال تک وسیع کر دیا گیا - اس لیے زندگی کے تمام گوشوں میں جو برائیاں پائی جانے والی تھیں ان سب سے منع کیا گیا - تمام انسانی اچھائیوں کو بھی کھول کر بیان کیا اور ان کے حصول کی تاکید کی - آئیے اس نظر سے قرآن کا مطالعہ فرمائیے اور غور فرمائیے کہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

طیبات کی تعلیم اور خبائث کی ممانعت کیسے کی ہے۔

شاید یہاں آپ کے ذہن میں یہ خلش محسوس ہو کہ اس آیت میں امر، نہی اور تحلیل و تحریم کی نسبت بجائے اللہ سبحانہ کے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی گئی ہے۔ حالانکہ اصول فقہ کی عام کتابوں میں یہ بات واشگاف طور پر بتائی گئی ہے الحاکم لاخلاف فی امۃ اللہ رب العالمین اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ حکم دینے والا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے اور لاحکم الامن اللہ حکم صرف اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔ یہی عبارت کم و بیش اصول فقہ کی مشہور کتاب التوضیح والتلویح میں بھی ہے اور اسی مضمون کو علامہ ابن امیر الحاج نے شرح تحریر الاصول میں اور علامہ اسنوی شافعی نے شرح منہاج الاصول میں نہایت شرح و بسط کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ حکم تشریعی صرف اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اس عقدہ کو حجۃ اللہ البالغہ میں اس طرح حل فرمایا ہے:

> تحلیل و تحریم اس تکوین کا نام ہے جو عالم ملکوت میں نافذ ہوتی ہے کہ فلاں شے پر مواخذہ ہوگا یا نہیں پس یہی تکوین اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے۔ رہی تحلیل و تحریم کی نسبت حضور انور کی طرف تو وہ اس معنے میں کہ رسول ہونے کی وجہ سے آپ کا قول قطعی نشانی ہے اللہ تعالیٰ کے حلال اور حرام کرنے کی۔

مطلب یہ ہے کہ احکام شرعی امور تکوینی کی طرف راجع ہیں اور تکوین اللہ تعالیٰ کی صفات میں داخل ہے اور اس صفت میں دیگر صفات کی طرح اس کا کوئی بھی شریک نہیں۔ شرعی امور میں حلت کی نسبت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس معنے میں ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور آپ کا کسی چیز کو حلال و حرام کہنا اس بات کی قطعی نشانی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو حلال یا حرام فرمایا ہے نہ یہ کہ آپ کو حلال یا حرام کرنے کا کوئی اختیار حاصل تھا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی مرتبہ اپنا منصب صاف الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ ایک مرتبہ حضرت علی نے ابوجہل کی لڑکی حضرت جویریہ سے نکاح کرنے کا ارادہ کیا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اطلاع ہوئی تو آپ نے ایک بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا جس میں یہ بات خاص طور پر فرمائی۔ بلاشبہ میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال نہیں کرتا لیکن بخدا رسول اللہ کی بیٹی اور دشمن خدا کی بیٹی دونوں کبھی یکجا نہیں ہو سکتیں۔ حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

> گفت من حرام نمی گردانم حلال را و حلال نمی گردانم حرام را ولیکن ہرگز جمع نہ شود

دخترِ دوستِ خدا و دخترِ دشمنِ خدا در یک جا۔

دوسری بات جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے کہ اس بوجھ سے نجات دلائے گا جس کے تلے لوگ دبے ہوتے ہیں ان پھندوں سے نکالے گا جن میں لوگ گرفتار ہیں۔ یہود نے اپنے اوپر بہت سی خود ساختہ پابندیاں لاد رکھی تھیں۔ اور بعض پابندیاں ان کی سرکشی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی ان پر عائد کر دی گئی تھیں۔ یہ خود ساختہ پابندیاں کیا تھیں اور یہ پھندے کون سے تھے جن سے محمد رسول اللہ نے رہائی دلائی۔ قرآن نے دوسرے موقع پر اسے واضح کر دیا ہے۔ مذہبی احکام کی بے جا سختیاں مذہبی زندگی کی ناقابل پابندیاں، ناقابل فہم عقیدوں کا بوجھ، وہم پرستیوں کا انبار، علماء کی عقیدتوں کی زنجیریں اور مشائخ کے تعبد کی بیڑیاں۔ یہ بوجھل رکاوٹیں تھیں جنہوں نے یہودیوں اور عیسائیوں کے دل و دماغ مقید کر دیے تھے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت نے ان سب سے نجات دلائی۔ اس نے سچائی کی ایسی سہل و آسان راہ دکھا دی جس میں عقل کے لیے کوئی بوجھ نہیں عمل کے لیے کوئی سختی نہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ سب دینوں میں اللہ تعالیٰ کو کون سا دین پیارا ہے فرمایا الحنیفیۃ السمحۃ دین حنیفی جو نہایت سہل تھا۔ مسند احمد میں حضور انور کا ارشاد ہے الدین یسر دین بہت آسان ہے اور مسند احمد ہی میں ایک روایت میں ہے سب دینوں میں بہتر وہ ہے جو سب سے آسان ہو۔ یہ نرمی اور سہولت ملت ابراہیمی کی بنیاد اور اساس ہے اور اس کی اسی بنیاد پر شریعتِ محمدیہ کی پوری عمارت اٹھائی گئی ہے اگر اس پر تفصیلی بحث کی جائے تو تمام شریعت پر ایک اجمالی نظر ڈالنا ہوگی اور اس اجمال میں بھی اتنی تفصیل ہو جائے گی۔ جس کے لیے معالم القرآن کے صفحات متحمل نہیں ہو سکتے اس لیے ہم یہاں صرف وہ اصول تیسیر پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے تحریر فرماتے ہیں۔ ان کی روشنی میں آپ تمام شریعت کا جائزہ لے کر بآسانی یہ فیصلہ کر سکیں گے کہ اس شریعت میں دوسرے ادیان کی نسبت سے کتنی سہولت کی رعایت رکھی گئی ہے۔ شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ دین میں یسر و سہولت کے لیے حسب ذیل امور کا لحاظ ضروری ہے۔

۱۔ کبھی عبادت کے لیے ایسی چیز کو رکن و شرط کی حیثیت نہ دی جائے جس کی ادائیگی میں دشواری ہو۔ شریعتِ محمدیہ میں ہر نماز کے ساتھ مسواک کرنا اسی لیے لازم قرار نہیں دیا گیا۔

لولا ان اشق علی امتی لامرتھم بالسواک عند کل صلاۃ کا یہی مفہوم ہے ۔
۲۔ اگر کسی دشوار چیز کا حکم دیا جاتے تو اس میں تدریج کا خیال رکھا جاتے تاکہ اس میں ایک گونہ سہولت پیدا ہو جاتے ۔ شراب کی حرمت کا مسئلہ بالخصوص اہل عرب کے لیے ایک سنگین مسئلہ تھا۔ اس کی حرمت یکبارگی نہیں بلکہ بتدریج آئی ۔
۳۔ طبعی میلان کو پیش نظر رکھا جاتے تاکہ دعوت کو عقل بھی قبول کرنے کے لیے آمادگی ہو۔ اور تعمیل حکم میں ایک ہی وقت عقل اور طبیعت دونوں کی رغبت پیدا ہو جاتے۔ مساجد کو صاف کرنا ان میں خوشبو کرنا ، جمعہ کے دن غسل کرنا ، خوشبو لگانا ، اذان میں خوش گلوتی اور قرآن خوانی میں آواز کی تزئین اسی لیے ہے ۔
۴۔ طبعی اور طبیعت کی نفرت کو بھی ملحوظ رکھا جاتے اور لوگوں سے ناقابل برداشت ناگواری کا مطالبہ نہ کیا جاتے ۔ اسی بنا پر اسلام میں غلام نابینا مجہول النسب شخص کی امامت کو پسند نہیں کیا گیا کہ بہت سے حالات میں ان کی امامت تنفر کا موجب ہو سکتی ہے ۔ اسی طرح امام یا کسی مقتدیٰ دبزرگ کی موجودگی میں ان کی امامت کی طرف طبعی میلان ہوتا ہے اسی لیے ان کی موجودگی میں دوسروں کی امامت ناپسندیدہ قرار دی گئی ۔
۵۔ انسان کی فطرت میں مسرت وغم کے موقعہ پر کچھ رسوم بھی منانا داخل ہے جن کی ادائیگی وہ اپنی زندگی کا ایک ناگزیر تقاضا سمجھتا ہے اس کے اس تقاضے کی بھی رعایت کی جاتے۔ عیدین اور جمعہ کی مشروعیت اسی تقاضے کو پورا کرنے کے لیے ہے ۔
۶۔ عوام کے جذبات کی تا بحدِ امکان رعایت کی جاتے ۔ خانہ کعبہ میں دو دروازے قائم کرنے کا ارادہ آپ نے اسی لیے فسخ کر دیا کہ اس میں قریش کے جذبات کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ مبادا وہ یہ خیال کر لیں کہ آپ نے ان کے بزرگوں کی یادگار کی بھی کوئی پرواہ نہ کی اور ان کی قدیم بنا کو توڑ کر نئی تعمیر کر ڈالی جہاں اسی مفسدہ کی خاطر اس مصلحت کو ترک کر دیا گیا ۔
۷۔ ارکان و شرائط کی تحدید و تعیین کی جاتے مگر نہ اتنی کہ بجاتے سہولت کے اور مصیبت بن جاتے ۔ ایک حد تک ان کو متعین بھی کر دیا جاتے اور ایک حد تک معاملہ مخاطبوں کی عقل و فراست کے سپرد کر دیا جاتے ۔ مثلاً سورہ فاتحہ کا پڑھنا نماز کے لیے ضروری قرار دیا گیا مگر مخارج حروف کی ادائیگی اور طرزِ قرأت کو معروف طریقہ پر چھوڑ دیا گیا ۔ نماز کے لیے استقبالِ قبلہ کو ضروری قرار دیا گیا مگر تعیینِ سمت قبلہ کے لیے براہین ہندسیہ طول و عرض بلد کا شرط قرار نہیں دیا گیا۔ رمضان

روزوں کے لیے ماہِ رمضان شرط قرار دیا گیا مگر یہاں بھی زائچہ اور جنتری کا مکلف نہیں بنایا گیا بلکہ صرف چاند کے طلوع پر مدار کیا گیا ہے اور ابر و غبار کی صورت میں تیس دن پورے کر لینا کافی سمجھ لیا گیا۔

بہرحال حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی آیت میں یہ صفت بیان ہوئی ہے کہ آپ یہودیوں سے ان کا بوجھ اتاریں گے اور ان پھندوں کو ہٹائیں گے جن میں وہ گرفتار ہیں۔ یعنی ان کو منسوخ کر کے ان کی جگہ آسان احکام دیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کی لائی ہوئی شریعت آسان ہوگی۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے ازالۃ الخفا میں اس پوری آیت پر جامع تبصرہ کیا ہے وہ بھی گوش گزار فرمالیجئے۔

ان آیات کا بالاختصار مطلب یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہِ الٰہی میں دعا کی کہ اے پروردگار ملاءِ اعلیٰ میں میری امت کے لیے دنیا اور آخرت کی نیکی مقدر کر دے۔ اللہ سبحانہٗ کی جانب سے جواب ملا یہود ایک حال پر نہ رہیں گے بلکہ ان میں سے بعض کو برا عذاب پہنچے گا اور یہ وہ لوگ ہیں جن کی نسبت اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وقضینا الی بنی اسرائیل فی الکتاب لتفسدن فی الارض مرتین اور کچھ پر رحمتِ الٰہی ہوگی اور یہ وہ لوگ ہیں جن کی نسبت اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے واذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ جعل فیکم انبیاء و جعلکم ملوکا و اٰتاکم مالم یؤت احدا من العالمین۔ پھر فرمایا فساکتبھا للذین یتقون ویؤتون الزکوٰۃ والذین ھم بآیاتنا یؤمنون۔ یعنی ان لوگوں کے لیے دنیا اور آخرت کی نیکی لکھ دوں گا جن کا تعارف یہ ہے کہ وہ متقی ہوں گے زکوٰۃ دیں گے اور اللہ کی آیات پر ایمان رکھیں گے۔ ان آیات سے معلوم ہوا کہ آئندہ زمانے میں ایک امت ایسی پیدا ہوگی جو ان اوصاف سے موصوف ہوگی اور اللہ تعالیٰ ان کو دو قسم کی خوشحالیاں عطا فرمائے گا۔ ایک دنیا کی خوشحالی اور دوسری آخرت کی خوشحالی۔ دنیا کی خوشحالی یہ کہ ان کو دنیا میں ملکی فتوحات، سیاسی غلبہ اور معاشی فراوانی کے ذریعے ایسا طاقتور بنائے گا کہ دوسری قومیں ان کی باجگذار اور محکوم بن کر رہیں گی اور آخرت کی خوشحالی یہ کہ وہ آخرت والی زندگی میں نجات یافتہ، مغفور اور رفع درجات سے ہمدوش ہوں گے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ یہ امت نبی امی کے پیروکار ہوگی اور دنیا و آخرت کی خوشحالیوں سے یہ ہمدوش ہوگی۔ یعنی ملکوت میں ہم نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ جو لوگ نبی امی کی پیروی کریں گے اس پر ایمان لائیں گے اس کی حمایت کریں گے اس کے مددگار بنیں گے اور اس روشنی کی اتباع کریں گے جو نبی لے کر آئے گا۔ یہی لوگ کامیاب ہوں گے۔ اس نبی امی کا تعارف یہ ہے کہ اس کا ذکر تورات و انجیل میں ہوگا۔ چونکہ

اس جلیل القدر پیغمبر کا ذکر عظیم المرتبت انبیاءؑ کی زبانوں پر ہوگا اس لیے پوری انسانیت پر اس کا ماننا ضروری ہے جو نہ مانیں گے وہ معذور نہ ہوں گے۔ اور انبیاءؑ نے تورات و انجیل میں اس نبی اُمی کا جو تعارف کرایا ہے یہ ہے کہ وہ پسندیدہ باتوں اور کاموں کا حکم دے گا اور ناپسندیدہ باتوں، کاموں سے روکے گا۔ پاکیزہ چیزوں کو ان کے لیے حلال کرے گا ناپاک چیزوں کو حرام قرار دے گا اور جن اضافوں اور سختیوں نے انسانوں کو دبا رکھا ہے ان کو ہٹائے گا یعنی قوانین کی سختیاں ہٹا کر ملت حنیفہ سہلہ اور سمحہ پیش کرے گا لہٰذا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت اللہ سبحانہٗ کی بھرپور رحمت اور کمال رافت ہوگی۔

صحابہ کرام کا چہرہ

۲۰۳۔ تو جو لوگ اس پر ایمان لے آئے اس کی حمایت کی اور اس کی مدد کی اور اس روشنی کے پیروکار ہو گئے جو اس کے ساتھ بھیجی گئی ہے۔ پس یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔ نور سے مراد وحی ہے متلو ہو یا غیر متلو یعنی قرآن و سنت[1] پہلی آیت میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا تعارف تھا اس آیت میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا بھرپور چہرہ پیش کیا گیا ہے اور بتایا ہے کہ جن حضرات نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان، آپ کی رفاقت اختیار کی، آپ کی مدد کی اور اس روشنی کی پیروی کی جو آپ کے ساتھ اتاری گئی ہے یہی لوگ کامیاب و بامراد ہیں۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

> ان آیات میں اللہ سبحانہٗ نے منطوقاً صحابہ کے لیے فلاح کو ثابت کیا ہے اور مفہوماً بتایا ہے کہ دُنیا و آخرت کی دونوں خوشحالیاں ان کے لیے ہوں گے اور یہ بے غبار حقیقت ہے کہ خلفاء راشدین ایمان کی نعمت سے مالا مال ہوتے اور انہوں نے حضور کی زندگی میں اور حضور کے وصال کے بعد آپ کی مدد کی۔ بزرگی کا یہ مقام کہ جس سے بالا کسی مقام کا تصور بھی ممکن نہیں صحابہ کرام کو حاصل ہوا ہے

آیت کے الفاظ پر غور کرو ایمان، تعزیر، نصرت اور اتباع کے الفاظ میں بڑی معنویت ہے۔ اس میں حضور انور پر ایمان کے ساتھ صحابہ کے تین وصف بیان کیے گئے ہیں ایک تعزیر

---

[1] افادات شیخ الاسلام

دوسرے نصرت اور تیسرے اتباع ۔

تعزیر عزر سے ہے عزر کے معنے لغت میں مدافعت کرنے اور روکنے کے آتے ہیں۔ عزروہ کے معنے یہ ہیں کہ انہوں نے اس کی مدد کی بایں طور کہ ان کے دشمنوں کی اس سے مدافعت کی ۔ اور جب نصرت واجب ہوئی تو تعظیم بھی اس میں آگئی کیونکہ نبوت کے نصرت کے معنے یہ ہیں کہ اس کی طرف سے مدافعت کی جائے اور ان کے دین کی حمایت کی جائے اور خود ان کی تعظیم توقیر ہو چنانچہ عربی میں تعزیر کے معنے توقیر کرنے اور تلوار کے ذریعے مدد کرنے کے آتے ہیں۔

حدیث بعثت میں ورقہ ابن نوفل کا یہ مقولہ نقل ہوا ہے ان بعث و انا حی فاعزرہ وانصرہ اگر میری زندگی میں آپ مبعوث ہوتے تو میں ان کی توقیر کروں گا اور مدد کروں گا۔ حضرت عبداللہ بن عباس سے اس کے معنے تعظیم و توقیر کے منقول ہوئے۔ صحابہ کرام سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی توقیر کے تاریخ میں الواب نقل ہو کر آتے ہیں۔ اس میں ادب رسول، خدمت رسول، محبت رسول، شوق دیدار رسول، شوق محبت رسول، اطاعت رسول، ہیبت رسول، رضامندی رسول، نعت رسول جیسے الواب ہیں ۔ یعنی توقیر رسول کا کوئی گوشہ نہیں جو صحابہ کرام میں موجود نہ ہو۔ صحابہ کرام میں جو خاص وصف ان کی پوری جماعت میں عام تھا اور جس کو ہم ایمان کے بعد ان کی پوری دینی زندگی کی روح حیات کہہ سکتے ہیں وہ یہ تھا کہ رسول کی محبت ان کو ہر چیز سے زیادہ تھی ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا تھا کہ آپ لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کتنی محبت تھی تو آپ نے فرمایا خدا کی قسم حضور ہم لوگوں کو اپنی جانوں سے زیادہ محبوب تھے ۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحابہ کے عشق و محبت کا جو حال تھا صلح حدیبیہ کی گفتگو قریش مکہ کے سفیر عروہ بن مسعود ثقفی نے اس کا جو منظر دیکھا اور جو اس نے کفار مکہ کی مجلس میں جاکر بیان کیا وہ آج تک صحیح بخاری اور دوسری حدیث کی کتابوں میں محفوظ ہے اس نے بتایا ؛

اے میری قوم کے لوگو میں نے بڑے بڑے بادشاہوں کے دربار دیکھے ہیں قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے درباروں کا منظر بھی میری آنکھوں نے دیکھا ہے ۔ میں نے نہیں دیکھا کہ کسی بادشاہ کی رعیت اپنے بادشاہ کے ساتھ عظمت و توقیر کا وہ معاملہ کرتی ہو جو محمد کے اصحاب ان کے ساتھ کرتے ہیں ۔ وہ جب تھوکتے ہیں تو ان کے فدائی تھوک کو ہاتھ میں لے لیتے ہیں اور اپنے منہ اور بدن پر مل لیتے ہیں اور جب وہ کسی کام کو کہتے ہیں تو ہر ایک دوسرے سے پہلے اور آگے بڑھ کر اس کو کرنا چاہتا

ہے اور جب وہ وضو کرتے ہیں تو پروانہ وار آپ کے وضو کا پانی اپنے ہاتھوں میں لینا چاہتے ہیں اور اس کے لیے ایک دوسرے پر گرتے ہیں اور جب وہ بات کرتے ہیں تو ان کی آوازیں ادب سے نہایت پست ہو جاتی ہیں اور احترام و وقار کی وجہ سے آنکھ بھر کے ان کی طرف نہیں دیکھتے ہیں۔ (صحیح بخاری)

یہ حال جو بیان کیا جا رہا ہے مخصوص افراد کا نہیں بلکہ پوری جماعت کا ہے اور یہ بیان بھی کسی دوست اور معتقد کا نہیں ہے بلکہ دشمنوں کے سفیر اور نمائندہ کا ہے جو اس نے اپنے لوگوں کے سامنے دیا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحابہ کے عشق و محبت کا کیا حال تھا۔

دین کے لیے محنت و قربانی

دوسرا وصف اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ انہوں نے حضور کی مدد کی۔ حضور کی مدد کا مطلب یہ ہے کہ جو دین حق آپ لے کر آئے ہیں اس کے فروغ کے لیے محنت اور حضور انور کی لائی ہوئی ہدایت و دعوت کا حلقہ وسیع کرنے اور غافل و خدا فراموش انسانوں کو اللہ کی بندگی کے صحیح راستہ پر لگانے کے واسطے محنت و مشقت برداشت کرنا اور اس راہ میں اپنا وقت اپنا چین و آرام اور اپنے جان و مال کی قربانی بھی صحابہ کرام کا عمومی وصف تھا۔ جس دین کو انہوں نے قبول کیا اور جس پر انہوں نے اپنی زندگی کی بنیاد دین استوار کی تھیں۔ وہ ایک جاندار انقلاب انگیز اور متحرک نظام فکر و عمل تھا جس کا خمیر عشق و محبت کی ولولہ انگیزیوں اور جنون نوازیوں سے تیار ہوا تھا جس میں ایثار و قربانی اور سرفروشیوں کی ایک دنیا آباد تھی اور جس میں محض افراد کی شخصی نجات کا نہیں بلکہ پورے عالم کی نجات کا تصور اور جذبہ کار فرما تھا۔ صحابہ کرام ایک نظام تمدن اور طرز زندگی کے داعی تھے۔ ایک عالمگیر نصب العین کے نمائندے تھے اور ایک جہانی مقصد کے علمبردار تھے۔ چنانچہ ان کے اعمال و عبادات کی قدر و قیمت اسی نسبت سے متعین کی جاتی تھی جس نسبت سے وہ اس نصب العین کی تقویت کا باعث ہوتے تھے۔ اللہ کے دین کی مدد ان کے اخلاص و اتقاء کا پیمانہ تھا اور خدا کے ہاں ان کا اجر بھی اسی پیمانہ سے تقسیم ہوتا تھا۔ دین کی نصرت کے بارے میں قرآن کا مطالبہ صحابہ سے اس قدر انتہا پسندانہ تھا کہ جب انصار کی ایک جماعت نے کئی برس تک متواتر اس جدوجہد میں مشغول رہنے اور اس راہ میں ہر طرح

کی جانی و مالی قربانیاں کرنے کے بعد کچھ مدت کے لیے اپنے کاروبار اپنی کھیتی باڑی اور باغات کی اصلاح و خبر گیری کے لیے دین کی محنت سے رخصت چاہی تو یہ آیت نازل ہوئی۔ لا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ، گویا انفرادی فرائض پوری طرح ادا کرتے ہوئے بھی دین کی خدمت و نصرت اور اعلاء کلمۃ اللہ کی جدوجہد سے سبکدوش ہو کر صرف کاروباری زندگی گزارنے کو خودکشی قرار دیا گیا۔

ایمان باللہ کا حقیقی امتحان صرف اللہ کے دین کی مدد میں ہے اور یہی وہ کسوٹی ہے جس پر کھرے اور کھوٹے کی تمیز ہوتی ہے بلکہ اگر یوں کہیں کہ اللہ کے دین کی نصرت ہی ایمان کا اولین تقاضا ہے تو یہ کوئی مبالغہ نہیں ہے۔

ایمان کے ساتھ یہاں صحابہ کی چوتھی خصوصیت زیادہ نمایاں کر کے بیان کی گئی ہے وہ ہے اتباع ما انزل معہ وہ چیز جو پیغمبر کے ساتھ اتاری گئی ہے اس کا اتباع کرتے ہیں۔ بجائے ما انزل الیہ یا ما انزل علیہ کہنے کے ما انزل معہ کی تعبیر شاید یہ بتانے کے لیے اختیار کی گئی ہے کہ صحابہ کی اتباع کا دائرہ وحی کتابی ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ ان تمام چیزوں میں نبوت کی پیروی کرتے ہیں جو وہ رسول ہونے کی حیثیت میں پیش کرتے ہیں کیونکہ نبی کی ذات نبوت اور وحی سے سرفراز ہونے کے بعد مجسم ہدایت و رہنمائی اور امامت و پیشوائی کے لیے خاص ہو جاتی ہے۔ ان کی بعثت اسی لیے ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کی رہنمائی کریں۔ ان کو ضلالت و گمراہی سے بچائیں جس امت میں وہ مبعوث ہوتے ہیں اس کے سامنے وہ ہدایت و رہنمائی کے دو چراغ روشن ہوتے ہیں۔ ان دونوں کی روشنی مل کر ایک ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو جنہیں یہود اپنی شرارت اور سازش سے گمراہ بنانا چاہتے تھے خطاب کر کے فرماتا ہے۔

یا ایھا الذین اٰمنوا ان تطیعوا فریقاً من الذین اوتوا الکتاب یردوکم بعد ایمانکم کافرین وکیف تکفرون وانتم تتلیٰ علیکم آیات اللہ وفیکم رسولہ،

اے مسلمانو! اگر تم اہل کتاب میں سے کسی گروہ کا کہا مانو گے تو وہ تمہیں مومن ہونے کے بعد کافر بنا دیں گے اور تم کفر کیوں کر کرو گے جب کہ تم کو اللہ کی آیتیں سنائی جاتی ہیں اور تم میں اللہ کا رسول موجود ہے۔

آیت کے آخری ٹکڑے سے ثابت ہوا کہ کفر سے بچانے والی دو مستقل چیزیں مسلمانوں

کے پاس تھیں۔ ایک تو آیاتِ الٰہی جو ان کو سنائی جاتی تھیں اور دوسری خود رسول کا وجود جو اپنی تعلیم و تلقین، فیضِ صحبت اور اثر سے ان کو بہکنے نہ دیتا اور ضلالت سے مانع آتا تھا۔ اگر صرف کتابِ الٰہی اس کام کو انجام دے سکتی تو رسول کے ذکر کی حاجت بلکہ خود بعثت کی ہی ضرورت کیا تھی اس سے یہ واضح ہوا کہ اللہ کی کتاب صامت قرآن اور اس کی کتاب ناطق رسول سے مل کر اپنے فریضہ کو انجام دیتی ہے۔ اور غالباً اس حدیثِ صحیح کے بھی معنے یہی ہیں جس کا اعلان آپ نے حجۃ الوداع سے واپسی میں اپنی وفات سے کچھ مہینوں پہلے کیا۔

انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ و سنتی

ان دونوں کے درمیان نور ہونے کا ربط ہے۔ اسی بنا پر قرآن میں ایک جگہ قرآن کو نور کہا ہے اور دوسری جگہ خود حضور انور کو نور کہا ہے گویا قرآن آفتاب ہے تو حضور اس کی روشنی ہیں اور حضور آفتاب ہیں تو قرآن اس کی روشنی ہے۔ اگر آفتاب سے اس کی روشنی کو جدا نہیں کر سکتے تو پھر قرآن سے سنت کو اور سنت سے قرآن کو بھی جدا نہیں کر سکتے۔ اسی بنا پر یہاں دونوں کو النور الذی معہ سے تعبیر کیا ہے۔

غور کا مقام ہے یہ وہی وحشی عرب بت پرست عرب وہی بداخلاق ہیں۔ ان میں یہ انقلاب کیوں اور کیسے ہوا، ایک امی نبی پر ایمان، اس کی توقیر، اس کے دین کی نصرت اور اس نور کی پیروی نے جو اس کے ساتھ اتارا گیا تھا ان کو عاقل روشن دل، روشن دماغ اور متقین کیوں کر بنا گئی۔ ایک نہتے پیغمبر کا ولولہ تبلیغ کس میرس عربوں کو سپہ سالار اور بہادر بنا کر نئے زور و قوت کا خزانہ کیسے عطا کر گیا جو خدا کے نام سے بھی آشنا نہ تھے وہ ایسے شب زندہ دار، عابد و متقی اور طاعت گزار کیوں کر ہو گئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات انسانی کمالات اور صفات حسنہ کا ایک کامل مجموعہ تھی اور یہ سب ان ہی کی جامعیت اور نیرنگیاں اور جلوہ آرائیاں تھیں جو کبھی صدیق و فاروق ہو کر چمکتی تھیں کبھی ذوالنورین اور مرتضیٰ ہو کر نمایاں ہوتی تھیں۔ کبھی خالد اور ابو عبیدہ اور کبھی سعد و جعفر ہو کر سامنے آتی تھیں۔ کبھی ابن عمر اور ابوذر اور سلمان اور ابو درداء ہو کر مسجد و محراب میں میں نظر آتی تھیں، کبھی ابن عباس اور ابی بن کعب، زید بن ثابت اور عبداللہ بن مسعود کی صورت میں علم و فن کی درسگاہ اور عقل و حکمت کی دبستان بن جاتی تھیں اور کبھی بلال و صہیب اور عمار و خبیب کی امتحان گاہوں میں تسلی کی روح اور تسکین کا پیام پہنچاتی تھیں۔ گویا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود مبارک ایک آفتاب عالم تاب تھا اور صحابہ کرام اسی آفتاب کی کرنیں تھیں یا ابر باران

تھا اور صحابہ کرام اسی ابر باراں سے اپنی اپنی استعداد کے مطابق سیراب ہو کر قسم قسم کے درخت اور رنگا رنگ پھول اور پتے بنے ہوتے تھے۔ ان نیرنگیوں کے ساتھ ایک چیز تھی جو سب میں مشترک تھی وہ ایک بجلی تھی جو سب میں کوندرہی تھی ایک روح تھی جو سب میں تڑپ رہی تھی۔ ایمان کا نور اخلاص کی صحیح توقیر کا جذبہ، قربانی کا ولولہ ہر کام میں نبوت کی پیروی کا جوش اور ہر قدم پر اللہ کی رضا طلبی کا ولولہ سب میں کام کر رہا تھا۔ اس کے نتیجہ میں وہ دنیا و آخرت کی سعادتوں سے ہمدوش اور زندگی کے ہر گوشہ میں کامیاب و بامراد تھے اولئک هم المفلحون وہ جو کچھ بھی ہوں جہاں بھی ہوں اور جو کچھ بھی کر رہے ہوں یہ فیضان حق سب میں یکساں تھا۔ راستوں، رنگتوں اور مذاقوں کا اختلاف تھا مگر خدا ایک تھا قرآن ایک تھا رسول ایک تھا اور قبلہ ایک تھا۔ ہر رنگ ہر راستہ اور ہر کام سے مقصود دنیا کی درستی، خلق کی ہمدردی، خدا کے نام کی اونچائی اور حق کی ترقی تھی، رضی اللہ عنہم۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کی اس دعا کا مصداق حضرات صحابہ کرام ہیں جن کو دنیا کی خوشحالی اور آخرت کی خوش حالی سے اللہ نے مالا مال کیا۔ اس طرح پہلی آیت میں حضور انور کا اور اس آیت میں آپ کے صحابہ کرام کا بھرپور چہرہ اللہ سبحانہ نے پیش فرما دیا اور اہل کتاب کو آگاہ کر دیا کہ وہ اس پیغمبر پر ایمان لائیں۔ لوگوں میں اس کا تعارف کرائیں مخالفوں کے مقابل میں اس کی حمایت کریں اور اس روشنی کی پیروی کریں جو اللہ کی طرف سے نازل کی گئی ہے۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہ ہی کامیاب ہیں فلاح پانے والے ہیں باقی سب محروم اور نامراد ہوں گے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت عامہ

۲۰۴۔ اے پیغمبر تم لوگوں سے کہہ دو اے افراد انسانی میں تم سب کی طرف خدا کا رسول بن کر آیا ہوں۔ وہ خدا کہ آسمانوں اور زمین کی ساری بادشاہت اسی کے لیے ہے کوئی بندگی نہیں مگر اسی کی ذات کی وہی جلاتا ہے وہی مارتا ہے لہٰذا اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول امی پر جو کہ اللہ اور اس کی باتوں پر ایمان رکھتا ہے اور اسی کی پیروی کرو تاکہ کامیابی کی راہ تم پر کھل جائے یعنی آپ کی بعثت تمام دنیا کے لوگوں کو عام ہے۔ عرب کے امیین یا یہود و نصاریٰ تک محدود نہیں ہے جس طرح خداوند تعالیٰ شہنشاہ مطلق ہے آپ اس کے رسول مطلق ہیں اب ہدایت و کامیابی کی صورت بجز اس کے کچھ نہیں ہے کہ اس جامع ترین عالمگیر صداقت کی پیروی کی جائے جو آپ لے کر آئے ہیں۔ یہ ہی پیغمبر ہے جس پر ایمان لانا تمام انبیاء و مرسلین اور تمام کتب سماوی

پر ایمان لانے کے مترادف ہے۔[1]

یہ آیت جوامع آیات میں سے ہے جس نے دعوتِ اسلام کی پوری حقیقت واضح کر دی۔ یہ دعوت یکساں طور پر تمام نوعِ انسانی کے لیے ہے۔ یہ ایک خدا کے آگے سب کے سروں کو جھکا ہوا دیکھنا چاہتی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ ایمان باللہ و کلماتہ اس کا شعار ہے یعنی خدا پر اور اس کے تمام کلماتِ وحی پر ایمان۔[2]

دراصل اس آیت میں بنیادی طور پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالتِ عامہ کو ماننے کی پوری انسانی دنیا کو دعوت دی گئی ہے۔ انی رسول اللہ الیکم جمیعاً" میں بتایا گیا ہے کہ آپ عالمگیر پیغمبر بنا کر مبعوث کیے گئے ہیں اس لیے ہدایت تامہ نبوت، عمومی نجات کامل اور فلاح عام اب صرف محمد رسول اللہ کی دعوت میں محدود ہے۔ اسی میں وہ دین ازلی ہے جو ہر مذہب کا جوہر تھا اور جو اس کے پیرووں کی تحریف و تصرف سے برباد ہو گیا تھا۔ اسی کو دعوت محمدی لے کر آئی ہے اب وہ ہمیشہ محفوظ رہے گا کیونکہ اس کا نبی عمومِ رسالت کا حامل اور خاتم النبیین ہے اس کا دین کامل اور اس کا صحیفہ تمام صحفِ الٰہی پر مہیمن اور حاوی ہے اور قیامت تک خدا کی طرف سے اس کی پوری حفاظت اور بقا کا وعدہ کیا گیا ہے۔ یہ چاروں دعوے یعنی تکمیل دین، قرآن کا مہیمن ہونا قیامت تک اس کا محفوظ و باقی رہنا اور ختم نبوت یا ایہا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعاً" کے منطوق، مدلول اور مفہوم میں موجود ہیں۔ جب یہ فرمایا کہ میں سب کی طرف خدا کا رسول بن کر آیا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جو دین اب تک مختلف وقتوں اور مختلف قوموں میں مختلف پیغمبر لاتے رہے ہیں وہ اپنے نقطہ کمال کو پہنچ گیا ہے۔ حضرت آدم سے لے کر تمام شریعتوں پر نظر ڈالیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ تمام نبوتیں کسی ایک کمال کی جانب متحرک ہیں۔ ہر پچھلی شریعت پہلی سے نسبتہً" ارتقائی شکل میں نظر آتی ہے اس لیے اس طبعی اصول کے مطابق ضروری ہے کہ یہ حرکت بھی کسی نقطہ پر جا کر ختم ہو جس کو اس کا کمال کہا جاتے لیکن جب خود نبوت ہماری سرحد ادراک سے باہر ہے تو اس کے آخری نقطہ کمال کا ادراک بدرجہ اولیٰ ہماری پرواز سے باہر ہونا چاہیے اس لیے ضروری ہوا کہ اللہ سبحانہ خود ہی اس کی ذمہ داری لے اور بتائے کہ نبوت کا ارتقاء جہاں درجہ کمال کو پہنچا ہے وہ مرکزی اور کامل ہستی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ قرآن

[1] افادات شیخ الاسلام [2] ترجمان القرآن

سے ثابت ہے کہ نبوت اب اپنے ارتقائی کمال کو پہنچ چکی ہے الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی یعنی تمہارا دین کمال کو پہنچ چکا ہے اب ناقص نہ ہوگا۔ خدا کی نعمت پوری ہو چکی اب اس میں اضافہ نہ ہوگا۔ اسی بنا پر قرآن نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین بتایا ہے یعنی نبوت کے سلسلے کو بند کرنے والے ہیں۔ قرآن نے اپنے صحیفہ میں کسی آیت میں کسی بعد میں آنے والے پیغمبر کے لیے کوئی جگہ نہیں چھوڑی بلکہ الی الناس جمیعاً کہہ کر بتا دیا کہ صرف وہی پیغام ربانی جو محمد رسول اللہ کے ذریعے دنیا میں آیا خدا کا آخری اور دائمی پیغام ہے اور اسی لیے وانا لہ لحٰفظون کے وعدے اللہ سبحانہ نے اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود لے لی ہے۔

انی رسول اللہ الیکم جمیعاً سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضور انور کی نبوت خدا کی پہلی اور آخری نمائندگی ہے جو کالے گورے، عرب و عجم، ترک و تاتار، ہندی و چینی، زنگ و فرنگ سب کے لیے عام ہے جس طرح اس کا خدا تمام دنیا کا خدا ہے، تمام دنیا کا پروردگار ہے اسی طرح اس کا رسول تمام دنیا کا رسول ہے، تمام دنیا کے لیے رحمت ہے اور اس کا پیغام بھی تمام دنیا کے لیے پیغام ہے۔ جہاں تک خدا کی سلطنت ہے وہاں تک آپ کی پیغامبری کی وسعت ہے لہ ملک السمٰوات والارض

سارے نبیوں میں صرف حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دائمی، آخری اور کامل اور عالمگیر ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ آپ نے فرمایا،

مجھ سے پہلے تمام انبیاء صرف اپنی قوم کی طرف بھیجے گئے اور میں تمام قوموں کی طرف بھیجا گیا ہوں۔

الغرض کہنا یہ ہے کہ رسالت محمدی اسی طرح کامل دائمی اور عالمگیر ہے جس طرح اللہ سبحانہ کی فرمانروائی اور حکومت کامل دائمی اور عالمگیر ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کامل دائمی اور عالمگیر نبوت کا آخری، دائمی اور عالمگیر پیغام کیا ہے؟ یہاں قرآن نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ اس کا آخری دائمی اور عالمگیر پیغام لا الٰہ الا ہو ہے یہی وحدت اس کی دلیل ہے۔ نادان انسانوں نے خود ایک دوسرے کو بھی الٰہ بنایا تھا وہ اوتار بن کر آتے ہوں یا تخت جبروت پر قدم رکھ کر فرعون نمرود شہنشاہ بنے ہوں یا تقدس کا لبادہ اوڑھ کر راہب و قسیس کہلاتے ہوں یا عالم و حبر بن کر اپنے کو الٰہ بنانا چاہا ہو۔ یہ انسانیت کی تحقیر تھی۔ پیغام محمدی نے اس کو جڑ سے کاٹ کر رکھ دیا، ولا یتخذ بعضنا بعضاً ارباباً من دون اللہ یہاں تک کہ نبیوں کو بھی روا نہیں ہے کہ وہ کہیں کونوا عباداً لی من دون اللہ۔

آنکھوں سے پوشیدہ ہستیوں میں فرشتے اور آنکھوں کے سامنے کی ہستیوں میں انبیاء سب سے بلند ہیں مگر وہ بھی انسانوں کے معبود نہیں ہو سکتے۔

ولا یامرکم ان تتخذوا الملائکۃ والنبیین اربابا ،

اس پیغام محمدی کو سامنے رکھ کر ذرا توحید کے مسئلہ کو سمجھو تو معلوم ہو گا کہ توحید کی حقیقت کو کس طرح واشگاف کیا ہے یہاں اللہ کے ساتھ کوئی الہ نہیں ہے۔ انسان کی پیشانی سوائے ایک اللہ کے کسی کے سامنے نہیں جھک سکتی اور اس کے ہاتھ اس ایک کے سوا کسی اور کے آگے نہیں پھیل سکتے جس سے وہ لینا چاہے اس کو کوئی دے نہیں سکتا اور جس کو وہ دینا چاہے اس سے کوئی لے نہیں سکتا۔ یہاں خدا کے ساتھ کوئی قیصر نہیں ہے جو کچھ ہے اسی خدا کا ہے قیصر کا کچھ نہیں اسی کی حکومت ہے، اسی کی سلطنت ہے اور اسی کی فرمانروائی ہے، اسی کا ایک حکم ہے جو فرش سے عرش تک اور زمین سے آسمان تک جاری ہے۔

نبی شناسی کے پیمانے

اس آیت میں ورسولہ النبی الامی الذی یومن باللہ وکلماتہ فرما کر اشارہ کر دیا کہ معجزات ہی صرف نبی شناسی کا پیمانہ نہیں ہیں بلکہ اس کے یہاں کچھ اور بھی پیمانے ہیں۔ معجزات تو نبوت شناسی کے لیے ظاہری نشانیاں ہیں لیکن نبی شناسی کی کچھ باطنی نشانیاں بھی ہیں۔ حقیقت شناس صرف باطنی نشانیوں کے طلبگار ہوتے ہیں۔ زمانۂ نبوت میں جو لوگ اہل نظر تھے وہ ان ہی علامات کو تلاش کرتے تھے۔ اس عہد کے ان یہودیوں، عیسائیوں کو دیکھو جنہوں نے کسی سبب سے علی الاعلان حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی ہونے کی تصدیق کی جرأت نہیں کی مگر وہ اندرونی طور سے متاثر تھے۔ یہودی خدمت اقدس میں آتے امتحانات لیتے مگر ان کا امتحان کیا تھا یہ تھا کہ وہ آپ کے اخلاق کی آزمائش کرتے تھے۔ صحف انبیائے بنی اسرائیل کے سوالات دریافت کرتے آپ کی تعلیمات کا گہرا مطالعہ کرتے۔ ان میں سے کسی نے اگر آپ سے خارق عادت معجزہ کا مطالبہ نہیں کیا۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ خوارق نبوت کی اندرونی اور باطنی علامات نہیں ہیں آنے والے نبی کی بشارات اور صفات تورات وانجیل میں مذکور تھیں لیکن ان میں سے کسی میں بھی صاحب خوارق ہونا اس کی صفت نہیں بتائی گئی تھی بلکہ تورات میں اس کے اوصاف یہ بتلائے گئے تھے کہ وہ فاران پر طلوع ہو گا دس ہزار قدسیوں کے ساتھ اس کے ہاتھ میں آتشیں شریعت ہو گی۔

وہ غریبوں اور مسکینوں کا مددگار ہوگا اور بدکاروں کو جنگی مرد کی طرح ہلاک کرے گا وہ عبادت گزار اور خدا کے احکام کا مطیع ہوگا۔ انجیل نے بتایا ہے کہ وہ تسلی کی روح ہوگا وہ مسیح کی نامکمل تعلیم کی تکمیل کرے گا۔ خدا کی زبان اس کے منہ میں ہوگی۔ قرآن نے یہاں الذی یومن باللہ وکلماتہ فرما کر نبوت کی ان ہی باطنی علامات کی طرف اشارا کیا ہے۔

اگرچہ علم کلام میں یہی بتایا گیا ہے کہ نبی شناسی کا پیمانہ صرف معجزہ ہے۔ لیکن یہ ان کا ذاتی خیال ہے۔ سچی بات وہ ہے جو حافظ ابن تیمیہ نے شرح العقیدہ الاصفہانیہ میں لکھی ہے کہ العلم بالنبوۃ یحصل لطرق متعددۃ، نبی شناسی کے ایک سے زیادہ پیمانے ہیں۔ امام بخاری نے اپنی کتاب الجامع الصحیح المسند الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی ایامہ وسنتہ کے مقدمہ میں نبوت کی تعریف، نبوت کی ضرورت اور نبی شناسی کے ایک سے زیادہ پیمانوں کی طرف اشارا کیا ہے۔ بدء وحی کے عنوان میں الی رسول اللہ کے اضافہ سے نبوت کی تعریف کی ہے۔ تعریف کو مدلل کرنے کے لیے آیات وحی میں سے سورہ مائدہ کی آیت انا اوحینا الیک کما اوحینا الی نوح۔ الخ تلاوت کی ہے اور آیات وحی میں سے اس آیت کا انتخاب صرف یہ بتانے کے لیے نہیں کیا کہ وحی ایک مشترک المعانی لفظ ہے بلکہ یہ سمجھانے کے لیے کیا ہے کہ انبیاء دو طرح کے ہوتے ہیں ایک انبیاء مرسلین، دوسرے انبیائے مجددین۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کا تعلق اول الذکر قسم سے ہے۔ نبوت کی تعریف کے بعد نبوت کی ضرورت بتانے کے لیے مشہور حدیث انما الاعمال بالنیات لاتے ہیں۔ سمجھایا ہے کہ انسانی قدریں ہوں یا اخلاقی قدریں، اعمال ہوں یا اقوال ان کی قدر و قیمت اور افادیت کا دارومدار صرف دو چیزیں ہیں ایک روح دوسرے ڈھانچہ۔ روح عمل کو مصادر اور عمل کے ڈھانچے کو مظاہر کہتے ہیں۔ لہٰذا جیسے اعمال و اخلاق کے لیے مصادر میں اللہ کی رضا شرط ہے ایسے ہی مظاہر میں اللہ کی وحی کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ اس کے بعد سمجھانا چاہتے ہیں کہ وحی کیا ہوتی ہے مگر ارادۃً اسے چھوڑ کر وحی کی کیفیت والی حدیث لے کر آتے ہیں۔ بتانا یہ چاہتے ہیں کہ وحی وہ معلوماتی ذریعہ ہے جو ہمارے ادراک کی گرفت میں نہیں آسکتا ہے یہ اللہ کی دین، محنت اور ریاضت سے حاصل نہیں ہوتی ہم جو کچھ جان سکتے ہیں وہ وحی نہیں بلکہ وحی کی آمد کی کیفیت ہے اور وہ بھی صرف تمثیل کے درجے میں۔ اس کے بعد دو حدیثوں کے ذریعے نبی شناسی کے چار پیمانے پیش فرماتے ایک شخصی پیمانہ دوسرا نوعی پیمانہ، تیسرا اخلاقی پیمانہ،

اور چوتھا علمی پیمانہ۔

نبی شناسی کا شخصی پیمانہ

شخصی پیمانہ کو بتانے کے لیے دربار بادشاہ روم کی طویل حدیث ذکر فرماتی جس میں حضور انور کی شخصی حیثیت سے بھرپور عکاسی کی گئی ہے لیجئے آپ بھی چند سوال و جواب پڑھ لیجئے قیصر روم کے دربار میں جب قاصد نبوی پہنچا تو ابوسفیان کو بلوا کر قیصر نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق سوالات کیے وہ حسب ذیل ہیں۔

قیصر: مدعی نبوت کا خاندان کیسا ہے؟

ابوسفیان: شریف ہے۔

قیصر: اس خاندان میں کسی اور نے بھی دعویٰ نبوت کیا ہے؟

ابوسفیان: نہیں۔

قیصر: اس خاندان میں کوئی بادشاہ گزرا ہے؟

ابوسفیان: نہیں۔

قیصر: جن لوگوں نے اس مذہب کو قبول کیا ہے وہ کمزور ہیں یا صاحب اثر؟

ابوسفیان: کمزور لوگ ہیں۔

قیصر: اس کے پیرو گھٹ رہے ہیں یا بڑھ رہے ہیں؟

ابوسفیان: بڑھتے جاتے ہیں۔

قیصر: کبھی تم لوگوں نے اس کے بارے میں جھوٹ کا تجربہ کیا ہے یا نہیں؟

ابوسفیان: نہیں۔

قیصر: وہ کبھی عہد و اقرار کی خلاف ورزی بھی کرتا ہے؟

ابوسفیان: ابھی تک تو نہیں کی لیکن اب جو معاہدہ ہے دیکھیں وہ اس پر قائم رہتا ہے یا نہیں۔

قیصر: تم لوگوں نے اس سے جنگ کی ہے؟

ابوسفیان: ہاں۔

قیصر: نتیجہ جنگ کیا رہا؟

ابوسفیان : کبھی ہم غالب رہے اور کبھی وہ

قیصر : اس کی تعلیمات کیا ہیں؟

ابوسفیان : وہ کہتا ہے کہ ایک خدا کی عبادت کرو، کسی اور کو خدا کا شریک نہ کرو، نماز پڑھو، پاکدامنی اختیار کرو، سچ بولو، صلہ رحمی اختیار کرو۔

اس گفتگو کے بعد قیصر نے کہا تم نے اس کو شریف النسب بتایا پیغمبر ہمیشہ اچھے خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ تم نے کہا کہ اس کے خاندان میں کسی اور نے دعویٰ نبوت نہیں کیا اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ یہ خاندانی خیال کا اثر ہے۔ تم مانتے ہو کہ اس کے خاندان میں کوئی بادشاہ نہیں ہوا اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ اس کو بادشاہت کی ہوس ہے۔ تم مانتے ہو کہ اس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ جو شخص آدمیوں سے جھوٹ نہیں بولتا وہ خدا پر کیوں کر جھوٹ باندھ سکتا ہے۔ تم کہتے ہو کہ کمزوروں نے اس کی پیروی کی ہے۔ انبیاء کے ابتدائی پیرو ہمیشہ غریب ہی لوگ ہوتے ہیں۔ تم نے تسلیم کیا کہ اس کا مذہب ترقی کرتا جاتا ہے سچے مذہب کا یہی حال ہے۔ تم نے بتایا ہے کہ اس نے کسی کو فریب نہیں دیا پیغمبر کبھی فریب نہیں دیتے۔ غور فرمائیے اور امام بخاری کے ذوق کی داد دیجئے کہ کس طرح حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی صداقت کو جانچنے کے لیے حضور کے شخصی جوہر کو پیش کر دیا ہے اور اپنے مخاطبوں کو بتا دیا ہے کہ نبی کا ایک پیمانہ شخصی ہوتا ہے اور یہ سب سے پہلا پیمانہ ہے۔

نبی شناسی کا اخلاقی پیمانہ

یہ نبی شناسی کا دوسرا پیمانہ ہے۔ امام بخاری نے اس پیمانہ کا حدیث عائشہ میں ذکر کیا ہے۔ اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ کی زبانی اس پیمانہ کی تصویر ان الفاظ میں پیش کی ہے۔ آغاز وحی ہی میں جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجۃ الکبریٰ سے غار حرا کے روحانی مشاہدات کا تذکرہ کیا تو وہ ایمان لے آئیں مگر کس پیمانہ سے اس کی توضیح اس سے ہوتی ہے کہ جب آپ نے بتقاضائے بشریت ان سے اپنی خوف جاں کا تذکرہ کیا اور فرمایا کہ خشیت علی نفسی تو حضرت خدیجہ نے فرمایا:

خدا کی قسم خدا آپ کو رسوا نہ کرے گا، آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، قرض داروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، غریبوں کی مدد کرتے ہیں، مہمانوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔ حق کی

مصیبتوں پر لوگوں کی اعانت کرتے ہیں۔

امام بخاری نے خدیجۃ الکبریٰ کے اس بیان کو اپنی صحیح میں لاکر بتادیا کہ نبی شناسی کا ایک پیمانہ اخلاقی قدریں بھی ہیں اور حضرت خدیجہ نے اسی پیمانہ کی مدد سے آپ کے نبی ہونے کی صداقت کا فیصلہ فرمایا تھا۔

نبی شناسی کا نوعی پیمانہ

حضرت امام بخاری حضرت عائشہ کی یہ حدیث پیش فرما کر نبی شناسی کے نوعی پیمانے کی طرف بھی اشارا کیا ہے۔ اسی حدیث میں امام بخاری نے جو یہ ٹکڑا پیش کیا ہے کہ

حضرت خدیجہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر ورقہ ابن نوفل کے پاس گئیں اور ورقہ زمانہ جاہلیت میں عیسائی ہو گئے اور عبرانی زبان میں کتابیں لکھتے انجیل عبرانی میں لکھتے تھے بعد میں زیادہ عمر کے ہو کر نابینا ہو گئے تھے۔ حضرت خدیجہ نے ان سے کہا کہ اپنے برادرزادے کی سنیئے۔ ورقہ نے حضور کو مخاطب کر کے کہا فرمائیے کیا بات ہے حضور نے غار حرا کی ساری داستان سنادی۔ ورقہ ابن نوفل نے سن کر کہا کہ یہ تو وہ ہی ناموس ہے جو حضرت موسیٰ پر نازل ہوا تھا۔

اس آخری فقرے کہ ھذا ھو الناموس الذی نزل اللہ علی موسیٰ یہ تو وہی ناموس ہے جو اللہ نے حضرت موسیٰ پر نازل فرمایا ان الفاظ کے ذریعے امام بخاری اپنے مخاطبوں کے جملہ دماغ میں یہ بات اتارنا چاہتے ہیں کہ معجزات ہی نبی شناسی کا پیمانہ نہیں ہے بلکہ ایک پیمانہ یہ بھی ہے کہ نبی کو نبیوں کی ترازو میں رکھ کر تولا جاتے خود قرآن نے بھی جابجا اسی پیمانہ کی طرف اشارا کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ سلسلہ نبوت جو آدم علیہ السلام سے قائم ہے اس کی آپ آخری کڑی ہیں اور خود آیت بالا انا اوحینا الیک کما اوحینا کا تشبیہی پیمانہ بھی اسی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ کہیں فرمایا ہے ماکنت بدعا من الرسل میں کوئی انوکھا رسول نہیں ہوں۔ یعنی ہمیشہ سے انبیاء آتے رہے ہیں میں بھی ان ہی میں سے اللہ کا ایک رسول ہوں، اسی کا نام نوعی پیمانہ ہے۔

نبی شناسی کا علمی پیمانہ

امام بخاری نے عائشہ کی اس حدیث اور پہلی حدیث سے اس بات کی طرف اشارا کیا ہے کہ نبی شناسی

کا علمی پیمانہ کیا ہے۔ نبی کے علوم کا ماخذ انسانی فکر نہیں، کسب و اکتساب، محنت و ریاضت بلکہ نبی میں علم کی تخلیق اور تکوین ہوتی ہے اور اس تکوین علم کا ذریعہ حضرت جبریل ہیں۔ یہی روح الامین ہیں۔ ایک امی میں اگر غارِ حرا میں علم کی تخلیق ہوتی ہے تو وہ بلاشبہ اللہ کا رسول ہے۔ چنانچہ اسی حقیقت کو بیان کرنے کے لیے امام صاحب حضرت عائشہ کی وہ حدیث لائے ہیں جس میں جبریل کے ذریعے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم میں تخلیق علم کی داستان بیان ہوتی ہے ارشاد ہے۔

حرا میں آپ کے پاس فرشتہ آیا اور اس نے کہا کہ پڑھو آپ نے فرمایا کہ میں پڑھا ہوا نہیں۔ فرشتہ نے مجھے پکڑا اور دبایا اور مجھے چھوڑ کر پھر کہا کہ پڑھو میں نے پھر وہی بات دہرائی کہ میں پڑھا ہوا نہیں۔ فرشتہ نے دوبارہ ایسا ہی کیا اور اور تیسری بار چھوڑ کر کہا کہ اقرأ باسم ربك الذی خلق، خلق الانسان من علق ؛

یہی سینۂ نبوت میں علم کی تخلیق ہے۔ علامہ کرمانی نے یہاں بڑی مفید بات لکھی ہے۔

اس میں اس خیال کی تردید ہے کہ علم صرف تعلیم ہی کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ بلکہ جیسا تعلیم کے ذریعے علم آتا ہے ایسے ہی کبھی بغیر ذریعے کے بھی علم محض فضل الٰہی سے حاصل ہو جاتا ہے۔

بہر حال اس حدیث کے ذریعے نبوت۔ علمی پیمانہ کی طرف امام بخاری نے اشارہ کر دیا۔ یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر صرف معجزہ ہی دلیل نبوت ہوتا تو کم از کم ورقہ ابن نوفل اور سربراہ روم ضرور اس کی جستجو کرتے کہ آپ کا کوئی معجزہ بھی ہے۔ لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ سربراہ روم نے بھی ابو سفیان سے یہ دریافت نہیں کیا کہ اس پیغمبر نے کوئی معجزہ بھی پیش کیا ہے یا نہیں۔ بہر حال نبی شناسی کا پیمانہ صرف معجزہ نہیں ہے بلکہ اعجاز کے ساتھ یہاں دوسرے پیمانے بھی ہیں۔ دوسرے علماء نے بھی یہی بات اپنے اپنے انداز میں لکھی ہے۔ امام غزالی نے المنقذ من الضلال میں، حافظ ابن تیمیہ نے شرح العقیدہ الاصفہانیہ اور النبوات میں، اور امام رازی نے المطالب العالیہ میں اس موضوع پر مفید باتیں لکھی ہیں۔ اور صوفیائے حضرت مولانا روم نے مثنوی میں اس کو بہت پیارے اور انوکھے انداز میں پیش کیا ہے۔ آئیے ہم بھی سب کچھ نہیں تو کچھ تو ان بزرگوں کے علمی فیضان سے استفادہ کر لیں۔

نبی شناسی اور امام غزالی

نبوت کے کچھ آثار و خواص ہیں۔ اگر کسی شخص کی نسبت یہ سوال ہو کہ یہ پیغمبر ہے یا نہیں تو اس کا صرف اس کے احوال کی معرفت سے ہو سکتا ہے یہ معرفت یا تو ذاتی مشاہدے سے ہو جیسے صحابہ کو تھی یا خبر متواتر سے سن کر ہو جیسے آپ لوگوں کو ہے۔ نبوت کے آثار و کیفیات کی ذوق شناسی جس میں ہوتی ہے وہی آمادہ تصدیق ہوتا ہے۔ مثلاً اگر فن طب اور قانون سے کچھ واقفیت ہے اور ان کا ذوق رکھتے ہو تو جو شخص طبیب یا قانون دان اور فقیہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تم اس کے احوال دیکھ کر اور اس کی باتیں سن کر فوراً یہ فیصلہ کر سکتے ہو کہ یہ طبیب یا فقیہ ہے یا نہیں اور اس طرح تم امام شافعی کی فقاہت اور جالینوس کی طبابت کی تصدیق تقلید سے نہیں بلکہ اپنی ذاتی تحقیق سے کر سکتے ہو اگرچہ آج امام شافعی اور جالینوس کا وجود نہیں ہے مگر ان کے سوانح اور تصانیف پڑھ کر اب بھی تم کہہ سکتے ہو کہ امام شافعی فقیہ کامل اور جالینوس طبیب حاذق تھے۔ اسی طرح کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم۔

آخر میں ارشاد ہوا ہے واتبعوہ لعلکم تھتدون، اس میں پوری انسانی دنیا کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرنے پر ہدایت تامہ کی بشارت دی گئی ہے۔ یہی بات قرآن میں دوسرے موقعہ پر دوسرے عنوان سے کہی گئی ہے۔

قل للذین اوتوالکتاب والامیین اسلمتم فان اسلموا فقدا ھتدوا۔
اے پیغمبر اہل کتاب اور امیین عرب سے کہہ دو کہ کیا تم نے اسلام قبول کر لیا اگر کر لیا تو وہ ہدایت یافتہ ہو گئے۔

ایسے ہی دوسری آیت فان امنوا بمثل ما امنتم بہ فقدا ھتدوا، اگر وہ بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جیسے تم ایمان لاتے ہو تو انہوں نے سیدھی راہ پا لی۔

اس سے معلوم ہوا کہ جس چیز کو ان آیتوں میں اسلام اور ایمان سے تعبیر کیا گیا ہے اسی کو یہاں اتباع محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہا ہے۔ تعبیرات مختلف ہیں حاصل سب کا ایک ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام ہدایت تامہ ہے۔ یہی دین ہے جس کو یہود و نصاریٰ اور تمام اہل مذاہب نے کھو دیا تھا اور اب جس کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آتے ہیں اس لیے جو ہدایت ان قوموں کے پاس تھی وہ ناقص تھی اور محمد رسول اللہ جو لے کر آتے وہ کامل ہے۔ نیز یہ معلوم ہوا کہ جن

آیتوں میں یہ کہا گیا ہے " جو ایمان لائے جو یہودی ہوتے اور نصرانی اور صابئی جو بھی خدا اور یوم آخر پر ایمان لایا اور اس نے نیک کام کیا اس کو خوف و غم نہ ہوگا ان میں خدا پر ایمان لانے سے مقصود اتباع محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور اس کا یہ منشا ہرگز نہیں کہ یہود و نصاریٰ اپنے موجودہ گمراہ عقیدوں کے باوجود نجات کے مستحق ہیں۔ یہود و نصاریٰ کیا خود مسلمان بھی اتباع محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر نجات کے مستحق نہیں ہیں جب تک مسلمانوں کا ایمان و عمل صالح ٹھیک اس علم و عمل کے مطابق نہ ہو جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آتے ہیں۔ یہ اصول ہر ایک کے لیے ہے خواہ مسلمان ہو یا یہودی، عیسائی ہو یا صابئی، غرض کوئی ہو۔

مسند احمد اور صحیح مسلم میں اس ارشادِ نبوت سے اس کی مزید توضیح ہوتی ہے جو حضرت ابوہریرہ کے حوالہ سے آیا ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے اس امت میں کوئی یہودی ایسا نہیں ہے اور نہ کوئی نصرانی جو میری خبر پاتے پھر اس دعوت پر ایمان نہ لاتے جو میں دے کر بھیجا گیا ہوں اور اسی حال میں مر جاتے مگر وہ دوزخیوں میں ہوگا۔

اس جگہ واتبعوہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا مطالبہ کیا ہے۔ یہی بات قرآن کے بارے میں پہلے ارشاد ہوئی ہے۔ واتبعوا النور الذی انزل معہ، مگر دونوں میں فرق ہے۔ پہلی بات قرآن کے بارے میں خاص ہے اور یہ بات حضور انور کے بارے میں عام ہے۔ اتباع کے معنے محض صفات میں ہم رنگ ہونے کے نہیں ہیں بلکہ طرزِ فکر، معیار اقدار، اصول و نظریات، اخلاق و معاملات اور سیرت و کردار میں پیروی کرنا بھی لازماً اس میں شامل ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ جہاں حضور نے رسول کی حیثیت سے دین کے کسی حصہ پر عمل کر کے بتایا ہو وہاں امتی کی طرح اس عمل میں آپ کی پیروی کرنا ہمارے لیے ضروری ہے۔ اسی لیے علماء نے سنن کی دو قسمیں کی ہیں سنن ہدیٰ اور سنن عادیہ۔ اتباع کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ جس تراش و خراش کا لباس آپ پہنتے ہیں وہی ہم پہنیں۔ جس طرز کے کھانے آپ کھاتے تھے وہی ہم کھائیں۔ جس قسم کی سواریاں آپ استعمال کرتے تھے ان ہی پر ہم بیٹھیں۔ یا جس اسلحہ سے آپ جنگ کرتے تھے اس کے سوا ہم کوئی ہتھیار استعمال نہ کریں بلکہ اتباع کا مطلب یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و فعل سے اسلامی اندازِ فکر اور دین کے اصول و احکام کی جو تشریح

فرماتی ہے اس میں ہم آپ کی پیروی کریں۔

یہاں قرآن نے دو اتباعوں کا ذکر کیا ہے ایک قرآن کی واتبعوا النور الذی انزل معہ اور دوسرے حضور کی واتبعوہ لعلکم تہتدون، اس سے معلوم ہوا کہ مدارِ ہدایت دو چیزیں ہیں ایک قرآن دوسرے سنت۔ واتبعوہ میں اسی ہدایت کے دوسرے حصہ کا مطالبہ ہوا ہے، اسی کا نام قرآن کی زبان میں حکمت ہے انزل اللہ علیک الکتاب والحکمۃ اور ان کے ذریعے دین کی تکمیل ہوتی ہے۔ ملا علی قاری نے یہ بات آبِ زر سے لکھنے کے قابل فرمائی ہے:

الیوم اکملت لکم دینکم کے بعد ہمیں دین کی تکمیل میں کسی ایسے امر کی حاجت نہیں جو کتاب و سنت سے باہر ہو۔ (شرح فقہ اکبر)

بہر حال ان آیات میں اللہ سبحانہٗ نے نبوت کی حقیقت، نبی شناسی کے پیمانے اور نبوت کے فرائض کی نشاندہی فرما کر نبوتِ محمدیہ کو ثابت کیا ہے اور بتایا ہے کہ رہتی دنیا تک فلاح ان لوگوں میں محدود ہو کر رہ گئی ہے جو نبوتِ محمدیہ کی پیروی کریں گے اور اس نظامِ فکر و عمل کو لے کر دنیا میں زندگی گزاریں گے جو محمد رسول اللہ لے کر آئے ہیں۔ آپ کی نبوت عالمی ہے اور عالمی ہونے کے ساتھ آپ آخری پیغمبر ہیں۔ اب تا قیامِ قیامت کوئی اور نبی نہ آئے گا۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک جس قدر انبیا آئے وہ خاص خاص قوموں اور قبیلوں کے پیغمبر تھے۔ ان کی دعوت عام نہ تھی۔ یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ نے بھی اپنے کو بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کی جگہ مانی تک محدود رکھا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت روئے زمین کی تمام قوموں اور تمام اجناس کی طرف ہوتی کالے گورے، رومی حبشی، عرب و عجم، ترک و تاتار، چینی و ہندی سب آپ میں برابر کے حقدار ہیں۔ اسی لیے فرمایا ہے:

یا ایہا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعاً،

صحیحین میں ہے کہ مجھ سے پہلے نبی خاص قوم میں بھیجا جاتا تھا اور میں تمام دنیا کے لیے بھیجا گیا ہوں اس موضوع پر بکثرت احادیث حدیث کی کتابوں میں آئی ہے۔ اس کی عملی دلیل یہ ہے کہ تمام پیغمبروں کے حالات پڑھ جاؤ سب کے پیرووں کو اس کی زندگی میں خود اسی کے قوم و ملک کے اندر محدود پاؤ گے لیکن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے حلقہ بگوشوں میں خود آپ کی زندگی میں عرب کے علاوہ مسلمان عجمی صہیب رومی، بلال حبشی سب کو پاؤ گے، سلاطینِ عالم کے نام آپ کا دعوت نامہ بھی اسی تعلیم دعوت کی مستحکم عملی دلیل ہے۔

وَمِنْ قَوْمِ مُوسَىٰٓ أُمَّةٌ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِۦ يَعْدِلُونَ ﴿۱۵۹﴾
وَقَطَّعْنَٰهُمُ ٱثْنَتَىْ عَشْرَةَ أَسْبَاطًا أُمَمًا ۚ وَأَوْحَيْنَآ إِلَىٰ مُوسَىٰٓ
إِذِ ٱسْتَسْقَىٰهُ قَوْمُهُۥٓ أَنِ ٱضْرِب بِّعَصَاكَ ٱلْحَجَرَ ۖ فَٱنۢبَجَسَتْ
مِنْهُ ٱثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۖ قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۚ وَظَلَّلْنَا
عَلَيْهِمُ ٱلْغَمَٰمَ وَأَنزَلْنَا عَلَيْهِمُ ٱلْمَنَّ وَٱلسَّلْوَىٰ ۖ كُلُوا۟ مِن طَيِّبَٰتِ
مَا رَزَقْنَٰكُمْ ۚ وَمَا ظَلَمُونَا وَلَٰكِن كَانُوٓا۟ أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿۱۶۰﴾
وَإِذْ قِيلَ لَهُمُ ٱسْكُنُوا۟ هَٰذِهِ ٱلْقَرْيَةَ وَكُلُوا۟ مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ وَ
قُولُوا۟ حِطَّةٌ وَٱدْخُلُوا۟ ٱلْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيٓـَٰٔتِكُمْ ۚ سَنَزِيدُ
ٱلْمُحْسِنِينَ ﴿۱۶۱﴾ فَبَدَّلَ ٱلَّذِينَ ظَلَمُوا۟ مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ ٱلَّذِى
قِيلَ لَهُمْ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ ٱلسَّمَآءِ بِمَا كَانُوا۟ يَظْلِمُونَ ﴿۱۶۲﴾

وقف لازم
نقاط
معانقہ
النصف

اور موسیٰ کی قوم میں ایک جماعت ایسی بھی ہے جو حق کے مطابق لوگوں
کی رہنمائی کا فرض انجام دیتی ہے اور اسی کے موافق انصاف کرتی

ہیں۔[۲۰۵] اور ہم نے بنی اسرائیل کو بارہ گھرانوں میں تقسیم کر کے انہیں مستقل جماعتوں کی شکل دے دی تھی۔[۲۰۶] اور جب موسیٰ سے اس کی قوم نے پانی مانگا تو ہم نے موسیٰ کو وحی کی کہ اس پتھر پر اپنی لاٹھی مارو چنانچہ اس چٹان سے یکایک بارہ چشمے پھوٹ پڑے اور ہر گروہ نے اپنے پانی لینے کی جگہ معلوم کر لی۔[۲۰۷] ہم نے اُن پر بادل کا سایہ کیا اور اُن پر من و سلویٰ اُتارا (اور کہا) کھاؤ وہ پاک چیزیں جو ہم نے تم کو دی ہیں مگر اس کے بعد جو کچھ انہوں نے کیا تو ہم پر ظلم نہیں کیا بلکہ اپنے آپ پر وہ ظلم کرتے رہے۔[۲۰۸] اور اس وقت کو یاد کرو جب اُن سے کہا گیا تھا کہ اس بستی میں جا کر بس جاؤ اور اس کی پیداوار سے اپنے حسب منشا روزی حاصل کرو اور تمہاری زبانوں پر حطۃ کا کلمہ جاری ہو، اور شہر کے دروازے میں سجدہ ریز ہو کر داخل ہو جاؤ، ہم تمہاری خطائیں معاف کر دیں گے اور نیکوکاری کرنے والوں کو مزید نوازیں گے۔[۲۰۹] لیکن اُن

یں جو لوگ ظلم پیشہ تھے انہوں نے اس بات کو جو ان سے کہی گئی
تھی بدل ڈالا ایسی بات سے جو ان سے نہیں کہی گئی تھی پس
نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے ان کے ظلم کی پاداش میں ان پر آسمان سے
عذاب بھیج دیا۔ [۲۱]

معانی مفردات

المن :- اسم شبنمی گوند جو وادی تیہ میں اسرائیلیوں کے کھانے کے لیے اللہ سبحانہٗ روزانہ درختوں کے پتوں پر جما دیتا تھا۔ یہ ایک سفید چیز ہوتی تھی، مزے میں میٹھی ہوتی تھی۔ ابتدا میں پھوار کی طرح برستی تھی بعد میں گوند کی طرح جمع ہو جاتی تھی۔ بیشتر شارحین قرآن نے اسے ترنجبین کا نام دیا ہے۔ السلوی :- ایک پرندہ ہے جس کو بٹیر کہتے ہیں۔ قاموس میں اس کا واحد سلواۃ لکھا ہے اور صحاح میں اخفش سے منقول ہے کہ میں نے اس کا واحد نہیں سنا۔ ان کا بیان ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا واحد جمع ہی کی طرح ہے (تاج العروس)۔ حطۃ :- ہم بخشش مانگتے ہیں تو ہمارے گناہ جھاڑ، گناہ اتار۔ حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں اس کلمہ کے معنے میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں یہ اترنے کی ہیئت کا نام ہے یعنی اتار کا حطہ سے مشتق ہے جس کے معنے بلندی سے کسی چیز کے نیچے اترنے کے ہیں جیسے جلسہ بیٹھک ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس کے معنے توبہ کے ہیں۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے :

فاز بالحطۃ التی صیر اللہ بہا ذنب عبدہ مغفورا

وہ اس توبہ پر فائز ہوا جس کے ذریعہ اللہ نے اپنے بندے کے گناہ کو بخش دیا۔

اور بعض کا قول ہے کہ اس کے معنے معلوم نہیں محض امتثال مقصود تھا۔ اور ابن ابی حضرت عبداللہ بن عباس روایت کرتے ہیں کہ ان سے کہا گیا تھا کہ تم مغفرت مانگو۔ رجزاً :- عقوبت، بلا، عذاب، قاضی بیضاوی لکھتے ہیں کہ رجز اصل میں وہ چیز ہے جس سے گھن آتے اور رجس بھی اسی کی

طرح ہے۔ لیکن علامہ زمخشری الفائق فی غریب الحدیث میں رقمطراز ہیں رجز اور رجس کے معنے عذاب کے ہیں۔ ابو تراب کا بیان ہے کہ میں نے ابوالسمیدع حصینی سے سنا وہ کہتے تھے کہ رجز اور رجس وہ سخت مصیبت ہے جو لوگوں پر نازل ہو۔ یہ اہل عرب کے محاورہ ارتجزت السماء بالرعد وارتجست، آسمان بجلی کی کڑک سے کانپ اٹھا اور لرز گیا اور رعد مرتجز و مرتجس، کپکپا دینے اور لرزا دینے والی گرج سے ماخوذ ہے اور وہ ایسی جنبش ہے جس کے ساتھ شور ہو۔ کیونکہ جو عذاب کہ اترتا ہے اس میں ضروری ہے کہ جن پر اترے وہ ہل جائیں اور چیخ اٹھیں۔ اور امام راغب فرماتے ہیں :
رجز کی اصل اضطراب یعنی خوب ہلنا اور جنبش کرنا ہے اور اسی سے رجز البعیر رجزاً فھو ارجز وناقۃ رجزاء آتا ہے جب کہ اونٹ یا اونٹنی کے قدم قریب قریب پڑنے اور ضعف کے سبب ڈگمگانے لگیں۔

بنی اسرائیل پر ماضی میں انعامات کی بارش

اصل سلسلہ کلام بنی اسرائیل کے متعلق آرہا تھا۔ یہاں موقع کی مناسبت سے رسالت محمدی پر ایمان لانے کی دعوت بطور جملہ معترضہ آگئی تھی۔ اب پھر تفسیر کا رخ اسی مضمون کی پھر رہا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ یہ وہی دین ہے جو تمہارے انبیاء کرتے آتے تھے۔ اصول دین میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جس میں قرآن کی تعلیم تورات کی تعلیم سے مختلف ہو۔ ان پر ثابت کیا جا رہا ہے کہ جو ہدایت تمہیں دی گئی تھی اس کی پیروی کرنے میں اور جو رہنمائی کا منصب تمہیں دیا گیا تھا اس کا حق ادا کرنے میں تم بری طرح ناکام ہوگئے ہو اس کے ثبوت میں ایسے واقعات سے استشہاد کیا گیا ہے جن کی وہ تردید نہ کر سکتے تھے پھر جس طرح حق کو حق جاننے کے باوجود وہ اس کی مخالفت میں سازشوں، وسوسہ اندازیوں، کج بحثیوں اور مکاریوں سے کام لے رہے تھے اور جن ترکیبوں سے وہ کوشش کر رہے تھے کہ کسی طرح محمد رسول اللہ کا مشن کامیاب نہ ہونے پاتے۔ ان سب کی پردہ دری کی جا رہی ہے جس سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ ان کی ظاہری مذہبیت محض ایک ڈھونگ ہے جس کے نتیجے میں دیانت اور حق پرستی کے بجائے ہٹ دھرمی، جاہلانہ عصبیت اور نفس پرستی کام کر رہی ہے اور حقیقت میں وہ یہ چاہتے ہی نہیں کہ نیکی کا کوئی کام پھل اور پھول سکے۔ اس طرح اتمام حجت کرنے کا فائدہ یہ ہوا کہ ایک طرف خود اس قوم میں جو صالح عنصر تھا اس کی آنکھیں کھل گئیں اور یہاں قرآن نے ومن قوم موسیٰ کہہ کر

اس صالح عنصر کی طرف اشارہ کیا ہے اور بتا دیا ہے کہ اس گئے گزرے زمانہ میں بھی ایسا طبقہ موجود ہے جو کھلے دل سے حق کو قبول کرنے کے لیے تیار ہے۔

۲۰۵۔ اور موسیٰ کی قوم میں ایک جماعت ایسی بھی ہے جو حق کے مطابق لوگوں کی رہنمائی کا فرض انجام دیتی ہے اور اسی کے موافق انصاف کرتے ہیں۔ گو اکثر یہود سرکشی اور ناانصافی کی راہ اختیار کرتے ہیں تاہم کچھ ایسی سعید روحیں بھی ہیں جو دوسروں کو حق کی طرف دعوت دیتی ہیں اور بذاتِ خود حق و انصاف کے راستوں پر گامزن ہیں مثلاً عبداللہ بن سلام وغیرہ [1]

اُمۃ کی تنکیر تقلیل کے لیے ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ اہلِ کتاب میں ایک چھوٹی سی جماعت ایسی موجود ہے جو حق و عدل پر قائم ہے اور حق پر مبنی لوگوں کی رہنمائی کا فرض انجام دیتی ہے اور زندگی کے معاملات میں ظلم و جور سے کام نہیں لیتی ہے بلکہ عدل و انصاف کو شیوہ بناتے ہوتے ہے۔ یہدون اور یعدلون کے الفاظ استمرار کو ظاہر کر رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان اہلِ کتاب میں ایک مٹھی بھر جماعت ایسے لوگوں کی بھی ہے جو حق کے مطابق لوگوں کی رہنمائی اور عدل کے مطابق لوگوں کے معاملات کے فیصلے کرتے رہے ہے۔ اسی طرح کا ایک گروہ قلیل تعداد میں سہی ان آیات کے نزول کے زمانے میں بھی موجود تھا اور یہی لوگ تھے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے۔ قرآن نے ان لوگوں کا ذکر کئی جگہ مختلف عنوانوں سے کیا ہے ایک جگہ ان کی عبادت کا تذکرہ اس طرح کیا ہے۔

من اھل الکتاب امۃ قائمۃ یتلون آیات اللہ اٰناء اللیل و ھم یسجدون۔

اہلِ کتاب میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو راتوں کو کھڑے ہو کر خدا کی آیتیں پڑھتے ہیں اور وہ سجدہ کرتے ہیں۔

احادیث میں بھی یہودیوں اور عیسائیوں کے تذکرے ہیں۔ مثلاً آپ نے فرمایا کہ جب نماز پڑھو تو تہ بند باندھ لو یا چادر اوڑھ لو، یہودیوں کی طرح ننگے نہ پڑھو۔ تم یہودیوں کی طرح صرف اوپر سے نماز میں چادر نہ ڈالو بلکہ اس کو باندھ لیا کرو۔ نماز میں یہودیوں کی طرح مت جھومو۔ تم یہودیوں کے برخلاف نماز میں کپڑے اور جوتے پہنا کرو۔ میری اُمت میں اس وقت تک دین کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور رہے گا جب تک لوگ یہودیوں کی تقلید میں مغرب کی نماز میں ستاروں کے نکلنے کا اور عیسائیوں

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

کی طرح نمازیں ستاروں کے ڈوبنے کا انتظار نہ کریں گے۔ یہ سب حدیثیں ہم نے کنزالعمال جلد چہارم سے نقل کی ہیں۔ ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عرب کے یہود و نصاریٰ میں کچھ لوگ ایسے تھے جو نماز پڑھتے تھے۔

قرآن نے ایک موقعہ پر اسی گروہ کی معاملاتی دیانت وانصاف کی طرف یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے

منهم من ان تامنه بقنطار يوده اليك

اہل کتاب میں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ اگر تم اس کے اعتماد پر مال و دولت کا ایک ڈھیر بھی دے دو تو وہ تمہارا مال تمہیں دے دیں گے۔

یہاں قرآن نے ان کے اس کردار کی داد دی ہے تاکہ ان کی حوصلہ افزائی ہو اور وہ اس میدان میں اور آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔ یہی لوگ تھے جو بعد میں اسلام کی نعمت سے بہرہ ور ہوتے۔ بہرحال اس آیت گرامی کا مصداق وہ لوگ ہیں جو اہل کتاب میں سے نعمتِ ایمان سے مالا مال ہوتے ہیں اور جو پہلے سے شریعتِ موسیٰ کے مطابق حق وانصاف کے علمبردار اور عبادت کی سرشاریوں سے ہمدوش اور امانت و دیانت سے مالامال تھے۔ ان ہی کا چہرہ قرآن نے ایک سے زیادہ آیات میں پیش کیا ہے اور یہ قرآن کا بہت بڑا انصاف ہے کہ وہ اہل کتاب میں اچھوں کو اچھا اور بُروں کو بُرا کہتا ہے۔

اور یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ یہاں شارحینِ قرآن نے اس آیت کا مصداق مقرر کرنے کے لیے ایک ایسی بے سروپا اور غیر مستند کہانی درج کر دی ہے جسے زبانِ قلم پر لاتے ہوتے بھی دکھ ہوتا ہے۔ خدا بھلا کرے مفسرِ قرآن قرطبی کا کہ انہوں نے اس کے بارے میں لکھ دیا ہے کہ تاریخی طور پر یہ داستان صحیح نہیں ہے اور علامہ آلوسی نے ساری کہانی نقل کرنے کے بعد لکھا ہے۔ میرے خیال میں یہ کہانی کچھ نہیں ہے۔ اس کی کوئی قابلِ اعتبار سند نہیں۔ زمین میں سرنگ لگا کر یا آسمان میں سیڑھی لگا کر بھی اس کی کوئی سند نہیں مل سکتی۔

بنی اسرائیل کا تنظیمی ڈھانچہ

۲۰۶۔ اور ہم نے بنی اسرائیل کو بارہ گھرانوں میں تقسیم کر کے انہیں مستقل جماعتوں کی شکل دے دی تھی۔ یعنی اصلاح و انتظام کے لیے ان کی بارہ جماعتیں جو بارہ دادوں کی اولاد تھی الگ الگ کر دی گئی تھیں۔ پھر ہر ایک جماعت کا ایک نقیب مقرر فرما دیا جو اس کی نگرانی اور اصلاح

کا خیال رکھے و بعثنا منھم اثنی عشر نقیباً[1] یہ بات بعینہٖ معمولی تغیرِ الفاظ کے ساتھ سورہ مائدہ میں گزر چکی ہے۔ اس میں بنی اسرائیل کے تنظیمی ڈھانچہ کی طرف اشارا ہوا ہے۔ اس سے پتہ لگتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے کوہِ سینا کے بیابان میں بنی اسرائیل کی مردم شماری کرائی پھر ان کے بارہ گروہوں کو جو حضرت یعقوب کے دس بیٹوں اور حضرت یوسف کے دو بیٹوں کی نسل سے تھے۔ الگ الگ گروہوں کی صورت میں منظم کیا اور ہر گروہ پر ایک ایک سردار مقرر کیا تاکہ وہ ان کے اندر اخلاقی، مذہبی، تمدنی و معاشرتی اور فوجی حیثیت سے نظم قائم رکھے اور احکامِ شریعت کا اجزاء کرتا رہے۔ نیز حضرت یعقوب کے بارہویں بیٹے لاوی کی اولاد کو جس کی نسل سے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون تھے ایک الگ جماعت کی شکل میں منظم کیا تاکہ وہ ان سب قبیلوں کے درمیان شمع حق روشن رکھنے کی خدمت سرانجام دیتی رہے قرآن نے اس تنظیم کے بارہ سربراہوں کے لیے نقیب کا لفظ بولا ہے و بعثنا منھم اثنی عشر نقیباً بائیبل کی کتاب گنتی میں سرداروں کا ذکر موجود ہے مگر ان کی وہ حیثیت جو یہاں لفظ نقیب سے قرآن میں بیان کی گئی ہے بائیبل کے بیان سے ظاہر نہیں ہوتی۔ بائیبل انہیں صرف رئیسوں اور سرداروں کی حیثیت سے پیش کرتی ہے اور قرآن ان کی حیثیت اخلاقی و دینی نگران کار کی قرار دیتا ہے۔ تورات کی کتاب خروج کے حوالہ سے سید سلیمان ندوی نے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ

حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو لے کر جب مصر سے حدودِ عرب میں داخل ہوئے تو مدین کے کاہن نے ان کا استقبال کیا۔ بنی اسرائیل غلامی کے عہد سے ابھی نکلے تھے۔ نظامِ تربیت سے بالکل آگاہ نہ تھے بھیڑ کی طرح روز و شب پیغمبر کو گھیرے رہتے تھے اور ذرا ذرا سی بات کے لیے انہیں کے پاس دوڑے آتے تھے۔ مدین کے کاہن نے بتایا کہ ایک قوم پر کیوں کر حکومت کرنی چاہیے۔ اور اس کی تربیت و تنظیم کے اصول کیا ہیں۔ اول ہزار ہزار پر افسر ہوں پھر ہر سو پر اور پھر ہر دس پر۔ صرف افسروں کے اختلاف رائے کے موقعہ پر حضرت موسیٰ کی عدالت کی طرف رجوع کیا جائے۔ بہرحال قرآن کی تصریح کے مطابق قبائل کی گنتی کے نقیبوں کی تعداد بارہ تھی۔

بیابانی علاقہ میں پانی کی بہم رسانی

۲۰۷ – اور جب موسیٰ سے اس کی قوم نے پانی مانگا تو ہم نے موسیٰ کو وحی کی کہ اس پتھر پر اپنی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

لاٹھی مارو۔ چنانچہ اس چٹان سے یکایک بارہ چشمے پھوٹ پڑے اور ہر گروہ نے اپنے پانی لینے کی جگہ معلوم کرلی۔

اب تنظیم کا ذکر کرنے کے بعد مزید تین انعامات کا ذکر کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ کہ جزیرہ نما سینا کے علاقہ میں ان کے لیے پانی کی بہم رسانی کا غیر معمولی انتظام کیا گیا۔ بنی اسرائیل فلسطین سے دور اور مصر سے الگ دونوں کے درمیان معلق جزیرہ نما سینا کے لق ودق بیابان وریگستان میں اپنے خیموں کے ساتھ کوچ در کوچ ایک مقام سے دوسرے مقام اور ایک منزل سے دوسری منزل کو منتقل ہوتے رہے ہیں۔ قدیم گلہ بان قوموں میں یہ دستور عام تھا اور آج بھی خانہ بدوش قوموں میں عام ہے۔ خشک ملک اور پھر مقامی جغرافیہ سے ناواقفیت چلتے چلتے ایسی جگہ پہنچے جہاں پانی نایاب تھا اور ساتھ کا ذخیرہ ختم ہو چکا تھا۔ صورتِ حال کا ذرا تصور کیجئے۔ پیاس سے بے حال اور بے دم ہو رہے تھے کہ مرنے مارنے پر بھی آمادہ ہو گئے اور اپنا غصہ حضرت موسیٰ پر نکالنے لگے۔ توراۃ میں ہے: "تب سارے بنی اسرائیل کی جماعت نے اپنے سفروں میں خداوند کے فرمان کے مطابق سین کے بیابان سے کوچ کیا اور رفیدیم میں ڈیرہ لگایا۔ وہاں لوگوں کے پینے کو پانی نہ تھا، سو لوگ حضرت موسیٰ سے جھگڑنے لگے اور کہا کہ ہم کو پانی دے کہ پیویں۔ موسیٰ نے خداوند سے فریاد کرکے کہا کہ میں ان لوگوں سے کیا کروں وہ سب تو مجھے سنگسار کرنے کو تیار ہیں[1] اور قدیم ترین یہودی جوزیفس کی تاریخ آثار یہود میں ہے۔" وہ مقام رفیدیم میں پہنچے جہاں پیاس کی شدت سے بے تاب ہو رہے تھے۔ یہاں کی سرزمین میں پانی کا ایک قطرہ نہ پایا اس پر یہ لوگ غصہ میں بھر کر پھر حضرت موسیٰ پر ٹوٹ پڑے۔ لیکن وہ خدا کے آگے دعا میں زاری کے ساتھ مشغول ہو گیا (باب ۳ فصل ۲) جب تلاش کے بعد مایوسی ہو چکی تو بجز دعا اور مناجات کے اور کیا کرتے۔ خود توراۃ ہی میں ایک دوسری جگہ مقام کا نام بجائے رفیدیم کے قدیش درج ہے اور تفصیلات تقریباً وہی ہیں۔ اس بنا پر علماء اہل کتاب میں اس موضوع پر سخت اختلاف ہے کہ جہاں یہ واقعہ پیش آیا وہ جگہ کون سی تھی۔ بہر حال مقام اور جگہ کوئی ہو خود واقعہ میں کوئی اختلاف نہیں بلکہ یہ اسرائیلی تاریخ کے مسلمات میں سے ہے۔ استسقیٰ کے معنی ہیں پانی مانگا، پانی تلاش کیا لیکن مراد یہ ہے پانی کے لیے دعا مانگی اسی پر شارحین قرآن کا اتفاق ہے۔

---

[1] خروج ۱۷-۱-۴

اس دُعا کے جواب میں حضرت موسیٰ کو اللہ سبحانہ کی جانب سے حکم ہوا اضرب بعصاک الحجر۔ الحجر سے مراد کوئی خاص چٹان ہے۔ امام رازی اور قاضی بیضاوی نے الحجر پر الف لام تعریف کا ہی سمجھا ہے۔ اگر یہ خاص ہے تو کون سی ہے۔ تورات میں ہے کہ یہ چٹان جبل حوریب میں تھی (خروج ۱۷-۶) حوریب سے مقصود وہ سلسلۂ کوہ ہے جو وادی سینا میں واقع ہے۔

خداوند نے موسیٰ سے فرمایا کہ لوگوں کے آگے جا اور بنی اسرائیل کے بزرگوں کو اپنے ساتھ لے اور اپنا عصا جو تو نے دریا پر مارا تھا اپنے ہاتھ میں لے اور جا۔ دیکھ میں وہاں قریب کے چٹان پر تیرے آگے کھڑا ہوں گا تو اس چٹان کو مار دیو، اس سے پانی نکلے گا تاکہ لوگ پیویں۔ چنانچہ بنی اسرائیل کے بزرگوں کے سامنے موسیٰ نے یہی کیا۔

(خروج ۱۷-۵-۶)

یہ چٹان اب تک جزیرہ نما سینا میں موجود ہے۔ سیاح اسے جا کر دیکھتے ہیں اور چشموں کے شگاف اب بھی اس میں پائے جاتے ہیں۔

آگے ارشاد ہوا ہے فانبجست منہ اثنتا عشرۃ عینا، بارہ چشمے اس سے پھوٹ نکلے یعنی اس پہاڑی چشمے سے بارہ دھاریں الگ الگ جاری ہو گئیں۔ یہ بارہ چشمے بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں کے مطابق تھے۔ تورات میں بارہ کی تصریح نہیں لیکن جارج سیل جو انگریزی میں قرآن کا قدیم مترجم ہے آیت کے حاشیہ پر لکھتا ہے،

ایک مسیحی سیاح جو وہاں ہو آیا ہے بتصریح بیان کرتا ہے کہ جہاں سے بارہ مقامات سے پانی نکلتا تھا۔ اور ایک دوسرے مسیحی سیاح کا مشاہدہ بیان کرتا ہے کہ چٹان میں اس وقت ۲۴ سوراخ موجود ہیں جو بآسانی شمار کیے جا سکتے ہیں۔ ۱۲ ایک طرف اور بارہ ان کے مقابل جانب۔

پادری ڈین اسٹینلی نے جو انیسویں صدی میں مسیحیت کے ایک ممتاز رکن ہوتے ہیں۔ صدی کے وسط میں بائیبل کے مقاماتِ مقدسہ کی جغرافی تحقیق کے لیے بہ نفسِ نفیس فلسطین اور اس کے ملحقات کا سفر کیا اور اپنے مشاہدات و تحقیقات پر ایک مستقل تصنیف "سینا اور فلسطین" کے نام سے شائع کی۔ اس میں اس چٹان کا ذکر کر کے لکھتے ہیں۔

یہ چٹان دس اور پندرہ فٹ کے درمیان بلند ہے آگے کی طرف ذرا خمیدہ ہے اور راس سفیفہ کے قریب لجا کی وسیع وادی میں واقع ہے۔ شگاف اور دراڑ جا بجا

پڑے ہوتے ہیں ۔ کچھ مٹے ہوتے ہیں، کچھ بڑے ہیں کچھ چھوٹے۔ گنتی میں اگر سب کو لیا جائے تو بیس ہوتے ہیں۔ اور اگر بعض کو چھوڑ دیا جائے تو دس سب سے پہلے قرآن نے حتمی طور پر بنی اسرائیل کے بارہ قبائل کے لیے بارہ چشموں کی تعداد بیان کی ہے۔ یہ اشارہ انہیں شگافوں کی طرف ہے [1]

رہائش اور خوراک کا غیبی سامان

۲۰۸ ۔ ہم نے ان پر بادل کا سایہ کیا، اور ان پر من وسلویٰ اتارا اور کہا کھاؤ وہ پاک چیزیں جو ہم نے تم کو دی ہیں مگر اس کے بعد جو کچھ انہوں نے کیا تو ہم پر ظلم نہیں کیا بلکہ اپنے آپ پر وہ ظلم کرتے رہے۔ پہلی آیت میں پینے کا انتظام کیا گیا اس آیت میں خوراک اور رہائش کے دو انعامات کا ذکر ہو رہا ہے۔ ایک یہ کہ دھوپ کی تپش سے بچانے کے لیے آسمان پر بادل تان دیا گیا۔ دوسرے یہ کہ ان کے لیے خوراک کی بہم رسانی کا غیر معمولی انتظام من وسلویٰ نازل فرما کر کیا۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ ان ضروریاتِ زندگی کا بندوبست نہ کیا جاتا تو یہ قوم جس کی تعداد کئی لاکھ تک پہنچی ہوئی تھی۔ اس علاقہ میں بھوک، پیاس اور تپش سے بالکل ختم ہو جاتی۔ آج بھی کوئی شخص وہاں جائے تو یہ دیکھ کر حیران رہ جائے کہ اگر پندرہ بیس لاکھ آدمیوں کا ایک عظیم الشان قافلہ یکایک آٹھہرے تو اس کے لیے پانی، خوراک اور سائے کا آخر کیا انتظام ہو سکتا ہے۔ موجودہ زمانے میں پورے جزیرہ نما کی آبادی ۵۵ ہزار سے زیادہ نہیں ہے اور آج اس بیسویں صدی میں بھی اگر کوئی سلطنت وہاں ۵۔۶ لاکھ فوج لے جانا چاہے تو اس کے مدبروں کو رسد کے انتظام کی فکر میں دردِ سر لاحق ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانے کے بہت سے محققین نے جو نہ کتاب کو مانتے ہیں اور نہ معجزات کو تسلیم کرتے ہیں۔ یہ ماننے سے انکار کر دیا ہے کہ بنی اسرائیل جزیرہ نما سینا کے اس حصہ سے گزرے ہوں گے جس کا ذکر بائبل اور قرآن میں ہے۔ ان کا گمان ہے کہ شاید یہ واقعات فلسطین کے جنوبی اور عرب کے شمالی حصہ میں پیش آئے ہوں گے۔ جزیرہ نما سینا کے طبعی اور معاشی جغرافیہ کو دیکھتے ہوئے وہ اس بات کو بالکل ناقابلِ تصور سمجھتے ہیں کہ اتنی بڑی قوم یہاں برسوں ایک ایک جگہ پڑاؤ کرتی ہوئی گزر سکی تھی خصوصاً جب کہ مصر کی جانب سے اس کی رسد کا بھی راستہ

---

[1] تفسیر ماجدی

منقطع ہو گیا تھا اور دوسری طرف خود اس جزیرہ نما کے مشرق اور شمال میں عمالقہ کے قبیلے اس کی مزاحمت پر آمادہ تھے۔ ان امور کو پیش نظر رکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان چند مختصر آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر اپنے جن احسانات کا ذکر کیا ہے وہ درحقیقت کتنے بڑے احسانات تھے اور اس کے بعد یہ کتنی بڑی احسان فراموشی تھی کہ اللہ کے فضل و کرم کی ایسی صریح نشانیاں دیکھ لینے پر یہ قوم مسلسل ان نافرمانیوں اور غداریوں کی مرتکب ہوتی رہی جن سے اس کی تاریخ بھری پڑی ہے بلکہ

اصل ارشاد میں من و سلویٰ کے اتارنے کا ذکر ہے۔ اتارنے سے لازمی طور پر یہ مراد نہیں ہوتی کہ وہ چیز کسی غیر طبعی معجزانہ طریق پر اتاری گئی ہو۔ پانی لوہا کھانے کا سامان وغیرہ جو اپنے معمولی اور طبعی طریقوں پر انسان کے کام کے لیے پیدا ہوتے رہتے ہیں ان سب کے لیے قرآن کی زبان میں اتارنے ہی کا لفظ آیا ہے۔ من اہل لغت کی تحقیق میں ایک میٹھی میٹھی رطوبت تھی جو درختوں پر گرا کرتی تھی۔ عربی میں اسم جنس ہے اس کے معنے متعدد ہیں میٹھا گوند، شہد، شربت وغیرہ لیکن اکثر کا خیال ہے کہ یہ ترنجبین کے مرادف ہے اور ترنجبین کے متعلق قدیم کتب طب میں درج ہے کہ شہد کی طرح جمی ہوئی اور لذیذ آسمان سے گرنے والی شبنم کی قسم کی چیز ہے۔ بہرحال اتنا یقینی ہے کہ کوئی قدرتی غذا تھی جو بنی اسرائیل کو مسلسل مسافرت کے زمانے میں بلا مشقت و تعب مل جاتی تھی۔ تورات کی تصریحات اس موضوع پر حسب ذیل ہیں:

صبح کو لشکر کے پاس اوس پڑی۔ اور جب اوس پڑ چکی تو کیا دیکھتے ہیں کہ بیابان میں ایک ایک چھوٹی چھوٹی گول چیز ایسی سفید جیسے برف کا چھوٹا ٹکڑا زمین پر پڑی ہے اور بنی اسرائیل نے آپس میں دیکھ کر کہا کہ من ہے کیونکہ انہوں نے نہ جانا کہ وہ کیا ہے۔ تب موسیٰ نے انہیں کہا کہ یہ روٹی ہے جو خداوند نے تمہیں کھانے کو دی ہے[2]

اسرائیل کے گھرانے نے اس کا نام من رکھا اور وہ دھنیے کے بیج کی طرح سپید تھی اور مزہ اس کا شہد میں ملی ہوئی پھلوری کا تھا[3]

اور من سوکھے دھنیے کے مانند تھا اور اس کا رنگ موتی کے دانہ کے مانند تھا۔ لوگ ادھر ادھر جا کر اسے جمع کرتے اور چکی میں پیستے تھے اور ہانڈیوں میں

---

[1] تفہیم القرآن [2] [3] خروج ۱۶- ۱۴، ۱۵، ۱۶- ۳۱-

پکاتے تھے اور پھلکیاں بناتے تھے اس کا مزہ تیل کا سا تھا اور رات کو جب خیموں پر اوس پڑتی تو من بھی ان پر پڑتا تھا[1]

سلوٰی ایک قسم کا بٹیر ہے۔ بٹیر جزیرہ نما سینا کا خاص جانور ہے۔ بڑی کثرت سے پایا جاتا ہے۔ گرمی میں شمال کی طرف چلا جاتا ہے۔ جاڑے میں جنوب کی طرف پھر آجاتا ہے۔ اڑتا اونچا نہیں بہت نیچا رہتا ہے۔ تھک بہت جلد جاتا ہے اور شکار بڑی آسانی سے ہو جاتا ہے (جیوز انسائیکلو پیڈیا) اس کا شمالی سفر مصر سے فلسطین کی طرف عموماً مارچ میں ہوتا ہے اور جنوبی فلسطین سے مصر کی طرف عموماً نومبر میں۔ یہ اسرائیلی بٹیر وہ تھے جو مارچ اپریل میں رات کے وقت اپنی شمالی پرواز میں ہوتے ہیں۔ بحر قلزم شمال میں جہاں دو حصوں میں تقسیم ہوا ہے وہاں تک یہ اپنی سالانہ اڑان میں آتے ہیں اور وہاں سے جزیرہ نما سینا کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ سمندری ہوا ان کی بے شمار تعداد باسانی اسرائیلیوں کے ڈیروں تک لے آتی تھی (ڈکشنری آف دی بائیبل) ان کا گوشت چربی دار ہوتا ہے اور رکھنے سے بہت جلد خراب ہو جاتا ہے۔

واضح رہے کہ ذکر بنی اسرائیل کے اللہ سبحانہٗ سے معاملات کا ہے اور ان معاملات کو اللہ سبحانہٗ نے بطور اپنے انعامات اور احسانات کے گنایا ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ ساری معاملات اپنے عام طبعی اسباب سے ہٹ کر بصورتِ معجزات ہی پیش آئے ہوں۔ اصل مقصود یہاں احسانات اور انعاماتِ خداوندی کو یاد دلانا ہے چاہے وہ عام حالات میں ہوں یا بطورِ خرقِ عادت۔ شارحین قرآن نے عموماً ابر کی سایہ افگنی، من وسلویٰ کے نزول اور چٹان سے چشمہ کی روانی سب کو معجزات میں شمار کیا ہے۔

اس کے بعد ارشاد ہوا ہے کلوا من طیبات ما رزقناکم جو کچھ ہم نے دیا ہے اسے کام میں لاؤ۔ یعنی ان چیزوں کا ذخیرہ نہ کرو، روز کا روز خرچ کرتے رہو۔ بنی اسرائیل کو حکم یہ ملا تھا کہ بلاضرورت ان غذاؤں کا ذخیرہ نہ کرنا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہود میں ذخیرہ اندوزی کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ انہوں نے اس حکم خداوندی کی خلاف ورزی کی۔ چنانچہ ارشاد ہے وما ظلمونا ولکن کانوا انفسهم یظلمون انہوں نے جو کچھ کیا تو ہم پر ظلم نہیں کیا بلکہ اپنے آپ پر ہی ظلم کرتے تھے۔ اس سے حضرت مولانا اشرف علی نے یہ بات بڑی معنے خیز معلوم کی ہے کہ باوجود معاصی کے انعامات کی بارش استدراج ہے اور اس میں جاہل صوفیوں کو سخت دھوکا ہوا ہے چنانچہ وہ کثرت مال وجاہ کو مقبولیت کی علامت

[1] گنتی ۱۱ - ۸، ۱۱ -

سمجھتے ہیں۔ حرص میں مبتلا، توکل سے ناآشنا اور نافرمانی کے خوگر بنی اسرائیل سے اتنے معمولی حکم کی بھی تعمیل نہ ہوئی۔ وہ ان غذاؤں کا ذخیرہ فراہم کرنے میں لگ گئے اور لطیف غذائیں باسی ہو کر سڑنے لگیں۔ توراۃ میں ہے۔ اور باوجودیکہ موسیٰ نے کہا کہ کوئی اس میں سے صبح تک باقی نہ چھوڑے۔ وہ اس کے سننے والے نہ ہوتے اور بعضوں نے صبح تک کچھ رہنے دیا۔ اس میں کیڑے پڑ گئے اور سڑ گیا۔ (خروج)

بنی اسرائیل کا شہر میں فاتحانہ داخلہ

۲۰۹۔ اور اس وقت کو یاد کرو جب اُن سے کہا گیا تھا کہ اس بستی میں جا کر بس جاؤ اور اس کی پیداوار سے اپنی حسبِ منشا روزی حاصل کرو اور تمہاری زبانوں پر حطہ کلمہ جاری ہو اور شہر کے دروازے میں سجدہ ریز ہو کر داخل ہو جاؤ، ہم تمہاری خطائیں معاف کر دیں گے اور نیکوکاری کرنے والوں کو ہم زیادہ نوازیں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات بنی اسرائیل سے براہ راست نہیں کہی گئی تھی بلکہ پیغمبر کے واسطہ سے کہی گئی تھی۔ یہ واقعہ اگر حضرت موسیٰ کے زمانہ کا ہے تو وہی مراد ہیں اور اگر اُن کے بعد کا ہے تو ان کے جانشین حضرت یوشع علیہ السلام مراد ہیں۔ یہ واقعہ تاریخ اسرائیل کا ایک مسلم واقعہ ہے زمانہ تاریخی اس کا کچھ بھی ہو۔ یہ بستی کون سی تھی؟ ممکن ہے کہ فلسطین کا مشہور شہر اریحا ہو۔ یہ بحر مردار کے شمالی ساحل سے پانچ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اسے اسرائیلیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد حضرت یوشع علیہ السلام کے حکم سے فتح کیا تھا۔ ہمارے قدیم شارحین قرآن بیت المقدس کے بعد زیادہ تر اسی کی طرف میلان رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی متعدد شہروں اور مقامات کے نام لیے گئے ہیں۔ بعض شہروں کے نام تک اب بدل گئے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مراد شہر سطیم ہو۔ یہ علاقہ موآب میں واقع ہے جو بحر مردار کے مشرق میں شہر دریائے یردن کے بائیں کنارہ پر واقع ہے بنی اسرائیل کی دشت پیمائی کے زمانہ میں یہ شہر ان کا سرحدی مقام تھا۔ بعض مفسرین نے جو دردن کا نام لیا ہے اس سے یہی مراد معلوم ہوتا ہے۔

یہ واقعہ البقرہ میں بھی گزر چکا ہے مگر دونوں جگہ کچھ فرق ہے مثلاً البقرہ میں واقعہ کا آغاز واذ قلنا سے ہوا ہے اور یہاں و اذا قیل سے ہے۔ سورہ بقرہ سلسلۂ کلام کے مخاطب بنی اسرائیل ہیں اس لیے واقعہ میں اُن کو ہی مخاطب بنایا ہے اور یہاں اصل خطاب بنی اسرائیل سے نہیں بلکہ اہل مکہ سے ہے اس لیے واقعہ کو بجائے خطاب کے صیغۂ غائب سے پیش کیا اور قیل کے بعد لھم کا اضافہ کیا۔ یہاں اسکنوا ھذہ القریۃ فرمایا اور سورہ بقرہ میں ادخلو فرمایا۔ لفظ سکون یہاں دخول سے زیادہ

بلیغ ہے کیونکہ سکونت کے لیے دخول لازم ہے لیکن دخول کے لیے سکونت لازم نہیں ہے۔

یہاں فرمایا وکلوا منھا حیث شئتم اور سورہ بقرہ میں فکلوا منھا حیث شئتم رغدا۔ سورہ بقرہ میں فاء لے کر آتے ہیں کیونکہ مکان میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلے کھانے سے تو اضع ہوتی ہے برخلاف سکونت کے کروہ ایک طویل عمل ہے۔ کھانا سکونت کے دوران ہوتا ہے سکونت کے بعد نہیں ہوتا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شہر خوب وسیع اور بارونق تھا۔

یہاں فرمایا وقولوا حطۃ وادخلوا الباب سجدا" یعنی بطور عجز و نیاز و عبودیت کے کہ یہی شان مخلص اہل ایمان کی ہے۔ الباب سے مراد شہر کا پھاٹک ہے۔ قدیم شہروں کے اردگرد ایک بلند چہار دیواری شہر پناہ کے نام سے مشہور ہوتی تھی۔ شہر میں داخل ہوتے وقت اسی شہر پناہ کے پھاٹک سے گزر کر جانا ہوتا تھا۔ سجداً یہاں اپنے لغوی معنے میں ہے یعنی عاجزی سے فروتنی کے ساتھ۔ تورات اس اہم خبر سے خالی ہے اور حطۃ کہتے ہوتے یہ کلمہ استغفار ہے یعنی خدایا گناہوں سے پاک کردے۔ گویا زبان بھی قلب و اعضا کی طرح اظہار تذلل کرتی رہے۔ سورہ بقرہ میں پہلے سجدے اور پھر استغفار کا ذکر ہے اور یہاں پہلے استغفار اور پھر سجدے کا ذکر ہے۔ تعبیر کا یہ اختلاف یہ بتانے کے لیے ہے کہ دونوں مطلوب ضرور ہیں مگر ترتیب مطلوب نہیں پہلے سرنگوں ہو جائے اور پھر زبان سے حطۃ کہے یا پہلے حطۃ کہے اور پھر سرنگوں ہو جاتے دونوں درست ہیں۔

یہاں ارشاد ہوا ہے سنزید المحسنین اور البقرہ میں واؤ کا اضافہ ہے یعنی ان لوگوں کو جو نیکوکاری میں اخلاص کامل سے لگے ہوتے ہیں۔ عفو و مغفرت کا وعدہ تو سب ہی توبہ کرنے والوں سے ہے اس کے بعد ان کو مزید فضل و انعام سے نوازا جائے گا۔ یہاں واو ہٹا کر اشارہ فرما دیا کہ یہ زیادت محض اللہ کی جانب سے فضل و انعام ہے یہ خضوع و سجود اور توبہ کے نتیجے میں مغفرت کا حصہ نہیں ہے۔ اس طرح سنزید المحسنین کا فقرہ یہاں بطور استیناف بیانی آیا ہے یعنی ایک اٹھے ہوتے سوال کا جواب ہے گویا دریافت کرنے والے نے دریافت کیا کہ مغفرت کے بعد کیا ہوگا۔ فرمایا کہ ہم ان کو مزید نوازیں گے۔

بنی اسرائیل کی مجرمانہ بیباکی

۲۱۰۔ لیکن ان میں جو لوگ ظلم پیشہ تھے انہوں نے اس بات کو جو ان سے کہی گئی تھی ایسی بات سے بدل ڈالا جو ان سے نہیں کہی گئی تھی۔ پس نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے ان کے ظلم کی پاداش میں آسمان سے

ان پر عذاب بھیج دیا۔ حکم یہ تھا کہ جابر و ظالم فاتحوں کی طرح اکڑتے ہوئے شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ خدا ترس لوگوں کی طرح منکسرانہ شان سے داخل ہونا جیسے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے موقعہ پر داخل ہوئے تھے لیکن جو کچھ ان سے کہا گیا تھا اس کے خلاف کیا۔ یعنی دعا کے لیے جو لفظ ان کو تلقین کیا گیا تھا اس کو انہوں نے بالکل مختلف مفہوم رکھنے والے لفظ سے بدل دیا۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہاں مراد الفاظ کی تبدیلی نہیں ہے بلکہ رویہ کی تبدیلی ہے۔ قدیم شارحین قرآن میں سے ابو مسلم اصفہانی کا یہی خیال ہے لیکن قرآن کے الفاظ سے اس خیال کی تائید نہیں ہوتی۔ بدل کا لفظ جب اپنے دو مفعولوں کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنے یہی ہوتے ہیں کہ ایک چیز کی جگہ دوسری چیز رکھ دی۔ پھر جب واضح میں یہاں یہ بات کہی گئی ہے کہ ظالموں نے اس بات کو جو ان سے کہی گئی تھی ایک ایسی بات سے بدل دیا جو ان سے نہیں کہی گئی تھی اس لیے اس سے صرف رویہ اور عمل کی تبدیلی مراد لینا الفاظ قرآن سے صریح انحراف ہے۔ قرآن کے الفاظ بتاتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے کچھ بدبختوں نے حطۃ کے لفظ کو اس سے بالکل مختلف معنے رکھنے والے لفظ سے بدل دیا تھا۔ رہا یہ سوال کہ انہوں نے کس لفظ سے اس کو بدلا تھا تو قرآن میں اس کی کوئی صراحت نہیں ہے البتہ شارحین نے ان کی کچھ نشاندہی کی ہے۔ اگرچہ ان کی آراء مختلف ہیں مگر ماحصل سب کا ایک ہے کہ بجائے توبہ و انابت کے انہوں نے تمسخر و استہزا شروع کر دیا۔ اور جیسا کہ حضرت ابوہریرہ نے مرفوعاً، موقوفاً انکشاف فرمایا ہے کہ بجائے حطۃ کے حنطۃ کہنے لگے۔ ابو حیان اندلسی رقمطراز ہیں کہ :

> انہوں نے توبہ و استغفار پر لفظوں کے پیمانے سے ہٹ کر تمسخر و استہزاء پر مشتمل پیمانہ اپنا لیا۔

بتانا یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کے مذکورہ بالا احسانات کا جواب یہ لوگ کیسی کیسی مجرمانہ بے باکیوں سے دے رہے تھے۔

اس مجرمانہ بیباکی کا نتیجہ یہ ہوا کہ فارسلنا علیھم رجزاً من السماء بما کانوا یظلمون۔ ان کی ظلم کاریوں کی پاداش میں ہم نے ان پر آسمان سے رجز روانہ کیا۔ رجز اور رجس دونوں ایک ہی لفظ کی دو شکلیں ہیں۔ ان کا اصل مفہوم اضطراب ارتعاش ہے۔ یہیں سے یہ گندگی اور نجاست کے لیے استعمال ہوتے کیونکہ گندگی اور نجاست کو دیکھ کر طبیعت میں ایک قسم کا اضطراب اور بے چینی پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر یہ عذاب کے لیے استعمال ہوئے کیونکہ عذاب بھی دلوں میں ایک اضطراب اور کپکپی پیدا کر دیتا ہے۔ اول لفظ کی تنوین ہی عذاب کی شدت و ہیبت کے اظہار کے

لیے کافی تھی اور پھر اس پر من السماء کا اضافہ اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ اس حادثہ کی نوعیت عام حوادث کی سے بالکل مختلف نوعیت کی تھی۔ اس میں قدرت کی غضبناکی کا پہلو بہت نمایاں تھا۔

رہا یہ سوال کہ یہ عذاب کیا تھا۔ اکثر ہمارے شارحین قرآن نے طاعون کی روایات نقل کی ہیں۔ تاریخ بنی اسرائیل میں آتا ہے کہ طاعون اس قوم پر بار بار آیا۔ تورات میں اس کا ذکر بار بار آیا ہے۔ اس آیت میں اگر بستی سے مراد سطیم لیا جائے تو تورات میں اس کے طاعون کا مفصل ذکر موجود ہے۔

سو اسرائیل سطیم میں مقیم ہوتے اور ان لوگوں نے موابیوں کی بیٹیوں سے حرامکاری شروع کی۔ انھوں نے اپنے معبودوں کی قربانیوں پر لوگوں کی دعوت کی۔ لوگوں نے کھایا اور ان کے معبودوں کو سجدہ کیا اور اسرائیل بعل فغور سے ملے۔ تب خداوند کا قہر بنی اسرائیل پر بھڑکا۔ (گنتی ۲۵۔ ۲-۴)

اور یہ بھی لکھا ہے کہ:

وہ جو اس وبا میں مرے چوبیس ہزار تھے (گنتی ۲۵-۹)

کتاب گنتی کے باب ۳۳ میں یہ بات بھی بیان ہوئی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مواب کے میدانوں میں بنی اسرائیل کو ہدایت کی تھی کہ جب تم یردن کو عبور کر کے ملک کنعان میں داخل ہو تو یہاں کے سب مشرکوں کو نکال دینا۔ ان کے شبیہ دار پتھروں اور ان کے ڈھالے ہوتے بتوں کو توڑ ڈالنا اور ان کے اونچے مقامات کو مسمار کر دینا۔ اگر تم نے اس کی خلاف ورزی کی تو یاد رکھو جیسا میں نے تمہیں ان کے ساتھ کرنے کے لیے کہا ہے ویسا ہی میں تمہارے ساتھ کروں گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل نے اپنی عادت کے مطابق پیغمبر کے اس حکم کی بھی خلاف ورزی کی جس کی پاداش میں ان پر اسی قسم کی کوئی وبا آئی جس قسم کی وبا ان پر سطیم میں آئی تھی۔

یہاں بھی تعبیر میں فرق ہے۔ البقرہ میں ہے فانزلنا علی الذین ظلموا رجزاً من السماء بما کانوا یفسقون۔ اور یہاں فارسلنا علیھم رجزاً من السماء بما کانوا یظلمون۔ سورہ بقرہ میں چونکہ یہ بتانا مقصود تھا کہ ان کے اللہ سے اور اللہ کے بندوں سے تعلقات ہیں فساد آچکا تھا اس لیے ظلم اور فسق دو لفظ لے کر آتے اور یہاں اس کا اجمالی نقشہ پیش کر دیا۔

اصل مقصد یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی اُمتوں کو گناہوں کی پاداش میں عذاب میں گرفتار کرتا ہے جیسا کہ آخرت میں نافرمانیوں کی پاداش میں عذاب دے گا اس لیے ہمیں حتی الوسع

اپنی زندگی کے مختلف گوشوں میں ظلم اور فسق سے بچ کر رہنا چاہیے۔ کسی امت کے فضائل اور فرمایا۔ گناہوں کے نتائج کو ٹال نہیں سکتے۔ زہر تو زہر ہے خواہ اس کے کھانے والا کوئی ہو۔ بنی اسرائیل اولادِ انبیاء ہونے کے باوجود اس دنیا میں ہی پکڑے گئے۔

وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ۘ اِذْ يَعْدُوْنَ
فِي السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا
يَسْبِتُوْنَ ۙ لَا تَاْتِيْهِمْ ۚ كَذٰلِكَ ۚ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۳﴾
وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا ۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ
مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ
يَتَّقُوْنَ ﴿۱۶۴﴾ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖۤ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ
عَنِ السُّوْٓءِ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۭ بَـِٕيْسٍۭ بِمَا كَانُوْا
يَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۵﴾ فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا
قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ﴿۱۶۶﴾

اور اے پیغمبر بنی اسرائیل سے اس شہر کے بارے میں پوچھو جو سمندر کے کنارے واقع تھا[۲۱۱]، اور جہاں سبت کے دن لوگ خدا کی ٹھہرائی ہوئی حد سے باہر ہو جاتے تھے، سبت کے دن ان کی

مطلوبہ مچھلیاں پانی پر تیرتی ہوئی ان کے پاس آجاتیں مگر جس دن سبت نہ مناتے نہ آتیں۔ اس طرح ہم انہیں آزمائش میں ڈالتے تھے، بہ سبب اس نافرمانی کے جو وہ کرتے تھے[۲۱۲]۔ اور جب اس شہر کے باشندوں میں سے ایک طبقہ نے کہا تم ایسے لوگوں کو نصیحت کیوں کرتے ہو جنہیں یا تو خدا ہلاک کر دے گا یا نہایت سخت عذاب میں مبتلا کر دے گا[۲۱۳]۔ انہوں نے کہا اس لیے کرتے ہیں تاکہ تمہارے پروردگار کے حضور معذرت کر سکیں اور اس لیے بھی کہ شاید لوگ باز آجائیں[۲۱۴]۔ پھر جب ایسا ہوا کہ ان لوگوں نے وہ تمام نصیحتیں بھلا دیں جو انہیں کی گئی تھیں تو ہمارا مواخذہ نمودار ہو گیا۔ ہم نے ان لوگوں کو بچا لیا جو برائی سے روکتے تھے مگر شرارت کرنے والوں کو ایک ایسے عذاب میں ڈالا کہ محرومی اور نامرادی میں مبتلا کرنے والا عذاب تھا، بہ سبب ان نافرمانیوں کے

جو وہ کیا کرتے تھے۲۱۵ ۔ پھر جب وہ اس بات میں حد سے زیادہ سرکش ہو گئے جس سے انہیں روکا گیا تھا تو ہم نے کہا بندر ہو جاؤ ذلت وخواری سے ٹھکرائے ہوتے ۔۲۱۶

معانی مفردات

حاضرۃ البحر :- لب دریا، سمندر کے کنارے، حاضرہ حضور سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مونث ہے۔ یعدون :- مضارع معروف کا جمع مذکر غائب ہے مصدر عدو اور عدوان ہے اس کے معنے حد سے گزر جانے کے ہیں، اسی سے صفت کا صیغہ فعول کے وزن پر عدو ہے۔ شرعاً :- پانی کے اوپر ظاہر ہونے والے شارع کی جمع جو شرع سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر ہے۔ شرع کے معنی ظاہر ہونے اور پانی کے اندر بھی آتے ہیں۔ جب یہ لفظ نیزوں کے لیے بولا جاتا ہے تو اس سے مراد سیدھے اٹھائے ہوتے نیزے ہوتے ہیں۔ یہاں یہ لفظ مچھلیوں کے لیے آیا ہے تو اس سے منہ اٹھائے ہوتے مچھلیاں مراد ہیں۔ پلی ہوئی مچھلیوں کے تالاب کے کنارے ان کے ابھرنے کے اوقات میں کھڑے ہو جائیے تو یہ دلکش منظر نظر آئے گا کہ مچھلیاں اپنے سر سطح پر اس طرح ابھارے ہوتے نظر آئیں گی گویا وہ اپنے نیزے سیدھے کیے ہوتے ہیں سمندروں کے کنارے جو شکارگاہیں ہوتی ہیں ان میں یہ منظر اور بھی دلفریب اور طمع انگیز ہوتا ہوگا۔ بئیس :- باس سے بھی ہو سکتا ہے جس کے معنے شدت کے ہیں اور بوس سے بھی جس کے معنے فقر و فاقہ کے ہیں، ہم نے دوسرے معنے کو ترجیح دی ہے کیونکہ آگے چل کر خاسئین کا لفظ آیا ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عذاب کی نوعیت ایسی تھی کہ ذلیل وخوار کرنے والا تھا۔

خدائی احکام میں حیلہ سازی

بنی اسرائیل کی یہ گمراہی کہ دین کے حکموں پر سچائی کے ساتھ عمل نہیں کرتے تھے۔ اور قانونی

حیلے نکال کر ان کی تعمیل سے بچنا چاہتے تھے ان کو حکم دیا گیا تھا کہ سبت کا مقدس دن تعطیل کا دن ہے۔ اس کو آرام اور عبادت کے لیے مخصوص رکھیں ۔ اس روز کسی قسم کا دنیوی کام حتیٰ کہ کھانے اور پکانے کا کام بھی نہ خود کریں ۔ نہ اپنے خادموں سے لیں۔ اس باب میں یہاں تک تاکیدی احکام تھے کہ جو شخص اس مقدس دن کی حرمت توڑے وہ واجب القتل ہے ۔ دیکھو تورات میں خروج باب ۳۱ آیت ۱۲، ۱۷۔ لیکن جب بنی اسرائیل پر اخلاقی انحطاط کا دور آیا تو وہ علی الاعلان سبت کی بے حرمتی کرنے لگے ۔ حتیٰ کہ ان کے شہروں میں کھلے بندوں سبت کے روز تجارت ہونے لگی ۔

یہاں جو واقعہ بیان کیا جا رہا ہے وہ کس بستی کا ہے ۔ قرآن نے اس بستی کا اس سے زیادہ تعارف نہیں کرایا کہ وہ سمندر کے کنارے تھا۔ محققین کا غالب میلان اس طرف ہے کہ یہ مقام ایلہ، ایلات یا ایلوت تھا۔ جہاں اب بنی اسرائیل کی یہودی ریاست ہے اسی نام کی ایک بندرگاہ بنائی ہے اور جس کے قریب ہی اردن کی مشہور بندرگاہ عقبہ ہے ۔ اس کی جائے وقوع بحر قلزم کی اس شاخ کے انتہائی سرے پر ہے جو جزیرہ نما سینا کے مشرقی اور عرب کے مغربی ساحل کے درمیان ایک لمبی خلیج کی صورت میں نظر آتی ہے ۔ بنی اسرائیل کے زمانہ عروج میں یہ بڑا اہم تجارتی مرکز تھا حضرت سلیمان نے اپنے بحرِ قلزم کے جنگی، تجارتی بیڑے کا صدر مقام اسی شہر کو بنایا تھا۔ جس واقعہ کی طرف یہاں اشارہ کیا گیا ہے اس کے متعلق یہودیوں کے کتبِ مقدسہ میں کوئی ذکر نہیں ملتا اور ان کی تاریخی روایات بھی اس موضوع پر خاموش ہیں لیکن قرآن عزیز نے جس انداز سے اس واقعہ کو یہاں اور سورہ بقرہ میں پیش کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ نزول قرآن کے یہودی اپنی تاریخ کی ایک مشہور روایت کی حیثیت سے اسے جانتے تھے چنانچہ سورہ بقرہ میں اس واقعہ کا ذکر اس طرح ہوا ہے کہ گویا قرآن کے مخاطب یہودیوں کی جانی بوجھی بات ہے ولقد علمتم الذین اعتدوا منکم فی السبت اور ان کو تم جانتے ہی ہو جنہوں نے تم میں سے سبت کے معاملہ میں حدود سے تجاوز کیا۔ ظاہر ہے کہ یہودیوں کو مخاطب کر کے اس انداز میں وہی بات کہی جا سکتی ہے جو نہ صرف یہ کہ ان کے مسلمات میں سے ہو بلکہ جو ان کے درمیان بھرپور شہرت رکھتی ہو ورنہ وہ قرآن کی اس بات کی ضرور تردید کرتے ۔

۱۶۳۔ اور اے پیغمبر بنی اسرائیل سے اس شہر کے بارے میں جو سمندر کے کنارے واقع تھا۔ یعنی اپنے زمانہ کے یہود سے بطور تنبیہہ و توبیخ اس بستی میں رہنے والے یہود کا قصہ دریافت کیجئے جو داؤد علیہ السلام کے عہد میں پیش آیا ۔ اکثر مفسرین نے اس بستی سے شہر ایلہ مراد لیا ہے

جو بحرِ قلزم کے کنارے مدین اور طور کے درمیان واقع ہے وہاں کے لوگ دریا کے قرب کی وجہ سے مچھلی کے شکار کی عادت رکھتے تھے[1] روایات میں آتا ہے کہ حضرت داؤد کے زمانے میں یہود کی ایک بڑی آبادی مقام ایلہ میں تھی۔ یہ ذکر انہیں کا ہے۔ حضرت داؤد کا زمانہ حکومت سنہ ۱۰۱۳ قبل مسیح تا سنہ ۹۷۳ قبل مسیح ہے۔ مقام ایلہ اگر وہ ہی ہے جس کا ذکر تورات میں ایلات کے نام سے آتا ہے تو یہ فلسطین کے جنوب میں عرب کے عین شمالی قدیم علاقہ ادوم بحرِ قلزم کی مشرقی خلیج میں اب ساحل واقع ہے۔ ایلہ کے یہودی اپنے قانون کی مسلسل خلاف ورزی کرتے مچھلی کا شکار کرتے اور ایک خاص چالاکی کے ساتھ اسے ظاہری صورتِ جواز دے کر کرتے۔

سبت کی عظمت کے خلاف

۲۱۲۔ اور جہاں سبت کے دن لوگ خدا کی ٹھہرائی ہوئی حد سے باہر ہو جاتے تھے، سبت کے دن ان کی مطلوبہ مچھلیاں پانی پر تیرتی ہوئی اُن کے پاس آتیں مگر جس دن سبت نہ مناتے نہ آتیں، اس طرح ہم انہیں آزمائش میں ڈالتے تھے بر سبب اس نافرمانی کے جو وہ کرتے تھے۔ سبت اس کے معنے کام کاج سے قطع تعلق، ہفتہ کی تعظیم کرنا، سینچر کا دن یوم سبتہ اول معنے کے اعتبار سے لفظ سبت مصدر ہے اور دوسرے معنے کے اعتبار سے اسم جنس کی جمع اسبت اور سبوت آتی ہے۔ علامہ زمخشری نے پہلے معنی اختیار کیے ہیں اور علامہ ابو حیان اندلسی نے دوسرے چنانچہ زمخشری کشاف میں لکھتے ہیں:۔

> سبت مصدر ہے سبتت الیہود کے معنے ہیں یہود نے شنبہ کے دن کی تعظیم کی۔

اور ابو حیان البحر المحیط میں رقمطراز ہیں:۔

> السبت یوم معلوم روز شنبہ کا نام ہے اور یہ سبت سے ماخوذ ہے جس کے معنے قطع کرنے کے ہیں یا سبات سے ہے جس کے معنی آسائش و راحت کے ہیں۔ اور ابو الفرج بن الجوزی نے کہا ہے کہ یہ خطا ہے کلام عرب میں سبت بمعنے استراح مشہور ہیں۔ ابن جریج کا بیان ہے کہ یوم السبت اس لیے نام پڑا کہ وہ وقت کا ایک ٹکڑا ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

علامہ مرتضیٰ زبیدی تاج العروس شرح القاموس میں فرماتے ہیں:

السبت ہفتہ کا ایک مشہور دن ہے اور وہ ہفتہ کا ساتواں دن ہے اور اس کا سبت اس لیے نام پڑا کہ اللہ تعالیٰ نے اس روز پیدائش کی ابتداء فرمائی اور زمین کے ایک حصتہ کو اسی دن میں قطع یعنی تمام کیا۔ اور محکم میں ہے کہ سبت اس لیے نام رکھا گیا ہے کہ پیدائش کی ابتداء اتوار کے روز سے ہوئی جمعہ کے روز تک جاری رہی اور شنبہ کو کسی چیز کی پیدائش عمل میں نہیں آئی۔ اہل لغت نے کہا ہے لہٰذا یوم السبت مسبتہ ہوا یعنی تمام شدہ بایں طور کہ اس دن میں عمل منقطع ہو گیا۔

علامہ موصوف نے سبت کی وجہ تسمیہ کے سلسلے میں تین توجیہیں ذکر فرمائی ہیں جن میں پہلی توجیہ "یقیناً" پوچ ہے کیونکہ اولاً تو اس میں اختلاف ہے کہ ہفتہ کے دن کسی چیز کی پیدائش عمل میں بھی آئی یا نہیں اور بتقدیر صحت ہفتہ کو ہی سبت سے موسوم کرنا کیا معنے جبکہ بقیہ چھ دنوں میں سے ہر ایک دن میں کسی نہ کسی چیز کی تخلیق تکمیل کو پہنچی ہے۔ البتہ دوسری توجیہ قابل قبول ہے۔ لیکن اصل میں سبت کی وجہ وہی ہے جو علامہ موصوف نے امام اللغت ابن سیدہ کی کتاب المحکم سے نقل کی ہے۔ ائمہ لغت کی تصریحات اسی کی تائید میں ہیں۔ ابو عبید کہتے ہیں:-

سبت اس لیے نام رکھا گیا کہ اس میں ہر شئے کی پیدائش کا کام قطع ہو گیا۔

امام راغب مفردات میں لکھتے ہیں:

حق تعالیٰ نے زمین و آسمان کی پیدائش کی ابتداء یوم الاحد یعنی یک شنبہ کے دن سے فرمائی اور جیسا کہ ارشاد ہے چھ دن میں ان کو خلق فرما کر ہفتہ کو اپنا کام ختم فرما دیا۔ لہٰذا اس دن کا نام یوم السبت پڑ گیا۔

امام جوہری صحاح میں لکھتے ہیں:

چونکہ دن اس پر ختم ہو جاتے ہیں اس لیے اس کا نام یوم السبت قرار پایا۔

غرض چونکہ آفرینش عالم کی ابتداء اتوار کے دن سے عمل میں آئی اس لیے وہ عالم کا پہلا دن یعنی یوم الاحد قرار پایا اور ہفتہ کے دن چونکہ پیدائش کا کام منقطع ہو گیا ہے اس لیے انقطاع کے دن یعنی یوم السبت سے موسوم ہوا۔ یہود و نصاریٰ دونوں فرقوں نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق ہفتہ کے ایک دن کو عید قرار دیا۔ یہود نے سنیچر کو پسند کیا اور عیسائیوں نے اتوار کو اور حق تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے جمعہ کو مقرر فرمایا۔ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہم پچھلے ہیں قیامت کے اگلے۔ بس کتاب ان یہود و نصاریٰ کو پہلے مل گئی اور یہ یعنی جمعہ ان کا دن ہے جو ان پر مقرر کیا گیا تھا تو انہوں نے اختلاف کیا اور اللہ نے ہمیں اس کی ہدایت دی۔ اب لوگ اس میں ہمارے پیچھے ہیں یہودی کل اور عیسائی پرسوں۔ اور صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ اور حضرت حذیفہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جمعہ سے اللہ نے اگلوں کو بے خبر رکھا۔ یہودیوں کے لیے تو سنیچر ہوا اور عیسائیوں کے لیے اتوار اور اللہ ہمیں لایا تو ہمیں جمعہ کی دن کی ہدایت فرمائی اور جمعہ، سنیچر اور اتوار مقرر ہوتے۔ اور اسی طرح وہ لوگ قیامت کے دن ہمارے پیچھے ہوں گے۔ ہم دنیا والوں میں آخری ہیں اور قیامت کے دن اول کہ خلائق سے پہلے ہمارا فیصلہ ہوگا۔

سنیچر، اتوار کے مقابلہ میں جمعہ کی فضیلت

امام رازی تفسیر کبیر میں فرماتے ہیں کہ۔ اگر کوئی کہے کہ جمعہ کا روز ہفتہ کے دن سے افضل کیوں ہے جبکہ تمام مذاہب کا اس پر اتفاق ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے عالم کی تخلیق چھ روز میں فرمائی۔ یکشنبہ سے پیدائش و آفرینش کا آغاز فرمایا اور جمعہ کے روز تکمیل ہوئی۔ ہفتہ کا روز فراغت کا دن ہوا۔ یہود تو ہفتہ کی تقریب کی یہ توجیہ کرتے ہیں کہ ہم ترکِ اعمال میں اپنے پروردگار کی موافقت کرتے ہیں اور عیسائی یہ کہتے ہیں کہ خلق و تکوین کی ابتداء تو یکشنبہ سے ہوئی ہے اس لیے ہم اس دن کو عید قرار دیتے ہیں۔ یہ دونوں وجہیں معقول ہیں۔ جمعہ کے تقریب ہونے کی عقلی توجیہ کیا ہے جواب یہ ہے کہ جمعہ کا دن کام کے تمام اور کمال کا دن ہے اور تمام و کمال ہی فرح و سرور کا ایک بنیادی اور معقول سبب ہے لہٰذا اس بنا پر جمعہ کے دن کو تقریب قرار دینا تقاضائے عقل کے مطابق ہے اور یہی اولیٰ ہے۔

آفرینشِ عالم کی ابتداء میں اختلاف

اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ آفرینش عالم کی ابتداء کس دن عمل میں آئی۔ بعض شنبہ بتاتے ہیں اور بعض یکشنبہ اور اس کی وجہ اختلاف روایات ہے۔ حافظ ابن کثیر البدایہ والنہایہ میں فرماتے ہیں:۔

ابن جریر نے اول ایام کے بارے میں تین اقوال نقل کیے ہیں اور محمد بن اسحاق

سے اس کا بیان روایت کیا ہے کہ اہلِ تورات کہتے ہیں کہ اللہ نے تخلیق کا آغاز اتوار سے کیا اور اہلِ انجیل کہتے ہیں دوشنبہ کو اللہ نے تخلیق شروع کی اور ہم مسلمان جیسا کہ ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے یوں کہتے ہیں کہ اللہ نے شنبہ کو تخلیق کا آغاز فرمایا۔ اور یہ قول جس کی ابن اسحاق نے مسلمانوں کی طرف نسبت کی ہے فقہاء شافعیہ کی ایک جماعت کا بھی مسلک ہے اور اس موضوع پر ابوہریرہ کی حدیث خلق الله التربة يوم السبت آنے والی ہے اور یک شنبہ کے قول کو ابن جریر نے بروایت سدی ابو مالک اور بروایت ابی صالح ابن عباس اور بروایت مرہ ابن مسعود اور صحابہ کی ایک جماعت نیز عبداللہ بن سلام سے بھی روایت کیا ہے اور اسی کو ابن جریر نے اختیار کیا ہے اور یہی تورات کی تصریح ہے اور اسی کی طرف فقہاء کا دوسرا گروہ مائل ہے اور یہی لفظ احد سے زیادہ مشابہ ہے اور اسی بنا پر چھ دن میں پیدائش کی تکمیل ہوئی اور جمعہ ان کا آخری دن ہوا اور مسلمانوں نے ہفتہ میں اسے اپنے لیے عید کا دن مقرر فرمایا۔[1]

حدیث مذکور جس کی طرف حافظ ابن کثیر نے اشارہ کیا ہے۔ مسند احمد، صحیح مسلم اور نسائی میں حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ اللہ نے مٹی کو شنبہ کے دن پیدا فرمایا اور پہاڑوں کو یک شنبہ کے دن اور درختوں کو دوشنبہ کے دن اور مکروہ کو سہ شنبہ کے دن اور نور کو چہار شنبہ کے دن پیدا فرمایا اور پنجشنبہ کے دن جانوروں کو منتشر فرمایا اور روز جمعہ بعد نمازِ عصر حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا جو آخری مخلوق ہیں۔ اور جمعہ کی آخری ساعت میں عصر سے لے کر رات کے درمیان ان کی تخلیق عمل میں آئی۔ یہ روایت ان تینوں کتابوں میں بروایت ابن جریج بایں اسناد مروی ہیں۔

ابن جریج اخبرنی اسماعیل ابن امیہ عن ایوب بن خالد عن عبداللہ بن رافع مولی ام سلمۃ

نیز امام نسائی نے تفسیر میں بروایت ابن جریج عن عطاء ابن ابی رباح عن ابی ہریرہ روایت کیا ہے۔ حافظ ابن کثیر اس روایت کے متعلق لکھتے ہیں:

ابن جریج کی اس حدیث میں اختلاف ہے۔ علی ابن المدینی، بخاری اور بیہقی

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۱

وغیرہ حفاظ نے اس حدیث میں کلام کیا ہے۔ بخاری نے تاریخ میں کہا ہے کہ بعض نے اس کو کعب سے بیان کیا ہے اور یہی زیادہ صحیح ہے۔ یعنی یہ حدیث ان روایتوں میں سے ہے جن کو ابوہریرہ نے کعب سے سُنا اور ان سے لیا ہے کیونکہ وہ دونوں حدیث کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ رہتے اور اُٹھتے بیٹھتے تھے۔ یہ تو انہیں اپنے صحیفوں سے بتاتے اور وہ انہیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ ارشادات سناتے جو اس کی تصدیق میں ہوتے۔ لہٰذا یہ حدیث وہ ہے جس کو حضرت ابوہریرہ نے کعب سے اسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع کر دیا اور یہ کہہ کر رسُول اللہ نے میرا ہاتھ پکڑا اس کے رفع کی اور تاکید کر دی۔ نیز اس کے متن میں سخت غرابت ہے من جملہ اس کے یہ کہ اس میں آسمانوں کے پیدا کرنے کا ذکر تک نہیں اور زمین اور زمین میں جو کچھ ہے سات روز میں اس کے پیدا ہونے کو بیان کیا ہے اور یہ روایت قرآن مجید کے خلاف ہے کیونکہ زمین چار دن میں پیدا ہوئی ہے پھر دو دن میں آسمانوں کو دھوئیں سے پیدا کیا گیا۔

اور دوسرے قول یعنی یک شنبہ کو آغاز آفرینش ہونے کے بارے میں وہ حدیث ہے جو مستدرک حاکم میں حضرت عبداللہ بن عباس سے مروی ہے کہ یہود نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر آسمانوں اور زمین کی پیدائش کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ اللہ نے زمین کو یک شنبہ اور دوشنبہ کے دن پیدا فرمایا اور پہاڑوں نیز ان منافع کو جو پہاڑوں میں ہیں سہ شنبہ کے روز بنایا اور درخت، پانی، شہر، آبادی اور ویرانہ کو چہارشنبہ کے روز تخلیق فرمائی۔ یہ چار روز ہوتے۔ اللہ سبحانہٗ کا ارشاد ہے:

قل ائنکم لتکفرون بالذی خلق الارض فی یومین وتجعلون لہ اندادًا ذالک رب العالمین وجعل فیھا رواسی من فوقھا وبارک فیھا وقدر فیھا اقواتھا فی اربعۃ ایام سواء للسائلین۔

کہہ دو کیا تم منکر ہو اس ذات کے جس نے زمین بنائی دو روز میں اور اس کے برابر کرتے ہو اوروں کو وہ رب ہے جہانوں کا اور رکھے اس میں پہاڑ بھاری اوپر سے اور برکت رکھی اس کے اندر اور ٹھہرائیں اس میں خوراکیں اس کی چار دن میں پورا ہوا پوچھنے والوں کو اور پنجشنبہ کے دن آسمان پیدا کیا اور جمعہ کے ستارے آفتاب و ماہتاب اور فرشتے پیدا کیے روایت طویل ہے۔ حاکم نے اس روایت کے بارے میں لکھا ہے یہ حدیث صحیح الاسناد ہے مگر بخاری و مسلم نے اس کو روایت نہیں کیا۔ اور حاکم کی تصحیح میں اہلِ فن کو کلام ہے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اس حدیث

میں غرابت ہے۔ اس حدیث کا ایک راوی ابوسفیان بقال ہے۔ اس کے متعلق حافظ ذہبی تلخیص المستدرک میں ابن معین سے جو فن جرح و تعدیل کے امام ہیں ناقل ہیں کہ اس کی حدیث نہ لکھی جائے۔
غرض آفرینش عالم کے متعلق دنوں کی ترتیب و تعیین میں کوئی حدیث صحیح موجود نہیں ہے۔
بہرحال سبت ہفتہ کے دن کو کہتے ہیں۔ یہ دن بنی اسرائیل کے لیے مقدس قرار دیا گیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے اور اولاد اسرائیل کے درمیان پشت در پشت تک دائمی عہد کا نشان قرار دیتے ہوئے تاکید کی تھی کہ اس روز کوئی دنیوی کام نہ کیا جائے۔ گھروں میں آگ تک نہ جلائی جائے۔ جانوروں اور لونڈی غلام تک سے کام نہ لیا جائے اور یہ کہ جو شخص اس ضابطہ کی خلاف ورزی کرے گا اسے قتل کر دیا جائے لیکن بنی اسرائیل نے آگے چل کر اس قانون کی علانیہ خلاف ورزی کی اور یہ حیلہ نکالا کہ سمندر کے کنارے گڑھے کھود لیے جب جوار کے بعد پانی اتر جاتا تو گڑھے کے اندر مچھلیاں پکڑ لیتے اور کہتے کہ یہ مچھلیاں خود بخود آ گئیں، شکار نہیں کی گئیں۔ برمیاہ نبی کے زمانہ میں جو ۶۲۸ اور ۵۸۶ قبل مسیح کے درمیان گزرے ہیں خاص یروشلم کے پھاٹکوں سے لوگ سبت کے دن مال و اسباب لے کر گزرتے تھے۔ اس پر نبی موصوف نے خدا کی طرف سے یہودیوں کو دھمکی دی کہ اگر تم لوگ شریعت کی اس کھلم کھلا خلاف ورزی سے باز نہ آئے تو یروشلم نذر آتش کر دیا جائے گا۔ اسی کی شکایت حزقی ایل بھی کرتے تھے جن کا دور ۵۹۵ ق م ہے۔ چنانچہ ان کی کتاب میں سبت کی بے حرمتی کو یہودیوں کے قومی جرائم میں سے ایک بڑا جرم قرار دیا ہے۔ ان حوالوں سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ یہ واقعہ بھی لازماً اسی زمانے میں ہوا ہے۔
آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہود کی شریعت میں سبت یعنی ہفتہ کے روز کام کاج اور سیر و شکار وغیرہ کی ممانعت تھی لیکن وہ صبر نہ کر سکے۔ انہوں نے سبت کے دن مچھلیوں کے شکار کے لیے مختلف قسم کے حیلے ایجاد کیے۔ سنتِ الٰہی یہ ہے کہ جب کوئی قوم کسی نافرمانی میں اصرار کی حد تک بڑھ جاتی ہے اور اچھوں کے سمجھانے سے باز نہیں آتی تو اس معاملہ میں اس کی آزمائش سخت سے سخت تر ہو جاتی ہے تاکہ وہ اپنا پیمانہ اچھی طرح بھرے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہی صورتِ حال بنی اسرائیل کے لیے پیدا کر دی۔ عام دنوں میں تو یہ مچھلیاں نظر نہ آتیں یا بہت ہی کم نظر آتیں لیکن سبت کے دن معلوم ہوتا کہ ان کے ہاں بارات اتری ہوئی ہے۔ یہ چیز ان کی آتشِ حرص کو اور بھڑکا دیتی۔ قاعدہ ہے کہ آدمی جس چیز سے روک دیا جاتا ہے اس کی خواہش اور زیادہ ہو جاتی ہے الانسان حریص فیما منع اور حرص وہ بلا ہے کہ اس کے اثر سے بسا اوقات آدمی کی نگاہ بھی بدل جاتی ہے۔ خواہش نہ ہونے کی

حالت میں جو چیز ناشر نظر آتی ہے خواہش کے غلبہ میں وہ ہی کیلو نظر آنے لگتی ہے کذالک نبلوھم بما کانوا یفسقون کا مطلب یہی ہے کہ ان کو سخت آزمائش میں اس لیے ڈالا گیا کہ وہ پہلے نافرمانیوں پر اصرار کرتے تھے۔ آزمائشیں حق سبحانہ، کے یہاں سے تو فرمانبرداروں اور نافرمانوں دونوں کی ہوتی ہیں لیکن جیساکہ شارحین قرآن نے لکھا ہے کہ اہل طاعت کی آزمائش لطف اور تائید اور توفیق کی خاطر ہوتی ہے۔ آزمائش کا جس کی علت یہاں نافرمانیوں پر اصرار بتایا گیا اس آزمائش سے تقابلی مطالعہ فرمایئے جو اہلِ طاعت کے لیے حالتِ احرام میں خشکی کے شکار کی ممانعت سے ہوتی ہے۔ فرمایا:

یا ایھا الذین امنوا لیبلونکم اللہ بشئ من الصید تنالہ ایدیکم ورماحکم لیعلم اللہ من یخافہ بالغیب۔

اے ایمان والو! اللہ تم کو کسی ایسے شکار سے ضرور آزمائے گا جو تمہارے ہاتھوں اور نیزوں کی دسترس میں ہوں تاکہ ان لوگوں کو ممتاز کر دے جو اس سے غیب میں ڈرتے ہیں۔

کیسا مشفقانہ انداز ہے آزمائشیں دونوں ہیں ایک کی علت بما کانوا یفسقون ہے اور ایک کی وجہ لیعلم اللہ من یخافہ بالغیب ہے۔ پہلا اگر حاکمانہ تہدید و توبیخ ہے تو دوسرا قطعاً محبوبانہ انداز ہے جو عشق اور فسق میں فرق ہے وہی دونوں آزمائشوں میں فرق ہے۔

آیئے اس آیت پر مولانا عثمانی کا بھی نوٹ ملاحظہ فرما لیجئے، فرماتے ہیں:

حق تعالیٰ نے یہود پر ہفتہ کے دن شکار کرنا حرام کیا تھا باشندگان ایلہ کو عدول حکمی اور نافرمانی کی عادت تھی۔ خدا کی طرف سے سخت آزمائشیں ہونے لگیں کہ ہفتہ کے دن دریا میں مچھلیوں کی بے حد کثرت ہوتی جو سطح دریا کے اوپر تیرتی تھیں باقی دنوں میں غائب رہتیں۔ ان لوگوں سے صبر نہ ہو سکا۔ صریح حکم الٰہی کے خلاف حیلے کرنے لگے دریا کا پانی کاٹ لاتے۔ جب ہفتہ کے دن مچھلیاں ان کے بناتے ہوتے حوض میں آجاتیں تو نکلنے کا راستہ بند کر دیتے اور اگلے دن اتوار کو جا کر پکڑ لاتے تاکہ ہفتہ کے دن شکار کرنا صادق نہ آئے۔ گویا اس حرکت سے معاذاللہ خدا کو دھوکہ دینا چاہتے تھے آخر دنیا میں اس کی سزا بھگتنی پڑی کہ مسخ کر کے ذلیل بندر بنا دیے گئے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ حیلہ سازی اور مکاری خدا کے پیش نہیں جاتی۔ [1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

آخری حد تک دعوت کا کام ہونا چاہیے

۲۱۳ - اور جب اس شہر کے باشندوں میں سے ایک طبقہ نے کہا تم ایسے لوگوں کو نصیحت کیوں کرتے ہو جن کو یا تو خدا ہلاک کر دے گا یا نہایت سخت عذاب میں مبتلا کر دے گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب انہوں نے حکمِ الٰہی کے خلاف حیلہ سازی شروع کی تو شہر کے باشندے کئی قسموں میں منقسم ہو گئے جیسا کہ عموماً ایسے حالات میں ہوا کرتا ہے۔ ایک وہ لوگ جنہوں نے اس حیلہ کی آڑ میں صریح حکمِ الٰہی کی خلاف ورزی کی۔ دوسرے نصیحت کرنے والے جو اخیر تک فہمائش کرتے رہے، تیسرے جنہوں نے ایک آدھ مرتبہ نصیحت کی پھر مایوس ہو کر اور ان کی سرکشی سے تھک کر چھوڑ دی۔ چوتھے وہ ہوں گے جو نہ اس عمل شنیع میں شریک ہوئے اور نہ منع کرنے کے لیے زبان کھولی بالکل علیحدہ اور خاموش رہے۔ مؤخر الذکر دو جماعتوں نے ان تھک نصیحت کرنے والوں سے کہا ہو گا کہ ان متمردین کے ساتھ کیوں مغز زنی کر کے اپنا دماغ کھپاتے ہو جن سے کوئی توقع قبول حق کی نہیں۔ ان کی نسبت تو دو باتوں میں سے ضرور ایک بات پیش آنے والی ہے یا خدا ان کو بالکل تباہ کر دے گا اور یا کسی سخت ترین عذاب میں مبتلا کر دے کیونکہ یہ لوگ اب کسی کی نصیحت پر کان دھرنے والے نہیں ہیں [1]

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس بستی کے لوگوں نے شقاوت کی یہ راہ سمجھانے اور بجھانے کے باوجود اختیار کی۔ یہ بات نہ تھی کہ ان کو کوئی آگاہ کرنے والا نہ تھا۔ اللہ کے ایسے بندے وہاں تھے جنہوں نے ان کو نہ صرف اس جرم سے روکنے کی کوشش کی مگر ان کے اپنے ساتھیوں میں سے ایک جماعت نے اب مزید سمجھانے کو بالکل غیر مفید سمجھا اور یہ کہا کہ ایسے لوگوں کو سمجھانے سے کیا حاصل ؟ جو اب یا تو ہلاک ہونے والے ہیں یا کم از کم کسی شدید عذاب کی پکڑ میں آنے والے ہیں۔

فرضِ دعوت کی غرض و غایت

۲۱۴ - انہوں نے کہا اس لیے کرتے ہیں تاکہ تمہارے پروردگار کے حضور معذرت کر سکیں، اور اس لیے بھی کہ شاید لوگ باز آ جائیں۔ یعنی شاید سمجھاتے رہنے سے کچھ ڈر جائیں اور اپنی حرکاتِ شنیعہ سے باز آ جائیں ورنہ کم از کم ہم پروردگار کے سامنے عذر تو پیش کر سکتے ہیں کہ خدایا ہم نے

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

آخری دم تک نصیحت و فہمائش میں کوتاہی نہیں کی یہ نہ ماننے تو اب ہم پر کیا الزام ہے گویا یہ ناصحین اول تو بالکلیہ مایوس نہ تھے دوسرے عزیمت پر عمل کر رہے تھے کہ مایوسی کے باوجود بھی ان کا تعاقب نہیں چھوڑتے تھے [1]

مطلب یہ ہے کہ اللہ کے ان بندوں نے اس نقطہ نظر کو تسلیم نہیں کیا بلکہ ان کو یہ جواب دیا کہ ہمارا سمجھانے کا کام جاری رہنا چاہیے۔ اگر یہ لوگ نہ مانے تو ہم اللہ کے ہاں اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائیں گے اور کیا عجب مان ہی جائیں سو اگر مان گئے تو یہی مقصود ہے۔

اس سے اس ذمہ داری کی حد معین ہوتی ہے جو ہر مومن پر دوسروں کو برائی سے روکنے اور بھلائی کی دعوت دینے کی عائد ہوتی ہے۔ معلوم ہوا کہ اس میں کوئی ایسا مرحلہ نہیں آتا ہے۔ جب داعی یہ فرض کرے کہ اب دعوت کا فرض ادا ہو گیا۔ اس لیے نہ ماننے والوں کو عذابِ الٰہی کے لیے چھوڑ دینا چاہیے بلکہ یہ کام زندگی کے آخری لمحے تک کرتے رہنا چاہیے۔ اگرچہ ایک شخص بھی نصیحت کی قدر کرنے والا نہ ہو۔ عنداللہ ایسے ہی لوگ اپنے فرض سے سبکدوش قرار پائیں گے۔ وہ اللہ کے ہاں بری نہ ہوں گے جو خود اگرچہ برائی میں مبتلا نہ ہوں لیکن دوسروں کے خیر و شر سے بالکل بے تعلق ہو کر زندگی گزاریں۔ الغرض گمراہوں کی جانب سے کتنی ہی مایوسی ہو لیکن اہلِ حق کا فرض ہے کہ موعظت سے باز نہ رہیں کیونکہ اوّل تو یہ ایک فرض ہے اور ادائے فرض میں نتیجہ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا، ثانیاً، کون کہہ سکتا ہے کہ ہدایت قطعاً مؤثر نہ ہو گی۔ ہو سکتا ہے کسی کے دل میں کوئی بات اتر جائے۔ اسی لیے فرمایا معذرۃ الی ربکم ولعلہم یتقون۔ سبحان اللہ قرآن کی کیا معجزانہ بلاغت ہے۔ پانچ چھ لفظوں میں وہ سب کچھ کہہ دیا جو اس بارے میں کہا جا سکتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا ہے کہ جس بستی میں علانیہ احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی ہو رہی ہو وہ ساری کی ساری آبادی قابلِ مواخذہ ہوتی ہے اور اس کا کوئی باشندہ محض اس بنا پر مواخذہ سے بری نہیں ہو سکتا کہ اس نے خود خلاف ورزی نہیں کی بلکہ اسے خدا کے سامنے اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے لازماً اس کا ثبوت فراہم کرنا ہو گا کہ وہ اپنی حدِ استطاعت تک اصلاح اور اعلاءِ حق کی کوشش کرتا رہا تھا۔ قرآن و حدیث کے دوسرے ارشادات سے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ اجتماعی جرائم کے باب میں اللہ کا قانون یہی ہے چنانچہ قرآن میں دوسری جگہ ارشاد ہے:

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

واتقوا فتنۃ لا تصیبن الذین ظلموا منکم خاصۃ
اس آزمائش سے بچ کر رہو جس کے وبال میں خصوصیت کے ساتھ صرف وہی لوگ گرفتار نہ ہوں گے جنہوں نے تم میں سے ظلم کیا ہو۔
اور اس کی تشریح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح فرمائی ہے:
اللہ سبحانہ خاص لوگوں کے جرائم پر عام لوگوں کو سزا نہیں دیتا جب تک عامۃ الناس کی حالت یہ نہ ہو جائے کہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے بُرے کام ہوتے دیکھیں اور وہ ان کاموں کے خلاف اظہار ناراضی کرنے پر قادر ہوں اور پھر کوئی اظہار ناراضی نہ کریں۔ پس جب لوگوں کا حال یہ ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ خاص و عام سب کو عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔

عذاب کی ہمہ گیری سے بچنے والے

۲۱۵ ۔ پھر جب ایسا ہوا کہ ان لوگوں نے وہ تمام نصیحتیں بھلا دیں جو انہیں کی گئی تھیں تو ہمارا مواخذہ نمودار ہو گیا۔ ہم نے ان لوگوں کو بچا لیا جو برائی سے روکتے تھے مگر شرارت کرنے والوں کو ایک ایسے عذاب میں ڈالا کہ محرومی اور نامرادی میں مبتلا کرنے والا عذاب تھا۔ بر سبب ان کی نافرمانیوں کے جو وہ کیا کرتے تھے۔ یعنی جب ان نالائقوں نے تمام نصیحتوں کو بالکل ایسا بھلا دیا گویا سنا ہی نہیں ہے تو ہم نے ناصحین کو بچا کر ظالمین کو سخت عذاب میں گرفتار کر دیا الذین ینھون عن السوء کا عموم الفاظ دلالت کرتا ہے کہ جو نصیحت سے تھک کر لم تعظون قوما کہہ رہے تھے اور جنہوں نے آخر تک وعظ و نصیحت کا سلسلہ جاری رکھا ان دونوں کو نجات ملی۔ صرف ظالم پکڑے گئے۔ یہ ہی عکرمہ سے منقول ہے اور حضرت عبداللہ بن عباس نے ان کو قرآن فہمی کی داد دی۔ باقی جو لوگ اول سے آخر تک ساکت رہے۔ خدا نے بھی ان کے ذکر سے سکوت فرمایا۔ ابن کثیر نے خوب لکھا ہے:

فنص علی نجاۃ الناھین وھلاک الظالمین وسکت عن الساکتین لان الجزاء من جنس العمل فھم لا یستحقون مدحاً فیمدحوا ولا ارتکبوا عظیما فیذموا۔

قرآن نے بتایا ہے کہ روکنے والے نجات یافتہ ہیں اور ظالم ہلاکت کا شکار ہیں۔ لیکن قرآن نے خاموش رہنے والوں کے بارے میں خاموشی اختیار کی۔ کیونکہ جزا عمل جیسی ہوتی ہے اس لیے وہ کسی مدح کے مستحق ہیں اور چونکہ انہوں نے کسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا

اس لیے قابلِ مذمت نہیں۔

ابن کثیر نے حضرت عکرمہ کی تشریح کو ترجیح دی ہے [1]

دراصل بستی میں تین قسم کے آدمی تھے ایک وہ جو کھلم کھلا خدائی احکام کی خلاف ورزی کر رہے تھے دوسرے وہ جو خود تو خلاف ورزی نہیں کرتے تھے مگر اس خلاف ورزی کو خاموشی کے ساتھ بیٹھے دیکھ رہے تھے اور ناصحوں سے کہہ رہے تھے کہ ان کم بختوں کو نصیحت کرنے سے کیا حاصل ہے۔ تیسرے وہ جن کی غیرتِ ایمانی حدود اللہ کی اس کھلم کھلا بے حرمتی کو برداشت نہ کر سکتی تھی۔ اور وہ اس خیال سے نیکی کا حکم کرنے اور بدی سے روکنے میں سرگرم تھے کہ شاید وہ مجرم لوگ ان کی نصیحت سے راہِ راست پر آجائیں۔ اور اگر وہ راہِ راست اختیار نہ کریں تب بھی ہم اپنی حد تک تو اپنا فرض ادا کر کے خدا کے سامنے اپنی برأت کا ثبوت پیش کر ہی دیں۔ اس صورتِ حال میں جب اس بستی پر اللہ کا عذاب آیا۔ تو قرآن کہتا ہے کہ ان تینوں گروہوں میں سے صرف تیسرا گروہ اس سے محفوظ رہا کیونکہ اسی نے خدا کے حضور معذرت پیش کرنے کی فکر کی تھی اور وہی تھا جس نے اپنی برأت کا ثبوت فراہم کیا تھا باقی دونوں گروہوں کا شمار ظالموں میں ہوا اور وہ اپنے جرم کی حد تک مبتلائے عذاب ہوئے۔

حضرت عکرمہ نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے گروہ کو مبتلائے عذاب ہونے کی اور تیسرے گروہ کے نجات یافتہ ہونے کی تصریح کی ہے لیکن دوسرے گروہ کے بارے میں سکوت اختیار فرمایا ہے لہٰذا اس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ نجات پانے والوں میں سے تھا یا مبتلائے عذاب ہونے والوں میں سے۔ ایک روایت میں عبداللہ بن عباس سے یہ بھی مروی ہے کہ دوسرا گروہ عذاب میں مبتلا ہونے والوں میں سے تھا۔ بعد میں ان کے شاگرد حضرت عکرمہ نے ان کو مطمئن کر دیا کہ دوسرا گروہ نجات پانے والوں میں شامل تھا۔ لیکن ظاہر قرآن وہی ہے جو حضرت عبداللہ بن عباس کا پہلا خیال ہے اور جسے ابن کثیر نے باسناد چند پیش کیا ہے۔ عام شارحینِ قرآن آلوسی، ابن کثیر، زمخشری وغیرہ نے عکرمہ کی رائے کو راجح قرار دیا ہے۔ امام الحسن البصری، اور یمان بن رباب کہتے ہیں کہ بچنے والے دو گروہ تھے۔ ایک وعظ کہنے والے اور دوسرے خاموش رہنے والے اور ہلاک ہونے والا گروہ صرف جرائم پیشہ طبقہ تھا لیکن ابن زید کہتے تھے کہ بچنے والا گروہ صرف وہ ہے جو ان کو روک رہا تھا باقی خاموش اور جرائم پیشہ ہلاک ہو گئے۔ اس کی تائید ظاہر قرآن سے ہوتی ہے۔ قرآن کی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

تصریح ہے کہ بچنے والا گروہ صرف وہ تھا جو ان کو روک رہا انجینا الذین ینھون عن السوء ظاہر ہے کہ جو گروہ روک نہیں رہا تھا وہ اس میں داخل نہیں ہے۔ اسی لیے ابن زید نے اس آیت کے بارے میں اپنا یہ تاثر پیش کیا ہے کہ قرآن کی یہ آیت نہی عن المنکر کو چھوڑ دینے کے موضوع پر سب سے زیادہ سنگین ہے۔ زمخشری کا یہ کہنا کہ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ برائی پر روک ٹوک کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ ایسے موقع پر نہی عن المنکر کا فرض ساقط ہو جاتا ہے کوئی وزنی نہیں ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ فرائض کی ادائیگی کا مدار خوش آئند نتائج ہیں۔ یہ بات روحِ اسلام کے خلاف ہے۔ داعی کا کام فرض کی ادائیگی ہے۔ اسی بنا پر ارشادِ نبوت ہے سب سے اونچا جہاد ظالم فرمانروا کے سامنے کلمہ حق کہنا ہے۔ یہ تو ایمان کے کمزور ترین درجہ کی علامت ہے۔ اگر نتائج کو پیش نظر رکھ کر فرائض کی حیثیت متعین کی جائے تو ادائے فرض کے لیے برائیوں کے ہجوم میں کوئی موقعہ نہ رہے گا۔ اس لیے علامہ زمخشری کی یہ رائے زیادہ وزنی نہیں۔ آیت کی تشریح میں روحِ اسلام اور نہی عن المنکر کے فرض سے زیادہ قریب عبداللہ بن عباس کی پہلی رائے ہے۔

بہرحال آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ تنبیہات جو ان کو کی گئی تھیں وہ بھلا بیٹھے اور کسی طرح سوچنے اور سمجھنے پر راضی نہ ہوتے تو اللہ نے ان پر اس نافرمانی اور عہد شکنی کی پاداش میں ایک سخت عذاب بھیجا جس سے وہ لوگ محفوظ رہے جو لوگوں کو برائی سے روکتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس طرح کی اجتماعی نافرمانیوں کے نتیجے میں جب اللہ کا فیصلہ کن عذاب آتا ہے تو اس کی پکڑ سے صرف وہی لوگ محفوظ رہتے ہیں جو برائی سے روکنے والے ہوتے ہیں۔

سرکشی و نافرمانی کا عبرتناک انجام

۲۱۶- پھر جب وہ اس بات میں حد سے زیادہ سرکش ہو گئے جس سے انہیں روکا گیا تھا۔ تو ہم نے کہا بندر ہو جاؤ ذلت و خواری سے ٹھکرائے ہوتے۔

شاید پہلے کچھ عذاب اور آیا ہو گا جب بالکل حد سے گزر گئے تب ذلیل بندر بنا دیے گئے یا فلما عتوا کو گزشتہ آیت فلما نسوا ما ذکروا بہ کی تفسیر قرار دیا۔ یعنی وہ عذاب بئیس بھی بندر بنا دینا تھا۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ منع کرنے والوں نے شکار والوں سے ملنا چھوڑ دیا اور بیچ میں دیوار اٹھائی ایک دن صبح کو اٹھے تو دوسروں کی آواز نہ سنی۔ دیوار پر سے دیکھا ہر گھر میں بندر تھے۔ وہ آدمیوں کو پہچان کر اپنے قرابت والوں کے پاؤں پر سر رکھنے لگے اور رونے لگے۔

آخر یہ بے حال تین دن میں مر گئے۔[1]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بستی پر خدا کا عذاب دو قسطوں میں نازل ہوا تھا۔ پہلی قسط وہ جسے عذاب بئیس کہا گیا ہے، دوسری قسط وہ جس میں نافرمانی اصرار کی پاداش میں ان کو بندر بنا دیا گیا۔ مسلسل نافرمانی پر ان مجرموں کو یہ سزا یقیناً ملی باقی کیسے ملی؟ جمہور شارحین قرآن کا خیال بھی ہے کہ یہ سزا اسی طرح ملی جیسی ظاہر قرآن کے الفاظ سے ظاہر ہو رہی ہے یعنی وہ انسان بندر بنے اور پھر تین دن کے بعد ہلاک ہو گئے۔ اس تفسیر پر عقلاً کوئی اعتراض نہیں ہوتا جو لوگ اللہ کے قانون تشریعی کو توڑنے میں اتنے جری و بے باک ہوں ان کے حق میں خالق کائنات اپنے قانون تکوینی کو کسی حد تک اگر بدل دے اور بجائے ارتقاء کے اگر کبھی ارتقاء معکوس ہو جائے تو اس میں عدم امکان تو بہت دور کی بات ہے استبعاد بھی نہیں ہے لیکن تفسیری روایات خود اس نتیجہ پر متفق نہیں ہیں بلکہ یہ بات بھی قدیم شارحین قرآن نقل کرتے ہیں کہ مسخ صرف معنوی ہوا تھا حقیقی اور صوری نہ تھا یعنی ان کے اخلاق و عادات بندروں کی طرح کر دیے گئے تھے اور بندر کا اطلاق ان پر مجازاً ہوا ورنہ وہ واقع میں بندروں کے جسم و قالب میں تبدیل نہ ہوئے تھے۔ امام مجاہد سے اسی قسم کی تشریح حافظ ابن جریر نے نقل کی ہے۔ امام راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں بھی اسی قسم کی بات لکھی ہے لیکن جمہور مفسرین کا خیال یہ ہے کہ یہ تشریح غریب اور ظاہر سیاق قرآنی کے خلاف ہے۔ ابن کثیر فرماتے ہیں یہ بات غریب اور اس موقعہ پر ظاہر قرآن کے خلاف ہے۔ اور علامہ آلوسی لکھتے ہیں ظاہر قرآن یہی ہے کہ مسخ واقعی ہوا تھا۔ یہی شارحین قرآن کی رائے عامہ ہے۔ سزا کی تفصیلی نوعیت کچھ بھی ہو بہر حال بھی وہ کوئی بہت سخت اور عبرتناک سزا۔ قرآن حکیم کا مقصد اس سزا کی تفصیل پیش کرنا نہیں بلکہ اس کی عبرت انگیزی اور موعظت آموزی کے پہلو کو واضح کرنا ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ
الْعَذَابِ ؕ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ ۖۚ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۶۷﴾
وَقَطَّعْنٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اُمَمًا ۚ مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ
ذٰلِكَ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۶۸﴾
فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ
هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ وَاِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ
مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ ؕ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا
عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ ؕ وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ
لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ
وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ ﴿۱۷۰﴾ وَاِذْ نَتَقْنَا
الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ
بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۱﴾ ع

اور دیکھو جب کہ تمہارے رب نے اعلان کر دیا کہ وہ قیامت تک ایسے لوگ بنی اسرائیل پر مسلط کرتا رہے گا جو ان کو بدترین عذاب دیں گے[۲۱۷] یقیناً تمہارا رب سزا دینے میں تیز ہے اور یقیناً وہ بخش دینے والا اور رحم کار ہے[۲۱۸]۔ ہم نے ان کو زمین پر ٹکڑے ٹکڑے کر کے بہت سی قوموں میں تقسیم کر دیا[۲۱۹]۔ کچھ لوگ ان میں نیک تھے اور کچھ اس سے مختلف، اور ہم ان کو اچھے بُرے حالات سے آزمائش میں مبتلا کرتے رہے کہ شاید یہ پلٹ جائیں[۲۲۰]۔ پھر اگلی نسلوں کے بعد ایسے ناہنجار لوگ ان کے جانشین ہوتے جو کتاب الٰہی کے وارث ہو کر اسی دُنیائے کمترین کے فوائد سمیٹتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ توقع ہے ہمیں معاف کر دیا جائے اور اگر وہی متاعِ دُنیا پھر سامنے آتا ہے تو پھر لپک کر اسے لے لیتے ہیں[۲۲۱]۔ کیا ان سے کتاب کا عہد نہیں لیا جا چکا ہے کہ اللہ کے نام پر وہی بات کہیں جو

حق ہو اور یہ خود پڑھ چکے ہیں جو کتاب میں لکھا ہے، آخرت والا
گھرانہ اہلِ تقویٰ کے لیے بہتر ہے کیا تمہاری سمجھ میں اتنی بات
بھی نہیں آتی ہے[۲۲۲]۔ اور جو لوگ کتابِ الٰہی کو تھامے رکھتے ہیں اور
نماز قائم کرتے ہیں یقیناً ہم ایسے اصلاح کرنے والوں کا اجر ضائع
نہیں کریں گے[۲۲۳]۔ اور ان کو وہ وقت بھی یاد دلاؤ جب کہ ہم نے
پہاڑ کو ان پر اس طرح ہلایا تھا کہ گویا وہ ایک سائبان ہے اور ان
کو اس کے اپنے اوپر گرنے کا گمان ہو رہا تھا، اس وقت ہم نے ان
سے کہا تھا کہ جو کتاب ہم تمہیں دے رہے ہیں اسے مضبوطی سے لے
لو اور جو کچھ اس میں لکھا ہے اسے یاد رکھو، توقع ہے کہ تم غلط روی
سے بچے رہو گے[۲۲۴]۔

معانی مفردات

درسوا :- یہ لفظ درس سے بنا ہے درس کے معنے پڑھنے پڑھانے کے ہیں۔ اسی کا دوسرا مصدر دراستہ آتا ہے ۔ یمسکون : اصل مادہ مسک ہے۔ اسی سے امساک اور استمساک اور تمسیک آتا ہے اور یہاں تمسیک آیا ہے۔ تمسک اور تمسیک دونوں کے ایک معنی ہیں یعنی کسی چیز کو مضبوطی

سے تھامنا ہے۔ نتقنا:۔ نتق سے ہے اس کے معنے ہلانے کے ہیں۔ مشکیزہ میں گھی ہو تو اسے ہلایا جاتا ہے تاکہ گھی نکل آئے اس وقت بولتے ہیں نتق السقاء اسی سے علماء نے اس کے معنے زلزلہ کے کیے ہیں۔ اور چونکہ قرآن میں دوسرے موقعہ پر اسی واقعہ میں نتقنا کی جگہ رفعنا آیا ہے۔ اس لیے کچھ علماء نے اس کے معنے اٹھانے کے کیے ہیں۔ ظلۃ لغت میں اس کے معنے سایہ کرنے والی چیز کے ہیں چاہے وہ گھر کی چھت ہو یا چھتری ہو یا سائبان ہو۔

اُمتوں اور قوموں کے بارے میں قانون

ان آیات میں اس قانونِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے کہ جب کوئی جماعت بدعملی و فساد میں مبتلا ہوتی ہے تو اس کا مہلک نتیجہ فوراً ظاہر نہیں ہو جاتا بلکہ تدریج و امہال کی وجہ سے یکے بعد دیگرے مہلتیں ملتی رہتی ہیں کہ اصلاحِ حال پر آمادہ ہو جائے۔ یہاں بتایا ہے کہ ہم نے ان کو الگ الگ گروہ بنا کر زمین میں متفرق کر دیا۔ یعنی بنی اسرائیل کی قومی وحدت باقی نہیں رہی۔ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں منتشر ہو گئے۔ یہ تباہی کی ابتداء تھی۔ تاہم ابھی نیک جماعتیں بالکل معدوم نہیں ہو گئی تھیں لیکن اس دور کے بعد جو نسلیں پیدا ہوئیں وہ عمل و حقیقت سے یکسر محروم ہو گئیں۔ چنانچہ علماءِ یہود کا یہ حال ہو گیا ہے کہ دُنیا کے حقیر فوائد کے لیے دین فروشی کرتے۔ ناجائز باتوں کو جائز بنا لیتے اور سمجھتے کہ ہمارے لیے کوئی کھٹکا نہیں ہے خدا ہمیں بخش دے گا۔ جب کسی قوم میں عمل اور حقیقت کی روح باقی نہیں رہتی تو معاصی کے ارتکاب میں وہ چھوٹ اور بے لگام ہو جاتی ہے اور عمل کی جگہ محض خوش اعتقادی کے خود ساختہ سہاروں پر اعتماد کرنے لگتی ہے۔ چنانچہ یہی حال یہودیوں کا ہوا جو سمجھتے تھے کہ ہم خدا کی پسندیدہ اُمت ہیں۔ آتشِ دوزخ ہم پر حرام کر دی گئی ہے اور یہی حال اب مسلمانوں کا ہو گیا ہے جو سمجھتے ہیں کہ ہم اُمتِ مرحومہ ہیں۔ آتشِ دوزخ ہم پر حرام کر دی گئی ہے اگر کچھ مواخذہ ہو گا بھی تو کسی پیر کی مریدی یا کسی وظیفہ کا ورد یا کسی خاص نفل نماز کی مداومت یا مجالس میلاد کا انعقاد اور عرسوں کی شرکت بخشش و نجات کے لیے کافی ہے [1]

۲۱۷۔ اور دیکھو تمہارے رب نے اعلان کر دیا کہ وہ قیامت تک ایسے لوگ بنی اسرائیل پر مسلط

---

[1] ترجمان القرآن

کرتا رہے گا جو ان کو بدترین عذاب دیں گے۔ یعنی خدا کی طرف سے پختہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ یہود اگر احکام تورات پر عمل کرنا چھوڑ دیں گے تو حق تعالیٰ قرب قیامت تک وقتاً فوقتاً ان پر ایسے لوگوں کو مسلط کرتا رہے گا جو ان کو بُرے عذاب میں مبتلا رکھیں۔ بُرا عذاب یہاں محکومانہ زندگی کو فرمایا چنانچہ قوم یہود کبھی یونانی اور کلدانی بادشاہوں کے زیرِ حکومت رہی۔ کبھی "بخت نصر" وغیرہ کے تشدد کا تختۂ مشق بنی۔ آخر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک تک مجوسیوں کی باجگزار رہی۔ پھر مسلمان حکمرانوں کو ان پر مسلط کر دیا۔ غرض اس وقت سے آج تک ان کو من حیث القوم عزت و آزادی کی زندگی نصیب ہوئی نہیں بلکہ جہاں کہیں رہے اکثر ملوک و حکام کی طرف سے سخت ذلت اور خطرناک تکلیفیں اٹھاتے رہے۔ ان کا مال و دولت وغیرہ کوئی چیز اس غلامی و محکومی کی لعنت سے نجات نہ دے سکی اور نہ قیامت تک دے سکے گی۔ آخر میں جب یہ لوگ دجال کے مددگار ہو کر تکلیفیں دیں گے تو حضرت مسیح علیہ السلام کے مسلمان رفقاء کے ہاتھوں سے تہ تیغ کیے جائیں گے۔ کما ورد فی الحدیث [1]

اس آیت سے معلوم ہوا کہ کسی قوم پر ظالم و مستبد حکمرانوں کا مسلط رہنا بھی اللہ سبحانہ کا ایک عذاب ہے جو پاداشِ عمل میں ظاہر ہوتا ہے۔

اصل میں لفظ تاَذَّنَ آیا ہے اس کا صحیح مفہوم کسی فیصلہ سے آگاہ کرنا ہے۔ اس نے سنا دیا اس نے پکار دیا، اس نے اعلان کر دیا، اس نے بتلا دیا، اس نے خبردار کر دیا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے بنی اسرائیل کی اس قسم کی نافرمانیوں اور بدعہدیوں کی بنا پر ان کے نبیوں کے ذریعہ سے آگاہ کر دیا تھا کہ وہ ان پر ایسے لوگوں کو قیامت تک مسلط کرتا رہے گا جو ان کو نہایت سخت عذابوں میں مبتلا کرتے رہیں گے۔ اس طرح کی تنبیہہ حضرت موسیٰ نے بار بار فرمائی اور بعد کے نبیوں نے بھی نہایت آشکارا لفظوں میں اس سے آگاہ کیا۔ احبار میں ہے۔ اگر تم میرے سننے والے نہ ہو اور ان سب حکموں پر عمل نہ کرو .... اور مجھ سے عہد شکنی کرو تو میں بھی تم سے ایسا ہی کروں گا.... اور میرا چہرہ تمہارے برخلاف ہوگا اور تم دشمنوں کے سامنے قتل کیے جاؤ گے اور جو تمہارا کینہ رکھتے ہیں تم پر حکومت کریں گے (احبار باب ۲۶ آیت ۱۴، ۱۷)

اسی طرح کتاب استثناء میں ہے تیرے بیٹے اور عزیز بیٹیاں دوسری قوم کو دی جائیں گی اور تیری

---

[1] افادات شیخ الاسلام

آنکھیں دیکھیں گی اور سارے دن ان کی راہ تکتے تکتے تھک جائیں گی اور تیرے ہاتھ میں کچھ زور نہ ہو گا (استثنا باب ۲۸)

یہی تنبیہہ حضرت یسعیا اور یرمیاہ نے کی پھر یہی تنبیہہ حضرت مسیح علیہ السلام نے انہیں کی، جیسا کہ اناجیل میں ان کی متعدد تقریروں سے ظاہر ہے۔ آخر میں قرآن نے اس کی توثیق کی۔ اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ کی عملی تصدیق تاریخ کے صفحات میں مرقوم ہے۔ اس کے لیے بنوخذ نصر اور رٹیلس سے لے کر جرمنی کے ہٹلر تک کی تاریخ پڑھ جائیے۔ ہر دور میں آپ کو اس قوم کی ذلت و بربادی کی نہایت لرزہ خیز داستان ملے گی۔ یہ بات خیال میں رہے کہ کبھی کبھار مہلت کا کوئی وقفہ مل جانے سے اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ کی نفی نہیں ہوتی۔ قرآن کا اندازِ بیان خود گواہ ہے کہ ان کو اس قسم کے وقفے ملتے رہیں گے لیکن ہر وقفہ ان کے لیے ایک تازہ مصیبت کا پیش خیمہ ہو گا۔ آج سرزمین قدس میں ان کا جو اجتماع ہو رہا ہے یہ بھی ایک نئی طوفان کی دعوت ہے جس کے بعد ان کی پوری اجتماعی قوت کا شیرازہ انشاء اللہ بکھر جائے گا۔ سورہ بنی اسرائیل میں ان کی دو بربادیوں کا ذکر ہے لتفسدن فی الارض مرتین و لتعلن علوا کبیرا"۔ پہلی بربادی بابل کے بادشاہ بخت نصر کے حملہ سے ہوئی اور دوسری رومیوں کے حملہ سے ہوئی۔ بابل کے حملے نے صرف یہود کی آبادیوں ہی کو پامال نہیں کیا تھا بلکہ بنی اسرائیل کی نسل و قومیت بھی ہلاک و منتشر ہو گئی تھی۔ لیکن ایک صدی کے بعد حالات نے پھر پلٹا کھایا اور اللہ سبحانہٗ نے وقت کی سب سے بڑی فاتح قوت کو ان کی مدد کے لیے تیار کر دیا مگر وہ پھر بھی ٹھیک نہ ہوئے اس کے بعد دوسری ہلاکت کا وقت آیا۔ رومیوں نے حملہ کیا۔ یہ بنی اسرائیل کی آخری بربادی تھی، اس کے بعد پھر سنبھل نہ سکے اور قرآن کا یہ اعلان کی ایک حقیقت بن گیا۔

ضربت علیھم الذلۃ اینما ثقفوا الا بحبل من اللہ وحبل من الناس۔
ان پر ذلت کی مار پڑی جہاں کہیں بھی یہ پائے گئے ہاں یہ کہ خدا کے عہد سے یا انسانوں کے عہد سے کہیں پناہ مل گئی۔

اللہ کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں

۲۱۸- یقیناً تمہارا رب سزا دینے میں تیز ہے اور یقیناً وہ بخش دینے والا اور رحم کار ہے۔ یعنی جو شرارت سے باز نہ آتے بعض اوقات اس پر جلدی ہی دنیا میں عذاب بھیجنا شروع کر دیتا

ہے اور کیسا ہی کٹر مجرم توبہ کرے اور نادم ہو کر خدا کی طرف رجوع کرے تو اس کی بخشش و رحمت بھی بے پایاں ہے۔ معاف کرتے ہوتے بھی دیر نہیں لگتی ہے[1] قوموں کی زندگی و موت کے لیے اللہ سبحانہ کا کیا قانون و ضابطہ ہے۔ اسی کو یہاں اللہ سبحانہ کی صفات سریع العقاب اور غفور رحیم کے الفاظ میں پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ کوئی خدا کو اس دنیا کے معاملات سے بے تعلق یا الگ تھلگ نہ خیال کرے جو لوگ اس کی راہ سے بے راہ ہوتے ہیں ان کو وہ سزا بھی بڑی ہی سخت دیتا ہے اور جو اس کی طرف رجوع کرتے ہیں ان کے لیے وہ بڑا بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے عقاب کے ساتھ سریع کی صفت ان لوگوں کی بلادت پر ضرب لگانے کے لیے ہے جو خدا کی دیر کو اندھیر سمجھ بیٹھتے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ کوئی اس کی بخشش ہوتی مہلت سے غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو۔ وہ جب پکڑتا ہے آناً فاناً پکڑتا ہے اور جن کو پکڑتا ہے وہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ صبح کی شام بھی ہونے نہیں پائی کہ دھر لیے گئے۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ ان اُمتوں اور قوموں کے لیے جو اس کی نافرمانی پر کمر کس لیتی ہیں اور زمین کو اپنے مفسدانہ اعمال کا گہوارہ بنا لیتے ہیں اپنے عذاب میں دیر نہیں کرتا جیسا کہ افراد کے بارے کبھی کبھار دیر کر دیتا ہے۔ بلکہ امتیں اپنے اعمال کے نتائج سے ضرور ہمدوش ہوتی ہیں اور جو برائی ان کو پیش آتی ہے خود ان کے اعمال کی پیداوار ہے۔ اس میں کبھی تخلف نہیں ہوتا۔ سریع العقاب کا یہی مطلب ہے لیکن اگر نافرمانیوں کے بعد کوئی اُمت توبہ کرتی ہے اور اصلاح حال کر لیتی ہے تو اللہ سبحانہ کی ذات غفور رحیم ہے۔

بنی اسرائیل میں ذلت کا نقطہ آغاز

۲۱۹۔ ہم نے ان کو زمین میں ٹکڑے ٹکڑے کر کے بہت سی قوموں میں تقسیم کر دیا یعنی یہود کی دولت برہم ہوئی تو آپس کی مخالفت سے ہر طرف نکل گئے۔ کوئی اجتماعی قوت و شوکت نہ رہی اور مذاہب مختلف پیدا ہو گئے۔ یہ احوال اس اُمت کو عبرت کے لیے سناتے گئے ہے[2] مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل کی ذلت اور بربادی کا نقطہ آغاز اس طرح ہوا کہ ان کی قومی وحدت باقی نہ رہی چھوٹے چھوٹے گروہوں میں منتشر ہو گئے۔ یہ تباہی کی ابتدا تھی۔ یہاں جو بات اہل ایمان

لعلّہ افادات شیخ الاسلام

سے اشارے میں کہی گئی ہے۔ دوسرے موقعہ پر یہی بات صراحۃً فرمائی گئی ہے۔

ولا تکونوا کالذین تفرقوا واختلفوا من بعد ما جاءھم البینات اولٰئک لھم عذاب عظیم۔

اور دیکھو ان لوگوں کی طرح نہ ہونا جو فرقہ فرقہ ہو گئے اور کتاب اللہ کی واضح دلیلوں کے باوجود اختلاف کر بیٹھے یہی لوگ ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے۔

اہل کتاب کی سب سے بڑی گمراہی یہ تھی کہ دین حق کے علم اور کتاب اللہ کے حصول کے بعد باہمی اختلافات میں پڑ گئے اور دین کی وحدت ضائع کر کے الگ الگ ٹولیاں بنا لیں۔ مسلمانوں سے کھول کر کہا جا رہا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ تم بھی اسی گمراہی میں مبتلا ہو جاؤ۔ اور ایک دین پر جمع رہنے کی جگہ الگ الگ فرقوں میں بٹ جاؤ۔ منشا یہ ہے کہ تفرق و اختلاف نے پچھلی اُمتوں کو تباہ کر دیا ان سے عبرت حاصل کرو اور اپنے میں یہ مرض پیدا نہ ہونے دو۔ یاد رکھو افتراق و اختلاف ہی سے تنزل و ادبار کا آغاز ہوتا ہے۔ ماضی میں ایسا ہو چکا ہے کہ اجتماعیت سے جدا ہو کر سب کچھ رکھنے کے باوجود سب کچھ کھو بیٹھے۔ اقبال کی جگہ ادبار، عروج کی جگہ تسفل، ترقی کی جگہ تنزل، عزت کی جگہ ذلت، حکومت کی جگہ محکومی اور بالآخر زندگی کی جگہ موت ان پر چھا گئی۔

آزمائشوں کے تنوع کی غرض و غایت

۲۲۰- کچھ لوگ ان میں نیک تھے اور کچھ اس سے مختلف اور ہم نے ان کو اچھے بُرے حالات سے آزمائش میں مبتلا کرتے رہے کہ شاید پلٹ جائیں۔ یعنی کچھ افراد ان میں نیک بھی تھے لیکن اکثریت کافروں اور فاسقوں کی تھی۔ ان اکثروں کے لیے بھی ہم رجوع و انابت الی اللہ کے مواقع بہم پہنچاتے رہے۔ کبھی ان کو عیش و تنعم میں رکھا کبھی سختی اور تکلیف میں مبتلا کیا کہ ممکن ہے کہ احسان مان کر یا سختیوں سے ڈر کر توبہ کریں اور خدا کی طرف رجوع کریں[1]

اگرچہ اس آیت سے یہ بات واضح ہے کہ ایمان کی راہ میں قدم رکھنے والوں کو صرف آزمائش سے نہیں بلکہ آزمائشوں سے گزرنا لازمی ہے اور ایک نظری انسان کو تو اتنی روشنی بس کرتی ہے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

لیکن ایک عملی انسان کو ایسے انسان کو جو اس حقیقت کا علم صرف برائے علم نہ حاصل کرنا چاہتا ہو بلکہ عمل چاہتا ہو اس سے زیادہ تیز روشنی کی ضرورت ہے وہ چونکہ دور کا تماشائی نہیں بلکہ بذات خود اس راہ کا راہرو ہے اس لیے وہ اس کے ایک ایک نشیب و فراز کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا چاہے گا وہ بس اتنا جان کر خاموش اور بے فکر نہ ہو سکے گا۔ یہاں صراط مستقیم ابتلاؤں سے گھری ہوئی ہے بلکہ اسے تجسس ہوگا کہ یہ ابتلاءات کس طرح کی ہوں تاکہ ان کے لیے وہ پہلے سے اپنے دل و دماغ کو تیار اور ان کا سامنا ہو جانے پر انتشار فکر و عمل کا شکار نہ ہو جائے اس لیے ہم ان بلاؤں کا ذرا تفصیلی جائزہ لیں گے اور یہ معلوم کریں گے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون کن کن شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے اور کن کن طریقوں سے علمبرداران حق کو آزمایا جاتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اس کے بغیر زندگی کی آسائشوں اور سختیوں کا نظری طور پر بھی صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔

قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی پوری زندگی ہی ابتلاء و امتحان کی زندگی ہے۔ انسان کا نام لے کر قرآن میں یہ قانون بتایا ہے۔

فاما الانسان اذا ما ابتلاہ ربہ فاکرمہ و نعمہ فیقول ربی اکرمن۔ واما اذا ما ابتلاہ فقدر علیہ رزقہ فیقول ربی اھانن۔

انسان کو جب اللہ عزت و نعمت کی بارش کے ذریعے جانچتا ہے تو انسان کہتا ہے کہ میرے مالک نے میری عزت بڑھائی اور جب اللہ انسان کو نپی تلی روزی دے کر جانچتا ہے تو کہتا ہے کہ اللہ نے مجھے ذلیل و خوار کر دیا۔

قرآن کی اس قسم کی متعدد آیات ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ زندگی کا کوئی خاص پہلو کوئی خاص رخ ہی نہیں بلکہ پوری زندگی ہی امتحان و ابتلا کی زندگی ہے اور یہ کیا ہے تمام آفاقی کائنات کے مقابلے میں بشری فطرت میں خواہ وہ کسی رنگ میں ہو۔ دو راہوں میں سے ایک راہ یا دو پہلوؤں میں سے ایک پہلو کے انتخاب و اختیار کرنے کی جو خصوصیت رکھی گئی ہے درحقیقت فطرت کے اسی اقتضا کے صحیح استعمال کے مطالبہ کی دوسری تعبیر یہ ہے کہ انسان کی پوری زندگی ابتلا و امتحان کی زندگی ہے۔ اور خدا کے امتحان لینے کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ جن باتوں کو خدا نہیں جانتا ان کو جاننا چاہتا ہے بلکہ انسانی فطرت میں اقتدار و اختیار، انتخاب و ترجیح کی جو قوت رکھی گئی ہے اسی قوت کے صحیح مطالبہ کا نام ابتلا و امتحان ہے۔

یہاں قرآن نے دو قسم کے ابتلاؤں کا ذکر کیا ہے۔ ایک حسنات کے ذریعے دوسرے سیئات کے

ذریعے۔ حسنات کے معنے خوشحالیاں یعنی زندگی کے ہر پہلو میں خوشحالی مثلاً قوم معزز ہو، دولت مند ہو، صحیح اور تندرست ہو اور سیئات کے معنے جماعتی بدحالیاں یعنی زندگی کے ہر پہلو میں بدحالی ہو۔ مثلاً قوم محکوم ماتحت ہو ذلیل وضعیف ہو مفلس و تنگ دست ہو۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ فرقہ فرقہ بن جانے کے بعد ان میں دو قسم کے لوگ پیدا ہو گئے تھے ایک صالحین جیسے وہ لوگ جنہوں نے سبت کے دن حیلہ سازوں کو حیلہ سازی اور خدا کی نافرمانی سے منع کیا اور وہ لوگ جو حضرت موسیٰ کے بعد زمانہ عیسیٰ تک تمام نبیوں پر ایمان رکھتے تھے اور وہ لوگ جو حضرت محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے اور کچھ لوگ ان صالحین سے کمتر تھے یعنی جن میں صلاحیت کا وصف نہ تھا کچھ کفر وفسق میں چھوٹ اور بے لگام تھے جیسے وہ جو انبیاء کے قاتل تھے۔ کچھ بے ایمان، جھوٹے اور حرام خور تھے۔ ان سب کے بارے قرآن نے بتایا ہے کہ ہم نے ان کو اس امید پر کہ شاید یہ اللہ کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے کے لیے کمربستہ ہو جائیں۔ خوشحالیاں اور بدحالیاں دے کر آزمایا، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت کے مطابق ان کو اچھے اور برے ہر طرح کے حالات سے آزمایا تاکہ وہ اپنے رب کی طرف رجوع کریں۔ لیکن ان کی خواہشیں اس طرح ان پر غالب آگئی تھیں کہ ان کے آگے ان کی قوتِ ارادی بالکل مفلوج ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ یہ احساس رکھتے ہوئے بھی کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں غلط ہے وہی کام کیے جاتے اور اپنے ضمیر کو یہ دھوکا دیتے کہ ہم خدا کے لاڈلوں اور محبوبوں کی اولاد ہیں خدا ہمیں معاف ہی کر دے گا۔

بنی اسرائیل کا تدریجی زوال

۱۶۹- پھر اگلی نسلوں کے بعد ایسے ناہنجار لوگ ان کے جانشین ہوتے جو کتابِ الٰہی کے وارث ہو کر اسی دنیائے کمترین کے فوائد سمیٹتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ توقع ہے ہمیں معاف کر دیا جائے گا اور اگر وہی سامانِ دنیا پھر سامنے آتا ہے تو پھر لپک کر اسے لے لیتے ہیں۔ یعنی اگلوں میں تو کچھ صالحین بھی تھے۔ پچھلے ایسے ناخلف ہوئے کہ جس کتاب تورات شریف کے وارث و حامل بنے تھے۔ دنیا کا تھوڑا سا سامان لے کر اس کی آیات میں تحریف و کتمان کرنے لگے اور رشوتیں لے کر احکامِ تورات کے خلاف فیصلے دینے لگے۔ پھر اس پر ستم ظریفی یہ دیکھئے کہ ایسی نالائق اور باچھانہ حرکات کا ارتکاب کرتے ہوئے یہ عقیدہ اور دعویٰ رکھتے ہیں کہ ان باتوں سے ہم کو مضرت کا کوئی اندیشہ نہیں۔ ہم تو خدا کی اولاد اور اس کے محبوب ہیں۔ کچھ بھی کریں وہ ہماری بے اعتدالیوں سے ضرور درگزر کرے گا۔ اسی

عقیدے کی بنا پر تیار رہتے ہیں کہ آئندہ جب موقع ہو پھر رشوت لے کر اسی طرح کی بے ایمانی کا اعادہ کریں گے۔ گویا بجائے اس کے کہ گزشتہ حرکات پر نادم ہوتے اور آئندہ کے لیے عزم رکھتے کہ ایسی حرکات کا اعادہ نہ کریں گے مگر اللہ سے نڈر ہو کر ان ہی شرارتوں اور بے ایمانیوں کے اعادے کا عزم رکھتے ہیں اس سے زیادہ حماقت اور بے وقوفی اور کیا ہوگی ؟ [1]

مطلب یہ ہے کہ گناہ کرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ یہ گناہ ہے مگر اس بھروسہ پر اس کا ارتکاب کرتے ہیں کہ ہماری تو کسی نہ کسی طرح بخشش ہو ہی جائے گی کیونکہ ہم خدا کے چہیتے ہیں اور ہم خواہ کچھ ہی کریں بہر حال ہماری مغفرت تو ضروری ہے۔ اسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے کہ گناہ کرنے کے بعد وہ نہ شرمندہ ہوتے ہیں نہ توبہ کرتے ہیں بلکہ جب پھر ویسے ہی گناہ کا موقعہ سامنے آتا ہے تو پھر اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ بدنصیب اس کتاب کے وارث ہوئے جو ان کو دنیا میں امام بنانے والی تھی مگر ان کی کم ظرفی اور پست خیالی نے اس نسخۂ کیمیا کو لے کر دنیا کی متاعِ حقیر کمانے سے زیادہ بلند کسی چیز کا حوصلہ نہ کیا اور بجائے اس کے کہ دنیا میں عدل و راستی کے علمبردار اور خیر و صلاح کے رہنما بنتے محض دنیا کے کتے بن کر رہ گئے ؟ [2]

گویا اس ارشاد گرامی میں یہود کے تدریجی زوال کی نشاندہی فرمائی ہے کہ روز بروز ان کی اخلاقی زندگی بد سے بدتر ہوتی گئی حتیٰ کہ ایسے برے لوگ کتاب الٰہی کے وارث ہوگئے جو ایک طرف کتاب کی وراثت کا دعویٰ رکھتے تھے اور دوسری طرف پست ہمتی اور دنائت کا یہ حال کہ جو لقمہ حرام بھی ملتا نظر آتا اس کو چھوڑنے کا حوصلہ نہ رکھتے تھے۔ کتاب الٰہی کے نام لیوا ہونے کی وجہ سے اگر دل میں کوئی خلش پیدا ہوتی تو ان جھوٹے دلولوں سے اپنا دل بہلا لیتے کہ ہم برگزیدہ امت ہیں۔ ابراہیم، اسحاق اور یعقوب جیسے انبیاء کی اولاد ہیں۔ دوزخ کی آگ ہم پر حرام ہے اپنے محبوب بندوں کے صدقے اللہ ہمیں معاف کر دے گا۔ اس طرح انھوں نے اپنے ایمان کو ایسا زنگ آلود بنا دیا تھا کہ ایک بار حرام خوری کے بعد دوسری بار حرام کا موقعہ پیش آتا تو اس سے بھی نہ چوکتے۔

علامہ آلوسی بغدادی نے اسی آئینے میں اس امت کا بھی چہرہ دیکھ لیا۔ انھوں نے مسلمانوں کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ اس قابل ہے کہ عبرت کے لیے پڑھا جائے۔

" یہی حال ہمارے زمانے کے بکثرت صوفیا کا ہے۔ شہوات و لذات دنیویہ پر

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

پروانوں کی طرح گرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کو نقصان نہیں دیتا کیونکہ ہم خدا رسیدہ ہیں اور
کچھ کی بات یہ بھی سنا گیا ہے کہ وہ خالص حرام کھاتا تھا اور کہتا تھا کہ نفی و اثبات کا ذکر اس
کے نقصان کی تلافی کر دیتا ہے ۔
لاحول ولا قوۃ الا باللہ

نجات کا غیر مشروط پروانہ کسی کے لیے نہیں

۲۲۲- کیا ان سے کتاب کا عہد نہیں لیا جا چکا ہے کہ اللہ کے نام پر وہی کچھ کہیں جو حق ہو اور یہ خود پڑھ چکے ہیں جو کتاب میں لکھا ہوا ہے۔ آخرت والا گھر اہل تقویٰ کے لیے ہے کیا تمہاری سمجھ میں اتنی بات بھی نہیں آتی ہے۔ یعنی تورات میں جو عہد لیا گیا تھا کہ خدا کی طرف سچ کے سوا کسی چیز کی نسبت نہ کریں۔ کیا وہ انہیں معلوم نہیں جو اس کی کتاب اور احکام میں قطع و برید کر کے اس پر افترا کرنے لگے۔ حالانکہ کتاب اللہ تورات کو یہ لوگ پڑھتے پڑھاتے ہیں۔ پھر کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اس کا مضمون انہیں معلوم نہیں یا یاد نہیں رہا۔ حقیقت وہی ہے کہ دُنیا کی فانی متاع کے بدلے انہوں نے دین و ایمان بیچ ڈالا اور آخرت کی تکلیف و راحت سے آنکھیں بند کر لیں۔ اتنا نہ سمجھے کہ جو لوگ خدا سے ڈرتے اور تقویٰ کی راہ اختیار کرتے ہیں ان کے لیے آخرت کا گھر اور وہاں کا عیش و تنعم دُنیا کی خوشحالی سے کہیں بہتر اور فائق ہے۔ کاش کہ اب بھی انہیں عقل آ جائے۔[1]
مطلب یہ ہے کہ ان کو اس بات کا خوب علم ہے کہ حضرت موسیٰ کی لائی ہوئی کتاب کہیں بھی نجات کے غیر مشروط پروانے کا ذکر نہیں ہے نہ اللہ سبحانہ نے ان سے کبھی یہ بات فرمائی ہے اور نہ ہی اسرائیلی انبیاء نے کہیں اس کی نشاندہی کی ہے کہ تم جو چاہو کرو بہرحال تمہیں مغفرت کا پروانہ مل جائے گا۔ پھر ان کو کیا حق ہے کہ خدا کی طرف وہ بات منسوب کریں جو خدا نے خود نہیں فرمائی حالانکہ ان سے اللہ نے یہ عہد لیا تھا کہ خدا کے نام سے کبھی کوئی بات حق کے خلاف نہ کہیں گے۔ یہ بات کہ کتاب الٰہی میں ان سے اللہ کے نام پر خلافِ حق نہ کہنے کا عہد لیا گیا ہے۔ موجودہ تورات میں ساری تحریفات اور ناجائز تصرفات کے باوجود بار بار ذکر ہوا ہے اس کے چند حوالے ملاحظہ ہوں
"تو ہر ایک بات پر جس کا حکم میں تمہیں دیتا ہوں دھیان رکھ کے عمل کیجیو تو اس سے زیادہ نہ کرنا

[1] افادات شیخ الاسلام

اور نہ اس سے کم کرنا۔ (استثنا ۱۴، ۳۲) ایک اور مقام پر ہے " تم اس کلام میں جس کا حکم میں تمہیں دیتا ہوں کچھ زیادہ نہ کیجیو اور نہ اس میں کم کیجیو (استثنا ۴-۲) ایک اور جگہ ہے " فقط تو مضبوط ہو اور خوب دلاوری کرتا تاکہ تو اس شریعت کے موافق جس کا میرے بندے موسیٰ نے تجھ کو حکم کیا کہ دھیان کر کے عمل کرے اس سے داہنے یا بائیں ہاتھ کو نہ پھیر تاکہ تو ہر جگہ جہاں تو جاتا ہے کامیاب ہو (یشوع ۱-۷) مقصد یہ ہے کہ اگر کتاب الٰہی کی یہ چیختی ہوئی صدا موجود ہے اور تم اس کے درس و تدریس کا مشغلہ کرتے رہتے ہو تو پھر تم نے حرام خوری اور حرام کاری کی راہ کہاں سے اور کیسے نکالی ہے اس کے حق میں قانون کی سند کہاں سے حاصل کی ہے۔

یہاں ہمارے پنجاب کے مشہور عالم اور شیخ طریقت پیر محمد کرم شاہ ایم اے بہت مفید اور کام کی نصیحت مسلمانوں کو کر گئے، فرماتے ہیں:

یہ آیت جہاں یہود کے اس طریق کار اور اخلاقی پستی کی مذمت کر رہی ہے وہاں مسلمان مشائخ اور علماء کے لیے بھی اس میں درس عبرت ہے۔ وہ چیز جو علماء اور مشائخ بنی اسرائیل کے لیے شرمناک تھی کیا وہ اللہ تعالیٰ کے محبوب ترین اور کامل ترین بندے اور سید الانبیاء والمرسلین کی امت جسے خیر الامم کے لقب سے نوازا گیا ہے کے علماء و مشائخ کے لیے قابل برداشت ہو سکتی ہے۔ اگر آخری نبی کی آخری شریعت اور آخری کتاب کے امین اپنی ذمہ داریوں کو ادا نہیں کریں گے اور شریعت کے احکام بھی دولت کمانے کا ذریعہ بن کر رہ جائیں گے تو پھر اس چشمۂ صافی سے دنیا کے پیاسے کیوں کر سیراب ہوں گے[1]

مطلب یہ ہے کہ یہ سرگزشت تو بنی اسرائیل کی ہے جن کو تورات نے مخاطب کیا تھا۔ لیکن خود مسلمانوں کا کیا حال ہوا جنہیں قرآن کی دعوت سپرد کی گئی تھی۔ افسوس ہے کہ یہ علماء مشائخ بھی اس گمراہی سے بچ نہ سکے انہوں نے بھی دینی و روحانی زندگی کو کاروباری زندگی بنا لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ تمام مفاسد ظہور میں آگئے جن کا دروازہ قرآن نے بند کرنا چاہا تھا اور سب سے بڑا فساد یہ پیدا ہوا کہ ان کی روحانی ترقی یک قلم رک گئی اور رسوم و رواج کی تقلید نے علم و بصیرت کی راہوں سے انہیں دور کر دیا۔ فانا للہ والی اللہ المشتکی۔

---

[1] ضیاء القرآن

مصلحین کی حوصلہ افزائی

۲۲۳ - اور جو لوگ کتاب الٰہی کو تھامے رکھتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں یقیناً ہم ایسے اصلاح کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کریں گے۔ یعنی توبہ اور اصلاح کا دروازہ اب بھی کھلا ہے۔ جو لوگ شرپسندوں کی راہ چھوڑ کر تورات کی اصلی ہدایات کو تھامے رہیں اور اسی کی ہدایت و پیشین گوئی کے موافق اس وقت قرآن کریم کا دامن مضبوط پکڑے رہیں اور خدا کی بندگی نماز وغیرہ کا حق ٹھیک ٹھیک ادا کریں۔ غرض اپنی اور دوسروں کی اصلاح پر متوجہ ہوں خدا ان کی محنت ضائع نہیں کرے گا وہ بلاشبہ اپنی محنت کا میٹھا پھل چکھیں گے۔[1]

آیت کا مطلب اوپر کی آیت کی روشنی میں یہ ہے کہ بدقسمت لوگ تو اللہ کی کتاب کو چھوڑ کر اپنی خواہشات کے پیچھے چل پڑے ہیں۔ حالانکہ جو لوگ اللہ کی کتاب کو مضبوطی سے اور نماز کا اہتمام کرتے ہیں وہ لوگ مخلوق خدا کی اصلاح کا کام کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصلاح و دعوت کے اہم ترین اجزاء یہ دو ہیں کہ داعی اور مصلح کتاب الٰہی کے احکام کی تعمیل کرے اور نماز کی پابندی کرے پہلی بات کو مضارع کے صیغے اور دوسری بات کو ماضی کے صیغے میں پیش کرنے میں تعبیری تعنن شاید اس لیے رکھا ہے کہ تمسک بالکتاب بلا قید زمان مطلوب ہے اور نماز اوقات خاصہ میں ہی پڑھی جاتی ہے یعنی اللہ کی کتاب کو زندگی کے سارے گوشوں میں تھامے رہے اور نماز کی اوقات مخصوصہ میں ادائیگی کرے۔ آیت میں ایجاز سے کام لیا گیا ہے پوری بات یوں ہے کہ جو لوگ کتاب کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں وہی اصلاح کرنے والے ہیں اور بلاشبہ ہم مصلحین کا اجر ضائع نہیں کرتے۔ امام مجاہد اور امام ابن زید فرماتے ہیں کہ اس سے مراد وہ اہل ایمان ہیں جو اہل کتاب میں سے مسلمان ہوئے گویا تمام یہودیوں کو سمجھا دیا گیا کہ اگر تم آج بھی احکام الٰہی کے کاربند ہو اور نماز پڑھو تو تمہارے آباؤ اجداد کے اعمال بد کی وجہ سے تمہاری پکڑ نہ ہوگی بلکہ تمہیں تمہارے اعمال کا اجر ملے گا۔ اس سے پہلے بھی اہل کتاب میں ان لوگوں کا ذکر و من قوم موسیٰ امۃ میں کیا تھا یہاں فرمایا الذین یمسکون بالکتاب دونوں جگہ یہ صراحت اس لیے کی کہ واضح ہو جائے کہ جن لوگوں نے کتاب الٰہی کو تھام رکھا ہے اور کتاب کے مطالبات پورے کر رہے ہیں۔ ان کی سعادت سے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

انکار نہیں ہے۔ تمسک بالکتاب یہ ہے کہ ہر راست باز انسان جو سچے دین پر چلنا چاہتا ہے۔ فرض ہے کہ بلا کسی امتیاز کے تمام رسولوں پر، تمام کتابوں، تمام دعوتوں پر ایمان لائے اور کسی ایک کا بھی انکار نہ کرے۔ بہر حال آیت کا مصداق وہ لوگ ہیں جو قوم کے عام بگاڑ کے باوجود حق پر قائم رہے اور بالآخر مشرف باسلام ہوئے۔

بنی اسرائیل سے اسلامی زندگی کا عہد

۲۲۴- اور ان کو وہ وقت بھی یاد دلاؤ جب کہ ہم نے پہاڑ کو ان پر اس طرح ہلا دیا تھا کہ گویا وہ ایک سائبان ہے اور ان کو اس کے اپنے اوپر گرنے کا گمان ہو رہا تھا اس وقت ہم نے ان سے کہا تھا کہ جو کتاب ہم تمہیں دے رہے ہیں اسے مضبوطی سے لے لو۔ اور جو کچھ اس میں لکھا ہے اسے یاد رکھو توقع ہے کہ تم غلط روی سے بچے رہو گے۔ یعنی جو میثاق الکتاب، عہد و اقرار انہیں یاد دلایا جا رہا ہے وہ ایسے اہتمام سے لیا گیا تھا کہ پہاڑ اٹھا کر ان کے سروں پر لٹکا دیا گیا اور کہا گیا کہ جو کچھ تم کو دیا جا رہا ہے اسے پوری مضبوطی اور عزم سے تھامو اور جو نصیحتیں کی گئیں انہیں ہمیشہ یاد رکھو ورنہ بصورت انکار سمجھ لو کہ خدا تم پر یہ پہاڑ گرا کر ہلاک کر سکتا ہے۔ اس قدر اہتمام اور تخویف و تاکید سے جو قول و قرار لیا گیا تھا افسوس ہے کہ وہ بالکل فراموش کر دیا گیا۔[1]

یہ واقعہ الم البقرہ میں گزر چکا ہے۔ یہاں الجبل پہاڑ آیا ہے وہاں اسی پہاڑ کا نام الطور آیا ہے یہ جزیرہ نمائے سینا کے ایک مخصوص پہاڑ کا نام ہے۔ جدید جغرافیہ نویس کہتے ہیں کہ طور کا اطلاق جزیرہ نمائے سینا کے متعدد پہاڑوں پر ہوتا ہے لیکن حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کے سلسلے میں جبل طور سے مراد جبل سینا ہوتا ہے لیکن خود جبل سینا کی ایک چوٹی نہیں متعدد چوٹیاں ہیں۔ انہیں میں سے کسی کا نام طور ہے۔ پہاڑ کے ہلانے یا بلند کرنے سے کیا مراد ہے؟ تورات میں اس کی اجمالی تصویر پیش کی گئی ہے۔

> وہ پہاڑ کے نیچے آکھڑے ہوئے اور کوہ سینا پر زیر و بالا دھواں تھا، کیونکہ خداوند شعلہ میں ہو کر اترا اور شور کا سا دھواں اس پر اٹھا اور پہاڑ سراسر ہل گیا۔
>
> (خروج ۱۹- ۱۷- ۱۸)

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اور تالمود جو تورات کی مشہور مستند اور نہایت ضخیم شرح یہود کے ہاں موجود ہے اس میں اس اجمال کی شرح اس طرح کی گئی ہے ،

حق تبارک و تعالیٰ نے ان کے اوپر کوہ سینا کو الٹ دیا جس طرح کوئی بڑا برتن الٹا جاتا ہے اور کہا کہ اگر تم تورات قبول کرتے ہو جب تو خیر ورنہ سب یہیں دفن ہو کر رہ جاؤ گے ۔
(جیوز انسائیکلو پیڈیا)

اسی میں ہے کہ :

خدا نے پہاڑ کو ان لوگوں پر الٹ کر اوندھا کر دیا اور ان سے کہا کہ تورات کو اگر قبول کرتے ہو جب تو خیر ورنہ یہیں تمہارا مدفن بن کر رہے گا ۔
(جیوز انسائیکلو پیڈیا)

اس طرح اللہ سبحانہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور عہد لیتے ہوئے خارج میں ایسا ماحول پیدا کر دیا جس سے انہیں خدا کے جلال اور اس کی عظمت و برتری اور اللہ سے عہد کی اہمیت کا پورا پورا احساس ہو اور وہ اس شہنشاہِ کائنات کے ساتھ عہد استوار کرنے کو کوئی معمولی سی بات نہ سمجھیں ۔

ہمارے شارحینِ قرآن نے جو آثار صحابہ و تابعین سے نقل کیے ہیں ان میں بھی تورات و تالمود سے ملتی جلتی روایات ہیں ۔

یہاں اس سوال کی اہمیت کو بہت زیادہ محسوس کیا گیا ہے کہ یہ اندازِ عہد قرآن کے مشہور نظریہ لا اکراہ فی الدین کے خلاف ہے اس کے اہلِ علم نے قرآن کی تشریح کرتے ہوئے مفید جوابات دیے ہیں ۔

حضرت مولانا اشرف علی قدس اللہ سرہ العزیز فرماتے ہیں :

اور کسی کو یہاں یہ شبہ نہ ہو کہ دین میں اکراہ نہیں ہے یہاں اکراہ کیسے کیا گیا ہے جواب نہایت واضح ہے کہ دین میں اکراہ نہ ہونے کے معنے یہ ہیں کہ ابتداءً قبولِ اسلام میں اکراہ نہیں یعنی عام کافروں پر یہ اکراہ نہ کریں گے کہ تو مسلمان ہو ورنہ سمجھ کو مار ڈالیں گے ۔ اسی لیے جہاد میں ایک جز یہ بھی ہے کہ اس کے قبول کرنے سے جہاد رک جاتا ہے ۔ اس سے معلوم ہوا کہ مقصود بالجہاد قبولِ اسلام نہیں ہے بلکہ ایک مشترک بین الاسلام والجزیہ ہے اور وہ اطاعت قانونِ عدل شرعی ہے ۔ جو مومنین اور کفار کے حق میں عام ہے ۔ یہاں بنی اسرائیل پہلے بطوع و رغبت ایمان لا چکے تھے ایسے شخص کو بقاء علی الایمان اور بجا آوری احکام پر ضرور کہا جائے گا جس کی نفی پر کوئی دلیل عقلی و نقلی قائم نہیں[1]

---

[1] بیان القرآن

مولانا مودودی فرماتے ہیں،

اس سے یہ گمان نہ کرنا چاہیے کہ وہ خدا کے ساتھ میثاق باندھنے پر آمادہ نہ تھے اور انہیں زبردستی خوفزدہ کر کے اس پر آمادہ کیا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ سب کے سب اہل ایمان تھے اور دامن کوہ میں میثاق باندھنے کے لیے گئے تھے مگر اللہ تعالیٰ نے معمولی طور پر ان سے عہد و قرار لینے کے بجائے مناسب جانا کہ اس عہد و اقرار کی اہمیت ان کو اچھی طرح محسوس کرا دی جائے تاکہ اقرار کرتے وقت انہیں یہ احساس رہے کہ وہ کس قادر مطلق ہستی سے اقرار کر رہے ہیں [1]

مزید تفصیل کے لیے جلد اوّل معالم العرفان کا نوٹ نمبر ۹۴ ملاحظہ فرمائیے۔

---

[1] تفہیم القرآن

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَ
اَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى ۛۚ شَهِدْنَا ۛۚ
اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِیْنَ ﴿۱۷۲﴾ اَوْ
تَقُوْلُوْۤا اِنَّمَاۤ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَ كُنَّا ذُرِّیَّةً مِّنْۢ
بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۱۷۳﴾ وَ كَذٰلِكَ
نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ وَ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ﴿۱۷۴﴾

اور اے پیغمبر لوگوں کو یاد دلاؤ وہ وقت جبکہ تمہارے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی نسل کو نکالا تھا[۲۲۵]۔ اور انہیں خود ان کے اوپر گواہ بناتے ہوئے پوچھا تھا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں، انہوں نے کہا ضرور آپ ہی ہمارے رب ہیں، ہم اس پر گواہی دیتے ہیں[۲۲۶]۔ یہ ہم نے اس لیے کیا کہ تم قیامت کے روز یہ نہ کہہ دو کہ ہم تو اس بات سے بے خبر تھے یا یہ کہو کہ شرک

کی ابتدا، تو ہمارے باپ دادا نے ہم سے پہلے کی تھی اور ہم بعد کو ان کی نسل میں پیدا ہوئے پھر کیا ہمیں اس قصور میں پکڑتے ہو جو غلط کار لوگوں نے کیا تھا، دیکھو ایسے ہی ہم کھول کر نشانیاں پیش کرتے ہیں۔ ۲۲۸

معانی مفردات

من ظهورهم ترکیب میں بنی آدم سے بدل واقع ہے اور اس کے بدل لانے سے یہ جتانا مقصود ہے کہ بنی آدم سے متعلق جو علمی حقیقت یہاں بیان ہو رہی ہے وہ خاص دور کے بنی آدم سے متعلق نہیں بلکہ قیامت آنے تک پیدا ہونے والے انسانوں سے ہے۔ یہاں بنی آدم کی پشتوں سے بنی آدم کی اولاد کا نکالنا ذکر کیا ہے اور حضرت آدم کا ذکر نہیں کیا۔ کیونکہ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ آدم علیہ السلام سب کے باپ ہیں اور سب ان ہی کی پشت سے نکلے ہیں۔ مسند احمد، نسائی، اور مستدرک حاکم میں عبداللہ بن عباس سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کی پشت سے ان کی ذریت کو اور سامنے بکھیر دیا جیسے چیونٹیاں اور پھر ان سے کلام کیا الست بربکم؟ سب نے جواب میں بلیٰ کہا (ابن کثیر ج ۲ ص ۲۶۱)

ذریتہم:۔ اولاد، اصل میں چھوٹے چھوٹے بچوں کا نام ذریت ہے مگر عرف میں چھوٹی بڑی اولاد کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے اور اگرچہ اصل میں یہ لفظ جمع ہے مگر واحد اور جمع دونوں کے لیے آتا ہے۔ شہدنا:۔ ہم نے اقرار کیا، ہم نے بیان کیا ہم موجود تھے، ہم نے دیکھا شہود اور شہادت سے ماضی کا صیغہ ہے۔ راغب نے لکھا ہے کہ کبھی شہادت سے اقرار کرنا بھی مراد ہوتا ہے۔ بلیٰ:۔ ہاں، الف اس میں اصلی ہے۔ کچھ کہتے ہیں کہ زائد ہے۔ کچھ کہتے ہیں تانیث کے لیے ہے۔ بلیٰ کا استعمال دو طرح ہوتا ہے ایک تو نفی ما قبل کی تردید کے لیے جیسے بلی وربی لتبعثن، دوسرے یہ کہ اس استفہام کے جواب میں جو نفی پر مشتمل ہو جیسے الیس زید بقائم"

جواب میں کہا جائے گا بلیٰ یا استفہام توبیخی جیسے ایحسب الانسان ان نجمع عظامہ بلیٰ قادرین علیٰ ان نسوی بنانہ ؟ اور یا استفہام تقریری ہو جیسے الست بربکم قالوا بلی و شھدنا۔ بلیٰ اور نعم میں یہ فرق ہے کہ نعم استفہام مجرد کے جواب میں آتا ہے اور بلی بالاتفاق ایجاب کے جواب میں نہیں آتا بلکہ اس استفہام کے جواب میں آتا ہے جو متقرر بنفی ہو، نیز بلی ابطال نفی کے لیے آتا ہے اور نعم تصدیق ماقبل کے لیے ان تقولوا میں ان سے پہلے کراہتہ یا اس کے ہم معنے کوئی لفظ محذوف ہے اس وجہ سے اس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ تم یہ نہ کہو یا مبادا تم قیامت کے دن عذر کرو۔ اس سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ توحید کے بارے میں روزِ قیامت مواخذہ ہر شخص سے صرف اس اقرار کی بنا پر ہوگا جو آیت میں مذکور ہے چاہے اس کو نبوت کی دعوت پہنچی یا نہیں۔

ازل میں پوری اولادِ آدم کا اقرار

بنی اسرائیل کے خصوصی میثاق کے بعد اس عہدِ فطرت کی یاددہانی کی ہے جو تمام بنی آدم سے اللہ سبحانہ اپنی توحیدِ ربوبیت کا لیا ہے۔ اس طرح روئے سخن بنی اسرائیل سے ہٹ کر عام انسانوں کی طرف ہوگیا ہے۔ بتایا جارہا ہے کہ بنی اسرائیل کی خصوصیت نہیں بلکہ فی الواقع تم سب اپنے خالق کے ساتھ ایک میثاق میں بندھے ہوئے ہو اور تمہیں ایک روز جوابدہی کرنی ہے کہ تم نے اس میثاق کی کہاں تک پابندی کی ہے۔ جیساکہ متعدد احادیث سے معلوم ہوا ہے کہ یہ معاملہ تخلیقِ آدم کے موقعہ پر پیش آیا تھا۔ اُس وقت جس طرح فرشتوں کو جمع کرکے انسانِ اوّل کو سجدہ کرایا گیا تھا اور زمین پر انسان کی خلافت کا اعلان کیا گیا تھا۔ اسی طرح پوری نسلِ آدم کو بھی جو قیامت تک پیدا ہونے والی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے بیک وقت وجود اور شعور عطا فرما کر اپنے سامنے حاضر کیا تھا اور ان سے اپنی ربوبیت کی شہادت لی تھی۔ حافظ ابن کثیر نے اس واقعہ کی تشریح میں عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمرو، عمر بن الخطاب، ابوہریرہ، ہشام بن حکیم، ابوامامہ، ابی بن کعب سے متعدد روایات نقل کی ہیں لیکن اس واقعہ کی تشریح میں حضرت ابی بن کعب نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ اس موضوع کی جان ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ۔ اللہ تعالیٰ نے سب کو جمع کیا اور لوگوں کو الگ الگ گروہوں کی شکل میں مرتب کرکے انہیں انسانی صورت میں گویائی کی طاقت دی۔ پھر ان سے عہد و میثاق لیا اور انہیں آپ اپنے پر گواہ بناتے ہوئے پوچھا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انہوں نے عرض کیا

کہ بے شک آپ ہمارے رب ہیں تب اللہ سبحانہ نے فرمایا میں تم پر زمین و آسمان سب کو اور خود تمہارے باپ آدم کو گواہ ٹھہراتا ہوں تاکہ تم قیامت کے روز یہ نہ کہو کہ ہم کو اس کا علم نہ تھا۔ خوب جان لو کہ میرے سوا کوئی مستحقِ عبادت نہیں ہے اور میرے سوا کوئی رب نہیں ہے تم میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا، میں تمہارے پاس اپنے پیغمبر روانہ کروں گا جو تم کو یہ عہد و میثاق جو تم میرے ساتھ باندھ رہے ہو یاد دلائیں گے اور تم پر اپنی کتابیں بھی نازل کروں گا۔ اس پر سب انسانوں نے کہا کہ ہم گواہ ہوئے۔ آپ ہی ہمارے رب اور آپ ہی ہمارے معبود ہیں آپ کے سوا نہ کوئی ہمارے رب ہے نہ کوئی معبود۔

اس واقعہ کو کچھ لوگ واقعہ نہیں بلکہ محض تمثیل کہتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ دراصل اللہ سبحانہٗ ان آیات میں یہ بات ذہن نشین کرانا چاہتا ہے کہ اگر انسان اپنی فطرت اور اپنی تخلیق کے عجائب اور اپنی صفت کے غرائب پر نظر کرے جو خود اس کے اندر موجود ہیں تو اس کو معلوم ہو جاتے کہ یہ سب چیزیں خدا تعالیٰ کی ربوبیت اور وحدانیت پر گواہ ہیں۔ یہ تشریح معتزلہ اور مدعیانِ عقل نے کی پیش کی ہے لیکن یہ تاویل درست نہیں۔ قرآن و حدیث اور صحابہ کرام اسے بالکل ایک واقعہ کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں اور صرف واقعہ ہی بیان نہیں کیا بلکہ یہ بھی اللہ سبحانہٗ نے بتایا کہ روزِ قیامت بنی آدم پر حجت قائم کرتے ہوئے اس ازلی عہد و اقرار کو سند میں پیش کیا جائے گا۔ لہٰذا اس خیال کی جو معتزلہ پیش کرتے ہیں، قرآن و حدیث، اجماعِ صحابہ و تابعین کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ آیات کی تشریح سے پہلے واقعہ کے بارے میں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کا مفید اور جامع تبصرہ گوش گزار فرما لیجئے :

میثاقِ خاص کے بعد یہاں سے میثاقِ عام کا ذکر کرتے ہیں۔ تمام عقائد حقہ اور ادیانِ سماویہ کا بنیادی پتھر یہ ہے کہ انسان خدا کی ہستی اور ربوبیتِ عامہ پر اعتقاد رکھے مذہب کی ساری عمارت اسی سنگِ بنیاد پر کھڑی ہے جب تک یہ اعتقاد نہ ہو مذہبی میدان میں عقل و فکر کی رہنمائی اور انبیاء و مرسلین کی ہدایات کچھ نفع نہیں پہنچا سکتیں۔ اگر پورے غور و تامل سے دیکھا جائے تو آسمانی مذہب کے تمام اصول و فروع بالآخر خدا کی ربوبیتِ عامہ تو اسی عقیدے پر منتہی ہوتے بلکہ اسی کی تہ میں چھپے ہوتے ہیں۔ عقلِ سلیم اور وحی و الہام اسی اجمال کی شرح کرتے ہیں لہٰذا ضروری تھا کہ یہ تخمِ ہدایت جسے کل آسمانی تعلیمات کا مبداء و منتہی اور تمام ہدایاتِ ربانیہ کا وجودِ مجمل کہنا چاہیے عام فیاضی کے ساتھ نوعِ انسانی کے تمام افراد میں بکھیر دیا جائے تاکہ ہر آدمی عقل و فہم اور وحی و الہام کی آبیاری سے اس تخم کو شجرِ ایمان و توحید کے درجہ تک پہنچا سکے۔ اگر قدرت کی طرف سے قلوب

بنی آدم میں ابتداءً یہ تخم ریزی نہ ہوتی اور اس سب سے زیادہ اساسی و جوہری عقدہ کا حل ناخن عقل و فکر کے سپرد کر دیا جاتا تو یقیناً یہ مسئلہ بھی منطقی استدلال کی بھول بھلیاں میں پھنس کر ایک نظری مسئلہ بن جاتا، جس پر سب تو کیا اکثر آدمی بھی متفق نہ ہو سکتے جیسا کہ تجربہ بتلاتا ہے کہ فکر و استدلال کی ہنگامہ آرائیاں اکثر اتفاق سے زیادہ اختلاف آراء پر منتج ہوتی ہیں اس لیے قدرت نے جہاں غور و فکر کی قوت اور نور وحی و الہام کے قبول کرنے کی استعداد بنی آدم میں ودیعت فرمائی وہیں اس اساسی عقیدے کی تعلیم سے ان کو فطرۃً بہرہ ور کیا جس کے اجمال میں کل آسمانی ہدایات کی تفصیلات منطوی اور مندمج تھی اور جس کے بغیر مذہب کی عمارت کا کوئی ستون کھڑا نہیں رہ سکتا۔ یہ اس ازلی اور خدائی تعلیم کا اثر ہے کہ آدم کی اولاد ہر قرن میں اور ہر جگہ حق تعالیٰ کی ربوبیت عامہ کے عقیدے پر کسی نہ کسی حد تک متفق رہی ہے اور جن معدود افراد نے کسی عقلی و روحی بیماری کی وجہ سے اس عام فطری احساس کے خلاف آواز اٹھائی ہے وہ انجام کار دنیا کے سامنے بلکہ خود اپنی نظر میں بھی، اسی طرح جھوٹے ثابت ہوتے جیسے ایک بخار وغیرہ کا مریض لذیذ اور خوشگوار غذاؤں کو تلخ و بدمزہ بتلانے میں جھوٹا ثابت ہوتا ہے۔ بہرحال ابتدائے آفرینش سے آج تک ہر درجہ اور طبقہ کے انسانوں کا خدا کی ربوبیت کبریٰ پر عام اتفاق و اجماع اس کی زبردست دلیل ہے کہ یہ عقیدہ عقول و افکار کی دارو دش سے پہلے ہی فاطر السماوات کی طرف سے اولادِ آدم کو بلا واسطہ تلقین فرما دیا گیا، ورنہ فکر و استدلال کے راستہ سے ایسا اتفاق پیدا ہونا تقریباً ناممکن تھا۔ قرآن حکیم کی یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ اس نے ان آیات میں عقیدہ کی اس فطری یکسانیت کے اصلی راز پر روشنی ڈالی ہے[1]

۲۲۵ ۔ اور اے پیغمبر لوگوں کو یاد دلاؤ وہ وقت جبکہ تمہارے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کو نکالا تھا۔ عربی زبان میں اذ کے ذریعے کسی ایسے امر واقعی کی یاد دہانی کرائی جاتی ہے جو متکلم کے نزدیک ایک حقیقت ہو۔ اس بنا پر یہ حقیقت ہے کہ جس واقعہ کا یہاں ذکر ہو رہا ہے وہ بالکل اسی طرح پیش آیا تھا جس طرح عالم خارجی میں واقعات پیش آیا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فی الواقع ان تمام انسانوں کو جنہیں قیامت تک پیدا کرنے والا تھا بیک وقت زندگی اور شعور دے کر اپنے سامنے حاضر کیا اور فی الواقع انہیں اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ ان کا کوئی رب اللہ کے سوا نہیں۔ اس اجتماع کو اگر کوئی بعید از عقل سمجھتا ہے تو یہ محض اس کے دائرۂ فکر کی تنگی ہے ورنہ حقیقت میں تو نسل انسانی کی

[1] افادات شیخ الاسلام

موجودہ تدریجی پیدائش جتنی قرب از امکان ہے، اتنا ہی ازل میں ان کا مجموعی ظہور اور ابد میں ان کا مجموعی حشر و نشر بھی قریب از امکان ہے۔ پھر یہ بات نہایت معقول معلوم ہوتی ہے کہ انسان جیسی صاحبِ عقل و شعور اور صاحبِ تصرف و اختیارات مخلوق کو زمین پر بحیثیت خلیفہ مامور کرتے وقت اللہ تعالیٰ اسے حقیقت بخشے اور اس سے اپنی وفاداری کا اقرار لے۔ اس معاملہ کا پیش آنا قابلِ تعجب نہیں، البتہ اگر یہ واقعہ پیش نہ آتا تو ضرور حیرت ہوتی۔

اس سے پہلے بنی اسرائیل کے میثاق کا ذکر تھا اس پر یہ سوال ہو سکتا تھا کہ اسرائیلی میثاق دنیا کی غیر اسرائیلی آبادی کے لیے کیوں کر حجت ہو سکتا ہے۔ اب یہ بیان ہو رہا ہے کہ توحید کا عہد تو ساری نسلِ انسانی سے لیا جا چکا ہے اور توحید شناسی، توحید پرستی انسان کی فطرت میں راسخ ہو چکی ہے اور بشر کی سرشت میں رچی جا چکی ہے۔ فطرت اگر مسخ ہو چکی ہے تو ایک خالق و رازق و مربی کا اعتراف ہر فطرتِ سلیم کا جزو رہے۔

اللہ کی ربوبیت کا عہد

۲۲۶ - انہیں خود ان کے اوپر گواہ بناتے ہوئے پوچھا تھا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں، انہوں نے کہا کہ ضرور تو ہمارا رب ہے ہم اس پر گواہ ہیں۔ اس میں اس حقیقت کا اعلان ہے کہ خدا کی ہستی کا اعتقاد انسان کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے اور فطرتِ انسانی کی اصلی آواز ہے یعنی تصدیق ہے انکار نہیں ہے۔ یہ اقرار صرف اس بات کا نہیں لیا گیا کہ وہ اللہ ہے بلکہ اس بات کا لیا گیا ہے کہ اللہ ہی رب ہے یہ بات دھیان میں رکھنی اس لیے ضروری ہے کہ اہلِ عرب کو اللہ کے اللہ ہونے سے انکار نہیں تھا لیکن رب انہوں نے اللہ کے سوا اور بھی بنا لیے تھے حالانکہ عہد الست میں صرف اللہ کی ربوبیت کا اقرار ہے۔ حافظ ابن کثیر نے اس کی تشریح اس طرح فرمائی ہے:

> اللہ تعالیٰ بتا رہا ہے کہ اللہ نے اولادِ آدم کی تمام ذریت کو ان کی پیٹھوں سے نکال کر ان سے عہد لیا اور اقرار کرایا کہ اللہ ہی ان کا رب اور ان کا بادشاہ ہے اور یہ کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے یہی بات ان کی فطرت میں ودیعت کی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ واقعہ اور حقیقت ہے کہ کیا عالمِ غیب کے کسی ایسے واقعہ کی یادداشت

انسانی ذہن میں محفوظ ہے اگر نہیں ہے تو یہ کیسے باور کیا جائے کہ انسان نے اس طرح کا کوئی اقرار کیا ہے یا اس قسم کا کوئی واقعہ ہوا ہے۔

شارحین قرآن نے اس کے متعدد جوابات دیئے ہیں۔ مثلاً حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی فرماتے ہیں:

بلاشبہ ہم کو یاد نہیں کہ اس بنیاد کی تعلیم کب اور کہاں اور کس ماحول میں دی گئی ہے تاہم جس طرح ایک لیکچرار اور انشاء پرداز کو یقین ہے کہ ضرور اس کو ابتدائے عمر میں کسی نے الفاظ بولنے سکھائے جس سے ترقی کرکے آج اس رتبہ کو پہنچا گو پہلا لفظ سکھلانے والا اور سکھلانے کا وقت مکان اور دیگر خصوصیات مکانی بلکہ نفس سکھلانا بھی یاد نہیں۔ تاہم اس کے موجودہ آثار سے یقین ہے کہ ایسا واقعہ ضرور ہوا ہے۔ اسی طرح بنی نوع انسان کا علی اختلاف الاقوام والاجبال، "عقیدہ ربوبیت" پر متفق ہونا اس کی کھلی شہادت ہے کہ یہ چیز بدفطرت میں کسی معلم کے ذریعے ان تک پہنچی ہے باقی تعلیمی خصوصیات واحوال کا محفوظ نہ رہ سکنا اس کی تسلیم میں خلل انداز نہیں ہو سکتا۔ اسی ازلی فطری تعلیم نے جس کا نمایاں اثر آج تک انسانی سرشت میں موجود چلا آتا ہے ہر انسان کو خدا کی حجت کے سامنے ملزم کر دیا ہے جو شخص اپنے الحاد وشرک کو حق بجانب قرار دینے کے لیے غفلت و بےخبری یا آباؤ اجداد کی کورانہ تقلید کا عذر کرتا ہے اس کے مقابلے پر خدا کی یہی حجت قاطعہ جس میں اصل فطرت انسانی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے بطور فیصلہ کن جواب کے پیش کی جا سکتی ہے[1]

حضرت مولانا محمد ادریس فرماتے ہیں کہ:

اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ وہ عہد تو یاد نہیں ہے تو پھر کیا حاصل تو اس کو یوں سمجھئے کہ وہ عہد اگرچہ یاد نہیں رہا مگر اس کا نشان تو ہر دل میں موجود ہے۔ انسان کے دل میں قدرتی طور پر حق تعالیٰ کی طرف ایک میلان پایا جاتا ہے جب کبھی کوئی پریشانی پیش آتی ہے تو دل خدا کی طرف دوڑتا ہے اور اس سے اس مصیبت کے دفعیہ کا طلبگار اور امیدوار ہوتا ہے۔ انسان کا دل خود اندر سے گواہی دیتا ہے کہ کوئی میرا پروردگار ضرور ہے۔ بہرحال یہ میلان تمام طبیعتوں میں پایا جاتا ہے، کسی میں کم اور کسی میں زیادہ، خواہ وہ اس میلان کے منشا کو سمجھے یا نہ سمجھے اور اس کے تقاضے پر عمل پیرا ہو یا نہ ہو۔ رہی یہ بات کہ اس طبعی اور فطری میلان کا سرچشمہ اور منشا کیا ہے؟ سو معلوم یوں ہوتا ہے کہ اس پیدائش سے پہلے انسان کو جناب باری تعالیٰ کی کسی قسم کی تجلی ضرور

[1] افادات شیخ الاسلام

میسر آئی ہے جس کے نتیجہ میں انسان کے دل میں خدا کی محبت اس قدر جاگزین ہو گئی ہے کہ صدہا تکالیف کے باوجود خدا ہی کی طرف جھکتا ہے۔ یہ طبعی میلان میثاق کی ایک ظاہری علامت ہے۔ تمام افراد انسانی کا اقرار ربوبیت پر متفق ہونا اور یقین کے ساتھ اتفاق کرنا کہ ہمارا کوئی پروردگار ہے۔ اسی پرانے میثاق کا دھندلا سا خاکہ ہے جو ایک لمحہ یا ایک گھڑی کے لیے پیش آیا۔ لمحہ میں ہونے والا واقعہ اور زمانہ اور انتقالِ مکان سے کوزہ ذہن سے اتر جائے یہ کوئی مستبعد بات نہیں ہے۔ الغرض تمام عالمِ انسانی کا اس میلان پر متفق ہونا اس بات کی علامت ہے کہ کبھی نہ کبھی یہ بات کان میں پڑی ہے۔ مکان اور زمان اگرچہ یاد نہیں مگر اس کا نشان موجود ہے، مرورِ زمانہ کی وجہ سے یہ وقت یاد نہیں رہا کیونکہ اس وقت چھوٹے چھوٹے ذرات کی صورت میں تھی اس وقت سے لے کر توالد و تناسل میں ایک طویل عرصہ گزرا اور ذرات مختلف اطوار اور ادوار سے گزرتے رہے یہاں تک کہ اس عالم فانی میں داخل ہوئے چلے[1]

مولانا اصلاحی فرماتے ہیں کہ :

جہاں تک اس اقرار کا تعلق ہے وہ ہر انسان کی فطرت کے اندر موجود ہے۔ رہا اس کا موقع و محل اور اس کی تاریخ تو وہ اگر یاد نہیں رہی تو اس سے نفس اقرار کی صحت و صداقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ زیادہ سے زیادہ کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ اقرار تو مجھے یاد ہے البتہ اس کا موقع و محل یاد نہیں ہے سو اللہ تعالیٰ نے اس کا موقعہ و محل بتا دیا کہ یہ اقرار انسان کے وجود میں آنے سے پہلے ہی عالم غیب میں خدا نے انسان سے لیا ہے اور یہ بات خدا ہی بتا سکتا تھا اس لیے کہ غیب کا علم صرف اسی کے پاس ہے۔ انسان پر حجت قائم ہونے کے لیے یہ امر کافی ہے کہ اس اقرار کی یادداشت اس کے اندر موجود ہے۔[2]

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر اس میثاق کا نقش انسان کے شعور اور حافظہ میں تازہ رہنے دیا جاتا تو انسان کا دنیا کی موجودہ امتحان گاہ میں بھیجا جانا سرے سے فضول ہو جاتا، کیونکہ اس کے بعد تو اس آزمائش اور امتحان کے کوئی معنی ہی باقی نہ رہ جاتے، لہٰذا اس نقش کو شعور و حافظہ میں تو تازہ نہیں رکھا گیا لیکن وہ تحت الشعور اور وجدان میں یقیناً محفوظ ہے، اس کا حال وہی ہے جو ہمارے تمام دوسرے تحت الشعوری اور وجدانی علوم کا حال ہے، تہذیب و تمدن اور اخلاق و معاملات کے تمام شعبوں

---

[1] معارف م [2] تدبر قرآن

میں انسان سے آج تک جو کچھ بھی ظہور میں آیا وہ سب درحقیقت انسان کے اندر بالقوۃ موجود تھا۔ خارجی محرکات اور داخلی تحریکات نے مل جل کر اگر کچھ کیا ہے تو صرف اتنا کہ جو کچھ بالقوۃ تھا اُسے بالفعل کر دیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کوئی تعلیم، کوئی تربیت، کوئی ماحولی تاثیر، اور کوئی داخلی تحریک، انسان کے اندر کوئی چیز بھی، جو اس کے اندر بالقوۃ موجود نہ ہو، ہرگز پیدا نہیں کر سکتی، اور اسی طرح یہ سب مؤثرات اگر اپنا تمام زور بھی صرف کر دیں تو ان میں یہ طاقت نہیں ہے کہ اُن چیزوں میں سے جو انسان کے اندر بالقوۃ موجود ہیں، کسی چیز کو قطعی محو کر دیں۔ زیادہ سے زیادہ جو کچھ وہ کر سکتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ اُسے اصل فطرت سے منحرف کر دیں۔ لیکن وہ چیز تمام تحریفات و تمسیخات کے باوجود اندر موجود رہے گی، ظہور میں آنے کے لیے زور لگاتی رہے گی، اور خارجی اپیل کا جواب دینے کے لیے مستعد رہے گی، یہ معاملہ جیسا کہ ہم نے ابھی بیان کیا، ہمارے تمام تحت الشعوری اور وجدانی علوم کے ساتھ عام ہے۔ وہ سب ہمارے اندر بالقوۃ موجود ہیں، اور ان کے موجود ہونے کا یقینی ثبوت اُن چیزوں سے ہمیں ملتا ہے جو بالفعل ہم سے ظاہر ہوتی ہیں۔

ان سب کے ظہور میں آنے کے لیے خارجی تذکیر (یاددہانی) تعلیم و تربیت اور تشکیل کی ضرورت ہوتی ہے اور جو کچھ ہم سے ظاہر ہوتا ہے وہ گویا درحقیقت خارجی اپیل کا وہ جواب ہے جو ہمارے اندر کی بالقوۃ موجودات کی طرف سے ملتا ہے۔ ان سب کو اندر کی غلط خواہشات اور باہر کی غلط تاثیرات دبا کر یا پردہ ڈال کر منحرف اور مسخ کر کے کالعدم کر سکتی ہیں مگر بالکل معدوم نہیں کر سکتیں، اور اسی لیے اندرونی احساس اور بیرونی سعی دونوں سے اصلاح اور تبدیلی ممکن ہوتی ہے۔

ٹھیک ٹھیک یہی کیفیت اس وجدانی علم کی بھی ہے جو ہمیں کائنات میں اپنی حقیقی حیثیت اور خالق کائنات کے ساتھ اپنے تعلق کے بارے میں حاصل ہے۔

اس کے موجود ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ وہ انسانی زندگی کے ہر دور میں، زمین کے ہر خطہ میں، ہر بستی میں، ہر پشت اور ہر نسل میں اُبھرتا رہا ہے اور کبھی دُنیا کی کوئی طاقت اُسے محو کر دینے میں کامیاب نہیں ہو سکی ہے۔ اس کے مطابق حقیقت ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ جب کبھی وہ اُبھر کر بالفعل ہماری زندگی میں کارفرما ہوا ہے اس نے صالح اور مفید نتائج ہی پیدا کیے ہیں۔

اس کو اُبھرنے اور ظہور میں آنے اور عملی صورت اختیار کرنے کے لیے ایک خارجی اپیل کی ہمیشہ ضرورت رہی ہے۔ چنانچہ انبیاء علیہم السلام اور کتبِ آسمانی اور ان کی پیروی کرنے والے داعیانِ حق سب کے سب یہی خدمت انجام دیتے رہے ہیں، اسی لیے اس کو قرآن میں مذکر (یاد دلانے والے) ذکر (یاد) تذکرہ (یادداشت) اور ان کے کام کو تذکیر (یاددہانی) کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے معنی

یہ ہیں کہ انبیاء اور کتابیں اور داعیان حق انسان کے اندر کوئی نئی چیز پیدا نہیں کرتے بلکہ اُسی چیز کو اُبھارتے اور تازہ کرتے ہیں، جو ان کے اندر پہلے سے موجود تھی۔

نفس انسانی کی طرف سے ہر زمانہ میں اس تذکیر کا جواب بصورت لبیک ملنا اس بات کا مزید ایک ثبوت ہے کہ اندر فی الواقع کوئی علم چھپا ہوا تھا جو اپنے پکارنے والے کی آواز پہچان کر جواب دینے کے لیے اُبھر آیا، پھر اُسے جہالت اور جاہلیت اور خواہشات نفس اور تعصبات اور شیاطین جن وانس کی گمراہ کن تعلیمات و ترغیبات نے ہمیشہ دبانے اور چھپانے اور منحرف اور مسخ کرنے کی کوشش کی ہے جس کے نتیجے میں شرک، دہریت، الحاد، زندقہ اور اخلاقی اور عملی فساد رونما ہوتا رہا ہے لیکن ضلالت کی ان ساری طاقتوں کے متحدہ عمل کے باوجود اس علم کا پیدائشی نقش انسان کی لوح دل پر کسی نہ کسی حد تک موجود رہا ہے اور اسی لیے تذکیر و تجدید کی کوشش اُسے اُبھارنے میں کامیاب ہوتی رہی ہیں۔

بلاشبہ دنیا کی موجودہ زندگی میں جو لوگ حق اور حقیقت کے انکار پر مصر ہیں وہ اپنی حجت بازیوں سے اس پیدائشی نقش کے وجود کا انکار تو کر سکتے ہیں یا کم از کم اسے مشتبہ ثابت کر سکتے ہیں۔ لیکن جس روز یوم الحساب برپا ہوگا اس روز ان کا خالق ان کے شعور و حافظہ میں روز ازل کے اُس اجتماع کی یاد تازہ کردے گا جبکہ انھوں نے اس کو اپنا واحد معبود اور واحد رب تسلیم کیا تھا۔ پھر وہ اس بات کا ثبوت بھی ان کے اپنے نفس ہی سے فراہم کردے گا کہ اس میثاق کا نقش ان کے نفس میں برابر موجود رہا۔ اور یہ بھی وہ ان کی اپنی زندگی ہی کے ریکارڈ سے علی رؤس الاشہاد دکھادے گا کہ انھوں نے کس کس طرح اس نقش کو دبایا، کب کب اور کن کن مواقع پر ان کے قلب سے تصدیق کی آوازیں اٹھیں، اپنی اور اپنے گرد و پیش کی گمراہیوں پر ان کے وجدان نے کہاں کہاں اور کس کس وقت صدائے انکار بلند کی، داعیان حق کی دعوت کا جواب دینے کے لیے ان کے اندر کا چھپا ہوا علم کتنی کتنی مرتبہ اور کس کس جگہ اُبھرنے پر آمادہ ہوا، اور پھر وہ اپنے تعصبات اور اپنی خواہشات نفس کی بنا پر کیسے کیسے حیلوں اور بہانوں سے اس کو فریب دیتے اور خاموش کرتے رہے۔ وہ وقت جبکہ یہ سارے راز فاش ہوں گے، حجت بازیوں کا نہ ہوگا بلکہ صاف صاف اقرار جرم کا ہوگا، اسی لیے قرآن مجید کہتا ہے کہ اس وقت مجرمین یہ نہیں کہیں گے کہ ہم جاہل تھے، بلکہ یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ ہم کافر تھے، یعنی ہم نے جان بوجھ کر حق کا انکار کیا۔

وشھدوا علی انفسھم انھم کانوا کافرین (الانعام ۱۳۰)

آیت کی دو تشریحیں

شارحین قرآن نے اس آیت کی دو طرح تشریح کی ہے - ایک تفسیر دوسرے تاویل - تفسیر یہ ہے یہ واقعہ مبنی بر حقیقت ہے - فی الواقع اللہ سبحانہ نے ذریت آدم علیہ السلام سے یہ عہد لیا ہے - ابن الانباری رقمطراز ہیں کہ یہ اکابر اہل سنت کی بیان کردہ تفسیر ہے "تاویل یہ کہ آیت میں مجازی معنے مراد ہیں اور کلام بطریق تمثیل ہے - یہ بات علامہ زمخشری نے کشاف میں لکھی ہے لیکن اہل السنۃ میں سے حافظ ابن کثیر، قاضی بیضاوی، نسفی اور رازی کا میلان بھی اس طرف ہے - تفسیر تو واضح ہے اس میں کوئی پیچیدگی نہیں لیکن تاویل ذرا وضاحت طلب ہے اس لیے ہم کسی قدر تاویل کی وضاحت کرتے ہیں - وہ کہتے ہیں کہ ذریت کے نکالنے سے ازل میں نکالنا مراد نہیں بلکہ یہی تدریجی یکے بعد دیگرے پیدائش مراد ہے - اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی ذریات کو اس طرح پیدا کیا کہ آباء کی پشت میں نطفہ بنایا - نطفہ نے ماؤں کے رحم میں قرار پکڑا پھر تدریجی ترقی سے انسان عالم شہادت میں آیا - اقرار ربوبیت اور شہادت سے مراد شہادت حال اور اقرار عقل ہے - انسان کی تخلیق اس طور پر ہوئی کہ اس کی فطرت اللہ کی ربوبیت کی بزبان حال شاہد ہے - قول سے مراد زبان فطرت اور دلالت حال ہے -

آیت کا تفسیری مطلب جیسے اکابر اہل السنہ نے پیش کیا ہے یہ ہے کہ اللہ سبحانہ نے آدم کی پشت سے تمام اولاد کو نکالا جو چیونٹیوں کی طرح نکل پڑے پھر ان کو عقل و گویائی عطا کر کے فرمایا الست بربکم؟ سب نے جواب دیا ہاں آپ ہمارے رب ہیں ہم اس کا اقرار کرتے ہیں -

آیت کا تاویلی مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی ذریت اس طرح نکالی کہ پہلے وہ آباء کی پشت میں بشکل نطفہ تھے، پھر ماؤں کے رحم میں آتے، پھر علقہ بنے پھر مضغہ ہوتے پھر مکمل انسان ہوتے - پھر ان کو عقل و ہوش عطا ہوا جس کی وجہ سے وہ اللہ کی مصنوعات میں غور و فکر کر کے اس کی وحدانیت پر دلائل پیش کرنے کے قابل ہوتے تو یہ تخلیق اور دلائل خدا کی طرف سے ایک عہد ہیں اور اس باب پر شہادت ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی خالق و رب اور معبود نہیں ہے اور لوگوں کی حالت احتیاج و حدوث گویا اس عہد فطری کو قبول کرنا اور مان لینا ہے - خدا تعالیٰ کا دلائل پیدا کرنا گویا اقرار لینا ہے اور انسان کو موجودہ میں خلق کرنا گویا زبان حال سے اقرار لینا اور گواہ بنانا ہے - اس عہد کی رُو سے ہر عاقل توحید پر قائم رہنے کے لیے مامور ہے -

اہل تاویل کے اعتراضات

۱۔ من ظھورھم بدل ہے بنی آدم سے۔ اس صورت میں معنے یہ ہوتے کہ اولادِ آدم کی پشتوں سے ان کی ذریت کو نکالا۔ ان سے عہد لیا نہ کہ آدم کی پشت سے نکال کر۔ اگر آدم کی پشت سے ذریت آدم کو نکالنا بتانا ہوتا تو تعبیر من ظھورھم نہیں بلکہ من ظھرہ کا ہوتی۔ کیونکہ آدم تنہا تھے۔ ان کی پشتیں نہیں بلکہ صرف ایک پشت تھی۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ سلسلہ وار تمام اولادِ آدم کی پشت سے ان کی ذریات کو نکالا جو قیامت تک پیدا ہونے والے تھے۔ مثلاً رشید عمر کی پشت سے عمر، حمید کی پشت سے مجید کو رفیق کی پشت سے اس طرح یہ سلسلہ حضرت آدم تک پہنچا کیونکہ سب کا مبدا حضرت آدم ہیں۔

۲۔ یہ بھی اعتراض کیا گیا ہے کہ عہد عاقل اور سمجھدار سے لیا جاتا ہے ظاہر ہے کہ اس عہد کے وقت اولادِ آدم کو ذی شعور اور عقل مند ہونا چاہیے مگر یہ خلافِ واقعہ ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ انسان فی الواقع نفس ناطقہ یا روح ہے۔ روح اگرچہ حادث ہے مگر تخلیق جسم سے بہت پہلی چیز ہے اور اس عالم محسوسات میں اس کا ادراک محسوسات کے ذریعہ سے ہوتا ہے لیکن عالم غیب میں آلات حسیہ کی چنداں ضرورت نہیں۔ تمام ارواح جواہر باقیہ ہیں اگر تمام اولادِ آدم کی روحیں ایک ہی وقت میں پیدا ہوگئیں مگر دُنیا میں ترتیبی ظہور کے اعتبار سے آدم سب کا پیش خیمہ ہیں۔ اللہ نے جب آدم کو دُنیا میں بھیجا، تو اُن کے ذریعے سے تمام نفوس و ارواح کو جو دُنیا میں ظاہر ہونے والے تھے۔ ان کی پشت سے ترتیب وار نکالا اور اس وقت ان کو عقل بھی عطا کی بلکہ اب تک وہ ذی عقل ہیں۔

۳۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اولادِ آدم لامحدود ہیں پھر اس قدر اولادِ آدم اگر چیونٹی کیا ذرہ سے کم فرض کیا جاتے میں تب بھی آدم کی پشت سے نہیں نکل سکتے کیونکہ ان کے اجسام کا مجموعہ ایک پہاڑ ہونا چاہیے اور جو انسانی زندگی عالم مادی ہیں سے اسے اگر ان ذرات کا عین قرار دیا جاتے پھر بھی ممکن نہیں ہے کیونکہ عین ہوتا تو بجائے خود رہا جزو ہونا بھی ممکن نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ چیونٹیوں کے مشابہ ہونے سے مراد ارواح کی تشبیہہ بلحاظ اس حالت اجمالیہ کے ہے جو اس وقت ارواح کی تھی تفصیل مراد نہیں ہے اسی لیے یہ بھی آیا ہے کہ ان میں کچھ نورانی اور کچھ ظلماتی تھے۔ یعنی اہل سعادت کی روحیں روشن اور اہل شقاوت کی روحیں تاریک تھیں۔ اس ذریت آدم اجسام عنصریہ نہ تھی جن کا مجموعہ پہاڑ کے برابر ہو۔ نہ روح کوئی مادی عنصری چیز ہے بلکہ یہ محض ایک تشبیہہ ہے۔

اور حالت اجمالیہ کا بیان مقصود ہے۔

اس موضوع پر حضرت مولانا اشرف علی نے بڑا البصیرت افروز تبصرہ کیا ہے، لیجئے وہ بھی گوش گزار فرمالیجئے۔ فرماتے ہیں :

ان آیتوں کی بھی تفسیر حدیثوں میں آئی اور یہی تمام اکابر سلف اہل حق سے منقول ہے اور اس میں جو اشکال عقلی ونقلی کیے گئے ہیں وہ سب لاشئی محض ہیں۔ ان میں سے جو ظاہر شبہ میں ڈال سکتے ہیں ان کو مع جواب کے ذکر کرتا ہوں۔

شبہ اول قرآن مجید میں من بنی آدم من ظھورھم آیا ہے اگر تفسیر مذکور مراد ہوتی تو من آدم من ظھرہ ہوتا جواب حدیث مرفوع میں مصرح ہے اخرج من صلبہ کل ذریۃ ذرا ھا فنثرھا من یدیہ کالذر وکلمھم قبلا قال الست بربکم اخرجہ احمد والنسائی والحاکم وصححہ وغیرہم عن ابن عباس مرفوعاً پس حدیث سے تو اخراج من ظہر آدم اور قرآن سے اخراج من ظہور بنی آدم معلوم ہوا دونوں میں کوئی تعارض نہیں جیسا کہ آیت کی تفسیر میں دونوں کو جمع کر دیا ہے۔ اور اس وجہ سے جمع کی تائید دوسری روایات سے بھی آتی ہے۔ چنانچہ عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے اخذ من ظھرہ ھم اخرجہ ابن ابی شیبۃ وعبد بن حمید وابن جریر وغیرہم، اور ابن عباس سے مروی ہے ثم ردھم فی اصلاب آباءھم حتی اخرجھم قرنا بعد قرن اخرجہ ابوالشیخ بلکہ روایت ثانیہ ہی اس باب میں کافی ہے کیونکہ رد کہتے ہیں عود الی الحالۃ الاولی کو۔ معلوم ہوا کہ اخراج بھی اصلاب آباء سے ہوا تھا پس حدیث میں تو دونوں صورتیں مذکور ہوگئیں۔ رہا یہ کہ قرآن میں ایک ہی صورت کا کیوں ذکر ہے سو یا تو بنا بر غایت ظہور کے چھوڑ دیا کیونکہ جب یقیناً معلوم ہے کہ تمام ذریت نسل آدم سے ہے ہی پس خروج من صلبہ امر جلی و مشہور تھا اس لیے ذکر کی ضرورت نہ ہوئی جو خبر و مخفی وغیرہ معلوم تھا اس کو بیان فرمادیا یا بنا پر اس کے کہ اخراج الذریۃ من ظہور بنی آدم مستلزم ہے اخراج ذریۃ آدم من ظہر آدم کو کیونکہ یہ ذریت بنی آدم بھی تو ظہر آدم ہی میں تھی۔ جب بنی آدم سے ذریت کا کسی بقعہ میں اخراج ہوا تو ظہر آدم سے خود ذریت آدم کا بھی تو لازمی طور پر اخراج ہوا، جیسے صندوق میں تھیلی ہو اور تھیلی میں روپیہ تو جب روپیہ تھیلی میں سے اس طرح نکالیں کہ نکلتے ہی بقعہ خارج عن الصندوق میں آجاتے اور ایسا خروج عن الصرہ مستلزم ہوگا خروج الصرہ عن الصندوق کو بھی اور قرآن میں لفظ اخذ کے ماضی ہونے سے اور حدیث شیخین میں ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس لفظ سے قد اردت منک اھون من ذالک قد اخذت علیک فی ظھر ابیک آدم ان لا تشرک بی فابیت الا ان تشرک بی شیئاً ہے

اور بعض اہلِ باطن کے اس دعویٰ سے کہ ہم کو وہ یاد ہے جیسا کہ روح المعانی میں حضرت ذوالنون مصری رحمہ اللہ کا یہ قول کانہ الآن فی اذنی کسی شخص کے اس سوال کے جواب میں ھل تذکرہ منقول ہے اسی تفسیر کی تائید ہوتی ہے۔ یہ روایات درمنثور میں مذکور ہیں۔

شبہ ثانی کہ اتنے آدمی کھڑے کہاں ہوتے ہوں گے جواب حدیث میں آیا ہے کہ بہت سی ننھی ننھی چیونٹیوں کی طرح تھے۔ پس کوئی شبہ نہیں۔ شبہ ثالث ان میں عقل کہاں تھی۔ جواب ان کو عقل دے دی گئی تھی۔ شبہ رابع اتنے ننھے جسم میں عقل کیسے ہوگی جواب جیسے چیونٹی کو ضروریات کی سمجھ ہوتی ہے۔ شبہ خامس اس عہد سے کیا فائدہ ہوا، جواب ہم اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کا دعویٰ نہیں کرتے اس لیے اس کی تعیین ہمارے ذمہ نہیں ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اب جو عقل کے نزدیک توحید ایک امر فطری ہے کہ ذرا انصاف سے غور کیا جائے تو سمجھ میں آجاتی ہے ممکن ہے کہ عہد کا اثر ہو۔ اگر وہ عہد نہ ہوتا تو شاید ایسی سہولت نہ ہوتی جیسے کسی کو حساب سکھا دیا جائے پھر گو وہ بھول جائے لیکن اگر اس کو تعلیم دیں تو بہ نسبت اوروں کے سہولت سے سیکھ لیتا ہے[1]

امام رازی فرماتے ہیں کہ بدن انسانی میں دو قسم کے اجزاء ہیں۔ ایک اجزائے اصلیہ اور کچھ زائدہ۔ جو اجزاء اول عمر سے آخر عمر تک باقی رہتے ہیں وہ اجزائے اصلیہ ہیں اور جن اجزائے بدن میں کمی زیادتی ہوتی رہتی ہے وہ اجزائے زائدہ ہیں لہٰذا اس آیت اور احادیث میں بنی آدم کی پشتوں سے ان کی نکالنا آیا ہے سو وہ اجزائے اصلیہ کا نکالنا مراد ہے اور اصلی اور حقیقی انسان بھی اجزائے اصلیہ ہیں اور روح کا تعلق ان ہی اجزائے اصلیہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ لہٰذا حقیقی انسان جو احکام شرعیہ کا مخاطب اور مکلف ہے وہ بھی ذرات ہیں جن کے ساتھ روح متعلق ہیں۔ اور قیامت کے دن درحقیقت ان ہی اجزائے اصلیہ کو دوبارہ زندہ کیا جائے اور ان ہی اجزائے اصلیہ کے ساتھ روح متعلق کر کے حساب و کتاب اور عذاب و ثواب دیا جائے گا۔ جس طرح دنیوی زندگی میں روح کا اصل تعلق انہی اجزائے اصلیہ کے ساتھ تھا۔ اسی طرح بعث بعد الموت کے وقت روح انہی اجزائے اصلیہ کی طرف لوٹا دی جائے گی اور جس طرح دنیوی زندگی میں اجزائے اصلیہ کے ساتھ اجزائے زائدہ ملا دیے گئے تھے اسی طرح بعث بعد الموت کے وقت بھی زائد اجزاء ان کے ساتھ ملا دیے جائیں گے۔

---

[1] بیان القرآن

میثاق کی فلاسفی

۲۲۷- کہیں تم روز قیامت یہ نہ کہہ دو کہ ہمیں اس بات کی خبر نہ تھی یا یہ نہ کہہ دو کہ شرک کا آغاز تو ہمارے باپ دادا نے پہلے کیا تھا ہم تو ان کے بعد ان کی اولاد تھے کیا آپ ہمیں اس قصور میں پکڑتے ہیں جو غلط کار لوگوں نے کیا۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کی پشت سے ان کی اولاد اور ان سے ان کی اولاد نکالی۔ سب سے اقرار کرایا اپنی خدائی کا پھر پشت میں داخل کیا۔ اس سے مدعا یہ ہے کہ خدا کے رب مطلق ماننے میں ہر کوئی آپ کفایت کرتا ہے۔ باپ کی تقلید نہ چاہیے اگر باپ شرک کرے تو بیٹے کو چاہیے کہ ایمان لے آئے لہ

گویا اس آیت گرامی میں وہ غرض بتائی گئی ہے جس کے لیے ازل میں پوری نسل انسانی سے عہد لیا گیا تھا اور وہ یہ ہے کہ انسانوں میں سے جو لوگ اپنے خدا سے بغاوت کریں وہ اپنے اس جرم کے پوری طرح ذمہ دار قرار پائیں۔ انہیں اپنی صفائی میں نہ تو لاعلمی کا عذر پیش کرنے کا موقع ملے اور نہ وہ سابق نسلوں پر اپنی گمراہی کی ذمہ داری ڈال کر خود بری الذمہ ہو سکیں۔ بالفاظِ دیگر اللہ تعالیٰ اس ازلی عہد و میثاق کو اس بات پر دلیل قرار دیتا ہے کہ نوعِ انسانی میں سے ہر شخص انفرادی طور پر اللہ کے الٰہ واحد اور ربِ واحد ہونے کی شہادت اپنے اندر لیے ہوتے ہے اور اس بنا پر یہ کہنا غلط ہے کہ کوئی شخص کامل بے خبری کے سبب سے یا ایک گمراہ ماحول میں پرورش پانے کے سبب سے اپنی گمراہی کی ذمہ داری سے بالکل بری ہو سکتا ہے۔

ایک بے حد اہم سوال

یہاں یہ سوال بھی بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ اگر انسان کے اندر ابتدا ہی سے یہ اقرار موجود ہے تو اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ انسان وجود میں آنے کے بعد دین کا آغاز خالص خدا پرستی اور توحید سے کرتا لیکن ہمارے نئے فلسفی تو یہ بیان کرتے ہیں کہ انسان نے دین کا آغاز شرک سے کیا ہے۔ دُنیا میں گوناں گوں حوادث کے ظہور نے اس کے اندر مختلف ان دیکھی طاقتوں کا خوف پیدا کیا۔ اس خوف نے اس کے اندر ان دیکھی طاقتوں کی پرستش کا خیال پیدا کیا، چنانچہ اس نے ان کی پرستش شروع کر دی۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے علم میں جتنی ترقی ہوتی گئی ان وہمی معبودوں سے چھوٹ کر وہ اقرارِ توحید کی منزل تک پہنچا۔ ہماری

لہ افاداتِ شیخ الاسلام

راستے میں یہ تقریر بالکل غیر منطقی ہے۔ خوف نام ہے کسی ایسی چیز کے چھن جانے کے اندیشہ کا جو انسان کو حاصل بھی ہو اور جو عزیز و محبوب بھی ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نعمت منعم اور اس کی شکر گزاری کا شعور اور جذبہ خوف کے جذبے اور اس کے عوامل پر مقدم ہے اس لیے انسان نے دین کا آغاز خوف سے نہیں بلکہ اپنے منعم پروردگار کی شکر گزاری اور اس کی عبادت سے کیا لیکن پھر مختلف اسباب کے تحت وہ اس جادۂ مستقیم سے ہٹ کر مختلف راہوں میں بٹ گئے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ناواقف لوگ جب اپنے قیاس و گمان کی بنیاد پر "مذہب" کی تاریخ مرتب کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ انسان نے اپنی زندگی کی ابتداء شرک کی تاریکیوں سے کی پھر تدریجی ارتقاء کے ساتھ ساتھ یہ تاریکی چھٹتی گئی اور روشنی بڑھتی گئی یہاں تک کہ آدمی توحید کے مقام پر پہنچا۔ یہاں اس آیت میں قرآن اس کے برعکس یہ بتاتا ہے کہ دنیا میں انسان کی زندگی کا آغاز پوری روشنی میں ہوا ہے۔ اللہ نے سب سے پہلے عالمِ غیب میں انسانوں کو یہ بتا دیا تھا کہ حقیقت کیا ہے اور صحیح راستہ کیا ہے۔ اس کے بعد ایک مدت تک نسلِ انسانی راہِ راست پر قائم رہی اور ایک امت بنی رہی۔ پھر لوگوں نے نئے نئے راستے نکالے اور مختلف طریقے ایجاد کیے اس لیے نہیں کہ ان کو حقیقت نہیں بتائی گئی تھی بلکہ اس لیے کہ حق کو جاننے کے باوجود بعض لوگ اپنے جائز حق سے بڑھ کر امتیازات، فوائد اور منافع حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اسی خرابی کو دور کرنے کے لیے اللہ سبحانہ نے انبیاء روانہ کیے۔

قرآن کا سارا فلسفہ فی الواقع انسان کی فطرت پر مبنی ہے۔ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ جن عقائد و اعمال کی تعلیم دیتا ہے ان میں سے کوئی چیز بھی اس کے خارج سے اس پر مسلط نہیں کی گئی بلکہ اس کو ان ہی باتوں کی یاددہانی کرائی جا رہی ہے جو روزِ اول اس کے خمیر میں رکھ دی گئی ہیں۔ لیکن اس نے لذاتِ عاجلہ کے پیچھے پڑ کر ان کو نظر انداز کر دیا ہے۔ قرآن اسی وجہ سے اپنے آپ کو ذکر اور ذکریٰ کہتا ہے جس کے معنے فراموش کردہ حقائق کو یاد دلانے کے ہیں۔

اس آیت میں قرآن نے بتایا ہے کہ اللہ کی توحید کے موضوع پر روزِ قیامت بے خبری اور تقلید کا عذر مسموع نہ ہوگا۔ یہ اللہ کا فضل و انعام ہے کہ اس نے انبیاء کو روانہ کر کے ایک مزید حجت قائم کر دی ورنہ جہاں تک اللہ کی توحید کا تعلق ہے اس کے باب میں قیامت کے دن ہر شخص سے مواخذہ مجرد اس اقرار کے بنا پر جو بلیٰ شہدنا میں مذکور ہے یہ کہنا کہ ہمیں پتہ نہ تھا یا یہ کہنا کہ ہمارا گرد و پیش اور ماحول صحیح نہ تھا قطعاً قابلِ پذیرائی نہ ہوگا۔

آیت کی تفہیم میں راہِ اعتدال

آیات کی تشریح کے سلسلے میں تفسیر اور تاویل دونوں آپ پڑھ چکے ہیں۔ معتزلہ کے اعتراضات تو تفسیر پر بالکل غلط اور بے معنے ہیں۔ عالمِ مادی پر عالمِ غیب کو قیاس کرنا لغو اور مہمل بات ہے، آیت کی تشریح تفسیر کی حد تک جو پیش کی گئی ہے وہ عقل و درایت کے خلاف نہیں ہے۔ اگر تفسیر صحیح روایات سے ثابت ہو جاتے تو مان لینا عین ایمان ہے اور اگر صحیح روایات کی مہر کابی نہ ہو تو پھر فکر و غور اور سوچ وبچار سے کام لینا ناگزیر ہے۔ اس موضوع پر جس قدر احادیث آئی ہیں ان میں اجمال ہے اور صراحۃً تفسیر کی ہمنوائی نہیں کرتی ہیں۔ اہلِ تفسیر کو بھی آخری درجہ میں آیت کی تشریح کرتے ہوتے تمثیل و تشبیہ کا سہارا لینا پڑا۔ حافظ ابن کثیر، امام رازی، قاضی بیضاوی جیسے شارحین قرآن کا میلان بھی آیت کی تشریح میں تاویل کی طرف ہے اس لیے اس آیت کے موضوع پر تفسیر پر اتنا اصرار درست نہیں ہے کہ اس کو اہل السنۃ کا مختار اور تاویل کو معتزلہ کا مسلک قرار دیا جاتے جبکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ بیشتر اہل السنۃ بھی کہہ رہے ہیں کہ شاہد بنانے سے مراد شاہد فطرت ہے یعنی ہر شخص اپنی فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ اللہ سبحانہٗ کا ارشاد ہے فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا۔ صحیحین میں حضرت ابوہریرہ کی مرفوع روایت ہے کہ ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے والدین اس کو یہودی یا عیسائی کر ڈالتے ہیں۔ عیاض بن حماز مجاشعی سے مرفوعاً مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو حنیف یعنی مائل بحق پیدا کیا پھر شیطان نے آکر ان کو ان کے دین سے بہکا دیا اور جس شے کو ان پر حلال کیا تھا اس کو حرام کر ڈالا (رواہ مسلم)

اسود بن سریع سندی کہتے ہیں میں نے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمراہی میں چار جہاد کیے۔ مسلمانوں نے ایک بار حربی کفار کو قتل کر کے ان کے بچوں کو قتل کرنا شروع کیا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہوئی تو آپ کو سخت ناگوار ہوا اور فرمایا بعض لوگ کیوں بچوں پر دست درازی کرتے ہیں۔ ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا یہ مشرکین کی اولاد نہیں ہیں۔ فرمایا تم میں جو بڑے نیکوکار ہیں وہ بھی تو مشرکوں کی اولاد ہیں۔ خوب سن لو ہر شخص فطرت پر پیدا ہوتا ہے اور برابر اسی حالت پر رہتا ہے یہاں تک کہ اس کی زبان کھلنے پر اس کے والدین اس کو یہودی، نصرانی وغیرہ کا دین سکھاتے ہیں۔ ان احادیث کا منشا یہی ہے کہ خدا تعالیٰ نے تمام ارواح کو جب خاکی عنصر کا لباس پہنایا اور سب کو عالمِ شہود میں لایا تو سب کو دینِ فطرت یعنی اقرارِ نبوت اور شہادتِ توحید پر پیدا کیا۔ آیت میں اقرار، شہادت و عہد سے یہی فطری اقرار مراد ہے۔

آیات کی غرض دعوتِ حق کو سمجھانا ہے

۲۲۸ - دیکھو اس طرح ہم نشانیاں واضح طور پر پیش کرتے ہیں اور اس لیے کرتے ہیں کہ لوگ حق کو قبول کر لیں۔ موضح القرآن میں یہ قصہ یہود کو سنایا کہ وہ بھی عہد سے پھرے ہوتے ہیں جیسے مشرک پھرتے ہیں لیے اصل میں ولعلهم یرجعون کا معطوف علیہ محذوف ہے اگر اس کو ظاہر کر دیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ اس طرح ہم اپنی آیات کی تفصیل اس لیے کرتے ہیں تاکہ ہم لوگوں پر اپنی حجت قائم کریں کہ ان کے لیے کوئی ادنیٰ عذر بھی باقی نہ رہے اور تاکہ اس وضاحت کے بعد ان میں سے جو شرک سے ہو کر اپنے رب کی طرف رجوع کرنا چاہیں وہ رجوع کر لیں۔ مطلب یہ ہوا کہ انسان سے مذکورہ عہد لینے کے بعد یہ اللہ تعالیٰ کا مزید فضل و احسان ہے کہ اس نے اس عہد و میثاق کی پوری تفصیل بھی سنادی تاکہ جو اپنی غلطی سے توبہ کرنا چاہیں وہ توبہ کر لیں اور جو اپنی ضد پر اڑے رہیں وہ اس کے نتائج کا ذمہ دار اپنے ہی کو سمجھیں کسی اور کا گردن پر اس کا بار ڈالنے کی کوشش نہ کریں۔

گویا بتایا گیا ہے کہ اس بلیغ انداز پر ہم دلائل کو کھول کر اس لیے بیان کر رہے ہیں تاکہ لوگ ان کو سمجھیں اور تاکہ لوگ جہالت اور کورانہ تقلید سے ہٹ کر علم و بصیرت کی راہ اختیار کریں۔ قرآن کی یہ آیت بتا رہا ہے کہ جن لوگوں تک رسول کی دعوت نہیں پہنچی وہ شرک کے موضوع پر روزِ قیامت معذور نہ ہوں گے اور یہ بھی اس میں داخل ہے کہ یہ آیات معرفتِ حق کی صاف اور واضح نشانیوں کی نشاندہی کر رہی ہیں اور اس لیے پیش کی جا رہی ہیں تاکہ لوگ بغاوت و انحراف کی راہ چھوڑ کر بندگی و طاعت کے رویہ کی طرف واپس آئیں۔

فیصلہ کن بات

جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے کہ یہ آیت قرآنی تاویل کے پہلو سے نہیں بلکہ تفسیر کے پہلو سے اس موضوع پر فیصلہ کن ہے کہ نسل انسانی کا اصل اور ابتدائی دین توحید ہے اور شرک بہت بعد کی پیداوار ہے۔ اس موضوع پر تفصیلی تبصرہ انشاء اللہ گیارہویں جلد میں آ رہا ہے

لہ افادات شیخ الاسلام

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِي آتَيْنَاهُ آيَاتِنَا فَانسَلَخَ مِنْهَا فَأَتْبَعَهُ الشَّيْطَانُ فَكَانَ مِنَ الْغَاوِينَ ﴿۱۷۵﴾ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا وَلَٰكِنَّهُ أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوَاهُ ۚ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ الْكَلْبِ إِن تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ أَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَث ۚ ذَّٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ﴿۱۷۶﴾ سَاءَ مَثَلًا الْقَوْمُ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَأَنفُسَهُمْ كَانُوا يَظْلِمُونَ ﴿۱۷۷﴾

اور اے پیغمبر ان کو اس شخص کو حال سنائیے جسے ہم نے اپنی نشانیاں دی تھیں،[۲۲۹] لیکن پھر ایسا ہوا کہ ان کو وہ چھوڑ بیٹھا، بس شیطان نے اس کا پیچھا کیا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ گمراہوں میں سے ہو گیا۔[۲۳۰] اگر ہم چاہتے تو ہم ان نشانیوں کے ذریعے اس کا درجہ بلند کر دیتے مگر وہ پستی کا ہو رہا اور ہوائے نفس کا پیروکار بنا،[۲۳۱] تو اس کی

مثال کتے کی سی ہے مشقت میں ڈالو جب بھی ہانپے، چھوڑ دو پھر بھی ہانپے ایسی ہی مثال ان لوگوں کی ہے جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی لہٰذا اے پیغمبر یہ کہانیاں ان لوگوں کو سُنا تاکہ وہ اُن میں غور و فکر کریں[۲۳۲] - ان لوگوں کی مثال بُری ہے جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی اور اپنے ہاتھوں خود اپنا ہی نقصان کرتے رہے[۲۳۳] -

---

معانی مفردات

انسلخ ماضی ہے مصدر انسلاخ ہے مادہ سلخ ہے - ثلاثی مزید ہے اور مزید مطاوع کی حیثیت سے لازم ہے سلخت الجلد من الشاۃ فانسلخت میں نے بکری کی کھال اتار دی وہ اتر گئی سانپ کے اپنی پرانی کینچلی اتار دینے کو عربی میں انسلخت الحیۃ من جلد ھا بولتے ہیں مقصد یہ ہے کہ جس طرح سانپ اپنی پہلی کینچلی کو اتار دیتا ہے اسی طرح اس شخص نے بھی آیات الٰہیہ کو اتار پھینکا اور اس کی جگہ غوایت کا لبادہ پہن لیا - الغاوین جمع ہے اور اسم فاعل ہے غوایت سے بنا ہے اس کے معنے بہکنے اور بھٹکنے کے ہیں اس کا متعدی اغواء آتا ہے - یہاں گمراہی میں کمال مراد ہے - یلہث ، مضارع کا واحد مذکر غائب ہے لہث سے بنا ہے ، ہانپتے ہوئے زبان نکالنا -

---

غلط کار عالم کی مثال

ان آیات میں جس واقعہ کی طرف اشارہ ہوا اس کی شخصیت کے بارے میں شارحین قرآن کا اختلاف ہے کوئی کہتا ہے بلعم باعوراء ہے کوئی اُمیہ ابن الصلت کا نام لیتا ہے اور کوئی صفی بن الراہب کا ذکر کرتا ہے۔ مولانا عثمانی فرماتے ہیں، اکثر مفسرین کے نزدیک یہ آیات بلعم بن باعوراء کے حق میں نازل ہوئیں جو ایک عالم اور صاحب تصرف درویش تھا۔ بعدہٗ اللہ تعالیٰ کی ہدایات و آیات کو چھوڑ کر عورت کے اغواء اور دولت کے لالچ سے حضرت موسیٰ کے مقابلہ میں اپنے تصرفات چلانے اور ناپاک تدبیریں بتلانے کے لیے تیار ہوگیا۔ آخر موسیٰ علیہ السلام کا تو کچھ بگاڑ نہ سکا خود مردود ابدی بنا۔ آیات اللہ کا جو علم بلعم کو دیا گیا تھا اگر خدا چاہتا تو اس کے ذریعے سے بہت بلند مراتب پر اسے فائز کر دیتا۔ اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ اسے اپنے علم پر چلنے اور آیات اللہ کا اتباع کرنے کی توفیق ہوتی، لیکن ایسا نہ ہوا کیونکہ وہ خود آسمانی برکات و آیات سے منہ موڑ کر زمینی شہوات و لذات کی طرف جھک پڑا۔ وہ نفسانی خواہشات کے پیچھے چل رہا تھا اور شیطان اس کا تعاقب کرتا جارہا تھا حتیٰ کہ پکے گمراہوں اور گمراہوں کی قطار میں داخل ہوا، اس وقت اس کا حال کتے کی طرح ہو گیا جس کی زبان باہر لٹکی ہو اور برابر ہانپ رہا ہو۔ اگر فرض کرو اس پر بوجھ لاد دیں یا ڈانٹ بتلائیں یا کچھ نہ کہیں آزاد چھوڑ دیں بہر صورت ہانپتا اور زبان لٹکائے رہتا ہے کیونکہ طبعی طور پر دل کی کمزوری کی وجہ سے گرم ہوا باہر پھینکنے اور سرد و تازہ ہوا کے اندر کھینچنے پر بسہولت قادر نہیں ہے اسی طرح سفلی خواہشات میں منہ مارنے والے کتے کا حال ہوا کہ اخلاقی کمزوری کی وجہ سے "آیات اللہ" کا دیا جانا یا نہ دیا جانا، تنبیہ کرنا یا نہ کرنا دونوں حالتیں اس کے حق میں برابر ہو گئیں۔ سواء علیهم ءانذرتهم ام لم تنذرهم لا یومنون، حرصِ دنیا سے اس کی زبان باہر لٹک پڑی اور ترک کی نحوست سے بدحواسی اور پریشانی خاطر کا نقشہ برابر ہانپتے رہنے کی مثال میں ظاہر ہوا۔ ممکن ہے کہ بلعم کی باطنی و معنوی کیفیت ظاہر کرنے کے لیے صرف ایک مثال کے طور پر یہ مضمون ان تحمل علیه یلهث او تترکه یلهث ذکر کیا گیا ہو اور ہو سکتا ہے کہ دنیا و آخرت میں اس کے لیے یہ سزا تجویز کی گئی ہو کر ظاہری و حسی طور پر کتے کی طرح زبان باہر نکل پڑے اور ہمیشہ پریشان و بدحواس اور خوفزدہ آدمی کی طرح ہانپتا رہے۔ العیاذ باللہ آیات کی شان نزول کچھ ہو بہر حال یہاں اہواء پرستوں کا انجام بتلایا گیا ہے جو حق کے قبول کرنے یا پوری طرح سمجھ لینے کے بعد محض دنیوی طمع اور سفلی خواہشات کی پیروی میں احکام الٰہیہ چھوڑ کر شیطان کے اشاروں پر

چلنے لگیں اور خدا کے عہد و میثاق کی کوئی پروا نہ کریں۔ گویا یہود کو بھی متنبہ فرمادیا کہ صرف کتاب کا علم کچھ نافع نہیں ہو سکتا جب تک صحیح معنے میں اس کا اتباع نہ ہو مثل الذین حملوا التوراۃ ثم لم یحملوھا کمثل الحمار یحمل اسفارا علمائے سوء کے لیے ان آیات میں بڑا عبرتناک سبق ہے۔

۲۲۹۔ اور اے پیغمبر ان کو اس شخص کا حال سنائیے جسے ہم نے اپنی نشانیاں دی تھیں۔ ایسا کوئی شخص فی الواقع تاریخ میں گزر چکا ہے۔ کون تھا اور کہاں تھا اور کب تھا، یہ متعین نہیں اور قرآن اس میں ساکت ہے۔ اور شاید سکوت کی وجہ یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ جب کسی برائی کو مثال میں پیش کرتے ہیں تو بالعموم اس کے نام کی تصریح نہیں کرتے بلکہ اس کی شخصیت پر پردہ ڈال کر صرف اس کی بری مثال کا ذکر کر دیتے ہیں تاکہ اس کی ذاتی رسوائی کے بغیر اصل مقصد حاصل ہو جائے۔ شارحین قرآن میں ایک گروہ کا خیال ہے کہ عرب جاہلیت کے ایک حکیم شاعر امیہ ابن عبداللہ ابن الصلت ثقفی کی طرف اشارہ ہے۔ یہ غیر معمولی استعداد و ذکاوت کا آدمی تھا اور اہل کتاب کی صحبت میں رہ کر خدا پرستی و دینداری کے خیالات سے آشنا ہو گیا تھا۔ قدرتی طور پر ایسا شخص سب سے زیادہ مستحق تھا کہ اتباع حق کی اس سے توقع کی جاتی لیکن جب اسلام کا ظہور ہوا تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت اس پر گراں گزری اور اس طمع میں پڑ گیا کہ خود ہی عرب کا پیغمبر کیوں نہ ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ادراک حق کی جو توفیق ملی تھی ضائع ہو گئی اور ہوائے نفس کی پیروی نے محروم و نامراد کر دیا۔ اس صورت میں یہ تمثیل ہے اس شخص کی جو حق آشنا ہونے کے باوجود حق قبول نہیں کرتا ہے۔ اور کچھ شارحین قرآن کی رائے میں اشارہ زمانہ بنی اسرائیل کے مشہور زاہد بلعم باعورا۔ کنعانی کی طرف ہے۔ اس کا ذکر تورات میں بھی ہے۔ اس صورت میں یہ تمثیل ہے اس کی جو حق کو قبول کرکے پھر پھر گیا۔ بہر حال جس فرد متعین کی طرف بھی ہو اہل تحقیق کا اس پر اتفاق ہے کہ تمثیل عام ہے اور ہر اس شخص پر صادق آتی ہے جو دین حق کی نعمت پالینے کے بعد پھر اس کا تارک ہو گیا ہو۔ جسے ہم نے اپنی نشانیاں دی تھیں۔ اصل ارشاد الذی اتینہ اٰیاتنا یعنی اسے ہم نے اپنے احکام کے علم کی نعمت عطا کی تھی۔

کچھ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ یہ کوئی مقرر اور معین شخصیت نہیں ہے مگر اس پر شبہ یہ کیا گیا ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو تعبیر میں الذی استعمال نہ ہوتا کیونکہ یہ لفظ اصلاً معرفہ کے لیے آتا ہے۔ اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ تمثیلات میں یہ ضروری نہیں کہ اس سے کوئی معین ہی شخص مراد ہو۔ جس کا وجود خارجی بھی ہو بلکہ متکلم جس کی تمثیل پیش کرنا چاہتا ہے اس کو نگاہ میں رکھ کر اس کا ایک ایسا سراپا آراستہ کر دیتا ہے جو اس پر پوری طرح منطبق ہو جاتا ہے۔ چونکہ پیش نظر صرف واقعہ کی تصویر کشی ہوتی ہے اس وجہ سے تقاضائے بلاغت یہ ہوتا ہے کہ اس کو نکرہ کے بجائے معرفہ کے لفظوں میں ذکر

کیا جاتے تاکہ تمثیل ایک خاص شخص کی صورت میں متمثل ہو کر اس طرح سامع کے سامنے آجائے کہ گویا اس نے اس کی سرگزشت صرف سنی ہی نہیں بلکہ خود اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔

ہماری رائے یہاں الّذی سے اشارہ بنی اسرائیل کے مشہور زاہد بلعم بن باعوراء کنعانی کی طرف ہے اس کو خدا نے اپنے علم آیات کی نعمت عطا فرمائی۔ اس میں بتانا یہ ہے کہ حق کو قبول کر کے اس کے خلاف سرکشی اور بغاوت کا انجام کیا ہوتا ہے اور یہ انجام سب کے لیے یکساں ہے خواہ کرنے والا کوئی عام شہری ہو یا کرنے والا بہت بڑا علامہ اور خدا رسیدہ ولی ہو۔ اور خواہ فرد ہو اور یا پوری قوم ہو۔ ذکر اگرچہ یہاں فرد واحد کا ہے لیکن ایک پوری قوم کے لیے پیش کی گئی ہے۔

علم کے باوجود گمراہی

۲۳۰- لیکن پھر ایسا ہوا کہ ان کو وہ چھوڑ بیٹھا۔ پس شیطان نے اس کا پیچھا کیا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ گمراہوں میں سے ہو گیا۔ پہلے بتایا تھا کہ ہم نے اسے اپنی آیتوں سے نوازا تھا، اب بتایا جا رہا ہے کہ اس نے ہماری اس نوازش کی قدر نہ کی بلکہ علم کی جو پوشاک ہم نے اس کو پہنائی تھی اسے اتار دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ خدا نے بھی اپنے قانون کے مطابق اس سے معاملہ کیا خدا کا قانون یہ ہے:

من یعش عن ذکر الرحمان نقیض لہ شیطانا فھو لہ قرین

جو خدائے رحمان کی یاد سے منہ پھیرتا ہے ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں وہ ہی اس کا رفیق ہوتا ہے۔

شیطان اس کے پیچھے لگ گیا اور وہ گمراہ ہو گیا۔ مطلب یہ ہے کہ وہ آیات الٰہی کا علم رکھتا تھا یعنی حقیقت سے آگاہ تھا۔ اس علم کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ اس رویہ سے بچتا جس کو وہ غلط جانتا تھا اور وہ طرز عمل اختیار کرتا جو اسے معلوم تھا کہ یہ صحیح ہے۔ یہاں حضرت مولانا اشرف علیؒ نے یہ لطیف بات ارشاد فرمائی ہے۔ ترتیب کا تقاضا بظاہر یہ ہے کہ تعبیر یوں ہو اتبعہ الشیطان فکان من الغاوین فانسلخ منھا۔ کیونکہ شیطان پہلے تعاقب کرتا ہے پھر اس سے غوایت شروع ہوتی ہے۔ پھر وہ بڑھ کر انسلاخ ہو جاتا ہے لیکن یہاں اتبعہ الشیطان سے لزوم و دوام تعاقب مراد ہے۔ مطلق تعاقب نہیں اور وہ انسلاخ سے مؤخر ہے اور غوایت سے مراد بھی لزوم و دوام غوایت و ختم علی الکفر اور وہ بھی انسلاخ سے مؤخر ہے اور انسلاخ پر اتبعہ الشیطان کے مقدم کرنے میں اشارہ ہے کہ مطلق معصیت سے شیطان کا کامل تسلط نہیں ہو سکتا۔ جب اس کے تسلط غیر تام انسلاخ اختیار

کرلیتا ہے کہ مخالفت عمل بھی ہو انکار اعتقادی بھی ہو تب اس کا تسلط تام ہوتا ہے پس آدمی اپنے ہاتھوں بگڑتا ہے[1]

ہدایت و ضلالت میں قانون الٰہی

۲۳۱ - اور اگر ہم چاہتے تو ہم ان نشانیوں کے ذریعے اس کا درجہ بلند کر دیتے مگر وہ پستی کا ہو رہا اور ہوائے نفس کا پیرو کار بن گیا۔ یہ اس سنت الٰہی کا ذکر ہے جو اس نے ہدایت و ضلالت کے معاملے میں پسند فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جن کو اپنی آیات سے نوازتا ہے، اگر وہ ان کی قدر کرتے ہیں تو وہ ان کے ذریعے سے ان کو دین و دُنیا میں سرفرازی عطا کرتا ہے۔ ان کی عقل کو ان سے رفعت اور ان کی روح کو ان سے معراج حاصل ہوتی ہے لیکن جو لوگ ان آیات کے پانے کے بعد بھی اپنی خواہشوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو ان کی خواہشوں ہی کے حوالے کر دیتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جو شخص علم کے باوجود دُنیا کے فائدوں، لذتوں اور آرائشوں کی طرف جھک جاتے۔ خواہشات نفس کا مقابلہ کرنے کے بجائے وہ ان کے آگے سپر ڈال دے معالی امور طلب میں دُنیا کی حرص و طمع سے بالاتر ہونے کے بجائے وہ اس حرص و طمع سے ایسا مغلوب ہو جاتے کہ سب اُونچے ارادوں اور اپنی عقلی و اخلاقی ترقی کے سارے امکانات کو بالائے طاق رکھ دے اور ان تمام حدود کو توڑ کر نکل بھاگے جن کی نگہداشت کا تقاضا خود اس کا علم کر رہا تھا پھر جب وہ محض اپنی اخلاقی کمزوری کی بنا پر جانتے بوجھتے حق سے رو گرداں ہو کر بھاگ جاتے تو شیطان جو قریب ہی اس کی گھات میں لگا ہوا، اس کے پیچھے لگ جاتے اور برابر ایک پستی سے دوسری پستی میں لے جاتا ہے یہاں تک کہ ظالم نے اسے ایسے زمرے میں داخل کر کے دم لیا جو اس کے جال میں پھنس کر پوری طرح متاع عقل و ہوش گم کر بیٹھا۔

قاضی بیضاوی نے یہ بات بڑی لطیف لکھی ہے کہ اس آیت میں بندے کے رفع درجات کو اوّلاً اپنی مشیت پر معلق کیا ہے پھر بندے کے کردار سے اس کا استدراک کیا یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ اللہ کی مشیت بندے کے اس فعل کا سبب ہے جس کے ذریعہ بندہ رفع درجات کرتا ہے۔ حقیقی سبب اللہ کی مشیت ہے۔ مولانا اشرف علی فرماتے ہیں چونکہ مشیت سبب ہے عمل کا، اس لیے

---

[1] بیان القرآن

مجازاً اس طرح تعبیر کر دیا۔ اب لکنہ اخلد الی الارض کا مقابلہ واضح ہو گیا۔ بہر حال یہ تو علمی نکتہ آفرینیاں ہیں اصل بات یہ ہے کہ اگر ہماری مشیت تکوینی یہی ہوتی کہ ہم بندے کے ارادے میں دخل دے کر اسے بزجر سیدھی راہ پر ڈال دیا کرتے تو ان دلائل کی روشنی میں اسے مجبور کر دیتے کہ راہِ حق میں طوعاً و کرھاً قدم اٹھاتا جاتے لیکن ایسی جبری مداخلت ہماری حکمت کے منافی ہے۔ ہم نے طاعت و معصیت کو بندے کے لیے ارادی اور اختیاری بنایا ہے جو شخص اپنے ارادے اور اختیار سے پستی کی طرف جاتا ہے اسے اس کا شوق پورا کرنے کا موقعہ دیا جاتا ہے۔ آیت میں لو شرطیہ اور لکن استدراکیہ دونوں آتے ہیں۔ تعلیق اور استدراک کا حاصل یہ ہے کہ جس شخص کو اللہ سبحانہٗ علم کی دولت عطا فرماتے ہیں اس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ درجہ کمال حاصل کرے کیونکہ علمِ دین سرتا سر ہدایت، ارشاد اور ذکر ہے اور اس کے ذریعے درجہ کمال صرف وہ شخص حاصل کر سکتا ہے جو علمِ دین کو اس ارادے اور نیت سے حاصل کرے لیکن جو شخص یہ ارادہ ہی نہ کرے اور اس نیت سے دین کا علم حاصل نہ کرے بلکہ اسے کسبِ مال اور حصولِ جاہ کا ذریعہ بنائے تو اس کے سامنے راستہ کھلا ہوا ہے کسی کو جبراً نیک بنانا ہمارا قانون نہیں ہے۔ اس کے بعد اس کو مثال سے اور زیادہ واضح کیا ہے۔

گمراہ عالم کی تمثیل کتّے سے

۲۳۲۔ تو اس کی مثال کتے کی سی ہے، مشقت میں ڈالو جب بھی ہانپے چھوڑ دو پھر بھی ہانپے۔ ایسی ہی مثال ان لوگوں کی ہے جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی لہٰذا اے پیغمبر ان کو سُنا تا کہ وہ ان میں غور و فکر کریں۔ اب علم کی موجودگی میں بدعملی کی زندگی اپنانے اور آیات کا علم حاصل کرنے کے بعد بھی اپنی خواہشوں کے پیچھے چلنے والے کی حالت کو ایک تمثیل سے واضح کیا جا رہا ہے۔ امام مجاہد فرماتے ہیں یہ اس شخص کی مثال ہے جو قرآن پڑھتا ہے اور اس پر عمل نہیں کرتا ہے۔ دیکھئے پستی کی طرف نکلنے اور خواہشات کے پیچھے چلنے کی عالم ہو کر کیسی دلنشیں اور مطابقِ واقعہ تمثیل ہے۔ اس کتے سے اس شخص کی حالت کو تشبیہہ دی ہے جس کی ہر وقت لٹکی ہوئی زبان اور ٹپکتی ہوئی رال ایک نہ بجھنے والی آتشِ حرص اور کبھی نہ سیر ہونے والی نیت کا پتہ دیتی ہے بناتے تشبیہہ وہی ہے جس کی وجہ سے ہم اپنی اُردو زبان میں ایسے شخص کو جو دُنیا کی حرص میں اندھا ہو رہا ہو دُنیا کا کتا کہتے ہیں۔ کتے کی جبلت کیا ہے۔ حرص عدا نہ چلتے پھرتے اس کی ناک زمین سونگھنے ہی میں لگی رہتی ہے کہ شاید کہیں سے بوئے طعام آ جاتے اسے پتھر ماریے تب بھی اس کی یہ توقع دور نہیں ہوتی کہ شاید یہ چیز جو پھینکی گئی ہے کوئی ہڈی یا روٹی کا ٹکڑا

ہو۔ پیٹ کا پجاری ایک دفعہ تو لپک کر اس کو بھی دانتوں سے پکڑ ہی لیتا ہے۔ اس سے بے التفاتی کیجئے تب بھی وہ لالچ کا مارا توقعات کی ایک دُنیا دل میں لیے زبان لٹکائے ہانپتا کانپتا کھڑا ہی رہے گا۔ ساری دُنیا کو وہ بس پیٹ ہی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ کہیں کوئی بڑی سی لاش پڑی ہو جو کئی کتوں کے کھانے کو کافی ہو تو ایک کتا اس میں سے صرف اپنا حصہ لینے پر اکتفا نہ کرے گا بلکہ اسے صرف اپنے ہی لیے مخصوص رکھنا چاہے گا اور کسی دوسرے کتے کو اپنے پاس پھٹکنے نہ دے گا۔ اس شہوتِ شکم کے بعد اگر کوئی چیز اس پر غالب ہے تو وہ شہوتِ فرج ہے۔ اپنے سارے جسم میں سے صرف ایک شرمگاہ ہی وہ چیز ہے جس سے وہ دلچسپی رکھتا ہے اور اسی کو سونگھنے چاٹنے میں مشغول رہتا ہے۔ تشبیہ کا مقصد یہ ہے کہ دُنیا پرست آدمی جب علم اور ایمان کی رسّی تڑا کر بھاگتا ہے اور نفس کی اندھی خواہشات کے ہاتھ میں اپنی باگیں دے دیتا ہے تو پھر کتے کی حالت کو پہنچے بغیر نہیں رہتا۔ ہمہ تن پیٹ اور ہمہ تن شہوت۔

اگر آپ غور کریں گے تو یہی یہود کی بھی تمثیل ہے۔ اللہ سبحانہٗ نے ان کو اپنے انعامات اور تنبیہات سے آزمایا لیکن یہ اپنی خواہشوں کے ہاتھوں اتنے بے بس رہے کہ نہ انعامات سے ذرا متاثر ہوئے نہ تنبیہات سے بلکہ ہر طمع ان کی ٹھوکروں کا ذریعہ بنی اور ہر خواہش کے آگے انہوں نے گھٹنے ٹیک دیے۔ ان کی اسی حالت کی تمثیل کتے سے دی ہے۔ کتا کبھی بخطِ مستقیم نہیں چلتا بلکہ ہمیشہ زمین کو سونگھتا ہوا اور ہر پاک و ناپاک چیز کا اپنی ناک سے جائزہ لیتا ہوا چلتا ہے کہ شاید کوئی چیز مل جائے۔ اس کی رہنما اس کی آنکھ نہیں ناک ہوتی ہے۔ بالکل یہی حال یہودیوں کا ہے۔ ان کو اپنے نفس پر ذرا قابو نہیں۔ ان کی قوتِ ارادی بالکل معطل ہو چکی ہے۔ اب یہ خواہشوں کے غلام اور اپنی حرص کے بندے ہیں اور حرص و دناءت ان کی فطرتِ ثانیہ بن چکی ہے۔ ان کی شکلیں آدمیوں کی ہیں لیکن ان کی فطرت بالکل کتوں کی جبلت کے سانچے میں ڈھل چکی ہے۔

آخر میں ذالك مثل القوم الخ ہے۔ آیت بتا رہی ہے کہ یہ مثال صرف شخصی نہیں بلکہ اجتماعی ہے یعنی جیسے بگڑا ہوا شخص اس کا مصداق ہے ایسے ہی بگڑی ہوئی قوم بھی اس کا مصداق ہے۔ فرد ہو یا جماعت جو بھی علم و ہدایت پاکر اس پر نہ چلے اور زندگی اس کی ضد پر بنائے۔ توحید کا جامہ پہن کر اسے اتار پھینکے شرک کے جال میں پھنس جائے، ایمان اختیار کرکے اسے چھوڑ دے اور کفر کی زندگی اپنا لے۔ راہِ سنت اپنا کر اسے چھوڑ دے، راہِ بدعت اختیار کرے۔ راہِ نبوت کو مان کر اسے چھوڑ دے اور اس کے مقابل کی راہوں پر چلے۔ سب اس آیت گرامی کا مصداق ہیں۔ اسی لیے آخر میں فرمایا ہے لعلهم يتفكرون یعنی آپ یہ حالات بیان فرمائیے تاکہ اس پر غور و فکر سے کام لیں۔ یعنی مقصد کسی فرد متعین کی تاریخ سنانا

نہیں ہے بلکہ کل منکرین، مکذبین، ملحدین، مشرکین اور مبتدعین کی حالت پر آگاہ کرنا اور اس سے عبرت دلانا ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت ہوئی کہ سب کو آیات الٰہی کی تکذیب کرنے والی قوم کا حال سنادو کہ جن کو اللہ تعالیٰ اپنی آیات سے نوازتا ہے ان کو وہ اپنی آیات کے ذریعہ سے زمین و آسمان کی سرفرازیاں عطا فرمانا چاہتا ہے بشرطیکہ وہ ان کی قدر کریں، ان کو اپنا ئیں اور زندگی میں ان سے رہنمائی حاصل کریں اگر وہ قدر نہیں کرتے بلکہ اپنے میلان نفس اور خواہشوں ہی کے غلام بنے رہتے ہیں تو ان کا حال بھی وہی ہوتا ہے جو اس شخص کا ہوا جس کی مثال دی گئی۔ حقائق کا جو علم اسے عطا کیا گیا تھا۔ اگر وہ اس پر عمل پیرا ہوتا تو مقربین بارگاہ الٰہی میں شمار ہوتا اور مناصب رفیعہ اور مراتب عالیہ پر فائز ہوتا لیکن اس بدبخت نے نفسانی خواہشات کی ایسی پیروی کی اور حرص ولالچ کا اس پر ایسا غلبہ ہوا کہ ایسا محسوس ہونے لگا کہ اس نے ذلت سے چمٹے رہنے کا پختہ عزم کر لیا اور وہ کسی طرح بھی انہیں چھوڑ کر ہدایت کی بلندی کی طرف ایک قدم بھی اٹھانے کو تیار نہیں۔ فاالی اللہ المشتکی۔

مکذبین آیات کی بدترین مثال

۲۳۳- ان لوگوں کی مثال بری ہے جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی اور وہ اپنے ہاتھوں خود اپنا ہی نقصان کرتے رہے۔ مشرکین وغیرہم کے رد میں جا بجا قرآن نے عنکبوت، ذباب، مکڑی، مکھی وغیرہ کی مثالیں بیان کی ہیں مگر ان لوگوں کی مثال ایسی بری ہے کہ کوئی غیرت مند آدمی حتی المقدور اس کو اپنے اوپر چسپاں نہیں ہونے دے گا اور جو بے حیا غدار اپنے احوال پر چسپاں ہونے دیتا ہے وہ صرف اپنا ہی نقصان کرتا ہے [1] اس ارشاد گرامی کے ذریعے قرآن اپنے مخاطبوں کے کوزۂ ذہن میں یہ بات اتارنا چاہتا ہے کہ آیات الٰہی کی تکذیب کرنے والے اور یہ تکذیب خواہ انکار کی صورت میں ہو یا مان کر ناقدری کی صورت میں ہو جو لوگ تکذیب کی یا ناقدری کی راہ اختیار کرتے ہیں ان کی مثال بدترین ہے یعنی مثالوں میں ان کی مثال بدترین ہے اور احوال وصفات میں ان کے حالات وصفات بد سے بدتر ہیں۔ ان صفات کے لوگوں اور اس بدترین مثال مصداق لوگوں نے قرآن کے ساتھ اعراض وانحراف کا جو رویہ اختیار کر رکھا ہے اس سے وہ کسی پر نہیں بلکہ ہدایت سے محروم رہ کر اپنے پر ظلم کر رہے ہیں گویا آیات الٰہی سے اعراض کر کے شامت زدہ انسان نقصان کسی اور کا نہیں خود اپنا ہی کرتا ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

یہاں ان آیات کے مطالعہ کے بعد علامہ طیبی کا یہ تاثر بڑا برمحل ہے فرماتے ہیں :

جو شخص اس مثال کا اور ان تمام مثالوں کا جو قرآن میں مشرکین اور بتوں کے بارے میں دی گئی ہیں بنظرِ غائر مطالعہ کرے گا وہ ضرور اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ علماء سُوء ان سے بھی زیادہ بُرے ہیں۔ یہ لوگ مال وجاہ کے پیچھے پڑ کر ہلاکت کا شکار ہیں۔

صاحبِ معارف القرآن مفتی محمد شفیع صاحب نے اس تمام واقعہ سے اچھی اور کارآمد باتیں بطور نتیجہ پیش کی ہیں :

اوّل یہ کہ کسی شخص کو اپنے علم وفضل اور زہد وعبادت پر ناز نہیں کرنا چاہیے۔ حالات میں تبدیلی ہونے کا ہر وقت احتمال ہے۔ طاعت وعبادت کے ساتھ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر اور استقامت کی دُعا اور اللہ تعالیٰ پر توکل کرنا چاہیے۔

دوسرے یہ کہ ایسے مواقع اور ان کے مقدمات سے بھی آدمی کو پرہیز کرنا چاہیے جہاں اسے اپنے دین کی خرابی کا اندیشہ ہو خصوصاً مال اور اہل وعیال کی محبت میں اس انجامِ بد کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔

تیسرے یہ کہ مفسد اور گمراہ لوگوں کے ساتھ تعلق اور ان کا ہدیہ یا دعوت وغیرہ قبول کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔

چوتھے یہ کہ بے حیائی اور حرام کاری پوری قوم کے لیے تباہی اور بربادی کا سامان ہوتی ہے۔ جو قوم اپنے آپ کو بلاؤں اور آفتوں سے محفوظ رکھنا چاہیے اس کا فرض ہے کہ قوم کے افراد کو بے حیائی کے کاموں سے پورے اہتمام سے روکے۔

پانچویں یہ کہ جسے اللہ سبحانہٗ نے دین کی نعمت سے سرفراز کیا ہو وہ اس کی قدر کرے اور اپنی اصلاح سے کسی وقت بھی بے فکر نہ ہو۔

مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ
الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۷۸﴾ وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ
لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۫ وَ
لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ
اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

جس پر اللہ کامیابی کی راہ کھول دے وہی راہ پر ہے اور جس پر کامیابی کی راہ گم کر دے تو ایسے ہی لوگ ہیں جو گھاٹے میں ہیں[۲۳۴]- اور کتنے ہی جنّ اور انسان ہیں جن کو ہم نے جہنّم کے لیے پیدا کیا ہے[۲۳۵]- ان کے پاس عقل ہے مگر وہ اس سے سوچتے نہیں اور اُن کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں، کان ہیں مگر ان سے سننے کا کام نہیں لیتے یعنی وہ چوپاؤں کی طرح ہیں بلکہ ان سے زیادہ گئے گزرے، ایسے ہی یک قلم غفلت میں ڈوبے ہوتے ہیں[۲۳۶]-

معانی مفردات

ذرأنا: ذرا سے بنا ہے لغت میں اس کے معنے پیدا کرنا ہیں، خلق اس سے مختلف ہے۔ خلق کے معنے کسی چیز کو نظام و تقدیر کے ساتھ پیدا کرنا ہیں۔ قلب: کے معنے دل کے ہیں لیکن کبھی عقل کو بھی کہتے ہیں۔ لفظ قلب ان معنے میں زیادہ استعمال ہوا ہے۔ لا یفقہون، فقہ سے بنا ہے۔ فقہ کے معنے کسی چیز کو جاننا اور اسے سمجھ جانا ہیں۔ امام راغب نے فقہ کی حقیقت بڑی جامع بتائی ہے۔ یعنی موجود علم کی مدد سے غیر موجود علم تک رسائی ہو جانا، قرآن میں یہ لفظ بایں معنی اور علم میں گہرائی کے معنے میں بھی آیا ہے۔ اس پر تفصیلی بحث ہم انشاءاللہ معالم القرآن کی گیارہویں جلد میں کریں گے۔ ناظرین اس کا انتظار کریں۔

عقل و حواس کی روشنی کب بیکار ہو جاتی ہے

ان آیات میں ہدایت و ضلالت کے چہرے سے نقاب ہٹائی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ہدایت کیسے نصیب ہوتی ہے اور ضلالت کیسے آتی ہے۔

اللہ سبحانہ کا کام یہ ہے کہ نیکوں کو آہستہ آہستہ نیکی کے مزید راستے دکھائے اور نیکی کے متلاشی کو نیکی کی راہ بتائے۔ اسی کو ہدایت کہتے ہیں اور بُروں کو اس توفیق کے نہ ملنے کا نام ضلالت ہے۔ ان دونوں میں سے ایک کا ملنا انسان کی ابتدائی کوشش سے ہے۔

اس کی مثال بالکل بچہ کی سی ہے۔ بچہ چلنا اور بولنا کیونکر سیکھتا ہے۔ وہ پہلے چلنے اور بولنے کی خود کوشش کرتا ہے تو اس کے والدین اس کو بولنا اور چلنا سکھاتے ہیں، بچہ پاؤں اٹھاتا ہے اور والدین اس کے ہاتھ پکڑ کر اس کو دو چار قدم چلاتے ہیں اور اس طرح رفتہ رفتہ آہستہ آہستہ چلنا سیکھتا ہے وہ پہلے زبان ہلاتا ہے اور مبہم آوازیں نکالتا ہے تو والدین اس کو با معنے الفاظ کی تلقین کرتے ہیں۔ اس طرح دونوں کی کوشش مل کر بارآور ہوتی ہے۔ اسی طرح ہدایتِ الٰہی اور ارادۂ انسانی مل کر انسانوں کی عملی تاریخ تیار کرتے ہیں۔ ہدایت و ضلالت اللہ سبحانہ کا وہ فیضان ہے جو انسان کے اچھے یا بُرے ارادے اور کام کے جواب میں خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ انسان کی جانب سے کفر کا صدور پہلے ہوتا ہے پھر خدا کی جانب سے ضلالت کا فیضان ہوتا ہے د ما یضل بہ الا الفاسقین میں یہی بات قصر کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ اسی اضلال کو تشبیہاً ختم اور طبع سے تعبیر کیا ہے بل طبع اللّٰہ بکفرھم

ان کا کفر خدا کی مہر پر مقدم ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جب کفر کا صدور ہوتا رہتا ہے تو دلوں سے صداقت شناسی اور اثر پذیری کا جوہر سلب ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر لوگ کانوں سے پیغام حق سننے، آنکھوں سے اور دل سے سمجھنے کی کوشش کریں تو اللہ تعالیٰ اپنی ہدایت سے سرفراز فرماتے ہیں۔ قرآن نے جابجا یہ حقیقت واضح کی ہے کہ ہدایت و سعادت کی راہ عقل و تفکر کی راہ ہے اور گمراہی و شقاوت کا سرچشمہ ہے جہل کورکی اور حواس و تفکر کو بیکار کر دیتا ہے۔ جو لوگ خدا کی دی ہوئی نعمت عقل سے کام نہیں لیتے یا ہوائے نفس سے اس درجہ مغلوب ہو جاتے ہیں کہ ذہن و ادراک کی قوتیں بیکار ہو جاتی ہیں وہ کبھی ہدایت نہیں پا سکتے۔

یہاں ان آیات میں انسان کی دماغی شقاوت کی اسی حالت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

۲۳۴۔ جس پر اللہ کامیابی کی راہ کھول دے وہی راہ پر ہے اور جس پر کامیابی کی راہ گم کر دے تو ایسے ہی لوگ ہیں جو گھاٹے میں ہیں۔ علم و فضل بھی انسان کو جب ہی کام دیتا ہے کہ خدا کی ہدایت و دستگیری سے علم صحیح کے موافق چلنے کی توفیق ہو جسے وہ سیدھے راستہ پر چلنے کی توفیق نہ دے، وہ کتنی ہی بڑی علمی فضیلت و قابلیت رکھتا ہو، سمجھ لو کہ خسارے اور ٹوٹے کے سوا کچھ نہیں۔ اس لیے انسان اپنے علم پر مغرور نہ ہو بلکہ دائماً خدا سے ہدایت و توفیق کا طلبگار رہے۔ لہ

اس آیت میں دراصل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی اور ساتھ ہی قریش کو دھمکی بھی۔ مطلب یہ ہے کہ ہدایت وہی پائیں گے جن کو خدا ہدایت کی توفیق بخشے گا اور خدا توفیق ان کو ہی دیتا ہے جو ہدایت کے طالب ہوں اور خدا کی عطا کردہ صلاحیتوں کو استعمال کریں۔ اگر ایک شخص علم و فضل کے باوجود اپنی آنکھوں اور اپنے دل و دماغ پر خواہشات کی پٹی باندھ کر زندگی گزارتا ہے۔ خدا اسے گمراہی کے لیے چھوڑتا ہے۔ وہ انسان جو اندھا اور بہرا بنتا ہے اور حق کا پیغام نہ سنتا ہے اور نہ اس پر عمل کرتا ہے۔ خدا اس کو اندھا بہرا بنا کر پھر اس کو دیکھنے اور سننے کی تکلیف نہیں دیتا (فانت تھدی العمی ولو کانوا لا مبصرون)۔ میں اسی حالت کی طرف اشارا ہے جو جابجا قرآن میں بیان کی گئی ہے یعنی جہل و فساد اور تعصب و تقلید کے جمود سے ایسی حالت کا پیدا ہو جانا انسان کی عقل و بصیرت کو یک قلم معطل کر دیتی ہے، اور وہ اس قابل نہیں رہتا کہ سچائی اور حقیقت کا ادراک کر سکے۔ اس آیت میں بتایا ہے کہ یہ حالت اس لیے پیش نہیں آئی کہ خدا نے کسی کو اس پر مجبور کر دیا ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو یہ ظلم ہوتا اور خدا کا یہ قانون نہیں کہ کسی پر ظلم ہو۔ یہ تو خود انسان کا کرتوت ہی ہے جو خدا کی دی ہوئی روشنی ضائع

لہ افادات شیخ الاسلام

کر کے اندھا، بہرا بن جاتا ہے، چنانچہ آگے آیت میں بتایا جارہا ہے کہ کن لوگوں کو ہدایت کے فیضان سے محروم کیا جاتا ہے۔

ہدایت وضلالت کی کشمکش

۲۳۵۔ اور کتنے ہی انسان اور جن ہیں جن کو ہم نے جہنم کے لیے پیدا کیا ہے۔ یہ آیت بظاہر آیت و ما خلقت الجن والانس الا لیعبدون کے خلاف معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے بعض مفسرین نے وہاں لیعبدون میں لام غایت اور یہاں لجہنم میں لام عاقبت مراد لیا ہے۔ یعنی سب کے پیدا کرنے سے تو مطلوب اصلی تو عبادت ہے لیکن بہت سے جن و انس چونکہ اس مطلب کو پورا نہ کریں گے اور انجام کار دوزخ میں بھیجے جائیں گے۔ اس انجام کے لحاظ سے کہہ سکتے ہیں کہ گویا وہ دوزخ ہی کے لیے پیدا ہوئے ہیں کما فی قولہ تعالیٰ فالتقطہ آل فرعون لیکون لھم عدواً وحزناً باقی محققین کے نزدیک اس تکلیف کی ضرورت نہیں وہ دونوں جگہ لام غایت ہی بتاتے ہیں، مگر لیعبدون میں غایت تشریعی ہے اور یہاں لجہنم میں غایت تکوینی ہے۔[1]

عموماً یہاں لوگ جبر و قدر کے مسئلہ کو چھیڑتے ہیں یعنی انسان اپنے عمل میں آزاد و خود مختار ہے یا مجبور؟ حالانکہ یہ سر رشتہ کائنات کا وہ عقدہ ہے جس کا حل نہ صرف کسی مذہب کے ناخن سے نہیں ہوتا بلکہ عقل کے ناخن سے بھی نہیں ہو سکتا جس اہل مذہب ارادۂ الٰہی اور ارادۂ انسانی کی باہمی تطبیق میں حیران ہیں اسی طرح فلسفہ الٰہیات کے معلم علم الٰہی اور انسان کی عملی آزادی کے درمیان اور فلسفہ اخلاق والے انسان کی آزادیٔ عمل اور اس کے موروثی اثرات، فطری جذبات، اور ماحول کی تاثیرات کی مجبوریوں کے درمیان جو تصادم ہے اس کو بمشکل ہی بچا سکتے ہیں۔

دُنیا کے عام مذاہب کا یہی حال تھا۔ پھر دھاگہ میں گرہ اسی طرح پڑی ہوتی تھی اور اس کے حل کی دو ہی صورتیں انہوں نے نکالی تھیں۔ یا تو سرے سے اس سے خاموشی برتی جائے اور دبے پاؤں اس راستہ سے گزر جائیں بالبحث حری تو جبری کی طرف ان کا میلان نمایاں تھا۔ یہ جبری ہے جس کے نتیجے میں ہندو مذہب میں تناسخ اور لوگوں کی اور عیسائی مذہب میں کفارہ کی اور یہودی مذہب میں نسلی شرافت کے مسائل اور مذاہب پیدا ہو گئے۔ دوسری طرف مجوسی تھے جنہوں نے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

انسانی اختیارات و آزادی کو یہاں تک بڑھادیا تھا کہ خود خدا بھی اس کے آگے مجبور تھا۔ خدا کو نہ صرف انسانوں کے بلکہ فرشتوں کے کاموں پر کوئی قابو حاصل نہ تھا۔ غرض حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے مذاہب نے بھی دو راہیں اختیار کی تھیں۔ تمام انبیاء میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت وہ نمایاں شخصیت ہے جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ اپنے اس دیرینہ راز کو نمایاں کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہاں دو صداقتیں ہیں، اور دونوں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ تمام دنیا اور اس کے ذرے ذرے پر قدرت مطلقہ رکھتا ہے۔ آسمان و زمین، بحر و بر میں کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کے ارادے اور مشیت کے بغیر حرکت کر سکے۔ اس طرح انسان اور اس کے تمام اعمال بھی اسی کی قدرت اور مشیت کے تحت ہیں۔ یہ وہ عقیدہ ہے جو ہر مذہب کی اور خصوصاً اسلام کی جان ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو مذہب کی قوت بے اثر ہو کر رہ جائے اور ایک ایسا خدا ماننا لازم آجائے جس کے اختیارات محدود اور جس کی قدرتیں ناقص اور جس کی شہنشاہی ناتمام ہو۔

دوسری طرف یہ بھی صداقت ہے کہ دوسری مخلوقات کو نہ سہی مگر انسان کو اپنے اعمال کے کرنے نہ کرنے کا کسی نہ کسی طرح اختیار ضرور بخشا ہے۔ اگر یہ اختیار تسلیم نہ کیا جائے اور انسان کو اسی طرح سراپا مجبور مان لیا جائے جس طرح دوسری مخلوقات ہے تو پھر انسان کے لیے خیر و شر کا امتیاز، جزا و سزا، شریعت، کتاب، تعلیم اور انبیاء کی بعثت یہ تمام چیزیں بیکار محض ہو جائیں۔ ظلم و انصاف نام کی دنیا میں کوئی چیز باقی نہ رہے۔ انسان کا اپنے کسی فعل پر قابل مدح یا قابل ملامت ہونا بے معنے ہو جائے، کسی اچھے کام پر خدا کا اس کو انعام اور برے کام پہ عذاب سراسر ظلم بن جائے بلکہ اس دنیا کی عدالت میں بھی وہ اپنے کسی فعل کا ذمہ دار نہ ٹھہرے۔

الغرض یہ دونوں صداقتیں اپنی اپنی جگہ درست ہیں ایک یہ کہ خدا کو اپنی مخلوقات پر قدرت تامہ حاصل ہے اور اس کی مشیت و ارادہ ہر جز و کل پر حاوی ہے اور دوسری یہ کہ انسان کو بھی اپنے عمل پر کوئی نہ کوئی ایسا اختیار حاصل ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے اس عمل کا ذمہ دار بنتا ہے۔ نیکی کے کاموں کے کرنے پر وہ تعریف کا اور بدی کے کاموں پر ملامت کا سزاوار ہے۔

قرآن نے ان دونوں صداقتوں کو پوری تفصیل اور وضاحت کے ساتھ ساتھ اپنی اپنی جگہ پر تسلیم کیا ہے اور ان کی تبلیغ کی ہے۔ ایک طرف قرآن کہتا ہے خدا کی اجازت کے بغیر کوئی پتہ نہیں ہلتا۔

ما تسقط من ورقة الا یعلمها و لا حبة فی ظلمات الارض و لا رطب و لا یابس الا فی کتاب مبین۔

اور دوسری طرف وہ کہتا ہے کہ ہر جان اپنے کاموں کے ہاتھوں گرو ہے ،

کلُّ نفسٍ بما کسبت رھینۃ

یعنی خدا کی ہمہ گیر قدرت وسیع اختیارات اور ناقابلِ رد مشیت کے باوجود اس نے خود اپنے اختیار اپنی مشیت اور خود اپنی حکمت سے انسان کو ارادہ اور ارادے کے مطابق اپنے کام کرنے والے اعضا کو ہلانے کی مشروط طاقت بخشی ہے۔ ارادہ و اختیار کے مطابق عمل کرنے کی محدود قدرت اس کی ذمہ داری کا تکلیف، بازپرس اور مواخذہ کی بنیاد ہے۔ اسی پر اس کے اعمال، اخلاق اور معاملات کی پوری عمارت کھڑی ہے اس لیے انسان پر اس کے کسی ایسے عمل کی ذمہ داری قانوناً نہیں۔ جو اس کے ارادے اور نیت سے صادر نہ ہوئی بلکہ اس کے کرنے نہ کرنے میں وہ بے اختیار و مجبور رہا۔ اس تطبیق سے نہ تو خدائے پاک کی قدرت و اختیار کی وسعت اور پہنائیوں میں فرق آتا ہے اور نہ انسان کا تمامتر مجبور ہونا لازم آتا ہے۔ خدا جب چاہے انسان سے اپنے دیے ہوئے اختیار کو چھین لے لیکن وہ ایک وقت مقرر تک اپنے بنائے ہوئے قانون اور فرمائے ہوئے وعدے کے مطابق وہ اس کو اس اختیار و قدرت سے محروم نہیں کرتا، اس لیے ہر انسان اپنی جہنم اور اپنی جنت آپ بناتا ہے۔

اس روشنی میں آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے ایسے لوگ پیدا کیے ہیں۔ جو قصد و ارادہ سے طلب ہدایت نہ کریں گے ان کو ہدایت نصیب نہ ہو گی اس لیے لامحالہ ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔ اللہ سبحانہٗ کی طرف اس کا انتساب محض تکوینی حیثیت سے یعنی بطور علۃ العلل کے ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم نے ان کو پیدا ہی اس غرض کے لیے کیا تھا کہ وہ جہنم میں جائیں گے اور ان کو وجود میں لاتے وقت ہی یہ ارادہ کر لیا تھا کہ ان کو دوزخ کا ایندھن بنانا ہے بلکہ صحیح مطلب یہ ہے کہ ہم نے تو ان کو پیدا کیا تھا دل و دماغ، آنکھیں اور کان دے کر مگر ظالموں نے ان سے کوئی کام نہیں لیا اور اپنی غلط کاریوں کی بدولت آخر کار جہنم کا ایندھن بن گئے۔ اسی کو کچھ شارحینِ قرآن نے اس طرح پیش کیا ہے لجہنم لامِ عاقبت ہے یعنی ان کی غرضِ آفرینش ان کو جہنم میں ڈالنا نہیں لیکن وہ اعمال ایسے کریں گے جس کا نتیجہ یہ ہو کر رہے گا۔ اس توضیح کی روشنی میں اس آیت کا و ماخلقت الجن والانس الا لیعبدون سے کوئی تعارض نہیں یعنی انسانوں اور جنوں کی حقیقی غرض و غایت ہی یہ ہے کہ اللہ کی عبادت کریں اس قسم کے دوسرے مواقع پر شارحینِ قرآن نے لامِ عاقبت بتایا ہے مثلاً

انا عرضنا الامانۃ علی السماوات والارض والجبال فابین ان یحملنھا و حملھا الانسان انہٗ کان ظلوماً جھولا لیعذب اللہ

المنافقین والمنافقات والمشرکین والمشرکات و یتوب اللّٰہ علی المومنین والمومنات وکان اللّٰہ غفوراً رحیما۔

میں لام کو لام عاقبت ہی قرار دیا ہے۔

علامہ آلوسی نے اس پر طویل بحث کی ہے۔ امام رازی اور ابن الجوزی نے بھی لام عاقبت ہی کو راجح قرار دیا ہے۔ خبر نہیں حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتی صاحب تفسیر مظہری کو اس میں بوئے اعتزال کیسے آگئی۔

ہدایت سے محروم رہنے والے

۲۳۶۔ ان کے پاس عقل ہے مگر وہ اس سے سوچتے نہیں اور اُن کے پاس آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں کان ہیں مگر ان سے سننے کا کام نہیں لیتے، وہ چوپاؤں کی طرح ہیں بلکہ ان سے زیادہ گئے گزرے ایسے ہی لوگ یک قلم غفلت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ یعنی دل، کان، آنکھ سب کچھ موجود ہیں لیکن نہ دل سے آیات اللہ میں غور کرتے ہیں، نہ قدرت کے نشانات کا بنظر تعمق و اعتبار مطالعہ کرتے ہیں اور نہ خدائی باتوں کو بسمع قبول سنتے ہیں۔ جس طرح چوپائے جانوروں کے تمام ادراکات صرف کھانے پینے اور بہیمی جذبات کے دائرے میں محدود ہوتے ہیں۔ یہی حال ان کا ہے کہ دل و دماغ، ہاتھ پاؤں، کان، آنکھ غرض خدا کی دی ہوئی سب قوتیں محض دُنیوی لذائذ اور مادی خواہشات کی تحصیل و تکمیل کے لیے وقف ہیں۔ انسانی کمالات اور ملکوتی خصال کے اکتساب سے کوئی سروکار نہیں بلکہ غور کیا جاتے تو ان کا حال ایک طرح چوپائے جانوروں سے بھی بدتر ہے۔ جانور مالک کے بلانے پر چلا آتا ہے، اس کے ڈانٹنے سے رک جاتا ہے۔ یہ کبھی مالک کی آواز پر کان نہیں دھرتے پھر جانور اپنے فطری قوی سے وہ ہی کام لیتے ہیں جو قدرت نے ان کے لیے مقرر کردیا ہے زیادہ کی اُن میں استعداد ہی نہیں لیکن ان لوگوں میں روحانی و عرفانی ترقیات کی جو فطری قوت و استعداد ودیعت کی گئی تھی اسے مہلک، غفلت اور بے راہ روی سے خود اپنے ہاتھوں ضائع اور معطل کردیا گیا۔ [1]

یہاں یہ بتایا ہے کہ ہدایت سے محروم کون لوگ ہوتے ہیں گویا لھم قلوب لا یفقھون بھا

---

[1] افادات شیخ الاسلام

استیناف بیانی ہے یعنی مخاطبوں کے ذہن میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ ان کا انجام جہنم کیوں ہے ؟ یا یہ جہنم کے لیے کیوں مخلوق ہوتے ہیں ۔ اس کے جواب میں ارشاد ہوتا ہے کہ اس لیے ہوتے ہیں کہ ان کو خدا نے دل و دماغ تو دیے ہیں لیکن وہ ان سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے ، ان کو آنکھیں عطا کی ہیں لیکن وہ ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے ، اُن کو کان تو عنایت فرمائے ہیں مگر وہ ان سے سننے کا کام نہیں لیتے ۔ یعنی اپنی عقلوں میں یہ بات نہیں سوچتے کہ ان کو نیک بنانے والی اور ان میں تزکیہ پیدا کرنے والی چیز کیا ہے ۔ توحید الٰہی جس کے ذریعے انسان اپنے فکر میں خرافات و اوہام سے نجات پاتا ہے اور ذلت و حقارت سے محفوظ ہوتا ہے ۔ اس پر غور نہیں کرتے ۔ کیونکہ ایمان و یقین کے ساتھ اللہ سبحانہٗ سے عابدانہ تعلقات پیدا کرے گا ۔ اس کی ذات میں رفعت اور بلندی آئے گی ۔ اپنے کو در بدر کا بھکاری بنا کر رُسوائیوں کا نشانہ نہ بنائے گا ۔ اللہ کے سوا نہ کسی کو پکارے گا نہ اللہ کے سوا کسی سے ڈرے گا نہ کسی کو اپنے اعتماد اور بھروسہ کا جائے پناہ بنائے گا بلکہ اپنی تمام حاجتوں ، تمام ضرورتوں میں اللہ کو پکارے گا ۔ اگر عالمِ مادی میں اسباب کی زنجیر پر قدرت ہوگی تو اسباب کی راہ سے تلاش کرے گا اور اگر اسباب کا علم نہ ہوگا تو اللہ سے علمِ اسباب کی درخواست کرے گا ۔ بیماری کا علاج حکما سے کرائے گا ۔ مسائل علمیہ میں علمائے راسخین سے دریافت کرے گا ۔ مطلب یہ ہے کہ سمجھنے ، دیکھنے اور سننے کی جو قوتیں اللہ نے دے رکھی ہیں ان سے قطعاً کام نہیں لیتے ۔ اپنی ساری صلاحیتیں بس اپنی ہوائے نفس کی تابع کر رکھی ہیں ۔ ان سے ہٹ کر کسی چیز کو سننے ، سمجھنے اور اس کو اختیار کرنے کا ان میں داعیہ نہیں پایا جاتا ۔ فرمایا کہ یہ لوگ چوپایوں کی طرح بلکہ ان سے بھی زیادہ بے عقل ہیں ۔ چوپایوں کی مانند اس لیے ہیں کہ جس طرح چوپایوں کی طلب و جستجو بس اپنے پیٹ اور تن کی مطلوبات ہی تک محدود ہوتی ہے ۔ اسی طرح ان کی تگ و دو بھی اپنی مادی ضروریات و خواہشات ہی تک محدود ہے اور چوپایوں سے زیادہ بے عقل اس لیے ہیں کہ چوپائے بہرحال اپنی جبلت کی تمام صلاحیتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں اس میں وہ کوئی کمی نہیں کرتے لیکن انسان کی فطرت کے اندر قدرت نے جو اعلیٰ صلاحیتیں رکھی ہیں ان سے نہ صرف یہ کہ وہ حقیقی فائدہ نہیں اٹھاتا بلکہ بسا اوقات اس سے ایسی حرکتیں صادر ہوتی ہیں جو ایک بیل اور گدھے سے بھی نہیں ہوتی ہیں ۔ مثلاً انسان انسان ہو کر اتنا بے عقل اور کج فہم بن جاتا ہے کہ درختوں پتھروں اور جانوروں کی پرستش شروع کر دیتا ہے لیکن ایک گدھا یا بیل ایسی بے عقلی کبھی نہیں کر سکتا ۔ اس سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ یہ جو فرمایا کہ ہم نے جہنم کے لیے پیدا کیا تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کو ماؤں کے پیٹوں سے جہنم کے لیے پیدا کیا ہے ۔ ماں کے پیٹ سے تو اللہ تعالیٰ نے دل ، سمع ، بصر کی صلاحیتیں دے کر پیدا کیا ہے ۔ لیکن قانون یہ ہے کہ جو ان صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائیں گے اللہ تعالیٰ ان کی رہنمائی جنت کی طرف کرے گا ۔ اور جو فائدہ نہیں اُٹھائیں گے ان کا انجام بہرحال جہنم ہے ۔

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۖ وَذَرُوا الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْۤ اَسْمَآىِٕهٖ ؕ سَیُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸۰﴾

اللہ ہی اچھے ناموں کا مستحق ہے لہٰذا تم اللہ کو اچھے ناموں سے پکارو [۲۳۷]۔ اور جو لوگ اس کے ناموں میں کج روی اختیار کیے ہوتے ہیں اُن کو چھوڑ دو، وہ وقت دُور نہیں کہ اُن کو اپنے کرتوتوں کا ضرور بدلہ ملے گا۔ [۲۳۸]

معانی مفردات

یلحدون: مضارع معروف الحاد سے بنا ہے مادہ لحد ہے اس کے معنے ہٹنا اور ٹیڑھا ہونا ہیں۔ اسی سے میت کے لیے قبر میں اس گڑھے کو جو درمیان سے جانب قبلہ ہی ہٹا ہوتا ہے لحد کہتے ہیں، ور اگر درمیان قبر میں ہو تو اسے شق کہتے ہیں۔ لحد افضل ہے لحد القبر اور الحد القبر دونوں بولا جاتا ہے یعنی قبر میں لحد بنائی۔ اسی سے الحد السھم الھدف تیر نشانہ سے ہٹ گیا۔ چونکہ وسط خیر الامور ہوتا ہے اس لیے درمیان سے ہٹنا برا ہوتا ہے اور اسی لحاظ سے حرم کی بے حرمتی کرنے پر فلان الحد فی الحرام بولا جاتا ہے،

اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات

سورت قریب ختم ہے اس لیے خاتمہ کلام کو نصیحت اور ملامت کا آمیزہ بنا کر پیش کیا ہے۔ یہاں اہل

ایمان کو متنبہ کیا ہے کہ تم غفلت اختیار نہ کرنا یا یوں کہہ دیجیے کہ پہلی آیت میں غافلوں کا ذکر کیا تھا اور اب اس غفلت کا علاج بتایا جا رہا ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ اللہ کو اس کے اچھے ناموں سے پکارو۔ انسان اپنی زبان میں اشیا کے جو نام رکھتا ہے وہ دراصل اس تصور پر مبنی ہوتے ہیں جو اس کے ذہن میں ان اشیا کے متعلق ہوا کرتا ہے۔ تصور کا نقص نام کے نقص کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور نام کا نقص تصور کے نقص پر دلالت کرتا ہے۔ پھر اشیا کے ساتھ انسان کا تعلق اور معاملہ بھی لازماً اس تصور ہی پر مبنی ہوتا ہے جو وہ اپنے ذہن میں اس کے متعلق رکھتا ہے۔ تصور کی خرابی تعلق کی خرابی میں رونما ہوتی ہے اور تصور کی صحت و درستگی، تعلق کی صحت و درستگی میں نمایاں ہو کر رہتی ہے اگر یہ حقیقت دنیا کی تمام چیزوں کے معاملے میں صحیح ہے تو اسی طرح اللہ تعالیٰ کے معاملے میں بھی صحیح ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے خواہ وہ اسماء ذات ہوں یا اسماء صفات تجویز کرنے میں انسان جو غلطیاں کرتا ہے وہ دراصل اللہ کی ذات و صفات کے متعلق اس کے عقیدے کی غلطی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ پھر اللہ سبحانہ کے اپنے تصور و عقیدے میں انسان جتنی اور جیسی غلطی کرتا ہے اتنی ہی اور ویسی ہی غلطی اس سے اپنی زندگی کے پورے اخلاقی رویہ کی تشکیل میں بھی ہوتی ہے کیونکہ انسان کے اخلاقی رویہ کی تشکیل تمام تر منحصر ہے۔ اس تصور پر جو اس نے خدا کے بارے میں اور خدا کے ساتھ اپنے اور کائنات کے تعلق کے بارے میں قائم کیا ہو، اسی لیے فرمایا کہ خدا کے لیے اچھے نام ہی موزوں ہیں اسے اچھے ناموں سے یاد کرنا چاہیے۔ اس کے نام تجویز کرنے میں الحاد بدترین چیز ہے۔

۲۳۷۔ اللہ ہی اچھے ناموں کا مستحق ہے لہٰذا تم اللہ کو اچھے ناموں سے پکارو۔ غافلین کا حال ذکر فرما کر مومنین کو متنبہ فرمایا ہے کہ تم غفلت اختیار نہ کرنا، غفلت دور کرنے والی چیز خدا کی یاد ہے سو تم ہمیشہ اسے اچھے ناموں سے پکارو اور اچھی صفات سے یاد کرو۔ [۱]

قرآن نے اللہ سبحانہ کی صفات کا جو تصور ہم میں پیدا کرنا چاہا ہے وہ سرتاسر حسن و خوبی کا تصور ہے چنانچہ وہ خدا کی تمام صفتوں کو حسنیٰ قرار دیتا ہے یعنی خوبی و کمال کی صفتیں، یہ صفتیں کیا ہیں، قرآن نے جابجا بیان کی ہیں اور شمار کی گئیں تو ۹۹ نکلی ہیں۔ ان تمام صفتوں کے معانی پر غور کرو گے تو معلوم ہو جائے گا کہ قرآن کا تصور کس درجہ بلند اور کامل ہے۔ صرف ان صفات کے معانی پر تدبر کر کے ہم کائنات ہستی کے بے شمار اسرار و دقائق کی معرفت حاصل کر سکتے ہیں کیونکہ یہاں جو کچھ ہے انہی صفات کا ظہور ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء صفات کا مسئلہ قرآن کی ان اہم اصلاحات میں سے ہے جن

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

سے نہ صرف عرب کے جاہل ناآشنا تھے بلکہ دُنیا کے بڑے بڑے مذاہب بھی ان کے متعلق غلطیوں میں مبتلا تھے۔ یہودیوں کے اسفار اور صحیفوں میں خدائے برحق کا اصلی نام یہودا تھا مگر کبھی عام یہودیوں کو اس مقدس نام کے زبان پر لانے کی اجازت نہ تھی۔ دوسرا عام نام "ایم" ہے جو ہر موقع پر استعمال ہوتا ہے۔ ان دو کے علاوہ خدا کے بیسیوں نام اور اسماء جو درحقیقت اس کے اوصاف ذاتی اور اعمال ربانی کے ترجمان ہیں۔ تورات کا دفتر ان کے ذکر سے بالکل خالی ہے۔ صفاتِ الٰہی میں سے جو صفت یہودی صحیفوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ وہ فوجوں والا خدا یعنی رب الافواج ہے جو صرف خدا کی صفاتِ جلالی کا مظہر ہے۔ عیسائیوں کی انجیل اور مذہبی کتابوں میں باپ کا لفظ خدا کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اس لفظ کی حقیقت اور خدا پر اس کے اطلاق سے مقصود کیا ہے۔ گوشت پوست اور مادیت سے بھرے ہوتے لفظ کا خدا پر مجازاً اطلاق بھی کہاں تک جائز ہے اور اس سے اس مذہب میں کہاں تک غلطیاں پھیلیں۔ ان باتوں کو چھوڑ کر بھی دیکھئے تو یہ صرف خدا کی حمایٔ صفات کی ناقص اور مادی تعبیر ہے۔ عیسائیت میں فلسفہ کی آمیزش نے تثلیث کے اختراعی عقیدہ کو اسی مسئلہ صفات کے پردے میں چھپا لیا۔

ہندوؤں میں اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کی نیرنگی نظر آتی ہے لیکن ہر ہر صفت نے ان کے ہاں ایک مستقل وجود حاصل کر لیا ہے اور خود خدا ہر قسم کی صفات سے خالی اور مجرد رہ گیا ہے۔

اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ اس مسئلہ کی غلط تعبیر نے دُنیا میں کتنی گمراہیاں پیدا کی ہیں۔

قرآن نے انسانوں کے ان تمام فاسد خیالات کو باطل ٹھہرایا ہے، ان کے غلط عقیدوں کی تصحیح کی اور ربانی ہدایت کے نور سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے سراج رسالت منیر بن کر جس طرح حقیقت کو روشن کیا وہ نبوتِ محمدی کے عظیم کارناموں میں ہے۔

آپ نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ گنتی اور شمار کی حد سے باہر ہیں۔ اور اس کی باتوں کی کوئی انتہا نہیں۔ آپ نے یہ دُعا سکھائی۔

اللھم انی اسالک بکل اسم ھو لک سمیت بہ نفسک او انزلتہ فی کتابک او علمتہ احداً من خلقک او استاثرت فی علم الغیب عندک۔

اے اللہ تیرے ہر اس نام کے وسیلہ سے جو تو نے اپنا رکھا یا کتاب میں اتارا یا کسی مخلوق کو سکھایا یا اپنے لیے اپنے علم غیب میں اس کو چھپا یا کیا میں تجھ سے مانگتا ہوں۔

قرآن اللہ تعالیٰ کے تمام اوصافِ حمیدہ اور اسمائے حسنہ سے بھرا ہوا ہے بلکہ اس کا صفحہ صفحہ

اللہ سبحانہٗ کے اسماء صفات کی جلوہ گریوں سے معمور ہے۔ قرآن کا کوئی رکوع ہوگا جس کا خاتمہ خدا کی توصیف اور حمد پر نہ ہو۔ اور یہ تمام اوصاف اور نام اس عشق و محبت کو نمایاں کرتے ہیں جو اس محبوب ازل اور نور عالم کے ساتھ ہر پیرو کے دل میں ہونا چاہیے۔

قرآن پاک اور احادیث میں اللہ سبحانہٗ کے سو سے زیادہ نام اور اوصاف آئے ہیں۔ صحیح احادیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اللہ سبحانہٗ کے ننانوے نام ہیں۔ جو ان کو محفوظ رکھے یا نگاہ میں رکھے وہ جنت میں داخل ہوگا۔ اللہ سبحانہٗ طاق ہے وہ طاق عدد کو پسند کرتا ہے۔ آخری فقرہ اس علت کو ظاہر کرتا ہے کہ ۹۹ نام کیوں ہیں ۱۰۰ کیوں مقرر نہیں کیے گئے۔ یہ اس لیے کہ اگر پورے ۱۰۰ ہوتے تو عدد طاق نہ رہتا اور اس سے توحید کی نشاندہی نہ ہوتی۔

صحیح احادیث میں صرف اسی قدر ہے یعنی صرف ۹۹ کی تعداد بتائی گئی ہے۔ ۹۹ کی تفصیل سے بحث نہیں کی گئی۔ لیکن ترمذی اور حدیث کی دوسرے درجہ کی کتابوں میں ان ناموں کی تفصیل بھی پیش کی گئی ہے مگر محدثین نے عموماً یہاں تک کہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں بھی لکھا ہے کہ یہ تفصیل والی روایات ضعیف ہیں۔ پھر ان روایتوں میں بعض ناموں کا ردّ و بدل بھی ہے اور کچھ ایسے نام بھی ہیں جو قرآن میں مذکور نہیں ہیں۔ اور بعض قرآن میں ذکر کردہ نام ان حدیثوں میں مذکور نہیں ہیں۔ اسی لیے محققین کا فیصلہ یہ ہے کہ ان روایتوں میں ناموں کا انتخاب راویوں نے خود اپنی تلاش و جستجو سے کیا ہے۔ اس بنا پر ان روایتوں سے یہ شبہ نہ ہونا چاہیے کہ اسماء الٰہی صرف ننانوے میں منحصر ہیں۔ بڑے بڑے ائمہ اور محدثین مثلاً عبدالعزیز یحییٰ، ابوبکر بن عربی، امام نووی، حافظ ابن حجر، علامہ خطابی، حافظ ابن تیمیہ اور علامہ قرطبی نے تصریح کی ہے کہ اسماء الٰہی ننانوے میں محصور نہیں ہیں۔ اور یہ بھی تصریح ملتی ہے کہ اسماء و صفات الٰہی محدود نہیں ہیں اور اس پر محدثین نے حضرت عبداللہ بن مسعود کی ان احادیث سے جن میں تصریح ہے کہ بکل اسم ھو لک سمیت بہ نفسک استدلال کیا ہے۔ ابن کثیر اسی حدیث کو دلیل بنا کر لکھتے ہیں کہ اسماء حسنیٰ ۹۹ میں منحصر نہیں ہیں۔

بہرحال قرآن حکیم اور احادیث کے تتبع سے اہل علم نے ۹۹ ناموں کا پتہ چلایا ہے اور ان کو الگ الگ ایک ایک کرکے گنایا ہے یہ تمام نام وہ ہیں جو بطور علم اور بطور صفت قرآن حکیم میں آئے ہیں یا افعال کی حیثیت سے خدا کی طرف منسوب ہیں اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دعاؤں میں ان کی تعلیم دی ہے۔ ہم ذیل میں بہ ترتیب ایک ایک نام لکھتے ہیں اور اس کی مختصر لغوی تشریح کرتے ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کا جو تخیل اور عقیدہ مسلمانوں کو سکھایا وہ کتنا

وسیع، کتنا بلند، کتنا منزّہ اور پاکیزہ ہے۔ علماء نے ان ناموں کو یا ان صفات کو مختلف معنوی مناسبتوں سے ترتیب دیا ہے لیکن ہم نے ان کے صرف تین مرتبے قرار دیے ہیں۔

ایک وہ جن سے اس کے رحم و کرم عفو و درگزر یعنی صفات جمالی طور پر ہوتی ہیں۔ دوسرے وہ جن سے اس کی شہنشاہی جلال و جبروت اور حکومت و استیلاء کا اظہار ہوتا ہے اور ہم ان کو جلالی صفات کہتے ہیں۔ تیسرے وہ اسماء و صفات جن کی اس کی تنزیہہ، بلندی کمالات کی جامعیت اور ہر قسم کے اوصاف حسنہ اور محامد عالیہ کا ثبوت ملتا ہے اور ان کو ہم صفات کمال کہتے ہیں۔ الغرض اللہ سبحانہ، کے اسماء و صفات تین قسم کے، صفاتِ جمال، صفات جلال اور صفاتِ کمال ہیں۔

اللہ سبحانہ، کی صفاتِ جمال

وہ اسماء و صفات جن سے اللہ سبحانہ، کے رحم و کرم اور شفقت و محبت کا اظہار ہوتا ہے۔

اللہ :- یہ خدا کا وہ نام ہے جو قرآن پاک میں بطور علم ہر جگہ استعمال کیا گیا ہے اور اسلام سے پہلے بھی یہ عرب میں خدائے برحق کے لیے استعمال ہوتا تھا بلکہ محققین کی رائے میں ساری زبانوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حروف و اصوات کی ایک خاص ترکیب ہے جو معبودیت کے معنے میں استعمال رہی ہے اور عبرانی، سریانی، کلدانی، حمیری، عربی وغیرہ تمام زبانوں میں اس کا یہ لغوی خاصہ پایا جاتا ہے۔ یہ الف لام اور ہ کا مادہ ہے اور مختلف شکلوں میں مشتق ہوا ہے کلدانی، و سریانی کا الاہیا، عبرانی کا الوہ اور عربی کا الٰہ اسے ہے۔ بلا شبہ یہی الٰہ تعریف کے بعد اللہ ہو گیا ہے اور تعریف نے اسے خالق کائنات کا علم بنا دیا۔

الرحمان : بے حد مہربان

الرحیم : نہایت رحم والا

الرب : پرورش کرنے والا، ہر لحظہ مخلوق کی نشو و نما اور ترقی کا ذمہ دار

اللطیف : لطیف والا، مہربان

العفو : معاف کرنے والا، درگزر کرنے والا۔

الودود : محبوب، محبت کرنے والا، پیار کرنے والا

السلام : امن و سلامتی، صلح و آشتی، ہر عیب سے پاک و صاف

المحبُّ : محبت والا، پیار والا، چاہنے والا۔

المومن : امان دینے والا، امن بخشنے والا، ہر خوف سے بچانے والا
الشکور : اپنے بندوں کے نیک عمل کو قبول کرنے والا اور پسند کرنے والا
الغفور، الغفار } معاف کرنے والا، گناہ بخشنے والا، درگزر کرنے والا
الحفیظ الحافظ : حفاظت کرنے والا، نگہبان، بچانے والا
الوہاب : دینے والا، عطا کرنے والا، بخشنے والا
الرازق والرزاق : روزی دینے والا، نشو و نما کا سامان بہم پہنچانے والا
الولی : دوست، حمائتی، طرفدار
الرؤف : مہربان، نرمی، اور شفقت کرنے والا
المقسط : انصاف والا، عادل
الھادی : راہ دکھانے والا، رہنما
الکافی : اپنے بندوں کی ہر ضرورت کے لیے کافی
المجیب : قبول کرنے والا، دعاؤں کا سننے والا
الحلیم : بردبار، بندوں کی برائیوں سے چشم پوشی کرنے والا
التواب، قابل التوب } توبہ قبول کرنے والا، گنہ گاروں کے گناہوں سے درگزر کرنے والا
الحنان : ماں کی طرح بچوں پر شفقت کرنے والا
المنان : احسان کرنے والا
النصیر :- مدد کرنے والا
ذوالطول : کرم والا
ذوالفضل : فضل والا
الکفیل : بندوں کی کفالت کرنے والا
الوکیل : بندوں کی ضرورتوں کا ذمہ لینے والا
المقیت : روزی پہنچانے والا
المغیث : فریاد کو پہنچنے والا، فریادرس

المجیر: پناہ دینے والا
المغنی: بندوں کو اپنے سوا ہر چیز سے بے نیاز کرنے والا

اللہ سبحانہٗ کی جلالی صفات

وہ اسماء جن سے خدا کی بڑائی، کبریائی، شہنشاہی اور ملوکیت کا اظہار ہوتا ہے۔

الملک والملیک: بادشاہ، فرمانروا
الحکم: فیصلہ کرنے والا
المقتدر: اقتدار والا، جس کے سامنے کوئی چون و چرا نہ کرے۔
العلی: برتر، جس کے سامنے سب کمتر ہوں
العظیم: بزرگتر، جس کے سامنے سب ہیچ ہوں
الکبیر: بڑا۔
العزیز: غالب، جس پر کوئی دسترس نہ پائے
القاھر: جس کے حکم سے کوئی باہر نہ ہو
القہار: سب کو دبا کر اپنے قابو میں رکھنے والا
المنتقم: سزا دینے والا۔
الجبار: جبروت والا جس کے سامنے کوئی دم نہ مار سکے
المہیمن: سب کا نگران اور سب پر شاہد
المتکبر: کبریائی والا، اپنی بڑائی دکھانے والا
شدید العقاب: سخت، سزا دینے والا
شدید البطش: بڑی گرفت والا
المدبر: تدبیر کرنے والا
مالک الملک: سلطنت کا مالک جس کے سامنے کسی کی کوئی حکومت نہیں
المحی: زندہ کرنے والا
الممیت: مارنے والا
المعز: عزت دینے والا

المذل : ذلت دینے والا

الخافض : پست کرنے والا

الرافع : اونچا کرنے والا

المعطی : دینے والا

المانع : رد کرنے والا

النافع : نفع پہنچانے والا

الضار : نقصان دینے والا

اللہ سبحانہ کی صفاتِ کمال

وہ اسماء وصفات جن سے خدا کی خوبی، بڑائی، بزرگی اور ہر وصف میں اس کا کامل ہونا ظاہر ہوتا ہے اس طرح کے اسماء وصفات پانچ قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو اس کی واحدنیت سے متعلق ہیں، دوسرے وہ جو وجود سے تعلق رکھتے ہیں، تیسرے اس کے علم سے، چوتھے اس کی قدرت سے اور پانچویں اس کی تنزیہ سے۔

صفاتِ واحدانیت

وہ صفتیں جو خدا کی یکتائی اور بے مثالی کو ظاہر کرتی ہیں اور وہ ہیں :

الواحد : ایک

الاحد : ایک

الوتر : طاق جس کا کوئی جوڑ نہیں

صفاتِ وجودی

یعنی وہ صفتیں جن سے اس کا وجود لقاء دوام ازلیت اور بے زوالی ظاہر ہوتی ہے ۔

الموجود : وجود والا ، ہست

الحی : ہمیشہ زندہ ، غیر فانی

القدیم : وہ جس سے پہلے کوئی دوسرا موجود نہیں جو ہمیشہ سے ہے ۔

القیوم : جو اپنے سہارے تمام کائنات کو سنبھالے ہوتے ہے ۔

الباقی : جس کو ہمیشہ بقا ہے

الدائم : ہمیشہ رہنے والا

الاوّل : وہ پہلا جس کے پہلے کوئی نہیں

الآخر : وہ پچھلا جو سب کے فانی ہونے کے بعد بھی ہمیشہ باقی رہے گا۔

المقدم : جو سب سے آگے سے ہے

المؤخر : جو سب سے پیچھے رہ جائے گا

الظاہر : جس کا وجود کھلا اور نمایاں ہے

الباطن : جو چھپا اور مخفی ہے۔

علم کی صفات

وہ صفات جو اس کے ہر چیز سے باخبر اور آگاہ ہونے کو ظاہر کرتی ہیں۔

الخبیر : خبر رکھنے والا

العلیم : جاننے والا

علام الغیوب : جو باتیں سب سے پوشیدہ ہیں ان کو جاننے والا

علیمٌ بذاتِ الصدور : دلوں کے چھپے ہوتے بھید کو جاننے والا۔

السمیع : سننے والا

البصیر : دیکھنے والا۔

المتکلم : بولنے والا اپنے علم اور ارادے کو ظاہر کرنے والا

الواجد : پانے والا، جس کے علم سے کوئی چیز گم نہیں۔

الشہید : حاضر جس کے سامنے سے کوئی چیز غائب نہیں

الحسیب : حساب کرنے والا، یعنی جس چیز کا علم حساب کے ذریعے کیا جاتا ہے۔

المحصی : گننے والا یعنی جن چیزوں کا علم گن کر حاصل کیا جاتا ہے

الحکیم : حکمت وعقل والا، سب کاموں کو مصلحت سے کرنے والا

المرید : ارادہ کرنے والا، مشیت والا

القریب : نزدیک جو اپنے علم کے اعتبار سے گویا سب کے پاس ہے۔

اللہ سبحانہٗ کی شان قدیری

اللہ کی وہ صفتیں جن سے اس کی قدرت کی وسعت کا اظہار ہوتا ہے

الفاتح : ہر مشکل کو کھولنے والا

الفتاح : ہر مشکل کو خوب کھولنے والا

القدیر : قدرت والا

القادر : قدرت والا

القوی : زبردست جس کے سامنے کسی کا بس نہیں چلتا۔

المتین : مضبوط جس میں کوئی کمزوری نہیں

الجامع : جمع کرنے والا، متفرق اور پراگندہ چیزوں کو اکٹھا کرنے والا

الباعث : اٹھانے والا، مُردوں کو قبروں سے اٹھانے والا

البدیع : نئی نئی چیزیں ایجاد کرنے والا

الواسع : سمانے والا جو ہر چیز کو سمائے ہوتے ہے

المحیط : احاطہ کرنے والا

القابض : سمیٹنے والا

الباسط : پھیلانے والا

المبدئ : جو چیز پہلے سے موجود نہ ہو اس کو وجود میں لانے والا

المعید : جو ہو کر فنا کر دی گئی ہو اس کو پھر دوبارہ وجود میں لانے والا

اللہ سبحانہٗ کی تنزیہی صفات

وہ صفات جو اس کی پاکی اور نیکی اور ہر عیب و نقصان سے اس کی برأت کو ظاہر کرتی ہیں۔

الرفیع : بلند

الجلیل : بزرگ

الکریم : شریف

الغنی : بے نیاز

الصادق : سچا

الماجد : عزت والا

الحمید : تعریف والا

القدوس : پاک

الحق : سچا اور اصلی یعنی یہ کہ اس کے سوا سب باطل ہیں

الجمیل : اچھا

البر : نیک

العدل : عادل

سبوح : ہر عیب سے پاک

الصمد : بزرگی کی ہر صفت میں کامل

الرشید : سیدھی راہ چلنے والا نہ بھٹکنے والا۔

قرآن نے صفات واسماء کے تصورِ الٰہی کا جو آئینہ ہمارے سامنے پیش کیا ہے اسے پڑھ کر آپ محسوس کریں گے کہ تصورِ الٰہی کی تمام تصویروں میں اس کی تصویر جامع اور بلند تر ہے۔ تنزیہہ کی حد تک قرآن کا تصورِ تنزیہہ ایسا مکمل ہے جس کی نظیر دنیا تے فلسفہ و کلام میں موجود نہیں۔ قرآن سے پہلے جہاں تک صفاتِ الٰہی کا تعلق ہے انسانی اوصاف و جذبات کی مشابہت اور جسم و ہیئت کے تمثل سے کوئی تصور بھی خالی نہ تھا۔ یہودی تصور جو توحید کا سب سے بڑا علمبردار تھا وہ بھی تشبیہہ اور تمثیل سے یکسر آلودہ ہے حضرت ابراہیم کا خدا کو ممرے کے بوطوں میں دیکھنا۔ خدا کا حضرت یعقوب سے کشتی لڑنا، کوہ طور پر شعلوں کے اندر نمودار ہونا۔ حضرت موسیٰ کا خدا کو پیچھے سے دیکھنا۔ خدا کا جوشِ غضب میں آکر کوئی کام کر بیٹھنا، اور پھر پچھتانا، بنی اسرائیل کو اپنی چہیتی بیوی بنانا اور پھر اس کی بد چلنی پر ماتم کرنا۔ ہیکل کی تباہی پر اس کا نوحہ، اس کی انتڑیوں میں درد کا اٹھنا اور کلیجے میں سوراخ پڑ جانا، تورات کا عام اسلوب ہے لیکن اس کے بعد جب ہم قرآن کے پیش کردہ خدا کے اسماء پر غور کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اچانک فکر و تصور کی ایک بالکل نئی دنیا سامنے آگئی۔ یہاں تشبیہہ کے تمام پردے یک دفعہ اٹھ جاتے ہیں۔ انسانی اوصاف و جذبات کی مشابہت مفقود ہو جاتی ہے۔ ہر گوشہ میں مجاز کی جگہ حقیقت کا جلوہ نمایاں ہو جاتا ہے اور تجسم کا شائبہ تک باقی نہیں رہتا، تنزیہہ اس مرتبہ کمال تک پہنچ جاتی ہے کہ القدوس، سبوح، الجمیل، الصمد کہہ کر تشبیہہ و تمثیل کے سارے تصورات کافور ہو جاتے ہیں۔ فلاسفہ

متکلمین کی تنزیہہ کا میدان جہاں جاکر ختم ہوا وہ یہ تصور تھا کہ خدا یہ نہیں، یہ نہیں، یہ بھی نہیں، اگر پھر سے کیا، اس راہ میں غلو نے تنزیہہ کو تعطیل کا لبادہ پہنا دیا۔ تنزیہہ سے مقصود یہ ہے کہ جہاں تک عقل بشری کی رسائی ہے صفات الٰہی کو مخلوقات کی مشابہت سے پاک اور بلند رکھا جائے۔ تعطیل کے معنے یہ ہیں کہ تنزیہہ کے منع و نفی کو اس حد تک پہنچا دیا جائے کہ فکر انسانی کے تصور کے لیے کوئی بات باقی نہ رہے۔
جس طرح اثبات صفات میں غلو تشبہ کی طرف لے جاتا ہے اسی طرح نفی صفات میں غلو تعطیل تک پہنچا دیتا ہے اور دونوں میں انسانی تصور کے لیے ٹھوکر ہے اگر تشبہ اسے حقیقت سے ناآشنا کر دیتا ہے تو تعطل اسے عقیدہ کی رُوح سے محروم کر دیتا ہے۔ ضروری ہے کہ افراط و تفریط دونوں سے قدم روکے جائیں اور تشبہ و تعطیل دونوں کے درمیان راہ نکالی جائے۔

اسمائے الٰہیہ اور دُعا

اس آیت میں یہ بات بتانے کے بعد کہ حسن و جمال والے سارے نام اللہ ہی کے لیے ہیں یہ بات بھی بتائی گئی ہے کہ اسمائے حسنیٰ کے ذریعے اللہ سے مانگو اور ان کے ذریعے اللہ کو پکارو۔ حجۃ اللہ البالغہ میں شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ مشرکین برکت کی اُمید پر اپنے معبودوں کے ناموں کی تلاوت کرتے تھے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ اپنے معبودوں کے ناموں کی جگہ اللہ سبحانہٗ کے اچھے ناموں کے ذریعے اللہ کو یاد کرو اور ان ناموں کے ذریعے دُعائیں مانگو۔ ذکر اور دُعا دونوں ایمان کی غذا ہیں۔ اور ان کے ذریعے قلب میں اللہ کی محبت اللہ کے لیے خشوع اور اللہ کی طرف رغبت زیادہ ہوتی ہے۔ دُنیا سے بے رغبتی اور دُنیا کی زندگی میں مصائب کی حقارت اور دُنیا کی چیزوں کے نہ ہونے پر بے غمی یادِ الٰہی کا خاصہ ہے۔ حدیث صحیح میں ہے۔

جس پر غم آجائے یا پریشانی کا شکار ہو جائے یا کوئی اہم معاملہ درپیش آجائے تو اس طرح کہے۔

لا الٰہ الا اللہ العظیم الحلیم، لا الٰہ الا اللہ رب العرش العظیم، لا الٰہ الا اللہ رب السماوات والارض و رب العرش الکریم۔

سنن ترمذی میں حدیث ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دُعا میں یہ کہتے ہوئے سنا، یا ذا الجلال والاکرام آپ نے فرمایا مانگ بشرف قبولیت ہو گئی۔ مستدرک حاکم میں حضرت انس سے حوالہ سے ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ سے فرمایا میری اس وصیت سننے سے تمہیں

کیا چیز مانع ہے کہ تم ہر صبح اور ہر شام یہ دعا کیا کرو

یاحی یا قیوم برحمتک استغیث ، اصلح لی شانی کلہ ولا تکلنی الی نفسی طرفۃ عین

اسمائے الٰہیہ پر مشتمل دعاؤں کا کافی ذخیرہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے اور علامہ جزری کی الحصن الحصین اور علامہ نووی کی کتاب الاذکار میں موجود ہے۔

اسلوب قرآنی اور اسماء الٰہی

قرآن حکیم کا اسلوب و انداز بیان یہ ہے کہ وہ جا بجا اسمائے الٰہیہ لاتا ہے پھر اپنے ماقبل و مابعد میں ان اسماء کے مظاہر بطریق استشہاد پیش کرتا ہے تاکہ پہلے ان اسماء کی عظمت ذہن نشین ہو اور انسانی ادراک کے قصور اور الفاظ کی کوتاہ دامنی کی وجہ سے ان کے بلند حقائق کو سمجھنے میں جو کوتاہی باقی رہ جائے وہ ان کے مظاہر دیکھ کر پوری ہوتی ہے۔ اگر قرآن اللہ سبحانہ کی شان عزیزی و قہاری کا تذکرہ کرتا ہے تو بتلا دیتا ہے کہ یہ وہ عزت و قہر نہیں جس کی اس کے تصور میں سمائی ہو۔ اگر اللہ کے جود و رحمت کا ذکر کرتا ہے تو اس کے ساتھ ہی سمجھا دیتا ہے کہ یہ اس نوع کی جود و رحمت نہیں کہ وہاں تک عقل کی رسائی ہو۔ اسماء اصل مقاصد نہیں بلکہ ذات حق کی معرفت کا ایک راستہ ہے جس سے گزر کر ذات پاک تک رسائی ہوتی ہے۔ اگر ان اسماء کا توسط نہ ہوتا تو داغ مہجوری عالم امکان کے لیے ہمیشہ نقد وقت رہتا۔ ذات پاک اپنی بے نیازی میں اور ممکن اپنے ادراک کے عجز و قصور میں ہمیشہ سرگرداں نظر آتا۔ یہ ذات اقدس کی بڑی فیاضی ہے کہ اس نے اپنی معرفت کے لیے حجاب اسماء ڈال دیا ہے کہ جو مشتاق اس ذات مستجمع جمیع کمالات کا نظارہ کرنا چاہے وہ ان اسماء میں آج بھی نظارہ کر سکتا ہے۔

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل
ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

سورۂ ملک کو پڑھیے، اس کی ابتداء تبارک الذی بیدہ الملک سے ہوتی ہے اس میں خدائی مملکت کا نقشہ پیش کیا گیا ہے اور اس کی وسعت کے وہ حدود بتلائے گئے جو انسانی دسترس سے وراء الوراء ہیں۔ اس ضمن میں ایک ملک والے کے لیے جو اسماء درکار ہیں ان کو موقعہ بموقعہ ایسا چسپاں کیا کہ گویا وہ آیت اسی اسم کی تشریح کے لیے اتری ہے۔ اسی لیے علماء معانی نے ایجاز آیات

کو قرآن کا ایک اعجاز قرار دیا ہے۔ اگر اس استحضار کے ساتھ آپ سورۂ ملک پڑھیں تو ابھی آپ سورت کو ختم نہیں کریں گے کہ الٰہی جبروت و ملکوت کا ایک قاہرانہ تسلط آپ کے دل و دماغ پر مستولی ہو جائے گا، استواء علی العرش اور سبع سماوات والارض، عرش و کرسی کا تذکرہ بھی اس لیے نہیں ہے کہ اللہ سبحانہٗ کے لیے کسی بڑے مکان کا تصور قائم کیا جائے بلکہ اس لیے ہے کہ ایک عاجز مخلوق کو ایک نادیدہ ذات کا شاہانہ تعارف ہو تو کیسے ہو اس لیے اس کی پرواز کے اعلیٰ سے اعلیٰ اور بلند سے بلند تخیل کو اس کے سامنے رکھا گیا ہے تاکہ وہ خدائی عظمت و جلال کی بلند سے بلند رفعتوں کو عبور کرنے کے قابل ہو جائے یہ گمان نہ کرنا چاہیے کہ یہ الفاظ بے مصداق ہیں یہ تو فکر اعتزال ہے ہرگز نہیں قرآن شاعرانہ تخیل سے بہت بلند ہے اسی لیے وہ شعر کی مذمت کرتا ہے کہ اس میں حقیقت نہیں ہوتی اور یہاں صرف حقیقت ہی حقیقت ہے بلکہ اللہ سبحانہٗ نے ان اشیاء کو پیدا فرمایا ہے اور ان کی حقیقتیں اپنی اپنی جگہ موجود ہیں مگر اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ ذات پاک کا تصور اس سے بھی وراء الوراء ہے یہاں شیخ اکبر کے الفاظ کس قدر قیمتی ہیں۔

معتقدات اور معقولات صورتوں، خدائی تجلیات اس لیے ہوتی ہیں کہ علم انسانی کی رسائی کے لیے ایک گزرگاہ بن سکیں جن سے عبور کر کے یہ علم حاصل ہو جائے کہ ان تجلیات کے پس پردہ کوئی ایسی باکمال ذات موجود ہے جو ہمارے احاطۂ علم و مشاہدہ سے بالا ہے بس ہم اتنا ہی جان سکتے ہیں کہ اسے جان نہیں سکتے۔

(الیواقیت والجواہر)

کیف الوصول الی سعاد ودونها
قلل الجبال ودونهن حتوف،

سعاد محبوبہ ہی تک رسائی ہو تو کیسے ہو کہ اس سے پہلے بلند پہاڑیاں ہیں اور ان سے پہلے ایک موت نہیں بلکہ بہت ہی موتیں ہیں۔

اسماءِ الٰہیہ میں الحاد

۲۳۸- اور جو لوگ اس کے ناموں میں کج روی اختیار کرتے ہیں ان کو چھوڑ دو، وہ وقت دور نہیں کہ ان کو اپنے کرتوتوں کا ضرور بدلہ ملے گا۔ خدا کے ناموں اور صفتوں میں کج روی یہ ہے کہ خدا پر ایسے نام یا صفت کا اطلاق کرے جس کی شریعت نے اجازت نہیں دی اور جو حق کی تعظیم و اجلال کے

لائق نہیں یا اس کے مخصوص نام اور صفت کا اطلاق غیر اللہ پر ہے یا ان کے معانی بیان کرنے میں بے اصول تاویل اور کھینچ تان کرے یا ان کو معصیت مثلاً سحر وغیرہ کے مواقع میں استعمال کرنے لگے یہ سب کج روی ہے۔[1]

الحاد کے شارحین قرآن نے ایک سے زیادہ مصداق بتاتے ہیں۔

عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ اس کا مصداق تکذیب ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ اللہ سے لات اور اعز سے عزیٰ بنالینا بھی الحاد ہے۔ امام اعمش فرماتے ہیں کہ الحاد یہ ہے کہ خدا کے ناموں میں وہ نام داخل کرتے ہیں جو خدا کے نام نہیں ہیں اور قتادہ سے الحاد کے دو مصداق منقول ہیں ایک شرک کرنا، دوسرے اسماء میں تکذیب۔ خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں الحاد یہ ہے کہ اسماء الٰہیہ کی تکذیب کی جائے۔ ان کے معانی کا انکار کیا جائے، ان میں تاویل کے ذریعے تحریف کی جائے اور اللہ سبحانہٗ کے لیے ایسے نام بولے جائیں جو قرآن وسنت میں نہیں آتے اور جو اس کے شایان شان نہیں خدا کے ناموں میں غیر اللہ کو شریک کر دینا۔ گویا خدا کو ایسے نام دیے جائیں جو اس کے مرتبے سے فروتر ہوں، جو اس کے ادب کے منافی ہوں۔ جن سے عیوب اور نقائص اس کی طرف منسوب ہوتے ہوں یا جن سے اس کی ذات اقدس کے متعلق غلط عقیدے کا اظہار ہوتا ہو۔ نیز یہ بھی الحاد ہے کہ مخلوقات میں سے کسی کے لیے ایسا نام رکھا جائے جو صرف خدا ہی کے لیے موزوں ہو۔

الحاد کی عام صورتیں یہ ہیں:

اولاً یہ کہ اللہ سبحانہٗ کے لیے اسماء تجویز کرنا جو قرآن وسنت سے ثابت نہیں ہیں۔ اہل حق کا اس پر اتفاق ہے کہ اسمائے الٰہیہ توقیفی ہیں۔ صوفیاء میں سے شیخ اکبر نے بھی اس پر تنبیہ فرمائی ہے کہ اسمائے الٰہیہ توقیفی ہیں۔ جو نام جس طرح شریعت میں استعمال کیا گیا ہے اس سے تجاوز کرنا درست نہیں ہے اس لیے اللہ سبحانہٗ کو حی کہا جائے گا مگر ذو حیاۃ نہیں کہا جائے گا۔ اسی طرح جہاں کسی صفت کی نسبت بطریق فعل وارد ہے اس کو بھی بدلہ نہیں جاسکتا جیسا کہ اللہ یستھزئ بھم سے اللہ سبحانہٗ پر مستھزی کا اطلاق جائز نہ ہوگا۔ اسی طرح وھو خادعھم کی وجہ سے اللہ سبحانہٗ کو خادع نہیں کہا جاسکتا۔ مفسرین نے تو اس کے جوابات اور دیے ہیں مگر شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ ان آیات کو تلاوت کرتے ہوتے چاہیے کہ انسان بحر ندامت میں غرق ہو جائے کیونکہ یہاں ہماری تفہیم

[1] افادات شیخ الاسلام

فہمائش کے لیے قرآن حکیم نے تنزل کے طور پر بارگاہ صمدیت میں ایسے الفاظ استعمال کر لیے ہیں جو اس کی شایانِ شان نہ تھے کیونکہ عالمِ انسانیت اپنے قصور و نقصان کی بنا پر عالمِ غیب کے بہت سے مخاطبات کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا اس لیے جب ناقص رتبہ کمال تک نہیں پہنچ سکتا تو پھر کامل ہی کو کچھ تنزل اختیار کرنا چاہیے۔ جاہل ان الفاظ کو پڑھتا ہے اور اعراض کرتا ہے اور عاقل فرطِ ندامت سے گر جاتا ہے۔ جاہل کا اعتقاد یہ سن کر ڈگمگا جاتا ہے اور عاقل کی عقیدت میں اضافہ ہوتا ہے۔

(الیواقیت والجواہر)

شیخ اکبر نے یہ تنبیہ بھی فرمائی ہے کہ اگرچہ بلحاظِ نعمت بعض اسماءِ الٰہیہ کا اطلاق انسانوں پر بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ نافع، وکیل، نور مگر شرعاً و عقلاً بطریق اسم اعظم ممنوع قرار دیا جائے گا اور اگر بالفرض کہیں اطلاق ہوگا تو اس کے اصل معنے سے ذہول ضروری ہوگا۔ مثلاً مومن ایماندار ہونے کی جہت سے درست ہو سکتا ہے مگر جس لحاظ سے خدا پر مومن کا اطلاق کیا گیا ہے وہ قطعاً حرام ہے۔ اس لیے جو اسماء خدا تعالیٰ کی بارگاہ کے لیے عرف عام یا خاص میں مشہور ہو چکے ہیں ان کا استعمال دائرۂ انسانی میں ممنوع ہے۔

ثانیاً، اللہ کے ناموں میں تبدیلی کر کے غیر اللہ کے لیے بولنا جیسے اللہ سے لات اور اعز سے عزیٰ بنا کر بتوں کے لیے استعمال کرنا۔

ثالثاً، جن اسماء کو قرآن و سنت میں اللہ سبحانہ کے لیے بولا گیا ہے یا جن افعال کی اللہ کی طرف نسبت کی گئی ہے ان کو چھوڑ دینا اور یہ خیال کرنا کہ یہ اسماء اللہ سبحانہ کے شایانِ شان نہیں ہے۔ یہ بھی الحاد ہے گویا یہ ملحدین خدا کی شان کو اللہ اور اس کے رسول سے زیادہ جانتے ہیں۔

رابعاً، اللہ سبحانہ کے اسماء میں تاویل کے ذریعے تحریف کر دینا اور اس طرح تشبیہ یا تعطیل کی راہ اختیار کر لینا۔ سمیع، بصیر، کلام وجہ ید کے الفاظ دیکھ کر اللہ تعالیٰ کو مخلوق پر قیاس کرنا یا ان میں ایسی تاویل کرنا کہ یہ سب اسماء و صفات کالعدم ہو کر رہ جائیں۔

خامساً، اللہ سبحانہ جن صفتوں سے موصوف ہے ان میں سے کوئی صفت کسی اور میں مان لی جاتے اور اسی معنے و مفہوم میں موجود مانی جائے۔ جس معنی و مفہوم میں وہ اللہ تعالیٰ میں پائی جاتی ہے۔ مثلاً علم اللہ تعالیٰ کی صفت ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کھلی اور چھپی ہر بات کو جانتا ہے۔ اس کے لیے غائب بھی حاضر ہے اور گزرا ہوا یا آنے والا زمانہ بھی حال کا زمانہ ہے۔ اب اگر کوئی یہ سمجھ بیٹھے کہ فلاں مخلوق بھی اسی طرح ہر بات کو جانتی ہے تو یہ الحاد فی الاسماء ہوگا۔ یہی طرح ضار و نافع یعنی نفع و نقصان پہنچانا

اللہ کی صفت ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جس کو چاہتا ہے مسرت و راحت کا سامان عطا کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے محروم کر دیتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ خیال کرے کہ فلاں مخلوق بھی ہماری بگڑی بنا سکتی ہے تو یہ بھی الحاد فی الاسماء ہے۔

سادساً، اسمائے الٰہی کے جو لازمی تقاضے ہیں انہیں اور ان سب کو اللہ کے لیے خاص نہ سمجھا جائے بلکہ انہیں یا ان میں سے بعض کو کچھ دوسری ہستیوں کے لیے ثابت اور موجود مانا جائے اور ان اسماء کو ان معانی کے اعتبار سے ان کے لیے بھی استعمال کرے یہ بھی الحاد فی الاسماء ہے۔

حضرت مولانا اشرف علی نے اس آیت کی جو مختصر تشریح فرمائی اس میں بہت گہری معنویت ہے لیجئے آپ بھی استفادہ کر لیجئے ؛

> اور اچھے اچھے مخصوص نام اللہ ہی کے لیے خاص ہیں لہٰذا ان ناموں سے اللہ ہی کو موسوم کیا کرو، اور دوسروں پر ان ناموں کا اطلاق نہ کیا کرو، بلکہ ایسے لوگوں سے تعلق بھی نہ رکھو جو اس کے ناموں میں کج روی کرتے ہیں۔ اس طرح سے کہ غیر اللہ پر اس کا اطلاق کرتے ہیں۔ ان لوگوں کو ان کے کیے کی ضرور سزا ملے گی مخصوص ناموں سے مراد وہ جن کا خاص ہونا اللہ تعالیٰ کے لیے دلیل شرعی سے ثابت ہے۔

وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۸۱﴾
وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا
يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۲﴾ وَاُمْلِيْ لَهُمْ ط اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ﴿۱۸۳﴾ اَوَلَمْ
يَتَفَكَّرُوْا سكتة مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ ط اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۸۴﴾
اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ
اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ وَّاَنْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ فَبِاَيِّ
حَدِيْثٍ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۵﴾ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ط
وَيَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۸۶﴾

اور جن لوگوں کو ہم نے پیدا کیا ان میں سے ایک اُمت ایسی بھی ہے جو لوگوں کو حق کی راہ دکھاتی ہے اور حق ہی کے مطابق لوگوں میں عدل وانصاف کرتی ہے۔[۲۳۹] اور جن لوگوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلا دیا ہم انھیں آہستہ آہستہ آخری نتیجہ تک پہنچا دیں گے

اس طرح کہ انہیں خبر بھی نہ ہوگی، میں ان کو ڈھیل دوں گا بلاشبہ
میری مخفی تدبیر بڑی ہی مضبوط ہے[۲۴۰]۔ کیا ان لوگوں نے غور نہیں
کیا کہ ان کے رفیق کو کسی قسم کا جنون نہیں ہے وہ تو صرف اللہ
کی جانب سے کھلے طور پر ڈر سنانے والا ہے[۲۴۱]۔ پھر کیا وہ آسمان و
زمین کی بادشاہی اور جو کچھ اللہ نے پیدا کیا ہے اس کا مطالعہ
نہیں کرتے اور اس بات پر کہ ہو سکتا ہے کہ ان کا مقررہ وقت
قریب آگیا ہو، اگر ان باتوں پر وہ غور نہیں کرتے تو اس کے
بعد وہ کون سی بات ہے جس پر وہ ایمان لائیں گے[۲۴۲]۔ جس پر
کامیابی کی راہ خدا گم کر دے تو پھر اس کے لیے کوئی راہ دکھانے
والا نہیں، اللہ ان کو ان کی سرکشی میں بھٹکتا چھوڑ دیتا ہے[۲۴۳]۔

معانی مفردات

سنستدرج :- اس کا مصدر استدراج ہے۔ یہ یا تو درج الکتاب اور درج الثوب سے جس کے معنے طے کرنے اور لپیٹنے کے ہیں اور یا یہ درجہ سے جس کے معنے سیڑھی کے ڈنڈے کے ہیں۔ استدراج

کے معنے ہیں آہستہ آہستہ گرفت میں لینا اور جکڑ دینا۔ املی، املاء سے بنا ہے اس کے معنے مہلت دینا ملوہ ملاوہ یعنے وقت کو کہتے ہیں اور ملوان دن، رات کو کہتے ہیں۔ الجنۃ جنوں کی ایک قسم کو کہتے ہیں ملکوت، بڑے ملک کو کہتے ہیں، آسمان و زمین کی مملکت مراد ہے۔ حدیث، بات مراد قرآن عزیز ہے۔

اللہ کا قانونِ استدراج

پہلے یہ بتایا تھا کہ ایسے لوگ نبوّت کے لاتے ہوتے علم و عمل سے کوئی استفادہ نہیں کرتے جو عقل کے ہوتے ہوتے عقل سے سماع کی قوّت کے ہوتے ہوتے کانوں سے اور بینائی کی موجودگی میں آنکھوں سے کام نہیں لیتے۔ ان کی زندگیاں قطعاً حیوانی بلکہ اس سے بھی بدتر ہیں۔ اب ارشاد ہو رہا ہے کہ ان کے مقابلہ میں اللہ کی مخلوق میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنی عقل سے کام لیتے ہیں۔ فکر و دماغ کی ساری قوتوں کو حق کی جستجو میں صرف کرتے ہیں۔ قوتِ سماع قوتِ بصارت کو حق کے لیے استعمال کرتے ہیں، حق کو سمجھ کر حق کو سُن کر اور حق کو دیکھ کر صرف حق کی روشنی میں زندگیاں نہیں گزارتے بلکہ اسی کے مطابق لوگوں کی رہنمائی کرتے ہیں اور معاملات کے فیصلے کرتے ہیں۔ یہ گویا ان پہلے لوگوں کے مقابلہ میں واقعی انسانی زندگیاں ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس بات کو بھی صاف کر دیا کہ جو لوگ عقل اور دید و شنید کی قوت کے باوجود نبوّت کی تکذیب کر رہے ہیں اور دندناتے پھر رہے ہیں وہ ہرگز یہ نہ سمجھیں کہ خدا کی گرفت سے باہر ہو چکے ان کے لیے یہاں ہمارا قانونِ استدراج کام کر رہا ہے۔ یہ فائدہ اٹھانے کا موقع دینے ڈھیل دینے، عفو و درگزر سے اور ایک خاص مدت تک فرصتِ حیات بخشنے کا قانون ہے اور یہ اس لیے ہے کہ اللہ سبحانہٗ فضل و رحمت والا ہے۔ فضل و رحمت کا تقاضا ہے کہ ہر غلطی کو درست کرنے پر نقصان کی تلافی کے لیے ہر لغزش کو سنبھل جانے کے لیے زیادہ سے زیادہ مہلت ملتی رہے اور اس کا دروازہ کسی پر بند نہ ہو۔ اگر تدریج و امہال کی یہ فرصتیں نہ ہوتیں تو دُنیا میں ایک وجود فرصت حیات سے فائدہ اٹھاتا۔ ان کو چاہیے کہ فکر و نظر سے کام لیں، فکر یہ کہ خدا کی دی ہوئی عقل سے کام لیں اور نظر یہ کہ کارخانہ ہستی کے عجائب و دقائق کا مشاہدہ کریں اور اس سے بصیرت حاصل کریں۔ یہ مکذبین نہ تو فکر سے کام لیتے ہیں اور نہ مشاہدہ و نظر سے، اگر فکر سے کام لیں تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ان کے لیے سچائی کی سب سے بڑی دلیل ہے، اگر نظر سے کام لیں تو آسمان و زمین کا ایک ایک ذرہ خدا کی توحید اور اس کے مقررہ قوانین کی شہادت دے رہا ہے۔

۲۳۹- اور جن لوگوں کو ہم نے پیدا کیا ہے ان میں سے ایک اُمت ایسی ہے جو لوگوں کو راہ حق دکھاتی ہے اور حق ہی کے مطابق لوگوں میں انصاف کرتی ہے۔ یہ جماعت اُمتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہے جس نے ہر قسم کی افراط و تفریط اور کج روی سے علیحدہ ہو کر سچائی اور انصاف و اعتدال کا طریقہ اختیار کیا اور اسی کی طرف دوسروں کو دعوت دیتی ہے [1]

شارحینِ قرآن کہتے ہیں کہ اس آیت میں اُمت سے مراد اُمتِ محمدیہ ہے۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اس موضوع پر آتے ہوتے آثار سے ثابت ہوتا ہے کہ آیت میں اُمت سے مراد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت ہے۔ علامہ بغوی نے حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت قتادہ سے یہی بات نقل کی ہے۔ لیکن شارحینِ قرآن نے اس کی معنویت کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا۔ دراصل یہ بات بتانے کے بعد کہ انسانوں کی کثیر تعداد بصیرت و بصارت اور عقل و فکر سے محروم ہو کر حیوانی بلکہ حیوانوں سے بدتر زندگی گزار رہی ہے اور یہ لوگ خدا کے ناموں میں الحاد کر رہے ہیں۔ یہ تو انبوہ ہیں، بھیڑ ہیں، تعداد میں کثیر ہیں لیکن اس کے مقابلہ پر ایک عظیم الشان اُمت ہے۔ ان کو اُمت اس لیے کہا کہ ان کے افکار و اعمال کے لیے ایک مرکز ہے اور وہ نبوت ہے۔ ضلالت، الحاد اور غفلت کے اس انبوہ میں ایک عظیم الشان جماعت بھی موجود ہے، اور یہی تعبیر ممن خلقنا امۃ اس اُمت کے دوام کو ظاہر کرنے کے لیے اختیار کی ہے۔ اس اُمت کے کام دُنیا میں دو ہیں ایک ہدایت اور دوسرے عدالت۔

اگر یہ حقیقت ہے کہ اسلام دین کامل ہے اور سارے انسانوں کے لیے ہے، آخری دین ہے اور نجات کے لیے اسی کی پیروی ضروری ہے۔ بلاشبہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پوری دُنیا کے پیغمبر ہیں اور قیامت تک کے لیے پیغمبر ہیں جیسا کہ پہلے انی رسول اللہ الیکم جمیعا، یہ بات کھل کر سامنے آگئی ہے جب تک آپ دُنیا میں موجود تھے بلاشبہ اپنے بہترین طریقہ سے رسالت کا حق ادا کیا لیکن آپ کے دُنیا سے روانہ ہونے کے بعد یہ حق اپنے ادا کیے جانے کا مطالبہ اور قیامت تک رہے گا۔ اگر یہ حقیقت ہے تو ضروری ہے کہ نبوت کی آواز دُنیا کے گوشہ گوشہ تک پہنچے۔ یہ ایک عظیم اہمیت کا مسئلہ ہے جس کا کوئی نہ کوئی عملی حل ہونا چاہیے۔ زیرِ تشریح آیت میں اس مسئلہ کا حل بڑے اہتمام سے کیا گیا ہے اور جتنا عظیم الشان یہ مسئلہ تھا اتنا ہی عظیم الشان اس کا حل بھی فرمایا گیا ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے اس حل کی عملی صورت یہ قرار پاتی ہے۔
۱۔ اسلام کو اللہ کے بندوں تک پہنچانے کا جو کام رسول اپنی زندگی میں کرتا رہا ہے اس کی تشریف بری کے بعد وہ اس کے پیروؤں کے ذمہ ہو گیا ہے اور اب یہ لوگ اس وقت تک کے لیے اس کام کے ذمہ دار ہیں جب تک وہ اس زمین پر موجود ہیں۔
۲۔ اسلام کو دوسروں تک پہنچانے کا مطلب محض تبلیغ نہیں ہے بلکہ ایسی دعوت ہے جسے ہدایت بالحق کہہ سکیں۔
۳۔ ہدایت بالحق کا بھی ایک متعین مفہوم ہے جس کا تعین وہ بعدلون کرتا ہے، یعنی گفتار کی حد تک ان کی بات دعوت ہدایت بالحق کی ہو تو کردار کی حد تک ان کی ذات عدل و انصاف کی حامل ہو۔
اس سے معلوم ہوا کہ پچھلی امتیں اگر صرف ایک ذمہ داری رکھتی تھیں تو اُمت مسلمہ دوہری ذمہ داری رکھتی ہے ایک یہ کہ اپنے دین کی مخلصانہ پیروی کرے دوسرے یہ کہ بیرونی دُنیا کے سامنے حق کی ہادی اور رہنما بن کر جائے۔
دراصل اس معاملہ میں صورت واقعہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ پوری دُنیا کے لیے اور قیامت تک کے لیے نبی تھے لیکن اس عالمگیر دعوت کے مسلسل جاری رہنے کی عملی شکل اللہ تعالیٰ نے یہ متعین فرمائی ہے کہ آپ اپنا قائمقام ایک ایسا گروہ تیار کریں جو اپنی سیرت، اپنے کردار اور اپنے افکار میں اتنا معتدل اور معیاری ہو کہ وہ آپ کے بعد آپ کی طرح ہدایت حق کا کام کر سکے اور پھر یہ گروہ اپنے بعد کی نسل کو اس کام کے لیے تیار کرے۔ آیت میں جملہ اسمیہ کی تعبیر اسی دوام کو بتا رہی ہے۔ اُمت مسلمہ کی یہ ذمہ داری کوئی معمولی ذمہ داری نہیں بلکہ اتنی بڑی اور ہمہ گیر ذمہ داری ہے کہ البقرہ سورت میں اسی ذمہ داری کو نمایاں کرنے کے لیے کھلے لفظوں میں اس طرح بیان کیا ہے۔

کذالک جعلنٰکم امۃ وسطاً لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا ٥

گویا مکی سورت میں جس بات کو اجمالاً بتایا گیا ہے اسی کی توضیح مدنی سورت میں کر دی گئی ہے معروف ہے آیت کی اس تشریح میں کہ اس سے مراد اُمت محمدیہ ہے یا اس سے مراد مہاجرین و انصار ہیں یا اس سے مراد اُمت محمدیہ کے علماء اور دعاۃ ہیں۔ یہ اور اس قسم کی تمام تفسیری تعبیرات اسی بات کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ چونکہ اُمت کے کام اور منصب کا ذکر یہاں ہوا اس لیے آگے نبوت اور آیات الٰہیہ کی تکذیب کرنے والوں یعنی اُمت محمدیہ کی اپوزیشن کے بارے میں یہ خصوصی وضاحت فرما دی۔

خدا کی ڈھیل کو اپنی جیت نہ سمجھو

۲۴۰- اور جن لوگوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلا دیا ہم انہیں آہستہ آہستہ آخری نتیجہ تک پہنچائیں گے اس طرح کہ انہیں خبر بھی نہ ہوگی اور میں ان کو ڈھیل دوں گا بلا شبہ میری مخفی تدبیر بڑی مضبوط ہے۔ جھٹلانے والے مجرموں کو بسا اوقات فوراً سزا نہیں ملتی بلکہ دنیوی فراخی کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ خدائی سزا سے بے فکر ہو کر ارتکاب جرائم پر اور دلیر بن جاتے ہیں۔ اس طرح جو انتہائی سزا ان پر جاری کرنی ہے۔ رفتہ رفتہ اپنے کو علانیہ اور کامل طور پر اس کا مستحق ثابت کر دیتے ہیں۔ یہ ہی خدا کی ڈھیل اور استدراج ہے۔ وہ حماقت اور بے حیائی سے سمجھتے ہیں کہ ہم پر مہربانی ہو رہی ہے اور حقیقت میں انتہائی عذاب کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔ خدا کا کید، داؤ یا خفیہ تدبیر اسی کو کہا کہ ایسی تدبیر کی جائے جس کا ظاہر رحمت اور باطن قہر و عذاب ہو بے شک خدا کی تدبیر بڑی مضبوط اور پختہ ہے جس کی کسی حیلہ اور تدبیر مدافعت نہیں ہو سکتی[1] مطلب یہ ہے کہ جس طرح مادیات میں ہر حالت بتدریج نشو و نما پاتی ہے اور ہر نتیجہ کے ظہور کے لیے ایک خاص مقدار، ایک خاص مدت اور ایک خاص وقت مقرر کر دیا گیا ہے ٹھیک اسی طرح اعمال کے نتائج کے لیے بھی مقدار و اوقات کے احکام مقرر ہیں۔ اور ضروری ہے کہ ہر نتیجہ ایک خاص مدت کے بعد اور ایک خاص مقدار کی نشو و نما کے بعد ظہور میں آتے۔ مثلاً اللہ سبحانہٗ کا یہ قانون ہے کہ اگر پانی آگ پر رکھا جائے گا تو وہ گرم ہو کر کھولنے لگے گا لیکن پانی کے گرم ہونے اور بالآخر کھولنے کے لیے حرارت کی ایک خاص مقدار ضروری ہے اور اس کے ظہور و تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ ایک مقررہ وقت تک انتظار کیا جائے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم پانی چولہے پر رکھو اور فوراً کھولنے لگے وہ یقیناً کھولنے لگے گا لیکن اُس وقت جب حرارت کی مقررہ مقدار بتدریج تکمیل تک پہنچ جائے گی۔ ٹھیک اسی طرح اعمالِ انسانی کے نتائج بھی اپنی مقررہ اوقات میں ظہور پذیر ہوتے ہیں اور ضروری ہے کہ جب تک اعمال کے اثرات ایک خاص مقررہ مقدار تک نہ پہنچ جائیں نتائج کے ظہور کا انتظار کیا جائے۔ اس صورتِ حال سے تدریج و امہال کی حالت پیدا ہو گئی۔

یہ آیت قریشِ مکہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ مسلمانوں کو تسلی دی جا رہی ہے اور اُن کو دھمکی دی جا رہی ہے کہ جو لوگ ہماری آیات کو جھٹلانے کے باوجود دندنا رہے ہیں وہ یہ نہ سمجھیں کہ خدا کی گرفت

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

سے باہر ہیں۔ ہم ان کو آہستہ آہستہ وہاں لے جاتے ہیں جہاں ان کو کسی خطرہ کا گمان بھی نہیں ہے۔ وہ ہماری اس ڈھیل کو اپنی جیت سمجھ رہے ہیں۔ اُن کو یہ ڈھیل اس لیے دی جا رہی ہے کہ ان کے گناہوں کا پیمانہ خوب لبریز ہو جائے۔ یہی خدا کی تدبیر ہے۔ اس کی تدبیر نہایت محکم اور اس کی گرفت نہایت شدید ہوتی ہے۔ کوئی اس کے احاطہ سے باہر نہیں نکل سکتا۔ اس وجہ سے وہ لوگوں کو ان کی سرکشی کے باوجود ڈھیل پر ڈھیل دیتا ہے۔ اس ڈھیل کو سرکش اپنی کامیابی سمجھتے ہیں۔ قرآن بتا رہا ہے کہ جزائے عمل کا قانون ان کی جانب سے غافل نہیں ہے۔ وہ بتدریج اس نتیجہ تک پہنچ کر رہیں گے جو انکار و سرکشی کا لازمی نتیجہ ہے۔

قرآن کی دعوتِ تفکر

۱۸۴۔ کیا ان لوگوں نے غور نہیں کیا کہ ان کے رفیق کو کسی قسم کا جنون نہیں ہے وہ تو اللہ کی جانب سے کھلے طور پر ڈر سنانے والا ہے۔ یعنی آخر آیات اللہ کو جھٹلانے اور اس کے بد انجام سے غافل ہو جانے کا سبب کیا ہے۔ ان آیات کا لانے والا معاذ اللہ کوئی بے عقل و مجنون نہیں ہے۔ وہ ساری عمر تمہارے پاس رہا ہے۔ اس کی عقل و دانش اور امانت و دیانت پہلے سے مسلّم و معروف ہے [1]۔

آیت میں صاحب سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ انہی لوگوں میں پیدا ہوئے جو آپ کے اوّلین مخاطب ہیں۔ ان میں رہ کر بچے سے جوان اور جوان سے بوڑھے ہوئے۔ نبی ہونے سے پہلے پوری قوم آپ کی سلامت طبع اور صحتِ دماغ اور امین و متدین کی حیثیت سے جانتی اور مانتی تھی۔ اور جب آپ نے نبوّت کا دعویٰ کیا اور خدا کا پیغام سنانا شروع کیا تو یکایک آپ کے مخاطب آپ کو مجنون کہنے لگے۔

اس آیت میں صداقت نبوّت کی ایک سب سے بڑی وجدانی دلیل پیش کی جا رہی ہے۔ فرمایا کہ ساری باتیں چھوڑ دو صرف اس ایک بات پر غور کرو کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ساری عمر تمہارے اندر رہے ہیں۔ ان کے تمام احوال سے تم خوب واقف ہو۔ ان کی عقل و دانش کو تم پہلے سے خود مانتے ہو اگر پوری عمر تم ان کو نہایت سلیم الطبع اور صحیح الدماغ آدمی کی حیثیت سے مانتے اور جانتے رہے ہو تو اب نبی ہونے کے بعد ان میں جنون کہاں سے آگیا۔ کیا تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ جو شخص ہمیشہ اپنی سلامت روی، اپنی صداقت شعاری، اپنی بے غرضی، اپنی پاکبازی، اپنی فکر و رائے کی اصابت اور اپنی دانش و بینش کی پختگی کے اعتبار سے ساری قوم میں ایک مثالی شخصیت رہا ہے اب وہ دیوانہ کیسے ہو گیا۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

یہ دیوانے نہیں بلکہ خطرے سے آگاہ کرنے والے ہیں۔

دراصل حضور کے مخاطب یہاں جس چیز کو جنون قرار دے رہے ہیں وہ صرف یہ نہیں کہ آپ دعوتِ حق پیش کر رہے ہیں بلکہ دعوتِ حق کے پیش کرنے میں ان کو حضور میں جو بے چینی اور بے قراری نظر آرہی ہے اس کو وہ جنون سے تعبیر کر رہے ہیں۔ قرآن جواب دے رہا ہے کہ ان کے اندر تمہیں ہوشیار و بیدار کرنے کے لیے جو بے قراری اور بے چینی نظر آرہی ہے اور جو انہوں نے تمہارے پیچھے اپنے دن رات ایک کر رکھے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کو جنون ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس عظیم خطرہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں جو تمہارے سروں پر منڈلا رہا ہے اور جو تمہیں اپنی کورچشمی کی وجہ سے نظر نہیں آرہا ہے یہ جنون نہیں بلکہ حقیقت کا سچا احساس اور اپنی قوم کی محبت کا بے پایاں جذبہ ہے۔ نبوت کی شب و روز کی لگن اور تن دہی کو قوم کے اشرار جنون کہتے ہیں۔

آفاق کی شہادت

۲۴۲۔ پھر کیا وہ آسمان و زمین کی بادشاہی اور جو کچھ اللہ نے پیدا کیا ہے اس کا مطالعہ نہیں کرتے اور اس بات پر کہ ہو سکتا ہے کہ ان کا وقت مقررہ قریب آگیا ہو۔ اگر ان باتوں پر وہ غور نہیں کرتے تو اس کے بعد وہ کون سی بات ہے جس پر وہ ایمان لائیں گے۔ یعنی یہ پیغمبر جس کے پاس سے پیغام لایا ہے وہ تمام جہاں کا مالک شہنشاہ مطلق اور ہر چیز کا پیدا کرنے والا اس کے نہایت ہی محکم و مضبوط نظام سلطنت بلکہ ہر چھوٹی بڑی چیز میں جو اس نے پیدا کی ہے غور کرو تو یہ آیات تکوینیہ آیات تنزیلیہ کی تصدیق کریں گی۔ پھر آیات اللہ کی تسلیم میں کیا عذر ہے۔ انہیں سمجھنا چاہیے کہ شاید ان کی موت و ہلاکت کا وقت قریب آگیا ہو۔ لہٰذا بعد الموت کے لیے جو تیاری کرنی ہے جلد کرنی چاہیے۔ اگر آیات قرآنیہ پر ایمان نہ لاتے تو دُنیا میں اور کون سی بات ہے اور کون سا کلام ہے جس پر ایمان لانے کی اُمید کی جا سکتی ہے۔ سمجھ لو کہ ان بدبختوں کے لیے ایمان مقدر ہی نہیں ہے [1]

پہلے فکر کی دعوت دی گئی تھی۔ اب مشاہدہ کی دعوت دی جا رہی ہے۔ یعنی اگر یہ لوگ آسمان و زمین کے سارے نظام اور اللہ سبحانہٗ کی تخلیقات کا مشاہدہ کرتے تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ پیغمبر ان کو جو عذاب سے اور قیامت سے ڈرا رہا ہے یہ دیوانگی نہیں بلکہ بھرپور عقلیت ہے۔ حضور انور جو کچھ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

فرمایا ہے یعنی اس کی شہادت آسمان و زمین کا ایک ایک ذرہ اور اس کے مقرر کردہ قوانین تخلیق دے رہے ہیں جو شخص بھی اس کائنات کے نظام پر غور کرے گا وہ پکار اٹھے گا ربنا ما خلقت ھذا باطلا یہ کائنات بے مقصد نہیں بلکہ ایک روز جزا و سزا ہونے والی ہے۔ یہ اس کائنات کے مجموعی نظام کی ایک ایسی شہادت ہے جس کو صرف وہی لوگ جھٹلا سکتے ہیں، جو عقل و شعور سے قطعی بیگانہ ہوں۔

گویا اس ارشاد کے ذریعے اللہ سبحانہ نے کائنات کے تکوینی اسلام کو تشریعی اسلام کے لیے بطورِ دلیل استعمال کیا ہے۔ تکوینی احکام ان حکموں کو کہتے ہیں جن کے مطابق عمل چارہ و ناچار کرنا ہی پڑتا ہے اور جن کی خلاف ورزی ناممکن ہوتی ہے کیونکہ تمام کائنات ان کی اطاعت کرنے پر مجبور پیدا کی گئی ہے اور اسے پیدائشی طور پر اس بات کی بالکل آزادی نہیں دی گئی کہ چاہے تو ان پر عمل کرے اور چاہے تو نہ کرے۔ مثال کے طور پر سورج کو اللہ کا حکم ہے کہ ایک وقت مقرر پر نکلے اور پھر ایک وقت مقررہ پر ڈوب جائے۔ زمین سے ایک مقررہ فاصلہ پر رہے اور اسے روشنی اور گرمی پہنچائے۔ سورج ان احکام پر عمل کرنے کے لیے مجبور ہے۔ اس طرح کے احکام کو قوانین طبعی اور قوانین قدرت بھی کہتے ہیں۔ تشریعی احکام اللہ تعالیٰ کے ان حکموں کو جن کی پیروی پیدائشی مجبوری کے ساتھ نہیں ہوتی بلکہ آزاد مرضی کے ساتھ ہوتی ہے۔ مخلوق کو ان پر عمل کرنے کا بھی اختیار ہوتا ہے اور عمل نہ کرنے کا بھی مثلاً انسان کو حکم ہے کہ وہ خدا کی بندگی کرے لیکن وہ ایسا کرنے پر پیدائشی طور پر مجبور نہیں ہے ان احکام کو شرعی احکام یا شرعی قوانین بھی کہتے ہیں۔

یہ دونوں قسم کے احکام یکساں طور پر اللہ ہی کے احکام ہیں۔ دوسری طرف چونکہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہی کا نام اسلام ہے اس لیے ان میں سے ہر ایک کی طاعت اسلام ہوگی۔ پھر چونکہ جمادات سے لے کر انسانوں اور فرشتوں تک کوئی مخلوق بھی ایسی نہیں ہے جو اپنے خالق کی محکوم نہ ہو اور جسے تکوینی یا تشریعی احکام نہ دیے گئے اس لیے پوری کائنات اللہ کی بندگی کر رہی ہے۔ یہ بات قرآن نے بڑی قوت اور زور سے پیش کی ہے۔

افغیر دین اللہ یبغون ولہ اسلم من فی السماوات والارض

اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ تکوینی طور پر ساری مخلوق اللہ کے احکام پر چل رہی ہے۔ نبوت یہ مقصد لے کر آتی ہے کہ انسان کی اختیاری زندگی میں اللہ کے قوانین انسان کے ارادے و اختیار سے چلیں۔ نبوت کے مخالفوں کو نبوت سے اس معاملہ میں شدید اختلاف ہوتا ہے۔ نبوت ان کو سمجھانے کے لیے تکوینی احکام کا ذکر کرتی ہے اور تشریعی احکام کے لیے اسے بطورِ دلیل استعمال کرتی ہے

یہاں بھی استدلال کیا گیا ہے اور ساتھ ہی یہ بتا دیا ہے کہ اگر یہ لوگ زمین و آسمان کے نظام اور مخلوقاتِ الٰہی کی حکمتوں پر غور کرتے تو ان پر یہ حقیقت کھل جاتی جیسے یہ کائنات بے مقصد نہیں بنائی گئی ہے خود انسان بھی بے مقصد نہیں پیدا کیا گیا ہے۔ اور یہ راز بھی ان پر کھل جاتا کہ کیا عجب ان کی وہ اجل قریب آگئی ہو جس سے پیغمبر ان کو آگاہ کر رہا ہے۔

اسی بنا پر آخر میں ارشاد ہوا ہے فبای حدیث بعدہ یومنون؟ بعدہ کے مرجع کے بارے میں اگرچہ اختلاف ہے لیکن محققین نے اس کا مرجع حدیث کو قرار دیا ہے۔ قرآن کی دوسری آیات سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ سورہ جاثیہ میں ہے فبای حدیث بعد اللہ و آیاتہ یومنون مطلب یہ ہے کہ اس کامل ترین کتاب کے بعد اور کون سے کلام پر وہ ایمان لائیں گے۔

اللہ کا قانونِ ہدایت و ضلالت

۲۴۳- جس پر خدا کامیابی کی راہ گم کر دے تو پھر اس کو راہ دکھانے والا کوئی نہیں۔ اللہ ان کو ان کی سرکشی میں بھٹکتا چھوڑ دیتا ہے۔ ہدایت و ضلالت ہر چیز خدا کے قبضے میں ہے وہ نہ چاہے تو سارے سامانِ ہدایت کے رکھے جائیں آدمی کہیں سے بھی منتفع نہ ہو۔ ہاں عادۃً وہ جب ہی ہدایت کی توفیق دیتا ہے جب بندہ خود اپنے کسب و اختیار سے اس راستہ پر چلنا چاہے باقی جو دیدہ و دانستہ بدی اور شرارت ہی کی ٹھان لے تو خدا بھی راستہ دکھانے کے بعد اسی حال میں چھوڑ دیتا ہے [1]

مطلب یہ ہے کہ جو روش پیغمبر کے مخاطبوں نے اختیار کی ہے۔ یہ گمراہی کی روش ہے۔ اللہ کے رسول اس لیے نہیں آتے کہ لوگوں سے برائی کرنے کی طاقت سلب کرلیں اور آپ کو ایسا بنا دیں کہ برائی کر ہی نہ سکیں۔ وہ تو پیغامِ حق پہنچانے والے ہیں۔ پیام پہنچانے والے کا کام صرف یہ ہے کہ صاف صاف اور روشن طریقہ پر پیام پہنچا دے۔ اب اسے ماننا یا نہ ماننا یہ سننے والوں کا کام ہے پیام پہنچانے والا اس کا ذمہ دار نہیں ہے۔ یہاں اللہ کا قانونِ ہدایت و ضلالت کارفرما ہے۔ اللہ کے قانونِ ہدایت یہ ہے کہ بندے کے ارادے اور کوشش کے بغیر از خود کسی کو ہدایت نہیں دیتا۔ زبردستی ہدایت دینا اللہ تعالیٰ کے جاری قانون کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

نے اپنی ہمہ گیر قدرت وسیع اختیار اور نا قابلِ رد مشیت کے باوجود اپنے اختیار، اپنی مشیت اور خود اپنی حکمت سے انسان کو ارادہ اور ارادہ کے مطابق اپنے کام کرنے والے اعضا استعمال کرنے کی مشروط طاقت بخشی ہے۔ یہی ارادہ اور اعضا کو اس کے مطابق حرکت دے سکنے کی محدود قدرت اس کی ذمہ داری، تکلیف، بازپرس اور مواخذہ کی بنیاد ہے۔ اور اسی پر اس کے اعمال، اخلاق اور معاملات کی پوری عمارت کھڑی ہے۔ ہدایت کا فیضان ان پر ہوتا ہے جو ہدایت کی طلب کا ارادہ کرتے ہیں اور ضلالت وہاں آتی ہے جہاں طلب اور ارادہ نہیں ہوتا۔ اگر لوگ کانوں سے حق کا پیغام سننے اور آنکھوں سے دیکھنے اور دل سے سمجھنے کی کوشش کریں تو اللہ تعالیٰ اپنی توفیق ہدایت سے سرفراز فرماتے۔ ارشاد ہے :

ان الذین آمنوا و عملوا الصالحات یھدیھم ربھم بایمانھم

اور

والذین اھتدوا زادھم ھدیً

جیسے ہدایت کے آنے کے لیے اللہ کا قانون ہے ایسے ہی گمراہی کے لیے بھی قانون ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ ۚ
لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ ؔؕ ثَقُلَتْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ
لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ؕ يَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِیٌّ عَنْهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا
عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۷﴾ قُلْ لَّاۤ
اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ
الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۛۚ وَمَا مَسَّنِیَ السُّوْٓءُ ۛۚ
اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۸﴾

لوگ آپ سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ وہ کب آئے گی؟ تم کہہ دو کہ اس کا علم تو صرف میرے رب کو ہے وہی ہے جو اسے اپنے وقت پر ظاہر کرے گا وہ آسمانوں، زمینوں میں بڑا حادثہ ہوگا وہ تمہارا اچانک استقبال کرے گی، اے پیغمبر یہ لوگ تم سے قیامت کے بارے میں اس طرح سوال کر رہے ہیں کہ گویا تم اس کی جستجو

ہیں لگے ہو، کہہ دو کہ اس کا علم تو اللہ ہی کو ہے لیکن لوگوں کی اکثریت اس حقیقت سے بے خبر ہے[۲۴۴]۔ اے پیغمبر کہہ دو کہ میں اپنی ذات کے لیے کسی نفع و نقصان پر کوئی اختیار نہیں رکھتا ہوں صرف وہ ہی کچھ ہو کر رہتا ہے جو اللہ چاہتا ہے، اور اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو میں بہت سے فائدے اپنے لیے فراہم کر لیتا اور مجھے کبھی کوئی نقصان نہ پہنچتا، میں اس کے سوا کیا ہوں کہ ماننے والوں کے لیے بشیر و نذیر بن کر آیا ہوں۔[۲۴۵]

معانی مفردات

ساعۃ: لغت میں وقت کے غیر معین قلیل حصہ کو کہتے ہیں۔ اور اہل ہیئت کے یہاں دن رات کو برابر ۲۴ پر تقسیم کرکے ۱/۲۴ کو کہتے ہیں۔ اہل عرب بھی علمائے ہیئت کی اس تقسیم سے واقف تھے۔ حدیث میں ہے، یوم الجمعۃ اثنتا عشرۃ ساعۃ۔ موجود وقت کو بھی ساعت کہتے ہیں۔ اور اس وقت کو بھی ساعۃ کہتے ہیں جس میں قیامت قائم ہوگی۔ قرآن میں لفظ ساعۃ بغیر الف لام کے وقت کے معنے میں آتا ہے اور الف لام کے ساتھ قیامت کے معنے میں ہوتا ہے۔ مُرْسٰا۔ مصدر میمی ہے اس کے معنے ٹھہرنے اور ہونے کے ہیں۔ رَسَا یَرْسُوْ کے معنے ٹھہرنے کے ہیں۔ اسی سے پانی کے جہازوں کے ٹھہرنے کی جگہ کو بندرگاہ کہتے ہیں۔ اسی سے بسم اللہ مجرٖھا و مرسٰھا۔ زندگی کی کشتی چلتے چلتے جہاں ٹھہر جائے گی وہ مرسی ہے۔ حَفِیٌّ، بحث کرنے والا، متلاشی۔ کسی چیز سے پورے طور پر باخبر حفادۃ سے جس کے معنے

تلاش کے ساتھ کسی کا حال پوچھنے اور کسی کام میں مہربان ہونے کے ہیں ۔

اشتراکی تصوّر پر بھرپور قدغن

جہاں تک توحید واشتراک کا تعلق ہے قرآن کا تصوّر اس درجہ کامل ہے اور بے لچک ہے کہ اس کی کوئی نظیر پچھلے تصوّرات میں نہیں مل سکتی ۔

اگر خدا اپنی ذات میں یگانہ ہے تو ضروری ہے کہ وہ اپنی صفات میں بھی یگانہ ہو ۔ کیونکہ اس کی توحید کی عظمت قائم نہیں رہ سکتی ۔ اگر کوئی ہستی اس کی صفات میں شریک مان لی جائے ۔ قرآن سے پہلے توحید کے ایجابی پہلو پر تو مذاہب نے زور دیا تھا لیکن سلبی پہلو نمایاں نہیں ہو سکا تھا ۔ ایجابی پہلو یہ ہے کہ خدا ایک ہے ۔ سلبی یہ ہے کہ اس کی طرح کوئی نہیں اور جب اس کی طرح کوئی نہیں تو ضروری ہے کہ جو صفتیں اس کے لیے ٹھہرا دی گئی ہیں ان میں کوئی دوسری ہستی شریک نہ ہو ۔ پہلی بات توحید فی الذات ہے اور دوسری توحید فی الصفات سے تعبیر کی گئی ہے ۔ قرآن سے پہلے اقوام عالم کی استعداد اس درجہ بلند نہیں ہوئی تھی کہ توحید فی الصفات کی نزاکتوں اور بندشوں کی متحمل ہو سکتی ۔ اس لیے مذاہب نے توحید فی الذات ہی پر زور دیا ۔ توحید فی الصفات اپنی ابتدائی اور سادہ حالت میں چھوڑ دی گئی ۔

اس بارے میں سب سے زیادہ نازک معاملہ پیغمبر کی شخصیت کا تھا یہ ظاہر ہے کہ کوئی تعلیم عظمت و رفعت حاصل نہیں کر سکتی جب تک نبی کی شخصیت میں بھی عظمت کی شان نہ پیدا ہو جائے لیکن نبی کی شخصیت کی عظمت کے حدود کیا ہیں ۔ یہیں آ کر سب کے قدموں نے ٹھوکر کھائی وہ اس کی ٹھیک ٹھیک حد بندی نہ کر سکے ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کبھی شخصیت کو خدا کا اوتار بنا دیا کبھی ابن اللہ سمجھ لیا ، کبھی شریک و سہیم ٹھہرا دیا اور اگر یہ نہیں تو کم ازکم اس کی تعظیم میں بندگی و نیاز کی سی شان پیدا کر دی ۔ یہودیوں نے اپنے ابتدائی عہد کی گمراہیوں کے بعد کبھی ایسا نہیں کیا کہ پتھر کے بت تراش کر ان کی پوجا کی ہو لیکن اس بات سے وہ بھی بچ نہیں سکے کہ اپنے نبیوں کی قبروں پر ہیکل تعمیر کر کے انہیں عبادت گاہوں کی شان تقدیس دے دیتے تھے ۔ اسی طرح ہمیں معلوم ہے کہ مسیحیت کی حقیقی تعلیم سرتاسر توحید کی تعلیم کی تھی لیکن ابھی اس کے ظہور پر پورے سو برس ہی گزرے تھے کہ الوہیت مسیح کا عقیدہ نشو ونما پا چکا تھا ۔ ان آیات کا اسی پس منظر میں مطالعہ فرمائیے ۔

۲۴۴ ۔ لوگ آپ سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ وہ کب آئے گی ؟ تم کہہ دو کہ اس کا

علم تو صرف میرے رب کو ہے وہی اسے اپنے وقت پر ظاہر کرے گا وہ آسمانوں زمینوں میں بڑا حادثہ ہو گا وہ تمہارا اچانک استقبال کرے گی اے پیغمبر یہ لوگ تم سے قیامت کے بارے میں اس طرح سوال کر رہے ہیں کہ گویا تم اس کی جستجو میں لگے ہو کہہ دو کہ اس کا علم تو اللہ ہی کو ہے لیکن اکثریت لوگوں کی اس حقیقت سے بے خبر ہے۔ پہلے عسی ان یکون قد اقترب اجلھم میں خاص اس قوم کی اجل موت کا ذکر تھا کہ انہیں کچھ معلوم نہیں کب آ جائے یہاں تمام دنیا کی اجل قیامت کے متعلق متنبہ فرما دیا کہ جب کسی کو خاص اپنی موت کا علم نہیں کب آئے، پھر کل دنیا کی موت کو کون بتلا سکتا ہے کہ فلاں تاریخ اور فلاں سنہ میں آئے گی۔ اس کی تعیین کا علم بجز خدائے علام الغیوب کسی کے پاس نہیں وہ ہی وقت معین و مقدر پر اسے واقع کر کے ظاہر کر دے گا کہ خدا کے علم میں اس کا یہ وقت تھا۔ آسمان و زمین میں وہ بڑا بھاری واقعہ ہو گا اور اس کا علم بھی بہت بھاری ہے جو خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں گو اس واقعہ کی امارات بہت سی نشانیاں انبیاء علیہم السلام خصوصاً ہمارے پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہیں۔ تاہم ان سب علامات کے بعد بھی جب قیامت کا وقوع ہو گا تو بالکل بے خبری میں اچانک اور دفعتہً ہو گا جیسا کہ بخاری وغیرہ کی احادیث میں تفصیلاً مذکور ہے کانک حفی کا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے قیامت کے آنے کے بارے میں دریافت کیا تھا ان کے طرزِ سوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ گویا وہ آپ کی نسبت یہ سوچتے ہیں کہ آپ بھی اس مسئلہ کی تحقیق و تفتیش اور کھوج لگانے میں مشغول رہے ہیں اور تلاش کے بعد اس کے علم تک رسائی حاصل کر چکے ہیں۔ حالانکہ یہ علم حق تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔ انبیاء علیہم السلام اس چیز کے پیچھے نہیں پڑتے جس سے خدا نے اپنی مصلحت کی بنا پر روک دیا ہو نہ ان کے اختیار میں ہے کہ جو چاہیں کوشش کر کے ضرور معلوم کر لیا کریں۔ ان کا منصب یہ ہے کہ جن بے شمار علوم و کمالات کا خدا کی طرف سے افاضہ ہو نہایت شکر گزاری اور قدر شناسی کے ساتھ قبول کرتے رہیں مگر ان باتوں کو اکثر عوام کالانعام کیا سمجھیں۔[1]

آیت زیرِ تشریح اس لحاظ سے خاص اہمیت رکھتی ہے کہ اس میں قیامت کے وقت خاص کے علم کو اللہ سبحانہ کی خصوصیت قرار دیا ہے۔ قیامت کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ بظاہر اس دعوے پر یہ آیت ایک دلیل معلوم ہوتی ہے مگر فی الحقیقت یہ ایک دلیل نہیں بلکہ دلائل کا مجموعہ ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

انما علمها عند ربی میں صرف قصر لاکر بتایا ہے کہ قیامت کے آنے کا علم صرف اللہ کو ہے۔ اللہ کے سوا کسی کو نہیں یہ قصر کا ایک طریقہ ہے۔

لا یجلیها لوقتها الا هو، اس میں قصر کا دوسرا طریق لاکر بتایا ہے کہ خدا ہی قیامت کو اپنے وقت پر ظاہر کرے گا اور اس کے آنے سے پہلے یہ خفا مستمر رہے گا یعنی کسی کو پتہ نہ ہوگا۔

ثقلت فی السماوات والارض یہ انداز بیان بھی یہی ظاہر کر رہا ہے کہ قیامت کے آنے کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں اکثر مفسرین نے ثقلت کی تفسیر خفیت سے کی۔

لا تاتیکم الا بغتة کا مطلب بھی اسی کی تائید کرتا ہے قیامت اچانک آئے گی یعنی کسی مخلوق کو پہلے سے اس کی اطلاع نہ ہوگی۔

کانک حفی عنها، بھی اسی کا موید ہے گویا اس کے متلاشی ہیں۔ کان کا استعمال بتا رہا ہے کہ حضور کو اس کا علم نہ تھا۔

انما علمها عند ربی، میں بھی مکرر یہی بات کہی گئی ہے کہ اللہ کے سوا قیامت کا علم کسی کو نہیں ہے۔

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ اس آیت میں چھ بار مختلف انداز اور مختلف پیرایوں میں اس حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے کہ قیامت کے وقت کا علم حق تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اور کسی آسمانی یا زمینی مخلوق کو اس کا علم نہیں۔ اس کے باوجود کچھ بزرگوں کی رائے یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو قیامت کے آنے کا علم تھا۔ اور ان بزرگوں نے قرآن کی اس آیت اور اس قسم کی دوسری آیات کی کچھ تاویلیں کی ہیں۔ اصولی طور پر ان کی تاویلیں صرف تین ہیں۔

۱۔ ایک یہ کہ اس قسم کی آیات میں غیر اللہ سے عموماً یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خصوصاً صرف علم ذاتی کی نفی کی گئی ہے نہ کہ علم عطائی کی۔

۲۔ دوسرے یہ کہ ان آیات کے نزول کے بعد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ علم عطا فرما دیا گیا تھا۔

۳۔ تیسرے یہ کہ جن آیات میں علم ساعت کو اللہ سبحانہ کے ساتھ خاص بتایا گیا ہے ان سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ کسی دوسرے کو اس کا علم نہیں بلکہ اس کا مفاد صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان کا علم ہے۔ رہا دوسروں کو اس کا علم ہونا نہ ہونا اس سے وہ آیات ساکت ہیں۔

بہرحال یہ بزرگ یہی تاویلات کرتے ہیں لیکن فی الحقیقت یہ تاویلات اتنی رکیک ہیں کہ کسی

علمی شخصیت کی طرف سے ان کا پیش کیا جانا ان کی عالمانہ حیثیت پر بدنما داغ ہے۔ ہم معالم القرآن کے ناظرین سے تھوڑی سی معذرت کے ساتھ زیرِ نظر آیت کے بارے میں اپنی عام شاہراہ سے ہٹ کر شارحینِ قرآن کی تشریحات ہدیہ ناظرین کرتے ہیں تاکہ وہ خود غور کر لیں اور ملاحظہ فرمالیں کہ ان تاویلات کے لیے وہاں کوئی معمولی سی گنجائش بھی ہے۔

امام الحدیث والتفسیر ابن جریر طبری اسی آیت کے ذیل میں حبرامت ترجمانِ قرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے اپنی سند سے بیان کرتے ہیں کہ:

جب لوگوں نے حضور سے قیامت کے متعلق سوال کیا تو اس طرح سوال کیا گیا گویا کہ حضور ان کے ساتھ بڑے مہربان ہیں۔ بس خدا کی طرف سے آپ پر وحی آئی کہ قیامت کا علم بس خدا ہی کو ہے۔ اس نے اپنے ہی لیے اس کے علم کو خاص کر لیا ہے۔ اسی لیے نہ کسی فرشتہ کو اس کی اطلاع دی ہے نہ کسی رسول کو۔

اور یہی امام ابن جریر اسی آیت کے ذیل میں اپنی سند سے حضرت قتادہؒ تابعی سے روایت کرتے ہیں۔

انما علمها عند ربی الخ کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے وقت خاص کا علم بس خدا ہی کے پاس ہے۔ وہی اس کو اس کے وقت پر ظاہر کرے گا۔ اس کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

طبقہ صحابہ و تابعین کے ان تفسیری کلمات کے بعد دیگر ائمہ تفسیر کی تصریحات بھی ملاحظہ ہوں۔ امام ابوجعفر ابن جریر طبری فرماتے ہیں۔

اس آیت میں اللہ سبحانہ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ جو لوگ آپ سے قیامت کے بارے میں سوال کرتے ہیں آپ ان کو یہ جواب دیں کہ اس کے وقت خاص کا علم اللہ سبحانہ عالم الغیب کے سوا کسی کو نہیں اور وہی اس کو اس کے وقت پر ظاہر کرے گا، دوسروں کو اس کی کچھ خبر نہیں۔

پھر آیت کریمہ کے آخری حصہ کی تفسیر فرماتے ہوئے اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ اسی مضمون کو اس طرح پیش فرماتے ہیں۔

اللہ سبحانہ کے اس ارشاد قل انما علمها عند ربی کا مطلب یہ ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ وقت قیامت کے متعلق سوال کرنے والی اس جماعت سے کہہ دیجئے

کہ مجھ کو اس کا علم نہیں اور اس کو اس خدائے علیم کے سوا کوئی نہیں جانتا جو زمین و آسمان کے تمام غیبوں کو جانتا ہے لیکن بہت سے لوگ اس بات سے ناواقف ہیں کہ اس کا علم صرف خدا ہی کو ہے اور وہ گمان کرتے ہیں کہ اللہ کی کچھ مخلوق کو بھی قیامت کے وقت خاص کی خبر ہے۔

تفسیر ابن جریر ص۸۵

عمادالمفسرین، امام المحدثین حافظ ابن کثیر دمشقی اس آیت کریمہ کی تفسیر احادیث و آثار سے فرمانے کے بعد لکھتے ہیں اور کس قدر زور سے فرماتے ہیں۔

لہٰذا یہ نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم اور خاتم النبیین ہیں جو نبی الرحمۃ نبی التوبہ اور نبی الملحمۃ ہیں۔ اور جو خدا کے سب سے آخری اور پچھلے نبی ہیں۔ جن کے قدموں پر لوگوں کا حشر ہوگا وہ باوجود ان خصائص اور فضائل عظیمہ کے اور باوجود اس قرب قیامت کے کہ آپ خود ارشاد فرماتے ہیں کہ میں اور قیامت اس طرح قریب ہیں جیسے یہ انگشت شہادت اور قریب والی انگلی جیسا کہ صحیح بخاری میں حضرت انس اور حضرت سہیل بن سعد سے مروی ہے۔ غرض بایں ہمہ حق تعالیٰ آپ کو حکم دیتا ہے کہ قیامت کے وقت کے بارے میں جب آپ سے یہ سوال کیا جائے تو ہمیشہ آپ اس کو خدا ہی کے حوالے کریں چنانچہ فرمایا قل انما علمھا عند اللہ ولکن اکثر الناس لا یعلمون۔

(تفسیر ابن کثیر)

اور علامہ علی بن محمد بن خازن آیت کی شان نزول نقل فرمانے کے بعد اس آیت کی تفسیر اس طرح فرماتے ہیں:

لوگ آپ سے قیامت کے متعلق سوال کرتے ہیں کہ وہ کب آئے گی۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان سے فرما دیجئے کہ اس کا علم بس میرے پروردگار کے پاس ہے یعنی اس کے وقت خاص کو سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا۔ خدا نے اس کے علم کو اپنے لیے خاص کر لیا ہے۔ اسی لیے کسی کو اس کی اطلاع نہیں دی ہے۔ بس خدا ہی بروقت اس پردے کو ہٹائے گا۔ یعنی جب اس کا وقت آئے گا اس کو قائم کردے گا وہ بھاری ہے آسمانوں اور زمین میں یعنی اس کا معاملہ گراں ہے اور اس کا علم مخفی ہے آسمان و زمین کی تمام مخلوقات سے، وہ قیامت تم پر اچانک آئے گی یعنی بے خبری ہی میں آجائے گی۔ یہ لوگ آپ سے قیامت کا اس

طرح سوال کرتے ہیں گویا کہ آپ ان کے ساتھ بڑے مہربان ہیں۔ اے محمدؐ آپ ان سے فرما دیجئے کہ اس کا علم بس خدا ہی کو ہے یعنی اللہ نے اس کا علم اپنے لیے خاص کر لیا ہے بس اس کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ کب آئے گی۔ لیکن بہت سے اس سے ناواقف ہیں یعنی وہ نہیں جانتے کہ اس کا بس خدا ہی کو علم ہے اور اس نے اپنے ہی لیے اس کو خاص کر لیا ہے تاکہ لوگ اس کے متعلق دریافت نہ کریں۔

(تفسیر خازن)

اور قریب قریب امام بغوی نے معالم التنزیل میں سپرد قلم فرمایا ہے اور خطیب شربینی اپنی تفسیر میں شان نزول ذکر فرمانے کے بعد لکھتے ہیں:۔

لوگ آپ سے قیامت کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ آپ ان سے فرما دیجئے کہ (انما علمها عند ربی) اس کا علم بس میرے پروردگار کے پاس ہے یعنی اس کے سوا کوئی اس وقت مخصوص کو نہیں جانتا جس میں قیامت آئے گی اس نے اپنے ہی لیے اس کو مخصوص کر رکھا ہے۔ اسی لیے اپنی مخلوق میں سے کسی کو اس کی اطلاع نہیں دی ہے اور یہی وجہ تھی کہ جب حضرت جبریل نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ بتلائیے کہ قیامت کب ہوگی تو حضور نے فرمایا کہ اس بارے میں میرا علم تم سے زیادہ نہیں ہے ورنہ اگر آپ کو اس کا علم ہوتا تو آپ ضرور بتلا دیتے جس طرح اسی مجلس کے باقی سوالات کا آپ نے حضرت جبریل کو صاف صاف جواب دیا تھا۔ اس سوال کا بھی صاف صاف جواب دے دیتے کہ فلاں وقت ہوگی۔ (تفسیر سراج منیر)

مشہور مفسر قرآن امام رازی ماقبل سے ربط اور شان نزول بیان فرمانے کے بعد آیت کی تفسیر میں رقمطراز ہیں:

لوگ آپ سے قیامت کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ آپ ان سے فرما دیجئے کہ جس خاص گھڑی میں قیامت ہوگی اس کا علم حق سبحانہٗ کے سوا کسی کو نہیں ہے اور اسی جیسا ان آیات کا مضمون ہے ان اللّٰہ عندہ علم الساعۃ ان الساعۃ اٰتیۃ لا ریب فیھا۔ ان الساعۃ اٰتیۃ اکاد اخفیھا۔ اور جب حضرت جبریل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ قیامت

کب ہوگی تو آپ نے فرمایا کہ اس کے متعلق میرا علم تم سے زیادہ نہیں ہے۔
(مفاتیح الغیب)

اور علامہ نسفی حنفی مدارک التنزیل میں فرماتے ہیں:

یہ لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں قیامت کے بارے میں یعنی اس کے ہونے کے وقت کا۔ ان سے کہہ دیجئے کہ اس کا علم بس خدا ہی کے پاس ہے۔ اس کو اس نے اپنے ہی لیے خاص کر رکھا ہے نہ کسی مقرب فرشتے کو اس کی اطلاع دی ہے اور نہ کسی نبی مرسل کو تاکہ یہ چیز طاعت کے لیے زیادہ داعی اور گناہوں سے زیادہ روکنے والی ہو جیسا کہ اسی مصلحت سے خدا نے ہر شخص کی موت کو بھی مخفی رکھا ہے تاکہ ہر وقت وہ ڈرتا رہے اور کسی وقت بے خوف و نڈر نہ ہو۔ بہر حال قیامت کا علم بس خدا ہی کو ہے، ظاہر نہیں کرے گا اس کے معاملہ کو اور نہیں کھولے گا اس کے خفا کو مگر وہی خدا۔ وہ آسمانوں اور زمین میں بھاری ہے یعنی قیامت کے معاملہ نے زمین و آسمان کی تمام مخلوق یعنی ملائکہ اور انس و جن کو غرض سب ہی کو مبتلائے فکر کر رکھا ہے اور ہر ایک اس کا متمنی ہے کہ کسی طرح اس کو اس کا وقت معلوم ہو جائے اور اس کا مخفی رہنا ہر ایک پر شاق ہے یا یہ کہ وہ قیامت خود بھاری ہے زمین و آسمان میں، اس لیے کائنات سماوی و ارضی اس کی سختیوں اور ہولناکیوں سے خائف ہے۔ وہ قیامت تمہارے پاس اچانک آئے گی وہ لوگ قیامت کے بارے میں اس طرح سوال کرتے ہیں گویا آپ نے اس کو معلوم ہی کر لیا ہے۔ آپ فرما دیجئے کہ اس کا علم بس خدا ہی کے پاس ہے لیکن بہت سے اس بات کو جانتے نہیں ہیں کہ اس کا علم صرف خدا ہی کو ہے۔ (مدارک التنزیل)

اور قاضی بیضاوی اپنی تفسیر انوار التنزیل میں فرماتے ہیں:

لوگ آپ سے قیامت کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہ کب اس کا وقوع ہوگا آپ فرما دیجئے کہ اس کا علم بس میرے رب ہی کو ہے اس کو اس نے اپنے لیے خاص کر لیا ہے نہ کسی مقرب فرشتے کو اس کی اطلاع دی ہے نہ کسی نبی مرسل کو وہی اس کے وقت پر اسے ظاہر کرے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے سوا دوسروں پر اس کا پوشیدہ رہنا اس کے آنے تک مستمر رہے گا وہ آسمانوں اور زمین پر گراں ہے یعنی زمین و آسمان کی ساری کائنات پر بھاری اور شاق ہے۔ شاید یہ اس کے

اخفاء کی حکمت کی طرف اشارہ ہے۔ بہرحال وہ تمہارے پاس اچانک ہی آئے گی۔ یہ لوگ آپ سے اس کے متعلق ایسے سوالات کرتے ہیں گویا کہ آپ اس سے باخبر ہی ہو گئے ہیں۔ آپ فرما دیجئے کہ اس کا علم بس خدا ہی کو ہے لیکن بہت سے لوگ نہیں جانتے کہ صرف خدا ہی اس کا جاننے والا ہے۔ اور وہ اسی کے ساتھ خاص ہے۔ (تفسیر بیضاوی)

اور تفسیر جلالین میں اس آیت کی تفسیر اس طرح کی گئی ہے:

لوگ آپ سے قیامت کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہ اس کا وقوع کب ہوگا آپ فرما دیجئے کہ اس کا علم بس میرے رب ہی کو ہے۔ نہیں ظاہر کرے گا اس کو اس کے وقت پر خدا کے سوا، یعنی خدا ہی اس کو اپنے وقت پر ظاہر کرے گا۔ بھاری ہے وہ آسمانوں اور زمین میں یعنی قیامت اپنی ہولناکی کی وجہ سے زمین و آسمان والوں پر بہت شاق ہے اور وہ تم پر اچانک اور بے خبری ہی میں آئے گی۔ وہ لوگ آپ سے ایسے سوال کرتے ہیں گویا کہ آپ اس کے بہت ہی متلاشی ہیں اور آپ نے تحقیق و تفتیش کر کے گویا اس کو معلوم ہی کر لیا ہے۔ آپ ان سے فرما دیجئے کہ اس کا علم بس خدا ہی کو ہے لیکن بہت سے حقیقت نا آشنا اس سے بے خبر ہیں۔

اور علامہ ابوالسعود انما علمها عند ربی کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

علم قیامت کے صرف خدا ہی پاس ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنے ہی واسطے اس کو خاص کر رکھا ہے اس طور پر کہ کسی ملک مقرب اور نبی مرسل کو بھی اس کی خبر نہیں دی ہے۔

پھر لا یجلیها لوقتها الا هو کی تفسیر فرماتے ہیں کہ:

حق تعالیٰ بذات خود قیامت کے معاملہ کو ظاہر کرے گا۔ اس طرح پر کہ جب اس کا وقت مقرر آجائے گا تو اس کو قائم کر کے مشاہدہ کرا دے گا تو اسی وقت مخلوقات کو معلوم ہو جائے گا یہ وہی وقت موعود ہے ایسا نہیں ہوگا کہ اس کے قائم ہونے سے پہلے حق تعالیٰ اپنے کسی خاص بندے کو اس کی اطلاع دے دیں اور پھر وہ دوسروں کو بتلا دے۔ بہرحال عام مخلوقات کو قیامت کے وقت کا علم اسی وقت ہوگا جب وہ آجائے گی اور بذریعہ مشاہدہ نہ کہ بذریعہ اخبار اور یہ بات لا یجلیها کے لفظ سے معلوم ہوتی ہے کیونکہ تجلیہ انکشاف تام کو چاہتا ہے جس کے بعد کوئی ابہام نہ ہے اور یہ چیز

مشاہدہ ہی سے حاصل ہوتی ہے اور لو قتعا کی تقدیم سے بھی اسی پر تنبیہ کرنی مقصود ہے کہ یہ انکشاف بذریعہ اخبار نہیں ہوگا بلکہ عین وقت پر بذریعہ مشاہدہ میں ہوگا۔

پھر آیت کے آخری حصہ یسئلونک کانک حفی عنہا کی تفسیر میں فرماتے ہیں :

مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ آپ سے قیامت کے متعلق اس طرح سوال کرتے ہیں کہ گویا اس سوال سے آپ کو خوشی ہوتی ہے اور گویا آپ کو اس سوال سے خوشی ہوتی ہے اور گویا آپ چاہتے ہیں کہ یہ سوال کیا جاتے حالانکہ آپ کو یہ سوال سخت ناگوار ہے کیونکہ اس میں اللہ عزوجل کے اس غیب کے پردے سے چھیڑ چھاڑ ہے جس کو اس نے اپنے ہی لیے خاص کر لیا ہے آپ صاف فرما دیجئے کہ اس کا بس خدا ہی کو علم ہے لیکن بہت لوگ نہیں جانتے یعنی ان کو اس کی خبر نہیں کہ یہ علم مخصوصات باری تعالیٰ سے ہے۔ چنانچہ ان میں سے بعض جاہل تو سرے سے قیامت ہی کے منکر ہیں اور بعض وہ ہیں جو یہ تو جانتے ہیں کہ قیامت آتے گی مگر اس کے باوجود از راہِ جہالت یہ بھی گمان کرتے ہیں کہ آپ کو اس کے وقت خاص کا پتہ ہے اسی لیے وہ آپ سے سوال کرتے ہیں۔

مشہور مفسر ابوالفرج جمال الدین عبدالرحمان بن علی الجوزی اپنی تفسیر زاد المسیر فی علم التفسیر میں انما علمہا عند اللہ کی تفسیر کرتے ہیں :

یعنی اللہ کے سوا قیامت کا کسی کو علم نہیں ہے لیکن لوگوں کی اکثریت اس سے نادان ہے۔ امام مقاتل کہتے ہیں کہ لوگ سے مراد یہاں اہلِ مکہ ہیں اور لا یعلمون کی تشریح دو طرح ہے۔ ایک یہ کہ وہ قیامت کو نہیں مانتے ہیں یہ امام مقاتل کی رائے ہے۔ دوسرے یہ کہ ان کو اس بات کا پتہ نہیں کہ قیامت کے آنے کا علم اللہ سبحانہٗ کے مخصوصات میں سے ہے۔ یہ سلیمان دمشقی کی رائے ہے۔

(زاد المسیر فی علم التفسیر)

علامہ آلوسی بغدادی اپنی تفسیر روح المعانی میں رقمطراز ہیں :

انما علمہا عند ربی میں قیامت کا علم خدا کے پاس ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ علم خاصۃ اللہ سبحانہٗ ہے اللہ نے اس کی کسی کو خبر نہیں دی ہے نہ فرشتہ مقرب کو اور نہ نبی مرسل کو۔

اس کے بعد لا یجلیها لوقتها کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اس میں اس کا بیان ہے کہ اس کا پوشیدہ ہونا تا قیام قیامت مستمر ہے اور اور اس کی خبر دینے کے بارے میں بھرپور مایوسی پیدا کی گئی ہے۔

اس کے بعد قل انما علمها عند ربی ولکن اکثر الناس لا یعلمون کی تفسیر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

لا یعلمون کا مفعول محذوف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو اس علم کے مخصوص الٰہی ہونے کی خبر نہیں ہے۔ کچھ تو قیامت ہی کے منکر ہیں ان کی جانب سے تو یہ سوال محض تلاعب ہے اور کچھ قیامت کو تو مانتے ہیں مگر ان کا گمان یہ ہے کہ حضور انور کو قیامت کے وقت کا علم ہے اس لیے نادانی اور بے خبری سے یہ سوال کرتے ہیں۔ اور کچھ یہ سمجھتے ہیں کہ قیامت کا علم ہونا رسالت کا تقاضا ہے۔ اس لیے بطور اعتراض دریافت کرتے ہیں۔ اللہ سبحانہ نے قیامت کے معاملہ کو حکمتِ تشریعی کی بنا پر پوشیدہ رکھا ہے کیونکہ اس کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے بندوں میں ایک طرف طاعت کا داعیہ ہوگا اور دوسری طرف گناہوں سے رکنے کا ذریعہ ہوگا۔ ٹھیک ایسے ہی جیسے انسان کی عمر کا اخفا انسان میں طاعت کا داعیہ اور گناہ سے بچنے کا ذریعہ ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ صرف حکمتِ تشریعی کا نہیں بلکہ حکمتِ تکوینی کا بھی یہی تقاضا ہے کہ قیامت کے معاملہ کو چھپایا جائے تو یہ بھی درست ہے۔ آیاتِ قرآنی کھلے طور پر بتا رہی ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو قیامت کے آنے کے وقت کا علم نہ تھا، ہاں آپ کو اجمالاً قیامت کا قرب ہونا معلوم تھا جیسا کہ ترمذی میں حضرت انس کی حدیث میں تصریح ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں اور قیامت اس طرح ہیں اور آپ نے انگشت شہادت اور درمیانی انگلی سے اشارہ کرکے بتایا۔

(روح المعانی)

در منثور میں بحوالہ ابن اسحاق و ابن جریر و ابو الشیخ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بعض یہود نے از راہِ شرارت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قیامت کے وقت کے متعلق سوال کیا تو اسی موقع پر یہ آیت نازل ہوئی نیز اسی در منثور میں ہے بحوالہ ابن جریر حضرت قتادہ سے مروی ہے کہ یہی سوال قریشِ مکہ کی جانب سے کیا گیا تھا۔ اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی۔

بہرحال سوال خواہ کسی کی جانب سے ہو لیکن اتنا متفق علیہ ہے کہ قیامت کے متعلق آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا تھا کہ وہ کب آئے گی۔ اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی جس میں بکرات و مرات اس حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے کہ قیامت کے وقت خاص کا علم مخصوصات باری تعالیٰ سے ہے اور بس اسی کو معلوم ہے کہ قیامت کب آئے گی۔

اگر مفسرین کی تشریحات کے بعد اب ہمیں آیت کی مزید تشریح کی ضرورت نہیں ہے مگر بات کی تکمیل کی خاطر چند جدید مفسرین کی تشریحات بھی ہدیہ ناظرین کرتے ہیں تاکہ ناظرین کو معلوم ہو سکے کہ پوری علمی دُنیا کیا کہہ رہی ہے اور ہمارے بزرگ یہ کہہ کر کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قیامت آنے کا علم تھا ہمیں کدھر لے جا رہے ہیں۔

علامہ السید رضا مصر کے مشہور عالم ہیں انہوں نے تفسیر المنار کے نام سے تفسیر لکھی ہے جو صرف ۱۱ پارے تک ہے۔ آپ مفتی عبدہٗ مصری کے شاگرد ہیں۔ وہ انما علمها عند ربی کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اے ڈر سنانے والے کہہ دو کہ قیامت کا علم صرف میرے رب کے پاس ہے نہ میرے پاس ہے اور نہ کسی اور کے، یہ معنے آیت کے انما کے آنے سے ہوئے ہیں۔

لا یجلیها لوقتها الا هو کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

مطلب یہ ہے کہ قیامت کے چہرے سے پردہ ہٹانا اور اسے اپنے وقت پر ظاہر کرنا صرف اللہ کا کام ہے۔ قیامت کے ظاہر کرنے اور اس کے وقت بتانے میں کوئی وساطت نہیں ہے۔

ولکن اکثر الناس لا یعلمون کی تفسیر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

لوگوں کو یہ پتہ نہیں ہے کہ قیامت کی آمد کا علم صرف اللہ سبحانہٗ کو ہے۔

اور نہ لوگوں کو اس کی حکمت کا پتہ ہے اور نہ پوچھنے والوں کو سوال کا سلیقہ ہے۔

۴ استاذ الشریعۃ الاسلامیہ جناب احمد مصطفیٰ المراغی اپنی تفسیر المراغی میں رقمطراز ہیں:

اے پیغمبر ان سے کہہ دو کہ قیامت کا علم صرف میرے رب کے پاس ہے، نہ میرے پاس ہے اور نہ ہی مخلوقات میں سے کسی اور کے پاس ہے۔ اسی کے ہم معنے قرآن کی یہ آیت ہے۔ الیه یرد علم الساعة اور فیم انت من ذکراها الی ربک منتهاها۔

اور و لکن اکثر الناس لا یعلمون کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

یعنی لوگوں کو پتہ نہیں ہے کہ قیامت کا علم مخصوص الٰہی ہے اور نہ لوگوں کو اس کی حکمت کا پتہ ہے اور نہ اس موضوع پر ان کو ادب سوال آتا ہے۔ سوال کا ادب صرف اہل ایمان کو آتا ہے ۔

اور علامہ الشام محمد جمال الدین القاسمی اپنی تفسیر محاسن التاویل میں اس آیت کی تشریح فرماتے ہوئے لکھتے ہیں :

لوگ آپ سے قیامت کے ہونے اور اس کے وقت کے بارے میں دریافت کرتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ اس کا علم میرے رب کے پاس ہے وہ ہی اسے اپنے وقت میں ظاہر کرے گا۔ و لکن اکثر الناس لا یعلمون یعنی لوگوں کو یہ پتہ نہیں کہ قیامت کے وقت کا علم اللہ کو ہے اور مخلوقات میں سے یہ علم کسی کو نہیں دیا گیا ہے ۔

اسی قسم کی آیت کی تشریح محمد عزہ دروزہ نے اپنی مشہور تفسیر التفسیر الحدیث میں کی ہے۔ دیکھئے التفسیر الحدیث ج ۲ ص ۱۹۱۔

ظاہر ہے ان تشریحات کے مطالعہ کے بعد مذکورہ بالا تینوں تاویلوں میں سے اس آیت کی تفسیر میں کسی کی بھی گنجائش نہیں ہے ۔ نہ یہاں ذاتی اور عطائی کی بحث ہی چل سکتی ہے اور نہ ہی احتمال ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو وقت قیامت کا علم دے دیا گیا ہوگا۔ لا یجلیھا لوقتھا الا ھو کے الفاظ ان تینوں تاویلوں کی بیخ کنی کر رہے ہیں کیونکہ حسب تصریحات مفسرین اس کا مطلب یہی ہے کہ اللہ سبحانہٗ خود قیامت کو اس وقت ہی پر ظاہر کرے گا۔ اس سے پہلے کسی کو اس کی اطلاع نہ دے گا دیکھو قاضی بیضاوی اور علامہ ابوالسعود کی تشریحات ۔

علاوہ ازیں یہ آیت بلکہ اکثر وہ آیتیں جن میں علم قیامت کی غیر اللہ سے نفی کی گئی ہے۔ کفار کے سوال کے جواب میں نازل ہوئیں وہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے بار بار کہتے کہ ۔ اگر آپ خدا کے رسول ہیں تو بتایئے قیامت کب آئے گی ؟ ان کے اس ناروا سوال کے جواب میں بعنوانات مختلفہ یہ فرمایا گیا ہے کہ اس کا علم بس خدا ہی کو ہے ۔ ان آیات کو مسخ کرنے کے مترادف ہے ۔ کیونکہ کفار کا سوال علم ذاتی کے متعلق نہیں تھا بلکہ اس علم عطائی کے بارے میں تھا جو بحیثیت رسول ہونے کے اللہ کی جانب سے ان کو عطا ہوا تھا۔ اب ان کے جواب میں یہ کہنا کہ مجھے اس کا علم ذاتی نہیں بلکہ خدا ہی کو ہے معاذاللہ سوال از آسمان جواب از ریسمان کا مصداق ہوگا۔

اور اسے قرآن اور حضور انور کے بارے میں ایک مومن کا ایمان قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔
نیز اگر بفرض غلط ان آیات کا یہی مطلب ہوتا تو ضروری تھا کہ وہ سوال کرنے والے کفار بھی یہی سمجھتے اور اس صورت میں ان کی طرف سے لامحالہ یہ کہا جاتا کہ حضرت ہم کو آپ کے ذاتی اور عطائی علم سے بحث نہیں ہم تو صرف یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ قیامت کب آئے گی؟ اگر آپ کو پتہ ہے تو بتا دیجئے لیکن ان کی طرف سے یہ نہیں کہا گیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل زبان نے بھی اس کو علم ذاتی کی نفی پر محمول نہیں کیا بلکہ انہوں نے بھی اس کا مطلب یہی سمجھا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو بھی وقت قیامت کا مطلقاً علم نہیں اور اس کی خبر بس خدا ہی کو ہے اس نے کسی کو بھی اس کی اطلاع نہیں دی اور یہی مطلب حضرات صحابہ و تابعین اور ائمہ تفسیر نے سمجھا چنانچہ ان کی تشریحی اقوال میں کہیں استاثر اللہ بعلمہ اور یطلع علیہ اور کہیں لم یطلع علیہ اور کہیں لم یطلع علیہا احدا ملکاً ولا رسولاً اور کہیں لم یطلع علیہ احدا من خلقہ اور کہیں لم یطلع علیہ غیرہ اور کہیں لم یخبر بہ احد من ملک مقرب و نبی مرسل۔ اور ان کے ہم معنے الفاظ مختلف تفاسیر میں آتے ہیں جن سے اس خیال کی قطعی تردید ہو جاتی ہے کہ ان آیات میں غیر اللہ سے صرف علم ذاتی کی نفی کی گئی ہے نہ علم عطائی کی۔ اور علیٰ ہذا ان آیات کے متعلق یہ کہنا کہ ان کے نزول کے بعد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو قیامت کے وقت کا علم دے دیا گیا ہو گا محض بے دلیل بات ہے اور عقائد میں اس قسم کی باتوں کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔

بلاغت کا قابلِ غور نکتہ

اس کے علاوہ ارباب بصیرت کے لیے یہاں ایک چیز یہ بھی قابل غور ہے کہ عربی زبان میں قصر اور حصر کے جتنے پیمانے ہیں وہ قرآن میں علم قیامت کو حق تعالیٰ کے ساتھ مخصوص کرنے کے لیے استعمال کیے گئے ہیں اور ہر جگہ انداز بیان میں اس تضرد و اختصاص کا زیادہ سے زیادہ لحاظ رکھا گیا ہے۔
بیشتر آیات میں لفظ انما لایا گیا ہے جیسے انما علمہا عند ربی بعض جگہ نفی و استثناء سے اس اختصاص کو ظاہر کیا گیا ہے لا یجلیہا لوقتہا الا ھو۔
اور کہیں ظرف کو مقدم کر کے یہ بات ظاہر کی گئی ہے جیسے الیہ یرد علم الساعۃ اور عندہ علم الساعۃ۔
عربی زبان میں قصر کے یہی معروف طریقے ہیں۔ ان کا مفاد یہی ہے کہ قیامت کے وقت کا

علم اللہ سبحانہ کے ساتھ مخصوص ہے اور اسی اختصاص کو شارحین قرآن نے استاثر اللہ بعلمہ، اور تفرد بعلمہ کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ اس کا منشا یہی ہے کہ قیامت کے آنے سے پہلے کسی وقت بھی حق تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کو اس کا علم نہ ہو ورنہ تفرد باقی نہ رہے گا۔

قرآن کا یہ قصری انداز بیان اس خیال کی کھلی تردید کر رہا ہے کہ ان آیات کے نازل ہونے کے بعد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو قیامت کے آنے کا وقت بتا دیا گیا تھا۔ اور یہ قصری انداز اس بات کو بھی غلط قرار دیتا ہے کہ ان آیات میں علم قیامت کو صرف اللہ کی طرف رد کیا گیا ہے۔ دوسروں سے اس کی نفی نہیں کی گئی۔ دوسروں کے متعلق یہ آیات ساکت ہیں۔ ان آیات میں کلمہ حصر استعمال ہوا ہے اور حصر کی حقیقت یہی ہے کہ ایک کے لیے اثبات ہو اور ماسوا سے نفی ہو، خود شارحین قرآن نے اس کو پوری قوت سے واضح کیا ہے، لہٰذا یہ کہنا کہ ان آیات میں علم قیامت کو حق تعالیٰ کے لیے ثابت کیا گیا ہے دوسروں سے اس کی نفی نہیں کی گئی اور ماسوائے اللہ کے علم اور عدم علم سے یہ آیات ساکت ہیں افسوسناک بے خبری ہے۔

بہرحال علم قیامت کے مخصوص بحق تعالیٰ ہونے کے متعلق قرآن کی یہ آیت برہان قاطع ہے۔ اس میں کسی تاویل کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور اس سے روز روشن کی طرح ثابت ہے کہ وقت قیامت کا علم اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے خاص کر رکھا ہے اور اپنی کسی مخلوق حتیٰ کہ کسی مقرب فرشتہ اور کسی برگزیدہ پیغمبر کو بھی اس کی اطلاع نہیں دی ہے اور نہ اس کی آمد سے پہلے کسی کو اس کی اطلاع دی جائے گی۔ اس میں مولانا احمد رضا خاں صاحب اور مولوی نعیم الدین مراد آبادی کی پیش کردہ ان تاویلات کی، کہ اس میں علم ذاتی کی نفی کی گئی ہے نہ کہ علم عطائی کی اور یہ کہ حضور کو اس آیت کے نازل ہونے کے بعد قیامت کا وقت بتا دیا گیا تھا یا یہ کہ اس آیت میں علم ساعت کے اللہ تعالیٰ کے پاس ہونے سے یہ ثابت نہیں کہ کسی دوسرے کو اس کا علم نہیں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ان بزرگوں کی پیش کردہ تاویلات کی علمی حیثیت کوئی نہیں بلکہ میرے جیسے بے علم کو بھی یہ تاویلات پڑھ کر یقین نہیں آتا کہ یہ باتیں کوئی علمی شخصیت کہہ سکتی ہے۔

ہاں اس دور آخر میں کچھ نے اپنی تفسیر میں اس موضوع پر ایک جدید موقف اختیار کیا ہے۔ آئیے سرراہے وہ بھی سن لیجئے انہوں نے پہلے کھلے دل کے ساتھ یہ بات مان لی ہے کہ ا

قرآن حکیم میں یہاں بھی اور اس کے علاوہ متعدد مقامات پر قیامت کے وقوع کے علم کو علم الٰہی کی طرف تفویض کیا گیا ہے۔ اس آیت میں ایک مرتبہ

فرمایا انما علمھا عند ربی اس کا علم تو میرے رب کے پاس ہے دوسری مرتبہ فرمایا انما علمھا عند اللہ اس کا علم تو اللہ کے پاس ہے۔ ان ہی آیات طیبہ کے پیش نظر اکثر مفسرین نے علم وقوع قیامت کے متعلق تصریح فرمائی ہے ان اللہ قد استاثر بعلمھا یعنی قیامت کا علم اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے ساتھ مخصوص فرما لیا ہے۔

یہ صحیح بات فرمانے کے بعد اپنے مخاطبوں کے جملہ دماغ میں یہ بات بھی اتاری ہے کہ علامہ بیضاوی نے اسے ان متشابہات میں شمار کیا ہے جن کا علم ذات الٰہی سے مختص ہے وہ سورۂ آل عمران کی آیت وما یعلمہ تاویلہ الا اللہ والراسخون فی العلم کی تفسیر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ اس آیت میں جن علماء نے الا اللہ پر وقف کیا ہے انہوں نے متشابہات سے وہ اشیاء مراد لی ہیں جن کا علم اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے لیے مخصوص کیا ہے۔

اس کے بعد لوگوں کو سمجھایا کہ:

ان عبارات سے یہ وہم پیدا ہو سکتا تھا کہ شاید ان امور کے متعلق دوسرے عام لوگوں کی طرح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ناواقف اور بے خبر ہوں۔ اس وہم کا ازالہ حضرت علامہ محمود آلوسی نے فرمایا۔

اس کے بعد روح المعانی سے ایک عربی عبارت کا ٹکڑا درج کر کے اس کا یہ ترجمہ کیا ہے:

یعنی جنہوں نے متشابہ کی یہ تعریف کی ہے کہ وہ امور جن کا علم اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے لیے مختص فرما لیا ہے وہ بھی اس کا انکار نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی یہ امور مفصلاً سکھا دیئے ہوں یا ولی کامل کے دل میں القا فرما دیا ہو لیکن یہ تفصیل بھی اللہ تعالیٰ کے علم محیط کے درجہ تک نہیں پہنچ سکتی یا تفصیلاً نہیں تو اجمالاً، جس شخص کو بھی سید المرسلین کی شان رفیع کا علم ہے اور حضور پُرنور کی اُمت کے اولیاء کاملین کے رتبہ کو جانتا ہے وہ یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

اس کا لب لباب یہ ہے کہ بے شک قیامت کے آنے کا علم مخصوص باری ہے اور قرآن کی تعبیرات خصوصی بتا رہی ہیں اور مفسرین قرآن کا بھی یہی فیصلہ ہے لیکن علامہ آلوسی کا انکشاف

یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے نہ صرف حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ آپ کی اُمت کے اولیاء کاملین کو وحی اور الہام کے ذریعے تفصیلاً قیامت کے آنے کی تاریخ بتا دی ہے۔ اس سے قطع نظر کہ علامہ آلوسی اس عبارت کے ذریعے کیا سمجھا رہے ہیں۔ ہم تھوڑی دیر کے لیے مان لیتے ہیں کہ وہ ہی کچھ سمجھا رہے ہیں جو حضرت پیر صاحب قبلہ نے سمجھا ہے کہ اللہ نے حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعے بتا دیا ہے کہ قیامت کب آنے والی ہے۔ سوال یہ ہے کہ وحی کی دو ہی قسمیں ہیں متلو اور غیر متلو، یا قرآن اور سنت، بتایا جاتے، قرآن کی کون سی آیت میں حضورِ انور کو بتایا گیا ہے یا کون سی حدیث ہے جس میں حضور نے فرمایا ہو کہ مجھے میرے رب نے بتا دیا ہے۔ ہم نے تو صحیح حدیث میں حضرت جبریل اور حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے مکالمہ میں حضرت جبریل کے اس سوال پر کہ قیامت کب آتے گی حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ما المسئول عنہا باعلم من السائل اس بارے میں میرا علم تم سے زیادہ نہیں ہے۔ اس واقعہ کے بعض طرق میں یہ بھی تصریح ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اور حضرت جبریل کی یہ گفتگو حضور کی عمر شریف کے آخری حصہ میں ہوتی تھی۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری میں رقمطراز ہیں :

> اس حدیث جبریل کو ابن مندہ نے کتاب الایمان میں اپنی سند سے جو علی شرط مسلم صحیح ہے بطریق سلیمان تیمی بروایت حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہٗ نے روایت کیا ہے اور اس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف کے آخر میں ایک شخص یعنی جبریل علیہ السلام حضور کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ اس کے بعد پوری گفتگو کا ذکر ہے۔

یہ مسئلہ عقائد سے تعلق رکھتا ہے اور عقائد کے اثبات کے لیے جس قسم کی دلیل کی قوت ضروری ہے اس کے لیے علامہ آلوسی کا انکشاف کوئی قانونی حیثیت نہیں رکھتا۔ ہمارا استدلال آیاتِ قرآنیہ سے ہے اور اس کے مقابلہ میں علامہ آلوسی کا انکشاف فرما رہے ہیں۔ اس تقابل کی نزاکت آپ بھی بخوبی جانتے ہیں۔ علماء محققین تو قرآن کی صریح آیات کے مقابلہ میں اخبارِ آحاد کو پیش کرنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ خود مولانا احمد رضا خاں صاحب الفیوض الملکیہ علی الدولۃ الملکیہ میں اسی علم غیب کی بحث میں فرماتے ہیں :

ان نصوص القرآن لا تعارض بالاحاد

اخبارِ آحاد نصوصِ قرآن کے مقابلہ میں پیش نہیں کی جا سکتی ہیں۔

نیز اپنے دوسرے رسالہ انباء المصطفیٰ میں فرماتے ہیں ،

عموم آیاتِ قرآنیہ کی مخالفت میں اخبارِ آحاد سے استناد محض ہرزہ باقی۔

بہر حال قرآن کی نصوص قطعیہ کے مقابلہ میں علامہ آلوسی کے انکشاف کا سہارا لینا عالمانہ شان کے منافی ہے اور بہت ہی کمزور تنکے کا سہارا ہے۔

رہی یہ بات کہ علامہ آلوسی اپنے مخاطبوں کو کیا سمجھانا چاہتے ہیں تو اس کے متعلق گزارش ہے کہ علامہ آلوسی نے ما یعلمہ تاویلہ الا اللہ والراسخون فی العلم کے وقف پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بیشتر شوافع الراسخون فی العلم پر وقف کرتے ہیں اور وہ متشابہ کی تعریف یہ کرتے ہیں کہ جس کے معنے واضح اور صاف نہ ہوں۔ اور بیشتر احناف الا اللہ پر وقف کرتے ہیں اور احناف متشابہ کی تعریف یہ کرتے ہیں جس کے علم کو اللہ نے اپنے ہی لیے خاص کر لیا ہو۔ شوافع نے اپنے موقف کی ترجیح میں آٹھ دلیلیں پیش کی ہیں۔ علامہ آلوسی نے احناف کی ترجمانی کرتے ہوئے شوافع کی پیش کردہ دلائل ترجیح کا جواب دیا ہے۔ ان دلائل میں سے شوافع نے والراسخون فی العلم پر وقف کی تائید میں آٹھویں دلیل یہ پیش کی تھی کہ اگر الا اللہ پر وقف کیا جائے گا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ سبحانہٗ اپنے بندوں کو ایسی باتوں کا مخاطبہ بنائے گا جن کی معرفت اور علم کا بندوں کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ علامہ آلوسی نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اگر اللہ سبحانہٗ اپنے بندوں کو ایسی باتوں کا مخاطب بناتا ہے جن کے علم کا بندوں کے پاس کوئی ذریعہ نہیں۔ اس میں اہمال نہیں بلکہ یہ اللہ کی جانب سے ابتلاء ہے اور یہ ابتلاء بھی ایسا ہی ابتلاء ہے جیسے بندوں کو مکلف بنا کر اور بیشتر عبادات کے ذریعے مکلف بنایا گیا ہے۔ حالانکہ بندوں کو ان کی حقیقت کا علم نہیں ہے۔ اور اس ابتلاء میں راز یہ ہے کہ عقلِ انسانی اور فکرِ انسانی کو بے دست و پا بنا کر قلبِ انسانی کی توجہات کا مرکز عبودیت کو بنایا جاتا ہے اور اس مرحلہ پر قصورِ معرفت کا اعتراف کرتا ہے اور اپنی بے چارگی محسوس کرتا ہے۔ یہ انسان کی بہترین تربیت اور آخری نیر خواہی ہے۔ یہ اس وقت ہے جبکہ مخصوص الٰہی سے مراد یہ ہو کہ ان باتوں تک انسانی فکر کی رسائی نہیں ہو سکتی اور مخصوص الٰہی علم سے مراد یہ ہو کہ کسی طرح بھی اس تک رسائی نہیں ہو سکتی نہ وحی کے ذریعے اور نہ الہام کے ذریعے تو قرآن کا مخاطب ایسا کوئی نہیں ہے۔ اور غالباً جو شخص متشابہ کی یہ تعریف کرتا ہے کہ مخصوص علم باری کا نام ہے وہ اس علمِ الٰہی کو وحی کے ذریعے تعلیم پر کوئی قدغن نہیں لگاتا بلکہ اس کے خیال میں ولی کامل کو الہام کے ذریعے اس

میں حصہ مل سکتا ہے لیکن نبی اور ولی کے اس علم کو اللہ سبحانہ، کے علم محیط سے کوئی نسبت نہیں ہے لیکن کیا قرآن میں یہی فرماتے ہیں فرماتے ہیں کہ ظاہر کلام میں اس ارادہ کا واہمہ بھی نہیں ہے۔ اس لیے ارادوں کا یہ تجزیہ بہت دور کی بات ہے۔

یہ ہے وہ بیان جو علامہ آلوسی نے روح المعانی میں لکھا ہے اور اسی کے قریب قریب قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے لکھا ہے۔ ان بزرگوں کا منشا صرف یہ بتانا ہے کہ حضور انور وحی کے ذریعے قیامت کا جو علم عطا کیا گیا ہے یعنی آپ نے جو قیامت کی علامات بتائی ہیں اس قدر علم کا ہونا بھی کلام کا مخاطب ہونے کے لیے کافی ہے۔ اس سے یہ اعتراض ہٹ جاتا ہے کہ خدا اپنے بندوں کو ان باتوں سے مخاطب کرتا ہے جن کے علم کا بندوں کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اور یہ بات بھی علی سبیل التنزل فرمائی گئی ہے ورنہ اصل یہی ہے کہ یہ ابتلائی بات ہے۔ اس سے یہ سمجھنا کہ علامہ آلوسی یہ بتا رہے ہیں کہ حضور کو قیامت کے آنے کی تاریخ کا علم تھا سینہ زوری ہے۔ اگر آپ کو علم ہوتا تو آپ حضرت جبریل سے کبھی نہ یہ فرماتے کہ لیس للمسئول عنها باعلم من السائل۔

اور اس بات کی دلیل کہ آلوسی کا مقصد یہی بتانا ہے۔ خود تفسیر میں آلوسی کی تصریحات ہیں:

آلوسی عندہ علم الساعۃ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ،

عندہٗ علم الساعۃ فی تقدیم الخبر اشارۃ الی استئثارہ تعالیٰ بعلم ذالک خبر کو مقدم کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے علم قیامت کو اپنے ہی لیے خاص کر لیا ہے۔

یہی آلوسی الیہ یرد علم الساعۃ کی تفسیر کرتے ہوتے فرماتے ہیں:

یعنی جب قیامت کے بارے میں سوال کیا جاتے تو جواب یہ دیا جائے کہ اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے یا اللہ کے سوا اسے کوئی نہیں جانتا ہے۔ اس فقرہ کا مقصد مومنین کو بتانا ہے کہ اس سوال سے گلو خلاصی کیسے کرائی جاتے۔ جواب خواہ کوئی ہو حاصل یہی ہے کہ قیامت کی تاریخ کا علم اللہ سبحانہ، کی خصوصیت ہے یعنی اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ دوسرے جواب پر یہ خصوصیت ظاہر ہے لیکن پہلے جواب میں کہ اللہ ہی جانتا ہے، بتانے والا اسی اختصاص کو جتا رہا ہے جب آپ سے کوئی مسئلہ دریافت کیا جاتے اور جواباً کہیں کہ فلاں جانتا ہے تو کنایۃً آپ پہلے

تب علم ہوا کہ جبرائیل تھے۔ یہ واقعہ بتصریح محدثین بالکل آخر عمر کا ہے۔ اس میں قیامت کے سوال پر ما المسئول عنھا باعلم من السائل ارشاد فرمایا ہے۔ گویا بتلا دیا گیا کہ علم محیط خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔ اور علم غیب تو درکنار محسوسات و مبصرات کا پورا علم بھی خدا ہی کے عطا کرنے سے حاصل ہوتا ہے وہ کسی وقت نہ چاہے تو ہم محسوسات کا بھی ادراک نہیں کر سکتے۔ بہرحال اس آیت میں کھول کر بتا دیا گیا کہ اختیار یا علم محیط نبوت کے لوازم میں سے نہیں جیسا کہ بعض جہلاء سمجھتے ہیں۔ ہاں شرعیات کا علم جو انبیاء علیہم السلام کے منصب سے متعلق ہے کامل ہونا چاہیے۔ اور تکوینیات کا علم اللہ تعالیٰ جس کو جس قدر مناسب جانے عطا فرماتا ہے۔ اس نوع میں ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام اولین و آخرین سے فائق ہیں۔ آپ کو اتنے بے شمار علوم و معارف حق تعالیٰ نے مرحمت فرمائے ہیں جن کا احصا کسی مخلوق کی طاقت میں نہیں۔[1]

اس آیت گرامی میں اصولی طور پر دو باتیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک تمام اختیار کل کا مسئلہ اور دوسرے علم محیط کا مسئلہ۔

لا املک لنفسی نفعاً ولا ضراً الا ما شاء اللہ میں اللہ سبحانہ کے مختار کل ہونے کا اعلان ہے اور اس بات کو بیان کرنے کے لیے اللہ سبحانہ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ آپ اعلان کر دیجئے کہ میں اپنے لیے کسی نفع اور نقصان کا مالک نہیں ہوں۔ جو کچھ اللہ کو منظور ہوتا ہے وہی کچھ ہوتا ہے۔ حقیقتہً اور مافوق الاسباب طریق سے نفع اور نقصان پہنچانا صرف اللہ کا خاصہ اور شان ہے۔ یہ موضوع اُمت میں کوئی اختلافی نہیں ہے۔ سب مانتے اور جانتے ہیں کہ نفع و نقصان پہنچانا اللہ کا کام ہے۔ یہ مسئلہ صرف ایک مسئلہ نہیں بلکہ ایک بنیادی عقیدہ ہے کہ کائنات کے اندر تصرف اور تدبیر کرنے والا صرف اکیلا خداوند عزیز ہے نہ تو اس کا کوئی شریک ہے اور نہ مشیر و وزیر ہے۔ وہ ہر لحاظ سے اس میں منفرد ہے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے مشرکین مکہ کے مشرکانہ کردار کی نقاب کشائی کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ان کا شرک یہ تھا کہ بعض بندوں کے بارے میں یہ خیال کرتے تھے کہ وہ کچھ مخصوص کام کر سکتے ہیں اور اُن مشرکوں کا یہ خیال تھا کہ علی الاطلاق تو بادشاہ اللہ ہی ہے لیکن وہ اپنے بعض بندوں کو الوہیت کی خلعت سے مشرف کر دیتا ہے اور

[1] افادات شیخ الاسلام

اپنے سے علم کی نفی کریں گے اور اپنے مخاطب کو آگاہ کریں گے کہ یہ سوال میرے سے نہیں فلاں سے ہونا چاہیے۔

یہی آلوسی زیرِ تشریح آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

> قرآن کی ظاہر آیات یہی بتا رہی ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو قیامت کے وقت کا علم نہ تھا۔ ہاں آپ کو اجمالاً قیامت کا قریب ہونا معلوم تھا اور آپ نے قربِ قیامت کی احادیث میں اُمت کو خبر بھی دی ہے۔

ان تصریحات کی موجودگی میں یہ کہنا کہ آلوسی اپنے مخاطبوں کو یہ بتا رہے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو قیامت کے وقت کا علم تھا۔ یہ علم سے بہت بڑی ناانصافی ہے۔

اختیارِ مستقل اور علمِ محیط

۲۴۵۔ اے پیغمبر کہہ دو کہ میں اپنی ذات کے لیے کسی نفع اور نقصان پر کوئی قدرت نہیں رکھتا ہوں صرف وہی کچھ ہو کر رہتا ہے جو اللہ چاہتا ہے اور اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو میں بہت سے فائدے اپنے لیے فراہم کر لیتا اور مجھے کبھی کوئی نقصان نہ پہنچتا، میں اس کے سوا کیا ہوں کہ ماننے والوں کے لیے بشیر و نذیر بن کر آیا ہوں۔ اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ کوئی بندہ خواہ کتنا ہی بڑا ہو نہ اپنے اندر اختیارِ مستقل رکھتا ہے نہ علمِ محیط۔ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم جو علومِ اوّلین و آخرین کے حامل اور خزائن ارضی کی کنجیوں کے امین بنائے گئے تھے اُن کو یہ اعلان کرنے کا حکم ہوا ہے کہ میں دوسروں کو کیا خود اپنی جان کو بھی کوئی نفع نہیں پہنچا سکتا نہ کسی نقصان سے بچا سکتا ہوں۔ مگر جس قدر اللہ چاہے اتنے ہی پر میرا قابو ہے۔ اور اگر میں غیب کی ہر بات جان لیا کرتا تو بہت سی وہ بھلائیاں اور کامیابیاں بھی حاصل کر لیتا جو علمِ غیب نہ ہونے کی وجہ سے کسی وقت فوت ہو جاتی ہیں نیز کبھی کوئی ناخوشگوار حالت مجھے درپیش نہ آتی۔ مثلاً افک کے واقعہ میں کتنے دنوں تک حضور کو وحی نہ آنے کی وجہ سے اضطراب و قلق رہا۔ حجۃ الوداع میں تو صاف ہی فرما دیا "اگر میں پہلے اس چیز کو جانتا جو بعد میں پیش آئی تو ہرگز ہدی کا جانور اپنے ساتھ نہ لاتا" اس قسم کے بیسیوں واقعات ہیں جن کی روک تھام علمِ محیط رکھنے کی صورت میں نہایت آسانی سے ممکن تھی۔ ان سب سے بڑھ کر عجیب تر واقعہ یہ ہے کہ حدیثِ جبریل کی بعض روایات میں آپ نے تصریحاً فرما دیا کہ یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے جبریل کو واپسی کے وقت تک نہیں پہچانا جب وہ اٹھ کر چلے گئے

ان کی رضا اور ناراضگی کو سب بندوں پر ترجیح دیتا ہے جس طرح ایک بڑی شان والا بادشاہ اپنے مخصوص غلاموں کو اطراف مملکت میں بھیجتا ہے اور ان کو جزوی معاملات میں تصرف کا اختیار دے دیتا ہے تا آنکہ بادشاہ سے اس کے خلاف کوئی حکم صادر ہو سو بادشاہ ان جزوی امور کی طرف متوجہ نہیں ہوتا اور سب لوگوں کے معاملات ان غلاموں کے سپرد کر دیتا ہے اور ان لوگوں کے بارے میں ان کی سفارش قبول کرتا ہے جو ان کی خدمت میں مشغول رہتے ہیں اور اس انداز سے ان کا توسل چاہتے ہیں ۔

(الفوزالکبیر)

اسی ذہن نے تاریخ ادیان میں انبیاؑ، اولیاؑ اور صالحین کو ما فوق الاسباب میں تصرف و اختیار کا مختار کل سمجھا ہے ۔ اور اس مشرکانہ ذہن نے ہمیشہ عطائی کی آڑلی ہے ۔ حضرت عیسیٰ کے بارے میں عیسائیوں کا خیال ہے ۔ یہ عطائی کا نظریہ عیسائیوں سے ماخوذ ہے جو پادریوں کی کارستانیوں سے انجیل کی زینت بنا ہوا ہے ۔ انجیل متی میں ہے ،

میرے باپ کی طرف سے سب کچھ مجھے سونپا گیا ہے

اور دوسرے مقام پر ہے :

یسوع نے پاس آکر ان سے باتیں کیں اور کہا کہ آسمان و زمین کا کل اختیار مجھے دیا گیا ہے ۔ (انجیل متی)

اسی مشرکانہ ذہن کی اصلاح کے لیے اللہ سبحانہ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ منصبِ رسالت پر کھڑے ہو کر اپنے بارے میں صاف صاف کہہ دیجئے لا املک لنفسی نفعاً ولا ضراً الا ما شاء اللہ۔ اس میں استثنا منفصل ہے ۔ اور بات کو کھول کر کہنے کی وجہ یہ ہے کہ پہلی اُمتوں میں گمراہی انبیاؑ کے بارے میں اسی قسم کے تصورات سے آئی تھی ۔ اسی بنا پر علماء نے یہ بات کھول کر بیان کی ہے ۔ حافظ ابن کثیر ایک موقعہ پر لکھتے ہیں ،

وہی ضرر اور نفع کا مالک ہے اور وہی اپنی مخلوق میں جیسے چاہتا ہے تصرف کرتا ہے ۔ (ابن کثیر ج ۲)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں :

سب ملک اور تصرف صرف اللہ تعالیٰ ہی کے قبضہ قدرت میں ہے ۔

حضرت شیخ عبد القادر جیلانی ایک مقام پر ارشاد فرماتے ہیں ،

اور یہ سب کچھ ایک فاعل کے فعل اور ایک مدبر کی تدبیر کا نتیجہ ہے اور وہ فاعل و مدبر اللہ تعالیٰ ہے۔ (فتوح الغیب ص ۱۵)

تصرف و اختیار کی چند صورتیں

اس موضوع پر اگر غور کیا جائے اور ہم اس کا پورا پورا تجزیہ کریں تو اللہ کے سوا مخلوق کے اختیار و تصرف کی چند صورتیں ہو سکتی ہیں۔

پہلی صورت یہ ہے کہ کوئی شخص یہ عقیدہ رکھے کہ جس طرح اللہ تبارک و تعالیٰ کو کائنات میں تصرف کی کن فیکونی قدرت از خود حاصل ہے اور وہ صرف اپنے ارادے اور مشیت سے بغیر اسباب و آلات کے جو چاہے کر سکتا ہے اور کرتا ہے اسی طرح تصرف کی یہ قدرت اللہ تعالیٰ کے سوا فلاں ہستی کو بھی از خود یعنی اللہ تعالیٰ کے عطا کیے بغیر حاصل ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عقیدہ اس درجہ کا شرک ہے جو ابوجہل اور ابولہب وغیرہ مشرکین عرب میں بھی نہ تھا۔ یہ بات قرآن کی روشنی میں واضح ہے کہ مشرکین عرب اپنے معبودوں اور دیوتاؤں کو خدا تعالیٰ کی مخلوق اور مملوک سمجھتے تھے اور ان میں تصرف و اختیار کل کی جو صفات مانتے تھے ان کی خدا کی عطا کہتے تھے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی نبی ولی، پیر یا شہید یا اللہ تعالیٰ کے سوا کسی بھی واقعی یا فرضی یا وہمی ہستی کے بارے میں یہ عقیدہ رکھا جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ایسے پیارے، چہیتے اور مقرب ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک درجہ میں کن فیکونی تصرف کی قدرت دے دی ہے۔ یعنی اب وہ صرف اپنے ارادہ و حکم سے تصرف کر سکتے ہیں۔ کسی کا کام بنا اور بگاڑ سکتے ہیں۔ ہماری حاجتیں پوری کر سکتے ہیں اور یہ ان کے اختیار میں ہے۔ یہ بعینہٖ وہ عقیدہ ہے جو مشرکین عرب اپنے معبودوں اور دیوتاؤں کے بارے میں رکھتے ہیں اور دُنیا کی اکثر قوموں میں یہی شرک رہا ہے اس سلسلے میں حضرت شاہ ولی اللہ نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں تفصیلی نوٹ لکھا ہے اور ابھی ابھی آپ الفوز الکبیر کا حوالہ پڑھ چکے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب نے اس کی بھی وضاحت کی ہے کہ مشرکین عرب اپنے معبودوں کے لیے اللہ تعالیٰ کا عطا کیا ہوا محدود اختیار اور تصرف کی محدود قدرت مانتے تھے لیکن عقیدہ رکھتے تھے کہ اس محدود دائرے میں وہ ارادے اور اختیار سے جو چاہیں کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں۔ یہی ان کا شرک تھا۔ بہر حال اللہ تبارک و تعالیٰ کے سوا کسی ہستی کے لیے اس طرح کن فیکونی اختیار و تصرف کا عقیدہ رکھنا بلا شبہ شرک ہے، اگرچہ اس کو

خدا کی عطا سے ماننے۔ قاضی ثناءاللہ پانی پتی نے ارشاد الطالبین میں اس موضوع پر مفید بات لکھی ہے۔
تیسری صورت تصرف کے عقیدے کی یہ ہے کہ کسی نبی ولی کے لیے پہلی اور دوسری صورت اختیاری کن فیکونی تصرف کی قدرت کا عقیدہ تو نہ رکھے لیکن یہ اعتقاد رکھے کہ خود اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے اپنی قدرت اور اپنے حکم سے بطورِ معجزہ نبی اور بطور کرامت ولی کے ہاتھ سے عالم کون میں تصرف کرا دیتا ہے۔ وہ تصرف اگرچہ ان کے ہاتھ سے ہوتا ہے لیکن دراصل وہ اللہ تعالیٰ کا فعل اور تصرف ہوتا ہے جو ان کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے۔ وہ ان کا اس طرح کا اختیاری فعل نہیں ہوتا جس طرح ان کے دوسرے عام اختیاری افعال ہوتے ہیں۔ پھر بھی چونکہ وہ ان کے ہاتھ سے ظاہر ہوتا ہے اس لیے اس کی نسبت ان کی طرف کی جاتی ہے اور اس کو ان کا معجزہ اور ان کی کرامت کہا جاتا ہے تو یہ عقیدہ برحق ہے۔
اسی طرح انبیاء علیہم السلام اور اولیائے کرام کے بارے میں یہ عقیدہ بھی برحق ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے مقبول اور مستجاب الدعوات بندے ہیں جب وہ کسی معاملہ میں قلب کی پوری توجہ اور الحاح کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی دعا قبول فرمالیتا ہے، اپنی کن فیکونی قدرت سے وہ کام کر دیتا ہے اگرچہ وہ کام اللہ تعالیٰ کا فعل اور تصرف ہوتا ہے لیکن چونکہ اس کا سبب اس مقبول بندے کی دعا ہوتی ہے اس لیے اس کام کی نسبت اس مقبول بندے کی طرف بھی کر دی جاتی ہے۔ بہرحال تصرف کی یہ دونوں صورتیں برحق ہیں۔
تصرف کی ایک صورت اور اس کا ایک درجہ وہ ہے جس کی صلاحیت اللہ تعالیٰ نے کم و بیش سب بندوں کو عطا فرمائی ہے اور وہ ہے خداداد قوت و صلاحیت سے اس عالم اسباب میں پیدا کیے ہوئے اسباب و آلات کے ذریعے یا جادو و مسمریزم جیسے کسی فن اور باطنی توجہ جیسے کسی عمل کے ذریعے اس عالم اشیاء میں تصرف کرنا۔ یہ تصرف جیسا کہ ہم سب کا تجربہ ہے ہم بندے اپنے ارادے اور اختیار سے اور اپنی خداداد قدرت سے کرتے ہیں اور یہ ہمارا فعل ہوتا ہے۔ ہم اس کے بارے میں مسئول اور اس کے گناہ یا ثواب کے مستحق ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ تصرف کی اس چوتھی قسم کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

نکتہ اختلاف کی تعیین

اس آیت قرآنی میں الا ماشاء اللہ کا استثناء ہے۔ یہ استثنا کون سا ہے منقطع یا متصل۔

شارحین قرآن کی اس موضوع پر آرا مختلف ہیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ استثنا متصل ہے اور مطلب یہ ہے کہ میں اپنی ذات کے لیے کسی نفع و نقصان کا مالک نہیں ہوں مگر اس نفع اور نقصان کا ضرور مالک ہوں جسے اللہ چاہے اور مجھے مالک بنا دے۔ اس کا واضح لفظوں میں مطلب یہ ہے کہ اللہ کے چاہنے سے میں اپنے لیے نفع و نقصان کا مالک ہوں۔ اسی سے کچھ لوگوں نے یہ سمجھا ہے:

"لا املک کے لفظوں سے اپنے اختیار کامل کی نفی فرما دی اور الا ما شاء اللہ سے اس غلط فہمی کا ازالہ کر دیا کہ کوئی نادان یہ نہ سمجھے کہ حضور کو نفع و ضرر کا کوئی اختیار ہی نہیں۔ فرمایا مجھے اختیار ہے اور یہ اختیار اتنا ہی ہے جتنا میرے رب کریم نے مجھے عطا فرمایا۔ اب رہی یہ بات کہ کونسا عطا فرمایا ہے تو انسانی عقل کا کوئی پیمانہ اور کوئی اندازہ اس کا احاطہ نہیں کر سکتا۔

اور اس کے نتیجے میں ان کا یہ خیال ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو تکوینی اور تشریعی احکام اللہ تعالیٰ کی طرف سے سپرد کر دیے گئے ہیں اس لیے آپ جہان میں تصرف کرنے رزق تقسیم کرنے اور نفع و ضرر دینے کے مجاز ہیں۔"

ظاہر ہے کہ یہ بے بنیاد عقیدہ روح اسلام کے سراسر خلاف ہے اور عیسائیت کی ہو بہو نقل ہے اور توحید پر ضرب کاری ہے۔ شارحین قرآن نے جو استثنا کو متصل بتایا ہے ان کا ہرگز یہ منشا نہیں ہے جو ان بزرگوں نے سمجھا ہے بلکہ اصل میں وہ تو یہ بتا رہے ہیں کہ ہر مخلوق میں اصل میں عجز ذاتی ہے۔ بندہ کسی چیز میں یہاں مستقل نہیں ہے نہ وہ بالذات کسی چیز کا مالک ہے بلکہ اس کو جو کچھ جتنا کچھ اور جیسا کچھ بھی کردار و عمل حاصل ہے اللہ کی مشیت سے ہے۔ اسی لیے یہاں علماء نے یہ نکتہ آفرینی فرمائی ہے کہ بندہ کی قدرت اللہ کے حکم اور مشیت سے موثر ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ خدا کی مشیت کے بغیر درخت کا ایک پتہ بھی نہیں ہل سکتا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان کو دوسری مخلوقات کے مقابلے میں کسی نہ کسی طرح کا اختیار دیا گیا ہے یعنی خدا کی ہمہ گیر قدرت وسیع اختیار اور ناقابل رد مشیت کے باوجود اس نے خود اپنے اختیار، خود اپنی مشیت اور خود اپنی حکمت سے انسان کو ارادہ اور ارادے کے مطابق کام کرنے والے اعضا کو ہلانے کی مشروط طاقت بخشی ہے۔ خدا جب چاہے انسان سے اپنے دیے ہوئے اختیار اور بخشی ہوئی قدرت کو چھین لے۔ علماء نے تصریح کی ہے کہ اگر امور تمام تر اللہ کی مشیت پر موقوف نہ ہوتے اور ہمارے افعال کی اس پر

تعلیق نہ ہوتی تو انشاء اللہ کا استثنا صحیح نہ ہوتا۔ آیت کا مفاد تو صرف یہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہو رہا ہے کہ اعلان کر دو کہ میں اپنے لیے نفع و نقصان کا مالک و مختار نہیں، جو کچھ اللہ کو منظور ہوتا ہے وہی ہوتا ہے۔ فی الواقع اور مافوق الاسباب سے نفع اور نقصان پہنچانا صرف اللہ جل مجدہٗ کا خاصہ اور شان ہے۔ استثنا کے متصل ہونے سے یہ بات خبر نہیں کہاں سے سمجھ لی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم مافوق الاسباب میں مختارِ کل ہیں، شرح قرآن کا یہ انداز قطعاً علمی نہیں ہو سکتا جس سے یہ آیتِ قرآنی اپنے مطالب کے اعتبار سے قرآن کے دوسرے بیانات سے متصادم ہو کر رہ جائے۔

اللہ تعالیٰ انسان کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

ان یمسسک اللہ بضر فلا کاشف لہ الا ھو و ان یمسسک بخیر فھو علیٰ کل شیء قدیر

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے کھول کر بتا دیا کہ اللہ تعالیٰ کے بغیر نہ تو کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ نفع سب کچھ محض اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔

چونکہ مشرکین عموماً اس خیال سے کہ فلاں سے مجھے ضرر پہنچے گا یا نفع اس کو اس عقیدے کے مطابق پکارتے تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی بھی صاف ممانعت کر دی۔

ولا تدع من دون اللہ مالا ینفعک ولا یضرک

اس میں کوئی استثنا نہیں ہے نہ انبیاؑ کا اور نہ اولیاؒ کا، پوری قوت سے یہ بات بتائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ورے اور اس کے سوا کسی کو پکارنا صحیح نہیں خواہ وہ حضرت ابراہیم ہوں یا کوئی اور۔ اگر کسی نے غیر اللہ کو اس خیال سے پکارا کہ وہ میری تکلیف دور کر سکتا ہے یا مجھے کچھ دے سکتا ہے تو ایسا شخص قرآن کے نقطۂ نظر سے ظالم ہوگا کیونکہ اس نے اللہ کا حق غیر کو دیا۔

حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ میں ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سوار تھا۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا اے پیارے اللہ کے حقوق کی پابندی کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہاری حفاظت فرمائے گا جب بھی سوال کرنا ہو، تو اللہ تعالیٰ ہی سے کرو۔ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے لیے دکھ مقصود ہے تو تمام کائنات مل کر بھی اس کو ٹال نہیں سکتی۔ اور اگر تیرے لیے آرام مقدر ہے تو تمام کائنات جمع ہو کر اس کو روک نہیں سکتی۔ قلم تقدیر

تیرے لیے جو کچھ لکھ چکا ہے وہی ہو گا اور تقدیر کے رجسٹر بھی خشک ہو چکے ہیں۔ امام ترمذی نے یہ حدیث روایت کی ہے اس سے بھی معلوم ہو رہا ہے کہ نافع اور ضار اللہ تعالیٰ کے بغیر اور کوئی نہیں۔ وہی ہوتا ہے جو اللہ چاہتا ہے اور کسی کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ اگر الا ماشاء اللہ کا وہی مطلب ہوتا جو یہ بزرگ بتاتے ہیں تو حضور انورؐ اس موقعہ پر ضرور بتلاتے کہ مجھے پکار لینا میں اللہ کی عطائی قوت سے تمہارا کام کر دوں گا مگر دنیا جانتی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی اس حدیث کو نقل کر کے لکھتے ہیں۔

ہر مومن کو چاہیے کہ اس حدیث کو اپنے ظاہر و باطن اور کردار کا آئینہ بنالے۔ (فتوح الغیب)

ملا علی قاری اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی سے مافوق الاسباب طور پر سوال نہ کرے کیونکہ غیر نہ تو دینے پر قادر ہے اور نہ منع کرنے پر اور نہ دفع ضرر پر اور نہ جلب نفع پر۔ کیونکہ وہ تو اپنی جان کے نفع اور ضرر کے مالک نہیں ہیں اور نہ موت و حیات اور دوبارہ زندگی ان کے اختیار میں ہے۔ (مرقات ج ۲)

قرآن عزیز نے اس بات کو صاف اور غیر مبہم الفاظ میں بیان کیا ہے کہ بے کس و بے بس، مجبور اور لاچار کی آہ و پکار اور فریاد کو سننے والی ذات اور اس کی تکلیف کو رفع کرنے والی ذات صرف اللہ ہی کی ہے۔

امن یجیب المضطر ویکشف السوء — ءالٰہ مع اللہ

کون ہے وہ ذات جو بے کس و بے بس کی آہ و پکار سنتی ہے اور اس کی تکلیف کو دور کرتی ہے — کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور بھی الٰہ ہے۔

اس سے بھی صاف معلوم ہو رہا ہے کہ بے کس کی پکار سننا اور پھر اس کی تکلیف کو دور کرنا صرف اللہ کا کام ہے۔ جو لوگ الا ماشاء اللہ میں معنوی تحریف کر کے انبیاء اور اولیاء سے یہ حسن ظن رکھتے ہیں کہ وہ بھی تکلیف دور کر سکتے ہیں اور اس حسن ظن کی بنا پر ان کو دور دور سے پکارتے ہیں یا ان کی قبروں پر جا کر قریب سے کہتے ہیں تو وہ ان کو الٰہ بناتے ہیں اور یہی وہ بات ہے جس کی نفی روز اول ہی سے اسلام کرتا ہے لا الٰہ الا اللہ۔

بہرحال آیت میں الا ماشاء اللہ کا ہرگز وہ مطلب نہیں ہے جو یہ بزرگ استثناء سے

متصل کی اڑ اٹے کہ اس کا بتایا ہے ہیں۔
ہمارے نزدیک آیت میں استثنائے متصل نہیں بلکہ منقطع ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ منصب نبوّت کی وجہ سے میں اپنے لیے کسی نفع اور نقصان کا مالک نہیں ہوں۔ یہ تو منطوق ہے اور مفہوم کے لحاظ سے میں دوسرے کے لیے بھی مالک نہیں ہوں ان تمام کاموں میں جن میں تبقضائے بشریت سارے انسان عاجز ہوتے ہیں لیکن اللہ ہی جو چاہتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ گویا آیتِ قرآنی کا صاف اور بے غبار مطلب یہ ہے کہ میں اپنے لیے کسی نفع و نقصان کا مالک نہیں جو کچھ اللہ کو منظور ہوتا ہے وہ ہی ہوتا ہے۔
اس کے بعد اللہ سبحانہ' نے فرمایا کہ اے پیغمبر یہ بھی فرما دیجئے کہ میں اپنی ذات کے لیے نفع و نقصان کا مالک کیسے ہو سکتا ہوں۔ اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو میں بہت منافع حاصل کر لیتا اور بہت زیادہ مال و دولت جمع کر لیتا اور مجھ کو کبھی کوئی تکلیف نہ ہوتی، نہ کبھی کوئی نقصان پہنچتا۔ یہ بات اس سوال کے جواب میں فرمائی ہے جیسا کہ علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ مکہ والوں نے حضور انور سے یہ سوال کیا کہ اے محمدؐ، کیا تمہارا پروردگار گرانی سے پہلے بازار میں نرخ کی ارزانی کی خبر نہیں دیتا ہے تاکہ آپ اسی ارزانی کے زمانہ میں خرید لیں اور گرانی کے وقت میں بیچ کر خاطر خواہ نفع حاصل کر لیں۔ اور کیا آپ کا رب آپ کو یہ بھی نہیں بتلاتا کہ فلاں ملک میں قحط ہونے والا ہے تاکہ وہاں سے کسی شاداب جگہ چلے جائیں۔ مکہ والوں کی جانب سے یہ سوال ہوا تو اسی کے جواب میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔
گویا اس آیت کریمہ میں عدم استکثارِ خیر اور مسِ سوء کو شاہد بنایا گیا ہے۔ عدم علم غیب پر اب صرف یہ چیز قابلِ غور ہے کہ یہاں خیر اور سوء سے کون سی بھلائی اور برائی مراد ہے اور غیب سے کون سا غیب مراد ہے اور پھر کس قسم کے علم کی نفی مراد ہے۔ ان تینوں چیزوں کی تنقیح کے بعد مطالبِ آیت کا مطلع بالکل صاف ہو جائے گا۔
کچھ لوگوں نے خیر اور سوء سے آخرت کی برائی اور بھلائی مراد لی ہے لیکن یہ کسی طرح درست نہیں ہے کیونکہ یہ ایک بے غبار حقیقت ہے کہ آخرت کی بھلائیاں اور نیکیاں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھرپور حاصل کی ہیں اور آخرت کی برائیوں سے آپ بالکل مبرا ہیں۔ اسی لیے محققین نے اس کو رد کر دیا ہے۔ راجح یہی ہے کہ یہاں خیر و سوء سے دنیاوی نفع و نقصان مراد ہے۔ اور اسی کے متعلق اہلِ مکہ کا سوال تھا۔

ہمیں یہاں ابوحیان اندلسی کی یہ بات بے حد پسند آئی کہ اس فقرے کا مطلب پوری آیت سے الگ کر کے متعین نہ کرنا چاہیے بلکہ پوری آیت کو پیش نظر رکھ کر بات کی تہ تک پہنچنا چاہیے۔ آغاز آیت میں لا املک لنفسی نفعاً ولا ضراً آیا ہے۔ یہاں لاستکثرت من الخیر وما مسنی السوء آیا ہے۔ خیر نفع کے اور سوء ضر کے مقابلے میں آیا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر میں مختار کل اور دانائے غیب ہوتا تو نفع کی حد تک میں بے حد دنیوی منافع فراہم کر لیتا اور نقصان کی حد تک مجھے زندگی میں کوئی تکلیف ہی نہ ہوتی۔ آیت کے پہلے حصہ سے نظر ہٹا کر اگر اس فقرے کو مطلب کا جامہ پہنایا جائے تو آیت کی مراد آپ صحیح نہ سمجھ سکیں گے اور آپ یہ خدشہ محسوس کریں گے۔

اگر یہاں علم غیب سے مراد علم ذاتی جو قدرت ذاتی کو مستلزم ہے نہ لیا جائے تو یہ سبب نہیں بن سکتا کیونکہ علم خیر کثیر جمع کر لینے اور دفع ضرر کو دور کرنے کا سبب نہیں ہوا کرتا۔

یہ خدشہ اسی لیے ذہن میں ابھرا ہے کہ آیت میں فقرہ ولو کنت اعلم الغیب پہلے حصہ سے علیحدہ کر کے مطلب پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگر پوری آیت کا منطوق پیش نظر ہوتا کہ لوگو! اگر میں مختار کل اور دانائے غیب ہوتا تو نفع کی حد تک اپنے لیے استکثار خیر اور ضرر کی حد تک ہر قسم کے نقصان سے محفوظ ہوتا۔ مگر تم دیکھ رہے ہو کہ ایسا نہیں ہے۔ باقی ذاتی وغیرہ کی یہاں بحث بالکل بے محل ہے جس کا وجود بھی ذاتی نہیں ہے۔ اس کی ذاتی صفات ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔

ہاں یہ بات تنقیح طلب ہے کہ غیب سے کیا مراد ہے تو اس میں تین احتمال ہیں، ایک یہ کہ مطلق غیب مراد ہو۔ اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر مجھے غیب کی کسی بات کی خبر بھی ہوتی تو میں بہت کچھ منافع حاصل کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف نہ ہوتی اور نہ کبھی کوئی نقصان پہنچتا۔ ظاہر ہے کہ یہ بات صحیح نہیں ہے کیونکہ اگر کسی شخص کو غیب کی بہت سی باتیں معلوم بھی ہو جائیں لیکن وہ ایسی نہ ہوں جن کا دنیوی منافع اور مضار سے کوئی خاص تعلق ہو لیکن وہ ایسی

نہ ہوں جن کا دنیوی منافع اور مضار سے کوئی خاص تعلق ہو تو صرف ان کے معلوم ہو جانے سے وہ شخص دنیوی منافع کی تحصیل اور مضرات سے اجتناب میں کامیاب نہیں

ہو سکتا مثلاً ہر مسلمان کو اللہ کی کتاب اور اللہ کے رسول علیہ السلام کے ذریعے سے جنت کا علم ہے۔ جنت کی بہت سی نعمتوں اور دوزخ کی بہت سی تکالیف کی خبر ہے اور یہ سب چیزیں عالمِ غیب کی ہیں۔ لیکن صرف ان کے معلوم ہو جانے سے کوئی شخص دنیوی منافع کی تحصیل اور دنیوی مضرات سے بچنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ان امور کا دنیوی نفع و نقصان سے کوئی خاص تعلق بھی نہیں ہے۔ بہرحال یہ بات بالکل بدیہی اور کھلی ہے کہ مطلق غیب کا علم میں اچھائی کو سمیٹنے اور برائی سے بچنے کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔

اس لیے اس آیت میں لفظ غیب سے مطلق غیب تو مراد ہو نہیں سکتا اور پھر کچھ غیوب کی اطلاع تو لازماً انبیا علیہم السلام کو شروع ہی سے ہوتی ہے مثلاً اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کے احکام اس لیے بھی مطلق غیب کے علم کی نفی انبیاء کسی وقت بھی نہیں فرما سکتے۔ ان وجوہ سے آیت میں غیب سے مطلق غیب کی نفی مراد نہیں ہو سکتی۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ الف لام کو استغراق حقیقی کے لیے مانا جائے اور غیب سے سارے ہی غیر متناہی غیوب مراد ہوں۔ اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ "اگر مجھے تمام غیوب غیر متناہیہ کا بالاستیعاب علم ہوتا تو میں بہت سے دنیوی منافع حاصل کر لیتا اور مجھے کوئی نقصان نہ پہنچتا۔

لیکن یہ بات معلوم ہے کہ دنیوی فوائد کی فراہمی اور نقصانوں سے حفاظت تمام غیوب کے علم محیط پر موقوف نہیں ہے بلکہ اس کے لیے ان غیب کی باتوں کو جاننے کی ضرورت ہے جو عادۃً اس کے لیے سبب بن سکتے ہوں۔ اور پھر یہ کہ اہلِ مکہ کا سوال سارے غیوب کے متعلق نہیں تھا کہ آپ اس موقعہ پر اس کو دلیل بنا کر پیش کریں جیسا کہ حرف لَو کا تقاضا ہے۔

ان وجوہ سے اس آیت کریمہ میں لفظ غیب سے نہ مطلق غیب مراد ہو سکتا ہے اور نہ سارے غیوب بلکہ اس سے مراد خاص اس قسم کے غیب مراد ہیں جن سے عالمِ اسباب میں دنیوی منافع اور نقصانات وابستہ ہیں اور ان ہی کے بارے میں اہلِ مکہ کا سوال ہی تھا یہ درست ہے کہ بطور نتیجہ اس صورت میں کل غیوب کے علمِ محیط کی بھی نفی ہو جائے گی۔

تیسری تنقیح طلب چیز یہ ہے کہ یہاں کس قسم کے علم کی نفی کی گئی ہے آیا ذاتی کی یا عطائی کی۔ بعض حضرات اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہاں صرف

علم ذاتی کی نفی مقصود ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے ۔

اگر مجھے ذاتی علم غیب ہوتا اور میں بلا خدا کے بتلائے غیب کی بات کو جان لیتا تو بہت زیادہ منافع حاصل کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچتی ۔

لیکن یہ تاویل شرح قرآن میں اس قدر مہمل اور بے معنی ہے کہ اس کی تردید کی بھی حاجت نہیں ہے ۔

اوّل تو جن اہل مکہ کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی ہے ان کا سوال خود علم ذاتی کے بارے میں نہ تھا بلکہ عطائی کے متعلق تھا ۔ انہوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دریافت کیا تھا ۔

کیا آپ کا پروردگار آپ کو گرانی سے پہلے ارزانی کی خبر نہیں دیتا ۔ کیا آپ کو زمین میں قحط ہونے سے پہلے اس کی اطلاع نہیں ہو جاتی تاکہ آپ اس پر عمل کر کے نفع حاصل کر سکیں اور نقصانات سے بچ جایا کریں ۔

ظاہر ہے کہ یہ سوال اب سے علم عطائی کے بارے میں تھا ۔ اس کے جواب میں یہ کہنا کہ مجھ کو ذاتی علم ہوتا تو میں خیر کثیر جمع کر لیتا ۔ سوال از آسمان جواب از ریسمان کا مصداق ہے جس قرآن اور صاحب قرآن یقیناً پاک ہیں اور پھر ان مشرکین کو جب حضورؐ کے ذاتی علم کے بارے میں کوئی شبہ ہی نہ تھا اور آپ نے کبھی ان کے سامنے علم ذاتی کا دعویٰ بھی نہیں کیا تھا ۔ آپ کا دعویٰ نبی ہونے کا تھا اور نبی کا سارا علم عطائی ہوتا ہے ۔ ان کا سوال بھی اسی علم عطائی کے بارے میں تھا ۔ ایسی حالت میں اصل سوال کے جواب میں خاموشی اختیار کرنا اور اپنی ذات سے علم ذاتی کی نفی کرنا بالکل بے محل اور بے جوڑ بات ہے ۔

دوسرے یہ کہ دُنیا کی زندگی میں منافع کی فراہمی اور نقصان سے بچنے کے لیے عالم اسباب میں صرف منفعت و مضرت کے اسباب کا معلوم ہونا ضروری ہے نہ کہ معلوم یہ علم ذاتی ہونا ۔ ایک سلیم الطبع اور صاحب عقل کو زہر کی مضرت سے بچنے کے لیے اتنا کافی ہے کہ اس کو یہ بات معلوم ہو کہ یہ زہر ہے اور اس کے کھانے کا نتیجہ ہلاکت ہے ۔ علیٰ ہٰذا جو شہد کے منافع حاصل کرنا چاہے اس کو صرف یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ شہد ہے اور اس کے منافع یہ ہیں ، اتنا معلوم ہو جانے کے بعد اگر وہ چاہے تو بتوفیق الٰہی شہد کھا کر نفع حاصل کر سکے گا اور زہر سے بچ سکے گا ۔ بہر حال اس کے لیے منافع اور مضرات

کا علم ذاتی ضروری نہیں بلکہ مطلق علم اس باب میں اس کی رہنمائی کر سکتا ہے لہٰذا یہ کہنا کہ اس آیت میں علم ذاتی مراد ہے محض مواہانہ مغالطہ ہے۔

بہر حال اس آیت میں صرف ذاتی کی نفی نہیں کی گئی بلکہ ان غیوب کے مطلق علم کی نفی مقصود ہے۔ اب آیت کا واضح اور صاف مطلب یہ ہے کہ

اے رسول آپ سے جو اہل مکہ یہ سوال کر رہے ہیں کہ کیا تمہارا پروردگار قحط اور گرانی کی خبر پہلے سے تمہیں نہیں دیتا کہ تم اس پر عمل کر کے خاطر خواہ منافع حاصل کر سکو اور نقصان سے بچ سکو۔ آپ فرما دیجئے کہ اگر مجھے ان تمام غیوب کی خبر ہوتی تو میں زیادہ منافع حاصل کر لیتا اور مجھے کبھی تکلیف نہ ہوتی۔ میرا کام جس پر میرے خدا نے مجھے لگایا ہے بس یہی کہ لوگوں کو اعمال نیک کے نتائج کی خوشخبری دوں اور اعمال بد کے نتائج سے آگاہ کروں۔ اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے مجھے ان تمام باتوں کے معلوم ہونے کی ضرورت نہیں کہ غلہ کب ارزاں ہوتا ہے اور کب گراں ہوگا اور خشکی کب اور کہاں ہوگی۔ ان امور کا فرائض نبوت سے کوئی خاص تعلق نہیں۔ اس طرح یہاں قرآن نے یہ حقیقت واضح کی کہ نبوت اور ان باتوں میں کوئی تلازم نہیں۔ غیب کی خبریں، پیشین گوئیاں کرنا اور اس قسم کے دوسرے آثار و دلائل اصل نبوت سے خارج ہیں۔ نبوت کے اصل لوازم وحی، مخاطبۂ الٰہی تزکیہ، انذار و تبشیر، تعلیم اور ہدایت ہیں۔

آیت کا مطلب یہی ہے۔ اسی کو شارحین قرآن نے مختلف الفاظ اور عبارات میں ادا کیا ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں،

اگر میں غیب کو جانتا تو بہت خیر کثیر جمع کر لیتا۔ یعنی اگر ایسا ہوتا تو جب کوئی چیز بغرض تجارت خریدتا تو مجھے انجام کا پتہ ہو جاتا اور ہر معاملہ میں مجھ کو نفع ہی ہوا کرتا اور ناداری میرے پاس بھی نہ آتی۔ (تفسیر ابن کثیر)

اور کچھ تابعین نے اسی بات کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

اگر میں غیب کو جانتا ہوتا تو قحط کے سال کے لیے شادابی کے سال سے اور گرانی کے زمانہ کے لیے ارزانی کے موسم سے سامان تیار کر لیتا۔ (تفسیر ابن کثیر)

امام بغوی نے بھی معالم التنزیل میں قریب قریب یہی لکھا ہے:

اگر میں شادابی اور قحط کے زمانے کو جانتا تو قحط کے سال کے لیے بہت سا مال و متاع پہلے سے جوڑ لیا کرتا اور مجھے تکلیف نہ ہوتی اور ناداری میرے پاس نہ آتی۔ (معالم التنزیل)

علامہ خازن اور قاضی بیضاوی نے بھی اپنی تفاسیر میں اسی تشریح کو اولیت کا درجہ دیا ہے اور علامہ ابوالسعود نے اسی مضمون کو بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ آخر میں فرماتے ہیں:

میں تو اللہ کا ایک بندہ ہوں جو ہوشیار کرنے اور بشارت سنانے کے لیے بھیجا گیا ہوں۔ میرا کام ان دینی اور دنیوی علوم کو حاصل کرنا ہے جن کو انذار و تبشیر سے کوئی تعلق ہو۔ باقی غیب کی وہ باتیں جن کو احکام و شرائع سے کوئی تعلق نہیں ان کو معلوم کرنا میری شان نہیں ہے۔ (تفسیر ابوالسعود)

شارحین قرآن کے ان تشریحی نوٹوں کا بنظر غائر مطالعہ فرمائیے۔ سب کا حاصل اور خلاصہ یہی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم غیب داں نہیں ہیں اور غیب دانی لازمہ نبوت نہیں ہے۔

قرآن کے مخاطبوں میں نبوت کے بارے میں یہ غلط فہمی تھی کہ نبی کے لیے ضروری ہے کہ وہ براہ راست عالم کائنات کے تصرف پر قادر ہو۔ اور چونکہ تصرف علم کے بغیر ہو نہیں سکتا اس لیے ضروری ہے کہ وہ دانائے غیب ہو۔ چنانچہ موجودہ انجیل کے مصنفوں نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کے معجزات کو جس طریقہ سے پیش کیا ہے اس نے عیسائیوں کے دلوں میں یہ یقین پیدا کر دیا ہے کہ یہ تمام کائنات حضرت عیسٰی کے قبضہ و قدرت میں تھی اور وہ اس میں جس طرح چاہتے تھے تصرف کرتے تھے۔ اور قدرت کا تصور چونکہ علم کے بغیر ممکن نہیں اس لیے وہ حضرت عیسٰی کو دانائے غیب مانتے تھے۔ یہی وہ بنیادی پتھر ہے جس پر انجیل کے مصنفوں نے دین حق کی دیوار کج کھڑی کی اور اسی کا نتیجہ ہے کہ توحید کی عمارت اس پر قائم نہ رہ سکی۔ قرآن عزیز نے نہایت شدت اور اصرار سے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ اللہ کا رسول دانائے غیب اور کائنات میں تصرف کا مالک نہیں۔ امام رازی نے اس آیت سے یہی بات سمجھی ہے فرماتے ہیں:

خوب سمجھ لو جب مخاطبوں نے غیوب کی خبریں بتانے اور اموال کثیرہ دینے کا مطالبہ کیا تو اللہ سبحانہٗ نے بتا دیا کہ آپ کی قدرت اور آپ کا دونوں

محدود ہیں اور بتایا کہ جو شخص بندگی کا شرف سے مالا مال ہوگا اس کی شان بھی ہوگی، قدرت کاملہ اور علم محیط صرف اللہ سبحانہ کا خاصہ ہے۔ بندہ کو یہ قدرت اور یہ علم کیسے ہو سکتا ہے۔ (تفسیر کبیر)

اسی بنا پر اسلامی عقائد میں یہ بات بالکل واضح اور بے غبار حقیقت کے طور پر اہل السنۃ والجماعۃ نے پیش کی ہے کہ غیب کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ خود قرآن نے بار بار حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس اعلان کی ہدایت کی ہے۔ اور اہل السنۃ میں اس موضوع پر بھی دو رائیں نہیں ہوئی ہیں۔ میں بالارادہ لفظ اہل السنۃ بول رہا ہوں کیونکہ اہل تشیع اس کے قائل ہیں کہ انبیاء اور ائمہ غیب داں ہوتے ہیں اور ان کو علم ماکان وما یکون حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ ابو جعفر محمد بن یعقوب ابن اسحاق الکلینی الرازی نے اپنی شہرہ آفاق کتاب الاصول من الکافی میں ایک عنوان قائم کیا ہے۔

ان الائمۃ علیھم السلام یعلمون علم ماکان ومایکون وانہ لا یخفی علیھم الشیئ صلوات اللہ علیھم

ائمہ علیہم السلام ماکان وما یکون یعنی جو کچھ ہو چکا ہے اور جو کچھ ہونے والا ہے اس کا علم رکھتے ہیں اور ان سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔

یہ عنوان قائم کرنے کے بعد سب سے پہلے سیف تمار کے حوالہ سے یہ واقعہ نقل کیا ہے۔ سیف تمار کہتے ہیں کہ ہم شیعہ کی جماعت ابو عبداللہ کے پاس خانہ کعبہ میں مقام حجر میں بیٹھے تھے۔ ابو عبداللہ نے فرمایا کہ ہماری کوئی جاسوس کر رہا ہے۔ ہم نے دائیں بائیں دیکھا۔ ہمیں کوئی جاسوس نظر نہیں آیا۔ ہم نے بتایا کہ حضرت یہاں کوئی جاسوس نہیں ہے۔ ابو عبداللہ نے کہا، رب کعبہ کی قسم اور اس عمارت کی قسم۔ تین بار قسم کھا کر فرمایا کہ اگر میں حضرت موسیٰ اور حضرت خضر کے درمیان موجود ہوتا تو میں ان کو بتاتا کہ میں ان دونوں سے عالم ہوں اور ان کو وہ باتیں بتاتا جن کا ان کو پتہ نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت موسیٰ اور حضرت خضر کو علم ماکان حاصل تھا یعنی جو کچھ ہو چکا ہے اس کو علم تھا لیکن علم مایکون یعنی ہونے والا ہے اس کا ان کو علم نہ تھا اور ہمیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے علم ماکان ومایکون وراثت میں ملا ہے [۱]

---

[۱] الاصول من الکافی ج ۱

اسی کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج کی رات میں ماکان اور مایکون کا علم مرحمت ہوا تھا۔

جب حضور انور کو معراج میں لے جایا گیا تو آپ اُس وقت تک نیچے نہیں آئے جب تک اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام ماکان و مایکون کا علم عطا نہ فرمایا۔

اور اسی کتاب کی شرح میں علامہ خلیل قزوینی مشہور عالم لکھتے ہیں:

بلاشبہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب معراج میں لے جایا گیا مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ اور وہاں سے آسمانوں پر۔ آپ وہاں سے اس وقت تک نیچے تشریف نہیں لائے جب تک اللہ تعالیٰ نے وہ سب کچھ نہیں بتادیا جو کچھ ہوچکا ہے اور جو کچھ ہوگا[1]

اس موضوع پر آپ عیسائیوں اور شیعوں کا مذہب سُن چکے ہیں۔ آئیے اب اہل السنۃ والجماعۃ کا مذہب سُن لیجئے۔ اہل السنہ کا علمی سرمایہ چار سو پھیلا ہوا ہے۔ علم کلام، علم فقہ، علم تفسیر، علم شرح الحدیث اور علم التصوف۔ ہم سب سے پہلے علم کلام کو لیتے ہیں۔ علم کلام میں ہمارے پیش نظر قاضی بیضاوی کی مطالع الانظار شرح طوالع الانوار، علامہ قاضی عضد الدین عبدالرحمٰن ابن احمد الایجی حنفی ۷۵۶ھ کی مواقف اور علامہ میر سید شریف علی بن محمد الجرجانی حنفی ۸۱۶ھ کی شرح المواقف، سید الفلاسفہ امام محمد بن محمد الغزالی الشافعی ۵۰۵ھ کی تہافت الفلاسفہ، علامہ ابن رشد الاندلسی المالکی ۵۹۵ھ کی تہافت الفلاسفہ، علامہ خواجہ زادہ ۸۹۳ھ کی تہافت الفلاسفہ اور امام فخر الدین رازی ۶۰۶ھ کی مناظرات رازی ہیں، قاضی بیضاوی فرماتے ہیں -

فلاسفہ کا مذہب یہ ہے کہ نبی تین صفات سے مختص ہوتا ہے۔ پہلی یہ کہ وہ اپنے جوہر نفس کی صفائی اور مبادی عالیہ کے ساتھ شدت کی وجہ سے بغیر کسی سابق کسب اور تعلیم و تعلّم کے غیب پر مطلع ہوتا ہے مگر اس پر اعتراض ہوا کہ فلاسفہ کی اطلاع علی الغیب سے کیا مراد ہے؟ اگر ان کی مراد یہ ہے کہ نبی تمام مغیبات پر مطلع ہوتا ہے تو فریقین کا اس پر اتفاق ہے کہ نبی ہونے

---

[1] الصافی حصہ اوّل

کے لیے تمام غیوب پر مطلع ہونا ہرگز شرط نہیں ہے اور اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ نبی کچھ مغیبات پر مطلع ہوتا ہے تو یہ نبی کی خصوصیت نہیں ہے کیونکہ یہ دوسروں کے لیے بھی ممکن ہے۔ نیز جب کل نفوس بشریہ بلحاظ نوع متحد ہیں تو ان کی حقیقت صفائی اور کدورت کی وجہ سے مختلف نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا جو چیز کچھ کے لیے جائز ہے وہی دوسرے کچھ کے لیے ممکن ہے۔ پس بعض مغیبات پر اطلاع نبی کی خصوصیت نہ رہی۔

(مطالع الانظار شرح طوالع الانوار)

علامہ عضد الدین عبد الرحمٰن ابن احمد الایجی مواقف میں اور علامہ سید شریف علی بن محمد الجرجانی شرح مواقف میں اپنی فلاسفر میں اس باطل نظریہ کی تردید کرتے ہوئے رقمطراز ہیں

ہم کہتے ہیں کہ جو کچھ تم کہتے ہو وہ بچند وجوہ غلط ہے کیونکہ تمام مغیبات پر نبی کا مطلع ہونا واجب نہیں ہے اس پر ہمارا اور تمہارا اتفاق ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ سید الانبیاء نے فرمایا ہے' اور اگر میں غیب جانتا تو بہت سی بھلائی جمع کرلیتا اور مجھ کو کوئی تکلیف نہ پہنچتی اور بعض مغیبات پر نبی کا مطلع ہونا نبی کے ساتھ خاص نہیں ہے جیسا کہ تم بھی مانتے ہو کہ ریاضت والے، بیمار اور سونے والے بھی بعض مغیبات پر مطلع ہوجاتے ہیں لہٰذا نبی میں اس بنیاد پر کوئی امتیاز نہ ہوگا۔

یہ تینوں اکابر مدرسہ اہل السنہ والجماعۃ کے وکیل صرف محقق' عالم' محدث اور مفسر نہیں بلکہ علم کلام کے بلا مقابلہ امام تسلیم کئے جاتے ہیں۔ میری مراد قاضی بیضاوی، علامہ عضد الدین، اور سید شریف علی سے ہے۔ یہ تینوں اس امر کی تصریح کر رہے ہیں کہ تمام مغیبات پر مطلع ہونا نبی کے منصب میں داخل نہیں ہے۔ اور نبی وہ نہیں ہے جو اپنے نفس کی صفائی کی بنا پر مغیبات پر مطلع ہو بلکہ نبی وہ ہے جس کے پاس اللہ کی وحی آئے۔

خوب سمجھ لیجئے کہ غیب دان ہونے اور غیب پر بذریعہ وحی مطلع ہونے میں جوہری فرق ہے۔ فلاسفہ کا موقف پہلا ہے جب کہ اہل السنہ والجماعۃ کا موقف دوسرا ہے غیب دان کے لیے عالم الغیب بول سکتے ہیں، کیونکہ اس کا علم خود بخود ہوتا ہے لیکن وحی کے ذریعے آمدہ علم کے حامل کو غیب دان نہیں کہہ سکتے۔ صاحب کشاف نے

لکھا ہے کہ الغیب سے مراد وہ علم ہے جس تک رسائی بغیر وسائل قرائن اور دلائل کے خود بخود ہو۔ اور یہ اللہ کے سوا کسی کا علم نہیں ہے۔ علامہ زمخشری کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

المراد به الخفی الذی لا ینفذ فیه ابتداء الا علم اللطیف الخبیر۔
غیب سے مراد وہ پوشیدہ ہے جس کی طرف رسائی ابتداء صرف اللہ کی ہے۔

اس کے بعد لکھا ہے کہ اس علم تک ہماری رسائی صرف اللہ کے بتانے اور دلائل کے ذریعے ہوتی ہے۔ اسی بنا پر مخلوقات میں سے کسی کو یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ یعلم الغیب وہ دانائے غیب ہے۔ اس پر میر سید شریف فرماتے ہیں کہ غیر خدا کو عالم غیب کہنا اس لیے ناجائز ہے کہ ہر مخلوق کا علم کسی وسیلہ سے ہے۔ اگر وہ نبی ہے تو اس کا علم وحی کے ذریعے ہے، اگر ولی ہے تو اس کا علم الہام کے ذریعے ہے، اگر وہ فلاسفر ہے تو اس کا علم دلائل کے ذریعے ہے۔ جب آپ نبی کو عالم الغیب کہیں گے تو گویا بیک وقت آپ دو دعویٰ کریں گے ایک یہ کہ نبی کا علم خود بخود ہے اور دوسرے یہ کہ اس کے علم کا ذریعہ وحی ہے اور یہ صریح تناقض ہے جو عالم غیب ہے وہ صاحب وحی نہیں ہے اور جو صاحب وحی ہے وہ عالم غیب نہیں ہے۔ فلاسفر کہتے ہیں کہ نبی اپنے باطن کی صفائی کی وجہ سے دانائے غیب ہوتا ہے اور اہل السنۃ والجماعۃ کہتے ہیں کہ نبی غیب دان کو نہیں بلکہ صاحب وحی کو کہتے ہیں اہل السنۃ والجماعۃ نے عقائد کی کتابوں میں اپنے اس نظریہ کی بھرپور توضیح کی ہے۔

بہرحال توحید کی نزاکت کے پیش نظر اس آیت میں مقام نبوت کو سمجھایا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ پیغمبر وہ ہے جس کے پاس اللہ کی وحی آتی ہے وہ نہیں جو غیب دان ہو۔ عیسائیوں کو اس بارے میں ٹھوکر لگ چکی ہے وہ حضرت عیسیٰ کو غیب دان سمجھتے ہیں۔ اس بارے میں قرآن نے جس طرح صاف اور قطعی الفاظ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحب وحی ہونے اور غیب دان نہ ہونے پر زور دیا ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ عالم غیب سے جو کچھ آتا ہے وہ وحی کے ذریعے آتا ہے اور نبی کے علوم کا ذریعہ اللہ کی وحی ہی ہوتا ہے۔ مولانا ابوالکلام نے اس موقعہ پر نکتہ آفرینی خوب فرمائی ہے۔

انسان کی ایک عالمگیر گمراہی یہ رہی ہے کہ جب کوئی انسان روحانی عظمت کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے تو لوگ چاہتے ہیں کہ اسے انسانیت اور بندگی کی سطح سے بلند کرکے دیکھیں۔ لیکن قرآن نے پیغمبر اسلام کی حیثیت ایسے صاف اور قطعی لفظوں میں واضح کر دی کہ ہمیشہ کے لیے اس

گمراہی کا ازالہ ہو گیا۔ صرف یہی ایک بات ان کی صداقت کے اثبات کے لیے کفایت کرتی ہے
جو دنیا اپنے پیشواؤں کو خدا اور خدا کا بیٹا بنانے کی خواہش مند تھی۔ اسلام کے پیغمبر نے اس سے
اتنا بھی نہ چاہا کہ کاہنوں کی طرح مجھے غیب دان تسلیم کر لو۔ زیادہ سے زیادہ بات جو اپنے
متعلق سنائی وہ یہ تھی ان انا الا نذیر و بشیر۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا
لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا ۖ فَلَمَّا تَغَشَّاهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيفًا فَمَرَّتْ
بِهِ ۖ فَلَمَّا أَثْقَلَت دَّعَوَا اللَّهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ آتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُونَنَّ
مِنَ الشَّاكِرِينَ ﴿١٨٩﴾ فَلَمَّا آتَاهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهُ شُرَكَاءَ فِيمَا
آتَاهُمَا ۚ فَتَعَالَى اللَّهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿١٩٠﴾ أَيُشْرِكُونَ مَا لَا يَخْلُقُ
شَيْئًا وَهُمْ يُخْلَقُونَ ﴿١٩١﴾ وَلَا يَسْتَطِيعُونَ لَهُمْ نَصْرًا وَلَا أَنفُسَهُمْ
يَنصُرُونَ ﴿١٩٢﴾ وَإِن تَدْعُوهُمْ إِلَى الْهُدَىٰ لَا يَتَّبِعُوكُمْ ۚ سَوَاءٌ
عَلَيْكُمْ أَدَعَوْتُمُوهُمْ أَمْ أَنتُمْ صَامِتُونَ ﴿١٩٣﴾

وہی اللہ ہے جس نے اکیلی جان سے تمہیں پیدا کیا ہے اور اسی کی جنس سے اس کی رفیقہ حیات کو بنایا، تاکہ وہ اس کی رفاقت میں سکون پائے۔ پھر جب دونوں میں میاں بیوی کے تعلقات ہوتے ہیں تو عورت کو حمل ہو جاتا ہے اوّل اوّل حمل ہلکا ہوتا ہے اس لیے

وہ چلتی پھرتی ہے پھر جب عورت بوجھل ہو جاتی ہے تو دونوں میاں بیوی اللہ کے حضور دعا مانگتے ہیں[۲۴۷]۔ خدایا اگر تو نے ہمیں اچھا بچہ دیا تو ہم ضرور تیرے شکر گزار ہوں گے، پھر جب اللہ ان کو تندرست بچہ عطا کر دیتا ہے تو وہ ناشکرے ہو کر اللہ کی دی ہوئی چیز میں دوسروں کو شریک بنا لیتے ہیں، لہٰذا یاد رکھو لوگوں کی شرک سازیوں سے اللہ سبحانہ، بہت بلند ہے[۲۴۸]۔ کیا لوگ اللہ کے ساتھ ان کو شریک ٹھہراتے ہیں جو خالق نہیں ہیں بلکہ خود مخلوق ہیں نہ وہ شریک بنانے والوں کی مدد کر سکتے اور نہ اپنی[۲۴۹]۔ بلکہ اگر تم ان کو راستہ کی طرف بلاؤ تو وہ تمہاری پکار کے جواب میں ایک قدم بھی تمہارے پیچھے نہ چلیں گے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ تم ان کو پکارو یا تم خاموش رہو۔ دونوں حالتوں میں تمہارے حق میں نتیجہ یکساں ہے[۲۵۰]۔

الفاظ کے معانی

ایسکن یہ لفظ سکون سے بنا ہے۔ اس کے معنے چین اور اطمینان کے ہیں۔ اسی سے

لفظ سکینت بنا ہے۔ اسی سے سکن ہے۔ تسکین، آرام، رحمت، برکت جس سے سکون حاصل ہو۔ علامہ مرتضیٰ زبیدی تاج العروس میں ابن الکمال سے ناقل ہیں سکون جس میں حرکت کی صلاحیت ہو اس کے حرکت نہ کرنے کا نام ہے۔ جس میں حرکت کرنے کی صلاحیت ہی نہ ہو۔ اس سے حرکت نہ ہونا سکون نہیں ہے۔ تغشّٰا - تغشّی سے ماضی کا پہلا صیغہ ہے اس کے معنے ڈھانکنا ہیں۔ اسی سے غشاوہ ڈھکن کے معنے میں آتا ہے معنی یہ ہیں کہ جب مرد عورت کو ڈھانپ لیتا ہے۔ عربی زبان میں یہ کنائی تعبیر ہے۔ میاں بیوی کے خصوصی تعلقات کے لیے۔ یہ قرآن کی بلاغت ہے کہ وہ میاں بیوی کے تعلقات کو صراحت کے ساتھ نہیں پیش کرتا۔ بلکہ کنائی زبان استعمال کرتا ہے۔ حمل، یہ دو مصدر ہیں ایک حَمل حاکے زبر کے ساتھ دوسرا حِمل حاکے زیر کے ساتھ۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ جو بوجھ ظاہر میں اٹھایا جاتا ہے اسے حِمل زیر کے ساتھ بولتے ہیں اور جو بوجھ آنکھوں سے اوجھل ہوتا ہے اسے حَمل حاکے زبر کے ساتھ بولتے ہیں۔ بچہ پیٹ میں ہو تو حَمل ہے اور گٹھڑی سر پر ہو تو حِمل ہے۔ فعل دونوں سے ایک ہی آتا ہے۔ یہاں حَمل زبر کے ساتھ آیا ہے اس لیے اس کے معنے اس بوجھ کے ہیں جو ماں پیٹ میں اٹھائے ہوتی ہے۔ اس کی جمع احمال آتی ہے۔

واولات الاحمال اجلھن ان یضعن حملھن

ربوبیت سے الوہیت پر استدلال

یہ استیناف بیانی ہے یعنی ذہنوں میں ایک اٹھے ہوئے سوال کا جواب ہے۔ توحید الوہیت پر ساری تقریر سننے کے بعد یہ سوال خود بخود ذہنوں میں چٹکیاں لینے لگتا ہے کہ اللہ سبحانہٗ کے علاوہ، اللہ سبحانہٗ کے ساتھ، اللہ سبحانہٗ سے ورے عابدانہ تعلقات کسی اور سے کیوں نہ ہونے چاہئیں۔ آخر دنیا میں بھی تو بادشاہوں تک پہنچنے کے لیے ہمیں سیڑھیوں کی ضرورت ہے۔ جواب میں ارشاد ہوتا ہے جب تم مانتے ہو کہ تمہارا پیدا کرنے والا اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے تو پھر تدبیر و انتظام عالم کے بہت سے تخت اقتدار تم نے کیوں بنا رکھے ہیں اور کیوں انہیں بندگی کا نیاز کا مستحق سمجھتے ہو، جیسے یہ بات ہے کہ تمہارا پیدا کرنے والا اس کے سوا کوئی نہیں اسی طرح پیدا کرنے کے بعد تمہارے بقاء وجود کا سامان کرنے والا بھی کوئی نہیں۔ اس میں نہ تو کسی سفارشی کی سفارش کو دخل ہے نہ کسی مقرب کے

زقرب کو۔ سورت کا آغاز بھی اسی استدلال سے ہوا تھا کہ تمہیں اللہ کے قانون کی پابندی اس لیے کرنی چاہیے کہ تمہیں اللہ نے پیدا کیا ہے۔ تمہاری تصویر اسی کی بنائی ہوئی ہے۔ ولقد خلقنکم ثم صورنکم قرآن نے بے شمار مواقع پر ربوبیت سے الوہیت پر استدلال کیا ہے۔ یہاں اسی استدلال کو اس انداز سے پیش کیا ہے جس سے مخاطبوں کی عقل کی فرسودگی ہی کھل کر سامنے آگئی۔ فرمایا یہ کہاں کی عقلیت ہے کہ احتیاجوں و مصیبتوں میں اللہ سبحانہ سے التجائیں کرتے ہو لیکن جب مطلب حاصل ہو جاتا ہے تو اسے ان آستانوں کی بخشش سمجھنے لگتے ہو جو تم نے ٹھہرا رکھے ہیں۔ چنانچہ مشرکین عرب کا طرز عمل یہی تھا کہ مصیبتوں میں اللہ سبحانہ کو پکارتے اور جب مصیبت ٹل جاتی تو اپنے بنائے ہوئے آستانوں پر نذریں چڑھاتے اور اپنی اولاد کو ان کی طرف منسوب کرتے اور کہتے کہ یہ ان کی بخشش ہے کہ ہمیں اولاد ملی ہے، حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ عورت کے رحم میں نطفہ کو ٹھہرانا اور حمل کو پرورش کر کے ایک زندہ بچے کی صورت دینا اور پھر اس بچے کے اندر طرح طرح کی قوتیں رکھنا یہ سب اللہ سبحانہ کے قبضے میں ہے۔

انسانی مساوات کا تخلیقی اعلان

۱۸۹ ۲- وہی اللہ ہے جس نے ایک جان سے تمہیں پیدا کیا ہے اور اسی کی جنس سے اس کا رفیق بنایا تاکہ اس کی رفاقت میں وہ سکون پائے۔

یعنی خدا نے سب انسانوں کو آدم سے پیدا کیا۔ آدم کے انس اور سکون و قرار حاصل کرنے کے لیے اسی کے اندر سے اس کا جوڑا حوا بنایا۔ پھر دونوں سے نسل چلی [1]

عام شارحین قرآن نے یہاں نفس واحدہ سے حضرت آدم کو مراد لیا ہے۔ اور علامہ آلوسی نے اسی کو فقہاء اور محدثین کی طرف منسوب کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ساری نسل انسانی ایک ہی آدم کا گھرانہ ہے۔ نسل آدم ہونے کے اعتبار سے سب برابر ہیں۔ اس پہلو سے عربی عجمی، احمر و اسود، افریقی و ایشیائی میں کوئی فرق نہیں، سب خدا کی مخلوق اور آدم کی اولاد ہیں۔ خدا اور رحم کا رشتہ سب کے درمیان مشترک ہے اس کا لازمی تقاضا یہ ہے

[1] افادات شیخ الاسلام

کہ سب ایک خدا کی بندگی کرنے والے اور ایک مشترک گھرانے کے افراد کی طرح آپس میں حق و انصاف اور مہر و محبت کے تعلقات رکھنے والے بن کر زندگی بسر کریں۔

اسلام سے پہلے خدا کی مخلوق جیسے خدا کی حد تک مختلف معبودوں سے رشتہ استوار کر بیٹھی تھی ایسے ہی اولادِ آدم کی حد تک رنگ و نسل، ملک و وطن، دولت و جاعت اور پیشوں کے اعتبار سے اعلیٰ اور ادنیٰ طبقوں میں بٹ گئی تھی۔ جو طبقہ جس دائرے سے تعلق رکھتا تھا اس سے کبھی نہیں نکل سکتا تھا۔ ادنیٰ طبقوں پر ترقی کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند تھے۔ ان کا مقصدِ زندگی اعلیٰ طبقوں کی خدمت تھا۔ قرآن نے خلقکم من نفس واحدۃ کے اعلان سے ان سارے امتیازات کو ختم کر کے حُسنِ عمل اور اخلاق و کردار کو عزت و شرف کا معیار قرار دیا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔ خاندانوں اور قبیلوں کی تقسیم محض تعارف کی خاطر ہے ورنہ عزت و شرف کا قرآن کے نزدیک اصل معیار حُسنِ عمل ہے انسانی مساوات کا مسئلہ اسلام کی نظر میں اس قدر اہم تھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ نے اپنے آخری خطبہ میں جن بنیادی باتوں کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی تھی۔ ان میں یہ بھی مسئلہ تھا۔ اس خطبہ کے الفاظ یہ ہیں:-

> لوگو! تمہارا پروردگار ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے۔ تم سب اولادِ آدم ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے پاکباز ہے۔ کسی عربی کو عجمی پر فضیلت نہیں مگر تقویٰ کی بنا پر۔ (العقد الفرید ج ۲ ص ۱۱۱)

ایک دوسری روایت میں ہے:

> کسی عربی کو عجمی پر فضیلت نہیں اور کسی عجمی کو عربی پر فضیلت نہیں ہے تم سب اولادِ آدم ہو اور آدم مٹی سے بنا ہے۔

ایک روایت میں تصریح کے ساتھ حسب و نسب پر فخر و امتیاز کی ممانعت کی گئی ہے:

> اللہ تعالیٰ نے جاہلیت کے غرور اور آباد اجداد پر فخر کو ختم کر دیا۔ انسان یا مومن و پاکباز ہے اور یا فاجر و شقی، تم سب اولادِ آدم ہو[1]

---

[1] ابوداؤد باب التفاخر بالاحساب

بہر حال آیت میں نفس واحدہ سے حضرت آدم علیہ السلام مراد ہیں۔ اور حضرت آدم کی پیدائش اللہ سبحانہ، کے ایک تکوینی ارادے کے تحت ہوئی۔ اس کا تعلق ہمارے محسوسات سے نہیں بلکہ نوعِ انسانی کی ابتدائی وآفرینش کا معاملہ عالم غیب سے تعلق رکھتا ہے کیونکہ ہم اپنے وسائل ذہن وادراک سے کوئی یقینی روشنی اس موضوع پر حاصل نہیں کر سکتے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ اس موضوع پر قرآن نے جو کچھ بتایا ہے اس پر ایمان لائیں۔ مسئلہ ارتقاء سے متاثر ہو کر قرآن کی تاویل ظلم عظیم ہے۔

جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا کی تشریح

اسی کی جنس سے اللہ نے اس نفسِ واحدہ کی رفیقۂ حیات کو بنایا تاکہ وہ اس کی رفاقت میں سکون پائے جسے یہاں جعل سے تعبیر کیا ہے۔ اسی لیے سورۂ نساء میں خَلَقَ کا انداز اختیار کیا۔ امام راغب نے جعل پر یہ نوٹ لکھا ہے۔

جعل ایسا لفظ ہے جو تمام کاموں کے لیے بولا جاتا ہے۔ یہ صَنَعَ اور اس قسم کے تمام افعال سے عام ہے اس کا استعمال کئی طرح ہوتا ہے۔

۱۔ صار اور طفق ہو گیا اور لگا۔ کی جگہ آتا ہے جیسے جعل رشید یقرا رشید پڑھنے لگا۔ عربی شاعر کہتا ہے ؎

قد جعلت قلوص بنی سھیل

من الاکوار مرتعھا قریبٌ

بنی سہیل کی اونٹنی ایسی ہو گئی کہ گلوں سے اس کی چراگاہ قریب ہے۔ . . .

۲۔ اوجد ایجاد کیا۔ اس نے پیدا کیا۔ کی جگہ آتا ہے جیسے جعل الظلمات والنور اس صورت میں اس کا ایک مفعول آتا ہے۔

۳۔ ایک چیز کو دوسری چیز سے پیدا کرنے اور بنانے کے معنے میں جیسے واللہ جعل لکم من انفسکم ازواجاً۔

یہاں لفظ جعل تیسرے معنے میں ہے۔ اس آیت میں حضرت حوا کی ولادت کا نہیں بلکہ تخلیق کا ذکر ہے۔ قرآن یہ نہیں کہتا کہ حضرت حوا کی ولادت حضرت آدم سے ہوئی بلکہ یہ کہہ رہا ہے کہ حضرت حوا کی تخلیق حضرت آدم سے ہوئی۔ یعنی جیسے آدم کو مٹی سے بنایا

گیا ایسے ہی حوا کو آدم سے بنایا گیا۔ انسان سے انسان کی تخلیق اتنی بعید نہیں جتنی انسان کی مٹی سے۔ اس آیت کا اگر سورۂ نسا کی اس آیت کی روشنی میں مطالعہ کیا جائے تو بات صاف ہو جاتی ہے۔ آیت یہ ہے:

یاایھا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ و خلق منھا زوجھا وبث منھما رجالا کثیرا و نساء۔

اے انسانو! تم اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بکثرت مرد و عورت پھیلا دیے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی کائنات صرف ایک وحدت سے پیدا نہیں کی گئی ہے اور نہ یہ کثرت براہ راست وجود میں آئی ہے بلکہ صورت یہ ہوئی کہ پہلے ایک نفس یعنی حضرت آدم کی تخلیق ہوئی۔ پھر اسی نفس سے حضرت حوا کی تخلیق ہوئی۔ یہ سب کچھ ایک تدریجی عمل تخلیق کے ذریعے ہوا۔ پھر ان دونوں سے ولادت کے ذریعے انسانوں مردوں اور عورتوں کی یہ کثرت وجود میں آئی۔ حضرت آدم کی تخلیق میں قرآن نے تراب، طین سلالۃ من طین، صلصال اور حما مسنون کے الفاظ بولے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آدم کی تخلیق مٹی سے ہوئی اور ایک لمبے تدریجی عمل کے ذریعے ہوئی۔ اگر حضرت حوا کی تخلیق بھی حضرت آدم کی طرح ہوئی تو بتایا جائے کہ حوا کا مادہ تخلیق کیا تھا قرآن کا انداز بیان کہہ رہا ہے کہ حوا کا مادہ تخلیق مٹی نہ تھا، بلکہ خود حضرت آدم تھے۔ اگرچہ قرآن نے حضرت آدم کی طرح تخلیق حوا کی تفصیلی کیفیت بیان نہیں کی۔ حدیث میں بھی اس کی صراحت نہیں ہے لیکن ضمناً اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔ حدیث صحیح بخاری و مسلم میں ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورتوں سے حسن سلوک کرو کیونکہ یہ پسلی کی مخلوق ہے اور پسلیوں میں سب سے زیادہ ٹیڑھی اوپر کی ہوتی ہے اگر تم اسے سیدھا کرو گے تو توڑ دو گے اور اگر چھوڑ دو گے تو ٹیڑھی رہے گی۔

یہ استعارے کی زبان ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ حوا کی تخلیق پسلی سے ہوئی ہے۔

حافظ عسقلانی لکھتے ہیں:

اس میں کچھ کے خیال کے مطابق اس بات کا اشارہ ہے کہ حوا، آدم کی پسلی سے پیدا ہوئی ہے۔

گویا حافظ صاحب نے جن بزرگوں کا یہ خیال نقل کیا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں حوا کے آدم کی پسلی سے پیدا ہونے کی صراحت نہیں بلکہ صرف اشارہ ہے اور اس اشارے کو بھی حافظ عسقلانی جیسے وسیع النظر نے قیل کہا گیا بصیغہ مجہول نقل کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حافظ صاحب کو متقدمین میں سے اس اشارے کا کوئی ہمنوا معلوم نہیں ہے۔

شاید آپ کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ اگر قرآن و حدیث دونوں میں اس کی صراحت نہیں تو پھر یہ پسلی کی کہانی کہاں سے آئی ہے۔

اصل تورات میں یہ بیان آیا ہے:

> خداوند نے آدم پر بھاری نیند بھیجی۔ وہ سو گیا۔ اور اس نے اس کی پسلیوں سے ایک پسلی اور اس کے بدلے گوشت بھر دیا اور خداوند نے اس پسلی سے جو اس نے آدم سے نکالی تھی ایک صورت بنا کر آدم کے پاس بھیجی
> (پیدائش ۲، ۲۲-۲۳)

بہرحال پسلی کی کہانی نہ قرآن میں ہے اور نہ حدیث میں، لیکن قرآن نے اجمالاً یہ ضرور بتایا ہے کہ حوا کی تخلیق آدم سے ہوئی ہے۔ کیسے ہوئی۔ اس سے قرآن نے بحث نہیں کی معاملہ کا تعلق چونکہ عالم غیب سے ہے اس لیے اس کی تفصیلی کیفیت متعین کرنے میں وقت ضائع نہ کیا جائے۔ امام قرطبی فرماتے ہیں کہ عربی زبان میں عورت کو امراۃ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ المرء سے نبی ہے جس کے معنے مرد کے ہیں اور ان کا نام حوا بھی اس لیے رکھا گیا کہ وہ ایک حی زندہ ہستی سے بنائی گئی ہے۔ ہم نے اس موضوع پر تفصیلی بحث چوتھے پارے سورۃ نساء میں کی ہے

شادی کا بالاتر مقصد

اس آیت میں لیسکن الیھا فرما کر شادی اور نکاح کے اہم اور بنیادی مقصد کی طرف رہنمائی کی گئی ہے۔ دوسرے پارے میں نساءکم حرث لکم میں شادی کا مقصد صرف بقائے نسل بتایا تھا۔ اس میں حیوان اور انسان دونوں شریک ہیں۔ اب یہاں اس آیت

میں حیوان سے الگ کر کے انسان کی ازدواجی زندگی کی یہ خصوصیت بتائی گئی ہے کہ اس میں زوجیت کا ایک بالاتر مقصد بھی ہے اور وہ یہ کہ ان کا تعلق محض شہوانی تعلق نہ ہو بلکہ محبت اور اُنس کا تعلق ہو۔ دل کے لگاؤ اور روحوں کے اتصال کا تعلق ہو۔ وہ ایک دوسرے کے رازدار اور شریک رنج وراحت ہوں۔ ان کے درمیان ایسی معیت اور دائمی بستگی ہو کہ زندگی سکون کا گہوارہ بن جائے۔ دونوں کا یہی تعلق انسانی تمدن کی عمارت کا سنگِ بنیاد ہے۔ اس کے ساتھ لیسکن الیھا سے اس طرف اشارہ کر دیا گیا کہ عورت کی ذات مرد کے لیے سرمایہ سکون وراحت ہے اور عورت کی فطری خدمت یہی ہے کہ وہ اس جدوجہد اور ہنگامہ عمل کی مشقتوں بھری دُنیا میں سکون وراحت کا ایک گوشہ مہیا کرے۔ یہ انسان کی خانگی زندگی ہے جس کی اہمیت کو مادی منفعتوں کی خاطر مادہ پرستوں نے نظرانداز کر دیا ہے حالانکہ تمدن وعمران کے شعبوں میں جو اہمیت دوسرے شعبوں کی ہے وہی اس شعبے کی ہے۔ اور تمدنی زندگی کے لیے یہ بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنے دوسرے شعبے ضروری ہیں۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ قرآن کے نقطہ نظر سے نکاح کے رشتہ سے جو پہلی چیز حاصل ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ میاں بیوی میں سے ہر ایک کو دوسرے سے تسکینِ خاطر اور اطمینانِ قلب میسر ہو اور پھر ہر ایک دوسرے کی بے چینی میں سہارا ہو اور جب کبھی اور جس وقت اُمنگ وولولہ پیدا ہو اور جنسی اضطراب چھیڑے تو ایک جائز آئینی ذریعہ فطرت سے ان تقاضوں کی تکمیل کا ذریعہ سامنے موجود ہے۔ اسی مسئلہ کی طرف کتنے بلیغ اور پاکیزہ انداز میں قرآن نے اشارہ کیا ہے: فلما تغشا ھا

اس آیت سے یوں ہی نہ گزر جائیے بلکہ غور فرمائیے کہ قرآن کے اس احسانِ عظیم کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا جو اس نے جعل منھا زوجھا فرما کر عورت پر کیا ہے۔ انسانی تمدن کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ عورت کا وجود دُنیا میں ذلت اور شرم کا وجود تھا۔ بیٹی کی پیدائش باپ کے لیے سخت اور موجب ننگ تھی۔ سسرالی رشتے ذلیل سمجھے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ سسرے اور سالے کے الفاظ اسی جاہلی تخیل کے تحت آج تک گالی کے طور پر استعمال ہو رہے ہیں۔ بہت سی قوموں میں اسی ذلت سے بچنے کے لیے لڑکیوں کو قتل کر دینے کا رواج ہو گیا تھا۔ جہلاء تو درکنار علماء اور پیشوایانِ مذاہب تک میں مدتوں یہ سوال زیرِ بحث رہا کہ آیا عورت انسان بھی ہے یا نہیں۔

اور خدا نے انہیں روح بخشی ہے یا نہیں۔ ہندو مذہب میں ویدوں کی تعلیم کا دروازہ عورت کے لیے بند تھا۔ بدھ مت میں عورت سے تعلق رکھنے والے کے لیے نروان کی کوئی صورت نہ تھی۔ مسیحیت اور یہودیت کی نگاہ میں عورت ہی انسان کے گناہ کی بانی مبانی اور ذمہ دار تھی۔ یونان میں گھر والیوں کے لیے نہ علم تھا اور نہ تہذیب و ثقافت اور نہ حقوق مدنیت۔ یہ چیزیں جس کو ملتی نہیں وہ زندگی ہوتی تھی۔ روم ایران اور چین اور مصر اور تہذیب انسانی کے دوسرے مرکزوں کا حال بھی قریب قریب ایسا ہی تھا۔ صدیوں کی مظلومی و محکومی اور عالمگیر حقارت کے برتاؤ نے خود عورت کے ذہن سے بھی عزت نفس کا احساس مٹا دیا تھا وہ خود بھی اس امر کو بھول گئی تھی کہ دُنیا میں کوئی حق لے کر پیدا ہوئی ہے یا اس کے لیے بھی کوئی عزت کا مقام ہے۔ مرد اس پر ظلم و ستم کرنا اپنا حق سمجھتا تھا اور وہ اس ظلم کو سہنا اپنا فرض سمجھتی تھی۔ غلامانہ ذہنیت اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ وہ فخر کے ساتھ اپنے آپ کو شوہر کی "داسی" کہتی تھی۔ پتی ورتا اس کا دھرم تھا اور پتی ورتا کے معنی یہ تھے کہ شوہر اس کا معبود ہے۔

اس ماحول میں جس نے نہ صرف قانونی اور عملی حیثیت سے بلکہ ذہنی حیثیت سے بھی انقلاب عظیم بپا کیا وہ قرآن ہے۔ قرآن نے ہی عورت اور مرد دونوں کی ذہنیت کو بدلا ہے۔ عورت کی عزت اور اس کے حق کا تخیل ہی انسان کے دماغ میں قرآن کا پیدا کیا ہوا ہے۔ آج حقوق نسواں اور تعلیم نسواں اور بیداری اناث کے جو الفاظ آپ سن رہے ہیں۔ یہ سب اسی انقلاب انگیز صدا کی بازگشت ہیں جو قرآن نے بلند کی تھی اور جس نے افکار انسانی کا رُخ ہمیشہ کے لیے بدل دیا۔ یہ قرآن ہی ہے جس نے دُنیا کو بتایا کہ عورت بھی ویسی ہی انسان ہے جیسا مرد ہے خلقکم من نفس واحدہ وجعل منھا زوجھا۔ ایمان اور عمل صالح کے ساتھ روحانی ترقی کے جو درجات مرد کو مل سکتے ہیں وہی عورت کے لیے بھی کھلے ہوتے ہیں۔ مرد اگر ابراہیم بن ادھم بن سکتا ہے تو عورت کو بھی رابعہ بصریہ بننے سے کوئی چیز نہیں روک سکتی۔

قانون زوجیت کے تین اصول

۲۴۷۔ پھر جب دونوں میں میاں بیوی کے تعلقات ہوتے ہیں تو عورت کو حمل ہو

جاتا ہے، اوّل اوّل حمل ہلکا ہوتا ہے اس لیے وہ چلتی پھرتی ہے، پھر جب عورت بوجھل ہوجاتی ہے تو دونوں میاں بیوی اللہ کے حضور دُعا مانگتے ہیں۔

یعنی جب مرد نے عورت سے فطری خواہش پوری کی تو عورت حاملہ ہوئی۔ حمل کی ابتدائی حالت میں کوئی گرانی نہ تھی، حسبِ معمول چلتی پھرتی اور اُٹھتی بیٹھتی رہی۔ جب پیٹ بڑھ گیا اور یہ کون جان سکتا تھا کہ اس کے اندر کیا چیز پوشیدہ ہے، مرد و عورت دونوں نے حق تعالیٰ کی جناب میں عرض کیا۔[1]

پہلے یہ بتایا گیا تھا کہ میاں بیوی کے درمیان جس قسم کا تعلق انسانی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے وہ لیسکن الیہا ہے۔ یعنی عورت کی ذات میں مرد کے لیے سرمایہ سکون و راحت ہے اور عورت کی فطری خدمت یہی ہے کہ وہ اس جدّ و جہد اور ہنگامہ عمل کی مشقتوں سے بھری دُنیا میں سکون و راحت کا ایک گوشہ مہیا کرے۔ اب اس آیت میں بھی بتایا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کا جوڑا اس لیے بنایا ہے کہ ان کے صنفی تعلق سے انسانی نسل جاری ہو۔ یہ انسان کی حیوانی فطرت کا مقتضا ہے جس کی رعایت ضروری ہے۔ اللہ سبحانہٗ نے نوعِ انسانی کو اس لیے پیدا نہیں کیا کہ اس کے چند افراد زمین پر اپنے نفس کی پرورش کریں اور بس ختم ہوجائیں بلکہ اس کا ارادہ ایک مدتِ مقررہ تک اس کو باقی رکھنے کا ہے۔ اور اس نے انسان کی حیوانی فطرت میں صنفی میلان اسی لیے رکھا ہے کہ اس کے زوجین باہم ملیں اور اللہ سبحانہٗ کی زمین کو آباد رکھنے کے لیے اپنی نسل جاری کریں۔ آیت میں اس مقصد کی طرف اشارہ کرنے کے لیے قرآن نے یہاں تغشاھا کی بلیغ کنائی زبان استعمال کی ہے تغشّی کا فاعل مرد ہے اور ھا کی ضمیر مونث ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ زوجیت میں اصل یہ ہے کہ زوجین میں سے ایک فعل ہو اور دوسرے میں قبول و انفعال ہو۔ ایک میں تاثیر ہو اور دوسرے میں تاثر، ایک میں عاقدیت ہو اور دوسرے میں انعقاد۔ یہی عقد و انعقاد، فعل و انفعال، تاثیر و تاثر اور قابلیت و فاعلیت کا تعلق دو کے درمیان زوجیت کا تعلق ہے۔ اسی تعلق سے تمام ترکیبات واقع ہوتی ہیں اور ان ہی ترکیبات سے انسانی زندگی کا سارا کارخانہ چل رہا ہے تغشاھا کا یہ مفہوم معین ہوجانے کے بعد اس سے

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

قانونِ زوجیت کے تین ابتدائی اُصول مستنبط ہوتے ہیں ۔

۱۔ اللہ سبحانہٗ نے جس فارمولے پر تمام کائناتِ انسانی کی تخلیق فرمائی ہے اور جس طریقہ کو اپنے کارخانے کے چلنے کا ذریعہ بنایا ہے وہ ہرگز ناپاک اور ذلیل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اپنی اصل کے اعتبار سے وہ پاک اور محترم ہی ہے اور ہونا چاہیے ۔

۲۔ فعل و انفعال دونوں اس کارخانے کو چلانے کے لیے یکساں ضروری ہیں۔ فاعل اور منفعل کا وجود اس کارگاہ میں یکساں اہمیت رکھتا ہے نہ فاعل کی حیثیتِ فعلی میں کوئی عزت ہے اور نہ منفعل کی حیثیتِ انفعالی میں کوئی ذلت۔ فاعل کا کمال یہی ہے کہ اس میں قوتِ فعل اور کیفیاتِ فاعلیہ پائی جائیں تاکہ وہ زوجیت کے فعلی پہلو کا کام بخوبی انجام دے سکے اور منفعل کا کمال یہی ہے کہ اس میں انفعال اور کیفیاتِ انفعالیہ بدرجہ اتم موجود ہوں تاکہ وہ زوجیت کے انفعالی اور قبولی پہلو کی خدمت انجام دے سکے ۔

۳۔ فعل اپنی ذات میں قبول و انفعال پر بہرحال ایک طرح کی فضیلت رکھتا ہے لیکن یہ فضیلت اس معنی میں نہیں ہے کہ فعل میں عزت ہو اور انفعال اس کے مقابلے میں ذلیل ہو۔ بلکہ یہ فضیلت دراصل غلبہ اور قوت اور اثر کے معنی میں ہے جس طرح وقوعِ فعل کے لیے فاعل اور منفعل دونوں کا وجود یکساں ضروری ہے ۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ فاعل میں غلبہ اور قوتِ تاثیر ہو اور منفعل میں مغلوبیت اور قبولِ اثر کی استعداد۔ کیونکہ اگر دونوں قوت میں یکساں ہوں اور کسی کو کسی پر غلبہ نہ ہو تو ان میں سے کوئی کسی کا اثر قبول نہ کرے گا ۔ اور دوسرے سے فعل واقع ہی نہ ہو گا۔ اگر ایک فاعل کے مقابلے میں ایک منفعل نہ ہو اور منفعل میں فاعل کے اثر سے مغلوب ہونے کی صلاحیت نہ ہو فعل وجود میں ہی نہیں آسکتا ۔ اس لیے زوجین میں سے زوجِ فاعل کی طبیعت کا تقاضا یہی ہے کہ اس میں غلبہ شدت اور تحکم ہو اسی لیے قرآن نے یہاں مرد کو فعل کا فاعل اور عورت کو مفعول بنا کر ظاہر کیا ہے **فلما تغشاها** کہنا یہ چاہتا ہوں کہ مرد میں فعلی پرزے کی حیثیت سے اپنی خدمت بجا لانے کے لیے غلبہ، شدت اور تحکم ضروری ہے ۔ اس کے برعکس زوجِ منفعل کی فطرت انفعالیہ کا تقاضا بھی ہے کہ اس میں نرمی اور نزاکت اور لطافت اور تاثر ہو ۔

اب ایک قدم اور آگے بڑھائیے اور ذریت کی تشریح علامہ آلوسی کی اس بات پر غور کیجئے فیہ رمز الی ان تکثیرا لنوع علۃ المؤانسۃ کما ان الوحدۃ علۃ الوحشۃ

آیت میں فلما تغشاھا پر فاء لاکر یہ اشارہ فرمایا ہے کہ نوعِ انسانی کے بقا کی علت میاں بیوی کی باہمی موانست ہے یعنی ان کی موانست اور ہم آہنگی سے تناسل کا سلسلہ جاری ہوا۔ گویا بتا دیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام حیوانات کی طرح انسان کے جوڑے بھی اس مقصد کے لیے بنائے ہیں کہ ان کے صنفی تعلق سے انسانی نسل جاری ہو۔ اور یہ صنفی تعلق محض شہوانی تعلق نہ ہو بلکہ محبت اور انس کا تعلق دل کے لگاؤ اور روحوں کے اتصال کا تعلق ہو۔ وہ ایک دوسرے کے رازدار اور شریک رنج و راحت ہوں۔ ان کے درمیان ایسی معیت اور دائمی وابستگی ہو جیسے غشادہ اور مغشی میں ہوتی ہے یا جیسے لباس اور جسم میں ہوتی ہے۔ اور یہ صنفی تعلق صرف زوجین کی باہمی محبت ہی کا مقتضی نہیں ہے بلکہ اس کا بھی مقتضی ہے کہ اس تعلق سے اولاد ہو۔ اور اولاد کے ساتھ بھی ایک گہرا روحانی تعلق ہو۔ حملت حملا کو قرآن میں فلما تغشاھا کا جواب بنا کر اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

یہاں قرآن کی اس بلاغت پر غور کیجئے کہ حمل کے زمانے میں عورت پر جو حالات گزرتے ہیں ان کو کیسے لطیف انداز میں پیش کیا ہے حملت حملاً خفیفا فمرت بہ فلما اثقلت۔ قرآن جنین کے تمام تغیرات کو انقلابی تطور قرار دیتا ہے من نطفۃ ثم من علقۃ ثم من مضغۃ۔ ایک اور جگہ ہے ثم خلقنا النطفۃ علقۃ فخلقنا العلقۃ مضغۃ، یعنی تخلیق کی ایک حالت نطفہ کی ہوتی ہے پھر تخلیق کی دوسری حالت علقہ کی ہوتی ہے۔ پھر تخلیق کی تیسری حالت مضغہ کی ہوتی ہے۔ پہلی دو حالتوں میں عورت حملت حملا خفیفا کی اور تیسری حالت میں عورت اثقلت کی تصویر ہوتی ہے۔ جو حالات عورت پر اس زمانہ میں گزرتے ہیں اگر غیر زمانہ حمل میں عورت پر گزریں تو قطعی بیماری کا حکم لگا دیا جائے۔ اس زمانہ میں اس کا نظام عصبی مختل ہو جاتا ہے۔ اس کا دماغی توازن بگڑ جاتا ہے۔ وہ مرض اور صحت کے درمیان معلق رہتی ہے۔ لیکن عورت یہ سب کچھ بڑی خندہ پیشانی سے برداشت کرتی ہے۔ کیوں؟ قرآن بتاتا ہے اس لیے کہ اسے اولاد کے ساتھ ایک گہرا روحانی تعلق ہوتا ہے اور اس کی رگ رگ اور ریشے ریشے میں اولاد کی محبت پیوست ہوتی ہے۔ دوسری جگہ حملتہ امہ وھنا علی وھن میں اسی کی تصویر پیش کی ہے۔ بچہ ابھی شکم مادر میں ہوتا ہے لیکن اولاد کے لیے والدین کا اضطراب ان کی زبان پر دعا بن کر ظاہر ہوتا ہے۔ وہ ہاتھ پھیلا پھیلا کر اللہ سے بھیک مانگتے ہیں دعوا اللہ ربھما۔ یہ دعا کیا ہوتی ہے۔

شرک فی التسمیہ کی ممانعت

۲۴۸- خدایا ! اگر تو نے ہمیں اچھا بچہ دیا تو ہم ضرور تیرے شکر گزار ہوں گے۔ پھر جب اللہ ان کو تندرست بچہ عطا کر دیتا ہے تو وہ ناشکرے ہو کر اللہ کی دی ہوئی چیز میں دوسروں کو شریک بنا لیتے ہیں لہٰذا یاد رکھو کہ لوگوں کی شرک سازیوں سے اللہ سبحانہٗ بلند و بالا ہے۔

یعنی مرد و عورت دونوں نے حق تعالیٰ کی جناب میں عرض کیا کہ اگر آپ اپنے فضل سے بھلا چنگا کارآمد بچہ عنایت فرمائیں گے تو ہم دونوں (بلکہ ہماری نسل بھی) تیرا شکر ادا کرتی رہے گی۔ خدا نے جب ان کی یہ تمنا پوری کر دی تو ہماری دی ہوئی چیز میں اوروں کے حصے لگانے شروع کر دیئے مثلاً کسی نے یہ عقیدہ جما لیا کہ یہ اولاد فلاں زندہ یا مردہ مخلوق نے ہم کو دی ہے۔ کسی نے اس عقیدے سے نہیں تو عملاً اس کی نذر و نیاز شروع کر دی یا بچہ کی پیشانی اس کے سامنے ٹیک دی یا بچہ کا نام ایسا رکھا جس سے شرک کا اظہار ہوتا ہے مثلاً عبدالعزیٰ یا عبدالشمس وغیرہ۔ غرض جو حق منعم حقیقی کا تھا وہ اعتقاداً و فعلاً یا قولاً دوسروں کو دے دیا گیا۔ خوب سمجھ لو کہ حق تعالیٰ تمام انواع شرک سے بالا و برتر ہے۔

ان آیات میں حسن بصری وغیرہ کی رائے کے موافق خاص آدم و حوا کا نقشہ نہیں بلکہ عام انسانوں کی حالت کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ بے شک ابتداءً هوالذی خلقکم من نفس واحدة وجعل منها زوجها میں بطور تمہید آدم و حوا کا ذکر تھا مگر اس کے بعد مطلق مرد و عورت کے ذکر کی طرف منتقل ہو گئے۔ اور ایسا بہت جگہ ہوتا ہے کہ شخص کے ذکر سے جنس کے ذکر کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں جیسے ولقد زینا السماء الدنیا بمصابیح وجعلناها رجوما للشیاطین میں جن سیاروں کو مصابیح فرمایا ہے وہ ٹوٹنے والے سیارے نہیں جن سے رجم شیاطین ہوتا ہے مگر شخص مصابیح سے جنس مصابیح کی طرف کلام کو منتقل کر دیا گیا۔ اس تفسیر کے مطابق جعلا له شرکاء میں کچھ اشکال نہیں ہے۔ مگر اکثر سلف سے یہی منقول ہے کہ ان آیات میں صرف آدم و حوا کا قصہ بیان فرمایا ہے کہتے ہیں کہ ابلیس ایک نیک مخلوق کی صورت میں حوا کے پاس آیا اور فریب دے کر ان سے وعدہ لے لیا کہ اگر لڑکا پیدا ہو تو اس کا نام عبدالحارث رکھیں۔ حوا نے آدم کو بھی راضی کر لیا۔ اور جب بچہ پیدا ہوا تو دونوں نے عبدالحارث نام رکھا۔ حارث ابلیس کا نام تھا جس سے وہ گروہ ملائکہ میں پکارا جاتا تھا۔

ظاہر ہے کہ اسمائے اعلام میں لغوی معنے معتبر نہیں ہوتے ہیں۔ اور یوں بھی تو عبد کی اضافت حارث کی طرف اس کو مستلزم نہیں کہ حارث کو معاذاللہ معبود سمجھ لیا جاتے۔ ایک مہمان نواز آدمی کو عرب عبدالضیف کہہ دیتے ہیں یعنی مہمان کا خادم، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ گویا میزبان مہمان کی پوجا کر رہا ہے۔ پس اگر عبدالحارث نام رکھنے کا یہ واقعہ صحیح ہے تو نہیں کہا جا سکتا کہ آدم علیہ السلام نے معاذاللہ شرک کا ارتکاب کیا جو انبیار کی شان عصمت کے خلاف ہے۔ ہاں بچہ کا ایسا غیر موزوں نام رکھنا جس سے شرک کی بو آتی ہو نبی معصوم کی شان رفیع اور جذبۂ توحید کے مناسب نہ تھا۔ قرآن حکیم کی عام عادت ہے کہ انبیائے مقربین کی چھوٹی سی لغزش اور ادنیٰ ترین زلت کو حسنات الابرار سیئات المقربین کے مطابق اکثر سخت عنوان سے تعبیر کرتا ہے جیسے یونس علیہ السلام کے قصے میں فرمایا فظن ان لن نقدر علیہ یا فرمایا حتی اذا استیئس الرسل وظنوا انھم قد کذبوا علی توجیہ بعض المفسرین۔ اسی طرح یہاں بھی آدم علیہ السلام کے رتبہ کے لحاظ سے اس موہم شرک تسمیہ کو تغلیظاً ان الفاظ میں ادا فرمایا جعلا لہ شرکاء یعنی ان کی شان کے لائق نہ تھا کہ ایسا نام رکھیں جس کی سطح سے شرک کا وہم ہوتا ہے۔ گو حقیقتہً شرک نہیں۔ شاید اسی لیے فقط اشرکا وغیرہ مختصر عبارت چھوڑ کر یہ طویل عنوان جعلا لہ شرکاء فیما اتاھما اختیار فرمایا، واللہ اعلم [1]

اس آیت کرامی کے سمجھنے میں عام شارحین قرآن ایک سنگین غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں۔ انہوں نے آیت گرامی کا مصداق حضرت آدم و حوار کو قرار دے کر ایک قصہ بنا لیا۔ اور آیت کی تشریح اس طرح کی کہ نفس واحدہ سے آدم اور زوج سے حوار مراد ہیں۔ جب حضرت آدم اور حوار کے بچہ پیدا ہوا تو دونوں نے اس کا نام عبدالحارث رکھا اور اس طرح دونوں نے شرک کیا۔ اور اس تشریح کو پائیدار اور مضبوط بنانے کے لیے محمد بن اسحاق نے حضرت عبداللہ ابن عباس کے حوالہ سے بتایا کہ حضرت حوار کے بچے ہو کر مر جاتے تھے۔ آخرکار ایک بچے کی پیدائش کے موقع پر شیطان نے ان کو بہکا کر اس بات پر راضی کر لیا کہ اس کا نام عبدالحارث (بندۂ شیطان) رکھا۔ صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کی تائید میں ایک مرفوع روایت بھی ترمذی کے حوالہ سے پیش کر دی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کہ

[1] افادات شیخ الاسلام

حوا کے بچہ پیدا ہوکر مرجاتا تھا۔ ایک بار جب حوا کے بچہ ہوا تو ابلیس آیا اور اس نے حضرت حوا سے کہا کہ اس کا نام عبدالحارث رکھ لو اور بچہ زندہ رہا۔

حافظ ابن کثیر نے ابن عباس کی تشریح کے بارے میں لکھا ہے کہ ابن عباس نے یہ تشریح اہل کتاب سے لی ہے۔ اور ترمذی کی روایت کے بارے میں ابن کثیر ہی نے بتایا ہے کہ یہ حدیث تین وجہ سے معلول ہے۔ اوّل یہ کہ عمر بن ابراہیم بصری کی اگرچہ ابن معین نے توثیق کی ہے لیکن ابوحاتم الرازی اسے ناقابلِ استدلال بتاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ یہ روایت مرفوع نہیں بلکہ خود سمرہ کی بات ہے۔ تیسرے یہ کہ سمرہ سے روایت کرنے والے راویوں میں الحسن البصری ہی ہیں۔ اور حسن بصری سے اس آیت کی تفسیر اس سے بالکل مختلف ہے۔ اگر فی الواقع یہ روایت حسن بصری کو معلوم ہوتی تو اس کی موجودگی میں وہ کوئی اور تشریح نہ فرماتے۔ ابن عباس کی تشریح کی بنیاد پر جو سنگین اعتراض ہوتا ہے وہ یہ کہ حضرت آدم نے نبی ہو کر شرک کیا اور حوا جیسی مقدس عورت نے بھی۔ اور پھر یہ کہ آیت کے آخر میں تعالی اللہ عما یشرکون آرہا ہے جو اس بات کی کھلے طور پر نشاندہی کر رہا ہے کہ شرک کرنے والے صرف دو یعنی آدم و حوا نہیں بلکہ جماعت ہے اور پھر یہ کہ اگر یہ افسانہ صحیح ہوتا تو تعبیر عما یشرکون نہ ہوتی بلکہ عمن یشرکون ہوتی ہے یعنی ما کی جگہ من آتا کیونکہ من ذوالعقول کے لیے آتا ہے جبکہ ما غیر ذوی العقول کے لیے آتا ہے۔ اور پھر یہ کہ آدم اللہ سبحانہ نے ہر چیز کے نام تعلیم فرمائے تھے۔ پھر کیا ممکن ہے کہ حضرت آدم کو یہ بھی معلوم نہ ہو کہ حارث شیطان کا نام ہے ان اعتراضات کے جوابات بہت ضعیف ہیں۔ کچھ کی طرف شیخ الاسلام نے چند اشارات کیے ہیں لیکن ان سب کی حیثیت ایک کمزور تاویل سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ مثلاً یہ کہ اعلام میں لغوی معنے مراد نہیں۔ یہ جواب بہت ہی ضعیف ہے۔ بے شک لوگوں کے استعمال میں اعلام میں معانی مراد نہیں ہوتے لیکن رکھنے والا جب نام رکھتا ہے تو اس کے پیش نظر یقیناً معانی ہوتے ہیں۔ اور تو اور بچہ کا نام خود ایک پیغمبر رکھ رہے ہیں۔ معنویت ہی کی وجہ سے عبدالعزیٰ جیسے اسماء ناجائز ہیں۔ یہاں لوگوں کے استعمال کا سہارا ایک بے جان سہارا ہے یا یہ کہنا کہ یہ شرک فی العبادت نہیں بلکہ شرک فی التسمیہ ہے۔ یہ جواب ہی لغو ہے کیونکہ شرک فی التسمیہ بھی حرام ہے۔ اور کوئی نبی حرام کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ ان اعتراضات سے بچنے کے لیے بعض لوگوں نے نفس واحدہ سے قصی مراد لیا ہے اور اس کی بیوی کو پیدا کرنے کا

مطلب یہ بتایا ہے کہ قصی کی نوع یعنی نوعِ انسانی اللہ تعالیٰ نے اس کی بیوی کو پیدا کیا تاکہ اس کی طبیعت کو سکون اور روح کو راحت حاصل ہو۔ لیکن جب قصی کی اولاد ہوئی تو اس نے اپنی اولاد کا نام بجائے عبداللہ، عبدالرحمان کے عبد مناف اور عبدالدار رکھ دیا۔ اور خدا کے ساتھ ایسی چیزوں کو شریک کیا جو خالق نہیں اور پھر اس کی اولاد نے بھی شرک کیا۔

لیکن یہ تاویل بھی درست نہیں ہے کیونکہ اس کی روایتی اور تاریخی حیثیت کچھ نہیں ہے۔ صحیح مطلب وہی ہے جو ابن کثیر، بیضاوی اور رازی نے بتایا ہے کہ جعل منہا میں مِن جزئیت کے لیے نہیں بلکہ حقیقت کے لیے ہے۔ اور نفس واحدہ سے مراد مرد ہے۔ یعنی سب کو اللہ نے ایک مرد کی جنس سے پیدا کیا۔ سب کو انسانی افراد بنایا۔ مرد کی بیوی کو بھی اس کی جنس سے پیدا کیا۔ جانور کو اس کا جوڑا نہیں بنایا تاکہ مرد کو سکونِ خاطر حاصل ہو۔ اسی سکون کے نتیجہ میں جب میاں بیوی ملتے ہیں تو بیوی کو حمل ہو جاتا ہے۔ زمانۂ حمل کی ابتدا میں عورت کو کچھ زیادہ بوجھ محسوس نہیں ہوتا لیکن جب حمل کو زیادہ زمانہ گزر جاتا ہے اور بوجھ محسوس ہونے لگتا ہے تو مرد و عورت دونوں اللہ سے دعا مانگتے ہیں کہ اگر تو نے ہمیں اچھا بچہ دے دیا تو ہم تیرے شکر گزار ہوں گے۔ پھر اللہ سبحانہ، حسب مراد ان کو بچہ دے دیتا ہے تو وہ خدا کی دین میں خدا کے ساتھ اوروں کو بھی شریک کر لیتے ہیں۔ حالانکہ اللہ سبحانہ، کی ذات گرامی ہر قسم کے شرک سے بالا و برتر ہے۔ اس تشریح کی تائید امام الحسن البصری کی اس تفسیر سے ہوتی ہے جو معمر کے طریق بسند صحیح مروی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ آیت سے آدم کی ذریت مراد ہے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ امام حسن سے یہ تفسیر بہترین تاریخی اور روایتی طریق سے مروی ہے۔ اور یہ تفسیر احسن التفاسیر یعنی تمام تفاسیر میں عمدہ ہے۔

دراصل آیت میں مشرکین کی مشرکانہ گمراہیوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ منشا یہ ہے کہ نوعِ انسانی کو ابتداء وجود کی نعمت عطا کرنے والا اللہ سبحانہ، ہے پھر انسان کو بھی لبادہ وجود اللہ ہی نے عطا فرمایا ہے۔ عورت کے رحم میں نطفہ کو ٹھہرانا پھر اس ایک قطرے کو پرورش کر کے ایک زندہ بچہ کی صورت دینا پھر اس بچہ کے اندر طرح طرح کی قوتیں اور قابلیتیں ودیعت کرنا اور اس کو اچھا بچہ انسان بنا کر پیدا کرنا یہ سب اللہ سبحانہ، کی شانِ تخلیق کا مظہر ہے۔ اس حقیقت سے مشرکین بھی اسی طرح آگاہ ہیں جیسے موحدین۔ یہی وجہ ہے کہ زمانہ حمل میں ساری امیدیں اللہ سے وابستہ کر لی جاتی ہیں

کردی صحیح وسالم بچہ پیدا کرے گا لیکن اس کے باوجود نادانی اور حماقت کا حال یہ ہے کہ جب اُمیدیں بھر آتی ہیں اور خوبصورت بچہ اللہ سبحانہ، عطا فرما دیتے ہیں تو شکریے کے لیے اعمال نیاز کا قبلہ دیویوں، اوتاروں، ولیوں اور حضرتوں کو بنا لیا جاتا ہے اور بچہ کا ایسا نام رکھ دیا جاتا ہے۔ کہ گویا وہ خدا کی عنایت نہیں بلکہ کسی اور کی عنایت کا نتیجہ ہے، جیسے پیراں دتا، حسین بخش، میراں بخش، پیر بخش، عبدالعزیٰ، عبدالشمس وغیرہ۔

یہاں یہ بات بھی دھیان میں رکھنی چاہیے کہ اس آیت میں انسان کی اس کمزوری کو بھی بتایا گیا ہے کہ انسان اپنی اصل ضرورت اور اصل احتیاج کے وقت تو اپنے رب ہی کی طرف متوجہ ہوتا ہے لیکن جب وہ احتیاج پوری ہو جاتی ہے تو وہ اس کو دوسرے اسباب و وسائل کا کرشمہ قرار دیتا ہے۔ یہ ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے کہ اس کا تجزیہ ہر شخص خود کر سکتا ہے۔

انسان کی عام حالت یہی ہے اور یہاں عام حالت ہی بیان ہوئی ہے۔ ممکن ہے کہ کچھ ایسے ہی ہوں جو کسی حال میں بھی اللہ سبحانہ، کی طرف متوجہ نہ ہوتے ہوں لیکن قرآن نے بڑے سے بڑے باغی کا بھی یہی حال بیان کیا ہے۔ جیسے فرعون اسے بھی آڑے وقت خدا ہی یاد آیا۔ آدمی پر جب واقعی محتاجی اور نیازمندی کی حالت طاری ہوتی ہے تو وہ دل دل میں یا زبان اور دل دونوں ہی سے خدا کو پکارتا ہے اور یہ عہد بھی کرتا ہے کہ اگر اس بلا سے نکل گیا تو آئندہ وہ اپنے رب کا شکر گزار بندہ بن کر رہے گا لیکن جونہی وہ اس مرحلہ سے گزر جاتا ہے تو یک دم خدا فراموشی بلکہ خود فراموشی کا شکار ہو جاتا ہے۔

مخلوقیت احتیاج کی مظہر ہے

۱۹۹۔ کیا لوگ اللہ کے ساتھ ان کو شریک ٹھہراتے ہیں جو خالق نہیں ہیں، مخلوق ہیں نہ وہ شریک بنانے والوں کی مدد کر سکتے ہیں اور نہ اپنی۔ پہلے ایک طرح کے شرک کا ذکر تھا، اس کی مناسبت سے اس آیت میں بت پرستی کا رد فرماتے ہیں۔ یعنی جو کسی کو پیدا نہ کر سکے بلکہ خود تمہارا بنایا ہوا ہو وہ تمہارا خدا یا معبود کیسے بن سکتا ہے[1] قرآن کا عام

[1] افادات شیخ الاسلام

اسلوب بیان یہ ہے کہ وہ توحید خالقیت سے توحید الوہیت سے استدلال کرتا ہے۔ اس استدلال کے لیے اس کے مختلف انداز ہیں۔ کبھی کہتا ہے کہ اللہ ہی تمہارا خالق ہے۔ اس لیے اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ اور کبھی کہتا ہے جن کو تم عبادت میں نیازمندی میں اور عجز و نیاز کے اعمال میں اللہ کا شریک بناتے ہو وہ خالق نہیں مخلوق ہیں۔ اور مخلوق ہو کر کوئی بھی خالق کا ہمسر نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ یہاں بھی شرک فی التسمیہ کی شناخت بیان کرنے کے بعد فرمایا ایشرکون مالا یخلق شیأ و ھم یخلقون وہ لوگ خدا کے ساتھ کن ہستیوں کو شریک ٹھہراتے ہیں ایسوں کو جو کسی چیز کے خالق نہیں ہیں بلکہ خود مخلوق ہیں۔ خالق اور مخلوق میں برابری ہو۔ یہ کوئی عقل انسانی باور نہیں کر سکتی۔ یعنی لوگوں کی حالت یہ ہے کہ جب حمل ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگتے ہیں۔ جب بچہ پیدا ہو جاتا ہے تو دوسروں کی طرف اس اولاد کو منسوب کر دیتے ہیں کہ فلاں بزرگ یا فلاں پیر یا فلاں دیوتا نے دیا ہے یا اس کا نام شرکیہ رکھتے ہیں یا غیروں کے روبرو بچہ سے ماتھا رکھوا تے کہ تم نے یہ اولاد دی ہے یہ سب باتیں شرک ہیں جو پیر یا دیوتا خود ہی پیدا ہونے میں اللہ کا محتاج ہے وہ کسی کو کیا پیدا کر سکتا ہے یا کسی کو کیا اولاد دے سکتا ہے۔ آپ اگر موٹر کا ہینڈل پکڑ کر موٹر سے یہ کہنا خلاف عقل سمجھتے ہیں کہ اے موٹر مجھے موٹر دے دے تو پھر کسی مخلوق سے بچہ مانگنا یا ہوئے بچہ کو اس کی داد و دہش قرار دینا کہاں کی دانشمندی ہے۔ قرآن کا یہ شکوہ بلاشبہ مشرکین سے ہے۔ لیکن یہ بڑے درد اور دکھ کی بات ہے کہ مسلمان بھی اس بیماری میں مبتلا ہو گئے، بلکہ سچ پوچھو تو آج کے مسلمان مشرکین کو بھی شرمات دے گئے۔ مشرکین تو بچہ پیدا ہونے پر اللہ کی اس دین میں دوسروں کو شکریہ کا مستحق گردانتے تھے۔ ان سے شکوہ صرف یہ تھا کہ وہ ناموں میں دوسروں کو شریک کرتے ہیں اور آج کے مدعیان توحید تو اولاد کی دعا بھی غیروں سے مانگتے ہیں۔ مزاروں پر جا کر اولاد مانگتے ہیں۔ حمل کے زمانے میں منتیں بھی غیروں کی مانتے ہیں اور بچہ پیدا ہونے کے بعد نیاز بھی ان کی دیتے ہیں۔ انا للہ فالی اللہ المشتکی قرآن کا یہ انکشاف ہمارے لیے بڑا ہی عبرت انگیز ہے کہ لا یستطیعون لھم نصرا و لا انفسھم ینصرون۔ یعنی جن ہستیوں اور شخصیتوں کو وہ خدا کا شریک بناتے ہیں وہ نہ تو شریک بنانے والوں کی مدد کر سکتے ہیں اور نہ اپنی مدد کر سکتے ہیں۔ یاد رہے کہ اس ارشاد کا مصداق بت نہیں بلکہ وہ شخصیتیں ہیں جن کے انہوں نے بت بنا رکھے تھے۔ آگے

قرآن نے ان شخصیتوں کی بے بسی، بے کسی اور بے چارگی کی جو تصویر پیش کی ہے وہ سننے کے لائق ہے۔ سادہ لوح لوگ ان آیات سے یہ کہہ کر گزر جاتے ہیں کہ یہ آیات بتوں کے بارے میں ہیں۔ یاد رکھو کہ ان آیات میں بتوں کا نہیں بلکہ ان کا ذکر ہے جن کے لوگوں نے بت بنا رکھے تھے۔

خالقیت سے توحید پر استدلال

۲۵۰۔ بلکہ اگر تم ان کو راستہ کی طرف بلاؤ تو وہ تمہاری پکار کے جواب میں ایک قدم بھی نہ اٹھائیں گے۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ تم ان کو پکارو یا تم خاموش رہو دونوں حالتوں میں تمہارے حق میں نتیجہ برابر ہے۔ یعنی جن بتوں کو تم نے معبود ٹھہرایا ہے اور خدائی کا حق دیا ہے وہ تمہارے کام تو کیا آئیں گے وہ تو خود اپنی حفاظت پر بھی قادر نہیں ہیں اور باوجود مخلوق ہونے کے ان کمالات سے محروم ہیں جن سے کسی مخلوق کو دوسری مخلوق پر تفوق حاصل ہو سکتا ہے گو ان کے ظاہری ہاتھ پاؤں، آنکھ، کان سب کچھ تم بناتے ہو لیکن ان اعضا میں وہ قوت نہیں جن سے انہیں اعضا کہا جا سکے[1] اس آیت کا مصداق عام شارحینِ قرآن کی ہمنوائی میں شیخ الاسلام نے ہاتھوں کے بنائے ہوئے بتوں کو بتایا ہے۔ لیکن یہاں دو چیزیں ہیں۔ ایک اشخاص ہیں جن کو ہم بت یا اصنام کہتے ہیں۔ اور ایک وہ شخصیتیں جن کے بت بنائے جاتے ہیں۔ ہماری رائے میں یہاں بت نہیں بلکہ وہ شخصیتیں مراد ہیں جن کے بت بنا کر لوگ پوجا کر رہے ہیں اس کی دلیل یہ ہے۔

۱۔ ان آیات میں وہ صیغے، الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو عربی زبان میں ذوی العقول کے لیے استعمال ہوتے ہیں اور یہ ایک کھلی اور واضح بات ہے کہ ذوی العقول وہ ہستیاں ہیں جن کے بت بنائے جاتے ہیں، وہ مورتیاں نہیں جن کو پوج رہے ہیں۔ یہاں دھم یخلقون، لا یستطیعون۔ انفسھم ینصرون۔ لا یتبعوا، ھم یہ ساری تعبیرات بتا رہی ہیں کہ ان سے وہ ہستیاں مراد ہیں جن کے بت بنا کر وہ پوج رہے ہیں۔

۲۔ قرآن نے ان کو جواب دیا ہے کہ جن کو تم شریک کر رہے ہو وہ تو خود مخلوق ہیں۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

خالق نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ خدا کی مخلوق وہ ہستیاں ہیں نہ کہ بُت۔

۳۔ آگے آیت میں ان کے بارے میں کھول کر بتایا ہے کہ عباد امثالکم وہ تمہارے جیسے بندے ہیں اور معلوم ہے کہ یہ تعبیر ان ہستیوں کے لیے ہے جن کے بُت بنائے گئے ہیں۔ عباد امثالکم کی تعبیر قرآن میں کہیں بُتوں کے لیے نہیں آئی۔ اس بنا پر اس آیت میں اصلاً قرآن کی تنقید کا رُخ بُت نہیں بلکہ وہ ہستیاں ہیں جن کے بُت بنائے گئے ہیں اور بُتوں پر تنقید اس آیت میں ضمناً ہے۔ قرآن کے مترجمین میں سے حضرت شاہ عبدالقادر اور حضرت شیخ الہند کی نگاہ اس باریک فرق پر گئی ہے۔ وہ آیت ایشرکون ما لا یخلق شیأ وھم یخلقون کا ترجمہ کرتے ہیں، کیا شریک بناتے ہیں ایسوں کو جو نہ پیدا کریں ایک چیز بھی اور وہ پیدا ہوئے ہیں۔ اور شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں رکن کو شریک بناتے ہیں جو پیدا نہ کریں ایک چیز اور آپ پیدا ہوئے ہیں۔ اور نئے مفسرین میں سے مولانا آزاد فرماتے ہیں یہ لوگ خدا کے ساتھ کن ہستیوں کو شریک ٹھہراتے ہیں ایسوں کو جو کوئی چیز پیدا نہیں کر سکتے اور خود کسی کے پیدا کیے ہوئے ہیں۔ قرآن کا عام استدلال یہی ہے کہ جن کو تم اللہ کا شریک اپنا شفیع کہتے ہو وہ خالق نہیں بلکہ مخلوق ہیں اور وہ خواہ کتنا ہی اونچا ہو خالق کے ہمسر نہیں ہو سکتا۔ یہ قرآن کا نظام ربوبیت سے توحید پر استدلال ہے یعنی ایک طرف اللہ سبحانہٗ کی ذات گرامی ہے جو تمام کائنات کی خالق ہے اور جس کی تخلیق کا اعتراف تمہارے دل کے ایک ایک گوشہ میں ہے۔ اس کے سوا تمہاری پرستش اور بندگی کا مستحق کون ہو سکتا ہے ایشرکون مالا یخلق شیأ وھم یخلقون۔ اور آیت کی یہ خاص بلاغت ہے کہ ایک ہی آیت میں دونوں پر ضرب کاری لگائی ہے۔ شروع میں مالا کہہ شخصوں اور بتوں پر اور باقی آیت میں جمع مذکر کے صیغے لاکر ان شخصیتوں اور ہستیوں پر جن کے بُت بنا کر پوج رہے ہیں۔ حجۃ اللہ البالغہ میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اس کی نشاندہی کی ہے۔

آیت میں ان ہستیوں کے بارے میں پہلے یہ بتایا ہے کہ یہ خالق نہیں ہیں بلکہ مخلوق ہیں۔ دوسری بات یہ بتائی ہے کہ وہ تمہاری حاجت روائی کیا کریں گے وہ تو اپنی مدد ہی نہیں کر سکتے۔ پھر ان کی بے بسی اور بے کسی یہ کہہ کر جتائی ہے۔ اگر تم ان کو راہ بتانے کے پکار دو تو تمہاری پکار پر کوئی قدم نہ اٹھائیں۔ یعنی معبود سے عابد کی سب سے بڑی ضرورت

یہ ہوتی ہے کہ وہ ان کو زندگی کے ہر گوشہ میں اس کی رہنمائی کرتا ہے لیکن تمہارے معبودوں کا حال یہ ہے کہ اگر تم ان کو زندگی کے موڑ پر پکارو کہ آؤ ہماری رہنمائی کرو تو وہ تمہاری پکار سے بالکل بیگانہ رہیں اور تمہاری رہنمائی کے لیے تمہارے ساتھ نہ ہوں لفظ اتباع پیچھے چلنا اور ساتھ ہونے کے معنے میں ہے۔ آگے اسی بات کو کھول کر بتایا ہے کہ تم ان کو پکارو یا خاموش رہو دونوں کا نتیجہ تمہارے حق میں برابر ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ عِبَادٌ أَمْثَالُكُمْ فَادْعُوهُمْ
فَلْيَسْتَجِيبُوا لَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿١٩٤﴾ أَلَهُمْ أَرْجُلٌ يَمْشُونَ
بِهَا أَمْ لَهُمْ أَيْدٍ يَبْطِشُونَ بِهَا أَمْ لَهُمْ أَعْيُنٌ يُبْصِرُونَ بِهَا
أَمْ لَهُمْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا قُلِ ادْعُوا شُرَكَاءَكُمْ ثُمَّ كِيدُونِ
فَلَا تُنظِرُونِ ﴿١٩٥﴾

بلاشبہ وہ ہستیاں جن کو تم خدا سے ورے ورے پکارتے ہو وہ تمہارے ہی جیسے بندے ہیں، اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو ان کو تمہاری پکار کا جواب دینا چاہیئے۔[۲۵۱] کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے وہ چلتے ہیں یا ان کے ہاتھ ہیں جن سے پکڑتے ہیں، یا ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے ہیں یا ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے ہیں[۲۵۲]، اے اللہ کے پیغمبر ان لوگوں سے کہہ دو کہ تم اپنے خدا کی عبادت میں شریک ہونے والوں سے دُعا کرو اور

ان کو پکارو پھر میرے خلاف خفیہ تدبیریں کرو اور مجھے بالکل مہلت نہ دو۔ ۲۹۳

مفردات کے معانی

عباد، بندے، غلام، عبد کی جمع امام راغب لکھتے ہیں جو عبد بمعنی غلام کے ہے اس کی جمع عبید آتی ہے اور جو عبد بمعنی عابد ہے یعنی پرستار حق، اس کی جمع عباد ہے تاج العروس میں ہے عبد وہ ہے جو اپنے خالق کا پروردہ ہو۔ ابن حزم کا کہنا ہے کہ عبد کا لفظ مذکر و مونث دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ قاضی شوکانی فرماتے ہیں کہ عبد تعبد سے بنا ہے جس کے معنے فروتنی اور عاجزی کے ہیں اور امام بغوی فرماتے ہیں عبد کو عبد اس کی فروتنی اور عاجزی کی وجہ سے کہتے ہیں۔ ان معانی کا تقاضا ہے کہ آیت میں عباد سے بت نہیں۔ بلکہ وہ ہستیاں مراد ہیں جن کی نمائندگی اصنام یا تصاویر کرتی ہیں - شرکاء شریک کی جمع ہے جیسے فقیہ کی جمع فقہاء، ساتھی اور ساجھی کو کہتے ہیں۔ مشرکین اللہ کی عبادت میں جن کو شریک کرتے تھے ان کو ہی قرآن شرکاء کہتا ہے۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ مشرکین نے کچھ بزرگوں اور نیک لوگوں کے بارے میں یہ خیال کر لیا تھا کہ انہوں نے اللہ کی عبادت کرکے اللہ کا قرب حاصل کر لیا ہے اس کے نتیجہ میں اللہ نے ان کو الوہیت کا مقام دے دیا ہے۔ اس لیے یہ نیک لوگ ساری مخلوقات میں ہمارے نیازمندانہ اعمال کے مستحق ہیں۔ ان کو وہ دانائے غیب اور حاضر و ناظر سمجھتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ یہ حلال مشکلات اور کشاف حاجات ہیں۔ ان ہی بزرگوں کی مورتیاں اور تصویریہ بنا کر ان کی عبادت کرتے تھے۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں مشرکین اپنی حاجتوں میں غیر اللہ سے استعانت کرتے تھے مثلاً بیمار کی شفا فقیر کی مالداری کی خاطر اور ان کی نذریں مانتے تھے اور نذروں کی راہ سے ان کو اپنے مقاصد پورے ہونے کی توقع ہوتی تھی۔ اور برکت کے لیے ان کے ناموں کا ورد کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی لیے یہ ضروری قرار دیا کہ مسلمان یوں کہیں ایاک نعبد و ایاک نستعین۔

یہ ہستیاں بھی تمہاری طرح کے بندے ہیں

مشرکین کا عقیدہ تھا کہ جن مورتیوں کی وہ عبادت کرتے ہیں یہ بڑے بڑے عظیم الشان بزرگوں کی مورتیاں ہیں۔ ان کا موقف یہ تھا کہ جیسے ایک بادشاہ اپنے غلام کی حسن کاری سے خوش ہو کر اس کو حکومت کے اختیارات دے دیتا ہے اور مملکت میں اس کو اپنا شریک کار بنا لیتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بزرگوں کی عابدانہ سرشاریوں سے ہو کر ان کو اپنا شریک کار بنا لیا ہے۔ لہٰذا اب کوئی عبادت ان کی عبادت کی آمیزش کے بغیر قبول نہیں ہوتی ہے بلکہ اللہ کی ذات بالا و برتر ہے۔ تقرب کی خاطر اس کی عبادت سود مند نہیں ہے۔ اس کے تقرب کا صرف ایک راستہ ہے اور وہ یہ کہ ان بزرگوں کی عبادت کی جائے تاکہ یہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیں۔ اس کی خاطر وہ ان بزرگوں کے لکڑی، پتھر، سونے چاندی اور لوہے کے مجسمے تیار کرتے ان کو وہ اصنام کہتے۔ امام راغب لکھتے ہیں الصنم جثۃ متخذہ من فضۃ او نحاس او خشب۔ اور اگر ان بزرگوں سے متعلق کوئی یادگاری مقام ہو تو وہاں کچھ پتھر رکھ دیے جاتے ہیں اور ان پتھروں کی پوجا کرتے۔ امام راغب لکھتے ہیں ھو حجارۃ کانت تعبد اردو میں اسے ستان یا تھان کہتے ہیں۔ ابو داؤد میں ایک حدیث آتی ہے ثابت بن الضحاک کہتے ہیں کہ ایک شخص نے زمانۂ نبوت میں یہ نذر مانی کہ بوانہ جا کر اونٹ ذبح کروں گا۔ اس نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر دی۔ حضور نے فرمایا کہ ھل کان فیھا وثن من اوثان الجاھلیۃ وہاں جاہلیت کے ستھانوں میں سے کوئی ستھان تو نہیں ہے۔ صحابہ نے کہا نہیں۔ پھر دریافت فرمایا کہ مشرکین کے میلوں میں سے وہاں کوئی میلہ تو نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ وثن عربی میں وہی ہے جسے ہم اردو میں ستھان کہتے ہیں۔ اور کچھ بزرگوں کی وہ قلمی تصاویر بنا لیتے۔ راغب لکھتے ہیں کہ الشیئ المصور ان کی بھی پوجا کرتے۔ ان کے پوجنے کی انواع بے شمار تھیں۔ حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ کا اس موضوع پر وہ نوٹ بے حد قیمتی ہے جو انہوں نے الفوز الکبیر میں سپرد قلم کیا ہے۔ ہم ناظرین معالم القرآن کی ضیافت طبع کے لیے یہاں درج کرتے ہیں۔

شرک یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کے علاوہ کسی اور کے لیے ان صفات میں سے کوئی چیز ثابت کی جائے جو اللہ تعالیٰ کے خاص ہیں مثلاً جہاں میں اس ارادے

سے تصرف کرنا جس کو کُن فیکون سے تعبیر کیا جاتا ہے یا علم ذاتی ثابت کیا جائے جو بغیر حواس اور عقلی دلیل اور خواب اور الہام وغیرہ کے حاصل کیا گیا ہو، یا بیمار کی بیماری کو دور کرنے کی صفت ثابت کی جائے یا کسی شخص پر ایسی پھٹکار اور ناراضگی ڈالی جائے کہ اس کی وجہ سے اس پر رزق تنگ ہو جائے۔ یا کسی شخص پر رحمت کی جائے جس کی بنا پر اس پر رزق کی وسعت ہو اور اس کو صحت ہو جائے اور نیک بخت ہو جائے (یہ تمام صفات صرف اللہ سبحانہٗ کے لیے خاص ہیں) یہ مشرکین کارِ تخلیق میں یا بڑے بڑے کاموں کی تدبیر و تصرف میں کسی کو خدا کا شریک نہ گردانتے تھے اور کسی کے لیے یہ قدرت ثابت نہیں کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی امر کا فیصلہ کر چکتا ہے تو وہ اس کو ٹال دیتے ہیں۔ ان کا شرک یہ تھا کہ بعض بندوں کے بارے میں یہ خیال کرتے تھے کہ وہ کچھ مخصوص کام کر سکتے ہیں اور اس بارے میں ان کی سوچ یہ تھی کہ علی الاطلاق بادشاہ تو اللہ تعالیٰ ہی ہے لیکن وہ اپنے بعض بندوں کو الوہیت کی خلعت سے مشرف کر دیتا ہے اور ان کی رضا اور ناراضگی کو سب بندوں پر ترجیح دیتا ہے۔ جیسے ایک بڑی شان والا بادشاہ اپنے خاص غلاموں کو اطرافِ مملکت میں روانہ کرتا ہے اور کچھ امورِ مملکت میں تصرف کے اختیارات دے دیتا ہے تاآنکہ بادشاہ سے اس کے خلاف کوئی حکم صادر ہو، سو بادشاہ ان جزوی اُمور کی طرف توجہ نہیں کرتا اور لوگوں کے معاملات غلاموں کے سپرد کر دیتا ہے اور لوگوں کے بارے میں ان کی سفارش قبول کرتا ہے جو اس کی خدمت میں مشغول رہتے ہیں اور اللہ ان کو وسیلہ بنا دیتا ہے۔ اس عقیدے کی وجہ سے مشرکین اللہ تعالیٰ کے ان خاص بندوں کا تقرب ضروری سمجھتے ہیں تاکہ ان کو بادشاہ مطلق کے یہاں آسانی سے شرف باریابی حاصل ہو۔ اور ضرورت کے موقعہ پر ان بندگانِ خاص کی سفارش ان کے بارے میں قبول ہو سکے۔ اسی لیے مشرکین ان بندگانِ خدا کو سجدہ کرنا جائز سمجھتے ہیں۔ ان کے نام کے جانور ذبح کرتے ہیں اور ان کے ناموں کی قسمیں کھاتے ہیں۔ ضروری معاملات میں ان کو شانِ کن فیکون کا حامل سمجھ کر مدد مانگتے ہیں اور مشرکین ان خاص بندگان

خدا کے پتھر، لوہے اور پیتل سے مجسمے بنالیے اور ان کو قبلہ بنا کر ان بزرگوں کی ارواح سے استفادہ کرتے تھے۔ نادانوں نے بعد میں آہستہ آہستہ ان پتھروں کو معبود سمجھ لیا۔ اور اس کے نتیجہ میں سارا معاملہ خلط ملط ہو کر رہ گیا۔ قرآن نے آیت میں عباد امثالکم کہہ کر اس ساری داستان کو بیان کر دیا ہے۔

مخلوق کو پکارنا حماقت ہے

۲۵۱- بلاشبہ وہ ہستیاں جن کو تم خدا سے ورے ورے پکارتے ہو وہ تمہارے ہی جیسے بندے ہیں۔ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو ان کو پکارو ان کو تمہاری پکار کا جواب دینا چاہیے۔ یعنی تعجب ہے کہ جو چیزیں مملوک و مخلوق ہونے میں تم ہی جیسی عاجز و درماندہ بلکہ وجود و کمالات وجود میں تم سے بھی گئی گزری ہوں۔ ان کو معبود بنا لیا جائے اور جو اس کا رد کرے اسے نقصان پہنچنے کی دھمکیاں دی جائیں۔ چنانچہ مشرکین مکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے تھے کہ آپ ہمارے بتوں کی بے ادبی کرنا چھوڑ دیں ورنہ معلوم نہیں وہ کیا آفت تم پر نازل کر دیں یخوفونک بالذین من دونہ (زمر رکوع ۴) اسی کا جواب قل ادعوا شرکاءکم الخ سے دے دیا۔ یعنی تم اپنے سب شرکاء کو پکارو اور میرے خلاف اپنے سارے منصوبے اور تدبیریں پوری کر لو۔ پھر مجھ کو ایک منٹ کی بھی مہلت نہ دو۔ دیکھو تم میرا کیا بگاڑو گے[1]

اس ساری تشریح کا مدار اس پر ہے کہ آیت میں بتوں کا ذکر ہو رہا ہے لیکن جیسا آپ سن چکے ہیں کہ قرآن کا روئے سخن مورتیوں اور بتوں کی طرف نہیں بلکہ ان شخصیتوں اور ہستیوں کی طرف ہے جن کی یہ تصاویر، مورتیاں اور بت بنائے گئے ہیں۔ مخاطبوں کا عقیدہ تھا کہ جن مورتیوں کی وہ پوجا کرتے ہیں، وہ مورتیاں بڑے بڑے عظیم الشان بزرگوں کی ہیں۔ ان کی تردید میں ارشاد ہوا ہے کہ تمہارے معبود کوئی بھی ہوں تمہاری ہی طرح وہ اللہ کے بندے ہیں۔ ان کو اپنے نفع و نقصان کا بھی کوئی اختیار نہیں تمہاری مدد کیا خاک کریں گے۔ اچھا اگر تمہارے خیال میں وہ تمہاری پکار سنتے ہیں اور تمہاری مشکلات میں تمہارے کام آتے ہیں تو

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ان کو پکار کر دیکھو۔ انہیں چاہیے کہ وہ تمہاری پکار کا جواب دیں اور تمہارا کہا مانیں۔ اگر تمہارا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ وہ کچھ کر سکتے ہیں جو تم نہیں کر سکتے۔ نبوت کی جانب سے یہ مشرکین کو کھلا چیلنج ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب تک تو تم نے ان خیالی معبودوں کو جو چاہا مانا اور جو چاہا منوایا۔ لیکن اب قرآن اور نبوت نے ان سب کی معبودیت کو چیلنج کیا ہے۔ اب وقت ہے کہ وہ تمہاری مدد کریں اور تم کو بھی اور اپنے آپ کو میری زد سے بچائیں۔ اگر انہوں نے اپنی معبودیت کو بچا لیا تو معلوم ہو جائے گا کہ تم سچے ہو۔ آیت قرآنی کا مفاد یہ ہے کہ جن ہستیوں کو تم معبود بنا کر ان کی عبادت کرتے ہو وہ تمہارے ہی جیسے اللہ سبحانہٗ کے بندے ہیں ان کو اگر تم پکارو گے ان سے اگر دعائیں کرو گے تو وہ تمہاری دعائیں کبھی قبول نہ کریں گے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے:

ومن اضل ممن یدعوا من دون اللہ من لا یستجیب لہ الیٰ یوم القیامۃ وھم عن دعائھم غافلون۔

اس سے بڑھ کر کون گمراہ ہو گا جو اللہ کو چھوڑ کر ایسوں کو پکار رہا ہے جو قیامت تک بھی اس کی بات کا جواب نہ دے سکیں گے بلکہ ان کو اس کی دعا کی خبر ہی نہیں۔

یعنی مشرک پرلے درجے کے بے وقوف ہیں کہ خدا جیسے قدرت و علم والے کو چھوڑ کر دوسروں کو پکارتے ہیں جو نہ تو ان کی پکار سنتے ہیں اور نہ کسی بات کی ان میں قدرت ہے۔ اگر یہ قیامت تک بھی پکارتے رہیں تو وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ معلوم ہوا کہ جو لوگ بزرگوں کو دور سے پکارتے ہیں اور انہیں پکار کر صرف یہی کہتے ہیں کہ یا حضرت آپ دعا فرما دیں کہ اللہ سبحانہٗ ہماری حاجت براری فرما دیں یہ بھی شرک ہے اگرچہ وہ اس بنا پر اسے شرک نہ سمجھیں کہ حاجت براری کی دعا تو اللہ ہی سے کی گئی ہے۔ لیکن شرک اس لیے ہے کہ ان کے بارے میں یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ دور سے اور نزدیک سے برابر سنتے ہیں حالانکہ یہ خدائی شان ہے۔ اسی لیے ارشادِ نبوت میں اسے سب سے بڑا گناہ بتایا گیا ہے ارشاد ہے:

عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں کہ ایک شخص نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ سب سے بڑا گناہ کون سا ہے فرمایا کہ تو کسی کو اللہ کا ہمسر بنا کر پکارے حالانکہ اللہ نے تجھے پیدا کیا ہے۔

یعنی جس طرح اللہ سبحانہٗ کو حاضر و ناظر سمجھا جاتا ہے اسی طرح غیر اللہ کو اسی صفت

سے متصف مان کر پکارنا سب سے بڑا گناہ ہے۔

معبودوں کی ظاہری کمال سے محرومی

۲۵۲۔ کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے چلتے ہیں یا ان کے ہاتھ ہیں جن سے پکڑتے ہیں یا ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے ہیں یا ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے ہیں۔ اس آیت میں مشرکوں کی حماقت پر ایک اور ضرب کاری لگائی ہے مگر تفنن کے طور پر تعبیر کا انداز بدل دیا ہے۔ بُت پرستی کے اجزاء ترکیبی دو ہیں۔ ایک اصنام، اوثان اور تماثیل، دوسرے وہ ہستیاں جو فی الواقع ان کے خیالی معبود ہیں اور جن کی نمائندگی اصنام و اوثان کرتے ہیں۔ پہلے قرآن نے ہستیوں کے بارے میں ان کی حماقت کو ظاہر کیا کہ ان سے دُعائیں مانگتے ہو جو دُعا کو قبول ہی نہیں کر سکتے، جو تمہاری دُعاؤں کو سنتے ہی نہیں۔ اور جن کو تمہاری دُعاؤں کی خبر نہیں ہے۔ اب رُوئے سخن ان اصنام کی طرف کر دیا جو ان ہستیوں کی نمائندگی کرتے ہیں، فرمایا دیکھ لو اور غور کرو ان بُتوں کے جو پاؤں تم نے خود بنائے ہیں کیا وہ ان پیروں سے چلتے ہیں اور جو ہاتھ تم نے بنا رکھے ہیں وہ ہاتھوں کو گرفت کے لیے استعمال کرتے ہیں اور جن آنکھوں کو تم نے بنایا ہے کیا ان کو ان آنکھوں سے کچھ نظر آتا ہے۔ یہ اپنے چہرے سے مکھی نہیں ہٹا سکتے، اپنے پیروں سے چل نہیں سکتے۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ نہیں سکتے۔ پھر یہ تمہاری کیا خاک مدد کریں گے۔ اور جب ان میں فاعلی قوتیں ہی نہیں ہیں تو ان سے کسی فعل کا صدور کیسے ہو سکتا ہے۔ اس سے زیادہ عقل کی یتیمی اور کیا ہوگی کہ آنکھوں والا اس کو اپنا رہبر کہے جو بینائی سے ہی محروم ہے، چلنے کی طاقت رکھنے والا اس سے پیروں میں توانائی کی دُعائیں مانگے جس کے پاس چلنے کی قوت نہیں۔ ایک بے حس اندھے بہرے ڈھانچہ سے توانائیوں کی درخواست کرے، یہ حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ کمہار اپنے بنائے ہوئے پیالہ سے کہے مجھے پیالہ بنا دے، یہ دیوانگی اور پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے۔ اندھی عقیدت انسان کو اندھا اور بہرا بنا دیتی ہے۔ کوئی نہیں جانتا یہ سب کچھ عقل سے بیگانہ ہو کر محض توہمات کی بنیاد پر ہو رہا ہے۔ جیسا کہ آپ سن آئے ہیں کہ ان آباء اشخاص اور شخصیتوں دونوں کی طرف اشارہ کرنے کے لیے بلیغانہ تفنن ہے۔ اس تفنن کی طرف شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں اشارہ کیا ہے فرماتے ہیں:

اسی لیے اللہ نے مشرکین کی تردید دو طرح سے کی ہے یہ کہہ کر ملک و اقتدار صرف اللہ کا ہے اس میں کوئی ہستی شریک نہیں ہے اور کبھی یہ کہہ کر یہ بُت جن کی تم پوجا کرتے ہو بے جان جمادات ہیں الهم ارجل یمشون بها الخ۔

عام شارحین قرآن نے یہاں اصنام کی قید لگائی ہے۔ اس سے لوگوں نے اس کا مطلب سمجھنے میں سنگین غلطی کی ہے۔ ضروری ہے کہ یہاں اس غلط فہمی کو بھی دُور کر دیا جائے۔ اور کھول کر بتا دیا جائے کہ دُنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں گزری جس نے محض لکڑی، پتھر اور اینٹ کی پوجا کی ہو اور بے جان مورت کو الہٰ بنایا ہو بلکہ بُت، تصویر اور مجسمہ جب بھی بنایا گیا ہے کسی جاندار مخلوق بلکہ بزرگوں اور پیغمبروں اور نیک بندوں کے نام اور شکل ہی پر بنایا گیا ہے اور بُتوں سے وہ ہی کام لیا جو نا اہل لوگ تصورِ شیخ سے یا غالی لوگ تصویر سے لیتے ہیں کہ ان کے سامنے رکھنے سے صاحبِ تصویر کا خیال جمنے کی وجہ سے یکسوئی اور یکجہتی حاصل ہوتی ہے اور خیالات پراگندہ نہیں ہوتے۔

قرآن حکیم نے حضرت نوح کے زمانے کے جن پانچ الہوں کا ذکر کیا ہے اور جن کی پرستش کی جاتی تھی اور جن کے نام ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر ہیں۔ یہ حضرت نوح کے زمانے کے نیک اور صالح اشخاص تھے (بخاری ۲ ص ۷۳۲) اور شاہ عبدالعزیز نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ یہ پانچوں نام حضرت ادریس علیہ السلام کے صاحبزادوں کے ہیں، بہت نیک تھے۔ ابن کثیر نے بھی اسی کے قریب قریب لکھا ہے۔ جلال الدین السیوطی رقمطراز ہیں کہ قرآن میں بُتوں کے ایسے نام جو انسانوں کے نام تھے یہ ہیں۔ ود، سواع، یغوث، یعوق، نسر۔ گویا نوح علیہ السلام کے زمانے کے پانچ پیر تھے۔ حافظ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں یہ بھی انکشاف فرمایا ہے کہ:

> ان کے کافی پیروکار تھے۔ جب ان کی وفات ہوئی تو ان کے عقیدتمندوں نے کہا کہ اگر ہم ان کا تصور پیش نظر رکھیں تو عبادت بڑی پُرکیف اور ذوق و شوق سے ہوگی اس طرح انہوں نے ان کی تصویریں بنالیں۔

اغاثۃ اللہفان میں حافظ ابن القیم الجوزی لکھتے ہیں:۔

> اکثر سلف کا بیان ہے کہ یہ پانچ حضرات جناب نوح علیہ السلام کی قوم کے نیک لوگ تھے جب وہ وفات پا گئے تو لوگوں نے ان کی قبروں کی

مجاوری کرلی۔ پھر ان کی تصویریں اور مجسمے بنا لیے۔ پھر جب کافی زمانہ گزر گیا تو ان کی عبادت شروع کر دی گئی۔

قرآن حکیم میں ایک بت نامی لات کا ذکر ہے۔ یہ کون تھا؟ یہ ایک نیک آدمی تھا جو حاجیوں کو ستو گھول گھول کر پلایا کرتا تھا جس کے نام پر یہ بت بنایا گیا تھا۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت مجاہدؒ، اور حضرت ربیع ابن انسؒ وغیرہ مفسرین قرآن کا بیان ہے کہ لات ایک آدمی کا نام تھا جو ایام جاہلیت میں حاجیوں کو ستو گھول کر پلاتا تھا۔ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ جب اس کی وفات ہو گئی تو لوگوں نے اس کی قبر پر اجتماع شروع کر دیا اور اس کی عبادت ہونے لگی۔ یہ عبادت کیسی تھی۔ حضرت حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:

> اللہ تعالیٰ نے مشرکین مکہ کو کافر کہا کیونکہ انہوں نے ایک سخی انسان کو جو حاجیوں کو پانی میں ستو ملا کر پلاتا تھا منصب الوہیت دے دیا تھا اور تکالیف میں اس سے مدد مانگتے تھے۔

۸ھ میں فتح مکہ کے وقت کعبۃ اللہ میں تین سو ساٹھ بت نصب تھے۔ ان میں خصوصیت کے ساتھ صورۃ ابراھیم واسماعیل فی ایدیھما من الازلام۔ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کی تصویریں بھی تھیں جن کے ہاتھوں میں لاٹری کے تیر تھے (صحیح بخاری) مسند امام احمد میں ہے کہ ان تصویروں اور مجسموں میں حضرت مریم کی تصویر بھی تھی۔ (البدایہ والنہایہ)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا بیان ہے کہ عُزّٰی ایک پری تھی جن درختوں میں اس کا ظہور ہوا تھا۔ ان کو لوگوں نے متبرک سمجھ کر عبادت گاہ بنا لیا تھا (معجم البلدان)

حافظ ابن کثیر نے مشہور محدثین نسائی اور بیہقی کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب ۸ھ میں مکہ فتح ہوا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد کو عُزّٰی کی بیخ کنی کے لیے روانہ کیا، وہ تشریف لے گئے اور کیکر کے تین درخت کاٹ کر اور ایک مکان کو گرا کر واپس آ گئے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا، خالد! کیا کر آئے۔ انہوں نے سارا قصہ سنا دیا فرمایا تم نے کچھ بھی نہیں کیا۔ پھر جاؤ اور جا کر عُزّٰی کو ختم کر کے آؤ۔ چنانچہ جب وہاں پہنچے تو مجاور یہ کہہ رہے تھے یا عُزّٰی یا عُزّٰی! اتنے میں ایک عورت

نکلی جو بدن سے ننگی تھی، بال بکھرے ہوئے تھے۔ سر پر مٹی ڈال رہی تھی۔ حضرت خالد نے اسے قتل کر دیا۔ پھر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے۔ آپ نے فرمایا ہاں یہ عزیٰ ہی تھی جو قتل کر دی گئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ عزیٰ ہی ایک عورت تھی جس کی پرستش کی جاتی تھی۔ لوگ اس کے رہنے کی جگہ کیکروں کا تو ذکر کرتے ہیں مگر عزیٰ کو نہیں بتلاتے۔

عرب کے بتوں میں منات بھی انسان کا نام تھا۔ السیوطی لکھتے ہیں کہ قرآن میں بتوں کے ایسے نام جو انسانوں کے تھے یہ ہیں: لات، منات وغیرہ یہ قریش کے بتوں کے نام ہیں۔

(الاتقان فی علوم القرآن)

قرآن عزیز میں جو بعل کا ذکر آتا ہے۔ السیوطی لکھتے ہیں کہ بعل ایک عورت کا نام ہے جس کی اکثر لوگ عبادت کرتے تھے۔ بعل کے لغوی معنی قوت اور طاقت کے ہیں، مجدالدین فیروز آبادی نے بصائر ذوی التمیز میں لکھا ہے کہ چونکہ مرد میں عورت کے مقابلہ میں برتری کا ذہن ہے اس لیے شوہر کو قرآن میں بعل کہا ہے اور چونکہ مشرکین کے اعتقاد میں معبود کو برتری ہوتی ہے اس لیے اسے بعل کہا ہے اور اسی سے پست زمین کے مقابلہ میں بلند زمین کو بعل کہتے ہیں۔ بعلبک شہر کا نام سے اسی دیوتا کی طرف نسبت ہے۔ بک مخفف ہے بکہ کا۔ بکہ شہر کو کہتے ہیں۔

ان کے علاوہ عرب میں اساف اور نائلہ بھی نامی بت تھے۔ یہ امام ہشام کی کتاب الاصنام میں تصریح کے مطابق اساف قبیلہ جرہم کے ایک مرد کا یعنی اساف بن یعلی اور نائلہ قبیلہ جرہم کی زید کی بیٹی ہے۔ اساف نائلہ پر عاشق تھا۔ امام نووی نے بھی تصریح کی ہے کہ یہ دونوں انسان تھے۔ مرورِ زمانہ کی وجہ سے لوگوں نے ان کی عبادت شروع کر دی تھی (نووی)

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ حضرت ابن ابزی کا بیان ہے کہ جب مکہ فتح ہوا تو ادھیڑ عمر کی ایک عورت حبشی نما داویلا کرتی ہوئی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ آپ نے فرمایا:

یہ نائلہ ہے یہ اس سے نا امید ہو چکی ہے کہ تمہارے اس شہر میں کسی بھی وقت اس کی پوجا ہو۔ (البدایہ)

اس سے بھی معلوم ہوا کہ نائلہ بھی عزیٰ کی طرح کوئی مونث جن اور پری تھی جس کی مشرکین پرستش کرتے تھے۔

بہرحال یہ بُت اگرچہ اشخاص تھے لیکن جن کے اشخاص تھے وہ شخصیتیں اصل میں معبود تھیں ورنہ دُنیا کا کوئی عقل مند انسان اس کو باور نہیں کر سکتا کہ کسی باہوش انسان نے کبھی محض اینٹ اور پتھر کی عبادت کی ہے۔ یہ جو کچھ بھی ہوا انبیاء، اولیاء، جنوں اور دیگر باعزت اور ذی رتبہ مخلوق کے نام پر ہی ہوا کسی کا مجسمہ قبلہ توجہ بنایا گیا تو کسی کا فوٹو، کسی کے اُٹھنے بیٹھنے کی جگہ کو متبرک سمجھ کر اس کی پرستش کی گئی تو کسی کی قبر کو قاضی الحاجات سمجھا گیا۔ کسی نے پتھر کو پتھر سمجھ کر الوہیت کا درجہ کبھی نہیں دیا۔ ذرا غور فرمائیے ویسے تو عرب میں ہزاروں بلکہ لاکھوں درخت موجود تھے لیکن نہ تو کسی نے ان سے عقیدت وابستہ کی اور نہ حضرت فاروق اعظم کی دُور رس نگاہ نے ان کو کٹوانے کا حکم دیا۔ حضرت عمرؓ نے اگر کٹوایا ہے تو صرف وہ درخت جس کے نیچے امام الدنیا والآخرہ سید الانبیاء خاتم الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر تقریباً پندرہ سو صحابہ کرام نے بیعت کی تھی جیسا کہ حافظ ابن القیم نے اغاثۃ اللہفان میں تصریح کی ہے کیونکہ شرک کا آغاز بزرگوں اولیاء اللہ کی قبروں ان کی عبادت گاہوں اور نشست و برخاست کی جگہوں سے ہوا ہے یہ اندھی عقیدت ہی ہے جو لوگوں میں توحید کی فرزانگی کو ختم کر کے شرک کی دیوانگی پیدا کرتی ہے ورنہ دُنیا کا کوئی پاپی سے پاپی مشرک بھی نہ دوالٰہ دو واجب الوجود مانتا ہے اور نہ بُتوں میں صفات الوہیت کا قائل ہے۔

میر سید شریف جرجانی رقمطراز ہیں:

بُت پرست دو واجب الوجود الٰہوں کے قائل نہیں اور نہ وہ اوثان کو صفات الوہیت سے موصوف مانتے ہیں۔ اگرچہ وہ ان پر الٰہ کا اطلاق کرتے ہیں بلکہ انہوں نے تو انبیاء کرام یا اولیاء یا فرشتوں یا ستاروں کی تصویریں بنا کر عبادت کے طور پر ان کی تعظیم کرنا شروع کر دی تاکہ وہ اس طریقہ سے الٰہ حقیقی تک رسائی حاصل کریں۔ [۱]

امام فخر الدین رازی لکھتے ہیں:۔

مشرکین نے اصنام و اوثان اپنے پیغمبروں اور بزرگوں کی صورتوں

---

[۱] شرح مواقف

پر بنائے تھے اور انہوں نے یہ خیال کیا تھا کہ جب وہ ان کی مورتیوں کی عبادت میں مشغول ہوتے ہیں تو یہ اکابر اور بزرگ ان کے حق میں اللہ کی جناب میں سفارش کرتے ہیں اور اس کی نظیر اس زمانے میں یہ ہے کہ بہت سے لوگ بزرگوں کی قبروں کی اس اعتقاد کے تحت تعظیم کرتے ہیں کہ اس طریقہ سے وہ بزرگ اللہ کی جناب میں ان کی سفارش کرتے ہیں [له]

حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے اسے خوب کھول کر بیان کیا ہے :۔

مشرکین کا مسلمانوں کے ساتھ اس بات پر اتفاق رہا ہے کہ بڑے بڑے کاموں کی تدبیر صرف اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے اور ایسے ہی وہ کام ہیں جن کے بارے میں اللہ سبحانہ نے فیصلہ فرما دیا ہے کہ اس نے اور کسی کو اس میں اختیار نہیں دیا ہے لیکن ساری باتوں میں مشرکین اور مسلمانوں میں ہم آہنگی نہیں ہے۔ مشرکین کا مذہب یہ ہے کہ اب سے پہلے جو نیک بندے گزرے ہیں۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی خوب عبادت کی ہے اور عبادت کی راہ سے انہی کا تقرب حاصل کیا ہے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے الوہیت اور حاجت روائی کا عہدہ دے دیا ہے لہٰذا وہ مخلوق کی عبادت کے مستحق ہیں۔ نیز مشرکین کا یہ بھی کہنا ہے کہ وہ صالحین اب بھی سنتے اور دیکھتے ہیں اور اپنی عبادت کرنے والوں کی سفارش کرتے ہیں اور ان کے کاموں کی تدبیر اور ان کی نصرت کرتے ہیں۔ پھر ان صالحین کے ناموں پر انہوں نے پتھروں کے بت بنائے اور ان صالحین کی طرف توجہ کرتے وقت ان کے بتوں کو قبلہ توجہ بناتے ہیں۔

(حجۃ اللہ البالغہ)

بہر حال یہاں دو چیزیں ہیں اور دونوں الگ الگ ہیں۔ ایک وہ اشخاص ہیں جن کو اصنام اور بت کہا جاتا ہے اور دوسرے وہ شخصیتیں ہیں، جن کے یہ بت ہیں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اللہ سبحانہ نے قرآن حکیم میں دونوں کی تردید کی ہے۔ اشخاص کی بھی اور شخصیتوں کی بھی۔ اشخاص یعنی بتوں کی یہ کہہ کر تردید کی ہے کہ یہ جمادات ہیں اور شخصیتوں کی یہ کہہ کہہ

[له] مفاتیح الغیب

تردید کی ہے کہ حکومت و اقتدار میں اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اشخاص یعنی بتوں کی تردید میں تعبیری انداز اور ہے اور شخصیتوں کی تردید میں اندازِ تعبیر اور ہے۔ یہاں اس آیت میں آیت کا آغاز الذین سے کیا ہے جو عربی زبان میں ذوی العقول کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے یہاں صرف شخصیتیں مراد ہیں۔ قرآن یہاں اسی پر ضرب لگا رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ جن شخصیتوں کو تم پکارتے ہو اور جن کی مورتیوں کے سامنے تم دعائیں مانگتے ہو اور التجائیں کرتے ہو وہ تو تمہارے ہی جیسے اللہ کے بندے ہیں۔ ان میں تمہاری دعاؤں کو قبول کرنے کا یارا نہیں ہے۔ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو ان کو پکار کر دیکھو۔ ان کو تمہاری پکار کا جواب دینا چاہیے۔ یہی بات قرآن نے شخصیتوں کے بارے میں دوسرے موقعہ پر اس طرح پیش کی ہے:

الذین تدعون من دونہ ما یملکون من قطمیر ان تدعوھم لا یسمعوا دعاءکم ولو سمعوا ما استجابوا لکم۔

اور وہ لوگ جن کو تم پکارتے ہو اللہ سے ورے وہ کھجور کی گٹھلی پر چھلکے کے بھی مالک نہیں ہیں۔ اگر تم ان کو پکارو گے تو وہ تمہاری پکار نہیں سنیں گے۔ اور اگر سن بھی لیں تو ان میں یارائے قبول نہیں ہے۔

ایک سنگین غلط فہمی

یہاں کچھ بزرگ ایک سنگین غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں کہ آیت میں دعا مانگنے اور پکارنے کے معنے میں نہیں عبادت کے معنی میں ہے۔ ایک صاحب لکھتے ہیں کہ یہاں بلکہ ان جیسی تمام آیات میں تدعون بمعنے تعبدون ہے، کسی کو پکارنا شرک نہیں بلکہ پوجنا شرک ہے۔ لیکن ان کا یہ سمجھنا درست نہیں ہے۔ کیوں؟

اس لیے کہ اگر اس مقام پہ دعا اور عبادت دو الگ الگ ہیں تو اللہ سبحانہ سے زیادہ دعا کے موقع و محل کو کون زیادہ جان سکتا ہے۔ پھر عبادت پہ دعا کا اطلاق کیسے صحیح ہو سکتا ہے جبکہ یہ دونوں جدا جدا چیزیں ہیں۔ اور اگر اس جگہ دونوں ایک ہی ہیں تو پھر

یہ منطق بالکل مہمل ہو کر رہ جاتی ہے کہ کسی کو پکارنا شرک نہیں بلکہ پوجنا شرک ہے۔

پھر قرآن حکیم ایسی کتاب نہیں ہے جو اپنی تشریح خود نہ کرتی ہو قرآن اکثر مقامات پر جہاں دُعا کے صیغے استعمال ہوتے ہیں وہاں اس کے ساتھ اجاب، استجاب، یجیب، اور سماع کے صیغے لا کر دُعا کو پکارنے کے معنے ہی میں متعین فرما دیا ہے مثلاً:

ان تدعوھم لا یسمعوا دعاءکم

اگر تم پکارو تو وہ تمہاری پکار نہ سُنیں گے۔

ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

امن یجیب المضطر اذا دعاہ ویکشف السوء

کون ہے جو بے قرار و بے کس کی دُعا قبول کرتا ہے اور بُرائی کو مٹاتا ہے۔

ایک اور جگہ ہے:

ومن اضل ممن یدعوا من دون اللّٰہ من لا یستجیب لہ الیٰ یوم القیامۃ وھم عن دعائھم غافلون۔

اس شخص سے زیادہ گمراہ کون ہوگا جو ان کو پکارتا ہے جو قیامت تک اس کی دُعا کو قبول نہ کر سکیں اور ان کو ان کی پکار کا پتہ بھی نہیں ہے۔

ان مقامات میں دُعا یدعوا کے بعد اجابت، استجابت اور سماع قرینہ ہے اس کا کہ یہاں دُعا کے معنے پکارنے کے ہیں۔ لُغت کی کتابوں میں اجاب، اور استجاب کے معنے یہی ہیں کہ اس نے اس کا سوال قبول کیا اور اجاب اللّٰہ دُعاءہ، واستجاب، کے ایک ہی معنے ہیں۔ لہٰذا قرآن کے صریح اور لفظی قرینہ کے باوجود کوئی اور معنے بتانا خالص سینہ زوری ہے حکیم الامت شاہ ولی اللّٰہ صاحب فرماتے ہیں کہ آیت قرآنی فلا تدع مع اللّٰہ احدا" میں دُعا سے مراد عبادت نہیں ہے جیسا کہ بعض مفسرین کا خیال ہے بلکہ دُعا سے مراد استعانت ہے کیونکہ اللّٰہ سبحانہ، کا ارشاد ہے:

بل ایاہ تدعون فیکشف ما تدعون الیہ وتنسون ما تشرکون

بلکہ تم صرف اللّٰہ کو پکارتے ہو پھر مٹا دیتا ہے اس تکلیف کو جس کے لیے تم اس کو پکارتے ہو اور تم اپنے شرکاء کو بھول جاتے ہو۔

مخاطبوں کو نبوت کا کھلا چیلنج

۳ ۲۵ - اے اللہ کے پیغمبر ان سے کہہ دو کہ تم خدا کی عبادت میں شرکا سے دعا کرو، اور ان کو پکارو، پھر میرے خلاف خفیہ تدبیریں کرو، مجھے بالکل مہلت نہ دو۔

یہاں تک تو ان لوگوں کو معقول دلائل اور دل کو لگنے والے نصائح کے ساتھ سمجھایا گیا تھا کہ ان کے عقائد اور خیالات اور طریقوں میں کیا غلطی ہے اور وہ کیوں غلط ہے اور اس کے مقابلے میں صحیح راہ کیا ہے اور وہ کیوں صحیح ہے۔ اب ان کے اس طرز عمل کی طرف توجہ منعطف ہوتی ہے جو وہ اس سیدھی سیدھی اور صاف صاف تفہیم و تلقین کے جواب میں اختیار کر رہے تھے۔ دس گیارہ سال سے ان کی روش یہ تھی کہ وہ بجائے اس کے کہ اس معقول تنقید اور صحیح رہنمائی پر غور کر کے اپنی گمراہیوں پر نظر ثانی کرتے الٹے اس شخص کی جان کے دشمن ہو گئے تھے جو ان باتوں کو اپنی کسی غرض کے لیے نہیں بلکہ انہی کے بھلے کے لیے پیش کر رہا تھا۔ وہ دلیلوں کا جواب پتھروں سے اور نصیحتوں کا جواب گالیوں سے دیتے تھے۔ یہ طرز عمل جو انہوں نے اختیار کر رکھا تھا۔ اس پر کچھ اور فرمانے کے بجائے اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو حکم دیتا ہے کہ تم ان کو چیلنج دے دو کہ میں اپنے کام سے باز نہ آؤں گا تم اپنے ٹھہرائے شریکوں کو بلا لو اور سب مل کر میرے خلاف تدبیر کر لو اور مجھے مہلت نہ دو۔ تم میرا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے۔

إِنَّ وَلِـۧىَ اللّٰهُ الَّذِىْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ ۖ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۹۶﴾
وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَآ
اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۷﴾ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا ؕ
وَتَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۹۸﴾

بلاشبہ میرا حمایتی اللہ ہے جس نے کتاب نازل کی ہے اور وہی نیک بندوں کی حمایت کرتا ہے[۲۵۴]۔ اور جن کو تم پکارتے ہو اللہ کے سوا وہ نہ تمہاری مدد کر سکتے ہیں اور نہ اپنی مدد کے قابل ہیں[۲۵۵]۔ اور اے پیغمبر اگر تم ان لوگوں کو سیدھے راستہ کی طرف بلاؤ تو وہ کبھی تمہاری دعوت کو نہ سنیں گے تم دیکھو گے کہ وہ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ دیکھتے نہیں ہیں[۲۵۶]۔

عبادت کی طرح ولایت کا مستحق بھی اللہ ہے

عبادت یہ ہے کہ اپنے آپ کو انتہائی ذلیل اور کمزور سمجھے اور یہ تذلل چاہتا ہے کہ کمزور میں ضعف ہو اور دوسری جانب قوت ہو۔ کمزور میں احساس کمتری ہو اور دوسری طرف شرف و فضل ہو۔ اس معنے کے اعتبار سے اللہ کے سوا اپنے اندر شان معبودیت رکھتا ہو جو پوجے جانے کا مستحق ہو۔ جس کی رضا چاہی چاہیے کوئی اور نہیں جو اس لائق ہو کہ اس کے آگے پیشانیاں جھکیں، نذریں پیش کی جائیں، اعتراف نعمت کیا جائے۔ ولایت ولی کا مصدر ہے اس کے معنے ہیں حاکم ہونا، مددگار ہونا اور حمایتی ہونا۔ اللہ کے سوا کوئی نہیں جسے کارساز، حاجت روا اور مشکل کشا سمجھا جائے اور جسے مدد کے لیے پکارا جائے، جس سے دعائیں اور حاجتیں مانگی جائیں۔ کوئی اور نہیں دل میں جس کا خوف اور تقویٰ رکھا جائے، جس سے اُمیدیں وابستہ کی جائیں۔ کوئی اور نہیں جس کے ہاتھ میں حقیقی اقتدار کا کوئی ذرہ بھی ہو جو بال برابر بھی کسی کو نفع یا نقصان پہنچا سکتا ہو جو کسی کے لیے قانون بنائے اور اپنا حکم چلانے کا ذاتی استحقاق رکھتا ہو اور جس کی بے قید اطاعت جائز ہو۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ مشرکوں کا مسلمانوں کے اس بات پر کلی اتفاق تھا کہ بڑے بڑے اور اٹل و محکم کاموں میں اللہ سبحانہٗ نے کسی کو کوئی اختیار نہیں دیا لیکن ان کا خیال تھا کہ اللہ تعالیٰ کے وہ نیک بندے جو ان سے پہلے اللہ سبحانہٗ کی عبادت اور تقرب کی وجہ سے اللہ سبحانہٗ کی بارگاہ میں مقبول اور مقرب ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو جزوی طور پر حاجت روائی فریادرسی، مشکل کشائی، پناہ دہندگی، امداد و اعانت، خبرگیری و حفاظت کا کام سپرد کر دیا ہے۔ اسی کا نام ولایت ہے۔

قرآن کی یہ آیت مشرکین کی ان دھمکیوں کا جواب ہے جو وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر تم ہمارے معبودوں کی مخالفت کرنے سے باز نہ آئے اور ان کی طرف سے تم لوگوں کے عقائد اسی طرح خراب کرتے رہے تو تم پر ان کا غضب آ پڑے گا۔

مفردات کے معانی

ولی: یہ صفت کا صیغہ ہے اس کی جمع اولیاء ہے۔ اس کے دو مصدر آتے ہیں۔ ولی، اور ولایت۔ جب مصدر ولی آئے تو لازم اور متعدی دونوں آتا ہے۔ لازم کے معنے قریب ہونے کے ہیں اور متعدی کے معنے ذمہ داری قبول کرنے کے ہیں۔ اسی سے یتیم کا ولی۔ اور نکاح میں لڑکی کا ولی ہے۔ مصدر جب ولایت ہو تو اس کے معنے حاکم ہونے کے ہیں، اسی سے والی ہے۔ ولایت کے معنے مددگار ہونا، حامی ہونا۔ اسی سے ولی اور مولی مددگار کے معنے میں آتا ہے۔ علامہ مجد الدین فیروز آبادی رقمطراز ہیں کہ مولی عربی میں ۱۹ معنے میں آتا ہے۔ آزاد کنندہ، مالک، غلام، ساتھی، مددگار، رشتہ دار، پڑوسی، ساتھی، بیٹا، چچا، پڑاؤ کرنے والا، شریک، بھانجہ، ذمہ دار، منعم، منعم علیہ، تابع، کارساز،

یتولی: یہ ولی سے باب تفعل بنا ہے۔ یہ بھی لازم اور متعدی دونوں معنی میں آتا ہے لازم جیسے فان تولوا۔ اور متعدی جیسے ومن یتولھم منکم۔ تولی جب متعدی بلا واسطہ ہوتا ہے تو اس کے معنے کسی سے دوستی رکھنے کسی کام کی ذمہ داری اٹھانے اور والی و حاکم ہونے کے آتے ہیں جیسے فھل عسیتم ان تولیتم اور جب عن کے ساتھ متعدی ہوتا ہے تو منہ پھیرنے نزدیکی چھوڑنے کے معنے ہوتے ہیں۔

کارساز اللہ کے سوا کوئی نہیں

۲۵۴ - بلاشبہ میرا حمایتی اللہ ہے جس نے کتاب نازل کی ہے اور وہ ہی نیک بندوں کی حمایت کرتا ہے۔ اس آیت کے پہلے فقرے ہی تعریف طرفین کے ذریعہ ذہنوں میں یہ بات اتاری گئی ہے کہ حمایت و نصرت کرنے والا اللہ کے سوا کوئی نہیں، وہی کارساز ہے۔ وہی چارہ گر ہے، وہ ہی حاجت روا اور مشکل کشا ہے کوئی اور نہیں جو بال برابر بھی کسی کو نفع یا نقصان پہنچا سکتا ہو۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے نجران کے عیسائیوں کو ایک خط لکھوایا تھا جس میں آپ نے یہ لکھوایا کہ:

انی ادعوکم الی عبادۃ اللّٰہ تعالیٰ من عبادۃ العباد

میں تمہیں بندوں کی بندگی کے بجائے اللہ کی بندگی کی دعوت دیتا ہوں۔

ایسے ہی یہ بھی ارشاد فرمایا کہ :

ادعوکم الی ولایۃ اللہ من ولایۃ العباد

میں تمہیں بندوں کی کارسازی کی جگہ اللہ کی کارسازی کی دعوت دیتا ہوں۔

مطلب یہ ہے کہ دونوں کا وزن برابر ہے۔ عبادت کی حد تک اللہ کے سوا پوجا کے لائق کوئی نہیں اور ولایت کی حد تک اللہ کے سوا حاجت روا اور کارساز کوئی نہیں ہے۔ عبادت اور ولایت خداوندی کے بنیادی تقاضوں پر اگر کوئی شخص کھلے دل کے ساتھ غور کرے تو وہ اس یقین پر مجبور ہو گا کہ جیسے اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جو اپنے اندر شان معبودیت رکھتا ہو، جو پوجے جانے کا مستحق ہو، جس کی رضا چاہی جائے۔ ایسے ہی اور کوئی نہیں جسے ولی، کارساز، حاجت روا اور مشکل کشا سمجھا جائے، جس سے دعائیں اور حاجتیں مانگی جائیں۔

غزوہ اُحد میں جب مشرکین کی جانب سے یہ نعرہ لگایا گیا لنا العزی ولا عزی لکم ہمارا کارساز عزیٰ ہے تمہارا کوئی عزیٰ نہیں ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ تم بھی نعرہ لگاؤ۔ اللہ مولنا ولا مولیٰ لکم اللہ ہمارا کارساز ہے تمہارا کارساز کوئی نہیں۔ یہاں بھی مولیٰ کارسازی کے معنے میں ہے۔ اس سے بھی عبادت اور ولایت دونوں کی اللہ سبحانہٗ کے لیے خصوصیت معلوم ہوتی ہے۔ عبادت اور ولایت کی جامعیت کا نام الوہیت ہے اور مشرکین کو جیسے عبادت میں ٹھوکر لگی تھی ایسے ہی وہ ولایت میں غلط روی کا شکار تھے۔ قرآن نے جا بجا یہ حقیقت واضح کی ہے کہ روحانی اعتقاد کے ساتھ ایک بالاتر ہستی کو پکارنا بندگی و نیاز کا ایک ایسا عمل ہے جو صرف خدا کے لیے ہونا چاہیے۔ اگر کسی دوسری ہستی کے لیے کیا گیا تو یہ شرک ہو گا۔ یہی مقام ہے جہاں مختلف مذاہب والوں نے ٹھوکر کھائی۔ وہ توحید ربوبیت میں نہیں بلکہ توحید الوہیت میں گمراہیوں کے شکار ہو گئے۔ کیونکہ خالق و رب تو وہ خدا ہی کو مانتے تھے لیکن اپنی دُعاؤں اور منتوں کے لیے انہوں نے بہت سے آستانے بنا رکھے تھے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں :

مشرکین مکہ کا شرک یہ تھا کہ وہ لوگ بیمار کی شفا یابی، فقیر کی مالداری وغیرہ کے لیے اپنی حاجتوں میں غیر اللہ سے مدد مانگتے تھے اور ان کی نذریں

دیتے تھے تاکہ ان کو اپنے مقاصد میں ان نذروں کی وجہ سے کامیابی ہو۔ نیز تحصیلِ برکت کے لیے ان کے ناموں کی تلاوت کرتے تھے۔

مخاطبوں کے اسی ذہن پر ضرب کاری لگانے کے لیے یہاں آیتِ قرآنی کا آغاز اِن حرفِ تحقیق سے کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ امرِ واقعہ اور حقیقت ہے اور اس میں قطعاً کوئی شک نہیں ہے کہ میرا کارساز، حاجت روا صرف اللہ ہے۔ اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے۔

یہاں یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ اللہ کی کارسازی بتانے کے لیے دو باتوں کو پیش کیا ہے ایک یہ کہ اللہ نے کتاب نازل فرمائی ہے دوسرے یہ کہ اللہ سبحانہ' نیک انسانوں کی کارسازی کرتا ہے۔

اللہ سبحانہ' کی ولایت و کارسازی کو بے نقاب کرنے کے لیے اوّلاً جس بات کو یہاں نزل الکتاب کہہ کر پیش کیا ہے۔ اسی کو قرآن میں دوسرے موقعہ پر ولایتِ خداوندی جتانے کے لیے یخرجھم من الظلمات الی النور کہہ کر پیش کیا ہے۔ یعنی اللہ سبحانہ' کی ولایت کا عملی مظاہرہ یہ ہے کہ وہ اس دُنیا کی زندگی میں اہلِ ایمان کو ایک روشنی عطا کرتا ہے۔ یہ روشنی قرآن کی روشنی ہے جس کے اُجالے میں اہلِ ایمان نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ زندگی کی مختلف منزلیں اور حالات کے مختلف مراحل طے کرتے ہیں۔ یہ قرآن کی تاثیر ہے کہ اہلِ ایمان میں نئی رُوح۔ نیا ولولہ، نئی زندگی رُونما ہو گئی تھی۔ ان کی تربیت اسی کے سائے میں ہوئی۔ ان کے ذہنوں میں قرآن کی برکت اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے نورانیت آگئی۔ اور اسی کی وجہ سے دُنیا ان کے لیے اور وہ دُنیا کے لیے بالکل بدل گئے اور ان کو احساس ہُوا کہ ان کو اللہ نے اس لیے مبعوث کیا ہے کہ وہ لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لائیں۔ انسانوں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی بندگی میں داخل کریں۔ اور مخلوق کی کارسازی سے نکال کر خالق کی کارسازی میں لے آئیں۔ انہیں دُنیا کی تنگی سے نکال کر کشادگی کی طرف لائیں۔ اور مذاہب کی کج روی اور بے اعتدالی سے اسلام کی صراطِ مستقیم پر لگائیں۔ اسی قرآن کے ذریعے وہ زندگی کے مختلف گوشوں مسائل زندگی حل کرتے تھے۔ قرآن ہی نے ان میں یہ رُوح پیدا کر دی تھی کہ وہ اللہ کے دین کے فروغ کی جدوجہد اور عام انسانوں کی ہدایت

کے لیے مبعوث ہوتے ہیں اور قوموں کی اصلاح کا کام ان کے سپرد ہوا ہے اور یہ کہ القرآن کا مددگار اور ان کی کامیابی کا ذمہ دار ہے۔ اس کا ثبوت ان کے ہر قول و فعل سے ملتا تھا۔ ان کے دلوں میں اطمینان اور خود اعتمادی اس قرآن کا نتیجہ تھی۔ اسی قرآن کی برکت سے ان کی عقلوں میں اس قدر نورانیت آگئی تھی کہ تدبّر و تفکّر کے ذریعے وہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ کے لیے ایسا اسلامی قانون بنانے میں کامیاب ہو گئے تھے جس میں زندگی کے تغیرات و تبدیلیوں کا ساتھ دینے کی پوری صلاحیت تھی اور جس کی موجودگی میں کسی وضعی قانون کی پناہ لینے کی ضرورت نہ تھی۔ حافظ ابن حزم ظاہری نے بجا لکھا ہے:

> قانون کے تمام ابواب میں کوئی باب بھی ایسا نہیں ہے جس کی اصل قرآن میں موجود نہ ہو۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم اس اصل کو خود بھی جانتے ہیں۔ ہاں ایک قراض کا باب ایسا ہے جس کی اصل ہمیں قرآن میں نہیں ملی۔ (الموافقات)

حافظ ابن القیم اور امام شاطبی نے اس کی اصل بھی ثابت کی ہے۔ دیکھو اعلام الموقعین اور الموافقات۔

یہی نکتہ ہے جس کی وجہ سے یہاں ولایت کا مظہر الذی نزل الکتاب لاکر پیش کیا ہے، ولایت خداوندی کو ظاہر کرنے کے لیے دوسرا فقرہ وھو یتولی الصالحین لائے ہیں۔ قرآن میں دوسرے موقعہ پر اسی کو ان لفظوں میں پیش کیا ہے اللہ ولی الذین امنوا۔ آیت میں یتولی آیا ہے۔ یہ ولی سے بنا ہے۔ ولی کے دو معنے ہیں۔ ایک معنی لگاؤ اور تعلق کے ہیں، دوسرے معنے مدد کرنا، حکومت کرنا، اور نگرانی کرنا ہیں۔ اہل ایمان کے اللہ سبحانہٗ سے دونوں قسم کے تعلقات میں محبت کے بھی اور حکومت کے بھی، یعنی اہل ایمان کے اللہ سبحانہٗ محبوب بھی ہیں اور حاکم بھی۔ اس آیت میں علماء نے دوسرے معنے کیے ہیں وھو یتولی الصالحین اللہ سبحانہٗ صالحین کی حمایت کرتے ہیں۔ شاہ عبدالقادر نے اپنے ترجمہ میں اسی کو اپنایا ہے۔ قاضی بیضاوی، حافظ ابن کثیر، حافظ ابن جریر، علامہ آلوسی، علامہ ابوحیان، علامہ قرطبی، امام رازی سب یک زبان ہیں کہ یہاں تولی کے معنے مدد کرنے اور حمایت کرنے کے ہیں۔

جس ولایت کو یہاں صالحین کے لیے بیان کیا گیا ہے۔ یہ صرف اللہ کے لیے خاص ہے، یعنی اس کے مفہوم میں یہ بات داخل ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی ولایت نہیں۔ ان کا معین و مددگار

ان کا کارساز و کارفرما، ان کا پشت پناہ اور مشکل کشا صرف اللہ سبحانہ ہے۔ جو بات یہاں مفہوماً معلوم ہو رہی ہے اس کو دوسرے موقعہ پر قرآن نے صراحتہً کلمہ حصر کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ایک موقعہ پر ہے فاللہ ھوالولی اللہ ہی کارساز و مددگار ہے۔ دوسرے موقعہ پر ہے وھوالولی الحمید وہی حمد و ستائش کے لائق کارساز ہے۔ اسی کو یہاں وھو یتولی الصالحین سے تعبیر کیا ہے۔

آیت کا مدعا یہ ہے کہ مجھے تمہارے بتوں سے کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ میرا کارساز تو صرف اللہ ہے، اللہ کے سوا میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا ہے۔ حضرت نوح نے بھی یہی اعلان کیا تھا کہ تم میری مخالفت میں جو کچھ کر سکتے ہو کر گزرو۔ اگر میں صادق ہوں تو تمہاری کوئی کوشش میرے خلاف کامیاب نہیں ہو سکتی۔ فعلی اللہ توکلت فاجمعوا امرکم و شرکاءکم۔ حضرت ہود علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کو یہی جواب دیا تھا کیدونی جمیعاً ثم لا تنظرون انی توکلت علی اللہ ربی وربکم تم سب میرے خلاف مل کر جو تدبیر کر سکتے ہو کر لو اور مجھے بالکل مہلت نہ دو۔ ربی وربکم کہہ کر اشارہ کر دیا کہ مشرکوں کو اس بات سے انکار نہیں ہوتا کہ ایک خالق کی ہستی موجود ہے اور اصلی طاقت اسی کی طاقت ہے یعنی وہ توحید ربوبیت سے بے خبر نہ تھے لیکن ان کی ساری گمراہی تھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ اس پروردگار ہستی کے ماتحت دوسری ہستیاں بھی ہیں جنہیں تصرف کا اختیار مل گیا ہے اور جو ہمارے احوال سے باخبر ہیں۔ اس لیے ہمیں ان کی نذریں دینی چاہئیں۔ دور دور سے ان کی دہائی دینی چاہیے۔ ان کے ناموں کو جپنا چاہیے۔ یہی بات یہاں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ کوئی میرا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ اللہ میرا حافظ و ناصر ہے۔ ابن کثیر لکھتے ہیں اللہ حسبی، کافینی وھو نصیری وعلیہ متکلی، والیہ الجا وھو ولی فی الدنیا والاخرۃ وھو ولی کل صالح بعدی یعنی اللہ ہی مجھے کافی ہے وہی میرا مددگار ہے۔ اسی پر میرا بھروسہ ہے وہی میری پناہ، وہی دنیا و آخرت میں میرا کارساز ہے اور میرے بعد ہر نیک کا کارساز ہے۔

آیت میں اشارہ ہے کہ مومن کامل کو کسی شیطانی طاقت سے ڈرنا نہ چاہیے صالح بندوں کو کوئی چیز نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے اور اسی کو اپنا کارساز حقیقی یقین رکھنا لازم ہے۔ سوائے خدا کے کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ نہ دکھ اور درد کو دور

کر سکتا ہے۔ جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت صرف اللہ کرتا ہے۔
بہرحال عبادت ہو یا ولایت یہ دونوں خاصۂ خداوندی ہیں نہ معبود اللہ کے سوا کوئی اور ہے اور نہ کارسازاللہ کے سوا کوئی اور ہے۔ حضرت یونس نے جب مچھلی کے پیٹ میں دعا کی تو یہ فرمایا، لا الٰہ الا انت، کوئی الٰہ نہیں مگر تو۔ مطلب یہ ہے کہ اے اللہ نہ تیرے بغیر کوئی فریاد رس ہے اور نہ تکلیف دور کرنے والا ہے نہ کوئی حاجت روا ہے اور نہ مشکل کشا ہے۔

مشرکین کے معبودوں کی بے بسی

۲۵۵۔ اور جن کو تم پکارتے ہو اللہ کے سوا وہ نہ تمہاری مدد کر سکتے ہیں اور نہ اپنی مدد کے قابل ہیں۔

یہاں بھی الذین استعمال ہوا جو اشخاص کے لیے نہیں، شخصیات کے لیے آتا ہے۔ بُت پرستی اشخاص اور شخصیتوں سے مرکب ہوتی ہے۔ ایک تو وہ شخصیتیں ہیں جن کو فی الواقع بت خدا کا شریک بناتا ہے دوسرے وہ اشخاص ہیں جو ان شخصیتوں کی شبیہوں، تصویروں پر مشتمل ہوتے ہیں اور جن کو مشرک اپنے ہاتھوں سے بناتا ہے ان کو صور، تماثیل اصنام کہتے ہیں۔ قرآن دونوں پر ضرب لگاتا ہے لیکن اندازِ تعبیر الگ الگ ہوتا ہے۔ اشخاص کے لیے مونث کے صیغے اور وہ الفاظ لاتا ہے جو غیر ذوی العقول کے لیے عربی میں استعمال ہوتے ہیں۔ اور شخصیتوں کے لیے جمع کے صیغے اور وہ الفاظ لاتا ہے جو ذوی العقول کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ قرآن کا رُخ یہاں اشخاص کی طرف نہیں بلکہ ان شخصیتوں کی طرف ہے جن کے یہ اصنام تماثیل ہیں۔ پہلی آیات میں اشخاص کو پیشِ نظر رکھ کر تردید کی تھی اب یہاں شخصیتوں کو پیشِ نظر رکھ کر تردید ہو رہی ہے۔ اللہ سبحانہٗ کی الوہیت میں یگانگت بیان فرمانے کے بعد اب روئے سخن ان ہستیوں کی طرف ہو گیا جن کو مشرکین شرکا سمجھے ہوئے ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ ذہنوں میں کوئی تصور اسی طرح واضح ہو کر آتا ہے جب کہ اس کے مخالف تصور کو بھی ساتھ ہی بیان کیا جائے۔ اس لیے اہم اصول و نظریات کی وضاحت کے وقت عموماً اس بات کا ضرور اہتمام ہوتا ہے کہ ان کے مقابل اصولوں اور نظریوں کو ان کے بالمقابل رکھ دیا جائے۔ توحیدِ الوہیت سے زیادہ اہمیت کس نظریے اور

عقیدے کو حاصل ہو سکتی ہے اس لیے ضروری ہے کہ اس کے مخالف نظریے یعنی شرک کی بھی وضاحت کی جائے۔ شاہ ولی اللہ نے حقیقت شرک یہ بتائی ہے ۔

شرک کی حقیقت یہ ہے کہ کوئی انسان انسانوں کی کسی بڑی ہستی میں عجیب و غریب کرامات دیکھے اور یہ اعتقاد کرلے کہ یہ جو لوگ صفات کمال سے موصوف ہیں اور اس میں آثار اس لیے پائے گئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو الوہیت کی خلعت سے نوازا ہے یا اس بزرگ نے فنا فی اللہ کا مقام حاصل کرلیا ہے اور اپنی ذات بالکل مٹادی ہے۔ اب اس سے جو کچھ صادر ہوتا ہے گویا خدا کر رہا ہے اور اس قسم کی اور بہت سی خرافات اس معتقد کے ذہن میں آتی ہیں ۔

شاہ صاحب کی یہ تشریح کہہ رہی ہے کہ شرک نام ہے اس بات کا کہ اللہ کی ذات یا صفات یا صفات کے لازمی تقاضوں میں کسی کو اس کا ساجھی ٹھہرایا جائے۔ گویا شرک کی تین قسمیں ہوئیں ۔

ایک وہ شرک جس کا تعلق اللہ کی ذات سے ہوتا ہے ۔
دوسرا وہ شرک جس کا تعلق اللہ کی صفات سے ہوتا ہے ۔
تیسرا وہ شرک جس کا تعلق اس کی صفتوں کے لوازم سے ہے ۔
پہلی قسم کے شرک کے عملی مظاہر یہ ہیں :
۱۔ کسی کو اللہ تعالیٰ کا ہم جنس قرار دینا ۔
۲۔ اسے کسی کا باپ یا بیٹا سمجھ لیا جائے ۔
۳۔ یہ مان لیا جائے کہ وہ کسی اور ہستی کے ساتھ مل کر ایک قالب ہو گیا ہے ۔
۴۔ یہ تصور کیا جائے کہ وہ کسی مخلوق کی شکل اختیار کر کے نمودار ہوتا ہے، دوسری شرک کی عملی صورت یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ، جن صفتوں سے موصوف ہے ان میں سے کوئی صفت کسی اور کے اندر بھی مانی جائے اور اسی مفہوم و معنی میں مانی جائے جس معنی و مفہوم میں وہ اللہ تعالیٰ کے اندر پائی جاتی ہے۔ مثلاً علم اللہ سبحانہٗ کی ایک صفت ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کھلی اور چھپی ہر بات کو جانتا ہے۔ اس کے لیے غائب بھی حاضر ہے اور گزرا ہوا یا آنے والا زمانہ بھی حال ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ اعتقاد رکھے کہ فلاں

شخص بھی اسی طرح ہر بات جانتا ہے تو یہ شرک فی الصفات ہے۔ اسی طرح نفع نقصان پہنچانا اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جس کو چاہتا ہے مسرت و راحت کا سامان عطا کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے محروم کر دیتا ہے۔

تیسری قسم کے شرک کی صورت یہ ہے کہ صفاتِ الٰہی کے جو لازمی تقاضے ہیں انہیں اور ان سب کو اللہ ہی کے لیے خاص نہ جانے بلکہ انہیں یا ان میں سے کسی کو بعض دوسری ہستیوں کے ثابت کرے۔

ان تینوں قسموں میں سے چاہے جس قسم کا بھی شرک ہو اس کی موجودگی میں توحید کا اسلامی عقیدہ باقی نہیں رہتا۔

مشرکینِ مکہ، عیسائی اور یہودی نزولِ قرآن کے وقت ان تینوں قسم کے شرکوں میں مبتلا تھے۔ وہ کچھ برگزیدہ ہستیوں کی مورتیوں کو پوجتے جن کی مورتیوں کو سجدے کرتے تھے ان کو دُور دُور سے پکارتے تھے۔ اُن کو اپنا حامی و ناصر سمجھتے تھے۔ اُن کو حلالِ مشکلات اور کشافِ حاجات سمجھتے تھے۔

قرآن یہاں بتا رہا ہے کہ جن ہستیوں سے تم کشافِ حاجات سمجھ کر دُعائیں مانگتے ہو دُور دُور سے پکارتے ہو اُن کے نام کی دہائیاں دیتے ہو یہ سب نہ صرف یہ کہ تمہاری مدد نہیں کر سکتے ہیں بلکہ اپنی بھی مدد نہیں کر سکتے۔ اسی معنے کی قرآن میں اور بھی آیات ہیں جن میں ان ہستیوں کی بے چارگی کو پورے زور سے ظاہر کیا گیا ہے اور ایسی آیات بھی ہیں جن میں بُتوں کو ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے۔

آئیے پہلے شخصیتوں کے بارے میں چند آیات پڑھ لیجئے:

ان الذین تدعون من دون اللّٰہ لن یخلقوا ذبابًا ولو اجتمعوا لہ

بے شک وہ ہستیاں جن کو تم اللہ کے ورے پکارتے ہو وہ سب مل کر ایک مکھی بھی قطعاً نہ بنائیں گے۔

ایک اور آیت ہے:

والذین یدعون من دون اللّٰہ لا یخلقون شیئًا وھم یخلقون، اموات غیر احیاء

اور وہ ہستیاں جن کو وہ اللہ کے ورے پکارتے ہیں کسی چیز کے خالق نہیں

بلکہ خود مخلوق ہیں، مردے ہیں زندہ نہیں ہیں۔
ایک اور آیت ہے:

قل ادعوا الذین زعمتم من دون اللّٰہ لا یملکون مثقال ذرۃ فی السماوات ولا فی الارض وما لھم فیھما من شرک وما لہ منھم من ظھیر۔

آپ کہہ دیجئے پکارو تم ان ہستیوں کو جن کو تم اللہ کے پیچھے خیال کرتے ہو وہ مالک نہیں ذرہ بھر کے آسمانوں اور زمین میں اور نہ ان کی ان دونوں میں کوئی شراکت ہے اور نہ ان تمہارے مزعومہ ہستیوں میں سے کوئی اللہ کا مددگار ہے۔

یہ تو وہ آیات ہیں جن میں براہ راست ان شخصیتوں کا ذکر ہے جن کی مورتیں، تصویریں اور بت وہ پوجتے تھے اور جن کو نفع و نقصان کا مالک تصور کر کے پکارتے تھے۔ آئیے سر راہے کچھ وہ آیات بھی پڑھ لیجئے جن میں شخصیتوں کا نہیں اشخاص کا ذکر ہے۔

قل افرایتم ما تدعون من دون اللّٰہ ان ارادنی اللّٰہ بضر ھل ھن کاشفات ضرہ او ارادنی برحمۃ ھل ھن ممسکات رحمتہ۔

فرما دیجئے، بتاؤ تمہارا ان بتوں کے بارے میں جن کو تم اللہ کے ورے پکارتے ہو کیا خیال ہے کہ اگر اللہ پاک مجھ کو نقصان پہنچانا چاہے تو کیا یہ اس نقصان کو ہٹا سکتے ہیں اور اگر اللہ مجھ پر رحمت کرنے کا ارادہ کرے تو کیا رحمت کو روک سکتے ہیں۔ (پ ۲۴ - زمر)

ایک اور آیت ہے:

قل ارایتم ما تدعون من دون اللّٰہ اروني ماذا خلقوا من الارض ام لھم شرک فی السمٰوات۔

فرما دیجئے کیا خیال ہے تمہارا ان بتوں کے بارے میں جن کو تم اللہ سے ورے پکارتے ہو، دکھاؤ تم مجھے کیا انہوں نے زمین میں نہ کوئی چیز بنائی ہے یا ان کا آسمانوں میں شراکت ہے۔

ان میں اور اس قسم کی دوسری آیات میں بتوں کا ذکر ہے۔ دونوں کا تعبیری انداز قطعاً مختلف ہے۔ بتوں کے ذکر میں اگر ما موصولہ آیا ہے جو عربی میں بے جان چیزوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور مونث کے صیغے آئے ہیں تو ہستیوں کے ذکر میں الذین اسم موصول

کی جمع اور جمع مذکر کے صیغے آئے ہیں جو قطعاً ذوی العقول کے لیے عربی میں بولے جاتے ہیں اس فرق تمیزی کے باوجود اگر کوئی نادان یہ سمجھتا ہے کہ قرآن میں شخصیتوں کا کوئی ذکر نہیں تو اسے اپنی عقل و فہم کا ماتم کرنا چاہیے کہ قرآن کی بلیغ معجزانہ تعبیر کو سمجھ نہیں سکتا۔

پیش نظر آیت میں بھی الذین استعمال ہوا ہے اور ارشاد گرامی کا مقصود یہ ہے کہ اللہ کے سوا تم جن ہستیوں اور شخصیتوں کو پکارتے ہو اور جن سے اپنی مشکلات اور حاجت روائی میں امداد چاہتے ہو وہ تمہاری قطعاً مدد نہیں کر سکتے ہیں اور تمہاری تو درکنار اپنی بھی مدد ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ جو کچھ بھی ہوتا ہے اللہ کے ارادے اور اس کی مشیت سے ہوتا ہے۔ یہ کچھ بھی نہیں کر سکتے ہیں نہ میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔

چشم بصیرت سے محرومی

۲۵۶۔ اور اے پیغمبر اگر تم ان کو سیدھے راستہ کی طرف بلاؤ تو وہ کبھی تمہاری دعوت کو نہ سنیں گے۔ تم دیکھو گے کہ وہ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ دیکھتے نہیں ہیں۔ اس آیت کی تشریح میں شارحین قرآن کا اختلاف ہے۔ حافظ ابن کثیر، حافظ ابن جریر، کے خیال میں اس آیت میں مشرکین کے معبودوں کی حالت بیان ہو رہی ہے اور مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر اگر آپ ان کے معبودوں کو کچھ بتلانے کے لیے پکارو تو آپ کی پکار پر لبیک کہنا تو درکنار آپ کی پکار سن بھی نہیں سکیں گے۔ آپ دیکھیں گے وہ آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں لیکن واقع میں کچھ بھی نہیں دیکھتے ہیں۔ مراد اگرچہ اشخاص ہیں مگر تعبیری انداز شخصیتوں والا اختیار کیا گیا ہے۔ قاضی بیضاوی کی تعبیری انداز کے لیے یہ توجیہ شاندار اور لطیف ہے،۔

کیونکہ ان کی صورت اس انداز سے بنائی گئی کہ معلوم ہوتا ہے کہ سامنے والے کو دیکھ رہے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ ایسی بے بصر ہستیوں سے کیا توقع ہے کہ وہ آپ کا کچھ بھی بگاڑ سکیں۔ سننا، دیکھنا جب ناپید ہے تو نفع و نقصان کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ اور مخاطبوں کو جتا دیا ہے کہ بیوقوفو تم تو یہ خیال کر رہے ہو کہ یہ کیڑے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے ہیں لیکن انہیں سوجھتا سجھاتا کچھ بھی نہیں ہے۔

کچھ شارحینِ قرآن یہ کہتے ہیں کہ اس آیت میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبوں کی حالت بیان کی گئی ہے اور مطلب یہ ہے کہ اللہ کے پیغمبر اگر تم ان لوگوں کو خدا کا راستہ بتانے کے لیے دعوت دو گے تو یہ کبھی تمہاری پکار نہ سنیں گے، تم دیکھو گے کہ یہ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں لیکن امرِ واقعہ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ آپ کو نہیں دیکھتے ہیں۔

یہ دراصل ان لوگوں کے تعصب اور ضد کی تصویر ہے۔ یہ لوگ تعصب اور ضد میں اتنے کھو گئے ہیں کہ ان کو اس عصبیت اور ضد کی وجہ سے حق نظر نہیں آتا ہے۔ ہدایت و سعادت کی راہ عقل و تفکر کی راہ ہے اور گمراہی و شقاوت کا سرچشمہ جہل و کوری اور حواس و تفکر کو بیکار کرنا ہے جو لوگ خدا کی دی ہوئی بصیرت سے کام نہیں لیتے یا ہوائے نفس اس درجہ مغلوب ہو جاتے ہیں کہ ذہن و ادراک کی قوتیں بیکار ہو کر رہ جاتی ہیں وہ کبھی ہدایت نہیں پاتے۔ المخا لکھتے ہیں :

مطلب یہ ہے کہ اگرچہ ان کی آنکھیں آپ کو دیکھ رہی ہیں لیکن اس دیکھنے سے ان کو کوئی فائدہ نہیں ہے۔ آنکھیں ہونے کے باوجود نابینا پن۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ دنیا میں جب کبھی سچائی کی دعوت ظاہر ہوتی ہے تو کچھ لوگ اسے قبول کر لیتے ہیں اور کچھ انکار کر دیتے ہیں لیکن کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اس دعوت کے خلاف طغیان و جحود اور ظلم و شرارت کی جتھا بندی کر لیتے ہیں۔ وہ صرف انکار ہی پر قناعت نہیں کرتے بلکہ ان کو نبوت کے خلاف ایک طرح کی کد اور ضد پیدا ہو جاتی ہے اور پھر یہ ضد بڑھتے بڑھتے بغض و عناد اور ظلم و شرارت کی سخت سے سخت صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اس طرح کا مخالف صرف یہی نہیں کرتا کہ نبوت سے اختلاف رکھتا ہے بلکہ اس کے اندر صاحبِ نبوت کے خلاف بغض و عناد کا ایک غیر محدود جوش پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی زندگی اور زندگی کی ساری قوتوں کے ساتھ بربادی اور ہلاکت کے درپے ہو جاتا ہے۔ صاحبِ نبوت کتنی ہی اچھی بات کہے وہ اسے جھٹلائے گا۔ کتنا ہی اچھا سلوک کرے وہ اذیت پہنچائے گا۔ یہی حالت ہے جسے قرآن انسانی فکر و بصیرت کے تعطل سے تعبیر کرتا ہے۔

امرِ واقعہ یہ ہے کہ جو لوگ خدا کی دی ہوئی عقل و بصیرت کو تاراج کر دیتے ہیں۔ اور اندھے بہرے ہو کر تاریکیوں میں گم ہو جاتے ہیں تو ان کے لیے کوئی دعوت بھی سودمند

نہیں ہے، کیونکہ جو آنکھیں دیکھتے ہوئے آنکھیں بند کیے ہوتے ہے اور دیکھتا نہیں تو اسے راستہ دکھانے کے لیے پکار دو وہ دیکھتا ہی نہیں ہے۔ اس کو ہدایت کی صورت صرف یہ ہو سکتی ہے کہ کوئی جبراً اٹھا کر اسے راستہ پر لگا دے تو ہدایت ایسی چیز نہیں ہے جو جبراً کسی کے حلقوم میں ٹھونس دی جائے۔

اسی ہدایت کو قرآن نے یہاں اس آیت میں بیان کیا ہے۔ بہر حال تشریحیں دونوں ہیں اور دونوں شارحین قرآن کی پیش کردہ ہیں۔ اب یہ آپ کے اختیار تمیزی اور صوابدید پر موقوف ہے کہ آپ کون سی تشریح اختیار کرتے ہیں۔

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ﴿١٩٩﴾ وَإِمَّا
يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۚ إِنَّهٗ سَمِيْعٌ
عَلِيْمٌ ﴿٢٠٠﴾ إِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ
تَذَكَّرُوْا فَإِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ﴿٢٠١﴾ وَإِخْوٰنُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي
الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ ﴿٢٠٢﴾

اے اللہ کے رسول، نرمی اور درگزر کو اپناؤ[257]، نیکی کی تلقین کرو،
اور جاہلوں سے کنارہ کش رہو[258]۔ اور اگر کبھی شیطان کی طرف
سے کوئی خلش محسوس ہو تو اللہ کی طرف متوجہ ہو جاؤ بلاشبہ
اللہ ہی سننے والا اور جاننے والا ہے[259]۔ بلاشبہ جو لوگ متقی
ہیں اگر انہیں کوئی کبھی شیطانی خیال آ بھی جاتا ہے تو فوراً چونک
جاتے ہیں اور پھر اچانک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں[260]۔ باقی
رہے شیطان کے بھائی بند تو انہیں وہ گمراہی میں کھینچے لیے

جاتے ہیں اور پھر اس میں ذرا بھی کمی نہیں کرتے ہیں۔[۲۶۱]

مفردات کے معانی

العفو اس کے معنے معاف کرنے، درگزر کرنے کے آتے ہیں۔ اس کا صلہ عن آتا ہے۔ عفا اللہ عنہ اور کبھی کبھار لام بھی آتا ہے جیسے عفا لہ ذنبہ عفو اچھی اور بہترین چیز کو بھی کہتے ہیں۔ اسی لیے علی ابن طلحہ نے عبد اللہ بن عباس سے اس کے معنے مال کے بتائے ہیں۔ عرف کے معنے نیکی کے ہیں۔ یہی معنے معروف کے ہیں۔ یہ معرفت سے ہے اس کے معنے پہچاننے کے ہیں۔ کسی چیز کی نشانیوں پر غور و فکر کے بعد اس چیز کے ادراک کا نام معرفت ہے۔ معروف اور عرف وہ بات ہے جو جانی پہچانی ہو۔ اس کی ضد منکر آتی ہے۔ یعنی ایسی بات جس کا عام طور پر انکار کیا گیا ہو۔ جاھلین۔ اس کے دو مصدر ہیں۔ جہل اور جہالت جہل کے معنے نہ جاننے کے، علم کی ضد ہے اور جہالت کے معنے بیوقوف ہونے اور نادان ہونے کے۔ یہاں یہی معنے مراد ہیں۔ نزغ، اس کے معنے چھیڑ خانی کرنے کے ہیں۔ علامہ مجد الدین فیروز آبادی نے نزغ اور ہمز کو وسوسہ کے معنے میں لکھا ہے۔ نزغ کے معنے برانگیختہ کرنے کے ہیں۔ طائف وسوسہ، خطرہ۔ پھر جانے والا، گھومنے والا، طوف سے اسم فاعل کا واحد مذکر ہے۔ طوف کے معنے کسی چیز کے گرد چکر لگانے کے ہیں۔ اور اسی لیے جو شخص گھروں کے گرد ان کی حفاظت کے لیے چکر لگاتا رہتا ہے طائف کہلاتا ہے اور اسی سے جن خیال، حادثہ وغیرہ کو بطور استعارہ طائف بولتے ہیں۔ غی، جیسے طوی، یطوی طی۔ غوی سے غی، اس کے معنے بھٹکنے کے ہیں۔ یہ دو بابوں ضرب اور سمع سے آتا ہے۔ غوی یغوی، اور غوی یغوی یہاں حاصل مصدر کے معنے ہیں گمراہی، بدراہی۔

دعوت میں کامیابی کے اصول

پہلے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ مخاطبوں کو اچھی بات بتائی جاتی ہے اور وہ نہیں مانتے۔ ان کے دعوے کی کمزوری ثابت کی جاتی ہے مگر وہ اپنی بات پر اڑے ہوتے ہیں۔ اور حق کا

جواب لایعنی گفتگو اور برا بھلا کہہ کر دیتے ہیں۔ ارشاد تھا وان تدعوھم الی الھدی الخ اور اگر تم ان کو راہِ راست کی طرف بلاؤ تو وہ تمہاری ایک نہ سنیں اور (بظاہر) وہ تم کو ایسے نظر آتے ہیں کہ وہ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں حالانکہ وہ دیکھتے نہیں ہیں۔ ضد اور کد کے اس پس منظر میں دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو تبلیغ و دعوت کا کام بند کر دیا جائے یا تبلیغ و دعوت کی راہ میں ان ناگواریوں اور ناخوشگواریوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا جائے قرآن نے نبوت کی راہ سے اہل ایمان کو دوسری صورت اختیار کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ ان ناگواریوں کو برداشت کرو اور نیکی کا حکم دیتے رہو۔ صرف یہی نہیں بلکہ فرمایا کہ اس سلسلے میں برائی کا جواب بھلائی سے دو ادفع بالتی ھی احسن اگر تمہارے ساتھ برائی کرے تو برائی کا جواب ایسے برتاؤ سے دو جو بہت اچھا ہو۔ اس معنے کے اعتبار سے یہ آیت گرامی مہمات اصول میں سے ہے۔ چند لفظوں کے اندر زندگی کی اخلاقی مشکلات کا پورا حل اور فضیلت و کامرانی کے تمام طریقے واضح کر دیے۔ اخذ بالعفو، امر بالمعروف، اعراض عن الجاہلین یعنی ناسمجھوں کی ناسمجھی بخش دینی، جاہلوں کے پیچھے نہ پڑنا اور نیکی کی دعوت میں سرگرم رہنا۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کی ساری عملی مشکلات کا ان تین باتوں میں حل موجود ہے۔ امام جعفر صادق کا یہ ارشاد بالکل بجا ہے کہ قرآن میں مکارمِ اخلاق کے موضوع پر اس سے زیادہ جامع آیت کوئی نہیں ہے۔ ان آیات کا مقصود صرف حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو تعلیم دینا نہیں بلکہ آپ کی وساطت سے آپ کی امت کو تعلیم دینا ہے۔

زید ابن اسلم کہتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ سبحانہٗ نے جس عفو و درگزر کا حکم مشرکین کے بارے میں دیا ہے وہ صرف دس سال کے لیے تھا۔ اس کے بعد سختی کا حکم آگیا۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ مشہور مفسرِ قرآن ابن جریر کا بھی یہی خیال ہے۔ اس قسم کی آیتوں کے بارے میں جن میں کفار سے متعلق عفو و درگزر کا حکم ہے۔ عام شارحین قرآن کا نظریہ یہی ہے کہ یہ جہاد سے پہلے کی بات ہے۔ جہاد نے کفار کے حق میں عفو و درگزر کو منسوخ کر دیا لیکن مفسرین میں وہ بزرگ بھی ہیں جو جہاد کے حکم اور عفو و درگزر کی نصیحت میں کوئی منافات نہیں سمجھتے اور اس لیے ایک کو دوسرے سے منسوخ نہیں مانتے۔ امام رازی کئی موقعوں پر اس کی تصریح کی ہے۔ اس آیت پر لکھتے ہیں :

اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ جاہلوں کی بداخلاقی پر صبر کریں۔ اور ان کی بیہودہ باتوں اور کمینہ حرکتوں کا جواب اسی قسم کی باتوں اور حرکتوں سے نہ دیا جائے۔ اس میں جنگ سے باز رہنے کی کوئی ہدایت نہیں ہے کیونکہ جاہلوں سے اعراض برتنے اور مشرکین سے جنگ کرنے میں کوئی تضاد نہیں۔ اور جب دونوں باتوں میں ہم آہنگی ہو سکتی ہے تو نسخ ماننے کی ضرورت نہیں مگر ظاہر میں مفسرین بے ضرورت ناسخ و منسوخ آیتوں کی تعداد زیادہ کرنے کے عاشق ہیں۔

میرے نزدیک اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ آیت میں جن قصوروں کو معاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے ان کا تعلق ان قصوروں سے ہے جن کے معاف کرنے کا حق بندوں کو ہے اور وہ حقوق عباد ہیں۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اس سے کفر و شرک اور عصیانِ الٰہی کے قصوروں کی معافی لازم آتی ہے جن کے معاف کرنے کا سرے سے بندوں کو حق ہی حاصل نہیں ہے۔ اور قتال و جہاد حقوقِ الٰہی کے مقابلے میں مشروع ہوا ہے۔ اس لیے جہاد کی آیتیں اس مغفرت اور عفو و درگزر کے اخلاقی احکام میں خلل انداز نہیں ہیں۔

عفو و درگزر کا حکم

۲۵۷۔ اے اللہ کے رسول نرمی اور درگزر کو اپناؤ۔ خذالعفو، کے کئی معنے کئے گئے ہیں۔ اکثر کا حاصل یہ ہے کہ سخت گیری اور تندخوئی سے پرہیز کیا جائے۔ اسی کو مترجم محقق نے درگزر کی عادت سے تعبیر کیا ہے۔ گزشتہ آیات میں بُت پرستوں کی جو تحمیق و تجہیل کی گئی تھی بہت ممکن تھا کہ مشرکین اس پر برہم ہو کر ناشائستہ حرکت کرتے یا کوئی بُرا لفظ زبان سے نکالتے اس لیے ہدایت فرمادی کہ عفو و درگزر کی عادت رکھو۔[1]

اس فقرے میں واضح کیا گیا ہے کہ داعی حق کے لیے جو صفات سب سے زیادہ ضروری ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اسے نرم خو، متحمل اور عالی ظرف ہونا چاہیے

[1] حاشیہ شیخ الہند

اس کو اپنے ساتھیوں کے لیے شفیق، عامۃ الناس کے لیے رحیم اور اپنے مخالفوں کے لیے حلیم ہونا چاہیے۔ اس کو اپنے رفقاء کی کمزوریوں کو برداشت کرنا چاہیے اور اپنے مخالفین کی سختیوں کو بھی۔ اسے شدید سے شدید اشتعال انگیز مواقع پر بھی اپنے مزاج کو ٹھنڈا رکھنا چاہیے۔ نہایت ناگوار باتوں کو عالی ظرفی کے ساتھ ٹال دینا چاہیے۔ مخالفوں کی جانب سے کبھی بھی سخت کلامی، بہتان تراشی، ایذا رسانی اور شریرانہ مزاحمت کا اظہار ہو، اس کو درگزر ہی سے کام لینا چاہیے۔ سخت گیری، درشت کلامی اور منتقمانہ اشتعالِ طبع اس کام کے لیے زہر کا حکم رکھتی ہے اور اس سے کام بگڑتا ہے بنتا نہیں۔ اسی چیز کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں بیان فرمایا ہے کہ میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے کہ غضب اور رضا دونوں حالتوں میں انصاف کی بات کہوں۔ جو مجھ سے کٹتے ہیں اس سے ملوں اور جو مجھے میرے حق سے محروم کرے میں اسے اس کا حق دوں۔ جو میرے ساتھ ظلم کرے میں اس کو معاف کردوں۔

تبلیغ کے اصول

یہ نکتہ کہ لوگوں کو کس طرح کسی سچائی کو قبول کرنے کی دعوت دینی چاہیے۔ دُنیا میں پہلی دفعہ قرآن عزیز نے بتایا ہے۔ دوسرے مذاہب بھی جو تبلیغی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کے صحیفوں نے ان کے لیے تبلیغ کے اہم اصولوں کی تشریح کی ہے لیکن قرآن نے نہایت جامعیت مگر پوری وضاحت کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ پیغامِ الٰہی لوگوں کو کیسے پہنچایا جائے۔ اور ان کو حق قبول کرنے کی دعوت کیسے دی جائے۔ یہاں قرآن نے بتایا ہے کہ دعوت کی ضرورت یہ ہے کہ داعی نرمی اور خیر خواہی سے باتیں کرے کیونکہ سختی اور شدت کا طریق دل میں نفرت اور عداوت کے جذبات پیدا کرتا ہے اور کیسی بھی اچھی بات ہو لیکن اس قسم کے جذبات اس کے قبول کی استعداد اس سے سلب کر دیتے ہیں اور سننے والے میں اپنی غلطی پر ضد اور ہٹ دھرمی پیدا کر دیتے ہیں جس سے دعوت کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔ اسی لیے قرآن حکیم نے آپ کو دشمنوں کی یاوہ گوئیوں کے مقابلہ عفو و درگزر کو اپنانے کا حکم دیا۔ اور اس کے نتیجے میں آپ کے تمام محاسنِ اخلاق یعنی رفق، ملاطفت، عدم تشدد، عفو و درگزر وغیرہ کی جو تفصیل سیرت کی کتابوں میں بیان کی گئی ہے اس پر مجموعی نظر ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ درحقیقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم

کا ایک اعجازی شاہکار تھا اور یہ معجزہ آپ کو تسخیرِ قلوب کے لیے عطا ہوا تھا۔ قرآن عزیز نے اس نکتہ کو خود بتایا ہے:

ولو کنت فظا غلیظ القلب لا نفضوا من حولک

اے اللہ کے رسول اگر تم تند خو اور سخت دل ہوتے تو لوگ تمہارے پاس سے چل دیتے۔

یہ عفو و درگزر کی آپ میں معجزانہ کشش تھی جو لوگوں کو کھینچ کھینچ کر دائرہ اسلام میں داخل کرتی تھی اور کفار کے جاہلانہ شکوک و اوہام کو دم کے دم میں مٹا دیتی تھی۔

ہندہ خاندانِ نبوت کی قدیم ترین دشمن تھی۔ جنگِ احد میں قوتِ بازوئے اسلام حضرت حمزہ کے جگر کو اسی نے چاک کیا تھا۔ اسی نے ان کا جگر نکال کر چبایا تھا جس کو نگل نہ سکی اور پھر اگل دیا تھا اور اسی نے بعض شہیدوں کے ناک کان کاٹ کر گلے کا ہار بنایا تھا۔ وہ فتح مکہ میں بھیس بدل کر آپ کی خدمت میں اسلام لانے کے لیے حاضر ہوئی اور اب بھی گستاخی سے باز نہیں آئی۔ لیکن دربارِ رسالت میں پہنچ کر آپ کے عفو و درگزر سے اس قدر متاثر ہوئی کہ بے اختیار بول اٹھی یا رسول اللہ سطح زمین پر آپ کے گھرانے سے زیادہ کوئی گھر مجھے مبغوض نہ تھا لیکن آج آپ کے گھرانے سے زیادہ کوئی گھر مجھے محبوب نہیں ہے۔ آپ نے یہ سن کر فرمایا کہ خدا کی قسم ہمارا بھی یہی حال تھا۔[1]

آپ پر ایک یہودی عالم کا قرض تھا۔ اس نے تقاضا کیا تو آپ نے فرمایا اس وقت میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ اس نے کہا میں لے کے ہی ٹلوں گا۔ آپ نے فرمایا تو اب میں تمہارے ساتھ بیٹھا ہوں۔ چنانچہ آپ ظہر سے لے کر فجر تک اس کے ساتھ بیٹھے رہے۔ صحابہ نے اس کی اس گستاخی پر ناراضگی کا اظہار کیا اور خدمتِ اقدس میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ کو ایک یہودی نے روک رکھا ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں لیکن مجھے خدا نے اس سے منع کیا ہے کہ میں کسی ذمی یا اور کسی شخص پر ظلم کروں۔ دن چڑھا تو یہودی نے کلمہ پڑھا اور کہا کہ میرا نصف مال خدا کی راہ میں صدقہ ہے۔ میں نے یہ گستاخی صرف اس لیے کی کہ تورات میں جو پیغمبر کے اوصاف ہیں ان کا تجربہ کر دوں۔[2]

---

[1] صحیح مسلم جلد اول [2] مشکوٰۃ

وسارعوا الی مغفرۃ من ربکم وجنۃ عرضها السماوات والارض۔
اعدت للمتقین الذین ینفقون فی السراء والضراء والکاظمین الغیظ
والعافین عن الناس واللہ یحب المحسنین ۔

اور اپنے پروردگار کی بخشش اور اس جنت کی طرف لپکو جس کا پھیلاؤ اتنا بڑا ہے جیسے آسمان و زمین کا پھیلاؤ، یہی سجائی ان پرہیزگاروں کے لیے تیار ہے جو خوشحالی اور تنگدستی دونوں حالتوں میں خدا کے نام پر خرچ کرتے ہیں اور غصّہ کو روکتے ہیں اور لوگوں کے قصوروں سے درگزر کرتے ہیں۔ اور لوگوں کے ساتھ نیکی کرنے والوں کو اللہ دوست رکھتا ہے

اس آیت میں متقیوں کے دو وصف بتائے ہیں۔ ایک ہر حال میں خدا کی راہ میں دینا۔ اور دوسرا لوگوں کو معاف کرنا اور درگزر کرنا۔ اور ان کے لیے دو جزائیں، ایک خدا کی مغفرت اور دوسری وسیع جنت بیان کی گئی ہیں۔ یہ اندازِ بیان کہہ رہا ہے کہ ہر حال میں خدا کی راہ میں دینے کا معاوضہ تو جنت ہے اور غصّہ کو پینا اور لوگوں کو معاف کرنے کی جزا یہ ہوگی کہ خدا کی مغفرت ان کے شامل حال ہوگی اور اللہ سبحانہٗ ان کو بھی معافی کا پروانہ عطا فرمادے گا۔

عفو و درگزر کی اس تعلیم میں اگر قدرت و طاقت کا حصہ نہ ہو تو وہ سراسر کمزوری ہو کر رہ جائے۔ اسی لیے قرآن نے اس اخلاقی تعلیم کے درس میں اس نکتہ کو فراموش نہیں کیا ہے اور موجودہ انجیل کی اس اخلاقی تعلیم سے کہ اگر ایک شخص کسی کے ایک گال پر چپت مارے تو اس کے سامنے دوسرا گال کر دو جو ذلت اور طبعی پستی پیدا ہوتی ہے اس کی اصلاح ہو جاتی ہے کیونکہ قرآن نے عفو و درگزر کی ایسی معتدل تعلیم دی ہے جس کے ساتھ خودداری کی شان بھی باقی رہتی ہے۔

برائی کا بدلہ برائی جماعت کا قانون ہے اور عفو و درگزر افراد کا اخلاقی کمال ہے۔ جماعتی قانون کی قوت ہوتے ہوئے افراد کا اس میں عفو و درگزر سے کام لینا ایک بلند اخلاقی مثال ہے۔

بہرحال زیرِ تشریح آیت کا مقصد مکارمِ اخلاق کی تعلیم ہے بروایت بخاری عبداللہ بن الزبیر فرماتے ہیں کہ یہ آیت لوگوں کے اخلاق کے متعلق نازل ہوئی۔

ثمامہ ابن اثال یمامہ کا رئیس تھا جو اسلام کا مجرم تھا۔ صحابہ کا ایک دستہ نجد کے اطراف روانہ کیا گیا۔ حسنِ اتفاق سے وہ راستہ میں مل گیا، گرفتار ہو کر مدینہ آیا۔ اور مسجدِ نبوی کے ایک ستون سے باندھ دیا گیا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لیے تشریف لائے تو اس پر نظر پڑی۔ آپؐ نے دریافت کیا کہ ثمامہ تمہارے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے۔ اس نے کہا۔ کہ اگر قتل کرنا چاہیں تو ایک خونی مجرم کو آپ قتل کریں گے اور اگر معاف فرما دیں تو یہ احسان ایک احسان شناس کی گردن پر ہوگا۔ اگر مال کی خواہش ہے تو فرمائیے جو ارشاد ہوگا حاضر کیا جائے گا۔ یہ سُن کر آپ اس کو اسی حالت میں چھوڑ کر چلے گئے۔ دوسرے روز پھر اسی قسم کا سوال و جواب ہُوا۔ تیسرے دن پھر یہی گفتگو ہوئی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خود دستِ مبارک سے اس کے بند گرہ کھولے اور رہا کر دیا۔ اُس پر اس عفو و درگزر کا یہ اثر ہُوا کہ مسجد سے نکل کر ایک کھجور کے درخت کی آڑ میں گیا اور وہاں غسل کیا۔ غسل سے فراغت کے بعد مسجد میں آیا اور کلمہ توحید پڑھ کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔ آپ کے چہرے سے زیادہ زمین پر مجھے کوئی چیز مبغوض نہ تھی لیکن آج وہ مجھ کو سب سے زیادہ محبوب ہے۔ مجھ کو آپ کے دین سے زیادہ کسی دین سے عداوت نہ تھی لیکن آج وہ میرے لیے سب سے زیادہ عزیز ہے مجھے آپ کے شہر سے زیادہ کسی شہر سے عداوت نہ تھی لیکن وہ مجھ کو تمام شہروں سے زیادہ محبوب ہے۔[1]

قرآن کی اس گراں قدر آیت کا یہ اثر صرف آپ کی ذات تک محدود نہ تھا بلکہ صحابہ کی پوری جماعت اس کا عملی نمونہ تھی۔ قرآن کی شہادت ہے کہ صحابہ کرام غصّہ کو پی جاتے اور لوگوں کو معاف کر دیتے تھے۔

والکاظمین الغیظ والعافین عن النّاس

غصّہ کو پی جانے والے اور لوگوں کو معاف کرنے والے

یہ اخلاقی وصف انتہا درجہ کی کشادہ دلی سے پیدا ہوتا ہے اس لیے اللہ سبحانہٗ نے اس کا ذکر ان اخلاقی اوصاف کے ساتھ کیا ہے جو کشادہ دلی سے پیدا ہوتے ہیں اور اس کا صلہ بھی ایسا عطا فرمایا ہے جو انتہا درجہ کی وسعت رکھتا ہے۔ پوری آیت پڑھیے

دعوت کی کامیابی کا گُر

۲۵۸ - اور نیکی کی تلقین کرو اور جاہلوں سے کنارہ کش رہو۔ نصیحت کرنے سے نہ رُکو، معقول بات کہتے رہو اور جاہلوں سے کنارہ کش رہو۔ یعنی ان جہالت آمیز حرکتوں پر روز روز اُلجھنے کی ضرورت نہیں۔ جب وقت آئے گا ذرا سی دیر میں سارا حساب بے باقی ہو جائے گا۔[1]

اگرچہ اندازِ بیان انفرادی ہے لیکن چونکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب بنا کر اُمت کو بتایا گیا ہے اس لیے اجتماعی ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ اُمت کے افراد پر پوری انسانیت کی نگرانی بقدرِ قوت فرض ہے۔ دو چیزیں ہیں اور دونوں الگ ہیں۔ ایک یہ کہ جماعت کے افراد پر ان کی قوت کے بقدر جماعت ہی کے دوسرے افراد کی نگرانی فرض ہے۔ اس اخلاقی فرض کا نام امر بالمعروف ہے دوسرے یہ کہ اُمت کے افراد پر پوری انسانیت کی نگرانی فرض ہے۔ اس آیت میں دوسری بات کا ذکر ہے۔ یہ وہ تعلیم ہے جو تمام دُنیا کے مذاہب میں اسلام کی اخلاقی نگرانی کے اُصول کو نمایاں کرتی ہے۔ اور اُمتِ اسلامیہ کا یہ فرض قرار دیتی ہے کہ پوری انسانی زندگی کے مزاج اور قوام کی نگہبانی اور اس کے بگاڑ کی دیکھ بھال کرے اسی کا نام دعوت الی اللہ ہے۔ تورات میں قابیل کا یہ فقرہ کہ "کیا میں اپنے بھائی کا رکھوالا ہوں"، عیسائی مذہب کا ایک اخلاقی اصول بن گیا ہے۔ اسی اخلاقی اصول نے اس قانونی مسئلہ کی صورت اختیار کر لی ہے جس کا نام شخصی آزادی ہے۔ لیکن قرآن کے قانون میں اس کے برخلاف واقعی ہر مسلمان کو انسان کا رکھوالا بنایا گیا ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ تم میں ہر شخص نگران ہے اور ہر شخص سے اس کی نگرانی کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو معروف یعنی ان سیدھی اور صاف بھلائیوں کی تلقین کی جائے جنہیں سارے انسان بالعموم بھلا اور اچھا جانتے ہیں یا جن کی اچھائی کو سمجھنے کے لیے وہ عقل عام کافی ہوتی ہے جو ہر انسان کو حاصل ہے۔ اس طرح داعی حق کی دعوت

[1] حاشیہ شیخ الہند

عام اور خاص سب کو متاثر کرتی ہے اور ہر سامع کے کان سے دل تک پہنچنے کی راہ آپ نکال لیتی ہے۔ ایسی معروف دعوت کے خلاف جو لوگ شورش برپا کرتے ہیں وہ خود اپنی ناکامی اور اس دعوت کی کامیابی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ کیونکہ عام انسان خواہ وہ کیسے ہی تعصبات کا شکار ہوں۔ جب یہ دیکھتے ہیں کہ ایک طرف ایک شریف النفس اور بلند اخلاق انسان ہے جو سیدھی سیدھی بھلائیوں کی دعوت دیتا ہے۔ اور دوسری طرف بہت سے لوگ اس کی مخالفت میں ہر قسم کی اخلاق و انسانیت سے گری ہوئی تدبیریں استعمال کر دیتے ہیں۔ تو آہستہ آہستہ ان کے دل خود بخود مخالفین حق سے پھرتے اور داعیٔ حق کی طرف متوجہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ آخر کار میدانِ مقابلہ میں صرف وہ لوگ رہ جاتے ہیں۔ جن کے ذاتی مفاد نظامِ باطل سے ہی وابستہ رہتے ہیں۔ یا جن کے دلوں میں تقلید قوم اور جاہلانہ تعصبات نے کسی روشنی کو قبول کرنے کی صلاحیت باقی ہی نہ چھوڑی ہو۔ یہی وہ حکمت ہے جس کی بدولت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو کامیابی حاصل ہوئی۔

اس آیت میں دوسری بات یہ ارشاد ہوئی ہے کہ جاہلوں سے کنارہ کش رہو۔ جاہل سے مراد یہاں بیوقوف اور احمق ہیں بے خبر اور بے علم نہیں ہیں۔ بیوقوف اور نادان بات بات میں اُلجھتے ہیں۔ اور دعوت کی زندگی میں اُلجھاؤ دعوت کے لیے موت کا سامان ہے۔ زندگی یہ ہے کہ اگر مخاطبوں کی جانب سے زیادتیاں ہوں تو ان کے ساتھ خیر خواہی اور ہمدردی کا معاملہ کریں اور نرمی کے ساتھ ان کو راہِ حق بتائیں۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ کنارہ کش ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان کی برائی کا جواب برائی سے نہ دیں یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کو راہِ حق بتانا چھوڑ دیں۔ کیونکہ دعوت کے کام میں یہ بات ضروری ہے کہ طالبینِ خیر کو معروف کی تلقین کی جاتی ہے وہاں یہ بات ضروری ہے کہ داعی جاہلوں کے منہ نہ آئے۔ منہ نہ آنے کی قاضی بیضاوی نے دو صورتیں بتائی ہیں۔ ایک مماراۃ دوسرے مکافاۃ۔ مماراۃ یہ کہ اس سے اُلجھ جائے اور مکافات یہ کہ ویسی جوابی کارروائی کی جائے اور خواہ وہ اُلجھنے اور اُلجھانے کی کتنی ہی کوشش کریں۔ داعی کو اس معاملہ میں بہت محتاط ہونا چاہیئے کیونکہ اس کا خطاب صرف ان لوگوں سے ہے جو معقولیت کے ساتھ بات کو سمجھنے کے لیے تیار ہوں۔ اور جب کوئی شخص جہالت پر اُتر آتے اور حجت بازی، جھگڑالو پن اور طعن و تشنیع شروع کر دے تو داعی کو اس کا حریف بننے سے انکار کرنا چاہیئے اس لیے کہ اس جھگڑے میں

اُلجھنے کا حاصل کچھ نہیں ہے اور نقصان یہ ہے کہ داعی کی جس قوت کو اشاعت دعوت اور اصلاح نفوس میں خرچ ہونی چاہیے وہ اس فضول کام میں ضائع ہوتی ہے۔

کچھ علماء نے اس آیت کی جامعیت کو بہت سراہا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہر نیکی اس کے دامن میں ہے اور ہر فضیلت کی یہ شارح ہے۔ خذ العفو میں لین دین اور معاملات میں نرمی اختیار کرنے کی اگر تلقین ہے تو امر بالمعروف ماموررات اور محرمات کو اپنی گود میں لیے ہوئے ہے اعرض عن الجاھلین کے ذریعے درگزر کی تعلیم ہے۔

جو بات یہاں مشرکین کے بارے میں ارشاد ہوئی ہے کہ طالبین کو معروف کی تلقین کرو اور ان میں بیوقوف لوگ اگر حماقت سے در پیش آئیں تو ان میں اُلجھ کر یا ان کی جوابی کارروائی میں وقت ضائع نہ کرو بلکہ ان سے کنارہ کش اختیار کرلو۔ یہی بات ان منافقین کے بارے میں بھی کہی گئی ہے جو زندگی میں پورا اسلام نافذ نہیں کرنا چاہتے بلکہ اسلام کو حالات مفادات اور وقت کے تقاضوں کے مطابق اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ ارشاد ہے:

اولئک الذین یعلم اللہ ما فی قلوبھم فاعرض عنھم و عظھم و قل لھم فی انفسھم قولا بلیغا۔"

ان لوگوں کے دلوں کے اندر جو کچھ ہے اللہ اس سے خوب واقف ہے تو ان سے اعراض کرو، ان کو نصیحت کرو اور تم ان کو ایسی نصیحت کرو کہ ان کے دلوں میں اُتر جائے۔

دونوں آیتوں کا مفاد ایک ہے کہ معروف کی تلقین اور وعظ و نصیحت کسی حال میں نہ چھوڑا جائے اور بات کو دعوت کی حد تک خوب سمجھا دیا جائے لیکن ان میں اگر کوئی نادانی پر اُتر آئے تو اس کی ترائز خائیوں سے اعراض کرنا چاہیے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ نرمی نرم خوئی تبلیغ کی کامیابی کی پہلی شرط ہے اور اسی لیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمتِ الٰہی نے خاص طور پر اس کا حصہ وافر عطا فرمایا تھا فبما رحمۃ من اللہ لنت لھم۔

اس لیے ایک پیغمبر کے لیے یہ وصف نہایت اہم ہے تاکہ لوگوں کو اس کی تعلیم و دعوت کی طرف میلان ہو اور وہ اس کے حلقہ اطاعت سے باہر نہ ہونے پائیں اور اسی لیے رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک میں یہ وصف سب سے زیادہ نمایاں طور پر

ودیعت کیا گیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر اس کو اپنی رحمت کا نتیجہ قرار دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ حلم و بُردباری، عفو و درگزر، چشم پوشی اور خوش خلقی غرض ان تمام اخلاق کے عطر کا نام ہے جن میں شانِ جمالی پائی جاتی ہے۔ یہی رفق و تلطف اور نرم دلی و نرم خوئی ہے۔ جس طرح حسنِ فطرت زینت و آرائش سے دوبالا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح رفق و نرمی کی خو سے انسان کا اخلاقی حسن دو چند ہو جاتا ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی حقیقت حضرت عائشہ کو ان لفظوں میں سمجھائی تھی۔

نرمی جس چیز میں ہو اس کو زینت دیتی ہے اور جس چیز سے الگ کر لی جاتی ہے اس کو بدنما بنا دیتی ہے۔

جس چیز کا لفظ کتنا عام ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر چیز میں نرمی کام کو بناتی ہے اور سختی بگاڑتی ہے۔ ہاں اگر قانون یا جماعت کی مصلحت سختی کا تقاضا کرتی ہو تو پھر سختی کی جاتے۔ قانون جس سختی کا مطالبہ کرتا ہے اس کا موقعہ وہ ہے جب کوئی شخص حدود الٰہی میں سے کسی حد کو توڑے یا جماعت کو نقصان پہنچانے کے درپے ہو۔ چنانچہ کفار و منافقین جب سمجھانے سے نہ سمجھیں اور اپنی ضد پر اڑے رہیں بلکہ مسلمانوں کو آزار پہنچانے کے درپے ہوں تو اُن کے شر کو روکنے کے لیے ان پر پوری سختی کی جا سکتی ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مکارمِ اخلاق کے بارے میں جو بیان حضرت عائشہؓ سے مروی ہے اس میں بھی نرمی اور سختی کے مواقع میں یہی امتیاز کی حد قائم کی گئی ہے۔ اُم المومنین فرماتی ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ذاتی معاملہ میں کبھی کسی سے بدلہ نہیں لیا البتہ جب احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی کی جاتی تو آپ اس کو سزا دیتے تھے۔ امام بخاری نے ایک خاص باب میں اس قسم کی متعدد حدیثیں جمع کی ہیں جن میں آپؐ نے مسلمانوں بلکہ ازواجِ مطہرات تک پر کسی کسی بات میں سختی ہوئی ہے۔ حافظ ابن حجر اس باب کی شرح میں لکھتے ہیں:

گویا امام بخاری اس باب میں یہ اشارا کرتے ہیں کہ جس حدیث میں یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تکلیفوں پر صبر کرتے تھے وہ آپ کے ذاتی حق سے متعلق ہیں، لیکن خدا کے حق میں آپؐ اس سختی سے کام لیتے تھے جس کا خدا نے حکم دیا تھا۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اُن صحابہ کو جنہیں آپ دین کی خدمت کے لیے

روانہ کرتے تھے۔ فرماتے تھے یسرا ولا تعسرا آسانی کرو سختی نہ کرو۔ جہاں اس کا یہ مطلب ہے کہ بیگانوں میں دین کی دعوت لے کر جاؤ۔ تم ان کے لیے سہولت کا سامان بنو نہ کہ تنگی و سختی کا، ایسے ہی یہ مطلب بھی ہے کہ یگانوں میں جب یہ کام کرو تو نوافل اور مستحباب میں سختی نہ کرو اور شریعت نے جس حد تک گنجائش رکھی ہے اس میں تنگی نہ کرو۔

راہِ حق میں وسوسوں کا مداوا

۲۵۹ - اور اگر کبھی شیطان کی جانب سے کوئی خلش محسوس ہو تو اللہ کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔ بلاشبہ اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ یعنی اگر کسی وقت بتقاضائے بشریت ان کی کسی نالائق حرکت پر غصہ آجائے اور شیطان لعین چاہے کہ دُور سے چھیڑ چھاڑ کر کے آپ کو ایسے معاملہ پر آمادہ کرے جو خلافِ مصلحت ہو یا آپؐ کے خُلقِ عظیم اور علم و متانت کے شایان نہ ہو تو آپ فوراً اللہ سے پناہ طلب کیجئے آپ کی عصمت و وجاہت کے سامنے اس کا کوئی کید نہیں چل سکے گا۔ کیونکہ خداوند قدیر جو ہر مستعیذ کی بات سننے والا ہے اور ہر حالت کا جاننے والا ہے۔ اسی نے آپ کی صیانت کا تکفل فرمایا ہے[1]

آیت میں نزغ آیا ہے۔ اس کے معنے چرکا لگانا، کچوکا لگانا، زخم لگانا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ان شیاطین جن و انس کی ہرزہ سرائیوں اور خاکبازیوں سے دل کو کوئی صدمہ پہنچے تو اپنے رب کی پناہ ڈھونڈو یعنی جب کبھی داعیٔ حق مخالفین کے ظلم اور ان کی شرارتوں اور ان کے جاہلانہ اعتراضوں اور الزاموں پر اپنی طبیعت میں اشتعال محسوس کرے تو اسے فوراً سمجھ لینا چاہیے کہ یہ شیطانی وسوسہ ہے اور اسی وقت خدا کے ساتھ پناہ مانگنی چاہیے کہ اپنے بندے کو اس جوش میں بہ نکلنے سے بچائے اور ایسا بے قابو نہ ہونے دے کہ اس سے دعوتِ حق کو نقصان پہنچانے والی کوئی حرکت سرزد ہو جائے۔ دعوتِ حق کا کام بہرحال ٹھنڈے دل سے ہی ہو سکتا ہے اور وہی قدم صحیح اُٹھ سکتا ہے جو جذبات سے مغلوب ہو کر نہیں بلکہ موقع و محل کو دیکھ کر خوب سوچ سمجھ کر اٹھایا جائے لیکن شیطان جو اس کام کو فروغ پاتے کبھی نہیں دیکھ سکتا ہمیشہ اس کوشش میں لگا رہتا ہے کہ اپنے بھائی بندوں سے

---

[1] حاشیہ شیخ الاسلام

داعی حق پر حملے کراتے اور پھر ہر حملے پر داعی حق کو اُکساتے کہ اس حملے کا جواب تو ضرور ہونا چاہیے۔ یہ اپیل جو شیطان داعی کے نفس سے کرتا ہے۔ اکثر بڑی بڑی پُر فریب تاویلوں اور خالص دینی اصطلاحوں کے غلافوں میں لپٹا ہوا ہوتا ہے لیکن اس کی تہ میں بجز نفسانیت کے اور کوئی چیز نہیں ہوتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اگر مخالفوں کے عناد ناموافق حالات کے ہجوم اور اپنی بے چارگی و بے نوائی کے تصور سے مایوس کن خیالات پیدا ہونے لگیں تو سمجھ جاؤ یہ شیطانی وسوسہ ہے اور اللہ کی یاد سے اس کا علاج کرو۔ آیت کے مخاطب اگر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تو شیطانی وساوس سے آپ کی ذات مقام عصمت کی وجہ سے بالا ہے اس کے شارحین قرآن نے دو جواب دیے ہیں۔ ایک یہ کہ حضورؐ کو واسطہ بنا کر اُمت مخاطب ہے دوسرے یہ کہ انداز بیان فرض و تقدیر کی صورت میں ہے یعنی اگر بالفرض ایسا ہو جائے تو پھر علاج یہ ہے۔ لیکن اگر شیطان سے شیطان انس مراد ہو تو پھر مطلب بالکل واضح ہے کہ حالات کی ناسازگاری اور دشمنوں کی کھلی ریشہ دوانیوں سے یہ خیالات آنے لگیں کہ مصائب کے اس ہجوم اور واقعات کے اس نرغے میں کامیابی کیسے ہوگی تو ایسے موقعہ پہ یادِ الٰہی سے کام لیجئے اور سمجھ لیجئے کہ یہ شیطان کا وسوسہ ہے۔

اس ارشادِ گرامی سے اشارا پا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، کہ غصہ شیطان سے ہے اور شیطان آگ سے بنا ہے اور آگ کو پانی ٹھنڈا کرتا ہے تو جس کو غصہ آئے اس کو چاہیے وضو کرے۔ حضرت ابوذر غفاری کہتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جس کو غصہ آئے وہ اگر کھڑا ہے تو چاہیے کہ بیٹھ جائے اور اگر اس سے کم نہ ہو تو چاہیے کہ لیٹ جائے۔

صحیحین میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دو شخصوں نے کچھ باتیں کیں۔ ان میں سے ایک صاحب کو اتنا غصہ آیا کہ چہرہ غصہ سے لال ہو گیا اور رگیں پھول گئیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف دیکھ کر فرمایا مجھے ایک ایسا کلمہ معلوم ہے کہ اگر وہ کہہ لے تو یہ غصہ جاتا رہے اور وہ کلمہ یہ ہے، اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم یہ بھی اسی آیت کریمہ کا مدلول ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے غصہ کے تین علاج بتائے ہیں، ایک روحانی اور دو ظاہری۔ روحانی تو وہ ہے جس کا ذکر قرآن کی اس آیت میں ہے فاستعذ باللہ یعنی جب

غصہ آئے تو فوراً دعا کرنی چاہیے کہ خداوندا میں شیطان سے بھاگ کر تیری پناہ چاہتا ہوں ۔ اعوذ باللہ الخ کا مطلب یہی ہے اللہ سبحانہ اس کی دعا کو شرفِ قبول عطا کرے گا۔ ظاہری طور سے بھی دیکھئے کہ جب کسی مسلمان کو دل سے یقین ہو گا کہ غصہ شیطانی حرکت ہے ۔ تو خدا کا نام لینے کے ساتھ وہ اس سے دور ہو جائے گا ۔

دو ظاہری علاجوں میں سے ایک تو یہ ہے کہ انسان کھڑا ہو تو بیٹھ جائے اور بیٹھا ہو تو لیٹ جائے۔ مقصود اس سے یہ ہے کہ تبدیل ہیئت سے طبیعت ہٹ جائے گی اور غصہ کم ہو جائے گا۔ اور کچھ علماء نے لکھا ہے کہ آدمی خاک سے پیدا ہوا ہے اور شیطان آگ سے ۔ آدمی جتنا خاک سے قریب ہو گا آگ کا اثر دور ہو جائے گا ۔ دوسرا علاج یہ ہے کہ وضو کرے ۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ غصہ کی حالت میں گرمی سے خون کا دوران بڑھ جاتا ہے، آنکھیں لال ہو جاتی ہیں، چہرہ سرخ ہو جاتا ہے تو پانی پڑنے سے مزاج میں ٹھنڈک آئے گی اور غصہ کی گرمی دور ہو جائے گی ۔ اور علماء نے یہ بھی بتایا ہے کہ وضو عبادت ہے اور شیطان کو عبادت سے نفرت ہے ۔ انسان میں شانِ عبدیت آتی ہے تو شیطانی اثر زائل ہو جاتا ہے ۔

تقویٰ سے انسانی ضمیر کی بیداری

۲۰۱ ۔ بلا شبہ جو لوگ متقی ہیں اگر انہیں کبھی شیطانی خیال آ بھی جاتا ہے تو فوراً چونک جاتے ہیں ۔ اور پھر اچانک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں ۔ پہلے تو تنہا حضورؐ کو خطاب تھا۔ گو حکم استعاذہ میں سب شامل تھے ۔ اب عام متقین کا حال بیان فرماتے ہیں ۔ یعنی عام متقین کے حق میں یہ محال نہیں ہے کہ شیطان کا گزر ان کی طرف ہو اور کوئی چرکہ لگا جائے، البتہ متقین کی شان یہ ہوتی ہے کہ شیطان کے اغواء سے ممتد غفلت میں نہیں پڑتے بلکہ ذرا غفلت ہوئی اور خدا کو یاد کر کے چونک پڑے ۔ ٹھوکر لگی اور یکدم سنبھل گئے ۔ سنبھلتے ہی آنکھیں کھل گئیں ۔ غفلت کا پردہ اٹھ گیا ۔ نیکی بدی کا انجام سامنے آنے لگا اور بہت جلد ناز یبا کام سے رک گئے[1] مطلب یہ ہے کہ جو لوگ جہالت کے بجائے تقویٰ کی روش اختیار کرتے ہیں جب کبھی ان کو جاہلوں کی جہالت اور شیاطین کی شیطنت کا کوئی جھٹکا لگتا ہے تو وہ اپنے رب کو یاد کرتے ہیں جس سے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

فوراً ان کا باطن روشن ہو جاتا ہے اور اشرار و معاندین کی ساری خاکبازی کے باوجود ان کی راہ ان کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے پاتی۔ یہ گویا اس استعاذے کا طریقہ اور فائدہ بتایا گیا جس کی اوپر والی آیت میں ہدایت ہوئی ہے کہ خدا کی پناہ میں داخل ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے رب کو یاد کرے۔ یہ چیز دل کے اندر ایسی بصیرت اور ایسی قوت و ہمت پیدا کر دے گی کہ دفعتہً آنکھوں کے سامنے کا سارا غبار چھٹ جائے گا۔

آیتِ قرآنی یہ بتا رہی ہے کہ اربابِ تقویٰ اپنے نفس میں کسی شیطانی تحریک کا اثر اور کسی بُرے خیال کی کھٹک محسوس کرتے ہی فوراً چوکنے ہو جاتے ہیں اور پھر انہیں صاف نظر آ جاتا ہے کہ اس موقعہ پر دعوتِ دین کا مفاد کس طرزِ عمل میں ہے اور حق پرستی کا تقاضا کیا ہے۔

بہر حال وساوس و خطرات سب کو گذرتے ہیں لیکن جو لوگ تقویٰ کی دولت سے مالا مال ہیں ان کا ضمیر تقویٰ کی وجہ سے ایسا بیدار ہو جاتا ہے کہ جونہی کوئی وسوسہ گذرا یکدم چونک اُٹھے اور راستی و نیکی کی روشنی نمودار ہو گئی۔

یہاں حضرت تھانوی قدس اللہ سرہٗ العزیز کا مسائل السلوک میں استنباط بڑا ہی لطیف ہے کہ آیت میں اشارہ ہے کہ وسوسہ کاملین کو بھی ہو سکتا ہے اور یہ ان کے کمال کے منافی نہیں ہے۔ چونکہ کاملین میں اس کا امکان ہے۔ اسی لئے آیت میں اس کا علاج بتایا گیا ہے۔

شیاطین کے بھائی کون ہیں؟

۲۶۱- باقی رہے شیطان کے بھائی تو وہ ان کو گمراہی میں کھینچے لئے جاتے ہیں۔ اور پھر اس میں ذرا بھی کمی نہیں کرتے ہیں۔ یعنی غیر متقین جن کے دل میں خدا کا ڈر نہ ہو اور جنہیں شیطان کی برادری کہنا چاہیئے اُن کا حال یہ ہے کہ شیاطین ہمیشہ ان کو گمراہی میں کھینچے چلے جاتے ہیں اور رگیدنے میں ذرا کمی نہیں کرتے۔ ادھر یہ لوگ ان کی اقتدار و پیروی میں کوتاہی نہیں کرتے اور اس طرح ان شیاطین کے غرور و سرکشی کو اور زیادہ بڑھاتے رہتے ہیں۔ بہر حال متقی کی شان یہ ہے کہ شیطان دق کرے تو فوراً اللہ کی پناہ لے دیر نہ کرے ورنہ غفلت میں تمادی ہو کر رجوع الی اللہ کی توفیق ہی نہ رہے گی[1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

مطلب یہ ہے کہ حق کے کاموں میں نفسانیت ہوتی ہے اور اس وجہ سے ان کا شیاطین سے بھائی چارہ ہوتا ہے تو ایسے لوگ شیطانی تحریک کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور اس سے مغلوب ہو کر غلط راہوں پر چل دیتے ہیں۔ پھر جہاں شیطان چاہتا ہے ان کو لے جاتا ہے۔ اور کبھی بھی ان کے قدم نہیں رکتے، گالی کا جواب گالی سے دیتے ہیں۔ اخوان الشیاطین سے ان جاہلین کے وہ ساتھی مراد ہیں جن کے اشاروں پر یہ کام کرتے ہیں خواہ وہ شیاطین انس ہوں یا شیاطین جن فرمایا کہ اہل ایمان کو تو خدا کی یاد سنبھال لیتی ہے لیکن جاہلین کو ان کے شیاطین گمراہی کی وادیوں میں بھٹکاتے بھٹکاتے آخری منزل پر پہنچا دیتے ہیں۔ ذرہ بھی کسر نہیں اٹھا رکھتے کہ بازگشت کا کوئی امکان باقی رہے۔ حافظ ابن کثیرؒ نے شیاطین الانس کو اولیت دی ہے اور مطلب یہ بتایا ہے کہ شیاطین الانس ہیں جو ان کے بھائی بند ہیں جن کے اوامر کی یہ لوگ پابجائی کر رہے ہیں وہ ان کی مدد کرتے ہیں۔

آیت میں دراصل یہ قانون بتایا گیا ہے کہ شیاطین کا بھائی چارہ ان ہی لوگوں سے ہوتا ہے جو ایمان سے خالی ہوتے ہیں۔ یعنی شیطان کو برادرانہ تعلقات قائم کرنے کا وہاں موقعہ ملتا ہے جہاں ایمان کا فقدان ہوتا ہے بے ایمانی اور کفر میں شیطان کی اخوت قبول کرنے کی پوری پوری صلاحیت ہوتی ہے۔ اس کی مثال مادی دنیا میں یہ ہے کہ جراثیم کا اثر بیماریوں کے لئے وہ جسم قبول کرتے ہیں جن میں اثر قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے جو ان اسباب سے نہیں بچتے جو بیماریاں پھیلاتے ہیں ایسے ہی شیاطین ان ہی روحوں پر دسترس رکھتے ہیں جو ایمان سے کورے ہوتے ہیں۔ ایمان سے کورے ہونے کا یہ مطلب ہے کہ انبیاء کی رہنمائی قبول نہیں کرتے اور خدا پر یقین نہیں رکھتے۔ شیاطین کی دستبرد سے محفوظ رہنے کی واحد تدبیر یہ ہے کہ نبوت کی رہنمائی قبول کی جائے اور زندگی میں اس کی پیروی کی جائے۔

یہ قانون سب کے لیے ہے، دولت مند ہوں یا غریب، حاکم ہوں یا محکوم۔ اس جرم کا ارتکاب اگر عام شہریوں کی جانب سے ہوگا تو اس قدرتی تازیانے سے وہ بھی ایسے ہی محفوظ نہ ہوں گے جیسے حکمراں۔ ان دو آیتوں پر غور کیا جائے تو یہ بات صاف معلوم ہو رہی ہے کہ جو لوگ اس دنیا میں متقیانہ زندگی بسر کرتے ہیں ان کی زندگی ان لوگوں سے قطعاً مختلف ہوتی ہے۔ جن میں تقویٰ نہیں ہوتا۔ جو لوگ فی الواقع خدا سے ڈرتے ہیں اور دل سے چاہتے ہیں کہ

بُرائی سے بچیں، ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ بُرے خیال کا ایک ذرا سا غبار بھی اگر اُن کے دل کو چھو جاتا ہے تو انہیں ویسی ہی کھٹک محسوس ہوتی ہے جیسی کھٹک انگلی میں پھانس چُبھ جانے سے ہوتی ہے۔ چونکہ وہ بُرے خیالات، بُری خواہشات اور بُری نیتوں کے خوگر نہیں ہوتے اس وجہ سے یہ چیزیں ان کے لیے اسی طرح خلافِ مزاج ہوتی ہیں جس طرح انگلی کے لیے پھانس یا آنکھ کے لیے ذرّہ یا ایک نفیس طبع اور صفائی پسند آدمی کے لیے کپڑوں پر سیاہی کا ایک داغ یا گندگی کی ایک چھینٹ۔ پھر جب یہ کھٹک انہیں محسوس ہو جاتی ہے تو ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ اور ان کا ضمیر بیدار ہو کر اس غبارِ شر کو اپنے اوپر سے ہٹانے میں لگ جاتا ہے بخلاف اس کے جو لوگ نہ خدا سے ڈرتے ہیں نہ بدی سے بچنا چاہتے ہیں اور جن کی شیطان سے لاگ لگی ہوئی ہے اور ان کے نفس میں بُرے بُرے خیالات بُرے ارادے بُرے مقاصد پکتے رہتے ہیں اور وہ ان گندی چیزوں سے کوئی اجنبیت اپنے اندر محسوس نہیں کرتے۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی دیگچی میں سؤر کا گوشت پک رہا ہو اور وہ بے خبر ہو کر اس کے اندر کیا پک رہا ہے یا جیسے کسی بھنگی کا جسم اور اس کے کپڑے غلاظت میں لتھڑے ہوئے ہوں اور کچھ احساس نہ ہو کہ وہ کن چیزوں میں آلودہ ہے[1]

---

[1] تفہیم القرآن

وَاِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا ۭ قُلْ اِنَّمَآ
اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ ۚ هٰذَا بَصَاۗىِٕرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَ
هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝٢٠٣ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ
فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝٢٠٤ وَاذْكُرْ
رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ
بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ۝٢٠٥ اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ
رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ ۝٢٠٦ السجدة ع ۱۸

اور اے اللہ کے رسول جب تم ان کے سامنے کوئی معجزہ نہیں
پیش کرتے ہو تو وہ کہتے ہیں کیوں نہیں چن کر لایا تو نشانی۔ ۲۶۲
آپ فرما دیجئے حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ میرا کام
تو صرف اس وحی کی پیروی کرنا ہے جو میرے رب کی جانب
سے مجھ پر آتی ہے ۔ ۲۶۳ یہ قرآن تمہارے رب کی جانب سے

ایمان والوں کے لیے بصیرت کی باتیں ہیں اور ہدایت و رحمت ہے۔[۲۶۴] اور مسلمانو! جب قرآن پڑھا جائے تو کان لگا کر سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے[۲۶۵]۔ اور اے پیغمبر یاد کرتا رہ اپنے جی میں اپنے رب کو گڑگڑا کر اور ڈر کر اور زبان سے بھی آہستہ آہستہ بغیر آواز بلند کئے صبح اور شام اور مت ہو غفلت والوں میں سے، بلاشبہ جن لوگوں کو اللہ کا قرب حاصل ہے وہ اس کی بندگی سے بڑائی نہیں کرتے اور وہ اس کی تسبیح میں لگے رہتے ہیں اور اسی کے حضور سجدہ کرتے رہتے ہیں۔[۲۶۶]

مفردات کے معانی

اجتبیت۔ اجتبار سے ماضی کا واحد مذکر حاضر ہے۔ اس کا مادہ جبی ہے۔ اس کے لغت میں اصل معنے مجموعہ میں سے کسی چیز کا انتخاب کر لینا اور چھانٹ لینا ہے۔ لیکن یہاں اس کے معنے گھڑنے اور بنانے کے ہیں۔ یہ بات مخالفوں نے آپ سے بطور طنز کہی تھی۔

بصائر بصیرۃ کی جمع ہے۔ بینائی، سمجھ، دلیل، بصیرۃ کا استعمال صرف اور صرف دل کی بینائی کے متعلق ہوتا ہے۔ آنکھ سے دیکھنے کو بصیرۃ نہیں کہتے۔ بصیرۃ کے مختلف معنے آتے ہیں عقل سمجھ، عبرت، دلیل اور حجت۔

رَحْمَۃٌ: بخشش، مہربانی رَحِمَ یرحم کا مصدر ہے۔ امام راغب لکھتے ہیں رحمت وہ رقت ہے جو مرحوم کی طرف احسان کی مقتضی ہو۔ کبھی اس کا استعمال محض رقت کے معنے میں ہوتا ہے اور کبھی صرف احسان کے معنے میں جو رقت سے خالی ہو جیسے رحم اللہ فلاناً، جب یہ اللہ سبحانہٗ کی صفت ہو گی تو صرف احسان مراد ہو گا رقت مراد نہ ہو گی۔ اس لئے رحمت رقت اور احسان دو معنوں پر مشتمل ہے۔ رقت کو طبائع انسانی میں جگہ ملی ہے اور احسان اللہ سبحانہٗ کی صفت ہوئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اردو میں رحمت کی بہترین تشریح کی ہے فرماتے ہیں عربی میں رحمت عواطف کی ایسی رقت کو کہتے ہیں، جس سے کسی دوسری ہستی کے لیے احسان و شفقت کا ارادہ جوش میں آجائے پس رحمت میں محبت، شفقت، فضل و احسان سب کا مفہوم داخل ہے اور محبت و محبت لطف اور فضل سے زیادہ وسیع ہے[1]

اِسْتَمِعُوْا: استماع سے امر ہے مادہ سمع ہے۔ سمع کے معنے سننا اور استماع کے معنے کان دھرنا اور توجہ کرنا ہے۔ قرأت سُنی جائے یا نہ سُنی جائے اس کی طرف توجہ کرے۔ امام نووی لکھتے ہیں الاستماع الاصغاء یعنی توجہ کرنا اور کان دھرنا۔ رازی لکھتے ہیں اسماع غیرہ والاستماع غیر سماع اور چیز ہے اور استماع اور۔ نواب صدیق حسن خاں بھوپالی رحمۃ اللہ نے اس فرق کو پیشِ نظر رکھ کر بدور الاہلہ میں یہ لطیف نکتہ آفرینی کی ہے کہ:

معتبر استماع است نہ سماع پس ہر کہ بانتہاء وقوف واقف شد ولمی شنود یا رحم باصوت خطیب صفی است و مے ہم چو سامع است۔

اَنْصِتُوْا: انصات سے امر بنا ہے۔ صراح قاموس میں اس کے معنے سکوت یعنی خاموش ہونا بتاتے ہیں۔ نووی نے شرح مسلم میں انصات کے معنے سکوت بتائے ہیں۔ امام بیہقی کتاب القراۃ میں لکھتے ہیں اذ لا فرق بین السکوت والا نصات عند العرب اہل عرب کے یہاں سکوت اور انصات میں کوئی فرق نہیں ہے۔ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ جب حضرت جبریل علیہ السلام وحی لے کر آتے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن پڑھاتے تو آپ بھی ہمیشہ آہستہ آہستہ ساتھ پڑھتے جاتے کہ مبادا حضرت جبریل علیہ السلام کے تشریف لے جانے کے بعد میں بھول نہ جاؤں

---

[1] ترجمان القرآن

اور کان بحرکت شفیتہ آپ آہستہ آہستہ ہونٹ ہلاتے جاتے مگر اللہ تعالیٰ نے حکم نازل کیا،
لا تحرک بہ لسانک آپ اپنی زبان کو حرکت نہ دیں فاستمع لہ، وانصت آپ توجہ کریں
اور مکمل خاموشی اختیار کریں۔ اس سے معلوم ہوا کہ سامع کے لیے آہستہ پڑھنا، زبان کو حرکت
دینا اور ہونٹ ہلانا استماع اور انصات کے بالکل منافی ہے۔

فی نفسک ۔ اس کے تین معنے آتے ہیں۔ یہاں ذکر کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ایک تدبر
اور غور کرنا دوسرے اکیلے یاد کرنا، تیسرے آہستہ یاد کرنا۔ یہ تینوں معنے ائمہ لغت اور
شارحین قرآن سے منقول ہیں۔ تفصیل انشاء اللہ تشریح میں آئے گی۔

تضرع ، یہ لفظ عربی میں ضراعت سے بنا ہے جس کے معنے کمزور ہونا، ذلیل ہونا آتے
ہیں۔ تضرع کے معنے ذلیل ہونا، گڑگڑانا ہے۔ بزدل مرد کو بھی ضرع کہا جاتا ہے۔

خیفۃ ، خوف، ڈر، خاف یخاف کا مصدر ہے۔ راغب لکھتے ہیں خیفہ اس حالت کا
نام ہے جو انسان کو خوف کی حالت میں ہوتی ہے۔

دعوت میں شیطانی رخنہ

پہلے یہ بتایا گیا تھا کہ جب کبھی حق کا داعی مخالفین کے ظلم اور ان کی شرارتوں سے اپنی
طبیعت میں اشتعال محسوس کرے تو اسے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ شیطانی حملہ ہے اور اسی
وقت اللہ کو اپنا ملجا اور معاذ بنانا چاہیے کیونکہ شیطان اس کام کو فروغ پاتے ہوئے کبھی
دیکھ نہیں سکتا وہ ہمیشہ اس کوشش میں لگا رہتا ہے کہ اپنے بھائی بندوں سے داعی حق
پر طرح طرح کے حملے کرائے اور پھر ہر حملے پر داعی حق کو اکسائے کہ اس حملے کا جواب تو ضرور
ہونا چاہیے۔ یہ اپیل جو شیطان داعی کے نفس سے کرتا ہے اکثر بڑی بڑی پُر فریب ناویل اور
مذہبی اصطلاح کے غلاف میں لپیٹ کر کرتا ہے لیکن اس کی تہ میں نفسانیت کے سوا کچھ نہیں
ہوتا۔ یہ فرمانے کے بعد اب اس کو ایک مثال سے سمجھایا جا رہا ہے کہ یہ شیاطین کس انداز
سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو پریشان کرتے ہیں بروایت ابن کثیر حضور کے مخاطبوں
میں کچھ ایسے خبیث کافر بھی تھے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے مقابلے کے لیے تیار
ہو جاتے اور اپنی کج بحثی سے حضورؐ کو پریشان کرتے اور قسم قسم کی باتیں بناتے۔

۲۶۲- اور اے اللہ کے رسُول جب تم ان کے سامنے کوئی معجزہ نہیں پیش کرتے ہو تو وہ کہتے ہیں کیوں نہیں چن کر تو نشانی ۔ یعنی جب کبھی وحی کے آنے میں تاخیر ہوتی تو کفار ازراہِ تمسخر کہتے تھے کہ اب کوئی آیت کیوں گھڑ کر نہیں لے آتے آخر سارا قرآن تم نے بنایا ہی ہے ۔ العیاذ باللہ۔ اسی طرح کبھی پریشان کرنے کی لیے بعض ایسے معجزات طلب کرتے جن کے دکھلانے کی حکمتِ الٰہی مقتضی نہ تھی۔ جب آپ دکھلانے سے انکار کرتے تو کہتے لولا اجتبیتھا یعنی اپنے خدا سے کہہ کر ہمارا مانگا ہوا نشان کیوں چھانٹ کر نہیں لے آئے ؟ ؎

یہ دونوں باتیں الگ الگ بھی ہو سکتی ہیں ۔ یعنی آیتِ قرآنی کا مطالبہ اور معجزے کی فرمائش ، اور دونوں جمع بھی ہو سکتے ہیں ۔ جمع کی صورت میں مطلب یہ ہے کہ جب تم ان کے مطالبے پر ان کی خواہش کے مطابق معجزہ نہیں دکھاتے تو یہ لوگ تمہیں یہ طعنہ دیتے ہیں کہ یہ کہیں سے کیوں نہ چھانٹ لائے ۔ اس سے ان کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے اس کا معاملہ تو بہت آسان ہے ۔ اِدھر اُدھر سے جو باتیں اگلوں کے واقعات اور اہلِ کتاب کی روایات پر مشتمل کانوں میں پڑیں ان میں سے جو باتیں دل کو بھا گئیں ان میں پیوند کاری کر کے کچھ کلام بنالیا اور لاکر اس دعوے کے ساتھ پیش کر دیا کہ کہ یہ اللہ نے وحی روانہ کی ہے لیکن اب ہم نے جو معجزہ کا مطالبہ کیا ہے تو تمہاری کچھ پیش نہیں جاتی ہے اس لیے اِدھر اُدھر سے چھانٹ لینا اور چیز ہے معجزہ دکھانا اور چیز ہے ۔ یہ چھانٹ لینے کی چیز نہیں تھی کہ کہیں سے چھانٹ لاتے اور ہمیں دکھا دیتے گویا اس طعنہ میں صرف معجزہ نہ دکھا سکنے کا ہی طعنہ نہیں ہے بلکہ اس سے زیادہ زہر آلود طعنہ اس کے اندر پوشیدہ ہے کہ معاذ اللہ قرآن ایک من گھڑت چیز ہے جو اِدھر اُدھر سے چھانٹی کر کے بنالی گئی ہے ۔

اجتباء کے لُغت میں معنے کسی چیز کو چُن لینے کے ہیں یعنی بہت سی چیزوں میں سے ایک کا انتخاب ۔ لیکن یہاں چونکہ طنز کے اسلوب میں آیا ہے اس لیے یہاں معنے گھڑ لینے کے ہیں ۔ اسی وجہ سے مشہور نحوی فراء نے اس کے معنے اختلاق اور افتراء کے بتائے ہیں یعنی گھڑ لینا ۔ حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبدالرحمٰن بن زید نے لولا اجتبیتھا کا مطلب

؎ افاداتِ شیخ الاسلام

یہ بتایا ہے کہ اگر کافروں کی خواہش کے مطابق آپ معجزہ نہیں دکھاتے تو وہ کہتے ہیں کہ تم اپنی طرف سے بنا کر معجزہ کیوں نہیں لے آتے۔ ابن جریج نے اسی کو اختیار کیا ہے لیکن امام ضحاک نے اس کا مطلب یہ بتایا ہے کہ تم خود جا کر آسمان سے کیوں نہیں لے آتے۔ یعنی اگر وحی نہیں آتی تو خود جا کر لے آتے۔

مخالفوں کے طنز کا باوقار جواب

۲۶۳۔ آپ فرما دیجئے کہ حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ میرا کام تو صرف اس وحی کی پیروی کرنا ہے جو میرے رب کی جانب سے مجھ پر آتی ہے یعنی ان سے کہہ دو کہ نبی کا یہ کام نہیں ہے کہ اپنی طرف سے خدائے قدوس پر افترا کرے یا لوگوں کے کہنے سننے پر اقدام کرکے خدا سے وہ چیز مانگے جس کا دینا اس کی حکمت کے منافی ہے یا جس کے طلب کرنے کی اجازت نہیں ہے اس کا وظیفہ صرف یہ ہے کہ خدا کی بھیجی ہوئی وحی قبول کرے اس پر عمل پیرا ہو اور دوسروں کو عمل پیرا ہونے کی دعوت دے[1] مقصد یہ ہے کہ میرا منصب یہ نہیں ہے کہ جس چیز کی مانگ ہو یا جس کی میں ضرورت محسوس کروں اسے خود ایجاد یا تصنیف کر لوں میں تو ایک رسول ہوں اور میرا منصب صرف یہ ہے کہ جس نے مجھے روانہ کیا ہے اس کی ہدایت پر عمل کروں۔ حضرت مولانا اشرف علی فرماتے ہیں کہ خلاصہ جواب یہ ہے کہ نبوت کی غایت اصلی اصلاح ہے اور معجزہ نبوت کی دلیل ہے اور دلیل دلیل سب برابر ہیں بس دلائل میں تعیین کی فرمائش بالکل لغو اور مہمل ہے۔ یہ تو ایک ضابطہ ہے کہ مدعی کے اختیار، تمیزی اور صوابدید پر موقوف ہے کہ جس دلیل سے چاہے دعویٰ کو ثابت کرے۔ مدعا علیہ جب پیش کردہ دلیل پر کوئی جرح نہیں کرتا تو اس کو یہ حق نہیں ہے کہ فلاں دلیل پیش کرو لہٰذا اوّلاً معجزہ کی فرمائش ہی بے محل ہے اور پھر اس میں حق کی طلب نہیں[2] مفتی محمد شفیع صاحب نے اسی کو دوسرے انداز میں پیش کیا ہے فرماتے ہیں:

پیغمبر کا معجزہ اس کی رسالت کی ایک شہادت ہوتا ہے اور جب مدعی کا دعویٰ کسی معتبر شہادت سے ثابت ہو جاتے اور فریق مخالف نے اس پر کوئی جرح بھی نہیں کی ہو تو

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] بیان القرآن

اس کو دُنیا کی کسی عدالت میں یہ حق نہیں دیا جاتا کہ وہ مدعی سے اس کا مطالبہ کرے کہ فلاں فلاں شہادت پیش کرو۔ اس لیے واضح معجزات دیکھنے کے بعد مخالفین کا یہ کہنا کہ فلاں قسم کا معجزہ دکھاؤ ایک معاندانہ مطالبہ ہے جس کو کوئی عدالت صحیح تسلیم نہیں کر سکتی۔

بظاہر جواب اس آیت میں جو دیا گیا ہے سادہ ہے لیکن باوقار اور بھرپور جواب ہے فرمایا کہہ دو تم جو چاہو سمجھو اور جو چاہو کہو میں تو بس اسی وحی کی اتباع کرتا ہوں جو میرے اوپر میرے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے۔ اصل حقیقت نہایت سادہ مگر نہایت باعظمت اسلوب میں ظاہر کر دی۔

معجزہ دلیلِ نبوّت ہے یا نہیں

اس آیت میں دو باتیں اشارۃً ارشاد ہوئی ہیں۔

ایک یہ کہ معجزہ ماہیتِ نبوّت میں داخل نہیں۔

دوسرے یہ کہ معجزہ دلیلِ نبوّت ہے۔ اگرچہ اس موضوع پر اشاعرہ اور معتزلہ کا اختلاف ہے۔ اشاعرہ کہتے ہیں کہ معجزہ دلیل ہے اور معتزلہ اس کا انکار کرتے ہیں۔ اس مسئلہ پر سب سے زیادہ سیر حاصل بحث ابن رُشد اندلسی نے کشف الادلہ میں کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ معجزہ دلیلِ نبوت نہیں ہو سکتا کیونکہ منطقی طور پر دعویٰ اور دلیل میں مطابقت ہونا ضروری ہے اور معجزہ اور نبوت میں کوئی مطابقت نہیں ہے۔ اشاعرہ اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ نبوّت علم و عمل کے مجموعہ کا نام ہے اور جو شخص نبوّت کا دعویٰ کرتا ہے اس کی نسبت یہ تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ وہ دونوں چیزوں میں کمال رکھتا ہے اور اسی کمال کے اظہار کے لیے معجزہ طلب کیا جاتا ہے۔ اور انبیاء کے معجزات اگرچہ مختلف قسم کے ہوتے ہیں تاہم ان کو صرف دو قسموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اخبار بالغیب اور تصرف فی الکائنات۔ اخبار بالغیب سے اس کے علمی کمال کا اظہار ہوتا ہے اور تصرف فی الکائنات سے اس کی قوّتِ عملی ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن معجزہ اگر دلیلِ نبوّت ہے تو منطقی حیثیت سے یہ کس قسم کی دلیل ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کو بُرہان نہیں کہا جا سکتا، مگر دلیل کا انحصار براہانیات ہی میں نہیں ہے بلکہ اس کی اور بھی قسمیں ہیں اور معجزہ ان میں داخل ہو سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اشاعرہ اور معتزلہ میں اس موضوع خلط مبحث ہو گیا ہے۔ اشاعرہ کا

یہ کہنا کہ معجزہ دلیلِ نبوت ہے بالکل صحیح ہے مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ وہ منطقی دلیل ہے دلیل کا لفظ یہاں منطق کی اصطلاحی زبان میں نہیں ہے بلکہ عام اور لفظی معنے نشان میں استعمال ہوا ہے اس لیے جب معجزہ سرے سے دلیل منطقی ہی نہیں تو یہ تلاش کہ وہ دلیل کی کس قسم میں داخل ہے بے سُود ہے چنانچہ اشاعرہ خود کہتے ہیں کہ معجزہ کی دلالت نبوت پر دلالت عقلی نہیں بلکہ عادی ہے۔ شرح مواقف بحث معجزات میں ہے :

معجزہ کی دلالت نبوت پر دلالت عقلی نہیں ہے جیسے فعل کی دلالت وجود فاعل پر ہوتی ہے یا فعل کے استحکام و نظم کی دلالت فاعل کے علم پر عقلی ہے۔ کیونکہ دلائل عقلی اپنے مدلولات کے ساتھ مربوط ہوتے ہیں اور یہ فرض ناممکن ہے کہ وہ اپنے مدلول پر دال نہ ہو۔ اور معجزہ کی دلالت کی صورت ایسی نہیں ہے بلکہ معجزہ کی دلالت دلالت عادیہ ہے جیسا کہ صاحب مواقف نے کہا ہے کہ یہ دلالت ہمارے نزدیک عادیہ ہے۔ اللہ کی عادت یہ ہے کہ جب معجزہ صادر ہوتا ہے تو صاحب معجزہ کی سچائی کا علم وہ لوگوں کے دلوں میں پیدا کر دیتا ہے۔

آج کل کے علمی محاورے میں اشاعرہ کے اس قول کی تشریح کہ معجزہ کی دلالت عقلی نہیں بلکہ عادی ہے یہ ہے کہ معجزہ منطقی نہیں بلکہ نفسیاتی دلیل ہے۔ عادتِ انسانی یہ ہے کہ جب کسی شخص سے کوئی غیر معمولی کارنامہ ظاہر ہوتا ہے تو نفوس اس کی عظمت و کبریائی کے سرنگوں ہو جاتے ہیں۔ جب ایک شخص عام انسانی حالت سے بلند تر سطح میں آکر منجانب اللہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور خوارقِ عادت اس سے ظاہر ہوتے ہیں تو عام متاثر طبع فوراً اس کے دعویٰ کو تسلیم کر لیتے ہیں۔

قرآن کا بصیرت، ہدایت اور رحمت ہونا

۲۶۴۔ یہ قرآن تمہارے رب کی جانب سے ایمان والوں کے لیے بصیرت کی باتیں ہیں اور ہدایت و رحمت ہے۔ یعنی باقی آیات تنزیلیہ یا تکوینیہ جو مجھ سے طلب کرتے ہو تو قرآن سے بڑھ کر کون سی آیات ہوں گی اور اس سے زیادہ عظیم الشان معجزہ کون سا ہو سکتا ہے جو سارے جہاں کے لیے بصیرت افروز حقائق و مواعظ کا خزانہ اور ایمان لانے والوں کے لیے خاص قسم کی ہدایت و رحمت کا ذخیرہ اپنے اندر رکھتا ہے اسی کو تم کب مانتے ہو جو فرمائشی

آیات تسلیم کرو گے[1] مطلب یہ ہے کہ تم اس قرآن کو میری گھڑی ہوئی کتاب کہتے ہو، لیکن یہ تمہارے رب کی جانب سے آنکھوں اور دلوں کے پردے ہٹا دینے والی آیتیں اور تمہارے لیے ہدایت و رحمت ہیں۔ ہدایت اپنے آغاز کے اعتبار سے اور رحمت اپنے انجام کے لحاظ سے لیکن یہ ان کے لیے نافع ہے جو ایمان لائیں، لقوم یؤمنون، اس میں لطیف اشارا ہے کہ میں جو کچھ پیش کر رہا ہوں، اس میں کوئی کمی نہیں اصل خرابی تمہارے اپنے دلوں کے اندر ہے کہ تم راستی کو قبول کرنا نہیں چاہتے ۔

دراصل اس آیت میں قرآن نے نبوت ایمان والوں کے درجات بتاتے ہیں۔ ایمان کے معنے یقین کے ہیں، اور یقین کے تین درجے ہیں۔ ایک یہ کہ اسے اس کے متعلق معلومات فراہم ہوں اور اس پر یقین آجائے۔ دوسرے یہ کہ اسے آنکھ سے دیکھ لیا جائے اور اس پر یقین آجائے۔ تیسرے یہ کہ یہ حال بن جائے اور اس پر یقین آجائے۔ مثلاً آپ کے سامنے شہد کا ذکر آتا ہے، شہد کے بارے میں آپ کو معلوم ہوتا ہے۔ یہ شہد کے بارے میں علم الیقین ہے۔ دوسرے یہ کہ شہد آپ کے سامنے آتا ہے آپ اسے آنکھوں سے دیکھتے ہیں یہ شہد کے بارے میں عین الیقین ہے۔ اور آخری درجہ یہ ہے کہ آپ شہد کو کھائیں یہ شہد کے بارے میں آپ کا حق الیقین ہے۔ قرآن کے ماننے والوں کے یقین میں بھی تین درجے ہیں۔ کچھ وہ ہیں جن کے علم میں یہ بات آئی ہے کہ یہ اللہ کی کتاب ہے اور ان کو بتانے والے نے بتایا ہے کہ یہ اللہ کی کتاب ہے۔ اس معنے کے اعتبار سے قرآن بصیرت ہے۔ بصائر، بصرۃ کی جمع ہے اس کے معنے دیدہ، عقل اور دانش کے آتے ہیں جیسے ظاہری آنکھ کے لیے بصر اور جمع ابصار آتی ہے۔ یہاں بصائر سے مراد دلائل عقلی اور وہ وسائل ہیں جن سے ہر انسان حق کو معلوم کر سکتا ہے۔ اسی معنے میں یہ لفظ قرآن کی اس آیت میں آیا ہے قد جاءکم بصائر من ربکم فمن ابصر فلنفسہ ومن عمی فعلیہا۔ دیکھو لوگو تمہارے رب کی جانب سے تمہارے پاس بصیرت کی روشنیاں آچکی ہیں اب جو بینائی سے کام لے گا اپنا ہی بھلا کرے گا اور جو اندھا بنے گا خود نقصان اٹھائے گا۔ مطلب یہ ہوا کہ لوگو تمہارے پاس حق بینی کے وسائل پہنچ چکے ہیں۔ حضور انور

[1] افادات شیخ الاسلام

صلی اللہ علیہ وسلم نبوت کی ظاہری و باطنی نشانیاں لے کر آگئے ہیں۔ امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ :

انبیاؑ کو دو قسم کے معجزے دیے جاتے ہیں۔ پہلی قسم یہ ہے کہ وہ پاک نسب ہوتے ہیں۔ ان کے چہروں پر وہ نور ہوتا ہے جو دلوں کو موہ لیتا ہے۔ ان کے اخلاق ایسے ہوتے ہیں جو قلوب کو مسخر کر لیتے ہیں۔ ان کی تقریر ایسی ہوتی ہے جس سے سننے والوں کی تشفی ہوتی ہے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ :

یہ حالات جب پائے جاتے ہیں تو صاحب بصیرۃ آدمی کو اور کسی معجزہ کی ضرورت نہیں رہتی ہے۔

امام غزالی نے المنقذ من الضلال میں جہاں نبوت پر بحث کی ہے لکھتے ہیں کہ جو شخص حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات اور ارشادات پر بار بار غور کرے گا اس کو خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر یقین ہو جائے گا۔ پھر لکھتے ہیں ،

اس طریق سے نبوت پر یقین لاؤ نہ اس سے کہ عصا سانپ ہو گیا یا چاند شق ہو گیا۔

یہی ھذا البصائر من ربکم ہے۔ یقین کا یہ درجہ خالص علمی ہے۔ اس کے بعد یقین کا دوسرا درجہ عینی ہے جسے قرآن نے یہاں ہدیٰ کہا ہے۔ ہدیٰ کے معنے راہ بتانے کے ہیں یعنی یہ قرآن لوگوں کو حق کا راستہ بتاتا ہے۔ جن لوگوں کو اس کے ذریعے حق کی رہنمائی ملتی ہے وہ ہی حق کو آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں۔ ان کا یقین ہی آنکھوں دیکھا یقین ہے۔ آخر میں تیسرے درجہ کو بیان کیا ہے جن کو حق الیقین حاصل ہوتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں قرآن جن کا حال بن گیا ہے۔ چونکہ یہ نعمت محض نعمت خداوندی سے حاصل ہوتی ہے اس لیے اس کو رحمت کہا ہے۔ حق الیقین والا طبقہ سب سے اونچا ہے۔ قرآن نے اس طرح طلب و جہد کی ہر پیاس کے لیے درجہ بدرجہ سیرابی کا سامان کر دیا۔ عوام کے لیے علم کا مرتبہ کافی ہے یعنی علم الیقین کا اور خواص کے لیے دوسرا مرتبہ ضروری ہے یعنی عین الیقین کا اور اخص الخواص کے لیے تیسرا درجہ ہے یعنی حق الیقین کا۔ قرآن ایک ہے لیکن اس سے استفادے کے انداز الگ الگ ہیں۔ ہر طالب کے لیے اس کے

ظرف کے مطابق ایک جاتا ہے اور اس کی سرشاری کی کیفیتیں مہیا کرتا ہے۔ قربان جائیے قرآن کی بلاغت کے کہ ایک مختصر سے فقرے میں کتنے علوم کو پیش کر دیا۔

جن لوگوں نے اس آیت کو صوفیانہ انداز میں دیکھا انھوں نے علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین کی ترتیب اُلٹ دی ہے۔ انھوں نے اس کو اس انداز میں پیش کیا ہے۔

اہلِ ایمان کے تین درجے ہو سکتے ہیں۔ اس لیے متوسط، ادنیٰ جو لوگ توحید و معرفت کے تمام زینوں کو طے کر کے اس مقام پر فائز ہوتے ہیں کہ کارخانہ زمین و آسمان کی علوی اور سفلی چیزیں مشاہدے کے طور پر ان کے سامنے آتی ہیں اور وہ عین الیقین تک پہنچ جاتے ہیں ایسے لوگ اصحابِ بصیرت کہلاتے ہیں اور جو لوگ نظر و استدلال سے کسی حقیقت تک پہنچنے کی اہلیت رکھتے ہیں وہ علم یقین کے درجہ تک پہنچ کر خود ان کا قدم ہدایت سے ایک اپنچ نہیں ہٹتا اور وہ لوگوں کی ہدایت کا ذریعہ بنتے وہ ہادی اور مہدی کہلاتے ہیں اور جن کو نہ پہلا درجہ حاصل ہے اور نہ دوسرا وہ صرف یہی جانتے ہیں کہ حق تعالیٰ کے احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہے وہ گروہ عامۃ المومنین کا ہے جن کو حق الیقین کا مرتبہ حاصل ہے لیکن اس میں درجات کی ترتیب طبعی قائم نہیں۔ طبعی ترتیب یہی ہے کہ علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین۔ اگر بصائر سب سے اونچا درجہ ہے تو قرآن مشرکوں اور کافروں کے لیے بصائر نہ ہوگا۔ کیونکہ کفار عین الیقین نہیں رکھتے۔ اس لیے ابوسعود نے جو تفسیر بیان کی ہے وہ زیادہ صحیح ہے یعنی قرآن کا بصائر ہونا تو سب کے لیے چاہے کافر ہوں یا مومن لیکن اس کا ہدایت و رحمت ہونا صرف اہلِ ایمان کے لیے ہے۔ شاید اس لیے بصائر کے بعد من ربکم فرمایا۔ اور ہدی و رحمۃ کو اس سے علیحدہ کر کے لقوم یومنون سے جوڑ دیا ہے۔ خازن نے اسے لطائف میں شمار کیا ہے لیکن آلوسی نے اسے خلافِ ظاہر کہہ کر رد کر دیا ہے۔ اصل یہ بتایا ہے کہ قرآن کی راہ علم و یقین کی راہ ہے۔ جہالت اور گمان کی راہ نہیں ہے۔ علم و یقین کا یہ راستہ تمہارے پروردگار کی جانب سے میرا بنایا ہوا نہیں ہے۔ بصیرۃ کا لفظ فرمایا۔ بصیرۃ کے معنے علم معرفت اور یقین کے ہیں اور اسی لیے دلیل و حجت کو بھی بصیرۃ کہتے ہیں۔ جمع اس لیے لائے ہیں کہ اس کی آیتوں اور سورتوں میں سے ایک ایک آیت علم و معرفت ہے یا علم و معرفت کا سامان ہے۔ پہلی صورت میں یہ تشبیہہ بلیغ ہے

اور دوسری صورت میں مجاز رسل ہے۔ قرآن کہتا ہے میں جس راہ کی طرف بلاتا ہوں اس کے لیے میرے سامنے علم و یقین ہے۔ اور جو لوگ اسے علم و یقین کی بنیاد پر اٹھی ہوئی عمارت کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں ان کے لیے ہدایت اور رحمت ہوں۔ ہدایت و رحمت کے الفاظ نہایت حکیمانہ ترتیب کے ساتھ اس مقصد کو ظاہر کرتے ہیں جس کے لیے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر کتاب اتارتا ہے۔ اللہ سبحانہٗ کتاب اس لیے اتارتا ہے کہ دُنیا میں زندگی بسر کرنے کا وہ طریقہ بتائے جو آخرت میں بندوں کو اس کی رحمت کا سزاوار بنا دے۔ اس پہلو سے کتاب اپنے مقصد کے اعتبار سے ہدایت اور نتائج کے لحاظ سے رحمت ہوتی ہے۔ زندگی کی اصلی غایت تو آخرت ہے۔ اس دُنیا کی زندگی تو فانی ہے اس لیے کتابِ الٰہی کا اصل مقصد یہ ہُوا کہ وہ اس دُنیا کی زندگی کو جلوہ دے کہ لوگ آخرت کی زندگی پر ایمان لے آئیں اور اسی کو نصب العین بنا کر زندگی کا سفر طے کریں، اسی کی طرف یومنون اشارا کر رہا ہے۔

قرآن سننے پر رحمت کا وعدہ

۵۲۶- اور مسلمانو! جب قرآن پڑھا جائے تو کان لگا کر سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ جب قرآن ایسی دولت بے بہا اور علم و ہدایت کی کان ہے تو اس کی قرأت کا حق سامعین پر یہ ہے کہ پوری فکر و توجہ سے ادھر کان لگائیں، اس کی ہدایات کو سمع قبول سے سُنیں اور ہر قسم کی بات چیت، شور و شغب کو چھوڑ کر ادب کے ساتھ خاموش رہیں تاکہ خدا کی رحمت اور مہربانی کے مستحق ہوں۔ اگر کافر اس طرح قرآن سنیں تو کیا بعید ہے کہ خدا کی رحمت سے مشرف بایمان ہو جائے اور جو پہلے سے مسلمان ہے تو ولی بن جائے یا کم از کم اس عمل کے اجر و ثواب سے نوازا جائے۔

اس آیت سے بہت سے علماء نے یہ مسئلہ بھی نکالا ہے کہ نماز میں جب امام قرأت کرے تو مقتدی کو سننا اور خاموش رہنا چاہیے جیسا کہ ابو موسیٰ اشعری اور ابو ہریرہ کی حدیث میں حضور نے فرمایا واذا قرأ فانصتوا جب نماز میں امام قرأت کرے تو چپ رہو۔ یہاں اس مسئلہ کی تفصیل کا موقعہ نہیں۔ صحیح مسلم کی شرح میں ہم نے نہایت شرح و بسط سے اس کے مالہٗ وما علیہ پر بحث کی ہے[1]

[1] افادات شیخ الاسلام

آیت قرآن کا منطوق یہ ہے کہ جب قرآن کی تلاوت کی جائے تو اس کا ادب حکماً یہ ہے کہ اس کی طرف کان لگائے رہو اور چپ رہو تاکہ تم پر اللہ کی رحمت ہو۔ پہلی آیت میں بتایا تھا کہ یہ قرآن اہلِ ایمان کے لیے رحمت ہے۔ اب بتایا جا رہا ہے کہ قرآن کے رحمت ہونے کی شرط یہ ہے کہ جب قرآن پڑھا جائے تو اسے کان لگا کر سنو اور خاموش رہو۔ سب سے پہلا سوال یہ ہے قرآن کے اس ادب کا دائرہ کہاں تک ہے۔ کیا یہ حکم قرآن کے ہر سننے والے کے لیے ہے کہ جب بھی قرآن کی تلاوت ہو خاموشی اختیار کر لی جائے۔ یا یہ حکمِ قرآنی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت کے لیے ہے کہ جب آپ قرآن تلاوت کریں تو ہر مومن کا فرض ہے وہ آپ کی تلاوت کو دھیان سے سُننے اور خاموش رہے۔ اور یا پھر یہ حکم نماز کے لیے ہے کہ جب امام نماز میں قرآن تلاوت کرے تو مقتدی کا فرض ہے کہ وہ کان لگا کر سُننے اور خاموش رہے۔

پہلی بات کی حد تک ابن المنذر نے بقول علامہ رشید رضا اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ ہر قاری کی تلاوت کے وقت سننا اور خاموش رہنا واجب نہیں ہے۔ اب صرف دو صورتیں باقی ہیں۔

ایک یہ کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم دعوت و تبلیغ کے موقعہ پر تلاوت کریں تو ہر مومن کا فرض ہے کہ دھیان سے سُننے اور خاموش رہے۔ یہ بھی ایک بے غبار حقیقت ہے۔ اس موضوع پر اُمت میں کبھی کوئی اختلاف نہیں رہا۔ دوسری یہ کہ امام نماز میں قرآن تلاوت کرے تو مقتدی کے فرائض میں ہے کہ سُننے اور خاموش رہے۔ صحابہ کرام اور تابعین نے اس آیتِ گرامی کا عمل میں مصداق جو بتایا ہے۔ ہم پہلے ناظرین کی خدمت میں وہ پیش کرتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود کے بارے میں حافظ ابن جریر نے یہ انکشاف فرمایا ہے کہ:

> حضرت عبداللہ بن مسعود نے نماز پڑھی اور کچھ لوگوں کو امام کے ساتھ قرأت کرتے سُنا۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا کیا وقت ابھی نہیں آیا کہ سمجھ اور عقل سے کام لو اور جب قرآن کی تلاوت ہو تو اس کی طرف دھیان کرو اور خاموش رہو جیسا کہ تمہیں اللہ سبحانہ نے حکم دیا۔ (ابن جریر)

حضرت عبداللہ کا یہ ارشاد پوری قوت سے یہ بات بتا رہا ہے کہ اس آیت گرامی میں استماع اور انصات کا جو حکم ہو رہا ہے اس کا اصلی اور بنیادی تعلق نماز سے ہے۔ عبداللہ ابن مسعود کا اسی قسم کا بیان امام بیہقی نے بھی کتاب القرأۃ میں پیش کیا ہے

فرماتے ہیں :

حضرت عبداللہ فرماتے ہیں کہ نماز میں امام کے پیچھے خاموشی اختیار کرو جیسا کہ تمہیں حکم ہے کیونکہ خود پڑھتے ہوئے امام کی قرآت سُن نہیں سکتا۔ امام کا پڑھنا تمہیں کافی ہے ۔

کتاب القرآۃ ہی میں امام بیہقی نے حضرت عبداللہ بن عباس کا یہ بیان بھی نقل کیا ہے کہ :

قرآن کی یہ آیت فرض نمازوں کے بارے میں نازل ہوئی اور اسی کتاب القرأت میں یہ بیان بھی حضرت عبداللہ بن عباس کا ہے وہ فرماتے ہیں :

آیت اذا قری القرآن کے پیشِ نظر مومن پر کوئی پابندی نہیں اس کو گنجائش ہے کہ سننے نہ سُنے مگر فرض نمازوں نمازِ جمعہ ، عید الفطر، عید الاضحیٰ میں اس کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے ۔

ان کے علاوہ امام بیہقی نے کتاب القرآت میں امام مجاہد سے حضرت سعید بن المسیب سے امام الحسن البصری سے حضرت ابو العالیہ ریاحی سے حضرت امام زہری بالسند بیان کیا ہے کہ اس آیت گرامی کا تعلق نماز سے ہے اور یہ آیت کا شانِ نزول نماز ہے ۔ حافظ ابن جریر اور حافظ ابن کثیر نے حضرت عبید بن عمیر اور عطا بن ابی رباح سے نقل کیا ہے کہ آیت کا شانِ نزول نماز ہے ۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں :

ضحاک، ابراہیم نخعی ، قتادہ ، شعبی، سدی اور عبدالرحمان بن زید بن اسلم فرماتے ہیں کہ آیت کا شانِ نزول نماز ہے ۔

آئیے اب اس موضوع پر کچھ قدیم شارحینِ قرآن کے ارشادات بھی گوش گزار فرمالیجئے ،

حافظ ابن جریر طبری آیت مذکورہ کی تفسیر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :

ان تمام اقوال میں سب سے زیادہ صحیح اور راجح قول یہ ہے کہ آیت اذا قرء القرآن کا شانِ نزول نماز اور خطبہ ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیث سے یہ ثابت ہے کہ جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو۔ اور تمام علماء کا اتفاق ہے کہ جن لوگوں پر جمعہ فرض ہے ان پر خطبہ کی حالت میں توجہ کرنا اور خاموش رہنا بھی ضروری ہے ۔

امام محی الدین حسین بن مسعود بغوی اس آیت کی تشریح میں متعدد اقوال نقل کرتے ہیں

کہ کچھ لوگ اس کا شانِ نزول نماز بتاتے ہیں اور کچھ خطبہ اور بعض مطلقاً وعظ و تلاوت،
اس کے بعد اپنا فیصلہ یہ درج فرماتے ہیں:

ان تمام اقوال میں صحیح ترین قول پہلا ہے وہ یہ کہ آیت اِذَا قُرِیَٔ الْقُرْاٰن کا شانِ نزول صرف نماز ہے کیونکہ یہ آیت مکی ہے اور جمعہ مدینہ میں فرض ہوا ہے۔

قاضی بیضاوی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اس آیت کا شانِ نزول نماز ہے۔

حافظ ابن کثیر اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

احادیث سے تاکیدی طور پر خاموش رہنے کا حکم صرف امام کے پیچھے فرض نمازوں میں اقتدار کرنے والوں کے لیے معلوم ہوتا ہے۔

علامہ ابوالسعود اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

آیت کے ظاہری الفاظ اس کے مقتضی ہیں کہ نماز میں اور خارج نماز میں جہاں اور جس وقت قرآن کی تلاوت ہو خاموش رہنا چاہیے لیکن جمہور صحابہ کرام کا مسلک یہ ہے کہ وجوبی طور پر خاموش رہنا صرف مقتدی کے لیے ہے۔

سید محمود آلوسی بغدادی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

آیت کا مطالبہ یہ ہے کہ نماز میں یا بیرونِ نماز میں جب بھی قرآن کی تلاوت ہو خاموش رہنا چاہیے لیکن نماز سے باہر سننے اور نہ سننے کی گنجائش پر دلیل قائم ہو چکی ہے لیکن جہری نمازوں میں خاموشی بہرحال ضروری ہے اور اسی طرح سری نمازوں میں بھی کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ امام قرأت کر رہا ہے۔

حافظ ابن تیمیہ نے فتاویٰ میں امام احمد بن حنبل کے بارے میں یہ انکشاف فرمایا ہے کہ

امام احمد بن حنبل نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ یہ آیت نماز کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ نیز اس پر بھی اتفاق نقل کیا ہے کہ جب امام جہر سے قرأت کرتا ہو تو مقتدی پر قرأت واجب نہیں ہے۔

اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ اس آیت کا سبب نزول نماز ہے اور واقعہ نہ ہونے کی وجہ کیا ہے جبکہ اس کی پشت پر تاریخ و روایت کی مضبوط ترین شہادت موجود ہے

تو پھر اس آیت کی رُو سے یہ حقیقت قطعاً بے غبار ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ نماز باجماعت میں امام کا کام قرآن کی تلاوت اور مقتدی کا فرض اس تلاوت کو سننا اور خاموش رہنا ہے اسی بنا پر ائمہ مجتہدین کا فیصلہ یہ ہے کہ امام کے پیچھے مقتدی پر قرأت نہیں ہے امام ابوحنیفہ کا صاف اور واضح مسلک یہ ہے کہ امام کے پیچھے مقتدی کو قرأت نہ کرنی چاہیے۔ امام محمد اور امام ابو یوسف کا بھی یہی مسلک ہے۔ مولانا مبارک پوری نے تحفۃ الاحوذی میں عبداللہ بن المبارک، امام مالک اور امام احمد بن حنبل کو بھی ان لوگوں میں شمار کیا ہے جو امام کے پیچھے قرأت کے وجوب کے قائل نہ تھے۔ علامہ ابن قدامہ نے المغنی میں امام احمد بن حنبل کا یہ زریں بیان نقل کیا ہے۔

امام احمد نے فرمایا ہے ہم نے اہلِ اسلام میں سے کسی سے نہیں سُنا جو یہ کہتا ہو کہ جب امام جہر سے قرأت کرتا ہو اور مقتدی اس کے پیچھے قرأت نہ کرے تو مقتدی کی نماز فاسد اور باطل ہو جاتی ہے۔ اور فرمایا یہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور یہ آپ کے صحابہ اور تابعین ہیں یہ امام مالک ہیں حجاز میں، یہ امام ثوری ہیں عراق میں، یہ امام اوزاعی ہیں شام میں اور یہ امام لیث بن سعد ہیں مصر میں، ان میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ جب کوئی شخص امام کے پیچھے نماز پڑھے اور اس میں قرأت نہ کرے، تو اس کی نماز باطل ہوتی ہے۔

صرف یہی نہیں بلکہ امام ابراہیم نخعی، امام محمد بن شہاب زہری، امام سفیان ثوری، امام لیث بن سعد، امام عبداللہ بن المبارک، امام اوزاعی، امام اسحاق بن راہویہ اور امام سفیان بن عیینہ میں سے کوئی بھی جہری نماز میں امام کے پیچھے پڑھنے کا قائل نہیں ہے۔ حافظ ابن تیمیہ نے قرآن کی اس آیت کے زور سے متاثر ہو کر کھلے الفاظ میں کہہ دیا ہے۔

امام کی قرأت سننے اور اس کے لیے چپ رہنے کا حکم قرآن کریم اور صحیح احادیث میں موجود ہے۔ اور اس پر تمام اُمت کا اجماع ہے کہ مقتدی پر سورۃ فاتحہ کے بعد کوئی قرأت نہیں ہے اور جمہور اور اکثر صحابہ کا مسلک یہ ہے کہ مقتدی پر نہ سورۃ فاتحہ کی قرأت ضروری ہے نہ کسی اور سُورت کی۔ امام شافعی کا بھی ایک قول یہی ہے اور ان کے

متبعین میں فن کار اور محقق اہلِ علم کا بھی یہی مسلک ہے اور اسی کو انہوں نے پسند کیا ہے۔ کیونکہ جہرِ امام کے وقت مقتدی کا پڑھنا قرآن کریم اور سنت کے خلاف ہے۔

یہی حافظ ابن تیمیہ قرآن کی اسی آیت کے پیشِ نظر مسئلہ قراۃ خلف الامام پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

امام کے جہر کرنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ پڑھے اور مقتدی سُنیں یہی وجہ ہے کہ امام جہری نمازوں میں جب و لا الضالین کہتا ہے تو مقتدی آمین کہتے ہیں اور سری نمازوں میں چونکہ مقتدی سُنتے نہیں اس لیے وہ آمین بھی نہیں کہتے۔ اگر امام بھی قرأت کر رہا ہو اور مقتدی پڑھتے ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ امام کو یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ تم ایسے لوگوں کو سناؤ جو اسے سنتے نہیں اور ایسی قوم کے سامنے تقریر کرو جو توجہ نہیں کرتی یہ ایسی کھلی حماقت ہے جس سے شریعت کا دامن پاک ہے۔

تمام ائمہ میں صرف امام شافعی ایک امام ہیں جن کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کے قائل ہیں لیکن ان کے بھی دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ مقتدی کو نہ پڑھنا چاہیے اور دوسرے یہ کہ پڑھنا چاہیے۔ لیکن یہ فیصلہ کہ ان کا کون سا قول قدیم اور کون سا جدید، امام بیہقی اور حافظ ابن کثیر کی تفسیر میں رائے یہ ہے کہ سب نمازوں میں پڑھنا قولِ جدید ہے۔ بہرحال قولِ جدید ہو یا قدیم ایک نہ ایک درجہ میں امام شافعی بھی جمہور کے ساتھ ہیں۔

یہاں یہ سوال بھی اچھی خاصی دلچسپی پیدا کرتا ہے کہ جن کے نزدیک مقتدی پر قرأت ضروری ہے وہ یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ مقتدی کس وقت پڑھے۔ امیر یمانی لکھتے ہیں:۔

امام کے پیچھے مقتدی کے لیے قرأت کو واجب کہنے والے آپس میں مختلف ہیں۔ ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ امام کے سکنات میں قرأت کرنی چاہیے اور دوسرا گروہ کہتا ہے کہ جب امام قرأت سے فارغ ہو جائے تو اس وقت مقتدی کو قرأت کرنی چاہیے۔ لیکن ان دونوں باتوں کا حدیث میں

کوئی ثبوت نہیں۔

شاید اسی لیے حافظ ابن تیمیہ یہ بتانے پر مجبور ہو گئے۔

امام پر سکتہ کرنا واجب نہیں تاکہ مقتدی قرأت کرلے۔ یہ امام مالک، امام ابو حنیفہ اور امام احمد بن حنبل اور جمہور اہل اسلام کا فیصلہ ہے۔

الغرض یہ آیتِ قرآنی اس موضوع پر اتنی واضح اور صاف ہے کہ ہر شخص کو اس کے سامنے گردن تسلیم خم کرنی پڑی ہے۔ جو قرأت خلف الامام کے قائل ہیں ان کو بھی سکتاتِ امام کا سہارا لینا پڑا ہے۔

تاریخ کی نپی تلی ترازو میں پائدار بات تو یہی ہے کہ آیت کا نزول نماز کے بارے میں ہوا ہے۔ لیکن کچھ اور خیالات بھی ہیں۔

کچھ کی رائے میں آیت کا نزول خطبہ سننے کے لیے ہوا ہے۔ اور کچھ کا خیال ہے کہ آیت کا نزول نماز میں باتیں ختم کرنے کے لیے ہوا ہے۔ کچھ کہتے ہیں کہ نماز میں لوگ امام کے پیچھے قرأت کے وقت ترغیب و ترہیب کی آیات پر اذکار کرتے تھے اسے بند کرنے کے لیے اس آیت کا نزول ہوا اور کچھ سمجھتے ہیں کہ آیت کا روئے سخن عام ہے۔ ہر قرآن سننے والے سے مطالبہ ہے خواہ نماز میں ہو یا نماز سے باہر ہو کہ وہ قرآن سنے۔ اور کچھ نے بتایا ہے کہ آیت کا نزول نماز اور خطبہ کے بارے میں ہوا ہے۔ اس اختلاف کے نتیجہ میں شارحینِ قرآن کی تشریحات مختلف ہو گئیں۔ امام رازی نے اس آیتِ قرآنی کا رخ اہل ایمان سے ہٹا کر اہل کفر کی طرف پھیر دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس کے مخاطب مسلمان نہیں بلکہ کفار ہیں۔ اس کو انہوں نے اس طرح پیش کیا ہے کہ اس آیت سے پہلے اللہ سبحانہ نے مشرکین کے اس مطالبہ کو پیش کیا کہ خاص اعجازی کارنامہ دکھائیے۔ حضور انورؐ نے ان کی درخواست کو درخور اعتناء نہ سمجھا۔ اللہ پاک نے اپنے رسول کو حکم دیا کہ ان کے جواب میں کہو کہ معجزہ لانا میری دسترس میں نہیں ہے میں تو رسول ہوں میرا کام تو صرف یہ ہے کہ اللہ کی وحی کی پیروی کروں یعنی قرآن کی، اس کے بعد اللہ سبحانہ نے بتایا کہ حضور نے معجزہ کی مانگ سے ہٹ کر وحی کی بات اس لیے کی ہے کہ قرآن نبوت کو ثابت کرنے کے لیے عظیم معجزہ ہے قرآن جیسے اعجاز کے ہوتے ہوئے اور معجزہ کی درخواست حماقت ہے قرآن کی شان اعجاز کو ان الفاظ میں پیش کیا۔

ھذا بصائر من ربکم و ھدی و رحمۃ لقوم یومنون اب اگر ہم آیت کے منہ میں یہ مطلب ڈالیں کہ اس میں امام کے پیچھے مقتدی کو قرآن خوانی سے روکا گیا ہے تو اس آیت کا پہلی آیت سے کوئی جوڑ نہ رہے گا۔ نظم کلام غیر مربوط ہو کر رہ جائے گا۔ کلام میں ایسی بے ربطی سے اللہ کا کلام پاک ہے۔ حالانکہ بات بالکل صاف ہے کہ قرآن کا اعجاز ظاہر کرنے کے لیے قرآن کو بصیرت، ہدایت اور رحمت کہا ہے اور بتایا ہے کہ یہ آپ کی صداقت کا معجزہ ہے۔ جب یہ قرآن پڑھا جائے تو اسے توجہ سے سنو تاکہ تم پر اس کی شان اعجازی ظاہر ہو۔ اور تمہیں اسے قبول کرنے کی توفیق ہو اور اس سے تم رحمت کے مستحق ہو جاؤ۔ امام رازی نے اچھی اور عمدہ تشریح قرار دیا ہے اور اس کی ایک سے زیادہ وجوہ بیان کی ہیں۔ ان میں سب سے اہم دلیل یہ پیش کی ہے کہ اگر واقعی خطاب آیت میں اہل ایمان کو ہوتا تو لعلکم ترحمون نہ ہوتا کیونکہ یہ لفظ ترجی کے لیے آتا ہے اور مومن تو بہر حال رحمت خداوندی کا مستحق ہے۔

امام رازی کی اس انوکھی تشریح کا جواب بہتوں نے دیا ہے لیکن ان میں سب سے لطیف جواب وہ ہے جو مولانا عبدالحی لکھنوی نے امام الکلام میں دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

امام رازی کا مختار اور ان کی پسندیدہ تشریح بالکل بے جان ہے۔ اگرچہ بظاہر ان کا یہ تشریحی موقف لطیف ہے لیکن اس کا کوئی علمی نسب نامہ نہیں ہے۔ ائمہ تفسیر میں سے کسی سے منقول نہیں۔ باقی ربط و نظم قرآنی کا مسئلہ تو یہ آیت قرآنی کو اہل ایمان سے ہٹا کر کافروں کی طرف موڑنے پر موقوف نہیں ہے۔ ہر فکر سلیم یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ پہلی آیت میں نبوت کے مخاطبوں کی جانب سے خاص معجزہ کا مطالبہ تھا۔ اس کا قرآن نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ جواب بتایا کہ آپ فرما دیجیے کہ میرا کام تمہارے مطالبات کو جناب الٰہی پیش کرنا نہیں۔ میرا کام تو صرف اللہ کی جانب سے آئی ہوئی وحی کی پیروی کرنا ہے۔ یہ وحی ہی میری صداقت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ ہر ذی شعور اس پر غور کر کے میری نبوت کی تصدیق کرے گا۔ میری زبان سے نکلا ہوا بول اللہ کی وحی ہے۔ اس لیے تمہیں سوجھ بوجھ سے کام لے کر اس پر غور کرنا چاہیے۔ یہ اگر ایک طرف عقل انسانی کے لیے دلچسپی کا سامان ہے تو دوسری طرف انسان کی عملی زندگی صحیح رُخ مقرر کرنے والی ہے۔ اور جو اہل ایمان اس کی روشنی میں اپنے افکار صحیح کر لیں اور اس کی رہنمائی میں اپنی عملی زندگی سنوار لیں، ان کے لیے یہ سرتا سر رحمت ہے۔ اب جو بھی اس کتاب الٰہی پر ایمان لائے گا۔ یہ

کتابِ الٰہی اس کے لیے رحمت، ہدایت اور بصیرت ہوگی۔ اے کافرو اگر تم اسے نہیں مانتے ہو تو تمہارے لیے یہ کتاب ہدایت و رحمت کیسے ہو سکتی ہے۔ چونکہ قرآن کا بصیرت، ہدایت اور رحمت ہونا کسی کے لیے بغیر فکر و غور، بغیر توجہ و تامل اور بغیر تدبر و تعمق کے ممکن نہیں۔ اس لیے اے مسلمانو! تم اس پر خوب غور و فکر سے کام لو اور جب اس کی تلاوت ہو تو کان لگا کر توجہ سے سنو اور خاموش رہو۔ اگر توجہ کرو گے اور خاموش رہو گے تو اس کا بصیرت ہونا، ہُدیٰ اور رحمت ہونا تم پر کھل کر سامنے آجائے گا اور اگر نہ سنو گے اور چپ نہ رہو گے تو تدبر و تفکر سے محروم رہو گے اور قرآن کے ذریعہ تمہیں نہ بصیرت ملے گی نہ ہدایت۔

اس نظر سے اگر اس آیتِ قرآنی کا مطالعہ کیا جائے تو یہ آیت اپنے سیاق و سباق سے بالکل مربوط معلوم ہوتی ہے۔ اس سے نہ لقوم یؤمنون کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے اور نہ لعلکم ترحمون کے منہ میں نیا مطلب ڈالنا پڑتا ہے۔ باقی امام رازی کا یہ کہنا کہ اگر آیت میں اہلِ ایمان کو خطاب ہوتا تو قرآن یہاں لعلکم ترحمون نہ کہتا، اس لیے بے جان ہے کہ عربی زبان میں لعل صرف ترجی کے لیے نہیں آتا بلکہ تعلیل کے لیے بھی آتا ہے۔ صاحبِ قاموس علامہ مجد الدین نے بصائر ذوی التمییز فی لطائف الکتاب العزیز میں لکھا ہے کہ لعل کئی معنی میں آتا ہے ایک توقع و ترجی ہے اور دوسرا تعلیل ہے۔ اگر یہاں تعلیل کے لیے ہو تو معنے بالکل صاف ہیں۔ جب قرآن پڑھا جائے توجہ کرو، خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے اور اگر ترجی کے لیے بھی ہو تو یہ ہماری نسبت سے ہے نہ کہ حق تعالیٰ شانہٗ کی نسبت سے، الزمخشری لکھتے ہیں کہ بادشاہوں کی عادت ہے کہ جب کسی چیز کا وعدہ کرتے ہیں تو اپنی شانِ استغنا کو ملحوظ رکھ کر لعل اور عسیٰ بولتے ہیں۔

بہرحال اس موضوع پر امام رازی کی یہ بات کہ اس آیت کے مخاطب اہلِ ایمان نہیں بلکہ اہلِ کفر ہیں۔ یعنی مسلمانوں سے یہ بات نہیں کہی جارہی ہے کہ جب قرآن پڑھا جائے تو کان لگاؤ اور خاموش رہو بلکہ کافروں سے کہی جارہی ہے۔ حیرت ہے کہ کچھ بزرگوں نے امام کے پیچھے پڑھنے کے شوق میں امام رازی کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ گویا یہ قرآن کا منطوق ہے۔ حالانکہ امام رازی کی بات کی نہ لغتِ عرب تائید کرتا ہے، نہ محولِ کلام اور نہ اجماع۔ کیونکہ امام احمد کی زبانی سُن آئے ہو کہ آیت کا بالاجماع نزول نماز کے بارے میں ہوا ہے۔ اس آیتِ قرآنی کی ضرب سے بچنے کے لیے یہ تاویل کہ یہ

مشرکین کے لیے ہے اہلِ ایمان کے لیے نہیں بالکل ایسی ہے جیسے یہ کہہ دیا جائے کہ سورۃ فاتحہ قرآن نہیں بلکہ اُم القرآن ہے ۔

کچھ نے آیتِ قرآنی سے پیچھا چھڑانے کے لیے یہ بھی راہ اختیار کی ہے کہ یہ قرآنی آیت یعنی اذا قری القرآن منسوخ ہے ۔ ذرا اس جرأت کی داد دیجئے کہ ایک آیت کا مطالبہ ہے کہ قرآن پڑھا جائے تو کان لگا کر سنو اور خاموش رہو ۔ اور دوسری آیت فاقرا ما تیسر من القرآن کہتی ہے کہ قرآن جس قدر آسانی سے پڑھ سکتے ہو پڑھ لو ۔ کیا اُمت میں سے آج تک کسی نے یہ بات کہی ہے کہ قرآن پڑھنے سے قرآن سننا اور چپ رہنا منسوخ ہو گیا ۔ انا للہ فالی اللہ المشتکی ، نسخ کا مسئلہ بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے ۔ گمان اور تخمین سے قرآن کی کوئی آیت منسوخ نہیں ہو سکتی اور صرف خیالی پلاؤ کے ذریعے اللہ کی کتاب بازیچۂ اطفال نہیں بنایا جا سکتا ہے ۔ ایک طرف تو لوگوں کو یہ سمجھائیں کہ آیت قرآنی ما تیسر من القرآن سے نماز میں قرأت قرآن کی فرضیت ثابت نہیں ہوتی ہے اور پھر اسی منہ سے یہ کہیں کہ اس آیت نے اذا قرء القرآن کو منسوخ کر دیا ہے ۔ لہٰذا ہر مقتدی پر سورۃ فاتحہ کا پڑھنا فرض ہے ۔ قرآن کی وہی آیت جس سے قرأت کی فرضیت کا انکار کیا جا رہا تھا اسی سے سورہ فاتحہ کی قرأت ثابت ہو گئی ۔ کوئی پوچھے بھلا یہ کیسے ۔

اور کچھ نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ صاحب اس آیت کا تو صرف یہی مطالبہ ہے کہ قرآن سنو اور خاموش رہو ۔ یہ مطالبہ تو نہیں ہے کہ مقتدی قرأت نہ کرے ۔ امام رازی نے اس کی کمزوری کو محسوس کر کے خود ہی جواب دیا ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے آیت میں استماع کا حکم دیا ہے ، سماع کا حکم نہیں دیا ۔ سماع اگر سننے کو کہتے ہیں تو استماع نام ہے کلام مسموع کے لیے سراپا توجہ ہو جانے کا ۔ ایک حدیث میں سماع اور استماع دونوں استعمال ہوئے ہیں ۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت یہ تھی کہ جب بسلسلہ جہاد تشریف لے جاتے اور کسی مقام پر حملہ کرانا چاہتے تو

کان یستمع الاذان فان سمع اذانا امسک والا اغار

تو پہلے اذان کی طرف متوجہ فرماتے اگر اذان سنتے تو حملہ نہ فرماتے ورنہ حملہ کر دیتے ۔

اگر استماع اور سماع ایک ہو تو اس حدیث کا مطلب بالکل مسخ ہو کر رہ جائے ۔

استماع کے معنے ہیں پورے طور پر کلام مسموع کی طرف متوجہ ہونا۔ قرآن میں حضرت موسیٰ کو کہا گیا ہے:۔

انا اخترتک فاستمع لما یوحیٰ

اس کا صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ مقتدی کا امام کے پیچھے قرأت میں مشغول ہونا فریضہ استماع میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اور جو قرارت کرتا ہے وہ استماع نہیں کرتا۔ اس لیے منطوق قرآنی تو استماع ہے اور مدلول قرآنی سننے والے کے لیے قرآت کی ممانعت ہے۔ جو لوگ بحالت اقتدار امام کے پیچھے آہستہ قرآت کرتے ہیں وہ اس قرآنی مطالبہ کو پورا نہیں کرتے ہیں۔ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ جب حضرت جبریل وحی لے کر آتے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بھی ساتھ ساتھ پڑھتے جاتے۔ الفاظ میں کان یحرک شفیتہ آپ ہونٹوں کو ہلاتے جاتے تھے لیکن حق سبحانہ نے آپ کو ہدایت فرمائی کہ لا تحرک بہ لسانک آپ اپنی زبان کو حرکت نہ دیں۔ پھر آپ کیا کریں۔ ارشاد ہوا اذا قرناہ فاتبع قرانہ جب ہم پڑھلیں تو تو پیچھے رہ پڑھنے کے۔ عبداللہ ابن عباس نے اس کا مطلب یہ بتایا ہے کہ:

فاستمع لہ وانصت آپ کان دھریں پوری توجہ کریں اور خاموشی اختیار کریں اس سے معلوم ہوا کہ آہستہ پڑھنا، ہونٹوں کو حرکت دینا، زبان کو ہلانا استماع اور انصات کے منافی ہے۔

بہر حال قرآن کی یہ آیت اس موضوع پر حجت قاطعہ ہے کہ نماز میں جب قرآن پڑھا جائے اس کی طرف پوری طرح توجہ کی جائے خاموش رہے اور کچھ نہ پڑھے۔ اور آیت قرآنی کے اس مطالبہ کی قوت کو پوری اُمت نے قبول کیا ہے۔ امام مالک، امام احمد، امام ابو حنیفہ اور ایک قول میں امام شافعی نے بھی فیصلہ کیا ہے کہ امام کی قرآت کے وقت میں مقتدی قرارت نہ کرے۔ امام شافعی کے دو قول ہیں ایک یہ کہ مقتدی قرآت نہ کرے اور ایک یہ کہ مقتدی قرآت کرے۔ یہ فیصلہ کہ ان دونوں میں سے کون سی بات نئی ہے اور کون سی پرانی۔ امام بیہقی اور حافظ ابن کثیر کی رائے یہ ہے کہ قول قدیم یہ ہے کہ جہری نمازوں میں قرآت نہ کرے اور قول جدید یہ ہے کہ جہری ہوں یا سری تمام نمازوں میں قرآت واجب ہے۔ امام شافعی کے مذہب میں قدیم اور جدید کے اختلاف نے اس مسئلہ

ہیں سنگین صورت اختیار کر لی ہے۔ جن لوگوں نے کتاب الام کو امام شافعی کی قدیم کتابوں میں شمار کیا ہے۔ ان کا موقف یہ ہے کہ امام کے پیچھے نہ پڑھنے کی بات امام شافعی کا قول قدیم ہے۔ لیکن یہ بات محققین کے نزدیک تاریخی طور پر صحیح نہیں ہے۔ حافظ ابن کثیر نے البدایہ میں علامہ محمد بن اسماعیل الیمانی نے توضیح الافکار میں اور حافظ جلال الدین السیوطی نے حسن المحاضرہ میں بالتصریح لکھا ہے کہ الام امام شافعی کی کتب جدیدہ میں سے ہے۔

بہر حال جدید ہو یا قدیم اس حد تک تو امام شافعی بھی دوسرے اماموں کے ہمنوا ہیں کہ اگر ایک شخص رکوع میں ملا اور اسے امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنے کا موقعہ نہیں ملا تو اس کو رکعت مل گئی اور اس کی نماز ہو گئی۔ کتاب الام میں اور فقہ شافعیہ کی متعدد کتابوں میں اس کی تصریح ہے۔ ابن عبدالبر نے تصریح کی ہے کہ :

> یہ امام مالک، شافعی، ابوحنیفہ، ان کے ساتھیوں، ثوری، الاوزاعی، ابوثور، احمد، اسحاق راہویہ کا مذہب ہے۔

بات تشنہ تکمیل رہ جائے گی اگر ہم یہاں عام شارحین قرآن کی تشریحات پیش نہ کریں۔ حافظ ابن جریر طبری اس آیت کی تشریح میں فرماتے ہیں :

> اللہ سبحانہ ان اہل ایمان سے فرماتے ہیں جو اس کی کتاب کو مانتے ہیں اور جن کے لیے قرآن ہدایت و رحمت ہے کہ اے مسلمانو! جب تمہارے سامنے قرآن کی تلاوت ہو تو اس کو سنو یعنی اپنے کانوں کو اس طرف لگا دو تا کہ تم اس کی آیات کو سمجھو اور اس کی نصیحتوں سے عبرت پذیر ہو اور چپ رہو تا کہ تم اس پر تدبر و تفکر کر سکو اور اس میں لغو نہ کرو کیونکہ اس سے تمہیں تدبر کا موقعہ نہ ملے گا تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔ تمہارا رب تم پر رحمت کرے گا جب تم اس کی نصیحتوں پر عمل کرو گے اور جن فرائض کو اللہ نے تمہارے لیے بیان کیا ہے ان کی پابجائی کرو گے۔

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ نے اپنی مشہور تفسیر میں فرماتے ہیں :

> جب اللہ سبحانہ نے یہ بتا دیا کہ قرآن عزیز پوری انسانیت کے لیے بصیرت، ہدایت اور رحمت ہے تو اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ قرآن کی تعظیم کے لیے جب اس کی تلاوت ہو تو خاموش ہو جاؤ۔ ایسا نہ ہو جیسا کہ مشرکین

مکہ کا وطیرہ رہا ہے کہ لا تسمعوا هذا القرآن لیکن یہ خاموش رہنے کا حکم تاکیدی طور پر فرض نمازوں میں جب کہ امام بلند آواز سے قرأت کر رہا ہو جیسا کہ امام مسلم نے اپنی صحیح میں ابوموسیٰ کے حوالہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ امام بنایا ہی جاتا ہے اس لیے کہ اس کی اقتدار کی جائے جب وہ اللہ اکبر کہے تو تم اللہ اکبر کہو اور جب پڑھے تو تم خاموش رہو۔

علامہ ابوالسعود اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں :

قرآن کریم کی سماعت کی طرف ایسی توجہ کرو جس سے تحقیق اور قبولِ حق کا جذبہ نظر آئے اور اثنائے قرأت میں بالکل خاموش رہو اور قرأت کے پورا ہونے تک نہایت تعظیم سے اس کو سنو تاکہ توجہ کا پورا اور مکمل فائدہ ہو۔ آیت کے ظاہری الفاظ اس کے مقتضی نہیں کہ نماز میں اور خارج از نماز میں جہاں اور جس وقت بھی قرأت ہوتی ہو خاموش رہنا چاہیے۔ لیکن جمہور صحابہ کرام کا مسلک یہ ہے کہ وجوبی طور پر خاموش رہنا صرف مقتدی کے لیے ہے۔

امام حسین بن محمود بغوی اپنی تفسیر معالم التنزیل میں لکھتے ہیں :

ان تمام اقوال میں صحیح ترین قول پہلا ہے وہ یہ کہ آیت اذا قری القرآن کا شانِ نزول صرف نماز ہے اس لیے کہ آیت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی ہے اور جمعہ مدینہ میں فرض ہوا ہے۔ لہٰذا خطبہ اس کا شانِ نزول کیوں کر ہو سکتا ہے ہاں مگر علماء کا اتفاق ہے کہ خطبہ کے وقت میں بھی خاموش رہنا چاہیے۔

علامہ ابوحیان الاندلسی البحر المحیط میں اس کی تشریح یوں فرماتے ہیں ،

اللہ سبحانہ نے جب پہلے بتا دیا کہ قرآن بصیرت ، ہدایت اور رحمت ہے۔ اب حکم دیا ہے کہ جب قرآن کی قرأت ہو تو متوجہ ہو جاؤ اور خاموش رہو، کیونکہ جو کتاب بصیرت ، ہدایت اور رحمت کے اوصاف سے موصوف ہے اس کا حق یہی ہے کہ اس کی طرف بھرپور توجہ کی جائے تاکہ استماع اور خاموشی کے ذریعے یہ عظیم نتائج حاصل ہو سکیں۔ بے بصیرتی کا

بصیرت سے، گمراہی کا ہدایت سے، غضب کا رحمت سے مداوا ہو سکے۔ ظاہر یہی ہے کہ قرآن جب بھی پڑھا جائے اس کو سنا جائے اور خاموشی اختیار کی جائے۔

علامہ سلیمان الجمل نے الفتوحات الالٰہیہ میں اس کی تشریح اس طرح کی ہے؛

علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ جب قرآن کی تلاوت ہو تو سننے اور خاموش رہنے کا محل کون سا ہے کیونکہ یہ دونوں امر ہیں اور امر وجوب کے لیے ہوتا ہے۔ اس کا تقاضا یہی ہے کہ سننا اور خاموش رہنا واجب ہو۔ پہلی رائے یہ ہے کہ حکم عام ہے جس وقت بھی اور جہاں بھی قرآن پڑھا جائے سننا اور خاموش رہنا واجب ہے۔ یہ حسن بصری اور ظاہریہ کی رائے ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ یہ حکم نماز میں باتیں کرنے والوں کے لیے آیا ہے۔ ان سے کہا گیا ہے کہ باتیں نہ کرو خاموش ہو کر قرآن سنو۔ تیسری رائے یہ ہے کہ امام کے پیچھے قرأت بالجہر کی ممانعت کے بارے میں آیا ہے۔ عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو امام کے ساتھ پڑھتے سنا، نماز کے بعد آپ نے فرمایا کہ کیا ابھی تک اللہ کے حکم اذا قری القرآن فاستمعوا لہ کو سمجھنے کا وقت نہیں آیا۔

علامہ حافظ الدین عبداللہ بن احمد نسفی مدارک التنزیل میں لکھتے ہیں؛

آیت بظاہر یہی چاہتی ہے کہ نماز اور غیر نماز میں قرأت قرآن کے موقعہ پر سننے والوں کو متوجہ ہونا چاہیے اور خاموش رہنا چاہیے۔

علامہ محمود بن احمد زمخشری اپنی تفسیر کشاف میں لکھتے ہیں:۔

آیت کی ظاہری سطح یہی چاہتی ہے کہ نماز کی حالت ہو یا نماز سے باہر۔ بہرصورت قرآن کی طرف توجہ کرنا اور خاموش رہنا ضروری ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لوگ نماز میں باتیں کرتے تھے۔ قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی۔ پھر یہ بات ختم ہو گئی کہ خارج از نماز قرآن کی تلاوت ہو تو سننے والا خاموش رہے۔

قاضی بیضاوی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں؛

آیت کا ظاہر اسی کا مقتضی ہے کہ جہاں قرآن کی تلاوت ہو سننا اور خاموش رہنا واجب ہو لیکن عام عُلماء نماز سے باہر سننے اور خاموش رہنے کو مستحب قرار دیتے ہیں۔

حافظ جلال الدین السیوطی نے الدر المنثور میں اس آیت کی تشریح میں جس قدر روایات درج کی ہیں۔ ان میں بیشتر وہ ہیں جو بتا رہی ہیں کہ آیت کا تعلق نماز سے ہے یعنی آیت کا مطالبہ یہ ہے کہ امام جب نماز میں قرآت کرے تو تم سنو اور خاموش رہو۔ ان میں ابوہریرہ، ابن عباس، محمد بن کعب القرظی۔ امام مجاہد حضرت عبداللہ بن مغفل، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت علی، حضرت زید بن ثابت، ابراہیم نخعی، ابوالعالیہ، کی روایات ہیں۔ علامہ شوکانی نے اپنی مشہور تفسیر فتح القدیر میں اولیت ان ہی روایات کو دی ہے جن سے نماز میں امام کے پیچھے پڑھنے کی ممانعت ثابت ہوتی ہے آخر میں لکھا ہے کہ:

اسی قسم کی سلف سے روایات ہیں اور بعضوں نے یہ بات کھول کر بتائی ہے کہ یہ آیت نماز میں امام کی قرآت کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

علامہ سید محمود آلوسی بغدادی اس آیت کی تشریح میں فرماتے ہیں۔

آیت کا مطالبہ یہ ہے کہ نماز یا خارج از نماز میں جب بھی قرآن کی قرآت ہوتی ہو تو خاموش رہنا چاہیے لیکن خارج از نماز سماع و عدم سماع دونوں کے جواز پر دلیل قائم ہو چکی ہے لیکن جہری نمازوں میں انصات بہر حال ضروری ہے اور ایسے ہی سری نمازوں میں بھی۔ کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ امام پڑھ رہا ہے۔

آیئے سر راہے جدید شارحین قرآن سے بھی کچھ علمی استفادہ کر لیجئے۔ مشہور مفسر قرآن علامہ سید رشید رضا اپنی شہرہ آفاق المنار میں لکھتے ہیں:

اس آیت میں شیطان سے جھٹکوں سے بچنے اور قرآن کے ذریعے رحمت حاصل کرنے کا راستہ بتایا ہے۔ فرمایا کہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ جب قرآن پڑھا جاتے تو اسے سنو اور خاموش رہو۔ استماع سمع سے زیادہ بلیغ ہے کیونکہ استماع کے معنے ہیں ارادہ اور نیت کے ساتھ

قوتِ شنوائی کو کلام کے ادراک کے لیے متوجہ کرنا۔ اور سمع تو بغیر ارادے کے بھی ہو سکتی ہے۔ انصات نام ہے استماع کی خاطر خاموش رہنے کا تاکہ پڑھنے والا جو کچھ پڑھ رہا ہے اس سے ہٹ کر کسی اور چیز میں مشغول نہ ہو لہٰذا جو شخص استماع اور انصات کرتا ہے وہ بھی سمجھنے اور غور کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اسی کے لیے رحمت کی اُمید کی جاتی ہے۔ یہ آیت دلیل ہے اس بات کی جب قرآن کی تلاوت ہو اس کو سنا جائے اور خاموش رہے خواہ نماز میں ہو یا نماز سے باہر۔ ابن المنذر نے اس پر اجماع نقل کیا کہ بیرونِ نماز و خطبہ قرآن سننا اور خاموش رہنا واجب نہیں ہے۔ کیونکہ یہ بہت بڑے حرج کا باعث ہے کیونکہ اس طرح قرآن کی تلاوت کی خاطر زندگی کے سارے مشاغل کو چھوڑنا پڑے گا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی حد تک تو بات میں معقولیت ہے۔ آپ کی تلاوت تبلیغ اور وعظ و ارشاد کے لیے ہوتی تھی اس لیے کسی مسلمان کے لیے جائز نہ تھا کہ آپ قرآن تلاوت کر رہے ہوں اور قرآن نہ سنے۔ یہی امام کے پیچھے متقدی اور خطیب کے سامنے سامعین کا حال ہے۔ آیت کا اصل موضوع نماز ہے اسی لیے لوگوں نے اس آیت سے امام کے پیچھے جہری نمازوں میں متقدی کے لیے پڑھنے کی ممانعت پر استدلال کیا ہے۔

الاستاذ الکبیر علامہ احمد مصطفےٰ المراغی نے اپنی تفسیر المراغی میں اس آیت کی تشریح بڑے پیارے انداز میں کی ہے۔

اے مسلمانو! جب تمہارے سامنے قرآن تلاوت کیا جائے تو اپنے کانوں کو اس کی طرف متوجہ کرو تاکہ تم اس کی آیات کو سمجھ لو اور اس کے مواعظ تمہارے لیے سامانِ عبرت ہو، اور خاموش رہو تاکہ تمہیں تدبر و تعقل کا موقعہ ملے اور یہ اس لیے کرو تاکہ اس عبرت گیری اور نصیحت پذیری کے نتیجہ میں تم پر تمہارا رب رحمت کرے۔ جو شخص خاموشی کے ساتھ قرآن کے لیے سراپا توجہ ہوگا۔ وہ بھی قرآن میں تدبر کر سکے گا اور جو ایسا ہوگا وہ اس لائق ہے کہ اس پر خدا کی رحمت ہو۔

علامہ الشام محمد جمال الدین قاسمی اپنی مشہور تفسیر محاسن التاویل میں اس آیت کی تشریح میں فرماتے ہیں :

ظاہر آیت کا مطالبہ یہی ہے کہ قرآت قرآن کے وقت نماز اور غیر نماز میں متوجہ ہو کر سننا اور خاموش رہنا واجب ہے ۔ یہی ظاہر پیہ کہتے ہیں ۔ الحسن البصری اور ابومسلم الاصفہانی کی رائے ہے ۔ امام مسلم نے اپنی صحیح میں ابوموسیٰ اشعری کے حوالہ سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی لکھا ہے کہ امام بنایا ہی جاتا ہے اس لیے کہ اس کی اقتدار کی جائے لہٰذا جب وہ اللہ اکبر کہے تم بھی اللہ اکبر کہو اور جب وہ قرآت کرے تو تم خاموش رہو ۔ اربابِ سنن نے بھی بحوالہ ابوہریرہ یہ روایت پیش کی ہے ۔

ان کے علاوہ اور بھی شارحین قرآن ہیں ۔ سب کا تفسیری جہرہ پیش کرنا مقصد نہیں ان تشریحات سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا ۔ سب کے سب اپنی تشریحات میں قرآن کی اس آیت میں استماع و انصات کے مطالبہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کر رہے ہیں ۔ ایسے بہت کم جنہوں نے آیت کی ضرب کاری سے بچنے کے لیے یہ کہہ کر دفاع کیا ہے کہ آیت کے مخاطب مسلمان نہیں مشرکین ہیں ۔ مولانا عبدالحی نے اس رائے کو پامال اور رکیک کہا ہے ۔ یہ امام رازی کی جدت ہے ۔ ان کی یہ جدت طرازی خود زبانِ حال سے بول رہی ہے کہ اس آیت کی قوت کو وہ شدت سے محسوس کر رہے ہیں ۔ امام بیہقی کو برملا یہ اقرار کرنا پڑا ہے :۔

ہم اس بات کا انکار نہیں کرتے ہیں کہ یہ آیت نماز کے بارے میں یا نماز اور خطبہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے جیسا کہ سلف امت کے اقوال ہم نے نقل کیے ہیں لیکن ہمارا اعتراض یہ ہے کہ انھوں نے یا ان میں سے بعض نے حدیث کو مختصر کر دیا ہے اور اس آیت کا شانِ نزول مطلق نماز کو قرار دیا ہے ۔

امام بیہقی کو اس کا اقرار ہے کہ آیت قرآنی کا شانِ نزول نماز ہے لیکن اعتراض یہ ہے کہ صرف نماز نہیں بلکہ خطبہ بھی ہے جیسا کہ حدیث میں ہے ۔ لیکن یہ خیال بالکل بے جان ہے کیونکہ جمعہ اور عیدین کا وجوب مدینہ طیبہ میں ہوا ہے اور آیتِ قرآنی مکی ہے ۔

پھر اس کا شانِ نزول خطبہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہاں آیت کے حکم میں خطبہ عموم الفاظ کی وجہ سے داخل ہے۔ جمہور نے خطبہ کی بات کو بے جان قرار دیا ہے۔ خود امام رازی نے یہ بات کہہ کر آیت کا نزول خطبہ میں ہوا ہے لکھا ہے کہ قانون عام ہے اسے خطبہ تک کیسے محدود کیا جا سکتا ہے۔ اور نواب علامہ شوکانی جو امام کے پیچھے قرآت کے شوق میں اجماعیات کا بھی انکار کر دیتے ہیں۔ وہ دعاءِ توجیہہ انی وجھت وجھی للذی فطر... الخ کے بارے میں امام کے پیچھے مقتدی کو منع کرتے ہیں اور وجہ یہ بتاتے ہیں:۔

امام جب اونچی قرآت کر رہا ہو تو مقتدی کو اس وقت قرآت نہیں کرنی چاہیے کیونکہ قرآن کریم اور سنت کے عمومات اور اکثر دلیلیں بتاتی ہیں کہ امام جب اونچی قرآت کر رہا ہو تو اس وقت مقتدی پر استماع اور انصات واجب ہے۔

خطبہ کی حد تک تو نواب صدیق حسن خاں رحمہ اللہ نے بھی لکھا ہے:

میں کہتا ہوں کہ آیت کے خطبہ کے بارے میں نازل ہونے میں شبہ ہے کیونکہ آیت قرآنی مکی ہے اور خطبہ مدینہ میں واجب ہوا ہے۔ جیسا کہ تاریخ سے ہر باخبر جانتا ہے۔ قرطبی، خطیب اور خازن نے ایسا ہی بتایا ہے...

آیتِ قرآنی سے گریز کی راہیں

کچھ لوگ اس آیت سے بچنے کے لیے یہ بہانہ بھی تراشتے ہیں کہ یہ آیتِ قرآنی اذا قری القرآن... الخ قرآن کی سورہ مزمل کی آیت فاقرءوا ما تیسر من القرآن سے منسوخ ہے اور اپنے اس موقف کی انہوں نے یہ دلیل پیش کی ہے کہ ابو نصر اوذی کہتے ہیں کہ آیت فاقرءوا ما تیسر من القرآن مدینہ میں نازل ہوئی۔ سیوطی لکھتے ہیں کہ فاقرءوا ما تیسر مدینہ میں نازل ہوئی۔ لہٰذا سورۂ مزمل کی آیت فاقرءوا ما تیسر من القرآن ناسخ ہے اور اذا قری القرآن منسوخ ہے۔

یہ دعویٰ قطعاً بے بنیاد اور غلط ہے کیونکہ۔ اولاً حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ امام ابو نصر کا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ سورہ مزمل میں آیت فاقرءوا ما تیسر من القرآن مدینہ میں نازل ہوئی کیونکہ پوری امت اس پر متفق ہے کہ سورہ مزمل ساری مکی ہے۔ امام

ابو نصر کو سورہ مزمل میں قتال کے ذکر سے یہ شبہ ہوا ہے کہ یہ سورت مدنی ہے لیکن ایسا سمجھنا درست نہیں ہے کیونکہ

علم ان سیکون منکم مرضی واخرون یقاتلون فی سبیل اللہ

بیماری اور جہاد میں پابندی کے ساتھ تہجد کی نماز ادا نہیں ہو سکے گی اس لیے اس کی تاکید اللہ تعالیٰ نے ختم کر دی ہے۔ اور اس آیت میں سیکون سے جہاد کی خوشخبری سنا کر جہاد کی فرضیت سے پہلے ہی تہجد کی نماز کی فرضیت ساقط کر دی ہے۔ اس سے یہ کیونکہ ثابت ہوا کہ جہاد اور قتال کا حکم اس وقت نازل ہو چکا تھا۔ بہرحال آیت مکہ میں نازل ہوئی۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نے یہاں جو فیصلہ کن بات فرمائی ہے وہ اس لائق ہے کہ ناظرین معالم القرآن کے مطالعہ میں آئے۔ فرماتے ہیں :

اول قرأت مقتدی کی فرض تھی۔ اس آیت یعنی اذا قرئ القرآن الخ سے ممنوع ہو گئی اور مدینہ طیبہ میں بھی یہ حکم پہنچ گیا تھا۔ گویا ایک کلیہ دین کا مقرر ہو گیا تھا کہ مقتدی کچھ نہ پڑھے حسب حکم آیت کے ـــــ اور آیت فاقرؤا ماتیسر من القرآن چونکہ اس سے پہلے نازل ہوئی تھی بحق مقتدی منسوخ ہو گئی۔ اور امام و منفرد کے حق میں ویسی ہی قطعی اس کا حکم باقی تھا۔ کیونکہ منسوخ البعض قطعی رہتی ہے چنانچہ اس قاعدہ کو سب اہل علم جانتے ہیں۔ لہٰذا مقتدی کے حق میں سورہ مزمل کی آیت سے استدلال کرنا درست نہیں ہے کیونکہ آیت مزمل کی نزول میں پہلے ہے اور سورہ اعراف کی یہ آیت بعد میں نازل ہوئی اور آخر اول کا ناسخ ہوتا ہے حکم بقدر تعارض ہیں۔

بہرحال سورۂ مزمل پوری مکی ہے۔ السیوطی لکھتے ہیں کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ سورہ مزمل کی آخری آیت مدینہ میں نازل ہوئی ہے وہ غلط فہمی کا شکار ہیں۔ کیونکہ حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ سورۂ مزمل کا آخری حصہ پہلے حصہ کے نزول کے پورے ایک سال کے بعد نازل ہوا ہے۔ اور سورۂ مزمل قرآن عزیز کی ابتدائی سورتوں میں سے ایک ہے۔

بچنے کی ایک اور راہ

کچھ بزرگ یہ بھی فرماتے ہیں کہ قرآن کی یہ دونوں آیتیں ایک دوسرے کے خلاف

ہیں فاقرؤا ماتیسر من القرآن سے امام مقتدی اور منفرد کو قرآن پڑھنے کی اجازت مل رہی ہے اور اذا قری القرآن سے مقتدی کو منع کیا جارہا ہے۔ اس کو یوں بھی پیش کرتے ہیں کہ دونوں میں تعارض ہے اور تعارض کا حکم یہ ہے کہ دونوں کو نظر انداز کر دیا جائے۔ لہٰذا قرآن کی آیت اذا قری القرآن سے مقتدی کے لیے ترک قرأت پر استدلال صحیح نہیں ہے۔

تعارض کی صورت میں تساقط وہاں ہوتا ہے جہاں جمع ممکن نہ ہو۔ یہاں دونوں کے نزدیک جمع ممکن ہے مقتدی پر قرأت کا بوجھ ڈالنے والوں اور مقتدی کو قرأت کی ذمہ داری سے سبکدوش کرنے والوں کے نزدیک، جو مقتدی پر قرأت واجب کہتے ہیں وہ اس طرح جمع کرتے ہیں کہ فاقرؤا ماتیسر من القرآن سے سب کے لیے مطلق قرأت کو ضروری کہتے ہیں اور اذا قری القرآن سے سورہ فاتحہ کو مستثنیٰ کر لیتے ہیں یعنی جب امام سورۃ فاتحہ پڑھے تو مقتدی بھی پڑھے اور جب امام باقی قرآن کی تلاوت کرے تو مقتدی خاموش رہے۔ اور جو لوگ مقتدی پر قرأت کی ذمہ داری نہیں ڈالتے وہ کہتے ہیں کہ فاقرؤا ماتیسر من القرآن سے امام اور منفرد پر قرأت فرض ہے اور اذا قری القرآن سے مقتدی قرأت کی ذمہ داری سے سبکدوش ہے۔ مقتدی کا استثنا زیادہ قرین صواب ہے۔ فاتحہ کے استثنا سے۔ کیونکہ یہ آیت جمہور کے خیال میں عام مخصوص البعض ہے۔ آخر مدرک رکوع کو بھی اس سے مستثنیٰ کر کے مدرک رکعت قرار دیا گیا ہے۔ اور اذا قری القرآن میں کسی درجہ میں تخصیص اصل حکم کو ختم کرنے کے مترادف ہے۔

اصل یہ ہے کہ ان دونوں آیتوں میں تعارض ہی نہیں ہے۔ کیونکہ تعارض کے لیے ضروری ہے کہ

۱۔ دونوں حکموں کا محل ایک ہو۔
۲۔ دونوں میں تقدم و تاخر کا پتہ نہ ہو۔
۳۔ ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ دی جاسکے۔
۴۔ دونوں میں تطبیق ممکن نہ ہو۔

لیکن ان دونوں آیتوں میں تعارض کی ایک شرط بھی موجود نہیں ہے۔ یہاں دونوں کا محل جدا جدا ہے۔ آیت اذا قری القرآن کا محل فرض نماز ہے۔ جیسا کہ عبداللہ بن عباس

بیان کرتے ہیں اور آیت فاقرءوا ما تیسر من القرآن کا محل تہجد کی نماز ہے۔ جیسا کہ ابوداؤد میں تصریح ہے۔ اور امام بیہقی لکھتے ہیں۔ اہل علم میں مشہور و معروف ہے۔ حافظ ابن القیم لکھتے ہیں کہ یہ آیت صلاۃ تہجد کے بارے میں ہے۔ جب ایک آیت کا محل فرضی نماز ہے اور دوسری کا نفلی نماز ہے تو پھر تعارض کیسے۔ تعارض کے لیے وحدت محل شرط ہے۔ دونوں میں تقدم و تاخر ہے۔ سورہ مزمل کا نزول بہت پہلے ہوا ہے جبکہ سورۃ اعراف بعد میں نازل ہوئی ہے۔ وجہ ترجیح بالکل ظاہر ہے۔ اگر بالفرض دونوں کا محل ایک ہوتا اور تقدم و تاخر بھی معلوم نہ ہوتا تب بھی اذا قری القرآن کے حکم کو ترجیح ہوتی۔ کیونکہ اس آیت میں مقتدی کو قراءت سے منع کیا گیا ہے۔ ترجیح کے لیے اتنی بات کافی ہے۔ علاوہ ازیں ان دو آیتوں میں جمع و تطبیق چنداں دشوار نہیں ہے کیونکہ اذا قری القرآن مقتدی کے بارے میں ہے اور فاقرءوا ما تیسر منفرد اور امام کے بارے میں ہے۔ یہ تطبیق کہ فاقرءوا ما تیسر سے سورہ فاتحہ اور قرآن مراد ہے اور اذا قری القرآن سے فاتحہ مستثنیٰ ہے۔ غیر منطقی اور غیر اصولی ہے۔ اسے کوئی ذوق سلیم پیش نہیں کر سکتا۔ حیرت ہے کہ کچھ بزرگوں نے اس جمع سے اپنے آپ کو کیسے مطمئن کر لیا ہے۔

ایک اور عذر بارد

کچھ بزرگوں نے اس آیت کی طاقت سے بچنے کے لیے یہ عذر بارد کیا ہے کہ آیت اِذَا قُرِیَ الْقُرْآنُ مکی ہے اور امام کے پیچھے قراءت کرنے کا حکم مدینہ میں ہوا ہے۔ کیونکہ عبادہ ابن الصامت مدنی ہیں اور ابوہریرہ ۷ھ میں مسلمان ہوئے۔ قرآن کی اس آیت کی چوٹ سے بچنے کی یہ تدبیر بھی بالکل بے جان ہے کیونکہ قرآن عزیز کی کسی آیت اور حکم کو منسوخ کرنے کے لیے کسی محکم قطعی حکم کی ضرورت ہے۔ حضرت عبادہ اور حضرت ابوہریرہ کی اخبار آحاد سے قرآن حکیم کی آیت کیسے منسوخ ہو سکتی ہے۔ پھر حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ کسی متاخر الاسلام صحابی کی روایت سے متقدم الاسلام صحابی کی روایت کو صرف تقدم و تاخر کی وجہ سے منسوخ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ نہ معلوم متاخر الاسلام صحابی کی روایت سے قرآنی حکم قطعی کیسے منسوخ کیا جا سکتا ہے۔ پھر کیا صرف حضرت عبادہ ابن الصامت اور حضرت ابوہریرہ ہی مدنی تھے۔ اور حضرت

ابوموسیٰ الاشعری، حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت ابوالدرداء، حضرت انس بن مالک
حضرت زید بن ثابت اور حضرت مالک بن بحینہ مدنی نہ تھے جن سے امام کے پیچھے مقتدی
کے لیے قرأت کی ممانعت کی حدیثیں آتی ہیں۔ اور یہ حضرت ابوہریرہ کا قول ہے۔
اس قول سے قرآن کی آیت کیسے منسوخ ہو سکتی ہے جبکہ قاعدہ یہ ہے کہ مرفوع
حدیث کے مقابلہ میں بھی اُمت میں سے کسی کا قول قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ حیرت
ہے کہ ایک طرف موقوفاتِ صحابہ کو حجت نہیں مانتے اور دوسری ان سے قرآنی آیت
اذا قری القرآن کو منسوخ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں ۔

ایک اور راہ فرار

امام کے پیچھے قرأت کا شوق پورا کرنے کی خاطر اس آیت قرآنی کی ضرب سے بچنے
کی ایک تدبیر یہ بھی کچھ نے اختراع کی ہے کہ اس آیت کا شانِ نزول خطبہ ہے لہٰذا
یہ آیت امام کے پیچھے پڑھنے سے نہیں روکتی۔ اس بے حقیقت اور بے کار بات
کی علمی دُنیا میں کوئی قدر و قیمت نہیں ہے جب کہ دلائل و براہین سے یہ بات ثابت
ہو چکی ہے کہ اس آیت کا شانِ نزول نماز ہے۔ خطبہ وغیرہ اس کے عمومی حکم میں
داخل ہے۔ بے شک یہ سعید بن جبیر، مجاہد اور عطاء کی رائے ہے لیکن محققین نے
اسے رد کر دیا ہے کیونکہ یہ آیت مکی ہے اور جمعہ کی فرضیت سنہ ۱ھ میں مدینہ میں ہوئی
جیسا کہ امام ابن جریر نے لکھا ہے اور امام بغوی بھی معالم میں تصریح کر چکے ہیں
کہ آیتِ قرآنی مکی ہے اور جمعہ کا معاملہ مدنی زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ امرِ واقعہ
یہ ہے کہ آیتِ قرآنی کا شانِ نزول تو نماز اور صرف نماز ہے لیکن جن حضرات نے یہ
کہا ہے کہ اس آیت کا شانِ نزول خطبہ ہے تو اُن کی مراد یہ ہے کہ اس آیت کا مضمون
عمومِ الفاظ کے اعتبار سے خُطبہ کو بھی شامل ہے۔ شاہ ولی اللہ الفوز الکبیر میں لکھتے ہیں:

> صحابہ و تابعین بسیار بود کہ نزلت فی کذا و کذا می گفتند و غرض
> ایشاں تصویر با صدق آں این آیت بود۔

صحابہ و تابعین اکثر و بیشتر کہتے کہ یہ آیت فلاں واقعہ میں نازل ہوئی۔ ان
کا منشا اس سے صرف یہ ہوتا کہ یہ واقعہ میں اس آیت کے مصداق میں داخل ہے ۔

یہ بات امام بیہقی کا نام لے کر پیش کی جا رہی ہے۔ حالانکہ امام بیہقی اپنی کتاب میں لکھ چکے ہیں کہ عبداللہ ابن مسعود، عبداللہ بن عباس، مجاہد بن جبیر، سعید بن المسیب، الحسن البصری، ابوالعالیہ، محمد بن شہاب الزہری، عطا ابن ابی رباح اور محمد بن کعب القرظی جیسے سب اکابر اس آیت کی شان نزول نماز کو بتلاتے ہیں۔ حافظ ابن جریر لکھ چکے ہیں کہ ان تمام اقوال میں سب سے زیادہ صحیح اور راجح بات یہ ہے کہ اس آیت کا شان نزول نماز ہے۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ ضحاک، ابراہیم نخعی، قتادہ، شعبی اور عبدالرحمان بن زید بن اسلم فرماتے ہیں کہ آیت کا شان نزول نماز ہے۔ اس کے باوجود پھر یہ کہنا کہ آیت کا شان نزول خطبہ ہے دھاندلی کے سوا کیا ہے۔

ایک اور معذرت

کچھ بزرگوں کی جانب سے اس آیت کے ذریعہ مقتدی کو امام کے پیچھے قرأت کی ممانعت پر یہ معذرت بھی پیش کی گئی ہے کہ یہ آیت نماز میں باتیں کرنے پر نازل ہوئی تھی یعنی اس آیت کے ذریعے مقتدی کو امام کے پیچھے قرأت سے نہیں بلکہ باتیں کرنے سے روکا گیا ہے۔ ایسا سمجھنا بھی غلط ہے کیونکہ:

اوّلاً، صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ نماز بات چیت کی ممانعت اس سے نہیں بلکہ سورہ بقرہ کی آیت قُومُوا لِلّٰہِ قَانِتِیْنَ سے ہوئی ہے۔

ثانیاً، زید بن ارقم کی روایت سے یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ صحابہ کرام نماز میں ہجرت کے بعد کی باتیں کرتے تھے۔ یہ مدنی زندگی کی بات ہے۔ قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی قُومُوا لِلّٰہِ قَانِتِیْنَ، سوچنے کی بات ہے کہ اگر قرآن کی اس آیت اِذَا قُرِیَ الْقُرْاٰنُ سے تکلم فی الصلوٰۃ ممنوع ہو چکا تھا تو صحابہ کرام مدینہ میں ہجرت کے بعد کیسے باتیں کرتے۔ دونوں باتیں بالکل واضح اور بے غبار ہیں۔

ایک یہ کہ نماز بات چیت پر پابندی قرآن کی آیت قُومُوا لِلّٰہِ قَانِتِیْنَ کے ذریعے عمل میں آئی ہے۔

دوسری یہ کہ بات چیت پر پابندی مدینہ میں ہوئی ہے نہ کہ مکہ میں اور سورۃ اعراف کی آیت اِذَا قُرِیَ الْقُرْاٰنُ مکی ہے نہ کہ مدنی۔

السیوطی نے الدر المنثور میں ان دو باتوں کی ایک سے زیادہ روایات درج کی ہیں مثلاً
بخاری و مسلم و ابو داؤد میں زید بن ارقم کہتے ہیں کہ ہم زمانۂ نبوت میں نماز میں باتیں کرتے
تھے یہاں تک کہ قرآن کی آیت وَ قُوۡمُوۡا لِلّٰهِ قٰنِتِیۡنَ نازل ہوئی اور ہمیں چپ رہنے کا حکم
ہوا۔ اور مسلم میں ہے کہ ہمیں بات چیت سے روک دیا گیا۔ اس کے علاوہ طبرانی نے
ابن عباس کی، ابن جریر و ابن المنذر نے عکرمہ کی، سعید بن منصور نے محمد بن کعب کی،
عبد بن حمید نے عطیہ کی، عبدالرزاق نے مجاہد کی روایات پیش کی ہیں جن سے معلوم ہوتا
ہے کہ نسخ کلام مدینہ میں ہوا ہے۔ اور اس بات کی تائید میں جو روایات پیش کی جاتی
ہیں کہ نماز میں بات چیت کی ممانعت اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ...الخ سے ہوئی ہے وہ سب
پایہ اعتبار سے گری ہوئی اور کمزور ہیں۔ ایک روایت میں محمد بن دینار ہے دوسری میں
موسل بن اسماعیل ہے، تیسری میں عبداللہ بن عامر اور چوتھی میں عاصم بن عمر ہے۔ یہ سب
ضعیف منکر الحدیث، کثیر الخطا، متروک ہیں۔ اس قسم کی روایات کے سہارے مسائل کا
فیصلہ کرنا اہلِ علم کے شایانِ شان نہیں ہے۔

ایک اور بہانہ

کچھ بزرگوں نے اس گرفت کو زیادہ ہی محسوس کیا۔ انہوں نے اس سے گلو خلاصی کے
لیے ایک اور راہ نکالی۔ اور وہ یہ کہ آیت اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ میں استماع اور انصات کا حکم
ہے اور ان دونوں کا مطلب یہی ہے کہ مقتدی کو بحالت قرأتِ امام توجہ کرتے ہوئے
خاموشی اختیار کرنی چاہیے اور جب امام قرأت کر رہا ہو اس وقت مقتدی کو کچھ نہ پڑھنا
چاہیے اور مکمل خاموشی اختیار کرنی چاہیے لیکن مقتدی کو سکتاتِ امام میں قرأت کرنے
سے یہ آیت نہیں روکتی ہے۔ اور نو اور ہمارے مولانا عبدالحی لکھنوی بھی امام الکلام میں
اسی وسوسہ میں مبتلا ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ دو سکتوں کے علاوہ امام کے سکتات کا ثبوت
کیا ہے۔ جو دو سکتے ثابت ہیں وہ یہ ہیں۔ ایک تکبیر تحریمہ کے بعد کا سکتہ اور دوسرا سکتہ
سورۂ فاتحہ کی قرأت سے فارغ ہونے کے بعد کا۔ پہلے سکتہ میں نہ تو قرأت فاتحہ کا
ثبوت ہے اور نہ گنجائش اور دوسرا سکتہ سورہ فاتحہ کی قرأت کے بعد امام اس لیے کرتا ہے
کہ قرأت سے فارغ ہونے کے بعد صرف سانس لے سکے۔ صرف اس سکتہ میں

سورہ فاتحہ کی قرأت کیسے ممکن ہے۔ شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

امام احمد، امام مالک، امام ابوحنیفہ اور جمہور اہل اسلام اس کے ہرگز قائل نہ تھے کہ سورہ فاتحہ کے بعد امام اس لیے سکتہ کرے کہ مقتدی اس سکتہ میں سورہ فاتحہ پڑھ سکے نہ یہ سکتہ کے وجوب کے قائل تھے اور نہ استحباب کے۔

اور دوسرے موقعہ پر رقمطراز ہیں:

جہاں تک ہمیں معلوم ہے علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ امام پر سکتہ واجب نہیں ہے تاکہ مقتدی سورۂ فاتحہ وغیرہ پڑھ لیں۔ امام مالک، امام ابوحنیفہ اور امام احمد بن حنبل وغیرہ جمہور اس پر متفق ہیں کہ امام کے لیے یہ بات مستحب بھی نہیں ہے کہ وہ سکتہ کرے تاکہ مقتدی قرأت کر سکیں۔

قاضی محمد بن عبداللہ ابوبکر بن العربی مالکی کہتے ہیں۔

اُمت کا اس پر اتفاق ہے کہ امام پر سکتہ واجب نہیں ہے۔

حافظ ابن القیم الجوزیہ لکھتے ہیں:

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی صحیح اور ضعیف حدیث میں یہ ثابت نہیں ہے کہ آپ نے محض اس لیے سکتہ کیا ہو کہ مقتدی سورہ فاتحہ پڑھ لیں۔ اگر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ایسا کوئی طویل سکتہ فرماتے جس میں مقتدی سورہ فاتحہ تلاوت کر سکتے تو یہ بات صحابہ کرام کی نگاہوں سے اوجھل نہ رہتی اور ان کو اس کا علم ہوتا اور تکبیر افتتاح کے سکتہ سے زیادہ اہم بنا کر وہ اسے نقل کرتے۔

علامہ امیر یمانی لکھتے ہیں:

امام کے پیچھے مقتدی کے لیے قرأت کا پروانہ دینے والے باہم مختلف ہیں۔ ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ امام کے سکتات میں پڑھے اور دوسرا کہتا ہے کہ چپ رہے۔ امام قرأت سے فارغ ہو تو پڑھ لے لیکن ان دونوں باتوں کا حدیث میں کوئی ثبوت نہیں ہے۔

بہرحال سکتاتِ امام کا کسی حدیث سے ثبوت نہیں ملتا ہے۔ اور اس موضوع پہ جو احادیث پیش کی جاتی ہیں وہ سب پایہ اعتبار سے ساقط ہیں، خواہ وہ کنز العمال میں

ابن عمر کی روایت ہو۔ اس کی سند میں مثنیٰ ابن الصباح ہے جو متروک اور ضعیف ہے اور چاہے ابوہریرہ کی مستدرک حاکم والی روایت ہو اس کی سند میں محمد بن عبداللہ ضعیف ہے اور چاہے عمر بن شعیب عن ابیہ عن جدہ امام بیہقی کی کتاب القرأۃ والی روایت ہو اس سند کے موضوع پر محدثین کا کلام مشہور ہے۔ یہی حال باقی دوسری روایات کا ہے مولانا عبدالحی نے امام الکلام میں لکھا ہے سکتہ والی ساری حدیثیں معلول ہیں۔

ان کے علاوہ کچھ اور بھی راہیں کچھ لوگوں نے اس آیتِ قرآنی پر عمل سے بچنے کی اختیار کی ہیں لیکن ان کی حیثیت دماغی ورزش سے زیادہ کچھ نہیں اس لیے ہم ان کو بیان کرکے ناظرینِ معالم کا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتے اگر آپ مزید تفصیل کے خواہاں ہیں تو حضرت مولانا سرفراز خاں مدظلہ العالی کی کتاب احسن الکلام کا مطالعہ کیجئے۔ میں نے خود ان سے استفادہ کیا ہے۔ جزاہ اللہ تعالیٰ عنا وعن جمیع المسلمین

اسی آیت کی تشریح میں حضرت مولانا عثمانی نے ایک حدیث بھی پیش کی ہے۔ میری مراد ابوموسیٰ اشعری کی وہ حدیث ہے جس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ہدایت دی ہے کہ نماز با جماعت ہو اور تم مقتدی ہو تو جب امام اللہ اکبر کہے تو تم اللہ اکبر کہو۔ اور جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو، اور جب امام غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو۔ آئیے اس حدیث کے متعلق بھی کچھ مفید باتیں سن لیجئے۔ پوری حدیث اس طرح ہے:

> حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خطاب فرمایا اور سنت کے مطابق زندگی بسر کرنے کی تلقین فرمائی اور ہمیں نماز کا طریقہ سکھایا اور فرمایا کہ نماز پڑھنے سے پہلے اپنی صفوں کو درست کرلو، پھر ایک تم میں سے تمہارا امام بنے جب وہ اللہ اکبر کہے تم بھی اللہ اکبر کہو اور جب وہ قرأت کرے تو تم خاموش رہو اور جب وہ غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو
>
> صحیح مسلم ص۱۷۴ ج۱

یہ حدیث صحیح قرآن عزیز کی اس آیت گرامی کی تشریح ہے۔ حافظ ابن عبدالبر لکھتے ہیں:

> اہلِ علم کا اس پر اجماع ہے کہ آیت اِذَا قُرِیَٔ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ میں جس استماع وانصات کا مطالبہ ہے اس سے نماز مراد ہے اور نماز کے

مراد ہونے کی کھلی اور واضح دلیل یہ ہے کہ مقتدی جہری نمازوں میں امام کے ساتھ قرأت نہیں کرتا ہے اور اس کی شہادت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ جب امام پڑھے تم خاموش رہو۔

یہ صحیح حدیث کہتی ہے کہ قرأت کرنا امام کا کام ہے۔ مقتدی کا کام صرف توجہ کرنا اور خاموش رہنا ہے۔ یہ حدیث صحیح مسلم کے علاوہ حدیث کی دوسری کتابوں میں بھی موجود ہے۔ اسی کی تائید ابوہریرہ کی اس حدیث سے ہوتی ہے جو امام نسائی نے روایت کی ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے امام اس لیے مقرر کیا جاتا ہے کہ اس کی اقتدار کی جائے۔ جب وہ تکبیر کہے تم اللہ اکبر کہو اور جب وہ قرأت کرے تم خاموش رہو۔ اور جب وہ سمع اللہ لمن حمدہ کہے تم ربنا لک الحمد کہو۔

یہ بھی حدیث کی متعدد کتابوں میں آئی ہے۔ یہ حدیث بھی قرآنی آیت کی تائید کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ امام کا کام قرأت کرنا اور سمع اللہ لمن حمدہ کہنا ہے اور مقتدی کا وظیفہ خاموش رہنا اور ربنا لک الحمد کہنا ہے۔

اس کی کھلی تائید ابوہریرہ کی اس حدیث سے بھی موطا امام مالک میں ہے کہ

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جہری نماز سے فارغ ہونے کے بعد ارشاد فرمایا کہ کیا تم میں سے کسی نے ابھی میرے ساتھ قرأت کی ہے ایک شخص بولا جی ہاں یا رسول اللہ میں نے قرأت کی ہے۔ آپ نے فرمایا جبھی تو میں کہہ رہا تھا کہ میرے ساتھ قرآن کی تلاوت میں چھیٹا جھپٹی کیوں ہو رہی ہے۔ آپ کے اس ارشاد کے بعد جن نمازوں میں آپ جہر سے قرأۃ کرتے تھے لوگوں نے آپ کے پیچھے بالکل قرأت چھوڑ دی۔

یہ حدیث موطا کے علاوہ حدیث کی دیگر کتابوں میں بھی موجود ہے۔ یہ بھی اذا قرئ القرآن آیت قرآنی کی شرح ہے۔ یہ واقعہ صبح کی نماز کا ہے جس میں تقریبًا سارے صحابہ کرام موجود ہوں گے مگر صحابہ کی اس ساری جماعت میں حضور کے پیچھے قرأت کرنے والا صرف ایک شخص تھا۔ اس سے پتہ چلا ہے کہ سارے صحابہ اس آیت قرآنی سے یہی سمجھے ہوئے تھے کہ جب قرآن پڑھا جائے تو اس کا سننا اور خاموش رہنا نماز میں ضروری ہے

اور مقتدی کو امام کے پیچھے قرأت کرنا منع ہے ۔

اس قسم کی اور بھی بہت سی حدیثیں آتی ہیں ۔

قرآن کی اس آیت اور ان احادیث کی وجہ سے امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام احمد نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ یہ نماز باجماعت میں مقتدیوں کے بارے میں ہے ۔ باقی رہی بغیر جماعت کے نماز میں امام کی نماز تو اس کا حکم قرآن کی دوسری آیت اور دوسری احادیث میں ہے ۔ قرآن کی آیت سے میری مراد سورۂ مزمل کی وہ آیت ہے جو آپ پہلے پڑھ چکے، یعنی فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ، اس پر تفصیلی تبصرہ تو سورۂ مزمل پارہ ۳۰ میں آئے گا ۔ یہاں تو سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اس آیتِ قرآنی سے معلوم ہوا نماز میں قرآن کی تلاوت نماز کا ایسا ہی رکن ہے جیسے قرآن میں قیام پر پوری نماز کا رکوع پر پوری نماز کا سجود پر نماز کا اطلاق ہوا ہے ایسے ہی اس آیت میں قرآن بول کر پوری نماز مراد ہے ۔

قرآن کا ثبوت قطعی ہے اور احادیث کا ظنی ۔ قرآن کے ثبوت کی جو نوعیت ہے وہ حدیث کی نہیں، اسی وجہ سے حدیث کا درجہ باعتبارِ ثبوت قرآن کے بعد ہے ۔ علامہ شاطبی نے اس پر ایک مستقل فصل لکھی ہے ۔ عنوان ہے :

رتبۃ السنۃ التاخر عن الکتاب سنت کا مرتبہ قرآن کے بعد ہے ۔

اساس میں نوعیت ثبوت کے اسی جوہری فرق کی وجہ سے پوری عمارت جو اس اساس پر اٹھائی گئی ہے اس میں امتیاز پیدا ہو گیا ۔ ارکان و فرائض کسی چیز کی ماہیت ہوتے ہیں، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج یہ سب آیاتِ قرآنیہ سے ثابت ہیں ۔ ان کے ارکان و فرائض بھی قرآن ہی سے ثابت ہیں جیسے قیام، قرأۃ، سجدہ، رکوع، اس لیے اس آیت سے نماز میں قرآن کی تلاوت کا فرض ہونا معلوم ہوا ۔ نماز میں صرف فرائض ہی نہیں بلکہ نماز مجموعہ ہے فرائض، واجبات، سنن اور مستحبات کا ۔ صرف نماز نہیں بلکہ قانونِ قدرت یہی ہے کہ دُنیا میں کسی بھی چیز کے اجزاء اہمیت و غیر اہمیت کے لحاظ سے یکساں نہیں ہوتے ۔ ایک درخت میں جڑ، شاخیں، پتیاں، ٹہنیاں سب اس کے اجزاء کہلاتے ہیں لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ اس کے تمام اجزاء ایک حیثیت نہیں رکھتے ۔ اسی طرح ایک شخص میں ہاتھ، پیر، سر، دل، دماغ وغیرہ سب کے سب اجزاء شمار ہوتے ہیں مگر ان اجزاء میں باہم اتنا فرق ہے کہ بعض کے کٹ جانے سے درخت باقی رہتا ہے اور بعض کے کٹ جانے سے صرف

زیبائش میں فرق پڑتا ہے اور بعض کے کٹ جانے سے درخت کی نشوونما میں فرق ہوتا ہے اور بعض کے کٹ جانے سے درخت کی نشوونما میں فرق ہوتا ہے اور بعض کے کٹ جانے اور کچھ کے نہ ہونے سے درخت ہی فنا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا جیسے مادیات میں کسی چیز کے اجزاء میں اس قدر فرق تمیزی ہوتا ہے اسی سے مجتہدین و فقہاء نے شرعی حقائق کے اجزاء میں قرآن و سنت کی روشنی میں بھی فرق جوہری معلوم کیا ہے۔ نماز کے کچھ اجزاء وہ ہیں جن کی کمی سے نماز کے حسن و زیبائش پر حرف آتا ہے اور کچھ اجزاء وہ ہیں جن کے نہ ہونے سے نماز کی حقیقت میں کمی آجاتی ہے اور بعض اجزاء وہ ہیں جن کے ناپید ہونے سے نماز نماز ہی نہیں رہتی۔ پہلی قسم کو مستحبات، دوسری کو واجبات اور تیسری کو فرائض کہتے ہیں۔ شاید آپ کے دماغ میں یہ خلش ہو کہ ان مراتب کا اندازہ اسلام کے قانون دان اداروں نے کیسے کیا۔؟

اس کا اندازہ قانونی اداروں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل سے اور ارشادات سے کیا ہے، نماز کے بعض اجزاء کے ترک سے نماز کو قابلِ اعادہ اور ناقص قرار دیا۔ اور بعض کے ترک سے گو ناقص کہا مگر دوبارہ پڑھنے کو نہیں کہا اور بعض کی وجہ سے نماز کا ہونا نہ ہونا برابر بتایا۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ نماز کے اجزاء میں فرض، واجب کا فرق صرف دلیل کے قطعی اور ظنی ہونے کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ دراصل خود ان اجزاء کی حقیقت کی وجہ سے ہے۔ یہ بات بڑی تفصیل سے بحر العلوم نے رسائل الارکان میں لکھی ہے۔ بہرحال نماز میں آیتِ قرآنی فاقرؤا ما تیسر من القرآن سے قرأتِ قرآن فرض ہے یعنی نماز کے ان اجزاء میں سے ہے جن کے نہ ہونے سے نماز کا وجود ہی نہیں ہوتا۔ اور عبادہ ابن الصامت کی حدیث کی وجہ سے

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے نماز سورۂ فاتحہ کے بغیر نہیں ہے۔

سورہ فاتحہ نماز میں واجب ہے لیکن قرآن کی زیرِ تشریح آیت اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ اور ان حدیثوں کی وجہ سے جو پہلے بیان ہو چکی ہیں مقتدی پر فاتحہ کا پڑھنا واجب نہیں ہے بلکہ سننا اور خاموش رہنا واجب ہے کیونکہ عبادہ ابن الصامت کی حدیث، نماز فاتحہ کے بغیر نہیں، مطالبہ نماز باجماعت میں امام کے سورہ فاتحہ کے پڑھنے سے بالکل

پورا ہو رہا ہے۔ اور اس کی دلیل یہ حدیث امام اور منفرد کے بارے میں ہے مقتدی کے بارے میں نہیں ہے یہ ہے کہ اسی عبادہ کی حدیث میں یہ الفاظ بھی مختلف روایات میں آتے ہیں فصاعدا اس سے زیادہ کچھ اور ماتیسر جو کچھ آسان ہو۔ مازاد کچھ اور زیادہ۔ ظاہر ہے کہ مقتدی پر سورت کی قرآت واجب نہیں ہے جبکہ امام اور منفرد پر واجب ہے اور روایات میں ان الفاظ کی زیادتی محض راویوں کی ذہنی کاوشوں کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ فی الواقع عربی اسالیب کا بھی تقاضا ہے۔ کیونکہ عبادہ کی اصل حدیث

لاصلاة لمن لم يقرأ بفاتحة الكتاب

لفظ قرآۃ عربی زبان میں متعدی ہے۔ قرآن میں اسی طرح استعمال ہوا ہے۔ مثلاً اذا قرأت القرآن اور اذا قرء القرآن۔ جب کوئی متعدی ہو اور اس کو حروف جار کے ذریعے پر متعدی بنایا جاتا ہے تو اس میں یہ راز بتانا ہوتا ہے کہ یہاں کچھ اور بھی ہے مثلاً قرآن میں وامسحوا برؤسکم ہے۔ مسح متعدی ہے اور مسحت الجدار بولا جاتا ہے مگر یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ سر پر صرف ہاتھ پھیرنا نہیں بلکہ پانی سے بھیگا ہوا ہاتھ پھیرنا ہے اس لیے مفعول پر با لگادی ہے [اخذت ید رشید اور اخذت بید رشید میں بھی یہی فرق ہے۔ اخذت ید رشید وہاں بولا جائے گا۔ جہاں براہ راست رشید کا ہاتھ پکڑا جائے لیکن اخذت بید رشید وہاں آئے گا جہاں اور بھی لوگ موجود ہوں اور ان میں سے رشید کا ہاتھ پکڑا جائے۔ قرآن میں اقرا باسم ربك الذی خلق میں اقرا کا مفعول با کے ساتھ لایا گیا ہے۔ اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو اس کی وجہ یہی سمجھتا ہوں کہ جبریلؑ نے آپ سے صرف پڑھنے کا مطالبہ نہیں بلکہ لکھی ہوئی چیز پڑھنے کا مطالبہ کیا تھا۔ اس لیے اقراء باسم ربك الذی خلق فرمایا زرقانی علی الموطا، میں عبید بن عمیر کی مرسل روایت سے اس کی تائید ہوتی ہے

جاء جبریل بنمط من دیباج فیہ کتاب

جبریل ریشم کی ڈبیہ میں لکھی ہوئی چیز لے کر آئے

اور ویسے بھی حضور اقدس کا یہ جواب کہ ما انا بقاری اسی وقت صحیح ہوتا ہے، جب آپ سے لکھی ہوئی چیز پڑھنے کا مطالبہ ہو کیونکہ اُمیت کتابت کے منافی ہے اُمی لکھی ہوئی چیز نہیں پڑھ سکتا۔ اور زبانی تعلیم سے تلقین کردہ الفاظ تو پڑھ

سکتا ہے۔ بہرحال قرآت متعدی ہے اس کے مفعول پر بار صرف اس لیے لگائی گئی ہے کہ فاتحہ ہی نہیں بلکہ کچھ اور بھی پڑھنا چاہیے۔ اسی کو مختلف احادیث میں روایت بالمعنے کے طور پر فصاعدا، فما زاد، ماتیسر اور سورۃ کی تعبیرات سے ظاہر کیا گیا ہے۔ اور جاننے والے جانتے ہیں کہ فاتحہ سے زیادہ مقتدی پر پڑھنے کی ذمہ داری کسی کے نزدیک نہیں ہے لہٰذا اس قسم کی ساری حدیثیں مطلق نماز کے بارے میں ہیں۔ اس قسم کی حدیثوں سے نماز میں سورہ فاتحہ اور سورۃ کا وجوب معلوم ہوتا ہے کیونکہ حدیث میں لا صلاۃ کے عمومی الفاظ کے تحت سورہ فاتحہ اور اس کے ساتھ کچھ اور کا بھی حکم دیا ہے تو جیسے سورہ فاتحہ واجب ہے اسی طرح فصاعدا اور مازاد بھی واجب ہے۔

زیر تشریح آیت کا منطوق اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ جب امام قرآت کر رہا ہے تو مقتدی کا کام سننا اور خاموش رہنا ہے۔ اس منطوق سے سارے ائمہ نے اثر لیا ہے بلکہ اکثر نے اس کے مدلول سے یہ سمجھا ہے کہ جب امام قرآت کر رہا ہو خواہ وہ نماز سری ہو مقتدی کو خاموش رہنا چاہیے۔ ابن قدامہ رقمطراز ہیں:

> مختصر یہ ہے کہ امام کے پیچھے نماز میں مقتدی پر قرأت واجب نہیں ہے چاہے امام جہری نماز پڑھ رہا ہو اور چاہے سری جماعت کی روایت امام احمد کا مسلک یہی ہے۔ یہی امام زہری، امام سفیان ثوری، امام مالک، امام ابو حنیفہ اور محدثین میں امام اسحاق بن راہویہ کا مذہب ہے۔ صرف امام شافعی اور امام داؤد ظاہری کہتے ہیں کہ ہر حال میں مقتدی پر قراۃ واجب ہے کیونکہ لاصلاۃ لمن لم یقرا بفاتحۃ الکتاب عام ہے لیکن حالت جہر میں وہ بھی خاموش رہنے کا حکم دیتے ہیں۔

اور یہی ابن قدامہ لکھتے ہیں:

> مقتدی جب امام کی قرآت سن رہا ہے تو اس پر قرآت نہ واجب ہے اور نہ ہی مستحب ہے۔ یہ امام احمد، امام زہری، امام سفیان ثوری، امام مالک، امام ابن عیینہ، امام ابن المبارک، امام اسحاق، اور یہی امام شافعی کا ایک قول ہے اور تابعین میں سعید بن المسیب، عروہ بن الزبیر، ابوسلمۃ بن عبدالرحمن، سعید بن جبیر، اور سلف کی ایک جماعت کی یہی رائے ہے۔

دوسرا قول امام شافعی کا یہ ہے کہ مقتدی امام کے پیچھے ہر حال میں پڑھے۔ یہی امام لیث بن سعد، اوزاعی، ابن عون، مکحول اور ابوثور کا کہنا ہے۔

لیکن امام نووی نے شرح المہذب میں ابن المنذر اور خطابی کے حوالہ سے ذرا کھول کر بیان کیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ:

سفیان ثوری، ابن عیینہ اور کوفہ والوں کی ایک جماعت کا یہ مسلک ہے کہ امام کے پیچھے مقتدی پر کوئی قرأت نہیں ہے۔ لیکن امام زہری، امام مالک، امام احمد، ابن المبارک اور اسحاق بن راہویہ کا خیال پہلے فریق کی طرح یہ ہے کہ جہری نمازوں میں مقتدی قرأت نہ کرے اور سری نمازوں میں پڑھنا ضروری ہے۔ ابن عون، اوزاعی اور ابوثور اور ان کے علاوہ کی رائے میں سب نمازوں میں مقتدی کے لیے پڑھنا ضروری ہے۔

مگر جہاں تک امام احمد کے مسلک کا تعلق ہے اس کی ترجمانی صحیح وہ ہی ہے جو ابن قدامہ نے کی ہے کہ سری نمازوں میں امام احمد کی رائے میں مقتدی کے لیے سورۂ فاتحہ کا پڑھنا مستحب اور پسندیدہ ہے واجب نہیں ہے۔ حافظ ابن تیمیہ نے بھی امام احمد کا یہی مسلک بتایا ہے۔

علامہ حازمی نے کتاب الاعتبار میں مذاہب کی وہی تفصیل بیان کی ہے جو علامہ ابن قدامہ نے پیش کی ہے اور لکھا ہے:

ابوحنیفہ، مالک، اوزاعی، لیث بن سعد، ابن المبارک، احمد اور اسحاق بن راہویہ اور ان کے علاوہ جمہور یہ کہتے ہیں کہ امام کے پیچھے مقتدی کے لیے جہری نماز میں فاتحہ پڑھنا جائز نہیں ہے اور یہی امام شافعی کا قدیم مذہب ہے۔

ان توضیحات سے معلوم ہوا کہ جہری نماز کی حد تک قرآنی آیت کے منطوق پر سب ائمہ عمل پیرا ہیں اور کہتے ہیں کہ جہری نماز میں مقتدی کے لیے فاتحہ کا پڑھنا جائز نہیں ہے۔ صرف امام شافعی کا ایک قول ہے کہ جہری نمازوں میں مقتدی پر فاتحہ پڑھنا واجب ہے۔ اگر امام شافعی کا خود شوافع میں بھی قول مشہور ہے لیکن واجب ہونے کے باوجود ان کا یہ بھی فیصلہ ہے۔

ایسا شخص جو امام کے ساتھ رکوع میں ہے اس پر فاتحہ نہیں ہے۔

اور یہ بھی امر واقعہ ہے کہ

چاروں اماموں ابوحنیفہ، مالک، شافعی اور احمد بن حنبل اور جمہور فقہا کا فیصلہ یہ ہے کہ رکوع میں ملنے والا رکعت پالیتا ہے۔

اسی فیصلہ کا پس منظر یہی ہے کہ امام کی قرأت مقتدی کے لیے کافی ہے۔ اگر یہ ضمانت نہ ہوتی تو رکوع میں ملنے والے کے بارے میں رکعت حاصل کرنے کا کبھی فیصلہ نہ ہوتا۔

اب تک جو کچھ کہا ہے اس سے یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آگئی ہے کہ قرآن کی یہ آیت اور ابوموسیٰ اشعری کی تشریحی حدیث یہ بتاتی ہے کہ جہری نمازوں میں امام کی قرأت کے وقت مقتدی کو نہ پڑھنا چاہیے۔ لیکن صرف اتنی نہیں ہے بلکہ اس سے آگے بھی ہے کہ :

۱۔ نماز جہری نہ ہو بلکہ سری ہو۔ مثلاً ظہر عصر ہو، مغرب کی آخری رکعت یا عشا کی آخری دو رکعت ہوں۔

اس موقعہ پر مقتدی کو کیا کرنا چاہیے۔ بے شک امام پڑھ رہا ہے لیکن مقتدی کو استماع کا موقعہ نہیں ہے۔ ایسے ہی امام جہری نماز میں ہے مگر وہ مقتدیوں کو سکتات کی مدد سے پڑھنے کا موقعہ دے رہا ہے ایسی صورت میں مقتدی کو کیا کرنا چاہیے۔

اس موضوع پر اگرچہ بہت کچھ لکھا گیا ہے اور مجوزین و مانعین کی جانب سے لکھا گیا ہے۔ مجوزین کا زور اس پر صرف ہو رہا ہے کہ فاتحہ کے بغیر مقتدی کی نماز ہی نہیں ہوتی اور مانعین یہاں تک چلے گئے کہ فاتحہ کا پڑھنا مکروہ ہے۔ افراط و تفریط کے اس ہنگامہ میں مجھے مولانا عبدالحی لکھنوی، مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا سید انور شاہ کشمیری کی پیش کردہ راہِ اعتدال بہت پسند آئی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ان تینوں بزرگوں کی تحقیق ہدیۂ ناظرین کردوں۔ تینوں بزرگوں نے اس موضوع پر کتابیں لکھی ہیں۔ مولانا عبدالحی نے امام الکلام، مولانا رشید احمد نے ہدایت المعتدی اور سبیل الرشاد اور مولانا سید انور شاہ کشمیری نے فصل الخطاب کے نام سے کتابیں لکھی ہیں۔ مولانا عبدالحی نے امام الکلام کے علاوہ موطا امام مالک کی شرح التعلیق الممجد اور شرح الوقایہ کی شرح السعایہ میں بھی اس موضوع پر تفصیلی کلام کیا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں :

ہماری رائے یہ ہے کہ امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنے کو مکروہ قرار دینا اگر راہِ تفریط ہے اور حدیث عبادہ چھوڑنے کو مستلزم ہے تو امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنے کو فرض کہنا کہ نہ پڑھنے سے نماز ہی نہ ہو راہ افراط ہے اور حدیث جابر چھوڑنے کو مستلزم ہے۔ اگر وہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنے کے لیے حدیث عبادہ صلاۃ الا بفاتحۃ الکتاب کا سہارا لیتے ہیں تو ہم ان سے وہی بات کہیں گے جو امام احمد نے کہی ہے کہ اس حدیث کو حضرت جابر نے بھی پیش کیا ہے مگر اس کا مصداق مقتدی کے علاوہ امام اور منفرد کو بتایا ہے۔ اور پھر اس سے زیادہ سے زیادہ وجوب ثابت ہوتا ہے۔ اگر مقتدی کے موضوع پر قراۃ الامام قراۃ لہ، حدیث نہ ہوتی تو ہم مقتدی کے حق میں بھی واجب کہتے۔ اگر وہ عبادہ کی دوسری ابوداؤد کو دلیل میں پیش کرتے ہیں تو یہ حدیث جابر کی حدیث سے معارض ہے اور پھر اس طرق ضعیف ہیں۔ الغرض بہتر یہ ہے کہ وہ طریقہ اپنایا جائے کہ جس سے ساری حدیثیں جمع ہو جائیں اس کی صورت یہ اور صرف یہ ہے کہ سری نماز دل میں مقتدی کی قرأت کو واجب نہیں جائز کہا جائے اور جہری نمازوں میں سکتاتِ امام میں قرأت کو جائز کہا جائے اور حدیث جابر کی وجہ سے نہ پڑھنے کو بھی جائز کہا جائے۔

زیرِ تشریح آیت پر تفصیلی تبصرہ کے بعد امام الکلام میں لکھتے ہیں کہ ،

اس ساری رد و کد کے بعد انصاف کی بات یہ ہے کہ کہ جس سے احناف نے امام کے پیچھے مقتدی کے لیے قرأت نہ کرنے پر استدلال کیا ہے سری نمازوں میں مقتدی کو قرأت کرنے سے نہیں منع کرتی ہے۔ اور نہ جہری نمازوں میں سکتاتِ امام کے وقت قرأت سے روکتی ہے۔ یہ تو صرف یہ بتاتی ہے کہ جہری نمازوں میں جب امام قرأت کر رہا ہو اس وقت مقتدی قرأت نہ کرے، یہ بات وہاں دلیل کا کام دے سکتی ہے جب کہنے والا یہ کہے کہ مقتدی امام کے ساتھ ساتھ پڑھے اور یا اس شخص سے کہی جا سکتی ہے جو یہ دعویٰ کرے کہ مقتدی پر فاتحہ واجب ہے اور امام کے لیے مقتدی

کی خاطر سکتات مسنون ہیں۔ باقی اس آیت سے سری نمازوں میں یا سکتاتِ امام میں مقتدی کے لیے خاموش ہونے کے ضروری ہونے پر استدلال صرف اس وقت ہو سکتا ہے جب نا قابلِ فہم اور فضول تاویلوں کا سہارا لیا جائے۔

مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سبیل الرشاد میں فرماتے ہیں :

مکہ میں ابتدائے اسلام میں نمازِ تہجد فرض ہوئی تھی جس کی سورۃ مزمل ابتدارِ بعثت میں نازل ہوئی کہ حسبِ تحریر سیوطی اتقان میں اول سورۃ اقرا ثانیاً سورہ قلم، ثالثاً ابتدارِ سورۃ مزمل کا نزول ہے۔ اور سب امام مقتدی فاتحہ و سورت دونوں کو پڑھتے تھے۔ پھر بعد ایک سال کے حسبِ روایت حضرت عائشہ صدیقہؓ کی مکہ ہی میں آخر سورۃ مزمل نازل ہوا، جس میں فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ہے۔ تو اس آیت سے نمازِ تہجد طویل منسوخ ہو کر قدر مَا تَيَسَّر باقی رہ گئی۔ اور اس وقت بھی مقتدی و منفرد و امام سب پر قرأت فرض رہی۔ بعد اس کے معراج میں صلوٰتِ خمسہ فرض ہو کر نمازِ تہجد کی فرضیت منسوخ ہو گئی اور پانچوں نمازیں مکان میں پڑھی جاتی تھیں۔ اور ان میں مقتدی قرأت کرتے تھے حسبِ حکم قدیم کے۔ پھر ایک مدت کے بعد مکہ ہی میں سورۃ اعراف نازل ہوئی اور اس میں آیت وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا نازل ہوئی تو اس سے قرأتِ مقتدی کی بالکل منسوخ ہو گئی۔ اس پر بہت شواہد احادیث مرفوعہ و موقوفہ صحیح و ضعیف موجود ہیں جو مولوی عبدالحی صاحب مرحوم نے اپنے رسالہ امام الکلام میں نقل کیے ہیں۔

اس کے بعد امام ربانی نے تین احادیث نقل کر کے لکھا ہے :

غرض ان احادیث سے یہ ہے کہ آخر حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ فاتحہ و سورت دونوں اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے نماز میں پڑھتے تھے اور مطلق حکم آیت سے دونوں کا پڑھنا منسوخ ہوا ہے اور آپ نے بھی اس مطلق حکم کو مقید سورۃ نہیں فرمایا بلکہ عام فاتحہ و سورت میں رکھا ہے۔ اور اس مجاز سے زمانے کے لوگ جو اس آیت کا نزول خطبہ میں بیان

کر کے اس حکم کو خطبہ پر متصور رکھتے ہیں۔ یہ سراسر ان کی غلطی ہے کیونکہ اوّل صریح احادیث سے ثابت ہو گیا کہ اس کا نزول قرأت مقتدی کے بارے میں ہے دوسرے یہ کہ جمعہ مدینہ میں فرض ہوا ہے اکثر علمار کے نزدیک ۔اور جو علمار مکہ میں فرضیت جمعہ کی بیان کرتے ہیں تو ان کے نزدیک بھی جمعہ کو ادا کرنے کا موقعہ مکہ میں حضور کو کبھی نہیں ملا۔ ایسا ہے تو آپ نے کب مکہ میں ادا کیا اور کب لوگوں نے خطبہ میں بات کی تھی جو یہ آیت نازل ہوئی۔ کیونکہ اعراف باتفاق محدثین و مفسرین مکی ہے۔ اور یہ آیت بھی مکی ہے کسی نے نے اس آیت کا استثنا نہیں کیا نہ کسی نے اس کو مدنی لکھا ہے۔ اور پھر حکم تو عموم الفاظ پر ہوتا ہے نہ کہ خصوصی مراد پر اور یہ قاعدہ مسلمہ تمام اُمّت کا ہے۔ اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں اس لیے اگر یہ آیت خطبہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے پھر بھی مقتدی کو عام ہے۔ اور امام بخاری جزء القرآۃ میں تصریح کرتے ہیں کہ یہ آیت نماز و خطبہ دونوں میں نازل ہوئی ہے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ آیت کا حکم دونوں کو شامل ہے۔ یہ بھی محدثین کہتے ہیں ورنہ مکہ میں خطبہ کہاں تھا۔

مقصد یہ ہے کہ قرأت مقتدی کی مطلقاً مکہ میں قبل ہجرت منسوخ ہو چکی تھی اور عبداللہ بن مسعود صحابی فقیہ و قدیم اور دیگر حاضرین کو نسخ محقق ہو چکا تھا۔ کیونکہ ہر وقت حاضر باش تھے اور علی ہذا دیگر اصحاب حاضرین مکہ کو معلوم تھا کہ پہلے قرأت مقتدی پر فرض تھی۔ اس آیت سے ممنوع ہو گئی اور مدینہ طیبہ میں بھی یہ حکم پہنچ گیا تھا۔ گویا دین کا ایک کلیہ مقرر ہو گیا تھا کہ مقتدی کچھ نہ پڑھے۔ اور آیت فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ جو اس سے پہلے نازل ہو چکی تھی وہ بحق مقتدی منسوخ ہو گئی اور امام و منفرد کے حق میں ویسے ہی اس کا حکم قطعی رہا۔ کیونکہ منسوخ البعض بھی قطعی ہوتا ہے بر خلاف مخصوص البعض کے یہ قاعدہ سب اہل علم جانتے ہیں۔ لہٰذا مقتدی کے لیے آیت مزمل سے استدلال درست نہیں ہے کیونکہ سورہ مزمل پہلے نازل ہوئی اور سورہ اعراف بعد میں۔ اور آخر پہلے کے لیے

ناسخ ہوتا ہے۔ جب آپ مدینہ طیبہ تشریف لائے اور علی الاعلان مسجد میں جماعت ہونے لگی تو یہ مقتدی کے خاموش رہنے کا ضابطہ جاری تھا۔ اور خود آنحضرت کو بھی علم تھا کہ یہ مسئلہ سب پر حسب حکم آیت اعراف واضح ہو گیا ہے کیونکہ بعد نزول آیت کوئی آیت اس کی ناسخ نازل نہیں ہوئی اور نہ آپ نے اس آیت کے خلاف کوئی مقتدیوں کو حکم دیا۔ اور دلیل اس کی یہ ہے کہ حدیث عبادہ جو مجوزین کی بہترین دلیل ہے اس کے الفاظ یہ ہیں: صلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الصبح فثقلت علیہ القرأۃ فلما انصرف قال انی اراکم تقرأون وراء امامکم اور ابوداؤد کی روایت میں ہے۔ لعلکم تقرأون اور ایک روایت میں ھل تقرأون؟ ان روایات میں آپ کا ایسی کلمات دریافت فرمانا اس بات کی دلیل ہے کہ آپ نے مقتدیوں کو امام کے پیچھے قرأت کا حکم نہیں دیا تھا۔ کیونکہ اگر آپ کے حکم سے پڑھتے تو لعلکم تقرأون شاید تم پڑھتے ہو اور ھل تقرأون کیا تم پڑھتے ہو فرما کر کیوں دریافت فرماتے۔ اس طرح آپ کا سوال کرنا اس بات کی کھلی نشانی ہے کہ یہ قرأت آپ کی اجازت اور حکم سے نہ تھی۔ جب آپ نے پوچھا تو کچھ نے پڑھنے کا اقرار کیا۔ بہر حال اس استفہام سے ظاہر ہے کہ اس واقعہ تک بھی قاعدہ کلیہ نماز کا مقرر تھا کہ مقتدی امام کے پیچھے کچھ نہ پڑھتے تھے اور آپ کو کسی کے پڑھنے کی خبر نہ تھی اس واقعہ اور آپ کے مطلع ہونے کے بعد ہوا جو کچھ ہوا

باقی رہی یہ بات کہ جب قرآن کی آیت قرأت مقتدی میں ممانعت کی نازل ہو چکی تھی اور حضور اقدس علیہ السلام کا حکم بھی اس کے خلاف نہ ہوا تھا اور نماز کا قانون یہی تھا کہ مقتدی قرأت نہ کرے تو پھر صحابہ کرام امام کے پیچھے کیوں پڑھتے تھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تو صاف اور واضح بات ہے کہ تمام جماعت نہیں پڑھتی تھی۔ البتہ کچھ صحابہ جن کو نزول آیت کا علم نہ تھا وہ پڑھتے تھے۔ اسی لیے ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے فقال بعضنا انا نصنع ذالک کچھ نے کہا ہاں یہ کرتے ہیں [1]

[1] حاشیہ اگلے صفحہ پر

بظاہر یہ بعض ہی پڑھنے والے تھے اگر سب یا اکثر پڑھتے تو پہلے دوسری ہی جماعت میں غالباً خبر ہو جاتی کہ مجمع میں کھس پھس مخفی نہیں رہتی ہے۔ لہٰذا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پڑھنے والے کچھ وہ حضرات تھے جن کو نسخ کا پتہ نہ تھا۔

اور حضرت عبادہ جیسے حضرات صحابہ اس واقعہ کے بعد بھی امام کے پیچھے قرأت کے قائل رہے وہ جواز ہی کے قائل تھے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ حضرات امام کے سکتات میں پڑھتے ہوں نظر بعلت حکم آیت کے کہ عین حالت قرأت میں قرأت سے منع کیا گیا ہے کہ استماع قرآن میں مانع نہ ہو۔ اگر سکتات میں پڑھا جائے تو مضائقہ نہیں ہے۔ چنانچہ بعض روایات میں ھذا نقرأ یعنی ہم جلدی جلدی پڑھتے ہیں۔ آپ کی شروع قرأت سے پہلے اور سکتات میں تاکہ خلط آپ کی قرأت سے نہ ہو اور وجہ جلدی کی یہی تھی۔ مگر یہ بھی ہوا ہے تو بعض کا فعل و اجتہاد ہے نہ جملہ صحابہ کا۔ کیونکہ اگر اکثر کا عمل ہوتا تو غالب یہی ہے کہ پہلی ہی دوسری جماعت میں حضرت علیہ السلام کو خبر ہو جاتی کہ اگرچہ مجمع میں کیسا ہی اخفا کیا جائے مگر اکثر رجال میں آواز اونچی ہو جاتی اس کو تجربہ سے مشاہدہ کیا جا سکتا ہے خصوصاً جبکہ خاموشی ہو۔

الحاصل جب آپ کو قرأت میں منازعت و ثقل واقع ہوا اور لوگوں

پچھلے صفحہ کا حاشیہ:۔ موطا امام مالک میں ہے فقال رجل نعم انا یا رسول اللہ ایک شخص نے کہا ہاں یا رسول اللہ۔ یہ واقعہ صبح کی نماز کا ہے دیکھئے سنن کبریٰ ج ۲ ص ۱۵۷ ابوداؤد ج ۱ ص ۱۲۰۔ جس میں تقریباً سارے صحابہ موجود ہوں گے مگر ان میں سے آپ کے پیچھے قرأت کرنے والا ایک شخص تھا۔ اور آپ نے ان دیگر اشخاص کو بھی کچھ نہیں کہا۔ جنہوں نے قرأت نہیں کی تھی۔ اور صحابہ کرام میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ حضرت آپ نے قرأت کرنے کا خود حکم دیا ہے پھر کیا ممانعت کا کوئی جدید حکم آیا ہے۔ اور یہ محال ہے کہ آپ نے قرأت کرنے کا حکم دیا ہو اور اس پر عمل کرنے والا صرف ایک شخص ہو۔ جہری نمازوں میں اس سے بڑھ کر امام کے پیچھے قرأت کے منع ہونے کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔

کا پڑھنا معلوم ہوا تو آپ نے حکم فرمایا:
لا تفعلوا الا بفاتحۃ الکتاب فانہ لا صلاۃ الا بفاتحۃ الکتاب۔
یعنی اگر جلدی جلدی سکتات امام ہی میں پڑھتے ہو تو سورہ فاتحہ کے سوا نہ پڑھو۔
اس سے معلوم ہوا کہ وہ لوگ فاتحہ اور سورت دونوں پڑھتے تھے جیسا کہ قبل نزول آیت کے سب ہی پڑھتے تھے مگر اب سکتات میں پڑھتے تھے اور پہلے رعایت سکتات نہ تھی بس جب یہ حکم ہوا تو اب صحابہ میں دو فریق ہو گئے۔
مجوزین کی جماعت نے ظاہر الفاظ حدیث سے یہ سمجھ لیا کہ آپ نے ایجاب قرآت فاتحہ کا فرمایا ہے اور عموم آیت کو خاص فرمایا - انہ لا صلاۃ الا بفاتحۃ الکتاب کے مگر مع ہذا دوسرے فریق کی نماز کو فاسد نہیں جانتے تھے کہ دوسرا فریق بھی مصاب ہو گیا تھا تو ان کا اس پر عمل ہوا کہ امام کے پیچھے فاتحہ سری نماز ہو یا جہری سکتات امام میں ہر حال میں پڑھنا چاہیے اور یہ فریق اسی پر قائم رہا۔ اور فخر عالم علیہ السلام نے بھی ان کو رد نہ کیا اور نہ وحی سے اس میں اصلاح کی گئی۔ اور جو لوگ مانع ہیں انہوں نے اس حکم کو ناسخ و مخصص آیت کا نہ جانا بلکہ جانا کہ یہ رخصت قرآۃ فاتحہ کی سکتات امام میں ہے کہ جلدی جلدی ادا کرے کہ بعد شروع قرآت امام کے پڑھنا منع ہے اور جملہ فانہ لا صلاۃ الا بفاتحۃ الکتاب کو وجہ رخصت جانا کہ باوجود اس قصد ممانعت کے کہ آیت سے ثابت ہے پھر خاص فاتحہ کی رخصت کیوں فرمائی حالانکہ سب قرآن یکساں ہے اس کی کیا خصوصیت ہوتی ورنہ سکتات میں سورت بھی جائز ہوتی تو اس کی وجہ رخصت آپ نے یہ فرمائی کہ فاتحہ کو نماز سے بہت مناسبت ہے اور نماز کے ساتھ اس کو ایسی خصوصیت ہے کہ کسی دوسری سورت کو اس قدر نہیں یہاں تک کہ سورۃ فاتحہ کا نام ہی صلاۃ سے تعبیر کیا گیا۔ اس حدیث قدسی میں ہے قسمت الصلوٰۃ بینی و بین عبدی نصفین لہٰذا جب اس قدر خصوصیت بالصلوٰۃ ہے تو اگر سکتات میں اس کو پڑھ لے تو رخصت ہے اور یہ قدر قلیل آیات محل تنازع میں

ختم بھی ہو سکتی ہیں اور خلط قرآت امام کی نوبت نہیں آتی۔ پس یہ جملہ بیان خصوصیت رخصت کے لیے ہے نہ بیان وجوب قرآت فاتحہ کے واسطے مقتدی کے حق میں۔ اور وجوب قرآت فاتحہ کا اس حدیث میں امام اور منفرد کے لیے ہے۔ پس معنے یہ ہوئے کہ تم سکتہ میں اگر فاتحہ پڑھو تو میں اس کی سی نہیں کرتا جیسا کہ تم اب کرتے ہو اس لیے کہ فاتحہ بہت موکد واجب صلوٰۃ منفرد و امام میں ہے مگر اور سورت ہرگز نہ پڑھو نہ سکتات امام میں نہ حالت قرآت امام میں اور دلیل رخصت کی سکتات امام میں آپ نے خود اس حدیث میں بیان فرمادی ہے وانا اقول وما لی بنا زعنی القرآن (جب ہی تو میں کہہ رہا تھا کہ میرے ساتھ قرآن میں چھینا جھپٹی کیوں ہو رہی ہے) اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ وجہ حرمت کی منازعت تھی۔ اور ظاہر ہے کہ منازعت سورۂ فاتحہ میں ایسی ہی ہے جیسا سورت میں۔ لیکن سورت فاتحہ کی آیتیں تھوڑی ہیں اس لیے ثنا وغیرہ کے سکتہ میں بلا منازعت پڑھی جا سکتی ہے۔ لہٰذا رخصت کی گنجائش ہے بخلاف دیگر سورت کے۔ لیکن اس کے باوجود حدیث میں ارشاد موجود ہے کہ نہ پڑھنا بہتر ہے کیونکہ نہی سے جو استثنا کیا جاتا ہے اس میں وجوب امر کی طرح نہیں ہوتا ہے بلکہ صرف اباحت ہوتی ہے۔ لہٰذا یہاں اباحت و رخصت ہے۔ اب حکم آیت کا مثل سابق اپنے عموم پر ہے۔ اس میں کوئی تخصیص نہیں ہوئی ہے۔ معلوم ہوا کہ اس طبقہ نے جو کچھ سمجھ کر عمل کیا تھا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاآخر حیات اس کی تردید نہیں فرمائی بلکہ خاموشی سے ہمنوائی کی اور اس موضوع پر وحی آئی اس لیے یہ فریق بھی راہ راست پر اور برحق ٹھہرایا گیا۔

اس کے بعد وہ روایات جن سے وجوب فاتحہ معلوم ہوتا ہے مجوزین ان کو عام کہتے ہیں اور مقتدی کو بھی شامل کرتے ہیں اور مانعین خاص بتاتے ہیں امام و منفرد کے ساتھ مثلاً عبادہ کی وہ روایت جو اس واقعہ سے الگ سادہ شکل میں ہے لاصلوٰۃ لمن لم یقرا الخ اس میں مانعین کے خیال میں مقتدی پر فاتحہ کا وجوب نہیں ہے بلکہ یہ امام و منفرد کے لیے ہے نہ کہ مقتدی کے

لیے کیونکہ اس روایت عبادہ میں معمر نے امام زہری سے لفظ فصاعدا زیادہ کیا ہے یعنی لا صلوٰۃ لمن لم یقرا بفاتحۃ الکتاب فصاعداً اور سفیان نے بھی زہری سے یہ زیادتی فصاعداً کی روایت کی ہے اور یہ بھی مقرر ہے کہ زیادت ثقہ کی حجت ہے۔ لہ یہ زیادتی صاف کہہ رہی ہے کہ حکم مقتدی کے بارے میں نہیں ہے کیونکہ مقتدی کو آپ پہلے ہی سے فاتحہ سے زیادہ پڑھنے سے منع فرما چکے ہیں۔ لہٰذا یہ بلاشبہ مقتدی کے لیے نہیں ہے۔ ایسے ہی ابوہریرہ کی منادی میں لفظ فما زاد موجود ہے۔ یہ منادی بھی مقتدی کے لیے نہیں ہے۔ اسی طرح ابوسعید خدری کی روایت میں امرنا ان نقرا بفاتحۃ

لہ حضرت امام ربانی بتانا یہ چاہتے ہیں کہ یہ کہنا فصاعداً کی زیادت میں معمر منفرد ہیں خود قواعد و اصول کے خلاف ہے کیونکہ معمر بالاتفاق ثقہ اور حجت ہیں اور ثقہ کی زیادتی بالاتفاق قابلِ قبول ہے۔ پھر یہ کہ فصاعداً کی زیادتی ابوداؤد میں بسند صحیح موجود ہے۔ علاوہ ازیں فصاعداً کی زیادتی امام اوزاعی اور شعیب بن ابی حمزہ سے بھی مروی ہے۔ اور یہی فصاعداً کی زیادتی عبدالرحمٰن بن اسحاق مدنی سے بھی مروی ہے اور صالح بن کیسان سے بھی منقول ہے۔ بلکہ فصاعداً کے بجائے حضرت ابوسعید خدری سے مرفوع روایت میں ما تیسر اور دوسری روایت میں ما زاد آیا ہے اور ان کے علاوہ اور بھی متعدد الفاظ آتے ہیں۔ ایک روایت وسورۃ معہا ہے اور ایک روایت میں ایتین وثلاث کی زیادت ہے۔ ایک روایت میں والسورۃ کی زیادتی ہے۔ ایک روایت وثلاث آیات فصاعداً آیا ہے ایک روایت میں وآیتین من القرآن ہے۔ ایک روایت میں ثم اقرا بما معک کی زیادتی ہے۔ ایک روایت میں بما شاء اللّٰہ ان تقرا ہے۔ ایک روایت شی منہا ہے۔ ایک روایت میں ثم قرأت بما معک من القرآن ہے۔ اور اسی قسم کے الفاظ کتبِ حدیث میں اور بھی موجود ہیں مگر مشتے نمونہ از خروارے ہی کافی ہے بہر حال روایت عبادہ میں فصاعداً کی زیادتی روایت کی دُنیا میں ایک واقعہ اور ثابت شدہ حقیقت ہے۔ اس لیے یہ دعویٰ کہ فصاعدا کی زیادت بیان کرنے میں معمر منفرد ہیں۔ اصول و قواعد کی روشنی میں بالکل بے جا اور بے دلیل ہے۔

الکتاب وما تیسر بھی سچی مقتدی نہیں ہے۔ اور جن مرفوع یا موقوف روایات میں مقتدی کو فاتحہ پڑھنے کی اجازت ہے وہ بطور رخصت کے خواص کے واسطے جو رعایت سکتات کر سکتے ہیں اور جو ان ہی رواۃ سے ممانعت ہے وہ ان عوام کے لیے ہے جو سکتات کا خیال نہیں کرتے۔ لہٰذا ہرگز جیسے امام کے پیچھے قرأت نہ کرنے والے کی نماز فاسد نہ ہوگی ایسے ہی امام کے پیچھے قرأت کرنے والے کی نماز میں کوئی نقصان نہ ہوگا۔ یہ مسئلہ اجتہادی ہے اور ہر ایک صحابہ کی رائے اور تاویل اور حضور اقدس کے ارشاد پر عمل کر رہا ہے۔ کسی کو دوسرے پر طعن کی کوئی گنجائش نہیں ہے[1]

مولانا محمد یوسف بنوری نے حضرت شاہ صاحب کی ترجمانی کا معارف السنن میں پورا پورا حق ادا کر دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ابو حنیفہ سے جو علمی سرمایہ منقول ہے اس میں امام ابو حنیفہ کے مذہب میں جہری اور سری نماز میں قرأت نہیں ہے۔ اس کے بعد فقہاء کی تصریح ہے کہ جہری میں ناجائز ہے اور سری نماز میں فقہائے احناف کی روایات مختلف ہیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ پڑھنا مستحب ہے کچھ کہتے ہیں کہ مباح ہے اور کچھ کہتے ہیں کہ مکروہ تحریمی ہے، اور کچھ کہتے ہیں کہ مکروہ تنزیہی ہے۔ متاخرین میں مشہور کراہت تحریمی ہے۔ ابن الہمام کے کلام سے بھی فتح القدیر میں یہی معلوم ہوتا ہے۔ اور صاحب بحر کی تصریح کے مطابق غایۃ البیان میں الاتقانی کا یہی خیال ہے اور ابن الہمام نے صاحب ہدایہ کی اس روایت کی تردید کی ہے کہ امام محمد سری نمازوں میں قرأت کے استحسان کے قائل ہیں۔ لیکن سری نمازوں میں امام محمد سے استحسان کی روایت بلاشبہ ثابت ہے کیونکہ صاحب ہدایہ نقل مذاہب میں استدلالی شخصیت ہیں۔ مولانا عبدالحی تعلیق موطا میں فرماتے ہیں کہ استحسان والی روایت ضعیف ہے لیکن درایت کے نقطہ نظر سے قوی ہے۔ اور کتاب الآثار

---

[1] سبیل الرشاد

اور موطا میں امام محمد کی تصریحات یہ تو بتاتی ہیں کہ سرّی نمازوں میں قرأت نہیں ہے اور یہ کہ قرأت پسندیدہ نہیں ہے لیکن ان سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ قرأت مکروہ ہے بلکہ زیادہ سے زیادہ یہ کہ نہ پڑھنا اولیٰ ہے۔ میری رائے میں اصل مذہب ابی حنیفہ یہ ہے کہ جہری نمازوں میں قرأت ناجائز ہے اور سرّی نمازوں میں ناپسندیدہ ہے۔ مولانا عبدالحی امام الکلام میں سرّی نمازوں میں ملا کر آیت جائز کہتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں مشائخ کے اقوال بھی پیش کئے ہیں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس کی دوسرے ماخذوں سے ہی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً ذخیرہ میں سرّی نمازوں میں قرأت کے متعلق مشائخ کا اختلاف ذکر کیا ہے پھر اپنا مختار عدم قرأت بتایا ہے۔ نیز مقدمہ غزنویہ میں ہے کہ ہمارے کچھ اصحاب نے امام کے پیچھے سرّی نمازوں میں مقتدی کے لیے قرأت کو پسند کیا ہے اور اسی کو امام ابو حنیفہ کا قول اوّل قرار دیا ہے [1]

مولانا عبدالحی امام الکلام میں بہت بڑی تفصیل کے بعد رقمطراز ہیں:

یہ بات کھل کر سامنے آگئی ہے کہ سب سے زیادہ قوی مسلک جس پر ہمارے اصحاب ہیں وہ سرّی نمازوں میں مقتدی کے لیے قرأت کا استحسان ہے جیسا کہ یہ روایت ہے۔ امام محمد ابن الحسن سے اور جسے فقہا کی ایک جماعت نے اختیار کیا ہے۔ روایت اگرچہ تاریخی اعتبار سے ضعیف ہے لیکن درایت کے نقطہ نظر سے قوی ہے اور غنیۃ المستملی سے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ جس روایت کی پشت پناہی درایت کرے اسے اپنانا چاہیے [2]

حضرت مولانا امام ربانی رشید احمد گنگوہیؒ مولانا عبدالحی اور حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیری کے بیانات کا خلاصہ یہ ہے کہ:

۱- جہری نمازوں میں امام کے ساتھ مقتدی کو قرأت کرنی منع ہے۔

۲- جہری نمازوں میں اگر امام سکتہ کرتا ہو تو سکتوں میں پڑھنا جائز ہے۔

---

[1] معارف السنن [2] امام الکلام

۳- جہری نمازوں میں سورہ فاتحہ کے علاوہ قرآن پڑھنا سکتہ میں بھی جائز نہیں ہے۔
۴- جہری نمازوں میں امام کے سکتات میں پڑھنا واجب نہیں ہے۔
۵- سری نمازوں میں امام کے پیچھے مقتدی پر پڑھنا واجب نہیں ہے۔
۶- سری نمازوں میں مقتدی کو قرأت کرنا جائز ہے۔
۷- سری نمازوں میں امام کے پیچھے فاتحہ کے سوا کچھ اور قرآن پڑھنا جائز ہے۔
۸- امام کے پیچھے جہری اور سری نمازوں میں قرأت کرنے والوں کی نماز ہو جاتی ہے۔
۹- امام کے پیچھے جہری اور سری نمازوں میں قرأت کرنے والوں کی نماز ہو جاتی ہے
۱۰- یہ مسئلہ صحابہ میں اجتہادی ہے ان مسائل میں ایک دوسرے کو برا کہنے کی کوئی گنجائش نہیں۔

آیت کی ایک اور تفسیر

حافظ ابن الہمام نے اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ فاستمعوا لہ میں اللہ سبحانہ نے جہری نمازوں میں مقتدیوں کو قرأت سے منع کیا ہے اور وانصتوا میں سری نمازوں میں قرأت سے روکا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ آیت قرآنی میں استماع اور انصات بولے گئے ہیں۔ استماع کے معنے صرف سننا نہیں بلکہ کان دھرنا اور توجہ کرنا ہے۔ اگر آیت میں سماع کا لفظ ہوتا تو یہ بات ٹھیک ہو جاتی کہ جہری میں سنو اور سری میں چپ رہو لیکن آیت میں استماع آیا ہے اور استماع تو انصات کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے چپ نہیں رہے گا تو استماع نہ ہوگا۔ خاموشی نہ ہوگی تو توجہ ضرور بٹے گی۔ یہاں مطلق سکوت مطلوب نہیں بلکہ استماع کی خاطر مطلوب ہے۔ اگر ایک بات کی طرف متوجہ ہیں لیکن خاموش نہیں ہیں تو آپ واقعہ میں متوجہ نہیں۔ اور اگر آپ خاموش تو ہیں مگر بات کی طرف متوجہ نہیں تو آپ کی خاموشی بے معنی۔ مقصود تو یہ ہے کہ خاموشی کے ساتھ قرآن کی طرف پوری توجہ ہو۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ علامہ سید انور شاہ کشمیری نے حافظ ابن الہمام کی اس بات کو قابل اعتنا نہیں سمجھا بلکہ یہ کہہ کر۔ کہ ابن الہمام کا استدلال کچھ نہیں۔ اس کی معنویت سے انکار کر دیا۔ اور بتایا کہ منشاء آیت قرآنی صرف جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت سے روکتا ہے۔ اس کا سری نمازوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مولانا عبدالحی نے امام الکلام میں ابن الہمام سے اختلاف کیا اور بات کو انوکھے انداز میں سمجھایا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ آیت قرآنی میں یہ دونوں

استماع اور انصات کا حکم صرف امر تعبدی نہیں ہے کہ جن کی پشت پر کوئی عقلیت نہ ہو بلکہ یہ اسی طرح عقلی پسِ منظر رکھتے ہیں جیسے خطبہ کے وقت خاموشی کا حکم۔ اس کا پسِ منظر دراصل یہ ہے کہ قرآن نازل ہی اس لیے ہوا ہے کہ اس میں تدبر و تفکر کیا جائے۔ اور یہ مقصد استماع و انصات کے بغیر حاصل ہی نہیں ہو سکتا۔ اور یہ بات سب جانتے ہیں کہ یہ مقصد صرف ان نمازوں میں حاصل ہو سکتا ہے جن میں امام بالجہر قرأت کر رہا ہے۔ مقتدیوں پر چونکہ تدبر کرنا ضروری ہے اس لیے اس ضرورت کے تحت استماع و انصات ناگزیر ہے۔ سری نمازوں میں امام کی آواز مقتدیوں تک پہنچتی ہی نہیں ہے اس لیے تدبر و تفکر ممکن ہی نہیں ہے خواہ وہ خاموش رہیں۔ اس لیے سری نمازوں میں خاموشی کے لیے کوئی معقولیت نہیں ہے۔ یہ کہنا کہ سری نمازوں میں خاموشی محض تعبدی ہے بلا دلیل ہے۔

شاید آپ کے ذہنوں میں یہ خلش ہو کہ یہ کہنا کہ قرآن کا نزول تدبر و تفکر کے لیے ہوا ہے بلا دلیل ہے۔ قرآن کی بے شمار آیات میں یہ بات واضح طور پر بتائی گئی ہے کہ قرآن کا مقصد نزول تدبر و تفکر ہے۔ احادیث مرفوعہ اور موقوفہ میں بھی یہ بات قوت سے واضح کی گئی ہے۔ نیز اُمت کے فضلاء نے تصریح کی ہے۔ صاحبِ نہایہ لکھتے ہیں۔ قرأت خود مقصود نہیں بلکہ تدبر و تفکر کی خاطر مقصود ہے۔ کافی کبایہ اور معراج الدرایہ میں ہے کہ قرأتِ قرآن سے مقصود تدبر و تفکر ہے اور یہ مقصد استماع و انصات کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔[1]

بہرحال حافظ ابن الہمام کی اس تشریح کو اربابِ علم و تحقیق میں وہ پذیرائی نہ مل سکی جس کی توقع تھی۔

آیتِ قرآنی کا تشریحی مقام اس سے زیادہ تفصیلی مباحث کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس موضوع پر مجوزین اور مانعینِ علماء نے علمی تحقیقات کا کافی سرمایہ فراہم کر دیا ہے۔ سب نے دادِ تحقیق دی ہے۔ سب سے پہلے امام بخاری نے جزء القرأۃ لکھا ہے۔ شوافع میں سے امام بیہقی نے کتاب القرأت لکھی ہے اور پاکستان و ہند

---

[1] امام الکلام اور غیث الغمام

میں بھی اس پر علمی اور تحقیقی کام ہوا ہے۔ اہلحدیث علماء میں سے نواب مولانا صدیق حسن خاں، مولانا میاں نذیر حسین، مولانا عبداللہ پشاوری، مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری، اور احناف میں سے مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا عبدالحی لکھنوی، مولانا محمد ہاشم سندھی، مولانا احمد علی سہارنپوری، علامہ ظہیر احسن بہاری، مولانا سید انور شاہ کشمیری، مولانا ابوالزاہد محمد سرفراز خاں کی کتابیں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ شروح حدیث میں اس پر تفصیلی تبصرہ کیا گیا ہے۔ لیکن یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ مسئلہ زمانہ صحابہ سے اختلافی چلا آرہا ہے۔ امام بیہقی کتاب القرآۃ میں لکھتے ہیں کہ:

> صحابہ کرام کے عہد سے اس وقت تک باقاعدہ اس مسئلہ میں اختلاف چلا آتا ہے۔ (کتاب القرآۃ)

علامہ خطابی نے معالم السنن میں لکھا ہے:۔

> اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف رہا ہے۔ صحابہ کی ایک جماعت امام کے پیچھے قرآت کو ضروری بتاتی تھی۔ اور کچھ صحابہ کرام امام کے پیچھے قرآت کے قائل نہ تھے۔ فقہاء بھی تین راہوں میں بٹے رہے کچھ امام کے پیچھے قرآت کو سب نمازوں میں ضروری کہتے تھے اور کچھ سری نمازوں میں ضروری کہتے تھے اور کچھ سری اور جہری نمازوں میں مقتدی کے لیے قرآت کے قائل نہ تھے۔

اللہ سبحانہ کو یاد کرنے کا طریقہ

۲۶۶۔ اور اے پیغمبر یاد کرتا رہ اپنے جی میں اپنے رب کو گڑگڑا کر اور ڈر کر اور زبان سے بھی آہستہ آہستہ بغیر آواز بلند کیے صبح اور شام اور مت ہو تو غفلت والوں میں سے۔ بلاشبہ جن لوگوں کو اللہ کا قرب ہے وہ اس کی بندگی سے بڑائی نہیں کرتے اور وہ اس کی تسبیح میں لگے رہتے ہیں اور اسی کے حضور سجدہ کرتے ہیں۔ بڑا ذکر تو قرآن حکیم ہے۔ اس کا اب بیان ہو چکا۔ اب عام ذکر اللہ کے کچھ آداب بیان کرتے ہیں۔ یعنی ذکر اللہ کی اصلی روح یہ ہے کہ جو زبان سے کہے دل سے اس کی طرف دھیان کرے تاکہ ذکر کا پورا نفع ظاہر ہو اور زبان و دل دونوں عضو

خدا کی یاد میں مشغول ہوں، ذکر کرتے وقت دل میں رقت ہونی چاہیے۔ سچی رغبت و رہبت سے خدا کو پکارے جیسے کوئی خوشامد کرنے والا ڈرا ہوا آدمی کسی کو پکارتا ہے۔ ذاکر کے لہجہ میں آوازیں اور ہیئت میں تضرع و خوف کا رنگ محسوس ہونا چاہیے۔ ذکر و مذکور کی عظمت و جلال سے آواز کا پست ہونا قدرتی چیز ہے و خشعت الاصوات للرحمٰن فلا تسمع الا همساً۔ اسی لیے زیادہ چلانے کی ممانعت آئی ہے۔ دھیمی آواز سے سراپا چھرا خدا کا ذکر کرے تو خدا اس کا ذکر کرے گا۔ پھر اس سے زیادہ عاشق کی خوش بختی کیا ہو گی۔ رات دن خصوصاً صبح و شام کے اوقات ذکر سے خالی نہ ہوں۔ جب مقرب فرشتوں کو اس کے ذکر سے عار نہیں ہے بلکہ ہمہ وقت اسی کی یاد میں لگے رہتے ہیں اسی کو سجدہ کرتے ہیں تو انسان کو اور بھی زیادہ ضروری ہے کہ اس کے ذکر و عبادت و سجدہ سے غافل نہ رہے۔ اس آیت پر بھی سجدہ کرنا چاہیے۔[1]

آیت بالا میں تلاوتِ قرآن کریم کے بگوش دل سننے، متوجہ ہونے اور خاموش رہنے کا حکم دیا تھا جو خود یادِ الٰہی کی ایک خاص صورت تھی اور تعمیلِ حکم کی ایک خاص شکل تھی اب حکمِ عمومی اور دائمی یاد کا حکم دیا جا رہا ہے۔ علماء نے یادِ الٰہی کی دس صورتیں بتائی ہیں۔

اوّل، تلاوتِ قرآن۔
دوم، تسبیح سُبحان اللہ کہنا۔
سوم، تحمید، الحمد للہ کہنا۔
چہارم، تعلیل، لا الٰہ الا اللہ کہنا۔
پنجم، تکبیر، اللہ اکبر کہنا۔
ششم، حوقلہ، لا حول و لا قوۃ الا باللہ کہنا۔
ہفتم، استغفار، استغفر اللہ یا کوئی اور استغفار پڑھنا۔
ہشتم، درود، درود کے صیغے بہت ہیں۔ ان میں سے سب سے افضل وہ ہے جو نماز میں پڑھا جاتا ہے۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

نہم ، استعاذہ ، اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ۔ احادیث میں اس کے اور پیمانے بھی آتے ہیں ۔

دہم ، اسمائے الٰہیہ کو پڑھنا ۔ احادیث میں اللہ سبحانہ کے ۹۹ نام آتے ہیں ۔ ان اذکار میں سے کوئی ذکر کرنا ۔

اس آیت میں ذکر کے بارے میں یہ باتیں بتائی گئی ہیں ۔

اول یہ کہ ذکر فی النفس ہو ۔ عربی زبان میں اس کے تین معنے آتے ہیں ۔ آہستہ پڑھنا ، دل میں غور و فکر کرنا ، اور اکیلے پڑھنا ۔ یہاں اگر آہستہ پڑھنے کے معنے لیے جائیں تو دُونَ الجہر مِنَ القول میں پھر اسی کا تکرار ہو جائے گا اور یہ کلام کی شانِ بلاغت کے خلاف ہے اس لیے یہاں دو ہی معنے ہو سکتے ہیں ۔ دل ہی دل میں غور و فکر کرنا ، یا پھر اکیلے پڑھنا ۔ اگر دل ہی دل میں غور و فکر کرنا مراد ہو تو دون الجہر من القول کی قید بے معنے ہو کر رہ جائے گی اس لیے بلاغت کا تقاضا یہ ہے کہ معنے یہ ہوں کہ تنہائی اور خلوت میں اللہ کو یاد کیجئے ۔ ایک حدیث قدسی سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے ۔ بخاری و مسلم میں ہے :

فان ذکرنی فی نفسہ ذکرتہ فی نفسی وان ذکرنی فی ملاء ذکرتہ فی ملا خیر منہم ۔

میرا بندہ اگر مجھے تنہائی میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اس کو تنہائی میں یاد کرتا ہوں اور جب وہ مجھے جلوت اور جماعت میں ذکر کرتا ہے تو میں اس جماعت سے بہتر جماعت میں یاد کرتا ہوں ۔

اس حدیث میں فی نفسہ تنہا اور اکیلے کے معنے میں ہے کیونکہ اس کا تقابل فی ملا جماعت سے کیا گیا ہے ۔ اور کنز العمال میں فی نفسہ کی جگہ خالیاً آیا ہے جو صراحت سے اس مفہوم کو ادا کر رہا ہے ۔ اس آیت میں تقابل ہے پہلے فَاسْتَمِعُوا وَاَنْصِتُوا میں ذکر اجتماعی بتایا تھا ۔ اب اس آیت میں ذکر انفرادی کی طرف رہنمائی ہو رہی ہے ۔ یہاں سے اس حدیث کا مطلب بھی واضح اور صاف ہو کر سامنے آجاتا ہے جس میں حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ :

جس نے نماز پڑھی اور اس میں سورہ فاتحہ نہیں پڑھی تو اس کی نماز

اُدھوری ہے اُدھوری ہے اُدھوری ہے مکمل نہیں ہے۔ ابوالسائب کہتے ہیں میں نے حضرت ابوہریرہ سے دریافت کیا کہ جناب جب میں امام کے پیچھے ہوں تو کیا کروں انہوں نے میرا بازو دبا کر جواب دیا اقرأ بها فی نفسك یا فارسی۔
اس کے دو معنے ہیں کہ اپنے دل میں پڑھ لیا کر یا یہ کہ امام کے پیچھے نہیں اکیلے پڑھا کر یعنی جب اکیلے ہو تو اس وقت سورۃ فاتحہ پڑھ لیا کرو۔ علامہ ابوالولید الباجی شرح موطا میں لکھتے ہیں کہ ابوالسائب کے سوال کرنے کا سبب یہ تھا کہ انہوں نے جب بڑے بڑے اماموں اور دیگر لوگوں کو امام کے پیچھے ترکِ قرأت کرتے امام کے پیچھے دیکھا تو حضرت ابوہریرہؓ پر یہ اعتراض کیا۔ اس روشنی میں بھی ان ہی معنے کی تائید ہوتی ہے۔
یہیں سے یہ بات بھی صاف ہوگئی کہ اس آیت سے امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنے پر استدلال بادر ہوا کے مترادف ہے کیونکہ
اوّلاً، اگر واقعی اس آیت سے یہ مسئلہ ثابت ہوتا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام اور جمہور سلف کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہوتا۔
ثانیاً، اس آیت میں نہ امام کا ذکر ہے نہ مقتدی کا نہ قرأت اور نہ سورۃ فاتحہ کا۔ مطلق ذکر کو خودساختہ قیدوں سے مقید کرنا کیوں کر صحیح ہو سکتا ہے۔
ثالثاً، اگر واقعی یہ آیت نماز کے بارے میں ہے تو اس کا صحیح عمل یہ ہو سکتا ہے کہ اذکر کا مخاطب امام ہے نہ کہ مقتدی کیونکہ اذکر، ربك اور لا تکن میں مفرد صیغے اس کی دلیل ہیں اور اس سے پہلی آیت فاستمعوا، انصتوا اور لعلکم ترحمون میں مقتدیوں کو خطاب ہے کیونکہ یہ جمع کے صیغے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ امام کو سری نمازوں میں امام کو اپنے دل میں قرأت کرنی چاہیے۔ پہلی آیت میں جہری نمازوں کا حکم امام اور مقتدی دونوں کو بتایا تھا اس آیت میں امام کو سری نمازوں کا حکم بتا دیا ہے۔
رابعاً، حافظ ابن کثیر نے اسے بعید از مراد قرار دے کر لکھا ہے کہ ایسا سمجھنا تو اس امر خداوندی کے سراسر منافی ہے جس میں مقتدیوں کو خاموش رہنے کا حکم دیا ہے اور حافظ ابن کثیر نے اس خیال کی تردید حافظ ابن جریر اور عبدالرحمان بن زید بن اسلم کا نام لے کر کی ہے۔ ابن جریر نے اس آیت کی یہ تشریح کی تھی۔
چاہیے تیری یادِ الٰہی قرآن سننے کے وقت دعا میں بغیر جہر کے آہستہ ہو۔

ان سے پہلے حافظ ابن کثیر کہتے ہیں کہ اسی قسم کی تفسیر عبدالرحمان بن زید بن اسلم نے کی ہے۔ خود حافظ ابن جریر نے ان کی یہ تفسیر نقل نہیں کی ہے بلکہ ان سے جو کچھ نقل کیا ہے وہ صرف یہ ہے کہ اذا قُرِیَ القرآن کی انہوں نے یہ تشریح کی ہے کہ :

استماع و انصات کا حکم اس وقت ہے جب امام نماز کے لیے کھڑا ہو۔

لیکن حافظ سیوطی نے الدر المنثور میں ابن جریر اور ابوالشیخ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ :

استماع و انصات کا حکم اس وقت ہے جب امام نماز کے لیے کھڑا ہو، کان لگا کر سنو اور خاموش رہو۔ اور اے خاموش رہنے والے تو اپنے جی میں عاجزی اور خوف کے ساتھ اللہ کو یاد کر، اور آہستہ کر۔

اور اس بنیاد پر لوگوں نے یہ عمارت اٹھالی کہ :

اس سے مراد یہ ہے کہ مقتدی آہستہ آہستہ قرأت کرے۔

افسوس کہ بیہقی کی کتاب القراۃ میرے پاس نہیں ہے۔ السیوطی نے عبدالرحمان بن زید بن اسلم کے اس بیان کو ابن ابی شیبہ اور ابوالشیخ کے حوالہ سے پیش کیا ہے خواہ کچھ ہو حافظ ابن کثیر نے اسے قرآنی مراد کے منافی قرار دیا ہے۔ روایتی نقطہ نظر سے بھی اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے کیونکہ اس مفسر یعنی عبدالرحمان بن زید بن اسلم کی شخصیت بارگاہ محدثین میں جانی پہچانی ہے۔ ان کی احادیث کی بازار علم میں کوئی قیمت نہیں۔ حاکم اور ابونعیم کہتے ہیں کہ یہ اپنے والد کے نام پر احادیث کا جھوٹی اور من گھڑت کا پشتارہ کھتا تھا۔ امام احمد، علی ابن المدینی، نسائی، حافظ ابوزرعہ، ابوحاتم سب ان کے ضعیف ہونے پر متفق ہیں۔

اور لطف کی بات یہ ہے کہ خوش فہمی کی بات یہ ہے کہ بات کو وزن بنانے کے لیے اس تشریح کی پیشانی پر بجائے عبدالرحمن بن زید بن اسلم کے زید بن اسلم کے نام کا لیبل لگا دیا گیا۔

بہرحال امام کے پیچھے قرأت کے لیے یہ سہارا بہت کمزور ہے۔

دوم، دوسری بات یہاں یاد الٰہی کے بارے میں یہ فرمائی گئی ہے کہ ذکر میں ذاکر پر عاجزی اور خوف کی کیفیت طاری ہو۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ رغبت و رہبت سے دوچار ہو یعنی اللہ سے رحمتوں کی امید رکھتا ہو اور ساتھ ہی اس کی عقوبتوں سے لرزاں بھی ہو۔ ان دونوں کا تعلق انسان کے قلب سے ہے اور قلب میں یہ کیفیت اس وقت تک نہیں پیدا ہو سکتی جب تک ذکر شعوری نہ ہو۔ ذکر کے شعوری ہونے کے لیے ضروری ہے کہ جو کچھ

کہہ رہا ہو اس کا ذہن و دماغ اس کا ادراک بھی کرتا ہو۔ علماء نے تصریح کی ہے کہ اذکار کی افادیت کا دارومدار ان کے سمجھ کر کہنے میں ہے۔ اذکار میں صرف قرآن ایسا ذکر ہے جسے بغیر معنے سمجھے پڑھنا اجر سے محرومی نہیں ہے۔ باقی دوسرے اذکار کے لیے ضروری ہے کہ شعوری ہوں۔ رغبت و رہبت سے بیگانہ ذکر نہ روح میں طہارت و پاکیزگی اور تطاعات میں نورانیت کی اس میں ضمانت ہے۔

سوم یہ کہ آہستہ ہو آواز بلند نہ ہو۔ حافظ ابن القیم نے بدائع الفوائد میں ذکر اور دعا میں ہم آہنگی بتاتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ دعا و ذکر دونوں باہم ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ اور دونوں کے آہستہ خفیہ اور بغیر جہر کرنے کے فوائد بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ آہستگی کا اولین فائدہ یہ ہے کہ اس سے مومن کے ایمان کی عظمت کھل کر سامنے آتی ہے کیونکہ آہستہ ذکر کرنے والا جانتا ہے کہ اللہ سبحانہٗ اس کی خفیہ دعا کو سنتا ہے۔ دوسرے یہ کہ آہستگی کو ادب اور تعظیم میں بہت دخل ہے۔ اسی لیے ارباب اقتدار کو باآواز بلند نہیں پکارا جاتا ہے اور ان کے سامنے آواز اونچی نہیں کی جاتی۔ تیسرے یہ کہ آہستگی خشوعی حالت پیدا کرنے میں بہت زیادہ معین ہے اور خشوع و تضرع دعا و ذکر کی جان ہے۔ چوتھے آہستگی اخلاص میں زیادہ موثر ہے، پانچویں یہ کہ قلب کی جمعیت اس سے پیدا ہوتی ہے آواز کی بلندی سے دل میں انتشار ہوتا ہے چھٹے یہ کہ آہستگی اللہ سے قرب کی نشانی ہے۔ گویا اللہ کو اس طرح یاد کرتا ہے یا پکار کرتا ہے جیسے قریب قریب کو پکارتا ہے اس طرح نہیں جیسے دور سے آواز دی جاتی ہے۔ ساتویں، آدمی کو آہستگی میں اللہ کو یاد کرنے اور اس سے دعا کرنے کا بھرپور موقع ملتا ہے برخلاف آواز بلند کرنے کے کہ اس میں زبان تھک جاتی ہے۔ یہ اور اس کے علاوہ اور بہت سے فوائد اخفا کے لکھے ہیں۔ اسی لیے احادیث میں ذکر و دعا میں آواز کی پستی کو سراہا ہے۔ مثلاً صحیح بخاری میں ہے:

حضرت ابوموسیٰ اشعری فرماتے ہیں کہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ خیبر کے لیے نکلے تو لوگ ایک میدان میں پہنچے انہوں نے باآواز بلند اللہ اکبر کہنا شروع کیا۔ اس پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنی جانوں پر رحم کرو بے شک تم بہرے اور غائب کو نہیں پکارتے ہو۔ تم تو اس

ذات کو پکار رہے ہو جو سننے والی اور قریب ہے اور وہ تمہارے ساتھ ہے ۔
یہ صحیح اور صریح ارشادِ نبوت بتا رہا ہے کہ بجز مستثنیٰ مواقع کے بلند آواز سے ذکر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند نہیں ہے ۔ اسی لیے آپ نے حضرات صحابہ کو اس سے منع فرمایا ہے ۔ اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد قرآن کی اسی آیت کی تشریح ہے ۔ شارحین حدیث نے بھی اس سے یہی کچھ اخذ کیا ہے ۔ امام محی الدین نووی اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں :

اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ جب جہر کی ضرورت نہ ہو تو ذکر میں پست آواز رکھنی چاہیے کیونکہ آہستہ آواز اس کی توقیر و تعظیم میں زیادہ کام کرتا ہے ۔ ہاں اگر بلند آواز سے ذکر کرنے کی ضرورت پیش آئے تو پھر آواز بلند کرنی چاہیے جیسا کہ احادیث میں آتا ہے ۔

اور علامہ بدر الدین عینی اس کی شرح میں فرماتے ہیں ۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بلند آواز سے ذکر اور دعا دونوں کو ناگوار سمجھا ہے ۔

ایک دوسری حدیث میں حضرت سعد بن ابی وقاص اللیثیؓ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ :

بہترین ذکر وہ ہے جو آہستہ ہو اور بہترین رزق وہ ہے جو ضروریات میں کفایت کرے ۔

اسی بنا پر قرآن حکیم کی اس آیت سے امام ابو حنیفہ نے ذکر بالجہر کے بدعت ہونے پر استدلال کیا ہے ۔ علامہ ابن نجیم البحر الرائق میں فرماتے ہیں کہ :

امام ابو حنیفہ نے فرمایا ہے کہ بلند آواز سے ذکر کرنا بدعت ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے مخالف ہے ۔

امام سرخسی اپنی کتاب مبسوط میں لکھتے ہیں :

احناف کے نزدیک اذکار اور دعا میں مستحب یہ ہے کہ آہستہ ہوں مگر جس چیز کا مقصد اظہار و اعلان ہو وہاں آواز بلند کرنا مستحب ہے جیسے اذان اعلان کے لیے اور خطبہ وعظ کے لیے اور تکبیر نماز کے لیے اور نماز کی

تکبیریں تحریمہ صلاۃ اور انتقال ارکان بتانے کے لیے۔ اور قرأت مقتدی کے
سنانے کے لیے۔ تلبیہ بھی اس چیز کو شروع کرنے کے لیے جس کا دین میں
اظہار مقصود ہے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی تحریر فرماتے ہیں:

اس پر علماء کا اجماع ہے کہ ذکر آہستہ ہی بہتر ہے اور جہر بدعت ہے، مگر ان خاص جگہوں میں جہاں جہر کی ضرورت ہے۔

چہارم یہ کہ صبح و شام ہو۔ علماء نے لکھا ہے کہ اس سے مقصود دوام ذکر ہے۔ یعنی ان اوقات میں ذکر ہمیشہ ہو۔ اور اس سے یہ بات دلالۃً معلوم ہو رہی ہے کہ ذکر کی بہتات ہو۔ حافظ ابن القیم نے الوابل الصیب میں ذکر کے ۷۹ فائدے لکھے ہیں۔ ان میں کچھ باتیں بہت ہی مفید ان کے قلم سے نکلی ہیں جزاہ اللہ عنا۔ مثلاً ذکر شیطان کو دور کرتا ہے اور اس کی قوت کو توڑتا ہے، اللہ سبحانہ کی خوشنودی کا سبب ہے دل سے فکر و غم کو دور کرتا ہے۔ دل میں فرحت و انبساط پیدا کرتا ہے، بدن کو اور دل کو قوت بخشتا ہے چہرہ اور دل کو منور کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کرتا ہے۔ اور محبت ہی اسلام کی روح اور دین کا مرکز ہے اور سعادت و نجات کا مدار ہے۔ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اللہ کی محبت تک اس کی رسائی ہو اس کو چاہیے کہ اس کے ذکر کی کثرت کرے۔ جیسا کہ پڑھنا اور تکرار کرنا علم کا دروازہ ہے ایسے ہی اللہ کا ذکر اس کی محبت کا دروازہ ہے ذکر سے مراقبہ نصیب ہوتا ہے جو مرتبہ احسان تک پہنچا دیتا ہے یہی مرتبہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی عبادت ایسی نصیب ہوتی ہے گویا اللہ سبحانہ کو دیکھ رہا ہے۔ اللہ کی طرف رجوع پیدا کرتا ہے جس سے رفتہ رفتہ یہ نوبت آجاتی ہے کہ ہر چیز میں اللہ سبحانہ اس کی جائے پناہ اور ماویٰ و ملجا بن جاتے ہیں اور ہر مصیبت میں اسی کی طرف توجہ ہو جاتی ہے۔ اللہ جل شانہ کی بارگاہ میں ذکر کا سبب ہے چنانچہ کلام پاک میں ارشاد ہے فاذکرونی اذکرکم اور حدیث میں ہے من ذکرنی فی نفسہ ذکرتہ فی نفسی اگر ذکر میں اس کے سوا کوئی بھی فضیلت نہ ہوتی تب بھی شرافت اور کرامت کے اعتبار سے بھی ایک فضیلت کافی تھی چہ جائے کہ اور بھی بہت سی فضیلتیں ہیں دوام ذکر کی بدولت اپنے آپ کو بھولنے سے اس کو امن نصیب ہوتا ہے جو سعادت دارین کا بہت بڑا سبب ہے۔

کیونکہ اللہ کی یاد کو بھلا دینا اپنے کو بھلا دینے کا سبب ہوتا ہے اور جب آدمی خود فراموش ہو جاتا ہے تو مصالح سے نظر ہٹ جاتی ہے اور یہ ہلاکت کا سبب بن جاتا ہے۔ ذکر کا نور دُنیا میں بھی ساتھ رہتا ہے اور قبر میں بھی ساتھ رہتا ہے اور آخرت میں پُل صراط پر آگے آگے چلتا ہے۔ جو شخص راستوں میں گھروں میں، سفر میں اور حضر میں کثرت سے ذکر کرے قیامت میں اس کی گواہی دینے والے کثرت سے ہوں گے قرآن میں ہے یومئذ تحدث اخبارھا اس روز زمین اپنی خبریں بیان کرے گی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا کہ جانتے ہو زمین کی خبریں کیا ہوں گی۔ صحابہ نے لاعلمی ظاہر کی تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ جس نے جو کام کیا ہے وہ بتائے گی کہ فلاں فلاں وقت مجھ پر یہ کام کیا ہے نیک ہو یا بد، اس لیے مختلف مختلف جگہوں میں کثرت سے ذکر کرنے والوں کے گواہ بھی زیادہ ہوں گے۔

بہر حال حاصل یہ ہے کہ ذکر کیا جائے اور ان چار شرطوں کے ساتھ کیا جائے کہ اوّل تنہائی ہو، دوم رغبت و رہبت کی حالت ہو، سوم آہستہ ہو، چہارم زیادہ ہو اور ہمیشہ ہو تو رضائے الٰہی کا مقام حاصل ہو جائے اور غفلت ختم ہو جائے گی اور اس کے نتیجہ میں ان فرشتوں سے تشبہ ہو جائے گا جو اللہ کی عبادت سے سرکشی نہیں کرتے اور تسبیح میں لگے رہتے ہیں اور اس کی جناب میں سجدہ ریز رہتے ہیں۔ یا یوں کہہ دیجئے کہ یہ آیت علت ہے پہلی آیت میں حکم کی یعنی ذکر اب تمہیں اس لیے کرنا چاہیئے کہ یہ اللہ کے قرب کا ذریعہ ہے۔ اللہ کی ذات چونکہ جسمانیت سے پاک ہے اس لیے اس کا قرب صرف ذکر سے حاصل ہوتا ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ اللہ سے محبت کی علامت اس کے ذکر سے محبت ہے اور اللہ سے بغض کی علامت اس کے ذکر سے بغض ہے۔

چونکہ اس آیت سے غلط رو لوگوں نے غلط سہارے لیے ہیں اس لیے آیئے اس کی تشریح خود شارحین قرآن کی زبانی بھی گوش گزار فرما لیجئے۔

امام ابو محمد حسین بن مسعود الفراء البغوی الشافعی اس آیت کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ:

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس آیت کے معنے ہیں کہ نماز میں قرآت آہستہ کر عاجزی کرتے ہوئے ڈرتے ہوتے یعنی میری بارگاہ میں عاجزی، فروتنی اور ڈرتے ہوئے آؤ۔ اور یہ سرّی نمازوں کے بارے میں ہے

اور دون الجہر من القول کا یہ مطلب ہے کہ جہری نماز میں جہر شدید نہ کرو بلکہ آہستہ اور سکون کے ساتھ ہو کہ اپنے مقتدیوں کو سنا سکے اور حضرت مجاہد اور ابن جریج کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ اس کی طرف عاجزی کرتے ہوئے اپنے دلوں میں اس کا ذکر کریں نہ کہ یہ دعا میں آواز بلند ہو اور نہ چلائیں۔

اس میں حضرت ابن عباس کی یہ تفسیر بھی آگئی کہ یہ آیت کریمہ نماز میں قرأت کے بارے میں ہے۔ سری نمازوں میں عاجزی و زاری کے ساتھ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے قرأت کی جائے۔ اور جہری نماز میں اس قدر جہر ہو کہ پیچھے مقتدی سن سکیں یعنی ضرورت سے زیادہ جہر نہ ہو اور پھر اس کے بعد حضرت مجاہد اور حضرت ابن جریج کی وہی تفسیر نقل کی ہے جو حضرات مفسرین کرام نقل کرتے ہیں۔

مشہور مفسر قرآن امام محمد بن جریر الطبری اس آیت کی تفسیر میں طویل تشریح کرتے ہوئے معروف تابعی حضرت مجاہد کی تفسیر اس طرح نقل کرتے ہیں:

امام مجاہد نے فرمایا کہ لوگوں کو حکم دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے دلوں میں عاجزی اور ڈرتے ہوئے ذکر کریں۔

اور امام ابن جریج سے اس کی یہ تفسیر نقل کرتے ہیں کہ:

عاجزی اور انکساری کے ساتھ دعا کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور دعا میں آواز بلند کرنا اور چیخنا چلانا مکروہ ہے۔

علامہ ابوالبرکات عبداللہ ابن احمد النسفی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

یہ آیت اذکار کے بارے میں عام ہے۔ قرأت قرآن، دعا، تسبیح، تہلیل وغیرہ سب کو شامل ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ذکر کا لفظ کسی مخصوص ذکر اور ورد سے مقید نہیں ہے بلکہ قرآن کی تلاوت، دعا، سبحان اللہ اور لا الہ الا اللہ وغیرہ سب کے لیے عام ہے اس کے بعد یہی صاحب مدارک لکھتے ہیں کہ:

دون الجہر من القول کا یہ مطلب ہے کہ ایسا کلام ہو جس میں جہر نہ ہو کیونکہ اخفا کو اخلاص سے گہرا لگاؤ ہے اور حسن تفکر کے بھی زیادہ نزدیک ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم کی تلاوت ہو یا دعا، تسبیح و تہلیل ہو یا کوئی اور ذکر ہو سب میں اخفا مطلوب ہے۔

علامہ علاء الدین علی ابن محمد المعروف بالخازن دون الجہر من القول کی تشریح میں نقل کرتے ہیں۔

حضرت مجاہد اور ابن جریج فرماتے ہیں کہ یہ حکم دیا گیا ہے کہ اپنے دلوں میں عاجزی وانکساری کے ساتھ اس کا ذکر کریں نہ یہ کہ دعا میں آواز بلند کی جاتے۔

امام فخر الدین رازی مفاتیح الغیب میں لکھتے ہیں:

دون الجہر من القول کے معنے یہ ہیں کہ اپنے رب کو اس طرح یاد کرو کہ اپنے آپ کو سنا سکے کیونکہ مقصد تو یہ ہے کہ زبانی ذکر حاصل ہو اور ذکر لسانی جب اس طرح ہو کہ اپنے نفس کو سنا سکے تو اس ذکر سے خیال متاثر ہوگا اور خیال کا متاثر ہونا قلبی وروحانی ذکر کی قوت کا موجب ہے۔

علامہ ابو السعود محمد بن محمد العمادی لکھتے ہیں:

یہ آیت تمام اذکار میں عام ہے کیونکہ آہستہ ذکر کو اخلاص میں بہت زیادہ دخل ہے اور یہ قبولیت کے زیادہ قریب ہے۔

علامہ سید محمود آلوسی بغدادی اپنی تفسیر روح المعانی میں لکھتے ہیں:

یہ ہر ذکر کے لیے عام ہے کیونکہ اخفاء کا اخلاص میں خاص دخل ہے اور یہ قبولیت کے بھی قریب ہے۔

اور دون الجہر کی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:

اور جہر سے مراد زیادہ آواز اونچی کرنا ہے اور دون الجہر سے جہر کی ایک اور قسم مراد ہے۔ حضرت ابن عباس نے اس قسم کو بیان کیا ہے کہ اپنے رب کو سنا سکے۔

اس تشریح سے معلوم ہوا کہ اذکار میں جہر مفرط مطلوب نہیں بلکہ جہر کی ایک ایسی نوع اور قسم مطلوب ہے جو جہر مفرط اور آہستہ کے درمیان ہو۔ اور حضرت عبد اللہ بن عباس نے اس کی تفسیر یہ فرمائی کہ ذکر کرنے والا اپنے رب کو سنا سکے۔

الغرض دُون الجہر میں ایسا جہر مراد نہیں کہ دوسرے لوگ سُن سکیں اور ان کے مشاغل میں خلل پڑے۔ قاضی ثناء اللہ نے دُون الجہر من القول کا جو مطلب بتایا ہے وہ بھی اس کا موید ہے فرماتے ہیں ؛

مطلب یہ ہے کہ اس انداز سے بولا جائے جو آہستہ سے اُوپر ہو اور جہر سے کم ہو اس سے مراد جہری نماز ہے مطلب یہ ہے کہ زیادہ شدت سے جہر نہ کرو بلکہ آہستہ اور سکون سے ہو تاکہ جو تمہارے پیچھے اقتداء میں ہیں وہ سُن لیں۔ اسی طرح اس آیت کی تشریح ابن عباس نے کی ہے۔

غور فرمایئے کہ جہری نماز میں بھی جس میں مطلوب ہی جہر ہے جہر شدید ممنوع ہے حالانکہ اس میں مقتدیوں کو سنانا مقصود ہوتا ہے لیکن ایسی جگہ تک جہر ہو جس حد تک نماز میں شامل مقتدی سُن سکیں ضرورت سے زیادہ درست نہیں ہے۔

آخر میں یہ بات پھر ذہن میں تازہ کر لیجیے کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک وہ تمام اذکار جن میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے جہر ثابت نہیں جہر بدعت ہے، خواہ نماز کے بعد تکبیر ہو یا تہلیل ہو یا استغفار ہو۔ اس موضوع پر ہم نے اپنی کتاب "اسلام کا نظامِ اذکار" میں تفصیلی بحث کی ہے۔ مزید بصیرت کے لیے مولانا ابوالزاہد محمد سرفراز خان صفدر کی کتابیں حکم الذکر بالجہر اور اخفاء الذکر مطالعہ کیجئے۔

بتانا یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ کی یاد میں ہمیشہ مشغول رہنا چاہیے اور اس میں کسی حال میں بھی غفلت نہ ہونی چاہیے۔ زندگی کے ہر موڑ پر اللہ کی یاد ہو۔ دُنیا میں جو کچھ گمراہیاں پھیل رہی ہیں اور انسان کے اخلاق و اعمال میں جو فساد بھی رونما ہوا ہے اس کا سبب صرف یہ ہے کہ انسان اس بات کو بھُول جاتا ہے کہ اللہ سبحانہٗ اس کا مالک و رب ہے اور وہ خدا کا بندہ ہے اور دُنیا میں اس کو آزمائش کے لیے بھیجا گیا ہے اور دُنیا کی زندگی ختم ہونے کے بعد اسے اپنے رب کو حساب دینا ہوگا۔ لہٰذا جو شخص حق پر چلنا چاہتا ہے اور دُنیا کو اس پر چلانا چاہتا ہے اس کو اس کا بہت زیادہ اہتمام کرنا چاہیے کہ یہ بھول کہیں کو خود نہ ہو جائے اسی لیے اجتماعی اور انفرادی یادِ الٰہی اور دائمی توجہ الی اللہ کی آخر میں تاکید کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ بڑائی میں آکر خدا کی طاعت و عبادت سے علیحدگی اختیار کرنا شیاطین کا کام ہے اور اس کا

نتیجہ اللہ کی رحمت سے دُوری ہے۔ اس کے برعکس خدا کو یاد کرنا، اس کے سامنے سربسجود ہونا اور اس کی بندگی میں ثابت قدم رہنا ملائکہ کی سیرت ہے اور اس کا نتیجہ ترقی، بلندی اور خدا سے قرب ہے۔ اگر اس زندگی اور اس زندگی میں ترقی چاہتے ہو تو اپنی زندگی کو شیاطین کے بجائے ملائکہ کے طرزِ عمل کے مطابق بناؤ کہ یہ کامیابی کا راستہ ہے۔ اس آیت ان الذین عند ربک میں ایک طرف تو اہلِ ایمان کو بتایا ہے کہ جو لوگ اللہ سبحانہٗ کو ہمہ وقت اور ہمیشہ یاد کرتے ہیں اگرچہ وہ رہتے دُنیا میں ہیں لیکن وہ اپنے افکار و اعمال اور اخلاق میں ملائکہ سے مشابہ ہو جاتے ہیں کیونکہ جس طرح ملائکہ ہر وقت تسبیح و تہلیل اور خدا کی یاد میں رہتے ہیں اسی طرح اہلِ ایمان بھی یادِ الٰہی میں مشغول رہتے ہیں۔ دوسری طرف اس آیت میں مشرکین پر تعریض ہے کہ یہ اس نعمت سے محروم ہیں۔

سجدہ تلاوت

قرآن کے ان مقامات میں سے جہاں سجدہ تلاوت کیا جاتا ہے یہ قرآن میں پہلا موقعہ ہے حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں:

یہ قرآن میں پہلا سجدہ ہے۔ یہاں قرآن پڑھنے والے اور قرآن سننے والے کے لیے بالاجماع سجدہ مشروع ہے۔

سجدہ تلاوت کی قانونی حیثیت کیا ہے۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ سجدہ تلاوت کو واجب کہتے ہیں اور دوسرے ائمہ اسے سنت بتاتے ہیں۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بسا اوقات جب مجمع میں آیت سجدہ تلاوت کرتے تو آپ خود بھی سجدہ کرتے اور مجمع میں جو شخص جہاں ہوتا وہیں سجدہ ریز ہو جاتا۔ کبھی آپ نے خطبہ کے دوران آیت سجدہ تلاوت کی تو منبر سے اُتر کر سجدہ کیا ہے۔ عام علماء صحابہ اس سجدہ کی صحت کے لیے انہی شرائط کے قائل ہیں جو نماز کے لیے ضروری ہیں یعنی باوضو ہونا، قبلہ رو ہونا اور نماز کی طرح زمین پہ سر رکھنا صحابہ میں صرف حضرت عبداللہ بن عمر کے بارے میں صحیح بخاری میں آتا ہے کہ وہ بغیر وضو سجدہ کرتے تھے لیکن حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری میں لکھتے ہیں کہ

بغیر وضو کے سجدہ کرنے میں ان کی کسی نے امام شعبی کے سوا ہمنوائی نہیں کی ہے بہرحال جمہور کا مذہب یہی ہے کہ سجدہ تلاوت کے لیے وہ تمام شرطیں ہیں جو نماز کے لیے ضروری ہیں ۔

الحمدللہ سورۃ اعراف کی تشریحات اس سیاہ کار کے قلم سے آج مورخہ ۲۱، ذی الحجہ ۱۴۰۳ھ بوقت پانچ بجے صبح قبل صلوٰۃ فجر پوری ہوئی ہیں ۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۔

مَعَالِمُ الْقُرْآن

سُورۃ اَلْاَنْفَال ۸

الانفال

سورت کا نام اور اس کا مقام

سورت کا نام اس میں انفال کے ذکر کی رعایت سے ہے۔ عبداللہ ابن عباس نے اس میں غزوہ بدر کے تفصیلی ذکر کی وجہ سے اسے سورۃ البدر بھی کہا ہے۔
حافظ سیوطی نے یہاں ایک بات لکھ کر بیگانوں کے ذہنوں میں کھلبلی اور بیگانوں کے ہاتھوں میں ہتھیار مہیا کر دیے۔ ان کا کہنا ہے کہ سورہ انفال کا اس موقعہ پر ذکر نبوت کی جانب سے سرکاری نہیں بلکہ حضرت عثمان کا اجتہادی کارنامہ ہے لیکن خدا بھلا کرے علامہ آلوسی کا کہ انہوں نے السیوطی کی ساری بنائی ہوئی عمارت کو بیک جنبش قلم مسمار کر دیا۔ اور بتایا کہ دونوں سورتوں کی ہم آہنگی، ربط اور مناسبت بزبان حال کہہ رہی ہے کہ اعراف و الانفال باہم ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ سورہ اعراف میں وامر بالعرف کا ایک ضابطہ پیش کیا جب کہ سورہ انفال میں اسی قانون کی متعدد جزئیات ذکر کی گئی ہیں۔ سورہ اعراف میں انبیاء اور ان کی قوموں کے واقعات کا تفصیلی تذکرہ ہے جبکہ سورہ انفال میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی قوم کے درمیان ہونے والے واقعات کا بھرپور ذکر ہے۔ سورہ اعراف میں حضور کے مخاطبوں کی جانب معجزات کی طلب کا اجمالی جھوٹ پیش کیا تھا اور سورہ انفال میں اسی کو کھول کر بیان کیا ہے۔ سورہ اعراف میں یہ قانون بتایا تھا کہ جب قرآن کی تلاوت ہو تو اہل ایمان کے لیے ضروری ہے کہ استماع اور انصات کو اپنائیں اور سورہ انفال میں جماعت اہل ایمان میں اس کا عملی شاہکار پیش کیا گیا ہے انما المومنون الذین اذا ذکر اللہ وجلت قلوبھم واذا تلیت علیھم ایاتہ زادتھم ایمانا یہ منشتے نمونہ خروار ہے اور بھی

بہت سی مناسبات ہیں ۔ اس صورت میں یہ کہنا بالکل سطحی ہے کہ سورہ انفال کا سورۃ اعراف کے بعد مقام توقیفی نہیں ہے بلکہ اجتہادی ہے ۔ اور جس روایت کو حافظ سیوطی نے اس نازک ترین مسئلہ میں سہارا بنایا ہے وہ مسند احمد، ابن حبان اور الحاکم کی روایت کی ہے ۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر جب سورتیں نازل ہوتی تھیں تو آپ لکھنے والے کو بلاتے اور فرماتے کہ ان آیات کو فلاں سورت میں رکھ دو ۔ سورہ انفال مدنی زندگی کے شروع میں نازل ہوئی جب کہ سورہ برأت قرآن کی آخری سورتوں میں سے ہے یعنی باعتبار نزول ۔ سورہ برأت اور انفال میں واقعاتی ہم آہنگی ہے ۔ میں نے خیال کیا کہ سورہ انفال اسی سے تعلق رکھتی ہے حضور کا وصال ہو چکا تھا اور اس موضوع پر آپ کا کوئی ارشاد نہ تھا اس لئے میں نے دونوں سورتوں کو باہم جوڑ دیا اور میں نے دونوں کے مابین بسم اللہ نہیں لکھی اور دونوں کو میں نے سبع طوال میں رکھ دیا ۔

یہ تو حضرت عثمان کا وہ جواب ہے جو عبداللہ بن عباس کو اس سوال پر دیا کہ جسے بیہقی نے دلائل النبوت میں نقل کیا ہے ۔

آپ نے سورہ انفال کے لئے یہ مقام کیوں تجویز کیا اور دونوں کے درمیان بسم اللہ کیوں نہیں لکھی ۔ ؟

اس پر حضرت عثمان نے وہ جواب دیا جو آپ پہلے سن چکے ۔ یہ حدیث سنن ترمذی میں موجود ہے ۔ اس کی امام ترمذی نے تحسین کی ہے ۔ یہ حدیث محمد بن بشار نے ان حضرات سے سنی ہے یحییٰ بن سعید، محمد بن جعفر، ابن ابی عدی اور سہل بن یوسف، ان سب کی معلومات کا سہارا عوف ابن جمیلہ ہیں ۔ اور عوف کو اس معاملہ میں یزید الفارسی کا تلمذ حاصل ہے ۔ یزید الفارسی کہتے ہیں کہ عبد سے یہ واقعہ عبداللہ ابن عباس نے بیان کیا ۔ امام بیہقی نے اسی واقعہ کے سہارے یہ لکھ دیا کہ سب سورتوں کی ترتیب نبوت کی جانب سے سرکاری ہے لیکن سورہ انفال و برأت کی ترتیب نہیں بلکہ حضرت عثمان کی اجتہادی ہے اور بعد میں السیوطی نے بھی بیہقی

کی ہاں میں ہاں ملادی ۔

یہ بات بالکل بے معنیٰ اور اس میں کوئی معقولیت نہیں ہے کہ تمام سورتوں کی ترتیب توحضور کی جانب سے ہو اوران دو سورتوں کی ترتیب نہ ہو۔ حالانکہ صحیح روایات سے ثابت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سارا قرآن رمضان میں ہر سال حضرت جبریل کو سناتے اور وفات والے سال آپ نے دو بار سنایا ۔ آخری قرأت میں آپ ان دو سورتوں کو کس جگہ پڑھتے تھے ۔ امر واقعہ اور حقیقت یہی ہے کہ ان دو سورتوں کی ترتیب بھی ویسے ہی سرکاری ہے جیسے باقی قرآن کی سورتوں کی ترتیب ۔ باقی رہی یہ حدیث تو اس کی سند میں یزید الفارسی ہے ۔ پتہ نہیں کہ یزید بن ہرمز ہے یا کوئی اور۔ صحیح یہی ہے کہ یہ کوئی اور ہے ۔ اس کے باپ کا پتہ نہیں۔ عبداللہ بن زیاد اور حجاج بن یوسف سے مصاحف کے موضوع پر روایات کا سہرا اس کے سر ہے۔ ابو حاتم کہتے ہیں کہ کوئی مضائقہ نہیں ۔ یحییٰ بن سعید ان سے شناسا نہیں۔ آگے قدم اٹھائیے ذرا عوف ابن ابی جمیلہ کے بارے ارباب فن نقد رجال کے تاثرات دیکھئے ۔ لکھا ہے کان قدریا رافضیا شیطانا ۔ آپ ہی خدا لگتی کہ ایسی روایات اور ایسے راویوں کے سر پہ متواتر، قطعی اور فیصلہ شدہ امور کو مشکوک بنایا جاتا ہے۔ اناللہ

سورہ انفال کا تاریخی پس منظر

آپ تیرہ سال کی زندگی کے پُر آشوب ایام گزار رہے تھے کہ ۱۱ھ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اطراف کے قبائل کی طرف توجہ فرمائی اور عرب کی مجالس و محافل اور سالانہ اجتماعات کے موقعہ پر اللہ کا پیغام سنایا ۔ آپ کی دعوت کو کچھ نے پذیرائی دی اور کچھ اپنی شومیٔ قسمت پہ قانع رہے ۔ جب موسم حج آتا تو عرب کے اطراف و جوانب سے زیارت بیت اللہ اور طواف کعبہ کی خاطر بہت بڑا اجتماع ہوتا جس میں اہل مدینہ بھی ہوتے ۔ آپ نے اس سال ان کو بھی دعوت دی ۔ وفد مدینہ میں اسعد بن زرارہ، عوف بن حارث، رافع بن مالک، قطبہ ابن عامر، عقبہ بن عامر، جابر بن عبداللہ، عامر بن عبد حارثہ شامل تھے ۔ اور سب کے سب کا تعلق قبیلہ خزرج سے تھا۔ انہوں نے دعوت حق سن کر اپنی جگہ مشورہ کیا اور کہنے لگے کہ یہ شخص وہی

معلوم ہوتا ہے جس کے بارے میں مدینہ کے یہود ہم سے کہا کرتے ہیں کہ ایک پیغمبر مبعوث ہوگا جس کے ساتھ ہم مل کر تمہارا مقابلہ کریں گے۔ اچھا یہ ہے کہ ہم پہل کر جائیں اور اسلام کو قبول کرلیں۔ یہ مشورہ کر کے وہ حاضر خدمت ہوئے اور اسلام کو قبول کر کے عرض کیا کہ ہم مدینہ والوں میں باہم سخت جنگ وجدال ہے۔ اگر آپ کی وجہ سے ان میں اتحاد ہو جائے تو یہ ہماری بڑی خوش نصیبی ہوگی۔ اب ہماری روانگی ہے آئندہ سال حاضر خدمت ہوں گے۔

آخر کار نبوت کے بارہویں سال حج کے موقعہ پر ۷۵ نفوس کا ایک وفد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے رات کی تاریکی میں ملا اور اس نے نہ صرف یہ کہ اسلام قبول کیا بلکہ آپ کو اور آپ کے پیروؤں کو اپنے شہر میں جگہ دینے پر بھی آمادگی ظاہر کی۔ یہ اسلامی تاریخ میں ایک انقلابی موقعہ تھا جسے اللہ سبحانہ نے خاص اپنے فضل سے فراہم کیا۔ اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اس پیشکش کو خندہ پیشانی سے قبول کیا۔ اس طرح مدینہ والوں نے گویا اپنے شہر کو مدینۃ الاسلام کی حیثیت سے پیش کیا اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول کر کے پہلا اسلام آباد بنالیا۔

مدینہ والوں کی یہ پیشکش جذباتی نہیں بلکہ شورائی تھی۔ عین اس وقت جبکہ بیعت ہو رہی تھی۔ اسی وفد کے ایک ذکی نوجوان اسعد بن زرارہ نے وفد کو مخاطب کر کے کہا۔

> اے یثرب والو ذرا ٹھہرو، ہم لوگ جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت گرامی میں حاضر ہوتے تو یہ سمجھ کر آتے ہیں کہ یہ اللہ کے رسول اور ان کو یہاں سے مدینے لے جانے کا مطلب یہ ہے کہ ہم پوری عرب قوم سے دشمنی مول لے رہے ہیں۔ اس کے تمہارے بہترین لوگ موت کے گھاٹ اتریں گے، اور تم پر تلواریں برسیں گی۔ اگر تم میں اس کی طاقت ہے تو بے شک ان کو لے چلو اس کا اجر تمہیں اللہ دے گا لیکن اگر تمہیں اپنی جانیں عزیز ہیں اور اندیشے ستاتے ہیں تو پھر ان کو مدینے لے جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ان کو یہیں چھوڑ دو۔ اس وقت معذرت کر دینا خدا کے یہاں قابل پذیرائی ہے۔

یہ تو امام احمد کی روایت میں ہے۔ محمد بن اسحاق صاحب مغازی کہتے ہیں کہ اسی موقعہ پر ایک دوسرے شخص عباس بن عبادہ بن فضلہ نے وفد کو مخاطب کرکے یہ تقریر کی :

دوستو! تمہیں پتہ ہے کہ ان کے ہاتھ پر کس چیز کا عہد کر رہے ہو۔ تمہارا یہ عہد اور تمہاری یہ بیعت اس بات کی ہو رہی ہے کہ تمہیں پوری کائنات انسانی سے جنگ کرنی ہے۔ لہٰذا اگر تم یہ خیال کرتے ہو کہ جب تمہارے اموال مصائب کی نذر ہو جائیں گے اور تمہارے اشراف موت کی گھاٹ پر اتر جائیں گے تو تم ان کو دشمنوں کے حوالے کر دو گے تو اچھا یہ ہے کہ آج چھوڑ دو۔ کیونکہ خدا کی قسم یہ دنیا و آخرت کی رسوائی ہے اور اگر تم اس عزم میں پکے ہو اور یہ پختہ ارادہ رکھتے ہو کہ مالوں کی تباہی و بربادی اور اشراف کے قتل و غارت کے باوجود ان سے کیا گیا عہد پورا کرو گے تو بخدا یہ دنیا و آخرت کی سب سے بڑی خیر ہے۔

لکھا ہے کہ اس پر سارے وفد نے بیک زبان ہو کر کہا کہ :

ہم ان کو لے جا کر اپنے مالوں کی تباہی اور اشراف کے قتل کو گوارا کرنے کے لئے تیار ہیں۔

اور یہ تقریریں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے کہنے پر ہوئی تھیں۔ آپ نے فرمایا تھا کہ :

تم میں بات کرنے والا بات کرے لیکن تقریر لمبی نہ ہو، کیونکہ مشرکین کے جاسوس تمہارے تاک میں ہیں۔ ان کو اگر پتہ لگ جائے گا تو معاملہ ابتر ہو جائے گا۔

اس کے بعد وفد نے وہ مشہور بیعت کی جسے تاریخ میں بیعت عقبہ ثانیہ کہتے ہیں۔ ان تقریروں کے بعد حضور اقدس نے قرآن کی تلاوت کی اور وفد کو اسلام کی دعوت دی اور فرمایا :

لوگو! میں اس بات پر تم سے بیعت لیتا ہوں کہ تم میرے لیے روک بن کر رہو گے۔ جیسے اپنی اولاد اور عورتوں کے لیے رہتے ہو۔

وفد میں براء بن معرور نے کھڑے ہو کر جواب دیا۔

قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو علمبردارِ حق بنا کر روانہ کیا ہم ضرور آپ کی حفاظت و حمایت کریں گے۔ اب ہم سے بیعت لیجئے یا رسول اللہ بخدا ہم بڑے جنگجو ہیں۔ جنگ ہمیں وراثت میں ملی ہے۔

ابھی گفتگو ختم نہیں ہوئی تھی کہ ابوالہیثم بن التیہان نے مجمع میں سے کھڑے ہو کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ

ہمارے اور دوسرے یہود کے درمیان کچھ سیاسی عہد و پیمان ہیں آپ کی خاطر ہم ان کو ختم کر دیں گے۔ آپ یہ تو فرمائیے کہ کل کو یہ تو نہ ہو کہ اب ہمیں بے یار و مددگار چھوڑ کر مکہ میں اپنی قوم میں واپس تشریف لے جائیں۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکرا کر فرمایا:

نہیں میں تم میں سے ہوں اور تم میرے ہو، میری ان سے جنگ ہوگی جن سے تم لڑو گے اور ان سے صلح ہوگی جن سے تم صلح کرو گے۔

اس کے بعد بیعت ہوئی۔

چونکہ یہ صورتِ حال سیاسی طور پر بلا شبہ اہلِ مکہ کے لیے خطرہ کی گھنٹی تھی اس کا صاف اور واضح مطلب یہ تھا کہ حضور اقدس کو ایک ٹھکانہ مل رہا تھا۔ یہ پرانے نظامِ جاہلیت کے لیے پیغامِ موت تھا۔ اور مدینہ میں مسلمانوں کی سیاسی زندگی کے قیام سے قریش کو صرف سیاسی اور اجتماعی نہیں بلکہ معاشی خطرہ نظر آرہا تھا کہ یمن سے شام کی طرف جو تجارتی شاہراہ بحر احمر کے کنارے کنارے شام تک جاتی ہے وہ مسلمانوں کی زد میں آجائے گی۔

قریش اس بات سے واقف تھے چنانچہ جس رات بیعت عقبہ ہوئی اسی رات قریش کو اس کا علم ہوا اور ان میں کھلبلی پڑ گئی۔ پہلے تو انہوں نے کوشش کی کہ اہلِ مدینہ کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے توڑا جائے۔ اس میں ناکامی کے بعد انہوں نے جو قدم اٹھایا وہ بہت خطرناک قدم تھا۔ حضور اقدس کی ہجرت سے چند ہی روز پہلے قریش کی مجلسِ شوریٰ منعقد ہوئی اور اس میں یہ فیصلہ ہوا کہ

ہاشمی خانوادے کو چھوڑ کر تمام قبائل سے ایک ایک نمائندہ لیا جائے اور یہ سب مل کر حضور اقدس پر حملہ کریں لیکن ان کی یہ تدبیر کارگر نہ ہوئی اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بعافیت مدینہ پہنچ گئے۔ اس کے بعد قریش نے دوسرا قدم یہ اٹھایا کہ عبداللہ بن ابی کو مدینہ خط لکھا کہ تم حضور کو مدینہ سے نکال دو ورنہ ہم تم پر حملہ کر دیں گے۔ مگر اللہ کے فضل سے اس میں بھی ناکامی ہوئی۔

اب مدینہ میں اسلامی حکومت کا ڈھانچہ قائم ہو چکا تھا۔ لیکن حالات خطرناک سے خطرناک ہوتے جا رہے تھے۔ ضروری تھا کہ مسلمان کوئی ایسا قدم اٹھائیں جس سے قریش کے حملہ کا خطرہ دور ہو۔ اس کے لیے مسلمانوں نے سب سے پہلا جو قدم اٹھایا وہ یہ تھا کہ اس تجارتی شاہراہ پر اپنی گرفت مضبوط کریں جو یمن سے شام تک بحر احمر کے کنارے کنارے جاری تھی تاکہ قریش اور وہ دوسرے قبائل جن کا مفاد اس راستہ سے وابستہ تھا اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ اپنی معاندانہ روش پر نظر ثانی کرنے کے لیے مجبور ہو جائیں۔

احادیث کسی ترتیب تاریخ کے ساتھ جمع نہیں ہوئی ہیں بلکہ جس کو جو بات یاد ہے وہ پیش کرتا ہے۔ دونوں موقعوں کے اجتماعات میں راویوں سے خلط ہو گیا ہے۔ مدینہ ہی میں اگر قتال کا مشورہ ہوتا تو جانے کی کیفیت وہ نہ ہوتی جو ہوئی ہے۔ افرادی قوت بھی زیادہ ہوتی۔ سامان جنگ بھی ساتھ ہوتا۔ کوئی شخص بھی پیچھے نہ رہتا کیونکہ اس خبر کے ملنے پر کہ قریش کا لشکر حملہ آور ہو رہا ہے اس کو روکنا ہے جہاد فرض عین ہوتا اور سب کا جانا ناگزیر ہوتا۔ لیکن واقعہ یہ نہیں ہے حقیقت وہ ہے جو کعب بن مالک نے بیان کی ہے۔

کعب کہتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر میں کسی غزوہ سے پیچھے نہیں رہا سوائے غزوہ تبوک کے اور ہاں میں غزوہ بدر میں بھی شریک نہیں ہوا تھا۔ اور اس میں شریک نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جنگ کے لیے نہیں بلکہ قریش کے تجارتی قافلہ کے لیے تشریف لے گئے۔ اسی لیے اس میں شریک نہ ہونے والوں میں سے کسی پر کوئی عتاب نہیں ہوا۔ جنگ کا سامان تو اللہ سبحانہ نے اچانک

کر دیا تھا۔
صحیح مسلم میں حضرت کعب بن مالک کا یہ واضح بیان کھلے بندوں اعلان کر رہا ہے کہ مدینہ سے روانگی جنگ کے پیش نظر نہیں بلکہ تجارتی قافلہ کی خاطر ہوئی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اللہ سبحانہ نے تجارتی قافلہ کے بجائے جنگِ بدر کا سامان کر دیا۔
بہر حال حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ابوسفیان کے قافلہ کی اطلاع پا کر مدینہ سے نکلے۔ ادھر ابوسفیان بھی جو سالارِ قافلہ تھا بے خبر نہ تھا اسے بھی تشویش تھی کہ مسلمان اس کی تلاش میں ہوں گے۔ جو لوگ راستے میں ملتے وہ شام سے واپس مکہ جاتے ہوئے ان سے پوچھ گچھ کے بعد اطمینان کے بغیر قدم آگے نہ بڑھاتا تھا۔ جب اُسے یقین ہو گیا کہ مسلمان راستے کا چکر لگا رہے ہیں تو اس نے بدر پہنچنے سے پہلے ہی ضمضم غفاری کو مکہ مکرمہ روانہ کر دیا تاکہ قریش کو خبر کر دے کہ قافلہ خطرے میں ہے۔ اس کے بچاؤ کے لیے جو کچھ کیا جا سکے جلد از جلد کر لو۔

کوکبۂ نبوت کی حرکت

مدینہ منورہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے روانہ ہونے کی تاریخ محمد بن اسحاق نے ۸ رمضان المبارک ۲ھ (۵ مارچ ۶۲۴ء) بتائی ہے۔ پیر کا دن تھا۔ لیکن ابنِ سعد نے ۱۲ رمضان المبارک لکھی ہے اور دن ہفتہ کا بتایا ہے۔
اس سفر میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن مقامات سے گزرے ان کی تفصیل یہ بتائی گئی ہے۔ عقیق، ذوالحلیفہ، اولات الجیش، تربان، ملل، غمیس الحمام، صخیرات الیمامہ، سیالہ، فج الروحاء، شنوکہ، عرق الظبیہ، سجسج، منصرف، النازیہ، وادی رحقان، صفراء، وادی ذفران۔
ذفران کے مقام پر جب آپ پہنچے تو آپ کو اطلاع ملی کہ قریش مکہ کا لشکر قافلہ کی حفاظت کے لیے آ رہا ہے۔ اب تک طائفتین میں سے ایک پیش نظر تھا یعنی تجارتی قافلہ، دوسرے کے بارے میں یقینی طور پر کچھ معلوم نہ تھا۔ اب دونوں طائفے منظرِ عام پر آ گئے تھے۔ قرآن میں ہے:

اذ یعدکم اللہ احدی الطائفتین انہا لکم

اللہ نے وعدہ کیا تھا کہ تمہیں دونوں میں سے ایک ملے گا۔
ذفران ہی میں وہ مجلسِ شوریٰ قائم ہوئی جسے یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ تجارتی قافلہ کی جگہ لشکرِ قریش سے سامنا ہوا تو کیا کرنا چاہیے۔

مسلمان طلایہ گرد

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روایت کے مطابق صفرا سے اور ایک روایت کے مطابق مدینہ ہی سے بسبس الجہنی اور عدی ابن ابی کو تجارتی قافلے کی خبریں لانے کے لیے بدر بھیج دیا تھا۔ وہ بدر پہنچے، پانی کے پاس اونٹ بٹھائے اور مشکیزہ بھرنے لگے۔ اس اثنا میں دو لڑکیاں پانی لینے آ رہی تھیں اور جھگڑا بھی کر رہی تھیں ایک کا قرض دوسرے کے ذمہ تھا۔ قرض خواہ تقاضا کر رہی تھی۔ دوسری نے جواب دیا کہ کل یا پرسوں قافلہ آنے والا ہے میں ان کے پاس مزدوری کر کے تیرا قرض ادا کر دوں گی۔ مجدی ابن عمرو نامی ایک شخص وہیں تھا۔ یہ پہلے بھی قریش اور مسلمانوں کی لڑائیاں دیکھ چکا تھا۔ اس نے قافلہ کے آنے کی تصدیق کی۔ اور دونوں لڑکیوں کا جھگڑا ختم کرا دیا۔ بسبس اور عدی کی اتنی خبر کافی تھی۔ اور یہی خبر انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا دی۔

تجارتی قافلہ بچ نکلا

ان کے جانے کے بعد ابوسفیان بدر پہنچا اور مجدی سے پوچھا، کیا تم نے کسی کی آہٹ پائی ہے۔ مجدی نے بتایا کہ دو سوار آتے تھے۔ اونٹ بٹھا کر انہوں نے مشکیزوں میں پانی بھرا تھا۔ ابوسفیان اونٹوں کے بیٹھنے کی جگہ پہنچا۔ مینگنیاں اٹھا کر توڑیں۔ ان میں کھجور کی گٹھلیوں کے ریزے دکھائی دیے۔ سمجھ گیا کہ یہ اہلِ مدینہ کے اونٹ ہیں۔ اسے یقین ہو گیا کہ مسلمان قافلہ کی تلاش میں ہیں۔ چنانچہ وہ تیزی سے قافلہ کی طرف لوٹا اور بدر سے اس کا رخ ہٹا کر اس راستہ پر چل دیا جو ساحلِ سمندر کے ساتھ تھا یعنی بدر کو اس نے بائیں ہاتھ چھوڑ دیا۔
اب حکیم مطلق کی حکمت ملاحظہ ہو کہ پہلے دشمن کا ایک گروہ پیش نظر تھا یعنی

قافلہ اور دوسرے کا گمان بے شک تھا لیکن اس کا وجود یقینی نہ تھا۔ پھر دونوں گروہ منظر عام پر آ گئے۔ قافلہ نے خطرے کا نشان دیکھ کر راستہ بدل لیا اور منظر عام سے غائب ہو گیا۔ دشمن کا جو گروہ پہلے غائب تھا اب وہ منظر عام پر تھا یعنی قریش کا لشکر ابوجہل کی قیادت میں جو اس لیے آیا تھا کہ قافلہ کو بچائے لیکن قافلہ کے سلامت نکل جانے کے باوجود ابوجہل کے اصرار پر واپس نہ ہوا بلکہ دندناتا ہوا بدر آ گیا۔

یہاں یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ قریش کو مکہ سے نکل کر بدر تک پہنچنے میں آٹھ روز لگے۔ منازل کی اجمالی کیفیت یہ ہے۔

۱۔ مکہ مکرمہ اور عسفان کے درمیان، ابوجہل نے دس اونٹ ذبح کیے۔
۲۔ عسفان، اُمیہ ابن خلف نے نو اونٹ ذبح کیے۔
۳۔ قدید، سہیل ابن عمرو نے دس اونٹ ذبح کیے۔
۴۔ قدید سے قریش سمندر کی طرف پلٹے وہاں پانی شیریں تھا وہاں سے پڑاؤ میں شیبہ نے دس اونٹ ذبح کیے۔
۵۔ جحفہ، عتبہ ابن ربیعہ نے دس اونٹ ذبح کیے۔
۶۔ الوا، ابناء حجاج نے دس اونٹ ذبح کیے۔
۷۔ الوا، اور بدر کے درمیان عباس نے دس اونٹ ذبح کیے۔
۸۔ بدر۔ ابوالبختری نے دس اونٹ ذبح کیے۔

ذفران کی مجلس

حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ حضور اقدس نے دوبار صحابہ کا اجتماع مشورہ کے لیے کیا۔ ایک بار مدینہ میں جب قافلہ تجارت کی آپ کو خبر ملی۔ دوسری بار ذفران میں جب آپ کو قافلہ تجارت کی حفاظت کے لیے مشرکین مکہ کے لشکر کی خبر ملی۔ پہلی مجلس مشاورت کا صحیح مسلم اور بخاری میں ذکر ہے۔ دوسری مجلس مشاورت کا بھی امام بخاری نے بحوالہ عبداللہ ابن مسعود ذکر کیا ہے۔ شاید اسی وجہ سے امام بخاری نے دونوں حدیثوں کو دو علیحدہ بابوں میں ذکر کیا ہے۔ اور مسلم کی حدیث کعب بن مالک کو پہلے اور حدیث ابن مسعود کو بعد میں ذکر کیا ہے۔ اس ترتیب سے انہوں

نے اشارہ کر دیا کہ جس مجلس کا کعب بن مالک ذکر کر رہے ہیں وہ پہلے مدینہ میں ہوئی جب آپ کو ابو سفیان کے قافلہ تجارت کا علم ہوا اور جس کی نشاندہی عبداللہ بن مسعود کر رہے ہیں وہ بعد میں ذفران میں ہوئی جب آپ کو مشرکین مکہ کے لشکر کا علم ہوا۔

قریش کی آمد کی اطلاع پاتے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو جمع کیا تاکہ آئندہ کے متعلق ان کی رائے معلوم ہو جائے۔ سب سے پہلے حضرت ابو بکر نے مؤثر تقریر کی، پھر عمر بولے، بعد میں مقداد نے کہا۔

یا رسول اللہ اللہ آپ کا رب جو کچھ فرمائے وہی کیجئے ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ خدا کی قسم ہم وہ نہ کہیں گے جو بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ سے کہا تھا۔

اذھب انت وربک فقاتلا

تو اور تیرا رب جا کر لڑو۔

ہم تو انا ھھنا قاعدون یہاں بیٹھ کر دیکھیں گے۔ اس خدا کی قسم جس نے آپ کو مبعوث کیا۔ اگر آپ برک انعماد تک بھی چلے جائیں تو ہم آپ کا ساتھ دیں گے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر تعریف کی اور دعا فرمائی لیکن حضرت ابو بکر، حضرت عمر اور حضرت مقداد تینوں مہاجرین میں سے ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم انصار کی رائے معلوم کرنا چاہتے تھے۔ خیال تھا کہ شاید انصار ساتھ نہ دیں کیونکہ انصار نے حفاظت کی ذمہ داری صرف مدینہ منورہ کے لیے اٹھائی تھی۔ چنانچہ آپ نے پھر فرمایا کہ مجھے مشورہ دو۔ اب سعد بن معاذ اٹھے اور فرمایا:

یا رسول اللہ! شاید آپ ہم سے خطاب فرما رہے ہیں۔ ہم آپ پر ایمان لا چکے ہیں۔ آپ کی تصدیق کی اور گواہی دی کہ آپ جو تعلیم لے کر آئے ہیں وہ سچی ہے، ہم آپ کی فرمانبرداری اور اطاعت کے پختہ وعدے کر چکے ہیں۔ آپ جس طرف کا ارادہ فرمائیں تشریف لے چلیں

لے برک انعماد یمن میں جگہ کا نام اور مکہ مکرمہ سے پانچ منزل کی مسافت پر ہے۔ ان کے خیال میں یہ زیادہ سے زیادہ مسافت کی ایک تعبیر ہے۔

ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ اس خدا کی قسم جس نے آپ کو سچائی کے ساتھ مبعوث کیا۔ اگر آپ سمندر بھی ہمارے سامنے لے آئیں اور اس میں داخل ہوں تو ہم آپ کے ساتھ داخل ہو جائیں گے۔ اور ہم میں سے ایک بھی پیچھے نہ ہٹے گا ہم اسے ناپسند نہیں کرتے کہ کل آپ ہمیں لے کر دشمنوں سے مقابل ہوں، ہم جنگ میں استوار اور مقابلے میں سچے ہیں۔ امید ہے کہ اللہ آپ کو ہماری طرف سے ایسے کارنامے دکھائے جن سے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ اب اللہ کا نام لے کر چلیں۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ان کی تقریر سے بہت خوش ہوئے اور فرمایا:

چلو اور خوش ہو جاؤ کہ اللہ نے میرے سے دونوں گروہوں میں سے ایک کا وعدہ فرمایا ہے۔ اور میں گویا اس وقت قریش کے پچھڑنے کی جگہیں دیکھ رہا ہوں۔

ذفران سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم روانہ ہوئے تو ان گھاٹیوں میں سے گزرے جنہیں الاصافر کہتے ہیں۔ پھر الدبہ بستی میں قیام فرمایا۔ بعد ازاں حنان کو دائیں چھوڑ دیا۔ یہ ایک ٹیلہ ہے جو بڑے پہاڑ کی طرح ہے۔ آپ نے بدر کے قریب پڑاؤ کیا۔ شام ہوئی تو علی، زبیر اور سعد بن ابی وقاص کو ایک جماعت کے ساتھ بدر کے چشمے پر روانہ کیا کہ کچھ خبریں لے آئیں۔ وہ دو غلاموں کو پکڑ کر لے آئے جو لشکر قریش کے لیے پانی لانے کی خدمت پر مقرر تھے۔ صحابہ نے ان سے ابوسفیان کے متعلق دریافت کیا تو جواب ملا کہ ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ پھر ان کی پٹائی کی تو دونوں نے مان لیا کہ ہم ابوسفیان کے ملازم ہیں۔ اس پر انہیں چھوڑ دیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے۔ سلام پھیرا تو فرمایا کہ جب انہوں نے سچ کہا تو تم نے ان کی پٹائی کی اور جب جھوٹ بولا تو تم نے چھوڑ دیا۔

پھر آپ بنفس نفیس مخاطب ہوئے فرمایا مجھے قریش کے متعلق بتاؤ۔

غلام۔ اس ٹیلے کے پیچھے ہیں جو دور نظر آ رہا ہے۔ اس سے ان کا ارشاد اس ٹیلے کی طرف تھا جس کا نام عقنقل ہے اور اس طرف کے ناکے کو العدوۃ القصوی کہتے ہیں۔

پھر فرمایا کہ وہ لوگ کتنے ہیں ۔
غلام ۔ بہت ہیں ۔
فرمایا ، کھانے کے لیے روزانہ کتنے اونٹ ذبح کیے جاتے ہیں ۔
غلام ، کسی روز نو اور کسی روز دس ۔
اس جواب سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اندازہ فرمالیا کہ لشکرِ قریش کی تعداد نو سو اور ایک ہزار کے درمیان ہے ۔ اور یہ اندازہ بالکل درست تھا ۔
پھر آپ نے دریافت فرمایا کہ قریش کے سربرآوردہ لوگوں میں سے کون کون ہیں ۔
غلام ۔ عقبہ ابن ربیعہ ، شیبہ ابن ربیعہ ، ابوالبختری ، ابن ہشام ، حکیم بن حزام ، نوفل بن خویلد ، حارث بن عامر ، طعیمہ بن عدی ، نضر بن حارث ، زمعہ ابن الاسود ، ابوجہل بن ہشام ، امیہ ابن خلف ، سہیل بن عمرو ، عمرو بن عبدود ۔
یہ سن کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مکہ نے اپنے جگر کے ٹکڑے تمہارے مقابلے کے لیے ڈال دیے ہیں ۔
حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بدر پہنچ کر پہلے قریبی چشمے پر اُتر گئے ۔ حباب بن المنذر نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا اس جگہ آپ اللہ کے حکم سے اُترے ہیں ، فرمایا نہیں یہ ایک رائے ہے ۔ حباب نے گزارش کی کہ یہ اچھا مقام نہیں ۔ آگے تشریف لے چلتے ۔ ہم اس چشمے کے قریب اتریں گے جو قریش سے قریب ہے ، اس کے پیچھے جتنے چشمے ہیں ، انہیں ناکارہ بنا دیں گے ، اور چشمے کے پاس حوض بنا کر اس میں پانی بھر لیں گے ۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حباب کی رائے کو صحیح قرار دیتے ہوئے آگے بڑھے اور قریش کے قریب جو چشمہ تھا اس کے پاس نزول فرمایا

(۸) سُوْرَۃُ الْاَنْفَالِ مَدَنِیَّۃٌ (۸۸)
آیاتها ۷۵ رکوعاتها ۱۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۚ
فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۪ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗۤ
اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۞۱ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ
اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا
وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۞۲ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا
رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۞۳ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ
دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۞۴

اے پیغمبر لوگ آپ سے مالِ غنیمت کے بارے میں پوچھتے ہیں، آپ کہہ دیجیئے کہ اموالِ غنیمت دراصل اللہ اور اس کے رسول کے ہیں! - لہٰذا اگر تم مومن ہو تو تمہیں اللہ سے ڈرنا چاہیے، باہم صلح رکھنی چاہیے، اللہ اور اس کے رسول کی طاعت

کرنی چاہیے[2]۔ مومنوں کی شان یہ ہے کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل دہل جاتے ہیں اور جب اُن کے سامنے اللہ کی آیتیں تلاوت کی جاتی ہیں تو ان کے ایمان میں[1] وافر اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ ہر حال میں اپنے آقا پر بھروسہ رکھتے ہیں[3]۔ جو نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں بلاشبہ ایسے ہی لوگ فی الواقع پکے مومن ہیں۔ اُن کے لیے اُن کے پروردگار کے پاس مراتب ہیں اور بخشش، اور اچھی عزت کی روزی۔[4]

کامیابی کے اسباب اور کامرانوں کا چہرہ

ایک پیدا شدہ سوال کے جواب میں ذہنوں کو مادیت سے ہٹا کر اصل روحانیت کی طرف متوجہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ کامیابی کا مدار نہ سامانِ جنگ کی فراوانی ہے نہ افرادی قوت کی بہتات ہے بلکہ صرف اور صرف سیرت و کردار کی بلندی، باہم یکجہتی اخوت اور ایمان کے تقاضوں سے دب کر اللہ و رسول کی طاعت ہے۔ مسلمان جنگ مادیت کی خاطر اور نہ مادی فائدے بٹورنے کے لیے ہے بلکہ دنیا کے اخلاقی و تمدنی فساد کو اصولِ حق کے مطابق درست کرنے کے لیے ہے جسے اس وقت اختیار

کیاجاتا جب کہ مزاحم قوتیں دعوت و تبلیغ کے راستہ میں مزاحم ہو کر اصلاح کو ناممکن بنا دیتی ہیں۔ مصلحین کی نظر اپنے مقصد پر ہونی چاہیے۔ مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ دُنیا سے بُرائی ختم ہو اور اللہ کے کلمہ کا بول بالا ہو۔ ان فوائد پر نظر نہ ہونی چاہیے جو مقصد کے لیے سعی کرتے ہوئے بطورِ انعام اللہ سبحانہٗ کی عنایت سے مل جائیں۔ ان فوائد سے اگر ابتدا ہی میں نظر نہ ہٹادی جائے تو بہت جلدی اخلاقی انحطاط رونما ہو کر یہی فوائد مقصود بن کر رہ جاتے ہیں۔

اصل مقصد شخصیت کے نشوونما اور اجتماعی سیرۃ کی تعمیر کے راستہ میں جتنی رکاوٹیں ہو سکتی ہیں ان کو دُور کرنا اور وہ تمام ترغیبات و ترہیبات فراہم کرنا ہے جو اس کے حصول میں مددگار ہوں۔ بنیادی چیز اللہ سے عابدانہ تعلق ہے۔ یہی وہ مرکز ہے جس سے اسلامی زندگی کے تمام اجزاء حرکت اور زندگی حاصل کرتے ہیں۔ تمام خارجی ادارے اور سلیقے اطوارِ زندگی اسی ایک مصدر سے مشتق ہیں۔ مملکت کا تصوّر، قانونی نظام رسُول کی شخصیت اور اس کا منصب و مقام غرض اسلامی زندگی کی ہر معمولی سے معمولی چیز اسی مرکز سے وابستہ ہے۔

اس بنیادی تصوّر سے ہٹ کر اگر مادّی راحت و آسائش اور معاشی خوشحالی کا حصول مقصد بنالیا جائے تو شخصیت کی نشوونما نہ ہوگی اور تہذیبِ نفس کا کوئی سامان نہ ہوگا اس لیے یہاں سب سے پہلے اموالِ غنیمت کے بارے میں بتا دیا کہ یہ لوگوں کا نہیں بلکہ اللہ و رسُول کا مال ہے۔ اس مال کو یہاں انفال کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ بتانا یہ ہے کہ مسلمان کی کوششوں اور اس کے اعمال و افعال مادّی چیزوں سے ہٹ کر آخری غایت اور عالمی مقصد سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ نظر مقصد پر ہونی چاہیے وسائل مقصد تو زمان و مکان کی تبدیلی سے بدلتے رہتے ہیں۔ مقصد تو صرف زندگی کے ہر گوشہ میں عبادت ہے اور یہی کائنات کا مقصدِ وجود ہے۔

غنیمت سے متعلق سوال

۱۔ اے پیغمبر لوگ آپ سے مالِ غنیمت کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپ کہہ دیجیے کہ اموالِ غنیمت دراصل اللہ اور اس کے رسُول کے ہیں۔ بدر میں جو مالِ غنیمت ہاتھ

آیا۔ اس کے متعلق صحابہ میں نزاع تھی۔ نوجوان جو آگے بڑھ کر لڑے تھے۔ وہ کل مال غنیمت کو اپنا حق سمجھتے تھے۔ پرانے لوگ جو نوجوانوں کی پشت پر تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ ہمارا سہارا لگانے سے فتح ہوئی لہٰذا غنیمت ہم کو ملنی چاہیے۔ ایک جماعت جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کر رہی تھی، وہ اپنے کو اس مال کا مستحق سمجھتی تھی۔ ان آیات میں بتلا دیا کہ فتح صرف اللہ کی مدد سے ہوئی ہے۔ کسی کا سہارا زور پیش نہیں جاتا لہٰذا مال کا مالک اللہ سبحانہ ہے۔ پیغمبر اس کے نائب ہیں جس طرح اللہ اپنے رسول کی معرفت حکم دے۔ اسی کے موافق مال غنیمت تقسیم ہونا چاہیے[1]

قدیم زمانے میں طریقہ یہ تھا کہ جو مال جس کے ہاتھ آتا وہی اس کا مالک ہوتا۔ یا پھر بادشاہ یا سپہ سالار تمام اموال پر قبضہ کر لیتا۔ پہلی صورت میں اکثر ہوتا کہ فتح یاب فوجوں کے درمیان اموالِ غنیمت پر سخت تنافس برپا ہو جاتا اور بسا اوقات ان کی خانگی جنگ فتح کو شکست میں تبدیل کر دیتی، دوسری صورت میں سپاہیوں کو چوری کا عارضہ لگ جاتا اور وہ اموال کو چھپانے کی کوشش کرتے۔ قرآن نے اموالِ غنیمت کو اللہ و رسول کا مال قرار دے کر پہلے تو یہ قاعدہ مقرر کر دیا کہ تمام مال غنیمت لاکر بے کم و کاست امام کے سامنے رکھ دیا جائے۔ اور ایک سوئی تک چھپا کر نہ رکھی جائے پھر آگے چل کر تقسیم کا قانون بنا دیا۔ اس طرح دونوں خرابیاں دور ہو گئیں۔

انفال، نفل کی جمع ہے۔ اس کے معنے اضافہ اور زیادتی کے ہیں جو چیز کسی کو اس کے حق سے زیادہ دی جائے تو جس قدر حق سے زیادہ دی گئی ہے وہ نفل ہے اسی طرح اگر کسی نے حق واجب سے زیادہ ادا کیا تو حصہ مزید کو نفل کہتے ہیں۔ یہاں انفال سے اس مال غنیمت کو تعبیر کیا گیا ہے جو راہ خدا میں جہاد کرنے والوں کو مفتوح دشمن سے میدانِ جنگ میں حاصل ہوتا ہے۔ اس تعبیر میں یہ لطیف اشارہ ہے کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے دشمن سے جو مالِ غنیمت حاصل کرتے ہیں اس کی حیثیت ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطیہ کی ہے کیونکہ جہاد کا جو اجر ہے وہ اس سے بالکل الگ مستقلاً اللہ کے ہاں دائمی ہے۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

جس قسم کے سوال کا قرآن نے یہاں ذکر کیا ہے۔ اس کی تفصیل حدیث و سیرت کی کتابوں میں موجود ہے۔ سیرت ابن ہشام میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ سے فراغت کے بعد حکم دیا کہ فوج میں سے جن لوگوں نے مال جمع کیا ہے سب اکٹھا کیا جائے چنانچہ وہ سب یکجا کیا گیا۔ اب لوگوں میں اختلاف ہوا کہ یہ کس کا حق ہے۔ جن لوگوں نے جمع کیا تھا وہ مدعی ہوئے کہ یہ ہمارا حق ہے۔ اگر ہم نہ ہوتے تو یہ مال حاصل نہ ہوتا اسی طرح جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت پر تھے انہوں نے کہا کہ مالِ غنیمت میں دوسرے لوگ ہم سے زیادہ حقدار نہیں ہیں۔ ان ہی مختلف سوالات کا قرآن نے یہ جامع اور اصولی جواب دیا ہے کہ ان کو بتا دو کہ اموالِ غنیمت اللہ اور رسول کی مِلک ہیں۔ اللہ و رسول کی مِلک، قرآن میں اجتماعی ملکیت کی تعبیر ہے۔ اس اصولی جواب نے مالِ غنیمت کے بارے میں اس جاہلی دستور کو ختم کر دیا جو اب تک رائج تھا اور جس کی بنا پر یہ سوالات پیدا ہوتے تھے۔

شاید آپ کے ذہنوں میں یہ سوال اُبھر آئے اسلام میں اموالِ غنیمت کو جب کہ ان کے مالک موجود ہیں کیونکر حلال کیا گیا ہے۔ مالِ غنیمت وہ مال ہے جو غیر مسلموں سے لڑائی کے نتیجہ میں مسلمانوں کو ملا ہو۔ اگر مسلمانوں میں باہم جنگ ہو جائے اور ان میں فاتح و مفتوح ہوں تو ان کا مال مالِ غنیمت نہیں ہے۔ مالِ غنیمت کے موضوع پر تفصیلی مباحث تو انشاء اللہ پارہ دہم میں آرہی ہیں۔ یہاں تو صرف یہ واضح کرنا ہے کہ اسلام نے میدان جنگ میں حاصل شدہ اموال میں جو راہ اختیار کی ہے۔ وہ یہ نہیں ہے کہ کافروں کا جو مال مسلمانوں کے قبضے میں آجائے وہ حلال ہے۔ اور مسلمانوں کے اموال جو کافروں کے ہاتھ آئیں وہ ان کے لیے حرام ہیں، بلکہ معاملہ طرفین میں یکساں ہے جیسے غیر اسلامی حکومتوں کے باشندوں کے اموال پر مالکوں کی رضامندی کے بغیر قبضہ کر کے مسلمان ان کے قانونی مالک بن سکتے ہیں۔ اسی طرح غیر اسلامی حکومتوں کے باشندوں کے لیے بھی اس حق کو اسلام نے قانونی قرار دیا ہے۔ یعنی اسلامی حکومت کے اموال پر العیاذ باللہ اگر ان کا قبضہ ہو جائے تو مالک کی رضامندی کے بغیر وہ بھی ان کے مالک ہو جاتے ہیں۔ دراصل اس دفعہ کا تعلق قانون جنگ سے ہے اسی بین الاقوامی قانون کی بنا پر کہ شریعت میں چونکہ بیٹھے کر دیا گیا ہے کہ اسلامی حکومت

شہریوں کا مال غیر اسلامی حکومت کے باشندوں کے لیے مباح اور جائز ہے یعنی قبضہ کرنے کے بعد ان کی ملکیت میں داخل ہوجاتا ہے۔ اور ان سے اگر کوئی مسلمان خریدے تو یہ قانونی مالک سے مال کا خریدنا ہوگا۔ پھر جس طرح مسلمانوں کا مال غیر اسلامی حکومتوں کے باشندوں کی ملک میں صرف قبضہ سے داخل ہوجاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح اسلامی حکومت کے باشندوں کے لیے غیر اسلامی حکومتوں کا مال بھی مباح و جائز ہے یعنی قبضہ کے بعد مسلمان اس کے قانونی مالک بن جاتے ہیں۔ اموال غنیمت کے مسلمان جائز مالک اسی بنا پر ہوتے ہیں کہ ان لوگوں کے اموال کو جنگ کے نتیجے میں مسلمانوں کے لیے جائز اور مباح قرار دیا ہے۔

کامیابی کا مدار

۲۔ لہٰذا اگر تم مومن ہو تو تمہیں اللہ سے ڈرنا چاہیے، باہم صلح رکھنی چاہیے، اللہ اور اس کے رسولؐ کی طاعت کرنی چاہیے۔ سچے مسلمان کا کام یہ ہے کہ معاملہ میں خدا سے ڈرے، آپس میں صلح و آشتی سے رہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر جھگڑے نہ ڈالیں۔ اپنی آراء اور جذبات سے قطع نظر کرکے محض خدا و رسولؐ کا حکم مانیں[1] یعنی ایمان باللہ صرف زبان کے خشک اقرار کا نام نہیں ہے بلکہ یہ دراصل اللہ سبحانہ سے ایک عہد ہے۔ ایک شخص جب مسلمان ہوتا ہے وہ اس بات کا عہد کرتا ہے کہ اس کا ارادہ اس کی عقل اور اس کے جذبات و خواہشات قانون الٰہی اور احکام رسالت کی اطاعت میں حائل نہ ہوسکیں گے اور خدا و رسولؐ کے حکم کے مقابلے میں وہ ان سب کی قربانی دینے پر آمادہ رہے گا۔ اس اطاعت و سپردگی کے معاوضہ میں اسے رضائے الٰہی اور تقرب خداوندی کی بشارت دی جاتی ہے۔ اس پورے معاملہ کو قرآن عزیز نے انتہائی بلاغت کے ساتھ اس جملہ میں پیش کردیا ہے ان کنتم مومنین۔ یہ محض دراصل اسلامی معاشرہ کا قیام اسی عہد و میثاق کے ذریعہ عمل میں آیا ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

تخیل آرائی نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت ہے جس کا ثبوت قرآن حکیم اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے ملتا ہے۔

یہ ایمان کا ناگزیر تقاضا ہے کہ زندگی میں خدا کی نافرمانی سے بچ کر رہو اور اس سے ڈرو۔ اپنے باہمی معاملات درست رکھو اور خدا ور سول کی اطاعت میں سرگرم ہو جاؤ۔

اس موقعہ پہ الانفال للہ والرسول فرما کر فاتقوا اللہ ارشاد فرمانا اس بات کی غمازی کر رہا ہے کہ خاص انفال کے موضوع پر مخاطبوں میں کوئی نافرمانی نمودار ہوئی تھی۔ یہ نافرمانی کیا تھی؟ باہمی مشاجرات اور جھگڑے کی نافرمانی تھی۔ اس نافرمانی کی نوعیت میں روایات میں اختلاف ہے۔

مسند امام احمد میں ہے، عبادہ ابن الصامت کہتے ہیں کہ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب بدر میں گئے اور مسلمانوں اور کافروں کی بدر میں مڈبھیڑ ہوئی۔ اللہ نے کافروں کو شکست دی اس کے بعد مسلمانوں کے تین گروہ ہو گئے۔ ایک گروہ نے کافروں کا تعاقب کیا اور ان کو قید و قتل کرنا شروع کر دیا۔ دوسرا گروہ مال غنیمت جمع کرنے لگا۔ تیسرا گروہ رسول اللہ کے اردگرد حفاظت میں رہا۔ جب رات ہوئی اور سب لوگ جمع ہوئے تو مالِ غنیمت کے بارے میں اختلاف ہو گیا۔ جمع کرنے والوں کا خیال تھا کہ اس میں ان کے سوا کسی کا کوئی حق نہیں۔ تعاقب کرنے والوں نے کہا کہ ہم تم سے زیادہ حقدار ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محافظین بولے کہ ہم دشمن کے قریب سے حضور اقدس کی نگرانی کر رہے تھے۔ اس وقت یہ آیات نازل ہوئیں۔

ابوداؤد، نسائی اور مسند احمد میں ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص کہتے ہیں کہ بدر کے دن میرا بھائی عمیر شہید ہو گیا۔ اس کے عوض میں نے سعد بن العاص کو قتل کیا اور اس کی تلوار جس کا نام ذوالکتیفہ تھا لے کر حضور کی خدمت میں پہنچا اور درخواست کی کہ یہ تلوار مجھے دے دیجئے۔ حضور نے فرمایا اسے مالِ غنیمت میں رکھ دو۔ میں بہت مغموم ہوا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ حضور نے فرمایا اب وہ تلوار لے لو۔

ابوداؤد، نسائی، حاکم میں عبداللہ ابن عباس کے حوالہ سے ہے کہ بدر کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان عام کیا جو شخص کام کرے گا اس کو انعام ملے گا۔ قوم کے نوجوان دوڑ پڑے۔ بوڑھے جھنڈے اٹھائے رہے۔ غنیمت آئی تو جوانوں نے اپنے انعام کا مطالبہ کیا۔ بوڑھے بول پڑے تم ہم سے زیادہ حقدار نہیں ہو ہم تو تمہاری پشت پناہی کر رہے تھے۔

یہ روایات بتاتی ہیں کہ جھگڑا ایک روپ میں نہیں بلکہ کئی صورتوں میں نمایاں ہوا اسی لیے یہاں آیت میں فرمایا کہ چونکہ انفال یعنی اموالِ غنیمت اشخاص کی نہیں بلکہ سرکار کی ملک ہیں اس معاملہ میں باہمی تشاجر کی ضرورت نہیں۔ باہمی جھگڑا اور فساد خدا کی نافرمانی ہے اس سے بچو۔ جھگڑنے کی جگہ جو کام کرنے کے ہیں وہ کرو۔ سب سے اہم اور بنیادی کام یہ ہے کہ باہم صلح و آشتی، بھائی چارہ اور اخوت پیدا کرو کہ یہ ایمان کا اولین تقاضا ہے۔

قرآن و سنت میں باہمی بھائی چارہ، اتحاد و اتفاق پر اجتماعی زندگی کی مضبوطی کے لیے جو اہمیت بتائی گئی ہے وہ الم نشرح ہے۔ قرآن کا یہ حکم کہ اصلحوا ذات بینکم میں انتشار، افتراق اور اشتات سے بچنے کی ہدایت کی ہے۔ قرآن حکیم نے جا بجا اجتماعیت کو اسلامی زندگی کی سب سے بڑی بنیاد اور خدا کی رحمت و نعمت قرار دیا ہے اور اسی لیے اسلام اور اسلامی زندگی کا دوسرا نام جماعت ہے اور جماعت سے علیحدگی کو جاہلیت اور حیاتِ جاہلی سے تعبیر کیا ہے۔ اسلامی زندگی متفرق اینٹوں کا نام نہیں دیوار کا نام ہے۔ الگ الگ اینٹے کا کوئی مستقل وجود نہیں۔ وجود اگر ہے تو اجتماعی وجود کا ہے لیکن جماعت کا وجود مرکزیت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اسلام فی الحقیقت سنت اللہ اور فطرت اللہ ہی کا دوسرا نام ہے۔ اگر نوعِ انسانی کی سعادت کے لیے قانونِ اسلام اسی فاطر السماوات والارض کا بنایا ہوا ہے جس نے تمام کائنات کے لیے قانونِ حیات بنایا ہے تو ضروری ہے کہ دونوں میں اختلاف نہ ہو۔ اسلام کا نظامِ جماعت بھی قانونِ مرکزیت سے وابستہ ہے۔ قرآن نے یہ بات جا بجا واضح کی ہے کہ جس طرح اجسام و اشیاء کی زندگی اپنے اپنے مرکزوں سے وابستہ ہے اسی طرح نوعِ انسانی اور اس کی جماعت و افراد کا جسمانی و معنوی بقا بھی قانونِ مرکزیت پر

موقوف ہے۔ جس طرح ستاروں کی زندگی اور حرکت کا مرکز و محور سورج ہے اسی طرح
اسلامی زندگی کا مرکز سعادت اللہ و رسول کی طاعت ہے۔ اللہ کی طاعت بالذات ہے
کیونکہ وہ رب العالمین ہے۔ اور نبوت کی طاعت نیابت کی وجہ سے ہے۔ اسی مرکز
طاعت کو یہاں واطیعوا اللہ والرسول سے تعبیر کیا ہے۔ یہ اسلامی زندگی کا
اصل اصول ہے اور یہی اسلام اور کفر کے درمیان حدِ فاصل ہے کفر بے قیدی اور بے
راہ روی ہے۔ وہ ایک ایسی زندگی ہے جس میں افراد اور جماعتوں کے ارادوں پر
کوئی بالاتر ضابطہ حیات اور اعلیٰ تر آئینِ زندگی حکمران نہیں ہوتا ہے۔ کفار کا ارادہ
بے قید اور ان کا نفس بے لگام ہوتا ہے وہ انسان سے بالاتر کسی اور اقتدار کے
آگے جھکنے کو تیار نہیں ہوتے۔ کبھی تو وہ عجز و درماندگی کی آخری حد تک پہنچ جاتے ہیں
اور مٹی کے ڈھیر تک کے سامنے سر جھکا دیتے ہیں اور کبھی وہ غرور اور فرعونیت کے نشہ
میں اس قدر سرشار ہوتے ہیں کہ انسان سے بالاتر کسی قوت کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ اپنے
ہی جیسے انسانوں کی غلامی اور چاکری انہیں جمہوریت، اشتراکیت اور سرمایہ دارانہ
نظام میں گوارا ہے لیکن قانونِ الٰہی کی اطاعت سے انہیں بیر ہے۔ اس کے برخلاف
ایمان، تقویٰ اور طاعت کی زندگی چاہتا ہے ایسا تقویٰ اور ایسی طاعت جو کسی انسان
یا انسانوں کی کسی جماعت کے ارادوں اور خواہشات پر نہیں بلکہ قانونِ الٰہی اور رضائے
الٰہی پر مبنی ہو۔ ایسے ہی تقویٰ اور آئین شناسی سے انسان اپنے ارادہ پر قابو پا سکتا
ہے۔ اور نفس و خواہشاتِ نفس کی غلامی سے نجات پا سکتا ہے۔ یہی تسخیرِ نفس ہے
اور یہ تنہا کسی ایک انسان کا کام نہیں ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ ایک اکیلا انسان خواہ وہ
کتنی ہی اعلیٰ درجہ کی صلاحیتوں کا مالک ہو، ان مواقع اور مشکلات پر قابو پا سکے جو فطرت
اور اس کی لاتعداد قوتوں کو مسخر کرنے میں پیش آتی ہیں۔ اس طرح یہ بھی ناممکن نہیں ہے
کہ ایک شخص بلاشرکتِ غیرے ان اصول و ضوابط اور اس آئین حیات کی پابندی کر
سکے جس کا مقصد انسان کی تکمیلِ ذات ہے اس مقصد کی خاطر اجتماعی زندگی کا قیام
اور انسانوں کی ایک مربوط جماعت کی شکل میں زندگی بسر کرنا ضروری ہے اور یہ اس
وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک ایک مرکزی طاقت نہ ہو۔ اطیعوا اللہ والرسول اسی
مرکزی طاقت کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس کے سامنے تمام افراد جماعت کو سرِ تسلیم خم کرنا

چاہیے۔ اپنی آراء، اپنے نظریات، اپنے افکار، اپنے خیالات اور اپنے جذبات کو قربان کرکے بے لوث اور مخلصانہ اس کی طاعت کرنی چاہیے۔ یہی ایمان باللہ والرسول کا ناگزیر تقاضا ہے۔ اس کے بغیر ایمان درخت کی ایک سوکھی جڑ کے سوا کچھ نہیں ہے۔

اہلِ ایمان کا چہرہ

۳۔ مومنوں کی شان یہ ہے کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈہل جاتے ہیں اور ان کے سامنے جب اللہ کی آیتیں تلاوت کی جاتی ہیں تو ان کے ایمان میں اور اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ ہر حال میں اپنے آقا پر بھروسہ کرتے ہیں۔ یعنی جب خدا کا نام درمیان میں آجائے خشیت و خوف سے کانپ اُٹھیں۔ آیات و احکام الٰہی سُن کر ان کا ایمان و یقین زیادہ مضبوط ہوتا ہے اس قدر قوی و مضبوط ہو جائے کہ ہر معاملہ میں ان کا اصل بھروسہ اور اعتماد بجز خدا کے کسی پر باقی نہ رہے[1]

اب تک جو بات نظریاتی طور پر پیش کی گئی ہے۔ ان آیات میں اسی کا عملی نمونہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اور سچے اہلِ ایمان کے اوصاف بیان ہو رہے ہیں۔ دراصل جن اہلِ ایمان سے پہلے یہ بات کہی گئی تھی کہ اگر ایمان کا دعوٰی کرتے ہو تو یہ کام کرو تقوٰی اختیار کرو، باہم صلح و آشتی پیدا کرو۔ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ ان ہی کا حال ایک استینافی جملہ کے ذریعے بیان کیا جا رہا ہے۔ پہلی بات سُن کر دماغ میں یہ خلش ہوتی ہے کہ کیا اسلامی زندگی ایسے افراد کا مجموعہ ہے جن کے دامن تقوٰی، طاعت خدا و رسول اور اصلاح ذات البین سے خالی ہیں۔ فرمایا نہیں یہ تو وقتی طور پر حالات کی بنا پر ایسا ہوا۔ ان کو اموال غنیمت کے بارے میں اللہ کی بات کا علم نہ تھا ورنہ ان کے تو کیا کہنے ہیں۔ ان کی روحانی رفعتوں کا تو اللہ کے سوا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ یہ بات کہ اس آیت میں المومنون سے پہلی آیت والے مومنین مراد ہیں ایک قاعدہ پر مبنی ہے۔ قاعدہ جب ایک بار ایک اسم کو نکرہ بنا کر اور دوسری بار اسی کو معرفہ بنا کر لایا جائے۔ دونوں میں عینیت اور ہم آہنگی ہوتی ہے۔ اس آیت میں اللہ سبحانہ نے ان کا

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

چہرہ پیش کرتے ہوئے پانچ اہم اور بنیادی باتیں ارشاد فرمائی ہیں۔ ان صفات کو جس انداز میں بیان کیا گیا ہے وہ اس بات کی عکاسی کر رہی ہیں کہ یہ صفات بالفعل اس وقت موجود ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اندازِ بیان المومنون الذین نہ ہوتا۔ منطوقِ قرآن تو ان لوگوں کا ہی چہرہ پیش کرتا ہے۔ ہاں اس کے مفہوم میں یہ بات ضرور داخل ہے کہ جو لوگ بھی قیامت تک ایمان کا دعویٰ کریں ان کو اس نمونہ کا ایمان پیش کرنا چاہیے۔ مطلب یہ ہے کہ اصل وضع کے اعتبار سے تو یہ جملہ خبریہ ہے لیکن انشا اس کے مفہوم میں داخل ہے۔ سب سے پہلے یہ بات جان لینی چاہیے کہ اس فقرے کی پیشانی پہ لفظ انما لگا ہوا ہے اور عربی زبان میں یہ لفظ وہاں ہوتا ہے جہاں یہ بتانا ہو کہ جن کا ذکر ہو رہا ہے بس ان میں ہی یہ صفات پائی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ یہ صفت کہیں نہیں پائی جاتی ہے ظاہر ہے کہ قیامت تک ہونے والے مسلمانوں سے یہاں ایمان کی نفی مقصود نہیں بلکہ بتانا یہ ہے کہ یہ لوگ جن کا ذکر ہو رہا ہے یہ ایمان میں اربابِ کمال ہیں کیونکہ المومنون کا ال اور الذین زبانِ حال سے بول رہا ہے کہ جن کا ذکر ہو رہا ہے وہ خاص طبقہ ہے مطلب یہ ہے کہ ایمان میں کمال و اخلاص کا تمام ایمان کا دعویٰ کرنے والوں کے لیے کمال و اخلاص میں بھی نمونہ ہیں۔

کمالِ ایمان کی پہلی نشانی

اذا ذکر اللہ وجلت قلوبھم پہلی علامت یہ بتائی ہے کہ اندر اللہ سبحانہ کی عظمت و کبریائی اور اس کی جلالت کا شعور ہوتا ہے۔ اس وجہ سے وہ اللہ سبحانہ سے برابر ڈرتے رہتے ہیں جب ان کے سامنے اللہ سبحانہ کا نام آجائے۔ جب ان کو یاددہانی کرائی جائے جب ان کے سامنے اللہ سبحانہ کی بات کا ذکر ہو جائے تو وہ اس کو خوف و خشیت کے احساس سے دب کر سنتے ہیں۔ گویا ایمان کا پہلا تقاضا وجل ہے۔ وجل کہتے ہیں اس ہیبت کو جو بڑوں کی شان، جلالت و کبریائی سے ہو۔ خوف و خشیت کو چھوڑ کر وجل کی تعبیر اختیار کرنے میں خاص حکمت یہ ہے کہ عذاب سے ڈرنا عام اہلِ ایمان کا درجہ ہے اہلِ کمال کو عذاب کی وعید کی نوبت نہیں آتی وہ تو اللہ سبحانہ کی عظمت و جلال اور عزت و کبریائی سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں۔ قرآن کی دوسری آیت اس کے

منافی نہیں ہے جس میں ذکر ہے الا بذکر اللہ تطمئن القلوب اللہ سبحانہ سے دلوں میں چین قرار اور سکون آتا ہے۔ جلالت قدر اور عظمت سے دل میں ہیبت ہوتی ہے اور محبت کے تقاضے سے دلوں میں اطمینان ہوتا ہے یعنی جب اللہ جلیل القدر حاکم کی حیثیت سے ذکر ہوتا ہے تو دل دہل کر رہ جاتے ہیں اور جب محبوب کی حیثیت سے ذکر ہوتا ہے تو دلوں میں سکون و اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ بندوں کے اللہ سبحانہ سے دوگونہ تعلقات ہیں۔ حاکمیت اور محبوبیت حاکم ہونے کی حیثیت میں بندے اس کے محکوم ہیں۔ اور اس کی کبریائی، عظمت اور اس کے عزت و جلال سے لرزاں رہتے ہیں۔ اس حیثیت سے جب اس کا نام آتا ہے تو دل دہل جاتے ہیں۔ بندے اس کے اوامر کی طاعت کرتے ہیں اس نے نواہی کی نافرمانی سے اسی احساس کے ساتھ بچتے ہیں کہ اللہ کی ذات احکم الحاکمین ہے اور محبوب ہونے کی حیثیت میں جب اس کا ذکر ہوتا ہے تو دلوں میں سکون و قرار آجاتا ہے۔ حاکمیت کی حیثیت میں اللہ کی بندگی کی جاتی ہے اور محبوب کی حیثیت میں اس کی پرستش ہوتی ہے۔ اسلام کے عبادت کے شعائر میں ان دونوں حیثیتوں کی عکاسی ہے۔ نماز اور زکوٰۃ اس کی شان حاکمیت کا مظہر ہیں جبکہ روزہ اور حج اس کی شان محبوبیت کا۔ اس لیے اگر ذکر اللہ بیک وقت دو کام کرتا ہے۔ دلوں کو گرما دینے اور رلا دینے کا تو اس میں کوئی تنافی نہیں۔ جن لوگوں کے پیش نظر حق سبحانہ کی یہ دو حیثیتیں نہیں وہ دونوں آیتوں کو سمجھنے میں حیران ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ توحید، وعدہ وعید سے دلی دہلتے ہیں۔ اوامر سے دلوں میں خوف آتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ اللہ سبحانہ کے انعامات کے موقعہ پر دلوں میں سکون ہوتا ہے اور معاصی کے ارتکاب کے موقعہ پر دلوں میں خوف ہوتا ہے۔ کچھ کی رائے یہ ہے کہ نعمت کے ذکر پر دلوں میں اطمینان ہوتا ہے اور عذاب کے ذکر پر دلوں میں ہیبت آتی ہے۔

کمالِ ایمان کی دوسری نشانی

دوسری علامت یہ بتائی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی آیات ان کو سنائی جاتی ہیں یہ آیات ان کے ایمان میں اضافہ کر دیتی ہیں۔ یہاں آیات سے قرآن کی آیات مراد ہیں یعنی اللہ کے احکام و قوانین۔ مطلب اللہ سبحانہ پر ایمان کے بعد ان کو زندگی میں سب سے زیادہ تلاش

اس بات کی رہتی ہے کہ اللہ کی پسند و ناپسند کیا ہے ؟ اور پسند و ناپسند کا یہ علم ان کی دولت ایمان میں اضافہ کرتا ہے ۔ ایمان دراصل دل کے باور کر لینے کا نام ہے ۔ یہی تصدیق ہے اور اس کی حیثیت درخت کی جڑ یا پھر مکان کی بنیاد کی ہے ۔ ایمان کے لیے دونوں باتیں زبان نبوت نے دو تمثیلوں میں بیان فرمائی ہیں ۔ لیجئے آپ بھی سن لیجئے ۔ مگر ایمان کی تمثیل کی زبان میں سمجھنے سے پہلے یہ حقیقت ذہن نشین کر لیجئے کہ یہ آیت قرآنی اس باب میں قاطع ہے کہ قرآن کے نزدیک ایمان کی ہر حالت یکساں نہیں ہے وہ گھٹتا بھی ہے بڑھتا بھی ہے ۔ نفس تصدیق کے لحاظ سے سب برابر ہیں کیفیت و یقین میں تفاوت ہے[1]

اس بات کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو تمثیلوں کے ذریعے ذہن نشین کرایا ہے ۔ پہلے درخت کی تمثیل سنیئے :

ایمان کی ستر یا ساٹھ سے اوپر شاخیں ہیں سب سے افضل لا الٰہ الا اللہ کہنا ہے اور سب سے ادنیٰ راستہ سے کسی معمولی چیز کا ہٹا دینا ہے اور شرم و حیا بھی ایمان کی ایک شاخ ہے ۔ متفق علیہ

سمجھانا یہ ہے کہ ایمان صرف درخت کی اس سوکھی جڑ یعنی تصدیق کا نام نہیں ہے جس میں عمل صالح کی ایک شاخ بھی نہ پھوٹے بلکہ وہ اس ترو تازہ اذعان و یقین کا نام ہے جس میں اعمال صالحہ کی بے شمار شاخیں سدا پھوٹتی رہیں ۔ اس پر رنگ برنگ کی عبادات کے پھول کھلیں اور ایسے ایسے نافع اعمال کی بہار آئے کہ راستہ سے ایک کانٹے کا ہٹا دینا ان میں ایک ادنیٰ ترین عمل شمار ہو ۔ ایسا ایمان زندہ ایمان ہے لیکن ایمان کے جس درخت پر اعمال صالحہ کا کوئی پتا اخلاق حسنہ کا کوئی پھل اور احوال صادقہ کی کوئی مہک اور لپٹ نہ ہو وہ زندہ ایمان نہیں مردہ ایمان ہے ۔ اسی بات کو قرآن عزیز نے ایک اور بلیغ انداز میں پیش کیا ہے ۔

مثل کلمۃ طیبۃ کشجرۃ طیبۃ اصلھا ثابت وفرعھا فی السماء توتی اکلھا کل حین باذن ربھا ۔

---

[1] ترجمان القرآن

اچھی بات کی مثال ایسی ہے جیسے ایک درخت جڑ اس کی جمی ہوئی، شاخیں آسمان سے باتیں کرتی ہوئیں، اپنے پروردگار کے حکم سے ہر وقت پھل دیتا ہے۔

یہی حال مومن کے ایمان کا ہے۔ ایمان کو درخت سے تشبیہ دی ہے لیکن اس درخت سے نہیں جس پر پھول اور پھل کی کوئی رونق نہ ہو یا اس پر بہار آئے تو سال بھر میں صرف ایک ہی بار آئے بلکہ اس درخت سے جو سدا بہار ہو۔

اب یہ آپ کے اختیار میں ہے کہ آپ جڑ کو ایمان قرار دیں اور اعمال صالحہ کو اس کے ثمرات کہہ دیں۔ یا پھر پورے درخت ہی کو ایمان کہہ دیں اور یہ بھی آپ کے صوابدید پر موقوف ہے کہ آپ ایمان کی زیادتی کی بشارت کو پتوں کی شادابی، پھولوں کی فراوانی اور پھل کی گرانباری تک محدود رکھیں یا اصل جڑ میں بھی اضافہ کا دعویٰ کریں۔

دوسری تمثیل یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

اسلام کا محل پانچ ستونوں پر قائم کیا گیا ہے۔ شہادتیں نماز کا قائم کرنا، زکوٰۃ دینا، حج کرنا، روزے رکھنا۔ (بخاری و مسلم)

یہ سمجھانا چاہتے ہیں اور ایک عام مثال اور دو مثال کے ذریعے سمجھا رہے ہیں کہ جس طرح اپنے گرد و پیش میں روزمرہ اپنا گھر دیکھتے ہو۔ اس میں چھت ہوتی ہے، ستون ہوتے ہیں، در و دیوار ہوتے ہیں اور یہ سب مل کر ہی تمہارا مکان کہلاتا ہے۔ پھر اس مکان کی کوئی بنیاد بھی ہوتی ہے جس پر یہ مکان قائم ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اتنا بڑا عظیم الشان مکان تو آنکھوں سے نظر آتا ہے مگر وہ بنیاد جس پر اتنی بڑی عمارت قائم ہے کہیں نظر نہیں آتی ہے وہ زمین میں ہوتی ہے۔ اسی طرح اسلام کی عمارت کو سمجھ لو کہ وہ بھی ایک مجموعہ ہے۔ اس کے بھی اجزاء ہیں۔ اس کی بھی بنیاد ہے۔ پھر اس کے اجزاء میں ایسا ہی فرق ہے جیسا کہ مکان کے اجزاء میں ہوتا ہے۔ ہر چیز مکان کی بقا کے لیے ضروری نہیں ہوتی ہے۔ تصدیقِ قلبی یعنی ایمان مکان کی بنیاد ہے جس طرح مکان کی بنیاد زمین میں مدفون ہوتی ہے اسی طرح ایمان بھی دل میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ اسلام کے ارکانِ خمسہ کی یہ عمارت اسی پوشیدہ تصدیق پر قائم ہوتی ہے۔

اس آیت میں ایمان کے زیادہ ہونے سے مکان کی بنیاد اور درخت کی جڑ یعنی

تصدیق میں زیادتی بتانا مقصود نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایک مومن جب کبھی گوش انقیاد و طاعت سے قرآن کی آیتیں سنتا ہے تو ہر بار معانی پر غور و تفکر اس کے قلب میں جنت کی نئی رغبت اور آخرت کا نیا خوف اللہ سبحانہ کی ایک نئی محبت اس کی طاعت کا ایک نیا جذبہ پیدا کر دیتا ہے اسی کا نام اللہ سبحانہ نے اس آیت میں ایمان کی زیادتی رکھا ہے۔ اس معنے کے اعتبار سے اگر ایمان میں زیادتی و کمی نہ ہو پھر تو فاسقوں، فاجروں کے ایمان بھی جلیل القدر صحابہ کے ایمان کے ہم پلہ ہو جائیں گے۔ اور ایسا ہرگز نہیں ہے۔ اس پر تفصیلی بحث انشآء اللہ سورۃ توبہ کے آخر میں آئے گی۔ اور آیت میں مجہول کا صیغہ لاکر یہ بھی اشارا کر دیا ہے کہ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ وہ خود قرآن تلاوت کریں تو ان پر یہ کیفیت طاری ہو بلکہ اگر تلاوت کرنے والا تلاوت کر رہا ہو تو ایمان کے تقاضے سے دب کر حکم کی تعمیل میں خاص توجہ سے سنتے ہیں اور خاموش رہتے ہیں اس وقت بھی ان پر یہی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ یعنی ان کے قلوب میں اللہ کی کبریائی اس کے جلال و عظمت سے ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔

کمالِ ایمان کی تیسری نشانی

کمالِ ایمان کی تیسری نشانی یہ بتائی ہے کہ ان میں اللہ پر توکل و اعتماد کی بھرپور صفت پائی جاتی ہے علی دبھد کی تقدیم بتا رہی ہے کہ وہ اپنے معاملات میں اللہ کے سوا کسی پر اعتماد نہیں کرتے ہیں۔ اسباب کی وہ پابجائی صرف اسباب کی حد تک کرتے ہیں۔ ان کو وہ بہانہ اور ذریعہ سمجھتے ہیں اور بنانے اور بگاڑنے والا صرف اللہ کو مانتے ہیں۔ روزی کے لیے ان کا اعتماد رزق کے اسباب پر نہیں بلکہ خالق اسباب پر ہوتا ہے۔ میدان جنگ میں ان کا آسرا افراد کی کثرت، سامانِ جنگ کی فراوانی، اور جرنیل کی تدبیر پر نہیں بلکہ اللہ سبحانہ کی قوتِ فاعلی اور اس کی مدد و نصرت پر ہوتا ہے۔

توکل کے لفظی معنے اپنے معاملات کو سپرد کرنے کے ہیں۔ اصطلاح میں اسباب پر عمل کرتے ہوئے اسباب پر یقین نہ کرنا بلکہ خالق اسباب پر نتائج کے بارے میں یقین کرنے کا نام توکل ہے۔ توکل ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ یہ قرآن کی

اصطلاح میں بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ عام لوگ اس کے معنے یہ سمجھتے ہیں کہ کسی کام کیلئے جدوجہد اور کوشش و محنت نہ کرنے کا نام توکل ہے لیکن یہ سراسر قرآن کا مذاق ہے اور مذہبی اپاہجوں کا دل خوش کن فلسفہ ہے۔ جس کو اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ حالانکہ توکل، کوشش، محنت، جدوجہد، تگ و دو کو چھوڑ دینے کا نہیں بلکہ محنت کے نتائج کو اسباب سے نہیں بلکہ اللہ سے حاصل ہونے کو چاہتا ہے۔ اگر محنت نہ کرنا توکل کے مفہوم میں کسی درجہ میں داخل ہوتا تو قرآن تلاش رزق کے لیے فامشوا فی مناکبہا اور جنگ کی خاطر خذوا حذرکم اور اعدوا لہم ما استطعتم من قوۃ کے مطالبات نہ کرتا۔

یہ دراصل ترک دنیا کو حصول دنیا کا ذریعہ بنا کر زندگی گزارنے کا طریقہ ہے۔ اسلام، قرآن اور نبوت نے توکل کے اس تصور یعنی بے عملی کا روز اول ہی انکار کر دیا تھا۔ اگر کسی درجہ میں قرآن توکل کے اس تصور کو پسند کرتا تو قرآن میں زراعت و باغبانی، شکار، شکاری کتوں، شکاری پرندوں، خشکی کا شکار، دریائی جانوروں کا شکار، مویشیوں کی پرورش، بری بحری جانوروں کے مختلف اجزاء، گوشت، کھال، اون، بال، دودھ، شہد وغیرہ سے استفادہ کی مختلف نوعیتیں تجارت، تجارت کے سلسلے میں حیوانی وغیر حیوانی، بری و بحری سواریوں کے ذریعے مواصلات و حمل و نقل کی سہولتوں کا ذکر، صنعت و حرفت اور اس کے مختلف سادہ اور پیچیدہ شعبے رنگریزی، نجاری، زرگری، ظروف سازی، شیشہ سازی، زرہ سازی، پارچہ بافی معماری، سنگ تراشی، کان کنی، غواصی مزدوری، مزدوری کی مختلف قسمیں، حکومتی ملازمت کاروباری تنظیم وغیرہ وغیرہ کا اشارۃً بھی ذکر نہ ہوتا۔ لیکن قرآن کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ قرآنی خطابات میں اس مصنوعی توکل کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اللہ اکبر کہاں یہ نقطہ نظر کہ جو جس حد تک دنیوی کاروبار سے الگ ہو کر توکل کی زندگی بسر کرے گا۔ اسی حد تک خدا کے حضور میں بلندی حاصل کرے گا اور کہاں یہ عقیدہ کہ دنیا کے مشغلوں میں انہماک اور ان میں استغال ہی خدا کی خوشنودی اور قرب کا ذریعہ بنا دیا جاتے۔ پہلا راہبانہ اور جوگیانہ تصور ہے اور دوسرا اسلامی تصور ہے۔

بہرحال توکل توحید کے اعلیٰ ترین مقامات میں ہے۔ مومن صرف اللہ پر توکل کرتا ہے اور اپنی مطلوبات کو اسی کی جناب میں پیش کرتا ہے۔ ترک اسباب اور اللہ کی مملکت میں اللہ کے بنائے قوانین کی خلاف ورزی بلاریب توکل نہیں ہے۔ اس کی مثال اس شخص کی ہے جس کے لیے بادشاہ نے کھانے اور پینے کی ذمہ داری لے کر دسترخوان کمرہ میں لگا دیا ہو اور کہہ دیا ہو کہ یہاں سے کھایا کرو لیکن یہ کمرے سے اٹھ کر کھانا کھانے نہیں جاتا اور یہ خیال کرتا ہے کہ اس میں بادشاہ کی نافرمانی ہے اور اس انتظار میں رہتا ہے کہ بادشاہ یہ طریقہ بدل کر کھانا اس کے پاس روانہ کرے۔ جو حیثیت اس شخص کی بادشاہ کی نظر میں ہوگی وہ ہی اس متوکل کی اللہ کے یہاں ہوگی جو اللہ کے قانون پر عمل نہیں کرتا۔

کمالِ ایمان کی چوتھی نشانی

۴۔ جو نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ بلاشبہ ایسے ہی لوگ فی الواقع پکے مومن ہیں، ان کے لیے ان کے پروردگار کے پاس مراتب اور بخشش ہے اور اچھی عزت ہے۔ یعنی اسی کے سامنے سرِ عبودیت جھکائیں۔ اسی کے نام پر دولت خرچ کریں۔ غرض عقیدہ خلق عمل اور مال ہر چیز سے خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش میں رہیں۔ ایسے ہی لوگوں کو سچا اور پکا ایماندار کہا جا سکتا ہے جو خدا کے یہاں اپنے اپنے درجہ کے موافق بڑے بڑے مقامات و مراتبِ قرب پر فائز ہوں گے جنہیں معمولی کوتاہیوں سے درگزر کر کے عزت کی روزی سے سرفراز کیا جائے گا رزقنا اللہ عنہ بفضلہ[1]

اس میں کمال ایمان کی چوتھی نشانی نماز بتائی گئی ہے۔ اور اس نشانی کے لیے اقامتِ صلاۃ کی تعبیر اختیار کی ہے۔ اقامت کے معنے ہیں نماز کو ٹھیک طور پر اس طرح ادا کرنا کہ اس کے ظاہری ارکان قیام و رکوع، سجود اور قرأت بھی پورے کمال کے ساتھ اس کی باطنی روح خشوع حضور اور تلاوت میں تدبر و تفکر کی دولت سے

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

مالامال ہو۔ یہی وہ نماز ہے جس کے ثمرات سے نمازی بہرہ وش ہوتا ہے۔ یعنی اعمال و اخلاق میں برائیوں سے اس کا دامن آلودہ نہیں ہوتا۔

نماز میں صحابہ کی سرشاریوں کا کیا حال تھا۔ اس پر تفصیلی تبصرہ کے لیے بہت بڑی فرصت چاہیے۔ یہاں اتنی بات ضرور گوش گزار کر لیجئے کہ قرآن نے صحابہ کی عابدانہ سرشاریوں میں نماز کو خاص اہمیت دی ہے۔ ایک ارشاد ہے:

رجال لا تلهيهم تجارة ولا بيع عن ذكر الله واقام الصلوة

ایسے لوگ جن کو اللہ کی یاد سے کاروبار اور خرید و قیمت غافل نہیں کرتا ہے۔

نماز کا عشق ان میں اس قدر سرایت کر گیا تھا کہ قرآن عزیز نے اس موضوع پر ان کا چہرہ اس طرح پیش کیا ہے۔

تتجافى جنوبهم عن المضاجع يدعون ربهم خوفا وطمعا و مما رزقنا هم ينفقون۔

جدا رہتے ہیں ان کے پہلو خواب گاہوں سے پکارتے رہتے ہیں اپنے مالک کو خوف و لالچ سے اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

اقامت الصلوٰۃ اور انفاق دراصل ایمانی زندگی میں راس الصفات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان ہی سے ان تمام اوصاف کی شیرازہ بندی ہوتی ہے جن سے ایمانی زندگی میں استواری اور پائیداری آتی ہے۔ قرآن میں ان دونوں کا ذکر ساتھ ساتھ آتا ہے۔ نماز میں اگر ایک طرف وقت کی، جذبات و میلانات اور خواہشات کی قربانی ہے تو زکوٰۃ میں پسینہ سے کمائی ہوئی دولت کی قربانی ہے۔ جب بندہ ان دو قربانیوں کے لیے تیار ہو جاتا ہے تو پھر اس کے لیے اللہ کی راہ میں ہر قربانی آسان ہو جاتی ہے۔

آخر میں ارشاد ہے کہ یہی پکے اہل ایمان ہیں۔ یعنی جن میں یہ صفات ہیں وہی واقعی طور پر کمال ایمان رکھتے ہیں ان کے ایمان میں کسی درجہ میں کوئی کمی نہیں ہے۔ قلبی تصدیق اور زبانی اقرار بلا شبہ ایمان کے سب سے بڑے رکن ہیں مگر یہ

اسی وقت واقعی اور حقیقی ہوں گے جبکہ ان اوصاف کی شہادت ان کے ساتھ موجود ہو۔ اور اسلام کا مقدس عہد بھی اسی وقت پورا کیا جا سکتا ہے جبکہ جوارح نیکی کے لیے مضطرب نظر آئیں۔

حارث بن مالک انصاری حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گزرے حضور نے دریافت کیا، حارث کیا حال ہے؟ بولے میں پکا مومن ہوں، فرمایا، دیکھ کیا کہہ رہا ہے ہر چیز اپنی پشت پر واقعیت اور حقیقت رکھتی ہے۔ تیرے ایمان کی واقعیت کیا ہے۔ بولے کہ یا رسول اللہ دُنیا میری نظر میں کچھ بھی نہیں۔ رات کی بیداری اور دن کی روشنی یعنی رات کا قیام اور دن کو روزہ میرا کام ہے۔ اور میرے ایمان کا حال یہ ہے کہ گویا نگاہیں عرش بریں کو سامنے دیکھ رہی ہیں۔ مجھے جنتی ملاقات کرتے اور دوزخی شور مچاتے نظر آ رہے ہیں۔ فرمایا حارثہ مقام عرفان یہی ہے۔ الحسن البصری سے کسی نے دریافت کیا کہ کیا آپ مومن ہیں۔ فرمایا ایمان دو ہیں۔ ایک تو اللہ کو، فرشتوں کو، اللہ کی کتابوں کو، اللہ کے رسولوں کو، آخرت جنت اور دوزخ، بعث اور حساب کو ماننے کا نام ہے۔ اس معنے کے لحاظ سے میں واقعی مومن ہوں، اور دوسرا ایمان وہ ہے جس کا ذکر انما المومنون الذی اذا ذکر اللہ میں کیا گیا ہے تو مجھے یہ پتہ نہیں ہے کہ میں ان میں سے ہوں یا نہیں۔

ملا علی نے شرح فقہ اکبر میں جو بات لکھی ہے اس میں الحسن البصری کے اس ارشاد کی عکاسی نظر آتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

> اصل ایمان و توحید میں سارے مسلمان برابر ہیں لیکن قوت و ضعف کے لحاظ سے ان میں مراتب کا بڑا فرق ہے۔ کیونکہ کفر و ایمان کی مثال اندھی اور بینا آنکھ کی ہے۔ بیناؤں کی بینائی کتنا اختلاف ہوتا ہے۔ ایک شخص کو اندھیرا تہ ہوتا ہے ایک شخص دن میں دیکھتا ہے مگر یہ وقت ایک شخص باریک خط دیکھ سکتا ہے اور ایک موٹا، کوئی قریب سے دیکھ سکتا ہے اور دُور سے بھی دیکھ لیتا ہے۔ غالباً اسی تفاضے کے پیش نظر امام محمد نے فرمایا ہے کہ مجھے یہ بات پسند نہیں ہے کہ کوئی شخص اپنے ایمان کے بارے یہ تعبیر اختیار کرے کہ میرا ایمان جبریل کے ایمان جیسا ہے۔ بلکہ یوں

کہنا چاہیے میرا مومن ہونا بھی وہ بھی ہے جو حضرت جبریل کا۔ اور ایسے ہی یہ کہنا بھی درست نہیں ہے کہ میرا ایمان نبیوں کے ایمان جیسا ہے اور نہ ہی یہ کہنا درست ہے کہ میرا ایمان ابو بکر و عمر جیسا ایمان ہے۔ یعنی اتحاد تو صرف مومن ہونے میں ہے کیفیت ایمان میں نہیں ہے۔

یہاں اولٰئک ھم المومنون حقاً میں قرآن نے صحابہ کے ایمانوں کی کیفیت بیان کی ہے۔ مومن بہ کو بیان نہیں کیا۔

آخر میں فرمایا ہے لھم درجات عند ربھم و مغفرۃ و رزق کریم۔ درجات سے مراد مراتب، منازل اور ارتقا کے مقامات ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کے یہاں ان ایمان والوں کے ان گنت درجات ہیں۔ لفظ درجات میں معنوی اور حسی دونوں بلندیاں داخل ہیں۔ درجات اول تو جمع لے کر آئے اور پھر اس میں تنوین تفخیم کی لگائی اور اس کو اور زیادہ وقیع بنانے کے لیے عند ربھم کا اضافہ کیا۔ بتانا یہ ہے کہ ان کے رفع مراتب کا اللہ کے یہاں آخر کوئی نہیں ہے۔ یہ ہے زندگی کا وہ اصلی ارتقا۔ جس کا قرآن داعی ہے دنیا تو صرف عناصر کے مادی ارتقا سے واقف ہے لیکن نبوت کی دعوت مادیت سے کہیں بلند ہے۔ عناصر کی ترکیب کی ارتقائی شکل انسان نے اور انسان کی زندگی کی ارتقائی شکل وہ ہے جسے قرآن الجنۃ یا النار کہتا ہے۔ جب آپ غلہ سے زندگی بنتا مانتے ہیں تو ایمان و عمل سے زندگی کا بننا کیوں نہیں مانتے۔ مادہ سے مادی زندگی کے لیے فنا ہے اور ایمان و عمل سے بننے والی زندگی دائمی ہے۔ اس کی صفت خالدین فیہا اور اسے آخر میں مغفرت فرما کر اشارہ کر دیا ہے کہ انسان اعمال کے لحاظ سے خواہ کتنا ہی بلند اور اونچا ہو جائے کوتاہی اور تصور جناب الٰہی کی عظمت، کبریائی اور جلال کے اعتبار سے ضرور ہو سکتی ہے۔ انسان جب تک انسان ہے یہ محال ہے کہ اس کا نامہ عمل سر تا سر معیاری کارناموں کی دستاویز ہو اور لغزش، کوتاہی اور خامی سے بالکل خالی ہو لیکن اللہ سبحانہ کی رحمتوں میں سے یہ بھی بڑی رحمت ہے کہ جب انسان بندگی کی لازمی شرائط پوری کر دیتا ہے تو اللہ سبحانہ اس کی کوتاہیوں سے چشم پوشی فرما لیتا ہے اور اس کی خدمات جس صلے کی مستحق ہوتی ہے اس سے کچھ زیادہ صلہ اپنے فضل سے عطا کرتا ہے ورنہ اگر قاعدہ یہ مقرر کیا جاتا کہ ہر قصور کی سزا اور ہر خدمت کی جزا الگ الگ دی جائے گی تو کوئی بڑا سے

بڑا صالح بھی سزا سے نہ بچ سکتا۔ آیت میں درجات وجل اور اخلاص کے مغفرت اقامہ صلاۃ کے اور رزق کریم انفاق کے مقابلے میں ہے ۔

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ۪ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ

لَكٰرِهُوْنَ ۝ يُجَادِلُوْنَكَ فِى الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا

يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝ وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ

اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ

الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَ

يَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ

وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۝

(اس معاملہ کو بھی ایسا ہی سمجھو) جیسا کہ آپ کے پروردگار نے سچائی کے ساتھ آپ کو آپ کے گھر سے نکالا[۵] ۔ اور بلاشبہ اہل ایمان کا ایک گروہ اس بات کو پسند نہ کرتا تھا وہ آپ سے امرِ حق کے معاملہ میں جھگڑا کرتے تھے باوجودیکہ معاملہ واضح ہو چکا تھا، ان کا حال یہ تھا کہ

گویا ان کو موت کی طرف ہانکا جا رہا ہے اور موت ان کو نظر آ رہی ہے[6]۔ اور مسلمانو! وہ وقت بھی یاد کرو جب اللہ تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ دونوں گروہوں میں سے ایک ضرور تمہیں ملے گا اور تم چاہتے تھے کہ بے کانٹے والا گروہ تمہیں ملے۔ اور اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ اپنے ارشادات سے حق کو حق کر دکھائے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے۔ اور یہ اس لیے ہوا کہ حق کو حق کر کے دکھلا دے اور باطل کو باطل خواہ مجرم پیشہ لوگوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو[7]۔

جنگِ بدر کا پس منظر

یہ سورت مدنی ہے۔ جنگِ بدر کے بعد نازل ہوئی۔ مکہ کی تیرہ سالہ زندگی میں مشرکینِ مکہ نے جو دردناک ہوشربا مظالم مٹھی بھر مسلمانوں پر روا رکھے اور مظلوم مسلمانوں نے جس صبر و استقلال اور معجز نما استقامت و للّٰہیت سے مسلسل تیرہ برس تک ان ہولناک مصائب و نوازل کا تحمل کیا وہ دنیا کی تاریخ کا بے مثال واقعہ ہے قریش اور ان کے حامیوں نے کوئی صورت ظلم و ستم کی نہ چھوڑی تاہم مسلمانوں کو حق تعالیٰ نے ان وحشی ظالموں کے مقابلے میں ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہ دی۔ صبر و تحمل کے

امتحان کی آخری حد یہ ہے کہ مسلمان مقدس وطن، عزیز و اقارب، اہل و عیال، مال و دولت سب چیزوں کو خیر باد کہہ کر خالص خدا و رسول کی خوشنودی کا راستہ طے کرنے کے لیے گھروں سے نکل پڑے۔ جب مشرکین کا جبر و تشدد اور مسلمانوں کی مظلومیت و بے کسی حد سے گزر گئی۔ ادھر اہل ایمان کے قلوب، وطن و قوم، زن و فرزند، مال و دولت غرض ہر ایک ماسوائے اللہ کے تعلق سے خالی اور پاک ہو کر محض خدا و رسول کی محبت اور دولت توحید و اخلاص سے ایسے بھرپور ہو گئے کہ گویا غیر اللہ کی ان میں گنجائش ہی نہ رہی۔ تب ان مظلوموں کو جو تیرہ برس سے برابر کفار کے حملے سہہ رہے تھے اور وطن چھوڑنے پر بھی امن حاصل نہ کر سکے تھے۔ ظالموں سے لڑنے اور بدلہ لینے کی اجازت ملی۔

اذن الذین یقاتلون بانھم ظلموا وان اللہ علی نصرھم لقدیر الذین اخرجوا من دیارھم بغیر حق الا ان یقولوا ربنا اللہ۔

جن اہل ایمان کے خلاف ظالموں نے جنگ شروع کر رکھی ہے اب ان کو بھی جنگ کی اجازت دی جاتی ہے کیونکہ وہ سرتاسر مظلوم ہیں۔ اور اللہ ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ مظلوم ہیں جن کو ناحق ان کے گھروں سے نکال دیا گیا۔ ان کا صرف یہ جرم تھا کہ وہ یہ کہتے تھے کہ ہمارا مالک و آقا اللہ ہے۔

مکہ کا ادب مانع تھا کہ مسلمان ابتداءً چڑھ کر وہاں جائیں اس لیے ہجرت کے بعد تقریباً ڈیڑھ سال تک لائحہ عمل یہ رہا کہ مشرکین مکہ کے تجارتی سلسلوں کو جو شام و یمن وغیرہ سے قائم تھے، شکست دے کر ظالموں کی اقتصادی حالت اور مسلمانوں کی مالی پوزیشن مضبوط کی جاتے۔ ہجرت کے پہلے سال ابوا، بواط، عشیرہ وغیرہ چھوٹے چھوٹے غزوات و سرایا جن کی تفصیل کتب احادیث و سیر میں ہے اسی سلسلے میں وقوع پذیر ہوا ہے۔ ۲ھ میں آپ کو معلوم ہوا کہ ایک بھاری تجارتی مہم ابوسفیان کی سرکردگی میں شام کو روانہ ہوئی۔ ابوسفیان کا یہ تجارتی قافلہ جس کے ساتھ تقریباً ساٹھ قریشی، ایک ہزار اونٹ اور پچاس ہزار دینار کا مال تھا جب شام سے مکہ کو واپس ہوا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر پہنچی۔ صحیح مسلم

کی روایت کے موافق آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا کہ آیا اس جماعت سے تعرض کیا جائے۔ طبری کی روایت کے موافق لوگوں نے اس مہم میں جانے سے پہلو تہی کی، کیونکہ انہیں کسی بڑی جنگ کا خطرہ نہ تھا جس کے لیے بڑا اہتمام و اجتماع کی ضرورت ہو۔ دوسرے انصار کی نسبت یہ بھی خیال کیا جاتا تھا کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نصرت و حمایت کا معاہدہ صرف اس صورت میں کیا تھا کہ کوئی طبقہ مدینہ پر چڑھائی کرے یا آپ پر حملہ آور ہو۔ ابتداءً اقدام کر کے جانا خواہ کسی صورت میں ہو ان کے معاہدہ میں شامل نہ تھا۔ مجمع کا یہ رنگ دیکھ کر ابوبکر و عمر اور رئیس انصار سعد بن رضی اللہ عنہم نے حوصلہ افزا تقریریں کیں۔ آخر حضور تین سو سے کچھ زائد آدمیوں کی جمعیت لے کر قافلہ کی طرف روانہ ہو گئے چونکہ کسی بڑے مسلح لشکر سے مڈبھیڑ ہونے کی کوئی توقع نہ تھی اس لیے جمعیت اور سامان اسلحہ کا زیادہ اہتمام نہیں کیا گیا۔ فی الوقت جو اکٹھے ہو گئے سرسری سامان کے ساتھ روانہ ہوئے۔ اسی لیے بخاری کی روایت میں حضرت کعب بن مالک فرماتے ہیں کہ جو لوگ غزوہ بدر میں شریک نہیں ہوئے۔ ان پر کوئی عتاب نہیں ہوا۔ کیونکہ حضور صرف تجارتی مہم کے ارادے سے نکلے تھے۔ اتفاقاً خدا نے باقاعدہ جنگ کی صورت پیدا فرما دی۔ ابوسفیان کو آپ کے ارادے کا پتہ چل گیا۔ اس نے فوراً مکہ آدمی روانہ کیا۔ وہاں سے تقریباً ایک ہزار کا لشکر جس میں قریش کے بڑے بڑے سردار تھے، پورے ساز و سامان کے ساتھ مدینہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ حضور اقدس مقام صفراء میں تھے۔ جب آپ کو معلوم ہوا کہ ابوجہل وغیرہ بڑے بڑے ائمۃ الکفر کی کمان میں مشرکین کا لشکر یلغار کرتا چلا آ رہا ہے۔ اس غیر متوقع صورت کے پیش آجانے سے اپنے صحابہ کو اطلاع دی کہ اس وقت دو جماعتیں تمہارے سامنے ہیں تجارتی قافلہ اور سرکاری فوج۔ اللہ کا وعدہ ہے کہ دونوں میں ایک پر تمہیں مسلط کرے گا، تم بتلاؤ کہ دونوں میں سے کس جماعت کی طرف بڑھنا چاہتے ہو۔ چونکہ فوجی مہم کے لیے تیار ہو کر نہ آئے تھے اس لیے اپنی تعداد اور سامان جنگ کی قلت کو دیکھتے ہوئے کچھ لوگوں کی رائے یہ ہوئی کہ تجارتی قافلہ پر حملہ کرنا زیادہ مفید ہے مگر حضور اس رائے سے خوش نہ تھے۔ حضرت ابوبکر و عمر اور مقداد بن الاسود نے ولولہ انگیز جوابات دیے اور آخر میں حضرت سعد بن معاذ کی تقریر کے بعد بھی فیصلہ ہوا کہ

فوجی مہم کا مقابلہ کیا جاتے۔ چنانچہ مقامِ بدر پر دونوں فوجیں بھڑ گئیں۔ اللہ سبحانہٗ نے مسلمانوں کو فتح عظیم عطا فرمائی۔ کافروں کے ستر بڑے بڑے سردار مارے گئے اور ستر قیدی ہوئے۔ اس طرح کفر کا زور ٹوٹا۔ اس سورت میں عموماً اسی واقعہ کے اجزاء و متعلقات کا بیان ہوا ہے۔

بدر کے لیے نکلنا بامرِ الٰہی تھا

۵۔ جیسا کہ آپ کے پروردگار نے سچائی کے ساتھ آپ کو آپ کے گھر سے نکالا۔ یعنی سوچو کہ اس جنگِ بدر میں شروع آخر تک کس طرح حق تعالیٰ کی تحریک و تائید اور امداد و توفیق مسلمانوں کے حق میں کار فرما دی۔ خدا ہی تھا جو نصرتِ دینِ اسلام کے حق میں سچے وعدے کر کے اپنے نبی کو ایک امرِ حق یعنی کفار کے ساتھ جہاد کرنے کے لیے مدینہ سے باہر لے آیا ۔[1]

اصل ارشاد کما اخرجک ربک من بیتک بالحق ہے۔ اس میں لفظ کما آیا ہے۔ شارحینِ قرآن اسے تشبیہ کے لیے کہتے ہیں۔ عربی میں تشبیہ کے لیے اور اُردو میں ایسے اور جیسے کی جگہ کذالک اور کما بولتے۔ قرآن میں کہیں ایسا بولا گیا ہے اور جیسا چھوڑ دیا گیا ہے اور کبھی جیسا بولا جاتا ہے اور ایسا چھوڑ دیا جاتا ہے۔ دوسرے مقامات پر کذالک ایسا آیا ہے مثلاً کذالک جعلنکم امۃ وسطا لیکن جیسا یعنی کما نہیں ہے اور کہیں کما ارسلنا فیکم میں جیسا ہے مگر ایسا نہیں ہے۔ پیشِ نظر آیت بھی اسی قبیل سے ہے۔ یہاں بھی اشارہ محذوف ہے۔

شارحین قرآن نے جیسا کی خاطر ایسا مقرر کرنے کے لیے تقریباً بیس صورتیں پیش کی ہیں۔ حافظ ابن جریر نے یہاں طول طویل تقریر کی ہے اور زمخشری و رازی نے بھی بہت کچھ دادِ تحقیق دی ہے لیکن حق یہ ہے کہ تعبیر کا حق ادا نہ ہو سکا۔ الخفاجی نے سب کی آراء لکھ کر کہدیا ہے کہ ان میں سے اکثر جی میں کھٹکتی ہیں۔ اکثر نے اس کا پیوند انفال سے جوڑا ہے اور منتہ الانفال للہ والرسول کو قرار دیا ہے۔ ایک کا

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

بدر کے لیے جانا ایک حال ہے اور یہ مشتبہ ہے اور اموالِ غنیمت کا تقسیم ہونا مشبہ ہے اور وجہ شبہ ناگواری اور کراہت ہے۔ سب سے پہلے اس کی تخریج کا سہرا فراء نحوی کے سر ہے۔ بعد کے شارحینِ قرآن نے بھی اسی کو راجح قرار دیا ہے۔ اُردو تفاسیر میں بھی اسی کو اپنایا ہے۔ حضرت مولانا اشرف علیؒ فرماتے ہیں :

یہ انفال کا لوگوں کی مرضی کے مطابق تقسیم نہ ہونا گو طبعاً لوگوں کو ناگوار گزرا ہو مگر بوجہ تضمن مصالح کثیرہ کے بھی خیر ہے بس یہ امر مشقت طبعی اور تضمن مصالح میں ایسا ہے جیسا کہ

شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں۔

یعنی غنیمت کا جھگڑا بھی ویسا ہی ہے جیسا نکلتے وقت عقل کی تدبیریں کرنے لگے۔

مفتی محمد شفیع صاحب نے بھی مولانا اشرف علیؒ کی ہمنوائی کی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ ترجمان القرآن میں لکھتے ہیں۔ اس معاملہ کو بھی ویسا ہی سمجھو جس طرح جنگ بدر میں یہ بات ہوئی کہ تیرے پروردگار نے تجھے سچائی کے ساتھ الخ اور مولانا ادریس فرماتے ہیں۔ اے نبی جس طرح لوگوں نے اس تقسیم انفال میں اختلاف کیا اور بعضوں کو یہ تقسیم طبعاً گراں گزری اور بعض اس سے ناخوش تھے مگر بوجہ مصالح کثیرہ خیر اسی میں تھی کہ اللہ کے رسول نے اللہ کے حکم سے تم میں یہ مال تقسیم کر دیا اور تمہاری کا خیال نہ کیا۔ اسی طرح جب تیرے پروردگار نے مولانا امین احسن اصلاحی کا بھی میلان اسی طرف ہے اگرچہ الجھا ہوا ہے اور واضح نہیں ہے۔ مولانا مودودی لکھتے ہیں کہ جس طرح اس وقت یہ لوگ خطرے کا سامنا کرنے سے گھبرا رہے ہیں حالانکہ حق کا مطالبہ اس وقت بھی تھا کہ خطرے کے منہ میں چلے جائیں۔ اسی لیے انہیں آج مالِ غنیمت کا چھوڑنا دشوار ہو رہا ہے حالانکہ حق کا مطالبہ یہی ہے کہ اسے چھوڑ دیں اور حکم کا انتظار کریں۔

اصل میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ اموالِ غنیمت میں اختلاف کی بات اللہ سبحانہٗ کے اس فیصلے الانفال للہ والرسول کے بعد رونما ہوئی ہے حالانکہ یہ بات نہیں ہے، بلکہ اختلاف کی بات اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے کی ہے۔ اور یہ اختلاف رونما ہونے

کی وجہ ان کے ایمان کی کمزوری نہ تھی بلکہ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ عرب جاہلیت میں دستور تھا کہ لڑائی میں جو مال جس کے ہاتھ آئے وہ اسی کا ہے۔ رومیوں میں بھی اسی کا دستور تھا۔ اسی دستور کی بنا پر بدر کی لڑائی کے بعد اموالِ غنیمت میں اختلاف ہوا مسندِ امام احمد میں عبادہ ابن الصامت کی دونوں روایات بھی یہ بتاتی ہیں کہ یہ اختلاف مالِ غنیمت کے بارے میں نزولِ قرآن سے پہلے ہوا۔ اگر نزولِ قرآن کے بعد ہوتا تو اس کو ایمان کی کمزوری کہا جا سکتا تھا لیکن جس معاملہ میں قرآن نازل ہی نہیں ہوا اس میں مخاطبوں پر کمزوری کا الزام زیادتی ہے۔ یہ تو ایسا ہے جیسے کوئی نماز کی فرضیت سے پہلے نماز نہ پڑھنے کو کسی کی کمزوری بتائے۔ جب قرآن کا حکم آگیا کہ الانفال للہ والرسول تو اس کے بعد ان کی ناگواری کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ یہ تاویل کہ یہ ایمانی نہیں صرف طبعی کمزوری تھی ایک بے جان سی بات ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جب قرآن نے یہ حکم دے دیا کہ مالِ غنیمت جو کچھ بھی ہاتھ آئے حکومت کا ہے نہ کہ لوٹنے والوں کا۔ لوگوں کی ذاتی طمع وحرص ابھرنے کی راہ روک دی۔ چونکہ یہ رواج اور دستور کے خلاف پابندی تھی اس لیے ضروری تھا کہ لوگوں پر یہ بات شاق ہو۔ اس لیے پہلے تقویٰ اور طاعت کی تلقین کی۔ پھر اہلِ کمال کی ایمان میں نشان بتا کر ان کی حوصلہ افزائی کی اور پھر فرمایا کہ اس معاملہ کو بھی ویسا ہی سمجھو جیسا جنگِ بدر میں پیش آیا ہے۔

مولانا عثمانی فرماتے ہیں :

> جیسے خدا ہی کی مدد سے از اوّل تا آخر یہ مہم سر ہوئی مالِ غنیمت کو بھی اسی کا سمجھنا چاہیے۔ وہ اپنے پیغمبر کے ذریعے سے جہاں بتلائے خرچ کرو۔ کما اخرجک ربک من بیتک کے کاف کو میں نے اپنی تقریر میں صرف تشبیہ کے لیے نہیں لیا بلکہ ابو حیان کی تحقیق کے موافق تعلیل کے لیے رکھا ہے جیسے واذکروہ کما ہداکم میں علماء نے تصریح کی ہے۔ اور اخرجک ربک من بیتک کے مضمون کو میں نے الانفال للہ والرسول کا ایک سبب قرار دیا ہے۔ ابو حیان کی طرح اعزک اللہ وغیرہ مقدر نہیں مانا۔

مولانا عثمانی نے جو بات ارشاد فرمائی ہے وہ جی کو لگتی ہے کہ کاف تعلیل کے لیے ہے

اور مطلب یہ ہے کہ چونکہ آپ کا میدانِ جنگ میں جانا اور اس کے نتیجے میں اموالِ غنیمت کا حاصل ہونا اللہ کے حکم سے ہے اس لیے اموال کی تقسیم بھی اللہ ہی کے حکم سے ہوئی ہے نہ تمہاری رائے کو نکلنے میں دخل تھا اور نہ تقسیم میں دخل تھا۔

اہلِ ایمان کی ناخوشی

۶۔ اہلِ ایمان کا ایک گروہ اس بات کو پسند نہ کرتا تھا۔ وہ آپ سے امرِ حق کے معاملہ میں جھگڑ رہے تھے۔ باوجودیکہ معاملہ واضح ہو چکا۔ ان کا حال یہ تھا کہ گویا ان کو موت کی طرف ہانکا جا رہا ہے اور موت ان کو نظر آ رہی ہے۔ یعنی بدر کے میدان میں اس وقت لے آیا جبکہ ایک جماعت مسلمانوں کی لشکرِ قریش سے نبرد آزمائی کرنے پر راضی نہ تھی۔ یہ لوگ ایسی سچی اور طے شدہ چیز میں پس و پیش کر رہے تھے اور حجتیں نکال رہے تھے جس کی نسبت بذریعہ پیغمبر انہیں ظاہر ہو چکا تھا کہ وہ یقیناً خدا کی فرمائی ہوئی اٹل بات ہے۔ یعنی اسلام اور پیروانِ اسلام کا بذریعہ جہاد غالب و منصور ہونا ابوجہل کے لشکر سے مقابلہ کرنا ان کو اس قدر شاق اور گراں تھا جیسے کسی شخص کو آنکھوں دیکھتے موت کے منہ میں جانا مشکل ہے تاہم خدا اپنی توفیق سے ان کو میدانِ جنگ میں لے آیا اور اپنی امداد سے مظفر و منصور واپس لایا۔[1]

آیت میں تشریح طلب یہ باتیں ہیں:

۱۔ یہ مختصر سی ٹولی جسے فریقاً من المؤمنین کہا ہے کس چیز کو ناپسند کر رہی تھی اور کیوں۔

۲۔ وہ حق کیا ہے جس میں یہ ٹولی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے بحث و مجادلہ کر رہی تھی۔

۳۔ من بعد ما تبین سے کیا مراد ہے کیا چیز ظاہر ہو چکی تھی اور کیسے۔

سب سے پہلے یہ بات دھیان میں رکھنی چاہیے کہ مختصر سی ٹولی کا تعلق ان

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

مومنین سے ہے جو بدر کی جنگ میں شریک ہوتے۔ اب یہ غور فرمائیے کہ اس ٹولی کو کیا چیز ناپسند تھی۔ آلوسی لکھتے ہیں کہ ان کو نکلنا پسند نہ تھا۔ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ ان کو مشرکین کی طلب پسند نہ تھی۔ خفاجی کہتے ہیں کہ ان کو لڑائی پسند، نکلنا ہو یا طلب اور یا پھر جنگ کیوں پسند نہ تھی۔ سب لکھتے ہیں اس لیے کہ جنگ کی تیاری نہ تھی۔

دوسری بات کہ وہ حق کیا ہے جس میں یہ ٹولی حضور سے مباحثہ کر رہی تھی۔ قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کہ حق یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے میں مشرکین سے جہاد کرنا چاہیے اور ان کا خیال یہ تھا کہ اس کی چونکہ بالفعل تیاری نہیں ہے اس لیے وہ کام کرنا چاہیے جس کی تیاری کر کے آتے ہیں۔ آلوسی لکھتے ہیں کہ وہ آپ سے مشرکین سے جنگ کے بارے میں بحث کر رہے تھے اور اس کے باوجود بحث کر رہے تھے کہ آپ ان کو کھول کر بتا چکے تھے کہ حق کا غلبہ ہوگا۔ لیکن ان کا موقف یہ تھا کہ اگر آپ ہمیں پہلے بتا دیتے تو ہم تیار ہو کر آتے۔ ان کو سوا دو تین سو کا مقابلہ پریشان کر رہا تھا۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ مجادلہ یہ تھا کہ وہ کہہ رہے تھے کہ آپ تو ہمیں صرف چالیس آدمیوں کا مقابلہ کہہ کر لائے تھے اور یہ تو باقاعدہ لڑائی اور میدانِ جنگ ہے۔ اس کو سر کرنے کے لیے طاقت کا توازن ضروری ہے یعنی صحابہ کی یہ جماعت اس مسئلہ پر اسباب و وسائل کی دنیا کو پیشِ نظر رکھ کر غور کر رہی تھی۔ ٹھیک اسی طرح جیسے اموالِ غنیمت کے معاملہ میں رسم و رواج کے پیشِ افتادہ کے قانون کے مطابق سوچ رہی تھی مگر وہاں اور یہاں دونوں جگہ قانونِ تکوینی کام کر رہا تھا۔ اس بحث و مباحثہ کے نتیجہ میں جب ان کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ اس معاملہ میں اللہ سبحانہ کا ارشاد اور حکم ہے تو سب خوش ہو گئے اور نصرتِ الٰہی پر اعتماد کر کے آگے بڑھے۔ بالکل ایسے ہی جیسے میدانِ جنگ میں حضرت حباب بن منذر نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ جو مقام انتخاب کیا گیا ہے وحی کی رو سے ہے یا فوجی تدبیر ہے۔ ارشاد ہوا کہ وحی نہیں ہے۔ حضرت حباب نے کہا تو بہتر ہوگا کہ آگے بڑھ کر چشمہ پر قبضہ کر لیا جائے اور آس پاس کے کنویں بے کار کر دیے جائیں۔ آپ نے یہ رائے پسند فرمائی اور اسی پر عمل کیا گیا۔ یہاں بھی ساری کراہت اور بحث و مجادلہ صرف اسی وقت تک تھا جب تک ان کو معلوم نہ تھا کہ

عالم غیب کا فیصلہ ہے۔ اور جب معلوم ہو گیا تو سب سراپا طاعت ہو گئے۔ جیسے اموالِ غنیمت میں حکم آنے کے بعد سب نے سر تسلیم خم کر دیا۔ جب تک حکم نہیں آیا تھا اور سمجھنے والے سمجھ رہے تھے کہ یہ آپ کی رائے ہے تو منظر یہی تھا کانما یساقون الی الموت وھم ینظرون گویا ان کو زبردستی موت کے منہ میں دھکیلا جا رہا ہے۔ یہ ان کی سمجھ میں نہ آنے کے باوجود طاعت کی سرشاری بیان ہو رہی ہے نہ کہ کمزوری۔

مسلمانوں سے کامیابی کا وعدہ

۷۔ اور مسلمانو! وہ وقت بھی یاد کرو جب تم سے اللہ تعالیٰ وعدہ کر رہا تھا کہ دونوں گروہوں میں سے ایک ضرور تمہیں ملے گا اور تم چاہتے تھے کہ بے کانٹے والا گروہ تمہیں ملے۔ اور اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ اپنے ارشادات سے حق کو جما دے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے اور یہ اس لیے ہُوا کہ حق کو حق کر کے دکھلا دے اور باطل کو باطل، خواہ جرم پیشہ لوگوں کو یہ کتنا ہی ناپسند ہو۔ مسلمان چاہتے تھے کہ تجارتی قافلہ پر حملہ آور ہو کر کانٹے نہ چبھے اور بہت سامال ہاتھ آئے لیکن خدا کی مرضی یہ تھی کہ اس چھوٹی سی بے سروسامان جماعت کو کثیر التعداد اور مرتب و پُر شوکت لشکر سے لڑا کر اپنی باتوں سے سچ کو سچ کر دکھائے اور کفارِ مکہ کی جڑ کاٹ ڈالے تاکہ اس طرح اس کے وعدوں کی سچائی حیرت انگیز طریقہ پر ظاہر ہو کر سچ کا سچ اور جھوٹ کا جھوٹ ہونا کفار کے علی الرغم صاف صاف آشکارا ہو جائے۔ چنانچہ یہ ہی ہُوا۔ بدر میں قریش کے ستر سردار مارے گئے۔ جن میں ابوجہل بھی تھا۔ اور ستر ہی قیدی ہوئے۔ اس طرح کُفر کی کمر ٹوٹ گئی اور مشرکین مکہ کی بنیادیں ہل گئیں فاللہ الحمد والمنۃ[1]

وہ معاملہ یہ تھا کہ ہجرت کے دوسرے سال جب رؤسائے مکہ نے مدینہ پر حملہ کیا تو اسی زمانے میں ایک تجارتی قافلہ بھی شام سے آ رہا تھا اور مدینہ کے قرب و جوار یعنی بدر سے ہو کر گزرنے والا تھا۔ کیونکہ مکہ سے شام جانے کے لیے راستہ بدر سے

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

ہی جاتا تھا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی الٰہی سے مطلع ہو کر فرمایا کہ ایک گروہ مکہ سے آرہا ہے۔ دوسرا قافلہ ہے۔ ان دو میں کسی ایک سے ضرور جنگ ہوگی اور تم کامیاب ہو گے۔ چونکہ دونوں جماعتوں میں سے ایک سے ضرور نبرد آزمائی کے نتیجہ میں کامیابی کی بشارت تھی۔ دو گروہوں کا اجمالی چہرہ بھی آیت میں بتا دیا۔ ایک کانٹے والا اور دوسرا بغیر کانٹے کے، یعنی ایک مسلح دوسرا غیر مسلح یا یوں کہہ دیجئے ایک فوجی لشکر جو مسلح ہے اور دوسرا تاجروں کا ایک قافلہ جو غیر مسلح ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو یہ بات کہ دو گروہوں میں سے ایک سے مقابلہ ہونا ہے کب بتائی اور کہاں بتائی۔ صحیح مسلم کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ابو سفیان کے آنے کا حال معلوم ہوا اسی وقت اپنے مہاجرین و انصار سے مشورہ کیا اور انصار سے اعانت کی خواہش کی۔ اور یہ سب کی مانی ہوئی بات ہے کہ ابو سفیان کی آمد کا حال مدینہ ہی میں معلوم ہو چکا تھا۔

نیز صحیح بخاری ہی میں ہے کہ کعب کہتے ہیں کہ

> رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر میں کسی غزوہ سے پیچھے نہیں رہا۔ بجز غزوۂ تبوک کے۔ اور ہاں غزوۂ بدر میں بھی میں شریک نہ تھا۔ اور جو اس میں شریک نہ ہوا اس پر کچھ عتاب نہیں ہوا، کیونکہ حضور اقدس قریش کے قافلہ کے لیے نکلے تھے کہ خدا جانے دونوں فریق کو اچانک آمنے سامنے کر دیا۔

کعب کی یہ حدیث بتاتی ہے کہ حضور مدینہ سے صرف اس لیے روانہ ہوئے کہ ابو سفیان کے تجارتی قافلہ کو روکیں اور بس۔

سوال یہ ہے کہ اجتماع کہاں ہوا اور صحابہ سے مشورہ کب اور کہاں ہوا؟ قرآن میں جن دو گروہوں سے مڈبھیڑ کی خبر دی گئی ہے یہ مدینے ہی میں صحابہ کو دے دی گئی تھی یا مدینہ سے باہر۔

تجارتی قافلہ پر حملہ کا مسئلہ

ایک خیال عام شارحین قرآن، محدثین اور مفسرین کا ہے۔ اسی کو اردو کے

مفسرین نے بھی اپنایا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے تو صرف ابوسفیان کے قافلہ کی خاطر چلے تھے اور حضور کو مدینے میں ابوسفیان کے قافلہ کے سوا مکہ کی فوجی مہم کی کوئی اطلاع نہ تھی۔ لیکن جب آپ وادی ذفران میں پہنچ کر مقام پذیر ہوئے وہاں آپ کو معلوم ہوا کہ قافلہ تجارت کی مدد کے لیے مکہ سے فوجی طاقت بدر میں جمع ہو رہی ہے۔ اسی جگہ اپنے صحابہ کو جمع کر کے مشورہ کیا۔ مہاجرین و انصار اس میں شریک تھے۔

دوسری طرف مولانا شبلی مرحوم، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم اور مولانا امین احسن اصلاحی ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ حضور کو فوجی مہم کی مدینہ ہی میں خبر آگئی تھی اور آپ مدینہ سے تجارتی قافلہ کے لیے نہیں بلکہ فوجی مقابلہ کے لیے روانہ ہوئے۔ مولانا شبلی کو یہ اعتراف ہے کہ اس معاملہ میں وہ اکیلے ہیں لیکن ان کو اصرار ہے کہ حق وہی ہے جس کے وہ علمبردار ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

اس بات کا مجھے مطلق خوف نہیں کہ اس فیصلے میں عام مورخین اور ارباب سیر میرے حریف ہیں۔ نہایت جلدی نظر آجائے گا کہ حق اکیلا تمام دُنیا پر فتح پا سکتا ہے۔

مولانا شبلی کے دلائل یہ ہیں :

۱۔ وان فریقا منھم لکارھون میں واو حالیہ ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ مسلمانوں کا ایک گروہ جو لڑائی سے جی چراتا ہے یہ موقع عین وہ موقع تھا جب آپ مدینہ سے نکل رہے تھے نہ کہ مدینہ سے نکل کر جب آپ آگے بڑھے کیونکہ واو حالیہ کے لحاظ سے خروج من البیت اور اس گروہ کے جی چرانے کا وقت اور زمانہ ایک ہی ہونا چاہیے۔

۲ آیت مذکورہ میں یہ تصریح ہے کہ یہ جس وقت کا واقعہ ہے اس وقت دو گروہ سامنے تھے۔ ایک کاروانِ تجارت اور ایک قریش کی فوج۔ اربابِ سیر کہتے ہیں کہ آیتِ قرآنی میں یہ اس وقت کا واقعہ مذکور ہے، جب آنحضرت، بدر کے قریب پہنچ چکے تھے لیکن بدر کے قریب پہنچ کر تو کاروان تجارت صحیح و سلامت بچ کر نکل گیا تھا اس وقت یہ کیونکہ صحیح ہو سکتا ہے کہ دونوں میں سے ایک کا وعدہ ہے۔ اس لیے یہ بالکل ظاہر ہے کہ قرآن مجید کی نص کے مطابق یہ واقعہ اس وقت کا ہونا

چاہیے جب دونوں گروہوں کے ہاتھ آنے کا احتمال ہو سکتا ہو اور یہ صرف وہ وقت ہو سکتا ہے جب حضور مدینہ میں تھے اور دونوں طرف کی خبریں آگئی تھیں۔

۳۔ سب سے زیادہ قابلِ لحاظ یہ امر ہے کہ قرآنِ مجید آیت مذکورہ میں کفار کے دو فریق کا خدا نے ذکر کیا ہے۔ ایک قافلہ تجارت دوسرا اصحابِ شوکت، آیت میں تصریح ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت ایسی بھی جو چاہتی تھی کہ کاروانِ تجارت پر حملہ کیا جائے۔ خدا نے ان لوگوں پر ناراضی ظاہر کی۔

یہ اور اس قسم کی باتیں تفصیل سے مولانا شبلی نے بیان کی ہیں۔ اور بتایا ہے کہ مدینہ سے روانگی صرف مشرکین کے لشکر سے مقابلہ کے لیے ہوئی تھی۔ تجارتی قافلہ آپ کے پیشِ نظر نہ تھا۔

آیئے مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا محمد ادریس کاندھلوی شارحینِ قرآن، محدثین اور مورخین کا بھی موقف سمجھ لیجئے۔ اور دونوں کو پڑھ کر پھر غور کیجئے کہ اصل بات کیا ہے۔ مولانا عثمانی کی تقریر میں مولانا شبلی کے جوابات کی طرف اشارات ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں:

صاحبِ روح المعانی کی تصریح کے موافق اخرجک ربک من بیتک میں صرف خروج من البیت مراد نہیں ہے بلکہ خروج من البیت سے دخول فی الجہاد تک کا ممتد اور وسیع زمانہ مراد ہوتا ہے جس میں وان فریقا من المومنین لکارھون یجادلونک فی الحق وغیرہ سب احوال واقع ہوتے۔ ایک فریق کی کراہت تو عین خروج من المدینہ ہی کے وقت ظاہر ہو گئی تھی جسے ہم صحیح مسلم اور طبری کے حوالہ سے سورۃ الانفال کے پہلے فائدہ میں بیان کر چکے ہیں اور مجادلہ کی صورت غالباً آگے چل کر لشکر کی اطلاع ملنے پر مقام صفرلہ میں پیش آئی۔ اس کے سمجھ لینے کے بعد بعض مبطلین کے مغالطات کا استیصال ہو جائے گا۔

اور یہ بھی مولانا کا ارشاد سن لیجئے:

جن لوگوں کا خیال یہ ہے کہ اس سفر میں حضور شروع ہی سے فوجی لشکر سے مقابلہ کے لیے نکلے تھے جو مدینہ پر از خود اقدام کرتا ہوا چلا آرہا تھا۔ تجارتی قافلہ پر حملہ کی نیت آپ نے اوّل سے آخر تک کسی وقت نہیں کی۔ وہ فی الحقیقت اپنے

خود ساختہ اصول پر تمام ذخیرۂ حدیث و سیر و اشارات قرانیہ کو قربان کرنا چاہتے ہیں۔ یہ منطق ہماری سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ کفار محاربین جن کی دستبرد سے مسلمانوں کی جان و مال کی کوئی چیز نہ بچی اور نہ آئندہ بچنے کی توقع ہے ان کو جانی و بدنی نقصان پہنچانا تو جائز سمجھا جائے۔ لیکن تجارتی اور مالی نقصان پہنچانا خلاف تہذیب و انسانیت ہو۔ یعنی ان کی جانیں تو کفر و طغیان اور ظلم و شرارت کی وجہ سے محفوظ نہ ہوں مگر اموال بدستور محفوظ رہیں۔ گویا زندگی کے حق سے محروم ہو جائیں تو ہو جائیں پر سامان زندگی سے محروم نہ ہوں ان ھذا الا شئ عجاب۔ باقی یہ دعویٰ کہ یہ لوگ حملہ آور نہ ہوں ان کو مسلمانوں کو از خود حملہ جائز نہیں ہے کیونکہ وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم کے خلاف ہوگا۔ قطع نظر اس سے کہ یہ مسئلہ موجودہ واقعہ سے بے تعلق ہے۔ کیونکہ کفار مکہ پہلے ہر قسم کے مظالم اور حملے مسلمانوں پر کر چکے تھے اور آئندہ کے لیے باقاعدہ دھمکیاں دے رہے تھے بلکہ اس بارے میں ان کی سازشیں اور مراسلتیں جاری تھیں۔ فی نفسہٖ بھی صحیح نہیں کیونکہ یہ آیت ابتدائے ہجرت میں اتری تھی۔ اس کے بعد دوسری آیات جن میں مطلق قتال کا حکم ہے، نازل ہوئیں۔ پھر یہ بھی قابل غور ہے کہ صرف اتنا کہنے سے حملہ آوروں کی مدافعت کرو یہ لازم نہیں آتا کہ کسی حالت میں بھی حملہ کی اجازت نہیں۔

آئیے آگے چلنے سے پہلے حضرت مولانا محمد ادریس کے ارشادات عالیہ بھی اختصار کے ساتھ سن لیجئے:

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا غزوۂ بدر سے مقصد قریش کے اس کاروان تجارت پر یلغار کرنا تھا جو ابوسفیان کی سرکردگی میں شام سے واپس آرہا تھا۔ قریش مکہ کے کسی حملہ کا دفاع مقصد نہ تھا۔ علامہ شبلی کی سیرۃ النبی میں رائے یہ ہے کہ غزوۂ بدر کا مقصد کاروان تجارت پر حملہ کرنا نہ تھا بلکہ آپ کو مدینہ ہی میں یہ خبر آگئی تھی کہ قریش ایک عظیم جمعیت لے کر مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے نکلے ہیں اس لیے حضور ان کی مدافعت کے لیے نکلے اور بدر کا معرکہ پیش آگیا۔ غزوۂ بدر سے آپ کا مقصود کاروان تجارت پر حملہ کرنا نہ تھا بلکہ قریش کے حملہ کا دفاع تھا۔ علامہ شبلی کا یہ خیال تمام محدثین اور مفسرین کی تصریحات کے خلاف ہے۔

ابن ابی حاتم نے حضرت ابوایوب انصاری سے روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضور اقدس نے ہم سے فرمایا اور ہم مدینہ میں تھے کہ مجھے خبر دی گئی ہے کہ ابوسفیان کا تجارتی قافلہ آرہا ہے کیا تمہیں یہ مرغوب ہے کہ تم چلو عجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس قافلہ کو بطور غنیمت ہمیں عطا کردے۔ صحابہ نے عرض کیا کہ ہاں ہم کو یہ منظور ہے اس کے بعد ہم روانہ ہو گئے۔ ایک یا دو روز کی منزل قطع کرنے کے بعد آپ نے ہمیں بتایا کہ کفارِ مکہ کو ہماری روانگی کی اطلاع ہو گئی۔ وہ تیار ہو کر ہمارے مقابلہ کے لیے آرہے ہیں، تم بھی مقابلہ کے لیے تیاری کرو۔ ہم نے کہا کہ یا رسول اللہ ہم میں بخدا ان لوگوں سے مقابلہ کی تاب نہیں ہے۔ ہم تو صرف قافلہ کے ارادے سے آئے ہیں۔ آپ نے پھر اپنی بات دہرائی تو حضرت مقداد نے کہا کہ ہم بنی اسرائیل کی طرح نہ کہیں گے۔

یہ روایت فتح الباری اور زرقانی علی المواہب میں ہے۔

ایک دوسری روایت البدایہ والنہایہ اور ابن کثیر میں ہے:

عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ سنا کہ ابوسفیان تجارتی قافلہ کے ساتھ شام سے واپس آرہا ہے تو آپ نے مسلمانوں کو اس کی طرف خروج کا حکم دیا اور فرمایا کہ قریش کا قافلہ آرہا ہے جس میں بے شمار اموال ہیں لہٰذا تم اس پر حملہ کرنے کے لیے چلو۔ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو یہ اموال عطا فرما دیں۔ کچھ آپ کے ہمراہ گئے اور کچھ نہیں گئے جس کی وجہ یہ تھی کہ لوگوں کا اس کا خیال بھی نہ تھا کہ کوئی جنگ کی صورت پیش آجائے گی۔ الخ

اس لیے حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

غزوۂ بدر کا سبب یہ ہوا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو ابوسفیان کے قافلہ کی طرف خروج کی دعوت دی تاکہ اس کے اموال پر قبضہ کریں، کیونکہ اس قافلہ میں بہت اموال تھے اور آدمی کم تھے اس لیے اکثر انصار کو یہ گمان بھی نہ ہوا کہ قتال کی نوبت آئے گی۔

اس لیے بہت تھوڑے آدمی آپ کے ساتھ گئے اور لڑائی کی خاص تیاری نہیں کی، برخلاف مشرکین کے وہ پوری تیاری کے ساتھ آتے۔

خلاصہ کلام یہ کہ ان تمام روایات سے روزِ روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ حضورؐ اور صحابہ کرام مدینہ سے کاروانِ تجارت کے ارادے سے نکلے اور قریش مکہ اور ابوجہل اسی کاروانِ تجارت کو بچانے کے لیے نکلے تھے اور بس۔[1]

انصاف کی بات یہ ہے کہ قرآن نے دونوں کا تذکرہ کیا ہے تجارتی قافلہ کا اور مشرکین کی مسلح فوج کا۔ اور ان دونوں کی جگہ بدر تھی۔ ابوسفیان کو بدر پہنچ کر مکہ کی طرف جانا تھا اور مشرکین مکہ کو بھی بدر آنا تھا۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ ابوسفیان کی واپسی کی شام سے اطلاع مدینے پہنچی۔ چونکہ تجارتی قافلہ بڑا تھا جیسا کہ لکھنے والوں نے لکھا ہے کہ اس میں ایک ہزار اونٹوں پر پچاس ہزار دینار کا سامان تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ پہنچ کر پہلا کام یہی کیا تھا کہ قریش کی شامی تجارت بند کر دی جائے۔ یہ قافلہ ۲ھ جمادی الاولیٰ میں شام کی طرف روانہ ہوا۔ اور آپ کو اس کی روانگی کی اطلاع ملی تھی اور آپ دو سو مہاجرین لے کر اسی قافلہ کا تعاقب کرنے کے لیے عشیرہ تشریف لے گئے۔ آپ کے پہنچنے سے کئی روز پہلے یہ قافلہ نکل چکا تھا ابن سعد کی تصریح کے مطابق اب یہی قافلہ شام سے سامان تجارت لے کر آرہا تھا کہ آپ کو اطلاع مل گئی۔ پہلے دو سو صرف مہاجر تھے۔ اس بار تین سو تیرہ حضرات آپ کے ہمراہ ہو گئے۔ چونکہ صرف قافلہ کو روکنا تھا اور قافلہ میں صرف تیس چالیس آدمی تھے اس لیے زیادہ تگ و دو نہیں کی گئی۔ اس بار اس قافلے میں انصار کی تعداد مہاجرین سے زیادہ تھی۔ اور یہ پہلا موقعہ ہے کہ اس قسم کی مہم میں انصار ساتھ گئے۔

اولین اور اصلی خبر قافلہ تجارت کی تھی اس لیے عام ذہنوں میں قافلہ تجارت تھا قافلہ تجارت ہی کے مطابق جانے والوں نے تیاری کی۔ اگر ذہنوں میں فوجی مہم کا مقابلہ ہوتا تو تیاری اس کے مطابق ہوتی صرف دو گھوڑے اور ستر اونٹ نہ ہوتے

---

[1] سیرۃ مصطفےٰ از مولانا محمد ادریس

اور افرادی قوت بھی زیادہ ہوتی۔ عام ذہن یہی تھا کہ تجارتی قافلہ لینا ہے۔ جب آپ مقامِ صفراء میں پہنچے تو آپ کو معلوم ہوا کہ قافلہ نے اسی خطرے کے پیشِ نظر راستہ بدل لیا ہے اور ساحلِ سمندر سے ہو کر نکل گیا ہے۔ جب آپ کو یہ علم ہوا تو اب فوجی مہم کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس وقت آپ نے مہاجرین و انصار سے مشورہ کیا اور پیش پا افتادہ حالات کی اطلاع دی۔ خود حضورِ اقدس کی رائے یہی تھی کہ فوجی مہم سر کی جائے۔ اجتماع میں جن لوگوں نے حضورِ اقدس کا منشا سمجھ لیا انہوں نے فوراً ہاں میں ہاں ملائی۔ حضرت ابوبکر، عمر نے اپنی تقریروں میں بسر و چشم آپ کے اشارے کو قبول کیا۔ حضرت مقداد نے بھی جان نثاری کا اظہار کیا۔ انصار میں سے سعد بن معاذ نے حضور کا اشارہ سمجھ کر دلیرانہ انداز میں تقریر کی۔ ابو ایوب انصاری کہتے ہیں کہ ہم مدینہ میں تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو قافلہ ابی سفیان کی خبر دی اور فرمایا کہ اگر تم چلو تو اللہ تعالیٰ تم کو مالِ غنیمت عطا فرمائے گا۔ ہم نے عرض کیا میرے اور روانہ ہو گئے۔ جب ایک دو دن کا راستہ طے کر چکے تب آپ نے ہم کو قریش کی فوج سے جہاد و قتال کے لیے تیار ہونے کا حکم دیا۔ کچھ لوگوں نے تامل کیا۔ حضرت مقداد نے کھڑے ہو کر دلیرانہ انداز میں آپ کی دعوت کا استقبال کیا اور مسند احمد میں ہے کہ مقداد کی تقریر کے بعد سب نے بالاتفاق یہی بات کہی جو مقداد نے کہی تھی۔ مشورہ میں تصویر کے دونوں رُخ ہوتے ہیں۔ اصل چیز وہ ہے جو مشورہ میں طے ہوتی ہے۔ قرآن عزیز نے ان اختلاف کرنے والوں کو فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ کہہ کر جو بات ارشاد فرمائی ہے وہ فیصلہ ہونے سے پہلے کی بات ہے۔ یعنی مجلسِ شوریٰ کے اجتماع میں اہلِ ایمان میں ایک طبقہ کے یہ تاثرات تھے کہ:

۱۔ وہ لڑائی کو ناپسند کرتے تھے۔

۲۔ مجلسِ شوریٰ میں وہ حضورِ انور سے اس معاملہ میں مباحثہ کرتے تھے۔

۳۔ جنگ کی بات قافلہ سے ہٹ کر ان کے سامنے کھل کر آگئی تھی۔

۴۔ جنگ کے موضوع پر گفتگو میں ان کا انداز یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ان کو موت کے منہ میں جانا ہے۔

۵۔ نبوت نے وحی کے ذریعے سے ان کو تجارتی قافلہ اور فوجی لشکر دونوں کی خبر

دے کر کہا تھا کہ ایک میں کامیابی کا اللہ نے وعدہ کیا ہے۔
۶۔ رائے عام چاہتی تھی کہ تجارتی قافلہ ہے۔
قرآن کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ کو ناپسند کرنے والا صرف ایک چھوٹا سا طبقہ تھا۔ لیکن تجارتی قافلہ کا حاصل ہونا یہ سب کی آرزو اور خواہش تھی یعنی اول مرحلہ میں جب پیغمبر نے دو باتوں کی خبر دی تھی کہ تجارتی قافلہ بھی ہے اور فوجی لشکر بھی ہے اور خدا کا وعدہ ہے کہ ان میں جس میں تمہارا مقابلہ ہوگا، تمہاری کامیابی ہے' اس وقت تو دون غیر ذات الشوکہ حکم کی تعبیر بتا رہی ہے کہ بلا استثنا سب کی خواہش یہی تھی کہ تجارتی قافلہ ہاتھ آئے اور اس میں کامیابی ہو۔ اور یہ بات قرین قیاس بھی ہے کہ پہلے مادی طاقت مضبوط بنا لی جائے پھر مقابلہ کیا جائے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر سے پہلے جو سرایا روانہ کیے اور جو غزوات کیے ان کا بھی پس منظر یہی تھا اور مدینہ سے اسی قافلہ کو روکنے کے لیے دو سو مہاجرین کے ساتھ آپ عشیرہ گئے تھے اس کا بھی مقصد یہی تھا کہ ابوسفیان قافلہ لے کر شام جا رہا ہے اس کی ناکہ بندی کی جائے۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ قافلہ نکل گیا اور آپ واپس آگئے اور اسی قافلہ کی جب شام سے واپسی کی آپ کو اطلاع ملی تو آپ نے لوگوں کو ساتھ چلنے کی یہ کہہ کر دعوت دی کہ

قریش کا قافلہ سرمایہ سے لدکر واپس آرہا ہے اس کے لیے چلو،
شاید اللہ سبحانہ، وہ سارا سرمایہ تم کو مال غنیمت میں دے دے۔

اسی بنیاد پر اگر اختلاف کرنے والوں نے اختلاف کیا تو اس میں حیرت کی کون سی بات ہے۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ مقام صفراء میں پہنچ کر معلوم ہوا کہ تجارتی قافلہ جا چکا ہے اور اب باقاعدہ مشرکین کی فوج سے مقابلہ ہے آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا۔ کچھ نے اختلاف کیا لیکن بالآخر سب کا فیصلہ یہی ہوا کہ مقابلہ کیا جائے ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں جو واپس گیا ہو۔
لوگوں کی چاہت تجارتی قافلہ کی تھی۔ اور ضرور تھی اور نہ ہونے کی وجہ کیا ہے جب خود قرآن کہہ رہا ہے و تودون لیکن حالات نے پلٹا کھایا اور عالم غیب میں فیصلہ یہی ہوا کہ مقابلہ صرف فوجی لشکر سے ہو۔ کیوں؟ اس لیے کہ تکوینی طور پر عالم غیب

میں اللہ سبحانہ، کا ارادہ یہی ہوا اور اس لیے ہوا کہ حق کا بول بالا ہو اور باطل کا منہ کالا ہو۔ صحابہ کی چاہت کا تعلق عالم اسباب سے تھا جبکہ ارادۂ الٰہی کا تعلق عالم اسباب سے بالا عالمِ غیب سے تھا۔ جب صحابہ کو منشاءِ الٰہی معلوم ہو گیا تو سب بلا استثنیٰ جنگ کے لیے تیار ہو گئے۔

مولانا شبلی ہوں یا مولانا اصلاحی اور مولانا مودودی ہوں۔ ان کا اس باب میں قافلے کو حملہ کا ہدف تسلیم کرنے سے گریز کرنا اور قرآن کا سہارا لینا سراسر تکلف ہے۔ قریش اور مسلمانوں کے درمیان حالتِ جنگ قائم تھی اور حالتِ جنگ میں دشمن کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرنا قطعاً قابلِ طعن نہیں ہے اسے ڈاکہ اس وقت سمجھا جا سکتا ہے جب بے قصور ہوں اور لوٹنے والے حکومت نہیں خانگی افراد ہوں۔ ورنہ دو حکومتوں میں کشیدگی پر نہ صرف جان بلکہ مال و آبرو کے خلاف بھی ہر فریق دوسرے فریق کو نقصان پہنچانے کا حق رکھتا ہے۔ جن بزرگوں نے اس موضوع پر تکلفات فرمائے ہیں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ انہوں نے حقیقی صورتِ حال پیشِ نظر نہیں رکھی اور صرف اس خیال سے متاثر ہو گئے کہ کہیں مسلمانوں پر غارت گری کا الزام عائد نہ ہو جائے۔ لیکن پیش بندی کے طور پر دشمن کو نقصان پہنچانا اور اسے جنگ کے معاملہ میں بے دست و پا بنا دینا ہر اعتبار سے درست اور جائز ہے اور یہ سب سے نزدیک تدابیرِ جنگ میں سے ایک مؤثر تدبیر ہے الفتنۃ اشد من القتل اور الفتنۃ اکبر من القتل کا مطلب بھی یہی ہے۔

خدا جانے اس بدیہی حقیقت سے اعراض کیوں مناسب سمجھا گیا ہے۔ یہ غارتگری نہ تھی۔ ایک جانی دشمن کے عناد سے بر ی منصوبوں کو ناکام بنانے کی ایک مثبت اور پائدار کوشش تھی۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ قریشِ مکہ ان املاک پر قابض ہو گئے تھے، جو مسلمان چھوڑ کر آئے تھے۔ قریش کے حملے اور چھاپے جاری تھے۔ حالانکہ مسلمان نہ قریش سے لڑنے کے خواہاں تھے اور نہ کسی اور سے جنگ کرنا چاہتے تھے۔ قافلے پر حملہ جارحانہ اقدام نہ تھا بلکہ یہ سراسر دفاعی کارروائی تھی جو حالتِ جنگ کے دوران کی گئی۔ خود مولانا شبلی فرماتے ہیں:

قریش نے ہجرت کے ساتھ ہی مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ عبداللہ بن ابی کو انہوں نے خط لکھا کہ یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دو یا ہم آکر ان کے ساتھ تمہارا بھی کام تمام کر دیں گے۔ قریش کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں مدینہ کی طرف گشت لگاتی رہتی تھیں۔ کرز فہری مدینہ کی چراگاہوں تک آکر غارت گری کر گیا تھا۔

اس کے بعد مولانا فرماتے ہیں:

حملہ کے لیے سب سے بڑی ضروری چیز مصارفِ جنگ کا بندوبست تھا۔ اس لیے اب کے موسم میں قریش کا جو کاروانِ تجارت شام کو روانہ ہوا اس سر و سامان سے روانہ ہوا کہ مکہ کی تمام آبادی نے جس کے پاس جو رقم تھی کل کی کل دے دی۔ نہ صرف مرد بلکہ عورتیں جو کاروبارِ تجارت میں بہت کم حصہ لیتی ہیں ان کا بھی ایک ایک فرد اس میں شریک تھا۔[۱]

غور فرمائیے جب یہ قافلہ تجارتی صرف اس مقصد کے لیے جا رہا ہے کہ اس سے آئی ہوئی دولت اور سرمایہ سے قریش مدینہ میں حملہ کریں گے تو کیا دنیا میں معمولی سی سیاسی سوجھ بوجھ والا شخص سب سے پہلے جنگ میں کامیابی کے اس ذریعہ پر ضرب کاری ہی نہ لگائے گا۔ حضور اقدس اسی تجارتی قافلہ کو مکہ جانے سے روکنا چاہتے تھے۔ اور سب گھر سے اسی ارادے سے نکلے تھے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ مشیت ایزدی نے تجارتی قافلہ پر حملے کے بجائے جنگِ بدر کا سامان کر دیا جسے قرآن نے یوم الفرقان سے تعبیر کیا ہے۔

معذرت آمیز انداز کیوں؟

اصل میں کسی بھی معاملے کے متعلق معذرت آمیز انداز اختیار کرنا موقف کی کمزوری کی نشاندہی کرتا ہے۔ اور جب موقف ہی کمزور اختیار کیا جائے تو اسے دلائل کے زور سے اور الفاظ کی فراوانی سے مستحکم نہیں کیا جا سکتا۔ اور پھر موضوع کے بنیادی

---

[۱] سیرت النبیؐ

حقائق آفتاب جہان تاب کی طرح تاباں ہوں تو ان کی طرف سے آنکھیں بند کر کے معذرت کا پہلو اختیار کرنا سراسر حیرت افزا ہے۔

بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے تجارتی قافلہ کی مراجعت کے متعلق دستے روانہ کرتے رہے۔ ایسی ہی کوئی اطلاع پا کر آپ دریافت کر سکے کہ اس تجارتی قافلہ کا پیش منظر مدینہ پر حملہ کی تیاری سے آپ مدینہ منورہ سے نکلے۔ ادھر ابوسفیان جو تجارتی قافلہ کا سالار تھا بے خبر اور غافل نہ تھا۔ اسے بھی تشویش تھی کہ مسلمان اس کی تلاش میں ہوں گے۔ جو لوگ راستہ میں ملتے تھے ان سے پوچھ گچھ کے بعد اطمینان کے بغیر قدم آگے نہیں بڑھاتا تھا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ مسلمان راستہ کا چکر لگا رہے ہیں تو اس نے بدر پہنچنے سے پہلے ہی ضمضم غفاری کو مکہ مکرمہ روانہ کر دیا تاکہ قریش کو خبر کر دے کہ قافلہ خطرے میں ہے۔ اور اس کے بچاؤ کے لیے جو کچھ ہو سکے کر لیں۔

کوکبہ نبوت کی مدینہ سے روانگی

مدینہ منورہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے روانہ ہونے کی تاریخ ابن اسحاق کے مطابق ۸ رمضان المبارک ۲ھ مطابق ۴-۵ مارچ ۶۲۴ء ہے۔ دن دوشنبہ یعنی پیر کا تھا یہ بیان تقویم کے مطابق ہے۔ ابن سعد نے روانگی کی تاریخ ۱۲ رمضان المبارک ۲ھ ۸ مارچ بتائی ہے اور لکھا ہے کہ دن دوشنبہ کا تھا۔

اس سفر میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جن مقامات سے گزرے ان کی یہ تفصیل بتائی گئی ہے۔ عقیق، ذوالحلیفہ، اولات الجیش، تربان، ملل، غمیس الحمام، صخیرات الیمامہ، سیالہ، فج الروحاء، شنوکہ، عرق الظبیہ، سجسج، منصرف، النازیہ، وادی رحقان، صفراء، وادی ذفران۔ اسی مقام پر پہلی مرتبہ اطلاع ملی کہ قریش مکہ کا لشکر تجارتی قافلہ کی حفاظت کے لیے آرہا ہے۔ یہاں تک طائفتین میں سے صرف ایک پیش نظر تھا یعنی تجارتی قافلہ۔ دوسرے کے بارے میں یقینی طور پر کچھ معلوم نہ تھا۔ اب دونوں قافلے منظر عام پر آگئے تھے۔ جیسا کہ زیر تشریح آیت کہہ رہی ہے یعنی اذ یعدکم اللہ احدی الطائفتین انہا لکم ذفران ہی کی منزل میں وہ مجلس شوریٰ قائم ہوئی جس میں یہ

فیصلہ کرنا پڑا کہ تجارتی قافلے کے بجائے لشکرِ قریش سے مڈبھیڑ کی نوبت آتے تو کیا کرنا چاہیے۔

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روایت کے مطابق صفراء سے اور دوسری روایت کے مطابق مدینہ منورہ سے بسبس اور عدی کو تجارتی قافلہ کی خبریں لانے کے لیے بدر روانہ کیا۔ وہ بدر پہنچے۔ پانی کے پاس اونٹ بٹھائے اور مشکیزہ بھرنے لگے۔ اس اثنا میں دو لڑکیاں آئیں اور جھگڑتی ہوئی آئیں۔ ایک کا قرض دوسری کے ذمہ تھا۔ اور قرض خواہ تقاضا کر رہی تھی۔ دوسری نے جواب دیا کہ کل پرسوں قافلہ آنے والا ہے۔ میں ان کے پاس مزدوری کر کے تیرا قرض ادا کر دوں گی۔ مجدی ابن عمرو نامی ایک شخص وہیں تھا۔ یہ پہلے ہی قریش اور مسلمانوں کی لڑائیوں میں فیصلہ کرا چکا تھا۔ اس نے قافلہ کے آنے کی تصدیق کی۔ اور دونوں لڑکیوں کا جھگڑا ختم کر دیا۔ بسبس اور عدی کے لیے اتنی خبر کافی تھی اور یہی خبر انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچا دی۔

ان کے جانے کے بعد ابوسفیان بدر پہنچا اور مجدی سے دریافت کیا کہ کیا تم نے کسی کی آہٹ پائی ہے۔ مجدی نے بتایا کہ دو سوار آئے تھے اور اونٹ بٹھا کر انہوں نے پانی مشکیزے میں بھرا۔ ابوسفیان اونٹوں کے بیٹھنے کی جگہ پہنچا۔ مینگنیاں اٹھا کر بھر لہرائی۔ ان میں کھجور کی گٹھلیوں کے ریزے دکھائی دیے۔ یہ اہلِ مدینہ کے اونٹوں کا خاص چارہ تھا اسے یقین ہو گیا کہ مسلمان قافلہ کی تلاش میں ہیں۔ وہ تیزی سے قافلہ کی طرف لوٹا اور بدر سے اس کا رخ پلٹا کر اس راستہ پر چل دیا جو ساحلِ بحر کے ساتھ تھا یعنی بدر کو اس نے بائیں ہاتھ چھوڑ دیا۔

حکمتِ الٰہی کا فیصلہ

اب اللہ سبحانہٗ کی حکمت نوازی ملاحظہ ہو کہ پہلے دشمن کا ایک گروہ پیشِ نظر تھا یعنی قافلہ تجارت اور دوسرے کا گمان بے شک ہو گا لیکن اس کا وجود یقینی نہ تھا۔ پھر دونوں گروہ منظرِ عام پر آ گئے۔ اب پہلے گروہ یعنی قافلہ نے معمولی نشانِ خطرے کا دیکھ کر راستہ بدل لیا اور وہ منظرِ عام سے غائب ہو گیا۔ دشمن کا جو گروہ پہلے غائب تھا اور صرف اس لیے وجود پذیر ہوا تھا کہ قافلے کو گزند نہ پہنچنے دے وہ قافلہ کے سلامت نکل

جانے کے باوجود ابوجہل کے اصرار پر واپس نہ ہوا بلکہ دندناتا ہوا بدر آیا تاکہ اس پاس کے قبیلوں پر اپنا رعب جمائے۔ ان دو گروہوں میں سے ایک کے ہاتھ آنے کا خدائی وعدہ ایسے انداز میں پورا ہوا کہ جنگ بدر سے اسلامی تاریخ میں حق کی فتح اور باطل کی شکست و ریخت کا دروازہ کھل گیا۔

آیت پر دوبارہ نظر

آئیے ان آیات پر تاریخ و روایت کی روشنی میں ایک بار پھر نظر ڈال لیجئے۔ جدید شارحین قرآن اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ جنگ بدر کے بارے میں تاریخ و سیرت کی روایات کا بڑا حصہ قرآن کے خلاف ہے۔

قرآن کے خلاف کیا ہے؟

یہ کہ آپ جب مدینہ سے نکلے تو صرف قافلہ تجارت پر حملہ کرنا تھا دو چار منزل چل کر معلوم ہوا کہ قریش فوجیں لیے چلے آرہے ہیں۔ اس وقت اپنے مہاجرین و انصار کو جمع کیا کہ ان کا عندیہ دریافت فرمائیں۔

آئیے قرآن کی روشنی میں معلوم کریں کہ ان باتوں میں سے کون سی بات قرآن کے خلاف ہے۔ اتنی بات تو خود قرآن ہی بتا رہا ہے کہ تجارتی قافلہ اور مسلح لشکر دونوں کا مسلمانوں سے سابقہ تھا۔ اور یہ بھی قرآن ہی سے معلوم ہو رہا ہے کہ بلا امتیاز اور بلا استثنیٰ سب کا پیش نہاد تجارتی قافلہ تھا۔ یہ بات قرآن میں لتو ددن غیرذات الشوکہ سے معلوم ہو رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ پیش نہاد کب تھا اس کا جواب اس کے سوا اور کیا ہے کہ مدینہ سے خروج کے وقت تھا۔ اسی لیے قرآن نے اسے واذ یعدکم کے تحت لاکر بیان کیا ہے۔ اس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ مدینہ سے روانگی قافلہ تجارت کے لیے ہوئی تھی۔ اگر اس وقت فوجی لشکر کا کوئی تصور بھی ہوتا تو قرآن کی تعبیر یہ نہ ہوتی۔ کیونکہ اس صورت میں بلکہ مدینہ سے نکلتے وقت دونوں صورتیں موجود ہوں اور پھر صحابہ جانتے اور سمجھتے ہوئے کہ اللہ کی مرضی اور حکم یہ ہے کہ فوجی لشکر پر حملہ کیا جائے حکم عدولی کریں تو یہ ایک ایسا سنگین جرم ہوتا جس کے اظہار کے لیے صرف تو ددن غیر ذات الشوکہ کی تعبیر نہ ہوتی بلکہ احد کی طرح

کہا جاتا عصیتم من بعد ما اراکم ما تحبون منکم من یرید الدنیا ومنکم من یرید الآخرۃ ، لیکن قرآن کے اوراق کھلے ہوئے ہیں۔ قرآن نے اس موضوع پر کوئی تہدیدی انداز اختیار نہیں کیا۔ کہا تو صرف یہ کہا کہ تمہیں یہ پسند تھا کہ قافلہ ہاتھ آجاتے۔ یہ بھی صرف اظہارِ واقعہ ہے نہ کہ اظہارِ ناراضی، اور یہ اظہارِ واقعہ بھی اسی وقت دُرست ہو سکتا ہے جب پہلے تجارتی قافلہ کی خاطر گھر سے چلے ہوں۔ اور آگے چل کر ان کا فوجی طاقت سے سامنا ہو گیا ہو۔ اور یہ بھی قابلِ غور ہے کہ قرآن نے یہ بات مسلمانوں کی کسی ٹولی کے بارے میں نہیں فرمائی ہے بلکہ پوری جماعت کے بارے میں فرمائی ہے یعنی اس سے مستثنیٰ کوئی نہیں۔ اگر مدینہ ہی سے فوجی لشکر پیشِ نہاد تھا تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے۔ سب کے سب مقصدِ خداوندی یعنی یہ کہ حق کا بول بالا ہو سے ہٹ کر تجارتی قافلہ کو ترجیح دے رہے تھے۔ اس میں صرف اجل صحابہ نہیں بلکہ حضورِ انور بھی داخل ہوں گے۔ اور دوں کا پتہ نہیں میں تو اس تصور سے کانپ جاتا ہوں۔ آخر آپ کس قانون سے تودون ان غیر ذات الشوکۃ تکون لکم حکم کی زد سے کیسے بچائیں گے۔ یہ فکری آوارگی نہیں تو اور کیا ہے۔
اصل بات یہی ہے کہ

مدینہ سے سب کا پیشِ نہاد تجارتی قافلہ تھا۔ اسی لیے اس کی تیاری میں عام مستعدی نہیں ہوئی۔ جنگ کا کسی کو احساس تک نہ تھا۔ جب مدینہ سے نکل کر صفرا نامی جگہ میں پہنچے تو قافلہ ہی کی نگرانی کی خاطر فوجی قوت کا علم ہُوا۔ اسی موقعہ پر حضور نے فرمایا۔ اللہ کا نام لے کر آگے بڑھو۔ خدا نے مجھ سے دونوں گروہوں میں ایک کا وعدہ کیا ہے اذ یعدکم اللہ احدی الطائفتین۔ اور اسی موقعہ پر شوریٰ ہُوا۔ اور اسی شوریٰ میں کچھ نے یہ تاثر ظاہر کیا کہ ہم جنگ کی تیاری کر کے نہیں آتے۔ حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت مقداد اور حضرت سعد بن معاذ کی تقریروں نے رُخ بدل دیا۔ جن لوگوں نے جنگ نہ کرنے کا تاثر ظاہر کیا قرآن نے ان کا ذکر اس طرح کیا کہ وان فریقاً من المومنین لکارھون۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ لڑائی سے کراہت عین اس وقت ہو رہی تھی جب آپ مدینہ سے نکل رہے تھے بلکہ یہ حال مقدر ہے اور مقدرہ کی تعبیر اختیار ہی اس لیے کی گئی ہے کہ کراہت کا زمانہ خروج کے بعد ہے۔

بلاشبہ وہ اس موقعہ پر یہ معلوم ہوجانے کے باوجود کہ تجارتی قافلہ نکل چکا ہے اور اب فوجی لشکر سامنے ہے صحابہ کرام حضور اقدس سے بحث کر رہے تھے کہ ہم تیاری کر کے نہیں آئے۔ ہماری تعداد کم ہے ہمارے پاس سامان جنگ بھی نہیں ہے، قرآن نے اسی کی تصویر یجادلونک فی الحق بعد ما تبین میں پیش کی ہے۔ صحابہ کا یہ اختلاف حالات کے تحت تھا یعنی اس لیے تھا کہ فوجی اقدام کے لیے جس قسم کے وسائل کی ضرورت ہے وہ ہمارے پاس موجود نہیں ہیں۔ ابوایوب انصاری کے الفاظ ہیں واللہ مالنا طاقۃ بقتال القوم۔ بخدا ہم میں مقابلہ کی طاقت نہیں ہے لیکن جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

واللہ لکانی الان انظر مصارع القوم

بخدا میری نگاہیں دشمنوں کے قتل ہونے کی جگہ دیکھ رہی ہیں۔

توسب نے رائے بدل لی اور بے کسی اور بے بسی کے باوجود میدان جنگ میں جانے کے لیے تیار ہوگئے۔ اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو ایسا ہی سمجھتا ہوں کہ اس بے کسی کی حالت میں صحابہ کی طاعت کی اسی سرشاری کی تصویر قرآن نے ان الفاظ میں پیش کی ہے۔

کانما یساقون الی الموت وھم ینظرون۔

گویا انہیں موت کی طرف دھکیلا جارہا ہے اور وہ اپنی موت کو آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

ڈر اور خوف حالات کی وجہ سے تھا اور اس کے باوجود اقدام فرمانبرداری کی وجہ سے تھا کیسا بلیغ اور خوبصورت انداز ہے۔ یہی جواب تک تجارتی قافلہ پر نظر جمائے ہوئے تھے منشائے الٰہی معلوم ہونے کے بعد فوجی لشکر سے مقابلہ کے لیے تیار ہوگئے۔

یہاں معاً سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اس بے سروسامانی کی حالت میں انہوں نے کیا کیا۔ قرآن نے آگے اسی کا جواب دیا ہے کہ اسباب کو چھوڑ کر سب خالق اسباب کی طرف متوجہ ہوگئے اذ تستغیثون ربکم۔

إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُم بِأَلْفٍ مِّنَ
الْمَلَائِكَةِ مُرْدِفِينَ ۝٩ وَمَا جَعَلَهُ اللَّهُ إِلَّا بُشْرَىٰ وَ
لِتَطْمَئِنَّ بِهِ قُلُوبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِندِ اللَّهِ ۚ
إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝١٠

ع ١٠

جب تم اپنے پروردگار سے فریاد کر رہے تھے پس اس نے تمہاری فریاد کو شرف پذیرائی عطا کی۔ یہ کہہ کر کہ میں ایک ہزار فرشتوں سے کہ یکے بعد دیگرے آئیں گے تمہاری ضرور مدد کروں گا۔ [9] اور اللہ نے فرشتوں والی بات صرف اس لیے کی کہ تمہارے لیے خوشخبری ہو اور تاکہ تمہارے بے قرار دل مطمئن ہو جائیں، اور مدد تو ہر حال میں اللہ کی جانب سے ہوتی ہے کیونکہ وہی بلاشبہ سب پر غالب آنے والا اور حکمت والا ہے۔ [10]

جنگ میں کامیابی کی معنوی طاقت

جس معنوی طاقت کا اس آیت میں بیان ہو رہا ہے اس کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ فریقین کی مادی قوتوں کا پیش کر دینا ضروری ہے۔
حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام کی تعداد اس جنگ میں تین سو سے کسی قدر زیادہ تھی۔ یہ تعداد مختلف روایتوں میں تین سو پانچ سے تین سو انیس تک بتائی گئی ہے۔ ان میں مہاجرین ۷۴، یا ۷۷ تھے باقی سب انصار تھے۔ ان کے ساتھ دو گھوڑے اور ستر اونٹ تھے۔ گھوڑوں میں ایک مقداد کا دوسرا مرثد غنوی کا تھا۔ اس سلسلے میں زبیر بن العوام اور مصعب بن عمیر کے نام بھی آئے ہیں۔ ہر اونٹ کی سواری میں تین تین شخص شریک تھے اور باری باری سوار ہوتے تھے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے شریک مرکب علیؓ اور ابولبابہؓ تھے جن کو الروحا سے مدینہ منورہ میں قائمقام کی حیثیت سے واپس کر دیا تھا۔ دونوں نے حضور اقدس کی خدمت میں عرض کی کہ ہم خوشی سے پیدل چلیں گے آپ سواری فرمائیں۔ فرمایا نہ تم دونوں مجھ سے زیادہ پیادہ روی میں طاقتور ہو اور نہ میں ثواب حاصل کرنے میں بے نیاز ہوں۔
قریش کے لشکر کی تعداد کم از کم ساڑھے نو سو تھی اور ان کے ساتھ ایک سو گھوڑے تھے۔ اونٹوں کی کثرت کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ ہر منزل پر ۹ یا ۱۰ اونٹ ذبح کرتے تھے۔ زرہیں اور باقی ساز و سامان جنگ بھی ان کے پاس بہت زیادہ تھا۔
بلاشبہ مادی طاقت میں اہل ایمان اہل کفر کے مقابلہ میں کچھ نہ تھے۔ اس تقابلی مطالعہ پر سب پریشان اور خوف زدہ تھے کیونکہ ان کی حالت بڑی ہی بے بسی کی تھی قدرتی طور پر یہ لوگ ہراساں ہوئے۔ صحیح مسلم میں ہے حضرت عمر فرماتے ہیں کہ جب حضور نے ملاحظہ فرمایا کہ مسلمانوں کی افرادی قوت بہت کم ہے اور کافروں کی بہت زیادہ ہے تو قبلہ کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو گئے اس وقت حضور تہبند باندھے اور چادر اوڑھے ہوئے تھے اور دعا مانگنی شروع کی۔ اسی طرح اپنے پروردگار سے استغاثہ کرتے رہے اور دعا مانگتے رہے۔ یہاں تک کہ دوشِ مبارک سے چادر سرک گئی۔ حضرت ابوبکر نے چادر اٹھا کر پھر اوڑھا دی۔ اور ایک طرف سے حضور کو دبوچ

کہ عرض کیا یا رسول اللہ بس آپ کی دعا کافی ہو چکی۔ اللہ عنقریب اپنا وعدہ پورا فرمائے گا۔ سعد بن معاذ نے حضور اقدس کے لیے ایک ٹیلہ پر ایک سائبان سا بنا دیا تھا۔ ابوبکر حضور اقدس کے ساتھ تھے۔ سعد بن معاذ دروازے پر پہرہ دے رہے تھے۔

اہل ایمان کا جناب الٰہی میں استغاثہ

۸۔ جب تم اپنے پروردگار سے استغاثہ کر رہے تھے پس اس نے تمہاری فریاد کو شرف پذیرائی دیا۔ یعنی جب حکم الٰہی کے تحت بے بسی، بے کسی کی اور افرادی قوت نہ ہونے کے باوجود میدان جنگ میں طاعت کی سرشاریاں دکھانے کے لیے تیار ہو گئے تو مادی طاقت کی تلافی معنوی طاقت سے اس طرح کی کہ اللہ کی جناب میں اغثنا یا غیاث المستغیثین کہہ کر دعائیں مانگنے لگے۔ یہ انداز خطاب کہہ رہا ہے کہ یہ وہی ہیں جو قافلہ تجارت کا گھر سے ارادہ کر کے آئے تھے۔ اور ان میں کوئی بھی حرب زبانی نہیں کر رہا تھا نہ یہ دل کے غریب تھے، نہ عقل کے بودے تھے اور نہ احقاق حق کے تقاضوں سے ناآشنا تھے۔ ان کو پتہ تھا کہ نبوت کا مزاج کیا ہے اور اسلام کا مطالبہ کیا ہے۔ یہ حالات کے تحت بات کر رہے تھے۔ ظاہر ہی ہے کہ سب دعائیں کر رہے تھے سب رو رہے تھے اور سب اللہ سے مدد مانگ رہے تھے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں کہ جب صحابہ نے یقین کر لیا کہ لڑائی ضرور ہو گی تو انہوں نے اللہ سے دعا کی۔ لیکن احادیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ صرف اس لیے آیا ہے کہ آپ کی دعا کا والہانہ انداز سب کو مبہوت و حیران کر رہا تھا۔ سوچنے کی بات ہے کہ نصرت کا وعدہ ہو چکا ہے۔ آپ لوگوں کو کامیابی کی خوشخبری دے رہے ہیں۔ مگر باوجود وعدہ کے محض اس لیے کہ خدا خدا ہے بندہ نہیں ہے بے نیاز ہے سب اس کے محتاج ہیں وہ سب سے غنی ہے کیا معلوم وعدہ کب پورا کیا جائے گا۔ حضرت علی فرماتے ہیں:

> میں بدر کے دن لڑائی کے لیے میدان جنگ میں گیا واپس آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں پڑے ہوئے یا حی یا قیوم فرما رہے ہیں۔ پھر میں میدان جنگ میں گیا لڑا پھر واپس گیا تو میں نے حضور کو اسی حال میں دیکھا۔ (فتح الباری)

سجدے سے سر اُٹھایا جاتا ہے۔ آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھے ہوئے ہیں۔ تن بدن کا ہوش باقی نہیں ہے۔ کاندھوں سے چادر سرک کر گر گئی ہے لیکن کامل انہماک و استغراق دل کی ساری قوت و توجہ، اصرار و الحاح کے ساتھ زبان مبارک پر یہ الفاظ جاری ہیں۔

یا اللہ۔ آپ کو یاد دلاتا ہوں آپ کا عہد، آپ کا وعدہ، یا اللہ اگر آپ چاہیں تو آپ کی عبادت نہ ہو۔ یا اللہ اگر یہ جماعت تباہ ہو گئی اسلام والوں کی تو آپ کی زمین پوجا نہ ہو گی۔

وعدہ اور بشارت کے باوجود رب اور رب کی مدد کو جس بے کلی اور اضطراب سے بقول عبداللہ بن مسعود بدر میں آج تلاش کیا جا رہا ہے کہ

ہم نے اپنی گم شدہ چیز کو کوئی تلاش کر رہا ہو نہیں سنا اس طرح جس طرح حضور اقدس بدر کے دن اپنے رب سے نصرت تلاش کر رہے تھے۔

مالک کے قدموں پر اس لوٹنے والے کو دیکھ دیکھ کر دوسروں سے رہا نہیں جاتا ہے جیسا کہ بخاری میں ہے تب ابو بکر نے آپ کا دستِ مبارک پکڑ لیا اور کہا کہ بس کیجئے یا رسول اللہ۔ تفصیل مسلم میں ہے۔

آئے ابو بکر اور آپ کی اتری ہوئی چادر کو آپ کے اوپر ڈال دیا۔ پھر آپ سے لپٹ گئے اور فرمارہے تھے اے اللہ کے نبی ضرور پورا کرے گا آپ سے کیا ہوا اپنا وعدہ۔

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ مواقع دو ہیں اور دونوں میں شخصیتیں دو ہیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ پہلا موقعہ ہجرت کا ہے غارِ ثور میں دوسرا موقعہ بدر کا ہے عریش میں۔ ہجرت کے موقعہ پر غارِ ثور میں ابو بکر ڈر رہے ہیں غمگین ہو رہے ہیں اور حضور اقدس ابو بکر کو لا تحزن ان اللہ معنا کہہ کر تسلی دے رہے ہیں۔ حضور مطمئن اور ابو بکر بے چین و بے قرار ہیں لیکن یہاں ابو بکر مطمئن ہیں اور حضور اقدس پر اضطراب اور بے قراری کی کیفیت طاری ہے۔ اور حضرت ابو بکر یہ کہہ کر حضور کو تسلی دے رہے ہیں بس کیجئے آپ سے کیا ہوا وعدہ ضرور پورا کرے گا۔

علامہ خطابی فرماتے ہیں کہ:

یہ وہم بھی نہ ہونا چاہیے کہ اللہ پر اعتماد کی دولت اس وقت حضور کے مقابلہ میں حضرت ابوبکر کے پاس زیادہ تھی۔ بلکہ اصل واقعہ یہ ہے کہ حضور اضطراب اور بے چینی کا باعث صحابہ کی شفقت تھی۔ آپ چاہتے تھے کہ ان میں معمولی قوت آ جائے کیونکہ صحابہ مادی قوت سے تہی دامن تھے۔ اور یہ اسلامی زندگی میں جنگ کا پہلا موقعہ تھا اس لیے آپ نے دعا میں زیادہ توجہ اور خیال سے کام لیا۔ جب حضرت ابوبکر نے فرمایا کہ اے اللہ کے پیغمبر بس کیجیے تو آپ کو ابوبکر کی طمانیت اور قوت سے پتہ لگ گیا کہ مقصد حاصل ہو گیا اس لیے آپ نے فرمایا سیھزم الجمع۔ اور ابن اسحاق کی روایت میں ہے کہ آپ نے ابوبکر ہی سے مخاطب ہو کر فرمایا ابشر یا ابابکر اتاک نصر اللہ ابوبکر بشارت ہو اللہ کی مدد آ گئی۔

علامہ السید رشید رضا نے یہاں عجیب نکتہ آفرینی کی ہے وہ بھی گوش گزار فرمالیجیے:
دونوں مقام ہجرت اور بدر الگ الگ ہیں اور دونوں کے تقاضے جدا جدا ہیں۔ ہجرت کے لیے جب آپ مکہ سے نکلے تو آپ نے اپنے بچاؤ کے لیے اسباب و وسائل کی حد تک سب کی تکمیل فرمائی تھی زادِ راہ لے لیا، دو اونٹنیاں فراہم کر لیں۔ راستہ بتانے کے لیے راہبر لے لیا۔ رات کی تاریکی میں کاشانہ مبارک سے نکل کر چھ میل کے فاصلہ پر غار ثور میں چھپ گئے۔ نشانِ قدم ختم کرنے کے لیے ابوبکر نے کندھوں پر بٹھا لیا۔ غار میں آپ نے چھپ کر تین دن اور تین راتیں گزاریں۔ گویا مکہ سے نکلنے کی ساری تدبیریں کر لی گئیں۔ یعنی

۱۔ حضرت ابوبکر نے پہلے سے دو سانڈنیاں ہجرت کے لیے تیار کر لی تھیں۔
۲۔ مکہ مکرمہ سے جنوب کی جانب سفر اس لیے اختیار کیا کہ یثرب شمال میں تھا۔ اور اس کی طرف جانے والے تمام راستے شمال ہی کی طرف جاتے تھے لہٰذا پیچھے آنے والے لوگ ان ہی راستوں کے آس پاس سرگرم تلاش ہوتے۔
۳۔ اغلب ہے کہ غارِ ثور میں پناہ لینے کا فیصلہ بھی پہلے کر لیا ہو گا۔
۴۔ حضرت ابوبکر نے اپنے بیٹے عبداللہ کو اس کام پر مامور کر دیا تھا کہ دن بھر قریش کی باتیں سن کر جو کچھ ضروری سمجھے رات کے وقت غار میں آ کر بتا دے۔

۵۔ حضرت اسماء رات کی تاریکی میں کھانا پہنچاتی تھیں۔
۶۔ عامر بن فہیرہ حضرت ابو بکر کے آزاد کردہ غلام تھے ان کو تاکید کر دی گئی تھی کہ دودھ والی بکریاں روک رکھیں اور رات کے وقت ان کو غار کے دہانے پر لے آیا کرے۔
۷۔ صبح کے وقت عامر بن فہیرہ بکریوں کا ریوڑ دہانہ غار سے دُور تک مکہ کی طرف لے جاتے تھے تاکہ کسی آنے والے کے پاؤں کا نشان باقی نہ رہے۔
۸۔ ایک شخص عبداللہ بن اریقط کو رہبری کے لیے پہلے سے مقرر کیا تھا۔
گویا مادی اسباب میں سے سب کی پابجائی کر لی تھی اور اب نتیجہ اللہ پر چھوڑ دیا تھا اسی کا نام توکل ہے۔ اللہ سبحانہ نے آپ کو اطمینان، سکینہ سے مالا مال فرمایا۔ اور ارواحِ ملائکہ سے آپ کو قوت دی۔ ابو بکر چونکہ اس مقام پر نہ تھے اس لیے غمگین تھے۔
بدر کے روز معاملہ بالکل برعکس تھا۔ جنگ میں وہ اسباب و وسائل بالکل ناپید تھے جن کے بل بوتے پر کامیابی ہوتی ہے۔ نہ افرادی قوت تھی اور نہ سامان خوراک تھا۔ اور نہ ہی اسلحہ تھا نہ ہی سواری تھی اور کسی کمک کے آنے کی کوئی توقع نہ تھی۔ مدینہ سے کسی تیاری کے بغیر صرف چالیس آدمیوں کے مقابلہ کی نیت سے نکلے تھے۔ حالات نے رُخ پلٹا اور ایک لشکر کا سامنا کرنا پڑ گیا۔ مادی اسباب کے ساتھ معنوی قوت بھی مفقود تھی۔ خود پڑھ چکے ہو ان فریقاً من المومنین لکارھون۔ ان حالات میں ہلاکت کا یقینی خطرہ تھا۔ معنوی اور مادی اسباب کے فقدان نے اسے یقینی بنا دیا تھا۔ آپ پر بے تابی، بے قراری اور اضطراب و خوف کی کیفیت طاری تھی۔ ایسا نہ ہو کہ مختصر سی جماعت ختم ہو کر رہ جائے۔ حضرت ابو بکر کو ان حالات کا علم نہ تھا۔ آپ نے حضور کو غمگین، پریشان اور بے چین و بے قرار دیکھ کر آپ کو تسلی دی۔ اور اللہ سبحانہ کا وعدہ یاد دلایا۔
حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے موقعہ پر توکل اور بدر میں خوفِ الٰہی کا مظاہرہ کیا۔ دونوں مقام پر شانِ نبوت نمایاں طور پر نظر آ رہی ہے۔ ہجرت میں اسباب کی پابجائی کے بعد اللہ پر نظر تھی اور بدر میں اللہ کے قانونِ اجتماعی کے پیش نظر خوف، اضطراب کام کر رہا تھا۔
اب اس خلش کی کوئی گنجائش نہیں رہی کہ جب اللہ سبحانہ کی طرف سے فتح و نصرت

کا وعدہ تھا تو اضطراب کیوں تھا۔ بات صاف ہے کہ اللہ سبحانہٗ کی جانب سے بے شک تھا لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر اللہ سبحانہٗ کی شانِ استغنا اور بے نیازی پر تھی کہ مالکِ مطلق ہے جو چاہے کر ڈالے۔ مقامِ عبدیت کا ادب یہی ہے کہ باوجود وعدہ حق کے اس سے ڈرتا رہے اور یہ سمجھتا رہے کہ کوئی چیز کسی حال میں اس پر واجب نہیں ہے۔ بندہ کا کام مانگنا ہے وہ جو کچھ عطا فرماتے وہ اس کا فضل و انعام ہے۔
شاہ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ حضور اقدس کا اس طرح والہانہ دعا مانگنا اس لیے نہیں کہ ان کو اللہ کے وعدے پر یقین نہیں بلکہ اس لیے ہے کہ ان پر اللہ سبحانہٗ کی شانِ استغنا کا خوف غالب تھا۔

دعا قبول ہوئی اور آپ میدانِ جنگ میں تشریف لاتے اور آکر بتایا کہ یہاں مشرکینِ مکہ کے رؤسا کی قتل گاہیں ہیں اور نام بنام ہر ایک کی قتل گاہ بتائی۔ بتانے والے بتاتے ہیں کہ جو جس کی قتل کی جگہ بتائی گئی وہیں وہ قتل کیا گیا۔

افرادی قوت کی تلافی

۹۔ یہ کہہ کر کہ میں ایک ہزار فرشتوں سے کہ یکے بعد دیگرے آئیں گے تمہاری ضرور مدد کروں گا۔ اسی طرح کی آیت آلِ عمران میں پارہ چہارم کے ربع اول پر گزر چکی ہے وہاں کے فوائد ملاحظہ کر لیے جائیں۔ البتہ اُس جگہ فرشتوں کی تعداد تین سے پانچ ہزار تک بیان کی گئی تھی۔ اگر واقعہ ایک ہے تو کہا جائے گا کہ اوّل ایک ہزار کا دستہ آیا ہوگا۔ پھر اس کے پیچھے دوسرے دستے آتے ہوں جن کی تعداد تین سے پانچ ہزار تک پہنچی شاید لفظ "مردفین" اسی طرف اشارہ ہو[۱]
یہ دعا کی قبولیت کے نتیجے میں پہلا انعام ہے۔ مسلمانوں کے پاس افرادی قوت کی کمی تھی۔ سب سے پہلے اس کی تلافی کی گئی کہ تم تین سو ہو اور تمہارے مقابلہ پر کفر کی طاقت ایک ہزار ہے۔ ہم اس کی تلافی اس طرح کرتے ہیں کہ تمہیں ایک ہزار فرشتوں کی امداد روانہ کرتے ہیں۔ اور ان کے ظاہر ہونے کی یہ شکل بتائی کہ ان کے دستے

---

[۱] افاداتِ شیخ الاسلام

کے بعد اوپر کے بعد پرے آئیں گے ۔ میدانِ جنگ میں فوجیوں کا یہ خاص نفسیاتی علاج ہے کہ جب امداد کے لیے کمک کے بعد کمک آرہی ہو تو فوجیوں کا حوصلہ ہر کمک کی آمد پر دُونا ہوجاتا ہے اور اسی اعتبار سے مدِ مقابل کے اعصاب ڈھیلے پڑجاتے ہیں پیچھے چوتھے پارہ میں پڑھ آئے ہو ۔

اذ تقول للمؤمنین الن یکفیکم ان یمدکم ربکم بثلاثۃ الاف من الملائکۃ منزلین

کیا تمہارے لیے یہ بات کافی نہیں ہے کہ اللہ سبحانہ نے تمہاری تین ہزار نازل کردہ فرشتوں سے مدد کرے ۔

اور اس کے آگے ہے :

بلیٰ ان تصبروا وتتقوا ویاتوکم من فورھم ھذا یمددکم ربکم بخمسۃ الاف من الملائکۃ مسومین ۔

ہاں اگر تم صبر کرو گے اور تقویٰ اختیار کرو گے اور دشمن کا تم پر فوری حملہ ہوگا تو تمہارا پروردگار تمہاری پانچ ہزار نشان والے فرشتوں سے مدد کرے گا ۔

یہاں ایک ہزار اور وہاں تین اور پانچ ہزار فرشتوں کی امداد بدر ہی میں آئی ہے یا کسی اور جگہ ۔ حافظ ابن القیم نے زاد المعاد میں لکھا ہے کہ تین اور پانچ ہزار والی امداد میں شارحینِ قرآن دو رائے پر ہیں ۔

ایک یہ کہ یہ اُحد میں ہوئی ہے اور یہ امداد مشروط تھی ، شرط پوری نہ ہوئی ، امداد بھی نہیں آئی ۔ یہ مشہور مفسر ضحاک اور مقاتل کی رائے ہے ۔

دوسرے یہ کہ یہ بدر کے دن کی بات ہے ۔ یہ عبداللہ ابن عباس ، مجاہد اور قتادہ کا خیال ہے ۔ ان کا موقف یہ ہے کہ لوگوں نے اللہ سے دُعا مانگی تو اللہ سبحانہ نے فرشتوں کی امداد تدریجی طور پر دی ، اوّل ایک ہزار پھر تین ہزار اور پھر پانچ ہزار حافظ ابن کثیر نے بھی بڑے بڑے تابعین کے حوالہ سے دونوں باتیں لکھی ہیں ۔ حسن بصری ، عامر الشعبی ، ربیع ابن انس کہتے ہیں کہ تین اور پانچ ہزار والی بات حضور نے بدر والے دن فرمائی تھی ۔ بہر حال کچھ ہو دونوں میں یہ فرق ضرور ہے کہ

ہزار والی امداد غیر مشروط ہے جب کہ تین اور پانچ والی بات مشروط ہے

فرشتے بدر میں کیوں آئے ؟

۱۰۔ اور اللہ نے فرشتوں والی بات صرف اس لیے کی کہ تمہارے لیے خوشخبری ہو اور تاکہ تمہارے بے قرار دل مطمئن ہو جائیں ، اور مدد تو ہر حال میں اللہ کی جانب سے ہوتی ہے وہی بلاشبہ سب پر غالب آنے والا اور حکمت والا ہے ۔ اس آیت میں نفی و استثناء کے ذریعے قصر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی امداد صرف اس لیے روانہ کی ہے کہ

۱۔ مسلمانوں کو خوشخبری ہو کہ اللہ نے جس نصرت کا وعدہ فرمایا تھا وہ آگئی ۔

۲۔ افرادی قوت کے اضافہ سے مسلمانوں کے دلوں میں جو بے چینی اور بے قراری ہو رہی تھی وہ اطمینان و سکینت سے تبدیل ہو ۔

مطلب یہ ہے کہ ملائکہ کی امداد کی غرض و غایت یہی ہے اس کے سوا کچھ نہیں ہے لڑائی کی فتح مندی میں فرشتوں کا یہی حصہ تھا ۔ چنانچہ محققین تفسیر و حدیث کی رائے بھی ہے کہ فرشتوں کا نزول مسلمانوں کے دلوں کو مضبوط رکھنے کے لیے ہوا تھا ۔ اور حضرت عمرؓ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مادی طور پر بھی صحابہ کو ملائکہ کے ساتھ ہونے کا یقین تھا ۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں بدر والے دن بلاریب فرشتے ہمارے ساتھ تھے ۔ یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ملائکہ کے ذریعے مسلمانوں میں افرادی قوت کا اضافہ کیا گیا تھا ۔ لیکن لڑائی میں صحیح روایات میں ملائکہ کی شرکت ثابت نہیں ہے اور نہ اس کی ضرورت پیش آئی ۔ اگرچہ علماء کی رائے یہ بھی ہے کہ ملائکہ نے قتال بھی کیا ہے لیکن اس کی تائید صحیح روایات سے نہیں ہوتی ہے ۔

آخر میں ارشاد ہے وما النصر الا من عند اللہ مدد تو صرف اللہ کی ہے مطلب یہ ہے کہ اسباب مادی ہوں یا معنوی ان پر آسرا نہ ہونا چاہیے ۔ سہارا تو اللہ کی نصرت اور امداد پر ہونا چاہیے اس لیے دعا و طلبگاری میں اسی کی طرف متوجہ ہونا چاہیے نہ کہ ان وسائل کی طرف ۔ حضرت مولانا اشرف علیؒ کا بیان القرآن میں استنباط لطیف ہے کہ یہ آیت اس بات کی واضح دلیل ہے کہ باوجود اسباب ، غیر موثر ہونے اور مسببات کے

منجانب اللہ ہونے کے پھر بھی اسباب میں حکمتیں ہیں۔ اسباب پر عمل پیرا ہو لیکن خالق اسباب سے نظر نہ ہٹے۔ دیکھ لیجئے اسی جنگ بدر میں خالق اسباب کی طرف اتنا انہماک یعنی کامیابی کا حقیقی اور واقعی اختیار جس کے قبضے میں ہے اس سے مانگنے میں اس قدر زور صرف ہو رہا ہے کہ دیکھنے والے آپ کی بے قراری سے بے قرار ہو رہے ہیں اور دوسری طرف اسباب کی طرف اتنی توجہ کہ اللہ سبحانہ جنگ میں جن وسائل سے کامیابی عطا فرماتے ہیں ان وسائل کے اختیار کرنے میں اب کوئی دقیقہ نہیں چھوڑ رہے ہیں۔ میدان جنگ میں بہترین موقع کا انتخاب فوج کی صف بندی، صفوں کی ترتیب، اسلحہ کے استعمال میں ترتیب، تیر کب چلائیں، تلوار کب استعمال کی جائے، پتھروں اور ڈھیلوں سے ان پر کس وقت حملہ کیا جائے۔ ہر ایک کا ایک خاص فاصلہ مقرر کر دیا۔ دشمن کی ہر حرکت و سکون کی نگرانی۔ یہاں تک کہ دست مبارک میں خود تیر لے کر صفوں کو درست فرما رہے تھے۔ اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ جو پیدا کر رہا ہے اس سے بھی مانگا جائے اور جن راہوں اور وسائل سے کامیابی آتی ہے ان کی بھی پاسبانی کی جاتے۔ تعلیم کی یہی جامعیت اسلام کی خصوصیت ہے اسلام کو الدین القیم قرار دیتے ہوئے قرآن میں ارشاد ہے،

فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا لا تبدیل لخلق اللہ

اللہ کی فطرت جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے اللہ کی تخلیق کو بدل دینا نہیں ہے۔

اس کا مطلب یہی کہ اللہ کی مملکت میں اللہ نے کامیابی کے جو قوانین بنا دیے ہیں اسلام ان میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا۔

ولتطمئن قلوبکم سے یہ بھی مترشح ہو رہا ہے کہ طبعاً تسلی اسباب ظاہری سے ہوتی ہے۔ تدبیریں دو نوں ہیں دعائی تدبیر اور عقلی تدبیر۔ بدر میں کامیابی کے لیے دونوں تدبیریں اختیار کی گئیں۔ عقلی تدبیر یہ کہ جنگ سے پہلے رات کے وقت لشکر اسلام کو قطاروں میں تقسیم کر کے باقاعدہ صف بندی کی۔ اس کے بعد ان کا معائنہ کیا اور جہاں آگے پیچھے کوئی نظر آیا اسے درست کیا۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے فوج کے مختلف حصوں پر افسر متعین فرمائے اور ان کے الگ الگ علمبردار بھی مقرر کیے۔ پھر فوج کو ہدایات دیں اور نصیحت فرمائی کہ صف بندی نہ توڑیں جب تک حکم نہ ہو لڑائی شروع نہ کریں۔ دشمن

دُور ہو تو تیر نہ چلائیں نزدیک آئے تو تیر چلائیں اور قریب آئیں تو پتھر ماریں اور زیادہ نزدیک آئیں تو تیروں سے رد کریں۔ اور سب سے آخر میں تلوار نکالیں۔ یہ تھی عقلی تدبیر۔ اس کے ساتھ اپنے دعائی تدبیر فرمائی۔ یہ آپ پہلے پڑھ چکے کہ آپ نے کس قدر توجہ الحاح اور اضطراب سے دُعا مانگی۔

یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ تدبیریں دونوں ہیں دعائی بھی اور عقلی بھی لیکن چونکہ دُعائی تدبیر میں مانگنا صرف ایک سے جا رہا ہے جیسا کہ وما النصر الا من عند اللہ میں بتایا ہے۔ اور عقلی میں جن ذرائع اور وسائل سے کامیابی آتی ہے وہ بے شمار ہیں اور انسان کی نگاہ زیادہ ان ہی وسائل پر پڑتی ہے اس لیے اسلام نے زیادہ اہمیت دُعائی تدبیر کو دی ہے۔ قرآن میں

ولله غيب السماوات والارض واليه يرجع الامر كله فاعبده وتوكل عليه

آسمان و زمین کی پوشیدہ چیزیں اللہ کی ہیں سارا معاملہ اللہ کی طرف سے پس اسی کی عبادت کرو اور اسی پر بھروسہ کرو۔

اس کا یہی مطلب ہے کہ عقل سے تم زیادہ سے زیادہ کامیابی کے ان ہی قوانین کو معلوم کر سکتے ہو جو تمہارے حواس اور عقل کی گرفت میں آ سکتے ہیں لیکن عالمِ غیب کے قوانین کا وہ حصہ جو تمہاری حواس اور ادراک سے بالا ہے۔ اس کے متعلق تم اس کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتے کہ اللہ سے مانگتے جاؤ اور اسی پر بھروسہ کرو۔ گویا عقل و حواس کی راہوں سے جو معلومات حاصل ہو سکیں ان کا تقاضا پورا کرنے کے بعد اللہ پر اعتماد کرو۔ وہ آخری پناہ ہے۔ وہی مختارِ کل ہے۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے پر سہارا کرنے والوں کو بے سہارا چھوڑ دے۔ من يتوكل على الله فهو حسبه کا یہی مطلب ہے۔

بہرحال اس آیت دُعائی تدبیر کا سب سے پہلا نتیجہ یہ بتایا ہے کہ ایک ہزار فرشتوں کی تدریجی کمک سے غزوہ بدر میں مسلمان فوج کی افرادی قوت میں اضافہ کیا گیا۔ یہ تو حسی طور پر آنکھوں سے نظر آ رہی تھی اور معنوی طور پر اس محسوس کا فائدہ یہ ہوا کہ بے چین اور مضطرب دلوں میں اطمینان ہو کر غلبہ اور فتح کی توقعات بشارت بن کر سامنے آ گئیں۔ گویا یہ دُعائی تدبیر کا پہلا نتیجہ ہے۔

إِذْ يُغَشِّيكُمُ النُّعَاسَ أَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُم مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً لِّيُطَهِّرَكُم بِهِ وَيُذْهِبَ عَنكُمْ رِجْزَ الشَّيْطَانِ وَلِيَرْبِطَ عَلَىٰ قُلُوبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْأَقْدَامَ ﴿١١﴾

وہ وقت یاد کرو جب اللہ سبحانہ نے چین کی خاطر تم پر غنودگی طاری کر دی تھی۔ [11] اور آسمان سے تم پر پانی برسا دیا تھا، کہ تمہیں پاک و صاف ہونے کا موقعہ عطا کرے، اور تم سے شیطان کی گندگی کو دُور کر دے اور تا کہ تمہارے دلوں کو مضبوط کر دے اور تا کہ تمہارے قدم جما دے۔ [12]

دُعائی تدبیر کے مزید نتائج

اس آیت میں دُعائی تدبیر کے دو محسوس نتائج کی رونمائی فرمائی ہے ایک یہ کہ ساری گھبراہٹ اور ساری بے قراریوں کے باوجود اللہ نے تمہیں نیند کی نعمت عطا فرمائی۔ جس پر نیند غالب ہو اسے خوف کا احساس نہیں ہوتا اور جو ڈرتا ہے اسے نیند نہیں آتی ہے۔ معرکہ جنگ وہ مقام ہے جہاں بڑے بڑے بہادروں کی آنکھ سے نیند اُڑ جاتی ہے مگر مایۂ تسکین عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعائی تدبیر کا اعجاز یہ تھا کہ بدر کے کارزار میں مسلمان سپاہیوں کی

بے خطری اور بے خوفی کے لیے ان کی آنکھوں پر نیند کا غلبہ کر دیا گیا تاکہ کسی خوف و خطر کا احساس کیے بغیر وہ اپنے فرض کو انجام دیں۔ دوسرا یہ کہ بدر کے میدان میں جہاں مسلمانوں نے صفیں قائم کی تھیں وہ جگہ بلند تھی اور جہاں سے قریش کی فوج لڑ رہی تھی وہ جگہ نشیب میں تھی۔ اللہ سبحانہ نے کفار کی شکست کا ایک ظاہری سامان پیدا کر دیا کہ عین اس وقت میدانِ جنگ میں موسلادھار بارش ہو گئی۔ جس نے ادھر تو مسلمانوں کی طرف کی گرد و غبار بٹھا کر مسلمانوں کے پاؤں جما دیے اُدھر کافروں کی طرف پانی کا ریلا چلا گیا کہ ان کو زمین پر قدم رکھنا مشکل ہو گیا۔ آج کل فنِ جنگ میں جس بات پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ سپاہیوں کی سپرٹ یعنی معنوی قوی درست رکھے جائیں۔ یہاں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ صرف اس بات نے کہ پانی کی ضرورت باقی نہیں رہی، ریت میں دھنسنے کا خطرہ جاتا رہا اور نہانے دھونے کی وجہ سے جسم میں تازگی آ گئی۔ لوگوں کے اندر جس درجہ خود اعتمادی اور سرگرمی پیدا کر دی ہو گی اس کا اندازہ صرف اہلِ نظر ہی کر سکتے ہیں۔

بعض اوقات قدرتی حوادث کا ایک معمولی سا واقعہ بھی فتح و شکست کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ میجر جنرل محمد اکبر خاں نے لکھا ہے کہ ۱۹۳۷ء میں برطانوی فوج آزاد قبائل میں فقیر ایپی کے خلاف یورش کرتی ہوئی مقام گرام تک پہنچ گئی۔ مئی کا مہینہ تھا کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس ماہ میں بارش ہو سکتی ہے۔ فوج نے نالہ کے بہاؤ کی زمین فوج کے پڑاؤ کے لیے اس لیے تجویز کی تھی کہ یہاں فوج کے لیے جگہ کافی ہے اور پھر یہاں قبائلیوں کے شبخون سے محفوظ تھا۔ انگریزی فوج کی نفری چالیس ہزار سے زیادہ تھی اور ہر قسم کے اسلحہ سے مسلح تھی۔ قبائلیوں کے پاس صرف رائفل تھی۔ پڑاؤ کے بعد فوج کے برطانوی کمانڈر نے فقیر ایپی کے پاس پیغام بھیجا کہ اب بھی موقعہ ہے ہتھیار ڈال دو ورنہ تباہ کر دیے جاؤ گے۔ فقیر ایپی کی مدد مسعودی قبیلہ کر رہا تھا جس کی تعداد چار سو سے کم تھی۔ فقیر ایپی نے برطانوی فوج کو کہلا بھیجا کہ میرا پروردگار اللہ ہے۔ میں آخری دم تک لڑوں گا۔ جب فوجی افسروں کی کانفرنس میں فقیر ایپی کا جواب سنایا گیا تو سب لوگ ہنس پڑے۔ شرکائے کانفرنس کمانڈر سے حملہ کے احکام حاصل کر کے اپنے اپنے خیموں کو واپس ہو رہے تھے کہ آسمان پر دفعۃً ایک

بدلی نمودار ہوئی۔ جب اس میں سے گرج کی آواز آئی تو سب خوش ہوئے کہ اب گرمی کی شدت کم ہوگی اور موسم خوشگوار ہو جائے گا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اولے پڑے اور تھوڑی دیر میں ژالہ باری نے اتنی شدت اختیار کی کہ تمام پہاڑ سفید ہو گئے۔ پھر بارش آئی اور اتنی تیز آئی کہ اولے بہہ کر ایک ٹیلہ کی صورت میں ہمارے کیمپ کی طرف بڑھے۔ اور جو خیمے نشیب میں تھے ان کو سیلاب بہا کر لے گیا۔ پھر یہی نہیں کہ اس سیلاب سے فوج کو نقصان ہوا اور حرب و ضرب سے لے کر رسد تک کا سامان ضائع ہو گیا بلکہ بہت سا سامان بہہ کر فقیر ایپی کے کیمپ کی طرف چلا گیا جو دریا کے بہاؤ کی جانب تھا اور قبائلیوں کے ہاتھ آیا۔

اس کے نتیجہ میں برطانوی کمانڈر کو مجبوراً حملہ ملتوی کرنا پڑا۔ اسی قسم کی دشواریاں بدر میں بارش سے قریش کے لشکر کو بھی پیش آئیں۔ ان کے باربردار اونٹ دلدل میں پھنس گئے۔ نقل و حمل دشوار ہو گیا۔

میدانِ کارزار میں نیند کا آنا

اا۔ وہ وقت یاد کرو جب اللہ سبحانہٗ نے چین کی خاطر تم پر غنودگی طاری کر دی۔ نیند اطمینان و راحت کا ذریعہ بھی ہے اور دل کے اطمینان اور دماغ کی یکسوئی کی نشانی بھی۔ جس کا ذہن پریشان اور دماغ منتشر ہو اس کی نیند اڑ جاتی ہے۔ اور ایسے شخص کے لیے کوئی کام عزم و حوصلہ اور استقلال و عزیمت کے ساتھ ممکن نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے دورانِ جنگ فوج کے لیے سونے کا موقعہ ملنا اور اس موقعہ سے فائدہ اٹھانا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ نیند کی اسی اہمیت کے پیش نظر دشمن فوج کے حوصلے پست کرنے کی ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ اس کو سونے کا موقعہ نہ دیا جائے یہ اللہ کا بڑا ہی فضل ہے کہ کسی فوج کو سونے کا موقعہ مل جائے اور وہ اس سے فائدہ اٹھا سکے۔ کیونکہ اس سے فائدہ اٹھانا صرف موقعہ ملنے ہی پر نہیں بلکہ اس کا بہت کچھ انحصار سونے والے کی ذہنی و قلبی صلاحیت پر بھی موقوف ہے۔

النعاس امنۃ کا مطلب یہ ہے کہ ایسی غنودگی طاری کر دی گئی جو امن و سکون والی تھی اور جس سے مسلمانوں کا خوف و ہراس اور ہر قسم کی پریشانی اور خطرات دور

ہو گئے اور سارا غم غلط ہو گیا۔

بدر میں یہ نیند کس وقت آئی۔ کچھ کی رائے میں یہ عین میدان جنگ میں آئی۔ لیکن دلائل نبوت میں حضرت علی کا بیان ہے کہ بدر کی پہلی رات کوئی نہ تھا جو آرام سے سو نہ گیا ہو، ہاں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم رات بھر عبادت کرتے رہے۔ اور سب جانتے ہیں کہ جس کے دل میں خوف و خطر ہو وہ کبھی آرام سے سو نہیں سکتا۔ اس نیند کا طاری ہونا بے خوفی کا القا تھا۔

قرآن کا انداز بتا رہا ہے کہ نیند کا معاملہ جنگ سے پہلے عمل میں آیا کیونکہ نیند کا ذکر ان انعامات کے سلسلے میں ہو رہا ہے جو بالفعل جنگ شروع ہونے سے پہلے ظہور میں آئی ہیں۔ پہلے فرشتوں کی امداد کی بشارت ہے۔ بعد کی آیت بارش کے نزول کا ذکر ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ دونوں باتیں جنگ سے پہلے ہوئی ہیں۔ پھر ان دونوں کے درمیان میں ایک ایسی بات کیسے آ سکتی ہے جس کا تعلق بالکل حالت جنگ سے ہو یہ بلاغت قرآن کے خلاف ہے اس لیے حضرت علی کا بیان بالکل درست معلوم ہوتا ہے کہ یہ انعام الٰہی لڑائی سے پہلے کی پہلی رات میں ہوا ہے۔

بدر کی رات میں نیند آنا بھی اللہ کا انعام ہے اور دعائی تدبیر کے نتائج میں سے ہے۔ ورنہ ایسے سنگین حالات میں کسے نیند آتی ہے۔ ایسے مواقع پر تو خوف کے مارے نیند اڑ جاتی ہے۔ اور پھر ان لوگوں کو نیند کیسے آسکتی ہے جن کے بارے میں خود قرآن ہی بتا رہا ہے کانما یساقون الی الموت و ھم ینظرون۔ شاید یہاں آپ یہ خلش محسوس کریں کہ قرآن نے یہاں نعاس کا لفظ بولا ہے۔ اس کے معنے اونگھ کے ہیں لیکن یہ شبہ بے جان ہے کیونکہ یہاں اس کے ساتھ یغشی کا لفظ آیا ہے جس کے معنے ڈھانپ دینے کے ہیں یعنی نیند کو ان پر اس طرح طاری کر دیا گیا تھا جیسے کسی چیز کو ڈھانپ دیا جاتا ہے وہ بے خوف و خطر مزے کی میٹھی نیند سوتے اور یہی اللہ کا انعام ہے۔

بدر میں باران رحمت کا نزول

۱۲۔ اور آسمان سے تم پر پانی برسا دیا تھا کہ تمہیں پاک و صاف ہونے کا موقعہ

ملے اور تم سے شیطان کی گندگی دور کر دے اور تاکہ تمہارے دلوں کو مضبوط کر دے اور تاکہ تمہارے قدم جما دے۔ بدر کا معرکہ فی الحقیقت مسلمانوں کے لیے بہت ہی سخت آزمائش اور عظیم الشان امتحان کا موقع تھا۔ وہ تعداد میں تھوڑے تھے، بے سروسامان تھے۔ فوجی مقابلہ کے لیے تیار ہو کر نہ نکلے تھے۔ مقابلہ پر ان سے تین گنا تعداد کا لشکر تھا۔ جو پورے ساز و سامان سے کبر و غرور کے نشہ میں سرشار ہو کر نکلا تھا مسلمانوں اور کافروں کی پہلے ہی قابلِ ذکر ٹکر تھی۔ پھر صورت ایسی پیش آئی کہ کفار نے پہلے ہی پانی وغیرہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ مسلمان بلند جگہ پر تھے۔ ریت بہت زیادہ تھی۔ جس میں چلتے ہوئے پاؤں دھنستے تھے۔ گرد و غبار نے الگ پریشان کر رکھا تھا۔ پانی نہ ملنے سے ایک طرف غسل و وضو کی تکلیف، دوسری طرف تشنگی ستا رہی تھی۔ یہ چیزیں دیکھ کر مسلمان ڈرے کہ بظاہر آثار شکست کے ہیں۔ شیطان نے دلوں میں وسوسہ ڈالا کہ اگر واقعی تم خدا کے مقبول بندے ہوتے تو ضرور تائید ایزدی تمہاری طرف ہوتی ایسی پریشان کن اور یاس انگیز صورتِ حال پیش نہ آتی۔ اس وقت حق تعالیٰ نے قدرتِ کاملہ سے زور کا مینہ برسایا جس سے میدان کی ریت جم گئی۔ غسل و وضو کرنے اور پینے کے لیے پانی کی افراط ہو گئی۔ گرد و غبار سے نجات ملی۔ کفار کا لشکر جہاں تھا وہاں کیچڑ اور پھسلن سے چلنا دشوار ہو گیا۔ جب یہ ظاہری پریشانیاں دور ہو گئیں تو حق تعالیٰ نے مسلمانوں پر ایک قسم کی غنودگی طاری کر دی۔ آنکھ کھلی تو دلوں سے سارا خوف و ہراس جاتا رہا۔ بعض روایات میں ہے کہ حضور اور حضرت ابوبکر صدیق رات بھر عریش میں مشغولِ دعا رہے۔ آخر میں حضور پر ایک خفیف سی نیند طاری ہو گئی۔ جب اس سے چونکے تو فرمایا کہ خوش ہو کہ جبریل تمہاری مدد کو آ رہے ہیں۔ عریش سے باہر تشریف لائے تو سیھزم الجمع و یولون الدبر زبان مبارک پر جاری تھا۔ بہرحال اس بارانِ رحمت نے بدن کو احداث اور دلوں کو شیطان کے وساوس سے پاک کر دیا اور ریت کے جم جانے سے ظاہری طور پر قدم جم گئے اور اندر سے ڈر نکل کر دل مضبوط ہو گئے۔[1]

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

اللہ اکبر۔ اللہ سبحانہ، کی کارسازی نے کس طرح ساری مشکلیں حل کر دیں کہ عین موقع پر بارش ہو گئی اور افراط کے ساتھ سب کو پانی میسر آگیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ نہا دھو کر صاف ستھرے ہو گئے۔ کوئی نہ تھا جو چست و چاق اور تازہ دم نہ ہو گیا ہو۔ بارش کی وجہ سے ریت جم گئی پاؤں کے دھنس جانے کا اندیشہ جاتا رہا۔ اپنی کامیابی کی طرف سے بے اعتمادی و مایوسی جو دراصل شیطانی وسوسوں کی ناپاکی تھی اب کسی کے دل میں باقی نہ رہی۔ یہ اس رات کا واقعہ ہے جس کی صبح کو بدر کی لڑائی پیش آئی۔ اس بارش کے تین فائدے ہوئے ایک یہ کہ مسلمانوں کو پانی کی کافی مقدار مل گئی اور انہوں نے حوض بنا کر بارش کا پانی روک لیا، دوسرے یہ کہ مسلمان چونکہ وادی کے بالائی حصہ پر تھے اس لیے بارش کی وجہ سے ریت جم گئی اور زمین اتنی مضبوط ہو گئی کہ قدم اچھی طرح جم سکیں اور نقل و حرکت بآسانی ہو سکے۔ تیسرے یہ کہ لشکر کفار نشیب کی طرف تھا۔ اس لیے وہاں اس بارش کی بدولت کیچڑ ہو گئی اور پاؤں دھنسنے لگے۔ مطلب یہ ہے کہ بدر کے میدان جہاں مسلمانوں کی اپنی صفیں قائم تھیں وہ جگہ بلند تھی اور جہاں قریش کی فوج کھڑی تھی وہ جگہ نشیب میں تھی۔ اللہ تعالیٰ نے کفار کی شکست کا ایک ظاہری سبب پیدا کر دیا کہ عین اس رات میدانِ جنگ میں موسلادھار بارش کر دی جس نے اِدھر تو مسلمانوں کی طرف گرد و غبار بٹھا دیا ان کے پاؤں جما دیے اور اُدھر کافروں کی طرف پانی کا ریلا آگیا کہ ان کو زمین پر قدم رکھنا دشوار ہو گیا۔

یہ دعائی تدبیر کا تیسرا نتیجہ بیان ہوا۔ پہلا یہ کہ نزولِ ملائکہ ہوا، دوسرا رات کو آرام کی نیند سوئے تیسرے یہ کہ بارانِ رحمت نازل ہوئی۔

قرآن نے نزول بارانِ رحمت کے چار فائدے بتائے ہیں۔
ایک یہ کہ لیطہرکم بہ اس کے ذریعے پاکیزگی اور طہارت ہو۔ طہارت کو انعامِ الٰہی بنا کر ذکر کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ طہارت و پاکیزگی صحابہ کرام کا خاص ذوق ہو۔ اور صحابہ میں یہ ذوق قرآن ہی کا پیدا کردہ تھا۔ قرآن نے ان کو بتایا تھا واللہ یحب المتطہرین اللہ تعالیٰ طہارت رکھنے والوں سے محبت کرتے ہیں۔ پانی کے اصلی اور بنیادی فائدے یعنی پینے کو نظر انداز کر کے تطہیر کو بیان کرنا اس بات کی نشاندہی کرنے کے لیے ہے کہ مومن کی نگاہ میں پانی کا اصلی فائدہ اور اس کی

حقیقی قدر و قیمت اس بات میں ہے کہ وہ پاکیزگی اور طہارت کا ذریعہ ہے اور یہ چیز اللہ کو بے حد محبوب ہے ۔

بلا شبہ صحابہ کو ان کے ذوقِ طہارت کے پیشِ نظر یہ چیز پریشان کر رہی ہوگی کہ نماز کے لیے وضو کیسے ہوگا۔ طہارت کے لیے کیا کریں گے ۔ غسل کی ضرورت پیش آئی تو کیا ہوگا ۔ صحابہ کی اس مخصوص پریشانی سے یہاں اللہ سبحانہ نے پانی کے عام حیوانی فائدوں کو نظر انداز کر کے اس کی روحانی برکت کا خاص طور پر ذکر فرما دیا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ الطھور شطر الایمان یعنی ایمان کے سارے تقاضوں کو اگر تنصیف کی نسبت قائم کی جائے تو پاکیزگی اور طہارت ایمان کا نصف تقاضا ہے ۔

دوسرا فائدہ یہ ہوا یذھب عنکم رجز الشیطان ۔ بلا شبہ رجزِ شیطان سے مراد وساوس ہیں ۔ لیکن جس طرح روحِ انسانی کی گندگی وساوس سے ہوتی ہے ٹھیک اسی طرح جسمِ انسانی جراثیم سے گندا اور میلا ہو کر بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے ۔ آدمی جب گندا اور میلا ہوتا ہے تو شیطانی وسوسوں کے ساتھ بیماری کے جراثیم کا بھی غلبہ ہوتا ہے ۔ اگرچہ قرآن کا منطوق تو طہارت کے ذریعہ وساوسِ شیطان کو دور کرنا ہے جس سے روح میں پاکیزگی آتی ہے لیکن اس کے مفہوم میں یہ بات بھی داخل ہے کہ پانی اور صفائی ہوگی تو جسم بیماریوں کے ان جراثیم سے محفوظ ہو جائیں گے جو گندگی اور میل سے پیدا ہوتے ہیں ۔ اور اگر پانی نایاب ہو جاتے تو شیطان کو عام ذہنوں میں بددلی اور مایوسی پھیلانے کا موقعہ مل جاتا ہے ۔

تیسرا فائدہ یہ بیان ہوا ہے لیربط علی قلوبکم یہ مستقل فائدہ ہے اور اس کے استقلال کی خاطر صرف تعلیل مکرر لایا گیا ہے تاکہ تمہارے دلوں کو مضبوط کر دے ۔ معلوم ہوا کہ دشمنوں کی افرادی قوت کی بہتات ، سامانِ جنگ کی ان کی طرف فراوانی سے دل پریشان ہو رہے تھے ۔ اللہ سبحانہ کی نصرت اور امداد کا یہ مقدمہ یا تمہید دیکھ کر دلوں میں مضبوطی آ گئی کہ خواہ تعداد تھوڑی اور چاہے سامانِ جنگ کی کمی ہے لیکن اللہ سبحانہ کی نصرت ان سب چیزوں کی تلافی کر دے گی ۔ اور عملاً لا کر اشارہ کر دیا کہ پہلے ان کے دلوں میں جو گھبراہٹ تھی اب اللہ کی مدد کا بارش

کی صورت میں مشاہدہ کر کے ان کے دل ڈھارس اطمینان و سکون اور مستقبل میں فتح کے یقین سے بھر گئے۔ اب وہ مستقبل کو وسائل کی کمی کی وجہ سے شک کی نگاہوں سے نہیں بلکہ بھرپور اعتماد کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

چوتھا فائدہ یہ ارشاد ہوا ہے یثبت بہ الاقدام اس کا ایک مطلب تو یہی ہے کہ زمین میں ریت جم جانے سے تمہارے قدم نہ پھسلیں گے بلکہ جم جائیں گے۔ حافظ ابن القیمؒ فرماتے ہیں کہ اس رات اللہ سبحانہ نے ایک ہی بارش کی لیکن یہ بارش مشرکین کی جانب موسلا دھار تھی اور اہلِ ایمان کی طرف خوشگوار پھوار کی صورت میں ہوئی اس سے ریت جم گئی۔ حضور انور رات ہی میں پانی تک پہنچ گئے اور حوض تیار کر کے پانی کو روک لیا۔ اور حوضوں کے اردگرد مسلمان فوج نے پڑاؤ کیا۔ اور اسی موقعہ پر حضور کے لیے اونچے ٹیلہ پر صحابہ نے ایک عریش تیار کیا۔ امام مجاہد کی رائے ہے کہ بارانِ رحمت رات کو سونے سے پہلے آئی تھی۔ اگر ایسا ہے تو مارچ کے مہینے میں یقیناً خنکی ہو گئی ہو گی۔ اور بہت ہی خوشگوار فضا ہو گی۔ فضا کی اسی خوشگواری سے ناکامی کا وہ احساس جو شیطانی وسوسوں سے پیدا ہو رہا تھا دور ہو گیا اور مستقبل کے بارے میں اللہ سبحانہ پر بھرپور اعتماد کی فضا قائم ہو گئی۔ اگر بدر میں بارش نہ ہوتی تو اہلِ ایمان کے لیے لڑائی ممکن نہ ہوتی۔ کیونکہ یہ سب پا پیادہ تھے۔ مولانا آزاد نے یہ بات بر موقعہ لکھی ہے کہ جنگ واٹرلو کے تمام مورخین متفق ہیں کہ اگر ۱۷، ۱۸ جون کی درمیانی رات میں بارش نہ ہوئی ہوتی تو یورپ کا نقشہ بدل گیا ہوتا۔ کیونکہ اس صورت میں نپولین کو بارہ بجے تک زمین خشک ہونے کا انتظار نہ کرنا پڑتا۔ واٹرلو میں اگر بارش نہ ہوتی تو یورپ کا سیاسی نقشہ بدل جاتا لیکن اگر بدر میں بارش نہ ہوتی تو کیا ہوتا۔ تمام کرۂ ارضی کی ہدایت و سعادت کا نقشہ الٹ جاتا۔ اسی طرف جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعا میں اشارہ کیا تھا۔

اللھم ان تھلک ھذہ العصابۃ فلا تعبد

خدایا اگر یہ مٹھی بھر جماعت آج ہلاک ہو گئی تو روئے زمین میں تیری عبادت نہ رہے گی۔

ادھر تو یہ ہوا کہ مسلمان شاداں و فرحاں ہو گئے اور بارش ان کے لیے رحمت کا پیغام

بن گئی۔ مگر اُدھر کیا ہوا بارش کی وجہ سے قریش کے باربردار اونٹ دلدل میں پھنس گئے۔ حمل ونقل دشوار ہوگئی۔ قریش کو آگے بڑھنے میں دشواری پیش آئی۔ پہاڑی علاقوں میں جنگ کا زریں اصول یہ ہے اور اس پر دنیا کے دفاعی ماہرین کا اتفاق ہے کہ فوج کو کبھی وادیوں اور نالوں میں پڑاؤ نہ ڈالنا چاہیے کیونکہ ایسے علاقوں میں اگر یکایک تیز بارش ہوجائے تو سیلاب آجاتا ہے اور اس سے جان ومال کا نقصان ہوتا ہے۔ اور اگر معمولی قسم کی بارش ہوتی ہے تو بدترین قسم کی دلدل ہوجاتی ہے جسے انسان اور حیوان دونوں مشکل سے عبور کرسکتے ہیں۔

مقام بدر پہاڑوں کے درمیان ۵½ میل لمبی اور چار میل چوڑی وادی ہے جس میں آنے جانے کے تین راستے ہیں۔ بجانب شرق مدینہ کی طرف سے داخل ہونے والا وادی کے درمیان میں کھلتا ہے۔ شمالی درّہ شام سے آنے والوں کے لیے شمال میں اور جنوبی درّہ مکہ سے آنے والوں کے لیے جنوب میں کھلتا ہے۔ جنوبی داخلہ کے بعد ایک چھوٹی پہاڑی اور نخلستان فوج کو چھپا کر بٹھانے کے لیے نہایت موزوں مقام ہے اور اسی مقام پر قریش کی فوج آکر ٹھہری۔ صحابہ کرام حضور اقدس کے حکم سے درّہ کے منہ سے کسی قدر ہٹ کر پہاڑوں کی اوٹ میں قیام کرنے لگے تھے تو حضرت حباب بن منذر آگے آئے اور عرض کیا یارسول اللہ اگر اس مقام پر قیام اللہ سبحانہ کے حکم سے ہے تو بجا۔ اور اگر آپ کی ذاتی رائے ہے تو میں کچھ عرض کروں۔ حضور نے فرمایا کہ میری ذاتی رائے ہے۔ بولے کہ پھر یہ مقام مناسب نہیں۔ ہمیں چاہیے کہ وسط وادی میں نخلستان کے قریب پانی کے چشموں پر قبضہ کرلیں تاکہ مقام کی بلندی اور پانی کی دستیابی کے لحاظ سے ہم ان سے برتر رہیں۔ حضور نے پسند فرمایا اور اسلامی فوج نئے مقام پر پہنچ گئی۔ یہ جگہ خشک ریتلی تھی اور اونچی تھی۔ قریش نشیب میں تھے جہاں زمین چکنی تھی۔ اللہ سبحانہ نے اسی رات باران رحمت نازل کی۔ مسلمانوں کی قیامگاہ پانی جذب کرکے مستحکم ہوگئی۔ اور قریش کی قیامگاہ کیچڑ اور پانی سے دلدل بنی گئی۔

إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ أَنِّي مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِينَ آمَنُوا ۚ
سَأُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوا فَوْقَ
الْأَعْنَاقِ وَاضْرِبُوا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ﴿۱۲﴾ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ
شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُولَهُ ۚ وَمَنْ يُشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ فَإِنَّ
اللّٰهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿۱۳﴾ ذٰلِكُمْ فَذُوقُوهُ وَأَنَّ لِلْكٰفِرِينَ
عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۴﴾

جب تیرے رب نے فرشتوں کو وحی کی کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، لہٰذا اہلِ ایمان کو جمائے رکھو۔[۱۳] میں ضرور کافروں کے دلوں میں دہشت ڈالوں گا۔[۱۴] لہٰذا تم ان کی گردنوں پر ضرب لگاؤ، اور ان کے ہاتھوں کے پور پور پر چوٹ لگاؤ۔[۱۵] اور یہ اس لیے کہ انہوں نے اللہ و رسول کی مخالفت کی ہے اور جو بھی اللہ اور اس کے

رسُول کی مخالفت کرے گا تو اللہ سبحانہ، اسے سخت سزا دینے
والا ہے۔[16] اے کافرو! یہ ہے تمہاری سزا، اس کا مزا چکھو
اور یقین کرو کہ کافروں کے لیے دوزخ کا عذاب ہے[17]۔

اہلِ حق کا جماؤ اور کُفر کی مرعوبیت

ان آیات میں بھی اسی دعائی تدبیر کا نتیجہ بیان ہوا ہے۔ تردد کی حالت، حالات کی نزاکت اور مٹھی بھر مسلمانوں کے دلوں کی کیفیت کا جو نقشہ خود اللہ سبحانہ، نے پیش کیا ہے اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود دھکیل کر مسلمانوں کو مدینہ سے باہر نکالا ورنہ عقل کا فیصلہ یہ کب ہوسکتا ہے کہ چھوٹی سی جمعیت کا گھروں سے اسی میل دور جا کر ایک بھاری فوج سے تصادم ہو۔ لیکن اس کے باوجود اللہ سبحانہ، اہل ایمان کو میدان جنگ کی طرف بڑھائے گیا۔ اکثر کی خواہش یہی تھی کہ ابوسفیان کا قافلہ ہاتھ آئے۔ لیکن اللہ سبحانہ، نے حوادث و حالات کے پردوں میں جلوہ آرا ہوکر اپنی مشیت کا مظاہرہ فرمایا۔ اور ظاہر بینوں کو دکھلا دیا کہ اللہ سبحانہ، کے حکم سے باطل پر حق کیسے غالب آتا ہے۔ گویا ظاہری مصالح کے خلاف اللہ سبحانہ، نے خود مسلمانوں کو میدانِ جنگ میں لا ڈالا۔ کوچ پہ مستعدی کا باعث یہ وعدہ ہوا کہ ایک گروہ ہاتھ لگے۔ مسلمان یہ سمجھے کہ ہاتھ لگنے والا گروہ تجارتی قافلہ ہے۔ وہ کمر ہمت باندھ کر نکل کھڑے ہوتے لیکن حق سبحانہ، کا مقصد کہیں بلند تھا۔ وہ حق و باطل کا ٹکراؤ چاہتا تھا تاکہ کشمکش کے پردے میں دعائی تدبیر کے ذریعے تائیدِ غیبی کے مظاہروں سے اسلام کے غلبہ کے اسباب پیدا کرے۔ تقدیر و تدبیر کے درمیان یہی وہ نقطۂ اتصال ہے جس کے گرد مومن کا ایمان مصروفِ طواف رہتا ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جس میں سرِ ایمان تمام تر مستعد ہے۔ ایمان کو اسی سے

غذا ملتی ہے اور یہی مومن کا سرمایہ حیات ہے۔ اسی کا قرآن کی ان آیات میں نہایت بلیغ انداز میں ذکر ہو رہا ہے۔

فرشتوں کو وحی

۱۳۔ جب تیرے رب نے فرشتوں کو وحی کی کہ میں تمہارے ساتھ ہوں لہٰذا اہلِ ایمان کو جمائے رکھو۔ ملائکہ کا اعتقاد دُنیا کے تمام مذہبوں اور قوموں میں کسی نہ کسی طرح موجود ہے لیکن ان کے اس اعتقاد میں بہت سی ایسی باتیں داخل تھیں جو توحیدِ کامل کے منافی تھیں۔ اسکندریہ کے نوافلاطونی فلسفہ کی رو سے عقل اوّل کی اضطراری پیدائش سے خدا کو معطل ہو جانا پڑا اور فرشتوں کو عقول کی صورت میں رفیلی کارفرما قرار دیا گیا۔ عراق کے صابی اجرام سماوی کی شکل میں ان کی پرستش کرتے تھے اور ان ہی کو عالم کا فرمانروا سمجھتے تھے۔ یہود ان کو کسی قدر صاحبِ اختیار تصور کرتے تھے اور گاہ گاہ ان کو خدائی کا درجہ دیتے تھے۔ ہندوؤں میں وہ دیوتا اور دیبی بن کر ایک طرف انسانی خصائص سے ملوث تھے۔ اور دوسری طرف اپنے ذاتی اختیارات کے لحاظ سے چھوٹے خداؤں کے مرتبے پر فائز تھے۔ عیسائی ان میں سے بعض مثلاً روح القدس کو خدا کا ایک جزو تسلیم کرتے تھے اور یہ تثلیث کا ایک رُکن تھا۔ عربوں میں فرشتے خدا کی بیٹیوں کا درجہ رکھتے تھے اور ان کی پوجا کرتے، ان کو اپنے گناہوں کا سفارشی سمجھتے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرشتوں کے بارے میں ان تمام عقائدِ باطلہ کو مٹا دیا اور ایک ایک کر کے ہر عقیدہ کی تردید کی اور بتایا کہ فرشتے بھی خدا کی دوسری مخلوقات کی طرح ایک مخلوق ہیں۔ ان کو خدائی کا کوئی اختیار نہیں وہ صرف خدا کی اطاعت و عبادت اور اس کے احکام کی بجا آوری میں مصروف رہتے ہیں۔ ان میں سے جس کے جو کام سپرد ہے وہ اس کو انجام دیتے ہیں۔ وہ ہماری طرح بندے ہیں۔ اللہ سبحانہٗ ان سے جو کام چاہتا ہے لیتا ہے۔ فرشتوں کی طرف خدا کی وحی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ ان کو احکام نافذ کرنے کا حکم دیتا ہے۔ جس طرح انبیاء پر وحی کی آمد کی کیفیت ہماری علمی دسترس سے باہر ہے ٹھیک اسی طرح فرشتوں پر وحی آنے کی حقیقت کا ہمیں علم نہیں ہے۔ ان کا تعلق حقائقِ غیب سے ہے اور غیب کے

معاملات کے بارے ہماری ہر تعبیر ناقص ہے۔

آیت میں ملائکہ سے مراد فرشتوں کی وہی فوج ہے جس کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں۔ اللہ نے ان ہی فرشتوں کو جن کو اپنے نبی کی مدد کے لیے اتارا ، وحی کی یہاں وحی کی تعبیر سے یہ بات بھی کھل کر سامنے آتی ہے کہ فرشتوں کو احکام بھی خدا کی جانب سے براہِ راست نہیں بلکہ بذریعہ وحی ملتے ہیں۔ وحی آئی کہ میں تمہارے ساتھ ہوں تم اہلِ ایمان کو جمائے رکھو اور ثابت قدم بناؤ۔ ساتھ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ میں تمہاری اس کام میں مدد کروں گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ خدا کی معیت کے بغیر فرشتے بھی کچھ نہیں کر سکتے۔ فرشتوں کی جانب سے اہلِ ایمان کو ثابت قدم یا جمانے کی کیا حقیقت تھی ؟ یہ معاملہ بھی عالمِ غیب سے تعلق رکھتا ہے اور اس عالم کے حقائق کی ہم اپنے ذہن و ادراک سے حقیقت نہیں معلوم کر سکتے۔ لوگوں کے فہم سے قریب کرنے کے لیے شارحینِ قرآن لکھتے ہیں کہ فرشتے ایسی باتیں اہلِ ایمان کے دلوں میں القا کرتے تھے جن سے ان کے عزائم میں پختگی آتے۔ فرشتوں کی جانب سے ایسے القاء کو الہام کہتے ہیں۔ جیسے شیطان کے القا کو وسوسہ کہتے ہیں اور کچھ کے خیال میں افرادی طاقت کا مظاہرہ کا نام ہی تثبیت ہے۔ بہرحال عددی طاقت سے ہو یا دلوں میں الہام کے ذریعے ہو کچھ ہو طریقہ اور ذریعہ کچھ ہو مقصود تو مسلمانوں کے دلوں کو اس بے بسی اور بے کسی کے وقت میں دلیر بنانا ہے۔

کافروں پر اہلِ ایمان کا رعب

۱۴۔ میں ضرور کافروں کے دلوں میں دہشت ڈالوں گا۔ حافظ ابن کثیر نے یہ مطلب بتایا ہے کہ اے فرشتو اہلِ ایمان میں جماؤ اور ثابت قدمی پیدا کرو۔ اور ان کو کافروں کے مقابلہ میں طاقتور بناؤ۔ اسی ذریعہ سے میں کافروں پر دہشت ڈالوں گا۔ دراصل یہ استیناف بیانی ہے فرمایا کہ اگر تم نے مسلمانوں کو جمائے رکھا تو میں ضرور اہلِ کفر کے دلوں میں دہشت ڈال دوں گا۔ یا اس کا تعلق اہلِ ایمان سے ہے کہ اگر انہوں نے ثباتِ قدم کا میدانِ جنگ میں مظاہرہ کیا تو میں ضرور اہلِ کفر کے دلوں میں رعب ڈال دوں گا۔ یہ زیادہ اچھا ہے۔ کیونکہ اصلی قوت فوج کا حوصلہ ہے اگر حوصلہ بحال ہو

اور ثابت قدمی ہو تو معمولی طاقت سے بھی دشمن زیر ہو جاتا ہے۔ اور اگر حوصلہ ختم ہو جائے تو سامانِ جنگ کی فراوانی، افرادی قوت کی بہتات بھی بے کار ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہ اللہ سبحانہٗ کی جانب سے بہت بڑا وعدہ ہے۔ لیکن اس کے پورا ہونے کا مدار ثابت قدمی اور حوصلہ کی بلندی پر ہے اسی لیے فثبتوا کے بعد آیا ہے۔ اور اگر آپ چاہیں تو اس جملہ کو استئنافیہ کہہ سکتے ہیں۔ یہ گویا فثبتوا کی علت بن جاتے گا۔ مطلب یہ ہو گا کہ فرشتو تم اہلِ ایمان میں تثبیت کا کام کرو کیونکہ میں کافروں میں ان کی دہشت ڈالوں گا۔ یہ بات بالکل وہی ہے جو حافظ ابن کثیر نے بتائی ہے۔

کافروں کی گردنیں مارو

۱۵- تم ان کی گردنوں پر ضرب لگاؤ اور ان کے ہاتھوں کے ہر پور پر چوٹ لگاؤ۔

یہ خطاب کس کو ہے۔ اہلِ ایمان کو یا فرشتوں کو۔ حافظ ابن کثیر نے حافظ ابن جریر کی رائے یہ نقل کی ہے اضربوا من عدوکم ایھا المومنون۔ یعنی اس کے مخاطب فرشتے نہیں بلکہ اہلِ ایمان ہیں۔ اور حافظ ابن کثیر نے اس پر کوئی تنقید نہیں کی ہے معلوم ہوا کہ ان کی بھی رائے یہی ہے کہ مسلمان مخاطب ہیں۔ محققین تفسیر و حدیث کی رائے یہی ہے کہ فرشتوں کا نزول مسلمانوں کے دلوں کو مضبوط رکھنے کے لیے ہوا تھا لڑائی میں ان کی شرکت ثابت نہیں ہے نہ اس کی کوئی ضرورت پیش آئی تھی اور اس آیت میں فاضربوا کا خطاب مسلمانوں سے ہے نہ کہ فرشتوں سے۔

پہلی آیت وما جعلہ اللہ الا بشریٰ میں نفی و استثنا کے ذریعے حصر کا تقاضا بھی یہی ہے کیونکہ اس آیت میں بتایا ہے کہ فرشتوں کا کام یہ اور صرف یہ تھا کہ کمزور مسلمانوں کے دل قرار پا جائیں۔ سیاق سے مخاطب اہلِ ایمان ہیں۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ مخاطب فرشتے ہیں وہ حیران کن پریشانیوں میں مبتلا ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ چونکہ فرشتوں کو کافروں کو مارنے کا طریقہ نہ آتا تھا اس لیے فاضربوا فوق الاعناق واضربوا منھم کل بنان کہہ کر ان کو مارنے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ چنانچہ نواب صدیق حسن خاں مرحوم فرماتے ہیں:

ملائکہ کو انسانوں کو مارنے کا طریقہ معلوم نہ تھا اس لیے ان کو اللہ نے تعلیم دی۔

لیکن اس کی پشت پر کوئی تاریخی روایتی دستاویز نہیں ہے۔ حافظ ابن جریر روایات کے مسئلہ میں توسع سے کام لیتے ہیں لیکن ملائکہ کے قتال کے موضوع پر انہوں نے بھی کوئی روایت نہیں پیش کی ہے۔ حافظ سیوطی نے اس موقع پر جو روایات پیش کی ہیں ان کا ماخذ ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ ہے اور اہلِ علم پر ان کتابوں کی روایتی حیثیت پوشیدہ نہیں ہے۔ ان روایات کا ضعف سب کا جانا بوجھا ہے۔ آیت میں فوق الاعناق اور کل بنان سے۔ قریش کی مرعوبیت کو ظاہر کیا گیا ہے۔ یعنی وہ اس قدر مرعوب ہو جائیں گے اور ان کے حوصلے اس قدر پست ہو جائیں گے کہ تم ان کو جانوروں کی طرح کاٹ ڈالو گے۔ یہ ان کی بے بسی کی بلیغ تعبیر ہے۔ اور اس میں ان کی تحقیر بھی ہے۔ آگے آیت میں اس قتل کی مرعوبیت کی اور تحقیر کی وجہ بتائی جا رہی ہے۔

اللہ و رسول کی مخالفت کی سزا

۱۶۔ اور یہ اس لیے کہ انہوں نے اللہ و رسول کی مخالفت کی ہے اور جو بھی اللہ و رسول کی مخالفت کرے گا تو اللہ سبحانہٗ اسے سخت سزا دینے والا ہے۔ یعنی سب کچھ اس لیے واقعہ بن کر سامنے آیا ہے کہ ان لوگوں نے اللہ و رسول کی مخالفت کی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جنگ کی اسلام میں اصلی علت اللہ و رسول کی مخالفت ہے۔ یہ دنیا خیر و شر دونوں کا مسکن ہے۔ اسلام کی نظر میں اللہ و رسول کا ہر حکم خیر ہے اور اس کے مقابلہ میں آنے والی ہر قوت شر ہے۔ شر جب بھی خیر کے راستہ میں رکاوٹ بن جائے تو اس رکاوٹ کا ہٹانا مسلمانوں کی دینی ذمہ داری ہے۔ اسی کے نتیجہ میں خیر اور شر باہم ٹکراتے ہیں۔ قرآن نے یہاں بدر کی سرگرمیوں اور جنگ کرنے کی وجہ یہ اور صرف یہ بتائی ہے کہ مشرکین نے اللہ و رسول کی راہ روکی۔ ان کی مخالفت پر میدان میں آگئے اس لیے ان کو اللہ کی جانب سے یہ سزا ملی۔ اسی کا نام قرآن کی زبان میں جہاد ہے۔ بتانا یہ ہے کہ اہلِ ایمان کے ذریعے مشرکین جس عذابِ شدید کا نشانہ بنے ہیں۔ اس کی علت اللہ و رسول کی مخالفت ہے ورنہ ان مسلمانوں کی ان سے کوئی عداوت نہ تھی، بلکہ قرابت تھی اور قرابت دور کی نہیں بہت قریب کی۔ لیکن ایثار و جاں بازی کا عالم یہ تھا کہ دونوں

فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو دنیا کو نظر آیا کہ خود ان کے جگر گوشے تلوار کے سامنے ہیں۔ حضرت ابوبکر کے بیٹے مشرکین کی صف سے تلوار لے کر نکلے تو حضرت ابوبکر خود آگے بڑھے۔ عتبہ میدان میں آیا تو اس کے فرزند حضرت حذیفہ اس کے مقابلہ پر آئے۔ حضرت عمر کی تلوار ماموں کے خون سے رنگین تھی۔ قرابت کے ساتھ یہ سب وطنی بھائی بھی تھے اور ہم وطن ہونے کے ساتھ یہ سب ہم زبان بھی تھے۔ گو نسلی، وطنی اور لسانی تعلقات سب کے ایک تھے اور اس معنے کے لحاظ سے سب اُمتہ واحدہ تھے۔ لیکن ان سارے علائق کو صحابہ کرام نے صرف اس لیے خیر باد کہہ دیا کہ ان رشتہ داروں، ہم وطنوں اور ہم زبانوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی تھی اور بس۔ اس طرح قرآن کی یہ آیت صحابہ کا مقام ایمان بتا رہی ہے۔

خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں!

یہ آیت بتا رہی ہے کہ اللہ سے بغاوت اور اس کی بھیجی ہوئی ہدایت سے منہ موڑنا کوئی معمولی درجہ کا جرم نہیں ہے بلکہ یہی سب سے بڑا جرم ہے۔ اس کی سزا دنیا میں بھی بھگتنی پڑتی ہے۔ اس آیت نے یہ بات بھی کھول دی ہے کہ کسی انسان کا وضع کردہ کوئی نظام خواہ فردِ واحد کا بنایا ہوا ہو یا جماعت کا نبوت کے لائے ہوئے نظام کے مقابلے میں پائے استحقار سے ہٹ کر آئے جانے کے لائق ہے اور اس کے لیے ایک مسلمان کے ایمان تقاضا یہ ہے کہ برادری، قرابتداری، وطنیت اور دوسرے سارے مفادات کو چھوڑ کر اللہ و رسول کا وفادار بنے۔ قرآن مسلمانوں کو ہرگز اس کی اجازت نہیں دیتا ہے کہ وہ نبوت کے مخالف نظام کو اپنائیں۔ اسی لیے قرآن نے یہاں بطور ضابطہ اور قانون یہ بتایا ہے۔

عذاب شدید نتیجہ ہے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کا اور جو بھی مخالفت رسول اختیار کرے گا تو اللہ اس کو سنگین سزا دے گا۔

یہ مشہور مفسر قرآن ابوالسعود نے اس آیت سے یہی نتیجہ نکالا ہے۔

آخرت میں کفر کی سزا

۱۴۔ اے کافرو! یہ ہے تمہاری سزا اس کا مزہ چکھو اور یقین کرو کہ کافروں کے

لیے دوزخ کا عذاب ہے۔

یہاں یہ نکتہ قابلِ غور ہے دُنیا میں سزا کی علت اللہ و رسُول کی مخالفت بتائی ہے اور آخرت میں سزا کی علت کفر بتائی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام دُنیا میں جنگ کافروں سے کُفر کی وجہ سے نہیں کرتا ہے بلکہ اس لیے کرتا ہے کہ کُفر حق کی راہ میں رکاوٹ بن کر آجاتا ہے۔ کیونکہ یہ دنیا خیر و شر دونوں کا مسکن ہے یہاں بھلائی کی طاقتیں موجود ہیں اور بُرائی کی بھی اور دونوں کو اپنے اپنے طور پر کام کرنے کی پوری آزادی ہے۔ اسی لیے ایمان میں کسی پر جبر و اکراہ نہیں ہے۔ جب کُفر اللہ و رسُول کا مخالف بن کر سامنے آتا ہے تو پھر اس کی سزا دی جاتی ہے بر خلاف آخرت کے کہ وہاں عذاب کی علت صرف کفر ہے اسی لیے ارشاد ہوا ہے ان للکافرین عذاب النار۔

آئیے اب ان آیات پر مولانا عثمانیؒ کا تشریحی نوٹ بھی گوش گزار فرمالیجیے۔ اگرچہ اس تشریح میں فرشتوں کے قتال کی بات بھی بتائی گئی ہے لیکن یہ عام شہرت کی بنا پر ہے اصل حقیقت ہم بتا چکے ہیں۔

جنگِ بدر کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس معرکہ میں خود ابلیس لعین کفار کے سردار اعظم سراقہ ابن مالک بدلجی کی صورت میں متمثل ہو کر ابو جہل کے پاس آیا۔ اور مشرکین کے خوب دل بڑھائے کہ آج تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا۔ میں اور میرا سارا قبیلہ تمہارے ساتھ ہے۔ ابلیس کے جھنڈے تلے بڑا بھاری شیاطین کا لشکر تھا۔ یہ واقعہ آگے آئے گا۔ اس کے جواب میں حق تعالیٰ نے مسلمانوں کی کمک پر شاہی فوج کے دستے جبریل و میکائیل کی کمانڈ میں یہ کہہ کر روانہ کیے کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اگر شیاطین آدمیوں کی شکل میں متشکل ہو کر کفار کے حوصلے بڑھا رہے ہیں اور ان کی طرف سے لڑ رہے ہیں اور مسلمانوں کے قلوب کو وسوسے ڈال کر خوفزدہ کر رہے ہیں تو تم مظلوم اور ضعیف مسلمانوں کے دلوں کو مضبوط کرو۔ ادھر تم ان کی ہمت بڑھاؤ گے ادھر میں کفار کے دلوں میں دہشت و رُعب ڈال دوں گا۔ تم مسلمانوں کے ساتھ ہو کر ان ظالموں کی گردن مارو اور پور پور کاٹ ڈالو۔ کیونکہ آج ان سب جنی و انسی کافروں نے مل کر خدا و رسُول سے مقابلہ کی

لڑائی ہے سوانہیں معلوم ہو جائے کہ خدا کے مخالفوں کو کبھی سخت سزا ملتی ہے۔ آخرت میں جو سزا ملے گی اصل تو وہی ہے لیکن دنیا میں بھی اس کا تھوڑا سا نمونہ دیکھ لیں اور عذاب الٰہی کا کچھ مزہ چکھ لیں۔ روایات میں ہے کہ بدر میں لوگ ملائکہ کو آنکھوں سے دیکھتے تھے اور ان کے مارے ہوئے کفار کو آدمیوں کے قتل کئے ہوئے کفار سے الگ شناخت کرتے تھے۔ خدا تعالیٰ نے یہ ایک نمونہ دکھا دیا کہ اگر کبھی شیاطین الانس والجن ایسے غیر معمولی طور پر حق کے مقابل جمع ہو جائیں تو وہ اہل حق اور مقبول بندوں کو ایسے غیر معمولی طریقوں سے فرشتوں کی کمک پہنچا سکتا ہے باقی ویسے فتح و غلبہ اور ہر چھوٹا بڑا کام خدا ہی کی مشیت و قدرت سے انجام پاتا ہے۔ اسے نہ فرشتوں کی احتیاج ہے نہ آدمیوں کی۔ اور اگر فرشتوں ہی سے کام ہے تو ان کو وہ طاقت بخشی ہے کہ تنہا ایک ایک فرشتہ بڑی بڑی بستیوں کو اٹھا کر الٹ سکتا ہے۔ یہاں تو عالم تکلیف میں ذرا سی تنبیہہ کے طور پر شیاطین کی غیر معمولی دوڑ دھوپ کا جواب دینا تھا اور بس۔ لہ

حضرت شیخ الاسلام کی یہ تشریح تکلف و تاویل پر مبنی ہے۔ ہم اس پر کوئی تبصرہ کرنا خلاف ادب سمجھتے ہیں۔ ملائکہ کے قتال کے بارے میں مولانا نے جو یہ انکشاف فرمایا ہے کہ ملائکہ کے مقتولین کو لوگوں کے مقتولین سے الگ شناخت کرتے تھے۔ یہ ربیع ابن انس کی روایت ہے۔ اور ربیع ابن انس کا تشیع افراط کے درجہ میں مشہور نقاد یحییٰ بن معین کی زبانی سب کو معلوم ہے۔ حافظ ابن کثیر نے اسے بلا سند پیش کیا ہے۔ اور حافظ سیوطی نے ابن ابی حاتم کا حوالہ دیا ہے۔ باقی ملائکہ کے دیکھنے کی بات تو یہ بلا ریب صحیح ہے۔ ان کی نمائش ہی نے تو صحابہ کو دلیری دی ہے بلکہ یہ فرشتوں کی نمود ہی تھی کہ قریش کی فوج کو مسلمانوں کی تعداد دگنی نظر آرہی تھی یرونھم مثلیھم رای العین۔ جسے خود قرآن رای العین کہے اس کے بارے میں یارائے انکار کیسے ہو سکتا ہے۔ اگرچہ آیت کے یہ معنی بھی کئے گئے ہیں کہ اہل ایمان کفار کو دوچند دیکھ رہے تھے لیکن اس میں دیکھنے کی بات ہی کیا ہے وہ تو دو چند نہیں

لہ افادات شیخ الاسلام

سہ چند تھے۔ اصل یہی ہے مشرکین صحابہ کو اپنے سے دوچند دیکھ رہے تھے۔ مشرکین کی تعداد ۹۰۰ تھی اور صحابہ کی تعداد ۳۰۰ تھی۔ اس میں ایک ہزار فرشتوں کے اضافہ سے مشرکین کو تعداد دوچند نظر آرہی تھی۔ اور بلاشبہ یہ نظر آنے والے فرشتے تھے۔ بہرحال فرشتوں کا نظر آنا دونوں کے لیے ضروری تھا۔ اس سے صحابہ کا حوصلہ بلند ہورہا تھا اور مشرکین پر رعب پڑ کر ان کا حوصلہ پست ہورہا تھا۔ قابلِ غور تو صرف فرشتوں کے جنگ میں قتال کی بات ہے۔ علامہ السید رشید رضا نے اس موضوع پر بہترین تبصرہ کیا ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ
الْاَدْبَارَ ﴿۱۵﴾ وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ
اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ
وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۶﴾

مسلمانو! جب کافروں سے تمہارا لڑائی میں سامنا ہو تو ان کی طرف سے پیٹھ نہ پھیرو۔[18] اور جو شخص لڑائی کے موقعہ پہ ان سے پیٹھ پھیرے گا تو وہ بلاشبہ خدا کے غضب کا نشانہ بن گیا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بدترین ٹھکانا ہے مگر ہاں جو شخص لڑائی کی مصلحت سے ہٹ جائے یا اپنے گروہ کی طرف جگہ لینی چاہے وہ اس سے مستثنیٰ ہے۔[19]

اہل ایمان کی فوجی تربیت

اس سے پہلی آیات میں انعامات الہیہ کا تذکرہ ہوا۔ اور بدر کی لڑائی میں اہل ایمان

کی کامیابی پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ بتایا کہ فتح و شکست کا مدار اسباب و وسائل پر نہیں بلکہ اللہ سبحانہٗ کی نصرت و توفیق پر ہے اور یہ محض اللہ ہی کا فضل تھا۔ گو مسلمان باوجود تعداد میں کم ہونے کے اور باوجود بے سروسامان ہونے کے بدر میں کامیاب ہو گئے۔ مسلمانوں کے دلوں کا اطمینان، کافروں پر ان کی دہشت، فرشتوں کی امداد عین وقت پر بارش، مسلمانوں کے لیے غیبی امداد تھی اور اسی کی وجہ سے مسلمانوں کو کامیابی ہوئی۔

ان ہی آیات میں پورے زور کے ساتھ مسلمانوں کو یہ بھی بتایا تھا کہ ان کو اللہ کی مدد پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ ظاہری اسباب پر بھروسہ کرنا مسلمانوں کا کام نہیں۔ یہ ممکن ہے کہ ظاہری اسباب ہوں اور کامیابی نہ ہو لیکن یہ ناممکن ہے کہ اللہ کی مدد ہو اور کامیابی نہ ہو۔ لیکن اللہ سبحانہٗ کی امداد کا یقین اور اس کے فضل پر بھروسہ کرنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ اب مسلمانوں کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے مسلمانوں کا کام ہی یہ ہے کہ وہ ایک طرف اللہ پر بھرپور بھروسہ کرتا ہے لیکن دوسری طرف وہ اسباب کی طرف سے قطعاً بے پروا نہیں ہوتا۔ وہ جو کچھ کر سکتا ہے قطعاً مستعدی سے کرتا ہے۔ اسباب فراہم کرتا ہے، ظاہری تدبیر کرتا ہے۔ اللہ کی دی ہوئی طاقت اور عقل کو استعمال کرتا ہے اور پھر سب کچھ اللہ کے سپرد کر دیتا ہے اس لیے ان آیات میں یہ ہدایت دی جا رہی ہے کہ جب حق و باطل میں ٹکر ہو جائے۔ جب برائیاں نیکیوں کے مقابلے پر تن جائیں تو اس وقت مسلمانوں کا فرض یہ ہے کہ وہ مقابلہ کے لیے میدان میں ڈٹ جائیں اور کسی چیز یہاں تک کہ اپنی جان کی بھی پروا نہ کریں۔ جس قدر محنت ہو گی اسی کی نسبت سے اللہ کی نصرت ہو گی۔ اللہ کا قانون یہ ہے ولینصرن اللہ من ینصرہ اللہ ضرور مدد کرے گا ان کی جو اللہ کی مدد کریں گے۔

معانی مفردات

زحف اس کے اصلی معنے پیٹ کے بل یا پیٹھ کے بل چلنے کے ہیں جیسے سانپ چلتا ہے یا بچہ چلتا ہے اور یا پھر گھٹنوں کے بل چلنے کے ہیں۔ اسی لیے یہ کسی بھاری بھرکم سامان سے لدے ہوئے لشکر کے جنگ کے لیے نکلنے پر بولا جاتا ہے۔ زمخشری فرماتے ہیں کہ زحف العسکر الی العدو کے معنے میں لشکر کا بوجھ اور کثرت کے ساتھ دشمن

کے مقابلہ پر جانا۔ اسی سے زحف کے معنے فوج اور لشکر کے آتے ہیں۔ اس کی جمع زحوف آتی ہے۔ الادبار : جمع دُبُر کی ہے۔ پیچھے کو کہتے ہیں اور قبل اس کی ضد آگے کے معنے میں ہے۔ کئی زبان میں مرد و عورت کے اندام نہانی کو بھی کہتے ہیں۔ پیٹھ پھیر لینے کا مطلب جنگ سے بھاگ جانا ہے۔ متحرفا : تحرف سے اسم فاعل ہے تحرف مادہ ہے اس کے معنے طرف میں ہو جانے کے ہیں۔ باب تفعل میں تکلف کے معنے ہوتے ہیں۔ متحیزا : یہ بھی باب تفعل ہے۔ حیز سے بنا ہے حیز کے معنے جگہ کے ہیں اس کا مادہ حوز ہے۔ حوز اس جگہ کو کہتے ہیں جس کے گرد باڑ ہو۔ زمخشری لکھتے ہیں کہ انحاز عن القوم کے معنے لوگوں سے الگ ہو جانے کے ہیں اور انحاز الیھم کے معنے لوگوں سے مل جانے کے ہیں۔ یہاں یہی معنے ہیں۔ فئۃ : جماعت اور گروہ کو کہتے ہیں۔

لڑائی سے بھاگنا سنگین جرم ہے

۱۵۔ مسلمانو! جب کافروں سے لڑائی میں تمہارا سامنا ہو تو ان کی طرف سے پیٹھ نہ پھیرو۔ فرار من الزحف، جہاد میں سے نکل کر بھاگنا اور لڑائی میں کفار کو پیٹھ دکھانا بہت سخت گناہ اور اکبر الکبائر میں سے ہے۔ اگر کافر تعداد میں مسلمانوں سے دگنے ہوں۔ اس وقت تک فقہاء نے پیٹھ پھیرنے کی اجازت نہیں دی ہے[1] اصل ارشاد اذا لقیتم الذین کفروا زحفا ہے۔ زحفا منصوب ہے اور منصوب ہونے کی وجہ یہ ہے کہ الذین کفروا کا حال ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب ان کفار سے تمہارا مقابلہ ہو جو تم پر حملہ آور ہوں۔ یعنی تم ہجوم کی نہیں بلکہ دفاع کی پوزیشن میں ہو تو دشمن کو پیٹھ دکھانا تمہارے لیے ہرگز روا نہیں ہے۔ علامہ آلوسی نے پیٹھ دکھانے سے یہ لطیف نکتہ آفرینی کی ہے کہ جیبہ جائے کہ بھاگنا۔ یعنی دشمن اگر ہجوم کر کے سے اور وہ تعداد میں تم سے زیادہ ہو تو پھر اسے اہل ایمان جب میدان جنگ میں تمہارا ان

---

[1] افادات شیخ الاسلام

مقابلہ ہو تو بھاگنا بڑی بات ہے پشت بھی نہ پھیرو بلکہ ڈٹ کر اور جم کر مقابلہ کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب دشمن کی تعداد زیادہ ہو تب بھاگنا ناجائز ہے۔ اگر برابر ہو۔ یا ان کی تعداد اہلِ ایمان سے کم ہو پھر تو اور زیادہ حرام ہے۔

آیت میں "زحفاً" لاکر یہ بھی بتادیا کہ جنگ کے دو طریقے ہیں، ایک گوریلا جنگ اور دوسرا منظم فوج کشی۔ گوریلا جنگ یعنی اچانک حملہ، یہ اتنا زبردست حربہ ہے کہ حملہ آور اسے استعمال کرکے دشمن کو ہراساں کر دیتا ہے۔ اس کا اصول یہ ہے کہ حملہ کرو اور بھاگ جاؤ۔ اس کے لیے چھوٹے چھوٹے دستے نکلتے اور چھاپہ مار کر اپنی پناہ گاہوں میں آجاتے۔ اس کا کوئی مخصوص ضابطہ نہ تھا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ طریق کار مدینہ تشریف لانے کے بعد دشمن کو ہراساں کرنے اور اس کی تجارتی شاہراہ پر قبضہ کرنے کے لیے اختیار کیا۔

۱۔ حضور انور نے قتال کی اجازت کے بعد ہجرت کے ساتویں مہینہ میں سب سے پہلا فوجی دستہ حضرت حمزہ ابن عبدالمطلب کی کمان میں تیس مہاجرین پر مشتمل قریش کے ایک تجارتی قافلہ کو روکنے کے لیے روانہ کیا۔ یہ قافلہ ابوجہل کی زیرِ سرکردگی میں تین سو قریشیوں کا شام سے واپس آرہا تھا۔ حضرت حمزہ سیف البحر تک پہنچے۔ ایک شخص نے بیچ بچاؤ کردیا اور مقابلہ نہ ہو سکا۔

۲۔ اس کے بعد آپ نے، ہجرت کے آٹھویں ماہ شوال میں ۶۰ مہاجرین کا ایک دستہ حضرت عبیدہ ابن الحارث کی کمان میں رابغ روانہ کیا۔ یہ حضرات جب ثنیہ مراد پر پہنچے تو وہاں ۲۰۰ قریش ابوسفیان کے ساتھ تھے، کوئی حملہ نہیں ہوا۔

۳۔ ہجرت کے نویں مہینہ ذی قعدہ میں بیس سواروں کا دستہ حضرت سعد بن ابی وقاص کی کمان میں قریش کی ایک جماعت کو روکنے کے لیے خرار روانہ کیا۔ یہ لوگ چھپ کر رات کو سفر کرتے تھے۔ پانچویں دن صبح کو خرار پہنچے تو معلوم ہوا کہ قریش کا قافلہ جا چکا ہے۔

۴۔ ہجرت کے بارہویں ماہ صفر میں خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مقام ودان تک قریش کی ایک جماعت کی مزاحمت کی خاطر تشریف لے گئے مگر وہ لوگ نہ ملے۔ آپ واپس تشریف لے آئے۔

۵۔ ہجرت کے تیرھویں مہینے ماہ ربیع الاوّل میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ۲۰۰ صحابہ کرام لے کر قریش کی ایک جماعت کو روکنے کے لیے بواط تک تشریف لے گئے۔ قریش کا یہ قافلہ امیہ ابن خلف کی نگرانی میں ۱۰۰ قریشیوں ۲۵۰۰ اونٹوں پر مشتمل تھا۔ لیکن قافلہ نہ ملا۔ آپ واپس تشریف لے آئے۔

۶۔ کرز بن جابر نے مدینہ کے اطراف میں گھیر ڈالا۔ حضور خود اس کے تعاقب کے لیے روانہ ہوئے۔ وادی سفوان تک آپ تشریف لے گئے جو بدر کے قریب ہے۔

۷۔ اس کے بعد ہجرت کے سولہویں ماہ جمادی الآخرہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ۲۰۰ مہاجرین کے ساتھ قریش کی مزاحمت کے لیے نکلے۔ ینبع کے جنوب میں ایک مقام تک تشریف لے گئے جس کا نام ذوالعشیرہ ہے۔ لیکن وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ قریش کی جماعت جا چکی ہے۔

۸۔ ہجرت کے سترہویں مہینے یعنی ماہ رجب میں قریش کی نقل و حرکت معلوم کرنے کے لیے حضور نے حضرت عبداللہ بن جحش کو بارہ آدمیوں کے ساتھ روانہ کیا۔ یہ واقعہ آپ معالم القرآن کی دوسری جلد میں پڑھ چکے ہیں۔

یہ سب گوریلا جنگ کی صورتیں تھیں۔ اس آیت میں ان کا حکم بیان نہیں ہو رہا ہے بلکہ جنگ کی دوسری صورت منظم فوج کشی کا اس میں حکم بیان ہو رہا ہے۔ منظم فوج کشی کا ایک ضابطہ تھا جس کی پابندی فوجوں کو کرنی پڑتی تھی۔ آیت میں "زحفاً" کا لفظ اسی لیے استعمال ہوا ہے تاکہ واضح ہو جائے کہ اس کا تعلق ان سرایا سے نہیں جو اچانک حملہ کے لیے گوریلا جنگ میں روانہ کیے جاتے ہیں۔ گویا اس آیتِ گرامی کے ذریعے مسلمانوں کو غزوۂ بدر کے بعد پیش آنے والی جنگوں کے بارے ہدایات دی جا رہی ہیں اور بتایا جا رہا ہے کہ دشمن سے جب فوجی مقابلہ ہو تو میدانِ جنگ سے بھاگنا حرام ہے اور اس کے مفہوم میں یہ بات بھی داخل ہے کہ مسلمانوں کی فوج کی تربیت اعلیٰ پیمانہ پر کرنی چاہیے۔ فوجی تربیت کا مقصد صرف ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ فوج پامردی اور قابلیت سے لڑ سکے۔ یہ تربیت سپہ سالار سے ادنی سپاہی تک سب کے لیے لازم ہے۔ فوجی تربیت کا اوّلین اور لازم ترین اصول نظم ہے اس کے ساتھ ہی جسمانی اور دماغی تربیت کی جاتی ہے۔ جسمانی تربیت سے سپاہی سخت جان بنتا ہے

اور دماغی تربیت سے احکام کی تعمیل عقلمندی سے کرتا ہے۔ اس طرح سپاہی میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ نظم و ترتیب سے فوج ایک اعلیٰ درجہ کا مضبوط ہتھیار بن جاتی ہے اس کو دشمن کے خلاف کامیابی سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جس طرح نماز کے حکم کے ساتھ وہ تمام چیزیں خود بخود واجب ہو جاتی ہیں جن کے بغیر نماز کی اقامت نہیں ہو سکتی اسی طرح اس کہنے کے ساتھ کہ اذا لقیتم الذین کفروا زحفا" وہ تمام چیزیں خود بخود واجب ہوتی ہے جو دشمن کے مقابلہ کے لیے ناگزیر ہیں۔ جنگ میں دشمن سے مقابلہ کی تیاری سیاسی، اخلاقی اور مادی تینوں طرح کی ہوتی، قرآن کا مطالبہ ہے۔ میدان جنگ میں دشمن کے مقابلے پر ڈٹنے کے لیے فوج میں عزم ہمت، نظم و ضبط، عقل و فہم جسمانی طاقت اور مصائب کی برداشت کی قوت کا ہونا ضروری ہے۔ لڑائی کے میدان میں اخلاقی قوتوں کی خاص آزمائش ہوتی ہے۔

اسی اہمیت کے پیش نظر قرآن نے میدان جنگ سے فوجیوں کے بھاگ جانے سے روکا ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے میدان جنگ سے بھاگنے کو گناہ کبیرہ بتایا ہے۔

امام بخاری اور امام مسلم نے صحیحین میں حضرت ابوہریرہ کے حوالہ سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی نقل کیا ہے۔

مسلمانو! سات تباہ کن چیزوں سے بچ کر رہو۔ دریافت کیا گیا یا رسول اللہ وہ کیا ہیں؟ فرمایا، اللہ کے ساتھ شرک کرنا، جادو کرنا، ناحق کسی کو مار ڈالنا، سود کھانا، مال یتیم کھانا۔ میدان جنگ سے بھاگ جانا، اور پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانا۔

اور آیت میں یہ بھی اشارہ ہے کہ مسلمانوں کی جماعت میں یکجہتی و اتحاد فرض ہے انتشار باہمی بھی وہ ہی نتیجہ پیدا کرتا ہے جو فوجیوں کا میدان جنگ سے بھاگ آنا، جہاد سے روگردانی اور بھاگ آنا صرف اس لیے حرام ہے کہ اس سے اسلام کی اجتماعی قوت کو نقصان پہنچے گا تو افتراق باہمی کیسے جائز ہو سکتا ہے۔

جنگ سے فرار کی مستثنیٰ صورتیں

۱۹- اور جو شخص لڑائی کے موقعہ پر پیٹھ پھیرے گا تو وہ بلاشبہ خدا کے

غضب کا نشانہ بن گیا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور جہنم بدترین ٹھکانا ہے۔ مگر ہاں جو شخص لڑائی کی مصلحت سے ہٹ جائے یا اپنے گروہ کی طرف جگہ لینی چاہے وہ اس سے مستثنیٰ ہے یعنی اگر پسپائی کسی جنگی مصلحت سے ہو۔ مثلاً پیچھے ہٹ کر حملہ کرنا زیادہ مؤثر ہے یا ایک جماعت سپاہیوں کی مرکزی فوج سے الگ ہو گئی وہ اپنے بچاؤ کے لیے پسپا ہو کر مرکز سے ملنا چاہتی ہے تو ایسی پسپائی جرم نہیں ہے۔ گناہ اس وقت ہے جبکہ پسپائی صرف لڑائی سے جان بچانے کی نیت سے ہو۔[1]

مطلب یہ ہے کہ اس مستثنیٰ کی وہ صورتیں ہیں جو کوئی سپاہی کسی جنگی تدبیر کے لیے اختیار کرتا ہے یا کوئی ایسی صورت اس کے سامنے آگئی ہے کہ وہ اپنے ایک مورچہ سے ہٹ کر اپنے کسی مورچہ کی طرف سمٹنا چاہتا ہے، یعنی جو چیز حرام ہے وہ فرار کی نوعیت کا پیٹھ دکھانا ہے وہ پیچھے ہٹنا اس سے مستثنیٰ ہے جو تدبیر جنگ کی نوعیت کا ہو۔

ان آیات سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ مدمقابل اگر افرادی طاقت اور قوت و شوکت کے لحاظ سے اہل ایمان سے میدان جنگ میں برتر ہوں تو ان کے مقابلہ سے مسلمانوں کے لیے بھاگنا بجز ان مذکورہ بالا دو صورتوں کے جائز نہیں ہے لیکن اگر دشمن کی تعداد بہت زیادہ ہو پھر کیا کرنا چاہیے۔ اسی سورت کی آیت الآن خفف اللہ نمبر ۶۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ میدان جنگ میں ایک مسلمان کو کم از کم دو دشمنوں پر بھاری ہونا چاہیے لہٰذا اگر دشمن دو گنے سے بھی زیادہ ہوں اور مسلمان لڑنے میں مصلحت نہ سمجھیں تو ایسا کر سکتے ہیں لیکن اس صورت میں بھی عزیمت یہی ہوگی کہ خدا پر بھروسہ کریں اور لڑنے سے منہ نہ موڑیں۔ اس حکم کو خاص جنگ بدر کے لیے سمجھنا صحیح نہیں ہے کیونکہ اعتبار عموم لفظ کا ہے نہ کہ خصوص سبب کا اور آیت میں یومئذ سے لڑائی کا وقت مراد ہے بدر کا دن نہیں۔ اس کی تائید کہ آیت میں یومئذ سے مراد لڑائی کا وقت مراد ہے اس سے بھی ہوتی ہے کہ آیت کا نزول بدر کے بعد ہوا ہے۔ اصل یہ ہی ہے کہ آیت کا منطوق عام ہے اگرچہ کچھ صحابہ و تابعین نے اسے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

بدر کے لیے مخصوص قرار دیا ہے۔ مگر حافظ ابن کثیر نے صیغۂ مجہول لا کر اس کی تضعیف کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور کچھ نے اس سے زیادہ گنجائش پیدا کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ صرف صحابہ کے لیے حرام تھا کیونکہ جہاد ان پر فرض عین تھا۔ لیکن یہ بات بھی کچھ وزن نہیں رکھتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ دشمن کے شدید دباؤ پر صرف پسپائی ناجائز نہیں ہے جبکہ اس کا مقصد اپنے عقبی مرکز کی طرف پلٹنا ہو یا اپنی ہی فوج کے کسی دوسرے حصہ سے ملنا ہو۔ جو چیز حرام کی گئی ہے وہ فرار ہے جو کسی جنگی مقصد کے لیے نہیں بلکہ محض بزدلی کے لیے شکست خوردگی کی وجہ سے ہوتی ہے اور اس لیے ہوتی ہے کہ بھاگنے والے کو اپنے مقصد کے بجائے جان زیادہ پیاری ہوتی ہے۔ اس فرار کو بڑے گناہوں میں شمار کیا گیا ہے چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ

تین گناہ ایسے ہیں کہ ان کے ساتھ کوئی نیکی فائدہ نہیں دیتی ہے ایک شرک دوسرے والدین کی نافرمانی، تیسرے میدان جنگ سے فرار۔

اس فعل کو اتنا بڑا گناہ قرار دینے کی وجہ صرف یہ ہی نہیں ہے کہ یہ ایک بزدلانہ فعل ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک شخص کا فرار بسا اوقات ایک پوری پلٹن کو اور ایک پلٹن کا فرار، ایک پوری فوج کو بدحواس کر کے بھگا دیتا ہے۔

غزوۂ احد میں پسپائی کو شیطانی کردار قرار دیا ہے انما استزلھم الشیطان ببعض ما کسبوا۔ لیکن جرم کی اس سنگینی کے باوجود اللہ نے سب کو معاف کر دیا۔ ولقد عفا اللہ عنھم۔ یہی صورت حال غزوۂ حنین میں پیش آئی۔ بہر حال جنگ سے فرار قرآن وسنت کی روشنی میں مذکورہ بالا صورتوں کے علاوہ سنگین جرم ہے۔ یہ جرم کی سنگینی ہے کہ ایک بار ایک غیر فوجی مہم میں عبداللہ ابن عمر دشمن سے بھاگ کر مدینہ آگئے۔ اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت گرامی میں آ کر اعتراف کیا کہ ہم مقابلہ سے بھاگ کر آگئے۔ چونکہ یہ فوجی مقابلہ نہیں بلکہ گوریلا جنگ بھی اس لیے حضور اقدس نے یہ کہہ کر ان کو تسلی دی اور فرمایا انتم العکارون وانا فئتکم تم بھاگنے والے نہیں بلکہ کمک حاصل کر کے دوبارہ حملہ کرنے والے ہو اور میں تمہاری کمک ہوں۔ اگرچہ یہ واقعہ یزید ابن ابی زیاد کے حوالہ سے آیا ہے۔ اکثر ناقدین رجال نے ان کو ضعیف بتایا ہے۔ لیکن اس کے باوجود امام ترمذی نے اس کی تحسین کی ہے

بہر حال تاریخی حیثیت واقعہ کی کچھ ہو میں تو اس سے یہی سمجھتا ہوں کہ عبداللہ ابن عمر نے گوریلا دستوں اور باقاعدہ منظم فوجی جنگ کا حکم ایک سمجھ لیا تھا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہہ کر اس کی اصلاح فرمادی انتم العکارون۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت گرامی کے مصداق کے بارے میں شارحین قرآن نے ایک سے زیادہ خیالات پیش کئے ہیں۔

ایک یہ کہ حکم عام ہے اور تا قیام قیامت آیت قرآنی کا مطالبہ یہی ہے کہ دشمن حملہ آور ہو تو مقابلہ میں ڈٹ جانا چاہیئے چاہے تعداد زیادہ ہو لیکن سورۃ انفال میں آنے والی آیت نے یہ بات کھول دی ہے کہ اپنے سے دوگنی تعداد کا یہ حکم ہے۔ اس سے زیادہ تعداد ہو تو وہ اس میں داخل نہیں ہے۔ بنا بریں عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں جو تین گنا کے سامنے سے ہٹ گیا وہ بھاگنے والا نہیں، ہاں جو دو گنے سے بھاگا وہ بھگوڑا ہے۔

دوسری رائے یہ ہے کہ یہ آیت صرف بدر والوں کے بارے میں ہے یعنی بدر کے روز یہ حکم تھا اس کے بعد نہیں۔

تیسری رائے یہ ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے اور اس کی ناسخ انفال میں آنے والی آیت تخفیف ہے۔

ہمیں اس موضوع پر شرح السیر الکبیر میں امام شمس الدین السرخسی کی رائے زیادہ پسند آئی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

> جنگ سے گریز پائی صرف گناہ نہیں بلکہ گناہ کبیرہ ہے۔ حضور نے ان پانچ گناہوں میں شمار کیا ہے جن کا کفارہ کوئی نہیں ہے اور اس کو ہلاکت خیز گناہوں کی فہرست میں شامل کیا ہے۔ اگر مسلمانوں کی افرادی طاقت دشمن کی افرادی قوت سے آدھی ہو۔ ایک اور دو کی نسبت ہو تو مسلمانوں کے لیے بھاگنا حرام ہے۔ آغاز اسلام میں حکم یہ تھا کہ مسلمانوں کی عددی طاقت میں دشمنوں کے مقابلہ میں اگر ایک اور اس کی نسبت ہو تو ان کے لیے بھاگنا جائز تھا۔ اس کے بعد بھاگنے کے حرام ہونے کا حکم باقی ہے لیکن عددی تناسب کو ایک اور دس سے ہٹا کر ایک اور دو کی نسبت کر دی۔

لیکن یہ یاد رہے کہ یہ اس وقت ہے جبکہ مسلمانوں کے پاس سامان جنگ موجود ہو۔ بے ہتھیار کو ہتھیار والے کے سامنے ہٹ جانا، بے تیر کو تیر انداز کے سامنے سے دُور ہو جانا۔ توپ کے دہانے کے سامنے سے ایک طرف ہو جانا جنگ سے بھاگنا نہیں ہے۔ طاقت موجود ہو تو پھر اگر مسلمانوں کی فوج بارہ ہزار ہو، دشمن خواہ زیادہ ہو اس وقت بھاگنا بالکل ناجائز ہے۔

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۪ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَ
لٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ؕ اِنَّ
اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۷﴾ ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۸﴾
اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ ۚ وَاِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرٌ
لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ ۚ وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ
شَيْـًٔا وَّلَوْ كَثُرَتْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹﴾

لہٰذا تم نے اے مسلمانو میدانِ جنگ میں کافروں کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے قتل کیا ہے۔[۲۰] اور اے پیغمبر تم نے جب مشتِ خاک پھینکی تھی تو تم نے اس کو دشمن تک نہیں پھینکا بلکہ اللہ نے دشمنوں تک پہنچائی۔[۲۱] اور یہ اس لیے ہوا تھا تاکہ اس طریقہ سے وہ اہلِ ایمان کو بہترین آزمائش میں آزمائے، بلاشبہ اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔[۲۲] یہ تو ہو چکا

اور یقین کرو کہ اللہ کافروں کو کمزور کر رہا ہے[۲۳]۔ اگر تم فتحمندی کے خواہاں تھے تو فتح تم کو مل گئی اور اگر باز رہو گے تو یہ تمہارے لیے اچھا ہے اور اگر تم پلٹ جاؤ گے تو ہم بھی پلٹ جائیں گے اور یاد رکھو کہ تمہاری جماعتی اکثریت تمہارے کچھ کام نہ آئے گی اللہ ایمان والوں کے ساتھ ہے[۲۴]۔

بدر، دُعائی تدبیر کے اور نتائج

جنگ بدر کی غیر معمولی کامیابی کے بعد ہر مسلمان اپنے کارنامول کو بیان کرتا۔ کوئی کہتا کہ میں نے جنگ میں ایسی بہادری کا مظاہرہ کیا، کوئی اپنی جفاکشی اور جانفشانی کی داستان سناتا، کوئی بتاتا کہ میں نے فلاں کو مارا ہے۔ اس طرح سب اپنے کارنامے بیان کرنے لگے۔ تھوڑے تھے بہتوں کو مار بھگایا، کمزور تھے زورآوروں کے مقابلے میں بازی جیت گئے ایسے موقعہ پر اپنی قوت پر ناز ہونا ایک طبعی چیز ہے اور یہ سمجھا کہ ہم بھی کچھ ہیں ایک حقیقت ہے۔ اہل ایمان کے لیے ایسا خیال مضر بھی ہے اور غلط بھی۔ اس خیال کی اصلاح بروقت ضروری تھی۔ چنانچہ ان آیات میں اللہ سبحانہٗ نے اہل ایمان کو جتا دیا کہ تم نے اپنے مدِمقابل کو جو شکست دی ہے یہ تمہارا کارنامہ نہیں ہے بلکہ اللہ سبحانہٗ کا فضل و انعام ہے۔ یہی حقیقت ہے اس پر یقین کرنے سے تمہاری اخلاقی قوت برتر ہو گی اور تم اس سے زیادہ خطرناک مواقع پر ڈٹ کر مقابلہ کر سکو گے۔ لیکن یہ ساری کہانی شارحین قرآن کی قیاس آرائی ہے ورنہ قرآن کا اندازِ بیان بالکل مربوط ہے۔ اس میں ایسا کوئی خلا نہیں جس سے کسی واقعہ کی نشاندہی ہوتی ہو جیسا کہ آپ کو

تشریح میں خود محسوس ہو جائے گا۔

اہل ایمان کو خدا پر اعتماد کرنا چاہیے

۲۰۔ اے مسلمانو! تم نے ان کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کو قتل کیا ہے۔ تم بے سروسامان قلیل التعداد مسلمانوں میں اتنی قدرت کہاں تھی کہ محض تمہارے زور بازو سے کافروں کے ایسے ایسے منڈ مارے جاتے یہ تو خدا ہی کی قدرت کا کرشمہ ہے کہ اس نے ایسے متکبر سرکشوں کو فنا کے گھاٹ اتارا۔ یہ ضرور ہے کہ بظاہر کام تمہارے ہاتھوں سے لیا گیا اور ان میں وہ فوق العادت قوت پیدا کر دی جسے تم اپنے کسب و اختیار سے حاصل نہ کر سکتے تھے۔ یہ اس لیے کیا گیا کہ خدا کی قدرت کا اظہار ہو۔ لہ

شارحین قرآن نے اس آیت پر جو تشریحی نوٹ نوٹ لکھے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے۔

حافظ ابن جریر فرماتے ہیں:

اللہ سبحانہ نے مشرکین کے قتل کی اہل ایمان سے نفی کی ہے اور اس کی نسبت اپنی طرف کی ہے صرف یہ بتانے کے لیے کہ اسباب کی حیثیت حقیقی نہیں ہے۔ حقیقی اور واقعی حیثیت تو خالق اسباب کی ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ انسانی کردار میں اللہ کا کوئی حصہ نہیں یہ ان کے خلاف کھلی حجت ہے۔

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ:

کہ فاعل حقیقی اور موثر اصلی اللہ سبحانہ کی ذات گرامی ہے بندہ کا حصہ تو صرف کسب کے درجہ تک ہے۔ یہ قتل تمہاری قوت سے نہیں بلکہ اللہ کی امداد سے ہوا ہے ورنہ تم میں اس کا یارا کب تھا کہ اپنے سے سہ چند قوت کو پچھاڑے۔

علامہ نیشاپوری نظام الفرقان میں لکھتے ہیں:

اکثر مفسرین کے خیال میں یہ ہے کہ مسلمانوں نے جب قریش کو شکست دے دی تو ان میں کچھ تفاخر رونما ہو گیا ان سے کہا گیا کہ تم نے قتل نہیں کیا

لہ افادات شیخ الاسلام

بلکہ اللہ نے قتل کیا ہے ۔

علامہ قرطبی، امام رازی، علامہ زمخشری، علامہ آلوسی سب نے اسی کے قریب قریب لکھا ہے ۔ لیکن قرآن کی تعبیر خود بتا رہی ہے ۔ اگر یہ آیات غزوہ بدر کے بعد نازل ہوئی ہیں، جیسا کہ عام شارحین کی رائے ہے ۔ تو یہاں فاء کا استعمال واضح اور صاف ہے ۔ گویا یہ کہا گیا ہے اے پیروان دعوت ایمانی کبھی میدان جنگ سے منہ نہ موڑو کیونکہ تمہیں ڈٹنے اور جمنے کا مشرکین سے زیادہ مظاہرہ کرنا چاہیے ۔ تم کو ہی اللہ نے افرادی قوت کم ہونے اور سامان نہ ہونے کے وقت مدد عطا فرمائی ہے اور تمہیں ہی اللہ کی تائید حاصل رہی ۔ تمہاری ہی اللہ نے ڈھارس باندھی اور تمہاری ہی اللہ نے میدان جنگ میں قدم جمائے جب یہ سب کام اللہ نے کیے تو پھر تم نے اپنی مادی طاقت سے ان کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے تمہارے ہاتھوں سے اپنی تائید غیبی کے ذریعہ قتل کرایا ہے ۔ اسی آیت کے ہم معنے قرآن میں یہ آیت ہے ۔

قاتلوھم یعذبھم اللہ بایدیکم و یخزھم

ان سے جنگ کرو اللہ تمہارے ہاتھوں ان کو عذاب دے گا اور ان کو ذلیل و خوار کرے گا ۔

اس صورت میں فا شرط مقدر کے جواب میں آئی ہے گویا پوری بات یوں تھی ۔

جب صورت حال یہ ہے تو تم نے ان کو اپنی مادی طاقت سے قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے اپنی تائید غیبی سے قتل کیا ہے ۔

اور ابوحیان اندلسی کے خیال میں یہ فا جواب شرط کی نہیں ہے بلکہ جملوں میں باہم ربط کے لیے آئی ہے ۔ کیونکہ پہلے حکم ہوا تھا فاضربوا فوق الاعناق ۔ اسی حکم کی پا بجائی سبب بنی ہے، مشرکین کے قتل کا ۔ اب ان کو بتایا جا رہا کہ تم فعل میں استقلالی حیثیت نہیں رکھتے کیونکہ اس پر قدرت عطا کرنا اللہ کا کام ہے ۔

نبوت کی مشت خاک

۲۱ ۔ اور اے پیغمبر تم نے جب مشت خاک پھینکی تھی تو تم نے اس کو دشمن تک نہیں پھینکا بلکہ اللہ نے دشمنوں تک پہنچائی ۔ جب جنگ کی شدت ہوئی تو

حضور نے ایک مٹھی کنکریاں لشکر کفار کی طرف پھینکیں اور تین مرتبہ شاھت الوجوہ فرمایا خدا کی قدرت سے کنکریوں کے ریزے ہر کافر کی آنکھ میں پہنچے۔ وہ سب آنکھیں ملنے لگے۔ ادھر سے مسلمانوں نے فوراً دھاوا بول دیا۔ آخر بہت سے کفار کھیت رہے۔ اسی کو فرماتے ہیں گو بظاہر کنکریاں تم نے اپنے ہاتھ سے پھینکیں تھیں لیکن کسی بشر کا یہ فعل عادۃً ایسا نہیں ہو سکتا کہ مٹھی بھر کنکریاں ہر سپاہی کی آنکھ میں پڑ کر ایک مسلح لشکر کی ہزیمت کا سامان بن جائے۔ یہ صرف خدائی ہاتھ تھا جس نے مٹھی بھر کنکریوں سے فوجوں کے منہ پھیر دیے۔[1]

محدثین اور مورخین کے بیان کے مطابق حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ممتاز صحابہ کے ساتھ میدان جنگ کا معائنہ کیا اور جگہ جگہ بتانے گئے کہ دشمن کا فلاں افسر فلاں جگہ ہو گا۔ حضور اقدس کا انتہائی خطرہ کے موقعہ پر اس درجہ اطمینان کے اظہار سے فوج میں جو ولولہ اور خود اعتمادی پیدا ہوتی ہو گی۔ اس کا اندازہ لگالینا مشکل نہیں ہے۔ حضور اقدس نے اپنی اس چھوٹی سی فوج کے لیے رضاکار عورتیں بھی مقرر کی تھیں۔ زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔ سپاہیوں کو پانی پلاتیں۔ میدان میں دشمن کے گرے ہوئے تیر اٹھا کر مسلم تیر اندازوں کو دیتیں۔

جب آپ فوج کا معائنہ کر کے ہدایات جاری کر چکے تو آپ چند صحابہ کے ساتھ اس پہاڑی ٹیلہ پر پہنچے۔ جہاں آپ کے لیے عریش بنائی گئی تھی۔ یہاں سے میدان جنگ صاف نظر آرہا تھا۔ دشمن کے حملے کو دیکھ کر آپ نے آسمان کی طرف نظر اٹھائی اور مٹھی بھر خاک اٹھا کر دشمن کی طرف شاھت الوجوہ کہہ کر پھینکی۔ اس کے فوراً بعد پہاڑ کی طرف سے ایک ہوا کا جھونکا آیا جس کے ساتھ قریش کی طرف ریت کا طوفان بڑھا اور ان کے کیمپ میں ابتری پھیل گئی۔ ایک طرف مسلمانوں کے تیروں کی بارش تھی۔ دوسری طرف ریت کا طوفان اور تیسری طرف حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حملہ کرنے والے دستہ کو دشمن کے دائیں بازو پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ اس دستہ میں سید الشہداء حمزہ، علی مرتضیٰ اور ابو دجانہ وغیرہ جیسے نامور بہادر شامل تھے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

قریش کے اسپ سوار اور شترسوار ریت کے دلدل میں پھنس گئے۔ اس لیے دشمن کے اوسان خطا ہو گئے۔ ابوجہل نے پوری طاقت سے حملہ کیا مگر کارگر نہ ہوا۔ خود بھی دو بچوں سے اسی حملے میں مارا گیا اور دوسرے ساتھی بھی کام آئے۔ قریش کے پاؤں اکھڑ گئے اور افراتفری میں بھاگ اٹھے۔

قرآن نے اسی واقعہ کی یہاں تصویر پیش کی ہے۔ بدر میں کنکریاں پھینکنے کا واقعہ مختلف روایتوں میں آیا ہے۔ اور حافظ عسقلانی نے بھی لکھا ہے۔ اگرچہ علامہ طیبی نے یہ کہہ کر انکار کیا ہے کہ بدر کے دن کنکریوں کا واقعہ نہیں ہوا بلکہ حنین کی لڑائی میں یہ واقعہ ہوا ہے۔ حافظ سیوطی نے علامہ طیبی کی بے خبری پر افسوس کیا ہے اور لکھا ہے کہ ان کا حفاظِ حدیث میں شمار نہیں ہے۔ حدیث میں ان کا مبلغ علم صحاح ستہ مسند احمد مسند دارمی ہے اور بس۔ محدثین نے یہ واقعہ لکھا ہے اس لیے انکار بے معنی ہے۔

شارحینِ قرآن اس آیت کی تشریح میں تصوف و کلام کی وادیوں میں نکل گئے۔ جبریہ نے اس آیت کریم انسان کے مجبور ہونے کا پروانہ خیال کیا۔ صوفیا نے اس سے وحدۃ الوجود کی راہ نکالی۔ اشاعرہ نے کسب اور خلق تعلیم باہم ہم آہنگی پیدا کی لیکن آیت قرآنی سب افکار و نظریات سے بالا ہے اور ان تاویلات سے پاک ہے۔ امام رازی اور علامہ آلوسی نے ان ہی موضوعات کو پیش نظر رکھ کر سوالات و جوابات کا ایک عجیب انداز پیش کیا ہے۔

دراصل ان بزرگوں کی نظر اس حقیقت سے اوجھل ہو گئی ہے کہ اس آیت میں اعجاز نبوت کی نشاندہی ہو رہی ہے۔ اعجاز کی حقیقت یہی ہے کہ وہ فعلِ خداوندی ہوتا ہے اور نبوت کی حیثیت ایک آلہ کی ہوتی ہے۔ معجزے کے بارے میں عام لوگوں میں یہ غلط عقیدہ قائم ہو گیا تھا کہ نبی براہِ راست عالمِ کائنات میں تصرف کر سکتا ہے۔ چنانچہ موجودہ انجیل کے مصنفوں نے حضرت عیسٰی کے معجزات کو جس انداز سے پیش کیا ہے اس نے عیسائیوں کے دلوں میں یہ یقین پیدا کر دیا ہے کہ یہ تمام کائنات حضرت عیسٰی کے قبضے میں تھی اور وہ اس میں جس طرح چاہتے تھے تصرف کرتے تھے۔ یہی بنیادی پتھر ہے جس پر انجیل کے مصنفوں نے دیوارِ کج کھڑی کی۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ توحید کی عمارت اس پر قائم نہ رہ سکی۔ قرآن عزیز نے نہایت شدت اور نہایت اصرار سے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ معجزات اور نشانات پیغمبر کی قوت اور ارادہ سے نہیں بلکہ خدا کی قدرت اور مشیت سے

ظاہر ہوتے ہیں۔ شاہ عبدالحق محدث دہلوی مدارج النبوت میں لکھتے ہیں:

معجزہ نبی کا فعل نہیں ہوتا بلکہ خدا تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے جس کو وہ نبی کے ہاتھ پر ظاہر کرتا ہے۔

شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں:

معجزہ کا صادر ہونا اور ایمان کا قبول کرنا نبی کی خواہش اور اختیار سے نہیں ہوتا تاوقتیکہ اللہ تعالیٰ نہ چاہے اور ارادہ نہ فرمائے وہ واقع نہیں ہوتا۔

فتوح الغیب میں شیخ عبدالقادر جیلانی لکھتے ہیں:

معجزہ اور کرامت خدا تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے جو بندہ کے ہاتھ پر اس کی تصدیق و تکریم کی غرض سے ہوتا ہے۔ معجزہ بندہ کا فعل نہیں ہے جو اس کے ارادہ و اختیار سے صادر ہو جیسے کہ دوسرے افعال اختیاریہ ہوتے ہیں۔

یہ قرآن عزیز کے اسی اظہار حقیقت اور خالص تعلیم کا اثر تھا کہ اسلام میں توحید و نبوت کی حقیقتیں مشتبہ نہیں ہوئیں۔ اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی میں ادنیٰ سا شائبہ بھی الوہیت کا مسلمانوں نے کبھی تسلیم نہیں کیا اور تمام مذاہب عالم پر توحید کا علمبردار صرف اسلام رہا۔ بہرحال کنکریاں پھینکنا اگرچہ حضور اقدس کا معجزہ تھا مگر یہ فعل صرف حق تعالیٰ شانہٗ کا تھا۔ اسی لیے جو چیز حضور کے اختیار میں نہ تھی اور جس میں آپ کی قدرت اور کسب کو کوئی دخل نہ تھا اس کی صاف لفظوں میں اللہ سبحانہٗ نے نفی فرما دی حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

یعنی وہ تو صرف اللہ کی ذات تھی جس نے یہ ریزے ان کافروں تک پہنچائے اور ان کو ذلیل کیا۔ یہ چیز آپ کے اختیار میں نہ تھی۔

اور قاضی بیضاوی فرماتے ہیں:

اے اللہ کے پیغمبر تم نے وہ سنگریزے نہیں پھینکے کہ تم ان کو دشمنوں تک پہنچا دیتے اور تمہیں اس پر قدرت نہ تھی جس وقت تم نے بظاہر سنگریزے پھینکے بلکہ اللہ نے پھینکے یعنی پھینکنے کے مقصد کو پورا کیا اور

ان سب کی آنکھوں تک پہنچا دیا تا آنکہ وہ شکست کھا گئے۔

معرکہ بدر میں حکمت خداوندی

۲۲۔ اور یہ اس لیے ہوا تھا تاکہ اس طریقے سے وہ اہل ایمان کو بہترین آزمائش میں آزمائے بلا شبہ اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ یعنی یہ اس لیے کیا گیا کہ خدا کی قدرت ظاہر ہو اور مسلمانوں پر پوری مہربانی اور خوب طرح احسان کیا جائے بے شک خدا مومنین کی دعا و فریاد کو سننے والا اور ان کے افعال و احوال کو خوبی جانتا ہے۔ اور یہ بھی جانتا ہے کہ مقبول بندوں پر کس وقت کس عنوان سے احسان کرنا مناسب ہے۔[1] اس آیت گرامی کے ترجمہ و تشریح میں شارحین قرآن لکھتے ہیں۔ شاہ عبدالقادر نے اس کا ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ اللہ چاہتا تھا ایمان والوں پر اپنی جانب سے خوب احسان کرے بتحقیق اللہ ہے سنتا اور جانتا۔ مولانا اشرف علیؒ فرماتے ہیں کہ تاکہ اللہ مسلمانوں کو اپنی طرف سے خوب اجر دے بلا شبہ اللہ خوب سننے والا جاننے والا ہے۔ مولانا محمد ادریس اور مفتی محمد شفیع صاحب نے بھی یہی لکھا ہے۔ مولانا آزاد فرماتے ہیں یہ اس لیے ہوا تھا کہ اللہ اس کے ذریعے ایمان والوں کو ایک بہترین آزمائش میں ڈال کر آزمائے بلا شبہ اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں کہ یہ اس لیے ہوا کہ اللہ مومنوں کو ایک بہترین آزمائش سے کامیابی کے ساتھ گزار دے۔ لفظی ترجمہ یہ ہے تاکہ آزمائش کرے اللہ اہل ایمان کی اچھی آزمائش۔ مقصد سب کا ایک ہے حضرت شاہ صاحب نے بلا کے معنے احسان فرماتے ہیں۔ ان ہی معنے کو محققین نے اختیار کیا ہے۔ ابلاہ اللہ ابلاء حسنا اس وقت بولا جاتا ہے جب اللہ سبحانہٗ کسی کے ساتھ اچھا معاملہ کرے اور اسے نیکی کی توفیق دے کر آزمائے۔ زہیر شاعر کہتا ہے:

جزی اللہ بالاحسان ما فعلا بکم
وابلاھما خیر البلاء الذی یبلو

یعنی اللہ تعالیٰ نے ان دونوں سے وہ بہترین معاملہ فرمایا جو اپنے بندوں سے وہ کرتا ہے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اور انسان کو خیر و شر ہی سے آزمایا جاتا ہے

علامہ طیبی نے یہاں یہ نکتہ آفرینی فرمائی ہے کہ ابلا کے معنے ہیں کہ اللہ نے اہل ایمان کو میدانِ جنگ میں خوب آزمایا ہے ابلی الله عبادہ بلاحسنا کے معنے یہ ہیں کہ اللہ اپنے بندوں کو میدان میں اچھے جوہر نمایاں کیے۔ ابن الاعرابی کہتے ہیں کہ ابلی فلان اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی لڑائی میں یا سخاوت میں مثالی کارنامہ کرے۔ ابوالسعود مفسر فرماتے ہیں کہ لیبلی المومنین کا معطوف علیہ محذوف ہے۔ پوری بات یوں ہوگی میدانِ جنگ میں یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ اللہ سبحانہٗ اپنی تائید و نصرت کی شان دکھائے اور مسلمانوں کے جوہر اچھی طرح نمایاں کر دے۔

دونوں صورتوں میں یہ آیت شر کا بدر کے مقام کی نشاندہی کر رہی ہے۔ پہلے معنے کے لحاظ سے اس طرح کہ بدر کا معرکہ قائم ہوا ہے اس لیے کہ اللہ سبحانہٗ اپنے صحابہ کرام پر اپنے انعامات کی ارزانی فرمائے اور دوسرے معنے کے اعتبار سے اس طرح کہ بدر کا معرکہ قائم ہوا ہے اس لیے کہ اللہ سبحانہٗ صحابہ کی جواں مردی، شجاعت کے جوہر کی سرِعام نمائش کرے۔ دونوں میں مقامِ صحابہ کی نشاندہی ہے۔ شاید اسی لیے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے شرکائے بدر سے فرمایا ہے۔

جو چاہے کرو میں نے تمہیں بخش دیا ہے

زندگی میں اباحت کا نہیں گناہوں کی مغفرت کا پروانہ ہے۔ اسی لیے علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ اس بشارت کا تعلق دنیوی احکام سے نہیں ہے بلکہ آخرت سے ہے۔ آخر میں ارشاد ہوا ہے اِنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ یعنی اللہ بدر میں ان کی دعاؤں، طلبگاریوں، دہائیوں اور استغاثوں کو سن رہا تھا اور ان کے ارادوں، نیتوں، اقوال اور اعمال کو جانتا تھا۔

جہاد کفر کی کمزوری کا ذریعہ ہے

۲۳۔ یہ تو ہو چکا اور یقین کرو کہ اللہ کافروں کو کمزور کر رہا ہے۔ یعنی اس وقت بھی خدا نے کفارِ مکہ کے سارے منصوبے خاک میں ملا دیے اور آئندہ بھی ان کی تدبیروں کو سست کر دیا جائے گا۔[1] اصل ارشاد میں ذالکم آیا ہے۔ یہ مبتدا ہے محذوف

[1] افادات شیخ الاسلام

کی خبر ہے اگر اس محذوف کے چہرہ کو کھول دیا جائے تو پوری بات یوں ہوگی۔ معرکۂ بدر کی ایک حکمت یہ بھی کہ تم اللہ کے انعامات کی بارش ہو یا یہ کہ تمہاری جواں مردی اور شجاعت کا بول بالا ہو اس کے ساتھ معرکۂ بدر کی حکمت یہ بھی ہے کہ نہ صرف اب بلکہ مستقبل میں کافروں کی ساری سازشوں کو رسوا کیا جائے۔ اس سے یہ بات مترشح ہو رہی ہے کہ جن کو بدر میں شکست ہو چکی ہے۔ اب مستقبل میں ان کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، بدر کے بعد قریش مکہ کی کوئی تدبیر ان کے لیے سود مند نہیں آئی۔

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ یہ مستقبل کے لیے ایک اور بشارت ہے۔ بتایا جا رہا ہے کہ اللہ سبحانہ، مستقبل میں ان کی سازشوں کو ناکام بنا دے اور ان کے نظام کو ذلیل و رسوا کرے گا اور ان کو تباہی و بربادی کا نشانہ بنائے گا۔ جیسا کہ بتایا، تاریخ گواہ ہے ایسا ہی ہوا اس لحاظ سے یہ بھی حضور اقدس کا معجزہ ہے گویا یہ بھی نبوت کی دعائی تدبیر کا ایک جیتا جاگتا نتیجہ ہے۔

غزوہ بدر حضور اقدس کا معجزہ ہے

اب ہم قرآن کی تشریح میں اس جگہ آگئے ہیں جہاں ہمیں یہ بات صاف طور پر سمجھ لینی چاہیے کہ بدر کی جنگ صرف جنگ ہی نہیں ہے بلکہ رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک شاندار اعجازی کارنامہ ہے۔ جس طرح مختلف نبیوں کے زمانے میں دوسری قوموں کے لیے عذاب کے مختلف معجزات کا ظہور ہوا۔ اسی طرح جس قوم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تھے اس کے لیے غزوہ بدر معجزہ عذاب تھا۔ ہجرت سے پہلے حضور اقدس کی بد دعا سے پہلے قریش پر قحط کا عذاب آیا جو اس قدر سخت تھا کہ بھوک سے آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا تھا۔ آسمان کی طرف دیکھتے تھے تو دھواں سا نظر آتا تھا۔ کچھ لوگ سائے قریش نے خدمت نبوی میں آکر کہا کہ اے محمد تم رحمت و شفقت اور صلہ رحمی کی دعوت دیتے ہو۔ تم دیکھتے ہو کہ اس قحط سے قریش کا کیا حال ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی اور یہ بلا دور ہوئی مگر پھر قریش کی سرکشی کا وہی عالم ہو گیا۔ اس کے بعد معجزہ عذاب کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ چنانچہ ہجرت کے بعد بدر کا بطشۂ کبریٰ ان کی ہلاکت کی نشانی قرار پایا۔ قرآن حکیم نے

ہجرت سے پہلے ہی مکہ میں اپنا اعلان عام سنا دیا تھا۔ اس سے پہلے اس قحط کی پھر ان کے گڑگڑانے کی اور اس کے بعد یہ کہہ کر غزوہ بدر کی پیشین گوئی کی تھی یوم نبطش البطشۃ الکبریٰ انا منتقمون اس آیت میں یہ بتا دیا گیا ہے کہ البطشۃ الکبریٰ ان لوگوں کے لیے وہی حیثیت رکھتا ہے جو فرعون کے لیے غرق بحر کی تھی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ بطشہ کبریٰ والی آیت قریش کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ قریش نے جب نافرمانی کی حد کر دی تو حضور اقدس نے اللہ سے دعا کی تھی، اے اللہ ان کے لیے حضرت یوسف کے سات برس والا قحط نازل فرما۔ چنانچہ سخت قحط پڑا۔ مکہ والوں نے حضورؐ سے ازالہ قحط کے لیے دعا کی درخواست کی۔ آپ نے دعا کی اور بارش ہوئی۔ قرآن نے بتایا انا کاشفوا العذاب قلیلا انکم عائدون اچھا ہم تھوڑے دنوں کے لیے عذاب ہٹاتے ہیں لیکن تم پھر وہی کچھ کرو گے یعنی ایمان نہ لاؤ گے چنانچہ ایسا ہی ہوا تب اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے بدر کا دن مقرر فرمایا[1]

آپ نے یہ بات بارہا سنی ہوگی کہ صحن حرم میں جو روسائے قریش آپ کی نماز میں خلل انداز ہوتے تھے۔ آپؐ نے ان کا نام لے کر ہر ایک کے لیے بددعا کی تھی۔ اس سے پہلے کہ غزوہ بدر پیش آئے ہجرت کے بعد ہی آپ نے ان کی ہلاکت و بربادی کا اعلان کر دیا تھا۔ بدر سے پہلے حضرت سعد انصاری عمرہ کو گئے تھے۔ ابوجہل نے ان کو روکا اُمیہ نے بیچ میں دخل دینا چاہا۔ حضرت سعد نے کہا اُمیہ تم دخل نہ دو۔ حضورؐ نے فرمایا کہ تم ان کے ہاتھوں سے مارے جاؤ گے۔ یہ سن کر اُمیہ ڈر گیا۔ چنانچہ جب بدر کا موقع پیش آیا تو اس نے اسی ڈر سے جانے میں پس و پیش کی۔ لوگوں کے طعن سے اس نے جانا چاہا تو اس کی بیوی نے دامن تھام لیا اور کہا کیا تم کو اپنے یثربی دوست کی بات یاد نہیں[2]

جب غزوہ بدر کے لیے آپ مسلمانوں کو ساتھ لے کر نکلے تو اس وقت جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں مسلمانوں کے سامنے قریش کی دو جمعیتیں تھیں۔ ایک قریش کا تجارتی قافلہ جو بدر سے ہو کر مکہ جا رہا تھا۔ دوسرا روسائے قریش کا جنگی لشکر جو

---

[1] صحیح بخاری [2] صحیح بخاری کتاب المغازی

مسلمانوں سے لڑنے کے لیے نکلا تھا۔ خدا نے مسلمانوں سے وعدہ کیا تھا کہ ان دو جمعیتوں میں سے ایک ان کے ہاتھ لگے گی۔ عام مسلمان یہی سمجھتے تھے کہ تجارتی قافلہ ان کے ہاتھ آئے گا۔ لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اچھی طرح معلوم تھا کہ آج معمولی فتح و شکست کا نہیں بلکہ اس بطشۃ الکبریٰ کا دن ہے جس کا بارگاہ الٰہی میں مدت سے وعدہ تھا۔ رات کو جب مسلمان بدر کے پڑاؤ پر پہنچے تو انہیں یہ فکر ہوئی کہ قریش کے تجارتی قافلہ کا پتہ لگایا جائے۔ چنانچہ مسلمان مخبر ادہر اُدہر گئے اور ایک چرواہے کو پکڑ لائے اور اس سے قریش کے قافلہ کا حال پوچھنے لگے۔ اس نے جواب دیا کہ قریش کے قافلہ کا تو مجھے علم نہیں البتہ اُن کا لشکر ادہر پڑا ہے۔ یہ سن کر مسلمانوں نے اس کو مارا کہ یہ ہم سے صحیح حال چھپاتا ہے۔ مار کھانے پر اس نے کہا اچھا ٹھہرو قافلہ کا حال بتاتا ہوں۔ جب لوگ ملسے چھوڑ دیتے تو پھر وہ یہی کہتا کہ مجھ کو قافلہ کی خبر نہیں البتہ یہ جانتا ہوں کہ ادہر قریش کا لشکر سامنے پڑا ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں مصروف تھے۔ اس سے فراغت ہوئی تو فرمایا جب وہ جھوٹ کہتا ہے تو تم چھوڑ دیتے ہو اور جب وہ سچ کہتا ہے تو تم مارتے ہو۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ یہ قریش کی تباہی کا دن ہے۔ یہ ابوجہل کا مقتل ہے، یہ عتبہ کا ہے، یہ ابی کا ہے۔ عبداللہ بن مسعود جو صحن حرم کی بددعا کے دن موجود تھے وہ کہتے ہیں کہ عرب کے ساتوں رئیس جن کے حق میں آپ نے بددعا کی تھی سب کے سب میدان بدر میں ڈھیر ہو گئے۔ اور بطشۃ کبریٰ کے انتقام کی پیشین گوئی پوری ہوئی۔

بہر حال بدر کا دن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا اعجازی شاہکار ہے اور روحانی تدبیر کا شاندار نتیجہ ہے۔ اسی لیے آیت میں یہ بات کھول کر بتائی ہے کہ بدر میں جو کچھ ان پر عذاب آیا صرف وہی نہیں بلکہ مستقبل میں بھی ان کے بچ سکنے کی کوئی تدبیر کامیاب نہ ہوگی۔ حافظ ابن جریر فرماتے ہیں:

> مسلمانو! جان لو کہ اس فتح و کامیابی کے ساتھ اللہ تعالیٰ ان کی سازشوں کو کمزور کرے گا تاآنکہ وہ ذلیل ہو کر حق کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں یا ختم ہو جائیں۔[1]

---

[1] تفسیر ابن جریر

اعمال کی درستگی کے بغیر دعائی تدبیر

۲۴۔ اگر تم فتح مندی کے خواہاں تھے تو فتح تم کو مل گئی ، اگر باز رہو گے تو یہ تمہارے لیے اچھا ہے اور اگر لوٹ جاؤ گے تو ہم بھی پلٹ جائیں گے اور یاد رکھو تمہاری جماعتی عددی طاقت تمہارے کچھ کام نہ آئے گی ۔ اللہ ایمان والوں کے ساتھ ہے ۔ یہ خطاب کفار مکہ کو ہے وہ ہجرت سے پہلے حضور اقدس سے کہتے تھے متی هذا الفتح ان کنتم صادقین یعنی ہمارے اور تمہارے درمیان یہ فیصلہ کب ہو گا ۔ سو پورا فیصلہ تو قیامت کے روز ہو گا مگر ایک طرح کا فیصلہ آج میدان بدر میں بھی تم نے دیکھ لیا کہ کیسے خارق عادت کے طور پر تم کو کمزور مسلمانوں کے ہاتھوں سے سزا ملی ۔ اب اگر نبی علیہ السلام کی مخالفت اور کفر و شرک سے باز آجاؤ تو تمہارے لیے دنیا و آخرت کی بہتری ہے ورنہ پھر اگر اسی طرح لڑائی کرو گے تو ہم بھی پھر اسی طرح مسلمانوں کی مدد کریں گے اور انجام کار تم ذلیل و خوار ہو گے ۔ جب خدا کی تائید مسلمانوں کے ساتھ ہے تو تمہارے جتھے اور جماعتیں خواہ کتنی ہی تعداد میں ہوں کچھ کام نہ آئیں گے ۔ بعض روایات میں ہے کہ ابو جہل نے مکہ سے روانگی کے وقت کعبہ کے پردے پکڑ کر دعا کی تھی کہ خداوندا دونوں میں جو اعلیٰ و اکرم اسے فتح دے اور فساد مچانے والے کو مغلوب کر فقد جاءکم میں اس کا بھی جواب ہو گیا کہ جو واقعی اعلیٰ افضل تھے ۔ ان کو فتح مل گئی اور مفسد ذلیل و رسوا ہو گئے ۔ [1]

شارحین قرآن نے اس آیت گرامی کی دو طریقہ پر تشریح کی ہے ۔

ایک تو یہ ہے جسے شیخ الاسلام نے اپنایا ہے ۔ یہی عام شارحین قرآن کی رائے ہے ۔ اس صورت میں اس آیت کے مخاطب اہل ایمان نہیں بلکہ مشرکین مکہ ہیں لیکن سیاق و سباق میں مخاطب اہل ایمان ہیں ۔ پہلے یا ایها الذین آمنوا اذا لقیتم ہے اور بعد میں بھی یا ایها الذین آمنوا اطیعوا الرسول آیا ہے اور ان کے درمیان کوئی بھی قرینہ موجود نہیں جس کی وجہ سے خطاب کا رخ عبادت میں مشرکین کی طرف ہو ۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اوروں کا پتہ نہیں مگر میری رائے میں یہ بلاغت قرآنی کے خلاف ہے۔ اس لیے کچھ شارحین قرآن کی رائے یہ ہے کہ آیت کریمہ کے اہل ایمان مخاطب ہیں۔ علامہ آلوسی اور قاضی ثناء اللہ نے اس کو حضرت ابی بن کعب کی تشریح قرار دیا ہے۔ اور قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کہ سباق قرآنی سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ اگر آیت میں روئے سخن اہل ایمان کی طرف ہے تو مطلب صاف ہے کہ مسلمانو! تم نے بدر کے موقعہ پر فتح کی دعا مانگی تھی۔ اللہ نے تمہیں فتح دے دی ہے۔ اب آئندہ کے لیے یاد رکھو کہ اگر زندگی میں خدا کی نافرمانی سے بچو گے ایمان کے ساتھ اعمال و اخلاق درست رکھو گے تو یہ تمہارے لیے بہتر ہو گا۔ اور تمہیں ہی اس کا فائدہ ہو گا۔ اور اگر تم پلٹ جاؤ گے یعنی تمہاری زندگیاں خدا اور اس کے رسول کی طاعت سے بیگانہ ہو جائیں گی تو پھر ہم بھی پلٹ جائیں گے۔ یعنی جیسے تمہارے اعمال ہوں گے ویسے ہی نتائج ہوں گے وان تعودوا نعد دو لفظوں میں وہ سب کچھ کہہ دیا جو جزائے عمل کے بارے میں کہا جا سکتا ہے۔ اس سے قرآن کی معجزانہ بلاغت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ان تعودوا نعد اگر تمہاری زندگی میں اعمال غلط ہو جائیں گے تو ہم بھی لوٹ جائیں گے۔ بدر کی فتح تو تمہارے اعمال کا نتیجہ ہے۔ اگر تم اسلامی زندگی کو خیر باد کہہ دو گے تو اللہ کا قانون مجازات بھی تمہارے حق میں بدل جائے گا۔ عمل اور نتیجہ دو ایسی لازم و ملزوم حقیقتیں ہیں جو کسی حال میں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتی ہیں۔ نتیجہ عمل کا سایہ ہے۔ جہاں عمل آیا اس کا سایہ بھی ساتھ آ گیا۔ تم نے اچھے عمل کی طرف رخ کیا اور ایمان کے جوہر دکھائے جیسا کہ لیبلی المومنین سے معلوم ہو رہا ہے۔ کامیابی اور فتح مندی نے بھی تمہارا رخ کر لیا۔ نہ اب بدر میں تمہیں کامیابی افرادی طاقت سے ملی ہے اور نہ آئندہ افرادی قوت تمہارے کام آئے گی خواہ افرادی طاقت کتنی زیادہ ہو جائے۔ مدار کامیابی تو صرف ایمان اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنا ہے اور بس۔ بدر میں ہم نے تمہارے ایمان کے مظاہرے کی وجہ سے تمہیں فتح مندی سے ہمدوش کیا ہے آئندہ بھی ایمان کے اگر ایسے ہی مظاہر رونما ہوئے تو فتح مندی یقینی ہے۔ اس میں یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ تمہیں اللہ نے ایک ایسی امت بنایا ہے جو باقی ساری نوع انسانی کی ہادی اور پوری انسانیت کی پاسبان ہے۔ اور یہی تمہارے وجود کا اولین اور آخری مقصد ہے۔ اگر تم اس مقصد سے بے تعلق ہو گئے تو تمہاری اہمیت ختم ہو

جائے گی، تمہاری قدر و قیمت اسی وقت تک باقی رہے گی جب تک تم اپنے وجود کے مقصد کو پورا کرتے رہو گے۔ دُنیا کی مادی طاقت اور افراد کی عددی اکثریت تمہارے کچھ کام نہ آئے گی۔ اگر تم اپنی زندگیوں کو اپنے مقصدِ وجود سے وابستہ نہ رکھو گے۔ اگر مقصدِ وجود سے وابستہ رہو گے تو بے سروسامانی، مفلسی اور غربت اور تعداد میں قلت کے باوجود بدر کی طرح اللہ سبحانہٗ تمہاری مدد کرے گا۔ کیونکہ اللہ کی معیت ایمان والوں کو حاصل ہوتی ہے۔

بہرحال جمہور شارحینِ قرآن کی وہ رائے ہے جو مولانا عثمانی نے پیش فرمائی ہے اگر سیاقِ قرآنی کا انداز یہ نہ ہوتا جو ہے تو جمہور کی تشریح زیادہ قرینِ قیاس ہے لیکن سیاقِ قرآنی اس کا ساتھ نہیں دے رہا ہے اس لیے آیت کی تشریح میں ابی بن کعب کا موقف زیادہ پائیدار ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَأَنْتُمْ
تَسْمَعُونَ ﴿٢٠﴾ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ قَالُوا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ﴿٢١﴾
إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللَّهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ ﴿٢٢﴾
وَلَوْ عَلِمَ اللَّهُ فِيهِمْ خَيْرًا لَأَسْمَعَهُمْ ۖ وَلَوْ أَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا
وَهُمْ مُعْرِضُونَ ﴿٢٣﴾

مسلمانو! اللہ کی اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اس سے روگردانی نہ کرو اور تم سن رہے ہو۔[25] اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے کہا کہ ہم نے سن لیا حالانکہ وہ نہیں سنتے۔[26] بلاشبہ اللہ کے نزدیک بد ترین جانور وہ لوگ ہیں جو بہرے گونگے ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔[27] اور اگر اللہ کو معلوم ہوتا کہ ان میں کچھ بھی خیر ہے تو وہ ضرور ان کو سننے کی توفیق دیتا۔ اور اگر وہ ان کو سنوا

دیا وہ ضرور بے رُخی برتتے ۔[۲۸]

اسلامی زندگی مکمل طاعت کا نام ہے

اگر یہ مسلّم ہے کہ اس وقت رات نہیں ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ اس وقت لازماً دن ہے۔ اس لیے جب یہ تحقیق ہو گئی کہ انسانیت کا کوئی مسئلہ نہیں جو اسلام کے دائرے سے باہر ہو۔ وہ ایک ایسا دین ہے جو ہر جگہ انسان کے ساتھ ہوتا ہے اور وہ جو قدم بھی اٹھانا چاہتا ہے اس کی رہنمائی کو سامنے پاتا ہے۔ مختصر یہ کہ وہ اس قدر جامع دین ہے جو انسانی زندگی کے اعتقادی، فکری، اخلاقی اور عملی تمام پہلوؤں کو پوری طرح گھیرتے ہوئے ہے۔ کچھ اسی طرح جس طرح کہ ہوا کا کرّہ اس زمین کو چاروں طرف سے اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ قرآن نے اس آیت میں مسلمانوں کو اسلام کی ہمہ گیر طاعت کا حکم دیا ہے۔ خدا اور رسول کی طاعت کے مقابلہ میں یہاں کسی اور طاعت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ پہلے یہ بتایا تھا کہ اللہ اہلِ ایمان کے ساتھ ہے۔ ان آیات میں بتایا جا رہا ہے کہ خدا کا اہلِ ایمان کے ساتھ ہونا مردم شماری کے رجسٹر میں مسلمان درج ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ دو شرطوں کی تکمیل پر موقوف ہے۔

اوّل یہ کہ مومن ہونے کا دعویٰ کرتے ہو تو زندگی کی ہر شاخ میں اللہ و رسول کی طاعت کرو۔

دوسرے یہ کہ حضور اقدس کا حکم سننے کے بعد روگردانی نہ کرو۔ حضور اقدس کی باتوں سے لاپرواہی نہ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ فرمانِ رسول سننے کے بعد سُنی ان سُنی برابر کر دو اور تعمیل نہ کرو۔ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو زبان سے کہہ دیتے ہیں کہ ہم نے سُن لیا لیکن واقع میں وہ سنتے نہیں ہیں کیونکہ اس کی طرف توجہ اور اس پر عمل نہیں کرتے۔ منشاء یہ ہے کہ صرف مردم شماری کا مسلمان ہونا کافی نہیں ہے۔

خدا کی نصرت کیسے آتی ہے؟

۲۵- مسلمانو! اللہ اور اس کے رسول کی طاعت کرو، اس سے روگردانی نہ کرو

اور تم سن رہے ہو۔ پہلے فرمایا تھا کہ اللہ ایمان والوں کے ساتھ ہے۔ اب ایمان والوں کو بتایا جارہا ہے کہ ان کا معاملہ خدا اور رسول کے ساتھ کیسا ہونا چاہیے جس سے وہ خدا کی نصرت کے مستحق ہوں سو بتلا دیا کہ ایک مومن صادق کا کام یہ ہے کہ ہمہ تن خدا اور رسول کا فرمانبردار ہو۔ احوال و حوادث خواہ اس کا کتنا ہی منہ پھیرنا چاہیں مگر خدا کی باتوں کو جب وہ سن کر سمجھ چکا اور تسلیم کر چکا تو قولاً و فعلاً کسی حال میں ان سے رُخ نہ پھیرے[1] وانتم تسمعون اصل میں حال بن کر آیا ہے۔ اس کے دو معنے ہیں۔ ایک معنی یہ ہیں کہ یہ جانتے ہوئے کہ آپ کی دعوت کیا ہے ان کی طاعت سے رُوگردانی نہ کرو۔ یعنی ہر حال میں آپ کے احکام کی پیروی کرو۔ احکام کی نوعیت خواہ کچھ ہو۔ یہ معنے حافظ ابن کثیر نے بیان فرمائے ہیں۔ دوسرے معنے یہ ہیں کہ تم یہ جانتے ہو کہ قرآن نے پیغمبر کی طاعت واجب کی ہے اور اس کی نافرمانی سے منع کیا ہے۔ پھر نبوت کے احکام سے روگردانی کرتے ہو ایسا نہ کرو۔ یہ معنے علامہ آلوسی نے بتائے ہیں۔ دونوں میں گہری معنویت ہے۔ دونوں کا حاصل یہ ہے کہ اللہ کے رسول کی اطاعت کرو جس طرح ایمان کا تقاضا ہے۔ وانتم تسمعون حال ہے اور ذوالحال کی قید ہوتا ہے۔ یہ قید جرم کی سنگینی کو ظاہر کر رہی ہے۔ یعنی یہ کہ رسول کی موجودگی میں جب کہ تم اس کی دعوت سن رہے ہو اس سے اعراض نہ کرو۔ اس ارشاد کی بالکل وہی حیثیت ہے جو قرآن میں اس آیت کی ہے۔

کیف تکفرون وانتم تتلی علیکم آیات اللہ وفیکم رسولہ
تم راہ کفر کیسے اختیار کر سکتے ہو جبکہ تمہارے سامنے اللہ کی آیتیں پیش ہو رہی ہیں اور تم میں اللہ کا رسول موجود ہے۔

مطلب یہ ہے کہ تمہارے لیے نبوت کی طاعت سے اعراض کی کب گنجائش ہے جبکہ تم میں اللہ کا رسول موجود ہے اور تم اس سے خدا کے احکام سن رہے ہو ولا تولوا میں عنہ کی ضمیر کا مرجع صرف اللہ کا رسول ہے حالانکہ پہلے اللہ اور رسول دونوں کا ذکر ہے۔ یہ اس بات کی نشاندہی کر رہی ہے، جیسے اللہ کے رسول کی طاعت بالکل

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اللہ کی طاعت ہے ٹھیک اسی طرح رسُول سے اعراض بھی اللہ سبحانہ سے اعراض ہے جس نے رسُول سے منہ پھیر لیا اس نے اللہ سے مُنہ موڑ لیا۔ اللہ سبحانہٗ سے تعلق اور اس کی طاعت کا واحد ذریعہ اللہ کا رسُول ہے۔

دراصل اسلامی زندگی کی فطرت اور حقیقت پر غور کیا جائے تو یہ حقیقت بے غبار ہو کر سامنے آتی ہے کہ اس کا اصلی مقصد افراد کی تکمیل ذات اور مسلمان کی اجتماعی خودی کی نشوونما ہے۔ یہ مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب انفرادی شخصیت اور اجتماعی سیرت کا کوئی ایسا مکمل نمونہ افراد کے سامنے موجود ہو۔ کیونکہ اس کے بغیر شخصیت کا حقیقی مفہوم اور اجتماعی سیرت کا معیار مقرر کرنا دشوار ہے۔ قرآن کا فیصلہ ہے کہ رسُول کی شخصیت و سیرت ایک نمونہ ہے اور ایسا نمونہ ہے کہ قرآن رسُول کی طاعت کو براہِ راست خدا کی طاعت اور رسُول سے اعراض کو براہِ راست اللہ سبحانہٗ سے اعراض بتا رہا ہے۔ اس کا کھلا مطلب یہ ہے کہ رسُول کی ذات موہوعنایات الٰہی اور مرکز الطاف و توجہات ہوتی ہے۔ اس کے اخلاق و عادات اس کی زندگی کے طور طریقے سب اللہ سبحانہٗ کی نظر میں محبوب ہوتے ہیں اور زندگی کے تمام طریقوں میں اس کا طریقہ حیات لوگوں کے اخلاق میں اس کا اخلاق اور لوگوں کی گوناگوں عادتوں میں سے اس کی عادتیں اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہوتی ہیں۔

جمہور کی رائے میں اس آیت کے مخاطب منافقین نہیں بلکہ مومنین ہیں اور ان کو غزوۂ بدر کی کامیابی کے بعد مستقبل میں کامیابی سے ہمدوش ہونے کا طریقہ بتایا جا رہا ہے۔ لیکن کچھ کا خیال ہے کہ اس کے مخاطب منافقین ہیں اور انتم تسمعون ان کے رویہ کی شناعت کو ظاہر کر رہا ہے کہ جب تم رسُول کی موجودگی میں ٹھوکریں کھاؤ گے تو کل تمہارا کیا بنے گا لیکن یہ خیال درست نہیں ہے۔

احکامِ نبویہ پر جاں نثاری ہونی چاہیے

۲۱۔ اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے کہا کہ ہم نے سُنا حالانکہ وہ نہیں سنتے۔ یعنی زبان سے کہتے ہیں کہ ہم نے سُن لیا حالانکہ وہ سننا ہی کیا جو آدمی سیدھی سی بات کو سُن کر سمجھے نہیں یا سمجھ کر قبول نہ کرے۔ پہلے یہودیوں نے موسیٰ علیہ السلام

سے کہا تھا سمعنا و عصینا ہم نے سن لیا مگر مانا نہیں۔ مشرکین مکہ کا قول آگے آتا ہے قد سمعنا لو نشاء لقلنا مثل ھذا یعنی جو قرآن آپ سناتے ہیں ہم نے سن لیا ہم چاہیں تو اسی جیسا کلام بنا کر لے آئیں۔ مدینہ کے منافقین کا تو شیوہ یہ تھا کہ پیغمبر علیہ السلام اور مسلمانوں کے سامنے زبانی اقرار کر گئے اور دل سے اسی طرح منکر رہے۔ بہرحال مومن صادق کی شان ان یہود، مشرکین اور منافقین کی طرح نہ ہونی چاہیے۔ اس کی شان یہ ہے کہ دل سے زبان سے عمل سے حاضر و غائب احکام الٰہیہ اور فرامین نبویہ پر نثار ہوتا ہے۔[1]

اصل میں اس آیت میں یہود کی طرف اشارہ ہے۔ یہود کا قرآن میں اس سے پہلے یہ چہرہ پڑھ چکے ہو و یقولون سمعنا و عصینا، ہم نے سنا اور نہیں مانا۔ کہنا ان کو چاہیے تھا سمعنا و اطعنا۔ ہم نے سن لیا اور مان لیا۔ اہل عرب اس موقعہ پر بولتے ہیں جب اپنے کسی بڑے، کسی سردار، کسی بادشاہ کے حکم پر اپنی طرف سے امتثال امر کے لیے آمادگی اور مستعدی کا اظہار کرنا چاہتے ہیں۔ اور یہ بھی قرآن میں ہے کہ یہود کا یہ طرز عمل اپنے پیغمبر کی موجودگی میں رہا ہے گویا اہل ایمان کو بتایا جا رہا ہے کہ مستقبل میں اگر تم نے بھی یہ طرز عمل اختیار کیا تو کامیابی کی جگہ ناکامی آجائے گی۔ ایمان کی حدود میں اسلامی زندگی علم و عمل میں نبوت سے وابستگی کا نام ہے۔ اس سے جدائی جب ہوگی تنزل و ادبار کا اسی وقت آغاز ہو جائے گا۔ ماضی میں ایسا ہو چکا ہے کہ نبوت کے علم و عمل سے جدا ہو کر سب کچھ رکھنے کے باوجود سب کچھ کھو بیٹھے۔ اقبال کی جگہ ادبار، عروج کی جگہ تسفل، ترقی کی جگہ تنزل، عزت کی جگہ ذلت، حکومت کی جگہ محکومی اور بالآخر زندگی کی جگہ موت ان پر چھا گئی۔ یہ آیت ٹھیک ایسے ہی موقعہ پر آئی جیسے تم آل عمران میں یہ آیت پڑھ چکے ہو۔

ولا تکونوا کالذین تفرقوا واختلفوا من بعد ما جاء البینات ۔ واولٰئک لھم عذاب عظیم۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ان لوگوں کی طرح نہ ہونا جو جدا جدا ہو گئے اور واضح آیات آنے کے باوجود باہم اختلاف میں پڑ گئے۔

نظم کلام کی روشنی میں ان آیات کا مطالعہ کرو گے تو یہ حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آجائے گی کہ نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل سے محروم ہونے کے بعد اہل کتاب اختلاف و انتشار کا شکار ہو گئے۔ اور یہ انتشار ایمان کے بعد درحقیقت کفر کی طرف پلٹ جانے کے مترادف ہے۔ دنیا میں مسلمان کی سربلندی کے لیے ضروری ہے کہ ان کی زندگی نبوت کے علم و عمل سے وابستہ ہو۔ اگر وہ اپنی شامت اعمال سے نبوت کے علم و عمل سے ہٹ کر کسی اور راہ کو اپنا لیتے ہیں۔ تو ان کو ذلت و رسوائی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے اس آیت کا بھی مطلب یہ ہے کہ مستقبل میں بدر جیسی کامیابی چاہتے ہو تو ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو اس دنیا کی زندگی میں نبوت سے ہٹ گئے اور نبوت کی بات مسلمان ہونے ہوئے سُنی ان سنی کر دی۔ کان کی حد تک ارشادِ نبوت سن لیا لیکن عمل کے معاملہ میں نبوت سے بیگانگی اختیار کر لی۔ غور کرو آج ہماری اجتماعی زندگی کی سب سے بڑی اور بنیادی بیماری یہی ہے۔ اہل ایمان کو بتا دیا گیا کہ تمہارا طرز عمل یہ نہ ہونا چاہیے۔ علامہ قرطبی کی یہ بات یہاں برمحل ہے کہ

> یہ آیت اس بات کی نشاندہی کر رہی ہے کہ مومن کا یہ کہنا کہ میں نے سن لیا بے معنے اور بے فائدہ ہے جب تک اس کی زندگی میں امتثال اور بجا آوری کا اظہار نہ ہو۔ اوامر کو سن کر اگر تعمیل نہیں کرتا اور نواہی کو سن کر اگر اجتناب نہیں کرتا تو سننے اور ماننے کے کوئی معنے نہیں۔

علامہ زمخشری لکھتے ہیں:

> قرآن اور نبوت کو مانتے ہوتے اگر تمہاری زندگی میں کچھ باتوں میں طاعت رسول نہیں ہے تو تمہارا ماننا نہ ماننا اور تمہارا سننا نہ سننا ہے۔

اسلامی زندگی کا بدترین عنصر

۲۷۔ بلاشبہ اللہ کے نزدیک بدترین جانور وہ لوگ ہیں جو بہرے گونگے ہیں جو

عقل سے کام نہیں لیتے۔ یعنی جنہیں خدا نے بولنے کے لیے زبان، سننے کو کان اور سمجھنے کو دل و دماغ دیے ہیں۔ پھر انہوں نے یہ سب قوتیں معطل کر دیں۔ نہ زبان سے حق بولنے اور حق کو دریافت کرنے کی توفیق ہوئی نہ کانوں سے حق کی آواز سنی نہ دل و دماغ سے حق کو سمجھنے کی کوشش کی۔ غرض خدا کی بخشی ہوئی قوتوں کو اس اصلی کام میں صرف نہیں کیا جس کے لیے فی الحقیقت عطا کی گئی تھیں بلاشبہ ایسے لوگ جانوروں سے بھی بدتر ہیں۔[1]

انسان کو جانوروں سے ممتاز کرنے والی چیز صرف علم ہے۔ علم کے حاصل ہونے کے تین ہی ذریعے ہیں۔ سننا، دیکھنا اور سمجھنا۔ قرآن ان لوگوں کو جو علم کے ان ذرائع کو معطل کر کے اپنے نوعی امتیاز سے محروم ہو جاتے ہیں جانور ہی نہیں بلکہ بدترین جانور قرار دیتا ہے۔ اور اس کی وجہ سے انسان کو بولنے کی نعمت ملی ہے۔ خلق الانسان ہ علمہ البیان۔ ایک انسان اگر ان علمی ذرائع سے فائدہ نہیں اٹھاتا ہے۔ کانوں سے بہرا اور زبان سے گونگا ہو کر رہتا ہے تو اس کی اور حیوان کی زندگی میں کوئی فرق نہیں رہتا بلکہ یہ حیوانوں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے کیونکہ اس طرح وہ اپنے نوعی امتیاز سے محروم ہو جاتا ہے۔ انسان اپنے علمی کمال ہی کی وجہ سے تمام مخلوقات میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ ساری مخلوقات اللہ کی صفت قدرت کا مظہر ہیں جبکہ انسان اللہ کی صفت علم کا مظہر ہے۔ اور معلوم ہے کہ قدرت علم کے توابع میں سے ہے کیونکہ علم کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ سب سے بالا اور سب سے مستغنی ہے۔ سب کی صفتیں اس کے پیچھے اور اس کی محتاج ہیں۔ اسی لیے انسان میں مدارِ خلافت علم کو قرار دے کر فرشتوں کے سامنے آدم علیہ السلام کی شانِ علمی کی نمائش ہوئی ہے۔ اگر مدعیانِ ایمان خود نبوت کے علم ہی سے بیگانہ ہو جائیں اور دعوائے ایمان رکھتے ہوتے نبوت کے علم کی حد تک کانوں سے بہرے، زبانوں سے اور قلب سے عقل و شعور سے بیگانہ ہو جائیں تو ان کے دعویٰ ایمان کی قدر و قیمت کیا ہو سکتی ہے۔ اکثر شارحینِ قرآن نے اس آیت کا رخ منافقین کی طرف موڑ دیا ہے لیکن اس

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

نفاق سے وہ نفاق مراد نہیں جو مدینے کے منافقین کا تھا کہ بظاہر مسلمان ہو گئے تھے۔ دل میں منکر تھے بلکہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو ایمان کے مدعی ہو کر ایمان کے تقاضے پورے نہیں کرتے، ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں مگر نماز نہیں پڑھتے، زکوٰۃ نہیں دیتے، جہاد نہیں کرتے، اسلام سے آشنا نہیں ہیں۔ اسی اسلام ناآشنائی کو قرآن یہاں الصم البکم الذین لا یعقلون سے تعبیر کر رہا ہے۔ یعنی مردم شماری میں مسلمان ہیں مسلمانوں جیسے نام رکھتے ہیں لیکن اسلام سے بالکل بے خبر ہیں اور ایمان کے تقاضوں سے ان کی زندگی بے گانہ ہے۔

مذمت کی اس سے زیادہ بلیغ تعبیر کیا ہو سکتی ہے جو قرآن نے تشبیہ کے ذریعے پیش کی ہے۔

پہلی آیت میں بدر جیسی کامیابی حاصل کرنے کے لیے ارشاد ہوا تھا کہ بنیادی چیز یہ ہے کہ اللہ و رسول کی طاعت کرو۔ اب بتایا جا رہا ہے کہ طاعت ہوتی ہے اوامر اور نواہی میں اور یہ علم کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لیے بدر جیسی کامیابی حاصل کرنے کے لیے دوسری اہم چیز یہ ہے کہ اسلام آشنا ہو اور اسے دنیا میں پیش کرو۔ اسلام کی حد تک گونگا، بہرا اور بے سمجھ بن کر رہنا خدا کو بے حد ناپسند ہے۔

اسلام ناآشناؤں کی محرومی

۲۸۔ اگر اللہ کو معلوم ہوتا کہ ان میں کچھ بھی خیر ہے تو وہ ضرور ان کو سننے کی توفیق دیتا اگر ان کو سنوا دیتا تو وہ ضرور بے رخی اختیار کر لیتے۔ یعنی اصل یہ ہے کہ ان لوگوں میں بھلائی کی جڑ ہی نہیں ہے کیونکہ حقیقی بھلائی انسان کو اس وقت ملتی ہے جب اس کے دل میں طلب حق کی سچی تڑپ ہو اور نور ہدایت قبول کرنے کی صلاحیت ہو۔ جو طلب حق کی روح سے یکسر خالی ہو چکی اور اس طرح خدا کی بخشی ہوئی قوتوں کو اپنے ہاتھوں برباد کر چکی ہو۔ رفتہ رفتہ اس میں قبول حق کی لیاقت و استعداد بھی نہیں رہتی۔ اسی کو فرمایا ہے کہ اللہ نے ان کے دلوں میں قبول خیر و ہدایت کی لیاقت نہیں دیکھی۔ اگر ان میں کچھ بھی لیاقت دیکھتا تو اپنی عادت کے موافق ضرور ان کو اپنی آیتیں سنا کر سمجھا دیتا۔ باقی بحالت موجودہ اگر انہیں آیات سنا اور سمجھا دی جائیں تو

یہ ضدی اور معاند لوگ سمجھ کر بھی تسلیم اور قبول کرنے والے نہیں ہے

یہ بھی ان ہی اہل کتاب کا مزید چہرہ پیش کیا گیا ہے جن کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ مسلمانو! تم ان جیسے نہ ہو جانا جنھوں نے زبان سے کہا تھا ہم نے سُن لیا لیکن انھوں نے قبول نہیں کیا۔ ایسے لوگ جو ایمان کے مدعی ہو کر علم و عمل کی دُنیا میں ایمان کے تقاضوں سے تہی دامن ہوں اللہ کے نزدیک صرف جانور نہیں بلکہ بدترین جانور ہیں کیونکہ یہ حق سنتے نہیں ہیں، حق کو سمجھتے نہیں اور حق کے لیے ان کے مُنہ میں زبان نہیں ہے۔ جو انسان، انسان ہو کر اپنے حواس اور عقل سے کام نہیں لیتا وہ انسان نہیں بدترین جانور ہے۔

یہاں پہنچ کر انسانی ذہن میں یہ خلش ضرور پیدا ہوتی ہے کہ جب نبوت کے لائے ہوئے علم کے سننے اور سمجھنے پر ہی انسانیت کا دارومدار ہے اور اس سے محرومی خدا کو اس قدر ناپسند ہے کہ اس سے محروم ہو کر انسان انسان نہیں بلکہ چوپایہ بن جاتا ہے تو پھر خدا خود اپنی قدرت سے ان کو سننے کی توفیق کیوں نہیں دے دیتا۔

اسی سوال کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے لیکن جواب سننے سے پہلے امام رازی کی یہ بات گوش گزار فرما لیجیے۔

جو موجود ہے وہ علمِ الٰہی میں ہے۔ کسی چیز کا علمِ الٰہی میں نہ ہونا اس کے نہ ہونے کو مستلزم ہے۔

مطلب یہ ہے کہ خالق و مخلوق کے علم میں یہ بنیادی فرق ہے۔ مخلوق کو علم ہوتا ہے جب چیز موجود ہو۔ اور چیز کے موجود ہونے کی شرط یہ ہے کہ علمِ الٰہی میں ہو۔ ایک چیز اگر علمِ الٰہی میں نہیں تو سمجھ لیجیے کہ اس کا وجود بھی نہیں ہے۔

جواب یہ ہے کہ اگر ان میں ذرہ خیر کا کچھ بھی ہوتا تو ان کو سننے اور سمجھنے کی توفیق مل جاتی یہ صلاحیت ان میں چونکہ موجود نہیں ہے اس لیے ان کو توفیق نہیں ملی۔ اللہ کا قانون ہدایت و ضلالت کے بارے میں یہ ہے کہ اللہ نے یکساں طور پر ہر انسان میں خیر و شر قبول کرنے کی صلاحیت رکھی ہے جو لوگ اپنے اعمال سے خیر قبول کرنے کی صلاحیت کو طاقتور بناتے ہیں ان کو مزید خیر کی توفیق ملتی ہے اور وہ آہستہ آہستہ خیر میں ترقی کرتے جاتے

ے افاداتِ شیخ الاسلام

ہیں اس کے برعکس جو لوگ اعمالِ بد کے ذریعے شر قبول کرنے والی صلاحیت کی تربیت کرتے ہیں ان کو خیر نہیں ملتی ہے بلکہ قانون یہ ہے کہ ان کو جو ہدایت فطرت سے ملی ہوئی ہوتی ہے وہ بھی سلب ہو جاتی ہے۔ بتلانا یہ ہے کہ جن لوگوں نے نبوت کی دعوت کو قبول نہیں کیا دراصل انہوں نے اپنی استعداد ایمانی کو کھو دیا تھا۔ اگر اللہ سبحانہٗ ان کو اس روگردانی کی حالت میں سننے کی توفیق بھی دیتا پھر بھی ان کے دل پذیرائی کے لیے تیار نہ ہوتے کیونکہ وہ اس نورِ فطرت کو اپنی بدعنوانیوں سے ختم کر چکے تھے جس سے قبولِ خیر کی توفیق ہوتی ہے۔

وہ انسان جو گونگا بہرا بنتا ہے اور حق کا پیغام نہ سنتا ہے اور نہ اس پر عمل کرتا ہے خدا اس کو بہرا گونگا بنا کر پھر اس کو بولنے اور سننے کی تکلیف نہیں دیتا ہے۔ اگر وہ ایسا کرتا تو یہ اس کا ظلم ہوتا اور اللہ کی ذات ظلم کے شائبہ سے بھی پاک ہے۔ قرآن میں ہدایت وضلالت بھی اسی معنے میں ہے۔ انسان کے اچھے برے کے جواب میں خدا کی طرف سے ہدایت یا ضلالت آتی ہے۔ جب انسان سے کفر کا صدور ہو جاتا ہے تب خدا کی طرف سے ضلالت آتی ہے اور اس کو تشبیہاً یوں کہا جاتا ہے کہ ان کے دلوں پر مہر لگ گئی کہ سمجھتے نہیں ہیں کانوں پر مہر لگ گئی کہ سنتے نہیں ہیں اور آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے کہ دیکھتے نہیں ہیں۔ مثلاً طبع اللّٰہ علیھا بکفرھم یعنی کفر کا صدور ان سے ہوا تو دلوں سے صداقت شناسی اور اثر پذیری کا جوہر سلب ہو گیا برخلاف اس کے اگر لوگ کانوں سے پیغامِ حق سنیں۔ زبان سے حق کا اعلان کریں اور دل سے سمجھنے کی کوشش کریں تو اللہ سبحانہٗ اپنی توفیق سے سرفراز فرماتے ہیں۔

يَاۤ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا
يُحْيِيْكُمْ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ وَاَنَّهٗۤ اِلَيْهِ
تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۴﴾ وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا
مِنْكُمْ خَاۤصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۵﴾
وَاذْكُرُوْۤا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ
تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ
بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۲۶﴾

مسلمانو! اللہ کی پکار کا جواب دو اور اللہ کے رسول کی پکار کا جواب دو جب وہ تم کو اس بات کی دعوت دے جو تمہیں زندگی دیتی ہے[۲۹]۔ اور خوب جان لو کہ اللہ آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور تمہیں اللہ کی بارگاہ میں پیش ہونا ہے[۳۰]۔ اور اس فتنے سے

بچو جس کی زد میں صرف ظالم ہی نہ آئیں گے اور جان لو کہ اللہ کا عذاب سخت ہے[۳۱] اور وہ وقت یاد کرو جب تم ملک میں ایک کمزور اقلیت تھے، تمہیں اندیشہ تھا کہ لوگ تمہیں ختم کر دیں گے اللہ نے تمہیں ٹھکانا دیا اور اپنی مدد سے تمہیں قوت عطا فرمائی اور تمہیں بہترین روزی عطا کی تاکہ تم اس کا شکر ادا کرو۔[۳۲]

اسلامی زندگی کے اجتماعی خطرے

پچھلی آیات میں انفرادی زندگی کے خطرات پر متنبہ کیا تھا۔ اب اسلامی زندگی کے اجتماعی خطرات کی طرف اشارات ہو رہے ہیں۔ پہلے بتایا گیا تھا کہ مستقبل میں اسلامی زندگی کی تابانی کی بدر کے بعد اوّلین شرط یہ ہے کہ اوامر اور نواہی میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی جائے۔ یعنی صرف پرستش تک اسلام کو محدود نہ رکھا جائے بلکہ اس کے دائرہ اطاعت میں زندگی کے سارے گوشے ہوں۔ ایک مکمل دین و قانون کی حیثیت میں زندگی کا ہر گوشہ اس کی نگرانی میں ہو۔ روحانی، اخلاقی، خاندانی، معاشرتی، معاشی، سیاسی اور قانونی گوشوں میں اسلام نافذ ہو۔ اس کے بعد بتایا تھا کہ مکمل زندگی کو اسلام کی نگرانی کے لیے ضروری ہے کہ انفرادی طور پر ہر شخص اسلام آشنا ہو۔ اسلام کے لیے تمہاری زندگی بہروں، گونگوں اور نادانوں کی نہ ہو۔ اب بتایا جا رہا ہے کہ پیش پا افتادہ حالات میں اجتماعی زندگی کے لیے جب اللہ کا رسول تمہیں پکارے

تمہارا ایمانی تقاضا یہ ہے کہ اس کی دعوت پر لبیک کہو۔ اور بتایا ان فتنوں سے دامن بچا کر رکھو جنہیں سوسائٹی کا ایک فرد یا ایک جماعت برپا کر دیتی ہے لیکن جب اس کی آگ بھڑک اٹھتی ہے تو صرف انہیں کو نہیں جلاتی ہے جنہوں نے سلگائی تھی سب ہی لپیٹ میں آجاتے ہیں اور اس لیے آجاتے ہیں کہ کیوں آگ لگانے والے کا ہاتھ نہیں پکڑا۔ کیوں بروقت آگ بجھانے کی کوشش نہیں کی۔ یعنی نہی عن المنکر اور اجتماعی زندگی سے مفاسد مٹانے کو اپنے قومی شعار بنالو۔ اس کے بعد اس خاص انعام کا ذکر کیا ہے کہ مکہ میں تمہاری تعداد تھوڑی تھی۔ دنیا کی نظر میں تم کمزور اور بے سروسامان تھے۔ یہ اللہ کا فضل ہے کہ اس نے مدینہ میں تمہیں آباد کیا اور صرف آباد نہیں کیا بلکہ تمہاری باقاعدہ حکومت قائم کی اور ہر قسم کی نعمت سے تمہیں نوازا۔ ان عنایات کے نتیجہ میں تمہارا کام یہ ہے کہ اللہ کے شکر گزار بندے بن کر رہو۔ یعنی جو نعمتیں اللہ نے تم کو عطا کی ہیں ان کو اللہ کی مرضی میں استعمال کرو۔ اگر تم ایسا کروگے تو بدر کی کامیابی کی طرح تمہیں مستقبل میں بھی کامیابیاں حاصل ہوں گی۔ اور اگر نہیں کروگے تو سن چکے ہو ان تعودوا نعد اگر تم پلٹ جاؤ گے یعنی اعمال بدل جائیں گے تو ہم بھی پلٹ جائیں گے یعنی اعمال کے نتائج بدل جائیں گے۔

انسانیت اعلیٰ کے قیام کی دعوت

۲۹۔ مسلمانو! اللہ کی پکار کا جواب دو اور اللہ کے رسول کی پکار کا جواب دو۔ جب وہ تم کو اس بات کی دعوت دے جو تمہیں زندگی دیتی ہے۔ یعنی خدا اور رسول تم کو جس کام کی دعوت دیتے ہیں مثلاً جہاد وغیرہ اس میں از سرتا پا تمہاری بھلائی ہے ان کا دعوتی پیغام تمہارے لیے دنیا میں عزت و اطمینان کی زندگی اور آخرت میں حیات ابدی کا پیغام ہے پس مومنین کی شان یہ ہے کہ خدا و رسول کی پکار پر فوراً لبیک کہیں جس وقت اور جدھر وہ بلائیں سب اشغال چھوڑ کر ادھر ہی پہنچیں۔ [1]
مطلب یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اس لیے ہے کہ تمہیں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

زندہ کر دے یعنی وہ انسانیت اعلیٰ کے انبعاث و قیام کی دعوت ہے۔ اس دعوت نے دنیا کی تمام مُردہ جماعتوں کو کس طرح قبروں سے اٹھا کر زندگی کے میدانوں میں متحرک کر دیا ہے اس لیے جب تمہیں معلوم ہو گیا کہ رسول کی طاعت فرض ہے اور خدا کے پیغام کو سننا اور سمجھنا ضروری ہو تو پھر تمہیں رسول کی پکار کو پوری توجہ، پوری قوت، پوری عزیمت اور ہمت کے ساتھ پذیرائی دینی چاہیے۔ حیات کے بارے میں شارحین قرآن نے مختلف خیالات ظاہر کئے ہیں کچھ کہتے ہیں کہ علمی حیات مراد ہے، کچھ جہاد بتاتے ہیں، کچھ ایمان و اسلام کو اس کا مصداق قرار دیتے ہیں، اور کچھ کی رائے میں قرآن ہے۔ لیکن یہاں موقعہ و محل کے لحاظ سے علمی حیات زیادہ قرین قیاس ہے کیونکہ اس کے بغیر نہ جہاد ہے نہ قرآن ہے اور نہ ہی ایمان و اسلام ہے۔ یہ علمی حیات ہی ہے کہ عرب کے ساربانوں کو جہاں بانی کے مقام پر پہنچا دیا۔ اور ابوبکر، عمر، علی، عائشہ، سعد بن ابی وقاص اور عمر بن العاص جیسے اکابر عالم پیدا ہو گئے۔ اور پچاس برس کے اندر کرۂ ارض کی سب سے بڑی مہذب و اشرف قوم عرب ہو گئے۔ اللہ و رسول کی دعوت حقیقی زندگی کی دعوت ہے۔ اسی سے بصیرت پیدا ہوتی ہے۔ اسی سے عقل کو وہ نور ملتا ہے جو آفاق و انفس کے حقائق سے پردے ہٹاتا ہے۔ اسی سے دل کو وہ زندگی ملتی ہے جو اس کو ایک مضغہ گوشت سے تجلیات و انوار الٰہی کا مہبط بنا دیتی ہے۔ فرمایا کہ اللہ کے رسول کی دعوت کو پذیرائی دو اسی سے تم کو حقیقی اور دائمی زندگی حاصل ہو گی۔

آیت میں استجابت سے مراد امتثال و طاعت ہے۔ آیت میں اللہ سبحانہٗ کا ذکر تاکید اور زور کے لیے ہے ورنہ اصل مقصود حضور اقدس کی طاعت بتانا ہے۔ عین نماز کی حالت میں بھی آپ اگر کسی کو پکاریں پھر بھی استجابت ضروری ہے خود حضور اقدس نے اس موضوع پر اس آیت سے استدلال کیا ہے۔ صحیح بخاری میں ہے۔ ابوسعید بن المعلی کہتے ہیں میں نماز پڑھ رہا تھا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلایا، میں نماز پوری کر کے حاضر خدمت ہوا۔ آپ نے دریافت کیا کہ دیر سے کیوں آئے ہو، میں نے عرض کیا کہ نماز پڑھ رہا تھا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کیا اللہ سبحانہٗ نے یہ حکم نہیں دیا ہے یا ایھا الذین آمنوا استجیبوا للّٰہ و للرسول

اذا دعاکم۔ ترمذی اور مستدرک حاکم میں حضرت ابو ہریرہ کے حوالہ سے ابی بن کعب کا بھی ایسا ہی واقعہ منقول ہے۔ اس سے حافظ ابن حجر عسقلانی نے یہ استنباط کیا ہے اولاً امر کا تقاضا یہ ہے کہ فوری طور پر بجا لائی جائے۔ کیونکہ حضور اقدس نے بلانے پر ان صحابی کے دیر کرنے پر ناراضگی کا اظہار فرمایا؛

ثانیاً، عام حالات میں عام الفاظ بولے جاتے ہیں؛

ثالثاً، اس سے معلوم ہوا کہ عین حالت نماز میں حضور اقدس کے بلاوے کا جواب دینا مفسد صلوٰۃ نہیں ہے لیکن یہ حافظ کا استنباط اپنے اندر کچھ معنویت نہیں رکھتا اس کو یوں کہا جائے تو زیادہ معنویت ہے کہ حضور کے پکارنے پر نماز توڑ کر جواب دینا واجب ہے۔ خود بعض شوافع کا بھی یہی مسلک ہے۔

اس آیت کا عموم یہ کہتا ہے کہ ہر مومن پر حضور اقدس کی بات کو پذیرائی دینا واجب اور فرض ہے زندگی میں اور وصال مبارک کے بعد بھی خواہ اس کا تعلق زندگی کے کسی گوشہ سے ہو۔ آیت میں کوئی قید اور کوئی استثنا نہیں ہے۔

علامہ سید رشید رضا نے یہ بات بالکل برمحل لکھی ہے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ حضور کی طاعت صرف آپ کی زندگی میں واجب ہے۔ یہ وصال مبارک کے بعد آپ کی طاعت نہیں ہے صرف قرآن پر عمل کرنا ہی آپ کی طاعت ہے۔ یہ لوگ زنادقہ خود گمراہ ہیں دوسروں کو گمراہ کرتے ہیں۔ ان کا پیش نہاد اس کے سوا کچھ نہیں کہ مسلمانی کا لبادہ پہن کر اسلام کی بنیادیں کھوکھلی کریں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ حضور اقدس کی طاعت بے قید فرض ہے اور قیامت تک ہر دور میں واجب ہے۔ حضور کی ذات گرامی تو اپنے مقام پر ہے ہمارا موقف تو یہ ہے کہ اسلامی زندگی میں خلفائے راشدین ائمہ اہل بیت، فقہا، اور محدثین کی پیروی بھی ضروری ہے۔ آداب زندگی، عدالتی اور سیاسی اجتہادات میں قوانین شرعیہ اور مصالح عامہ کی رعایت رکھتے ہوئے ان پر عمل کرنا چاہیے۔

اخلاص کے لیے ایک مؤثر تدبیر

۲۰ - اور خوب جان لو کہ اللہ آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور
نہیں اللہ کی بارگاہ میں پیش ہونا ہے۔ یعنی حکم بجالانے میں دیر نہ کرو شاید تھوڑی دیر
بعد دل ایسا نہ رہے گا اپنے دل پر آدمی کا اپنا قبضہ نہیں ہے بلکہ دل خدا کے ہاتھ میں ہے
جدھر چاہے پھیر دے سیے تنک دہ اپنی رحمت سے کسی کا دل ابتداً نہیں روکتا نہ
اس پر مہر کرتا ہے۔ ہاں جب بندہ امتثال امر الٰہی میں سستی اور کاہلی کرتا رہے
تو اس کی جزا میں روک دیتا ہے یا حق پرستی چھوڑ کر ضد و عناد کو شیوہ بنائے تو مہر
کر دیتا ہے کذا فی الموضح۔ بعض نے یحول بین المرء و قلبہ کو قرب کے لیے بتایا ہے
یعنی حق تعالیٰ بندہ سے اتنا قریب ہے کہ اس کا دل بھی اتنا قریب نہیں ہے۔ نحن
اقرب الیہ من حبل الورید تو خدا کی حکم برداری سچے دل سے کرو۔ خدا تم سے
بڑھ کر تمہارے دلوں کے احوال و سرائر پر مطلع ہے خیانت اس کے آگے نہیں چل
سکے گی۔ اسی کے پاس سب کو جمع ہونا ہے وہاں سارے مکتوبات و سرائر کھول کر
رکھ دیے جائیں گے [1]

ایک مسلمان میں اسلامی زندگی سے اخلاص کے لیے اگر کوئی سب سے زیادہ مؤثر
تدبیر ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ دو باتیں ایک مسلمان کے کونہ ذہن میں اتر جانی
چاہئیں۔ ایک یہ کہ اسلامی زندگی میں اس کا معاملہ اللہ سبحانہ کے ساتھ ہے جو ایسا
علیم' بذات الصدور ہے کہ آدمی اپنے دل میں جو نیت، جو خواہش، جو غرض، اور
جو خیال راز بنا کر رکھتا ہے۔ وہ سب اس کو معلوم ہے۔ دوسرے یہ کہ اس زندگی کا
بہرحال اس کو حساب دینا ہے۔ اس سے بچ کر کہیں بھاگ نہیں سکتا۔ دو عقیدے
جس قدر پختہ ہوں گے اسی قدر ایک مسلمان میں اسلامی زندگی کی خاطر اخلاص رونما ہوگا
اس لیے اخلاص کے لیے قرآن ان دو عقیدوں پر زور دیتا ہے۔ یہی دو باتیں اخلاص
کی بنیاد ہیں۔ اس آیت میں بتایا ہے کہ یہ نہ ہو کہ انسان کے افکار و اعمال میں حکمت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

الٰہی کا یہ قانون کام کر رہا ہے۔ بسا اوقات اس کے ارادہ میں اور اس کے دل کے جذبات اور انفعالوں کے درمیان اچانک کوئی غیر متوقع بات آ کر حائل ہو جاتی ہے۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اچانک اچھائی سے برائی میں جا پڑتا ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اچانک بُرائی سے اچھائی میں آ نکلتا ہے چنانچہ کتنے ہی اچھے ارادے ہیں جن سے عین وقت پر ہمارے دل نے انکار کر دیا اور کتنے ہی بُرائی کے منصوبے ہیں جن سے اچانک ہمارے دل نے بغاوت کر دی لہٰذا انسان کو اپنے دل کی نگرانی کرتے رہنا چاہیے۔ اسی لیے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اکثر یہ دعا ہوتی تھی اللھم مقلب القلوب ثبت قلبی علی دینک اور فرمایا یہ بھی نہ بھولو کہ خدا کے حضور پیش ہونا ہے کیونکہ جس دل میں آخرت کا یقین ہوگا وہ زندگی کی غفلتوں سے کبھی مغلوب نہ ہوگا۔

آیت میں بندے اور اس کے دل کے درمیان اللہ کے حائل ہونے سے اس کے قانون کا حائل ہونا مراد ہے۔ جو باتیں اللہ کے قانون کے اور اس کی مقررہ سنت کے تحت ظہور میں آتی ہیں بسا اوقات اللہ تعالیٰ ان کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے دل ایسے بے قابو ہو جاتے ہیں کہ وہ ان کو کسی طرح بھی قابو میں نہیں لا سکتے۔ انسان کا دل جب بُرائیوں کے پیچھے لگتا ہے تو ایک خاص حد تک تو اس کا حال یہ رہتا ہے کہ انسان اگر متنبہ ہو جائے اور اس کو روکنا چاہے تو روک سکتا ہے اور اس کو اصلاح کی راہ پر لگا سکتا ہے لیکن جب اس حد سے دل آگے بڑھ گیا اور انسان کو توفیق نہ ہوئی کہ وہ اس کو لگام دے تو پھر آدمی کے قابو سے باہر ہو جاتا ہے اور وہ دل کے ہاتھوں بے بس ہو جاتا ہے۔

حاصلِ آیت یہ ہے کہ نبوت کی بات کو فوراً شرفِ پذیرائی دینی چاہیے اور اس معاملہ میں بھرپور اخلاص سے کام لینا چاہیے۔ یہ سمجھ کر کہ فرصت غنیمت ہے اور یہ یقین کر کے کہ تمہیں اللہ کے حضور پیش ہونا ہے۔

آئیے اب اس آیت کی تشریح میں شارحین قرآن کے خیالات سے بھی استفادہ کر لیجئے۔ حافظ ابن جریر فرماتے ہیں کہ۔ یہ اللہ سبحانہٗ کی جانب مسلمانوں کو خبر دی جا رہی ہے۔ بدر کے روز مسلمانوں کو عددی کثرت سے اندیشہ تھا۔ اللہ سبحانہٗ نے بتایا کہ قلوب کی حالت اللہ کے قبضے میں ہے۔ کثرت سے بہتوں کے دل خوفزدہ ہو

سکتے ہیں جیسے بدر میں کفار کے ہوتے اور قلیل تعداد کو ثبات ہو سکتا ہے جیسے مسلمانوں کو بدر میں ہوا۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں مومن اور معاصی کے درمیان اور کافر اور ایمان کے درمیان خدا حائل ہو جاتا ہے۔ یعنی خدا کا قانون حائل ہو جاتا ہے اس کے قانون کی وجہ سے مومن کا اتصال کفر و معاصی سے نہیں ہوتا اور نہ کافر ایمان و طاعت کے قریب نہیں آتا۔ سعید بن جبیر، ضحاک، عکرمہ، مجاہد اور ابو صالح کی یہی رائے ہے۔ یہی صحیح ہے کیونکہ قلب کا فعل، اعتقاد ہے۔ یا ارادہ و انفعال اور دونوں کا خالق اللہ ہے۔

شاید آپ کے ذہن میں یہ خلش ہو کہ اللہ کی ذات جسم اور جسمانیت سے پاک ہے تو وہ کیسے حائل ہوتا ہے۔ تو جواب یہ ہے کہ یہاں حقیقی معنے نہیں بلکہ مجازی معنے مراد ہیں۔ یعنی قانونِ الٰہی حائل ہو جاتا ہے۔ آپ چاہیں تو قانون کی جگہ مشیتِ الٰہی کہہ دیں اور چاہیں تو علمِ الٰہی سے تعبیر کر لیں۔

اجتماعی گناہوں کے نتائج

۲۱۔ اور اس فتنے سے بچو جس کی زد میں صرف ظالم ہی نہ آئیں گے اور جان لو کہ اللہ کا عذاب سخت ہے۔ یعنی فرض کیجیے کہ ایک قوم کے اکثر افراد نے ظلم و عصیان کا وطیرہ اختیار کر لیا۔ کچھ لوگ جو اس سے علیحدہ رہے انہوں نے مداہنت برتی نہ نصیحت کی نہ اظہارِ نفرت کیا تو یہ ہے وہ فتنہ جس کی لپیٹ میں وہ ظالم اور یہ خاموش مداہن سب آ جائیں گے۔ جب عذاب آئے گا تو حسبِ مراتب سب اس میں شامل ہوں گے کوئی نہ بچے گا۔ اس تفسیر کے موافق آیت کا مقصود یہ ہے کہ خدا و رسول کی حکم برداری کے لیے خود تیار رہو اور نافرمانوں کو نصیحت و فہمائش کرو۔ نہ مانیں تو بیزاری کا اظہار کرو۔ باقی حضرت شاہ صاحب نے آیت کا مطلب یہ بتایا ہے کہ مسلمانوں کو ایسے فساد سے بالخصوص بچنا چاہیے جس کا عذاب کا اثر گناہ گار کی ذات سے متعدی ہو کر دوسروں تک پہنچتا ہے۔ پہلے فرمایا تھا کہ خدا و رسول کا حکم ماننے میں ادنیٰ تاخیر اور سستی نہ کرو تمہیں دیر کرنے کی وجہ سے دل نہ ہٹ جاتے۔ اب فرماتے ہیں کہ اگر نیک لوگ کاہلی کریں گے تو تمام لوگ بالکل چھوڑ دیں گے تو رسمِ بد پھیل جائے گی۔

اس کا وبال سب پر پڑے گا جیسے جنگ میں دلیر سستی کریں تو نامرد بھاگ ہی جائیں گے پھر شکست ہو تو دلیر بھی نہ تھام سکیں [1]

مطلب یہ ہے کہ اس فتنہ سے اہلِ ایمان کو دامن بچا کر رکھنا چاہیے جس کی پاداش میں صرف ظالم ہی نہ پکڑے جائیں گے بلکہ ان کی نشامتِ اعمال سے سب ہی اس لپیٹ میں آجائیں گے۔ نیک لوگ بھی انہی کے منہ میں آجائیں گے اور بد بھی۔ جب دلیر لڑائی میں بزدلی کا مظاہرہ کریں تو بزدل خود بخود گریز پائی اختیار کریں گے۔ اس کے نتیجہ میں شکست کا وبال سب کو بھگتنا ہوگا۔ اسی طرح دین میں مدافعت کرنے اور گنہگاروں کو گناہ سے روکنے کی وجہ سے جب عذابِ الٰہی آتا ہے تو سب پر آتا ہے تا آنکہ جانور بھی اس سے محفوظ نہیں رہتے۔

مسند امام احمد میں عدی بن عمیر کے حوالے سے ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ خاص لوگوں کی بدعملی کی وجہ سے اللہ سبحانہٗ عام لوگوں کو اس وقت تک عذاب میں مبتلا نہیں کرتا جب تک وہ لوگ اپنے سامنے برائیاں ہوتے دیکھ کر روکتے رہیں۔ ہاں اگر قادر ہونے کے باوجود نہ روکیں تو اللہ سبحانہٗ کی گرفت سب کو آپکڑتی ہے۔

مسند احمد ہی میں حذیفہ ابن الیمان کے حوالہ سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد آیا ہے۔ قسم ہے اس اللہ کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، تمہیں معروف کا حکم دینا چاہیے اور منکرات سے روکنا چاہیے۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو اللہ سبحانہٗ تم پر ایسے لوگوں کو مسلط کر دے گا جن سے بچنے کی دعائیں مانگو گے مگر قبول نہ ہوں گی۔ نعمان بن بشیر کی روایت میں حضور اقدس نے اسے ایک مثال سے سمجھایا ہے۔ جہاز میں نیچے درجہ والے اگر پانی لینے کے لیے جہاز میں سوراخ کریں اور اوپر والے ان کو نہ روکیں تو سب ہی غرق ہو جائیں گے۔ یہ تمثیل فتنۃ لا تصیبن الذین ظلموا منکم خاصۃ سب سے اچھی اور عمدہ تفسیر ہے۔ گویا قرآن نے اس آیت کے ذریعے جماعت کے افراد پر ان کی قوت کے بقدر جماعت کے دوسرے افراد کی نگرانی فرض کی ہے۔ اسی

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

اخلاقی فرض کا قانونی نام امر بالمعروف، نہی عن المنکر ہے۔ یہ وہ تعلیم ہے جو دُنیا کے تمام مذاہب میں اسلام کی اخلاقی نگرانی کے اُصول کو نمایاں کرتی ہے۔ تورات میں قابیل کا یہ فقرہ کہ "کیا میں اپنے بھائی کا رکھوالا ہوں" عیسائیت کے اخلاق کا ایک اہم اصول بن گیا ہے۔ اسی اخلاقی اصول نے یورپ میں اس قانونی مسئلہ کی صورت اختیار کر لی ہے جس کا نام شخصی آزادی کی بحالی ہے لیکن اسلام کے قانون میں واقعی ہر شخص اپنے بھائی کا رکھوالا بنایا گیا ہے۔ کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ۔ قرآن میں صداقت کے ساتھ لوگوں کو نیکی کی ہدایت کرنے اور برائی سے بچنے اور باز رکھنے کا فرض مسلمانوں پر عائد کیا ہے۔ اس آیت میں قرآن جس بات کی طرف رہنمائی کر رہا ہے وہ اجتماعی اور عمومی برائی اور اس کے عمومی نتائج ہیں۔ یہ عمومی نتائج ہی اجتماعی فتنے ہیں جو وبائے عام کی طرح پوری قوم کی شامت لے آتے ہیں۔ یعنی صرف برائی کرنے والا ہی پکڑا نہیں جاتا بلکہ سب پکڑ لیے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر یوں سمجھو کہ جب تک کسی شہر میں گندگیاں خال خال انفرادی طور پر کچھ مقامات پر رہتی ہیں ان کا اثر محدود ہوتا ہے اور ان سے وہ مخصوص افراد ہی متاثر ہوتے ہیں جنہوں نے اپنے جسم اور اپنے گھر کو گندگی سے آلودہ کر رکھا ہو لیکن جب گندگی عام ہو جاتی ہے اور کوئی گروہ بھی پورے شہر میں ایسا نہیں ہوتا جو اس خرابی کو روکنے اور صفائی کا انتظام کرنے کی سعی کرے تو پھر ہوا، زمین، پانی ہر چیز میں سمیت پھیل جاتی ہے اور اس کے نتیجے میں جو وبا آتی ہے اس کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ اسی طرح اخلاقی نجاستوں کا حال ہے۔ اگر وہ انفرادی طور پر بعض افراد میں موجود رہیں اور نیک لوگوں کی وجہ سے دبی رہیں تو ان سے نقصانات کم ہوتے ہیں لیکن جب معاشرہ کا اجتماعی ضمیر کمزور ہو جاتا ہے تو مجموعی طور پر پورے معاشرہ کی شامت آجاتی ہے اور وہ فتنہ عام برپا ہو جاتا ہے۔

بس اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا مقصد یہ ہے کہ نبوت جس اصلاح و ہدایت کے لیے آئی ہے اور تمہیں جس خدمت میں ہاتھ بٹانے کی دعوت دے رہی ہے اسی میں درحقیقت تمہارے لیے انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے زندگی ہے۔ اگر اس میں سچے دل سے مخلصانہ حصہ نہ لوگے اور برائیوں کو جو لوگوں میں پھیلی ہوئی ہیں برداشت کرتے رہو گے تو وہ فتنہ عام برپا ہو جائے گا جس کی آفت سب کو لپیٹ میں لے لے گی۔

آخر میں فرمایا واعلموا ان اللہ شدید العقاب یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ سبحانہ کے قوانین جس طرح جسمانیات و مادیات میں بے لچک ہیں اسی طرح اخلاقیات میں بھی بے لچک ہیں۔ خراب آب و ہوا میں سانس لینے والا جس طرح آب و ہوا کے فساد سے لازماً متاثر ہوتا ہے اسی طرح بُرے ماحول میں زندگی بسر کرنے والا اس کے بُرے عواقب کی زد میں آجاتا ہے۔

اہلِ عرب پر انعامِ خداوندی

۳۲- اور وہ وقت یاد کرو جب تم ملک میں ایک کمزور اقلیت تھے، تمہیں اندیشہ تھا کہ تمہیں لوگ ختم کر دیں گے، اللہ نے تمہیں ٹھکانا دیا اور اپنی مدد سے تمہیں قوت عطا فرمائی اور تمہیں بہترین روزی عطا فرمائی تاکہ تم اس کا شکر ادا کرو۔ یعنی اپنی قلت و ضعف کو خیال کر کے خدا کا حکم جہاد ماننے میں سستی مت دکھلاؤ۔ دیکھو ہجرت سے پہلے بلکہ اس کے بعد بھی تمہاری تعداد تھوڑی تھی، سامان بھی نہ تھا۔ تمہاری کمزوری کو دیکھ کر لوگوں کو طمع ہوتی تھی کہ تم کو ہضم کر جائیں تمہیں ہر وقت یہ خدشہ رہتا تھا کہ دشمنانِ اسلام کہیں نوچ کھسوٹ کر نہ لے جائیں مگر خدا نے تم کو مدینہ میں ٹھکانا دیا۔ انصار و مہاجرین میں عدیم النظیر رشتہ مواخات قائم کر دیا۔ پھر معرکہ بدر میں کیسی کھلی ہوئی غیبی امداد پہنچائی۔ کفار کی جڑ کاٹ دی۔ تم کو فتح الگ دی، مالِ غنیمت اور فدیہ اساری الگ دیا۔ غرض حلال طیب ستھری چیزیں اور انواع و اقسام کی نعمتیں عطا فرمائیں تاکہ تم اس کے شکر گزار بندے بنے رہو۔[1]

اس آیت کے بارے میں شارحین قرآن کی دو رائیں ہیں۔

ایک رائے یہ ہے کہ آیت کے مخاطب مہاجرین ہیں دوسری رائے یہ ہے کہ آیت کا روئے سخن سارے عرب کی طرف ہے۔ یہ دوسری رائے قتادہ ابن دعامہ کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ اہلِ عرب پوری انسانی دنیا میں سب سے زیادہ ذلیل، معیشت میں سب سے زیادہ بدحال۔ معاش میں سب سے زیادہ تنگ دست، ننگے بھوکے بنجر اور تپتی زمین

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

میں ان سے زیادہ کوئی بدحال نہ تھا۔ اللہ نے اسلام کے ذریعے ان کو عزت بخشی۔ اقتدار عطا فرمایا۔ یہ سب کچھ اسلام کی بدولت ہوا۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ و رسول نے اسلام کی نعمت سے تمہیں مالا مال کیا ہے اب تم نے دیکھ لیا ہے کہ اسلام کی راہ میں تمہیں اس نے ہر قدم پر سہارا دیا ہے۔ تم تھوڑے تھے۔ پوری زمین میں تمہیں کمزور سمجھا جاتا تھا۔ اللہ نے تمہیں قوت دی ہے۔ اپنی نصرت سے نوازا۔ تمہارے لیے پاکیزہ معاش و معیشت کی راہیں کھولیں۔ ان سب باتوں کا تقاضا ہے کہ تم نعمتِ اسلام کی قدر کرو اور مستقبل میں اسلام کے وفادار بن کر رہو۔ اس اندیشے میں نہ پڑو کہ اسلام پر چل کر تم کسی خطرے کا نشانہ بن جاؤ گے۔

قرآن کی یہ آیت تاریخی اور اجتماعی حجت ہے یہ بتا رہی ہے کہ عرب دنیا کی اصلاح کا ذریعہ اسلام ہے۔ اسی کی وفاداری سے ان کو دنیا میں سعادت اور سیادت کی نعمت ملی ہے اس نعمت کی شکر گزاری صرف یہ نہیں ہے کہ لوگ صرف یہ مان لیں کہ اسلام نے ہمیں کمزوری کی حالت سے نکالا ہے بلکہ اصل شکر گزاری یہ ہے کہ دنیا میں زندگی کے دوسرے نظاموں کے مقابلے میں اسلام کے پورے وفادار بن کر رہیں۔ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن اخلاص اور جاں نثاری کے ساتھ کام کریں اور اس راہ میں جو خطرات اور مصائب پیش آئیں ان کا مردانہ وار مقابلہ کریں اور یقین کریں کہ جب وہ اللہ سبحانہ کا کام اخلاص سے کریں گے تو اللہ سبحانہ ضرور ان کا کفیل ہو گا۔ اور بس۔ غور کریں چند محلوں پر مشتمل شہری مملکت سے مدینہ میں جس کام کا آغاز ہوا وہ روزانہ دو سو چوہتر میل سے بھی زیادہ مربع میل کے اوسط سے وسعت اختیار کرتی ہے اور دس سال میں جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو دس لاکھ سے زیادہ مربع میل کا رقبہ آپ کے زیر اقتدار آچکا تھا۔ اس میں تقریباً ہندوستان کے برابر علاقہ کی فتح میں جس میں یقیناً ملینوں آبادی تھی دشمن کے صرف ڈیڑھ سو آدمی قتل ہوئے اور مسلمان فوج کا مشکل سے اس دس سال میں ماہانہ ایک سپاہی شہید ہوا۔ انسانی خون کی یہ عظمت تاریخ عالم میں بلا خوفِ تردید بے نظیر ہے۔ [1]

---

[1] عہدِ نبوی کے میدانِ جنگ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْۤا
اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٢٧﴾ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَاۤ اَمْوَالُكُمْ
وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿٢٨﴾
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّ
يُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ
الْعَظِيْمِ ﴿٢٩﴾

اے مسلمانو! اللہ اور اس کے رسول سے خیانت نہ کرو۔ اور نہ اپنی امانتوں میں خیانت کرو حالانکہ تم اس سے باخبر ہو۔[٣٣] اور خوب جان لو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد ایک آزمائش ہیں، اور جان لو کہ اللہ ہی کے پاس اجر عظیم ہے۔[٣٤] اے مسلمانو! اگر تم اللہ کی نافرمانی سے بچتے رہو گے تو وہ تمہارے لیے حق و باطل میں امتیاز کرنے والی ایک

قوت فراہم کر دے گا اور تم سے تمہاری بدحالیاں ہٹا دے گا اور تمہیں بخش دے گا اور اللہ سبحانہ بہت بڑے فضل و کرم والا ہے۔ ۴۵

اسلامی زندگی کے اجتماعی خطرے

ان آیات میں مزید اجتماعی خطروں کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے اور یہ تین خطرے ہیں ایک امانت میں خیانت ، دوسرے مال و اولاد کی خاطر دین کو خیرباد کہنے کا ، تیسرے اجتماعی زندگی میں خدا کی نافرمانی کا۔ خیانت سے مقصود وہ تمام خیانتیں ہیں جو اسلام کے احکام کی تعمیل و تبلیغ اور اُمت کے مصالح و مقاصد میں کی جائیں۔ اور تقویٰ سے مراد اوامر کی پا بجائی اور نواہی سے بچنا ہے کیونکہ اسلام کا اولین مقصد یہ ہے کہ شر و فساد کی ان قوتوں کا استیصال کیا جائے جن سے کفر کا وجود عبارت ہے۔ دُنیا کے ہر دوسرے وجود کی طرح کفر بھی اپنی ہستی کی بقا کا آرزومند اور کشمکش حیات میں مبتلا ہے اور اس میدان میں اسلام تنہا اس کا مدمقابل ہے کیونکہ وہ اپنی فطرت کے اعتبار سے کفر کی ضد ہے۔ اسلام اور کفر کے درمیان مصالحت ناممکن اور ان کی لڑائی بلافصل قائم ہے۔ یہ لڑائی دُنیا کی دوسری لڑائیوں پر حاوی اور ان سے مافوق ہے بلکہ اور جتنی نزاعیں اور لڑائیاں ہیں ان کا سلسلہ کہیں نہ کہیں جاکر اس لڑائی سے ضرور مل جاتا ہے۔ کفر کی طاقتیں اسلام کی مزاحم ہوتی ہیں لیکن ان کی یہ مزاحمت حق و صداقت کی سعی کمال کا سبب بن جاتی ہے۔ اس لیے اسلام کو کفر کے مقابلے کے لیے ایسی جماعت درکار ہے جس کا دامن ہر قسم کی بُرائی سے بے داغ ہو تاکہ کفر کا صحیح اور مکمل مقابلہ ہو سکے۔ یہاں اصل مقابلہ مادی نہیں معنوی ہے۔ معنوی مقابلے میں معنوی طاقت کی ضرورت ہے۔

خیانت سنگین جرم ہے

۳۳۔ اے مسلمانو! اللہ اور اس کے رسول سے خیانت نہ کرو اور نہ اپنی امانتوں میں خیانت کرو حالانکہ تم اس سے باخبر ہو۔ خدا اور رسول کی خیانت یہ ہے کہ ان کے احکام کی خلاف ورزی کی جائے زبان سے اپنے کو مسلمان کہیں اور کام کفار کے کریں۔ یا جس کام پر خدا اور رسول نے مامور کیا اس میں دخل فصل کیا جائے یا مالِ غنیمت میں چوری کی جائے۔ و نحو ذالک بہرحال ان تمام امانتوں میں جو خدا اور رسول یا بندوں کی طرف سے تمہارے سپرد کی جائیں۔ خیانت سے بچو اس میں ہر قسم کے حقوق اللہ اور حقوق العباد آ گئے۔ روایات میں ہے کہ یہود بنو قریظہ نے جب حضور سے صلح کی درخواست کی اور یہ کہ ان کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے جو بنی نضیر کے ساتھ ہوا ہے تو آپ نے ارشاد فرمایا نہیں میں تم کو اتنا حق دیتا ہوں کہ سعد بن معاذ کو حاکم بنالو، جو فیصلہ وہ تمہاری نسبت کر دیں وہ منظور ہونا چاہیے۔ انہوں نے حضرت ابولبابہ کو حضور سے اجازت لے کر اپنے یہاں بلوایا اور دریافت کیا کہ تمہاری اس معاملہ میں کیا رائے ہے ہم سعد بن معاذ کی تحکیم منظور کر لیں یا نہ کریں۔ ابولبابہ کے اموال اور اہل و عیال بنو قریظہ کے یہاں تھے وہ ان کی خیر خواہی کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے حلقوم کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا یعنی اگر سعد بن معاذ کی تحکیم منظور کی تو ذبح ہو جاؤ گے۔ ابولبابہ اشارہ کر کے گزرے مگر فوراً احساس ہوا کہ میں نے خدا اور رسول کی خیانت کی، واپس آکر اپنے کو ایک ستون سے باندھ دیا اور عہد کیا نہ کچھ کھاؤں گا نہ پیوں گا حتیٰ کہ موت آجائے یا اللہ تعالیٰ میری توبہ قبول کرے۔ سات آٹھ دن یوں ہی بندھے رہے۔ فاقہ کشی سے غشی طاری ہو گئی۔ آخر بشارت پہنچی کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے تمہاری توبہ قبول کی۔ کہا کہ خدا کی قسم میں اپنے آپ کو نہ کھولوں گا جب تک خود جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دستِ مبارک سے میری رسی نہ کھولیں گے۔ آپ تشریف لائے اور اپنے ہاتھ سے اپنے قیدی کو آزاد کیا۔ ابن عبدالبر کا دعویٰ ہے کہ یہ واقعہ غزوہ تبوک میں شرکت نہ کرنے کی بنا پر پیش آیا تھا واللہ اعلم[1]

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

شیخ الاسلام نے جو روایت لکھی ہیں یہی واقعہ متعدد روایات میں عبداللہ ابن قتادہ، زہری، کلبی، سدی اور عکرمہ کے حوالہ سے پیش کیا گیا ہے اور اسی کو شارحین قرآن نے آیت کا پس منظر قرار دیا ہے۔ لیکن یہاں ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ سورہ انفال غزوہ بدر کے حالات و واقعات پر مشتمل ہے۔ غزوہ بدر ۲ھ میں ہوا جبکہ قریظہ کا محاصرہ ۵ھ میں ہوا۔ اس لیے ابولبابہ کا واقعہ اس آیت کا پس منظر نہیں ہو سکتا۔ آپ یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ ابولبابہ کا عمل اس آیت کے خلاف تھا لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ آیت کا پس منظر یہی واقعہ ہے۔ شارحین قرآن نے آیت کے پس منظر میں اور بھی واقعات لکھے ہیں۔ ایک واقعہ ابوسفیان کے مکہ سے روانہ ہونے کا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ عامر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ ابوسفیان مکہ سے روانہ ہوا۔ حضرت جبریل نے حضور کو اس کی روانگی کی اطلاع دی۔ حضور نے لوگوں کو بتایا اور حکم دیا کہ چلو۔ منافقین میں سے ایک شخص نے ایک خط کے ذریعے حضور کے ارادے کی اطلاع ابوسفیان کو دے دی۔ اس پر قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی۔ گویا اس آیت میں منافقین کے اس عمل پر تعریض کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس کی یہ خیانت دعوائے ایمان کے منافی ہے۔ یہ روایت بھی اس کے بارے میں ہے حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ اس کی سند اور سیاق محل نظر ہیں۔ امام رازی نے اس جیسے اور بھی واقعے لکھے ہیں مگر آخر میں لکھا ہے کہ العبرۃ لعموم اللفظ۔ اعتبار تو قرآن کے عموم کا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر آیت کے پس منظر میں ضرور کوئی واقعہ ہو۔ آیت اپنے سباق سے مربوط ہے اور اس کے معنی میں مطلب ڈالنے کے لیے کسی پس منظر کی حاجت نہیں ہے

یاایھا الذین امنوا استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم میں جس بات کا مطالبہ کیا ہے یعنی اللہ و رسول کی دعوت پر لبیک کہو کیونکہ اسی سے تم کو حقیقی اور دائمی زندگی حاصل ہوگی۔ اس آیت میں اس کی مخالفت سے روکا گیا ہے کہ دعوائے ایمان کر کے اگر لبیک نہ کہو گے تو یہ اللہ اور اس کے رسول سے خیانت ہوگی۔ سمعنا اطعنا کا اقرار کر کے بے وفائی خیانت ہے۔ ایمان انقیاد باطن، التزام طاعت اور وفاداری کا ایک عہد ہے اور عہد ایک امانت ہوتا ہے۔ اس کی خلاف ورزی خفیہ ہو یا علانیہ خیانت ہے۔ حافظ ابن تیمیہ، حسن بصری سے نقل کرتے ہیں :

ایمان صرف ظاہری ٹیپ ٹاپ کا نام نہیں ہے، ایمان اسے کہتے

ہیں جو دل میں گھر کر جائے اور اعمال اس کی تصدیق کریں۔
اللہ اور رسول کے ساتھ خیانت یہ ہے کہ اقرار کر کے اسے پورا نہ کیا جائے۔ ایمانداری سے ان کے حکموں کی تعمیل نہ کی جائے۔ دین و ملت کے مصالح کے ساتھ غداری کی جائے۔ اور اللہ و رسول اور مسلمانوں کے دشمنوں کو چھپے چوری مدد پہنچائی جائے یا مسلمانوں کے چھپے راز ان کو بتائے جائیں و تخونوا اماناتکم میں آپس کی امانتوں میں خیانت سے روکا گیا ہے۔ آپس کی امانتوں میں خیانت یہ ہے کہ جو چیز جس کے پاس امانت ہے اس میں خیانت کرے اور کسی کا جو راز کسی کو معلوم ہو، اس کو دوسروں پر ظاہر کر دے۔ یہ حدیث کئی دفعہ پڑھ چکے ہو کہ منافق کی تین علامتوں میں سے ایک یہ ہے کہ جب کوئی امانت اس کے سپرد کی جائے تو وہ اس میں خیانت کرے۔ حافظ منذری نے باب الترغیب فی انجاز الوعد میں عبداللہ بن مسعود کی ایک موقوف روایت پیش کی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ خدا کی راہ میں مارا جانا ہر گناہ کا کفارہ ہے لیکن امانت میں خیانت کا نہیں۔

آیت میں امانتوں سے مراد وہ تمام ذمہ داریاں ہیں جو کسی پر اعتبار کر کے اس کے سپرد کی جائیں۔ اس میں سارے سرکاری عہدے اور نجی معاملات داخل ہیں۔ امانات امانت کی جمع ہے۔ یہاں لفظ امانت خاص معنے میں نہیں بلکہ عام معنی میں آیا ہے اس میں تمام حقوق و فرائض انفرادی نوعیت کے ہوں یا اجتماعی نوعیت کے، اپنوں سے تعلق رکھتے ہوں یا بیگانوں سے، مالی معاملات ہوں یا سیاسی معاہدات سب لفظ امانت کے مفہوم میں داخل ہیں۔ شاہ عبدالقادر نے قرآن کی آیت انا عرضنا الامانۃ کی تشریح کرتے ہوئے امانت کی یہ تعریف کی ہے۔ امانت کیا ہے پرائی چیز رکھنی، اپنی خواہش کو روک کر، اس معنے میں علم بھی امانت ہے رائے بھی امانت ہے، عہدے اور مناصب بھی امانت ہیں۔ قرآن کے نقطۂ نظر سے حکومت اور سیاسی اقتدار بھی امانت ہے۔ حدیث میں اس کی تشریح آئی ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر غفاری سے فرمایا تھا انك ضعيف وانها لامانۃ تو کمزور ہے اور حکومت امانت ہے۔ فقہی نقطۂ نظر سے ذرائع اور وسائل مقاصد کے تابع ہوتے ہیں اس لیے حکومت اگر امانت ہے تو حکومت سازی کا

ذریعہ ووٹ بھی امانت ہے۔ اور امانت کے بارے میں قرآن کا حکم ہے ان اللہ یامرکم ان تودوا الامانات الی اھلھا اور حکم ہے و تخونوا امانتکم یعنی ووٹ ان کو دو جن میں اہلیت ہو۔ اگر نااہل کو تم نے ووٹ دیا تو مجرمانہ خیانت کر رہے ہو وانتم تعلمون کا مطلب یہ ہے کہ تم جانتے ہو کہ اس میں اس کی اہلیت نہیں اور پھر اس کو ووٹ دے رہے ہو تو یہ اور زیادہ سنگین جرم ہے۔ بے خبری تو ایک درجہ میں عذر بھی ہے لیکن جانتے بوجھتے ایسا کرنا بہت بڑا جرم ہے۔

دولت اور اولاد میں فتنہ

۲۸۔ اور خوب جان لو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد ایک آزمائش ہیں اور جان لو کہ اللہ ہی کے پاس اجر عظیم ہے۔ یعنی آدمی مال اور اولاد کی خاطر ہی خدا کی اور بندوں کی چوری کرتا ہے اس لیے متنبہ فرما دیا کہ امانت داری کی جو قیمت اللہ کے یہاں ہے وہ یہاں کے مال و اولاد وغیرہ سب چیزوں سے بڑھ کر ہے[1]

اب اللہ اور اس کے رسول کی محبت و طاعت میں کمزوری کی اصلی وجہ بتائی جا رہی ہے۔ یعنی بتایا جا رہا ہے کہ ایمان میں یہ بیماری کہاں سے لگی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جو لوگ خدا اور رسول کی دعوت پر لبیک نہیں کہتے وہ مال و اولاد کی محبت میں گرفتار ہیں۔ اور یہ بیماری جب لگ جاتی ہے تو انسان از خود رفتہ ہو کر اللہ و رسول کو فراموش کر جاتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں اللہ کی نعمت ہیں لیکن جب یہ خدا فراموشی کا سبب بن جائیں تو دونوں فتنہ بن جاتی ہیں۔ خدا اور رسول سے بے وفائی ہو یا دوسروں کے حقوق میں خیانت ہو سب کا بنیادی سبب ہی دونوں کی حد سے بڑھی ہوئی محبت ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ انسان کے اخلاص ایمانی میں جو چیز بالعموم خلل ڈالتی ہے اور جس کی وجہ سے اکثر بے ایمانی، غداری اور خیانت جیسے سنگین جرائم کا ارتکاب کرتا ہے وہ اپنے مالی مفاد اور اپنی اولاد کے مفاد سے اس کی حد سے بڑھی ہوئی دلچسپی ہوتی ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ یہ مال و اولاد جن کی محبت میں گرفتار ہو کر تم عموماً راستی سے ہٹ جاتے ہو

[1] افادات شیخ الاسلام

دراصل یہ دنیا کی امتحان گاہ میں تمہارے لیے سامانِ آزمائش ہے۔ فی الواقع جسے تم بیٹا یا بیٹی کہتے ہو۔ یہ دراصل امتحان کا ایک پرچہ ہے اور جسے تم سرمایہ اور دولت کہتے ہو یہ بھی امتحان کا دوسرا پرچہ ہے۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ اگر قرآن کے بیان کے مطابق انسان کی پوری زندگی ابتلائی ہے۔ اسی ابتلائی زندگی میں امتحان کے اصلی یہ دو پرچے ہیں مال اور اولاد۔ ابتلائی ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ سبحانہٗ جن باتوں کو نہیں جانتے ان کو جاننا چاہتے ہیں بلکہ انسانی فطرت میں اقتدار، اختیار، انتخاب و ترجیح کی جو قوت رکھی گئی اسی قوت کے صحیح استعمال کے مطالبہ کا نام امتحان ہے۔ اللہ سبحانہٗ نے اس آیت میں اہلِ ایمان کو اسی کے جان لینے کا حکم دیا۔ یعنی جان لو کہ تمہارا مال اور اولاد دونوں تمہاری ابتلائی زندگی کے امتحانی پرچے ہیں۔ قرآن نے آدمی کی زندگی کے پانچ دور بتائے ہیں۔ اس میں آخری دور "تکاثر فی الاموال والاولاد" کو قرار دیا۔ یعنی مال اور اولاد کی کثرت میں باہم مقابلہ کرنا۔ زندگی کے اس دور میں پہلے تو دولت و ثروت کا مقابلہ ہوتا ہے۔ تنخواہیں ناپی جاتی ہیں۔ آمدنیوں کا موازنہ کر کے اندر ہی اندر ہر ایک دوسرے کے مقابلے میں آگے بڑھ جانے کی فکر میں منہمک رہتا ہے۔ الاموال کے بعد پھر الاولاد کا مقابلہ شروع ہو جاتا ہے۔ بیٹے گنے جاتے ہیں، بیٹیاں شمار ہوتی ہیں۔ گھر، خاندان، برادری، کنبہ تک اس کو وسیع کر دیا جاتا ہے۔ الاموال اور الاولاد کے تکاثر کا یہ مشغلہ زندگی کا آخری مشغلہ ہوتا ہے۔ بالآخر اسی کو دنیا میں کلمیابی کا معیار بنا لیا جاتا ہے۔ قرآن ہی میں ہے :

ای الفریقین خیر مقاما واحسن ندیا

بتاؤ دونوں جماعتوں میں سے کون بہتر ہے اور کس کا جلسہ شاندار ہے۔

اور یہی نہیں بلکہ نبوت کی تعلیمات کو رد کرنے والوں نے ان دونوں کی بہتات کو حق پر ہونے کی کسوٹی بنا رکھا تھا۔ قرآن میں ہے :

نحن اکثر اموالا واولادا وما نحن بمعذبین

مال و اولاد میں تو ہم زیادہ ہیں ہمیں خدا کا عذاب نہیں ہوگا۔

آج بھی معیار یہی ہے۔ اسی لیے قرآن ان دونوں کو موجودہ ابتلائی زندگی میں پرچہ امتحان قرار دیا ہے۔

خیر و شر میں امتیاز کی کسوٹی

۲۵۔ لے مسلمانو! اگر تم اللہ کی نافرمانی سے بچتے رہو گے تو وہ تمہارے لیے حق و باطل میں امتیاز کی قوت فراہم کر دے گا اور تم سے تمہاری بدحالیاں ہٹا دے گا اور تمہیں بخش دے گا اور اللہ سبحانہ، بہت بڑے فضل و کرم والا ہے۔ یعنی اگر خدا سے ڈر کر راہ تقویٰ اختیار کر لو گے تو خدا تم میں اور تمہارے مخالفوں میں فیصلہ کر دے گا۔ دُنیا میں بھی تم کو عزت دے گا اور ان کو ذلیل یا ہلاک کرے گا جیسے بدر میں کیا اور آخرت میں بھی کہ تم نعیم دائم میں رہو گے۔ اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہو گا وامتازوا الیوم ایہا المجرمون اور المرسلات میں ہے ھذا یوم الفصل دوسری بات یہ ہے کہ تقویٰ کی برکت سے حق تعالیٰ تمہارے دل میں ایک نور ڈال دے گا جس سے تم فرق و جدا نا حق و باطل اور نیک و بد کے درمیان فیصلہ کر سکو گے۔ اس کے علاوہ ایک بات حضرت شاہ صاحب نے لکھی ہے کہ شاید فتح بدر میں مسلمانوں کے دل میں خیال آیا ہو کہ یہ فتح اتفاقی ہے۔ حضرت سے مخفی کافروں پر احسان کریں کہ ہمارے گھر بار اور اہل و عیال کو مکہ میں نہ ستاویں۔ سو پہلی آیت میں خیانت کو منع فرمایا اور دوسری آیت میں تسلی دی کہ آگے فیصلہ ہو جائے گا تمہارے گھر بار کافروں میں گرفتار نہ رہیں گے۔ لے

اصل ارشاد میں ایک شرط کے پورا کرنے پر مستقبل میں تین انعامات کی خوشخبری دی ہے۔ شرط یہ ہے ان تتقوا اللہ۔ حضرت شاہ صاحب نے اس کا ترجمہ کیا ہے کہ اگر تم ڈرتے رہو گے در اصل یہ ایک تشریح طلب مضمون ہے جسے حضرت شاہ صاحب نے مختصر لفظوں میں پیش کیا ہے۔ مشرکین اور اہل کتاب کے حیا سوز معاشرے دہشت انگیز ماحول اور گھٹی ہوئی فضا میں ان لوگوں کو جنہوں نے نبوت کی دعوت پر لبیک کہہ کر بدر میں قربانی دی ہے۔ بتایا جا رہا ہے کہ مستقبل میں بدر جیسی کامیابی حاصل کرنے اور مشرکین و اہل کتاب کی چیرہ دستی اور ان کی ایمان سوز سازشوں سے بچنے کی آخری تدبیر یہ ہے کہ پوری قوت سے اپنے اندر اجتماعی تقویٰ پیدا کر و مشرکین

لے نادرات شیخ الاسلام

جو کچھ کر رہے ہیں یا اہل کتاب جو کچھ کہہ رہے ہیں یہ سب کی سب اندھی قوتیں ہیں جن میں نہ فہم حقیقت ہے اور نہ عقل و دانش کی روشنی ہے اور نہ انسانیت کی منزل مقصود کا کوئی نشان۔ یہ سب قوتیں وقتی حالات اور ہنگامی تقاضوں کی مخلوق ہیں۔ اور اس وقت تک اہل ایمان کے ایوانوں پر شبخون مارتے رہیں گے جب تک ایمان ایک جاندار طاقت بن کر ان کے سامنے نہیں آئے گا۔ ایمان کے جاندار بننے کا دارومدار صرف زبانی اقرار سے نہیں بلکہ یقین کی شدت اور عمل کی پختگی پر ہے۔ جس طرح درخت کی مضبوطی جڑ کی طاقت پر منحصر ہوتی ہے اور جڑ ہی سے درخت کو نشو و نما کا پورا سامان ملتا ہے۔ اسی طرح ایمان دنیا میں ایک زندہ اور کارفرما قوت کی حیثیت سے اس وقت ابھرتا ہے۔ جب ایمان کے روشنی سے دل و دماغ منور ہوں۔ آیت میں ایمان کے حوالہ سے خطاب کرنا اور پھر ان تتقوا اللہ کی شرط پیش کرنا اس کی طرف اشارہ کر رہا ہے کیونکہ ایمان ہی وہ مرکزی قوت ہے جس سے اسلامی زندگی کے مختلف اجزاء ترکیبی اپنی زندگی اور قوت کے لیے غذا حاصل کرتے ہیں۔ ایمان باللہ کی حقیقی کسوٹی تقویٰ ہے۔ ایمانِ خالص کا معیار ہی یہ ہے کہ ایک مسلمان اپنی زندگی میں متقیانہ سیرت اپنائے بلکہ اس راہ میں سب سے پہلی قربانی ہی یہ ہے کہ جہاں جہاں اللہ کی نافرمانی ہو رہی ہے اور جس طرح ہو رہی ہے اس سے یک قلم کنارہ کش ہو جائے۔ ذاتی منفعت، ملکی مصلحت اور قومی مفادات اس راہ میں اگر رکاوٹ ہوں تو ٹھکرا دے یہی تقویٰ ہے

یہ شرط پیش فرما کر اس کی جزا میں تین انعامات کا ذکر ہے۔

پہلا انعام یہ ہے یجعل لکم فرقانا" اللہ تمہارے لیے حق و باطل میں امتیاز کرنے والی قوت بنا دے گا۔ فرقان ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو حق اور باطل کے درمیان امتیاز کر دے۔ یہ امتیاز اندرونی طور پر ہو سکتا ہے اور بیرونی بھی، علمی اور عقلی بھی، عملی اور واقعاتی بھی۔ قرآن دلائل و براہین کو بھی فرقان کہتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو جماعت اجتماعی زندگی میں تقویٰ کی سیرت اختیار کرے گی اس میں حق و باطل اور خیر و شر میں امتیاز کی ایک خاص قوت پیدا ہو جائے گی اور اس لیے کبھی باطل و شر کی طرف قدم نہ اٹھائے گی۔ واقعات کی روشنی میں اگر آپ اس آیت کی جیتی جاگتی تفسیر دیکھنا چاہتے ہیں تو صدر اول کے مسلمانوں کو دیکھ لیجیے۔ عرب کے صحرا نشین

جن کی ساری زندگیاں اُونٹ چرانے میں بسر ہوئیں۔ بلکہ ایک ایرانیوں اور رومیوں جیسی متمدن قوموں کی قسمتوں کے مالک تھے۔ لیکن خیر و شر میں امتیاز کی ایسی قوت ان میں آ گئی تھی کہ جو کچھ جتنا کچھ جیسا کچھ کرتے تھے وہ حق و عدل اور خیر و سعادت کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا۔

آیت کا منشا یہ ہے کہ اگر تم دنیا میں اللہ سے ڈرتے ہوئے گزارو گے اور تمہاری دلی خواہش یہ ہو کہ تم سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو جو رضائے الٰہی کے خلاف ہو۔ تو اللہ تعالیٰ تمہارے اندر وہ قوتِ تمیز پیدا کر دے گا جس سے قدم قدم پر تمہیں خود یہ معلوم ہوتا رہے گا کہ کون سا رویہ صحیح ہے اور کون سا غلط۔ کس رویہ میں خدا کی رضا ہے اور کس میں اس کی ناراضی۔ زندگی کے ہر موڑ پر، ہر دوراہے پر نشیب و فراز پر تمہاری اندرونی بصیرت تمہیں بتانے لگے گی کہ کدھر قدم اُٹھانا چاہیے اور کدھر نہیں اٹھانا چاہیے۔ کون سی راہ حق ہے اور خدا کی طرف جاتی ہے اور کون سی راہ غلط ہے اور شیطان سے ملاتی ہے۔ گویا اس طرح اس آیت میں مسلمانوں سے یہ وعدہ کیا گیا ہے کہ مستقبل تمہارے لیے تاباں ہے بشرطیکہ تم تقویٰ پر مضبوطی سے جمے رہے یعنی اللہ اور اس کے رسول سے بدعہدی اور بے وفائی کے مرتکب نہ ہوئے۔ بلاشبہ اللہ سبحانہ، وہ وقت جلدی لائے گا کہ فضا میں جو کفر و شرک کے بادل نظر آ رہے ہیں سب چھٹ جائیں گے اور جو حق تم لے کر کھڑے ہوئے ہیں اس کا بول بالا اس طرح ہو گا کہ دشمنوں کی نگاہیں خیرہ ہو کر رہ جائیں گے۔

دوسرا انعام یہ ہے وَ يُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ اور تم سے تمہاری بدحالیاں مٹا دے گا۔ قرآن میں اجتماعی خوشحالیوں کے لیے حسنہ اور اجتماعی بدحالیوں کے لیے سیئات کی تعبیر آئی ہے۔ یہاں یہی مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم زندگی کے مختلف گوشوں میں ایمان کے اولین تقاضے پر کاربند رہے تو اللہ تمہاری اجتماعی بدحالیوں کو مٹا دے گا۔ اور اس کی جگہ تمہیں اجتماعی خوشحالیاں عطا فرمائے گا۔

اس میں بھی مسلمانوں سے وعدہ ہو رہا ہے کہ اگر تم تقویٰ پر مضبوطی سے جمے رہے تو تمہاری موجودہ اجتماعی بدحالیاں ختم ہو جائیں گی۔ اس کا تماشا بھی دنیا نے آنکھوں سے دیکھا۔ جن کو کھانے کو روٹی نہ ملتی تھی۔ ان کے گھروں میں قیصر و کسریٰ کے خزانوں

کی ریل پیل ہو رہی تھی۔ اونٹ چرانے والے دنیا کی متمدن قوموں کی قسمت کے مالک بن گئے۔ فقر و فاقہ کی ساری گھٹائیں چھٹ گئیں اور حالات یکسر بدل گئے۔ یہ کہ سیئات سے مراد اجتماعی بدحالیاں ہیں۔ یہ کوئی میری ذاتی رائے نہیں یا میرے دماغ کا کوئی خود تراشیدہ نتیجہ نہیں بلکہ سینۂ قرآن سے ابلی ہوئی بات ہے۔ اس موضوع پر قرآنی آیات کا جو ذخیرہ ہے سب کا نقل کرنا تو مشکل ہے۔ مثلاً چند آیات پیش کرتا ہوں۔

ان تمسسکم حسنۃ تسوھم وان تصبکم سیئۃ یفرحوبھا

اگر تم پر خوش حالی آجائے تو ان کو غمگین بنا دے اگر کوئی بدحالی آجائے تو وہ خوشیاں منائیں۔

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں:

اذا اصاب المومنین خصب ونصر وتائید۔ ساءذالک المنافقین وان اصاب المسلمین سنۃ ای جدب۔ فرح المنافقون

اہل ایمان کو جب معاشی خوشحالی، نصرت و قوت ملتی ہے تو منافقین کو غم ہو جاتا ہے اور جب مسلمان قحط سالی کا شکار ہوتے ہیں تو وہ خوش ہوتے ہیں۔

اس آیت میں سیئۃ سے مراد معاشی بدحالی ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

وان تصبھم سیئۃ یقولوا ھذہ من عندک

اور اگر ان کو کوئی بدحالی لپٹتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ یہ تمہاری وجہ سے ہے

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں:

سیئۃ الجدب والضرفی اموالھم

سیئۃ سے مراد قحط سالی اور مالی نقصان ہے۔

ایک اور ارشاد ہے:

ثم بدلنا مکان السیئۃ الحسنۃ حتی عفوا

پھر تبدیل کر دی ہم نے بدحالی کی جگہ خوشحالی یہاں تک کہ وہ زیادہ ہو گئے۔

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں۔

حولنا الحال من شدة الی الرخاء ومن مرض وسقم الی صحة وعافیة ومن فقر الی غنی۔

ہم نے حالات بدل دیے معاشی بدحالی کی جگہ معاشی خوشحالی، بیماری کی جگہ صحت اور فقیری کی جگہ مالداری۔

اس کے علاوہ قرآن ہی میں ایمان و تقویٰ کے نتیجے میں معاشی برکتوں کا ذکر آتا ہے۔

ولو ان اهل القریٰ امنوا واتقوا لفتحنا علیهم برکات من السماء والارض۔

اور آبادیاں والے اگر ایمان و تقویٰ کی زندگی اپنا لیتے تو ہم ان پر آسمان و زمین سے ضرور برکتوں کو کھول دیتے۔

اگر حقیقت یہ ہے اور نہ ہونے کی وجہ کیا ہے جبکہ خود قرآن گواہی دے رہا ہے تو پھر یہاں سیئات سے اجتماعی معاشی بدحالیاں مراد لینے میں کون سی قباحت ہے مطلب یہ ہے کہ اگر ایمان کی زندگی میں تقویٰ کا سرمایہ فراہم کرلوگے تو ہم تمہیں اس دنیا کی زندگی میں اجتماعی طور پر معاشی خوشحالی عطا کریں گے اور تمہاری معاشی بدحالیوں کو ملیا میٹ کر دیں گے۔

تیسرا انعام یہ ہے، و یغفر لکم اور تمہیں بخش دے گا۔ غفر کے معنے ڈھانپنے کے نہیں بلکہ محفوظ رکھنے کے ہیں۔ مغفر خود کو اس لیے کہتے ہیں کہ وہ سر کو تلوار کی ضرب سے محفوظ رکھتی ہے۔ اس لیے نہیں کہتے کہ وہ سر کو ڈھانپتی ہے۔ غفار پٹے کو کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ آزاد کو گرنے سے محفوظ رکھتا ہے۔ اس انعام کا تعلق بھی دنیا سے ہے اور یہ بھی مستقبل کے بارے میں وعدہ ہے۔ مطلب یہ ہے اگر تم اپنی زندگی میں تقویٰ اختیار کرو گے تو اللہ سبحانہ، تمہیں گناہوں سے اپنی حفاظت میں لے لے گا۔ اگر یہ سورت بدر اور اصحاب بدر کے بارے میں نازل ہوئی ہے تو اس کا صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ نے اصحاب بدر کی گناہوں سے حفاظت فرمائی ہے یہ اصحاب بدر کی گناہوں سے حفاظت کا پروانہ ہے۔ یہی مطلب ہے اس ارشادِ نبوت کا جو خاص اہلِ بدر کے بارے میں ہے۔

اعملوا ما شئتم فقد غفرت لکم

آخر میں ارشاد ہوا ہے واللّٰہ ذوالفضل العظیم یہ آیت ان تینوں انعامات کی علت ہے یعنی یہ انعامات تم پر صرف اس لیے ہوتے ہیں کہ اللہ سبحانہ بہت بڑے فضل والے ہیں - یہ بات نہیں کہ یہ تمہارے کیے کی قیمت ہے اور قیمت ہونے کی وجہ سے یہ انعامات اللہ کے ذمہ ہو گئے ہیں - نہیں بلکہ یہ محض اس کا فضل و احسان ہے کہ وہ انعامات سے تمہیں مالا مال کر رہا ہے - اوروں نے تو نہیں لیکن قاضی ثناءاللہ پانی پتی نے اس آیت سے یہ نکتہ خوب نکالا ہے کہ اللہ کے انعامات اعمال کی قیمت نہیں ہیں بلکہ محض ان کے ذوالفضل العظیم ہونے کا تقاضا ہے - اسی آیت سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات معلوم کی ہے کہ

تم میں سے کسی کو اس کا عمل نہیں بچائے گا - صحابہ نے دریافت کیا یا رسول اللہ آپ کو بھی آپ کا عمل نہیں بچائے گا - فرمایا مجھے بھی نہیں تاآنکہ ڈھانپ لے مجھے اللہ اپنی رحمت اور فضل میں -

گویا ہماری عابدانہ نیازمندیوں کی حیثیت ایسی ہے جیسے کوئی آقا اپنے غلام کو فرائض ادا کرنے پر انعام دینے کا وعدہ کرے -

بہر حال یہ پوری آیت مستقبل میں اہلِ ایمان سے دُنیا میں کامیابی کے وعدوں پر مشتمل ہے - اب تک بدر کی فتح کے بعد قرآن نے اہلِ ایمان کو جو کچھ بتایا ہے اس پر ایک اجمالی نظر ڈال لیجیے -

بات یہاں سے چلی تھی کہ مستقبل میں اگر بدر جیسی کامیابی حاصل چاہتے ہو تو

اوّلاً ، اللہ و رسول کی بھرپور اطاعت کرو -

ثانیاً ، حکم سننے کے بعد سرمو انحراف نہ کرو -

ثالثاً ، نبوت کے علم کی حد تک بہرے گونگے اور بے عقل بن کر نہ رہو -

رابعاً ، نبوت کی پکار پر لبیک کہو -

خامساً ، اپنے ماضی کو دھیان میں رکھو کہ تم کیا تھے -

سادساً ، اپنا معاملہ خدا کے ساتھ رکھو اور ہر کام فکرِ آخرت سے دب کر کرو -

سابعاً ، اجتماعی گناہوں سے بچ کر رہو جن کے نتیجے میں اجتماعی بلائیں آتی ہیں

ثامناً ، خدا اور رسول اور اہلِ ایمان کے بارے میں وفادار بن کر رہو خائن نہ بنو -

تاسعاً ، مالی مفادات اور اولاد کا مقابلہ خدا و رسول سے ہو تو خدا و رسول کو ترجیح دو ۔
عاشراً ، ایمان کی پوری زندگی میں تقویٰ اختیار کرو ۔ تلک عشرۃ کاملاً ۔
یہ ابتدائی اور بنیادی باتیں ہیں جن پر مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس دنیا میں کامیابی موقوف ہے ۔ اگر یہ باتیں تمہارے اندر موجود ہوں گی تو کامیابی کا سہرا تمہارے سر ہوگا اور مطلع پر جو غبار نظر آرہا ہے یہ سب چھٹ جائے گا اور اسلام اس طرح غالب ہو کر چمکے گا کہ دشمنوں کی نگاہیں خیرہ ہو کر رہ جائیں گی ۔ قرینہ بتا رہا ہے کہ ان آیات میں اسلام اور مسلمانوں کے کامل غلبہ کا وعدہ ہو رہا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ وہ وقت دور نہیں ہے کہ جب کفر کی طاغوتی طاقتیں زیر ہو جائیں گی اور اسلام کا آفتاب اپنی پوری تابانی سے تمہارے سامنے آجائے گا ۔ بس یہ شرط ہے کہ اپنے اندر یہ دس باتیں پیدا کر لو ۔

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ۗ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ۗ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝

اور یاد کرو اس وقت کو جبکہ کفار آپ کے بارے میں سازشیں کر رہے تھے[۳۶] کہ آپ کو قید کر دیں یا قتل کر دیں[۳۷]، اور وہ سازشیں کر رہے تھے اور اللہ تدبیر کر رہا تھا، اللہ بہترین تدبیر کرنے والا ہے[۳۸]۔

ہجرت مدینہ اور مکہ سے روانگی

یہ آیت قرآنی بتا رہی ہے کہ انسان اپنے جہل و غفلت کی سرشاریوں میں کیا سوچتا ہے، اور حکمت الٰہی کی مخفی تدبیروں کا فیصلہ کیا ہوتا ہے۔ جب ہجرت سے پہلے قریش آپ کی گرفتاری، قتل اور جلا وطنی کے منصوبے بنا رہے تھے۔ ایک لمحہ کے لیے بھی ان کو پیش یا افتادہ حالات کا احساس نہ تھا۔ لیکن خود ان کے ظلم و عداوت نے ان کا سامان کر دیا۔ اگر قریش کی جانب سے ظلم نہ ہوتا تو ہجرت نہ ہوتی، اور اگر ہجرت نہ ہوتی تو بدر نہ ہوتا بلکہ وہ تمام نتائج نہ ہوتے جو ہجرت سے رونما ہوئے، کیونکہ ہجرت ایک ہی واقعہ نہیں تھا بلکہ بے شمار وقائع کا مجموعہ تھا۔ اسلام کے ظہور کی تاریخ دراصل دو بڑے اور اصولی دوروں میں تقسیم ہے۔ ایک دور مکی زندگی کا ہے، دوسرا دور مدنی زندگی کا۔ پہلا دور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم

کی بعثت سے شروع ہوتا ہے اور ہجرت پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی ابتدا غارِ حرا کے اعتکاف سے ہوتی ہے اور تکمیل غارِ ثور کے انزوا پر۔ دوسرا، ہجرت سے شروع ہوتا ہے اور حجۃ الوداع پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی ابتدا مدینہ کی فتح سے ہوئی۔ اور تکمیل مکہ کی فتح پر ہوئی۔

دنیا کی نظروں میں اسلام کے فروغ و ظہور کا دوسرا دور ہے کیونکہ اسی دور میں اسلام کی پہلی غربت ختم ہوئی اور ظاہری حشمت و طاقت کا سامان ہوا۔

بدر کی جنگ فتح ہتھیاروں کی فتح تھی۔ مکہ کی فتح، عرب کی فتح کی تمہید تھی، لیکن قرآن کی نظر میں اس کی زندگی کا اصلی دور ہجرت سے پہلا دور ہے۔ اسلام کی ساری قوتوں کی بنیادیں اسی دور میں استوار ہوئیں۔ بلاشبہ بدر کی فتح نے دنیا میں اپنی بے مثال طاقت کا اعلان کر دیا لیکن جو ہاتھ ان ہتھیاروں کو استعمال کر رہے تھے ان کی قوت و طاقت کس جگہ تیار ہوئی تھی۔ یقیناً مکہ کی فتح عرب کی فیصلہ کن فتح تھی لیکن اگر مدینہ پہلے فتح نہ ہوتا تو مکہ کی فتح کی راہ ہموار نہ ہوتی۔ یہ سچ ہے کہ مکہ ہتھیاروں سے فتح ہوا لیکن مدینہ ہتھیاروں سے نہیں بلکہ ہجرت سے فتح ہوا۔ دوسرے دور میں خواہ جسمانی طاقت کتنی زیادہ ہو گئی ہو لیکن اس کی روح پہلے دور میں تیار ہوئی۔ ہجرت سے پہلا دور اگر تخم ہے تو دوسرا دور اس کا برگ و بار ہے پہلا دور اگر بنیاد تھی تو دوسرا دور اسی بنیاد پر اٹھی ہوئی عمارت تھی۔ پہلا نشو و نما کا دور تھا دوسرا ظہور و غلبہ کا۔ دوسرے کا ظہور خواہ کیسا ہی شاندار ہو لیکن بنیاد اور استعداد کی حیثیت پہلے دور کو حاصل ہے۔ اس آیت میں قرآن اسی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

واقعۂ ہجرت کی یاد دہانی

۳۶ - اور یاد کرو اس وقت کو جب کفار اے پیغمبر آپ کے بارے میں سازشیں کر رہے تھے۔ یہاں واقعۂ ہجرت کو یاد دلانے سے مقصود یہ ہے کہ مستقبل میں اسی وعدہ کو جو پہلے بجعل مکم فرقانا میں کیا ہے زیادہ مؤکد کر دیا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ معلوم کرنا چاہتے ہو کہ مستقبل میں تمہیں اللہ سبحانہ کس طرح ناموافق حالات میں کامیابی دے گا اور مخالف ہواؤں کو کیسے سازگار بنائے گا تو واقعۂ ہجرت پر غور کرو۔

یہ واقعہ کب اور کس تاریخ میں پیش آیا ہے اور آپ کون سے دن مکہ مکرمہ سے نکل کر غارِ ثور میں پہنچے۔ قاضی سلیمان منصور پوری کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ۲۷ صفر المظفر ۱۳ نبوی کو کاشانۂ نبوت سے بقصدِ ہجرت روانہ ہوئے۔ جمعرات کا دن گزر چکا تھا اور جمعہ کی رات شروع ہو گئی تھی۔ عیسوی تاریخ ۱۰ ستمبر ۶۲۲ء تھی۔ تطابق میں ایک دن کے آگے پیچھے ہونے کا امکان بھی ہے۔ طبقات ابن سعد کے مطابق مکہ مکرمہ سے روانگی کی تاریخ یکم ربیع الاول ۱۳ نبوی تھی یعنی ۱۳ ستمبر ۶۲۲ء، پہلے حساب کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تین روز غارِ ثور میں گزار کر یکم ربیع الاول کو عازم فرمائے مدینہ طیبہ ہوئے یعنی ۱۳ ستمبر ۶۲۲ء۔ دوسرے حساب کے مطابق روانگی ۴ ربیع الاول کو عمل میں آئی یعنی ۱۶ ستمبر ۶۲۲ء کے۔ روانگی کا دن پہلے حساب کے مطابق یقیناً دوشنبہ تھا۔ طبقات ابن سعد میں بھی روانگی کا دن دوشنبہ ہے گویا دن میں کوئی اختلاف نہیں صرف تاریخ میں اختلاف ہے۔

تین راتیں غارِ ثور میں گزار کر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہوئے۔ بعض روایات میں ہے کہ یہ سفر رات کو شروع ہوا۔ مصلحت کا تقاضا یہی تھا۔ غالباً صبح بہت سویرے روانگی ہوئی ہوگی تاکہ دن چڑھنے سے پہلے مکہ مکرمہ کے قرب و جوار کو پیچھے چھوڑا جا سکے۔ ایک سانڈنی پر حضورِ اقدس اور حضرت ابوبکر آگے پیچھے سوار ہوئے۔ دوسری پر عبداللہ بن اریقط اور عامر بن فہیرہ سوار تھے۔

غارِ ثور سے نکل کر وہ راستہ اختیار کیا گیا جس سے عام آمد و رفت نہ تھی۔ اسی طرح مغربی اور شمالی رخ چلتے چلتے سمندر کے قریب پہنچ گئے۔

سہ شنبہ کے روز ابوبکر نے ایک چٹان کے پاس سایہ دیکھا، زمین صاف کر کے اس پر چادر بچھائی تاکہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم استراحت کریں۔ ادھر ادھر دیکھا تو ایک چرواہا نظر آیا اس کے ہاتھ اور بکری کے تھن خوب صاف کرا کے دودھ نکلوایا۔ برتن کا منہ ڈھانپ دیا تاکہ دودھ گرد و غبار سے محفوظ رہے اس میں پانی ڈال کر خدمتِ اقدس میں پیش کیا۔ آپ نوش فرما چکے تو روانہ ہو گئے۔

راستہ کے مقامات

طبقات ابن سعد، سیرۃ ابن ہشام اور بعض دوسری کتابوں میں مقاماتِ سفر کے

نام بھی دیے ہیں مثلاً رابغ تک طبقات میں قدید اور ابن ہشام میں عسفان کا ذکر ہے
طبقات میں رابغ کے بعد یہ مقامات ہیں، خرار، ثنیۃ المرہ، لقف، مدیحہ، مجاح،
مرحج مجاج، بطن مرحج، ذات کشد، جسے بعض کشت لکھا ہے، جداجد، اذافر،
بطن ایم، ذاسلم الغنانیہ، بطن القاحہ، عرج، جدوات، غابۃ، رکوبہ، بطن الحقیق،
جثجاثہ، الوحید، بطن ایم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مغرب کی نماز ادا کی۔ رابغ
سے آگے سراقہ کا واقعہ پیش آیا۔ اس کا قبیلہ رابغ ہی میں آباد تھا۔ کفار قریش جناب رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پا نہ سکے تو اعلان کر دیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یا ابوبکر کو بھی
زندہ یا مردہ لے آئے گا اسے ایک سو اونٹ انعام دیے جائیں گے۔ سراقہ کو یہ خبر مل
چکی تھی۔ وہ مجلس میں بیٹھا تھا کہ کسی نے بتایا کہ ساحلِ بحر کی طرف چند سائے سے
نظر آتے ہیں شاید وہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھی ہوں۔ سراقہ
کو یقین ہو گیا کہ وہی ہیں۔ لیکن آدمی کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ وہ فلاں فلاں ہیں اور ابھی
یہاں سے گزرے ہیں۔ وہ دراصل اکیلا انعام لینا چاہتا تھا۔ سراقہ چپ چاپ اٹھا نوکرانی
سے کہا کہ میرا گھوڑا ٹیلے سے پرے لے جا کر ٹھہر خود نیزہ لے کر پیدل وہاں پہنچا۔
اور سوار ہو کر تعاقب میں نکل پڑا۔ قریب پہنچا تو یقین ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم اور ان کے ساتھی جا رہے ہیں۔ تیر نکال کر فال دیکھی تو خلاف نکلی لیکن سو
اونٹوں کا نشہ سر پر سوار تھا، باز نہ آیا۔ وہ خود کہتا ہے کہ میں نے فال کے خلاف کیا۔
حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مالک حقیقی سے لو لگائے قرآن عزیز کی تلاوت
کر رہے تھے۔ ابوبکر جو کنے تھے اور ان کی نظر ہر طرف تھی۔ سراقہ قریب پہنچ
گیا۔ ابوبکر نے حضور اقدس کو بتایا تو آپ نے فرمایا اے اللہ اس کی شر سے بچا۔ فوراً
سراقہ کے گھوڑے کے پاؤں گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئے اور وہ گر پڑا، اٹھا اور گھوڑے
نے پاؤں بمشکل زمین سے نکالے تو سراقہ کہتا ہے کہ ایسی گرد اڑی جو دھوئیں کی
طرح آسمان تک پھیل گئی۔ سراقہ کو یقین ہو گیا کہ یہ معاملہ دوسرا ہے۔ درخواست
کر کے سواریاں ٹھہرائیں۔ زادِ راہ پیش کی مگر قبول نہ ہوئی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ
وسلم نے اتنا فرمایا کہ ہمارا ذکر کسی سے نہ کرنا۔ واپس ہوتے ہوتے سراقہ نے امان نامہ
کے لیے درخواست کی۔ حضور اقدس کے ارشاد کے مطابق عامر بن فہیرہ نے چمڑے

کے ایک ٹکڑے پر امان نامہ لکھ کر سراقہ کے حوالہ کر دیا۔ جنگ احد کے بعد سراقہ مسلمان ہوا۔ اور فتح مکہ کے بعد امان نامہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھایا۔ استیعاب میں ہے کہ سراقہ واپس ہونے لگا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ سراقہ اس وقت تیری کیا شان ہوگی جب تیرے ہاتھوں میں کسریٰ کے شاہی کنگن ہوں گے۔ سراقہ نے دریافت کیا کسریٰ ابن ہرمز شہنشاہ ایران کے کنگن؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ سراقہ حیران و ششدر رہ گیا۔ جب فاروق اعظم کے زمانے میں مداین فتح ہوا اور ایران کا مال غنیمت آیا تو اس میں کسریٰ کے کنگن بھی تھے حضرت فاروق اعظم نے سراقہ کو پہنا دیے۔

راستے میں حضرت زبیر سے ملاقات ہوئی جو شام سے تجارتی قافلہ کے ساتھ آرہے تھے۔ انہوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر کی خدمت میں سفید کپڑوں کا ایک ایک جوڑا پیش کیا اور عرض کیا کہ میں بھی قافلہ اور مال کو مکہ مکرمہ پہنچا کر ہجرت کر کے آجاؤں گا۔ حضرت ابوبکر متعدد تجارتی سفر اسی تجارتی شاہراہ پر کر چکے تھے اس لیے اطراف واکناف میں کافی شناسائی تھی۔ اتفاقاً راستہ میں کوئی واقف کار مل گیا اور پوچھا کہ آپ کے ساتھ اگلے کون ہیں؟ اشارہ حضور اقدس کی طرف ہوتا۔ حضرت ابوبکر نے فرمایا رجل یھدی السبیل راہ بتانے والا ہے۔ آپ کے ذہن میں مفہوم یہ ہوتا کہ میرے مرشد ہیں سننے والا سمجھتا کہ راستہ بتانے کے لیے آدمی ساتھ لے لیا ہے۔

سفر ہجرت میں کل آٹھ روز لگے جن کے نزدیک غار ثور سے روانگی یکم ربیع الاول کو ہوئی ان کے حساب کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۸ ربیع الاول کو قبا پہنچے۔ اور جن مورخین نے روانگی ۴ ربیع الاول بتائی ہے ان کے حساب سے قبا میں حضور کا ورود مسعود ۱۲ ربیع الاول کو ہوا۔

تشریف آوری کی خبر پہلے پہنچ چکی تھی۔ تمام لوگ ہمہ تن چشم انتظار تھے۔ اور جوش میں کہتے پھرتے تھے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم آرہے ہیں۔ لوگ ہر روز صبح سویرے گھروں سے نکل کر آبادی کے باہر جمع ہو جاتے اور دوپہر تک انتظار کر کے واپس ہو جاتے۔ ایک روز انتظار کر کے واپس جا چکے تھے کہ ایک یہودی نے قلعہ کی بلندی سے دیکھا اور قرائن سے پہچان کر آواز دی کہ اہل عرب لو تم جس کا انتظار

کہہ رہے تھے وہ آگیا۔

آگیا اسلام کا تابندہ گوہر آگیا

ساری آبادی تکبیر کی آواز سے گونج اٹھی۔ انصار ہتھیار سے سج سج کر بے تابانہ گھروں سے نکل آئے۔

اسے اتفاق کہہ دیجئے یا عالم غیب میں فیصلہ خداوندی کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جس روز قبا میں پہنچے اس روز نبوت کا تیرھواں سال پورا ہو رہا تھا۔ دوسرے روز سے نئے سال کا آغاز ہونے والا تھا۔ دوسرا دور نئے سال کے پہلے دن سے شروع ہوا دوشنبہ کی آپ کی سیرت میں جو خصوصیت حاصل ہے اسے بھی پیش نظر رکھئے۔ آپ دوشنبہ ہی کو اس دنیا میں تشریف لائے۔ دوشنبہ ہی کو منصب نبوت ملا۔ دوشنبہ ہی کو غار ثور سے نکل کر مدینہ کی طرف روانگی ہوئی، دوشنبہ ہی کو قبا پہنچے اور دوشنبہ ہی کو اس دنیا سے رحلت فرمائے دار بقا ہوئے اللھم صل صلوٰۃ کاملۃ و سلم سلاما تاما علی سیدنا محمد و علی آل سیدنا محمد کما صلیت علی ابراھیم و علی آل ابراھیم انک حمید مجید۔

ہجرت کا پس منظر

۳۷۔ کہ آپ کو قید کر دیں یا قتل کر دیں یا جلا وطن کر دیں۔ ہجرت سے پیشتر کفار مکہ نے دار الندوہ میں جمع ہو کر مشورہ کیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کیا کیا جائے۔ انہوں نے ساری قوم کو پریشان کر رکھا ہے اور باہر کے کچھ لوگ ان کے جال میں پھنستے جاتے ہیں۔ کہیں رفتہ رفتہ بڑی طاقت اکٹھی نہ کر لیں جس کا مقابلہ دشوار ہو۔ اس وقت رائیں مختلف تھیں۔ کوئی کہتا کہ قید کیا جائے اور خوب زخمی کیے جائیں۔ کسی کی رائے تھی کہ انھیں وطن سے نکال دیا جائے تاکہ ہمیں ہر وقت کے خرخشہ سے نجات ملے۔ آخر میں ابوجہل کی رائے پر فیصلہ ہوا کہ تمام عرب قبائل میں سے ایک ایک جوان منتخب ہو اور وہ سب مل کر ان واحد میں ان پر تلوار کا ہاتھ چھوڑیں تاکہ بنی ہاشم سارے عرب سے لڑائی نہ کر سکیں اور دیت دینی پڑے تو تمام قبائل پر تقسیم ہو جائے۔[۱]

---

[۱] فوائد شیخ الاسلام

یہ ان حالات کی طرف اشارہ ہو رہا ہے جن میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو مدینہ کی طرف ہجرت کی اجازت دے دی۔ چنانچہ صحابہ کرام چھوٹے چھوٹے گروہوں میں مدینے کی طرف جانے لگے۔ مسلمانوں کی صرف تھوڑی سی تعداد مکہ مکرمہ رہ گئی جن میں ممتاز ترین ہستیاں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکرؓ، اور حضرت علیؓ کی تھیں۔ باقی وہ بزرگ تھے جو مسکین اور بے استطاعت تھے۔ صحابہ کی اس اجتماعی ہجرت کو دیکھ کر قریش کے ارباب اقتدار میں کھلبلی مچ گئی۔ ان کو خیال آیا کہ اگر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ روانہ ہو گئے تو مسلمان منظم ہو کر طاقت بن جائیں گے اور ان کو اپنے مشن کے پھیلانے کے مواقع مل جائیں گے۔ اس طرح رفتہ رفتہ مختلف قبیلوں کو ساتھ ملا کر قریش کے لیے بہت بڑا خطرہ بن جائیں گے چنانچہ ارباب اقتدار نے دارالندوہ میں جو ان کا دارالشوریٰ تھا جمع ہو کر اس صورت حال پر غور کیا۔ اس جلسہ میں تین تجویزیں پیش ہوئیں۔

۱۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو قید کر دیا جائے۔

۲۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی ایسی جگہ جلاوطن کر دیا جائے جہاں سے وہ ان فدائیوں کے ساتھ کوئی رابطہ نہ پیدا کر سکیں جو مدینہ جا چکے ہیں۔

۳۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دیا جائے۔

قرآن نے ان تینوں کے لیے یہ تعبیر اختیار کی ہے لِيُثْبِتُوكَ اَوْ يَقْتُلُوكَ اَوْ يُخْرِجُوكَ قید والی تجویز اس لیے رد کر دی گئی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو قید کر لینا ممکن تھا لیکن قید رکھنا ممکن نہ تھا۔ شعب ابی طالب میں محصور کرنے اور بائیکاٹ کرنے کا سابقہ تجربہ سامنے تھا۔ ان کو علم تھا کہ حضور اقدس بہر حال اپنی رہائی کا سامان کر لیں گے۔ دوسری تجویز میں بظاہر یہ خامی محسوس ہوئی کہ ایسا کوئی مقام تھا ہی نہیں جہاں سے مدینہ کے ساتھ رابطہ نہ ہو سکے۔ تیسری تجویز یعنی یہ کہ قتل کر دیا جائے لیکن سوال یہ تھا کہ خاندان نبوت بنی عبد مناف کے جوش انتقام سے بچاؤ کی صورت کیا ہوگی۔ ابوجہل کی تجویز یہ تھی کہ قریش کے ممتاز قبیلوں میں سے ایک ایک جوان چن لیا جائے۔ وہ رات کو حضور کے مکان کا محاصرہ کر لیں۔ صبح کے وقت آپ نماز کے لیے باہر نکلیں تو تمام محاصرین ایک دم حملہ کر کے آپ کا کام تمام کر دیں۔ اس طرح بنو عبد مناف کے سوا تمام

قریش اس خون میں شریک ہوجائیں گے اور سب کا مقابلہ بنوعبد مناف نہ کر سکیں گے۔
جو لوگ مسکن مبارک کے محاصرے کے لیے چنے گئے تھے ان کے نام طبقات ابن سعد کے مطابق یہ ہیں۔

۱- ابوجہل عمرو بن ہشام
۲- عقبہ ابن ابی معیط
۳- نضر بن الحارث
۴- اُمیہ ابن خلف
۵- ابی بن خلف
۶- زمعہ ابن الاسود
۷- بنیہ ابن الحجاج
۸- منبہ ابن الحجاج
۹- طعیمہ ابن عدی
۱۰- حکم بن ابی العاص
۱۱- ابولہب
۱۲- ابن الغیطلہ

ان میں سے پہلے آٹھ غزوہ بدر میں مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے۔
ادھر بارہ آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کا محاصرہ کرنے کے لیے مقرر ہوئے اُدھر آپ کو اجازت مل گئی اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے روانگی کا ارادہ فرمالیا۔
صحیح بخاری میں حضرت عائشہ کی ایک روایت ہے کہ ہم ٹھیک دوپہر کے وقت گھر میں بیٹھے تھے کہ کسی نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ہیں آپ کا سر ڈھکا ہوا تھا۔ عادت شریفہ کے مطابق وہ وقت ہمارے گھر آنے کا نہ تھا۔ حضرت ابوبکر نے کہا میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ بخدا یہ تشریف آوری یوں ہی نہیں کوئی اہم معاملہ ہے۔ آپ اجازت لے کر اندر آئے اور فرمایا جو بھی آپ کے پاس ہو اسے باہر کر دیں۔ ابوبکر نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔

صرف آپ کے گھر والے ہیں۔ آپ نے فرمایا مجھے ہجرت کی اجازت ہو گئی ہے۔ ابو بکرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ رفاقت و معیت کا آرزو مند ہوں۔ فرمایا ہاں یعنی رفاقت ہو گی۔ ایک اور روایت ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا میں نے کسی کو خوشی میں روتے نہیں دیکھا تھا حضور اقدسؐ کی زبان سے ہاں نکلا تو حضرت ابو بکرؓ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ یہ خوشی کے آنسو تھے اور دنیا میں اس سے بڑھ کر خوشی کا مقام کون سا ہو سکتا تھا کہ ایسے مبارک سفر میں رہبر عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی کی سعادت نصیب ہو۔ حضرت ابو بکرؓ نے عرض کیا کہ میں نے دو سانڈنیاں ببول کی پتیاں کھلا کھلا کر اسی غرض سے پالی ہیں۔ ان میں سے ایک آپ لے لیں فرمایا قیمت سے لوں گا۔

یہ فیصلہ فرما کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر تشریف لے گئے۔ اگرچہ قریش آپ کے جانی دشمن تھے مگر مکہ مکرمہ کے اکثر لوگ آپ کے پاس امانتیں رکھتے تھے۔ آپ نے تمام امانتوں کا معاملہ حضرت علیؓ کو سمجھا دیا اور فرمایا کہ یہ ان کے مالکوں کو لوٹا کر مدینہ آ جاؤ۔ نیز فرمایا کہ بے تکلف میرے بستر پر لیٹ جاؤ۔ بفضلہ تعالیٰ کوئی تکلیف نہ ہو گی ان تمام انتظامات سے فارغ ہوئے تو محاصرین نے کاشانہ مبارک کو گھیر لیا۔ پھر کیا ہوا۔ اسی کو قرآن نے آگے بیان کیا ہے۔

سازشوں میں خدائی تدبیر کا مظاہرہ

۳۸۔ اور وہ سازشیں کر رہے تھے اور اللہ تدبیر کر رہا تھا اللہ بہترین تدبیر کرنے والا ہے۔ یہاں تو وہ اشقیاء یہ سازشیں کر رہے تھے ادھر ان کے توڑ میں اللہ سبحانہ کی بہترین اور لطیف تدبیر تھی۔ حضورؐ کو فرشتوں نے آ کر اطلاع دی آپؐ نے اپنے بستر پر حضرت علیؓ کو لٹا کر اسی مجمع کی آنکھوں میں جو آپ کے قتل کے لیے جمع ہوا تھا خاک جھونکتے ہوئے نکل گئے۔ آپ کا اور حضرت علیؓ کا بال بھی بیکا نہ ہوا اور دشمن خائب و خاسر رہے۔ پھر جنہوں نے آپ کے قتل کا مشورہ دیا تھا بدر میں وہی قتل کیے گئے۔ اس لیے بتلا دیا کہ جب خدا ساتھی ہو تو کوئی کچھ نہیں کر سکتا اور جس طرح اس نے اپنے پیغمبر کو بچا لیا تمہارے گھر بار اور اہل و عیال کو بھی جو مکہ میں ہیں حفاظت کر سکتا ہے۔

دشمن اگر قوی است نگہبان قوی تر است [1]

اللہ سبحانہ کی تدبیر نے کس طرح شب ہجرت میں نبوت کی حفاظت فرمائی۔ اس کو سمجھنے کے لیے یہ بات دھیان میں رکھئے کہ کفار نے دارالندوہ میں پوشیدہ طور پر جو آپ کے قتل کا مشورہ کیا کوئی مسلمان وہاں موجود نہ تھا اور نہ کسی طرح جانا وہاں ممکن تھا مگر اللہ سبحانہ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر چیز کی خبر دے دی۔ دن، تاریخ، وقت سب سے آگاہی ہو گئی اور پھر یہ کہ جس شب کو آپ نے ہجرت کی سب کو معلوم ہے کہ اس رات کو آپ کے گھر کے چاروں طرف دشمن کا پہرہ تھا تاہم آپ ان کی آنکھوں میں خاک جھونک کر ان کے ہی درمیان سے گزر کر حضرت ابوبکر کے ساتھ شہر سے نکلے۔ ادھر حضرت ابوبکر کے ہاں حضرت عائشہ اور حضرت اسماء نے جلد جلد سفر کا سامان درست کیا یعنی کھانا تیار کر کے چمڑے کے ایک تھیلے میں رکھا۔ جب تھیلے کا منہ باندھنے کے لیے کوئی چیز نہ ملی تو حضرت اسماء نے اپنے کمربند سے ایک ٹکڑا اپھاڑ کر منہ باندھ دیا۔ اس وقت سے حضرت اسماء "ذات النطاقین" مشہور ہو گئیں۔ ایک روایت میں ہے کہ کمربند کے دو ٹکڑے کر کے ایک سے کھانے کا تھیلا اور دوسرے سے پانی کا مشکیزہ باندھ دیا۔ کاشانۂ مبارک سے نکل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر کے ساتھ جن کا مکان مکہ مکرمہ کے جنوبی حصہ میں تھا۔ شہر سے جنوبی سمت میں چل پڑے۔ چھ میل کے فاصلہ پر ثور نام پہاڑ تھا۔ جس کے اندر ایک بڑا غار تھا۔ راستہ سخت پتھریلا تھا۔ حضرت ابوبکر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف سے بچانے کے لیے تھوڑی دور تک کندھوں پر بٹھالیا۔ چلتے وقت وہ کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے کبھی پیچھے، کبھی دائیں کبھی بائیں ہو جاتے گویا چاہتے تھے کہ ہر سمت سے حضور کی حفاظت میں اپنی جان قربان کر دیں۔ غار کے متعلق تفصیلی تبصرہ انشاء اللہ دسویں پارہ میں آرہا ہے۔ یہاں تو سمجھنے کی بات یہ ہے۔ اللہ سبحانہ نے حضور کی حفاظت کی کیا تدبیر فرمائی۔ اللہ سبحانہ نے ہر قدم پر دشمنوں کے منصوبے ناکام بنا دیے اور اپنے رسول پاک کو ہر خطرے سے محفوظ رکھا۔ مجھے یقین ہے کہ جب سے

[1] افادات شیخ الاسلام

ہجرت کا فیصلہ ہو چکا تھا اسی وقت سے نکلنے کی تمام تدابیر بھی سوچ لی گئی ہوں گی مثلاً، ۱۔ حضرت ابوبکرؓ نے پہلے سے اس مقصد کی خاطر دو سانڈنیاں تیار کر لی تھیں
۲۔ مکہ مکرمہ سے جنوب کی طرف سفر اس لیے اختیار کیا کہ مدینہ طیبہ شمال میں تھا اور اس کی طرف جانے والے راستے شمال ہی کی طرف جاتے تھے لہٰذا تعاقب کرنے والے لوگ انہیں راستوں کی طرف تلاش کے لیے جاتے جنوب کی طرف تلاش کا ان کو خیال بھی نہ آتا۔
۳۔ بلاشبہ غارِ ثور میں قیام کا فیصلہ بھی پہلے سے کر لیا گیا ہو گا۔
۴۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے بیٹے عبداللہ کو اس کام پر مامور کر دیا تھا کہ دن بھر قریش کی باتیں سن کر جو کچھ ضروری سمجھے رات کے وقت غار میں سنا جائے۔
۵۔ حضرت اسماءؓ رات کی تاریکی میں کھانا پہنچا دیتی تھیں۔
۶۔ عامر بن فہیرہ حضرت ابوبکرؓ کے آزاد کردہ غلام تھے اور بکریاں چراتے تھے ان کو تاکید کر دی گئی تھی کہ دودھ والی بکریاں روک رکھیں اور رات کے وقت انہیں غار کے دہانے پر لے کر آیا کریں اس طرح تازہ دودھ مل جاتا تھا۔
۷۔ صبح کے وقت عامر بن فہیرہ ریوڑ دہانۂ غار کے پاس سے دور تک مکہ مکرمہ کی طرف لے جاتے تھے تاکہ کسی آنے جانے والے کے پاؤں کے نشان باقی نہ رہے
۸۔ ایک شخص عبداللہ بن اریقط کو رہبری کے لیے پہلے سے مقرر کر لیا تھا۔
یہ تمام انتظامات اس خوبی اور خوش اسلوبی سے کیے گئے کہ ہر کام وقت پر اور انتہائی رازداری سے ہوتا رہا۔ یہاں تک تو ساری تدابیر کا تعلق عالمِ مادی سے تھا، عالمِ غیب میں کیا تدابیر ہوئیں۔ وہ بھی سن لیجئے۔
۱۔ قاتلوں کے جھرمٹ میں سے مشتِ خاک ڈال کر آپ گھر سے تشریف لے گئے اور کسی کو پتہ نہ ہوا۔
۲۔ عرب آثارِ قدم سے کھوج لگانے میں ماہر تھے۔ صبح کو وہ آپ کا پتہ لگاتے ہوئے غار کے دہانے تک پہنچ گئے۔ اللہ سبحانہ نے یہ تدبیر کی کہ ان کی یہ سوجھ سلب کر لی کہ وہ غار کے اندر دیکھ سکیں۔
۳۔ مسند احمد کی ایک روایت میں ہے کہ غار کے دہانے پر مکڑی نے جالا بنا لیا تھا

اس آیت قرآنی میں بظاہر خطاب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن اپنے موقعہ محل کے اعتبار سے دو پہلو رکھتی ہے۔ ایک پہلو سے یہ سباق سے تعلق رکھتی ہے۔ دوسرے پہلو سے یہ سیاق سے مربوط ہے۔ سباق میں یہ بات سمجھائی جارہی ہے کہ نبی کی قوم پر عذاب اس وقت تک نہیں آتا جب تک نبی قوم میں موجود ہوتا ہے اور سیاق میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ نبی کو ہجرت کا اس وقت تک حکم نہیں ہوتا جب تک نبی کی قوم انتہائی عناد میں نبی ہی کو ختم کرنے کے درپے نہ ہو جائے۔ دونوں باتیں کھل کر سامنے آگئی ہیں۔

ایک یہ کہ آپ کی ہجرت کا باعث آپ کی قوم کا عناد و دشمنی اور آپ کے قتل کی سازش ہے۔ اسی سازش کا نتیجہ ہے کہ آپ کو اللہ نے ہجرت کا حکم دیا ہے۔

دوسری بات یہ کہ نبی کی قوم پر اس وقت تک عذاب نہیں آتا ہے جب تک نبی کی ذات گرامی ان میں موجود ہوتی ہے۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ
هٰذَآ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۱﴾ وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ
اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً
مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۲﴾ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ
وَاَنْتَ فِيْهِمْ ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴿۳۳﴾
وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ
الْحَرَامِ وَمَا كَانُوْٓا اَوْلِيَآءَهٗ ۭ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ
وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۴﴾

اور جب ان کے سامنے ہماری آیات پیش کی جاتی ہیں تو وہ کہتے ہیں ہم سن چکے ہیں، اگر ہم چاہیں تو ہم بھی اس جیسا کہہ لیں، یہ تو صرف اگلوں کی داستانیں ہیں۔ ۳۱
اور اے پیغمبر جب ان لوگوں نے کہا تھا اے اللہ اگر

آپ کی جانب سے یہی حق ہے یعنی اسلام کی دعوت
تو پھر ہم پر پتھروں کی بارش آسمان سے برسا دے
یا ہمیں کسی دردناک عذاب میں مبتلا کر دے[۴۰]۔ اور اللہ
کا دستور یہ نہیں ہے کہ آپ ان میں موجود ہوں اور
ان کو عذاب میں ڈال دے اور نہ اللہ کا یہ دستور ہے
کہ لوگ معافی مانگ رہے ہوں اور پھر ان کو عذاب
میں ڈال دے[۴۱]۔ اور اب ان کو عذاب نہ دینے کی وجہ
کیا ہے جبکہ وہ اہلِ ایمان کو مسجد حرام سے روک
رہے ہیں، اور فی الواقع وہ مسجد حرام کے متولی نہیں
ہیں۔ مسجد حرام کے متولی تو اہلِ تقویٰ ہی ہو سکتے ہیں۔
لیکن اکثر کو اس حقیقت کا علم نہیں ہے[۴۲]۔

قریشِ مکہ کے جماعتی اقبال کا خاتمہ

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں قریش کو تقریباً ۱۳ برس تک دعوت

دی۔ اور ان تیرہ سالوں کے اندر اس راہ میں ہر قسم کی مصیبت اور تکلیف برداشت کی۔ اور آیاتِ ہدایت کے ان کو مختلف نمونے دکھائے اور آخر وہ وقت آیا۔ جو اپنے اپنے پیغمبروں کے سامنے دوسری قوموں پر آچکا تھا یعنی قبیلہ قریش میں سے وہ افرادِ صالحہ جو بے خوف وخطر حق قبول کر سکتے تھے انہوں نے حق قبول کر لیا۔ صرف وہ رؤسائے قریش جو قبولِ حق کی مطلق صلاحیت نہ رکھتے تھے یا وہ ضعفاء تھے جو ان رؤسا کی موجودگی میں حق کا ساتھ دینے کی قوت نہ رکھتے تھے اور اس لیے ضرورت ہوئی کہ ان رؤسا کے وجود سے ارضِ حرم کو پاک کیا جائے۔ قریش کو اب آخری عذاب کی اطلاع دی گئی۔ اطلاع ملنے پر انہوں نے اپنے پیشرووں کی طرح اس کا مذاق اڑایا اور حضور سے کہنے کہ جس عذاب کی دھمکی دی جاتی ہے وہ کیوں نہیں آتا۔ اگر تم میں قدرت ہے تو وہ عذاب لاؤ اور اپنی صداقت کا نشان دکھاؤ۔ نبوت کا جواب تھا کہ

انما الغیب للہ ، فانتظر وانی معکم من المنتظرین

قرآن نے رؤسائے قریش کی طرف اشارہ کر کے پوچھا

فھل ینظرون الا سنۃ الاولین

کیا وہ لوگ پہلی قوموں کے دستور کا انتظار کر رہے ہیں۔

اب گزشتہ قوموں کے قانون کے پورا ہونے کے دن آ گئے یعنی حضور اقدس اور اہلِ ایمان کو گنہ گار قوم کی آبادی کے اندر سے نکل جانے کی اجازت مل گئی کیونکہ جب تک رسول اپنی قوم سے ہجرت نہیں کرتا عذابِ ہلاکت کا نشان ظاہر نہیں ہوتا۔ چنانچہ قریش کو جو اس عذاب کو دیکھنے کے لیے بے تاب تھے پہلے ہی بتا دیا گیا۔

وان کادوا لیستفزونک من الارض لیخرجوک منھا

واذا لا یلبثون خلافک الا قلیلا

اگر اس زمین سے وہ تجھے بے قرار کر دیں گے تاکہ تجھے شہر بدر کر دیں تو پھر تیرے جانے کے بعد وہ بہت تھوڑا عرصہ رہیں گے۔

مظالم کی انتہا ہو گئی۔ حضور اقدس نے بلند آواز میں بددعا کی اور اللہ سبحانہٗ کی بارگاہ میں قریش کی ہلاکت کی بددعا کی۔ لیکن یہاں بھی رحمتِ عالم نے حضرت نوحؑ اور حضرت موسیٰ کی طرح پوری قوم کی تباہی و بربادی کی دعا نہیں مانگی بلکہ صرف قریش

کے سات رئیسوں کے حق میں بددُعا کی اور فرمایا کہ خداوندا ابوجہل، عتبہ، شیبہ، عقبہ، اُمیہ، ابی اور ولید کو پکڑ۔

انبیاء کی صفت کے مطابق آپ نے ہجرت کی اور جس دن کا انتظار تھا وہ آگیا۔ قرآن نے ان آیات میں بتایا ہے کہ رؤسائے قریش پر آیتِ عذاب نازل ہونے کے لیے ہجرت کا انتظار تھا وہ ہو چکی اب کوئی مزید انتظار نہیں ہے۔

قریش کا مکابرہ

۳۹ - اور جب ان کے سامنے ہماری آیات پیش کی جاتی ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ ہم سُن چکے اگر ہم چاہیں تو ہم بھی اس جیسا کہہ لیں، یہ تو صرف اگلوں کی داستانیں ہیں۔ نضر بن الحارث کہا کرتا تھا کہ ہم چاہیں تو قرآن جیسا کلام بنالائیں، اس میں قصّے اور کہانیوں کے سوا کیا رکھا ہے۔ مگر قرآن تو سب جھگڑوں کا فیصلہ اسی بات پر رکھتا تھا پھر چاہا کیوں نہیں۔ کسی نے کہا تھا کہ میرا گھوڑا اگر چلے تو ایک دن میں لندن پہنچے مگر چلتا نہیں۔ بہرحال پچھلی قوموں کے احوال سُن کر کہتے تھے کہ سب قصّے کہانیاں ہیں اب بعد میں دیکھ لیا کہ محض افسانے نہ تھے وعدہ الٰہی تم پر بھی آیا جیسے پہلوں پر آیا تھا۔[1]

یہ قرآن سے عناد کا آخری شاہکار ہے۔ یہ نضر بن الحارث ایران وغیرہ ملکوں میں جاتا رہتا تھا وہاں سے رستم و اسفندیار کے قصّے سُن کر آتا۔ یہود و نصاریٰ سے بھی ملتا۔ ان سے تورات و انجیل سنتا، قرآن میں نبیوں اور اُن کی قوموں کی داستان سُن کر شاید اس کو یہ خیال ہو گیا ہو کہ یہ قصّے تو میں بھی بیان کر سکتا ہوں۔ شاید اسی نے عرب میں یہ بات کہی ہے اور لوگوں نے اسی کی تقلید میں اس کو دُہرایا ہو اس لیے بصیغہ جمع بات بتائی گئی ہے۔ اس کے ساتھ وہ یہ بات ہرگز نہ مانتے تھے کہ یہ داستان اقوام انبیاء خود حضور اقدس کی ساختہ و پرداختہ ہے۔ اور نہ وہ حضور اقدس کو جھوٹا خیال کرتے تھے فانھم لا یکذبونک ولکن الظالمین بآیات[2]

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

اللہ یجحدون۔ قریش کے ارباب اقتدار اور زعماء سمجھتے تھے کہ حضور اقدس نے کسی سے کبھی کوئی علمی فیض حاصل نہیں کیا۔ وہ تو اس مقصد کے لیے مشورے کرتے تھے کہ عرب کو قرآن سے روکا جائے۔ یہ نضر بن الحارث کفر و عناد میں مثالی شخص تھا۔ قرآن سے لوگوں کو روکنے کے لیے اس نے یہ تماشا رچایا بلکہ بتایا گیا ہے کہ اچھی خوبصورت گلو کار گانے والی خرید کر لاتا اور ان ہی قصوں کو منظوم کر کے اس سے پڑھواتا تاکہ لوگوں کی توجہ قرآن سے ہٹا سکے، اسی کے بارے قرآن میں ہے۔

ومن الناس یشتری لہو الحدیث لیضل عن سبیل اللہ

نضر بن الحارث کا یہ کہنا کہ اگر ہم چاہیں تو ہم بھی یہی کہہ سکتے ہیں اس بات کی ہرگز دلیل نہیں ہے کہ وہ ایسا کرنے پر قادر ہے اگر ایسا ہوتا تو وہ یقیناً کر گزرتا۔ بلکہ یہ تو صرف قرآن کے واقعات و قصص پر ایک تنقید ہے یعنی یہ کچھ بھی نہیں ایسے ہی افسانے ہیں جیسے رستم و اسفندیار کے افسانے، اس کا مقصد اس طریق سے لوگوں کو قرآن سے ہٹانا تھا۔ اور یہ تعبیر اس بات کی نشاندہی کر رہی تھی کہ قرآن عزیز کی شیرینی، نمکینی، تاثیر تسخیر سب کو یکساں فریفتہ کر رہی تھی اور یہی قرآن کا اعجاز ہے۔

کیا یہ امر واقعہ نہیں ہے کہ عین اس وقت جب ایک امی کی طرف یہ مدعیانہ اعلان عرب میں شائع ہوا اس وقت عرب کے قبیلہ قبیلہ میں زبان آور شعراء اور آتش بیان خطباء موجود تھے مگر اس کے سامنے سب کی زبانیں گنگ ہو گئیں۔ کفار عرب نے اسلام اور نبوت کی تکذیب کی، کیا کیا کوششیں کیں مگر یہ نہ ہو سکا کہ قرآن عزیز کی ایک سورت کا جواب پیش کرتے جو نبوت کے دعوے صداقت کو پل جھپکنے میں پست کر دیتا۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اس کی مثال لانے سے عاجز تھے۔

قرآن کی اثر انگیزی کا کیا حال تھا۔ اس کا اندازہ کرنا ہو تو تاریخ کی زبانی سنیے۔

ولید بن مغیرہ قریش میں بڑا دولت مند اور صاحب اثر تھا۔ وہ ایک بار آپ کی خدمت میں آیا اور فرمائش کی کہ کچھ پڑھ کر سنائیے۔ آپ نے چند آیتیں پڑھیں۔ اس نے دوبارہ پڑھوا کر سنیں۔ آخر بیخود ہو کر کہا خدا کی قسم اس میں کچھ اور ہی شیرینی اور تازگی ہے۔ اس نخل کی شاخوں میں پھل اور اس کا تنا بھاری ہے۔ یہ کسی انسان کا کلام نہیں۔

بنو ذیل بن شیبان کے سامنے آپ نے چند آیتیں پڑھیں گو وہ مسلمان نہیں ہوا مگر کلام الٰہی سے بے حد متاثر ہوا۔ نجاشی کے دربار میں جب حضرت جعفر نے سورہ مریم کی تلاوت کی تو اس پر رقت طاری ہو گئی اور اس کی دونوں آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے پھر کہا کہ خدا کی قسم یہ کلام اور انجیل دونوں ایک ہی چراغ کے پر تو ہیں۔

اس قسم کے اور واقعات ابن اسحاق نے سیرۃ میں نقل کیے ہیں۔ معالم القرآن کی جلدوں میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ لوگ قرآن عزیز کی آیتیں سن کر متاثر ہو جاتے ہیں۔ حضرت عمر کا دل ایک سورت کی چند آیتیں پڑھ کر اور سن کر پتھر سے موم ہو گیا۔ حضرت جبیر بن مطعم اسیران بدر کو چھڑانے آتے تھے انہوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے سورہ طور کی ایک دو آیتیں سن لیں تو ان کا دل دھڑکنے لگا۔ حضرت عثمان بن مظعون نے چند آیتیں سن لیں تو فوراً حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ حضرت الطفیل بن عمرو الدوسی کے کانوں میں اتفاقاً قرآن عزیز کی چند آیتیں پہنچ گئیں تو مسلمان ہو گئے طائف کے سفر میں حضرت خالد العدوانی نے آپ کو والسماء والطارق پڑھتے سنا گو وہ اس وقت مسلمان نہ ہوئے مگر پوری سورت ان کو یاد ہو گئی۔ حبشہ سے بیس آدمیوں کی ایک جماعت حاضر خدمت ہوئی۔ آپ نے ان کو قرآن پڑھ کر سنایا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

قرآن عزیز کی اسی اثر انگیزی اور تسخیر نے نضر بن الحارث کو یہ بات سمجھائی کہ اس اثر کو قصوں اور کہانیوں سے ختم کیا جا سکتا ہے۔ یہاں بتانا یہ ہے کہ مشرکین کی اسی قسم کی جسارتیں ان کے لیے عذاب کا باعث ہوئی ہیں۔

انتہائی جہل و شقاوت

۴۰۔ اور اے پیغمبر جب ان لوگوں نے کہا تھا کہ اے اللہ اگر آپ کی جانب سے یہی حق ہے یعنی اسلام کی دعوت تو ہم پر پتھروں کی بارش آسمان سے برسا دے یا کسی عذاب دردناک میں مبتلا کر دے۔ اس آیت میں مشرکین مکہ کے انتہائی جہل و شقاوت و عناد کا اظہار ہے۔ یعنی وہ کہتے تھے کہ خداوندا اگر یہی دین حق ہے جس کا ہم اتنی دیر سے اور اس قدر شدومد سے تکذیب کر رہے ہیں تو پھر کیوں دیر

ہے گزشتہ قوموں کی طرح ہم پر بھی پتھروں کا مینہ کیوں نہیں برسایا جاتا یا اسی طرح کے کسی دوسرے عذاب میں مبتلا کر کے ہمارا استیصال کیوں نہیں کر دیا جاتا۔ کہتے ہیں کہ یہ دعا ابو جہل نے مکہ سے نکلتے وقت کعبہ کے سامنے کی تھی جو کچھ مانگا تھا، اس کا ایک نمونہ بدر میں دیکھ لیا۔ وہ خود مع ۶۹ سرداروں کے کمزور اور بے سر و سامان مسلمانوں کے ہاتھوں سے مارا گیا۔ ستر سردار اسیری کی ذلت میں گرفتار ہوئے۔ اس طرح خدا نے ان کی جڑ کاٹ دی بے شک قوم لوط کی طرح آسمان سے پتھر نہیں برسائے لیکن ایک مٹھی سنگریزے جو خدا تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے پھینکے تھے وہ آسمانی سنگباری کا چھوٹا سا نمونہ تھا۔ فلم تقتلوھم ولکن اللہ قتلھم وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ۔

صحیح بخاری میں انس بن مالک کے حوالہ سے اس دعا کرنے والے کا نام ابو جہل آیا ہے۔ حافظ عسقلانی نے لکھا ہے۔ اصل میں ابو جہل ہی ہے۔ اگر قرآن میں صیغہ جمع آیا ہے، اصل بات ابو جہل نے کہی تھی باقی نے ہاں میں ہاں ملائی اس لیے صیغہ جمع آیا ہے۔ طبرانی میں بحوالہ عبداللہ ابن عباس دعا کرنے والے کا نام نضر بن الحارث بتایا ہے اور لکھا ہے کہ قرآن کی آیت کا سبب نزول یہی ہے یعنی سأل سائل بعذاب واقع الخ۔ مجاہد، عطاء اور سدی کی یہی رائے ہے یہ دونوں باتیں درست ہو سکتی ہیں کیونکہ ہو سکتا ہے کہ دونوں نے ہی دعا مانگی ہو لیکن دعا کی نسبت سربراہ قوم کی طرف کر دی۔ حضرت قتادہ کہتے ہیں کہ یہ دعا مانگنے والے اس امت کے بیوقوف اور نادان لوگ ہیں۔ قسطلانی نے شرح بخاری میں یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ جب نضر بن الحارث نے قرآن کو پہلوں کا قصہ کہا تو حضور اقدس نے ارشاد فرمایا ارے تیرا خانہ خراب یہ تو اللہ کا کلام ہے تب نضر بن الحارث اور ابو جہل نے کہا اللھم ان کان ھذا ھو الحق من عندک فامطر علینا۔

عام نگاہیں دعا کی پیمانہ کو دیکھ کر اسے دعا سمجھتی ہیں لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ یہ قرآن عزیز کا حقانیت سے انکار کا ایک بلیغ انداز ہے۔ اگر یہ صرف دعا کا

پیمانہ ہوتا تو قرآن کی حقانیت پر عذاب کو نہ مانگنا یہ کہنا کہ اگر قرآن حق ہے تو ہم پر پتھر برسا اس بات کی غمازی کر رہا ہے کہ وہ قرآن کی حقانیت کو محال تصور کرتا ہے۔ اس لیے یہ بات دعا کے طور پر نہیں بلکہ قرآن کی حقانیت کو چیلنج کے انداز میں ہے مطلب یہ ہے کہ اگر یہ قرآن اور اس کی دعوت اے اللہ واقعی آپ کی جانب سے ہے جیسا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم دعویٰ کر رہے ہیں تو آپ ہم کو اس انکار پر پتھروں سے سزا دیجیے جیسا کہ اصحاب فیل کو آپ نے سزا دی یا کوئی اور سزا دیجیے۔ یہ دعا بتارہی ہے کہ ان کا انکار نادانی اور بے خبری کا نہ تھا اور اس لیے نہ تھا کہ حضور کی دعوت غلط ہے بری ہے یا نقصان دہ ہے بلکہ اس کا باعث ان کا تمرد، عناد، نشہ اقتدار اور کبر تھا۔ یہ تاریخی لطیفہ خوب ہے کہ حضرت معاویہ نے قوم سبا کے کسی شخص سے کہا کہ تمہاری قوم کس قدر بیوقوف ہے کہ عورت کو سربراہ مملکت بنالیا تھا۔ مخاطب حاضر جواب تھا بولا میری قوم سے زیادہ آپ کی قوم احمق اور بیوقوف ہے کہ دعا مانگ رہی ہے کہ اے اللہ اگر یہ حق ہے تو ہمیں عذاب میں مبتلا کر دے۔ کہنا چاہیے تھا کہ اگر حق ہے تو قبول کرنے کی توفیق دے دے۔ حق ہونے پر عذاب کی درخواست سب سے بڑی حماقت ہے۔

عذاب الٰہی کے لیے اللہ کا قانون

۳۴۔ اور اللہ کا دستور یہ نہیں ہے کہ آپ ان میں موجود ہوں اور ان کو عذاب میں ڈال دے اور نہ اللہ کا یہ دستور ہے کہ لوگ معافی مانگتے ہوں اور پھر ان کو عذاب میں ڈال دے۔ سنتہ اللہ یہ ہے کہ جب کسی قوم پر تکذیب انبیاء کی وجہ سے عذاب نازل کرتے ہیں تو اپنے پیغمبر کو ان سے علیحدہ کر لیتے ہیں۔ خدا نے جب حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے علیحدہ کر لیا تب مکہ والے بدر کے عذاب میں پکڑے گئے۔

نزول عذاب سے دو چیزیں مانع ہیں ایک ان کے درمیان پیغمبر کا وجود تھا۔ دوسرے استغفار یعنی کہ حضرت کے قدم عذاب اٹک رہا تھا اب ان پر عذاب آیا ایسے ہی جب تک گنہ گار نادم رہے اور توبہ کرتی رہے تو پکڑا نہیں جاتا اگرچہ بڑے سے

بڑا گناہ ہو ۔ حضرت نے فرمایا گنہ گاروں کی پناہ دو چیزیں ہیں ایک میرا وجود دوسرے استغفار کذا فی الموضع تنبیہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن قدس اللہ سرہ العزیز نے آیت ماکان اللہ لیعذبہم کے معنے یہ کیے ہیں اور اللہ ہرگز عذاب نہ کرتا ان پر جب تک تو رہتا ان میں ۔ یہ بعض مفسرین کے موافق ہیں ، لیکن اکثر کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ مشرکین جس قسم کا خارقِ عادت عذاب طلب کر رہے تھے جو قوم کی قوم کا دفعتہً استیصال کر دے ان پر ایسا عذاب بھیجنے سے دو چیزیں مانع ہیں ایک حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود کہ اس کی برکت سے اس امت پر خواہ امتِ دعوت ہی کیوں نہ ہو ایسا خارقِ عادت عذاب نہیں آتا ۔ یوں کسی وقت افراد و آحاد پر آجائے وہ اس کے منافی نہیں ۔ دوسرے استغفار کرنے والوں کی موجودگی خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم جیسا کہ منقول ہے کہ مشرکینِ مکہ بھی تلبیہ و طواف میں غفرانک کہتے تھے ۔ باقی غیر خارقِ عادت معمولی عذاب مثلاً قحط یا وبا یا قتل کثیر وغیرہ اس کا نزول پیغمبر یا بعض مستغفرین کی موجودگی میں بھی ممکن ہے ۔ آخر جب وہ لوگ شرارتیں کریں گے تو خدا کی طرف سے تنبیہ کیوں نہ کی جائے گی ۔ آگے اسی کو بیان فرمایا[1]

دراصل اس آیت میں عذاب آنے کے لیے اللہ کے قانون کا ذکر ہو رہا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ عذابِ الٰہی آنے کی دو شرطیں ہیں ۔ ایک یہ کہ جن لوگوں پر اور جس جگہ پر عذاب آتا ہے ضروری ہے کہ نبی اس قوم سے اور اس جگہ سے ہجرت کر جائے ۔ جب عذاب آنا ہوتا ہے نبی کو وہاں سے ہجرت کرنے کا حکم ہو جاتا ہے ۔ حضرت نوح کو مع رفقا کے کشتی پر سوار کرا کے کفار سے الگ کیا جاتا ہے ۔ حضرت ابراہیم نمرود کے ملک سے اپنی ہجرت کا اعلان کرتے ہیں (انی مہاجر الی ربی) ، حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکل جاتے ہیں ۔ حضرت لوط ، حضرت ہود ، حضرت صالح ، حضرت شعیب سب نے اپنی اپنی جماعتوں کو لے کر اپنی نافرمان قوموں سے علیحدگی اختیار کی اور جب تک یہ ہجرت نہیں ہو لیتی اور مومن و کافر الگ نہیں ہو جاتے معجزہ عذاب نہیں بھیجا جاتا ۔ حضرت نوح جب تک کشتی پر سوار ہو کر علیحدہ نہیں ہوئے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

طوفان نہ آیا۔ حضرت ابراہیم جب تک کلدانیوں کے ملک عراق سے نکل کر شام اور مصر نہ چلے گئے ان پر عذاب نہ آیا۔ اسی طرح حضرت لوطؑ، حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، اور حضرت شعیبؑ اپنی اپنی جماعتوں کو لے کر جب تک الگ نہ ہو گئے ہلاکت کا عذاب نہ آیا۔ اور جب انہوں نے ہجرت کر لی تو یہ معجزہ عذاب مختلف صورتوں میں ان قوموں پر نازل ہوا اور اہل ایمان کو نجات اور کافروں کو ہلاکت نصیب ہوئی۔

قرآن عزیز میں ان حقائق کو بکثرت بیان کیا گیا ہے اور نیز اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنا دستور اور قانون فرمایا ہے۔

اسی دستور کے مطابق عذاب ہلاکت کے نازل ہونے کے لیے پہلے دو چیزوں کی ضرورت تھی۔

ایک اہل ایمان کی جماعت کے ساتھ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی شہر مکہ سے ہجرت، دوسرے ہجرت سے پہلے ہدایت کی آخری نشانی ظاہر ہو جائے۔ چنانچہ ہجرت سے پہلے شق قمر کا معجزہ ظاہر ہوا اسے دیکھ کر جب مکہ کے ارباب اقتدار ایمان نہ لائے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے ہجرت کا حکم ہوا اور عذاب ہلاکت نازل ہونے کا وقت قریب آ گیا۔ صحابہ میں جو اسرار نبوت کے محرم تھے وہ تاڑ گئے تھے کہ یہ ہجرت قریش کی بربادی کا پیش خیمہ ہے۔ مستدرک حاکم اور مسند احمد بن حنبل میں ہے کہ جب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے نکلے تو حضرت ابو بکرؓ نے کہا کہ انا للہ مکہ والوں نے اپنے پیغمبر کو نکال دیا اب یہ ضرور ہلاک ہو جائیں گے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں تیرہ برس تک قریش کو دعوت دی اور ان تیرہ سالوں میں ہر قسم کی مصیبت اور تکلیف برداشت کی۔ قریش نے فرصت و مہلت کے سارے اوقات اپنی سرکشی و تمرد کی نذر کر دیے۔ اب قریش کو آخری عذاب ہلاکت کی اطلاع دے دی گئی لیکن نادان مذاق اڑاتے رہے۔ ان کو معجزہ عذاب دیکھنے کی جلدی تھی کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ پیشین گوئی جھوٹ ہے اللہ سبحانہ نے فرمایا کہ جب تک نبوت کی آمد کی برکات ختم نہ ہو جائیں عذاب نہ آئے گا۔ سنۃ الٰہی کے مطابق اللہ سبحانہ نے حضور اقدس کو ہجرت کی دعا بتائی۔ دبِّ

ادخلنی مدخل صدق و اخرجنی مخرج صدق واجعل من لدنک سلطاناً نصیرا"
یہ دعا مقبول ہوئی اور بشارت آئی جاء الحق و زھق الباطل، انبیاء کی سنت کے
مطابق حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمائی اور جس دن کا انتظار تھا وہ
آگیا۔ قرآن نے کہا کہ رؤسائے قریش پر عذاب آنے کے لیے ایک وجہ تو یہ تھی کہ خود ذات
پیغمبر ان میں موجود تھی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جب تک بستی میں ایسے لوگ موجود ہوں جو
اپنی سابقہ غفلت اور غلط روی پر متنبہ ہو کر اللہ سے معافی کی درخواست کرتے ہوں
اور آئندہ کے لیے اصلاح کا ارادہ رکھتے ہوں۔ اس وقت اللہ تعالیٰ عذاب ہلاکت نہیں
لاتا۔ اصل ارشاد میں ماکان اللہ معذبھم وھم یستغفرون یعنی اللہ سبحانہٗ
لوگوں کو ایسی حالت میں مبتلائے عذاب نہیں کرے گا جب کہ وہ خدا کی جناب میں
معافی مانگ رہے ہوں۔ اس فقرہ کے تین مطلب بتائے گئے ہیں۔

ایک یہ کہ جب تک پیغمبر کے بیرو کار مکہ میں موجود ہیں عذاب نہ آئے گا۔ یعنی وہ
کمزور مسلمان جو استطاعت نہ ہونے کی وجہ سے ہجرت نہ کر سکتے تھے۔ علامہ طیبی نے اس کو
بلیغ ترین وجہ قرار دیا ہے۔ اس صورت میں عذاب سے عذاب استیصال مراد ہوگا۔
بدر کا معجزہ یقیناً معجزہ ہلاکت ہے لیکن قریش کے رؤسا کے اقتدار کے لیے معجزہ
ہلاکت ہے نہ کہ پوری قوم کے استیصال کے لیے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ حضور اقدس
نے دعا میں سات ارباب اقتدار کا نام لیا تھا۔ پوری قوم کے لیے عذاب کی نہیں
ہدایت کی دعا تھی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود جو صحن حرم کی بد دعا کے دن موجود تھے
وہ کہتے ہیں کہ عرب کے ساتوں رئیس جن کے حق میں آپ نے بد دعا کی تھی کل کے کل
بدر کے میدان میں مارے گئے اور عذاب ہلاکت کی پیش گوئی پوری ہوئی۔

دوسرا یہ کہ استغفار سے خود کافروں کی استغفار مراد ہے جیسا کہ مشرکین طواف
غفرانک کہتے تھے۔

تیسرا مطلب یہ ہے کہ استغفار سے مراد تو یہ ہے یعنی ہر چند نبی کی ہجرت کی
بعد اب ان سے امان اٹھ چکی ہے اب کوئی چیز ان کو عذاب سے بچانے والی نہیں
ہے لیکن اگر وہ اب بھی توبہ کرنے والے بن جائیں تو اللہ سبحانہٗ ان کو عذاب سے
بچالے گا۔ گویا اوپر کے حصے میں جو شدید قسم کی دھمکی دی گئی تھی اس فقرے نے

اس کو ذرا نرم کر دیا ہے یعنی اب بھی ان کے لیے موقع ہے کہ چاہیں تو اپنی روش بدل لیں، خدا سے معافی مانگیں اور اپنے آپ کو اس گرفت سے بچا لیں۔ ترمذی میں حضرت ابو موسیٰ اشعری کے حوالہ سے حضور اقدس کا ارشاد آیا ہے کہ اللہ سبحانہ نے مجھے دو قسم کی امانوں سے نوازا ہے۔ ایک تو اُمت کے لیے میں خود امان ہوں دوسرے استغفار امان ہے۔ جب دُنیا سے رُخصت ہو جاؤں گا تو استغفار عذاب سے قیامت تک کے لیے سامان امن ہے۔ یعنی دو چیزیں اُمت پر عذاب سے مانع ہیں ایک میری ذات دوسرے استغفار۔

ایک سنگین غلط فہمی

۴۲۔ اور اب ان کو عذاب نہ دینے کی وجہ کیا ہے جبکہ وہ اہلِ ایمان کو مسجدِ حرام سے روک رہے ہیں۔ اور فی الواقع وہ مسجدِ حرام کے متولی نہیں ہیں۔ مسجدِ حرام کے متولی تو صرف اہلِ تقویٰ ہو سکتے ہیں لیکن اکثر کو اس حقیقت کا علم نہیں ہے۔ عذاب کا نہ آنا ان دو سبب سے ہے جو اوپر مذکور ہوئے ورنہ تمہاری شرارتیں اور ظلم و شقاوت تو ایسی چیزیں ہیں کہ فوراً عذاب آنا چاہیے۔ اس سے زیادہ ظلم کیا ہوگا کہ موحدین کو حرم شریف میں آنے یا عبادت کرنے سے طرح طرح کے حیلے تراش کر روکا جائے بلکہ ان کے وطن مکۂ معظمہ سے نکال کر ہمیشہ کے لیے کوشش کی جاتی کہ یہ خدا کے پاکباز اور عبادت گزار بندے نہ آنے پائیں۔ اور ستم ظریفی یہ ہے کہ اس ظلم کے جواز کے لیے یہ سند پیش کی جاتی ہے کہ ہم حرم شریف کے متولی با اختیار ہیں جس کو چاہیں آنے دیں جسے چاہیں روک دیں۔ یہ ہمارا حق ہے۔ حالانکہ اول تو یہ حق متولی کو بھی نہیں کہ مسجد میں لوگوں کو نماز عبادت سے روکے دوسرے حق تولیت ان کو پہنچتا بھی نہیں۔ حرم شریف کے متولی تو صرف متقی اور پرہیزگار بندے ہو سکتے ہیں۔ مشرک اور بد معاش اس کے حقدار نہیں ہو سکتے۔ لیکن ان میں اکثر اپنی جہالت سے یوں سمجھ رہے ہیں کہ ہم اولادِ ابراہیم ہیں اور فلاں قبیلہ سے ہیں۔ تولیت کعبہ ہمارا موروثی حق ہے جس کے لیے کوئی خاص قید و شرط نہیں ہے سو بتلا دیا کہ اولادِ ابراہیم میں جو پرہیزگار ہو اسی کا حق ہے ایسے بے انصافوں کا

حق نہیں کہ جس سے وہ آپ ناخوش ہوتے نہ آنے دیا۔ [1]

آیت میں عذاب سے عذاب استیصال مراد نہیں بلکہ وہی عذاب ہلاکت مراد ہے جو بدر کی صورت میں رونما ہوا جسے قرآن عزیز نے البطشۃ الکبریٰ کہا ہے۔ یہ رؤسائے قریش سے لیے وہی حیثیت رکھتا ہے جو فرعون کے لیے غرق بحر کی حیثیت تھی۔ یہاں اس سے فتح مکہ مراد نہیں ہے جیسا کہ حافظ ابن حجر عسقلانی کی فتح الباری میں رائے ہے۔ آخر ہجرت کا باعث اس کے سوا کیا تھا کہ یہ رؤسائے قریش اہل ایمان کو مسجد حرام میں آنے سے روکتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم صحن حرم میں نماز پڑھ رہے تھے۔ رؤسائے قریش ادھر ادھر بیٹھے ہوئے ہنسی دل لگی کی باتیں کر رہے تھے۔ ابوجہل نے کہا کون مذبح میں جا کر وہاں سے اونٹ کی اوجھڑی اٹھا لائے گا۔ چنانچہ ایک شریر نے یہ خدمت انجام دی اور جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں گئے تو وہ نجاست آپ کی پشت مبارک پر ڈال دی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس بوجھ سے سر نہیں اٹھا سکتے تھے اور کفار اس منظر کو دیکھ کر ہنسی سے بے خود ہوئے جاتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود جو اس موقعہ پر موجود تھے کہتے ہیں کہ میں یہ دیکھ رہا تھا۔ لیکن مجھ میں اتنی طاقت نہ تھی کہ میں ان کے منہ آتا۔ اسی اثنا میں ایک شخص نے جا کر حضرت فاطمہ کو اطلاع دی جو اس زمانہ میں بچی تھیں، وہ آئیں اور اس نجاست کو ہٹایا تو آپ نے سر اٹھایا۔ یہ پہلا موقع ہے کہ حضور اقدس رؤسائے قریش کے ایمان سے مایوس ہوتے ہیں۔ اور یہ اس لیے نہیں کہ آپ کے جسم مبارک کو تکلیف ہوئی بلکہ اس لیے کہ وہ نماز میں جو اس دنیا میں آپ کی محبوب ترین چیز تھی خلل انداز ہوتے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بلند آواز میں بددعا کی اور رؤسائے قریش کی ہلاکت کی اللہ کی جناب میں درخواست کی اور سات رئیسوں کے نام لیے اور فرمایا خداوندا قریش کے سرداروں کی گرفت کر۔ خداوندا ابوجہل، عقبہ، شیبہ، عتبہ، ابن معیط، امیہ ابن خلف، ولید بن عقبہ اور ابی بن خلف کو پکڑ۔ یہ بددعا سن کر سب کے ہوش اڑ گئے۔ یہ ساتوں بدر میں مارے گئے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

یَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کا اس سے بڑا شاہکار اور کیا ہو سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان رؤسائے قریش کو بدر میں عذاب نہ دینے کا باعث کیا ہے جبکہ مانع عذاب موجود نہیں ہے۔ ذاتِ نبوت مکہ سے مدینہ روانہ ہو چکی ہے اور ان کو خدا کی جناب میں معافی مانگنے کی توفیق میسر نہیں ہے اور ان کی دستاویزِ جرم میں سب سے بڑا جرم منظرِ عام پر آچکا ہے یعنی لوگوں کو اللہ کے گھر میں عبادت سے روکنا۔ پھر ان کو عذاب کیوں نہ دیا جائے اور ان رؤسا کو ختم کیوں نہ کیا جائے۔

یہ فرمانے کے بعد قریش کے اس غرورِ باطل پر ضرب لگائی ہے جو خانہ کعبہ کی تولیت کی بنا پر ان کو تھا فرمایا ﴿وما کانوا اولیاء﴾ قریش کو یہ زعم تھا کہ وہ خانہ کعبہ کے متولی وفادہ اور سقایہ کی خدمت انجام دے رہے ہیں اور حضرت ابراہیم کی اولاد ہیں۔ یہی ان کے خدا کے یہاں مقرب ہونے کی نشانی ہے۔ اس کے رد میں فرمایا کہ محض میراث میں مجاورت اور تولیت پا لینے سے کوئی شخص یا خاندان یا جماعت کسی عبادت گاہ کی جائز متولی نہیں ہو سکتی۔ جائز متولی اور وارث تو صرف وہ شخص ہو سکتا ہے جو خداترس اور پرہیزگار ہو۔ اس میں اشارہ ہے کہ یہ لوگ خانۂ خدا اور اس گھر کے مقصدِ تعمیر اور اس کی حرمت کو تباہ کرنے والے ہیں۔ اس گھر کے اصلی حقدار متولی وہ متقی بندے ہیں جو ان ظالموں کے ہاتھوں مسجد حرام سے نکال دیے گئے۔ جب صورتِ حال یہ ہے کہ حضور اقدس کو انہوں نے ہجرت پر مجبور کر دیا اور ان کی سرکشی یہاں تک پہنچ گئی کہ خدا کے بندوں کو عبادت گاہ سے بجبر روکنے لگے تو اب کوئی وجہ نہیں کہ پاداشِ عمل کے ظہور میں تاخیر ہو۔ چنانچہ وہ بدر کی صورت میں ظاہر ہوا اور قریشِ مکہ کے جماعتی اقبال کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَتَصْدِيَةً ۚ
فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿٣٥﴾ إِنَّ الَّذِينَ
كَفَرُوا يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۚ
فَسَيُنْفِقُونَهَا ثُمَّ تَكُونُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُونَ ۗ
وَالَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ يُحْشَرُونَ ﴿٣٦﴾ لِيَمِيزَ اللَّهُ
الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيثَ بَعْضَهُ عَلَىٰ بَعْضٍ
فَيَرْكُمَهُ جَمِيعًا فَيَجْعَلَهُ فِي جَهَنَّمَ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ
الْخَاسِرُونَ ﴿٣٧﴾

اور کعبہ میں ان کی نماز اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ سیٹیاں بجاتے اور تالیاں پیٹتے تو اب اس کفر کا مزہ چکھو جسے تم اپنائے ہوئے تھے[۴۳]۔ بلاشبہ جن لوگوں نے راہِ کفر اختیار کی ہے وہ اپنا سرمایہ لوگوں کو راہ خدا

سے ہٹانے میں خرچ کرتے ہیں[44]۔ لہٰذا یہ لوگ آئندہ

بھی ضرور خرچ کریں گے لیکن پھر یہ مال خرچ کرنا ان

کے لیے سامانِ حسرت بن جائے گا اور پھر وہ ہمیشہ

کے لیے دب کر رہ جائیں گے اور جن لوگوں نے راہِ کفر

اختیار کی ہے ان کو آخرت میں دوزخ کی طرف سمیٹا جائے

گا[45]۔ اور یہ سب کچھ اس لیے ہوگا تاکہ اللہ تعالیٰ بُرے کو

اچھے سے ممتاز کر دے، اور بُرے کو بُرے سے جوڑ کر

اسے یکجا کر دے، پھر اس مجموعہ کو جہنم میں ڈال دے،

یہی لوگ فی الواقع تباہی اور خسارے والے ہیں[46]۔

کفر و ایمان کے درمیان امتیاز

جیسے نبوت کا اوّلین مقصد یہ ہے کہ شر و فساد کی ان قوتوں کا استیصال کیا جائے جن سے کفر کا وجود عبارت ہے۔ دُنیا کے ہر وجود کی طرح کفر بھی اپنی ہستی کی بقاء کا آرزومند اور کشمکشِ حیات میں مبتلا ہے ایسے ہی نبوت کے مقاصد میں یہ بات بھی داخل ہے کہ کفر و ایمان میں حدِ فاصل قائم کر دے اور ان تمام ملاوٹوں کو یکسر

مٹا دے جو کفر و ایمان میں ہم آہنگی اور ہم رنگی کی نشاندہی کرتی ہوں۔ جیسے ایمان کی زندگی کے لیے شرک کی حیثیت ایک ناسور کی ہے ایسے ہی طاعت کے نام پر خالص گناہ کی نمائش بھی ایمان کی زندگی کے لیے وہ جرثومہ خبیث ہے جو ایمان کی صحت کو تباہ کر دیتا ہے۔ نبوت کے مشن کی تکمیل کے لیے ان دونوں کا ہونا ضروری ہے۔ عرب کے مشرکین ایک طرف اگر وہ شرک کی نجاست سے آلودہ تھے تو دوسری طرف وہ اللہ کے نام پر شریعت سازی کے کارخانے کھولے ہوئے تھے اور بڑی بے باکی کے ساتھ خدا کے نام پر اعمال کے پیمانے بناتے تھے۔ ایک پیمانہ یہاں بتایا ہے کہ طواف میں ذکر اللہ کی جگہ سیٹیاں اور تالیاں بجاتے، ہماری شریعت میں اسی کا نام بدعت ہے علامہ شاطبی فرماتے ہیں کہ دین میں ایسا اختراع کیا ہوا طریقہ جو شریعت کے مشابہ ہو اور جس پر عمل سے اللہ کی عبادت میں مبالغہ مقصود ہو۔ قرآن نے ان آیات میں بتایا ہے کہ نبوت کا بنیادی مقصد خبیث و طیب میں عام نگاہوں میں امتیاز پیدا کرنا ہے۔ ایمان و کفر، تقویٰ و فجور، طاعت و بغاوت، توحید و شرک، فرمانبرداری اور نافرمانی، خوش اخلاقی و بد اخلاقی، ایمانداری و بے ایمانی، ان میں سے پہلا طیب اور دوسرا خبیث ہے۔ نبوت چاہتی کہ یہ دونوں لوگوں کے سامنے نمایاں ہو کر آ جائیں عام نگاہیں کفر کو ایمان بغاوت کو طاعت، فجور کو تقویٰ، شرک کو توحید نہ سمجھیں۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی و شرار بولہبی

قریش کی تماشائی عبادت

۳۵۔ اور کعبہ میں ان کی نماز اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ سیٹیاں بجاتے اور تالیاں پیٹتے لہٰذا اب اس کفر کا مزہ چکھو جسے تم اپنائے ہوئے تھے۔ یعنی حقیقی نمازیوں کو تو مسجد حرام سے روکتے ہیں اور خود ان کی نماز کیا ہے؟ کعبہ کا برہنہ طواف کرنا، اور ذکر اللہ کی جگہ سیٹیاں اور تالیاں بجانا۔ جیسے آج بھی بہت سی قومیں گھنٹیاں اور ناقوس بجانے کو بڑی عبادت سمجھتی ہیں۔ غرض نہ خود اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور نہ دوسرے کو کرنے دیتے ہیں۔ ان بے معنی اور لغو

ہاتوں کو عبادت قرار دے رکھا ہے۔ بعض نے کہا کہ سیٹیاں اور تالیاں بجانا مسلمانوں کی عبادت میں خلل ڈالنے کے لیے ہوتا تھا یا ازراہِ استہزاء و تمسخر ایسا کرتے تھے۔[1]
عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ مشرکین عرب اپنے رخسار زمین پر رکھ کر سیٹیاں بجاتے اور تالیاں پیٹتے۔ عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ وہ بیت اللہ کا ننگے طواف کرتے سیٹیاں بجاتے اور تالیاں پیٹتے۔ مجاہد کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی عبادت میں اس انداز سے رخنہ اندازی کرتے۔ زہری کہتے ہیں کہ اہلِ ایمان کا مذاق اڑاتے۔ آیت وما کان صلاتہم کا عطف یا ھم یصدون پر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ عذاب کے بدر کی صورت میں اس لیے مستحق ہیں کہ لوگوں کو مسجد حرام سے روکتے ہیں اور خود یادِ الٰہی کو لہو و لعب کا نمونہ بنائے ہوئے ہیں۔ اور یا اس کا عطف وما کانوا اولیاء پر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مسجد حرام کے متولی نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے عبادت کے پیمانے اپنے ایجاد کر لیے ہیں۔ نماز کی جگہ سیٹیاں بجانا اور تالیاں پیٹنا اپنا رکھا ہے۔ بیت اللہ کا برہنہ طواف مرد اور عورتیں ہاتھوں کی انگلیوں سے بگل بنا کر منہ سے بجاتے اور کبھی دونوں ہاتھوں سے تالیاں پیٹتے۔
دراصل ان کے مخترعہ اعمالِ عبادت کے لیے یہ ایک مثال بیان ہوئی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ عبادات میں دینِ ابراہیم کی پیروی کرتے لیکن انہوں نے شرک و بدعت کا قلعہ بنا رکھا ہے۔ نماز کی بالکل آبرو مٹا دی۔ فرمایا کہ ان کی نماز کیا ہے، سیٹی بجانا، تالی پیٹنا، یہ قرآنی بلاغت ہے کہ اس نے دو لفظوں میں ان کی عبادات کا سارا نقشہ پیش کر دیا۔ حیرت کی بات ہے کہ آج بھی عبادت کے جو غیر اسلامی اور جاہلی طریقے چلے ہوتے ہیں۔ ان کا جزو اعظم بھی باجا گاجا تالیاں اور سیٹیاں ہیں۔ فقہاء و مفسرین نے یہاں ان صوفیا کے کردار پر ماتم کیا ہے، جو وجد، حال لاکر اچھلتے کودتے تالیاں بجاتے اور ناچتے۔ اور اسے روحانی کمال سمجھتے ہیں۔
قرطبی لکھتے ہیں کہ اس میں مشرکین کے اعمال سے پوری مشابہت ہے جیسے حافظ ابن القیم اغاثۃ اللھفان میں فرماتے ہیں۔ سیٹیوں اور تالیوں کے ذریعے

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

اللہ کا قرب تلاش کرنے والے اور نمازیوں، ارباب ذکر و قرأت کا سکون برباد کرنے والوں میں آج بھی ان مشرکین کے اعمال کا عکس ہے۔ ابن عرفہ اور ابن الانباری کہتے ہیں کہ سیٹی بجانا اور تالیاں پیٹنا نماز نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بتایا ہے کہ مشرکین نے ان دونوں کو نماز کی جگہ عبادت کا پیمانہ بنا لیا تھا۔ اس لحاظ سے اس گناہ کا وزن زیادہ ہو گیا۔ مطلب یہ ہے کہ آج بھی جو لوگ گانے بجانے کے ذریعے اللہ کا قرب تلاش کرتے ہیں وہ اپنے عمل میں ان مشرکین سے ہم آہنگی رکھتے ہیں خواہ مشابہت بالکل ظاہری کیوں نہ ہو۔ حافظ ابن تیمیہ اپنے فتاویٰ میں لکھتے ہیں سیٹیاں بجانے، گانے اور باجہ بجانے اور اس کے لیے مجالس منعقد کرنے کو عبادت کا پیمانہ اور اللہ کے قرب کا ذریعہ سمجھنا ہرگز دین اسلام نہیں ہے۔ نہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت ہے۔ نہ خلفائے راشدین کا طریقہ ہے اور نہ مسلمانوں کے اماموں میں سے کسی نے اسے بنظر استحسان دیکھا ہے۔ بلکہ دینی زندگی میں یہ کام نہ زمانہ نبوت میں ہوا ہے نہ زمانہ خلافت میں، نہ زمانہ صحابہ و تابعین میں اور نہ اتباع تابعین کے زمانہ میں، نہ خیر القرون میں ہوا ہے۔ یہ بدعت خیر القرون کے بعد ایجاد ہوئی ہے۔ اسی سے امام شافعی نے اس ایجاد کو دیکھ کر فرمایا تھا کہ میں نے بغداد میں ایک ایسی بدعت کا مطالعہ کیا ہے جسے زنادقہ نے بنایا ہے۔ اس کا مقصد لوگوں کو قرآن سے ہٹانا ہے امام احمد سے اس کے بارے میں دریافت کیا گیا۔ فرمایا میں اسے ناجائز سمجھتا ہوں۔ سارے ائمہ فقہ و حدیث اور اکابر صوفیائے کرام ابراہیم بن ادھم، الفضیل بن عیاض، معروف الکرخی، سری سقطی اسے بہت بڑا گناہ سمجھتے تھے بلکہ شیخ عبدالقادر جیلانی نے اس سماع کو مشائخ طریقت کے مسلک کے خلاف بتایا ہے۔

امام شافعی اصول دین سے باخبر ہیں۔ ان کا یہ فیصلہ کہ یہ زنادقہ کی ایجاد ہے عبرت کا سامان ہے۔ اگر کوئی شخص دین کا ذوق رکھتا ہے تو بہت سی بدعتوں کو ان کی ظاہری ہیئت ہی سے پہچان لیتا ہے کہ ان خرافات کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مراثی کا لغویوں میں وجود، مزاروں پر قوالیاں اور ڈھول ڈھمکے اور خانقاہوں میں گانے بجانے کی خرافات ایسی چیزیں نہیں ہیں جن کی لغویت کا فیصلہ کرنے کے لیے کسی علمی کاوش کی ضرورت ہو۔ ہر صاحب ذوق بیک نظر دیکھ

سکتا ہے کہ ان چیزوں کو دین سے دُور کا بھی واسطہ نہیں ہو سکتا۔ دین کی ہر بات میں متانت وقار اور پاکیزگی کی جھلک اور معرفت حکمت و دانش اور روحانیت کی مہک ہوتی ہے۔

آخر میں فرمایا ہے فذوقوا العذاب الخ قریش کے جرائم گنانے کے بعد قریش کو مخاطب کر کے کہا ہے کہ تم یہ خبط دماغ سے نکال دو کہ تم خانہ کعبہ کے متولی ہو تمہارے کفر، تمہاری خیانت و بدعہدی کی ایک پوری تاریخ بن چکی ہے تو اب اس کی پاداش میں اللہ سبحانہ کے عذاب کا مزہ چکھو۔ اس میں اشارہ بدر میں عذاب ہلاکت کی طرف ہے۔ سلف میں اکثر کی یہی رائے ہے۔ حافظ ابن جریر نے تفسیر میں اسی کو اپنایا ہے یا یوں کہہ دیجئے کہ جس عذاب کا تم نے مطالبہ کیا تھا اب اس عذاب کا مزہ چکھو۔

قریش میں اسلام کے خلاف جوش

۳۶۔ بلاشبہ جن لوگوں نے راہِ کفر اختیار کی ہے وہ اپنا سرمایہ لوگوں کو راہِ خدا سے ہٹانے میں خرچ کرتے ہیں۔ بدر میں بارہ سرداروں نے ایک ایک دن اپنے ذمہ لیا تھا کہ ہر روز ایک شخص لشکر کو کھانا کھلائے گا۔ چنانچہ دس اونٹ روزانہ کسی ایک کی طرف سے ذبح کیے جاتے تھے۔ پھر جب شکست ہو گئی تو ہزیمت خوردہ مجمع نے مکہ پہنچ کر ابوسفیان وغیرہ سے کہا کہ جو مال تجارت قافلہ لایا ہے وہ سب محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے انتقام لینے میں صرف کیا جائے۔ چنانچہ سب اس پر راضی ہو گئے۔ اسی طرح کے خرچ کرنے کا یہاں ذکر ہے۔[1]

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ دُنیا کے دوسرے وجودوں کی طرح کُفر کا بھی ایک وجود ہے۔ یہ بھی اپنی ہستی کی بقا کا آرزومند ہے اور کشمکش حیات میں تن کر مقابلہ کرتا ہے۔ کُفر میں تاب مقاومت نہ ہو تو ایمان کی کوئی قیمت نہیں ہے کہ چیزوں کی قدر و قیمت اضداد سے ہوتی ہے۔ کُفر میں اسلام کو مٹانے کے لیے کس قدر جوش و خروش تھا۔ اسی کی اس آیت میں وضاحت ہو رہی ہے کہ قریش اپنے کُفر کی خاطر ایمان کے مقابلے میں بڑی فیاضی سے دولت لٹا رہے تھے۔ یہ بات کھول کر اس لیے

[1] افادات شیخ الاسلام

بتائی گئی ہے کہ فی الواقع قریش کے لیڈروں نے بدر کے موقع پر بڑی دریادلی دکھائی تھی جنگ کا سامان اور فوج کی رسد فراہم کرنے میں ہر سردار نے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کی۔ بارہ سرداروں میں سے ایک ایک نے ہر روز بدر کی لڑائی میں دس اونٹ ذبح کرنے کا وعدہ کیا۔ الخفاجی نے لکھا ہے کہ ان بارہ سرداروں کے نام یہ ہیں:

ابوجہل، عقبہ، بنیہ، منبہ، ابوالبختری، النضر، حکیم بن حزام، ابورفعہ، الحارث، العباس، عتبہ، شیبہ، یہ پیچھے پڑھ آئے ہو کہ قریش جنگ پر تلے بیٹھے تھے اور اس کے مصارف کی یہ تجویز سوچی گئی تھی کہ اہل مکہ کے پاس جو سرمایہ تھا وہ شام جانے والے قافلے کے سپرد کر دیا جائے اور اس سفر تجارت میں جس قدر نفع ہو وہ پورے کا پورا مسلمانوں کے خلاف سامان جنگ کی تیاری پر لگا دیا جائے۔ یہی تجارتی قافلہ تھا جس پر حملہ ابتدا میں مسلمانوں کے پیش نظر تھا اور احدالطائفتین سے ابتداء میں یہی قافلہ سمجھا گیا۔ اس میں ایک ہزار اونٹ اور پچاس ہزار دینار کا سامان تجارت تھا۔ یہی قافلہ بدر سے ہٹ کر نکل آیا تھا۔ بدر میں شکست کے بعد جب قریش واپس مکہ پہنچے۔ انہوں نے اسلام سے انتقام کے جوش میں ابوسفیان سے کہا کہ اس سارے سرمایہ کو مسلمانوں کے خلاف جنگ کے لیے لگایا جائے تاکہ ہم بدر کا بدلہ لے سکیں۔ اسی کی طرف قرآن نے یہاں یُنفِقُونَ اَموالَھُم سے اشارہ کیا ہے اور ان کی اس دریادلی کا باعث یہ بتایا ہے کہ اس طرح وہ لوگوں کو دین اسلام سے ہٹانے یا اسلام کی ابھرتی طاقت کو ختم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

مستقبل میں قریش کی تیاری

۳۶۔ اس کے لیے لوگ آئندہ بھی ضرور خرچ کریں گے لیکن پھر یہ مال خرچ کرنا ان کے لیے سامان حسرت بن جائے گا اور پھر وہ ہمیشہ کے لیے دب کر رہ جائیں گے اور جن لوگوں نے راہ کفر اختیار کی ہے۔ ان کو آخرت میں دوزخ کی طرف سمیٹا جائے گا جب دنیا میں مغلوب و مقہور اور آخرت میں معذب ہوں گے۔ تب افسوس و حسرت سے ہاتھ کاٹیں گے کہ مال بھی گیا اور کامیابی بھی نہیں ہوئی۔

چنانچہ اول بدر میں پھر اُحد وغیرہ میں سب مالی اور جسمانی طاقت خرچ کرکے دیکھ لیا کچھ نہ کر سکے آخر ہلاک یا رُسوا ہوئے یا نادم ہو کر کفر سے توبہ کی ہے۔

قرآن نے اہل بدر کو مستقبل کے بارے میں خبر دی ہے کہ یہی لوگ مستقبل میں بھی تمہارے خلاف بڑی گرمجوشی اور دریادلی کا مظاہرہ کریں گے۔ قاضی بیضاوی لکھتے ہیں وہو انفاقہم فیما یستقبل یہ مستقبل میں ان کے انفاق کی خبر ہے۔ گویا ینفقون میں بدر میں اموال خرچ کرنے کی داستان تھی اور یہاں مستقبل میں خرچ کرنے کی خبر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے اہل ایمان راہ حق سے روکنے کے لیے جو یہ دریادلی ہو رہی ہے اور جو مستقبل میں ہوگی ان سے مرعوب نہ ہوں۔ ان کے خزف ریزوں اور تنکوں سے اس سیلاب کا مقابلہ نہ ہو سکے گا جو حق و ایمان کا آ رہا ہے۔ بلاشبہ انہوں نے بڑی فیاضی سے خرچ کیا ہے اور بھی خرچ کریں گے لیکن ان تمام فیاضیوں کا نتیجہ کف افسوس ملنے کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ یہ بہت جلد منہ کی کھائیں گے۔ دنیا میں ان کے لیے شکست مقرر ہو چکی ہے اور آخرت میں یہ جہنم کی طرف ہانک دیے جائیں گے۔ اس سے بڑھ کر حسرت اور کیا ہو سکتی ہے کہ آدمی جس کام پر اپنا تمام وقت تمام محنت تمام قابلیت اور پورا سرمایۂ زندگی لگا دے۔ اس کی انتہا پر پہنچ کر معلوم ہو کہ وہ تباہی و بربادی ہے اور اس کام پر جو کچھ اس نے لگایا ہے اس پر سود یا منافع پانے کی جگہ اسے اُلٹا جرمانہ بھگتنا پڑا ہے۔

خبیث وطیب میں امتیاز

۳۷۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوگا تاکہ اللہ تعالیٰ بُرے کو اچھے سے ممتاز کر دے اور بُرے کو بُرے سے جوڑ کر اسے یکجا کر دے پھر اس مجموعہ کو جہنم میں ڈال دے۔ یہی لوگ فی الواقع تباہی اور خسارے والے ہیں۔ یعنی دنیوی اور اُخروی دونوں قسم کا نقصان۔ موضح القرآن میں ہے کہ آہستہ آہستہ اللہ تعالیٰ اسلام کو غالب کر دے گا۔ اس درمیان میں کافر اپنا جان و مال کا زور خرچ کر لیں گے تاکہ

افادات شیخ الاسلام

نیک و بد جُدا ہو جائے جن کی قسمت میں اسلام لکھا ہے وہ سب مسلمان ہو چکیں اور جن کو کفر پر مرنا ہے وہ ہی اکھٹے دوزخ میں جائیں [1]

اس آیت میں کھول کر بتا دیا کہ اللہ سبحانہ نے نصرت و غلبہ، کامیابی اور فتح مندی اہل ایمان کے لیے رُسوائی، ناکامی، مقہوری اور ذلت معاندین کے لیے رکھی ہے۔ تاکہ کفر و ایمان، عدل و ظلم، حق و باطل میں حدِ فاصل اور امتیاز ہو جائے۔ بُرا مٹ جائے۔ اور اچھا باقی رہ جائے۔ کُفر مٹ جائے ایمان باقی رہ جائے، باطل مٹ جائے حق رہ جائے۔ جو بات یہاں بدر کے سلسلے میں فرمائی ہے بالکل ایسی ہی بات غزوۂ اُحد کے موضوع پر بھی ارشاد فرمائی ہے۔

ما کان اللہ لیذر المومنین علی ما انتم علیہ حتی یمیز الخبیث من الطیب۔

اللہ کے یہ شایان نہیں کہ اہل ایمان کو موجودہ حالت میں چھوڑ دے، وہ بُرے کو اچھے سے ضرور ممتاز کرے گا۔

اس آیت میں اللہ سبحانہ نے یہ قانون بتایا ہے کہ اچھے اور بُرے میں امتیاز ناگزیر ہے۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ کفر و ایمان، عدل و ظلم، ہدایت و ضلالت، تقویٰ و فجور میں امتیاز ہونا چاہیے۔ یعنی اہل ایمان کی اللہ کی جانب سے مدد ہونی چاہیے اور ان کو کفر کے مقابلے میں غالب ہونا چاہیے اور یہ امتیاز صرف علمی نہیں بلکہ فعلی اور عملی ہونا چاہیے۔ کفر و ایمان دونوں ضد ہیں۔ اور اللہ کے "قانون میں ضدین کا اجتماع نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ جن لوگوں نے ایمان کو اپنایا ہے وہ ایمان کے تقاضے پورے کریں۔ کیونکہ ایمان کا معیار ہی یہ ہے کہ مسلمان کفر کے مقابلے میں ایمان کا بول بالا کرے اور اس کی راہ میں جان لڑانے کے لیے آمادہ ہو۔ مومن کے ایمان کا یہ بنیادی "تقاضا ہی نہیں بلکہ ذمہ داری ہے کہ جس چیز پر ایمان لایا ہے اس کے حق ہونے کی شہادت دے اور ہر ممکن طریقے سے اس بات کی کوشش کرے کہ خدا کے بندے فی الواقع اس کے بندے بن جائیں۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

اور اس کے بھیجے ہوئے اس دینِ حق سے دُور رہ کر اپنی دُنیا پریشان اور اپنی آخرت تباہ نہ کریں۔ اس ذمہ داری کا کھلا تقاضا یہ ہے کہ اہلِ ایمان اپنے دائرے میں سمٹے نہ رہیں بلکہ آگے بڑھیں۔ اللہ کا دین یہ ہے کہ دُنیا میں پھیل جائیں اور اس راہ میں کسی کو مزاحم نہ ہونے دیں۔ اور زندگی کے اجتماعی نظام باطل کے ہاتھوں سے چھین کر حق کے ہاتھوں میں دیں۔ یہ ہے طیب و خبیث کا امتیاز، کفر خبیث ہے اور ایمان طیب ہے۔ ان دونوں میں اخلاقی، معاشرتی، معاشی، سیاسی، قانونی اور روحانی طور پر امتیاز ہونا چاہیے۔ بدر کی صورت میں اہلِ ایمان کے ہاتھوں رُسوا ئے قریش کو عذاب میں مبتلا کر کے بھی امتیاز قائم کیا ہے۔ پھر یہی نہیں بلکہ خبیث جہاں جہاں بھی پایا جاتا ہے وہ سب کو یکجا کرے گا۔ ان میں باہم اتحاد قائم ہو گا، ان کی یونین بنے گی۔ پھر سب کو دُنیا میں تمہارے ذریعے رُسوا کرے گا اور آخرت میں ان کو جہنم کا ایندھن بنائے گا۔

یہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ بدر کے ذریعے اہلِ کفر کی تعذیب اس لیے عمل میں آئی ہے کہ جنہوں نے اسلام کا جام تو منہ سے لگا لیا ہے لیکن ابھی حلق کے نیچے نہیں اُترا۔ کسی تعلیم کو اختیار کر کے یقین و عمل کی جو رُوح پیدا ہونی چاہیے اس سے یک قلم محروم ہیں۔ اخلاص و صداقت کے لیے ان میں کوئی جگہ نہیں۔ جہاد کے تصور سے ان کی رُوحیں لرزتی ہیں۔ ان کے مقابلے میں وہ ہیں جنہوں نے ایمان قبول کر لینے کے بعد صرف مصیبتیں جھیلی نہیں ہیں بلکہ دل کی پوری آمادگی اور رُوح کے کامل سرور کے ساتھ اپنی پوری زندگیاں ان میں بسر کر ڈالیں۔ اب تک یہ دونوں ملے جلے تھے۔ خام پختہ خبیث و طیب ہر قسم کے افراد پر مشتمل ایمانی جماعت تھی۔ یہ بات اللہ کی حکمت کے خلاف تھی کہ جو جماعت پوری دُنیا کی قیادت کے لیے مبعوث ہوئی ہے۔ وہ اس طرح اچھے بُرے، فاسد و صالح کا مکسچر ہی ہے۔ دونوں میں امتیاز کی صورت اللہ سبحانہ نے اپنی سنت کے مطابق یہ اختیار کی کہ بدر کو ایمان باللہ کے لیے حقیقی کسوٹی بنا کر سب کے سامنے رکھ دیا۔ کیونکہ ایمان خالص کا معیار ہی یہ ہے کہ انسان معبودانِ باطل کے مقابلے میں اللہ سبحانہ کی معبودیت کا بول بالا کرے اور اس راہ میں جان لڑانے کے لیے آمادہ ہو جائے۔ دُنیا کی اور نیکیوں میں

ذاتی منفعت کی توقع اور خواہش نفس کی آمیزش ہو سکتی ہے لیکن خدا کی راہ میں جاں نثاری صرف محبت کے جذبے سے پیدا ہوتی ہے۔ ماں باپ کی خبر گیری میں رضائے الٰہی سے زیادہ والدین کی محبت کا جذبہ کار فرما ہو سکتا ہے۔ سب رشتہ داروں اور فقراء و مساکین کی امداد بنی نوع انسان کی عام ہمدردی پر بھی مبنی ہو سکتی ہے لیکن جہاد میں سر دے دینا صرف رضائے الٰہی کے لیے ہو سکتا ہے اس میں اور جذبہ کی آمیزش ممکن نہیں ہے۔

ایمان باللہ کی اس حقیقی امتحان کا موقعہ غزوۂ بدر نے فراہم کیا۔ یہی وہ کسوٹی بن گئی جس پر کھرے کھوٹے کی تمیز ہو گئی۔ قرآن کہتا ہے کہ بدر میں مصائب کے ہجوم نے خبیث و طیب کو الگ الگ کر دیا ہے اور اللہ کا قانون یہی ہے کہ اچھوں کو بروں سے ممتاز کرنے کے لیے وہ دونوں کو مصائب میں ڈال دیتا ہے تاکہ خام اور پختہ، مخلص اور منافق دونوں الگ الگ ہو جائیں۔ جو دنیا میں خبیث ہے وہ آخرت میں بھی خبیث ہے اور جو دنیا میں طیب ہے وہ آخرت میں بھی طیب ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی اللہ کا قانون ہے کہ جب وہ خبث کو طیب کے ذریعے ختم کرنا چاہتا ہے تو خبث خواہ کتنی صورتوں میں کتنی قسموں میں ہو باہم ان کو جوڑ دیتا ہے اور تدبر نہ کر دیتا ہے۔ ان میں باہم سنگٹھن قائم ہو جاتا ہے۔ اس طرح ان خبیثوں میں ہم آہنگی اور اجتماعیت پیدا کر کے پہلے دنیا میں ختم کرتا ہے اور پھر آخرت میں ان کو جہنم رسید کر دیتا ہے۔

اس آیت کی تشریح میں شارحین قرآن نے یہ بھی بتایا ہے کہ اس آیت گرامی کا موجودہ زندگی سے نہیں بلکہ آخرت کی زندگی سے تعلق ہے اور مطلب یہ ہے کہ آخرت کو ان کو سزا یہ ہو گی کہ کافروں کو دوزخ میں لے جانے کے لیے جمع کیا جائے گا تاکہ اللہ تعالیٰ ناپاک کو پاک سے الگ کر دے کیونکہ جب دوزخیوں کو دوزخ کی طرف لائیں گے ظاہر ہے کہ اہل جنت سے علیحدہ ہو جائیں گے اور ان سے الگ کر کے ناپاک لوگوں کو ایک دوسرے سے ملا دے یعنی ان سب کو متصل کر کے ان سب کو جہنم میں ڈال دے ایسے ہی لوگ خسارے میں ہیں جس کا کہیں منتہیٰ نہیں۔ یہ تشریح بیان القرآن میں حضرت مولانا اشرف علی نے اختیار کی ہے اور اسی کو مفتی محمد شفیع

اور مولانا محمد ادریس نے معارف القرآن میں شرف پذیرائی دیا ہے لیکن آپ پڑھ چکے ہیں کہ حضرت شاہ عبدالقادر اس آیت گرامی کو موجودہ زندگی سے متعلق بتاتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ :

اللہ آہستہ آہستہ اسلام کو غالب کرے گا اس بیچ میں کافر اپنا زور، جان اور مال کا خرچ کر لیں گے تاکہ نیک و بد جدا ہو جائے یعنی جن کی قسمت میں اسلام لکھا ہے وہ سب مسلمان ہو چکے اور جن کو کفر پر ہونا ہے وہی اکٹھے دوزخ میں جائیں گے۔

آیت کا یہی مطلب عبداللہ بن عباس کی تشریح سے ہم آہنگ ہے فرماتے ہیں :

تاکہ اہل سعادت کو اہل شقاوت سے ممتاز کر دے۔

شارحین قرآن نے اس موضوع پر یہ بھی بتایا ہے کہ خبیث عمل کو طیب عمل سے ممتاز کر دے یا راہ شیطان میں کیے گئے اخراجات کو راہ خدا میں کیے گئے اخراجات سے ممتاز کر دے یا اس مال خبیث کو جسے مشرکین نے حضور اقدس کی عداوت میں پانی کی طرح بہایا ہے اس مال طیب سے جسے اہل ایمان نے نبوت کی نصرت کے لیے خرچ کیا ہے ممتاز کر دے پھر ان اموال خبیثہ کو اکٹھا کر کے جہنم میں ڈالے اور جہنم میں خرچ کرنے والوں کو عذاب دے۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ وَاِنْ
يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۸﴾ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا
تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ
اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۳۹﴾ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ
مَوْلٰىكُمْ ۭ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿۴۰﴾

جنہوں نے راہِ کفر اختیار کی ہے ان سے کہہ دیجئے کہ اگر وہ باز آجائیں تو ان کے پچھلے گناہ معاف کر دیے جائیں گے[۴۷]۔ اور اگر پھر وہ ہی کچھ کریں گے تو اس بارے میں پہلوں کا طریقہ گزر چکا ہے[۴۸]۔ اور مسلمانو! تم ان سے لڑتے رہو تاآنکہ فتنہ نہ رہے[۴۹]۔ اور دین سارے کا سارا اللہ کا ہو جائے[۵۰]۔ بس اگر وہ باز آجائیں تو وہ جو کچھ کریں گے اللہ کی نگاہ میں ہے[۵۱]۔ اور اگر وہ پھر گئے

تو پھر جان لو کہ اللہ سبحانہ تمہارا کارساز ہے، کیا ہی اچھا کارساز اور کیا خوب مددگار ہے۔ ۵۲

کُفر سے مصالحت کی شرط

یہ سُن آئے ہو کہ نبوت کا اوّلین مقصد یہ ہے کہ شر و فساد کی ان قوتوں کو ملیا میٹ کر دیا جائے جن سے کُفر پروان چڑھتا ہے۔ دُنیا میں کُفر بھی ایک ہستی رکھتا ہے اور وہ بھی اپنے بقا کے لیے کوشش اور جدوجہد کرتا ہے اور اس میدان میں صرف نبوت اس کی مدِ مقابل اور حریف ہے کیونکہ وہ اپنی فطرت کے اعتبار سے ایمان کی داعی ہونے کی وجہ سے کُفر کی ضد ہے۔ ایمان اور کُفر کے درمیان مصالحت ناممکن اور ان کی لڑائی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ یہ لڑائی دُنیا کی دوسری لڑائیوں پر حاوی اور ان سے مافوق ہے بلکہ اور جتنی لڑائیاں ہیں ان کا سلسلہ کہیں نہ کہیں ختم ہوتا ہے کہ یا کُفر میں تابِ مقاومت نہ رہے یا اس کا مقابلہ کرنے کے لیے ایمان نہ ہو۔ حضورِ اقدس کا ارشادِ گرامی ہے۔

مجھے اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ انسانی دُنیا سے اس وقت تک برسرِ پیکار رہوں جب تک کہ وہ اس بات کی شہادت نہ دیں کہ اللہ کے سوا عبادت کے لائق کوئی نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسُول ہیں۔ نماز قائم کریں زکوٰۃ دیں۔ اگر وہ یہ کر لیں تو پھر ان کے خُون معصوم ہیں۔ ان کے اموال محفوظ ہیں۔ ہاں یہ کہ کوئی اسلام کے قانون میں پکڑا جائے اس کے بعد ان کا معاملہ اللہ کے سُپرد ہے۔

یعنی ایمان و کُفر کے درمیان جنگ ختم ہونے کی صرف ایک صورت ہے وہ یہ کہ ایمان کی راہ قبول کر لیں اور کُفر کی راہ سے ہٹ جائیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ لوگوں کو جبراً مسلمان بنایا جائے بلکہ مطلب یہ ہے کہ کُفر جب ایمان کے

مقابلہ میں تن کر آئے اس کی مزاحمت اس وقت کی جائے گی جب تک کفر مقابلہ سے باز نہ آجائے
انداز بیان اقاتل الناس ہے اقتل الناس نہیں ہے۔ صلح اور جزیہ کے ذریعے بھی اگرچہ
جنگ ختم ہوتی ہے مگر یہ دونوں صورتیں طرفین کی رضامندی پر موقوف ہیں۔ فریق مقابل
صلح کی درخواست کرے یا جزیہ دینا منظور کرے گا تو اس کی درخواست قبول کی جا سکتی
ہے لیکن جنگ ختم کرنے کا وہ حتمی اور یقینی ذریعہ جو صرف کفر کے ہاتھ میں ہے وہ
ایمان ہے۔ یہی ایک راستہ ہے جس پر چل کر کفر ایمان کو جنگ ختم کرنے پر مجبور
کر سکتا ہے۔ اس آیت میں قرآن نے بھی یہی بتایا ہے کہ اگر کفر، کفر سے باز آ آئے
تو اس کے ماضی کے سارے جرائم معاف ہو سکتے ہیں۔

عفو وکرم کا قانون

۴۷۔ جنہوں نے راہِ کفر اختیار کی ہے ان سے کہہ دیجئے اگر وہ باز آجائیں تو
ان کے پچھلے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔ یعنی اگر اب بھی کفر و طغیان اور عداوتِ
اسلام سے باز آجائیں اور پیغمبر علیہ السلام کی حلقہ بگوشی اختیار کر لیں تو پہلے حالتِ
کفر میں جو گناہ کر چکے ہیں وہ سب معاف کر دیے جائیں گے الاسلام یہدم ما کان
قبلہ حقوق العباد معاف نہ ہوں گے ان کا مسئلہ علیحدہ ہے[1] غزوہ بدر کے بعد یہ
قریشِ مکہ سے کہا جا رہا ہے اگر اب بھی وہ اس روش سے باز آجائیں، توبہ و اصلاح
کر لیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر لبیک کہیں۔ اگر انہوں نے
اپنا طرزِ عمل تبدیل کر لیا تو جو شرارتیں اب تک کر چکے ہیں اللہ سبحانہ ان کو معاف کر دے
گا۔ گزشتہ اعمال کی بنا پر ان سے کوئی مواخذہ نہ ہو گا۔

مسند احمد اور سنن سعید بن منصور میں عمرو بن العاص کے حوالہ سے ایک حدیث
آئی ہے وہ فرماتے ہیں کہ :

جب اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں اسلام کی حقانیت ڈال دی تو میں
آپؐ کے پاس حاضر ہوا تاکہ آپ مجھے بیعت فرما لیں۔ آپ نے بیعت

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے عرض کیا کہ میں اس وقت تک بیعت نہ کروں گا جب تک میرے پچھلے گناہ معاف نہ ہو جائیں۔ آپ نے فرمایا کہ اے عمر کیا تجھے خبر نہیں کہ ہجرت پہلے سب گناہوں کو ختم کر دیتی ہے اے عمر کیا تو یہ نہیں جانتا ہے کہ اسلام پہلے گناہوں کا تمام قصہ پاک کر دیتا ہے۔

اس ارشاد گرامی میں ذنوب کا لفظ آیا ہے۔ ذنوب کے معنے افراد کے انفرادی وہ گناہ ہیں جن کا تعلق حقوق اللہ سے ہو۔ بلاشبہ جو دین تمام ادیان کو ایک دین اور سب ملتوں کو ایک ملت بنانے آیا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ تمام اہل ملل کی سب سے مشترک خواہش کو پورا کرنے کی ضمانت دے۔ یہ ظاہر ہے کہ دین کی تلاش صرف اس لیے ہے کہ بندہ کو اپنے مالک و مولیٰ کے قہر سے نجات ملے۔ اور طبعاً بھی ایک گنہ گار کی سب سے بڑی خواہش ہوتی ہے۔ اس لیے قرآن اس کا اعلان کرتا ہے کہ ملک و ملت ہر نسل و رنگ کا جو گنہ گار بھی اس کی آغوش میں آجائے گا وہ اس کے گناہوں کی مغفرت اور نجات ابدی کا ضامن ہو گا۔

یہ بات دھیان میں رکھنے کی ہے کہ مغفرت کا تعلق ذنوب اور گناہوں سے ہے ان حقوق کے ساتھ نہیں جو قرض، عاریت، امانت اور خرید و فروخت کے سلسلے میں اس کے ذمہ ہیں۔ قرآن حقوق کی ادائیگی سے سبکدوش نہیں کرتا بلکہ اس کی ذمہ داری اور بڑھا دیتا ہے۔ قرض خواہ کا قرض ادا کرنا ہو گا اور امانت والے کو اس کی امانت ضرور سپرد کرنی پڑے گی۔ قرآن کی آیت اور عمرو بن العاص کی حدیث کا تعلق ان اعمال سے ہے جو بندے اور خدا کے درمیان ہیں۔ اسلام کے بعد ایک شخص کی انفرادی زندگی سے وہ سب محو ہو جائیں گے اور کیسے محو نہ ہوں جب کہ اسلام اس کے کفر و شرک کی اصل تاریخ کو محو کر چکا ہے۔ فقہا نے اس سے یہ سیاسی نکتہ بھی نکالا ہے کہ کافر حربی سے زنا، قتل، سرقہ اور لوٹ مار جیسے جرائم بھی ساقط ہو جائیں گے کیونکہ وہ حالت کفر میں اسلامی قانون کا معاملات میں پابند نہ تھا لیکن اسلامی مملکت کے غیر مسلم شہری پر مسلمان ہونے کے بعد بھی یہ حقوق باقی رہیں گے۔ اور انفرادی زندگی میں امام ابو حنیفہ نے مرتد

کے بارے میں یہ نکتہ آفرینی فرمائی ہے کہ مرتد سے اسلام میں واپسی کے بعد حالتِ کفر میں فوت شدہ عبادات کی قضا کا مطالبہ نہ ہوگا

عصمتِ موثمہ اور عصمت مقومہ

اسلام قبول کرنے کی یہ پہلی برکت ہے کہ اس کی حلقہ بگوشی کے بعد جان و مال دونوں کی عصمت فوراً نصیب ہو جاتی ہے۔ فقہا کے نزدیک اس عصمت کی دو قسمیں ہیں۔ عصمت موثمہ، عصمت مقومہ۔

عصمت موثمہ یہ ہے جس کے ازالہ سے صرف گناہ ہو

عصمت مقومہ یہ ہے کہ جس کے ازالہ سے گناہ بھی ہو اور خون بہا بھی دینا پڑے۔

پہلی عصمت اسلام قبول کرنے سے حاصل ہوتی ہے اور دوسری دارالسلام میں سکونت حاصل کرنے سے۔ اس لحاظ سے اگر ایک مسلمان دارالحرب میں رہتا ہے تو اس کو عصمت موثمہ تو حاصل ہے لیکن عصمت مقومہ حاصل نہیں ہے۔ لہٰذا اگر کوئی مسلمان دارالحرب میں قتل کر دیا جائے تو اس کے قاتل کو صرف گناہ ہوگا مگر اس پر دیت لازم نہ آئے گی۔ پوری عصمت اس وقت حاصل ہوگی جب دارالسلام میں سکونت رکھتا ہو۔ ابوداؤد میں بحوالہ جریر بن عبداللہ البجلی یہ واقعہ ہے:

> حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مختصر سا دستہ قبیلہ خثعم کی طرف روانہ کیا۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے سجدہ میں گر کر اپنی جان بچانی چاہی۔ اسلامی فوج نے اس سے بے پروا ہو کر ان کو مار ڈالا۔ جب یہ واقعہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچا تو آپ نے ان کی نصف دیت ادا کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ میں ایسے ہر مسلمان سے بری الذمہ ہوں جو مشرکین میں گھل مل کر رہے۔ لوگوں نے دریافت کیا کیوں یا رسول اللہ آپ نے فرمایا دونوں کی آگ نظر نہ آئے۔

یعنی دونوں کو اتنے فاصلہ پر رہنا چاہیے کہ ایک دوسرے کی آگ نظر نہ آئے۔

اس واقعہ میں نصف دیت آپ نے اس لیے ادا کرنے کا حکم دیا کہ معاملہ ایک مسلمان جماعت کا تھا اور آئندہ کے لیے اعلان کر دیا کہ پوری عصمت اس وقت حاصل ہوگی

جب مسلمان ہونے کے ساتھ سکونت بھی دارالسلام میں اختیار کرے۔ اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ دارالحرب کی سکونت مسلمان کے لیے موزوں نہیں ہے لیکن دارالسلام کی طرف ہجرت اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ دارالسلام موجود ہو اور اس کی طرف ہجرت کرنا ممکن بھی ہو اور اگر بدنصیبی ہے کہیں دارالسلام ہی نہ ہو یا مسلمانوں کی مسلسل غفلت کی وجہ سے دارالحرب میں ان کی تعداد اتنی زیادہ ہو جائے کہ دارالسلام میں ان کی کھپت ناممکن ہو جائے تو پھر ہجرت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان حالات میں مسلمانوں پر فرض ہو گا کہ وہ اپنے ماحول میں رہ کر ایسی فضا پیدا کریں جس میں اسلامی زندگی بسر کرنے کی ان کو پوری آزادی حاصل ہو۔ اور جب تک اسلامی قانون پر عمل کرنے میں کوئی ادنیٰ رکاوٹ بھی ہو اس وقت تک آرام کی نیند نہ سوئیں۔

مشرکین مکہ کو دھمکی

۳۸۔ اور اگر پھر وہی کچھ کریں گے تو اس بارے میں پہلوں کا طریقہ گزر چکا ہے۔ یعنی جس طرح اگلے لوگ پیغمبروں کی تکذیب و عداوت سے تباہ ہوئے ان پر بھی تباہی آئے گی یا یہ مطلب ہے کہ جیسے بدر میں ان کے بھائی بندوں کو سزا ملی ہے انہیں بھی سزا دی جائے گی[۱] دوسری بات کہ ان کے ساتھ وہی معاملہ ہو گا جو بدر میں رؤسائے قریش کے ساتھ ہو چکا ہے امام مجاہد کی رائے ہے۔ پہلی بات عام شارحینِ قرآن نے اختیار کی ہے۔ حافظ ابن کثیر نے بھی اسی کو اولیت دی ہے لیکن حافظ ابن جریر کے اندازِ بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ ان کو امام مجاہد کی رائے پسند ہے۔ موقعہ کے لحاظ سے بات بھی درست ہے کہ تہدیب کی تاثیر کو قوی کرنے کے لیے حال ہی کے واقعہ کو عبرت کے طور پر پیش کیا جائے۔ شنید اور دید میں بڑا فرق ہے۔ بے شک قوم عاد، قوم ثمود، قوم لوط کے واقعات تاریخی حقائق ہیں لیکن بہر حال سنی ہوئی بات ہے۔ آنکھوں سے دیکھا ہوا معاملہ تو بدر کا ہے۔ جس نے پوری عرب دنیا کو چونکا دیا تھا۔ قرآن نے بدر کے دن کو یوم الفرقان کہا ہے کیونکہ یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ

---

[۱] افاداتِ شیخ الاسلام

ہلاکت تھا۔ جس طرح دوسری قوموں پر مختلف معجزات عذاب آئے ایسے ہی جس قوم میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہو کر آئے اس کے لیے غزوۂ بدر معجزۂ عذاب تھا۔ جس طرح دوسری قوموں کے لیے عذاب کے معجزے ان کے انبیاء کی بددعاؤں کا نتیجہ تھے اسی طرح بدر کا معجزۂ ہلاکت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعا کا نتیجہ تھا اس لیے واضح قرینہ کا تقاضا یہی ہے کہ ترہیب کے لیے قریب ترین معجزۂ ہلاکت کو پیش کیا جائے۔ اس صورت میں فقد مضت سنۃ الاولین میں اولین سے مقتولین بدر مراد ہوں گے۔ اگر تعبیر یہ ہوتی کہ فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُہ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَکَ مِنْ رُّسُلِنَا تو پھر انبیاء کی سنت مراد ہوتی۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ بدر کی صورت میں جو عذاب ہلاکت آیا ہے اسے تم دیکھ چکے ہو اگر آئندہ اسلام اور نبوت کے خلاف تم نے اپنے معاندانہ طرزِ عمل کا اعادہ کیا تو تمہارے ساتھ بھی وہی سلوک ہوگا جو بدر والوں کے ساتھ ہو چکا ہے۔

مسلح جہاد کا اولین مقصد

۳۹۔ اور مسلمانو! تم ان سے لڑتے رہو تا آنکہ فتنہ نہ رہے۔ یعنی کافروں کا زور نہ رہے کہ ایمان سے روک سکیں یا مذہب حق کو موت کی دھمکی دے سکیں جیسا کہ تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی کفار کا غلبہ ہوا مسلمانوں کا ایمان اور مذہب خطرہ میں پڑ گیا۔ اسپین کی مثال دنیا کے سامنے ہے کہ کس طرح قوت اور موقع ہاتھ آنے پر مسلمانوں کو تباہ کیا گیا یا مرتد بنایا گیا۔ بہرحال جہاد و قتال کا اولین مقصد یہ ہے کہ اہل اسلام مامون و مطمئن ہو کر خدا کی عبادت کر سکیں۔ اور دولت ایمان و توحید کفار کے ہاتھوں سے محفوظ ہو۔ چنانچہ فتنہ کی یہی تفسیر ابن عمر وغیرہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے کتب حدیث میں منقول ہے [1]

حضرت شیخ الاسلام نے شارحین قرآن کی عام شاہراہ سے ہٹ کر یہاں فتنہ کی تشریح فرمائی ہے۔ حافظ ابن جریر نے اپنی تفسیر میں فتنہ کی تشریح شرک سے کی ہے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اور حافظ ابن کثیر نے بھی یہی انداز اختیار کیا ہے۔ قاضی بیضاوی، علامہ محمود آلوسی، علامہ شوکانی، علامہ نیشاپوری اور دوسرے شارحین قرآن۔ حضرت مولانا اشرف علی، مفتی محمد شفیع صاحب، مولانا احمد سعید، مولانا عبدالماجد دریا بادی نے بھی یہی تفسیر اختیار کی ہے۔ غالباً سب سے پہلے حضرت مولانا شاہ عبدالقادر نے موضح القرآن میں اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے بتایا تھا کہ:

لڑو جب تک فساد نہ رہے یعنی کافروں کا زور نہ رہے کہ ایمان سے روک سکیں۔

اسی کی پیروی مولانا عثمانی نے اپنی تشریحات میں کی ہے۔ دراصل فتنہ قرآن و سنت کا ایک اصطلاحی لفظ ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ ظالموں کی دستبرد کی وجہ سے مسلمانوں کی زندگی کا امن وسلام محفوظ نہ رہے۔ آزادی سے کوئی اللہ کی عبادت نہ کر سکے اور لوگوں کو اسلام پر چلنے سے روکا جائے۔ یہ خواہ مشرکین وکفار کے تسلط سے ہو یا خود اہل ایمان اس طرح انتشار کا شکار ہو جائیں کہ حق و باطل کی تمیز باقی نہ رہے اور صلاح کا قدم اٹھانا الٹا فساد کا باعث ہو جائے۔ عبداللہ بن عمر سے جب مشاجرات صحابہ میں جنگ کی شرکت کے لیے کہا گیا اور آپ کے سامنے قرآن کی یہی آیت تلاوت کی گئی تو آپ نے فرمایا کہ فتنوں کو فرد کرنے کے لیے جو جنگ تھی وہ تو ہم نے کی ہے۔ اب تم اس جنگ کا آغاز کر رہے ہو جس سے اور فتنے پیدا ہوں گے۔ اپنی مادی اور روحانی طاقت کا اندازہ کیے بغیر فتنوں سے زور آزمائی کرنا صرف ایک جذباتی طرزِ عمل ہے۔ اور فتنوں کو کچلنے کے لیے پہلے سامان مہیا کر لینا عقل کا فیصلہ ہے۔ جذبات جب نتائج سے یکسر خالی ہوں تو وہی ناکامی کا پیش خیمہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح جب عقل جذبات سے بیگانہ ہو جاتی ہے تو وہ بھی صرف دماغی فلسفہ بن کر رہ جاتی ہے کامیابی کا راز جوش کے ساتھ ہوش میں پنہاں ہے۔

بہر حال فتنہ سے مراد کفار کا وہ زور ہے جس کے ذریعے اہل ایمان کو ان کی مرضی کی اسلامی زندگی اپنانے سے روکتے تھے فرمایا کہ ان سے جنگ کرو اور یہ جنگ جاری رکھو یہاں تک کہ روئے زمین سے اس فتنہ کا استیصال ہو جائے۔

کسی کے لیے اس کا کوئی امکان باقی نہ رہ جائے کہ وہ کسی مسلمان کی اسلامی زندگی میں رکاوٹ بن سکے۔ اگر لوگوں کو اسلامی زندگی گزارنے کا حق نہ دیا جائے اور اپنے معبودِ حقیقی کی بندگی سے اپنے زور سے روکا جاتے تو یہ اتنا بڑا ظلم ہے جس سے بڑا ظلم اور کوئی نہیں ہو سکتا حتیٰ کہ ناحق خون کی بھی اس کے مقابلے میں کوئی قیمت نہیں ہے کیونکہ اگر کسی کی جان لے لی گئی تو اس کا مطلب زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ اسے دنیا کی چند روزہ بہار سے محروم کر دیا گیا لیکن اگر کسی سے اس کی خدا پرستی سلب لی گئی اور اپنے رب کا بندہ بننے سے اسے روک دیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی اصل زندگی ہی تباہ کر دی گئی اور اسے آخرت کی ابدی نعمتوں سے محروم کر دیا گیا۔ بلاشبہ دونوں ہی چیزیں ناپسندیدہ ہیں لیکن جب ان دو ناپسندیدہ چیزوں میں سے کسی ایک کو منتخب کرنا پڑے تو ایک احمق بھی پہلی کے مقابلے میں دوسری کا انتخاب نہ کرے گا اس لیے قرآن عزیز جب یہ کہتا ہے کہ والفتنۃ اشد من القتل تو یہ ایک ایسی بات فرماتا ہے جس کی صداقت میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ اگر اس بات میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں، کوئی وجہ نہیں ہے کہ اپنی جانیں دے کر اور دوسروں کی جانیں لے کر اگر اسلام کے راستے کی جبری رکاوٹیں دور کر دی جائیں تو اس کے بہتر ہونے میں دو رائیں ہو سکیں۔

یہ بھی یاد رہے کہ یہ زور اور غلبہ خالص کفر کی جانب سے ہو یا نام مسلمانوں میں فسق و فجور کی جانب سے ہو دونوں فتنے ہیں اور دونوں کا استیصال جہاد کا اولین مقصد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر خود مسلمانوں میں فسق و فجور آ جائے اور فسق و فجور پر مبنی اقتدار قائم ہو اور یہ اقتدار مسلمانوں کی اسلامی زندگی اور خدا کی بندگی میں رکاوٹ ہو تو اس فتنہ کا استیصال بھی مسلمانوں کے فرائض میں داخل ہے۔ اگر اس کی استطاعت نہیں رکھتے تو عافیت اس میں ہے کہ ان سے کنارہ کش رہیں۔ بیگانوں میں نہیں لیکن بیگانوں کی حد تک فتنوں کی ذات میں خود بڑی کشش ہوتی ہے۔ بے دین ناسمجھی سے ان کو دین سمجھ کر ان کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں۔ اور دیندار طبقہ حالات کے تحت ان میں شرکت پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ فتنہ شرک و کفر، بدعت و الحاد، تحریف و تبدیل، فسق و فجور، عریانی و بے حجابی کے مختلف روپ بدل کر آتا ہے۔

ترکِ صلاۃ، ترکِ صوم، ترکِ زکوٰۃ، عبادتِ قبور یہ سب اپنی اپنی جگہ فتنے ہیں۔ ان کی مثال متعدی امراض کی ہوتی ہے جو فضائے عالم میں دفعتہً پھیل جاتے ہیں۔ صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابوسعید خدری کے حوالہ سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

وہ زمانہ قریب ہے جبکہ مسلمان کے لیے سب سے بہتر مال چند بکریاں ہوں گی جنہیں لے کر وہ اپنے دین کو فتنوں سے بچانے کے لیے پہاڑوں کی چوٹیوں میں اور جنگلوں میں بھاگ جائے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ فتنوں کے سیلاب میں گھٹیا صحت ایمان کی نشانی نہیں بلکہ لاپرواہی کی بات ہے۔ عافیت اسی میں ہوتی ہے کہ اس فضا سے نکل جائے۔ اس حقیقت پر امام بخاری نے ایک مستقل باب قائم کر کے متنبہ کیا ہے۔

اسلام میں جنگ کا آخری مقصد

۵۰۔ اور دین سارے کا سارا اللہ کا ہو جائے۔ یہ جہاد کا آخری مقصد ہے کہ کفر کی شوکت نہ رہے حکم اکیلے خدا کا چلے۔ دینِ حق سب ادیان پر غالب آجائے۔ لیظہرہ علی الدین کلہ خواہ دوسرے باطل ادیان کی موجودگی میں۔ جیسے خلفائے راشدین کے عہد میں ہوا یا سب باطل مذاہب کو ختم کر کے، جیسے نزولِ مسیح کے وقت میں ہو گا۔ بہرحال یہ آیت اس کی واضح دلیل ہے کہ جہاد و قتال خواہ ہجومی ہو یا دفاعی، مسلمانوں کے حق میں اس وقت تک برابر مشروع ہے۔ جب تک یہ دونوں مقصد حاصل نہ ہو جائیں۔ اسی لیے حدیث میں آتا ہے [الجہاد ماض الی یوم القیامۃ[1] حافظ ابن کثیر نے اس آیت کی تشریح میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے دو ارشاد مبارک پیش فرمائے ہیں۔ لیجئے آپ بھی استفادہ فرما لیجئے :

حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میں اللہ کی جانب سے مامور ہو کر آیا ہوں کہ لوگوں سے جنگ

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

کرتا رہوں یہاں تک کہ لوگ اقرار کر لیں کہ اللہ کے سوا بندگی کے لائق کوئی نہیں اور مجھے اللہ کا رسول مان لیں اور ہیں جو خدا کی جانب سے کتاب لے کر آیا ہوں اسے مان لیں۔ جب وہ یہ عہد کر لیں تو وہ ان کی جانیں اور اپنے اموال میری جانب سے محفوظ ہوں گے ہاں جو باز پرس اسلامی قانون کرے گا وہ اپنی جگہ حق ہے باقی ان کے باطن کا حساب اللہ کے حوالے ہے۔

اس حدیث کے مختلف الفاظ ہیں۔ بعض میں صرف توحید کا ذکر ہے بعض میں توحید کے ساتھ رسالت کا بھی ذکر ہے اور کچھ میں توحید و رسالت کے ساتھ نماز اور زکوٰۃ کا بھی تذکرہ ہے۔ یہ سب ایک ہی مقصد کی مختلف تعبیرات ہیں۔ اصل یہ ہے کہ جب تک حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے تمام دین کو تسلیم نہ کیا جائے ایمان حاصل نہیں ہوتا۔ اس بات کی طرف کہیں تو دو مشہور ارکان نماز، روزہ، ذکر کر کے اشارہ کر دیا۔ کہیں تمام دین کو شہادتین کے پیمانہ میں پیش کر دیا ہے اور کہیں یہ دیکھ کر کہ صحیح توحید رسول پر ایمان لائے بغیر مکمل نہیں ہوتی صرف کلمہ پر اکتفا کر لیا۔ مدعا سب کا ایک ہے یعنی پورے دین اسلام کی تصدیق و پذیرائی۔

اصل ارشاد میں الدین کلہ للہ آیا ہے۔ اس میں دو باتیں سمجھنے کی ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن کی زبان میں دین کن معنوں میں آیا ہے، دوسرے یہ کہ دین کی کلہ سے تاکید کیوں کی گئی ہے۔ الدین کلہ، کا مطلب ہے سارا دین، سارے دین سے کیا مقصود ہے ادھورا دین کیا ہوتا ہے۔

دین قرآن میں ایک معنے میں نہیں بلکہ ایک سے زیادہ معنے میں آیا ہے۔ یہ دان یدین کا مصدر ہے اس کے چار معنے ہیں:

۱۔ غلبہ و اقتدار، حکمرانی و فرمانروائی جیسے دان الناس
۲۔ اطاعت، بندگی جیسے دنت الرجل۔ تدین لہم بہا العرب
۳۔ شریعت و قانون جیسے کانت قریش ومن دان بدینہم
۴۔ جزا، بدلہ۔ کما تدین تدان

قرآن میں یہ لفظ ان چاروں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ آیت کے معنے یہ ہوں گے، کہ دین سارا کا سارا اللہ کا ہے یعنی نظام زندگی سب کا سب اللہ کا ہو اس میں

کسی قسم کی کوئی پیوند کاری نہ ہو۔ سب کا سب دین اللہ کا ہو۔ اس کا مطلب صاف یہ ہے کہ غلبہ، اقتدار، حکمرانی اور فرمانروائی اللہ کی ہو، اطاعت و بندگی زندگی کے مختلف گوشوں میں صرف اللہ کی ہو، شریعت و قانون ہمارے لیے صرف اللہ کا ہو۔ جزاو سزا صرف اللہ کی ہو۔ اس اعتبار سے غور کیجیے کہ قرآن و سنت نے اللہ سبحانہ کا تصور کیا قائم کیا ہے اور انسان کی ذات اور کائنات سے اس کے تعلق نیز اس کی تعدیہ کی نسبت نبوت کا نظریہ کیا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے سارا ملک اور اقتدار اللہ سبحانہ کا ہے۔ قل اللھم مالک الملک توتی الملک من تشاء کہہ دو اے اللہ ملک کے مالک تو ہی ہے جسے چاہتا ہے حکومت عطا کرتا ہے۔ انسان کی حیثیت اس زمین میں اللہ کے خلیفہ کی ہے جسے ایک مکمل قانون حوالہ کرکے اس لیے روانہ کیا ہے کہ وہ اس قانون کو خود اپنی زندگی اور معاملات کے لیے مشعلِ راہ بنائے اور دوسروں کو بھی اسی قانون کے مطابق چلانے کی کوشش کرے۔ اس کام کے لیے اسے کچھ تھوڑے بہت اختیارات بھی تفویض کیے گئے ہیں۔ اور اسی مقصد کے حصول کی خاطر کائناتِ خارجی اور اس کی لاتعداد قوتوں کو انسان کا خادم بنا دیا گیا ہے کہ وہ ان کو جس طرح چاہے کام میں لائے۔ انسان اس لیے نہیں ہے کہ وہ خارج کا بے بس غلام بن کر رہے۔ اس کا شرف و امتیاز یہ ہے کہ وہ خارج اور اس کی قوتوں پر اپنے ارادے کو موثر کرے اور جس کا خلیفہ بن کر آیا ہے اس کی ذات و صفات سے قرب پیدا کرے تاکہ اس کی ذات، ذاتِ الٰہی کا پرتو بن جائے۔ حضور اقدس کا ارشاد ہے تخلقوا باخلاق اللہ۔ اللہ کی ذات سے یہ ہرگز مراد نہیں کہ وہ انسانوں کی طرح جسم اور اس کے لوازم سے آلودہ ہے۔ شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں اللہ کی ذات جسم اور جسمانیت سے پاک ہے۔ اس کے قرب کا ذریعہ صرف اس کی یاد اور اس کی طاعت ہے۔ یاد سے مراد پرستش اور طاعت سے مراد بندگی ہے یعنی خدا کا قرب حاصل کرنے کی صرف دو راہیں ہیں ایک پرستش اور دوسرے بندگی۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ پرستش اور بندگی جو دین ہے یہ صرف اللہ کی ہو۔ یہ تاریخ کا بہت بڑا المیہ ہے کہ نبیوں کی امتوں نے ان دونوں میں ہم آہنگی قائم نہیں رکھی۔ دین کے نام پر پرستش کو لے لیا اور بندگی کو خیرباد کہہ دیا حالانکہ روزِ ازل سے اسلام کی

گاڑی کے دو پہیئے ہیں اور ان دونوں میں یگانگت قائم رکھی گئی ہے۔ عموماً پرستش کی زندگی تک دین کا نام استعمال کیا گیا ہے اور بندگی کے دائرے کو دنیا کہہ دیا گیا۔ قرآن نے دین میں یہودیوں کے جس تفرق کی نشاندہی کی ہے وہ یہی ہے۔ اور اسی تفرق سے قرآن نے امتِ اسلامیہ کو روکا تھا واعتصموا بحبل اللّٰہ جمیعاً و لا تفرقوا۔ یہاں تفرق سے فرقہ بندی نہیں بلکہ دین کے اسی حصے ٹٹ جانا مراد ہے اور اس کی طرف قرآن نے یہ کہہ کر مسلمانوں کی رہنمائی کی تھی یا ایہا الذین اٰمنوا ادخلوا فی السلم کافۃ اس آیت میں کافۃً السلم کا حال ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پورے اسلام میں داخل ہو ادھورے اسلام میں نہ داخل ہو۔ یہ نہ ہو کہ صرف اللّٰہ کی پرستش کرو اور بندگی میں اللّٰہ سے تمہارا کوئی تعلق نہ ہو۔ یہی ادھورا اسلام یعنی پرستش کو اپنانا اور بندگی کو خیرباد کہنا۔ پھر قرآن نے یہودیوں کو یہ کہہ کر ڈانٹا تھا کہ:

افتومنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض۔

کیا تم کتاب الٰہی کی کچھ پر ایمان رکھتے ہو اور کچھ کا انکار کرتے ہو۔

یہی بات آج مسلمانوں پر صادق آتی ہے۔ ان سے بھی یہی پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا تم کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ پر ایمان رکھتے ہو اور کُتِبَ عَلَیْکُمُ القصاص پر ایمان نہیں رکھتے ہو۔ اسلام پرستش اور بندگی دونوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ آیت میں الدین کے ساتھ کلہ، کا اضافہ یہ بتانے کے لیے کیا ہے کہ پرستش اور بندگی دونوں کا سارا کا سارا مجموعہ جب تک صرف اللّٰہ کے لیے نہ ہو جائے تم اس وقت تک جنگ کرتے رہو۔ یہی اسلامی جنگ کا آخری مقصد ہے۔ اولین مقصد یہ ہے کہ دنیا سے کفر کا زور ختم ہو جائے، ہر قسم کا فساد مٹ جائے۔ اخلاقی، معاشرتی، خاندانی، معاشی، سیاسی اور روحانی فسادات میں سے کوئی فساد باقی نہ رہے۔ اور آخری مقصد یہ ہے کہ پرستش اور بندگی میں عابدانہ تعلقات اللّٰہ کے بندوں کے صرف اللّٰہ سے ہو جائیں اور بس۔ اگر صورتِ حال یہی ہے اور کیوں نہ ہو جب کہ سفینۂ قرآن اُبلی ہوئی صدا یہی ہے، تو پھر انسانیت کا کوئی مسئلہ نہیں جو اسلام کے دائرے سے باہر ہو۔ وہ بندگی و پرستش پر مبنی ایسا دین ہے جو ہر جگہ انسان کے ساتھ رہتا

ہے۔ مسجد میں بھی، گھر میں بھی، برادری میں بھی، بازار میں بھی، خانقاہ میں بھی، عدالت میں بھی، تعلیم گاہ میں بھی، حکومت کے ایوانوں میں بھی، زندگی کی ہر شاخ میں وہ رہنمائی کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ وہ ایک ایسا مکمل نظام ہے جو انسانی زندگی کے اعتقادی، فکری، اخلاقی، انتظامی، سیاسی، معاشی، معاشرتی، قانونی اور روحانی تمام پہلوؤں کو پوری طرح گھیرے ہوئے ہے۔ کچھ اسی طرح جس طرح ہوا کا کرہ اس زمین کو چاروں طرف سے اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے۔

جنگ کے دو گونہ مقاصد اور فقہا

اسلام کے قانون داں طبقہ نے مسئلہ جہاد کے ان دو مقاصد کے پیش نظر جہاد کی تشریح میں دو جامع لفظ بولے ہیں۔ اعلاء کلمۃ اللہ اور دوسرا دفع الشر عن العباد اور بتایا ہے کہ جہاد کی فرضیت کی غایت یہی دو چیزیں ہیں۔ صاحب ہدایہ لکھتے ہیں۔

جہاد فرض ہوا ہے اعزاز دین اور عام انسانی زندگی سے برائی کو ہٹانے کے لیے۔

صاحب نہایہ لکھتے ہیں کہ آیت زیر تشریح میں ان دونوں باتوں کی طرف اشارا ہے لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ سے دفع الشر عن العباد اور یکون الدین اللہ میں کلمۃ اللہ سے اعزاز دین اللہ مراد ہے۔ ان ہی مقاصد کو پیش نظر اسلام کے قانون داں طبقہ نے قانونی حیثیت سے بین الاقوامی ضابطہ کی تشکیل کی ہے اور بتایا ہے کہ اسلام کے سامنے دنیا کی تمام قوموں کی تین قسمیں ہیں۔

اول مشرکین عرب ان کے لیے صرف دو صورتیں ہیں اسلام یا تلوار۔ اس آیت میں روئے سخن ان کی طرف ہے۔

دوم، اہل کتاب یعنی ان کتابوں کے پیروکار جن کے نام قرآن میں آئے ہیں۔ مثلاً عیسائی اور یہودی۔ ان کے لیے تین صورتیں ہیں۔

الف، اسلام قبول کرلیں۔
ب، اسلام قبول نہیں کرتے تو اسلامی مملکت کے شہری بن جائیں۔
ج، اگر اسلامی مملکت کے شہری نہیں تو مصالحت کرلیں۔

اسلامی مملکت کا شہری بننے کی صورت میں ان سے ٹیکس لیا جائے گا اور ان کی جانوں، مالوں، ان کے معابد کی حفاظت کی جائے گی۔

سوم: اشبہ اہل کتاب یعنی وہ لوگ جو تورات، انجیل اور زبور کو نہیں مانتے مگر وہ خود اپنے لیے کسی آسمانی کتاب پر ایمان لانے کے مدعی ہیں جیسے صابی وغیرہ، مسلمان ان کی عورتوں سے نکاح نہیں کر سکتے، ان کا ذبیحہ نہیں کھا سکتے۔ ان دو باتوں کے علاوہ اہل کتاب کے بقیہ حقوق اسلام نے ان کو عطا کیے ہیں۔

ان آیات قرآنی میں قتال کی بحث صرف مشرکین عرب اور قریش سے ہے اسی روشنی میں ان کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اس آیت کی تشریح البقرہ میں گزر چکی وہاں نوٹ نمبر ۵۵۴ کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔

قانونی طور پر اسلام کا فیصلہ

۵۱۔ پس اگر وہ باز آجائیں تو وہ جو کچھ کریں گے اللہ کی نگاہ میں ہیں۔ یعنی جو ظاہر میں اپنی شرارت اور کفر سے باز آجائیں ان سے قتال نہیں۔ ان کے دلوں کا حال اور مستقبل کی کیفیات کو خدا کے سپرد کیا جائے گا۔ جیسا وہ کام کریں گے خدا کی نگاہ سے غائب ہو کر نہیں کر سکتے۔ مسلمان صرف ظاہر حال کے مطابق عمل کرنے کے مکلف ہیں وفی الحدیث۔

امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الٰہ الا اللہ فاذا قالوا ها عصموا منی دماءھم واموالھم الا بحقها وحسابهم علی اللہ عز وجل[1]

میں اس بات پر مامور ہوں کہ اس وقت تک برابر جنگ جاری رکھوں تا آنکہ وہ اس کی گواہی دیں کہ اللہ کے سوا معبود کوئی نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ اللہ کے رسول ہیں۔ نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں۔ جب وہ ان احکام کو مان لیں تو اب مجھ سے وہ اپنی جان و مال کو بچا لیں گے ہاں بجز اس صورت کے جو اسلامی قانون کے تحت ہو، اس کے بعد ان کا معاملہ اللہ

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

کے مپیر ہے۔ وہ جانتے کہ ان کا اسلام نمائشی ہے یا واقعی ۔
آیت کا روئے سخن مشرکین عرب کی طرف ہے۔ انتھوا کا متعلق محذوف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اپنی کافرانہ اور مشرکانہ روش سے باز آ جائیں یعنی اسلام قبول کرلیں تو پھر ان سے کوئی جنگ نہیں بلکہ وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔ سورہ توبہ میں یہ بات کھول کر کہہ دی گئی ہے فان تابوا و اقاموا الصلاۃ فاخوانکم فی الدین ۔
باقی رہا یہ سوال کہ ان کا اسلام نمائشی ہے یا واقعی، اس کے جواب میں ارشاد ہوا کہ یہ دیکھنا تمہارا کام نہیں ہے، یہ اللہ کا کام ہے کیونکہ ان کے اعمال یہ اللہ کی نگاہ ہے۔ تمہیں اس اندیشہ سے بالا ہونا چاہیے۔ یہ آیت کرامی روئے زمین کے سارے کافروں کے بارے میں نہیں بلکہ صرف مشرکین عرب کے بارے میں ہے۔ فقہاء احناف اور اکثر تابعین کا یہی خیال ہے۔ قرطبی نے، ابو حیان اندلسی نے اور علامہ آلوسی نے اسی کو اپنایا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ بیت اللہ کی تعمیر ملت ابراہیم کے مرکز کی حیثیت سے ہوئی ہے۔ یہ گھر اللہ سبحانہ کی عبادت کے لیے تعمیر ہوا۔ قریش نے اس گھر کے تمام مقاصد کو برباد کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کی دعا کے مطابق جب اپنا آخری پیغمبر روانہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ان سے جنگ کرو اور یہ جنگ جاری رکھو یہاں تک کہ پورے علاقہ میں اللہ کے دین کے علاوہ یعنی اسلام کے علاوہ کوئی دین باقی نہ رہے۔ اسی بات کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں تعبیر فرمایا ہے کہ اس سرزمین پر دو دین جمع نہیں ہو سکتے۔

ایک اہم سوال

شاید آپ کے ذہنوں میں یہ خلش ہو کہ دُنیا کی تمام قوموں سے الگ مشرکین عرب سے جنگ کے موضوع پر یہ امتیاز کیوں رکھا گیا ہے کہ سب کو اسلام کی، اسلام کی شہریت کی اور محارب ہونے کی رعایت دی گئی ہے جبکہ عرب کے مشرکین کو صرف اسلام اور جنگ دو صورتوں میں ایک صورت اختیار کرنے کو کہا گیا ہے اور وں کا پتہ نہیں میں جو کچھ سمجھا ہوں وہ یہ ہے کہ کوئی نظریاتی اُمت زندہ نہیں رہ سکتی جب تک کہ اس کا کوئی مرکز نہ ہو۔ کوئی تعلیم باقی نہیں رہ سکتی جب

تک اس کی قائم و جاری درسگاہ نہ ہو۔ کوئی دریا نہیں جاری رہ سکتا جب تک ایک سرچشمہ سے اس کا یگانگی نہ ہو۔

نظامِ شمسی کا ہر ستارہ روشنی اور حرارت صرف اپنی مرکزِ شمسی ہی سے حاصل کرتا ہے۔ اسی کی بالاتر جاذبیت ہے جس نے یہ پورا کارخانہ سنبھال رکھا ہے۔ یہی قانونِ الٰہی ہے جس پر اس کی شریعت کے تمام اجتماعی احکام مبنی ہیں۔ لہٰذا جیسے قرآن نے اُمت کے لقا اور حق و ہدایت کے لیے طرح طرح کے مرکز بنائے ایسے ہی ایک زمینی مرکز بھی قیامت تک کے لیے ضروری تھا۔

قرآن نے اس غرض کے لیے سرزمینِ حجاز کو منتخب کیا۔ یہی ناف زمین دُنیا کی آخری اور دائمی ہدایت کے لیے مرکزی چشمہ اور روحانی درسگاہ قرار پائی۔ چونکہ حجاز سرزمینِ عرب میں واقع ہے اس لیے تمام سرزمینِ عرب بھی اس حکم میں داخل ہو گئی۔

مرکزِ ارضی کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کی دعوت ایک عالمگیر اور دُنیا کی بین الاقوامی دعوت تھی۔ وہ کسی خاص ملک میں محدود نہ تھی مسلمانوں کی قومیت کے اجزاء ساری دُنیا میں پھیل جانے والے تھے۔ ان بکھرے ہوئے افراد کو ایک رشتۂ تسبیح میں منسلک رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ ایسی کوئی جگہ مخصوص ہو جو ان بکھرے ہوئے افراد کے لیے مرکزی نقطہ ہو۔ سارے منتشر افراد وہاں پہنچ کر سمٹ جائیں تمام پھیلی ہوئی شاخیں وہاں اکٹھی ہو کر جُڑ جائیں۔ ہر شاخ کو اس جڑ سے زندگی ملے۔ ہر نہر اس سرچشمہ سے سیراب ہو۔ ہر ستارہ اس سورج سے روشنی لے۔ ہر انتشار کو اس سے اتحاد و یگانگت ملے۔ یہی مقام ساری اُمت کی تعلیم و ہدایت کے لیے ایک بین الملّی درسگاہ ہے۔ یہی تمام روئے زمین پر پھیلی ہوئی اہلِ ایمان کی کثرت کے لیے نقطۂ اتحاد ہے۔ اگر تمام دُنیا انسانوں کی باہمی کشمکش اور فتنہ و فساد سے دوزخ بن جائے تو یہ ایک پاک و مقدس جگہ ایسی ہے جو ہمیشہ امن و رحمت کی بہشت ہے۔ اس کا ایک ایک چپہ مقدس ہے، اس کا ایک ایک کونہ اللہ سبحانہٗ کے مقدس نام پر محترم ہے۔ اس کا ایک ایک ذرہ اس کے جلال و قدوسیت کا جلوہ گاہ ہے۔ دُنیا پر کفر و شرک کے جماؤ اور ابھار کا کیسا ہی سخت سے سخت وقت آجائے مگر وہ سچی توحید اور مخلصانہ عبادتوں کا ایسا گھر ہے جہاں اللہ سبحانہٗ

اور اس کی صداقت کے سوا کسی کو خیال بھی نہیں آتا۔

شاخوں کی شادابی جڑ پر موقوف ہے۔ درختوں کی جڑ اگر سلامت ہے تو شاخوں اور پتوں کے مرجھانے سے باغ اُجڑ نہیں سکتا۔ دس ٹہنیاں کاٹ دی جائیں تو بیس نئی نکل آئیں گی۔ اسی طرح اُمت کا اگر مرکز ارضی محفوظ ہے تو اس کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کی بربادی سے اُمت نہیں مٹ سکتی۔ جس طرح اہل ایمان کی اجتماعی زندگی کے لیے خلافت امامت کو مرکز بنایا ہے۔ ٹھیک اسی طرح اُمت کے زمینی پھیلاؤ اور پھیلاؤ کے لیے ابراہیمی عبادت کدہ یعنی کعبہ کو اس کی سرزمین حجاز اور اس کے ملک جزیرہ عرب کو دائمی مرکز قرار دیا۔ قرآن کی آیت جعل اللّٰہ الکعبۃ البیت الحرام قیاما للناس اور واذ جعلنا البیت مثابۃ للناس و امنا اور حیث ما کنتم فولوا وجوھکم شطرہ کا یہی مطلب ہے

زیر تشریح آیت میں بتایا گیا کہ اگر مشرکین عرب کفر و شرک سے اور اسلام کے خلاف باغیانہ روش سے باز آجائیں تو اللہ سبحانہ ان کی ماضی کی غلطیوں کو نہ دیکھے گا بلکہ ان کے مستقبل کے اعمال کو دیکھے گا اگر وہ واقعی ہوئے تو جزا دے گا اور اگر نمائشی ہوئے تو سزا دے گا۔ اس لیے مسلمانو! تمہیں ہر حال میں ان کے اسلام کو قبول کر لینا چاہیے۔ جو شخص زبان سے اعلان کرتا ہے تو مان لینا چاہیے۔ جیسے کسی چیز کے وجود کی تین صورتیں ہوتی ہیں لفظی، ذہنی اور عینی ایسے ہی ایمان کے وجود کی بھی تین صورتیں ہیں۔ ایمان کا لفظی وجود اس کا زبان سے اقرار کرنا ہے۔ حافظ ابن تیمیہ کتاب الایمان میں لکھتے ہیں کہ اسلام کے ثبوت کا دارومدار کسی ایسی چیز پر ہونا چاہیے جس کا علم یکساں طور پر سب کو ہو سکے اس لیے کلمہ توحید کا اقرار زبانی ہی کو اسلام قبول کرنے کا معیار بنا دیا گیا اور اسی ایک کلمہ پر جنگ کے آغاز و خاتمہ کو بنیاد و اساس کی حیثیت دے دی ہے پہلے ارشادِ نبوت سن چکے ہو امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الٰہ الا اللّٰہ۔ یہ نبوت کے نظامِ حیات کی بہت بڑی فیاضی ہے کہ صرف زبانی اقرار کو جان و مال اور آبرو کی عصمت میں ضمانت بنا دیا جائے۔ دُنیا کا کوئی نظام بھی یہ رعایت نہیں دیتا۔ لیکن یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ اسلام میں ایمان کے وجود عینی اور ذہنی

کے بغیر صرف لفظی وجود کوئی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ قلبی تصدیق ایمان کا وہ اہم رکن ہے جو ایک لمحہ کے لیے بھی کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے، تا آنکہ اگر جان بھی جا رہی ہو زبان سے کلمہ کفر کہنے کی صرف اس شرط پر اجازت ہے کہ قلب کی گہرائیاں اذعان و یقین سے معمور رہیں۔

الا من اکرہ وقلبہ مطمئن بالایمان

یہ صرف نبوت کا نظام ہے جو یہ دعوت دیتا ہے کہ اپنے حریفوں کی زبان پر بھی اعتماد کر لو۔ اور یہ فکر نہ کرو کہ ان کے دل میں کیا ہے۔

ایک بار صحابہ کرام نے ایک کافر کو بکریاں چراتے دیکھا۔ دوران جنگ ہر فریق گھات میں لگا رہتا ہے۔ صحابہ کرام نے چاہا کہ اس کی بکریاں چھین لیں۔ مدِ مقابل نے اپنا پانسہ کمزور دیکھا، مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا۔ لیکن اس وقت میں دشمن کا اقرار وفاداری کب قبول کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے صحابہ نے یہ سمجھ کر کہ یہ بچاؤ کا طریقہ ہے اس کی بکریاں لے لیں۔ اس واقعہ کی اہمیت اتنی محسوس کی گئی کہ خود اللہ سبحانہ نے دست اندازی فرمائی تنبیہہ انداز لہجہ میں وحی آئی۔

لا تقولوا لمن القی الیکم السلام لست مومنا

حدیث کی کتابوں میں اس قسم کے واقعات ایک دو نہیں بہت ہیں جہاں ایمان کے صرف لفظی وجود یعنی اقرار کو دنیوی احکام کے لیے ضروری سمجھ لیا گیا۔

موقعہ کی نزاکت کے پیش نظر حضرت امام بخاری نے کتاب الایمان میں اپنے فقہی مسلک کو ایک عنوان قائم کر کے سمجھایا ہے۔

اذا لم یکن الاسلام علی الحقیقۃ وکان علی الاستسلام
او الخوف من القتل لقولہ تعالی، قالت الاعراب آمنا
قل لم تومنوا ولکن قولوا اسلمنا۔

شارحین بخاری اس کے مطلب میں دور کی وادیوں میں نکل گئے۔ کسی نے اس سے ایمان و اسلام کا تغایر اور کسی نے اتحاد سمجھا۔ کسی نے اسلام حقیقی اور مجازی کی بحث چھیڑ دی اور کسی نے اسلام لغوی اور اسلام شرعی کی بات بتائی۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ حضرت امام بخاری صرف یہ بتاتے ہیں کہ ایک اسلام ہے اور ایک استسلام

ہے۔ اسلام یہ ہے کہ ایک شخص فی الواقع دل کی گہرائیوں سے اعتقاد و انقیاد کے ساتھ
نبوت کے لائے ہوئے نظامِ حیات کو اپنا ئے اور استسلام یہ ہے کہ حالات کے تحت
مالِ غنیمت میں لالچ یا قتل کے اندیشہ سے مسلمان بن جائے۔ پہلا اسلام واقعی اسلام
ہے۔ دُنیا و آخرت دونوں میں کارآمد ہے دوسرا استسلام آخرت میں کام آنے
آنے والا نہیں لیکن دنیا میں کارآمد ہے۔ ہم شہری زندگی میں اسے مسلمان کہیں گے
اور ایسے اسلامی مملکت میں مسلمان شہری قرار دیں گے۔ علامہ سندھی نے عبارت میں
او الخوف کا معطوف علیہ کس طرح کھول کر امام بخاری کی مراد ظاہر کردی۔ اور شارح
عقیدہ سفارینی نے تو معطوف علیہ مذکور نہ ہونے کی وجہ سے امام بخاری پر یہ الزام
لگا دیا کہ ان کے خیال میں خوف کی حالت کا اسلام معتبر نہیں ہے۔ حالانکہ ایسا سمجھنا
دُرست نہیں ہے۔ صورتیں دو ہیں۔ ایک یہ کہ جان بچانے کی خاطر صرف نمائشی طور پر
مسلمان ہو رہا ہے۔ قلب کو اذعان و یقین کی نصیب نہیں ہے تو یہ اسلام دُنیا میں
معتبر ہے لیکن آخرت میں مفید نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ قلب یقین سے معمور ہے
لیکن مسلمان عین میدان جنگ میں ہو رہا ہے تو یہ ایمان آخرت اور دُنیا دونوں جگہ
معتبر اور مفید ہے۔ امام بخاری ہرگز اس کے مخالف نہیں۔ اور مخالف کیسے ہو
سکتے ہیں جیسا کہ تاریخِ اسلام ایسے افراد سے بھری ہوئی ہے جو تلواروں کے سائے
میں مسلمان ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کا اسلام قبول ہُوا۔ یہ واضح رہے کہ دین
دائمی کی تبدیلی جس طرح دلائل کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ اسی طرح دنیوی یا کسی خوف و
ہراس کی وجہ سے بھی ہو سکتی ہے۔ دونوں صورتوں میں قانونی طور پر اسلام قابلِ
پذیرائی ہے۔ یہاں قرآن فان اللہ بما یعملون بصیراً میں یہی بات سمجھا رہا
ہے کہ دلوں کا حال تمہیں معلوم نہیں ہے۔ اگر وہ کفر و شرک سے باز آجاتے ہیں
تو وہ قانونی طور پر مسلمان ہیں۔ باقی مستقبل میں اعمال تو اس کی جزا و سزا اللہ
کا کام ہے۔

اہلِ ایمان کے لیے اللہ کی ولایت

۵۲۔ اور اگر وہ پھر جائیں تو پھر جان لو کہ اللہ سبحانہٗ تمہارا کارساز ہے

کیا ہی اچھا کارساز اور کیا ہی خوب مددگار ہے۔ یعنی مسلمانوں کو چاہیے کہ خدا کی مدد اور حمایت پر بھروسہ کر کے جہاد کریں۔ کفار کی کثرت اور سازوسامان سے مرعوب نہ ہوں، جیسے جنگ بدر میں دیکھ چکے ہو کہ اللہ سبحانہ نے مسلمانوں کی کیا خوب امداد و حمایت کی[1] مطلب یہ ہے کہ اگر وہ اسلام قبول نہ کریں تو پھر تمہیں اس یقین کے ساتھ ان کا مقابلہ کرنا چاہیے کہ اللہ سبحانہ تمہارے بگڑے حالات بنانے والا اور آڑے وقت میں تمہاری مدد کرنے والا ہے۔ تمہیں ان کی عددی طاقت اور ان کے سروسامان کی بہتات سے ہراساں نہیں ہونا چاہیے اللہ سبحانہ نے جیسے اب تک تمہاری نصرت فرمائی ایسے ہی آئندہ بھی تمہاری مدد کرے گا۔ وہ بہترین کارساز ہے۔ اپنی مشکلات جو اس کو اپنا ملجا و ماویٰ بناتے ہیں وہ ان کو کبھی مایوس نہیں کرتا ہے، وہ بہترین مددگار ہے۔ حق کی امداد وہ کرتا ہے وہ کبھی ناکامیوں سے دوچار نہیں ہوتے ہیں۔ اللہ سے تمہارا عابدانہ تعلق جس قدر زیادہ مضبوط ہوگا اسی قدر اللہ کی نصرت تمہارے ہمدوش ہوگی۔ جن کا اللہ مولیٰ ہوتا ہے وہ دنیا و آخرت میں کامیاب ہوتے ہیں دُنیا میں جب کبھی کوئی فرد یا جماعت کسی مقصد کی خاطر جدوجہد کرتی ہے تو اس کے سامنے اُمید بھی ہوتی ہے مایوسی بھی، کامیابی بھی اور ناکامی بھی۔ لیکن قرآن بتاتا ہے کہ مومن وہ ہے جسے اللہ کی رفاقت حاصل ہے۔ اس کی جدوجہد میں اللہ کی ولایت کی وجہ سے جو کچھ ہے اُمید و کامیابی بھی ہے مایوسی اور ناکامی کی اس پر پرچھائیں بھی نہیں پڑ سکتی۔ کیونکہ وہ جو کچھ کرتا ہے اللہ کے لیے کرتا ہے۔ اس کے لیے یہ بات کامیابی نہیں ہوتی کہ کسی خاص منزل تک پہنچ جائے بلکہ اس کی راہ میں چلتے رہنا اور جدوجہد میں لگے رہنا بجائے خود بڑی سے بڑی کامیابی ہے۔ وہ جب اپنا سفر شروع کرتا ہے تو اس لیے کہ کسی خاص منزل تک ضرور پہنچے بلکہ صرف اس لیے کرتا ہے کہ اس کے اللہ سے عابدانہ تعلقات ہیں اور اللہ اس کا مولیٰ ہے اور مولیٰ کی راہ میں چلتے رہنا ہی اس کی منزل مقصود ہے،

[1] افادات شیخ الاسلام

رہ روداں را خستگی راہ نیست

عشق ہم راہ است وہم منزل است

الحمدللہ معالم القرآن کی نویں جلد ۹۶۳ صفحات پر مشتمل آج مورخہ
۱۷ صفر المظفر ۱۴۰۴ھ مطابق ۲۳ نومبر ۱۹۸۳ء بروز چہار شنبہ بوقت
۵ بج کر ۲۷ منٹ پر ختم ہوئی ۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم وتب علینا انک
انت التواب الرحیم۔